

# ناقابلِ فخر و شرم

دیوانِ سجادِ حق

مکتبہ نوائے وقت دی مال لاہور

قیمت دس روپے

7

ب

س

پاکستان میں پہلی بار \_\_\_\_\_ نومبر ۱۹۵۷ء  
پاکستان میں پہلی بار \_\_\_\_\_ مارچ ۱۹۵۸ء

پاکستان میں چھاپنے اور شائع کرنے وغیرہ کے تمام حقوق  
”نوائے وقت“ پہلی کیشنر لمیٹڈ لاہور  
کے نام وقف اور محفوظ ہیں

انڈیا میں

میں چھپی { (۱) محبوب المطابع پریس دہلی  
(۲) دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی  
(۳) دیال پریس دہلی  
(۴) ٹائٹل، نوٹک پریس دہلی

اردو پریس ۸۸ میکوڈ روڈ - لاہور میں مکتبہ نوائے وقت کے  
لئے بہ اہتمام چودھری علی محمد چھپی ہو







مصنف

# منذر

محبت کے آنسوؤں کے ساتھ

اُن کے قدموں میں

جو اس دنیا میں موجود ہیں یا دوسری دنیا میں چلے گئے  
اور جن کی محبت - اخلاص اور دوست نوازی کی یاد ہمیشہ  
ہی میرے دل میں مسرت - راحت اور طہارت پیدا  
کرنے کا باعث ثابت ہوئی۔

منذر گزدار

دہلی

یکم نومبر ۱۹۵۷ء



# فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ	نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	نذر دیوان سنگھ	۱۵	۲۲	ریاستوں کی قومی زندگی کا علم پر دار	۲۲
۲	فہرست	۱۵	۲۳	(جناب مالک دلم صاحب معصفت ذکر غالب وغیرہ)	۲۳
۳	دیباچہ	۱۶	۲۴	خیر معتمد	۲۴
۴	اردو زبان میں ناقابل فراموش اضافہ	۱۶	۲۵	(ہندت ہری چند صاحب اختر)	۲۵
۵	ناقابل فراموش اردو کی یادگار کتاب	۱۶	۲۶	دلچسپ پریشش اور مفید	۲۶
۶	(اردو اکثر ایم ڈی تاثیر ایملے۔ پی۔ ایچ ڈی مرحوم)	۱۶	۲۷	(سرگوبائی مل ایڈیٹر رسالہ تحریک دہلی)	۲۷
۷	بہترین دوست اور خطرناک دشمن	۱۷	۲۸	سچا افسانہ	۲۸
۸	(حضرت علامہ نیاز فقہوری ایڈیٹر نگار گھنٹی)	۱۷	۲۹	(جناب عرش لمیائی ایڈیٹر آج کل دہلی)	۲۹
۹	ناقابل فراموش ایڈیٹر کے ناقابل فراموش مضامین	۱۸	۳۰	(مضامین)	۳۰
۱۰	(بھیا شیخ احسان الحق صاحب ترقی دین علم بیٹھ)	۱۸	۳۱	کام سے محبت	۳۱
۱۱	سبق آموز اور عبرت انگیز	۱۹	۳۲	طوائفوں سے نفرت	۳۲
۱۲	(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بانی انجمن ترقی اردو)	۱۹	۳۳	خود داری کا کیریٹر	۳۳
۱۳	ناقابل فراموش میں جرأت اور صاف گوئی	۲۰	۳۴	اعتماد کشی جرم ہے	۳۴
۱۴	(حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر شمع دہلی)	۲۰	۳۵	محنت کی عادت	۳۵
۱۵	بہترین دوست اور بدترین دشمن	۲۱	۳۶	کامیابی کے لئے مضبوط قدم کی ضرورت	۳۶
۱۶	(جناب ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام لطیف کارگاہ)	۲۱	۳۷	خبریں حاصل کرنے میں مشکلات	۳۷
۱۷	پنجاب کا تیسرا معجزہ	۲۲	۳۸	کام کرو روپیہ کی کمی نہیں	۳۸
۱۸	(پروفیسر غلام احمد صاحب فرقہ کا کوڑی ایم اے)	۲۲	۳۹	کیریٹر کا دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے	۳۹
۱۹	غیر فانی کتاب	۲۳	۴۰	اچھے لوگ اپنے ہم وطنوں کے لئے باعث عزت	۴۰
۲۰	(حضرت مولانا عبد الرزاق صاحب طبع آبادی)	۲۳	۴۱	دعا اور بددعا کا اثر	۴۱
۲۱	بہترین خود نوشت سوانح عمری	۲۴	۴۲	ماں کی مامتا	۴۲
۲۲	(جناب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ ملٹ ہیڈ کوارٹر دیپاٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)	۲۴	۴۳	محنت اور کامیابی	۴۳
۲۳	درس عمل	۲۵	۴۴	والیان ریاست کا انتقام	۴۴
۲۴	(ڈاکٹر م جمیل سید ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ ملٹ ہیڈ کوارٹر دیپاٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)	۲۵	۴۵	انگریزوں کا کیریٹر	۴۵
۲۵	ممبر برٹش انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی۔ ہندو)	۲۵	۴۶	مہاراجا جی کی نظر زندگی سبب جہان کا گزری کا دست کار	۴۶
۲۶		۲۶	۴۷	روپیہ سے محبت نہ کرو	۴۷

نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار
۱۴۲	مارشل لا کا زمانہ	۶۴	سیاسی جرائم کی تعزیر لا حاصل	۳۵
۱۴۴	پولیس کے نیپے پر پبلک کا دہلہ	۶۵	احسان کرنا اور احسان جتنا	۳۶
۱۸۰	دالیان ریاست کا "پیر شیخ"	۶۶	خبریں حاصل کرنے میں مشکلات	۳۷
۱۸۲	عادت کا قوت ارادی پر اثر	۶۷	ایک پائیل کی ریاست "کراہاد"	۳۸
۱۸۳	معقولیت باعث اطمینان	۶۸	پبلک لائٹ اور شادی	۳۹
۱۸۸	قانون اور فرض	۶۹	ایڈیٹر "ریاست" پر چوری کا مقدمہ	۴۰
۱۹۶	ریاستوں کے جرائم اور ان کی سزائیں	۷۰	ایڈیٹر "ریاست" پر کوکین کا مقدمہ	۴۱
۱۹۸	ریاستی جرنلزم	۷۱	عورت اور سنگار	۴۲
۲۰۵	اختیار نویس ہونے	۷۲	بد دل ملازم دشمن سے بدتر	۴۳
۲۰۹	جرنلزم کا روشن پہلو	۷۳	"ریاست" میں سر جان تھا مین اور دالیان ریاست	۴۴
۲۱۳	گورنمنٹ کی کاغذی مشینری	۷۴	جرنلزم کی چاٹ اور عشق	۴۵
۲۱۷	ریاستوں کی عدالتیں اور مجسٹریٹ	۷۵	دوستوں کے لئے قربانی کرو	۴۶
۲۲۱	خدا رنا قابل معافی ہیں	۷۶	ایڈیٹر "ریاست" کی عدالتی قمار بازی	۴۷
۲۲۴	سی آئی ڈی کے معتبر رپورٹر	۷۷	گناہوں کی سزا	۴۸
۲۳۰	علامہ مشرقی کی گرفتاری و "رہائی"	۷۸	ریاستی رعایا اور اہلکاروں کی وفا شعاری	۴۹
۲۳۴	پیش گوینٹ کی دالیان ریاست کے متعلق مصلحتیں	۷۹	خود کشی کرنا بزدلی نہیں	۵۰
۲۳۷	پانی کا اثر طبائع پر	۸۰	ریاستوں کے مظالم اور پیش حکام	۵۱
۲۴۰	عزت مرنے کے بعد	۸۱	اگر وال ذہنیت	۵۲
۲۴۲	عزت کی قربانی	۸۲	نفرت و محبت کے اسباب	۵۳
۲۴۷	دالیان ریاست کا "پیر شیخ"	۸۳	نسل اور صحبت کا اثر	۵۴
۲۵۱	خاندانی وقار پر فخر نہ کرو	۸۴	راز داری اور کامیابی	۵۵
۲۵۲	ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کرو	۸۵	"روحانیت" کا تجربہ	۵۶
۲۵۵	لائق سمجھنا ہی لالائی کا ثبوت ہے	۸۶	بغیر نیت کے جرائم	۵۷
۲۵۷	ستاروں کے اثرات	۸۷	"ریاست" اور افغان گورنمنٹ	۵۸
۲۶۳	کیرکٹر کا بننا اور گزرتا	۸۸	پبلک آڈا ر واقعات کی بنیادوں پر	۵۹
۲۶۶	انگریزوں کے کیرکٹر کی بندی	۸۹	ایڈیٹر "ریاست" کی "نیک چلنی اور بد چلنی"	۶۰
۲۶۸	نفس کو دھوکہ	۹۰	اختیار نویس مصیبت زدہ لوگوں کے لئے	۶۱
۲۷۲	قابل معافی گناہ	۹۱	غلط تشخیص اور غلط علاج	۶۲
۲۷۵	ریاستی وزیر کا اقبال کو دال	۹۲	ریاست نامہ کا پراسرار کس	۶۳

نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار
۳۶۵	مقدمہ ہوشنگ آباد	۱۲۲	۲۴۹	معمورہ کا مستحق ہر شخص نہیں
۳۶۰	ہوشنگ آباد کے مقدمہ کا تماشہ	۱۲۳	۲۸۴	طوائف کی ناقابل تبدیل فطرت
۳۶۳	دالیان ریاست کا "پرشیچ"	۱۲۴	۲۸۴	خواب اور خیال
۳۶۶	ایڈیٹر ریاست "پرچھو" سٹریٹیکٹ جمل کرنیکا الزام	۱۲۵	۲۹۰	دالیان ریاست کا انتقام اور ریاستی عدالتیں
۳۸۰	خواب اور اس کی تعبیر	۱۲۶	۲۹۴	ریاستوں کے جرایم
۳۸۲	علاج کے لئے تشخیص کی ضرورت	۱۲۷	۲۹۸	ہندوستانی پول
۳۸۴	دالیان ریاست کی سازشیں	۱۲۸	۳۰۲	مرحوم ہمارا جہاں کی گرفتاری
۳۸۸	گناہوں کی سزا	۱۲۹	۳۰۵	مرثیوں کا بڑھاپے میں جوش
۳۹۰	دالیان ریاست کا روپیہ اور پبلک خدمت	۱۳۰	۳۰۷	وختداریاں
۳۹۵	سیاسی پراپانڈا	۱۳۱	۳۱۰	ریاستوں کی رعایا کا احساس کمتری
۳۹۷	وکیلوں کی طفل تسلیاں	۱۳۲	۳۱۲	شہرت باعث راحت نہیں
۳۹۹	نئے اخبارات کی ناکامی	۱۳۳	۳۱۴	تجارتی ہتھکنڈے
۴۰۱	بدحواسیاں	۱۳۴	۳۱۶	جہاننا گدھی سے لے کر آرزو
۴۰۴	بڑی دیلے بسی	۱۳۵	۳۱۹	غلط فہمی سے بچنے کی ضرورت
۴۰۹	دفعہ ۱۰۹ تعزیرات ہند کا شکار	۱۳۶	۳۲۲	جھوٹ بولنے کی فطرت
۴۱۳	فسادات کا کیرکٹر پراثر	۱۳۷	۳۲۳	جیل کی "بدحاشیاں"
۴۱۷	اندھوں میں قوت احساس	۱۳۸	۳۳۰	جرائیم پر فطرت کا اثر
۴۱۹	مسٹر مارنیمین کی فیاضی	۱۳۹	۳۳۲	بدا چھا بدنام بُرا
۴۲۳	عشق و شباب کی مجبوریاں	۱۴۰	۳۳۵	خیالات میں انقلاب کا باعث
۴۲۶	عورت اور شباب جیل میں	۱۴۱	۳۳۷	محرطہ ملازمین کی بددیانتیاں
۴۲۸	ریڈری اور اخبارات	۱۴۲	۳۴۱	سی۔ آئی۔ ڈی کی کارگزاری
۴۳۰	رشوت اور سفارش	۱۴۳	۳۴۵	بھوتوں کا وجود
۴۳۳	اہل فن اور ان کی قدر ناشناسی	۱۴۴	۳۴۶	عورتوں کا نازک احساس
۴۳۴	ٹیلیفون پر شرارتیں یا مذاق	۱۴۵	۳۴۸	ہمارا تجارتی چلن
۴۳۸	شہرت کا غلط شوق ذلت کا باعث	۱۴۶	۳۴۹	بچپن کا زمانہ اور والدین کا فرض
۴۴۰	سوامی شرما خاندان اور خواجہ حسن نظامی	۱۴۷	۳۵۲	فرہ جسم ایک لعنت ہے
۴۴۳	پراسرار مسٹر سوامی	۱۴۸	۳۵۵	طوائفوں کی قابل رحم زندگی
۴۴۴	ذہن میں انقلاب	۱۴۹	۳۵۹	پولیس کے گڑھوں کی کارگزاریاں
۴۴۶	مسٹر مارنیمین سمیت آف مارشل لا کا وحشیانہ پن	۱۵۰	۳۶۲	اخبار نویسوں کا امتحان طلبہ صبر

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ	نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱۵۱	پولیس کے پہلے پرائیڈ ریاست کا دہلہ	۲۴۸	۱۴۴	جہانہ ذہنیت اور اس کے نتائج	۵۱۸
۱۵۲	کمیونسٹوں کی قوت ارادی	۲۵۱	۱۴۵	جیل کا پاگل پن	۵۲۳
۱۵۳	ہندوستان کی پولیس اور نظم	۲۵۲	۱۴۶	"ریاست" اور جنٹس سرنگس مینگ	۵۲۴
۱۵۴	ریاستوں کے "خوش خور"	۲۵۶	۱۴۷	نوبل پرائز کے امیدوار مولانا ناصر علیاوی	۵۳۱
۱۵۵	کھانے کی لذت	۲۵۸	۱۴۸	شراب کی زیادتی موت کا باعث	۵۳۸
۱۵۶	کتوں کی وفا شعاری	۲۶۰	۱۴۹	روپیہ کی موجودگی میں افلاس	۵۴۲
۱۵۷	پچاسی کے منتظر	۲۶۴	۱۵۰	مرحوم بابا سرکیم سنگھ کے اثرات	۵۴۶
۱۵۸	گناہوں کی سزا اس جہنم میں	۲۶۹	۱۵۱	ضامن ہونا بھی ایک جرم ہے	۵۵۰
۱۵۹	یتیم ہونا بھی ایک نعمت ہے	۲۷۲	۱۵۲	گھر کا جوگی جو گڑا	۵۵۶
۱۶۰	صحافتی مراسم	۲۷۴	۱۵۳	سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ آف ناہجہ	۵۵۹
۱۶۱	ہندوستان کا نام دین	۲۷۸	۱۵۴	روپیہ اور فیاضی	۵۶۲
۱۶۲	عدالتوں میں خمیر کا سودا	۲۸۶	۱۵۵	خاندانی وقار	۵۶۴
۱۶۳	سٹریٹ رینجمن کی تنگدستی	۲۸۹	۱۵۶	"نیتا جی" نیم چند	۵۶۷
۱۶۴	جہیز کا شکار	۲۹۱	۱۵۷	گھریلو ملازموں کا جھوٹ اور چوری	۵۷۱
۱۶۵	۱۹۴۷ء کا "بیت المال"	۲۹۳	۱۵۸	اخبارات کی اشاعت کے متعلق غلط بیانیوں	۵۷۵
۱۶۶	مرحوم شیخ ضیاء الحق کی علم دوستی	۲۹۶	۱۵۹	حسن اور موسیقی کا اثر	۵۸۲
۱۶۷	ہندوستانی وضع داریاں	۲۹۹	۱۶۰	محسن ہوں کے اقرار کا اثر	۵۸۶
۱۶۸	ریاست پٹیالہ کے سیشن ججوں کا پنج	۵۰۱	۱۶۱	نفرت و عداوت میں فرق	۵۹۱
۱۶۹	مذاق کا کفارہ	۵۰۲	۱۶۲	غسل اور صحت	۵۹۹
۱۷۰	مہاراجہ بھرتپور کا انجام	۵۰۷	۱۶۳	زنس کا کیرکیر	۶۰۳
۱۷۱	یہن جی کہنے کا اثر	۵۱۰	۱۶۴	حضرت جوش ملیح آبادی کی مددینہ نظرت	۶۰۶
۱۷۲	عورتوں پر صدمہ کا اثر	۵۱۲	۱۶۵	کیا سکھ ہندو نہیں	۶۱۱
۱۷۳	نظام دکن کا نظم اور مہاتما گاندھی	۵۱۷	۱۶۶	ایڈیٹر ریاست کے خلاف تشددات اور ان میں بریت	۶۱۴



# دیباچہ

دوسرے لوگوں کے لئے تو بیل شایہ مصائب و مشکلات کا باعث ہو مگر جیل کی زندگی میرے لئے تو ہمیشہ ہی ایک نعمت ثابت ہوئی کیونکہ جیل سے باہر جہاں مجھے ایک منٹ کے لئے بھی کبھی فرصت ملتی تھی۔ جس اپنے ماضی۔ حال اور مستقبل کے متعلق سوچ نہ سکتا تھا اور مالی مشکلات ہمیشہ ہی ذہنی کوفت اور پریشانی کا باعث رہیں جیل میں کوئی کام نہ ہونے کے باعث مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کے لئے بہت کافی وقت ملا اور چونکہ وہاں مالی پریشانیوں کا سوال ہی نہیں ہوتا میں وہاں ہمیشہ ہی اس کو شش میں رہا کہ اپنی حالت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کروں اور وہاں کے فرصت کے زمانہ کو ”دیباچہ“ اور پبلک کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بناسکوں۔ چنانچہ نواب بھوپال واسطے مقدمہ میں جب میں تین ماہ کے لئے ناگپور جیل میں رہا تو میں نے ”دیباست“ کے مستقل کالم ”جذبات مشرق“ کے لئے ہندی کے بہترین شعرا کے کلام کا انشائریہ کر لیا جو آئندہ کئی ماہ کے لئے کافی تھا اور رہا ہوتے ہی دہلی پہنچ کر میں نے اس نئے اور مستقل کالم کو شروع کر دیا۔ اور انبالہ وغیرہ جیل میں جب ایک سال کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اپنی زندگی کے گذشتہ اکثر واقعات کے متعلق نوٹ لے لئے اور دہلی پہنچتے ہی مستقل عنوان ”نا قابل فراموش“ قائم کر کے اس کے لئے ہر سہفتہ ایک صفحہ لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اگر میں جیل نہ جاتا تو یہ کالم شاید کبھی ابھی جاری نہ ہو سکتا کیونکہ جیل سے باہر بچنے والی واقعات کو یاد کر کے ان کے متعلق نوٹ لینے کی فرصت ہی نہ ملتی۔

”دیباست“ میں جب ہر سہفتہ ”نا قابل فراموش“ کالم کے مضامین شائع ہوتے شروع ہوئے تو یہ پبلک میں بے حد مقبول ہوئے اور مجھے یاد ہے اُس زمانہ میں جب چھوٹے سائیز پر چند مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو ایک بہت بڑے ادیب (جو اُس زمانہ میں دہلی میں گورنمنٹ ہند کے ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے۔ آج کل پاکستان میں ایک منسٹر کی پوزیشن میں ہیں اور جو اپنے مطالعہ کے لئے پانچ سو روپیہ ماہوار کی کتابیں، یورپ اور امریکہ سے مستقل طور پر خرید کر لیتے ہیں) نے ایک خط لکھا جس میں آپ کا ارشاد تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں اس کتاب سے زیادہ دلچسپ دوسری کوئی کتاب کسی زبان میں بھی نہیں دیکھی اور ان کی خواہش ہے کہ اس کتاب کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو۔ اس ٹری پوزیشن کے ادیب کا یہ خط میری اور بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہوا اور ان مضامین کا مسئلہ کئی برس تک جاری رہا جو اب موجودہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے اور اس کتاب میں بہت سے ایسے نئے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو صرف اس کتاب کے لئے ہی حال میں لکھے گئے اور جو قطعی غیر قابل فراموش ہیں۔

”دیباست“ ۱۹۶۷ء میں جاری کیا گیا اور آج اس کو بیسٹس میں سے ہے۔ اور گو ”دیباست“ اردو زبان کا بہترین باقسط ہر سہفتہ وار تھا جو انگریزی زبان کے اچھے سے اچھے رسائل کا مقابلہ کر سکتا تھا اور بیسٹس

تک ہی میں نے کوشش کی کہ میری زبان غلیظیوں سے پاک ہو مگر میں ایماندار سی کے ساتھ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ بارہ برس دہلی میں رہے بھڑاڑ بھونکتے رہے " کے مصداق تینتیس برس میں بھی میں اردو زبان پر قادر نہ ہو سکا کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں اور میرے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ زبان کے لحاظ سے مجھے وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو دہلی کے رہنے والے ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص کو بھی حاصل ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ پنجاب کا رہنے والا کوئی شخص جس کو ماں کے دودھ کے ساتھ پنجاب کی صرت پنجابی زبان نصیب ہوئی وہ ایک دوسرے علاقہ میں بولی جانے والی اردو زبان پر قادر ہو سکے۔ چنانچہ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اردو زبان کا کوئی ادیب بھی (مع مولانا ظفر علی خاں - مولانا مالک اور مرحوم سر عبد القادر جو اردو زبان پر ایک انتہائی تسلیم کئے جاتے ہیں) ایسا نہیں جو پنجاب میں پیدا ہوا اور وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اردو زبان پر قادر ہے یعنی میری رائے میں کوئی شخص بھی کسی غیر زبان پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر وہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہے جس کے ثبوت میں مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔

مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد گو دہلی میں پیدا ہوئے مگر آپ فارسی زبان کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنی اس کوالیفیکیشن کے باعث ہی سالہا سال تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی زبان کے پروفیسر رہے۔ آپ کو یہ وہم تھا کہ آپ فارسی زبان کے اعتبار سے ایران کے اہل زبان کا بھی معتمد بلکہ کہہ سکتے ہیں اور اس غلط فہمی میں ہی مبتلا تھے کہ آپ ایران تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے اہل زبان ملنا پڑا اپنی فارسی دانی کا سکڑ بٹھا سکیں۔ طہران پہنچنے کے بعد آپ وہاں کے ایک عالم اور مصنف کے جہان ہوئے اور دوسرے یا تیسرے روز کا واقعہ ہے آپ مکان کے صحن میں بیٹھے تھے اور قریب ہی چڑھا جل رہا تھا۔ اتنے میں دیکھی نہ زیادہ آجھ ہونے کے باعث اہل بڑی اور دیگھی کا ڈمکننا ایک طرف ہو گیا۔ مولانا آزاد یہ کیفیت دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ دیگھی کی اس کیفیت کو کیا کہنا چاہیے کہ اتنے میں کروہ کے اندر سے ایک چھوٹی لڑکی صحن میں آئی اور اس نے دیگھی کو ملتی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی ماں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا: اماں - اماں دیگھی سر کر دے " مرحوم پروفیسر آزاد نے جب یہ سنا تو آپ کو احساس ہوا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور کوئی شخص بھی چاہے کسی غیر زبان میں کتنا بھی اچھا دانی تسلیم کیا جاتا ہو وہ کسی غیر زبان پر قادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مرحوم پروفیسر صاحب ایران میں اپنی فارسی دانی کا سکڑ بٹھاے بغیر واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔

میں نے اپنی پچھلی زندگی میں بہت کوشش کی کہ میں صحیح اور درست اردو دیکھ سکوں اور اس سلسلہ میں ملا واحد صاحب - مسز ممتاز مرزا - بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی ایک مرحوم خاتون اور بعض دوسرے دوستوں نے میری بہت امداد کی۔ یہ شخصیتیں "ریاست" میں شائع ہونے والے مضامین کی غلطیوں پر طویل عرصہ تک مجھے توجہ دلاتی رہیں اور میں ان کا انتہائی شکر گزار رہوں۔ مگر پھر بھی مجھے قطعی درست اور صحیح اردو دیکھنے میں کامیابی نصیب نہ ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور گو بطور ایک طالب علم کے میری کوشش ہوتی ہے کہ میں بغیر غلطیوں کے اردو لکھ سکوں مگر کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں چنانچہ اس کتاب کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ زبان کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے اس مقصد کو ہمیشہ نظر رکھیں جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی اور وہ مقصد یہ ہے کہ میں اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان کے کیرکٹر کو

بلندے جانے کے اعتبار سے ملک کی کچھ خدمت انجام دے سکوں اور اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا دوم کا ایک واقعہ یاد دلانا ہوں۔ مولانا پر کسی شخص نے اعتراض کیا کہ آپ کے اشعار میں غلطیاں ہوتی ہیں تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب اس شعر میں دیا تھا ۵

من نہ دائم فاعلاتن فاعلات  
شعری گویم بہ از آب حیات

(میں شاعری کے فن اور عروض سے واقف نہ سہی مگر اشعار تو ایسے کہتا ہوں جن کو آب حیات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے) یعنی یہ نہ دیکھے کہ کس نے لکھا ہے یہ پڑھیے کہ کیا لکھا اور کیا کہا ہے۔ اور سیری خواہش ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے "عزت کی قربانی" (جو مرحوم دیوان دیارام گد دل کے متعلق ہے) وغیرہ مضامین نہ صرف پڑھیں بلکہ ایسی قابل احترام شخصیتوں کے بلند کیرئیر کی پیروی کی بھی کوشش کریں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے میں کئی برس سے کوشش میں تھا مگر مالی مشکلات کے باعث کامیابی نصیب نہ ہوئی اور میں ان دوستوں کا صدق دلی کے ساتھ شکر گزار ہوں جن کی مالی امداد سے یہ کتاب آج شائع ہو رہی ہے اور چونکہ یہ دوست نہیں چاہتے کہ ان کا نام شائع ہو اس لئے مجبور ہوں کہ اس شکر یہ کے ساتھ ان کا نام نہ لکھا جائے۔

نیا زکیش

دکتر انور سید

یکم نومبر ۱۹۵۷ء  
دہلی

# اُردو زبان میں ناقابل فراموش اضافہ

(شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

سیرتِ خالص ترین دوست سردار دیوان سنگھ مفتوں، ہماری قدیم و شعوراری، ہماری قدیم شرافت، ہماری قدیم دیادلی اور اخلاقی جرأت کی ایک ایسی عظیم یادگار ہیں کہ اگر ہماری قوم اندھی نہ ہو چکی ہوتی تو ان کو ایسی احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا، جس احتیاط کے ساتھ حکومتیں اپنے آثارِ قدیمہ کو برقرار رکھتی ہیں۔

سردار صاحب کی یہ کتاب اُن کی زندگی کا ایک زبردست کا نامہ اور اُردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

انھوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوشِ قدم کو بڑی دیدہ وری کے ساتھ چُن چُن کر اس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا اُس کی زندگی نے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اٹھیں گے، جن کی مستقل روشنی میں وہ بے خوف و خطر آگے بڑھے گا، اور کسی فریب و غرار یا کسی موڑ پر وہ ٹھوکر نہیں کھاسکے گا۔

میری دلی آرزو ہے کہ اس کتاب کو بہرہ و جوہ فروغ حاصل ہو اور حکومتِ ہند اس کے بعض حصوں کو نصاب میں داخل کرے آئندہ نسلوں تک اُس رُوحِ شرافت کے چشمے کو پہنچا دے جو اب عنقریب خشک ہو جائے والا ہے۔

کاش ایسی کتاب کسی زندہ قوم میں شائع ہوتی!

# ناقابل فراموش اردو کی یادگار کتاب

(ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مرحوم)

دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست" کا جہاں کہیں ذکر چھڑ جائے نہایت ہندوستانی قسم کی بحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مگر اگر کم بحث جس میں ہر کوئی دوسرے کی سُننے بغیر اپنی کہنے جاتا ہے۔

راے نواب کوسیں گے تو دلائل بائیں دیکھ کر تعریف کریں گے تو جیسے بہا ہڑو ہو کر۔ ان کے ذریعہ ذرا ایسے حیرت ناک تفسیلاتیں گے کہ سچ جھوٹ معلوم ہونے لگے۔ اور ہر جگہ کے لوگ اُسے مہاتما قسم کا قائدِ عظیم یا غرورِ عبادت قسم کا گوبلز تہائیں گے۔ پارٹی باز سیاسی لوگ ایک سانس میں گالی اور دوسرے سانس میں قصیدہ سنائیں گے۔ غرض ہر کوئی اپنے فطرت کے مطابق اندازہ لگائے گا۔ البتہ ایک بات پر سب کو اتفاق ہے کہ دیوان سنگھ بڑا یاد آوری ہے!

دیوان سنگھ کے یاروں کا حلقہ دولت مندی کے دنوں سے لے کر اب تک بہت متنوع رہا ہے۔ سرکاری افسر۔ معزور قیدی۔ رند مزاج ادیب۔ سادھو منشی فرنگی۔ ہر طرح کے ہندو مسلمان سیکھ۔ عیسائی اور دہریے اس میں شامل ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا دیوان سنگھ مختلف ہے۔

دیوان سنگھ کوئی گہرا فلسفی یا سیاست دان نہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتا یا کرتا ہے ہر کسی کی سمجھ میں آسانی سے آ سکتا ہے۔ مگر وہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے اُسے برملا بیان کر دیتا ہے۔

"ناقابل فراموش" کے عنوان سے جو سلسلہ مضامین ۳ مارچ ۱۹۷۷ء سے "ریاست" میں شروع ہوا وہ ابھی تک جاری ہے۔ شروع ہی سے یہ سلسلہ ایسا مقبول ہوا کہ اب یہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ کتاب دیوان سنگھ کی برملا گوئی کی شاہ ہے۔

ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریروں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کئے گئے ہوں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو۔ اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے وہ قہرِ کم کا واقعہ پوری تفصیل سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے۔ یہ نہیں تو زیب داستان کے لئے یوں رنگ آمیزی کی جاتی ہے کہ واقعہ قہرِ کم واقعہ داستان بن جاتا ہے۔ "ناقابل فراموش" ان محبوب سے پاک ہے مصنف کی زندگی اہم تاریخی قسم کے واقعات میں سے گزری ہے بلکہ کئی بار اس نے سوانح سازی میں تاریخ کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اُس نے واقعات کے انتخاب میں صرفے سے کام لیا ہے اور اس کی شخصیت اس قدر بھرپور ہے اور اسے زندگی کا اتنا گہرا چکا ہے کہ اس پر گزری ہوئی بات ہر کسی کو اپنے اوپر گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو واقعات وہ بیان کرتا ہے وہ اس قدر جان واد ہیں کہ اسے انہیں بڑھانے سمجھنے کی ضرورت نہیں اور اس کی ادا شدت اس بلا کی ہے کہ وہ محفل کر غلط بیانی نہیں کرتا۔

بیشتر واقعات بغاوتوں سے متعلق ہیں مگر ان کا رادیو سے اتنا تعلق ہے یا اسے ان سے اس قدر انہماک ہے

کہ ان میں سے اس کا اپنا کردار۔ اپنی شخصیت۔ اپنا آپ بھوٹ بھوٹ کر نکل رہا ہے۔ بات خواہ ہمارا جہان بھگ کی ہو یا کسی خفیہ پولیس والے کی۔ دوست کی ہو یا دشمن کی۔ اس میں سے بات کرنے والا جھجھلا تا نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کبھی کبھی صحافتی واقعہ نویسی ادبی واقعہ گوئی سے مل جاتی ہے۔ اس ادبیت کا ظہور کچھ اس بے ساختہ پن سے ہوتا ہے کہ اس اوقات تلاش نہ کرنے والے کو واضح دکھائی دیتا ہے اور تلاش کرنے والے سے اوجھل رہتا ہے۔ اس لئے کہ مفتوں کا طرزِ تحریر مصنوعی آرائش سے پاک ہے۔ وہ بھول کی کل کہتا ہے ”گرہِ دنگ وہ نہیں کہتا۔ نہ کدال کو“ آرزو میں کہتی ”جب غصے کا اظہار کرتا ہے تو محض“ آپ کے قبلہ و کعبہ کی شان میں گستاخی کے ارادے“ کا اعلان نہیں کرتا اور خوش ہوتا ہے تو ”نافا باشد بہادر شاہ باد“ قسم کے قصیدے نہیں لکھتا۔ کھری کھری بات کھردرے لہجے میں صاف صاف کہتا ہے۔ بے غوث اور بے لہجہ کہتا ہے۔

دو اول و آخر صحافت نگار ہے اور دیانت دار ہے۔ یہ اجتماع ہمارے اہلِ کمیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ”ناقابلِ فراموش“ کو اردو کی چند یادگار کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔ اردو کیا ہندوستان میں انگریزی میں بھی اس قسم کی کتابیں کم شائع ہوئی ہیں۔

اس کتاب کی ہر سطر دل چسپ ہے کیونکہ لکھنے والا دل چسپ ہے اور بے حد دل چسپ انسان ہے۔ البتہ ہر واقعہ کے بعد جو اخلاقی سبق نکالا گیا ہے وہ مجھے بوجھل معلوم ہوا میں اسے دیوانِ سنگھ مفتوں کی شخصیت سے باہر کی بات سمجھتا ہوں یوں تو ظاہر ہے کہ جس شخص نے جبر و استبداد کا اس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا ہو اس کی اخلاقی اقدار بہت راسخ ہوں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاق کے ساتھ ”اخلاقیات“ بلکہ وعظ گوئی بھی شامل ہو۔ یہ لیڈری۔ شیخت۔ مہاتما ریت قسم کی خور ہے۔ مفتوں اس سے اب تک محفوظ رہا ہے امید ہے آئندہ بھی بچا رہے گا۔ جس طرح وہ بے اختیار اور بے پناہ قہقہے لگاتا ہے۔ اپنے پر اور دوسروں پر ہنستا ہنساتا ہے۔ یہ طور طریقے اور طرح کے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کتاب میں لیگی۔ کانگریسی۔ اکالی۔ ہندو مسلم۔ عیسائی۔ گورے۔ کالے۔ راجے۔ وزیر۔ رند اور نمازی سب ایک ہی رستی میں بندھے ہوئے ہیں۔ انسانیت کی رستی میں مفتوں کی جنبہ داری۔ دوستی۔ دشمنی سب انسانی ہے اس دور میں۔ اس فتنہ و شر کے دور میں اس قسم کے لوگ بہت غنیمت ہیں۔ آپ ان سے اس کتاب میں مل کر بہت خوش ہوں گے۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

# بہترین دوست اور خطرناک دشمن

(حضرت علامہ نیاز فتح پوری - ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ)

اب سے ستریس سال قبل ۱۹۲ء کی بات ہے۔ دہلی سے ملاوادی روزنامہ "رعیت" نکال رہے ہیں اور مجھے بھوپال سے اس کی ایڈیٹری کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ میں آجاتا ہوں اور ملاوادی کے مکان پر اخبار "رعیت" کے دفتر میں آدل ڈال سردار دیوان سنگھ سے میرا تعارف ہوتا ہے۔

میں صبح کو دو تین گھنٹے کے لئے دفتر جاتا تھا اور ادارہ وغیرہ لکھ کر اپنی جائے قیام پر لوٹ آتا تھا۔ اس سے قبل وہاں کیا ہوتا تھا، اخبار کہاں چھپتا تھا، کب شائع ہوتا تھا اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اس کی ملکیت کے متعلق ضروری بات کانوں میں پڑی تھی کہ اس اخبار کو پہلے خواجہ حسن نظامی کی تحریک سے بھیا احسان الحق نے جاری کیا تھا اور پھر جب ان کو کچھ دشواریاں پیش آئیں تو ملاوادی نے اسے لے لیا۔

عوام کی آواز حکومت تک پہنچانا اس کی پالیسی تھی اور حکومت اسے کچھ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ غالباً بھیا احسان اسی لئے اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ملاوادی سمجھتے تھے کہ حکومت اخبار کو زیادہ دن چلنے نہ دے گی اور ضمانت طلب کر کے ختم کر دیگی اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ جب صورت یہ ہے تو کیوں نہ اس کے لب ولہجہ کو زیادہ سخت کر دیا جائے۔ اور جب وہ بند ہو تو اپنا نقش عوام کے دلوں پر چھوڑ جائے مجھ کو بلانے کی وجہ یہی تھی کہ اس وقت میری سیاسی نظریں اور سیاسی مضامین "الہلال" اور "زمین و آسمان" وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا لب ولہجہ بہت پرجوش ہوتا تھا اور حکومت پر میری گستاخیاں پسند کی جاتی تھیں۔ آخر کار جب چند دن بعد یہ معلوم ہو گیا کہ حکومت اپنی جگہ "رعیت" کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو واحدی صاحب نے مجھ سے کہا کہ جب صورت یہ ہے تو کیوں نہ سنبھال لایا جائے۔

آخر کار میں نے مسئلہ صریح پر دو ادارے زیادہ سخت لکھ دیئے اور حکومت کو ایک اور بہانہ "رعیت" بند کر دینے کا ہاتھ آ گیا۔ اور بساط اٹھ دی گئی۔

یہ ذکر میں نے اس لئے کیا کہ میرے اور دیوان سنگھ کے اولین تعارف کا پس منظر سامنے آ جائے۔ سردار صاحب سے روز نرمیں ملاقات ہوتی تھی لیکن بہت سرسری۔ وہ مجھے دیکھ کر کیا سمجھتے ہوں گے مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے ان کی ستودی بھینچی۔ ننگو کا انداز۔ بلند لب ولہجہ اور رجائی میلان کو دیکھ کر ضرور ان کے سمجھنے کی کوشش کی۔ اور آخر کار ایک دن واحدی صاحب دریافت کرنے پر میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ "رعیت" چلنے یا نہ چلے لیکن دیوان سنگھ سارا سنی آپ کو مشکل سے ملے گا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے دہلی سے بھوپال لوٹ آنے کے بعد دیوان سنگھ واحدی صاحب سے وابستہ رہے یا نہیں اور میں نے اس کے بعد کیا کیا۔ کیونکہ انھوں نے جو حالات اپنے قلم بند کئے ہیں ان میں کوئی تاریخی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ لیکن ان کے اصرار سے حاضر دور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی انھوں نے "ریاست" جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس سلسلے میں جو مفت "نما" ان نے ملے کئے ان کا علم آپ کو بالخصوص اس کتاب سے ہو سکتا ہے۔ میرے بھوپال واپس جانے کے بعد دیوان سنگھ اوتیں

سردار دیوان سنگھ کی خانگی زندگی کی میں نے کبھی جستجو نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ میں نے ہمیشہ اُن کو تنہا سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دنیا کے اسباب عیش و راحت سے متنفر تھے۔ اگرچہ وہ مکان، اچھا فوڈینچر، متعدد دلازم، سواروں کے لئے موٹر، سبھی کچھ ان کے پاس تھا اور اپنے احباب کی خاطر مدارات میں بڑی دریا دلی سے کام لیتے تھے لیکن خود ان کی زندگی راہبانہ انداز کی تھی جو انھوں نے کبھی ترک نہیں کی اور اب تک اس پر قائم ہیں۔

سردار دیوان سنگھ کی طبعی خصوصیت جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئی ان کا مردانہ عزم و استقلال ہے مصیبت و پریشانی میں گھبرا جانا انسانی فطرت ہے لیکن قدرت نے یہ احساس ان میں پیدا ہی نہیں کیا اور وہ مصائب کا مقابلہ ایسی پامردی، خوشدلی اور صبر و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں کہ کچھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔

وہ بڑے بولنے والے بذلہ سبغ انسان ہیں اور فکر و غم کو کبھی پاس نہیں آنے دیتے۔ وہ فطرتاً بڑے بے باک، آزاد، معاف گو انسان ہیں۔ دل و زبان کی ایسی ہم آہنگی میں نے کم کسی میں پائی ہے۔ وہ بڑے اچھے اور سچے دوست ہیں لیکن اسی حد تک خطرناک دشمن بھی۔۔۔۔۔ وہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں اور ایک بار جس سے جو تعلقات قائم ہو گئے انہیں ہمیشہ نباہتے ہیں لیکن وہ مادرِ استین کو کبھی معاف نہیں کرتے اور جب تک اس کا سر نہ کُجھل دیں سچیا نہیں چھوڑتے۔ -

سردار دیوان سنگھ کی مساری زندگی صحافت ہی کے مشغلے میں بسر ہوئی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اخبار ریاست ان کی صحافتی زندگی کا اتنا زبردست راز ہے کہ ہم اس سے ہٹ کر ان کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتے کسی کام کا ارادہ کر لینا ان کے نزدیک ایک ایسا روحانی عہد ہے جس کی تکمیل میں وہ اپنی تمام ذہنی و حیوانی قوت، مصروف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر کام کا اسلوب پہلے سے سوچ لیتے ہیں اور پھر اس سے نہیں ہٹتے۔ ان کی محنت کا یہ حال ہے کہ وہ ٹھکانا جانتے ہی نہیں اور ایک مشین کی طرح ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کامیاب صحافتی زندگی کا سب سے بڑا راز ان کا یہی جوش عمل ہے اور اس کے ساتھ ضمیر کی پاسداری ————— کہ ”موجِ غول“ سر سے گزر رہی کیوں نہ جائے“ لیکن وہ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھیں گے۔

سر داہرہ ان سنگدھڑے تن و توش کے آدمی ہیں اور ایک زمانہ سے یورک اسٹڈ کے مریض ہیں لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس کی وجہ سے ان کے مشاغل میں کوئی فرق آیا ہو۔

بہت صبح اٹھنا اور کام میں لگ جانا یہ ان کی زندگی کے ایسے تعینات ہیں جن سے اشعار ممکن نہیں۔ وہ اپنا ایک تخلص بھی رکھتے ہیں مغز۔ لیکن میں نے کبھی ان کی زبان سے ان کا کوئی شعر نہیں سنا۔ البتہ انشا پر ہذا کی حیثیت سے ان کے بہت سے کارنامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ووصحافی ادیب ہیں اور اس فن کے پورے ماہر۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک صحافی کو کس وقت کس انداز سے لکھنا چاہیئے۔  
 لیکن کبھی کبھی غلط جوش میں ان کا قلم مناسب حدود سے آگے گزر جاتا ہے۔

انگریزی سردار دیوان سنگھ بڑا سچا دوست، بڑا خطرناک دشمن، نہایت بے باک عسائی، بے خوف اور بڑا انسان ہے اور  
 میں نے کہا ایسے انسان دیکھے ہیں جو دیوان سنگھ کی طرح صابر و ضبط اور معایب کا مقابلہ کرنے کے لئے شیعہ کا سادہ رکھتے ہوں۔  
 یہ کتاب اسی ناقابل فراموش ہستی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور اس قدر دلچسپ ہے کہ کم از کم اس کے مطالعہ  
 میں مجھے اتنا ہی نفع آئے جتنا غوث علی شاہ کے "بزرگہ غوثیہ" کے مطالعہ میں۔



# ناقابل فراموش ایڈیٹر کے ناقابل فراموش مضامین

(محبیٰ شیخ احسان الحق صاحب حقیقی۔ رئیس اعظم میٹریج)

ہفت روزہ اخبار ریاست دہلی کے نامور ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتیوں کی ہمہ رنگی زندگی بھی قدرت کی تخلیقی عجز کا ریزہ اور ستم ظریفیوں کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس بُقلموں مرقع میں سردار صاحب کی طوفانی زندگی کے مدوجز، سیرت انسانی کی بلندی و بستی اور خیر و شر کی آمیزش و آویزش کے ایسے بصیرت افروز مناظر دکھنے میں آتے ہیں جو دوسرے خود ساختہ (سیلف میڈ) مشہور و معروف لوگوں کے حیا کی مرقعوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ اُن خود ساختہ مشاہیر عہد میں سے ہیں جو محض اپنی الوالعزمی و جرأت مندی، محنت و جفا کشی اور صبر و استقامت وغیرہ جیسی فطری قابلیتوں کے ذریعہ چھوٹی اور گنہام حیثیت سے ترقی کر کے بام شہرت و عروج پر پہنچے ہیں، جن کی ساری زندگی اپنی فلاح و ترقی کے لئے نئی نئی راہیں نکالنے، مختلف جولاں گاہوں میں بہت و مردانگی کے کمالات دکھانے اور پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہوئی ہے، جنہوں نے اپنی لرزہ خیز تحریروں سے با اختیار حکمرانوں اور بڑے بڑے با اثر لیڈروں کے دل ہلا دیئے اور اپنی حیرت انگیز حکمت علیوں اور حرلیت شکن منصوبوں سے اپنے بڑے بڑے مخالفوں کے غمخ ڈھیلے کر دیئے اور ان سے ہتھیار رکھوا لئے۔ سردار صاحب نے اپنی ہمہ رنگی زندگی کے ایسے بصیرت افروز واقعات کو جو خود اُن کے نزدیک ناقابل فراموش ہیں متفرق مضموذوں میں قلمبند کر کے اُن مضموذوں کا ایک مجموعہ ناقابل فراموش کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مضامین سردار صاحب کی زندگی کا کوئی مکمل اور صحیح مرقع نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سے واقعات زندگی تو درج ہی نہیں کئے گئے ہیں اور جو واقعات درج کئے گئے ہیں اُن میں بھی بعض اہم واقعات کی پوری تفصیلات مصلحتاً نہیں بیان کی گئیں۔ لیکن ناقص و نامکمل مرقع زندگی ہونے کے باوجود اس مجموعہ مضامین کے مندرجہ واقعات سے سردار صاحب کی زندگی اور اُن کے کردار کے ہر ایک پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے اور واقعات کے مطالعہ کے بعد ہر غیر جانبدار شخص کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ سردار دیوان سنگھ میں کچھ ایسی عجیب و غریب قابلیتیں اور متضاد قابلیتیں اور صلاحیتیں ضرور ہیں جو عام انسانوں میں نہیں ہوا کرتیں اور اس لحاظ سے سردار صاحب بلاشبہ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور اگر اس غیر معمولی انسان کے سینکڑوں قابل قدر کارناموں میں سے کچھ کارنامے ایسے ہیں جن کو مقدس اور متدین طبقوں میں اخلاقی میاں دوں سے گرا ہوا اور ناپسندیدہ کہا جاسکتا ہے تو سردار صاحب کے ان ناپسندیدہ کارناموں کو بھی کم از کم اولوالعزمانہ اور جرأت مندانہ کارنامے ہونے کی عزت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ سردار صاحب کی رسمی تعلیم صرف درجہ بیچم تک ہوئی ہے لیکن جو قدرتی تعلیم و تربیت سردار صاحب نے خود اپنی پُر آشوب زندگی کی آغوش اور مکتب حوادث میں پائی ہے وہ مروجہ اعلیٰ تعلیمات کے مقابلے میں کہیں یاہ گراں بہا اور قابل قدر ہے۔ سردار صاحب آج کل کے اُن ڈگری یافتہ علم برداروں میں سے نہیں جو "چسار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق ہیں اور جن کی فطری صلاحیتیں ان کے اکتسابی علوم و فنون کے بوجھ میں دگے

ناکارہ ہو گئی ہیں۔ سردار صاحب اس قدر قی تعلیم سے فیض یاب ہوئے ہیں جس نے ان کی تمام فطری صلاحیتیں کو بیدار اور چمکی کر دیا ہے۔ سردار صاحب کی فطرت میں اللہ العزیز نے جبرأت مندی و عالیٰ موصلمی۔ خودداری و خود نمائی۔ ایثار و قربانی۔ فیاضی و دریا دلی۔ بہر دمی و دلونمزی۔ غریب پروری و مظلوم نوازی اور وطن پرستی و حریت پسندی جیسی اعلیٰ اور قابل قدر صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان صلاحیتوں کو سردار صاحب کی قدرتی تعلیم نے اس قدر بیدار کر دیا ہے کہ وہ سردار صاحب کے تمام جوارح فکر و عمل پر چھا گئی ہیں اور سردار صاحب کے اندر انھوں نے خود اعتمادی کا ایسا احساس پیدا کر دیا ہے کہ سردار صاحب مروجہ ضوابط اخلاق کی پابندی و تقلید سے بھی کسی قدر آزاد و بے نیاز ہو گئے ہیں اور اعمال کے تابع نیت ہونے کے اصول پر وہ ایسی سختی سے عامل ہیں کہ ہر اس عمل کو جو نیک نیتی سے کسی اچھے مقصد کے لئے کیا جائے اچھا اور نیک ہی سمجھتے ہیں خواہ وہ عمل فی نفسہ بُرا اور غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے نظام معاشرت تمدن میں خلل ہی کیوں نہ واقع ہوتا ہو اس کے علاوہ اپنی نیت اور اپنے مقصد کی اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ بھی سردار صاحب خود اپنے ضمیر سے کرتے ہیں اور اس ضمیر سے جو ان کے فطری تقاضوں کا تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب سردار صاحب اپنی رصحتی یا دوست نوازی کے تقاضوں سے کسی ضرورت مند یا عزیز دوست کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو وہ انداز کے ناجائز ذرائع کو بھی استعمال کرنے میں اخلاقاً کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اسی طرح جب سردار صاحب اپنے کسی مخالف یا دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرنے اور اس کو شکست دینے کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بعض اوقات وہ قانون کی زد سے بچتے ہوئے ایسے غیر اخلاقی اقدامات بھی کر لے لے ہیں جو جرایم کی تعریف میں بھی آسکتے ہیں۔ سردار صاحب کا انتقامی جوش اس قدر بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمن کو اس کے دُنیائے شخصیت اور ”مرعوم“ ہو جانے کے بعد بھی معاف نہیں کرتے اور مرنے کے بعد بھی اس سے انتقام لے جاتے ہیں۔ ”درغفلت است کہ در انتقام نیست“ کے عارفانہ اصول کو وہ نہیں مانتے اور دشمن کے معاف کر دینے کو کیر کیڑ کی کمزوری سمجھتے ہیں۔ سردار صاحب کے ایسے ہی متضاد رجحانات و اقدامات کی وجہ سے سردار صاحب کے دوست بھی سردار صاحب کو اگر ایک بہت اچھا اور قابل قدر دوست سمجھتے ہیں تو ساتھ ہی ایک بہت بُرا اور نہایت خطرناک دشمن بھی کہتے ہیں اور جو لوگ سردار صاحب سے کوئی قریبی تعلق نہیں رکھتے اور نفسیات کے ماہر بھی نہیں ہیں ان کے لئے بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ سردار صاحب کو کلوئی اوصاف کی حامل شخصیتوں کی صف میں جگہ دی جائے یا ان کے برعکس خصائل رکھنے والی شخصیتوں کی صف میں۔

سردار دیوان سنگھ ایک کہنہ مشوق اور کامیاب اخبار نویس ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادیب و انشا پر داڑ بھی ہیں۔ وہ سیدھے سادے لفظوں اور بے تکلفانہ حقروں میں اپنے جمالی تاثرات اور جلالی جذبات کی ایسی صحیح تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کا دل اس سے وہی اثرات قبول کر لیا ہے جو سردار صاحب اُس پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ سردار صاحب نے ایڈیٹریل نوٹس اس قدر پُر زور، پُر جوش اور پُر اثر ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی دوسرا ہم عصر یہاں تک کہ ان کا کوئی ہم قوم وہم وطن یعنی پنجابی اور سکھ بھی اس خصوصیت میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وقائع نگاری میں بھی سردار صاحب کو بُری دسترس حاصل ہے۔ وہ واقعہ کے تمام بصیرت افروز اور دلچسپ پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر واقعہ کو اس حسادگی اور روانی کے ساتھ اپنے خصوصی پُر زور انداز میں اس طرح قلب بند کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بخوش ہوتا ہے کہ واقعہ خود اُس پر گزر رہا ہے یا اُس کے سامنے ہو رہا ہے۔ مجموعہ مضامین ناقابل فراموش ”عبرت و بصیرت“ کے نامت مرقعوں کا ایک دلکش البم ہے جس کے ہر مضمون میں ایسے قیمتی تجربات اور انمول نصائح موجود ہیں جن

مرد و عورت۔ جوان اور بوڑھے سب ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ خصوصاً جن لوگوں میں جرأت مندانہ اقدامات کی کچھ اہلیت موجود ہے ان کے لئے ناقابل فراموش مضامین کا یہ مجموعہ ایک ایسے قابل اعتماد اور کامل رہنما کا کام دے سکتا ہے جس سے وہ اپنے احوال و اعمال پر مندرجہ بالا اصولوں اور ارادوں کی تکمیل اور زندگی کی تشکیل میں ہر قسم کی قیمتی امداد و اعانت حاصل کر سکتے ہیں۔ مجموعہ مضامین "ناقابل فراموش" کی دلچسپی و دلکشی کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ہر ایک مضمون ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور ایک ہی واقعہ سے متعلق ہے لیکن پڑھنے والا ایک مضمون کے ختم ہوتے ہی دوسرے مضمون پڑھنا چاہتا ہے اور دوسرے کے بعد تیسرے مضمون۔ اس طرح جب تک کہ تمام مضامین ختم نہیں ہو جاتے کتاب ہاتھ سے رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

سردار دیوان سنگھ کے ناقابل فراموش مضامین کے اس دلچسپ و پُر نصاب مجموعہ کو بیسویں صدی کے ایک غیر مسلم کی لکھی ہوئی گلستاں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سردار دیوان سنگھ نے ناقابل فراموش مضامین میں زیادہ تر اپنے اُن کارناموں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کے مخالفین اور دشمنوں سے ہے۔ لیکن اپنی دوست نوازیوں اور وضع ذالیوں کا سردار صاحب نے بہت کم ذکر کیا ہے حالانکہ سردار صاحب کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات بھی ناقابل فراموش ہیں جو ان کی دوست نوازیوں سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ اقامتِ محروفت کو بھی سردار صاحب کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے اور اب تک حاصل ہے اس لئے میں اس مختصر دیباچہ میں چند ایسے واقعات کا ذکر کرے بغیر نہیں رہ سکتا جن کا تعلق سردار صاحب کی دوست نوازی اور رواداری سے ہے اور جن کو سردار صاحب کے ناقابل فراموش مضامین کا ایک جز سمجھا جاسکتا ہے۔

**پہلا واقعہ :-** ایک زمانہ میں غفران آباد حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ سردار دیوان سنگھ کے بھی نہایت گہرے دوستانہ بلکہ نیاز مندانہ اور عقیدہ مندانہ تعلقات تھے جو بدقسمتی سے بد میں باہمی اختلافات اور پھر باہمی منافرت عداوت میں تبدیل ہو گئے اور ایک عرصہ تک دونوں حضرات کے درمیان نہایت افسوسناک تجربہ جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب ملا واحدی صاحب اور راقم المحروف کو بھی حضرت خواجہ صاحب سے دیرینہ اُلفت و عقیدت تھی اور حضرت خواجہ صاحب بھی ہم دونوں پر اپنے عزیزوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اور ہم کو اپنا خلص و سہی خواہ سمجھتے تھے سردار صاحب کو بھی اس کا بخوبی علم تھا کہ ملا واحدی صاحب اور راقم المحروف کے حضرت خواجہ صاحب کے ساتھ کتنے اخلاص مندانہ تعلقات ہیں مگر حضرت خواجہ صاحب کو اپنا شدید مخالفت بلکہ دشمن سمجھنے اور باہمی جنگ و جدل جاری ہونے کے باوجود سردار صاحب نے ملا واحدی صاحب اور راقم المحروف سے دوستی کے تعلقات منقطع نہیں کئے بلکہ اس کے برخلاف سردار صاحب ہم دونوں پر اور زیادہ مہربانیاں کرنے لگے۔ اس وجہ سے ہمیں کہ ان کو اپنے دشمن حضرت خواجہ صاحب کے خلاف ہم سے کچھ مدد ملنے کی امید تھی بلکہ غالباً صرف اس وجہ سے کہ وہ ہم دونوں کے اخلاص مندانہ کیر کیڑے واقف تھے اور ان کو اگر ہم سے کوئی امید مدد ملنے کی نہیں تھی تو اس کا بھی اندیشہ نہ تھا کہ ہم ان کو حضرت خواجہ صاحب کی نیاز مندی کی وجہ سے کچھ نقصان پہنچائیں گے۔

ملا واحدی صاحب اور میں نے خواجہ صاحب اور سردار صاحب کی جنگ کے دوران میں خواجہ صاحب کے دشمن سردار صاحب سے اپنے تعلقات دوستی اس لئے برقرار رکھے کہ سردار صاحب کی خلصانہ خیانتوں اور مہربانیوں کی وجہ سے ان تعلقات کے منقطع کر دینے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ہمیں اندیشہ تھا کہ سردار صاحب سے ہمارے تعلقات منقطع ہو جانے سے ممکن ہے کہ باہمی جنگ اور تباہی و تلوٹ پھوٹ اور مقدمہ بازی وغیرہ تک نہ پہنچ جائے جس کو

کولنے کی ہم ہمیشہ امکانی کوشش کرتے رہے۔ سردار دیوان سنگھ کی انتہائی رواداری اور دوست نوازی کا یہ واقعہ بھی یقیناً ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے کیونکہ سردار صاحب جیسے مضبوط کیرکٹر کے شخص سے یہ امید کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے ایک دشمن کے فحش دوستوں سے تعلقات دوستی قائم رکھ سکے گا۔

**دوسرا واقعہ :-** سردار دیوان سنگھ کی طرح میں بھی ہندوستان کی تقسیم کا مخالف تھا اور پاکستان کے ایک اسلامی حکومت ہونے کے پختل کو شیخ چلی کے منصوبے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا لیکن جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اب کسی باہمی سمجھوتہ سے تقسیم ہند کے فیصلے کا تبدیل ہونا ناممکن ہے اور اب اگر اس فیصلے میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے تو صرف بھارت اور پاکستان کی باہمی جنگ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور جنگ کی صورت میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں اور زیادہ کشیدگی بلکہ سخت عداوت اور دشمنی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے میں سردار صاحب اور اپنے دوسرے نیشنلسٹ مسلم اور غیر مسلم دوستوں کو پاکستان کی مخالفت سے روکا کرتا تھا۔ جب میری تمام فیملی کے پاکستان چلے آنے کی وجہ سے (جس کو مجبوراً جنوری ۱۹۴۷ء میں بھارت چھوڑنا پڑا تھا) اپریل ۱۹۴۷ء میں مجھ کو خردمند نقل طور پر پاکستان ہجرت کرنے کی ضرورت پڑی اور پاکستان کو میں نے بادل، شواستہ اپنا وطن بنالیا تو یہاں کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد مجھے بھارتی اخبارات کا پاکستان کی مخالفت کرنا زیادہ ناگوار گزرنے لگا اور سردار دیوان سنگھ کے ایک ایڈیٹریل نوٹ سے جو انھوں نے پاکستان اور بائیان پاکستان کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں نہایت سخت لکھا تھا مجھ کو بہت تکلیف پہنچی اور میں نے ایک خط سردار صاحب کے نام لکھ کر اس میں ان کے مذکورہ معنوں کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور سردار صاحب سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے اس خط کو پڑھ کر سردار صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن میرے اندیشے کے برخلاف سردار صاحب نے میرا وہ خط ”ریاست“ کے ایک لیڈرین نقل کر کے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس قسم کے خطوط پاکستانیوں کی طرف سے اُن کے پاس اکثر آتے رہتے ہیں مگر وہ ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے لیکن یہ خط چونکہ سردار صاحب کے ایک ایسے دوست نے لکھا تھا جس کی اخلاص مندی کا سردار صاحب کو پورا یقین ہے اس لئے وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان سنگھ تقسیم ہند کا مخالف ہے اور جب تک تقسیم ختم نہ ہوگی وہ برابر مخالفت کرتا رہے گا۔ سردار صاحب کا میرے ساتھ یہ مخلصانہ طرز عمل بھی سردار صاحب کی دوست نوازی اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے کہ ان کی قوم اور وطن پرستی نے بھی میری پاکستانی حمایت کو گوارا کر لیا اور ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔

**تیسرا واقعہ :-** ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ہندو مسلم غریب ذات کا زور تھا۔ میرا مرحوم لڑکا عرفان الحق شبلی (جو میری مرضی اور اجازت کے خلاف فرقہ وارانہ سیاسی سرگرمیوں میں پرجوش اور نمایاں حصہ لے رہا تھا) اور میرے دادا دستگیر الاسلام کے والد ضیاء الاسلام صاحب ہندو پروفائیرنگ کے الزام میں گرفتار ہو کر دہلی جیل کی حالت میں بند کر دیئے گئے تھے۔ اُن کی رہائی اور جیل میں اُن کو خرد و نوش کی آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے مجھ کو سردار صاحب سے امداد لینے کی ضرورت تھی۔ سردار صاحب اُس زمانے میں محلہ چرنے والاں میں رہا کرتے تھے جس میں مسلمانوں کے مقرر چند مکانات تھے اور وہ مسلمان بھی ضادات کے ڈر سے اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے۔ یہ بھاگ گئے تھے۔ محلہ چلوڑ جانے والے کچھ مسلمانوں نے اپنے مکانات اور مالی و اسباب اہل ایک مسجد کی حفاظت سردار صاحب سے سپرد کر دی تھی۔ مسجد اور

مکانات کی حفاظتی کوششوں کی وجہ سے محلہ کے تقریباً تمام ہندو سردار صاحب کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد سردار صاحب کو خود بھی یہ ہندو محلہ چھوڑ کر ایک دوسرے محلے میں اپنی رہائش اور کاروبار کو منتقل کرنا پڑا۔ میرا قیام اس زمانے میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد عمر صاحب مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر محمد اصغر عرف اتھی میاں کے مکان واقع مٹیا محل میں تھا کیونکہ میرے سکونت مکان واقع محلہ کاشغری پر ہندو مشرانہ تھیلوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور میرا کافی گھر بادساوان اور کشتب خانہ نوٹ لیا گیا تھا۔ سردار صاحب اپنی دوراندیشی و احتیاط پسندی کی وجہ سے مجھے ملنے کے لئے مسلمان محلے مٹیا محل میں آنا پسند نہیں کرتے تھے اور مجھ جیسے کم زور دل شخص کے لئے چرخے والاں جانا ناممکن تھا اس لئے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ ہم دونوں کسی ایسی جگہ جمع ہو جایا کریں جہاں نہ ہندوؤں کا غلبہ ہو نہ مسلمانوں کا۔

چنانچہ دریا گنج میں کوہ چیلان کے ننگہ پڑ ایک ٹانہائی کی دوکان کو اس غرض کے لئے منتخب کیا گیا۔ سردار صاحب اور اُن کے مسلمان دوست اس دوکان پر جمع ہوتے اور اپنی ضرورتوں کے متعلق مشورے کیا کرتے تھے۔ میں اپنے سہمی ضیاء الاسلام صاحب کو جیل میں بی گلاس کی مراعات دلانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے سردار صاحب مجھ کو اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر ایک تانگہ پر ستر بندھاواڈی کشتی دہلی سے لینے کے لئے ٹاؤن ہال روانہ ہوئے۔ تانگہ ٹھنڈی سڑک اور چاندنی چوک پر تا ہوا ٹاؤن ہال پہنچا۔ سردار صاحب ستر بندھاواڈے لے اور ضیاء الاسلام صاحب کو بی گلاس دیئے جانے کا حکم لکھوایا۔ یہ حکم لے کر ہم سب گھر واپس آنے کے لئے اسی تانگہ پر روانہ ہوئے۔ تانگے والا بھی غالباً ہندو تھا اس تانگہ پر دو ہندو دو مسکھ اور صرف ایک مسلمان تھا۔ چلپے کے لئے قریب کاراستہ نئی سڑک کا تھا جو اس وقت تمام تر ہندوؤں کے قبضہ میں تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھ کو ساتھ لے کر نئی سڑک پر سے گزرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی راستے سے واپس جایا جائے۔ مگر میرے ساتھی نہ مانے اور تانگہ نئی سڑک کو عبور کر کے جب شاہ بولا کے بڑے قریب پہنچا تو چاؤڑی بازار کی طرف سے دو مسلمان تانگے والے اپنے تانگے سرپٹ دوڑاتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے اور انھیں نے مجھ کو تانگے پر کچھ کر چلا کر کہا۔ اُدھر تے جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔ مگر سردار صاحب اور اُن کے ساتھی لڑتے پر ضامن نہ ہوئے۔ جب تانگہ شاہ بولا کے قریب پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی میل گاڑی کے قریب چند مسلمانوں کی لاشیں جامع مسجد جانے والی سڑک پر پڑی ہیں اور سڑک کو دانتھروں اور پولیس والوں نے آمد و رفت کے لئے بند کر رکھا ہے (بعد میں پتہ چلا کہ یہ لاشیں اُن بد نصیب مسلمانوں کی تھیں جو ایک میل گاڑی پر پڑانے قلعے پناہ لینے جا رہے تھے کہ یہاں پہنچ کر کسی ہندو نے کوٹھے کے اوپر سے بم پھینک دیا اور بے چارے سب کے سب شہید ہو گئے)

جامع مسجد کاراستہ مسدود پا کر ہم سب نہایت پریشان ہوئے کہ اب مٹیا محل کیونکر پہنچا جائے لیکن اس مسئلے کا کوئی محلہ نہ نکل سکا اور میرے سب ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ بھئیاب تو سردار صاحب ہی کے مکان پر چلنا پڑیگا میں کیا کر سکتا تھا۔ سہمے ہوئے دل سے اس فیصلے کو قبول کر لیا اور ہمارا تانگہ محلہ چرخے والاں جانے کے لئے بجلی ماروں کی گلی کی طرف مڑا۔ راستے میں کچھ ہندو لے جو سردار صاحب سے زیادہ واقف نہ تھے۔ وہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک اور مسلمان شکار یوں کے جال میں پھنسا۔ پھر کچھ ہندو سردار صاحب کے ہم محلے جو سردار صاحب کو بہت پیسے الفاظ سے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ یہ دیکھو، یہ غیبت سردار ایک مسلمان کو جان بچانے کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ میں یہ آوازیں سن رہا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا کہ ہمارا تانگہ چرخے والاں کی گلی کے قریب پہنچ گیا

جہاں سے سردار صاحب کا گھر صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ تانگے کے کھڑے ہوتے ہی اس کا ہندوں نے محاصرہ کر لیا اور انھوں نے مجھ کو تانگے پر سے نیچے گھسیٹنے کا ارادہ کیا۔ سردار صاحب نے اول تو متین لہجے میں محاصرہ کرنے والے ہندوں کو کھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بڑے ارادہ سے باز آجائیں اور مجھ کو جہاں ایک سچا نیشنلسٹ مسلمان ہے کوئی تکلیف نہ دیں۔ لیکن جب سردار صاحب کی اس فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا تو سردار صاحب کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور انھوں نے اپنے پنجابی جوشیلے لہجے میں محاصرہ کرنے والے ہندوں کو نکالیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ اگر کسی نے بھی میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ اس کا سر توڑ دیں گے۔ سردار صاحب کے اس غصہ اور جوش کو دیکھ کر بھڑچھٹی شروع ہوئی اور محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کی حفاظت میں سردار صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں سردار صاحب کا ایک سابق سکھ ملازم جو مجھ کو بھی جانتا تھا اور فوج میں ملازم تھا کچے میں کارٹوسوں کی پیٹی ڈالے اور رائفل لے کھڑا تھا۔ سردار صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ محض سردار صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سردار صاحب نے کہا بہت اچھا۔ اب تم بھیہا کو اپنی حفاظت میں محلہ مٹیا محل پہنچا آؤ۔ میں نے کہا کہ میں کسی مسلح شخص کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرے تانگے کے سب ساتھیوں کو چلنا پڑے گا۔ میرے اس کہنے پر سردار صاحب اور دوسرے ساتھی اس مسلح شخص کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور چوڑی والان کے محلے میں سے ہوتے ہوئے محلہ مٹیا محل کی طرف چلے۔ ہم مطیع پنجابی کے قریب پہنچے تھے کہ سائے مسلمانوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ یہ مسلمان محلہ جفت فروشان کے تھے جو مطیع پنجابی سے متصل تھا۔ میرے ساتھیوں نے مسلمانوں کے اس مجمع کو دیکھ کر کہا کہ بھتیجا اب آپ چلے جائیں۔ ہمارے آپ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بھی ان کو واپس جانے کی اجازت دے دی اور میں تنہا مسلمانوں کے محلے میں پہنچ گیا۔ وہاں کے سب مسلمان میرے جاننے والے تھے۔ انھوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر یہ حفاظت مٹیا محل پہنچا دیا۔ اگر تانگے کے محاصرہ کے وقت سردار دیوان سنگھ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میری حفاظت نہ کرتے تو غالباً مجھے زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ اپنے دوستوں کے لئے جان کو خطرہ میں ڈال دینے کا یہ واقعہ بھی سردار صاحب کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس کا میں نے اپنے احسان مندی کے تقاضے سے یہاں ذکر کر دینا ضروری سمجھا۔

سردار دیوان سنگھ کو میں نے عنوان مضمون ہذا میں ناقابل فراموش لکھا ہے، حالانکہ سردار صاحب خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں اور عنقریب مرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ اپنے خارجی دشمنوں کی طرح اپنے اندرونی دشمنوں یعنی بڑھاپے کا بھی شباب آور دواؤں کے حربوں سے برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر خدا خواستہ سردار صاحب دنیا میں نہ ہوتے اور مجھے ان کے مجموعہ مضامین ناقابل فراموش پر کچھ لکھنے کیلئے کہا جاتا تو میں ہرگز اس آزادی اور صاف گوئی سے نہ لکھ سکتا جتنی آزادی اور صاف گوئی سے اس وقت سردار صاحب کی زندگی میں لکھ رہا ہوں۔ میری اس جسارت اور صاف گوئی کے کریڈٹ کے مستحق بھی سردار صاحب ہی ہیں کیونکہ ان ہی جیسے روادار اور دوست نواز شخص ہی کے کسی مخلص دوست کو اس جسارت کی ہمت ہو سکتی ہے۔

زندہ باد ناقابل فراموش سردار دیوان سنگھ

# سبق آموز اور عبرت انگیز

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بائی انجمن ترقی اردو)

دنیا میں ہندو نصیحت کی ہزار کتابیں ہیں۔ ایک سے ایک اچھی۔ اور ہر زبان میں ہیں۔ الہامی اور آسمانی صحیفے بھی ہیں۔ اخلاق و کردار پر تقریریں اور وعظ بھی ہوتے ہیں۔ ماں باپ اپنی اولاد کو وقت بے وقت نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو سمجھاتے اور ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں کچھ زیادہ کارگر اور موثر ثابت نہیں ہوتیں۔ ایک میں حکم و فرمان ہے اور دوسری پھینکی اور بے مزہ جس میں کوئی دل کشی نہیں۔ تعلیم کے لیے اسکولوں کالجوں اور پونی ورسیٹیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ذہنی قابلیت اور امتحانات پاس کرنے کے لیے اچھی درسگاہیں ہیں۔ لیکن اخلاق اور کردار کی بلندی جغرافیہ اور ریاضی کی طرح پڑھنے اور رٹنے سے میسر ہوتی ہے نہ پروفیسروں کے کچھروں سے۔ یہ نایاب شے صالح صحبت اور شاہدہ ماحول ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ یہی ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے۔ لیکن ہر کہیں اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے نونے نصیب نہیں ہو سکتے، خصوصاً اس زمانے میں جبکہ دولت اور اقتدار کی ہوس مقصدِ حیات بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا صرف ایک ہی بدل ہے۔ وہ یہ کہ اُن الوالعزم اور برگزیدہ ہستیوں کی آپ بیتی یا حالات زندگی مطالعہ کے لیے پیش کیے جائیں جنہوں نے اپنی خودی کو مٹا کر جان اور مال اور اپنا سب کچھ اپنی قوم یا وطن یا خلقِ خدا کی خدمت کے لیے نثار کر دیا۔ جن کی بے نفسی، فروتنی، بے لوث خدمت اور عزم و اسخ نے انفرادی قوموں کی قسمتیں بدل دیں یا جن کی حق پرستی، باطل شکنی اور راست گوئی کے کارناموں نے مردہ دلوں میں نئی روح بھونک دی۔ ان حالات کو پڑھ کر دلوں میں اُترنگ و نولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی بننے اور ویسے ہی کام کرنے کا شوق دلوں کو گدگداتا ہے۔

یہ کتاب "نا قابلِ فراموش" بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کے تجربوں اور مشاہدوں اور تاثرات کا بیان ہے جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں۔ اس پر چوری و جعل سازی، سازش، کوکین بیچنے، فوٹ بنانے کے عجیب الزامات لگائے گئے، اُچھوٹے مقدمات چلائے گئے اور اس کی پاداش میں اُسے بارہا جیل خانے کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اُس نے ایسے والیان ریاست کا مقابلہ کیا جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی اور جنہوں نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔

دیوان سنگھ کا گھر مظلوموں اور ظلم رسیدوں کی پناہ گاہ تھا۔ وہ اپنی فریادیں لے کر اُن کے ہاں پہنچتے یا لکھ کر بھیجتے ان میں امیر غریب رئیس سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ جب تحقیق ہو جاتا کہ شکایت صحیح ہے تو وہ اُن کی حمایت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ ان میں اکثر ظالم جاہل بے درد والیان ریاست کے ستائے ہوئے ہوتے تھے جن کے مقابل آتے ہوئے بڑے بڑے بہادر سردار ماؤں کے پتے پانی ہوتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک جگہ مسٹر ہارنی من کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اخبار نویس دنیا میں اُن لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے پیدا ہوا ہے جو مصائب میں ہوں۔ اُن لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں۔ دیوان سنگھ مفتوں نے ہارنی من کے اس قول پر ہمیشہ عمل کیا اور جان جو کھیں میں دال کو مظلوموں

کی حمایت کی۔ اگرچہ اس کی بدولت انھیں بہت سے بُرے دن دیکھنے پڑے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور آٹھ جیلوں کی سیر کی۔ لیکن اُن پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں اور جتنے مقدمات قائم ہوئے اُسی قدر اُن کی عزت اور وقعت بڑھتی گئی۔ وہ چاہتے تو بغیر زیادہ دوا و دوش کے گھر بیٹھے بے شمار دولت حاصل کر لیتے۔ لیکن بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ بھی انھیں اپنے اصول میں ڈالنا ڈول نہ کر سکا۔

یہ آپ جتنی بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس میں جہاں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، مظالم اور سازشوں، رشوت کی گرم بازاری، پولیس اور حکومت کی چیرہ دستیوں، جیلوں کی زندگی، اخلاق کی انتہائی بُسی و خود غرضی، ہوا و ہوس، خداری اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، وہاں غریبوں کی مہماں نوازی، مخلص دوستوں کی وفاداری اور دُشمنوں کی حسد و حسداری، احسان شناسی اور بے لوث خدمت کا بھی کوئی نہ کوئی واقعہ نظر آئے گا۔ غرض یہ کتاب انسانی فطرت کے مطالعہ کے لیے ایک عجیب مرقع ہے۔

سردار دیوان سنگھ کی زندگی سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے۔ اُن کی تعلیمی حالت کچھ بھی نہ تھی صرف پانچویں جماعت پڑھنے پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرنی پڑی اور محض اپنے سرگرم شوق اور شب و روز کے مطالعہ سے اسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت (جرنلزم) کی صفت اول میں آگئے اور اُن کا اخبار آزادی رائے، بے لاگ تنقید اور روزِ بیان کے اعتبار سے بہترین اخبار سمجھا جانے لگا۔ کامیابی کا راز محنت، کام کی لگن اور استقلال میں ہے۔ جو اقوام اور افراد کام سے بھاگتے اور محنت سے جی چراتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام اور غلام رہیں گے۔ کامیابی اور آزادی اُن کی قسمت میں نہیں۔



# ناقابل فراموش میں جرمِ ات و صا گوئی

(حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "شبح" دہلی)

سردار دیوان سنگھ مفتوں مدبر ریاست کی تحریریں، میں گزشتہ بیس بائیس سال سے پڑھتا ہوں۔ سات آٹھ سال سے میزبان سے میل جول بھی ہے۔ یہ چیز کچھ انسانی عظمت سی بن گئی ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور خامیوں کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔ مفتوں صاحب کو قدرت نے یہ خوبی عطا کی ہے کہ وہ اپنی خامیاں اور غریباں دونوں بیان کرنے کے عادی ہیں۔ شاید قدرت کا یہی وہ بڑا عطیہ ہے جس نے انھیں ایک نڈر اور بے باک صحافی بنادیا ہے کہ اردو و جرنلزم میں صاف گوئی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی تحریروں سے جہاں ایک بڑا آدمی خالص نظر آتا ہے وہاں ایک چھوٹا آدمی مست اثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ انھیں جگ ہنسائی کی باتیں بھی آتی ہیں اور آپ بیتی بھی خوب بیان کرتے ہیں۔

"ناقابل فراموش" ان کے ایسے ہی واقعات کا ایک مرتق ہے جس میں انھوں نے بڑے واقعات کی یاد ایک نہایت دلچسپ پیرائے میں قلمبند کی ہے، جو ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔ اس انکشاف میں بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں، امیروں، نوابوں اور راجوں ہمارا جوں سے بھی تعارف ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے مفتوں صاحب کو ان کی بے باک تحریروں کے سبب اکثر خلوں میں ان کو خوفناک سمجھا جاتا تھا۔ ایک صاف گو اور بے باک انسان کے لئے یہ اعزاز اس ملک میں بہت اذراں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مفتوں صاحب کو یہ اعزاز پسند تھا یا نا پسند۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوستوں اور مخالفین کے اس دیئے گئے اعزاز پر کبھی ناخوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ "اعزاز" انھیں صاف گوئی کے صلہ میں چند بڑے آدمیوں کے حواریوں کے دربار سے ملا تھا۔ اس بادا میں کہ انھوں نے بعض پُر اسرار محلوں اور خلوں کے سرسبز ماز افشا کئے تھے۔ اس صاف گوئی اور بے باکی کے لئے انھیں اکثر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں اچھے اچھے لوگ ڈول جلتے ہیں لیکن انھوں نے جیل کی چار دیواری میں بھی نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنے خصوصی کردار کو برقرار رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تحریریں کیا جو ان کو بڑے سمجھی کے لئے کیساں مفید ہیں۔ کیونکہ ان کے مطالعہ سے انسان میں جرات، صاف گوئی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ اس ناقابل فراموش کاٹلے کو اردو کے علاوہ دیگر مروجہ زبانوں میں بھی منتقل کریں تاکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کا آدمی ان سے مستفید ہو سکے اور اپنے کردار کو ان تحریروں میں پیش کئے گئے سانچے میں ڈھال سکے۔

# بہترین دوست اور بدترین دشمن

(جناب "ملا واحدی صاحب ایڈیٹر" نظام المشائخ "کراچی)

اس کتاب "ناقابل فراموش" کو میں نے پڑھا۔ سردار دیوان سنگھ صاحب معنوں کی زندگی اُتار چڑھا دیا اور جوار بھاٹوں سے پڑ ہے۔ سردار صاحب نے بڑی طوفانی زندگی بسر کی ہے۔ وہ جہان کو دیکھتے نہیں پھرے لیکن جہان اُن کے پاس برابر آتا رہا۔ انہیں ہر قسم کے انسانوں اور ہر قسم کے حالات و واقعات سے سابقہ پڑا ہے۔ چالیس دن کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سو مہینہ سداں نے بارہ سال کی عمر تک پڑھایا لکھایا۔ بارہ سال کی عمر میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری کر لی۔

ابتدا پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری سے جوئی اور انتہا یہ کہ اخبار ریاست کے صرف اشتہاروں کی آمدنی ہزار روپے ماہوار تھی۔

سردار صاحب کی عادت ہے کہ جاڑا گزر جانے کے بعد گرمی میں کام نہ آنے والے جاڑے کے کپڑے اور گرمی گزر جانے کے بعد جاڑے میں کام نہ آنے والے گرمی کے کپڑے خیرات کر دیتے ہیں۔ دوسرے جاڑے اور دوسری گرمی کے واسطے کپڑا روکنے نہیں۔ لیکن یہ تماشا بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ سردار صاحب جیل سے لوٹے ہیں اور ایک سے دوسرا جوڑا بدلنے کو نہیں ہے۔ اُسے ہی دھوٹے ہیں اور پہن لیتے ہیں۔

بیک گردش چرخ پھرنے سے لہر بہر ہو جاتی ہے۔ سردار صاحب کی زندگی میں لہر بہر کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں ہے اور ایسا وقت بھی آتا ہے کہ سردار صاحب کہتے ہیں کہ دلی کی حکومت نے مجھے ہمارا جہ پٹیا لہ کے حوالے کر دیا تو ہیرے کی کٹی کھاؤں کا اور مرچاؤں کا۔ ہمارا جہ کے رحم و کرم پر نہیں جیوں گا۔ ہمارا جہ پٹیا لہ سردار صاحب پر پٹیا لہ لاکر مقدمہ چلانا چاہتے تھے مگر دلی کے چیف کمشنر سر جان تھا مپسن نے جو حکومت ہند کے پولیسکل سیکریٹری رہ چکے تھے اور ہمارے نوابوں کی بدعنوانیوں سے واقف تھے ہمارا جہ پٹیا لہ کی خواہش کو ٹھکرا دیا۔

لہر بہر کا دور ہو یا خود کشی کے لئے آمادہ ہو جانے کا دور۔ پانچ روپے ماہوار کی ملازمت کر رہے ہوں یا ہزار روپے ماہوار کما رہے ہوں، سردار صاحب کی عقل حالات و واقعات سے نتائج ضرور اخذ کرتی ہے۔ پانچ روپے ماہوار کی ملازمت سردار صاحب نے اپنے وطن حافظ آباد کے کسی ہندو بھڑاڑ کے ہاں کی تھی۔ بھڑاڑ کی دوکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی بھی بیٹھتا تھا۔ اس کے جوان بیٹے کہیں سبز رنگ کی مٹھی کا کوٹ سفید رنگ سے سی دیا۔ درزی نے بیٹے سے کہا۔ کوٹ سلوانے والے گنوار کا خیال نہیں کیا تھا تو مٹھی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا۔ تو نے مٹھی کا ناس کر دیا۔ درزی نے سارا کوٹ ادھیڑا اور دوبارہ خود سبز رنگ سے سیا۔

سردار صاحب لکھتے ہیں۔ اس واقعہ کا مجھے پراشنا اثر ہوا کہ میں ہر کام پوری توجہ سے کرنے لگا۔

جو شخص بارہ سال کی عمر میں اتنا اثر لے سکتا ہے اُس نے آئندہ حالات و واقعات سے کتنا اثر لیا ہوگا اور حالات

واقعات سے کیا کیا نتائج اخذ کئے ہوں گے۔ اس کتاب میں سردار صاحب نے اپنے ان ہی تاثرات اور تجربات کو جمع کر دیا ہے۔ سردار صاحب کی تحریر میں امتداد قلم نے خاص نوعیت کی قوت بخشی ہے۔ تحریر بناوٹ اور تصنیع سے پاک ہوتی ہے سردار صاحب خیالات کو تکلف اور پھرچر کے ساتھ نہیں پیش کرتے، بالکل بے ساختہ لکھتے ہیں۔ غالباً ہی اُن کی تحریر کی قوت کا راز ہے۔ اس بات نے تحریر میں وہ زور بھر دیا ہے اور تحریر کو وہ سنجیدگی دے دی ہے جس کی بنا پر باوجود زبان کے نقائص کے انھیں صاحب طرز لکھنے والا کہا جاسکتا ہے۔

اخبار ”ریاست“ کے ایڈیٹوریل سٹاف میں بہت سے ممتاز اہل قلم اور زبان داں شامل رہ چکے ہیں لیکن اہل قلم اور زبان داں حضرات اور اور مضامین لکھا کرتے تھے یا اوروں کے مضامین کی اصلاح کیا کرتے تھے، اخبار ”ریاست“ کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا۔ کبھی اتفاق سے سردار صاحب بیمار ہو گئے اور ایڈیٹوریل اہل قلم اور زبان داں حضرات کو لکھنا پڑ گیا تو اخبار ”ریاست“ چھپکا اور پھس پھسا سمجھا جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزہ آتا تھا۔ سردار صاحب کے خلاف محاورہ فقروں کا بلا دینا ایڈیٹوریل کی جان سلب کر لیتا تھا۔

تحریر کا یہی طرز اور تحریر کا یہی ٹھاٹ سردار صاحب کی کتاب ناقابل فراموش میں ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مندرجات واقعی ناقابل فراموش ہیں اور یاد رکھنے کے لائق ہیں اور ان پر رائے زنی غور کرنے کے لائق ہے۔ اخبار ”ریاست“ کے ایڈیٹوریل جیسی جرأت مندانہ رائے زنی۔

مردمی نہیں کہ آپ سردار صاحب کی ہر رائے اور سردار صاحب کے ہر تاثر سے اتفاق ہی کر لیں۔ میں بھی ہر ہر رائے اور ہر ہر تاثر سے متفق نہیں ہوں لیکن اُن کے اظہار کی قوت سے انکار ہر حال محال ہے۔ سردار صاحب کی تحریر کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ مثلاً اُس میں جتنا زور پہلے دن تھا اتنا ہی زور آج موجود ہے۔ اور سردار صاحب کی تحریر بوڑھی نہیں ہوئی۔ تحریر میں جوانی کی سی جان ہے۔

جیسے عمر تناک اور سبق آموز واقعات سے سردار صاحب کو سابقہ پڑا میسے واقعات سے کم لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ پھر سردار صاحب نے واقعات کے بیان میں انسانوں کی سی دل کشی پیدا کر دی ہے۔

کئی جگہ خواجہ حسن نظامی صاحب کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے لئے دل کش نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق میں بس اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ سردار صاحب بہت اچھے دوست ہیں اور بہت بُرے دشمن جب خواجہ صاحب کے دوست تھے تو خواجہ صاحب کا فداکار سردار صاحب کے برابر کم از کم میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سردار صاحب بہترین دوست اور بدترین دشمن نہ ہوتے تو ناقابل فراموش کتاب ہمیں پڑھنے کو نہ ملتی۔ جن حالات سے سردار صاحب گزرے ہیں معمولی انسان اُن حالات سے نہیں گزرا کرتا۔

# پنجاب کا تیسرا معجزہ

(پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کا کوردی ایملے)

دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست" کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ مجھے نہیں جانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے تیس سال یعنی اپنے بچپن سے سترہ تک میرے محلہ حقوق صرف شہر لکھنؤ کے مہنڈیل حدود کے نام محفوظ رہے۔ اس نے ہندوستان کی بڑی سے بڑی شہنشاہ تاریخی عمارتوں سے لے کر ایڈیٹر "ریاست" جیسی تاریخی شخصیت تک سے میرا تعارف دلی آنے سے قبل تک صرف غائبانہ رہا۔ غائبانہ یوں کہ میں ان کا اخبار اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل آرٹ پیرپر چھپنا شروع ہوا تھا۔ الٹ سے لے کر بڑی سے تک پابندی سے پڑھتا رہا تھا۔ اس اخبار کی ترتیب اور انداز بیان اور مضامین کی ندرت کے پیش نظر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ایڈیٹر کی نوٹوں سے قلمزدان کون سی چیز زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔ ان کے قلم کی بے باکی، ان کی معلومات کی پختگی، ان کی تحریر کا زور، ان کا غیر متعصبانہ انداز بیان اور ان کے قلم کی شوخیاں پڑھ کر میں یہ سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے یہ شخص کس وضع قطع، طول و عرض، ذہانتوں اور بذلہ سنجیوں کا مجسمہ ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ سکھ ہیں کبھی میرے دماغ میں ان کی تحریر دل کی روشنی میں یہ خیال نہ جگہ پاسکا کہ ان کے سر پر بال اور چہرے پر ڈاڑھی بھی ہوگی۔ اگر کبھی ڈاڑھی کا تصور آتا بھی تھا تو اس وقت جب ان کی تحریر میں کوئی شرعی بات غیر شرعی موقع پر، رواداری میں کسی اسلامی مذہبی مسئلے کے سلسلے میں نکل جاتی تھی اور اس سے میرا دماغ دوسرا نتیجہ یہ نکالتا تھا کہ یہ شخص یا تو مسلمان زدہ سکھ ہے نہیں تو سکھ زدہ مسلمان ضرور ہے۔ بہر حال جہاں جہاں اور جب بھی "ریاست" میں کسی اسلامی مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی یا مذہبی حوالے دیئے جاتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایڈیٹر "ریاست" نے میدان عہدافت میں قدم رکھنے سے قبل ضرور کسی خالص اردو عربی انسل مولوی کے پاؤں دلبے ہوں گے یا بیچ وقت اس کی بدھنیوں کو غسل دے کر یہ شرعی نکتے جمع کئے ہوں گے۔ بہر حال ایک عرصے بعد جب انھوں نے اپنے اخبار میں "نا قابل فراموش" کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس میں ان کی آپ بیتی ہوتی تھی تو اسے پڑھ کر مجھے ان کے مذہب کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ صرف انسانیت کو اپنا دین و مذہب مانتے ہیں اور کرم اور اعمال کے قائل ہیں۔ چنانچہ اپنے مذہبی عقائد کے سلسلے میں وہ زیر نظر مجموعہ کے صفحہ ۱۱۲ میں لکھتے ہیں: "ایڈیٹر "ریاست" نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ خدا سے منکر ہے اور نہ کبھی اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے یا کوئی اور قدرت۔ مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے۔ جوش یعنی ستاروں کی گردش کا اثر انسانوں پر۔ دوسرے پھپھلا یا آئندہ جنم یعنی مسئلہ تاسخ (گویا اعمال) اور دعا یا بددعا کا اثر"

یہ واقعہ ہے کہ جو شخص دعاؤں یا بددعاؤں کا قائل ہوگا وہ نیکی اور بدی کا بھی سختی سے قائل ہوگا۔ نیک اعمال پر بھی وہ پورا پورا بھروسہ رکھتا ہوگا۔ اس کی زندگی نصیحت اور بناوٹ، مگر فریب سے بالا ہوگی اور اس کا ظاہر

اور باطن ایک ہوگا۔ وہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کو ظاہر کرنے میں ذرا بھی شرم و حیا محسوس نہ کرتا ہوگا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جیسی بلند پایہ شخصیت کی طرح "ایڈیٹر" ریاست کی تحریروں کی بھی سب سے بڑی غوی یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ذکر بھی اسی طرح نہایت تفصیل سے کر لے کر کرتے ہیں جس طرح کہ مرحوم والیان ریاست کے دست کردہ حالات بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اس تصنیف کے صفحہ ۳۲ پر انھوں نے باوجود اتنے بلند پایہ صحافت ہونے کے اس واقعہ کا ذکر کرنے میں ذرا بھی ہجھک محسوس نہیں کی کہ "ایڈیٹر" ریاست "پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک ہزار کی دکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندسے کپڑوں کے تھان لاکر لاکھوں کو دکھائے جائیں! اور اس سلسلے میں ایک دوسری جگہ جب کرو اپنے ذوقِ صحافت کی تشنگی کو دور کرنے کے سلسلے میں لکھنؤ آکر سید جالب مرحوم دہلوی "ایڈیٹر" بہم" کے پاس گئے اور ان سے کہا "اگر آپ میرے لئے تیس روپیہ ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کرنا اور لکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا بطور چراسی ہی مجھے لکھ لیجئے۔ میں چراسی کے طور پر تمام دن کام کروں گا اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم سیکھوں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس چراسی کی بھی کوئی جگہ خالی نہیں۔ یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا۔ کیا آپ کو میرے مفت کام کرنے پر اعتراض ہے؟ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ راقم المحروف نے اگلے روز سے دفتر "بہم" میں جیمز تنخواہ کے کام کرنا شروع کر دیا..... دن بھر "بہم" کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا رہے رات کو بارہ بجے تک ایک کمیٹ کے ہاں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہے اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنے روز سے زیادہ نہیں۔"

ذکورہ بالا واقعہ سے "ایڈیٹر" ریاست کے کردار کی بلندی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ اسے مذاق پر محمول نہ فرمائیں تو میں کہوں کہ فرشتوں کی فروگزاشت سے اگر "ایڈیٹر" ریاست ہندوستان میں نہ پیدا ہوتا اور امریکہ یا دوسرے کسی یورپین ممالک میں پیدا ہوتا تو آج وہاں کا صدر ریاست ضرور ہوتا کیونکہ ایسے ہی ذہین اور جفاکش انسان وہاں کے بار بار صدر ہوئے ہیں۔

"ایڈیٹر" ریاست کی تحریر کی شرفی کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل فقروں سے کر سکتے ہیں جس میں صفحہ ۴۱ پر مرحوم قاضی سر سرتیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "قاضی صاحب جرم بہت وضع دار بزرگ تھے دہلی میں آپ کی حمایت کے لئے سالہا سال سے وہی حجام آتا جس نے کنگ جارج کنگ ایڈورڈ۔ درجنوں وائسرائوں سکائڈ ان جینوں، ممبرانِ انتظامیہ کونسل اور کنگ حبیب الشراف افغانستان وغیرہ کی حمایت بنائی تھی" یہ واقعہ ہے کہ اس مجموعہ میں جو ذاتی تجربات "ایڈیٹر" ریاست نے لکھے ہیں انھیں پڑھ کر جب ناظرین "ایڈیٹر" ریاست کا تصور کریں گے تو ایک ریش دار بزرگ قسم کی انسانی شکل پیدا ہوتی ہے یا پھر ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی نظر آئے گی۔ دراصل "نا قابلِ فراموش" میں "ایڈیٹر" ریاست نے اپنے جن ذاتی تجربات پر روشنی ڈالی ہے وہ ایک اخلاقی درس ہے جو انھوں نے عام انسانوں کو دیا ہے۔ یہ کتاب ایک اخلاقی صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ نوجوانوں کو اسے پڑھ کر اپنا مستقبل بنانے میں خاص مدد ملے گی۔

"ایڈیٹر" ریاست کی تحریر میں جو دل کشی پائی جاتی ہے اس کی مثال نہ تو کسی صحافت نگار کے یہاں ملتی ہے اور نہ کسی دوسرے ادیب کے یہاں اور غالباً اسی چیز کو دیکھ کر ایک مرتبہ بابائے صحافت سید جالب دہلوی نے ہاتھ اکھانے ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کا مایابی پر آپ کو فخر ہے۔

ایڈیٹر "ریاست" کی تحریر کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت ان کا بے کا نہ انداز بیان ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے جب ہندوستانی صحافت کے گلے پر انگریزی قانون کی شمشیر برہنہ ہر وقت لٹکی رہتی تھی وہ اُس وقت بھی بدیسی حکومت اور اس کے پروردہ والیان ریاست پر اتنی ہی شدت سے تنقید کرتے تھے جس شدت سے آج ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد موجودہ ذمہ داران حکومت پر تنقید کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طرح آج حکام اور ملک کے اربابِ حل و عقد ان کے قلم سے لرزہ بر اندام رہتے ہیں وہی حالت بدیسی حکومت کے دور میں والیان ریاست اور ان کے آقائے نامدار کی تھی۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرزمین پنجاب سے تین معجزے وجود میں آئے۔ اول سر اقبال دوسرے مولانا ظفر علی خاں، تیسرے سابق بھاری بھر کم اور وجودِ نحیف الجتہ دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست"۔

# غیر فانی کتاب

(حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب لمیح آبادی)

بھلی کی کرٹک، کوندے کی لپک، بادلوں کی گرج، گنگھور گٹھاؤں کی برم جھم، ہنسیاں، چہلیں، دنگیاں! پھر دفعتاً پولیس اور پولیس کی رنگارنگ ”نیکیاں“ شیطانی حکومت کا قہر و ستم، قید و بند، جس دوام پھانسی بھی! پھر راجے ہمارے، اور مارجوں ہمارا جوں کی ”ریشک ملائک“ بوقلموں سیرتیں!

پھر عزم دہمت کے مرقعے، پہاڑوں سے ٹکڑے لینے والا عزم، سمندروں سے بھر جانے والی ہمت! جلوے، حیرت انگیز جلوے! باطل کی یلغار، ظلم کا طوفان! حق کی بے بسی، کس مہر سی! راؤں، ارجن کی شان سے نعمندانہ سینہ تلانے ناچ رہا ہے۔ سچائی کا بے گوردکن لاشہ پڑا تڑپ رہا ہے۔ نہ آسمان کے آنسو ٹپکتے ہیں، نہ زمین ہی کی چھاتی پھٹ جاتی ہے!

گر؟

”تو مگر“ کے بعد سچ سچ ایک طلسم ہو ستر باسے آنکھیں چار ہوتی ہیں:-

غرد کا سر کھل ڈالنے والا ایک سر ابھرتا نظر آتا ہے۔ جوش حق سے یسراونچا ہوتے ہوتے دوش تریا تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک گردن نمودار ہوتی ہے جس نے ظلم و استبداد کے سامنے جھکنا جانا ہی نہیں۔

ایک گدے بے یونیشیں، شیروں کی طرح دھاڑتا، چگھڑتا، تبار و قہار قوتوں پر مردانہ فار بڑھتا چلا آ رہا ہے!

باطل اپنی طاغوتی طاقتوں، قارونی خزانوں کے بل بوتے پر جاں لیوا آہنی ضربیں لگا رہا ہے، لیکن یہ دیکھو،

گدے بے نوائے باطل کو بچھا ڈالا، اور باطل اپنے نروددی، چنگیزی، گنگا جمنی دریائے غرور میں پڑا ڈبکیاں کھا رہا ہے!

یہ ہے کتاب ”ناقابل فراموش“

پھر مفتوں صاحب کے قلم کی گل کاریاں ہیں، ہنسا بھی رہی ہیں، رُلا بھی رہی ہیں۔ نشتر ہیں کہ دلوں میں چبھے چلے

جا رہے ہیں، چہلیں ہیں کہ گدگد گدگد کے بے دم کے ڈال رہی ہیں۔

پھر سیت ہیں، مکادم اخلاق کے سیت۔ روکھی پھسکی زبان میں ہنسی۔ شہد برساتی ہر لہری زبان میں۔ اخلاقیات کے

بتن چل رہے ہیں، اس طرح چل رہے ہیں کہ دہم ہی نہیں ہوتا ہم سبق پڑھ رہے ہیں، مگر سبق ہیں کہ دلوں میں رچتے بے

پلے جا رہے ہیں!

پھر تجربے ہیں۔ لہو رُلانے والے تجربے، دلوں کو برا ڈالنے والے تجربے۔

کہیں انسانیت برہنہ پڑی سسک رہی ہے، اور ہم ابکائیاں لے رہے ہیں، شرم سے گدے پلے پائے۔

ہیں کہ ہم بھی "انسان" ہیں !  
اور کہیں انسانیت اپنی تمام رعنائیوں، جلالوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہے، اور ہم غر سے سر اٹھانے کے لیے جا رہے ہیں کہ ہم بھی "انسان" ہیں !

بجدا مجھے تو رشک آتا ہے۔ کتاب پڑھتا جاتا تھا اور "پٹھانی شیطان" بھی انگڑائیاں لیتا جاتا تھا۔ لگاتار کانٹا بھجی کئے جاتا تھا۔ سردار کا قلم چھین لے ! بھاؤ بڑا تھا، مگر عقل نے کہا، تو پٹھان ہی، مگر غفرتیں بھی سیکھ ہے زبردستی تو سردار قبضے میں آنے سے رہا۔ ہاں، پٹھانوں کی روایتی "چالاک" سے کام لیا جائے، تو شاید سردار اپنا قلم سپرد کر دے۔ آخر "سردار" ہی تو ہے !

عمر دین معدی کرب، عرب کا مشہور آفاق سورما تھا۔ ایک دنیا اس کی ٹرک تازیوں، بے پناہ حلوں سے تھرایا کرتی تھی۔ ابن معدی کرب کی تلوار کا نام مصمصا تھا، اور اپنی لاٹ میں ضرب المثل تھی۔ عمر فاروق خلیفہ ہوئے۔ خود بھی بڑے جوار سپاہی تھے۔ خیال ہوا ابن معدی کرب کی مصمصا کو دیکھیں۔ حکم کی دیر تھی تلوار حاضر ہو گئی۔ ہاتھیں لی اور جھٹک کے بلائی تو ڈانڈ بھی۔ حیرت سے چیخ مٹھے۔ "اسی مصمصا کی یہ دھوم ہے ! بلاؤ معدی کرب کے بیٹے کو" حاضر ہوا تو فرمایا: تیری تلوار تو کچھ بھی نہیں ! محراب صحنے عرض کیا، "امیر المؤمنین، تلوار تو محض لہے کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن وہ ابن معدی کرب کا بازو ہے جس نے لہے کے اس ٹکڑے کو پورے عرب میں شہرت دے دی ہے۔ خطا معاف، امیر المؤمنین کے جسم میں ابن معدی کرب کا بازو موجود نہیں !"

تو بس اب آپ خود ہی فرمائیں، دیوان سنگھ کا قلم کسی طرح چھین بھی لوں، یا دم دلا سا دے کر اٹیٹھ بھی لوں، تو نتیجہ وہی "مصمصا" جیسا ہی تو نکلے گا !

اما بعد، دیوان سنگھ کی "ناقابل فراموش"۔ آپ چاہیں تو میں قسم کھا کر کہہ دوں کہ یہ کتاب اردو لٹریچر میں ناقابل فراموش رہے گی !

عمر بھر کسی کتاب کا دیباچہ لکھا نہیں۔ کوئی کتاب بھی پچی ہی نہیں۔ قلم سے تعریف کرنے میں اول درجے کا کنجوس، کھٹی چوس ہوں۔ لیکن دیوان سنگھ کی "ناقابل فراموش" نے مجھ پر واقعی ناقابل فراموش اثر کیا ہے۔

پورے جزم، پورے یقین، پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اردو ادب نے "ناقابل فراموش" جیسی کتاب پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے ادب میں یہ کتاب زندہ رہے گی۔ کیوں؟ اس لئے زندہ رہے گی کہ یہ کتاب انسانی زندگی کی عینا تک غور چکانیوں کی اور لغزشیوں کی ہر پہلو تصویر ہے۔ ایک زندگی ہے جو صحنے صحنے سے چھوٹ رہی ہے، چھلک رہی ہے، اٹھ رہی ہے !

دیوان سنگھ نے رشک خانی انسان ہے، کسی دن مرجی جائے گا، مگر دیوان سنگھ کی ناقابل فراموش "غیر فانی" ہے کبھی نہیں مرے گی !



# بہترین خودنوشت سوانح عمری

(جناب ڈاکٹر مہین سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ بٹ جید پنجابی ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)

مفتوں صاحب سے کئی برس ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے سوانح حیات کتابی صورت میں شائع کیجئے۔ اُن دنوں ریاست کے توسط سے ہر ہفتہ سردار صاحب اپنی کتاب زندگی کا کوئی ورق پیش کرتے تھے۔ مجھے تو چند ہی واردات کی اہمیت نے سردار جی کی شخصیت کا مدراجہ اُن کی اچھا بیانی کا شیدائی اور اُن کی صاف گوئی اور اُن کے ہمدردانہ بنادیا تھا۔ بہت ممکن ہے اور اصحاب نے بھی اسی طرح کا تقاضا کیا ہو۔

ذاتی ملاقات تو دیر ریاست سے غالباً ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ دریا گنج کے ایک کونے میں پڑے تھے اور میری طرح انقلاب کو دعائیں دے رہے تھے۔ جب چلے میز پر آئی اور تکلفات پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ ایک صادق دوست، سخی میزبان اور دیادل دانا ایک اجنبی کو بھی باوجود اپنی مالی مشکلات کے وہ کچھ پیش کر سکتا ہے جس کا مہمان کو خواب و خیال تک نہ ہوتا تو حق کی قربت جانے دیجئے۔ ہاں بے واسطہ دیوانہ ۱۹۱۹ء سے سردار دیوان سنگھ مفتوں کو جانتا تھا۔ غالباً ۱۹۲۰-۲۱ء میں سردار سردول سنگھ کویش سے مفتوں صاحب کی بلند کرداری کے قصائد سنے اور جی قابل ہو گیا۔ جسے کویشرا بھیجھا کہیں وہ بہت اچھا ہے فی الواقعی۔

مفتوں صاحب کی یہ خودنوشت سوانح عمری پڑھ چکا تو دل نے شاعری شروع کر دی۔ کیا فرماتے ہیں حضرت دل۔ مجھ سے کوئی پوچھے نہ پوچھے ہیں کہوں گا کہ اس کتاب کا ترجمہ سرکاری طور سے ہندوستان کی تمام تسلیم شدہ زبانوں میں کیا جائے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ امریکہ میں شائع ہوا اور اس کتاب سے سوزوں اقتباسات ہارسیکنڈری سکولوں کے ادبی لسانی نصاب میں شامل کئے جائیں۔

میں جانتا ہوں کہ دل دیوانہ کیوں یوں مفتوں صاحب کی تحریرات پر لپٹے۔ عرصہ ہوا ایک شعر ہوا تھا۔ وہ بھی سُنئے۔

تھا دل دیوانہ ایک پتلا خلوص و صدق کا

راز کی سب باتیں چہرے سے نمایاں ہو گئیں

میری طرح ہر وہ شخص جس کے دل میں درد ہے، جو جذب و سلوک کا قائل ہے جو وحدت الوجود پر ایمان رکھتا ہے، جسے روز حساب کی فکر ہے، جو حقیقی اور باقی مساوات کا قائل ہے، جو ہر فرد واحد، ہر گروہ، ہر قوم، ہر ملک میں کچھ نہ کچھ اچھائی دیکھنے کا عادی ہے، جو اخلاقی اقدار کی تینوں بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے۔ خاندانی تربیت، ذاتی تجربات اور ادب تعالے کا کرم۔ جسے اپنے وطن کی روحانی اور اخلاقی ترقی کی اور بھی زیادہ فکر ہے۔ اقتصادی اور سیاسی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہاں ہر وہ شخص مفتوں صاحب کے سوانح حیات پڑھ کر بے اختیار ان کے دل و دماغ اور قلم کی بے پناہ داد دینے پر خود کو مجبور پائے گا۔

فقیر نے انگریزی زبان میں شائع ہوئی بہت سی خودنوشت سوانح عمریاں ادبیوں۔ سیاست دانوں اور روحانی

پرست دوستوں کی جن میں ہندوستانی - امریکن - فرانسیسی - انگریزی - یونانی اور جرمن شامل ہیں، بڑے غور و اہتمام اور جتن اندوزی کے جذبہ سے پڑھی ہیں۔ اس مطالعہ کی بنا پر مصنفانہ انداز اور تقابلی نکتہ نظر سے فقیر کہتا ہے کہ آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں مفتوں کی خود نوشت سوانح عمری کی طرح ہر واقعہ بے کم و کاست، بے غلو اور بے رنگ آئینہ کاری کے بے طرحداری کے لکھ دیا گیا ہو۔ اس قدر نثر پرین سے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا گیا ہو۔ تجربات کی انہی وسعت، امارت، عمق، اُن کا اتنا تنوع ہو اور وہ تجربات ہر طبقہ، ہر سطح، ہر رنگ کر دامت سے متعلق ہوں۔ بیان کا ڈھنگ۔ اشاروں، شغاف، توجہ گیر اور ہلکا ہو۔ زبان ہر موقع و واقعہ کے لئے عسوز و ب ہو، نیز مجموعی طور پر زبان کا استعمال قادرانہ ہو اور لغات و طرزِ عام و خاص کی تمیزوں کو بھلوا دینے والا ہو۔ داستان گوئی کے ساتھ ساتھ معرفت پیمائی ہو، تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حق پروری ہو اور واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نکتہ آفرینی ہو۔ غریبی میں امیری اور امیری میں غریبی کے مزے لینے والا مصنف زندگی کا سارا کھیل شروع سے آخر تک ایک بے لاگ تیلہ کے طور پر کھیل سکا ہو یعنی ہر قدم پر عالمی خود کو شاہد و ناقد بھی محسوس کرتا رہا ہو۔

میاں اپنے بچوں کو اپنے دوستوں کو اپنی بیوی کو اپنے شوہر کو اپنے افسروں کو اپنے اتھنوں کو اپنے پڑوسیوں کو اپنے دشمنوں کو اگر تعلیم کرنا مقصود و منظور ہو تو ساری کی ساری کتاب انھیں پڑھوا دو۔ اور اگر اتنا نہیں کر سکتے وہ یا آپ تو اتنا ہی کریں کہ اس کتاب کے ابواب کے عنوانوں کو الگ الگ تختہ کاغذ پر لکھ کر درون خانہ کی دیواروں پر چسپاں کر دو۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ زندگی کا میاب ہو جائے گی ہاں زندگی زندگی ہو جائے گی۔ دیکھو تو کیا فرماتے ہیں سردار صاحب:-

والہد یہ عنوان ہیں یا اخلاق خداوندی پر مشتمل ایک عارف پر نازل ہوئے مسوتر:-

ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کرو۔

والہیان ریاست کا پرستیج۔

عزت کی قربانی۔

عزت مرنے کے بعد۔

پانی کا اثر طبع پر۔

سی۔ آئی۔ ڈن کے معتبر رپورٹر۔

غدار ناقابلِ صفائی ہیں۔

گورنمنٹ کی کاغذی مشینری۔

جو لازم کار و دشمن پہلو۔

قانون اور فرض۔

معنویت باعثِ اطمینان۔

بغیر نیت کے جرائم۔

نفرت اور محبت کے اسباب۔

وہ خاص بات جس نے مجھے سردار صاحب کا بے حد گرویدہ کر دیا ہے اور جو میرے پچاس سالہ تجربہ میں کسی اور ادیب، رہنما عالمی اور عارف میں شاذ و نادر ہی ملی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سردار صاحب نے سوانح نگار کرتے

وقت واقعہ کی اہمیت۔ اس کی سبق آموزی۔ اس کی دل چسپی اور اس کی معنی خیزی کو پیش نظر رکھا ہے خواہ وہ واقعہ کسی غریب دکھیا مجرم یا ولایتی سے متعلق ہے خواہ کسی امیر، فارغ التحصیل، پاکدامن یا دیسی شخص سے۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ سوانح نویس صرف انھیں ناموں، کاموں، مقاموں، واقعوں، تعلیموں کو لیتے ہیں بلکہ گھسیٹ لاتے ہیں جو بڑے ہیں جن سے کوئی نکتہ نگار کی بڑائی یا بڑا پن ثابت ہو اور پڑھنے والے پاس بات کا رعب چھا جائے کہ میں اس بڑے آدمی کی زندگی کے بڑے واقعات پڑھ کر بڑے نکتے حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر سردار دیوان سنگھ مفتوں ایک معمولی کھتری سنگھ گھرانے کا فرد ہے۔ یہی تھا یہی۔ یہی ہو گا۔ یعنی اُس نے خاندانی روایات، سنگھ تعلیمات اور عوامی فطری صلاحیتوں کو ایسا سنبھالا اور انھیں وہ فروغ دیا اور اس سختی سے اُن پر کاربند رہا کہ سب کچھ دیکھ۔ سُن۔ سہہ کر بھی وہ وہی ہے جو پہلے تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اول ہی سے بڑا یا چھوٹا تھا اور اب بھی وہی، ویسا ہی ہے۔ ہاں تلخی دوراں نے، ستم ہائے زمانہ نے اُسے کہ کلمہ سے ہیرا کر دیا ہے اور پتھر سے سنگ مرمر۔ اسے اظہارِ عقیدت سمجھے یا بیانِ واقعی۔

# درس عمل

(ڈاکٹر م حفیظ سید ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ممبر ریڈیوش انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی لندن)

دیباچہ کا مقصد ہے کسی کتاب کا قارئین سے تعارف کروانا لیکن پیشتر اس کے کرنا مقصود اس فرضیہ کو انجام دینے کے  
اطمینان و مسرت حاصل کرے۔ ناقابل فراموش کتاب کے مصنف کے کارناموں پر انھیں مبارکباد دیتا ہے۔  
ادبی اور اخلاقی کتابوں کے مضامین عموماً فرضی و قیاسی اور تخلیقی ہوتے ہیں اور زیادہ تر جگہ ادبی واقعات پر  
بنی۔ لیکن زیر نظر تصنیف اس نظریہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے فاضل مصنف نے جو کچھ قلمبند کیا ہے وہ آپ بیتی ہے  
جسے اُن کے ناقابل فراموش تجربات، تاثرات، مشاہدات کا جینا جاگنا مرقع سمجھے یا عبرت آموز واقعات کا سرچشمہ۔  
ان کی حقیقت بھی اور کمال اندیش نگاہیں روزمرہ کے حادثات اور واقعات کو سرسری طور سے نہیں دیکھتیں بلکہ ان پر  
غائرانہ نظر ڈالتی ہیں اور ان سے سبق حاصل کرتی ہیں اور یہی عملی زندگی کا حاصل ہونا چاہیے۔ کون ذی ہوش اور جس  
انسان ہو گا جو اس عبرت انگیز مرقع کو پڑھ کر اثر پذیر نہ ہو گا۔ ادب کے مطالعہ کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیے۔  
جس شعبہ ادب کا اثر روزانہ زندگی پر نہ ہو اور جس کے مطالعہ سے چشم بصیرت دانہ ہو وہ حقیقتاً غیر مفید ہے۔  
ناقابل فراموش کتاب کا ہر ورق بصیرت افروز ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر برادرِ ادب و ادب و ادب اس کے مطالعہ  
سے مستفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس میں ذاتی اصلاح اور ضبط نفس کا قدر سے ذوق ہو۔ اس کے مصنف حضرت  
دیوان سنگھ مفتوں سراپا خلوص اور سیکر صدق و صفا ہیں جن لوگوں نے بالاسلمیاب ریاست کا مطالعہ کیا ہو گا وہ  
بلا تامل میری ہمنوائی فرمائیں گے۔ ہر شذرہ کہ تم میں اخلاقی پہلو چھنی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ ہر صورت کے لئے سبق آموز  
ہے اور معمولی سی معمولی بات ان کے واسطے تنبیہ کا تازیانہ۔ معیار اخلاق و دیانت طاری اور راستبازی کے اصول سے جو  
حادثہ منطبق نہیں ہوتا وہ ان کی مشاہدہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ ان کی روداد حیات جفاکشی کی ایک زندہ مثال  
ہے جس کو پیش نظر رکھ کر یہ زریں سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر کامیابی مقصد کے لئے ارادہ کی پختگی اور محنت کی  
عادت ضروری ہے۔ اپنے حصول مقاصد کے لئے انھیں جن جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ان کا بیان اپنی محادگی  
جہارت کے باوجود کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ چند واقعات میں انھوں نے اپنی  
قابل تقلید زندگی کی ان حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے انکشاف و اعتراف سے عام طور پر لوگ غریزہ کرتے ہیں۔  
یہ لیکن روزگار اور اپنے قسم کی پہلی کتاب مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ اس کے باغیر مطالعہ سے قاری کا ضمیر  
بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ عالم باعمل کے کوناؤں مشاہدات کا بے نظیر مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر معمولی سے معمولی شخص بھی سبق حاصل  
کر سکتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب سے مفتوں صاحب کو شغف ہے۔ ان کا اسلوب بیان جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔  
ایک نشست میں پوری کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے جی نہیں لگتا کہ دُوح میں بالیگی اور عقل  
میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ یہ کتاب ہر طبقہ کے طلباء کے لئے بھی مجید مفید اور کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

قارئین کرام یقین کریں یا نہ کریں مگر درحقیقت یہ ناقابل فراموش واقعہ ہے کہ سردار دیوان سنگھ صاحب نے تین چار سو روپیہ ماہوار آمدنی کو فیوادگر ساتھ روپیہ ماہوار کی ملازمت کو محض اس وجہ سے قبول کیا کہ فن اخبار نویسی میں مہارت حاصل کریں۔ ایک واقعہ کے مطابق آپ پنجاب سے سفر کر کے لکھنؤ "ہمدرد" کے ایڈیٹر جالب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا معاوضہ اس فن کو سیکھنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ ریموں اور میروں کی خوشنودی کی ٹکڑاٹھوں نے کہیں نہیں کی بلکہ ان کی ہر غلطی اور فروگزاشت کی سبقت تنقید کی اور بے دھڑک ان عیوب کو طشت از باہم کیا۔ اس ذات پات، کنہہ پوری اور فرقہ پرستی کے زمانہ میں بے لوث ہو کر رائے زنی کی مثالیں نایاب نہیں تو کیا بضروری ہیں۔ اس کتاب میں متعدد واقعات ایسے درج ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محترمی دیوان سنگھ صاحب نے اپنے اور غیروں میں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے کوئی امتیاز نہیں برتا۔ ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی ان میں سے کسی فرقہ کے فرد سے اگر کوئی دیدہ و دانستہ غلطی ہوئی یا لغزش مسوذ ہوئی تو اس پر آپ نے ہلک و گاست، بلا خوف و خطر، بے باکانہ نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ آپ فطرتاً ہی پسند حق حاد و حق ہیں واقع ہوئے ہیں۔

مجھ کو تیس برس کے عرصہ میں انگریزی اور دو کے ایڈیٹروں سے کافی سابعہ ملا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ لکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میں نے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر کو بحیثیت ایڈیٹر کے بہرے عجوبہ صفات پایا۔ یہ صادق القول، صادق الافکار اور اپنی بات کا دھنی انسان اپنی آپ جی میں سا کر ہمیں غیر محسوس طریقہ پر زندگی کا وہ درس عمل دیتا ہے جو ہر پہلو اور ہر نقطہ نظر سے مفید، کارآمد اور اعلیٰ ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اس ناقابل فراموش مجموعہ کو قارئین توجہ اور دلچسپی سے پڑھ کر مستفیض ہوں گے۔

# ریاستوں کی قومی زندگی کا علم ہمارا

(جناب مالک رام صاحب مصنف "ذکر غالب" وغیرہ)

میں نے ۱۹۲۲ء میں وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول دیرآباد سے میٹرکولیشن کی سند لی اور اسی سال گورنمنٹ کالج گجرات میں الیت۔ اے کلاس میں داخلہ لیا۔ یادش بخیر، اس زمانے کا گجرات سراسر شعر و نغمہ کا شہر تھا۔ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا شاعر کہتا تھا۔ اگر خود نہ کہتا تو دوسروں کے ہی گنگنا تار جتا۔ ہر گلی کوچے سے طبلے کی تھا پ اور سارنگی کی دل نواز لہریں کی، آواز سنانی دیتی تھی۔ ہفتہ وار طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں مقامی اصحاب کے علاوہ باہر کے شعرا بھی اپنا کلام سُنانے کو آیا کرتے۔ اختر شیرانی اور عابد علی عابد کو میں نے پہلی مرتبہ یہیں دیکھا اور سُنا میری عمر بھی یہی ۱۶-۱۷ برس کی ہوئی۔ ناممکن تھا کہ میں اس فضا سے متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ میں بھی ان مشاعروں میں جانے لگا۔ شعر سُنانے کو نہیں بلکہ سُنانے کے لئے۔ کیونکہ اگرچہ میں نے اس زمانہ میں دو تین غزلیں لکھیں اور ان مشاعروں میں پڑھیں، لیکن بہت جلد میں نے محسوس کر لیا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ نہ شعر میں تازگی ہوتی ہے، نہ کوئی خاص بات ہی۔ وہی ایک معنوی ہے جو آپ لفظوں کے ہیر پھیر سے لکھ دیتے ہیں۔ اگر اس فعلی نٹ بازی میں کوئی محاورہ یا ترکیب عمدہ اور جدید طریقہ پر بندھ گئی تو واہ واہ، ورنہ دوسروں کا ڈکھنا ذکر، شعر خود اپنی نظر سے گر گیا۔ غرض کہ اس کے بعد میں نے شعر کہنا یکسر ترک کر دیا۔ البتہ ان مجلسوں میں باقاعدہ شریک ہوتا رہا۔ توضیر یہاں میری ملاقات ایک صاحب مہر یوسف سے ہوئی۔ ان کی تعلیم تو بالکل ادبی سی تھی۔ شاید چوتھے یا پانچویں درجے تک ہو۔ لیکن وہ بہت ذہین تھے اور انھوں نے اپنے شوق اور محنت سے اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ ہزاروں شعر یاد تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ یوسف تخلص تھا۔ چونکہ سیاب اکبر آبادی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے، اس لئے اپنے نام کے ساتھ سیابی بھی لکھتے تھے یعنی محمد یوسف۔ یوسف سیابی گجراتی مینا کہ شروع میں یہ درزی کی دوکان کرتے تھے۔ اس کام میں ضرور نفع ہوا ہو گا اور شاید باب دادا کی کمائی سے بھی کچھ بچا کھچا پاس ہو۔ انھوں نے درزی کا کام چھوڑ کے کپڑے کا کاروبار کر لیا۔ میں جس زمانے میں ان سے ملا ہوں ان کے پاس یہی بزاز کی دکان تھی۔ دن بھر کی تو خدا جلنے، کہہ دیا کرتے تھے، لیکن دن ڈھلنے کے ساتھ ہی دوست احباب ان کی دوکان پر جمع ہونے لگتے اور پھر یہ جھگڑا مارت گئے۔ تک رہتا۔ دراصل یوسف صاحب نے یہ دوکان تو محض "سرگرمی" کی طرح محض دوستوں سے ملاقات کے لئے ایک جگہ ہتیا کرنے کے لئے کھول رکھی تھی، ورنہ حقیقت میں انھیں طوقی عرف دو چیزوں کا تھا، شعرا اور کھانا۔ چنانچہ جتنی دیر یہ جمع رہتا، یا رنگ یا تو شعر پڑھتے اور سُنتے رہتے یا دعویں اُٹاتے رہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یوسف صاحب کے پاس کوئی قاروں کا خزانہ تو تھا نہیں: دو تین برس میں دوکان خالی ہو گئی۔ یوسف صاحب کے ہاں مختلف رسالے اور اخبار بھی آیا کرتے تھے۔ "نگار"، "زمانہ"، "پلیانہ"، "نیزنگ خیال" وغیرہ اس دور کے مشہور پرچے تھے۔ وہ ان سب کے خریدار تھے۔ گاہے ماہے ان میں سے کسی میں ان کی غزل بھی چھپ جاتی اور غالباً اسی غرض سے وہ انھیں منگواتے تھے۔ ایک دن شام کو جو میں ان کی دوکان پر گیا تو یہاں ایک نیا پرچہ

دیکھا۔ ریاست۔" بڑا سا نر، بڑھیا چکنا کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ تصویریں۔ غرض سہ  
زفرقہ تابعت دم ہر کجا کہ می ننگرم  
کر شمشہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

یہ تھا میرا پہلا تعارف سردار دیوان سنگھ مفتوی سے جو "ریاست" کے ایڈیٹر تھے۔

میں پہلا نمبر میں "ریاست" پر فریفتہ ہو گیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد ہر ہفتے مجھے اس کا انتظار اسی بے چینی سے  
رہا کرتا جیسے "نامہ دلدار" کا۔ اور میں جب اسے کھوتا، توجہ ہی چاہتا کہ "جان نذر دل فریبی عنوان" کردوں۔ میں اسے بلاناغہ  
پندرہ ہنگامہ (۱۹۲۶ء۔ ۱۹۳۶ء) پڑھتا رہا۔ اس کے بعد میں "باؤں کے چکر" سے مجبور ہو کر ذرا وسیع تر پہلے نے برداشت نور کی  
کرنے کو ملک سے باہر چلا گیا، اور پندرہ برس کی جہاں گردی کے بعد ۱۹۵۵ء کے اوائل میں وطن واپس آیا اس دوران میں مجھے  
"ریاست" دیکھنے کو نہیں ملا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کہیں بھی رہا ہوں، کبھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب  
میں یہاں آیا، تو چونکہ گھبراہٹ تو غیر حاضری کے زمانے میں تقسیم ملک کے باعث پاکستان کو پیارا ہو چکا تھا، لامحالہ مجھے دہلی  
میں قیام کرنا پڑا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، میں نے سردار دیوان سنگھ صاحب سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اپنے جلوس  
کا قائل نہیں اور اسی تقریبوں میں جہاں ہنگامہ ہو، بہت کم شامل ہوتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے، سردار دیوان سنگھ مجھ سے بھی  
زیادہ کم آہیز ہیں، کمزور ہیں نے ان میں برس میں انھیں کس جگہ بھی نہیں دیکھا۔

پچھلے جاڑوں میں میرے ایک ہریانہ بزرگ نے لکھنؤ سے لکھا کہ میں دو تین دن کے لئے دہلی آ رہا ہوں اور حسب معمول  
سردار دیوان سنگھ مفتوی کے ہاں ٹھہروں گا۔ چونکہ ان سے ملنا ضروری تھا، اس لئے جس دن ان کا آنے کا وعدہ تھا میں  
مکان تلاش کر کے حاضر ہوا۔ وہ بزرگ تو تشریف نہیں لائے تھے، لیکن اس جہانے سردار صاحب سے ملاقات ہو گئی۔  
زمانے کے اتفاقات کہوں ہیں نے اس شخص کو، جسے میں غالباً ۱۹۳۴ء میں برصغیر سے جاننا تھا۔ پہلی تقریب ۱۹۵۵ء میں لکھا۔  
"ریاست" نے تحریک آزادی میں جو نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ جنگ کا ایک محاذ تو یہ  
تھا کہ بھارتی اقتدار سے براہ راست جھڑپ کی جائے۔ انگریزوں نے یہی کیا۔ اس کی تمام تحریکیں اسی قصور سے شرم کی گئیں۔  
اس سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی اور بدقسمی حکمرانوں کا ہیرا بازی اور چٹائی رعب لوگوں کے دلوں میں بٹھایا ہوا تھا، وہ ذلیل ہو گیا۔  
دوسرا محاذ وہ تھا، جس کی لڑائی ہمدردی صحافت نے لڑی۔ اخبار نویسوں نے یہ کوشش کی کہ تحریروں سے انگریزوں کو اور یہاں  
ان کے طرز حکومت کو خود سرحد مطلق العنان اور اس طرح مضحکہ خیز ثابت کیا جائے تاکہ اخلاقی اور جنوی حیثیت سے  
بھی ان کی کم مائیگی ظاہر ہو۔ اگرچہ اس میں بسا اوقات ان غریبوں کا مالی نقصان اس حد تک ہوا کہ وہ تباہ ہی ہو گئے اور  
ان میں سے بعض کو قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں۔ لیکن آفریں ہے ان پر، کہ یہ ہمت نہیں ہارے اور  
براہر میدان میں ڈٹے رہے۔ "ریاست" نے یہی دوسرا راستہ اختیار کیا، بلکہ اپنی سرگرمیوں کو ریاستوں تک وسیع کر کے  
اس نے اپنی دشواریوں میں اور اضافہ کر لیا۔ ہندوستان میں انگریزی نوکر شاہی کی سب سے بڑی پشت پناہ دہلی حکمران  
تھے۔ چونکہ ان کی انتہی ہستی اور زندگی سراسر انگریز کے رحم و کرم پر ہو تو تھی، اس لئے یہ ہمیشہ اس کے قول و فعل کی تائید  
کونا چٹا فرض خیال کرتے تھے، اور اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حالانکہ بیشتر ریاستوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں برطانوی  
اور ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ یہاں کے نواب اور ہمارا جسے دن رات من مانی کرتے اور گھجھجھتے اٹھاتے تھے۔ ریاست کی دہلی  
گویا ان کا جیب خراج تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں نے تو کھلے بندوں ریاستوں کے معاملات میں دخل دیا، ان کے حکمرانوں

کو آئین، اصلاحات نافذ کرنے کا مشورہ دیتا۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ انگریز کی موجودگی میں کوئی کسی کو اب یا جہاں حاجت کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ اور رائے عامہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام کے لئے یہ دیسی حکمران سب سے بڑا بند تھے۔ "ریاست" نے ان دیسی رئیسوں کے خلاف جہاد شروع کیا، تاکہ عوام کے دماغ سے ان کا ہوتا نکلے اور اس طرح ان کے دلوں میں خود انگریز کے خلاف نفرت پیدا ہو، جو ایسے ناکارہ لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ "ریاست" کو کسی غلط بیانی یا مبالغے کی ضرورت نہیں تھی۔ واقعی ریاستوں کی رعایا کا نہ جان و مال محفوظ تھا، نہ عزت و ناموس، پھر ترم بالا سے تم یہ کہ نہ داد تھی نہ فریاد۔ خوش قسمتی سے اسے نامہ نگار بھی وہ لکھے جو گھر کے بھیدی تھے، اس لئے ہر ہفتے اس میں ایسے ایسے کچے چٹھے بچتے کہ پڑھنے کا لطف آجاتا۔ ان مضامین اور خبروں نے آگ سی لگا دی۔ سرکاری حلقوں پر ان سے جو گزر جاتی ہوئی، اس کا اثر بس اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ ریاستوں کا وقار اور ان کے حکمرانوں کی عزت طیامیٹ ہو کر رہ گئی۔ اور خود انگریز بھی ان شعلوں کی لپیٹ سے نہ بچا، اور یہی "ریاست" کا مقصد تھا۔ ریاستوں میں قومی تحریک کی بنیاد رکھنے اور اس کے نشوونما میں "ریاست" کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کاش کہ، کوئی اس کی تاریخ لکھ دے۔ اس کے لئے بھی سردار دیوان سنگھ سے زیادہ کون موزوں ہے۔

ظاہر ہے کہ سردار دیوان سنگھ کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔ "ریاست" کی ایڈیٹری بھولوں کی سیج نہیں، بلکہ تلوار کی دھار تھی۔ ریاستوں کا تمام روپیہ اور ان کے اثر و رسوخ کی پوری مشین ان کے خلاف تھی چنانچہ تلاشیاں ہوئیں۔ مقدمے قائم کئے گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ انھیں اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا جھڑ توڑ نہ کرنا پڑے ہوں گے۔ اس دوران میں دوستوں کی دوستی آزمائے اور دشمنوں کی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے بیسیوں موقع پیش آئے۔ ایسی بھرپور زندگی کے سینکڑوں واقعات ناقابل فراموش ہونا چاہئیں چنانچہ اپنے تجربات بیان کرنے کو انھوں نے ایک زمانے میں "ریاست" میں "ناقابل فراموش" کے عنوان سے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھنا شروع کئے تھے۔ انہی کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔ سردار دیوان سنگھ کا اسلوب نگارش سادہ اور پُرکا ہے۔ ان کے قلم میں زور ہے۔ چونکہ ساری عمر مصافحت میں گزری، اس لئے ان کے بیان میں روانی بہت ہے۔ زندگی کی افتاد نے انھیں واقعیت پسند بنا دیا ہے، اس لئے لگی لپٹی رکھنا یا باتیں چبا چبا کر کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے مد نظر معز ہوتا ہے، نہ کہ اس کا چھلکا۔ اگر ان کا مافی الضمیر کسی خاص لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، تو وہ اس کے لکھنے سے دریغ نہیں کرتے، خواہ اس سے کسی اہل زبان یا زبان داں کی بیشائی پر بل ہی کیوں نہ پڑ جائے میں نے جب یہ کتاب پڑھی، تو مجھے اس میں "داستان" کا لطف آیا۔ ناممکن ہے کہ آپ اسے ایک دفع مشہور کر کے آسانی سے ہاتھ سے رکھ دیں۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اپنے علم و صلاحیت سے دنیا کے ادب کو اور زیادہ مستفید کریں اور ان ریاستوں کے نظم و نسق اور ان کے حکمرانوں کی کارگذاریوں سے متعلق جو کچھ انھیں معلوم ہے، اسے قلم بند کر دیں۔ یہ مستقبل کے مورخ اور افسانہ نویس (اور قلم نگار) کے لئے خاتم مواد کا کام دے گا، اور اس طرح ان کا احسان ہمارے علم و ادب پر دائمی رہے گا۔

اب ایک مشہور:

ہماری زبان میں اچھی سوانح عمریوں کی بہت کمی ہے۔ ان کے نام آسانی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر



گئے جاسکتے ہیں۔ جہاں یہ حالت ہو، وہاں خود نوشت سوانح حری کا کیا ذکر۔ اس صنف میں سر رضا علی مرحوم کے "احوال نامہ" کے سوائے کوئی اور کتاب میرے علم میں نہیں، جو ادبی لحاظ سے بھی دیکھنے کے لائق ہو۔ اس فرزندِ گم کے پورا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اصحاب جن کی زندگی کے واقعات دل چسپ اور سبق آموز ہو اور وہ لکھتے پر بھی قادر ہیں، وہ بغل سے کام نہیں اور اپنے حالات اور تجربات لکھ ڈالیں، سووارہ پان سنگھ نے زندگی معمولی حیثیت سے شروع کی۔ تعلیم بھی معمولی تھی لیکن مسلسل محنت، خلوص، استقلال اور خود اعتمادی سے انہوں نے قابلِ رشک کامیابی حاصل کی۔ ان کے سوانح حیات ہمارے نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ انہیں حوالہ قلم کر دیں۔

ہے آج جو داستانِ اپنی  
کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

# خیر مقدم

(جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر)

سیری ان چند سطور کو سردار دیوان سنگھ مفتوں کا تعارف یا "ناقابل فراموش" کا دیباچہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ دورِ حاضر کا اردو ادب طبقہ اخبار "ریاست" کی معرفت دیوان سنگھ کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان ہی سے نہیں بلکہ ان کے کردار کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ اس طرزِ تحریر کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے مگر اس کی مقبولیت کے بارے میں اب شک و شبہ تک کی گنجائش نہیں رہی۔ دیوان سنگھ نے کبھی ادیب یا انشا پرداز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا زندگی کی ابتدائی دور و دھوپ کے چند سالوں کو چھوڑ کر عمر بھر صحافت ہی ان کی تمام تر توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے اور صحافت میں وہ ایک ایسی طرزِ تحریر کی ایجاد کا دعویٰ کر سکتے ہیں جو اخبار "ریاست" کے روزِ اجر سے اب تک بہت بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں سے داد و تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔

عہدِ انگریزی کے آخری تیس بیستیس سال ہندوستانی صحافت کے لئے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھے۔ اس وقت قوم پرست اخباروں اور اخبار نویسوں کو بے شمار مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوا۔ پھر مفتوں صاحب کا اخبار تو نہ صرف قوم پرست تھا بلکہ دایانہ ریاست کے اُس گرد و کے خلاف جہاد کر رہا تھا جو انگریزی حکومت کا پشتیبان اور قانون کا لاڈلا تھا، اپنے کروٹوں کو چھپانے کے لئے سب کچھ کر رہا تھا اور غیر محدود اختیارات۔ وسیع ذرائع اور طاقت ارفع کی پشت پناہی کی بدولت سب کچھ کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کو شادمانے کے لئے مختلف پہلوؤں سے پے در پے حملے کئے۔ ہر طریقہ اور ہر تہیارسے کام لیا اور نیک و بد کی فیز چھوڑ کر اس دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سردار دیوان سنگھ کو ان لوگوں کے پس پردہ کارناموں اور کروٹوں کا حال معلوم کرنے اور ان کے مختلف انزعجوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہر طبقہ اور ہر قماش کے بے شمار لوگوں سے سابقہ چل چلا۔ یہودوں تعلقات بنانے اور بگاڑنے پڑے اور انسانی ذہنیت اور نفسیات کے متعلق ان گنت اچھے بُرے تجربے ہوئے۔ انسان عمر بھر میں جو کچھ دیکھتا، بپھٹتا اور سنتا ہے اگر وہ سب کا سب یاد رہے تو یہ بے چارہ کثرتِ معلومات طوفان میں گم ہو سکے، چائے چہ بعض تجربے تو محض ہنگامی حیثیت کے ہوتے ہیں اور انسان انہیں بہت جلد بھول جاتا ہے لیکن بعض تجربوں کا انسان کا اپنی طبیعت اور مزاج سے خاص نگاہ ہوتا ہے اور وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ تجربے دل کے کسی گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاگزیں اور دماغ کے کسی خانے میں عموماً رکھے ہتھوڑا ہو جاتے ہیں۔ ناقابل فراموش ایڈیٹر "ریاست" کے ایسے ہی تجربوں کی داستان ہے۔ جو تجربوں کی کثرتِ تعداد اور بطلونی کی بدولت انسانی زندگی کے قریباً تمام پہلوؤں اور شعبوں پر حاوی ہو کر بے حد دلچسپ اور سبق آموز بن گئی ہے۔

لہذا انی اور صاف گوئی دیوان سنگھ کی تحریر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ انہوں نے عبارت آسانی اور الجھاؤ سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ جو کچھ کہنا ہو سیدھے سادے جملوں میں پوری صفائی اور بے باکی سے کہہ دیتے ہیں۔ ہر

تھے ہیں یہ خواہش جھانک کر نظر آتی ہے کہ جو کچھ کہا ہے بڑے ذالے کی سمجھ میں پوری طرح آجائے اسی لئے جہاں ضرورت تھی  
ہیں اپنے کسی بیان کا پس منظر اور تعلیمات بطور جملہ معترضہ لکھ کر پھر سلسلہ کلام شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات  
آٹھ دس الفاظ کے ایک فقرے کے عین درمیان میں پانچ چھ فقروں کا جملہ معترضہ آجاتا ہے بعینہ جیسے عام حاجت  
میں ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت جو صحافت میں دیوان سنگھ کی کامیابی اور ان کے اخبار کی مقبولیت کے لئے بہت بڑی حد  
تک ذمہ دار ہے "ناقابل فراموش" میں موجود ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے۔ "ریاست" کی ادارتی تحریروں میں  
قدرتی طور پر دیوان سنگھ کے اپنے خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ پبلک کے احساسات اور جذبات بھی شامل  
ہوتے تھے اور "ناقابل فراموش" میں دیوان سنگھ اور صرف دیوان سنگھ بول رہا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں دوسرے لوگوں کے  
اقوال اور بیانات ہی لکھے ہیں وہاں بھی میں السطور میں خود دیوان سنگھ کا ذہنی اور نفسیاتی ردِ عمل جھلکتا دکھائی دیتا ہے  
ایک طرف تو مختلف واقعات پر بزرگوں کے سے فلسفیانہ انداز میں تنقید و تبصرہ کرتا ہے اور دوسری جانب بچوں کی  
سی سادگی کے ساتھ اپنی اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی کمزوریوں اور حماقتوں کی داستان سُنا رہا ہے۔ مگر انداز بیان  
دونوں جگہ ایسا ہے جس سے محرر اور قاری میں خود بخود ایک مفاہمت بلکہ یگانگت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم  
ہوتا ہے کہ داستان اگر اپنے مخاطبوں کو راز داں اور باز دار بنا لینے کا آرزو مند ہے اور اس مقصد کے لئے صدقائی  
سے کوشش کر رہا ہے۔ مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں اس انداز کی کامیابی یقینی تھی۔ چنانچہ "ناقابل فراموش" کے مختلف  
واقعات جب "ریاست" میں شائع ہوئے تو مشقوں کی اس تازہ اُنج سے نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا گیا بلکہ ان  
واقعات و تجربات کو کتنا ہی صورت میں چھاپنے کا پُر اصرار مطالبہ ہونے لگا۔

ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہو سکتا ہے۔ دیوان سنگھ نے کسی شخص کے ان مشاغل و عادات  
سے کبھی تعرض نہیں کیا جن کا تعلق صرف اس شخص کی ذات سے ہو۔ وہ صرف ان اشغال و حرکات کو اخبار نویس  
اور نقاد کی توجہ کا مستحق سمجھتے ہیں جن کا بلا واسطہ یا بواسطہ طور پر دوسرے لوگوں پر اثر پڑتا ہو۔ کوئی بس بائیس  
سال کا ذکر ہے جب میں پہلے پہل دہلی آیا تو سردار صاحب سے ملنے گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام اور تحریروں  
سے آشنا تھے مگر اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یقیناً صاحب مجھے اور خوشی رام رچھپال سنگھ شیدآ مرحوم کو اپنی  
کار میں بٹھا کر دہلی کی سیر کرانے لے گئے۔ شام کو کناٹ پل میں پہنچے تو مجھ سے پوچھا: "کچھ نہیں گئے آپ؟" میں نے کہا میں  
شراب نہیں پیتا۔ چنانچہ ایک فیشن ایل ریٹوران میں چائے پیئے بیٹھ گئے۔ وہاں ٹیک سیٹری آئی تو میں نے  
کہا میں گوشت اور انڈیا بھی نہیں کھاتا۔ دیوان سنگھ نے دونوں مرتبہ میرے انکار کو سن کر اس "صوفی بن" تنقید و  
تبصرہ تو درکنار معمولی حیرت و تعجب کا اظہار بھی نہیں کیا۔ نہ تو بعض دوسرے لوگوں کی طرح شراب اور گوشت  
کے فضائل و مناقب بیان کئے نہ اس بات پر حیرانی ظاہر کی کہ ایک شاعر شراب سے اور نئے زمانے کا ایک بوٹ  
گوشت سے احراز کرتا ہے۔ میری بات کو یوں سُنا جیسے میں نے صرف یہ کہا ہو کہ ڈاک خانہ میں خط ڈال آیا ہوں یا صبح  
سے دوپان کھا چکا ہوں۔ "ناقابل فراموش" میں بھی ان کے کردار کا یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں اپنی  
کسی کمزوری یا خیر معمولی طرز عمل کا ذکر آگیا ہے وہاں اس کے متعلق صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔  
مثلاً ایک موقع پر سخت مصیبت میں گرفتار ہیں تو کوئی شخص سکھنی صاحب کا ہاتھ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ مگر  
یہ مشورہ پسند نہیں آتا لہٰذا کہہ "میں نے کبھی عبادت نہیں کی" اس کے بعد نہ تو اس بات یعنی عبادت نہ کرنے پر

فخر و مباہلات کا اظہار ہے نہ توجہ و معذرت کی کوشش۔ بس ایک حقیقت تھی جو ضمناً بیان کر دی گئی۔ کسی شخص کے ذاتی معاملات اور پبلک کیرئیر کے درمیان یہ بہت ہی غیر نمایاں اور مبہم سی حد فاصل عام طور پر ہمارے صحافیوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے مغتوں نے ہمیشہ سے پیش نظر اور ملحوظ خاطر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں ابتدا ہی میں کہہ چکا ہوں کہ میرا مقصد سردار دیوان سنگھ کا تعارف یا "نا قابل فراموش" کی دیباچہ نگاری نہیں۔ بعض باتیں جو میرے نزدیک اُن کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہیں اُن کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ "نا قابل فراموش" کے قارئین ان واقعات و تجربات کو کتابی صورت میں دیکھ کر خوش ہوں گے اور دیوان سنگھ کی اس تصنیف کا دلی جوش اور مسرت سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

---

# دکھیں پڑش اور مفید

(مسٹر گپال سنگھ ایڈیٹر رسالہ "تحریک" دہلی)

۱۹۲۳ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں ان دنوں اپنے وطن مالیر کھٹے میں آٹھویں کا طالب علم تھا۔ ایک معذ میں بھائی کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاک سے ریاست کا ایک پرچہ وصول ہوا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو اس وقت تک ہاتھ سے نہیں چھوڑا جب تک یہ ختم نہ ہو گیا۔ آج ۳۳ سال جو جب ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ کی کتاب ناقابل فراموش "کو پڑھنا شروع کیا تو بھی ایسا ہی تھا کہ اسے تمام وکمال پڑھے بغیر اتھ سے نہیں رکھ سکا۔ اس سے صحت بھی بہتر نہیں چلتا کہ سردار دیوان سنگھ کے انداز تحریر میں ایک غیر معمولی کشش ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی کتابوں کی طرح ان کی نگاش میں کوئی ایسی بات ہے جس کی ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق پذیرائی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ۳۳ سال کی مدت میں میرے مزاج میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہوں گی اور اس تمام مدت میں چونکہ میں نے کچھ پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا اس لئے میرے علم اور معلومات کا دائرہ بھی وسیع ضرور ہوا ہو گا۔ کم سنی کے کچھ جذبات کی جگہ مزاج میں تھوڑی بہت خشکی آ چکی ہے اور کچھ لوگ تو مجھ پر سنگین مزاجی کا الزام بھی لگاتے ہیں لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود سردار دیوان سنگھ کی تحریر میرے مسلسل کشش کا باعث بنی رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کشش کے اسباب بدلتے رہے ہیں۔ پہلے جہاں ان کی بے خوفی، جرأت مندی اور ان کی تحریر کا جوش و خروش موجب کشش تھا وہاں اب ان کے اور ان کی تحریر کے بالکل مختلف اوصاف دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے زندگی کا براہ راست مطالعہ کیا ہے اور اس کے بے شمار گوشوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے تجربات واقع، متنوع اور رنگارنگ ہیں جنہیں انھوں نے مکمل بے ریا کی ساتھ بغیر کسی تصنع کے قلمبند کر دیا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم و کاست بیان کرنے کی بجائے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے کسی مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں اور ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آ جاتی ہے جو نہ دل کے لئے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لئے۔ ایک اور چیز جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے ایسے خیالات قلمبند کرنے لگتا ہے جو مغفول کی جھلپنی سے چھپ کر نکلتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ کی کتاب اگر موجب کشش ہے تو اس کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالتے اور اپنی زندگی کے تمام خط و خال بے ریا کی ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ یہ بات عروج و مد میں مجھے ان کی کتاب کے علاوہ صرف جہانگاہ مذہبی کی خود نوشت سوانح حیات "سپاہی کے ساتھ میرے تجربات" میں نظر آئی۔

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے سردار دیوان سنگھ کی کامیابی مسلمات میں شامل ہے اور اس کے بیان میں اگر وہ چاہتے تو انتہائی مبافنے سے کام لے سکتے تھے لیکن جہاں انھوں نے یہ بیان کر دیا ہے کہ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے اہم ترین خبریں

کن کن ذرائع سے حاصل کیں وہاں بات بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ ایسی ہی ایڈیٹر نے آٹ انڈیا کے جنرل مگرجم مسٹر کے بی۔ رائے نے ان کے خبریں حاصل کرنے کے شوق سے فائدہ اٹھا کر انہیں کس طرح ایک دلچسپ مذاق کا ہون بنا یا۔ سردار دیوان سنگھ مسٹر رائے سے اکثر ملنے جلتے اور باتوں باتوں میں بہت نازکی خبریں معلوم کر کے ”ریاست“ میں شائع کر دیتے۔ ایک روز سردار دیوان سنگھ کی موجودگی میں مسٹر رائے نے اپنے ایک اسٹنٹ سے مخاطب ہو کر کہا: امریکہ سے جو اطلاع ہمارا جہ اندور کی امریکن بیوی کے طلاق کے متعلق آئی ہے وہ فی الحال اخبارات کو نہ بھیجئے۔ دو چار روز بعد بھیجئے جائے گا سردار دیوان سنگھ نے اس ”مصدقہ“ خبر پر بھروسہ کرتے ہوئے ”ریاست“ میں جو دوسرے ہی روز شائع ہوا تھا ایک نوٹ سپرد قلم کر دیا اور یہ عقدہ مسٹر رائے سے دوبار ملنے کے بعد ہی کھلا کہ وہ ایک مذاق کا ہون بن گئے ہیں جو ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ سردار دیوان سنگھ اگر چاہتے تو اس واقعے کو نظر انداز کر دیتے لیکن انہوں نے خبریں حاصل کرنے کی مشکلات بیان کرتے وقت اپنی کامیابیوں کے ذکر کے ساتھ اس واقعے کو بھی بیان کر دیا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے ان کے کیرئیر کی لمبی کاہلہ اس بات سے چلتا ہے کہ انہوں نے پاداش کے ڈر سے اپنی خبروں کے ماخذ کو کبھی انشا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی صحت گوئی سے بڑے بڑوں کو بہم کیا لیکن اگر کبھی اُدھر سے عتاب نازل ہوا تو اس کا وار انہوں نے اپنے سینے پر لیا اور ان لوگوں کے نام کبھی ظاہر نہیں کئے جن کے ذریعہ ان تک اطلاعیں پہنچی تھیں مثلاً ایک منہ پھر شام لال نہرو نے انہیں باتوں باتوں میں یہ بتا دیا کہ پنڈت موتی لال نہرو نے بھوپال سے ایک قانونی مشورے کی فیس میں لالہ روپے وصول کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ”قانونی مشورہ اور مقدمہ کیا ہے۔ یہ تو ہمارے ہیں اصل مقصد تو یہ ہے کہ بھوپال میں ناگرس کے لوگ ایچی ٹیشن نہ کریں اور چلے گئے گہری دوستی جو اس پر سردار دیوان سنگھ نے ”ریاست“ میں ایک نوٹ لکھا جس میں نواب بھوپال پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ سلیک کی آواز کو دبانے کے لئے ملک کے لیڈروں کو دعوئیں دیتے ہیں اور قانونی مشورے کے نام پر بیس بیس ہزار روپیہ نذر کیا جاتا ہے جسے رشوت قرار دیا جاسکتا ہے۔

نواب بھوپال نے پنڈت موتی لال نہرو کو بھڑکایا کہ آپ پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو بہم ہوئے، نوٹس دیا، مقدمے کی دھمکی دی لیکن سردار دیوان سنگھ نے کنایہ یہ بھی یہ ظاہر نہ کیا کہ بیس ہزار کے متعلق خبر انھیں پنڈت موتی لال نہرو کے سگے بھتیجے پنڈت شام لال نہرو نے فراہم کی تھی۔

سردار دیوان سنگھ طوائفوں سے سخت متنفر ہیں اور انہیں گنہگار ٹھہرے تشبیہ دیتے ہیں۔ انہیں یہ بھی یقین ہے طوائف کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور ان کے دل میں اخلاص کا گزر ناممکن ہے لیکن جب ان طوائفوں کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو ان کے سامنے آتے ہیں جن سے مظلومیت برہتی ہے، تو وہ ان کے بیان میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

سردار دیوان سنگھ ایک سیلف میڈ آدمی ہیں اور انہوں نے بہت ہی معمولی زندگی سے ترقی کے مراحل طے کئے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ان کی غیر معمولی ذہانت، جرات اور بے خوفی کو دخل ہے لیکن اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ان کی محنت شاقہ کو بھی کچھ کم دخل نہیں جس سے اکثر ذہین لوگ محروم ہوتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل اور ناگوار سے ناگوار ماحول میں کام کر سکتے ہیں اور صلے سے بے نیاز ہو کر۔ جس آدمی میں یہ وصف ہو ناکامی اس کے سامنے ہم حال نہیں ہو سکتی۔

اس کتاب کی دلچسپی اور کشش شک و مشبہ سے بالا ہے لیکن اس سے استفادہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ہی کر سکے گا۔ اسے اگر سرسری پڑھا جائے تو بھی پڑھنے والے کو ایک اچھے سے اچھے ناول سے زیادہ لطف آجائے گا اور اگر کوئی اسے گہری نظر سے پڑھے تو یہ بات بھی دائرہ ممکنات سے باہر نہیں کہ اس کا مطالعہ اس کی زندگی کا رخ بدل دے۔ کم از کم میں نے سردار دپوہن سنگھ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے میرے دل میں اخبار نویسی کی دُھن ان کی تحریریں پڑھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی میں نے انہی سے سیکھی کہ افلاس اور مشکلات کو آدمی کے عزائم کے راستے میں مزاحم نہیں ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ ذہانت کا پودا محنتِ شاقہ کے بغیر بار آور نہیں ہوتا۔

---

# پتھا افسانہ

(جناب عرش لمبیانی ایڈیٹر آج کل دہلی)

”زمیندار“ والے مولانا ظفر علی خاں، ”پتھا اخبار“ والے شیخ محبوب عالم، ”اخبار عام“ والے لالہ گوپی ناتھ، ”دیش“ کے ایڈیٹر لالہ دینا ناتھ اور ہندوستان والے لالہ رام رحیمپال سنگھ شیدا پنجاب کے پڑانے صحافیوں میں ایک خاص شہرت کے مالک تھے ہیں۔ انھیں کے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کی جو صفت آراستہ تھی اس کے پیچروں میں سردار دیوان سنگھ مفتوں کا نام آتا ہے۔ سردار دیوان سنگھ کے اخبار ریاست کا مطالعہ میں کم و بیش اس زمانے سے کرتا ہوں جب یہ جاری ہوا تھا میں نے اس کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور اس کیچ نہاد زلزلے کی ناقہ رشناسی بھی کہ آج یہ اخبار اس منزل میں ہے کہ اس کا مجاہد میرے بند کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔ اس اخبار میں سردار دیوان سنگھ گاہ گاہ اپنے تجربے کی کہانیاں ”ناقابل فراموش“ کے عنوان سے درج کیا کرتے تھے۔ ان کو کتابی صورت میں پہلے بھی شائع کیا گیا تھا۔ اب دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ اردو کی ابھی کتابیں شائع نہیں ہوتیں اور شائع ہوتی ہیں تو کسی نئی پرسد کی نذر ہوجاتی ہیں۔ یہ ضخیم کتاب اردو کے اس نپلے نپار کا کارنامہ عظیم ہے۔ یہ کتاب کہنے کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی لفظیہات کا مجموعہ ہے لیکن یہ ایک مسلسل جنگ دو اور جہاد تھا کا قصہ ہے۔ ایک ایسے جرمی اور مرد دلیر کی داستان ہے جو صحافت و ریاست کے علاوہ جزا و سزا کے بھی میدان کا مہر ہے۔ زندگی کی گوناگوں روزمرہ کے واقعات سے زندگی کے نئے سبق۔ مسلسل اور ان سب کے علاوہ کردار کی لطیفی ان تھوں میں نظر آتی ہے۔ یہ قصے ہندوستان کے ایک عہد کی تاریخ ہیں۔ کتنے مختلف النوع لوگ ہیں جن سے سردار دیوان سنگھ زندگی میں دوچار ہوئے۔ ایسے بھی ہیں اور وزیر بھی۔ ہمایوں قوم بھی اور ہندوستانی طریقت بھی بخلص قسم کے دوست اور جان نثار ہم نشین بھی اور خفیہ پولیس کے افسر بھی۔

والیاست بھی و قرون کے مجاہد بھی، رجعت پسند بھی اور انقلاب دوست بھی۔ آپنے اس کتاب میں کسی شخصیت پر تاثر سے کام نہیں لیا۔ آپ ایک محض ملن انسان ہیں صحافت و ریاست کی خاطر کئی باجیل گئے ہیں لیکن جہاں دیانت و ممانت کا تقاضا ہے آپنے اپنے ہم قدموں کو بڑا بھلا کہا ہے۔ انگریزوں ستوں کی بحیثیت انسان تعریف کی ہے اور مسلمان احباب پر اپنی جان چھڑکی ہے۔ نصف صدی تک جس شخص نے بڑی بے پروائی سے قلم اُڑائی کی ہو اس کا ایک حقہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے یہ بہت ضروری تھا۔ والیان ریاست کے دل جو فتنہ آرائیاں ہوتی رہیں، عیاشی اور لالچابی ہیں کے جو جو مظاہرے ہوتے رہے ان قانون شکنی کے جو جو کجوش واقعات اور تنگ انسانیت حادثات وقوع پذیر ہوتے رہے ان کی نقاب کشائی سردار صاحب نے جس ہمت مردانہ سے کی وہ ہندوستانی صحافت کا ایک اہم باب ہے۔

انھیں واقعات کے اجزا اس کتاب کا موضوع ہیں جس سرگرم زندگی میں آپنے ایسے تجربے حاصل کئے جو خود انھیں اب تک یاد ہیں اور جو شخص انھیں پڑھے اسے بھی یاد رہیں گے۔

مختصر افسانہ نویس اور ناول دونوں کا مزہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ ہر واقعہ جدا گانہ حقیقت رکھتا ہے۔ اس لئے ایک مختصر افسانہ ہے اور افسانہ بھی تھا۔ لیکن تمام واقعات ایک ہی آدمی کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں اس لئے یہ کتاب ایک ناول کا مقام بھی رکھتی ہے۔

کتاب میں ادبیت ہے، تاریخ ہے، داستان عہد حاضر کے تمام عناصر ہیں۔ دو ایسے والوں نے لکھی ہیں جو ادب میں بھی بنا ڈالیں جن سے ہر مرض کا علاج ہو لیکن کسی صحافی یا ادیب نے ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی جس سے ہر ذوق کی تسکین ہو۔

میرے ایک دوست ایک دن تشریف لائے بزم ترنا قابل فراموش کے کچھ اور اوراق تھے جو میرا چمکے لکھنے کے لئے میں نے ٹرنا سے طلب کئے تھے۔ پہلے ہی صفحہ پر عنوان تھا ”طوفانوں سے نفرت“ وہ دھوکھا اٹھے اور کہنے لگے کہ کون بد ذوق ہے جس نے کہا یہ سردار دیوان سنگھ مفتوں میں۔ انھوں نے کہا یوں نہیں کہہ دیا ہو گا۔ مجھے ان کی خوش ذوقی پر پورا اعتماد ہے۔



## کام سے محبت

ایڈیٹر ”ریاست“ کا دھن حافظ آباد و ضلع گوجرانوالہ ہے۔ یہ وہاں کے ایک کھنہ کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہوا۔ خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں۔ اور بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کے والد اپنے زمانہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ جو بنوں، سیالوالی اور جہلم وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی جب والد کا انتقال ہو گیا۔ اور تیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے۔ کیونکہ والد نے اپنی کامیاب زندگی میں کافی روپیہ پیدا کیا تھا۔ مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکانات پر قبضہ کر لیا۔ اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریات زندگی اور بڑے بھائی اور بہنوں کی چارہ شادیوں پر روپیہ صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیٹر ”ریاست“ کی عمر جب بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑوں کے تھان لاکر خریداروں کو دکھائے جائیں۔ اس ملازمت کے دو واقعات مجھے یاد ہیں۔ جن کا میرے کیرئیر پر بہت نمایاں اثر ہوا۔ یہ دکان ہندو بزاز کی تھی۔ اور اس دکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی اور اس کا جوان بیٹا کام کرتے تھے۔ یہ باپ اور بیٹا حافظ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک روز چند دن کے لئے باپ کسی شادی میں شریک ہونے اسٹے گاؤں گیا۔ تو اپنی غیر حاضری کے دنوں کے لئے اپنے بیٹے کو چند کپڑے سپرد کر گیا۔ تاکہ ان کو وہ تیار کر سکتے۔ بوڑھا درزی جب واپس آیا۔ اور اس نے بیٹے کے تیار کئے ہوئے کپڑوں کو دیکھا تو ان میں کسی بچے کا سبز رنگ کی نخل کا ایک کوٹ بھی تھا جس کو بیٹے نے بجائے سبز رنگ کے تانے کے سفید تانے سے سیاہ کیا۔ اس غلطی کو دیکھ کر بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کے منہ پر زور سے تھپتھپا دیا۔ اور کہا کہ نالائق تو دیہات کے رہنے والے جاٹ کے (ٹکے) جس کا کوٹ سیاہ تھا، پر رحم نہ کرنا مگر اس نخل پر تو رحم کرنا۔ جس کا ستیاناس کر دیا۔ چنانچہ بوڑھے باپ نے نخل کے اس کوٹ کی بٹائی کو کھولا۔ سفید تانے نکالے اور سبز تانے سے سیاہ کیا۔

اس واقعہ کا میری طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ چاہے میں نے چھ روپیہ تنخواہ لی یا بارہ روپیہ۔ یا دوسرے روپیہ اور چاہے ملازمت کی یا خود اپنا کام کیا۔ تمام زندگی ہمیشہ کام کو دیکھ کر کام کیا۔ نہ کہ اس کے معاوضہ کر۔ ہمیشہ بارہ گھنٹے سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کیا۔ چاہے تنخواہ کچھ ہی ملتی تھی۔ اور شاید ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہوا جو کہ کسی کام کو کرتے ہوئے اس پر پوری توجہ نہ دی ہو۔ غرض میرے کیرئیر پر اس واقعہ نے بہت بڑا اثر کیا۔

## طوائفوں سے نفرت

بزاز کی دکان کی اس ملازمت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس دکان کے بائیل سائیدو قریب ٹیٹن

رہتی تھیں۔ اور یہ ملوا تھیں ادنیٰ اور اوزان قسم کی سیلی اور گندی تھیں۔ دکان پر آتے جاتے اور کام کرتے ہوئے ان ملوا تھوں کو دیکھتا کہ یہ کیونکر چار چار آٹھ آٹھ آٹے کے لئے اپنے تعمیر کو فروخت کرتی ہیں۔ کتنے گندے اور سڑے ہوئے لوگ آتے ہیں۔ جن سے یہ بناوٹی شکر اسٹ کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ ان کے جاسنے کے بعد ان کو پودوں سمجھ کر ان کے غذائے باتیں کرتی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر شرمناک بیاروں میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اس دکان پر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان ملوا تھوں سے نفرت اور خفاوت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں کا نتیجہ یہ ہے کہ میں انہی جھانٹ اور خوش سلیقہ ملوا تھ کا گمان تو سن سکتا ہوں اور موسیقی کی اس ٹھکان میں بھی بیٹھ سکتا ہوں جہاں کوئی بلند معیار ملوا تھ کا رہی ہو مگر پیشہ ور عورتوں کے بازار یا محل میں سے مڑھیں گزرتے ہوئے بھی اتنی ہی ٹھیکہ نہ ہوتی ہے جتنی کہ پافانیا گندگی کے ڈھیر کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ اور اس کی وجہ بچپن کے وہ تاثرات ہیں جو پیشہ ور عورتوں کے حالات دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے۔

## خود داری کا گیر بیٹھ

”ریاست“ جاری ہو چکا تھا۔ اور دفتر ”ریاست“ پریٹر کے میدان کے قریب سڑک پر تھا۔ ایک دن ایڈیٹر ”زمین و آسمان“ اچانک میں سونے کے ٹن لگائے تشریف لائے۔ اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فرمایا کہ کرنل امریک سنگھ اسے ڈی۔ سی ہمارا چٹالہ دینا چاہتے ہیں میں نے جواب دیا ”اچھی بات ہے۔ بل لوگ“ چنانچہ اسکے وہ کرنل امریک سنگھ دوجی پیر آف پرنس کے دفوں میں ہمارا چٹالہ کے ساتھ لنگڑے کے کپڑوں میں مقیم تھے) دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے۔ اور آپ نے ڈی گنٹار کے بعد کہا کہ مجھے ہمارا چٹالہ دینے بھیجا ہے۔ ہمارا چٹا معام ہوا ہے کہ ایڈیٹر ”ریاست“ کا بطور ایک دوست ہمارا چٹا بہت بہت اثر ہے۔ ہمارا چٹالہ کہ ہمارا چٹا بھی کی گدی سے دستبرداری کا یہ حذر ضرور ہے۔ اور ہمارا چٹالہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر ”ریاست“ ہمارا چٹالہ اور ہمارا چٹا ہم کے درمیان صلح کے متعلق بات چیت کرے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے جواب دیا کہ اگر صلح ہو جائے تو اس سے زیادہ بہتر کیا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر ”ریاست“ رات کی گناہی سے ڈیرہ دون گیا۔ ہمارا چٹا ہم سے ملا کرنل سردار امریک سنگھ کا آنا اور ہمارا چٹالہ کا بیخام بیان کیا اور کہا کہ ہمارا چٹالہ مطاقی مانگنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ ہمارا چٹا ہم نے تمام واقعات شے کے بعد جو الفاظ کہے۔ وہ میرے کانوں میں آپ تک گونج رہے ہیں۔ وہ یہ تھے۔

”یہ تو ممکن ہے کہ ہمارا چٹا تھک سکتی، افلاس اور فرحت کے باعث گداگری اختیار کرے۔

اس کے پاس نہ کھانے کے لئے کچھ ہو۔ اور نہ رہنے کے لئے مکان۔ دن کو ڈیرہ دون کی سڑکی

کوٹ کر روٹی حاصل کرے۔ اور رات کو گوردارہ رام رائے دوجی ڈیرہ دون میں ہے۔ اس کے

برادر سے میں بڑے سوسہ ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی خود داری کو جواب دے کہ وہ ہمارا

چٹالہ سے ہاتھ بلائے“

اسی جواب کو سن کر ایڈیٹر "ریاست" رات کو ڈیرہ دون سے سوار ہوا صبح دہلی پہنچا۔ کزن امریک سنگھ منتظر تھے۔ جن کو پیغام کا جواب سن دینا چاہیہ گیا۔ اس جواب کا کزن امریک سنگھ اور ایڈیٹر "ریاست" دونوں کو افسوس تھا۔ مگر اس واقعہ کا میرے کیرئیر پر یہ اثر ہوا کہ میں نے بعد زندگی میں کم ہی ایسے واقعات میں جب خود داری کو جواب دے کر ایڈیٹر "ریاست" کیسی دشمن کے ساتھ جھگڑا ہے۔ چنانچہ جواب بھیج دیا کہ اس مقدمہ میں میرے اس کیرئیر کے بہت بڑا پارٹ ادا کیا۔ اور چھ برس کی مقدمہ بازی میں قدم آگئے ہی بڑھتا گیا۔

## اعتماد کشتی جرم ہے

پنجاب کے مارشل لاء کے بعد لاہور میں کانگریس کی طرف سے تحفہ قاتی کیٹیج قائم ہوئی۔ چارٹن مونی اور ہیرد اور پنڈت مالویہ جیسے بڑے بڑے لیڈروں کے علاوہ ہمارا گاندھی بھی تھے۔ اور شاہنشاہی شروع ہوئیں۔ سردار سردول سنگھ کو کیشور شاہنشاہی میں حصہ کر لینے کے خالصہ کلاں کے ایک لڑکے نے سردار سردول سنگھ کو بتایا کہ امرتسر کے واقعہ جلیب انار کے بعد جب خالصہ کلاں کے طلباء نے ہرنال کر دی اور غم وغصہ کا اظہار کرنے کے لیے کشتی کی شکل اختیار کی۔ تو اس شہر کو سن کر سردار ورن (انگریز پرنسپل) لڑکوں کے پاس آئے۔ اور ان کو قتل دیتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ وہ چند دستاویزوں کے بغیر خواہیں۔ اور جنرل انر نے کوئی چلائے سے پٹ جلیب امرتسر کے تمام پور میں کو بیٹھا کر کہہ کر ان کے متعلق رائے لی تھی۔ تو میں (یعنی سردار ورن) نے جنرل ڈائری سے صاحب الفاطن کو کہا تھا کہ اس انار کے فیصلے کو شادیگ راندھا دھند گولی چلائے) کو بغیر پست نہیں کرتا۔

سردار سردول سنگھ کو اپنے لیے توجہ بہت خوش ہوئے۔ نور پنڈت مالویہ کے پاس پہنچے۔ اور کہا کہ سردار ورن انگریز ہیں۔ انگریزوں کا کیرئیر کچھ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ہوسکتے۔ اگر سردار ورن کو تحقیقاتی کمیٹی میں طالب کیا جائے تو وہ یقیناً کر دیں گے کہ وہ اس وقت بھی اس خونریزی کو اندھا دھند سمجھتے تھے اور جان بوجھ کر مذہب دیتے تھے۔ اور افسوس ہے یہ الفاظ طلباء کے سامنے کہے تھے۔

سردار سردول سنگھ نے سردار ورن کے الفاظ سن کر پنڈت مالویہ بھی بہت خوش ہوئے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ راقم الحروف داہریٹر "ریاست" میں جس وقت سردار سردول سنگھ کے ساتھ تھوڑا بھلا پرپس کے نمائندہ کے زمرہ میں شامل ہوں ایڈیٹر "ریاست" (اور ہر کے ایک اخبار میں کام کرتا تھا) امرتسر جائے۔ اور سردار ورن سے ٹھیک کر کے بیان لے۔ اور وہ بیان اخبارات میں شائع کیا جائے تاکہ بطور عبادت کام میں لایا جاسکے۔

اس مشورہ کے بعد پنڈت مالویہ اور سردار سردول سنگھ جاتا گا ندھی کے پاس گئے۔ تمام واقعات بیان کئے اور چاکر جاتا جی بھی اس سکیم کے ساتھ متفق ہوئے۔ پنڈت مالویہ اور سردول سنگھ کا بیان سن کر جاتا گا ندھی نے جہاں الفاظ کہے وہ یہ تھے۔

"سردار ورن نے انگریز اور جلیب لڑکوں سے یہ بات کہی تو یہ ایک قسم کا اتنا پراعتا دیکھا سردار ورن کے اس اعتماد کے ساتھ ہمارا اختاری کرنا اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا بڑی بات ہے۔ اس لئے

میں اس سکیم کے ساتھ متفق نہیں ہوں۔ اور میں کسی قیمت پر بھی مشردادن کے اس اعتماد کا ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہتے۔ جو انھوں نے لڑکوں پر کیا۔

ہمارا گاندھی کے یہ الفاظ سن کر ہندوستان مالویہ اور سردار سردول سنگھ دونوں سن ہو گئے۔ اور کچھ کہہ نہ سکے۔ چنانچہ اس سکیم کو توڑ ہی چھوڑ دیا گیا۔ اور مشردادن کے بیان لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اس واقعہ اور ہمارا گاندھی کے کیریکچر کا راقم الحروف پر یہ اثر ہوا کہ جب کسی نے راز کی بات کہی اور اس کو ہمیشہ ایک امانت کے طور پر چھپائے رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجنوں ہمارا نیوں اور سیکٹات سے اپنے شوہروں اور عزیزوں کے خلاف اطلاعات دیں اور خطوط لکھے۔ ”ریاست“ کے ناظرین اور نامہ نگاروں نے بھی ہندوستان کے خلاف اطلاعات دیں۔ مگر ان خطوط اور اطلاعات کے ناجائز استعمال کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ اور اس مسئلہ پر سوچنے کو بھی ہمیشہ کبینہ میں سمجھا۔

## محنت کی عادت

ریاست نامہ کی قیادت سے ایک سال پہلے ایڈیٹر ”ریاست“ اور خواجہ حسن نظامی دونوں نے مل کر پہلی سے ایک روزانہ اخبار ”رجسٹ“ جاری کیا۔ اخبار بہت اچھا تھا۔ ارٹھانی سوردھیہ ایڈیٹر ”ریاست“ نے بطور حصہ دینے اور فیصلہ ہوا کہ باقی روزیہ خواجہ حسن نظامی لکھائیں گے۔ (ایڈیٹر ”ریاست“ اپنے کھانے کے لئے ایک ہیہ روز یعنی تیس روزیہ ہوا سے زیادہ نہ لے گا۔ خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے اشتہار کا ایک صفحہ ہر روز محنت چھپے گا جس کی اجرت ادا نہ کی نہ جائے گی۔ اس کے بعد اگر منافع ہوگا تو دونوں کا سادی ہوگا۔ اور اگر نقصان ہوگا تو خواجہ حسن نظامی پورا کریں گے۔ یہ اخبار چند ماہ جاری رہا۔ جب خواجہ حسن نظامی کو اس میں چھ سو روپیہ سہ کے قریب نقصان ہوا۔ تو آپ نے اس کو بند کر دیتے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ایڈیٹر ”ریاست“ کے لئے افسوسناک تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ لیگ کی کیر اخبار زندہ رہے۔ لاہور شام لال کپور ایڈیٹر ”گورو گشتال“ کو لاہور تار دیا۔ وہ آئے۔

ان کے پاس بھی سرباہر نہ تھا۔ وہ چند روز بھی نہ چلا سکے۔ پھر جیتنیش چندر صاحبین الحق صاحب نے اور بعد میں اس کو لاہور احمدی صاحب ایڈیٹر ”نظام المشرق“ نے لے لیا۔ واحدی صاحب کے پاس ”رجسٹ“ بھانسنے کے بعد اس کا دفتر بھی واحدی صاحب کے مکان میں چلا گیا۔ ایڈیٹر ”ریاست“ اتنے مالکان کے بدلنے کے بعد بھی مسلسل محنت سے کام کرنا رہا۔ تاکہ اخبار کا بیانی سے چل جائے چنانچہ راقم الحروف واحدی صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں ہی دجہاں کو دفتر تھا۔ رہتا۔ بازار سے کھانا منگا لیتا۔ اور اٹھارہ اٹھارہ گندھڑ کام کرتا۔ ایک دن شام کو دفتر کے تمام لوگ چلے گئے۔ مگر راقم الحروف کام کرتا رہا۔ کام کرتے کرتے رات کے دس بج گئے تو واحدی صاحب اتفاق سے اپنے دو بیٹے بھتیجے سے پیشاب کرنے کے لئے دفتر کے حصہ میں آئے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بیٹی بیٹھا کام کر رہا ہے۔ آپ یہ دیکھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے پھر ایک بجے آپ کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ وہ تشریف لائے۔ تو آپ نے دیکھا کہ میں پھر میز پر بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ چنانچہ آپ کو کہے اندر میری پیشاب کے قریب آگئے اور پوچھا کہ اس وقت تک کام کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کام موقوف تھا۔ اس لئے کہ ہاں کام باقی جو۔ تو اطمینان نہیں ہوا۔ اس کے بعد بائیں شروع ہوئے۔ واحدی صاحب میری باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔ آپ نے

باتوں باتوں میں پوچھا کہ اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہو صبح سویرے نکلنے ہی بیٹھ جاتے ہو۔ اب رات کے ایک بجے تک کام کر رہے ہو میں نے جواب دیا کہ انسان کی کامیاب زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سخت محنت کا عادی ہو۔ اور اپنی زندگی میں بہت کام کرے۔ واحدی صاحب نے پھر سوال کیا۔ کہ کامیاب زندگی کا معیار کیا ہے۔ اور کامیاب زندگی کس کو سمجھتے ہو میں نے اس سوال کا جواب دیا وہ مجھے اور واحدی صاحب دونوں کو اب تک یاد ہے جس نے کہا:

”میں کامیاب زندگی اس شخص کی سمجھتا ہوں۔ جب وہ مرے تو چند لاکھ روپیہ نقد چھوڑے۔ اور چند ہزار آدمی اس کے جنازہ کے ساتھ ہوں۔“

زندگی کی کامیابی کا یہ معیار اب بھی میرے ذہن میں وہی ہے۔ جو ”حیثیت“ کے زمانہ میں تھا۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کامیابی کہاں تک ہوئی یا کب ہوگی۔ بہر حال اگر کوئی شخص کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس کا معیار یہی ہونا چاہئے کہ وہ مالی اعتبار سے لاکھوں روپیہ پیدا کرے (چاہے اس روپیہ کو خیرات کرنے یا ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرے) اور جب مرے تو ہر عزیز و اقارب مقبولیت کے اعتبار سے ہزار ہا لوگ اس کے جنازہ کے ساتھ ہوں۔

## کامیابی کے لئے مضبوط قدم کی ضرورت

ایڈیٹر ریاست نے مونگا سے مستعفی ہونے کے بعد افسہ ریاست پیشالہ میں میڈیکل کالج میں شروع کر دی۔ آنکھوں کے یعنی موتیا بزرگ کثرت کے ساتھ ادپریشن کئے۔ اپنا ہسپتال جاری کیا۔ جہاں انڈیا بھی ہوتے اس زمانہ میں راقم الحروف کی آمد تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان تھی۔ اخبارات اور رسائل کے پڑھنے اور نامور مصنفین نگاروں، ایڈیٹروں اور شعرا سے ملنے اور ان سے خط و کتابت کا بہت شوق تھا، اردو زبان کا شاید کوئی اخبار رسالہ یا کتاب ایسی ہوگی جس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کرتا۔ اس شوق میں ایک روز مضمون لکھا جو لاہور کے اردو مہندس ”خالصہ اخبار“ کو چھپنے کے لئے بھیجا۔ یہ مضمون ایک فرضی ”ایشیٹرنگ فیروز پوری“ کے نام سے شائع ہوا۔ کیونکہ میں اس وقت کرا تھا کہ اگر مضمون اچھا نہ ہوا۔ اور اپنا نام سے چھپا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر اس قدر خوشی ہوئی کہ میان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں نے دو تین اور مضامین اسی نام سے شائع کرنے کے لئے اس اخبار کو بھیجے جو شائع ہوئے۔ ان مضامین کے چھپنے کے بعد بھائی مول سنگھ منیجر خالصہ اخبار کا خط میرے پاس پہنچا جس میں پوچھا کیا تھا کہ فیروز پوری میں کیا کام کرتا ہوں۔ تعلیم کہاں تک ہے۔ آمدنی کتنی ہے کیا خالصہ اخبار کو ایڈٹ کرنے کے لئے لاہور آ سکتا ہوں۔ اور اگر آ سکتا ہوں تو کیا تنخواہ لوں گا۔

اس خط کو دیکھ کر سرت اور حیرانی کے لیے جھلے جذبات کے باعث میری حالت عجیب سی تھی۔ خط کو بار بار پڑھتا تھا غور سے دیکھتا تھا اور خیالی کرتا تھا کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بن سکوں۔ اس خط کا میں نے جواب دیا کہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں۔ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے۔ تعلیم اتنی ہے مگر ایڈیٹر کا مطالعہ کافی ہے۔

میرے اس خط کا جواب سردار مول سنگھ نے یہ دیا کہ وہ ایڈیٹر کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ سو روپیہ تنخواہ دے سکتے

ہیں۔ اور چونکہ میری میڈیکل پریکٹس تین چار سو روپیہ ماہوار کی ہے۔ اس لئے میرے اخبار میں آنے کا سؤل ہی ایسا نہیں تھا۔ اس جواب کے بعد بھی میں کچھ بیتاب سا تھا۔ اور وہ کہ خیال کرتا تھا کہ میں جرنلزم اختیار کر کے لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن پریکٹس سے زیادہ کامیابی نصیب ہو چنا۔ میں نے اپنے ایک محترم خیر خواہ بھگت لکشن سنگھ کی لکھنے والی کتابوں کے مصنف تھے اور جن کو میرے فرضی نام سے بھیجے گئے ان معنائیں کا علم تھا۔ کہ میں نے لکھے ہیں (کو خط لکھا کہ وہ فائدہ اٹھا کر کے مالک مجھے ایڈیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ مگر خود صرف ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے میری موجودہ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے میں اس اخبار میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ بھگت لکشن سنگھ کا جواب آیا۔ اس کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اور شاید میں زندگی بھر انہیں نہ بھولی سکوں کیونکہ یہی الفاظ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ آپ نے لکھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے قلم میں غیر معمولی قور ہے۔ یہ غیر ممکن نہ ہوگا کہ تم بطور جرنلسٹ کامیاب ہو جاؤ۔ میری رائے میں جرنلزم اختیار کر کے دیکھنا چاہئے کہ تم کس میں کامیاب ہو سکتے ہو“

اس خط کے پچھلے کے بعد میں نے بجائی مول سنگھ کو خط لکھا کہ میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر ہی آنے کے لئے تیار ہوں۔ ان کا جواب آیا کہ آ جاؤ۔ چنانچہ میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس کو چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماہوار پر چلا گیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار مول سنگھ سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے لاہور آنے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے اور میں پوشیدہ طور پر اخبار کو پیش کر دوں گا۔ میرے اپنے آپ کو چھپانے کی خوش عورت پر بھی کوئی ناگہانی سے خوف زدہ تھا۔ اجرت دینا تھا اگر ناکام ہوا تو دوست اسباب مذاق آڑا دیں گے۔

مختلف اخبارات کو میں شاید چار ماہ ایڈٹ کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اخبار میں زندگی پوریا ہو گئی۔ ہر شخص ایڈیٹر میں معنائیں کا دماغ تھا مگر مجھے قانون سے ڈار کیفیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس چار ماہ میں مالک اخبار سردار ہر چند سنگھ رئیس لائل پور اور سردار مول سنگھ پرنسپل پشاور فوجداری مقدمات دائر ہو گئے۔ ان مقدمات میں ایک مقدمہ سردار امر سنگھ ایڈیٹر ”شیر پنجاب“ نے بھی کیا۔ جن کے خلاف معنائیں لکھے گئے تھے۔ چنانچہ میں ان مقدمات کے باعث فیصلہ کر لیا کہ میری زندگی کا یہ وقت بہت نازک تھا۔ میڈیکل پریکٹس چھوڑ چکا تھا۔ فائدہ اٹھانا سا جاز سے ملجھ کر نہ کیا گیا۔ دوسری کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہ ہوا۔ اور لاہور میں ہی بہت تھوڑی مدت ہی گزری۔ ایک اخبارات میں کام شروع کر دیا۔ لاہور کے اخبارات میں مجھے کام کرنے ہوئے۔ کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز میں نے مرحوم لالہ لٹم چیمبال سنگھ صاحب شیدا ایڈیٹر ”مقدس دستان“ سے پرچہ آ کر دو جرنلزم میں سب سے زیادہ لائق کون سا صاحب ہیں۔ آپ نے فرمایا: سبحانہ! تمہارے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ایڈیٹر شیدا صاحب بلوچر ”بدم“ ہیں۔ ان کے طر ف سے شیدا صاحب کو لکھنے کو کہنا کہ مجھے جرنلزم سے کٹھن کا شوق ہے اگر آپ اجازت دیں اور میرے اخراجات کے لئے ہفتہ وار ستر روپیہ دیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ شیدا صاحب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک مہینہ کے بعد میں نے پھر خط لکھا۔ پھر جواب نہ ملا۔ اس بے اعتنائی سے میں مایوس نہ ہوا۔ لکھنؤ کا ٹکٹ لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر سید راجا گوردوارہ میں گیا۔ راجا بطور مسافر ایک کوٹھری میں سامان رکھ لیا۔ اگلے روز صبح اٹھنے پر ”بدم“ کے دفتر میں پہنچا۔ ”بدم“ کا دفتر اس زمانہ حضرت گنج کی ایک بلاٹنگ میں تھا۔ بجڑائی۔ ڈھی۔ ٹی کے ساتھ مشترک تھی۔ کیونکہ دونوں اخبارات کے مالک شیدا مرحوم راجہ صاحب محمود آباد تھے۔ ”بدم“ کے دفتر میں پہنچ کر میں نے سینل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا

نام لکھا اور چٹرائی کے ساتھ سیدہ جالب کے پاس بھیجا۔ سیدہ صاحبہ نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ سامنے کھڑا ہوا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔  
 ”آپ کے دو خط ملے۔ مجھے اندوس ہے کہ میں جواب نہ دے سکا کیونکہ ہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔ اب بھی یہی ہوش  
 ہے۔ مجھے اندوس ہے کہ میں آپ کے لئے متعین نہیں ہو سکتا۔“

میں نے عرض کیا۔ مجھے کام سیکھنے کا شوق ہے۔ چونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ اردو جرنلزم میں ایک لائق ترین شخصیت  
 ہیں۔ اس عرض سے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے لئے تیس روپے ماہوار بھی مقرر کر دیں۔ تو میں اطمینان کے ساتھ  
 آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ سیدہ جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے  
 پھر عرض کیا۔ بلکہ چٹرائی سے مجھے رکھ لیجئے۔ میں چٹرائی سے کلور پر تمام دن کام کروں گا۔ اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم  
 سیکھوں گا۔ سیدہ جالب میری اس درخواست پر حیران تھیں۔ مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس کہ چٹرائی کی بھی کوئی جگہ خالی نہیں  
 یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا۔ کیا آپ کو میرے مصنف کام کرنے پر اعتراض ہے۔ سیدہ جالب نے مسکراتے ہوئے  
 فرمایا۔ مصنف کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دارق الحروف نے اگلے روز سے دفتر ”ہمد“ میں بغیر تنخواہ کام  
 شروع کر دیا۔ گزارہ کے لئے امین آباد پارک کے قریب ایک جنگالی کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت  
 اختیار کر لی۔ دن بھر دفتر ”ہمد“ میں کام کرتا۔ شام کو چھ بجے سے بڑھتے تک اس کیمسٹ کے ہاں رات کو گور دوارہ  
 میں سوتا۔ اور چونکہ قد جسم اور شکل نہ صورت باریع تھی جب کھٹنوں کے بازاروں میں سے گزرتا۔ تو پولیس کے ٹرافک کے سپاہی  
 یہ سمجھ کر سیلوٹ کرتے۔ کہ شاید کوئی نیا سب ٹیکٹر یا انپیکٹر مقرر ہوا ہے۔ کیونکہ پولی کی پولیس میں سبکے کافی تعداد میں اعلیٰ  
 عہدوں پر تھے۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ جس کو سیلوٹ کر رہے ہیں دن بھر ”ہمد“ کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام  
 کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہے۔ اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آٹھ  
 روز سے زیادہ نہیں۔

”ہمد“ اور امین آباد پارک کے کیمسٹ کے ہاں کام کرتے کی خبر مگر گز گیا جن کا ہینہ تھا۔ کھٹن کی گرمی صبح آٹھ بجے  
 ”ہمد“ کے دفتر میں پہنچتا اور دو بجے دوپہر کو پیدل گور دوارہ واپس آتا۔ ایک روز گرمی زیادہ تھی۔ نو لگ گئی تیز بخار  
 ہو گیا۔ گور دوارہ کی ایک کوٹھری میں پڑا تھا کہ گور دوارہ کے گھر گئی تھی۔ پوچھا۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ اپنا حسب  
 نسب بتاؤ۔ تاکہ اگر مر جاؤ۔ تو تمہارے گھر والوں کو اطلاع کی جائے۔ میں نے جواب دیا حافظ آباد و ضلع گوجرانوالہ کا  
 رہنے والا ہوں۔ گھر تھی نے پوچھا کہ کیا اسی حافظ آباد کے جہاں کے سردار گور بخش سنگھ میرٹھ ٹیلی گراف رہنے والے  
 ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ جس گھر تھی نے بغیر میری اطلاع کے سردار گور بخش سنگھ کی سردار گور بخش سنگھ میرٹھ چٹرائی  
 بھائی تھے۔ اور کھٹنوں میں آٹھ سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ پانستھ تھی۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں گور دوارہ میں بیمار ہوں  
 گور دوارہ میں پہنچے دو بجے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا کہ کھٹن کب آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا چند ماہ ہوئے۔ پوچھا  
 کہ اطلاع کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا۔ جب انسان اچھی حالت میں ہو تو بلند پوزیشن کے رشتہ داروں کو  
 اطلاع نہ دینا ہی مناسب ہے۔ سردار گور بخش سنگھ مجھے اپنی کوٹھی لے گئے۔ چند روز علاج کیا اور میں اچھا ہو کر واپس پنجاب آگیا۔  
 ادھر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند جانا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو  
 بیک بکھنے کے لئے تیار رہیں۔ مصداق مثلاً شکلات سے گھبراہٹیں نہیں۔ بلکہ کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں جو ان کی بہتری  
 کے لئے ہو۔ چاہے اس راہ کو اختیار کرتے ہوئے ان کے لئے کتنی بھی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں۔

ایڈیٹر "ریاست" کو شکایت ہے کہ مرحوم سید جالب نے اس زمانہ میں اس کے ساتھ جو سلوک فرمایا، سید جالب ان واقعات کے بعد کئی برس زندہ رہے جب کبھی اپنے وطن دہلی آتے تو دفتر "ریاست" میں بھی تشریف لایا کرتے اور لکھنؤ اور دہلی میں جب کبھی اپنے شاگردوں اور درجنوں کی تعداد میں آتے گاؤں کرتے تو فرمایا کرتے کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کا میاں پر آپ کو غر ہے۔

## خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

روزانہ اخبارات کو ہر روز سینکڑوں تاریخ نویس ایجنسیوں سے مل جاتے ہیں۔ اور ان خبروں کے لئے پبلک کو روزانہ اخبارات کے پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر ہفتہ وار اخبارات میں چونکہ نیوز ایجنسیوں کے کارکن نہیں ہوتے اس لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے لئے ایسی خبریں شائع کریں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں تاکہ روزانہ اخبارات کے پڑھنے والے بھی ان ہفتہ وار اخبارات کو خریدیں۔ کیونکہ اگر روزانہ اخبارات سے کچھ مختلف مواد ہفتہ وار اخبارات میں نہ دیا جائے تو پھر کسی کو ہفتہ وار اخبارات کے خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس اصول کے تحت ہمیشہ یہ کوشش کی گئی کہ "ریاست" چونکہ ہفتہ وار ہے اس لئے اس میں ادبی، تاریخی اور تفریحی مواد کے علاوہ ایسی خبریں بھی دی جائیں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں۔

ایک زمانہ میں "ریاست" کی خبروں کے لئے دوسرے اصحاب کے علاوہ مرحوم مسٹر کے ہی رائے میں جنگ ڈاکٹر ایسی ایڈیٹر ہیں آنت انڈیا اور مرحوم تاحی سر عزیز الدین احمد دیوان دنیا دہشت برے ذرائع تھے۔ تاہم آخر دن کے مرحوم مسٹر رائے کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایڈیٹر "ریاست" ہر دوسرے تیسرے روز شام کو مسٹر رائے سے ملنے کے لئے آپ کی کمرٹی (جہ اندر اہل بین پر مٹی) جاتا۔ اور مسٹر رائے بھی ہفتہ میں ایک دو بار اپنی کمرٹی سے ایسی ایڈیٹر ہیں کے دفتر جاتے ہوئے دفتر "ریاست" میں تشریف لاتے۔ مسٹر رائے آدھ دن جاتے تھے۔ اس لئے ان کو کچھ معلوم نہ ہوتا کہ "ریاست" میں کیا کچھ چھپا ہے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" مسٹر رائے سے بلا وقت باتوں میں ریاست میں اور گورنمنٹ ہند کے متعلق ایسی خبریں حاصل کر لیتا جن کو وہ اپنی ایجنسی کے ذریعہ روزانہ اخبارات کو بھیجتا مناسب نہ سمجھتے اور یہ خبریں "ریاست" کے نوٹوں میں تنقید کے ساتھ شائع کر دی جاتیں مرحوم مسٹر رائے کا اثر گورنمنٹ ہند پر بہت زیادہ تھا کہ کوئی ممبر گورنمنٹ یا سکرٹری ایسا نہ تھا جو سیاست اور میں مسٹر رائے کو گورنمنٹ نہ سمجھتا ہو۔ ہر شخص عزت کرتا تھا۔ داسرائے ہوس میں جب کوئی شکل پیش آتی تو مسٹر رائے کو مشورہ کے لئے طلب کیا جاتا۔ اور بعض دن تو ایسے بھی ہوتے جب مسٹر رائے مشورہ کے لئے داسرائے سے کئی کئی بار ملتے۔ چنانچہ اس راز کا آج مسٹر رائے کے انتقال کے بعد انکشاف کیا جاتا ہے کہ مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کے سلسلے میں مسٹر رائے آٹھ دس بار داسرائے سے ملے۔ اور اس مقدمہ میں نواب بھوپال کے مقابلہ میں جو کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ ان میں کافی جتنہ مرحوم مسٹر رائے کے اثر و اثران کی کوششوں کا تو مسٹر رائے کی ملاقاتوں اور دوستی سے "ریاست" کے لئے خبریں حاصل کرنے کے ایک طویل عرصہ گزرا تھا۔ کسی شخص کو مسٹر رائے سے شکایت کی کہ دیوان سنگھ آپ سے خبریں حاصل کر کے "ریاست" میں شائع کرتا ہے۔ مسٹر رائے



نصف کی ان شکایتوں کی کبھی کوئی پروا نہ کی۔ بلکہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کے بہت معترف تھے اور اس کو صحیح معنی میں جرنلسٹ سمجھتے تھے۔ کریہ باتوں باتوں میں خبریں چل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایک روز سٹرائے کے مذاق سوچا۔ ایڈیٹر "ریاست" جب آپ سے ملنے کے لئے گیا تو آپ نے اپنے ایک اسٹنٹ (مجھے ٹھیک یاد نہیں غالباً سٹری کرشن تھے) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"امریکہ سے جو اطلاع ہمارا ہمدرد کی امریکن بیورو کے حلاق کے متعلق آئی ہے وہ فی الحال اخبارات کو نہ دینے دے۔ دو چار روز بعد بھیجے جائے۔"

اس ہدایت کو دیتے ہوئے سٹرائے نے ایڈیٹر "ریاست" کی طرف دیکھا تاکہ وہ اس میں مذاق کو ناظر نہ جاؤں۔ ملاقات کے بعد میں دفتر "ریاست" پہنچا۔ اگلے روز اخبار شائع ہوتا تھا۔ اس اہم خبر کے متعلق فوراً نوٹ لکھا۔ "ریاست" کا پرچہ چھپنے کے بعد دوسرے روز ایڈیٹر "ریاست" سٹرائے سے ملنے کے لئے گیا۔ تو اس سے پہلے سٹرائے کو وہ پرچہ ان کے اسٹنٹ دیکھا چکے تھے۔ بہت آہستہ پڑا۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا گیا کہ خبر ایک سازش کا نتیجہ یعنی تاکہ مذاق اڑایا جائے۔ کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" سٹرائے سے ملنے دقت باتوں باتوں میں ہمیشہ خبریں چل کر لیتا ہے۔

سٹرائے جب تک زندہ ہے ان کے ذریعہ "ریاست" کے لئے کافی اور بہت اچھا خبروں کا مواد ملتا رہا۔ آپ ہر جرنلسٹ کے لئے مفید تھے کوئی دن ایسا نہ جاتا۔ جب ان کے گھر پر چائے یا ڈنر میں چند جرنلسٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے چند بڑے کام شامل نہ ہوتے ہوں۔ کیا بڑے لطیف زمانہ تھا۔ آہ! وہی کے جرنلسٹ مرحوم سٹرائے کے اخلاص، ہر باری شفیقت اور امداد سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ اور دہلی کے جرنلسٹوں کا حلقہ آپ کی موت سے اب تک ایک قیمتی محسوس کرنا ہے۔

"ریاست" کے لئے خبریں حاصل کرنے کے سلسلہ میں بہت سے واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔ جلد کم ہونے کے باعث آج یہاں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دیا ایڈیٹر "ریاست" پر اس طرح ہر باری فرماتے جیسے بزرگ اپنے عزیزوں پر آپ ہمیشہ میں ایک آدھ بار دہلی ضرور آتے۔ آپ کا اثر پبلیک ڈیپارٹمنٹ پر بہت تھا۔ ہر انگریز افسر آپ کو بزرگ اور خیر خواہ سمجھتا اور درجنوں دایان ریاست آپ سے سفارشیں کراتے۔ آپ جب بھی دہلی تشریف لاتے۔ ٹیشن پر آتے ہی ریلوے انڈسٹری آفیس سے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلی فون کرتے کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔ قاضی صاحب سے ملنے کا بہترین وقت صبح پانچ بجے سے سات بجے تک تھا۔ آپ علی الصبح چار بجے بیدار ہوتے۔ اس وقت ہی ان کے خاص خاص دوست ملنے کے لئے پہنچ جاتے یا نہیں کرتے ہیں دانت صاف کرتے۔ جامت بنواتے واقعی صاحب مرحوم بہت وضع دار بزرگ تھے۔ دہلی میں آپ کی جامت کے لئے ساہا سال سے دہی جام آتا۔ جس نے کنگ عارج۔ کنگ ایڈووڈ۔ درجنوں وائسرائوں۔ کمانڈر انچیفوں۔ ممبران انتظامیہ کونسل اور کنگ حبیب اللہ آف افغانستان وغیرہ کی جامت بنائی تھی۔ مجھے یاد ہے اس جامت کو قاضی صاحب ہر روز جامت بنواتے کے بعد پانچ روپے دیا کرتے، منہ ہاتھ دھوتے۔ خطوط لکھواتے۔ اور دوسرے کام کرتے۔ ایڈیٹر "ریاست" کا معمول تھا کہ جب تک قاضی صاحب دہلی میں قیام کرنے صبح پانچ بجے ان کے کمرہ میں سیل ہوٹل پہنچ جاتا۔ اور سات بجے تک

وہاں ہوتا پھر شکم کبھی کبھی پانچ چھ بجے اپنی کار میں قاضی صاحب کو سیر کے لئے نئی دہلی وغیرہ لے جاتا۔ صبح کے دو گھنٹہ میں قاضی صاحب اپنے پچھلے دن کی تمام مصروفیات اور دالیان ریاست و پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے حالات بیان کرتے رہتے جو ریاست کے کسی صنفوں کے لئے کافی مواد ہوتا۔

ایک دن قاضی صاحب نے فرمایا کہ آپ ڈپٹی سیکریٹری پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کو ڈمنٹ ہند کے ہاں چائے پر گئے تھے۔ دلیا توں باتوں میں ڈپٹی سیکریٹری نے بتایا کہ ذاب بھوپال جب ولایت گئے۔ تو ذاب صاحب نے بطور چانسلر دالیان ریاست وزیر ہند سر سیوہیل ہود سے درخواست کی کہ اخبار ریاست سے دالیان ریاست بہت تنگ ہیں۔ اگر مسکوئی قانون اخبار ریاست کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے کافی نہیں۔ تو داسٹر نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ ہی اس اخبار کو بند کر دیں۔ سر سیوہیل ہور نے داسٹر کے کوکھا کو ذاب بھوپال کی یہ خوبش ہے۔ مگر گورنمنٹ ہند نے اس کے خلاف راستے ہی اور وزیر ہند کو لکھا کہ ذاب بھوپال اور ایڈیٹر ریاست کے ذاتی جھگڑے ہیں گورنمنٹ کو ان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ ایڈیٹر ریاست نے اس واقعہ کو کہ ذاب بھوپال نے وزیر ہند سے کیا کہا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا ریاست میں شائع کر دیا۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ بھوپال کے حلقہ میں پچھل سی پیدا ہو گئی۔ مرحوم کرنل امیر احمد طری سیکریٹری ذاب بھوپال دہلی لائے اور سر چارلس داسن پولیسکل سیکریٹری سے لے۔ اس رائے کے خیر کے شائع ہونے کے خلاف سخت پریوشٹ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے دلی گورنمنٹ کو لکھا کہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف آفیشل سیکرٹ ایکٹ (قانون رازداری) کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے۔ اس زمانہ میں دلی کے چیف کٹشنر سر جان تھا جس نے تھے۔ آپ پانچ سال تک پولیسکل سیکریٹری گورنمنٹ ہند رہ چکے تھے۔ اور تمام دالیان ریاست کے اعمال سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ ریاست کے بہت بڑے راج تھے آپ نے گورنمنٹ ہند کو جواب دیا کہ یہ اتنا اہم معاملہ نہیں کہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ صرف تنبیہ کافی ہوگی۔ چنانچہ تنبیہ یعنی وارننگ کے لئے آپ نے ڈپٹی کٹشنر کو ہدایت کی۔ ڈپٹی کٹشنر کا حکم ایڈیٹر ریاست کے پاس پہنچا کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت ڈپٹی کٹشنر کی کوٹھی پر پہنچو۔ ایڈیٹر ریاست جب دہاں گیا تو ڈپٹی کٹشنر نے کہا کہ یہ خبر غلط ہے اس لئے آپ کو وارننگ دی جاتی ہے کہ آئندہ ایسی خبریں شائع نہ کرو۔ ایڈیٹر ریاست نے جواب دیا کہ خبر تو بالکل درست ہے۔ ہاں وارننگ دینا آپ کا فرض ہے۔ چنانچہ اس وارننگ سے اس مقدمہ کا خاتمہ ہوا۔

ان اوپر کے دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک جرنلسٹ کے لئے خبریں چل کر ناکٹنا شکل ہے۔ کوئی خبر حاصل کی جائے تو اس کو شائع نہ کرنا اور صبر سے اس کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ایک اخبار نویس کے لئے کتنا تکلیف کا باعث ہے۔ اور خبریں چھپنے کے بعد کیونکر مقدمات دائر کیے جاتے ہیں۔

## کام کرو روپیہ کی کمی نہیں

بعض لیڈر اور اخبار نویس زندگی بھر روتے رہے اور پبلک پر قدر ناشناسی کا الزام لگا کر ہمیشہ ہی چلاتے رہے کہ روپیہ نہیں۔ کام کیونکر کریں۔ مگر اقم الحروف کا صرف اپنی ذات کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے تمام لیڈروں اور اخبار نویسوں کے متعلق بھی یہ تجربہ ہے کہ اگر اخلاص اور ایمان داری کے ساتھ کام کیا جائے تو پبلک روپیہ کی

قتیلیان اور کرنسی نوٹوں کے بنڈل لے کر کام کرنے والوں سے درخواستیں کرتی ہے کہ قبول کر لو۔ اور اگر کوئی لیڈریا  
 اخبار نویس خود غرض ہو تو وہ روپیہ کے لئے لوگوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے گزاس کر دوئی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں  
 ہوتا۔ آپ دیکھئے کیا ہاتھ لگا رہی۔ پنڈت جو امر لال مسٹر جناح۔ ماسٹر آرا سنگھ یا دوسرے مخلص کام کرنے  
 والوں کو پبلک کام کے لئے بھی بھی روپیہ کی کمی ہوتی۔ اور اگر کبھی انھوں نے ہاتھ پھیلا تو کیا لاکھوں اور کروڑوں روپیہ  
 ان کے پاس نہیں پہنچ گیا۔ ان لیڈروں کو بھی چھوڑ دئے مولانا ظفر علی خاں جیسے اخبار نویسوں کو شروع شروع میں پبلک  
 نے کتنا روپیہ ضمانتوں کے لئے دیا۔ ہمارے اس لکھے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کام کرنے والے لوگ اپنی ذاتی اغراض  
 سے بلند رہ کر اخلاص کے ساتھ پبلک کا کام کریں تو ان کو روپیہ کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ اور اگر مقصد پبلک روپیہ سے  
 ذاتی جائیدادیں بنانا ہو تو پھر پبلک سے روپیہ کی توقع کرنا بے انصافی ہے۔ پبلک روپیہ کیوں دے۔

”نیاست“ جب جاری کیا گیا۔ تو ایڈیٹر ”نیاست“ کے پاس کل سرمایہ ڈیڑھ ہزار روپیہ تھا۔ اور یہ ڈیڑھ ہزار روپیہ  
 مرحوم سردار کبیر سنگھ کلسی ٹھیکہ دار کی معرفت انبالہ چھاننی کے ایک بٹے کے پاس زیور رکھ کر قرض لیا گیا تھا۔ یہ  
 پندرہ سو روپیہ تو غالباً تین ماہ کے اندر صرف ہو گیا۔ اس کے بعد درجنوں مالی پریشانیوں میں آئیں۔ اور ان پریشانیوں  
 کی وجہ روپے کو بید روی کے ساتھ صرف کرنا تھا۔ کیونکہ ایڈیٹر ”نیاست“ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ ورنہ اتویہ ہے  
 کہ ”نیاست“ کو آج تک کبھی نہ روپیہ کی کمی محسوس ہوئی۔ اور نہ روپیہ دینے والے قدر دانوں کی۔

کئی برس کی بات ہے ”نیاست“ کو جاری ہونے شاید چار ماہ ہوئے ہوں گے۔ دفتر ”نیاست“ جامع مسجد کے باطل  
 سانے پچھلی دلالان بازار کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک بار عرب جسم مسلمان سوٹ پہنے تشریف لائے  
 ان کے ساتھ دو ملازم بھی تھے۔ ایڈیٹر ”نیاست“ نے سمجھا کہ شاید پولیس کے کوئی افسر ہیں۔ اور وارنٹ لے کر آئے ہیں۔  
 آپ نے آتے ہی پوچھا کہ سردار دیران سنگھ کہاں ہیں۔ راقم الحروف نے جواب دیا۔ فریاضے میں ہی دیوانہ سنگھ ہوں۔  
 میرے پاس کا کتب اور دفتر کے مشاف کے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔  
 دفتر کا ایک ہی بڑا کمرہ تھا جس میں ان کو رہا رہا میں لے گیا۔ وہاں ہم کھڑے تھے کہ آپ نے اپنے حبيب سے ایک بندھا  
 نکال کر بٹھے دیا اور کہا۔

”میں آپ کے اخبار کا ایک مسرت ہوں۔ یہ لفاظ آپ کے اخبار کی امداد کے لئے ہے۔“

میں نے پوچھا آپ کو نصاب صاحب ہیں۔ اور وہی کیسے تشریف لاتے ہیں۔ آپ نے بتائے سے انکار کر دیا۔ اور چلے گئے  
 اس واقعہ کے ایک سال بعد معلوم ہوا کہ آپ ریوی کے ایک خان بہادر اور ڈپٹی کلکٹر بنشتر تھے۔  
 ایڈیٹر ”نیاست“ پر نوٹس کا مفور مہل ملا تھا۔ لاہور سے ایک خط پہنچا جو ایک مسلمان نوجوان کا تھا۔ اس میں  
 لکھا تھا کہ اگر روپے کی ضرورت ہے تو کھو کتنا روپیہ چاہئے۔ میرا خیال ہے اس زمانہ میں تو میں نے جواب نہیں دیا  
 تھا۔ اس کے بعد جب ”نیاست“ کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام ہو رہا تھا۔ اور کبھر ہوئے کاغذات درست  
 کر رہا تھا۔ تو یہ خط نظر سے گزرا۔ ان کو لکھا کہ آپ کو نصاب صاحب ہیں۔ اور آپ کے لکھے کا مقصد کیا تھا تو معلوم  
 ہوا کہ آپ کا نام شیخ محمد عمر ہے۔ لاہور میں چہرے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور ”نیاست“ کے پڑانے مسرت ہیں۔ چنانچہ  
 جب آپ کو معلوم ہوا کہ ”نیاست“ پھر جاری ہونے والا ہے۔ تو آپ نے امپیریل بینک کا ایک ڈرافٹ بھیجا۔  
 جو معقول رقم کا تھا۔ میں ان صاحب سے آج تک نہ کبھی ملا ہوں۔ اور نہ ان کو جانتا ہوں۔ ان کے خط سے معلوم

ہوا کہ یہ خود ان کی والدہ اور ان کے گھر کے دوسرے لوگ "ریاست" کے مخزن ہیں۔

لوگوں کا مقدمہ چل رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ایک دوست ملے۔ انھوں نے فرمایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فلاں بڑے افسر جو خطاب یافتہ سر ہیں، ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا کام ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کام کا تو علم نہیں۔ ملنا چاہتے ہیں۔ میں دوسرے یا تیسرے روز ان صاحب سے ملنے گیا۔ مقدمہ کے حالات پوچھتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ جب چلنے لگا تو آپ نے ایک ہند لفاظہ دیا۔ اور کہا۔ کہ مقدمہ کے باعث روپیہ بہت خرچ ہو رہا ہوگا۔ یہ دوستانہ ہدیہ ہے میں نے بار بار انکار کیا۔ آپ نہ مانے۔ آخر آپ نے کہا۔ کہ اگر نہ لوگے۔ تو بھست تکلیف ہوگی۔ یہ کہتے ہوئے لفاظہ آپ نے میرے کوشے کی جیب میں زبردستی ڈال دیا۔

ستمبر تک وہ یہی چل رہا ہو کر آیا۔ اور اخبار جاری کرنے کی کوشش میں تھا۔ تو دریا گنج ایک جرنلسٹ دوست سے ملنے گیا۔ وینک باتیں ہوتی رہیں۔ اور جب چلنے لگا تو آپ نے جو الفاظ کہے ان کو میں شاید آئندہ زندگی میں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔ آپ نے فرمایا۔

”پچھلے زمانہ میں ایک بہت بڑا ٹیگہ ہوا۔ جس میں لاکھوں یا کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ ایک کوڑا اپنی چوہچ میں ایک چاول لے آیا اور اس ٹیگہ میں ڈال دیا تاکہ ٹیگہ کی خدمت اور سعادت سے محروم نہ رہ جائے "ریاست" کا دہارہ جاری ہونا بھی ایک ٹیگہ ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اس کے لیے یہ رقم قبول کر لیجیے۔“

خلوص و محبت کے ان الفاظ کو سن کر مجھ پر ایک ناقابل بیان کیفیت سی طاری ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ان الفاظ کی قیمت کروڑوں روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ میں روپیہ نہیں لیتا۔ آپ نے بار بار زور دیا اور میں انکار کرتا ہوا چلا آیا۔ آپ پھر بھی باز نہ آئے اور آپ نے اپنے دفتر کے ایک آدمی کے ہاتھ چیک بھیج دیا۔

میری زندگی میں اس رقم کے دو چار دس ہیں نہیں سینکڑوں واقعات ہیں۔ کہ دوستوں اور معترفین نے چاہے ان سے کبھی ملا ہوں یا نہیں فراخ دل کے ساتھ "ریاست" کی امداد کی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب حیل سے باہر آیا تو خیال تھا۔ کہ اخبار کو دوبارہ جاری کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اور اس روپیہ کے لئے اپنے وطن کی ایک زمین کو فروخت کر دوں گا۔ اس زمین کا ابھی سودا ہی ہو رہا تھا۔ فروخت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اخبار کی اڑھائی ہزار روپیہ کی ضمانت بھی داخل کر دی گئی۔ اخبار بھی جاری ہو گیا۔ اور کام بھی چل نکلا۔

میرے اس نیکھنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ پبلک کا کام کرنے والے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کام کرنے کے لئے روپیہ نہیں ملتا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور ان میں اخلاص اور ایمان باری کی کمی ہے۔ پبلک تو ان پبلک کام کرنے والوں کے ایمان اور اخلاص کا سب سے بڑا تھرمامیٹر ہے۔ اور کام کرنے والوں کے ایمان کا پتہ پبلک آواز سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پبلک آواز کبھی غلط نہیں ہوتی۔ کام کرنے والوں کا جیسا اعماندہ ہوگا ویسی ہی ان کے متعلق پبلک آواز اور شہرت ہوگی۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کبھی کسی شخص سے یہ نہیں کہا کہ وہ نیک ہیں۔ مگر کیا دنیا میں ایک شخص بھی ایسا ہے جو ہزار اختلافات کے باوجود آپ کو نیک نہ سمجھے۔ رنٹالاس کے خوج حسن نظامی اپنے اخبار "مناوی" میں دن رات اپنی تعریفیں کرتے تھے مگر کیا ایک شخص بھی آپ کو ایسا ملے گا جو آپ کو سیاسی چار سو میں اور مذہبی فراڈ نہ سمجھتا ہو۔ یعنی دنیا میں نیک کہلاوے کسی کو مشتمل نہ کرتی چاہئے۔

نیک بنتا چاہئے۔ انسان نیک ہوگا۔ تو دنیا خود بخود نیک کہے گی۔ اسی طرح جو لوگ پیلک کے روپیہ کو ٹرسٹ اور امانت سمجھیں گے۔ اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال نہ کریں گے۔ ان کو پیلک کاموں کے لئے روپیہ کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی اور جو لوگ چار سو سو کے ذریعہ پیلک کا جیب خالی کر کے اپنی ذاتی جائیدادیں بنالیں گے وہ ہمیشہ ہی گداگر رہیں گے۔ اور ان کے کاسہ میں ٹکڑا پیچھے کا کوئی امکان نہیں۔ کمزوری اگر ہے تو ہم کام کرنے والوں میں۔ نہ کہ پیلک میں۔ یعنی جو لوگ قوی میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اگر اخلاص اور ایمان داری کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تو روپیہ ان کے ساتھ ہے۔ اور اگر ان کی پیلک لائف میں خود غرضی اور بے ایمانی ہے تو ان کے لئے پیلک کے پاس نہ روپیہ ہے نہ شہرت۔

## کیریکٹر کا دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے

مجھے ٹھیک تو یاد نہیں۔ مگر غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔ دفتر ریاست "اجیری دروازہ" کے باہر ایک بلڈنگ میں تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ صبح دس بجے کے قریب میرے وطن کے ایک بزرگ تشریف لائے۔ جو رائے بہادر ہیں۔ میری برادری میں سے ہیں۔ اُس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے انسٹی جینس ڈیپارٹمنٹ (سی۔ آئی۔ ڈی) میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ رائے بہادر وطنی تعلقات کے باعث پہلے بھی کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے۔ جب یہ مکہ میں پہنچے۔ تو میں ان کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں کسی دوسرے کمرے میں چلے۔ میں اُن کو لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ اور کہا فرمائیے ان رائے بہادر اتم اتھری کے درمیان جو بات چیت ہوئی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ رائے بہادر نے کہا تمہارا جہ بھرت پر آپ کے دوست ہیں۔ اور آپ ان سے ملتے رہتے ہیں۔ ہمارا جہ لے اُس تمام خط و کتابت کو ایک کتابی صورت میں چھاپ کر شائع کر دیا ہے جو ہمارا جہ اور پولیٹیکل ایجینٹ کے درمیان ہوتی رہی۔ گورنمنٹ کی اس میں بہت بدنامی ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ کتابیں ہندوستان کے لیڈروں کو بھی بھیجی گئی ہیں۔ اب ہمارا جہ لے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کلرکوں کو رشرت دے کر اُس تمام خط و کتابت کی نقلیں حاصل کر لی ہیں جو کانفیڈنشل طور پر ایجینٹ گورنر جنرل راجپوتانہ اور پولیٹیکل سکریٹری گورنمنٹ ہند کے درمیان ہمارا جہ کے متعلق ہوتی رہی۔ اور ہمارا جہ اس کو بھی کسی پریس میں چھپوا رہے ہیں۔ گورنمنٹ اس کے متعلق بہت متفکر ہے۔ کیونکہ یہ کارسپانڈنس کانفیڈنشل تھی۔ آپ کے ذرائع بہت وسیع ہیں اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کلرکوں سے آپ بھی اطلاعیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک تو یہ پتہ لیجئے۔ کہ ہمارا جہ لے یہ نقلیں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کس کس کلرک کے ذریعے سے حاصل کیں۔ تاکہ ان پر آفیشل سیکرٹ ایکٹ میں مقدمہ چلایا جائے۔ اور دوسرے یہ پتہ لے دیجئے کہ ہمارا جہ یہ کتاب کس پریس میں چھپوا رہے ہیں۔ تاکہ ہم چھاپہ باز یہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ضبط کریں۔ میں اس مقصد کے لئے ہی شملہ سے آیا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے رائے بہادر نے اپنے جیب سے کرنس نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کہا کہ یہ روپیہ آپ کے اخراجات کے لئے ہے۔ کیونکہ شاید کچھ لوگوں کو روپیہ دینا پڑے اور شاید آپ کو کہیں جانے آئے کی بھی ضرورت ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ روپیہ کتنا تھا۔ پانچ ہزار تھا۔ سات ہزار یا دس ہزار۔ یہ گڈی نصف اور ایک اچھے کے دو سیان موٹائی میں تھی۔

میں نے رائے بہادر سے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا بیڑا انفارمر ہوں۔ اور آپ مجھے اس قدر ذلیل اور کمینہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے روپیہ لے کر مہاراجہ بھرت پور اور دوسرے دوستوں کے ساتھ غداری کر دوں گا اور آپ کی سی۔ آئی۔ ڈی کی بحری کی خدمات انجام دوں گا۔ رائے بہادر نے نوٹوں کی وہ گڈی میرے کوٹ دے مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اُس زمانہ میں میں نے کھدر کے کوٹ سلائے تھے اور وہ کوٹ کھدر کا تھا میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اور کہا "تم بے وقوف ہو۔ گورنمنٹ کا کافی روپیہ لیٹھو اور اخبارات کو دیتی ہے اس میں کوئی ہرج نہیں۔" رائے بہادر کو میں نے جواب دیا۔ اگر لیڈر اس قدر کمینہ ہوں تو ہوں مگر میں اس قدر کمینہ نہیں۔ رائے بہادر میرے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ آپ نے پھر آگے بڑھ کر نوٹوں کی وہ گڈی میرے جیب میں ڈالنے کی کوشش کی تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے میں نے نیم فضا اور نیم بنجیدگی کی حالت میں رائے بہادر سے کہا "رائے صاحب آپ اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے مگر میں سمجھتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر کوئی شخص اخبار نکالتے ہوئے یا پبلک وکر کرتے ہوئے گورنمنٹ سے روپیہ لے کر بحری کرتا ہے تو اُس سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی مال کو چاروڑی بازار میں بیٹھا کر اس سے پیشہ کرے اور روپیہ حاصل کرے۔" رائے بہادر میرے ان الفاظ کو سن کر سکتے میں رہ گئے۔ ان کا ہاتھ میرے جیب کی بجائے مع نوٹوں کے اپنے جیب میں چلا گیا۔ اور ہم پھر واپس ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رائے بہادر نے کھیانہ پن سے ایک بار پھر کہا کہ تم کوشش کرنا کہ یہ طلبا میں حاصل ہو سکیں میں نے پھر جواب دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ پھر رائے بہادر نے ادھر ادھر کی دوسری رسمی باتیں شروع کر دیں اور چند منٹ کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

سی۔ آئی۔ ڈی اور پولیس کے چھوٹے اور ادنیٰ لوگ تو اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے اپنے امیروں کو بہت بھڑائی اور غلط پروٹیں دیتے ہیں۔ مگر بڑے امیر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بڑے امیروں کے پاس جھوٹی پروٹیں نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹے ثابت ہوئے تو ان کے لئے مذمت کا باعث ہوگا۔ رائے بہادر نے وہ تمام بات چیت جو ان کے اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان ہوئی تھی من و عن اپنے امیر سر ڈیوڈ پیٹری وائر کیڈر ان ٹیلی جنس رپورٹر جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی کے اعلیٰ ترین امیر اور اپنی وابستگی اور قابلیت کے باعث بعد میں پریزیڈنٹ فیڈرل پبلک سروس کمیشن مقرر ہوئے کو پہنچا دی۔

گرمیوں کا موسم ختم ہوا۔ سردیاں شروع تھیں اور گورنمنٹ آف انڈیا شملہ سے دہلی آ رہی تھی۔ ایک روز شام کو ایک بہت لمبے فاصلے کے مضبوط مسلمان سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ میں اور اپنے ذاتی دفتر کے کمرہ میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آپ نے چڑاسی سے پوچھا کہ دیوان سنگھ کہاں ہیں چڑاسی نے جواب دیا۔ اوپر۔ آپ بے تکلف اوپر میرے ذاتی دفتر کے کمرہ میں چلے آئے۔ میں ان کے غیر مقدم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اور ساتھ دالے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی آپ نے بے تکلفی کے انداز میں کہا "اے بھائی چائے منگاؤ۔" میں نے بجلی کی گھنٹی کاٹن دیا۔ چڑاسی آیا۔ اُس سے کہا باورچی کو بھیجو۔ اُس زمانہ میں کسی سے پاس گواکار رہنے والا باورچی کو بلو تھا۔ کوٹے میں لے کہا کہ جائے لاؤ۔ گردل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ شاید پہلے کسی ان سے بل چکا ہوں کس ریاست کے وزیر ہیں۔ کہاں ملا ہوں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے خود ہی مسکرا کر کہا "شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" میں جھنجکتے ہوئے کہا۔

جی ہاں۔ مجھے یاد نہیں پڑا، جناب کیا ذکر کہاں حاصل ہوا تھا۔ آپ نے ذرا زیادہ شکر ادا کر دیا، میں قصداً میں  
 ڈپٹی ڈائریکٹر ان ٹیلی جنس بیورو میں۔ اور آپ کے ہم وطن رائے بہادر کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ میں نے کہا: بہت ہرانی  
 فرمائی۔ آپ کے نام سے تو واقف تھا۔ رائے بہادر سے بھی ذکر آیا۔ مگر آپ سے نیاز حاصل کرنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا  
 تھا۔ خان بہادر رخصت حسین نے جواب میں فرمایا: میرے اور سر ڈیوڈ پیٹری کے دل میں آپ کی بہت عزت ہے  
 رائے بہادر نے اپنی رپورٹ میں وہ سب کچھ لکھ دیا تھا۔ جو آپ کے دوران کے درمیان بتا دیتی، ہم لوگ آپ کے کیرئیر  
 کے بہت متوجہ ہیں۔ اور اسی لئے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ ہندوستان کے لیڈروں اور  
 اخبار نویسوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جن کا کوئی کیرئیر نہیں۔ جو بہت تھوڑی رقم سے خریدے جاسکتے ہیں۔  
 اور ان میں بعض میرا سہیلی بھی ہیں۔ یہ لوگ گویا سارے لئے مفید ہوتے ہیں۔ مگر کیرئیر نہ ہونے کے باعث ہمارے  
 دل میں ان کی عزت نہیں۔“

خان بہادر جاسکے پتے پر رہے۔ اور باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز نصف گھنٹہ کے قریب بیٹھے ہوں گے چار روز کے  
 بعد آپ نے مجھے ڈنر پر بلایا۔ اس کے بعد یہ کبھی کبھی تشریف لایا کرتے۔ اور میں بھی جب کبھی نئی دہلی کی ٹرک پر  
 شام کو سیر کے لئے جاتا۔ تو ان کی کوٹھی پر ان سے ملنے حاضر ہوتا۔ اور تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ خان بہادر رخصت حسین  
 بہت مخلص۔ بہت محبت کے بہت ہمدرد۔ بہت بے تکلف اور بہت بلند انسان تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے  
 دوران کے درمیان بھائیوں جیسے تعلقات ہو گئے، مجھے یاد ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے یاد ہو گئے۔ راجہ  
 اکبر علی صاحب کو کوٹھی پر مقیم تھے۔ میں ہوشنگ آباد مقدمہ کی پیشی پر جا رہا تھا۔ ملنے کے لئے گیا۔ آپ کو پلوسمی کے  
 باعث سخت تکلیف تھی۔ جب آنے لگا۔ اٹھ نہ سکے۔ آپ نے لیٹ لیٹے اٹھ پھیلا دیئے۔ اور آنکھوں میں آنسو  
 بہہ کر فرمایا: ”اچھا بھائی جاؤ۔ اب تو شاید ملنے کا اتفاق نہ ہو۔“ یہ سن کر میرے بھی آنسو نکل آئے۔ میں ہوشنگ آباد  
 چلا گیا۔ دس روز کی مسلسل تاریخیں نہیں پہنچنے کے چار پانچ روز بعد سٹیشن میں پہنچا  
 کہ آپ کا انتقال ہو گیا اور گورنمنٹ ہند کا غیر معمولی گرٹ سیاہ حلقہ کے ساتھ شائع ہوا۔

خان بہادر رخصت حسین انتقال کر گئے سی۔ آئی۔ ڈی کے ذیل حکم میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی  
 ڈائریکٹر ان ٹیلی جنس بیورو کو گورنمنٹ ہند تھے۔ مگر طبعاً اتنے اچھے دیانت دار۔ مخلص اور بلند انسان کہ ان کے  
 قدموں پر درجنوں وہ کانگریسی قربان کئے جاسکیں جو اپنی ذاتی اغراض کے لئے قومی میدان میں موجود ہیں۔ مرحوم  
 کے انتقال کو کئی برس ہو گئے۔ مگر جب بھی خیال آتا ہے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

ان تمام حالات کے بتانے کا مقصد یہ ہے۔ کہ اگر انسان کے اندر کیرئیر نہ ہو۔ تو اس کے لئے اس کے دشمنوں  
 کے دل میں بھی عزت ہوتی ہے۔ اور اگر انسان میں کیرئیر نہ ہو تو اس کے دوست احباب۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔  
 بہن اور عزیز بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ چاہے یہ لوگ اپنی اغراض کے لئے اس کے منہ ہمارے کی تعریف  
 ہی کریں۔

راچپوتانہ کے قومی ورکر اور لیڈر شری رام نرائن جی چوہدری اپنا زیادہ وقت بہاتا گاندھی  
 کے پاس گزارتے جب کہیں وہ دہلی تشریف لاتے تو دفتر ”ریاست“ میں بھی آتے اور کئی کئی گھنٹہ  
 بہاتا گاندھی کے حالات کا ذکر ہوتا۔ ان کا بیان ہے کہ باوجود اس بات کے کہ مشر حناج کی مسلم لیگی

پالیسی ٹنک اور کانگریس کے لئے انتہائی نقصان کا باعث ہے۔ مگر ہمارا گاندھی کے دل میں مسٹر جناح کے لئے انتہائی عزت ہے۔ اور ہمارا گاندھی پرائیویٹ سے پرائیویٹ دوستوں میں بھی جب کبھی مسٹر جناح کا ذکر کرتے ہیں تو انتہائی عزت اور محبت کے ساتھ۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارا تاجی یہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح کے اندر کیریکٹر ہے۔ گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی ان کو خرید نہیں سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ نے کبھی بھی جناح کو اپنا نہ سمجھا اور آپ سے گورنمنٹ ہمیشہ بدگمتی ہی رہی۔ جناح کے مقابلہ پر جن کانگریسیوں کے اندر کیریکٹر نہیں۔ ہمارا تاجی ان کو چوروں کے بھی بڑا ڈیڑھل سمجھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے۔

جو لوگ پیٹک میں عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر کیریکٹر پیدا کریں۔ دنیا میں روپیہ اور دولت ہی سب کچھ نہیں۔ انسان کو اپنی عزت پر روپیہ قربان کرنا پڑتا ہے اور عزت۔ تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب انسان میں کیریکٹر ہو۔ بلکہ غور کیا جائے تو اس شخص سے جس کے اندر کیریکٹر نہیں جو دوستوں کے ساتھ کبھی بددیانت ہے۔ جو اعتماد کو کٹھن ہے اور جو قوی غذا ہے۔ بازار کا ایک آدمی کہتا بھی اچھا ہے جو اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کرتا ہے۔ اور دوستوں کے ساتھ غذا آری نہیں کرنا۔

## اچھے لوگ اپنے ہم وطنوں کے لئے باعث عزت

ایڈیٹر ”ریاست“ گوجرانوالہ کے ضلع کا رہنے والا ہے۔ اس ضلع نے سینکڑوں کی تعداد میں اخبار نویس مصنف اور علم دوست حضرات پیدا کیے۔ چنانچہ اس ضلع کے رہنے والے ایڈیٹروں اور مصنفین میں مولوی محمود عالم ایڈیٹر ”پیہ اخبار“ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر ”زمیندار“ لالوینا ناتھ ایڈیٹر ”دیش“ دھندوستان“ لالوینڈھی داس حضرت وارث شاہ مصنف ہیر، راجہ ہمدی علی خاں، مسٹر حامد علی، ہامانانند گپال اور مولوی نصر اللہ خاں عزیز ایڈیٹر ”کوثر“ وغیرہ درجنوں شخصیتیں ہیں۔ جنہوں نے علم و ادب کی بہت خدمات انجام دیں۔

ایڈیٹر ”ریاست“ جن دنوں لکھنؤ کے اخبار ”ہمدیم“ میں کام کرتا تھا۔ دوسرے تیسرے روز سہ پہر کے بعد منشی نوبت رائے صاحب نظر سابق ایڈیٹر ”ادیب“ اور ”آبادی کی خدمت“ میں بھی حاضر ہوا کرتا۔ نظر صاحب اس زمانہ میں اردو کے ایک بہترین شاعر اور ادیب تسلیم کئے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں آپ روزانہ ”ادب اخبار“ کے ایڈیٹر تھے اور پنجاب کے اخبار نویسوں و مصنفین کے حالات سے خوب واقف تھے۔ ایک روز باقول باتوں میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ وطن کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا پنجاب۔ پھر کہا کہ کن سا ضلع؟ میں نے جواب دیا گوجرانوالہ۔ گوجرانوالہ کا نام سننے ہی آپ نے فرمایا۔ ”یکیریں انہیں کہنے کہ شیراز ہند کے رہنے والے ہو۔ کیونکہ ایران میں شیراز نے سینکڑوں کی تعداد میں علم و ادب اور مصنف پیدا کئے۔ اور ہندوستان میں گوجرانوالہ نے“

گوجرانوالہ کے لئے شیراز ہند کا خطاب سن کر میرے دل نے جتنی مسرت محسوس کی میں بیان نہیں کر سکتا اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اچھے لوگوں کا کام ان کے ہم وطنوں اور ان کی اولاد کے لئے بھی باعث عزت ہے چنانچہ پیغمبروں، گوروں اور اوتاروں کی اولاد سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک لوگوں میں قابل پرستش ہے۔ اور برے لوگوں کے دشمن داروں کی نفرت کی جاتی ہے۔



## دُعا اور بددُعا کا اثر

مردم ہمارا جہ ناجبہ بہت بڑے قوم پرست اور نظریاتی دق رکھنے والی علم و دستِ چھتھے اُن کے دشمن بھی اُن کی ان صفات کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر ریاست نا بھسکی ایڈمنسٹریشن اور دوسرے حالات کا جہاں تک تعلق ہے۔ ناجبہ اور دوسری ریاستوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

راقم التحریر جس زمانہ میں ہمارا جہ کے پاس ریاست نا بھیں ملازم تھا۔ وہاں ایک سادھو بہن رہا کرتے تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں، یہ آنکھوں سے معذرت تھے۔ ایک طویل عرصہ تک سوامی دیانند بانی آریہ سماج کے ساتھ رہے اور انھوں نے سوامی جی سے سی سنسکرت بھی پڑھی تھی۔ یہ پنڈت جی ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لئے اکثر آیا کرتے اور سوامی دیانند کے متعلق اپنے چہرہ دید اور دلچسپ واقعات سنایا کرتے۔ پنڈت جی راجو سادھوؤں کے لباس میں رہتے تھے، بوڑھے ہو چکے تھے ان کی بیوی اور بچے بھی موجود تھے، بچوں میں ایک لڑکی کا نام ایشر کر تھا، اور بچے کا نام ایشر سنگھ زید دونوں آج کل غالباً ویرہ دون میں رہتے ہیں (پنڈت جی کی بیوی کا کافی بوڑھی اور ڈبلی پتلی اور کمزور تھیں۔

ہمارا جہ ناجبہ اپنے ایک اے۔ ڈی سی سے ناراض ہو گئے، اس اے۔ ڈی سی کا ناجائز تعلق پنڈت جی کی صاحبزادی ایشر کو رکھ کے ساتھ تھا۔ ہمارا جہ کی ناراضی کے باعث جب یہ اے۔ ڈی سی ناجبہ سے چلا گیا۔ تو اس نے ایک عورت بھیج کر اس ایشر کو رکھ بھی اپنے پاس لاہور بولا لیا۔ ایشر کو رکھ جانے کا جب ہمارا جہ کو علم ہوا، تو پولیس نے پنڈت جی سے ایک درخواست لی۔ جس میں لکھا گیا۔ کہ یہ اے۔ ڈی سی ان کی دختر ایشر کو رکھ کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ باپ کی درخواست پر بیٹی اور اس کے آشنا کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے اور ساتھ ہی ایشر کو رکھ کی ماں یعنی بوڑھے پنڈت جی کی بوڑھی بیوی کو بھی اغوا میں امداد دینے کے جرم میں بغیر ضمانت لئے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ضعیفہ کو توالی کی حوالات میں بند تھی۔ مئی جون کا مہینہ تھا۔ چھت کے اوپر سونے والے بھی گرمی کی شدت سے تڑپتے تھے۔ مگر یہ خاتون بغیر کسی جرم یا قصور کے حوالات کے بند کمروں میں قید تھی تمام رات سونہ سکتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ روتے ہوئے بلند اور درونگ آواز کے ساتھ "مائے میں مر گئی" "مائے میں بے گناہ ہوں" "مائے میرا کیا قصور ہے" کہتی، تو توالی کے قریب کے مکانوں کی چھت پر سوتے ہوئے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ظلم کے کئی واقعات میں سے ایک یہ واقعہ ہے جس کو دیکھ کر ایڈیٹر "ریاست" کو ناجبہ کی ملازمت میں ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ دیانند ریاست کے منظم کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ اس مقصد کے لئے اخبار جاری ہو۔ اور ریاستوں میں انقلاب پیدا کیا جائے۔

اب نہ تو ہمارا جہ ناجبہ اس دنیا میں موجود ہیں نہ ضعیفہ اور کمزور خاتون۔ مگر میرا یقین ہے اگر ہمارا جہ ناجبہ کی تباہی کا باعث جن لوگوں کی بددعا میں تھیں اُن میں اس بے گناہ اور بے قصور خاتون کی بددعاؤں کا بھی کافی حصہ تھا۔ اس خاتون کا یہ واقعہ ہی اخبار "ریاست" کو جاری کرنے کی بنیادوں کا باعث ہوا، ایڈیٹر

”ریاست“ کا ایمان ہے کہ اُن لوگوں کو قدرت ضرور سزا دیتی ہے، جو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ چاہے یہ سزا اُسی وقت ملے یا دو چار دس سال کے بعد ملے۔ اور خدا کا وجود ہریانہ ہو۔ مگر سزا دینے والی کوئی نہ کوئی طاقت ضرور موجود ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ دُعا اور بددُعا کا اثر نہ ہو۔

## مال کی مامتا

پنجاب کی اکالی تحریک کا آغاز دہلی کے گوردوارہ رکاب گنج سے ہوا۔ یہ گوردوارہ گورنمنٹ سیکرٹیریٹ کے بالکل قریب ہے۔ گورنمنٹ چاہتی تھی کہ اس گوردوارہ کی بیرونی اونچی دیوار کو گر کر دیا جائے تاکہ کوئی لمب باز یا انارکٹ اس دیوار کے پیچھے چھپ کر کبھی کوئی وار نہ کر سکے۔ لیکن اس دیوار کو مسجد بجلی بازار کا ہندو کے غسل خانہ کی طرح گوردوارہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے، اور اس دیوار کی حفاظت کے لئے ہی اکالی (جو مرنے سے نہ ڈریں) عالم وجود میں آئے۔ اس دیوار کی کامیابی نے اکالی تحریک کو ایک مستقل اور مضبوط حیثیت دینے کا کام کیا۔ چنانچہ آج پنجاب منسٹری اور گورنمنٹ ہند کی وزارت میں اکالیوں کے مشورے کی سیکھ وز لائیے جاتے ہیں۔

میں جب ریاست ناہی میں ملازم تھا تو اس وقت وہاں ہم چار جرنلسٹ تھے۔ (۱) میں (۲) مسٹر ایس رنگا آکر سابق سب ایڈیٹر ”لیڈر“ الہ آباد۔ (۳) سردار سوہن سنگھ راہی (۴) اور سردار جرن سنگھ شہتہ۔ اکالی تحریک جب زور پکڑ رہی تھی تو ہمارا جہ ناہی نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں پنجاب کا دورہ کر کے معلوم کروں کہ اس نئی اکالی تحریک کی تہیں کیا مقصد ہے۔ اس کے ساتھ کون کون با اثر حضرات شامل ہیں۔ چیف خالصہ دیوان (حکومت پرست پارٹی) کا اس کے ساتھ کس خد تک تعلق ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی کیا پوزیشن ہے اور اس کا مستقبل کیا نظر آتا ہے۔ میں ہمارا جہ کے حکم کے مطابق ناہی سے روانہ ہو کر سب سے پہلے امرتسر پہنچا۔ وہاں سکھوں کے اکثر لیڈروں اور ورکرز سے واقفیت تھی۔ متعدد اصحاب سے ملنے کے بعد امرتسر پہنچا۔ (جو اکالی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے) سے ملا۔ باسٹر صاحب سے دیر تک باتیں ہوئی، انہیں تو باتوں باتوں میں آپ سے معلوم ہوا کہ پٹیانہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کے متعلق کاغذات ان کے ایک دوست سردار تلوک سنگھ منیجر گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ایدال (ضلع راولپنڈی) کے پاس ہیں۔

سردار لال سنگھ مرحوم ہمارا جہ پٹیانہ کی ہمارائی (موجودہ ہمارائی پٹیانہ کی حقیقی والدہ) کے چچا تھے۔ سردار لال سنگھ کی بیوی ولیپ کو غیر معمولی خوبصورت تھیں، اور ہمارا جہ کا اس خاتون کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ ہمارا جہ نے چاہا کہ سردار لال سنگھ پچاس ہزار روپیہ یا اس سے زیادہ رقم لے کر دوسری شادی کر لیں اور ولیپ کو رکھ کر چھوڑ دیں۔ مگر سردار لال سنگھ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس انکار کے بعد ہمارا جہ نے سردار لال سنگھ کو قتل کر دیا۔ اس قتل میں جن لوگوں کا حصہ تھا ان میں سے کچھ تو مرچکے ہیں اور کچھ ابھی زندہ ہیں۔ چنانچہ جن کاغذات کا باسٹر تارا سنگھ نے ایڈیٹر ”ریاست“ سے ذکر کیا، ان میں وہ مسودہ بھی تھا جو سردار لال سنگھ کے اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑنے کے متعلق اس پر دستخط کر دیں اور سردار بہادر سردار سنگھ بھٹیہ سابق منسٹر پنجاب گورنمنٹ کے خطوط بھی تھے جن سے ثابت

ہوتا تھا کہ قتل کے بعد جب لوگوں کو اور گورنمنٹ کو قتل کا علم ہوا، تو اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس قتل کے واقعات بہت دلچسپ، دردناک، طویل اور ایک پوری کتاب لکھے جانے کے مستحق ہیں۔

ایڈیٹر "زیاست" ماسٹر تارا سنگھ سے مل کر لاہور وغیرہ کی مقامات پر دوسرے سکھ لیڈروں سے ملنے کے لئے گیا۔ اور ایک عشرہ کے اس دورہ کے بعد جب واپس ناہیچہ پہنچا، تو اکالی تحریک کے متعلق اپنی رپورٹ کے ساتھ ہمارا چکر لکھا کہ کاغذات قتل سردار لال سنگھ کے متعلق ماسٹر تارا سنگھ سے کیا بات چیت ہوئی۔ ہمارا چکر ان کاغذات کو حاصل کرنے کے لئے ایک عرصہ سے کوشش میں تھے۔ کیونکہ یہ کاغذات ہمارا چکر پٹیا لال کے خلاف قتل کا جرم ثابت کر سکتے تھے میرا خط دیکھ کر ہمارا چکر بہت خوش ہوئے تھے طلب کیا۔ زبانی سب کچھ پوچھا، اور کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، ان کاغذات کو حاصل کیا جائے۔ چاہے ان کاغذات پر کتنا بھی روپیہ خرچ ہو۔

میں نے ہنر بانیس سے پوچھا کہ کتنا روپیہ زیادہ سے زیادہ ان کاغذات پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا چکر نے جواب دیا کہ ایک یا دو لاکھ، یا اگر زیادہ ضرورت ہو تو زیادہ بھی۔

اگلے روز میں نے سفر کے اخراجات کے لئے پانچ سو روپیہ سردار گوردیال سنگھ پر ایڈیٹس کر مٹیری دے کر بعد میں ناہیچہ میں منسٹر ہوئے اور سردار بہادر تھے) سے لینا۔ اور سیدھا گوجر خاں (ضلع راولپنڈی) سردار نانک سنگھ کے مکان پر پہنچا سردار نانک سنگھ کسی وقت پٹیا لال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ اور سردار لال سنگھ کو قتل کرنے کے الزام میں اُس وقت پٹیا لال جیل میں تھے۔ اور قتل کے کاغذات، انھوں نے ہی اپنے بہنوئی سردار تلوک سنگھ کو دیئے تھے۔ تاکہ محفوظ رہیں) مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ سردار نانک سنگھ کے گھر میں ان کی بوڑھی اور ضعیف والدہ اور ایک بہن تھیں۔ ان کی بہن کا نام خالیا گوہند رکورنڈا۔ اس لڑکی کی شادی ہوئے ابھی دو تین ماہ ہوئے تھے اور اس کے ہاتھوں میں سرخ چڑیاں دج شادی ہونے کے بعد پنجاب میں ایک سال تک بیٹی جاتی ہیں، انھیں ان دروں خواتین کو جب یہ علم ہوا کہ میں ناہیچہ سے آیا ہوں۔ ناہیچہ اور پٹیا لال دونوں کی عداوت ہے اور اگر قتل لال سنگھ کے کاغذات ہمارا چکر ناہیچہ کو دے دیئے جائیں تو ہمارا چکر پٹیا لال اس قتل کے الزام میں گدھی سے اتر سکتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سردار نانک سنگھ بھی پٹیا لال جیل سے رہا کر دیئے جائیں گے۔ تو ان ماں بیٹی کے چروں پر مسرت اور خوشی کا سرخ رنگ چمکنے لگا۔ اس کے بعد سردار نانک سنگھ کی ماں نے مجھے متاثر کرنے کے لئے بیٹے کی جدائی اور اپنے غم کی داستان سنانا شروع کی اور اس ضعیف اور دکھی خاتون نے جب یہ کہا کہ نانک سنگھ قید ہونے کے باعث اپنی بہن کی شادی میں بھی شامل نہیں ہو سکا تو پاس بیٹھی معصومہ جوان۔ خوبصورت اور سرخ چڑیوں والی گوہند رکور کی آنکھیں بھائی کی محبت میں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اور اس نے جیسا کہ ساتھ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں، اس کے بعد سردار نانک سنگھ کے ماموں سردار جے سنگھ اور دوسرے عزیز آگئے۔ راولپنڈی اور سرحد کے لوگ دیے تو فطرتاً ہی بے حد ہماں نواز ہوتے ہیں، مگر مجھے تو وہ اُس وقت ایک فرشتہ سمجھ رہے تھے۔ جو نانک سنگھ کو جیل سے رہا کرنے کے لئے آسمان سے نازل ہوا ہو۔ ان لوگوں نے اخلاص و محبت اور خاطر تواضع کی انتہا کر دی میں ان کے مکان پر دو روز ورا۔ مشورے ہوتے رہے۔ آخر میں اور سردار جے سنگھ دونوں سردار تلوک سنگھ کے پاس پنج صاحب (حسن ابدال) روانہ ہوئے۔ پنج صاحب پانچ کر

مشورہ ہوا۔ پھر تینوں واپس گوجر خاں پہنچے۔ پھر مشورہ ہوا۔ یہ لوگ دلیان ریاست کو ناقابلِ عہدت بار خود غرض اور جھوٹا سمجھتے تھے۔ اس لئے ہمارا جہ نا بھہ پر بھی بھروسہ کرنا نہ چاہتے تھے، اور کا غذات حوالہ کرنے میں ان کو متامل تھا۔ اور بعض اس بات کے حق میں تھے کہ کا غذات ایک یا دو لاکھ روپیہ میں فروخت کیے جائیں، اور نا بھہ سے روپیہ لیا جائے۔ میری غراہش یہ تھی کہ یہ کا غذات بغیر ایک پیسہ خرچ کے ہمارا جہ نا بھہ کو مل جائیں۔ ہمارا جہ نا بھہ ان کو ہمارا جہ پٹیلہ کے غلات استعمال کریں، اور سردار نانک سنگھ بھی پٹیلہ جیل سے رہا ہوں۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ سردار نانک سنگھ کے گھر والوں کی یہ پچایت کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی، اور ان کی مختلف رائیں ہیں، تو میں نے سب کے سامنے قطعی فیصلہ کے لئے دو تجویزیں پیش کیں (۱) یا تو آپ روپیہ لے لیجئے ہم ایک لاکھ روپیہ دینے کے لئے تیار ہیں، ہم ان کا غذات کو عینا چاہیں استعمال کریں اور آپ کو حق حاصل نہ ہوگا اگر ہم ان کا غذات کو استعمال کرتے ہوئے سردار نانک سنگھ کے مسئلہ کو چھوڑ دیں۔

(۲) آپ کوئی روپیہ نہ لیجئے۔ آپ کا غذات بغیر ایک پیسہ لئے ہمارا جہ نا بھہ کے حوالہ کر دیجئے۔ ہمارا جہ نا بھہ آپ سے وعدہ کریں گے کہ وہ ان کا غذات کو استعمال کرتے ہوئے سردار نانک سنگھ کی رہائی کے لئے انتہائی کوشش کریں گے، اور اس مسئلہ کو کسی قیمت پر بھی چھوڑانہ جائے گا چاہے اس پر دس لاکھ روپیہ بھی کیوں نہ خرچ ہو۔ میں نے جب قطعی فیصلہ کے لئے یہ دونوں شرائط سب کے سامنے رکھیں تو سردار نانک سنگھ کی ماں نے جو اپنے بیٹے کی جدائی میں بے حال تھیں بغیر کچھ سوچے یا غور کے فوراً جواب دیا۔

”مجھے روپے کی ضرورت نہیں، مجھے اپنے بچے کی ضرورت ہے میں روپیہ نہیں چاہتی۔ آپ کا غذات لے جائیے اور میرے بچے کو جیل سے چھڑانے کی کوشش کیجئے۔“

سردار نانک سنگھ کی والدہ کا یہ جواب سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ اور آخر فیصلہ ہوا کہ کا غذات بغیر روپیہ لئے ہمارا جہ نا بھہ کے حوالہ کر دیئے جائیں۔ چنانچہ میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو ساتھ لے کر نا بھہ واپس آ گیا۔ کا غذات ایک ٹین کے ٹکڑے میں بند تھے، اور یہ ٹینکا سردار تلوک سنگھ کے کوٹ کے اندر چھپاتی اور گردن کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

تیسرے روز رات کہ ہم نا بھہ پہنچے میں نے ان کی رہائش کا انتظام ہمان خانہ سرائے شادیات میں کیا۔ خود اپنے مکان پر جا کر سویا صبح اٹھا۔ آٹھ بجے کے قریب سردار گردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری کے مکان پر پہنچا۔ سردار صاحب نے پوچھا، کہ کا غذات کا کیا ہوا۔ میں نے کہا کہ کا غذات لے آیا ہوں۔ وہ حیران ہوئے اور کہا کہ روپیہ ساتھ لے نہیں گئے تھے۔ ابھی صرف معلوم کرنے گئے تھے کہ کا غذات کہاں ہیں، کا غذات کس طرح آ گئے۔ یہ ممکن ہی کیونکر ہے۔ کیا مذاق کر رہے ہو۔ میں نے تمام قصہ بیان کیا۔ سردار گردیال سنگھ حیران رہ گئے۔

انہوں نے میرا محل جا کر ہمارا جہ کو تمام حالات بتائے۔ ہمارا جہ حیران تھے کہ دو لاکھ روپیہ تک خرچ کرنے کی اجازت دی گئی تھی، مگر ایک پیسہ خرچ کے بغیر کا غذات مل گئے۔ ہمارا جہ واقعات کو سن کر بے حد خوش ہوئے۔

رات کو نو بجے کے قریب میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو لے کر قلعہ میں گیا۔ دونوں کو ہمارا جہ سے بلایا۔ کا غذات ٹالائین کا ٹینکا کوٹ کے اندر سے نکالا گیا۔ تمام کا غذات ہمارا جہ کو دیئے گئے۔ ہمارا جہ نے ان کو دیکھا۔ بہت خوش ہوئے۔ اور وعدہ کیا کہ وہ سردار نانک سنگھ کی رہائی کے مسئلہ کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کر کوشش

کریں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کے ذریعہ سردارانک ٹھکانہ لکھنؤ ہمارا رہنے دو ہزار روپیہ نقد بھجوا دیا اور ایک سو روپیہ ماہوار پنشن تاحیات مقرر کی (جوشاید چند ماہ ملی۔ اس کے بعد ہمارا جگہ گدی سے دستبردار ہو گئے) اور اگلے روز جب راقم التحریر ہمارا رہ سے ملا تو ہمارا رہنے کہا۔

”میں اور دربار نا بھ آؤ آپ کا یہ احسان کبھی بھی نہ بھول سکیں گے۔“

یہ کاغذات گوہارا جہ پٹیل کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنے کے اعتبار سے بہت قیمتی تھے مگر گوہر خٹ ہمارا جہ پٹیل کے حق میں تھی اور ہمارا جہ نا بھ کے خلاف، اور صرف گوہر خٹ ہی قتل کے متعلق کوئی کارروائی کر سکتی تھی یہ کاغذات استعمال نہ ہو سکے اور ان کاغذات کی پوزیشن بالکل ایک ایسے چیک کی تھی۔ جو مبعاد گزر جانے کے بعد بینک سے کیش نہیں ہو سکتا۔

سردارانک سنگھ ایک عرصہ کے بعد پٹیل جیل سے رہا ہوئے اور وہ آجکل غالباً ڈیرہ دکن میں کوئی کام کرتے ہیں۔

ان اوپر کے واقعات سے ماں کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کے اپنی اولاد اپنے بچے کے لئے ہوتے ہیں یعنی یہ اپنی اولاد کے مفت بلہ پر لاکھوں روپیہ کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھتی

## محنت اور کامیابی

کئی برس ہوئے ”ریاست“ جب جاری ہوا تو اس کے دفتر میں نہ کوئی منصب ایڈیٹر تھا، نہ مترجم، اور نہ کوئی سینئر، صرف ایک کلرک تھا اور ایک چپڑاسی بک رک کی تنخواہ تیس روپیہ تھی۔ اور چپڑاسی کی پندرہ روپیہ ”ریاست“ کا دفتر دہلی دروازہ کے قریب موجود تھا نہ کے بالکل سامنے ایک گلی کے اندر تھا۔ اس مکان کا کرایہ اٹھائیس روپیہ ماہوار تھا۔ اس میں سے بھی کچھ حصہ ایک ریلوے گارڈ کو بارہ روپیہ ماہوار پر دیا گیا تھا۔ گویا کہ ”ریاست“ کے دفتر اد ایڈیٹر ”ریاست“ کی رہائش دونوں کے لئے سولہ روپیہ ماہوار کرایہ دیا جاتا تھا۔ اور کام کی حالت یہ تھی کہ دیے تو ایڈیٹر ”ریاست“ کی تمام زندگی ہی دن رات میں سے چودہ چودہ یا سولہ گھنٹہ کام کرتے گزر گئی مگر اس زمانہ میں یہ نگار اٹھارہ اٹھارہ گھنٹہ کام کرتا اور چھ گھنٹہ سوتا۔ چنانچہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ صبح چھ بجے کام شروع کیا، شام ہو گئی۔ رات ہو گئی، رات بھر کام جاری رہا، دن بکل آیا، ضروری حاجات سے فارغ ہوا۔ غسل کیا، اور پھر مینز پر بیٹھ گیا۔ اور پھر رات ہو گئی یعنی چھتیس چھتیس گھنٹہ مسلسل کام کرتا رہا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار میں کامیابی ہوئی۔ دو تین ماہ کے اندر ہی اشتہارات کے آٹھ دس صفحے ہو گئے۔ اور لاہور، دہلی اور دوسرے مقامات کے اخبار نویس ”ریاست“ کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

”ریاست“ کو جاری ہونے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا، اور اس کی اشاعت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ اس ناہیں جامع مسجد کے قریب ایڈر ڈپارک میں شام کے وقت چند اہم شخصیتیں جمع ہوا کرتیں مرحوم ملانا راجہ خیری خواجہ خن نظامی، واحدی صاحب ایڈیٹر ”نظام اشاعت“ قاری عباس حسین۔ منشی عبد الحمید ایڈیٹر ”مولوی“ مولانا عارف ہوسوی اور بھتیجا شیخ احسان الحق وغیرہ یہ مجلس بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایڈیٹر ”ریاست“ بھی کبھی

کبھی فرصت بحال کران دوستوں کی خدمت میں حاضر ہو جانا، کیونکہ یہ تعلیم ہی اس نیا زمند کے کرم فرماتے، احمد مرحوم مولانا راشد الخیری کے اخلاص و محبت میں تو بہت بڑی کنش تھی۔

ایک روز ایڈیٹر ”ریاست“ ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر تھا تو قادی عباس حسین صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ ایک اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں، جو بالکل ”ریاست“ کے سائز کا ہوگا، اس کے لئے ”ریاست“ والا مفید کاغذ استعمال کیا جائے گا، اور ترتیب کے اعتبار سے بھی ”ریاست“ جیسا ہوگا، اس میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نے قادی صاحب سے عرض کیا، کہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جتنے زیادہ اخبارات جاری ہوں اُنہی میدان وسیع ہوگا قادی صاحب نے پوچھا کہ اگر اخبار جاری ہو تو میں اس میں کیا امداد دے گا۔ میں نے عرض کیا جو خدمت مجھے بتائیے میں حاضر ہوں۔ پھر پوچھا، کیا کامیابی ہوگی؟ میں نے جواب دیا، اگر ”ریاست“ کو کامیابی ہوئی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ آپ کے اخبار کو نہ ہو۔ چنانچہ اگلے روز ایڈیٹر ”ریاست“ نے قادی صاحب کو ”ریاست“ کے چھپے ہوئے مسطرے کاغذ بھیجے۔ اخبار ”قوم“ کا ڈیکارشن داخل کیا گیا، اور دو ہفتے کے اندر اس اخبار کا پہلا پرچہ بازار میں آگیا۔

قادی عباس حسین صاحب اس سے پہلے بندے ماترم، لاہور وغیرہ متعدد روزانہ ہفتہ وار قومی اخبارات میں ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دے چکے تھے، اور آپ ایک اچھے جرنلسٹ ہیں۔ مگر اخبار کو ایڈیٹ کرنا اور اخبار کو تجارتی اعتبار سے چلانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ قادی صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہ میں نے کتنے سرمایہ سے ”ریاست“ جاری کیا، تو میں نے عرض کیا تھا کہ پندرہ سو روپیہ سے، چنانچہ قادی صاحب نے بھی اس اخبار ”قوم“ کو جاری کرنے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ انتظام کیا تھا۔ تین ماہ کے اندر اس اخبار پر ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہو گیا، مگر اخبار کو کامیابی نہ ہوئی۔ تین ماہ کے بعد قادی صاحب ایڈیٹر ڈپارک میں بے تو آپ نے فرمایا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ تو صرف ہو چکا کہ کامیابی نہیں ہوئی۔ نقصان ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے عرض کیا اور کوشش کیجئے۔ قادی صاحب نے بارہ سو روپیہ کامزید انتظام کیا۔ وہ روپیہ بھی صرف ہو گیا، اس کے بعد ایک ہزار روپیہ کا وہ انتظام کیا وہ بھی غرق ہوا۔ تو ایک روز ایڈیٹر ڈپارک میں پھر بے، آپ نے فرمایا کہ ساڑھے تین ہزار روپیہ سے زیادہ صرف ہو چکا ہے۔ نہ زیادہ اشاعت ہے، نہ اشتہارات کافی، اخبار میں گھانا ہے، کیا صورت ہو۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے عرض کیا، اگر گھانا ہے تو بند کر دیجئے۔ قادی صاحب در ساند شکوہ کے انداز میں بولے۔ آپ نے کوئی مدد نہیں کی۔ نہ اشتہارات لے کر دیے، نہ کوئی صورت خریدی اور زیادہ کرنے کی بتائی۔ اس دوستانہ شکوہ کے بعد آپ نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا کہ ناکامی کا باعث کیا ہے۔ تو ایڈیٹر ”ریاست“ نے جو کچھ عرض کیا وہ یہ تھا:-

”قادی صاحب۔ آپ کے لئے کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور میر جانتا تھا کہ آپ کو کامیابی نہ ہوگی۔ مگر اس خیال سے کہ اگر میں آپ کے اخبار جاری کرنے سے پہلے آپ کو اخبار جاری کرنے سے روکتا تو آپ مجھ پر غور و خوض اور تجارتی خد اور رقابت کا الزام لگاتے اس لئے میں نے آپ کو منع نہیں کیا ورنہ سوچتے کہ آپ کو کامیابی نہ کر نہ ہوتی۔ آپ حج آٹھ بجے جاتے ہیں۔ ایک گھنٹہ پلنگ پر کوٹیں جاتے رہتے ہیں پھر یکم صاحب فرماتے ہیں کہ ریان لاؤ بیگم صاحبہ آپ کے پلنگ کے قریب چھایا کرتی ہیں۔ چھایا کرتے ہوئے چڑیوں کی

آواز کو سنتے اور پان کھانے کے لئے آپ کو نصف گھنٹہ چاہئے۔ پھر باخاندہ جاتے ہیں، ہاتھ منہ دھوتے اور ناشتہ کرتے آپ کو ساڑھے دس بجے جاتے ہیں۔ اور گیارہ بجے اچکن پہن کر دفتر میں تشریف لے جاتے ہیں۔ آپ کے ملازم جب جاتے ہیں کہ آپ گیارہ بجے تشریف لاتے ہیں تو وہ بھی پونے گیارہ بجے سے پہلے دفتر میں قدم رکھنا حرام سمجھتے ہیں۔ آپ کے تمام کے تمام ملازم دلی کے رہنے والے نازک مزاج اصحاب ہیں۔ دفتر کے بندہ بڑے کا وقت پانچ بجے ہو تو یہ تین بجے ہی سے ہی گھڑی کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، کہ گھڑی کی سوئی کب آگے بڑھے اور یہ گھر کو جائیں۔ آپ چار بجے دفتر سے روانہ ہو کر گھر پہنچتے ہیں۔ بیوی چائے پلاتی ہیں۔ پان کھلاتی ہیں اور آپ اچکن پہن کر اور چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر کے لئے تشریف لے جاتے ہیں ایک دو چار چار ڈیڑھ گھنٹے بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر تفریح نامکمل رہتی ہے۔ پھر ایڈورڈ پارک میں آتے ہیں اور سیر و تفریح کے بعد دس بجے واپس گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ تو کیفیت آپ کی ہے۔ سیری حالت یہ ہے کہ صبح ۶ بجے میز پر بیٹھا ہوا میز پر ہی چائے پیتا ہوں۔ یہاں ہی کھانا کھاتا ہوں۔ دفتر کے لوگ تمام کے تمام پنجابی میں بد نظرتا کام کی پروا کرتے ہیں۔ وقت کی پروا نہیں کرتے۔ دس بجے دفتر کا وقت ہو تو نو بجے ہی دفتر میں پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ گھر میں ان کو کوئی کام نہیں ہوتا، اور بغیر کام ان کا جی گھبراتا ہے۔ شام کو یہ لوگ دفتر سے اُس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک کہ یہ اپنا تمام کام ختم نہ کر لیں۔ چنانچہ ان کو بھی دفتر میں رات کے اٹھ اٹھ بجے جاتے ہیں۔ میں صبح چھ بجے کامیز پر بیٹھا رات کو دس گیارہ بجے بعض اوقات بارہ بجے اٹھتا ہوں۔ رات کو خواب آتے ہیں تو وہ بھی اشاعت کو زیادہ کرنے اور استہانات بڑھانے کے۔ نہ کوئی سیر ہے، نہ تفریح، نہ کبھی کسی پارٹی میں جاتا ہوں، نہ کسی دوست کے ہاں۔ تو فرمائیے آپ کو کامیابی کیوں ہو اور مجھے ناکامی کیوں؟

قاری صاحب میری یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے۔ اُس ہفتہ میں ہی انھوں نے اپنے اخبار کو بند کر دیا۔ آپ آج کل ریڈر شپ میں مگلازم ہیں ان کے ساتھ کئی برس سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ جب بھی کبھی جلتے ہیں تو ساڑھے تین ہزار روپیہ کے نقصان کا اُس طرح ہی گلہ کرتے ہیں جس طرح کوئی قرض خواہ بینا کسی نادہن مقرر رض سے قرضہ وصول کرنے کے لئے تھکاؤ کرتا ہے اور اس قرضہ کو بحال نہیں سکتا۔

میرے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اگر کوئی فرشتہ نبی آسمان سے نازل ہو اور وہ محنت نہ ہو تو اُس کی کامیابی کا اس دنیا میں کوئی امکان نہیں اور اگر کوئی شخص انتہائی محنت ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں۔ جو اس کو قدم قدم پر ناکامی کی طرف لے جاتا ہے (تو اس شخص کے کامیاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ میں نے درجنوں سیلٹ میڈ لوگوں کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، ان سے پتا ہوا، اور ان سے ان کی کامیابی کے متعلق گفتگوں باتیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں بلکہ انتہائی محنت نہ تھا، اور میں نے تجارتی دنیا میں ناکام اور تباہ حال لوگوں کے حالات پر بھی غور کیا ہے ان میں سے پچھتر فی صدی ایسے لوگ تھے جن کا وقت محنت کی جگہ عیش و آرام کی نذر ہوا۔

”ریاست“ کی پچھلے کئی برس کی زندگی میں میرا اندازہ ہے کہ لاہور، دہلی، پٹنہ اور دوسری جگہوں سے ایک سو کے قریب ایسے اخبارات جاری ہوئے۔ جنہوں نے ”ریاست“ کی نہ صرف شکل و شباہت بلکہ مضامین کی ترتیب اور اس کے عنوانات کی بھی تقلید کی۔ مگر ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہوگا جس کو ”ریاست“ جیسی

کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ چنانچہ اب اس کے نئے دُہری کو لیجئے۔ یہ پرچہ ”ریاست“ کا بارہواں نمبر ہے۔ گویا کہ اس کو جاری ہوئے ابھی صرف تین ماہ ہوئے ہیں۔ مگر باوجود اس بات کے کہ کام کرنے والے اچھے آدمی اب تنگ نہیں مل سکے، اس مئی کے مہینے میں اس کے اشتہارات کی آمدنی دو ہزار روپیہ ہمارے قریب ہے اور اشاعت کے لحاظ سے بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی آزدو کا ایسا ہفتہ وار اخبار ہوگا جو ”ریاست“ کا مقابلہ کر سکے۔

ان تمام حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ”ریاست“ کی تمام کامیابی کا سبب صرف محنت ہے اور جو لوگ ناکام ہوئے وہ محنت نہ کرنے کے باعث۔

## والیان ریاست کا انتقام

ایڈیٹر ”ریاست“ جب مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں تھا تو اُس زمانہ میں اس کے تعلقات وہاں کے ایک بٹے لالہ جوت رام کے ساتھ بہت گہرے اور دوستانہ تھے۔ یہ لالہ جوت رام ذات کے تو بٹے تھے مگر بہت ہمارے فیاض دوست، نواز اور سیر چشم تھے۔ چنانچہ آپ کی ان صفات کے باعث تمام دوست آپ کو ”پٹھان بیا“ کہا کرتے ان لالہ جوت رام کے ساتھ ایڈیٹر ”ریاست“ کا لین دین بھی تھا۔ یعنی جب ضرورت ہوتی ان سے روپیہ لیا جاتا۔ اور پھر واپس کر دیا جاتا۔

ایڈیٹر ”ریاست“ جب مانسہ سے لاہور ”خالصہ اخبار“ کو ایڈیٹ کرنے کے لئے چلا گیا۔ تو اُس وقت حساب میں ایڈیٹر ”ریاست“ کے ذمہ لالہ جوت رام کا دوسرو روپیہ تھا۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ نے لاہور پہنچنے پر لالہ جوت رام کو ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ یہ دوسرو روپیہ میں چند روز کے اندر آپ کو ادا کر دوں گا۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد یہ روپیہ لالہ جوت رام کو واپس کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے کئی برس بعد ایک مقامی مقدمہ کے سلسلہ میں لالہ جوت رام کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ پٹیالہ پولیس جب تلاشی لے رہی تھی۔ تو تلاشی لینے والے سب انسپکٹرنے وہ کارڈ بھی دیکھا۔ جو ایڈیٹر ”ریاست“ نے دوسرو روپیہ کے متعلق لالہ جوت رام کو کئی برس پہلے لکھا تھا۔ اور چونکہ تلاشی لینے والے کو علم تھا۔ کہ ہمارا جہ پٹیالہ ”ریاست“ کے مضامین کے باعث ایڈیٹر ”ریاست“ کے دشمن ہیں اس نے یہ کارڈ لے لیا۔ اور ان پکٹر جنرل پولیس کو بھیجا۔ اس کارڈ کے پہنچنے پر پٹیالہ کے انسپروں کے درمیان کا نفرین ہوئی کہ اس کارڈ کو کس طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کارڈ کے دوسرو روپیہ کو ایک امانت قرار دیا جائے، اور امانت میں خیانت کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا جائے۔

پٹیالہ کے انسپروں کے اس فیصلہ کے بعد اس معاملہ کے لئے ایک جڑا پولیس افسر خاص طور سے مقرر کیا گیا یہ افسر مانسہ آیا۔ اس نے لالہ جوت رام سے حکومت کا دباؤ ڈال کر یہ بیان لیا کہ کارڈ لکھنے سے چند ماہ پہلے دیوان سنگھ مانسہ سے بھٹنڈہ جا رہا تھا تو لالہ جوت رام نے دوسرو روپیہ ساون سنگھ ٹھیکہ دار شہر اب بھٹنڈہ کو دینے کے لئے دیوان سنگھ کو دیئے۔ مگر دیوان سنگھ نے ساون سنگھ کو یہ روپیہ دیا۔ اور امانت



میں خیانت کی۔ مانسہ کے دو نمبر داروں سے بیان لیا گیا کہ ان کے سامنے اور ان کی موجودگی میں لالہ جوت رام نے دیوان سنگھ کو دوسروں پر یہ روپے سادون سنگھ کو دیئے دیئے کہ یہ روپے سادون سنگھ کو دیئے جائیں اس افسر نے بھٹنڈہ جا کر سادون سنگھ سے یہ بیان لیا کہ لالہ جوت رام نے دوسروں پر یہ دیوان سنگھ کے ہاتھ آتے بھیجا مگر دیوان سنگھ نے یہ روپیہ اُسے نہیں دیا۔ چنانچہ ان شہادتوں کی بنیاد پر ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمہ کی کارروائی ریاست پٹیل میں شروع ہوئی۔

لالہ جوت رام بہت نیک فطرت اور دوست پرست تھے۔ آپ نے دبا دیں اگر یہ بیان تو دے دیا۔ مگر آپ اگلے روز ہی دہلی پہنچے، ایڈیٹر "ریاست" سے ملے۔ اور تمام واقعات بیان کئے۔ کہ پولیس نے کس طرح ان کو دھمکی دی کہ اگر وہ دیوان سنگھ کے خلاف بیان نہ دیں گے تو خود ان پر کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کیا جائے گا۔ سادون سنگھ ٹھیکیدار سے کہا کہ اگر وہ بیان نہ دے گا تو اس کا ٹھیکہ غلط کر لیا جائے گا۔ اور آئندہ کبھی ٹھیکہ نہ دیا جائے گا۔ اور نمبر دار تو پولیس کے قیدی اور خاندانی گروہ کے تھے۔ جن کا کام ہی پولیس کو امداد اور جھوٹی شہادتیں دینا ہے۔

لالہ جوت رام نے جب یہ تمام حالات بتائے تو ایڈیٹر "ریاست" نے پوچھا کہ کیا آپ وہ دوسروں پر یہ اس زمانے میں لے چکے ہیں، یا نہیں۔ لالہ صاحب نے کہا۔ ہاں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے پوچھا کیا آپ کو رسید دینے میں کوئی اعتراض ہے۔ آپ نے کہا کوئی اعتراض نہیں چنانچہ لالہ جوت رام نے رسید کی ٹکٹ لگا کر رسید لکھ دی کہ دوسروں پر جو حساب میں دیوان سنگھ کے فتنے تھا، اس زمانہ میں ہی کارڈ لکھنے کے چند روز بعد اپنے دیں لے لیا تھا۔ اور اس کے بعد ایڈیٹر "ریاست" کے فتنے کوئی روپیہ نہ تھا۔ اس رسید کے بعد لالہ جوت رام کی پوزیشن بہت تازہ تھی۔ مانسہ میں وہ پولیس کو بیان دے چکے تھے کہ دیوان سنگھ نے امانت میں خیانت کا جرم کیا۔ یہاں آنکھوں نے رسید لکھ دی۔ آپ ہمارا چٹیلالہ کی رعیت، اور ہمارا چٹیلالہ دیوان سنگھ کے دشمن۔ یہ سب کچھ تھا مگر بہادر اور دوست پرست جوت رام دوستی اور سچائی کے لئے مصائب کو ٹھیک کہنے کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ لالہ جوت رام ایڈیٹر "ریاست" کو رسید دے کر تمام حالات بتا کر اور دو تین دن ایڈیٹر "ریاست" کے ہمارے وہ کر واپس مانسہ چلے گئے۔

ایڈیٹر "ریاست" کا یہ تجربہ ہے کہ جب کبھی اس نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ لوگ بغیر واقفیت کے بھی اس کے ہمدرد ہو گئے۔ اور کوئی ریاست ایسی نہیں، جو اس کے خلاف ہو، اور وہاں کے لوگ اس کے ہمدرد اور معادن ثابت نہ ہوتے ہوں۔ چنانچہ یہی کیفیت پٹیلالہ کے متعلق تھی۔ لالہ جوت رام کے دہلی سے جانے کے چند روز بعد پٹیلالہ سے ایک سب انسپکٹر پولیس کا پرائیویٹ پیغام ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچا کہ پٹیلالہ پولیس لالہ جوت رام کے بیان کی بنیادوں پر مقدمہ کی تکمیل کر رہی ہے۔ اور کوشش جاری ہے کہ ایکٹ گورنر جنرل ریاست اُسے پنجاب اس مقدمہ میں ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق دیوان سنگھ کو ریاست پٹیلالہ کے حوالہ کر دیں۔ تاکہ ہمارا چٹیلالہ دیوان سنگھ سے پٹیلالہ جیل میں انتقام لے سکیں۔

اس اطلاع کے چند روز بعد ایڈیٹر "ریاست" ایک روز صبح چھ بجے اخبار کے لئے مضامین لکھ رہے تھے تو ایک نوٹ لکھا کہ دفتر "ریاست" اور رہائشی مکان اس زمانہ میں درنوں دریا گنج کی ایک کونٹھی میں تھے کہ پولیس نے حاصرہ

کر لیا ہے۔ اور دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے انسپکٹر نذیر الحق۔ پٹیل پولیس کے سپرنٹنڈنٹ فضل کریم اور دو درجن کے قریب دہلی اور پٹیل کے سب انسپکٹر، ہیڈ کنسٹیبل اور کنسٹیبل موجود ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے نذیر الحق صاحب سے پوچھا، معاملہ کیا ہے۔ تو آپ نے بتایا کہ ریاست پٹیل نے امانت میں خیانت کا ایک مقدمہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف چلایا ہے۔ اس سلسلہ میں ہی تلاشی اور گرفتاری ہوگی۔ نذیر الحق صاحب کے بنانے پر ایڈیٹر "ریاست" نے کہا کہ سب سے پہلے آرن سیف میں لالہ جت رام کی رسید لی جائے۔ چنانچہ رسید لی گئی، اور اس پر نذیر الحق صاحب اور مسٹر فضل کریم اور گواہوں کے دستخط ہو گئے۔ لالہ جت رام کی رسید دیکھ کر فضل کریم صاحب کے چھکے چھوٹ گئے یہ پولیس کے کام میں بہت جلد اختیار تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مقدمہ تیار کرنے کی تمام محنت ہربانی پھر گیا، دفتر میں سلمان بہت تھا۔ سورج کے غروب ہونے تک تلاشی جوتی رہی۔ مگر ابھی کئی کمرے باقی تھے۔ اس لئے بقایا کردوں کو تالا لگا کر پھر لگا دیا گیا۔ تاکہ اگلے روز صبح پھر تلاشی ہو۔ تلاشی کی یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ دہلی کے اخبارات کے ایڈیٹر اور دوست احباب دن بھر جمع ہے رات کو آٹھ بجے کے قریب نذیر الحق صاحب ایڈیٹر "ریاست" کو کوٹوالی لے گئے۔ "ملازم" کو اس زمانہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک دیوی دیال کے سپرد کر دیا گیا، اور فضل کریم صاحب نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ ملازم کو حالات میں بند کر دیا جائے۔ ملک صاحب اپنے کام میں بہت ہوشیار اور نیک شخصیت تھے آپ نے جواب دیا کہ حالات میں بند کرنا دہلی پولیس کا کام ہے، آپ ہوٹل میں جا کر آرام کیجئے اور صبح پھر تلاشی کے لئے تشریف لائیے فضل کریم صاحب کے فاختانہ افسران میں ہوٹل جانے کے بعد ملک دیوی دیال نے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی سٹراٹگن کو ٹیلی فون پر کہا کہ دیوان سنگھ بہت با اثر اخبار نویس ہے۔ اسمبلی اور کونسل آف میٹس کے اکثر ممبر اس کے دوست ہیں۔ اور مقدمہ کی کیفیت یہ ہے کہ زیر بحث الزام کے متعلق ملازم نے مستغیث کی رسید پیش کر دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مقدمہ کا کوئی وجود نہیں رہا۔ پٹیل والے چاہتے ہیں کہ ملازم کو حالات میں بند کر دیا جائے۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ ممکن ہے کل کو کل پولیس اور پول کوٹنٹ کے لئے اسمبلی یا کونسل آف میٹس میں جواب دینا مشکل ہو جائے۔ سوچ لیجئے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ملازم کو حالات میں بند کر دوں یا نہ کر دوں۔ سٹراٹگن نے ڈپٹی کسٹرنسٹر جانسن کو ٹیلی فون کیا۔ تمام حالات بتائے۔ مسٹر جانسن نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ ملازم کو پانچ سو روپیہ کی ضمانت پر فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ اطلاع ملک دیوی دیال کو رات کے دس بجے کے قریب پہنچی۔ ملک صاحب نے ایڈیٹر "ریاست" اور اس کے ضامن مسٹر کرشن داس کو ٹیلی فون پر "نبطل کال" "رجسٹرڈ" "ہندوستان ٹائمز" کے مینیجر تھے) کو موٹر میں ساتھ لیا۔ ہم لوگ رات کو گیارہ بجے کے قریب مسٹر رئیس سیٹیو سٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچے۔ مسٹر رئیس کو جگایا۔ ضمانت تصدیق کی گئی، اور ملک صاحب اسی موٹر میں ایڈیٹر "ریاست" کو دفتر "ریاست" میں چھوڑ گئے۔

مسٹر فضل کریم صبح اٹھتے ہی دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ تاکہ پٹیل کی اپنی امانت سے خیر خیریت پوچھیں۔ جو رات بھر دفتر "ریاست" کی نگرانی کرتی رہی، آپ نے جب دیکھا کہ ایڈیٹر "ریاست" بجائے حالات کے اپنے گھر پر ہے ان کا رنگ فق ہو گیا۔ بھاگے ہوئے کو توالی گئے۔ ملک دیوی دیال سے پوچھا تو ملک صاحب نے بتایا کہ ملازم کو ڈپٹی کسٹرنسٹر کے حکم سے ضمانت پر رہا کیا گیا ہے فضل کریم صاحب گیا کر سکتے تھے۔ اپنا سر پر گرہ لگئے۔ اگلے روز پھر تلاشی ہوئی۔ جو چند گھنٹے جاری رہی۔ تلاشی کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے مسٹر دیورتی ممبر کونسل،

آئن سٹینٹ رجسٹریٹر ریاست کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے) سے مشورہ کیا۔ اور مشورہ کے بعد دیوان گیارہ بجے سیکریٹری ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب (رجسٹریٹر اندور میں وزیر اعظم بنے) کو لاہور ٹیلیفون کیا کہ کرنل سینٹ جان ایجنٹ گورنر جنرل کہاں ہیں۔ دیوان صاحب نے بتایا کہ وہ شملہ میں ہیں اور وہاں کرنل ہوس میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ایڈیٹر ریاست رات کو وہاں سے سوار ہو کر صبح کالکا پہنچا۔ کالکا سے مرٹر ریل میں دس بجے کے قریب شملہ پہنچا۔ اور وہاں سے کرنل ہوس میں ٹیلی فون کیا، تو ایک لیٹری نے بتایا کہ کرنل سینٹ جان آج صبح بذریعہ مرٹر ڈیوڑھی چلے گئے ہیں اور وہ وہاں ٹھہر کر ریاست چھبہ دہ پور چلیئے۔ ایڈیٹر ریاست "اسی روز شام کو پھر ڈیوڑھی کے لئے شملہ سے سوار ہوا۔ اگلے روز دوپہر کو پٹھان کوٹ پہنچا۔ اور اس سے اگلے روز صبح ڈیوڑھی پہنچ کر چھبہ ہوس میں کرنل سینٹ جان سے ملے گیا۔ چھبہ ہوس پہنچ کر چٹرا پری کو درختنگ کا روڈ دیا۔ تو سسر سینٹ جان برآمدہ میں آگئیں۔ یہ قانون بہت اچھی طرح سے پیش آئیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ اور چائے وغیرہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ میں ابھی ہوٹل میں بی کر آیا ہوں۔ سسر سینٹ جان نے اپنے شوہر کو اطلاع کی تو ان کے شوہر نے دفتر کے کمرہ میں بلایا۔ میں نے کرنل سینٹ جان کو بتایا کہ یہ مقدمہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے، اور چونکہ ہمارا جہ پٹیلہ دشمن ہیں اس لیے یہ مقدمہ بنایا گیا تاکہ ہمارا جہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت ظلم کرنے کے لئے مجھے پٹیلہ لے جائیں۔

کرنل سینٹ جان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس مقدمہ کے متعلق ہمارا جہ پٹیلہ یا ان کے ذرائع سے کسی سے ان کی بات ہو چکی ہے۔ بلکہ ان کی منظوری سے کارروائی شروع کی گئی ہے اور ان کو تمام واقعات کا علم ہے۔ کرنل سینٹ جان نے صاف طور سے کہا کہ مقدمہ بچا ہے جھوٹا ہے یا سچا، گورنمنٹ کسی صورت میں بھی مایا یا ریاست کو بے نقاب ہوتا دیکھ نہیں سکتی۔ اور وہ ایڈیٹر ریاست کو ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے تحت لازمی طور سے ریاست پٹیلہ کے حاکم کرے گی۔ ایڈیٹر ریاست نے کہا کہ کیا برطانوی انصاف یہی ہے۔ تو کرنل سینٹ جان نے فوجی انداز میں جواب دیا "ہم انصاف نہیں جانتا ہمارا کام ہے کہ نوابوں اور ہمارا جوں کی پریس کے حملوں سے حفاظت کی جائے۔"

یہ جواب سن کر میں سمجھ گیا کہ ایجنٹ گورنر جنرل اور ہمارا جہ پٹیلہ ایک ہیں۔ اور اگر ایجنٹ گورنر جنرل نے ایڈیٹر ریاست کو ہمارا جہ کے حوالہ کر دیا تو اس حکم میں ہائی کورٹ بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل کے حکم کے مطابق اگر ایڈیٹر ریاست کو پٹیلہ بھیج دیا گیا، تو وہاں دشمن کے جیل کا ایک دن بھی ساہا سال کی ہر روز کی مرٹ سے زیادہ عذاب کا باعث ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں اپنے آپ کو پٹیلہ کے حوالہ نہ ہونے دوں گا۔

ڈیوڑھی سے سوار ہو کر ٹانگہ میں پٹھان کوٹ پہنچا۔ کیونکہ وہاں کوئی مرٹر یا لاری نہ مل سکی۔ پٹھان کوٹ سے ریل شروع ہوتی ہے۔ مگر میں ریل میں نہ بیٹھا خیال تھا کہ شاید پٹیلہ پریس نے ایجنٹ گورنر جنرل سے وارنٹ چل کر لئے ہوں۔ پٹھان کوٹ سے لاری میں سوار ہوا، امرتسر پہنچا۔ امرتسر سے دوسری لاری پر سوار ہوا، جالندھر چھاؤنی پہنچا، رات کو کلکتہ جانے والی گاڑی جب لاہور سے جالندھر چھاؤنی پہنچی، تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر کوپے میں بیٹھ گیا۔ کمرہ کو اندر سے بند کر لیا۔ رات کو غیندہ آئی۔ زندگی کا آئندہ بردگراں بناتا رہا۔ اگلے روز صبح دس بجے کھنکھنچا۔ کھنکھریوے سٹیشن سے "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف" کے دفتر میں گیا وہاں اس اخبار کے ایڈیٹر مسٹر زنگا آکر سے ملا۔

تمام حالات بتائے۔ اور کہا کہ میں ہمیشہ کے لئے فرانس کے علاقہ پانڈیچری میں جا رہا ہوں۔ راستہ اور مدراس کے لوگوں سے ناداقت ہوں۔ میرے ساتھ پانڈیچری چلے۔ اور مجھے وہاں چھوڑ آئیے۔ مسٹر رنگا آرمیہ گہرے دوست تھے۔ فوراً تیار ہو گئے۔ ہم لکھنؤ سے کانپور گئے۔ کانپور سے جھانسی۔ جھانسی صبح کے وقت پہنچے۔ جھانسی سے سولہ میل کے فاصلہ پر ریاست دتیا ہے۔ وہاں ایک ہم وطن اور دوست لالہ بشن داس چوڑہ ملازم تھے۔ جھانسی سے دتیا پہنچے تاکہ اخبار پریس، اور حافظ آباد کی جو کچھ بھی تھوڑی بہت زمین مکان وغیرہ جائیداد ہے ان کے نام منتقل کر دوں کیونکہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب آئندہ زندگی میں ہندوستان کے برطانوی علاقہ میں نہ آسکوں گا۔

ہم دتیا لالہ بشن داس چوڑہ کے مکان پر پہنچے۔ لکھمت پڑھت کے متعلق مشورہ ہو رہا تھا تو ایک فسر نے ہمیں لالہ بشن داس کے مکان پر بیٹھا دیکھا وہ صاحب قاضی سر عزیز الدین احمد دیوان دتیا کی کٹھی پر ان سے ملنے کے لئے جا رہے تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب سے ذکر کر دیا کہ دیوان سنگھ آیا ہوا ہے۔ اور لالہ بشن داس چوڑہ کے مکان پر کھڑا ہے۔ قاضی صاحب کو میرے آنے کا جب پتہ چلا تو قاضی صاحب نے اپنی موٹر بھیج کر ہمیں بلوایا۔ ہم جب پہنچے تو آپ نے دوستانہ شکایت کی کہ ان کو آنے کا پتہ کیوں نہ دیا۔

قاضی صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں، مگر میرا دل پانڈیچری میں تھا۔ قاضی صاحب نے محسوس کیا کہ میں کچھ متفکر ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ متفکر کیوں ہو میں نے کہا کہ میں نے جب پھر بار بار پوچھا، تو مسٹر رنگا آرمیہ تمام قصہ سنایا، اور بتایا کہ آج رات تو کپیسریشن میں ہم لوگ بیٹھے جا رہے ہیں یہی سب مدراس جائیں گے، اور وہاں سے پانڈیچری قاضی صاحب اخبار لے ریاست کے لئے صرف مداح تھے۔ بلکہ اس کو بخت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں پانڈیچری جا رہا ہوں اور اخبار لے ریاست، بند ہو جائے گا اور بند ذہبی ہوا تو دیوان سنگھ اس کو آئندہ ایڈیٹر نہ کر سکے گا۔ تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ آپ کچھ دیر سوچتے رہے۔ سوچنے کے بعد فرمایا کہ پٹیل اور دتیا کے درمیان ایکسٹراڈیشن کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں اور پٹیل کے وارنٹوں کی تعمیل دتیا کی حدود میں نہیں ہو سکتی۔ اور ایڈیٹر ریاست، قاضی صاحب یا ریاست دتیا کے ہمارے ہمارے کی صورت میں دتیا میں ہے، جب تک کہ اس جھگڑے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ ایڈیٹر ریاست نے قاضی صاحب سے عرض کیا، کہ ہمارا جہ پٹیل آپ کے دشمن ہو جائیں گے یا پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اعتراض ہو۔ یہ مناسب نہیں قاضی صاحب نے جواب دیا، کہ ہمارا جہ پٹیل کے تعلقات کو دیوان سنگھ کی دوستی پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ اور پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے اعتراض کا وہ جواب دے دیں گے چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ میں چند روز دتیا میں رہوں۔ ایک دوسرے دوست سردار تارا سنگھ انجنیر بھی وہاں ملازم تھے۔ وہ مجھے موٹر میں اپنے ہاں لے گئے۔ میں نے ان کے مکان پر قیام کیا۔ مسٹر دیو مورتی کو ملی تاکہ دیا گیا کہ آپ فوراً دتیا پہنچے۔ وہ دتیا پہنچ گئے۔ پھر سب نے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد اسی روز رات کو مسٹر دیو مورتی شملہ گئے، اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ آپ نے اسمبلی کے تمام ممبران کو جو ان کے گہرے دوست تھے حالات بتائے۔ ممبران اسمبلی حالات سن کر حیران ہو گئے۔ مسٹر نیوگ نے ایڈیٹر فرنٹ مشن پیش کر دی مسٹر پٹیل اسمبلی کے صدر تھے۔ ایک بلچل سی پیدا ہو گئی۔ جرم ممبر کو بھی حالات کا کچھ پتہ نہ تھا وہ حیران تھا کہ ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور دوسروں کو یہی کے الزام میں ایک جرنلسٹ کو کیونکہ ایک دشمن ریاست کے حوالہ کیا جا رہا ہے۔ جرم ممبر نے پریذیڈنٹ اسمبلی سے کہا کہ تھوڑے عرصہ کی قبلت دی جائے۔ تاکہ پولیسکل سیکرٹری سے

حالات معلوم کئے جاسکیں۔ مسٹر کرٹین ڈائریکٹر انفرمیشن بیورو کو رنٹ ہند تھے۔ ہوم ممبر کی ہدایت کے مطابق انھوں نے سر جان تھاچین پولیٹیکل سیکریٹری کو رنٹ ہند سے پوچھا تو انھوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر ہوم ممبر کے یہ وعدہ کرنے پر التوا کی تحریک واپس لے لی گئی کہ جب تک اسمبلی میں اس مسئلہ پر بحث نہ ہوگی اور سوالات کے جوابات نہ دیئے جائیں گے دیوان سنگھ کو ایکسٹرا ڈیوٹی ایکٹ کے تحت پٹیلہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا۔

اسمبلی میں ہوم ممبر کے اس وعدہ پر سر جان تھاچین پولیٹیکل سیکریٹری نے کنٹرل سینٹ جان کو لاہور تار دیا۔ کہ ایڈیٹر ریاست کے معاملہ میں اُس وقت تک کچھ نہ کیا جائے جب تک کہ پولیٹیکل سیکریٹری سے اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اور مسٹر وید موہرتی نے ایڈیٹر ریاست کو دیتا تار دیا کہ فوراً شملہ پہنچو۔ اسمبلی کے ممبران ہل کر خود حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں تار پہنچنے پر شملہ گیا وہاں مسٹرنی۔ داس۔ مسٹرنی۔ سی گروانی راج پھیلے نوں بگال میں مسٹر تھے۔ مسٹر نارائیڈی۔ مسٹر رنگا آکر اور مسٹر نیوگی وجیرہ دوستوں سے ملا۔ تمام حالات بتائے۔ اسمبلی کے لئے سوالات تیار کیئے گئے۔ ایک درجن کے قریب ممبروں نے سپلینٹری سوالات پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ نوٹس کے بعد سوالات دریافت کیئے گئے اور ضمنی سوالات پوچھے گئے۔ مقدمہ کی نوعیت پر اکثر ممبروں نے مذاق اڑایا۔ اور آخر ہوم ممبر نے یقین دلایا کہ دیوان سنگھ کو اس مقدمہ میں پٹیلہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا۔

گورنمنٹ کے اس فیصلہ کے بعد موم ہمارا جہ پٹیلہ سر جان تھاچین کے پاس پہنچے اور کہا کہ ریاست پٹیلہ کی بہت توہین ہوئی ہے۔ اور اگر دیوان سنگھ کو پٹیلہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا تو آپ گدی چھوڑ دیں گے سر جان تھاچین نے ہمارا جہ کو ٹال دیا۔ اور جب ہمارا جہ سر جان سے مل کر چلے گئے۔ تو آپ نے اپنے ڈپٹی پولیٹیکل سیکریٹری مسٹرنی۔ جے کلینسی (جو بعد میں سر پرنسپل کلینسی گورنر پنجاب تھے) سے کہا کہ اگر ہمارا جہ گدی چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں۔ مگر ایک بکری کو بھیڑیے کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ان کا مقصد بلکہ کرنے کے لئے کتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## انگریزوں کا کیرکٹر

”ریاست“ کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ ایک روز حافظ آباد سے میرے ایک قریبی رشتہ دار اور دوست سردار حاکم سنگھ کپور کا خط آیا کہ حافظ آباد کا سب انچکم پولیس یہ تحقیقات کر رہا ہے کہ دیوان سنگھ کی زمین۔ مکان وغیرہ جائیداد حافظ آباد میں کیا کچھ اور کتنی مالیت کی ہے۔ میں نے سمجھا کہ پولیس سیاسی کام کرنے والوں کی ہٹسری شیٹ تیار کرتی ہے، اور اس کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لئے ہر سال اس میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی کئی بار ایسی تحقیقات ہوتی رہی۔ اُس سلسلہ میں ہی شاید اب جائیداد بھی معلوم کی جا رہی ہو۔ چنانچہ سردار حاکم سنگھ کو میں نے جواب دیا کہ معمولی بات ہے۔ پولیس یہ لیتی ہے تو لینے دو۔ جو بد چلتی ہے بتا دو۔

اس خط کے آنے کے دو ہفتہ بعد ایک دزراقم الحروف دفتر سے نیچے اُترا اور موٹر میں سوار ہو کر باہر چلے

والا تھا۔ کہ دیوانی عدالت کے ایک پیادہ نے دوسن دیئے۔ ایک سمن تو سول جج سکھر (سندھ) کی عدالت کا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ مسٹر ٹانٹن آئی۔ سی۔ ایس جیف منسٹر ریاست خیر پور (جو بعد میں گورنر بمبئی کے ایڈیٹر دائر اور منسٹر محفل ہونے کے باعث صدر بمبئی کے سپاہ و سفید کے مالک تھے) نے دس ہزار روپے کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ فلاں تاریخ کو جواب دعویٰ کے لئے سکھر میں حاضر ہو جاؤ۔ دوسرا سمن یہ تھا کہ اسی تاریخ کو حاضر ہو کر وجہ بتاؤ کہ مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے یعنی قبل از دہ گری تمہاری حافظ آباد کی جائیداد کیوں نہ عارضی طور سے قرن کر لی جائے تاکہ تم اس جائیداد کو خورد برد نہ کر سکو۔

میں نے دونوں سمنوں پر دستخط کر دیئے اور موٹریں سیر کر چلا گیا۔

اس مقدمہ کے واقعات یہ ہیں کہ مرحوم ہزہائیس میر صاحب خیر پور دہلی میں آئے۔ تو ایک روز سیٹے کے لئے دفتر ”ریاست“ میں بھی تشریف لائے۔ میر صاحب کا وزن مرحوم مولانا شوکت علی سے دو گنے کے قریب تھا آپ زینہ پر چڑھ نہ سکتے تھے۔ اپنی کار کو نیچے کھڑا کیا اور اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو اوپر بھیج کر راقم الحرف کو بلوایا۔ میں موجود نہ تھا۔ واپس چلے گئے۔ جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے تھے۔ چنانچہ اگلے روز ان کی جائے رہائش (جو دریا گنج میں ایک کوٹھی میں تھی) پر پہنچا۔ میر صاحب سے ملا۔ دو گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ یہ اپنی مظلومیت کے حالات بتاتے رہے کہ ان کا وزیر اعظم مسٹر ٹانٹن آئی۔ سی۔ ایس جس کو بمبئی گورنمنٹ نے خیر پور میں پورے اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں ریاست خیر پور ریزرڈینٹ پنجاب کے ماتحت نہ تھی بلکہ سندھ میں ہونے کے باعث گورنر بمبئی کے ماتحت تھی ان کو تنگ کر رہا ہے اور یہ اپنے اس وزیر اعظم سے انتہائی پریشان ہیں۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ میر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اُن کے پاس ایک دو روز پہلے خیر پور سے یہ اطلاع آئی ہے کہ مسٹر ٹانٹن شکار کو گئے ہوتے تھے۔ وہاں آپ نے کسی جانپور بے احتیاطی کے ساتھ بندوق چلائی۔ اور گولی ایک لڑکی کو لگی۔ جو ہلاک ہو گئی۔ میر صاحب کی ذاتی تکلیفیں اور پریشانیوں تو ایڈیٹر ”ریاست“ کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ مگر ایک دیہاتی لڑکی کا گولی سے مار دیا جانا بہت افسوسناک تھا ایڈیٹر ”ریاست“ نے اس ہفتہ کے پرچہ میں ایک سخت نوٹ لکھا جس میں تمام واقعہ لکھنے کے بعد تنقید کی گئی کہ انگریز آئی۔ سی۔ ایس ریاستوں میں جا کر انسانوں کو بھی جانوروں سے زیادہ جثیت نہیں دیتے۔ اور بے احتیاطی کے ساتھ معصوم لڑکیوں تک کو گولیوں سے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ”ریاست“ میں یہ نوٹ چھپ گیا۔ تو میر صاحب کو ان کے ایک عکازم نے خیر پور سے اطلاع دی کہ وہ لڑکی مری نہیں بلکہ چھڑوں سے صرف زخمی ہوئی۔ اور چھترے ہسپتال میں ڈاکٹر نے نکال دیئے۔ چنانچہ اگلے ہفتہ ہی اس نوٹ کے متعلق لکھ دیا گیا کہ لڑکی کے مرنے کا واقعہ غلط ہے۔ لڑکی چھڑوں سے زخمی ہوئی تھی اور چھترے نکال دیئے گئے۔

پہلے نوٹ کے چھپنے کے بعد دہلی گورنمنٹ کے برین سپرنٹنڈنٹ (جو اُس زمانہ میں مرزا عبد الرحمن تھے) نے اپنی ڈیوٹی سمجھتے ہوئے۔ اس نوٹ کا کٹنگ اور اس کا ترجمہ بمبئی گورنمنٹ کو بھیجا۔ بمبئی گورنمنٹ نے مسٹر ٹانٹن سے جواب طلب کیا کیونکہ الزام ایک لڑکی کو ہلاک کرنے کا تھا۔ مسٹر ٹانٹن نے جواب دیا کہ الزام غلط ہے۔ انھوں نے کسی لڑکی کو ہلاک نہیں کیا۔ صرف ایک دھچھرے لگے جو نکال دیئے گئے۔ اس جواب کے بعد بمبئی گورنمنٹ نے مسٹر ٹانٹن سے کہا کہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے سرکاری خرچ سے ایڈیٹر ”ریاست“ پر دیوانی مقدمہ دائر کر دو۔ چنانچہ سکھر کا

سرکاری وکیل مقدمہ کی پیروی کے لئے مقرر ہوا۔ اور سرکاری کیوٹ فیس لگا کر مقدمہ دائر کر دیا گیا اس سلسلہ میں ہی مقدمہ سے پہلے حافظ آباد کی جائیداد ریافت کی گئی اور سمن پہنچے۔

مقدمہ کی تاریخ سے تین چار روز پہلے ایڈیٹر ”ریاست“ مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ دہلی اور مسٹر بشن میں چوڑہ (جو بعد میں خطاب یافتہ رائے صاحب اور ریاست میکانیز میں ریونیو کیشنر بنے) سکھر گئے۔ وہاں روہری جنگلشن کے ریلوے سٹیشن کے وٹینگ روم میں قیام کیا۔ میں اور توکلی صاحب تو سکھر گئے تاکہ کوئی مقامی وکیل بھی مقرر کیا جائے۔ اور لالہ بشن داس خیر پور گئے تاکہ وہاں کے سٹیٹ انجینئر مسٹر ساہی سے بل کر مسٹر ٹائٹن سے صلح و صفائی اور مقدمہ واپس لینے کی گفت و شنید کی جائے۔

لالہ بشن داس جب واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ صلح و صفائی کا کوئی سوال نہیں۔ مسٹر ساہی نے بہت کوشش کی۔ مگر مسٹر ٹائٹن نہیں مانے۔ وہ اپنی بہت سخت توہین سمجھتے ہیں کہ ان پر لڑکی کو ہلاک کرنے کا الزام لگایا گیا۔ سکھر میں ہم لوگ جب عدالت میں گئے۔ تو مسٹر توکلی نے پرائیویٹ طور سے سرکاری وکیل سے کہا کہ بطور ایک غیر جانبدار جرنلسٹ کے ایڈیٹر ”ریاست“ نے اپنے پرچہ کی اگلی اشاعت میں ہی جب کہ اس کو علم ہوا لڑکی کے مرنے کی تردید کر دی۔ اور چھتروں سے مسٹر ٹائٹن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ مگر سرکاری وکیل نے اپنی جے بی کا انکار کیا اور کہا کہ مسٹر ٹائٹن کسی صورت میں بھی مقدمہ واپس نہ لیں گے۔ وہ بہت سخت غصہ میں ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی سخت توہین ہوئی۔

ہم لوگ مقدمہ کی پیشی کے بعد واپس دہلی آ گئے۔ اگلے روز راقم الحروف حسب معمول شام کو مسٹر کے ہی رائے مینجنگ ڈائریکٹر ایو سی ایڈ پریس (جن سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور جن سے ایڈیٹر ”ریاست“ دوسرے تیسرے روز ہلاک تھا) کے ہاں گیا۔ تو مسٹر رائے نے کئی روز نہ ملنے کا سبب پوچھا۔ میں نے بتایا کہ مقدمہ کی پیشی پر سکھر گیا ہوا تھا۔ آپ نے مقدمہ کے تمام حالات سنئے تو پوچھا کہ مسٹر ٹائٹن کس صوبہ کی عدالت سے تعلق رکھتے ہیں میں نے کہا بمبئی کے صوبہ سے۔ وہاں سے ہی بطور لینٹ آفیسر خیر پور میں گورنر بمبئی کے ماتحت ہے مسٹر رائے نے فرمایا کہ بمبئی گورنمنٹ میں ان کے دو افسر بہت گہرے دوست ہیں۔ ایک سرارنیسٹ ہائسن ہرم ممبر (جو گورنر کے رخصت پر ولایت جانے کے باعث عارضی طور سے ان دنوں گورنر بمبئی تھے) اور دوسرے مسٹر یونگ جنرل سکریٹری بمبئی گورنمنٹ۔ ان دونوں کے نام خط لے کر بمبئی جاؤ تاکہ مقدمہ واپس لیا جائے۔ دو تین روز کے بعد مسٹر رائے نے دونوں اصحاب کے نام مجھے خط دیئے۔ جن میں لکھا تھا کہ دیوان سنگھ آپ کا گہرا دوست ہے۔ اور یہ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ یہ خط لے کر بمبئی گیا۔ مگر میٹل کا زانہ تھا۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ نہ تو گورنر سرارنیسٹ ہائسن وہاں ہیں۔ نہ مسٹر یونگ دونوں بمبئی گورنمنٹ کے گرائی صدر مقام ہاں بلیشور پہاڑ پر ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ بمبئی سے پوچھا گیا۔ پوچھا تو اسے موٹر کے ذریعے ہاں بلیشور پہنچا۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ جس کا مالک پارسی تھا غسل کر کے کپڑے بدلے اور مسٹر یونگ کے پاس پہنچا مسٹر یونگ نہایت خرم رہا۔ ملنسار اور اچھے آدمی تھے۔ مسٹر رائے کا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور کچھ دیر مسٹر رائے کی صحبت کے متعلق پوچھتے رہے۔ آپ نے بتایا کہ ریاستوں کا محکمہ مسٹر ٹرور آئی۔ سی۔ ایس پولیس سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کے ماتحت ہے جو کچھ مسٹر رائے چاہتے ہیں مسٹر ٹرور گویں گے اور سرارنیسٹ ہائسن سے پہلے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ

مسٹر یونگ نے ٹیلیفون پر مسٹر ٹرنر کو کہا کہ ایڈیٹر ریاست“ آرہے۔ اس سے بل لیا جائے۔ اور مسٹر رائے کی خواہش کے مطابق مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ مسٹر یونگ نے مسٹر ٹرنر کو ٹیلیفون کرنے کے علاوہ ایک خط بھی دیا۔ اور ساتھ مسٹر رائے کا خط بھی اس خط میں ملحوظ کر دیا۔ میں یہ خط لے کر مسٹر ٹرنر کے پاس پہنچا۔ تھوڑی تھوڑی بلنڈا باندی جو رہی تھی۔ مسٹر ٹرنر برآمدہ میں بیٹھے سرکاری فائلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ فوراً بلایا۔ مسٹر ٹرنر بہت شن مزاج اور متعصب قسم کے آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ آپ نے کہا۔ کہ لڑکی کو ہلاک کرنے کی اطلاع کہاں سے ملی۔ میں نے جواب دیا۔ میں اس کے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ یہ صحافتی کیرئیر کے خلاف ہے۔ آپ نے کہا کہ مسٹر ٹانٹن کا بیان ہے کہ میر صاحب خیر پور نے یہ اطلاع دی ہیں۔ آپ نے کہا۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ غصہ میں آ گئے۔ اور کہا کہ میر خیر پور جیسے ناقابل اعتبار آدمی کا کیوں اعتبار کیا گیا۔ میں نے کہا کہ میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ کہ میر خیر پور نے مجھے بتایا مگر چونکہ آپ کہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر میر خیر پور اتنے ہی ناقابل اعتبار ہیں۔ تو گورنمنٹ کے کاغذات میں وہ ہر سائنس کیوں ہیں۔ اور ان کی تو پہلی کی سلامی کیوں مقرر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ ریاستوں کی بے زبان رعایا کو ناقابل اعتبار دالیان ریاست کے سپرد اس طرح کرتی ہے جیسے بھیڑوں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا جائے۔ میرا یہ جواب سن کر مسٹر ٹرنر میسرے، اٹھنے کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ وہ توقع نہ کرتے تھے کہ یہ الفاظ ان سے وہ شخص کہے گا۔ مقدمہ میں صلح کی درخواست کر رہا ہو۔ اس کے بعد مسٹر ٹرنر نے کہا کہ اخبارات کے حملہ سے انڈین سول سروس کے افسر بھی محفوظ نہیں۔ میں نے کہا کہ مسٹر ٹانٹن سے کوئی عداوت نہ تھی۔ بغیر واقعہ کے الزام نہیں لگایا گیا۔ مسٹر ٹانٹن کی بندوق سے لڑکی زخمی ہوئی۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی مری نہیں زخمی ہوئی تو فوراً لکھ دیا گیا کہ مرنے کی اطلاع غلط تھی صرف زخمی ہوئی۔ اس میں اخبار کا کیا قصور ہے۔ مسٹر ٹرنر نے جواب دیا کہ گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی اخبارات کے آئی۔ سی۔ ایس افسروں کے خلاف لکھنے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مسٹر ٹرنر میرے جواب سے بہت غصہ میں تھے۔ آپ نے کہا کہ مقدمہ کبھی واپس نہیں لیا جاسکتا۔ جس صورت میں کہ ایڈیٹر ریاست“ کا رد یہ یہ ہے۔ میں نے کہا کہ میرے لئے جھوٹا خوشامد کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کھڑے ہوتے ہی کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیا۔ مجھے آپ سے بلانا نہ چاہئے تھا۔ مسٹر ٹرنر میرے اس جواب سے اور بھی حیران ہوئے۔ وہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایسا جواب ملے گا۔ میں جب چلا تو وہ حیرانی کے عالم میں میری پشت دیکھنے رہے۔ اور میں جب ان کی کوٹھی سے مڑا تو میں نے دیکھا کہ ان کی نگاہیں میری طرف تھیں۔ میں نے مسٹر ٹرنر کے اس جواب کے بعد مسٹر یونگ کو بلانا مناسب نہ سمجھا اور دل میں فیصلہ کیا کہ دس ہزار روپیہ کی ڈگری کا روپیہ مسٹر ٹانٹن کو ادا کر دوں گا۔ ہا بلیشور سے واپس پڑنا پہنچا وہاں سے واپس دہلی آیا۔ مسٹر رائے کو تمام واقعہ بتایا۔ مسٹر رائے کو افسوس تھا کہ میں سر ارنیسٹ ہاٹن گورنر سے نہ بولا۔ میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ ڈگری کا دلوں گا مگر بلوں گا نہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر پیشی پر سکھر گیا۔ اور فیصلہ کیا کہ مقدمہ اچھی طرح سے لڑا جائے۔ دو ہفتہ بعد میں اور مسٹر توکل پھر سکھر گئے۔ روہڑی ریلوے ویننگ روم میں ٹھہرے۔ کیونکہ یہ جگہ سٹیشن سے بلند بہت پر فضا مقام پر ہے۔ دس شیٹ سکھر سول جج کی کورٹ میں گئے۔ اور عدالت کے اجلاس پر چھا۔ کہ پیشی کس وقت ہوگی۔ تو ابلد نے بتایا کہ سرکاری ریلیں کا منشی مجھے تلاش کر رہا تھا۔ وکیلوں کے بیٹھے کی جگہ پر گئے۔ سرکاری وکیل



کے منشی کو تلاش کیا۔ تو اس نے کہا کہ سرکاری وکیل ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سرکاری وکیل کے پاس گئے۔ تو اس نے بتایا کہ بی بی گورنمنٹ کا حکم اُس کے پاس پہنچا ہے کہ کورٹ فیس وغیرہ پر جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے چنانچہ کورٹ فیس اور سرکاری وکیل کی فیس چودہ سو روپیہ جو گورنمنٹ نے ادا کی تھی۔ وہ ہم نے سرکاری وکیل کو دی۔ عدالت میں گئے۔ سرکاری وکیل نے مقدمہ واپس لینے کے لئے عدالت سے درخواست کی۔ مقدمہ واپس لیا گیا اور ہم واپس دہلی آگئے۔

مسٹر ٹرنر اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان گزشتہ کچھ تلخی کے ساتھ ہمیں۔ اور ایڈیٹر "ریاست" سخت جواب دے کر مسٹر ٹرنر سے جدا ہوا۔ مگر آپ نے میرے جانے کے بعد سرکاری وکیل سکھر کے نام حکم لکھ دیا کہ جو روپیہ گورنمنٹ کا خرچ ہوا ہے وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ ایک صورت تو وہ تھی کہ ہم مسٹر ٹانننڈی سے مقدمہ واپس لینے کی درخواستیں کرتے رہے۔ مگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اور ایک صورت یہ کہ سرکاری وکیل کا منشی صلح کے لئے ہمیں تلاش کرتا رہا۔ یہ سب کچھ مسٹر رائے کی کوشش۔ دوست نرازی اور محنت کا نتیجہ تھا۔ اور اس واقعہ سے انگریزوں کے قومی کیرکٹر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اور اگر بات چیت میں تعلقات شریفانہ طریقہ سے ناخوش گوار بھی ہو جائیں۔ تو ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور وہ بطور ایک سپورٹس مین اپنی اور دوسروں کی کمزوریوں سے درگزر کرتے ہیں۔

## ہمارا جہ تا بھہ کی نظر بندی کا سبب

### ہمانا گاندھی کا پوسٹ کارڈ

مرحوم ہمارا جہ تا بھہ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں۔ مگر آپ کی معزوری کا اصلی باعث پولیس ڈیپارٹمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ آپ ابھی دلی عہدہ تھے۔ گورنمنٹ نے تو اپنی حاکمیت کے لئے آپ کو سنٹرل اسمبلی رجسٹر افسر اور ایڈیٹر کونسل کے نام سے فنی اکاؤنٹ ممبر نامزد کیا۔ مگر آپ اسمبلی میں گورنمنٹ کا ساتھ چھوڑ کر مرحوم مسٹر کھلے کے ساتھ مخالفین پر جا بیٹھے۔ چنانچہ آپ کے مصائب کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے۔ آپ کے دلی عہدے کے زمانہ میں ہی سرزمینِ ہند گورنر پنجاب (جن کے ماتحت اُن دنوں پنجاب کی ریاستیں تھیں) نے گورنمنٹ آف انڈیا کو رپورٹ کی تھی کہ ملکہ تا بھہ (یعنی مرحوم ہمارا جہ تا بھہ) کو جب گاندھی پر بٹھانے کا زمانہ آئے تو یہ غور کر لیا جائے کہ یہ گورنمنٹ کے خلاف ہیں۔ دفا شاعر نہیں۔ اس کے بعد کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی اور نتیجہ آپ کی معزوری کی صورت میں ہوا۔ آپ کی معزوری کی دوستان بہت طویل ہے۔ اس کے چشم دید حالات میں پھر عرض کروں گا۔ کیونکہ میں معزوری کے وقت تا بھہ میں موجود تھا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوا۔ میرے اس لکھے کا مطلب یہ ہے کہ بقول مرحوم مولانا محمد علی (جیسا کہ آپ نے اپنی کانگریس کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا) ہمارا جہ کی معزوری کا سبب آپ کی صفات (یعنی حب الوطنی اور خود دانی) تھیں۔ نہ کہ آپ کے نقائص رجن کو سامنے رکھ کر گورنمنٹ نے آپ کو

معزول کیا کیونکہ اگر ان تقاضے کی بنا پر دوسرا بیان ریاست کو بھی مزادی جاتی - تو شاید ایک دایئے ریاست بھی گدی پر حکمران نہ رہتا۔

ہمارا جہ نا بھ نے اپنی معزولی کے بعد گورنمنٹ کے حکام سے تو تعاون کرنا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور آپ اس کو سنش میں رہے کہ کانگریس اور پارلیمنٹ کے لیبر میمبرز کے ذریعے انصاف حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ کی دعوت پر سر جین لعل سیتلہ اور مرحوم پنڈت مونی لال نہرو سٹرنگٹھ ناگہ آئے۔ سٹر جناح، سردار سردل سنگھ کریشنر، مسٹر تارا سنگھ، مولانا محمد علی سرسنگھ، انارٹر۔ سرسی۔ بی۔ را۔ ساوای آرتھویر ورجنہ ہندوستانی لیڈر اور مسٹر راڈی جونس اور مسٹر تھرٹل وغیرہ میمبران پارلیمنٹ ہمارا جہ سے ملے۔ اور ان لوگوں میں سے اکثر نے مختلف طریقوں سے ہمارا جہ سے روپیہ بھی حاصل کیا۔ چنانچہ بعض اصحاب نے تو ایک ایک دو دو لاکھ روپیہ بھی گدی پر واپس بٹھانے کے نام پر وصول کیا۔

ہمارا جہ نا بھ ان تمام اصحاب کی معرفت کو شیش کرتے رہے۔ کبھی پارلیمنٹ میں سوالات کبھی اسمبلی میں تقریریں۔ کبھی میو ریل۔ کبھی ڈیپوٹیشن کرنا۔ کبھی کبھار ٹیکہ لے لیا۔ کیونکہ پولیس کی ڈیپارٹمنٹ آپ کے خلاف تھا۔ ہمارا جہ کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ہمارا جہ نا بھ آپ کے مسئلہ میں دلچسپی لیں تو آپ گدی پر واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا جہ نا بھ سی پراثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ پنڈت مونی لال نہرو کی سہادی میں دعوتیں ہوئیں۔ مرحوم مولانا محمد علی نے ہمارا جہ سے کہا، مختلف ممبران اسمبلی اور لیڈروں کے ذریعے اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی، سردار سردل سنگھ کریشنر اس سلسلہ میں کئی بار ہمارا جہ سے ملے۔ اور ہمارا جہ نے اپنی مظلومیت کے متعلق نہ صرف تمام مطبوعہ لٹریچر بھیجا، جو چھاپا گیا تھا، بلکہ ٹائپ کر کر کر بہت طویل خطوط بھی ہمارا جہ کو لکھے کہ آپ اس سکرپٹ پر ذاتی توجہ کیجئے۔ اور دوسرے سے مل کر گدی پر واپس بٹھوایئے۔

اس تمام لٹریچر اثرات اور خط و کتابت کے بعد ہمارا جہ نا بھ کا ایک پرسنٹ کارڈ ہمارا جہ نا بھ کے نام سردی پہنچا۔ جس پر صرف دو چار سطر پر نیل سے لکھی تھیں اور جن کا مطلب یہ تھا کہ تمام لٹریچر اور خطوط پڑھئے اور حالات سنئے کے بعد ہمارا جہ نا بھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمارا جہ نا بھ کانگریس یا ہمارا جہ نا بھ کی امداد کے مستحق نہیں۔ ہمارا جہ نا بھ تو ہر شخص کو اپنے گیر گیر کی بلندی کے پیمانہ سے ناپتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہمارا جہ نا بھ چونکہ انسانی کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں اس لئے وہ ہمارا جہ نا بھ کی کانگریس کی ہمدردی اور امداد کے مستحق نہیں مگر یہ منسل کا لکھا ہوا پرسنٹ کارڈ ہی ہمارا جہ نا بھ کی مزید تباہی اور کوڈائی کنال میں نظر بندی کا باعث ہوا۔ ہمارا جہ کی ڈاک سنسر ہوتی تھی اس کارڈ کا فوٹو گورنمنٹ کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ہمارا جہ کو ہمیشہ کیلئے کسی دور دراز مقام پر نظر بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک دوسرا الزام لگا کر آپ کو کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں سے آپ اپنے مرتے دم تک رہنا نہ کیئے گئے۔ اور وہیں نظر بندی کی حالت میں ہی انتقال کر گئے۔

## روپیہ سے محبت نہ کرو۔

دہلی سے روزانہ رعیت تباہی کرنے سے پہلے راقم الحروف لکھنؤ۔ کانپور اور الہ آباد اس غرض کے لئے

کیا کہ اگر کسی پر اس کا انتظام ہو جائے تو وہاں سے روزانہ اخبار جاری کیا جائے۔ اس زمانہ میں پر اس ایکٹ بہت سخت تھا۔ کسی پر اس میں بھی اخبار کے چھاپنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ اس سلسلہ میں جب الہ آباد گیا تو سید اکبر الہ آبادی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میں رات کو تو ایک سرائے میں سوتا تھا۔ جہاں ایک کوٹھری کرایہ پر لے رکھی تھی۔ مگر دن بھر اکبر صاحب کی خدمت میں عشرت منزل رہتا۔ وہاں چار پانچ روز رہا حضرت اکبر صاحب شاعروں اور فلاسفوں کو دنیا صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔ اکبر نمٹیل دینے کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک روز فیاضی اور کنجوسی کے فلسفہ پر باتیں ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا۔ روپیہ سے اتنی محبت کرنی چاہئے جتنی ایک انگریز اپنے بہرایا خانساں سے کرتا ہے۔ یعنی جب بہرایا خانساں سے کام لینا ہو تو انگریز بہرا اور خانساں کو اپنے کمرہ میں اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ مگر جب کام نکل جائے تو اس بہرایا خانساں کو صاحب کے کمرہ میں ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یعنی روپیہ سے کام لو۔ مگر اس سے محبت نہ کرو۔

## سیاسی جبرائیم کی تغیر حاصل

میں لاہور کے ہفتہ وار "ہندوستان" میں کام کرنا تھا کہ ایک روز اسٹریٹسنگھ (جن کو سنگھوں میں ڈی ولیر کہتے ہیں۔ جو پنجاب پولیس کی انتہائی کوشش کے باوجود کئی برس تک گرفتار نہ ہو سکے جو مرحوم کنگ نادر خاں آف افغانستان کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ جن کی زندگی کا زیادہ حصہ جیلوں میں گزرا۔ جن کی شہادت جیل کمیشن کے سامنے قیدیوں کے نمائندہ کے طور پر ہوئی۔ اور جو آجکل پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں) مجھ سے ملے اور انھوں نے بتایا کہ مرحوم ہمارا جہ پٹیل بھسٹو (ریاست پٹیل) کے قومی درکار باوتیجاسنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں (باوتیجاسنگھ بہت بلند گیر کیڑے بزرگ تھے۔ وہاں کے لڑکیوں کے ہائی سکول کے منیجر تھے۔ ہمارا جہ پٹیل نے باوتیجاسنگھ کو اپنے گرمائی صدر مقام چائل سے پیغام بھیجا کہ کچھ لڑکیوں کو ساتھ لے کر آؤ۔ باوتیجاسنگھ بہت اجیرت شخص تھے۔ آپ نے ہمارا جہ پٹیل کی رعیت جو تھے جو بھی اس خواہش کی تعمیل سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا جہ باوتیجاسنگھ کے دشمن ہو گئے۔ اسٹریٹسنگھ نے یہ بھی کہا کہ باوتیجاسنگھ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بس بھسٹو آؤں اسٹریٹسنگھ بھی ان دونوں بھسٹو ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ماسٹریٹسنگھ کی خواہش کے مطابق میں بھسٹو پہنچ گیا۔ وہاں باوتیجاسنگھ، ماسٹریٹسنگھ اور سنگھوں کے دوسرے قومی دہکے موجود تھے۔ مشورہ ہوتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ ہمارا جہ پٹیل کی زیادتیوں کے متعلق اخبارات میں مضامین شائع ہوں۔ اور ان تمام شخصوں کو جو آپ باوتیجاسنگھ کے خلاف کر رہے ہیں پبلک میں بے نقاب کر دیا جائے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ میں اردو زبان میں ایک پمفلٹ لکھوں جو شائع ہو۔

میں لاہور واپس آ گیا۔ اس زمانہ میں میرا قیام لاہور سوری دروازہ کے اندر اولڈ ہندو ہیٹل میں تھا۔ جہاں کھانے اور رہائش دونوں کے لئے ہر بورڈر سے صرف چھ روپے ماہوار لیا جاتا تھا۔ کھانے میں ایک دال اور

ایک سبزی بلیتی تھی۔ وال تو خیر پھر بھی غنیمت، ہوتی تھی۔ سبزی ہمیشہ وہ بکائی جاتی جس کا موسم جا چکا ہو اور بازار میں جسے کوئی نہ خریدتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں یہ ہوٹل شاید تمام لاہور میں ادراں ترین ہوڑ ڈانگ ہو جس تھا۔ جس میں ساٹھ کے قریب ہوڑ روڑ رہتے تھے۔

اس ہوٹل میں پیچ کر میں نے پمفلٹ لکھا جس کا نام ”خون شہادت کا تازہ قطرہ“ تھا۔ پمفلٹ بہت اچھا لکھا گیا جس کی کتابت امرتسر کے ایک بہت اچھے کاتب منشی فرخ سے کرائی گئی۔ اور لاہور پہنچنے کے بعد دوستوں سے مشورہ کیا اور وہاں لے سب سے اچھے پریس میں یہ دو ہزار چھپا جب یہ پمفلٹ چھپ چکا اور ابھی اس کی سہلائی نہ ہوئی تھی۔ تو میں دوسرے کاپیاں سلا کر پریس سے لے آیا۔ جن میں سے کچھ میں نے اُسی روز بعض دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ پمفلٹ کو دیکھتے ہی اس کا چوڑا شروع ہوا۔ شام تک مہاراجہ پٹیلار کے دوستوں کو بھی علم ہو گیا اور پریس تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے دجولا ہوڑ میں سکھوں کے ایک لیڈر تھے اور اُس زمانہ میں حکام رس تھے۔ یہ پمفلٹ حکام تک پہنچا دیا۔ رات کو بعض مقامی افسروں میں مشورہ ہوا۔ اور اگلے روز میں جب ہتھیار اٹھا رہے سوکائی لینے کے لئے پریس میں گیا۔ تو پریس والوں نے بتایا کہ صبح پریس آئی تھی۔ پمفلٹ گورنمنٹ نے ضبط کر لیا ہے اور تمام کاپیاں پریس لے گئی ہے۔

اس خبر کو سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ دوسرے کاپیوں میں سے جو پمفلٹ بچے تھے۔ اُن کو لے کر میں بھسور پہنچا ماسٹر مورتا سنگھ اور بابو تیا سنگھ صاحب سے تمام واقعات بیان کیے۔ ان لوگوں کو بھی بے حد افسوس ہوا۔ رات پھر مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ چاہے کچھ ہو اس پمفلٹ کو پھر دوبارہ چھاپ کر شائع کیا جائے۔ بابو تیا سنگھ نے مجھے دوسرے اخبارات کے لئے دیے۔ پمفلٹ کی ایک کاپی لے کر میں لدھیانہ پہنچا۔ لدھیانہ سے دہلی آیا۔ یہاں مہاراجہ ہوٹل میں قیام کے منشی فردوس خورشید سے گفتگو کیا۔ اُن کو پمفلٹ کتابت کرنے کے لیے دوبارہ کہا کہ جرات چاہو۔ لے لو اگر دن رات لگا کر اس کو جلدی لکھ دو۔ منشی فردوس نے تمام کام چھوڑ کر کتابت کر دی۔ کاپیاں لے کر میں چمپلی والاں کے ایک پریس میں گیا جس کا نام ہے اینڈ سنز پریس تھا یہ پریس اب بند ہو چکا ہے۔ مالک پریس سے میں نے پمفلٹ چھاپنے سے لے کہا۔ اُس زمانہ میں پریس ایکٹ بہت سخت تھا۔ مگر جب مالک پریس نے دیکھا کہ اس سے پہلے بھی یہ پمفلٹ چھپ چکا ہے اور اب دوبارہ چھپ رہا ہے۔ تو وہ چھاپنے پر آمادہ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میں کل واپس جانا چاہتا ہوں۔ جرات چاہو۔ لے لو۔ مگر کل دوپہر تک چھپائی اور سہلائی وغیرہ مکمل ہو جائے۔ اُنھوں نے اجرت کچھ زیادہ طلب کی۔ جو دے دی گئی۔ اور اگلے روز دو ہزار پمفلٹ تیار صورت میں بھیج دیے۔ میں نے رات کی گاڑی سے بھسور پہنچا۔ وہاں ایک روز میں ان پمفلٹوں کے سپیکٹ بنا کر رکھ لئے گئے۔ ان سپیکٹوں کو لے کر میں لدھیانہ پہنچا۔ کچھ دنوں کے ڈاک خانہ میں پوسٹ کئے پھر جالندھر پہنچا وہاں پوسٹ کئے پھر لہر نسر گیا وہاں پوسٹ کئے اور باقی لاہور آکر پوسٹ کر دیئے۔

ادھر تین پمفلٹ اس طریقہ سے پوسٹ کر دیئے گئے۔ ادھر دہلی کو گورنمنٹ کو جب یہ علم ہوا کہ ضبط شدہ پمفلٹ دوبارہ چھاپ کر تقسیم کیا گیا تو بے اینڈ سنز کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اور منشی فردوس کاتب کو پریس سے پریشان کیا اور یہ چھاپ کر پمفلٹ کتابت کے لئے کہیں نہ دیا اور کون لے گیا وغیرہ۔

پمفلٹ کے تقسیم ہونے کے بعد میں برستور اسی ادھر بند ہوٹل میں رہتا تھا۔ اور کام ”ہندوستان“ میں

لار رام رچھپال سنگہ شیدام روم کے ماتحت کرتا تھا۔ ایک روز اتوار تھا۔ ہوٹل میں صبح بیدار ہوا۔ پاخانے گیا۔ اور جب واپس آیا۔ تو میرے کمرے میں میری چار پائی پر ایک مسلمان بیٹے تھے میں نے پوچھا۔ فرمایے کس طرح تشریف لائے۔ آپ نے بتایا کہ کو تو ملی میں انسپکٹر صاحب نے بیٹے کے لئے بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کیا کام ہے۔ تو آپ نے کہا کہ ان کو کچھ علم نہیں میں ٹانگہ میں ان کے ساتھ دہلی دروازہ والی کو تو ملی میں گیا۔ انسپکٹر انچارج کو تو ملی کے سامنے پیش کیا گیا۔ انسپکٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر کلارک کو ٹیلی فون کیا۔ ایک سب انسپکٹر پولیس آیا۔ وہ سب انسپکٹر تھے مسٹر کلارک کی کوٹھی پر لے گیا۔ کیونکہ اتوار کے باعث یہ اپنی کوٹھی پر ہی تھے۔ یہ مسٹر کلارک کٹرہم کے اینگلوانڈین تھے۔ بہت نند مزاج جو ہندوستانہوں کو انسان ہی نہ سمجھتے تھے۔ اور ان کی پبلک میں یہ عام شکایت تھی۔ میں جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ پولیس دو ہفتے سے تلاش کر رہی تھی تم کہاں تھے؟ میں نے کہا کہ اولڈ منڈ ہوٹل میں رہتا تھا اور کام اخبار "ہندوستان" میں کرتا تھا۔ ان سے پتہ چلا کہ ہفٹل کے شائع اور ضبط ہونے کے بعد مجھ پر مقدمہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت قائم کیا گیا ہے۔ پولیس مجھے میرے وطن حافظ آباد تلاش کرتی رہی اور آخر بہت مشکل سے پولیس کو اولڈ منڈ ہوٹل کا پتہ ملا۔ مسٹر کلارک نے سب انسپکٹر کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگالی جائے۔ اور چونکہ اتوار ہے سب انسپکٹر مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر ہی ریمانڈ کے لئے لے جائے۔ کیونکہ گرفتاری کے دارنٹ ڈپٹی کمشنر کے ہی دستخطوں سے جاری ہوتے ہیں۔

سب انسپکٹر اور کنسٹیبل مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹانٹن تھے۔ ان کی اس زمانہ میں غالباً شادی نہیں ہوئی تھی۔ شراب کثرت کے ساتھ پیتے تھے۔ اور چونکہ اتوار تھا معلوم ہوا کہ شراب میں محمور ہیں۔ سب انسپکٹر نے ہراسے کہا کہ وہ صاحب بہادر سے ملنا جاتے ہیں ایک ملزم کا ریمانڈ لینا ہے۔ بہرا لے مسٹر ٹانٹن کو اطلاع کی۔ تو مسٹر ٹانٹن نشہ میں فٹ کچھ تھوڑے سے لڑکھڑاتے ہوئے برآمدہ میں تشریف لائے۔ اور آتے ہی سب انسپکٹر سے پوچھا کیا ہے۔ سب انسپکٹر نے سلیوٹ کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا یہ ملزم ہے۔ آج اتوار ہے۔ اور ریمانڈ لینا ہے۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے دارنٹ پیش کئے جو وہ مسٹر کلارک سے لایا تھا۔

مسٹر ٹانٹن نشہ میں چڑھتے۔ انسان شراب کے نشہ میں بہت فیاض اور فراخ دل ہوتا ہے۔ آپ نے میری طرف دیکھا۔ اور محمور آواز میں بولے۔ دہلی کیا تم کل ہماری کوٹ میں آئے گا۔ میں نے کہا ضرور آؤں گا اگر آپ کہتے ہیں۔ میرے اس جواب پر مسٹر ٹانٹن نے سب انسپکٹر سے کہا۔ کھول دو ہتھکڑی۔ اور مجھ سے کہا کہ جاؤ کل ہماری کوٹ میں حاضر ہو جاؤ۔ ڈپٹی کمشنر تو یہ حکم دے کر برآمدہ سے اپنے کمرے میں چلے گئے مگر سب انسپکٹر جیران کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا مقدمہ ہے۔ دو ہفتے مختلف مقامات پر تلاش کرنے کے بعد مشکل سے مل گیا اور ڈپٹی کمشنر نے شراب کے نشہ میں چھوڑ دیا۔ کیا کیا جائے۔ سب انسپکٹر مجبور تھا۔ اس نے ہتھکڑی کھول دی۔ اور وہ تو واپس مسٹر کلارک کے پاس چلا گیا۔ اور میں ہوٹل میں رہیں آگیا۔

اگلے روز مسرور کو میں مسٹر ٹانٹن کی عدالت میں گیا۔ اور جب پیش ہوا۔ تو مسٹر ٹانٹن بغلیں جھانکنے لگے۔ بہت پریشان نظر آتے تھے کہ کل نشہ میں کیا حکم دے چکے۔ کبھی کاغذات کو اٹھائے۔ کبھی میری طرف دیکھتے۔ کبھی سوچتے۔ آخر آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا:۔

”قبول اگر تم معافی مانگو اور یہ وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی کوئی ایسا پھلٹ نہ لکھو گے تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے“

نا تجربہ کاری اور جوش کا زمانہ تھا۔ میں نے جواب دیا کہ میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ نہ میں معافی مانگتا ہوں۔ اور نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ آپ مقدمہ چلائیے۔

میرا یہ خلاف توقع جواب سن کر مسٹر ٹائنٹن اور پریٹان ہوئے۔ اور آپ نے چپراسی کو غیظ کرتے ہوئے کہا: ”اس لڑکے کو عدالت سے باہر نکال دو۔ چھو کر رہے۔ یہ جانتا نہیں کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے۔“

چپراسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے باہر جانے کے لئے کہا۔ میں عدالت سے باہر آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر ٹائنٹن نے یہ لکھ کر مقدمہ داخل دفتر کر دیا کہ ”میں نے جو ان لڑکا ہے۔ نا تجربہ کار ہے۔ اس کو تنبیہ کر دی گئی ہے کہ آئندہ گورنمنٹ اور ہمارا چہ بیٹا لہ کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھے۔ اور چونکہ جرم پہلی بار کیا گیا ہے اس لئے وارننگ ہی کافی سمجھی گئی ہے۔“

یہ میری پہلی گرفتاری تھی۔ اس کے بعد مجھ پر درجنوں مقدمات قائم کیے گئے۔ اگر کسی اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تو شاید دنیا میں کسی کو مٹہ دکھانے کے قابل نہ ہوتا۔ مگر سیاسی جرم کی یہ ابتدا ایک دوامی زندگی کا پائیدار ثابت ہوئی اور جب بھی کوئی نیا مقدمہ قائم ہوا۔ گورنمنٹ فیس تو اس میں بہت ہوتی۔ مگر جوش۔ زندگی اور قوت ارادی میں ہمیشہ ہی اضافہ ہوا چنانچہ دنیا میں سیاست کی راہ میں گرفتاریاں اور سزائیں کبھی بھی توبہ کرنے کا باعث نہ ہو سکیں۔ بشرطیکہ سلازم ملک کے مخلص اور بے غرض خادم ہوں۔

تعزیر جرم عیش ہے بے صرۃ مختب  
بڑھتا ہے اور ذوق گستاہیاں سزا کے بعد

## احسان کرنا اور احسان جتنا

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس جو ہندوستان کے بہترین آئی سپیشلسٹ تسلیم کیے جاتے ہیں جب سرکاری مڈل ازمٹ میں داخل ہوئے تو ان کی تنخواہ پچیس روپیہ ماہوار تھی۔ اور ایک ہسپتال ہسٹنٹ رجن کو اب سب ہسٹنٹ سرجن کہا جاتا ہے) تھے۔ آپ ہندوستان بھر میں سب سے پہلے ہسپتال ہسٹنٹ تھے۔ جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کئے بغیر ہسٹنٹ سرجن ہوئے اور بعد میں سول سرجن کے عہدہ پر پہنچے۔ آپ نے اپنی زندگی میں موتیا بندر کے اتنی تعداد میں آپریشن کیے کہ غالباً دنیا کے تمام ڈاکٹروں کے آپریشنوں کی مجموعی تعداد بھی اس سے کم ہے۔ آپ نے اپنی حیات میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا اور لاکھوں خیرات میں دیا۔ آپ کے روپیہ سے اس وقت ایک کالج اور متعدد سکول چل رہے ہیں۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں۔ تو آپ پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار سلسل خیرات میں صرف کرتے رہے۔ اور آپ کو تمام ہندوستان میں شہرت نصیب ہے، چنانچہ عرصہ ہوا ہاتا گاندھی نے بھی آپ کی تعریف میں اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر متھرا داس نہ صرف بطور ڈاکٹر بہت کامیاب ہیں۔ بلکہ بطور انسان ان میں اخلاص اور نیک نیتی وغیرہ کی بعض ایسی صفات موجود ہیں جو ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب بھی جاسکتی ہیں اور جن کے باعث آپ کو عالم گیر شہرت و ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر متھرا داس کی شروع کی زندگی میں جب کہ آپ موگا کے ہسپتال میں مقرر ہوئے۔ فیروز پور کے سول سرجن کرنل ایڈی تھے۔ کرنل ایڈی

نظام مزاج کے خوشامد پسند انگریز تھے۔ مگر نہایت شریف اور نیک جس پر مہربانی کرتے۔ ہمیشہ ہی اُس کی امداد پر آمادہ رہتے۔ یہ ڈاکٹر متھرا داس بہت مہربان تھے۔ اور آپ نے ڈاکٹر متھرا داس کی قدم قدم پر امداد کی۔ یہ کہی برس فیروز پور میں سول سرجن رہے۔ وہاں سے پنجاب کے چھت لیریل میڈیکل آفیسر وغیرہ ہو گئے۔ اور ریٹائر ہوئے کے بعد آپ نے پھر فیروز پور میں ہی مستقل رہائش اختیار کی۔ کیونکہ فیروز پور کی آب و ہوا ان کو موافق تھی اور وہاں دوستوں کا حلقہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔

کرنل ایڈی کو ریٹائر ہونے کے بعد فیروز میں رہنے لگی برس ہو گئے۔ ڈاکٹر متھرا داس کا معمول تھا کہ وہ جب کبھی فیروز پور کسی کام کے لئے جاکر کرنل ایڈی سے ملنے کے لئے ان کی کوشی پر ضرور پہنچتے۔ ایک روز کرنل ایڈی نے ڈاکٹر متھرا داس سے کہا کہ ان کو ایک گائے کی ضرورت ہے۔ موگا سے خرید کر بھجوا دی جائے۔ ڈاکٹر متھرا داس نے واپس موگا پہنچ کر ایک بہت اچھی گائے اتنی روپے میں خریدی اور اپنے آدمی کے ساتھ فیروز پور کرنل ایڈی کو بھیج دی۔ ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر متھرا داس کو فیروز پور جانے کا پھر اتفاق ہوا۔ تو آپ حسب معمول کرنل ایڈی سے ملنے کے لئے گئے باتوں باتوں میں کرنل ایڈی نے کہا کہ گائے بہت اچھی ہے۔ یہ کتنے میں خریدی گئی۔ ڈاکٹر متھرا داس نے جواب دیا کہ قیمت کا کیا سوال ہے۔ سب کچھ آپ کا ہے۔ کرنل ایڈی حاکم سپرٹ کے انگریز تھے۔ آپ نے کہا نہیں ہم حکم دیتا ہے کہ گائے کتنے میں خریدی گئی۔ ڈاکٹر متھرا داس کرنل ایڈی کی انص پچانتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ جب وہ حکم کا لفظ استعمال کریں اور پھر بھی ضد کی جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اسی روپیہ میں کرنل ایڈی نے فوراً اتنی روپے کا چیک لکھ کر ڈاکٹر متھرا داس کو دے دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب چلے آئے۔ چیک لانے کے بعد یہ چیک ڈاکٹر متھرا داس کے پاس کئی روز پڑا رہا۔ ڈاکٹر صاحب سوچا کرتے کہ اس چیک کا کیا کریں۔ کرنل ایڈی کے احسانات ان پر بہت تھے۔ ان کا ضمیر یہ گزار نہ کرتا تھا کہ اتنے بڑے محن سے گائے کی قیمت لی جائے۔ کرنل ایڈی اپنی طرف سے روپیہ ادا کر چکے تھے اُن کے بنک میں کئی لاکھ روپے تھے۔ اور ان کو خیال بھی نہ رہا کہ وہ گائے کا چیک کیش ہوا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر متھرا داس کئی روز سوچتے رہے۔ کہ کیا کریں۔ آخر انھوں نے اپنے محن سے گائے کی قیمت لینا گزارا نہ کی اور چیک بغیر کرنل ایڈی کو بتائے پھاڑ دیا۔ اور ٹکٹف یہ کہ کرنل ایڈی جب تک زندہ رہے وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ گائے کی قیمت متھرا داس کو ادا کر چکے ہیں۔

اس واقعہ سے ڈاکٹر متھرا داس کے اخلاص و محسن شناسی اور نیک نیتی کا اندازہ ہو سکتا ہے میرا یقین ہے کہ اگر یہ صفات ڈاکٹر متھرا داس میں نہ ہوتیں۔ تو وہ بھی معمولی ڈاکٹروں کی طرح گستاخی کی زندگی بسر کرتے اور موجودہ عروج و صہل کرنا اُن کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ جب کوئی شخص کسی سے اخلاص اور نیکی کا سلوک کرتا ہے تو قدرت لازمی طور سے مخلص اور نیک شخص کو اُس کا معاوضہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر بخیر شخص ہمیشہ بالمال رہا۔

یہ واقعہ اُن لوگوں کے لئے آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیے جو اگر احسان کرتے ہیں تو جت کر اور بقول ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے ”اگر خیرات دینے والے نے خیرات دے کر اُس کا اظہار کر دیا تو اُس نے اپنی نیکی کو خود اپنے ہاتھوں میں لپی میں مہلادیا“

## خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

مرحوم ہمارا جہ اور ایڈمنسٹریشن کی بدانتظامی اور اپنے اعمال کے باعث اپنی ریاست سے نکال دیئے گئے تھے اور پولیسکل ڈیپارٹمنٹ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ آپ ریاست اور کی حدود سے ایک سو میل دور رہیں تاکہ اور کے ملازموں یا رعایا کے ساتھ جمل کر کوئی سازش نہ کر سکیں۔ چنانچہ آپ سبھی تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے رہائش اختیار کر لی۔

دالیان ریاست گدی پر ہوں یا معزول حالت میں چونکہ ان کو لاکھوں روپیہ سالانہ الاؤنس ملتا ہے۔ خود غرض لوگ ہر صورت میں ان کے ساتھ چسپاں رہتے ہیں۔ ہمارا جہ کے سبھی پہنچنے پر بہت سے لیڈروں اور دوسرے لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ کوئی گدی پر واپس بٹھانے کی روشنی دکھانا نہ کرئی یا اختیار کرنے کا وعدہ کرتا۔ اور کوئی اپنا اثر جتانے جوئے تمام زرخوں کے مفاد مل کر دینے کا یقین دلاتا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک صاحب مسٹر جنناداس دوارکا داس بھی تھے۔ جو تھیا سونٹ اور مسنراہنی مینٹ کے خاص چیلوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور جب مسنراہنی مینٹ انگلستان گئیں اور لندن میں لیڈی ونگلڈن کی بہن یعنی لارڈ ونگلڈن وائسرائے ہند کی سالی کے گھر پر بطور مہمان مقیم تھیں۔ تو اس وقت یہ مسٹر جنناداس دوارکا داس بھی مسنراہنی مینٹ کے ساتھ ملاقات کیا کرتے تھے۔ یعنی مسٹر جنناداس دوارکا داس کی کرائسٹیکیشن عورت یہ تھی کہ آپ لارڈ ونگلڈن وائسرائے کی بیوی کے پرانے واقف تھے۔ اس سٹریٹیکٹ پر آپ نے مرحوم ہمارا جہ اور کو بقیں لایا کہ ہمارا جہ کو گدی پر بٹھا دیں گے۔ اور ہمارا جہ گدی پر بیٹھنے کی صورت میں پچیس تیس لاکھ روپیہ صرف کرتے پر بھی آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر جنناداس دوارکا داس اس مشن پر دہلی تشریف لائے مسٹر میول پرائیویٹ سیکریٹری وائسرائے سے ملے۔ پھر لیڈی ونگلڈن سے ملاقات ہوئی اور بعد میں لارڈ ونگلڈن کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ نے عرض کیا کہ ہمارا جہ اور کو واپس اور جانے کی اجازت دی جائے۔ لارڈ ونگلڈن نے تمام کچھ سننے کے بعد جواب دیا کہ اگر پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو آپ ہمارا جہ کو واپس اور جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس جواب کو سن کر آپ پولیسکل سیکریٹری سے ملے۔ پولیسکل سیکریٹری نے ملانے ہوئے کہا کہ اگر میجر کیمبل ایڈمنسٹریٹر اور کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ کو کبھی کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ مسٹر جنناداس دوارکا داس پولیسکل سیکریٹری کے اس جواب سے خوش ہو کر میجر کیمبل سے ملنے کے لئے فوراً تشریف لے گئے۔

ایڈیٹر ریاست "کو ان تمام باتوں کا علم وائسرائے جس کے ایک دوست سے ہوتا رہا۔ اور راقم الحروف دیکھتا رہا کہ یہ اوٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اس دست نے اطلاع دی کہ مسٹر جنناداس دوارکا داس اور سے واپس تشریف لے آئے ہیں اور سوس ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ایڈیٹر ریاست نے سوس ہوٹل ٹیلی فون کیا۔ اور مسٹر جنناداس دوارکا داس کو فون پر بلا کر پوچھا کہ میں کس بل سکتا ہوں۔ مسٹر جنناداس دوارکا داس بتلنے سے گھبراتے تھے۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" بھی بطور عزرائیل نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ پنج کے بعد دو بجے آئیے۔ ایڈیٹر "ریاست" دو بجے سوس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ مسٹر جنناداس دوارکا داس ہوٹل کے ڈائٹنگ روم کے برآمدہ میں بید کی ایک کرسی پر بیٹھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ ایڈیٹر ریاست نے "خبریت پوچھنے کے بعد سوال کیا۔ فرمایا مسٹر جنناداس دوارکا داس آپ اور میں کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یہ سوال پوچھنا تھا کہ آپ کا



رنگ فق ہو گیا۔ کیونکہ آپ تمام کارروائی رازیں کر رہے تھے۔ آپ نے فوراً جواب دیا "آپ کو پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے۔" میں نے جواب دیا "ایک اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر مجھے حق حاصل ہے کہ میں معلوم کر لوں کہ الوری کی غریب رعایا آئندہ کس بیڑے کے سپرد کی جائے گی۔ فرمائیے آپ اور جاکر میجر کیمبل سے ہمارا جواب الوری کے لئے چارٹر لے آئے ہیں یا نہیں۔" مسٹر جنناداس دوارکا داس کے منہ سے بات نکلنے لگی۔ جیران تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" کے تمام حالات کا علم کیونکر ہو گیا۔ آپ نے ٹالے ہوئے جواب دیا "ہمارا جواب الوری اخبار "ریاست" کے بہت مداح ہیں۔ اور باوجود اس بات کے کہ "ریاست" نے ہمارا جواب کے خلاف سخت مضامین لکھے۔ اور ایجنڈیشن کرنے میں حصہ لیا۔ ہمارا جواب اخبار "ریاست" کو پسند کرتے ہیں۔ کئی بار آپ کے متعلق ذکر آیا۔ ہمیشہ آپ کی تعریف کرتے تھے۔ آپ لمبی چلے۔ ہمارا جواب سے ملتے۔ وہ خود آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔" میں نے جواب دیا کہ میں لمبی چلے اور ہمارا جواب سے ملتے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ میجر کیمبل نے آپ کو کیا جواب دیا۔ مسٹر جنناداس دوارکا داس کیا جواب دیتے۔ میں یہی کہنے رہا۔ اخبار "ریاست" بہت اچھا ہے، ایڈیٹر "ریاست" بہت اچھے ہیں۔ ہمارا جواب الوری اخبار "ریاست" کے زور قلم کے مداح ہیں۔ میں الوری کا تو تھا۔ مگر میں کچھ نہیں سکتا۔ کچھ گنا قبل از وقت ہے آپ لمبی چلے۔ وہاں ہمارا جواب سے مشورہ کریں گے دیگر مسٹر جنناداس دوارکا داس سے مل کر میں واپس آیا۔ اور میں نے داسرائے ہوس والے دوست کو ٹیلی فون کیا کہ وہ مزید معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ اگلے روز مسٹر جنناداس دوارکا داس ہوٹل والوں کو کچھ بتائے بغیر بارہ کھمبہ روڈ پر آریل مسٹر آسکر یا میجر کونسل آف سٹیٹ کے ہاں چلے گئے۔ ہوٹل میں ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ آپ دالیں لمبی چلے گئے ہیں داسرائے ہوس میں ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ مسٹر آسکر یا کے ہاں بارہ کھمبہ روڈ پر مقیم ہیں۔

مسٹر جنناداس دوارکا داس مسٹر آسکر یا کے ہاں پانچ چھ روز رہے اس عرصہ میں آپ کی بار مسٹر میویل پر میٹنگ سیکریٹری سے ملے کئی خطوط لکھے۔ آخر آپ کو لارڈ لنگڈن نے جواب لکھا کہ چونکہ میجر کیمبل ہمارا جواب الوری کا داس جانا مناسب نہیں سمجھتے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اعتراض ہے۔ اس لئے داسرائے مداخلت کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور وہ ہمارا جواب الوری کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ خط داسرائے نے لکھ کر مسٹر میویل کے حوالہ کیا۔ مسٹر میویل نے یہ خط داسرائے ہوس کے ایک چپڑاسی کو دیا کہ آسکر یا صاحب کی کوٹھی پر مسٹر جنناداس دوارکا داس کو پہنچا دیا جائے۔ مگر مسٹر جنناداس دوارکا داس کو یہ خط نہیں ملا۔ آپ جواب کا دروازہ انتظار کرتے رہے۔ تو آپ نے مسٹر میویل کو جواب کے لئے ٹیلی فون کیا۔ مسٹر میویل نے جواب دیا کہ دروازہ جوئے جواب تو ایک اتفاق میں بھیجا جا چکا ہے۔ داسرائے کے خط کا کلمہ ہونا تمام لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوا۔ ایک گھر امیٹ سی پیدا ہو گئی۔ مسٹر جنناداس دوارکا داس مسٹر میویل کے پاس فوراً پہنچے خط لے جانے والے چپڑاسی کو بتایا گیا۔ خط ڈال کر دلی بینک دیکھی گئی۔ اس میں اردو زبان میں دیلوی داس کے دستخط تھے جس نے خط وصول کیا۔ چپڑاسی نے کہا کہ جب وہ مسٹر آسکر یا کی کوٹھی پر پہنچا۔ تو وہاں ایک شخص سے پوچھا کہ مسٹر جنناداس دوارکا داس کہاں ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ وہی ہیں دستخط کر کے خط لیا۔ تمام لوگ حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ خط کون اڑا کر لے گیا۔ مسٹر جنناداس دوارکا داس نے مسٹر میویل کو بتایا کہ ایڈیٹر "ریاست" سوس ہوٹل میں ان سے ملنا تھا۔ وہی پوچھا کر رہا ہے۔ اس نے ہی یہ خط اڑایا ہوگا۔ اور اسی

کا کوئی آدمی ہے جس نے اُدو میں دھنڈا کر کے یہ خط وصول کیا۔

دائسر نے ہوس میں سنٹی پھیل گئی۔ مسٹر میل نے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے تمام حالات بتائے گئے۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی کو بلایا۔ وہ سب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خان بہادر میاں محمد صادق وغیرہ پہنچے۔ کانفرنس ہوئی، مشورے ہوئے تو سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ دیوان سنگھ مسٹر حنا داس دوا رکھا داس کا بچھا کر رہا تھا۔ اس نے ہی کوئی اپنا آدمی چھوڑ رکھا ہے جس کی معرفت یہ خط اڑایا گیا۔ چنانچہ دونوں سپرنٹنڈنٹوں نے فیصلہ کیا کہ ایڈیٹر "ریاست" کو گرفتار کیا جائے۔ اور دفتر "ریاست" کی تلاشی لی جائے ان تمام حالات کی ایڈیٹر "ریاست" کو بھی دائسر نے ہوس کے دوست سے ٹیلیفون پر اطلاع ملتی رہی اور ایڈیٹر "ریاست" گرفتاری و تلاشی کا منتظر رہا۔

خان بہادر میاں محمد صادق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی (جواب ریشا ہو چکے ہیں) لاہور کی احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذہبی قسم کے بہت شریف اور نیک بزرگ ہیں۔ آپ نے شاید اپنی تمام زندگی ایک پیہہ رشتہ نہیں لی۔ اور نہ جھوٹے مقدمے بنائے۔ آپ موگا (ضلع فیروز پور) کے علاقہ میں کسی برس انسپکٹر اور انسپکٹر پولیس رہے۔ اور وہاں آپ کے رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر متھرا داس جب کبھی مدلی تشریف لاتے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر پھرتے تو میاں محمد صادق بھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر تشریف لاتے اس ذریعہ سے ایڈیٹر "ریاست" کی میاں محمد صادق سے ذاتی واقفیت تھی۔ اور میاں صاحب ایڈیٹر "ریاست" کے حالات، کیرئیر اور صفات یا برائیوں سے واقف تھے۔ جب پولیس کے دونوں سپرنٹنڈنٹوں نے ایڈیٹر "ریاست" کی گرفتاری اور تلاشی کا فیصلہ کیا۔ تو میاں صاحب نے ان سے کہا کہ اگر یہ خط دیوان سنگھ نے اڑایا ہے۔ تو وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اُس نے یہ خط اپنے گھر پر کبھی نہ رکھا ہوگا اُس کی درجنوں باتلاشیاں ہوں گی۔ مگر کبھی ایک بڑبڑہ برآمد نہیں ہو سکا۔ یہ طریقہ غلط ہے اس صورت میں خط کا، آپس ملنا ممکن نہ ہوگا۔ اور حالات زیادہ بگڑ جائیں گے بہتر ہے کہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھایا جائے۔ دیوان سنگھ اپنے ذاتی دوستوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر اُسے نہ بتانا ہوگا۔ تو کہہ دے گا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ اگر خط اُس نے لیا ہے اور وہ بتانے میں ہرج نہیں سمجھے گا۔ تو وہ فوراً بتا دے گا۔ اور اگر اُسے خط کو اخبار میں شائع کرنا ہے تو وہ شائع کر دے گا۔ کسی کی پروا نہ کرے گا۔ وہ بزدل نہیں کہ ان باتوں سے ڈر جائے۔ چنانچہ دو تین گھنٹہ کی بحث اور مشورہ کے بعد یہ تحقیقات میاں محمد صادق کے سپرد کر دی گئی۔ میاں صاحب موٹر میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں پہنچے۔ ادھر مجھے دائسر نے ہوس سے تمام مشوروں اور نتیجہ کا ٹیلی فون پر پتہ چل گیا تھا میں منتظر تھا کہ میاں صاحب نے اپنے دفتر میں پہنچ کر مجھے ٹیلی فون کیا۔ اور اس طرح بات چیت شروع ہوئی:-

میاں صاحب - فرمائیے کیا حال ہے۔ مزاج اچھے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" - آپ کی مہربانی ہے میاں صاحب۔

میاں صاحب - کیا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط آیا۔

ایڈیٹر "ریاست" - حال میں تو کوئی نہیں آیا۔ پندرہ میں روز ہوئے آیا تھا۔

میاں صاحب۔ ڈاکٹر صاحب دہلی تو نہیں آئے والے۔  
ایڈیٹر ریاست۔ ”میاں صاحب اُن کا کیا ہے کام ہوا فوراً پلے آئے نہ کام ہوا۔ جہیز نہیں آتے۔  
میاں صاحب۔ میری آج طبیعت بہت اُداس تھی۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں نے کہا آپ کو  
ٹیلی فون ہی کروں۔

ایڈیٹر ریاست۔ ”آج کل موسم ایسا ہی ہے شاید طیریا کی آمد ہو۔

میاں صاحب۔ ہاں شاید۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔

ایڈیٹر ریاست۔ ”میاں صاحب کام کر رہا ہوں۔ ہم مزدور آدمی ہیں صبح سے رات تک کام کرتے ہیں۔  
آپ کی طرح تو نہیں کہ کوئی کام نہیں۔ اور حکم چلاتے رہے۔

میاں صاحب۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو یہاں آجائیے۔ ہتھوڑی دیر باتیں کریں گے یا مجھے کہئے میں وہاں  
آجاؤں۔

میں نے جواب دیا۔ میں ہی آتا ہوں کیونکہ جانتا تھا کہ اس طرح نہ جاؤں گا تو کنیشنل یا سب انسپکٹر بھیج کر بلا لیں گے۔ پولیس  
کے احقر ہیں چاہے کتنے دوست ہوں۔ وقت پر نہ باپ کے ہیں نہ بھائی کے اور نہ دوستوں کے۔ میں اپنی کار پر میاں صاحب  
کے دفتر میں گیا۔ میاں صاحب اکیلے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے میں تو تمام حالات سے واقف تھا کہ داسرے ہوس  
میں کیا مشورے ہوئے۔ مگر میاں صاحب سمجھتے تھے کہ میں بالکل بے خبر ہوں۔ میرے پہنچنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔  
ڈاکٹر متھرا داس کے متعلق۔ موسم کے متعلق۔ بلیریا کے متعلق۔ اخبار ”ریاست“ کے کاروبار کے متعلق پانچ سات منٹ  
ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میاں صاحب نے پوچھا کہ ہمارا راجہ اور آج کل کہاں ہیں۔ یہ سن کر مجھ سے رہا نہ گیا میں  
شکر ادا کیا۔ اور جواب میں کہا۔ میاں صاحب یہ نہ پوچھئے کہ ہمارا راجہ اور کہاں ہیں۔ یہ پوچھئے کہ لارڈ وننگٹن کے  
ہاتھوں کی لکھی ہوئی وہ چٹھی کہاں ہے جو ہمارا راجہ اور کے متعلق داسرے نے مسٹر جناداس دوار کا داس کو مسٹر آسکریا  
کی کوٹھی پر بھیجی اور جو گم ہے۔ میاں صاحب یہ سن کر دنگ رہ گئے۔ حیران تھے کہ مجھے تمام واقعات کا علم کیونکر ہوا۔  
آخر میاں صاحب نے اقرار کیا کہ ہاں اس خط کی تحقیقات کے سلسلہ میں ہی مجھے وہاں دفتر میں بلا لیا گیا ہے۔

میں نے میاں صاحب سے کہا کہ آپ کے بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی میں آپ کو کوئی جواب  
دینا نہیں چاہتا مگر چونکہ آپ ذاتی دوست ہیں۔ اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ چٹھی میرے پاس نہیں پہنچی نہ میں  
نے اڑائی اور نہ مجھے کوئی علم ہے۔ اور مجھے سخت افسوس ہے کہ ایسی چٹھی میرے ہاتھ کیوں نہ لگی۔ جس میں داسرے  
نے پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے اپنے بے بسی کا اظہار کیا ہے۔ اگر یہ چٹھی مجھے مل جاتی تو چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہوتا  
میں اس چٹھی کو ”ریاست“ میں ضرور شائع کر دیتا۔

میاں صاحب کو میرے اس جواب سے یقین ہو گیا کہ خط کے اڑانے میں میرا ہاتھ نہیں۔ آپ نے داسرے  
ہوس جا کر اس چٹھی اسی سے پھر پوچھنا شروع کیا۔ سوالات ہوئے۔ اور وہ کچھ ہوا جس کو پولیس اپنی لغات میں  
”انٹیرڈکشن“ کہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چٹھی اسی نے اقرار کر لیا کہ اس کا لارڈ کاسنٹ بیمار تھا اس بیماری کے  
باعث وہ خط نہ لے جا سکا۔ اگلے روز اس خوف سے کہ خط لپٹ کیوں ہوا۔ اس نے خط کو چولے میں خود جلا دیا  
ہے۔ چنانچہ چولے میں دیکھا گیا۔ تو چلے ہوئے اُس خط کے ٹکڑے موجود تھے۔ چٹھی اسی جو پنجاب کا رہنے والا

مسلمان تھا۔ اس جرم میں موقوف کر دیا گیا۔ اور مسٹر ہیمل کو یقین ہوا کہ خط دیوان سنگھ نے نہیں اڑایا۔ اور نہ دیوان سنگھ سے داسرائے ہوس غیر محفوظ ہے۔ مسٹر ہیمل نے پولیس کے سپرنٹنڈنٹس سے کہا تھا کہ دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست کے ہاتھوں ریاستوں کے علاوہ داسرائے ہوس بھی محفوظ نہیں، اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے لئے خبریں حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور ان کے لئے کیونکر قدم قدم پر خطرہ برداشت کیا جاتا ہے۔

## ایک پاگل کی ”ریاست“ کو امداد

ایڈیٹر ”ریاست“ اور مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر، بمبئی سینیٹل ”دوڑوں نے دہلی سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار تبصیر اخبار ”ہیرلڈ“ جاری کیا۔ ”ریاست“ اور ”ہیرلڈ“ دونوں کے وقار تاریخی دروازہ کے باہر لالہ دیوان چند کی بلڈنگ میں تھے مسٹر ہارنیمین کام تر دہ نہیں کرتے تھے۔ مگر دہنہ تھے نئی دہلی رائے بہادر سردار نائن سنگھ ٹھیکہ دار کی کوشش کے ایک حصوں۔ جنس ”ہیرلڈ“ کو جاری ہونے دو ہفتے گزر چکے۔ تو ایک روز صبح نو بجے کے قریب ایک گجراتی نوجوان کھڑے کپڑے پہنے ہوئے دفتر میں آئے۔ اور آپ نے پوچھا کہ مسٹر ہارنیمین کہاں ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے جواب دیا کہ وہ نئی دہلی میں ہیں کوئی ضروری کام ہو تو فرمائیے۔ میں آدمی ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ نے بتایا کہ مسٹر ہارنیمین نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ بمبئی میں ایک نئے جاری ہونے والے روزانہ انگریزی اخبار کو ایڈیٹر کر رہے ہیں۔ اس وعدہ پر آپ نے اڑھائی تین لاکھ روپے کی مشینری کا آرڈر دلا بیت دیا تھا اور اب جب کہ مشینری بمبئی میں پہنچ گئی ہے تو مسٹر ہارنیمین دہلی آگئے ہیں۔ میں نے ان صاحب کے لئے چائے منگائی چائے پر باتیں ہوئیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ آپ ایک کروڑ پتی سیٹھ ہیں۔ اخبارات نکالنے کا آپ کو شوق ہے۔ بمبئی اور کراچی میں آپ کا کاروبار ہے۔ اور جاری کئے جانے والے روزانہ انگریزی اخبار کے لئے آپ دس لاکھ روپیہ صرف کر دیں گے تاکہ وہ اخبار ہندوستانیوں کا ہو۔ اور ”سٹیٹسین“ اور ”ٹائمز آف انڈیا“ کا مقابلہ کر سکے چنانچہ آپ نے یہ بھی رائے ظاہر کی کہ اس انگریزی روزانہ اخبار کے ساتھ ”ریاست“ کو بھی بمبئی سے شائع کیا جائے۔ اور اس کے لئے آپ لاکھ دو لاکھ روپیہ صرف کر دیں گے۔

اس گجراتی سیٹھ کی باتیں سن کر ایڈیٹر ”ریاست“ کو ایک نئی دنیا نظر آ رہی تھی اور وہ خیال کر رہا تھا کہ اگر اتنا روپیہ صرف کیا جائے تو ”ریاست“ ”ٹائمز آف انڈیا“ کے ”اسٹریٹ ویلک آف انڈیا“ کی طرح تمام کام آروڑ ٹاپ اور نقصان دہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے اس گجراتی کو اپنی کاروں میں ساتھ لیا۔ اور اسے مسٹر ہارنیمین کے پاس نئی دہلی لے گیا۔ مسٹر ہارنیمین مضمون لکھ رہے تھے۔ اور مصروف تھے۔ معمولی بات چیت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ رنج کے وقت دفتر میں بات چیت کریں گے۔ میں سیٹھ صاحب کو لے کر واپس آ گیا۔ ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ باورچی سے دجس کا نام کوہلو تھا۔ گو آکا رہنے والا تھا۔ اور انگریزی کھانا بہت اچھا پکاتا تھا، کہا کہ آج پینے غیر معمولی طور سے زیادہ اچھا اور پر تکلف ہو۔ میں ایک بجے تک ان گجراتی صاحب کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہا۔ ایک بجے مسٹر ہارنیمین آئے۔ اس زمانے میں میرے ہاں پینے اور ڈنر پر پانچ سات دوست ضرور ہوتے

تھے پہنچ کھایا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو مشینری دلایت سے آئی ہے۔ وہ فی الحال یہی رہے گی۔ نیا اخبار یہی سے جاری کیا جائے۔ اور پھر مناسب موقع سے ”ریاست“ کو بھی بنی منتقل کروایا جائے کیونکہ وہاں پریس کے متعلق زیادہ سہولتیں ہوں گی۔

مسٹر ہارنیمین شام تک کام کرتے رہے۔ شام کو ان گجراتی سیٹھ صاحب کے اعزاز میں پر تکلف چائے کا انتظام کیا گیا نصف درجن کے قریب دوست چائے پر موجود تھے۔ چائے کے بعد سب دوست اور مسٹر ہارنیمین اپنے اپنے گھر دس کو چلے گئے۔ گجراتی سیٹھ صاحب بیٹھے رہے۔ دو گھنٹہ کے بعد میں ان کو دہلی کی سیر کرانے کے لئے کار میں لے گیا۔ راستہ میں آپ نے پوچھا کہ ”ریاست“ کی مالی حالت کیسی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخبارات کو مالی پریشانیاں تو رہتی ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ ہاں ہندوستان میں جرنلزم کی حالت ایسی ہی ہے۔ سیر سے واپس آئے تو آپ نے پوچھنے ہی اپنی چیک بک نکالی۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ کا ایک چیک کراچی بینک کا ”ریاست“ کے لئے لکھ کر راقم السطور کو دیا۔ اور کہا کہ فی الحال یہ دس ہزار روپیہ لو۔ اگر اور ضرورت ہوئی۔ تو دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ تک اور ”ریاست“ کی امداد کریں گے۔ یہ گجراتی سیٹھ رات کو ڈونر کھانے کے بعد تشریف لے گئے۔ اور آپ نے فرمایا کہ آپ لاہور۔ راولپنڈی اور پشاور وغیرہ سیر کے لئے جا رہے ہیں۔ اگلے روز وہ چیک کیش کرنے کے لئے مسلم بینک (جہاں کہ اس زمانہ میں ”ریاست“ کا حساب تھا) کو بھیجا گیا۔ اس دس ہزار روپیہ صرف کرنے کی سکیم پر غور ہونے لگا۔ اتنا روپیہ مسٹر ہارنیمین کو دیا جائے گا۔ اتنا فلاں دوست کو۔ اتنا قرضہ میں ادا کیا جائے گا۔ اتنے روپیہ کی فلاں فلاں چیز منگائی جائے گی۔ وغیرہ ایک ہفتہ ان دل خوش کن خیالات میں مصروفیت رہی۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ چیک مسلم بینک سے واپس آیا۔ جس کے ساتھ ایک سلپ لگی ہوئی تھی کہ اس چیک جاری کرنے والے کا اس بینک میں کوئی حساب نہیں۔ جب یہ چیک واپس آیا تو یقین نہ آتا تھا کہ گجراتی سیٹھ صاحب کا بینک میں حساب نہیں۔ میں کبھی چیک کو سیدھی طرف سے دیکھتا کبھی آٹمی طرف سے کبھی ساتھ والی سلپ کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ کراچی والے بینک نے شاید غلطی سے ایسا لکھ دیا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ بینک میں حساب نہ ہو۔ واپس آئے ہوئے چیک پر میں اور مسٹر ہارنیمین دو روز غور کرتے رہے۔ کبھی خیال آتا کہ کراچی کے کسی دوست کو اصل حالات معلوم کرنے کے لئے لکھا جائے۔ ان کے خیالات میں تھا کہ کو تو ملی سے انسپکٹر پولیس کا ٹیلی فون آیا کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو ایڈیٹر ریاست کا ذاتی دوست بیان کرتے ہیں حالات میں بند ہیں دلتا چلتے ہیں میں حیران تھا کہ کون دوست حالات میں بھیج دیے گئے۔ فوراً کار میں بیٹھ کر کو ٹلی پہنچا۔ حالات میں دیکھا۔ تو وہی سیٹھ صاحب جس کے اندر تشریف فرما ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ کہا ”ہیلو دیوان سنگھ“ میں نے پوچھا آپ کس طرح یہاں تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ غلط فہمی سی ہے۔ انسپکٹر پولیس سے ملنا۔ پوچھا کیا معاملہ ہے۔ تو انسپکٹر نے بتایا کہ سیٹھ صاحب ایک ہوٹل میں پھٹے ہوئے تھے۔ فریخ موٹر کار کمپنی کو پانچ ہزار روپے کا جعلی چیک دے کر موٹر خریدی۔ پھر والے بائیس کوپ کے پاس ایک گھڑی ساز کو چیک دے کر گھڑیاں خریدیں۔ پھر ان کے اس سے کپڑا خریدا اور اس طرح ایک درجن کے قریب جعلی چیک دے کر مختلف لوگوں سے سامان خریدا مگر سامان لیا نہیں۔ انسپکٹر کی باتیں سن کر یقین آیا۔ کہ دس ہزار روپیہ والا چیک بھی ایسا ہی ہے جو کیش نہیں ہو سکتا۔

تین روز بعد سیٹھ صاحب کی پیشی سٹر رشید محٹرٹ کی عدالت میں تھی۔ مقدمہ چار سو میں جنی دھوکہ قابل ضمانت تھا۔ مجسٹریٹ نے سزائے موت سے کہا کہ اگر ضمانت دو۔ تو ضمانت پر رہا ہو سکتے ہو۔ کیا کوئی ضمانت ہے جو ضمانت نے سیٹھ صاحب نے فرمایا کہ دیوان سنگھ آپ کا بہت گہرا دوست ہے۔ سٹر رشید نے ایڈیٹر ریاست کو ٹیلی فون کر کے عدالت میں بلایا۔ اور کہا کہ سیٹھ صاحب آپ کے دوست ہیں۔ اگر ضمانت دو۔ تو یہ رہا ہو سکتے ہیں۔ یہ سن کر میں شکر ادا کیا۔ اور کہا کہ اگر آپ فرمائیے۔ تو میں تمام حالات عرض کروں۔ میں نے من و عن تمام حالات بتائے۔ کس طرح مجھے بھی دس ہزار روپے کا چیک دیا گیا۔ اور پینچ اور ڈھمکی دعوتیں ہوئیں۔ عدالت میں شکر اہسٹ اور قہقہوں کی ایک دلچسپ کیفیت سی تھی۔ آخر میں نے کہا کہ سیٹھ صاحب کے دماغ میں خلل ہے۔ ان کی نیت بُری نہیں۔ صرف چیک جاری کرنے کا شوق اور پانگل پن ہے۔ ورنہ مجھے دس ہزار روپے کا چیک کیوں دیتے۔ کیونکہ مجھ سے تو انھوں نے کوئی چیز اس کے معاد ضے میں لی نہیں۔ چنانچہ میری شہادت ہوئی۔ میں نے تمام حالات لکھائے۔ اور سیٹھ صاحب دعوئی عارضہ میں مبتلا قرار دیئے جا کر بری ہوئے۔ واپس یہی تشریف لے گئے۔ اور وہ دس ہزار روپے کا چیک جو ایک ہفتہ کے قریب بل کو انتہائی خوش کرنے اور نئی سکیں بنانے کا باعث رہا۔ بھاڑ دیا گیا۔

## پبلک لائف اور شادی

”ریاست“ جاری ہو چکا تھا۔ میں ہمارا جہنا بھگت کے پاس منصوبہ پہاڑ پتیم تھا۔ ہمارا جہ اور ہمارا فی بجھے اپنے فیلی کے ایک ممبر کی طرح سمجھتے تھے۔ ہمارا جہ کے ساتھ کئی برس سے گہرے تعلقات تھے۔ اور ہمارا فی بھی اپنے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھیں۔ مجھے منصوبہ کے لئے پندرہ بیس روزہ ہوئے تھے حافظ آباد سے میری والدہ کا خط ملا کہ شادی کے لئے تمام تیاری مکمل ہو چکی ہے اور تاریخ مقرر کی جا رہی ہے۔ روپیہ کا انتظام کرو۔ میرے پاس روپیہ کہاں تمام زندگی گمبی بھی روپیہ جمع نہ ہو سکا۔ بلکہ ہمیشہ مفروض رہا۔ وہ پیہ جمع بھی کیونکر ہو۔ جب روپیہ آنے سے پہلے اس نے خرچ کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔ اس خط کو پڑھ کر سوچنا رہا کہ کیا کروں۔ دور در سوچنے کے بعد میں نے یہ خط ہمارا فی کو دکھایا۔ دوپہر کو جب ہم لوگ پینچ کھا رہے تھے۔ تو ہمارا فی نے ہمارا جہ کو غیاطب کرتے ہوئے کہا کہ یوں تنگ کی شادی کے لئے تاریخ مقرر ہو رہی ہے۔ اس کے پاس روپیہ موجود نہیں۔ زبور اور کپڑا وغیرہ تو تیار ہے مگر دوسرے اخراجات کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ ہمارا جہ نے پوچھا کہ کتنا روپیہ چاہئے۔ ہمارا فی نے جواب دیا۔ دو ہزار روپیہ کافی ہوگا۔ ہمارا جہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

پینچ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہاں بیٹھے تھے کہ ہمارا جہ نے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ہمارا جہ نے کہا کہ جو لوگ پبلک خدمت کریں ان کو شادی نہ کرنی چاہئے میں نے جواب دیا کہ میں تنہائی کی زندگی سے تنگ نہ چکا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ شادی کر لوں۔ یہ بحث دیر تک جاری رہی۔ ہمارا جہ بار بار زور دیتے تھے کہ میں شادی نہ کروں۔ میں کہتا تھا کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارا فی میرے ساتھ متفق تھیں۔ اور کہتی تھیں کہ شادی کر لینا چاہئے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ رات کو ڈیڑھ بج کر ہوتی۔ تو ہمارا جہ نے اپنے متعلق کہا۔

”اگر میری شادی نہ ہوتی۔ بیوی بچے نہ ہوتے۔ تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ یہ بیوی بچے ہیں جن کے

باعث میں نے مگرنسٹ کے سامنے کھٹے ٹیک دیئے اور نا بھکی گدتی سے دستبردار ہو گیا۔ اگر بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کبھی دستبردار نہ ہوتا۔ اور زندگی کے آخری لمحوں تک کھڑا رہتا۔“

ہمارا جہ کے ان الفاظ کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ میں شادی کے خوشگوار خواب دیکھ رہا تھا۔ تین چار روز یہ بحث جاری رہی۔ ہمارا جہ بار بار زور دیتے تھے کہ میں شادی نہ کروں۔ پیسک لائف اختیار کرنے والے لوگوں کے راستے میں شادی اور بیوی بچے بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور انسان شادی کے بعد جرأت بہادری اور شجاعت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر مجھ پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ ہمارا بی بیاری کبھی تو غیر جانبدارانہ کو خاموش رہتیں۔ کبھی فرماتیں کہ دیوان سنگھ کو شادی کرنی چاہیے۔ آخر کئی دن رات اس مسئلہ پر بحث ہونے کے بعد جب میں نہ سانا۔ تو ہمارا جہ نے مجبور ہو کر اپنی چیک بک منگائی۔ چیک لکھنے لگے۔ تو پھر فرمایا:

”سردار دیوان سنگھ تم نہیں مانتے۔ تمام زندگی بچھتاؤ گے۔ چونکہ تم نہیں مانتے۔ اس لئے میں تم کو شادی کے لئے دو ہزار روپیہ دیتا ہوں۔“

جب آپ دو ہزار روپیہ کا چیک لکھ چکے۔ تو آپ نے چیک دیتے ہوئے پھر فرمایا۔  
”دیوان سنگھ جی آپ زندگی بھر بچھتاؤ گے۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں۔ شادی نہ کرو۔ پیسک لائف اختیار کرنے والے لوگوں کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ آپ کو شادی کے لئے دو ہزار روپیہ دے چکا ہوں اب بھی اگر شادی نہ کرنے کا اقرار کرو تو میں دو ہزار روپیہ کا ایک اور چیک آپ کو دیتا ہوں۔ یعنی شادی کو تو ہزار اور اگر شادی نہ کرو تو چار ہزار۔“

میں دو ہزار روپیہ لے کر دہلی واپس آ گیا۔ اور چند روز بعد اپنے وطن حافظ آباد شادی کے لئے چلا گیا۔ اور شادی ہو گئی۔ مگر میرے کانوں میں اب تک ہمارا جہ نا بھکے وہ الفاظ گونج رہے ہیں۔  
”شادی نہ کرو۔ تمام زندگی بچھتاؤ گے۔ پیسک لائف اختیار کرنے والوں کو شادی نہ کرنی چاہیے۔“

۱۹۴۲ء میں جب کانگریسی اصحاب کے ساتھ راقم الحروف بھی نظر بند کر دیا گیا۔ جیل میں سوائے کتابیں پڑھنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ تو دہلی کے ایک کانگریسی بزرگ شری برہنہ جی چلنی لالا جو ہما تھا گاندھی کے سچے بھگت اور جو غائبانہ دہلی کے تمام کانگرسیدوں سے زیادہ نیک ہیں اور پیسک کے بغرض خادم ہیں اس نے ایک چھوٹی سی کتاب مشکل پر بھات دی۔ جو ہما تھا گاندھی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب انسان کے کیریکٹر کو بلند کرنے کے اعتبار سے ایک لا جواب تصنیف ہے۔ شاید سولہ یا بیس صفحے کا چھوٹا سا پمفلٹ مگر جس کے ایک ایک صفحہ ایک ایک سطر ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف ہر جواہرات قربان کیے جاسکیں اس تصنیف میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ پیسک لائف اختیار کرنے والے شخص کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اور اگر اس کی شادی ہو چکی ہو۔ تو پھر بھی اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہن کے برابر سمجھے۔ اور یہاں بیوی کے تعلقات نہ رکھے۔

پچھلے تجربہ کے بعد میری رائے یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستہ میں بیوی۔ بچے اور روپیہ ایک لعنت ہیں۔ بیوی بچوں اور روپیہ کے باعث انسان جرأت اور شجاعت سے محروم ہو کر خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ لوگ خدشہ نصیب ہیں۔ جو اگر پیسک لائف اختیار کریں۔ تو ان کے بیوی بچے نہ ہوں اور وہ روپیہ سے محروم ہوں۔ اور

شادی صرف ان لوگوں کو کرنی چاہئے جو کلک ٹاپ کے ہوں۔ اور جن کی زندگی کا مقصد کھانا پہنتا شادی کرنا۔ بچے پیدا کرنا۔ بچوں کو کھلانا۔ ملازمت کرنا۔ اور اگر ان کا انٹرسٹ کا دے تو خوش ہو جائے۔ اور اگر انٹر کی پیشانی پر نشن بڑ جائیں۔ تو رات کو نیند نہ آتا ہو۔

## ایڈیٹر ریاست پر چوری کا مقدمہ

میں ذاب بھرپال والے مقدمہ کی پیشی پر سٹریٹج بہاری توکی اور سردار بہادر بھنگو ان سنگھ دھلا کے ساتھ ہوشنگ آباد گیا ہوا تھا۔ واپس آیا۔ تو دفتر کے لوگوں نے بتایا کہ مرحوم ذاب صاحب رام پور کے اے۔ ڈی۔ سی کرنل محمد علی آئے تھے اور کہتے تھے کہ ذاب صاحب رام پور کی حقیقی بہن شہزادی بیگم صاحبہ دہلی آئی ہیں۔ رام کٹر لین کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں اور بلنا چاہتی ہیں۔ میں شام کے وقت کاریں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ تو جس کوٹھی کا پتہ بتایا گیا تھا۔ وہ خالی تھی کوٹھی کے چوبیدار سے معلوم ہوا کہ دو تین روزہ میرے بیگم صاحبہ نئی دہلی کی کسی کوٹھی میں چلی گئی ہیں۔ میں نے پڑوسیوں سے پوچھا۔ کرنی دہلی میں کس سڑک پر وہ کوٹھی ہے۔ تو کچھ پتہ نہ چلا۔ واپس آگیا۔ ڈاک خانہ کوٹھی خزن کیا کہ بیگم صاحبہ کی ڈاک کہاں جاتی ہے تو انھوں نے بتایا کہ ان کے پاس بھی کوئی ہدایت نہیں۔ دو روز بعد کرنل محمد علی پھر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ شہزادی بیگم صاحبہ نئی دہلی یارک روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں لات بلنا چاہتی ہیں اور کئی بار یاد فرما چکی ہیں۔ شام کو جب سیر کے لیے گیا۔ تو یارک روڈ والی اُس کوٹھی میں پہنچا جس کا پتہ بتایا گیا تھا کرنل محمد علی منتظر تھے مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ بیگم صاحبہ کے دونوں صاحبزادے (موجودہ ذاب رام پور کے حقیقی بھائی) بھی بیٹھے تھے۔ غنڈی دیر بعد ساتھ والے کمرہ میں بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ اور دروازہ کی اوٹ میں پردہ کے اندر بیٹھ کر آپ نے باتیں شروع کیں۔ آپ نے پوچھا کیا دفتر "ریاست" میں رام پور سے گناہ خطوط ملتا کرتے تھے۔ میں نے کہا۔ مجھے تو یاد نہیں۔ شاید ملے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ رام پور کے شاہی محلات سے آپ بغیر نام لکھنے والے کے مطالبہ کے متعلق خطوط لکھا کرتی تھیں۔ اور ملازموں کو دے کر سٹیشن پر پوسٹ کرایا کرتی تھیں۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔ تو مجھے یاد آیا کہ کئی گناہ خطوط رام پور سے ملے تھے۔ جن میں ام لیر پولیس کے اندرونی انٹرنسٹ کے حالات کا ذکر ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ نے ایک طویل عرصہ بطور ایک قیدی کے پولیس میں بسر کیا۔ آپ کے محلات سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ آپ ذاب صاحب اور اپنی بھانج و غیرہ اور عزیزوں کے ساتھ منصوری گئیں۔ اور جب سب لوگ منصوری سے واپس ڈیرہ دون جا رہے تھے۔ تو آپ راستہ میں ڈیرہ دون رام پور والی گاڑی کی جگہ دہلی والی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ملازموں میں بہت تشویش ہوئی۔ مگر کسی کو جرات نہ تھی کہ کوئی روکتا۔ اور اب آپ دہلی میں اس لئے آئی ہیں کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ آپ کے ساتھ انصاف کرے۔ اور پہلے کو بتایا جائے کہ بھائی نے حقیقی بہن کے ساتھ کس قدر زیادتی کی تھی دنگھنہ کے قریب بیگم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔ میں ڈرائنگ روم میں تھا۔ اور وہ پردہ کے پیچھے دروازہ کی اوٹ میں دھمکے کمرہ کے اندر باتیں ہو چکے تھے بعد میں یہ وعدہ کر کے چلا آیا کہ حاضر ہوا کر دوں گا۔

شہزادی بیگم صاحبہ کے آنے کی اطلاع تمام شہر میں پھیل گئی۔ اور بھائی کی بہن کے ساتھ کی گئی



زیادتیوں کے چرچے شروع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کو جب معلوم ہوا۔ تو آپ فوراً رام پور پہنچے۔ وہاں سے بیس ہزار روپیہ کے قریب اس لئے لائے۔ کہ شہزادی بیگم صاحبہ کو دہلی میں رسوا و ذلیل کیا جائے۔ آپ نے ایک روزانہ اخبار "عادل" جاری کیا۔ اس میں ہر روز شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف کئی کئی کالم کے مضامین شروع ہوئے۔ آپ نے کرایہ کے کچھ لوگ تھوڑے روپیہ کے ساتھ خریدے۔ اور باقی روپیہ جو دوسرے لوگوں کے نام سے لائے تھے وہ بھی ہضم کر گئے۔ چند روز کے بعد پھر رام پور تشریف لے گئے۔ اس طرح سے بہرا پھیری کر کے آپ نے کافی روپیہ اخبار "عادل" کو چلانے اور دوسرے لوگوں کا ضمیر خریدنے کے نام پر حاصل کیا۔ اور نواب رام پور کو یقین دلایا۔ کہ آپ پبلیکل ڈیپارٹمنٹ پر بھی اپنا اثر استعمال کر کے شہزادی بیگم صاحبہ کو جبراً دہلی سے رام پور بھجوا دیں گے۔ حالانکہ پبلیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کو کچھ سمجھتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مہنی آتی تھی کہ نواب صاحب رام پور کو کیونکہ بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔

ادھر تو خواجہ حسن نظامی نے شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف اخبار "عادل" اور دوسرے چند اخبارات میں گندہ پراگندہ شروع کیا۔ ادھر شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں خود غرض لوگوں نے آنا شروع کیا۔ کوئی پمفلٹ لکھنے کی ترغیب دیتا۔ کوئی پوسٹر لکھنے کی۔ کوئی نیا اخبار نکالنے کیلئے امداد چاہتا۔ اور کوئی اپنے اخبار میں حمایت کرنے کا وعدہ کرتا۔ بیگم صاحبہ کسی کچھ جواب نہ دیتیں صرف یہ کہہ کر سب کو ٹال دیا جانا کہ خود کریں گی۔ میں کام سے فارغ ہونے کے بعد جب کاریں سیر کو جانا۔ تو مغرب کے بعد بیگم صاحبہ کے ہاں بھی ہر روز پہنچتا۔ بیگم صاحبہ بتاتیں کہ کون صاحب تشریف لائے تھے۔ اور کیا کہتے تھے۔ میں مناسب رائے دے دیتا۔ کیونکہ ان خدمات پیش کرنے والوں کے تمام حالات سے واقف تھا۔ یہ زمانہ بھی میرے اور میرے دوستوں کے لئے بہت امتحان کا تھا۔ اس سے پہلے سیر اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان بہت گہرے تعلقات تھے۔ آپ نے نواب رام پور کو خوش کرنے کے لئے میرے خلاف لکھنے کی ہم اشرا اس اخبار "عادل" سے کی۔ جب خواجہ حسن نظامی نے میرے خلاف پہلا مضمون لکھا۔ تو میں نے واحدی صاحب اور بھیا شیخ احسان الحق جو دروزں کے مشترکہ دوست تھے۔ کی معرفت آپ سے کہا کہ میرے خلاف بلا وجہ نواب رام پور کو خوش کرنے کے لئے نہ لکھئے۔ یہ وضع داری کے خلاف ہے۔ زبانی تو آپ نے واحدی صاحب اور بھیا احسان دونوں سے وعدہ کیا۔ مگر مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ان کی جیب ان کو مجبور کر رہی تھی۔ کہ نواب رام پور کو اور خوش کرو۔ آخر میں نے واحدی صاحب کے ٹیلیفون پر کہا۔ کہ اب میں خواجہ کو ایسا سیدھا کروں گا جیسے (اس کے بعد پنجابی زبان میں کہا۔ جس کا یہاں لکھنا مناسب نہیں) واحدی صاحب بچائے پنجابی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتے تھے۔ اور غیر معمولی اور غیر ضروری نیک۔ آپ نے جب مجھے انتہائی غصہ کی حالت میں ٹیلی فون میں پنجابی کے زیادہ سخت اور زوردار الفاظ کہتے سنا تو آپ نے کہا کیا فٹ رمایا سردار صاحب کیا فرمایا میں سمجھا نہیں۔ آپ نے کہا فرمایا۔ "میں نے پنجابی کے ان الفاظ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ واحدی صاحب سن کر سن ہو گئے۔ میں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ اور سمجھ لیا کہ خواجہ حسن نظامی دیکھنے کے دوستوں کو بھی قربان کر سکتا ہے چنانچہ اُس کے بعد کبھی ان کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہو سکے حالانکہ انہوں نے درجنوں بار تعلقات کو اچھا کرنے کی کوشش کی ان تمام واقعات کا علم واحدی صاحب اور بھیا احسان دونوں کو ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی مخالفت کا ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میرے ان دونوں

کے ساتھ ہمیشہ ہی گہرے اخلاص دوستی کے تعلقات قائم رہے چنانچہ بھٹی صاحب نے نو سو سال ہوئے میرے جیل ہانے پر میری غیر حاضری میں دفتر ”ریاست“ کا اور میرا ذاتی تمام انتظام بھی اپنے ذمہ لیا۔ اور اب تک دونوں کے ساتھ بھائیوں جیسے گہرے تعلقات میں (خواجہ حسن نظامی کے علاوہ اس زمانہ میں کئی اور دوست بھی ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے۔ میرٹھ کے ایک جرنلسٹ ان واقعات سے پہلے جب کبھی نہلی آتے تو ایڈیٹر ”ریاست“ کے مکان پر بیٹھتے۔ بہت گہرے مرام تھے۔ اس گفتگو کو دیکھ کر ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ خواجہ حسن نظامی کے پاس چلے گئے۔ اور امداد چاہی۔ وہاں درہنڈیل کے پاس دوسروں کے لئے کیا رکھا تھا۔ ان کی بھولی میں تو اپنے لئے بھی کافی نہیں ہوتا۔ ناکام واپس میرٹھ چلے گئے۔ چند روز کے بعد پھر دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے۔ مجھے ان کے خواجہ حسن نظامی سے ملنے اور اپنی خدمات پیش کرنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ میں نے کہا۔ تشریف لے جایئے۔ اور آئندہ کبھی نہ آئیئے۔ چنانچہ اس کے بعد ان حضرت کو ادھر کا رخ کرنے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوا۔ اس طرح سے ہی کئی دوسرے دوستوں سے تعلقات منقطع ہو گئے جن کے متعلق دیکھ لیا کہ یہ لوگ روپیہ پر دوستوں کو قربان کر سکتے ہیں۔

میں ایک روز شام کو شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں گیا۔ تو انھوں نے فرمایا کہ ایک صاحب خواجہ حسن نظامی کے ہاں کلرک کا کام کرتے ہیں۔ آتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر روپیہ دو۔ تو خواجہ حسن نظامی کے ہاں کے کچھ کاغذات دیئے جا سکتے ہیں۔ جو رام پور سے آئے ہیں۔ چونکہ آپ سے مشورہ کرنا تھا اس لئے اس شخص کو کل آنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ میں نے کہا کل جب وہ شخص آئے تو اس سے کہئے کہ پہلے کاغذات دکھاؤ۔ پھر روپیے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اگلے روز اس کلرک سے ہی کہا گیا تیسرے روز یہ شخص کاغذات کا ایک چھوٹا سا بنڈل لے کر آیا۔ تو اس سے کہا گیا کہ دو روز کے بعد جواب دیا جائے گا۔ میں اس روز جب بیگم صاحبہ کے ہاں گیا۔ تو آپ نے بغیر اس بنڈل کو کھولے یہ کاغذات مجھے دیکھنے کے لئے دیئے۔ میں کاغذات لے کر دفتر چلا آیا۔ وہاں اس بنڈل کو کھولا۔ تو زیادہ تر اس میں خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے مضامین کے ردی مسودے تھے جن سے ہمیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کام کے جو کاغذات ملے ان میں چار پانچ بہت اہم تھے۔ ایک خط مسعود صاحب (میرا خیال ہے۔ یہی نام تھا۔ اس زمانہ میں ”ریاست“ میں اس خط کا بلاک چھپا تھا۔) ریونیو سنٹر رام پور کا۔ ایک دہاں کے بیٹی آفسر کا اور ایک اور کسی صاحب کا۔ ان خطوط میں لکھا گیا تھا کہ شہزادی بیگم کے خلاف اخبارات میں اور پولیس کی ڈیپارٹمنٹ پر اپنا اثر استعمال کرتے ہوئے خوب پراپا گندہ کر دے تاکہ یہ قانون ذیل دوسرا ہو۔ ان خطوط کے علاوہ اخباری نقطہ نگاہ سے چند مضامین کے مسودے بہت اہم تھے۔ جو خواجہ صاحب نے اپنے اخبار میں چھپنے کے لئے حیدرآباد سے بھیجے۔ اور جن میں بار بار آپ نے خود اپنے آپ کو ”حضرت خواجہ صاحب“ ”حضرت خواجہ صاحب“ لکھا تھا۔ یعنی حسن نظامی کو اپنے نام کے ساتھ خود ”حضرت خواجہ صاحب“ لکھتے ہوئے شرم محسوس نہ ہوئی حالانکہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ذہنیت کے آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لالہ۔ بابو یا سردار وغیرہ لکھتے۔ میں نے جب یہ کاغذات دیکھے۔ تو ایسا محسوس کرنا تھا۔ گویا کہ ایک نعمت ہاتھ میں آگئی۔ اور اس سے خواجہ حسن نظامی کی چلبک میں اخلاقی موت کی جا سکے گی۔ میں بار بار ان خطوط اور مسودوں کو دیکھتا رہا مجھے میند نہ آئی (میری فطرت ہے۔ کہ جب تک کسی بات کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کروں یا پروگرام تیار نہ ہو جائے

یہ کام ختم نہ کر لیا جائے۔ میں سو نہیں سکتا) نصف گھنٹہ کے قریب ان کا غذا کو دیکھتا رہا۔ اور کھانا بھی کھاتا رہا۔ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ سو چتا رہا۔ پھر خیال کیا کہ کن شخص ایسا ہوگا۔ جو مسعود صاحب کے خط سے واقف ہو۔ چند منٹ سوچنے کے بعد مکان سے نیچے اترتا۔ دفتر کی پچھلی طرف موٹر گیرج تھا۔ اس میں سے کار نکالی۔ اور نئی دہلی خان بہادر موروی محمد مظہر صاحب (جو دہلی آنے سے پہلے یوپی میں ملازم تھے۔ ہندوستان کے مشہور مفتی مولانا اشرف علی تھانوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور بعد میں ریاست حیدرآباد میں ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے) کے مکان پر گیا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ مگر وہ ابھی ایک دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ پان کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمانے لگے۔ اس وقت کیسے تشریف لائے۔ خیریت تو ہے۔ میں نے کہا۔ سلام دہقانی خانی از مطلب نیست۔ کیا آپ مسعود صاحب کو جانتے ہیں۔ جو پہلے یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور آجکل رام پور میں ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ بہت اچھی طرح سے۔ میں نے جیب سے مسعود صاحب والا خط نکالا۔ اور پوچھا کیا آپ جھٹا بچاتے ہیں۔ آپ نے خط دیکھ کر کہا کہ آپ اتنے زیادہ واقف نہیں۔ مگر یہ صاحب (جو ساتھ بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے) کئی برس مسعود صاحب کے ساتھ مراہ آباد میں اکٹھے رہے ہیں اور ان کے گہرے دوست ہیں۔ خدان صاحب کو دیا گیا۔ تو انہوں نے دیکھتے ہی فوراً کہا۔ ہاں یہ خط مسعود کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مظہر صاحب نے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا معمولی بات ہے پوچھنا تھا۔ کہ یہ خط کس کا ہے۔ میں رابیں چلا آیا۔ دفتر پہنچا۔ بینک کے آتی میز پر بیٹھ گیا۔ تمام سکیم تیار کی۔ کہ ان کو گب اور کس طرح شائع کیا جائے۔ لیڈر لکھتا اور تمام پروگرام تیار کرنے کے بعد سو گیا۔ صبح اٹھے ہی ان خطوط کو فوٹو گرافر کے پاس اس تاکید کے ساتھ آدمی کے ہاتھ بھیجا کہ جب وہ فوٹو لے چکے۔ تو اصل خط واپس لے آئے۔ شام کو سکیم صاحبہ کے پاس گیا۔ ان سے کہا کہ پانچ چھ خط کام کے ہیں۔ باقی تمام واپس کر دیجئے۔ اور کہا کہ ان پانچ چھ خطوط کا ایک یا دو سو روپیہ دے دیا جائے چنانچہ اگلے روز جب خط لانے والا آیا۔ تو اس کو دو سو روپے دے دیئے گئے۔

ان خطوط کے ہلاک بنے ہلاکوں کا چر بہ لیا گیا۔ اور "ریاست" میں ان چوبیس کے ساتھ لیڈر شائع ہوا۔ اس پر چر کا شائع ہوتا تھا کہ خواجه حسن نظامی کے کیس میں زلزلہ آگیا۔ انتہائی گھبراہٹ بھاگ دوڑ۔ کہ اب کیا ہو۔ خواجہ اینڈرک کی کانفرنس اور مشورے۔ خواجه حسن نظامی کو جو لوگ ذاتی اعتبار سے جانتے تھے ان کو علم تھا۔ کہ یہ حضرت عقل اور ہوشیاری کے اعتبار سے ہمیشہ دوسروں کے رحم پر رہے۔ ان کی اوپر کی منزل کا حصہ (رومانا) بالکل ڈھیلیٹ (خالی) رہتا ہے۔ ان کے مشیروں نے رائے دی کہ پولیس انسرول سے بل کر تھانہ میں رپورٹ درج کرائیے۔ اور کاغذات کے چوری کرانے کے جرم میں دیوان سنگھ کو قید کر دیجئے۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ظالم کے مطابق چوری کا مال لینا بھی جرم ہے۔ دیوان سنگھ فوراً قید ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ سب اپنے حواریوں کے پولیس انسرول کے پاس پہنچے۔ راقم الحروف نے بھی اطلاعوں کے لئے ان کے کیس میں آدمی چھوڑ رکھا تھا اس نے ٹیلی فون کیا کہ یہ سکیم ہے۔ چوری کا مقدمہ قائم ہوگا۔ اور دفتر ریاست کی تلاشی ہوگی میں نے ٹیلی فون پر اس اطلاع کو باتے ہی فوراً تمام کاغذات اور ہلاک ایک اٹاچی کیس میں بند کئے۔ تار لگایا۔ اور نئی دہلی ایک دوست کے ہاں گیا۔ وہ دوست اپنے خسر کے ہاں رہتے تھے۔ اور ان کے خسر جوم ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدہ پر تھے میں نے اس دوست کو اٹاچی کیس دیا۔ اور کہا کہ اس میں کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ ان کو اپنے ہاں احتیاط سے رکھ چھوڑ دیجئے۔

اس دوست نے کہا۔ رکھ لئے جائیں گے معمولی بات ہے۔ اگر بہت ہی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے تو آپ اپنے خسر کے ہاتھ دفتر میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں وہ کانفیڈنشل کاغذات کی الماری میں رکھ سکتے ہیں چنانچہ میں تو واپس آگیا اور وہ کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی کانفیڈنشل الماری میں پہنچ گئے جہاں سے دو ہفتہ کے بعد واپس منگائے گئے۔ اٹاچی کیس اس دوست کے پاس چھوڑ کر میں واپس آیا۔ اپنے کام میں مصروف تھا۔ کہ پولیس کی جمعیت کے آٹھ دس آدمی۔ ایک سب انسپکٹر۔ خواجہ حسن نظامی کے سامنے ابن عربی۔ ایک اخبار نویس جو ان دنوں خواجہ حسن نظامی کے اخبار میں کام کرتے تھے۔ اور اب خواجہ حسن نظامی کو قابل نفرت مگر قابل رحم سمجھتے ہیں۔ اور متعدد دوسرے لوگ تلاشی کے لئے تشریف لائے۔ میں بے فکر تھا۔ تلاشی ہوئی۔ ایک ایک کونہ چھان مارا گیا۔ کوئی کسی طرف تلاشی میں مصروف ہے۔ کوئی کسی طرف۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے دُور سے آواز دی کہ دیکھو دوری کے نیچے سے خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی ایک تحریر نکل آئی ہے ہم لوگ وہاں گئے۔ تو کاغذ کا ایک پرزہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جو خواجہ حسن نظامی کے کسی مضمون کے مسودہ کی ایک سلیپ تھی۔ میں نے سب انسپکٹر کو بتایا کہ اس شخص نے خود اپنے جیب سے یہ پرزہ نکال کر رکھا ہے۔ ورنہ دری کے نیچے اگر میں نے رکھا ہوتا۔ تو اصل کاغذات بھی یہاں ہوتے جن کی تلاش ہے۔ سب انسپکٹر کو بھی اس شخص کی اس حرکت پر غصہ ہوا۔ کیونکہ یہ پرزہ بالکل بے ضرر تھا۔ دراصل یہ لوگ بے ایمانی کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے اندر بے ایمانی کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ اگر اس طرح سے کوئی شے رکھنا چاہتے تھے۔ تو کوئی پستول یا کیبن وغیرہ رکھواتے۔ ایک کاغذ کا پرزہ وہ بھی بے ضرر یعنی ساری رات روتے رہے مگر ایک بھی نہ۔ تلاشی ختم ہوئی۔ کچھ نہ نکلا۔ ریاست کے جن پرچہ میں ہلاک چھپا تھا۔ پولیس وہ پرچہ لے کر چلی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے بہت کوشش کی کہ اس پرچہ کو چوری کا ثبوت سمجھ کر ایڈیٹر ریاست کو گرفتار کیا جائے۔ مگر یہ بچارانہ قانون سے واقف تھا۔ نہ خدا نے شے لطیف دی تھی مقدمہ کیسے چلتا۔ جب کہ چوری کا سال "ہی نہ پکڑا گیا۔ کیونکہ کسی چوری شدہ شے کا نوٹو چوری نہیں قرار دیا جاسکتا جس طرح فراوندہ مجرم کا نوٹو قابلِ تعزیر نہیں۔ بلکہ خود قرار ہونے والا مجرم قابلِ گرفت ہے یہ لوگ ٹھنڈے ہو کر اور اپنا سر کپڑ کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ اس کے بعد "ریاست" میں یہ ہلاک پیچھے اور ان پر تفصیل کے ساتھ بحث ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کے پریشان مشیروں کی پھر کافرہش ہوئی ایک صاحب نے آپ کو رائے دی کہ اپنی پبلک پوزیشن صاف کرنے کے لئے یہ اعلان کر دو کہ یہ خطوط جعلی تھے۔ رام پور کے لوگوں کے لکھے ہوئے نہیں تاکہ لوگ "ریاست" کے پراگانڈہ پر یقین نہ کریں۔ خواجہ حسن نظامی لوگوں کی رائے قبول کرنے کے اعتبار سے بہت احسن واقع ہوئے تھے۔ آپ نے کچھ نہ سوچا۔ جھٹ اخبارات میں اعلان کر دیا کہ جو خطوط "ریاست" میں شائع ہوئے وہ جعلی ہیں۔ رام پور کے منسٹرپل کے لکھے ہوئے نہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا یہ اعلان شائع ہونا تھا کہ ہمارے ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ ہم نے چیخ کیا کہ خواجہ حسن نظامی میدان میں آئے۔ اور بتائے کہ اصل پوزیشن کیا ہے۔ یہ خطوط جعلی ہیں یا اصلی کیونکہ صرف دو صورتیں ہی ممکن ہیں یا تو یہ جعلی ہیں یا اصلی۔ اگر یہ خط جعلی ہیں۔ تو اس نے پولیس میں چوری کی جھوٹی رپورٹ دی۔ کیونکہ جعلی خطوط کا چوری سے کیا تعلق۔ اس کا تعلق تو جعل سازی سے ہے۔ اور اگر چوری کی رپورٹ درست تھی۔ اور خواجہ حسن نظامی نے یہ رپورٹ پولیس میں ایمان داری کے ساتھ سچی درج کرائی۔ یعنی خطوط چوری ہوئے۔ تو پھر یہ جعلی کس طرح قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اس چیخ کو پڑھ کر محضرت خواجہ صاحب کے

چھٹے چھوٹ گئے۔ کیا جواب دیتے۔ اس زہر کو اپنی والدہ محترمہ کا بیٹھا دودھ سمجھ کر صبر کے ساتھ پی گئے۔ اور قطعی خاموش ہو گئے۔ گویا آپ کی زبان میں گنگ علقا۔ چنانچہ اس کے بعد اس مسئلہ پر پھر آپ نے کبھی کچھ نہ فرمایا۔

جیلنگ شائع ہوا۔ دفتر ”ریاست“ میں اطلاع پہنچی کہ نواب رام پور کے خسر صاحبزادہ عبدالصمد جو بعد میں ریاست کشمیر میں ہوم منسٹر مقرر ہوئے) دہلی آئے ہیں۔ اور میڈن ہوٹل میں مقیم ہیں، اُس زمانہ میں مسٹر محمد حسن سابق ایڈیٹر روزانہ ”اددہ اخبار“ لکھنؤ دہلی میں تھے۔ اور دفتر ”ریاست“ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ صاحبزادہ صاحب کے دوست تھے جس نے اُن سے کہا کہ میڈن ہوٹل میں جا کر پتہ تو کر۔ کہ صاحبزادہ صاحب پر اس جیلنگ کا کیا اثر ہے وہ گئے۔ صاحبزادہ صاحب سے ملے۔ اور اس جیلنگ۔ اخبار ”ریاست“ اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو صاحبزادہ صاحب نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر محسن صاحب سے کہا۔

”محسن صاحب کیا پوچھتے ہو۔ نواب صاحب غلط راستہ پر جا رہے ہیں کسی کی نہیں سنئے۔ خواجہ حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دار اور نادان دوستوں کے باعث ریاست رام پور کی ہی تولید ہو رہی ہے۔ ذمہ دار منسٹروں نے حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دار شخص کو خطوط لکھنے کی حماقت کی۔ میں تو ایسے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ خدا ان کو عقل دے۔“

یہ خطوط اب بھی ایڈیٹر ”ریاست“ کے پاس موجود ہیں۔ جن کی حیثیت ادراک پارینہ سے زیادہ نہیں۔ جب کبھی پچھلے کا غزات کو جھانٹتا ہوں۔ اور ریاست رام پور کے فائل میں ان خطوط اور شہزادی بیگم صاحبہ کے خط (جن میں آپ نے لکھا تھا کہ آپ ایڈیٹر ”ریاست“ کی اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح عزت و قدر کرتی ہیں) کو دیکھتا ہوں۔ تو گنگنائے ہوئے یہ شعر زبان سے نکل جاتا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں این دفتر پارینہ را  
تازہ خواہی داستان گرد اغمائے سینہ را

## ایڈیٹر ”ریاست“ پر کوکین کا مقدمہ

ایڈیٹر ”ریاست“ لاہور کے ایک روزانہ اردو اخبار ”پنٹھ“ کو ایڈیٹر کرتا تھا۔ اس اخبار میں دے الفاظ کے ساتھ پٹیا لہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کا ذکر ہوا۔ اس سے پہلے کسی اخبار میں کبھی بھی مرحوم ہمارا چٹیا لہ کے خلاف ایسا الزام شائع نہ ہوا تھا۔ اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ پٹیا لہ کے کیمپ میں زلزلہ آگیا۔ سردیا کشن کرل وزیر اعظم پٹیا لہ لاہور تشریف لائے۔ اور یہ مضمون ڈاکٹر گوگل چند نارنگ ہیر سٹر دج بعد میں پنجاب کے منسٹر بنے اور اب سر گوگل چند ہیں) کو دکھا کر قانونی مشورہ طلب کیا۔ اس مضمون میں دے الفاظ کے ساتھ اشارۃ قتل کا ذکر تھا۔ صاف الفاظ میں نہ تھا میں نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر نارنگ نے کیا رائے دی۔ اتنا حق سے اُس وقت ڈاکٹر نارنگ کے پاس لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر ہندوستان ”جوڈاکٹر صاحب کے بہت گہرے دوست تھے۔ بیٹھے تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ

سرڈیکشن کول اس مضمون پر مقدمہ چلانے کا مشورہ لے رہے ہیں۔ تو آپ سیدھے دفتر ”پنتھ“ میں تشریف لائے اور بتایا کہ سرڈیکشن کول ڈاکٹر نارنگ سے مشورہ لینے کے لئے پٹیل سے تشریف لائے ہیں اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ راقم الحروف کا یہ زندگی بھر معمول رہا کہ اُس وقت تک کسی معاملہ کو اخبار میں شائع نہیں کرتا جب تک کہ ہاتھ مضبوط نہ ہوں! اور میں قدم اٹھانے کے بعد ڈر خوف یا دھمکی کے ذریعہ قدم پیچھے لے جانا بزدلی سمجھتا ہوں۔ لالہ دینا ناتھ باتیں کرتے اور مجھے قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ میں مستنار ہوا۔ لالہ جی کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر غور کرتا رہا۔ پھر ایک لیڈر لکھا۔ جو بہت زوردار تھا۔ اس لیڈر میں مرحوم ہمارا چہ پٹیل پر کھلے اور صاف الفاظ میں لالہ سنگھ کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا اور جیل بھیجا گیا کہ اگر ہمارے پٹیل میں غیرت ہے تو مجھ پر اس الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔ میں ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ قتل کی ذمہ داری ہمارا چہ پٹیل کی گردن پر ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پٹیل کی کیا حالت ہوگی جس صورت میں کہ اشادہ اور دبے الفاظ سے ہی گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لیڈر کے بعد راقم الحروف نے اخبار ”پنتھ“ میں ہر روز اس الزام کے سلسلہ میں لکھنا شروع کیا۔ اور کئی روز تک مضامین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس واقعہ سے قریباً ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے۔ میں شام کو کچھ سامان خریدنے بازار گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو دیکھا کہ دفتر ”پنتھ“ کے سامنے ایک اکسائز ان پکٹر، ایک سب ان پکٹر پولیس اور ایک درجن کے قریب اکسائز اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ملازم اور گواہ کھڑے ہیں۔ میں نے پہنچتے ہی پوچھا کہ فرمائیے کیا حکم ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کوکین رکھنے کے الزام میں تلاشی ہوگی۔ پولیس کو اطلاع ملی ہے کہ دیوان سنگھ کوکین فروشی کرتا ہے۔

تلاشی ہوئی۔ تلاشی میں میری میز پر جو غذات والا ڈیسک بکس تھا اس میں سے نارنگ دیسٹرن ریلوے کے دو ٹائم ٹیبل نکلتے۔ ایک ٹائم ٹیبل جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور میرا ذاتی تھا۔ دوسرا جس کے الفاظ میں رجو ٹائم ٹیبل کے ساتھ پچھلے حصہ میں ریلوے کے نقشہ کے لئے ہوتا ہے) کوکین کی ایک چھوٹی سی پڑی اور ایک کارڈ تھا جو گجرانوالہ سے دیوان سنگھ ایڈیٹر ”پنتھ“ کے نام بھیجا گیا اور جس میں لکھا تھا کہ کوکین بھیجی جا رہی ہے روپیہ جلدی بھیج دو۔ اس کارڈ کے لکھنے والے کا نام گورنمنٹ سنگھ نثار غالب ایسی نام تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، تلاشی میں کوکین اور یہ خط ہٹل آیا۔ میں حیران تھا کہ یہ اس کس ہیں کیونکہ اگر خط کوکین کے نکلنے کے بعد مجھے کو تو الی انارکلی لے جایا گیا۔ وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس چودھری رلم چند تھے۔ میری گرفتاری کی خبر اخبارات اور دوستوں کے حلقہ میں پہنچی تو اخبارات کے ایڈیٹر حیران تھے۔ کئی دوستوں نے کو تو الی پہنچ کر ضمانت کے لئے کوشش کی اور باوجود اس بات کے کہ جرم قابل ضمانت تھا۔ پولیس والوں نے ضمانت نہ لی۔ اور رات کو مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اگلے روز صبح بھی میرے دوست اخبارات کے ایڈیٹر اور عزیز ضمانت کے لئے کوشش کرتے رہے۔ مگر پولیس والوں نے کسی کی بات تک نہ سنی۔ دوپہر کو پولیس مجھے لالہ مشنکر لال مجسٹریٹ کے گھر پر کوکین میاٹڈ کے لئے لے گئی وہاں کئی اخبارات کے ایڈیٹر۔ دوست اور رشتہ دار موجود تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ رات کو اور صبح ضمانت کے لئے کوشش کی گئی۔ مگر کسی نے پروا نہیں کی۔ مجسٹریٹ نے فوراً ضمانت پر چھوڑنے کا حکم دیا۔ اور آپ پولیس والوں پر ناراض ہوئے اور پوچھا کہ جس صورت میں مجرم قابل ضمانت تھا کیوں

ضمانت نہیں لی گئی۔ پولیس کے جو لوگ ساتھ آئے تھے وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ صرف یہی کہا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب جواب دے سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو کچھ علم نہیں کہ کیوں ضمانت نہ لی گئی۔

کوئین کا مقدمہ چلا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر کوکل چند نارنگ کو کبیل کیا۔ ڈاکٹر صاحب لاہور کے فائلز میں وکلا میں سے تھے۔ آپ صرف ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ جھوٹی عدالتوں میں نہ جاتے تھے۔ آپ نے کافی فیس طلب کی جو ادا کر دی گئی۔ مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی اور سل کو غور کے ساتھ دیکھا گیا تو محامد ہوا کہ کوئین کے ساتھ جو پرسٹ کارڈ رکھا ہوا ملا اس پر جو عبارت ہے اس میں کارڈ لکھنے کا مقام کو جراثیمہ درج ہے مگر کارڈ کی رودانگی کی ہر نصف لگی ہے جس میں سے شہر کا نام پڑھا نہیں جاتا۔ مگر ڈاک خانہ سے ڈیپوچ کا وقت صبح آٹھ بجے ہے۔ دوسری ٹہر لاہور پہنچنے کی لگی تھی جس پر لاہور اور دہلی تاریخ جو ڈیپوچ کی تھی۔ اور وقت نو بجے کا تھا۔ گویا کہ یہ کارڈ ہر دس کے مطابق (اگر کو جراثیمہ سے چلا ہے تو) نو گوجراتوالہ کے ڈاک خانہ سے ۸ بجے کے بعد چلا اور نو بجے لاہور کے ڈاک خانہ میں پہنچا۔ اس کارڈ کو دیکھ کر ہم سب لوگ حیران تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر نارنگ نے مجسٹریٹ کو توجہ دلائی کہ صبح آٹھ بجے کو جراثیمہ سے کوئی گاڑی لاہور کی طرف نہیں آئی اور اگر آئے بھی تو ٹرین جلدی سے جلدی دو گھنٹہ میں کو جراثیمہ سے لاہور پہنچ سکتی ہے۔ پھر یہ کارڈ کس طرح اور کس ذریعہ سے آٹھ بجے کو جراثیمہ کے ڈاک خانہ سے چل کر نو بجے لاہور کے ڈاک خانہ میں پہنچ گیا۔ استغاثہ کی یہ جلساری صاف ظاہر تھی اور اس کارڈ کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے ڈاک خانہ میں کسی مہر لگانے والے کو پہنچ دس روپیہ دے کر دونوں مہر لگوا لی گئیں اور جلدی میں وہی مہر میں لگ گئیں۔ جو تاریخ اور وقت کی تیار رکھی تھیں۔ چنانچہ اس مقدمہ میں ٹھاکر لٹل پتہ مجسٹریٹ (جو بعد میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور ریاست جے پور میں ریونیو فٹنڈر رہے) نے راقم الحروف کو بری کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ یہ مقدمہ ایک سازش کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں ریاست پٹیا ل کاروپہ ہے اور بلاشبہ جلساری کی گئی ہے۔

میں بری ہو گیا۔ اخبار ”پنتھ بندھو“ کا تھا اور میں ریاست ناجھ میں چلا گیا تھا جہاں مہاراجہ کی مزرولی کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ ناجھ میں تین ماہ کے قریب پولیس کی نگرانی میں نظر بند رہا۔ کسی کو مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت نہ تھی میرے دوستوں نے ناجھ کی گرفتاری اور نظر بندی کو دسراٹے تک پہنچایا۔ لارڈ ریڈنگ دسراٹے تھے۔ آپ نے کاغذات طلب کئے۔ کوئی الزام نہ تھا۔ آپ کے حکم سے تین ماہ کی نظر بندی کے بعد رہائی ہوئی۔ انجیب میں رہا ہو کر لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری نظر بندی کے زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے میرے کوئین کے مقدمہ کی تحقیقات ہوئی تحقیقات کا کام خان بہادر عبدالعزیز سپرنٹنڈنٹ پولیس راجہ میں پنجاب میں ڈپٹی انپٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے کے سپرد کیا گیا۔ خان بہادر عبدالعزیز نے گورنمنٹ آف انڈیا کو میں اصل حالات کی رپورٹ کی۔ اس رپورٹ کے بعد لاہور پولیس واکسٹرو پیارمنٹ کے متروا افسروں کے گھروں کی تلاشی ہوئی۔ تلاشی میں کوئین کا سرائے بھل آیا۔ اور ان افسروں میں سے بعض پر مقدمہ قائم ہوا بعض موقوف کئے گئے اور بعض کی تبدیلیاں کی گئیں۔

مقدمہ کے دوران میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کوئین کے رکھنے اور مقدمہ بنانے میں مہاراجہ پٹیا لہ کا پچاس ہزار کے قریب روپیہ صرف ہوا۔ کوئین والا نام ٹیبل رکھنے کے لئے دفتر ”پنتھ“ کے ایک کلرک کی خدمات دو سو روپیہ

میں حاصل کی گئیں۔ یہ مقدمہ میرے اندر قوت ارادی اور مصائب کو برداشت کرنے کی سپرٹ کو زیادہ کرنے کا بڑا باعث ہوا اور میرا خیال ہے کہ ہر مصیبت انسان کو زیادہ مضبوط کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

## عورت اور سنگار

”ریاست کا دفتر امیر دوازہ کعبہ ہر تھا۔ سردار گوپال سنگھ مہاراجا پنجاپ اسمبلی رجسٹرار پنجاپ اسمبلی میں ایجوکیشن کے لیڈر ہیں۔ اور او۔ بی۔ اے کا خطاب بھی حاصل کر چکے ہیں) اپنی امریکن بیوی سٹریٹس گوپال سنگھ کے ساتھ تشریف لائے۔ اور غالباً تین ماہ کے قریب بطور بہانہ رہے۔ امریکن اور انگلش عورتوں کی سوسائٹی بہت پر لطف ہوتی ہے۔ اگر ان کے ساتھ بے تکلفی کے مگر بھائی بہنوں جیسے پاکیزہ تعلقات ہوں۔ اور ان تعلقات میں بدعتی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ یہ عورتیں لطیف مذاق سے بہت محفوظ ہوتی ہیں۔ ان میاں بیوی کی سوسائٹی کو جس زندگی بھر بھول نہیں سکا۔ اور شاید تین ماہ میری زندگی کا ایک بہترین حصہ تھا۔ اور یہ منزل پر میرے پرانیو بیٹ دفتر کے ساتھ والے کمرے میں مقیم تھے۔ اور میرے پرائیویٹ دفتر میں ہی میری خوابگاہ تھی تاکہ جب کام سے فارغ ہو جاؤں تو سو جاؤں اور جب جاگوں تو فوراً کام شروع کر دوں چنانچہ جب رات کو ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو یہ میاں بیوی میرے کمرے میں آجاتے ہیں تھکاوٹ کے باعث بلنگ پر لیٹ جاتا۔ اور یہ پاس کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اس طرح رات کا بارہ ایک بج جاتا۔ اور بارہا ایسا ہوا کہ سٹریٹس گوپال سنگھ بیٹھ بیٹھ دہلی سے باہر چلے جاتے رات کو بھی وہاں نہیں آتے اور سٹریٹس گوپال سنگھ حسب معمول اسی طرح رات کو بارہ ایک بجے تک میرے پاس بیٹھ جاتے اور رات کو بھی وہاں نہیں آتے اپنے بھائی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے سٹریٹس گوپال سنگھ خوبشہر نہیں ہیں۔ پچیس سال کی عمر۔ امریکن مترخ و سپید رنگ۔ اور پھر جوان لڑکیوں کا بناؤ سنگار۔ دن میں کئی کئی بار ساڑھی بدلتیں۔ اور اپنی خوبصورتی کو نشیہ میں دیکھتیں۔ ایک روز ہم شام کو موٹر میں سیر کر جاتے والے تھے۔ سٹریٹس گوپال سنگھ نے بناؤ سنگار کر کے بہت خوبصورت ساڑھی پہنی۔ اور بار بار ”قد آدم آئینہ کے سامنے کبھی سیدھی کھڑی ہو کر کبھی ایک طرف کا حصّہ اور کبھی دوسری طرف دیکھتیں ہیں نے مذاق سے کہا کہ آپ کا حسن قدرتی طور پر ہی دہلی کے لوگوں کے لئے کافی خطرہ کا باعث ہے۔ اس قدر بناؤ سنگار اور خوبصورت ساڑھی کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر آپ کے سیاں دن بھر آپ کے پاس رہتے ہیں جن کو سنگار دکھانے کی ضرورت ہے۔ اب باہر جاتے وقت کیوں یہ حسن کا زہرہ بکتر پہن لیا کیا شہر کے لئے قتل عام کا حکم جاری ہوگا۔ سردار گوپال سنگھ اور ان کی بیوی دونوں مسکرا دیئے۔ مسکرا نے کے بعد سٹریٹس گوپال سنگھ نے بناؤ سنگار کے فلسفہ پر بحث شروع کر دی۔ اور جو کچھ کہا۔ میں اس کو اس کے بعد کبھی بھول نہیں سکا۔ آپ نے فرمایا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بناؤ سنگار کا باعث کبیر کی طرح کمزوری ہے یا اس کی تہیں بڑے خیالات ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں عورت بناؤ سنگار کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں کرتی۔ بلکہ انسانی فطرت ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو خوبصورت دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اور یہ خوشی صرف عورتوں تک محدود نہیں۔ مرد بچے اور جانور بھی اس سے مستر اور حظ حاصل کرتے ہیں۔ مرد آئینہ کے سامنے کالٹائی لگاتا ہے۔ بالوں کو سنوار کر ٹوپی پہنتا ہے۔ یا



بنانا کر پکڑی بانہضہ ہے تو کیا وہ اپنی مائی، کالہ یا گڑھی دوسری عورتوں کو دکھانے یا ان کو محبت کی دعوت دینے کے لئے پہننا ہے۔ آپ ایک تجر کو لیجئے۔ اس کو ہنلا ڈھلا کر اچھے خوبصورت کپڑے پہنائیے اور بھر دیکھئے وہ کس قدر خوش ہوتا ہے۔ اس قدر خوش کہ دوسرے نیلے کپیلے بچوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ عورت اگر بناؤ سنگار کرتی ہے تو وہ صرف اپنی ذات کو خوش کرنے کے لئے۔ کیونکہ عورت ہونے کے باعث فطرتاً اس کو خوبصورتی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور جب وہ آئینہ کے سامنے یا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بہت حسین محسوس کرتی ہے تو وہ انتہائی مسرور ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بڑے خیالات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسٹر گوپال سنگھ کے اس جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس سے پہلے میں ہر اس عورت کو بد چلی سمجھتا تھا جو بناؤ سنگار کرنے کے بعد بازار میں اپنے حسن کی نہرں پھینکتی ہوئی گزرتی ہے۔ مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ میرا خیال غلط تھا۔ اس نمایشِ حسن کا بد چلنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ عورت مرد کے مقابلہ پر فطرتاً زیادہ داد پسند ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کی سیلیاں اس کے رشتہ دار اور دوسرے لوگ اگر زبان سے نہیں تو اپنے دل میں ضرور اس کے حسن اور اس کی خوبصورتی کی دادیں اور اس کے حسن کی کشش کو محسوس کریں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ایسے سینکڑوں واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں کہ کوئی حسین عورت بناؤ سنگار کے بعد لوگوں سے داد و حسن لینے ہوئے مسکرا دی بعض بے وقوفوں نے اس نمایشِ حسن کو دعوتِ محبت سمجھ لیا۔ اور اس خاتون کے دل کو ٹٹولنے کے لئے اس نے مذاق کیا۔ تو اس خاتون نے اس "عاشق" کی جو قوتوں سے مرمت کر دی۔

میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ عورت کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہوئے اس کے بناؤ سنگار اور اس کی نمایشِ حسن کو بد چلی سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں اور جو عورت یہ کہتی ہے کہ وہ بناؤ سنگار صرف اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہے۔ اور اس کی اپنی ذات۔ یا لوگوں سے خراج تحسین وصول کرنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ مکاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے شوہر کو بے وقوف بناتی ہے۔ کیونکہ عورت فطرتاً یہ چاہتی ہے کہ دنیا اس کو حسین سمجھے اس کی اس فطرت کے ساتھ بد چلی یا بد معاشی کا کوئی تعلق نہیں۔ اور عورت کے بناؤ سنگار کو بد چلی سمجھنا عورت کے ساتھ بہت برا ظلم ہے۔

## بدول ملازم دشمن سے بدتر

مرحوم ہمارا جیو اس سینئر فطرت کے لحاظ سے صحیح معنی میں مرہٹہ تھے دشمن کے سامنے زچھلکا اور خود داری پر جان دینے کو تیار رہنا آپ کا کیریکٹر تھا۔ اس کیریکٹر کے باعث آپ زندگی بھر پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے معتبور رہے اور گورنمنٹ ہمیشہ اس کو بخشش میں رہی کہ آپ کو معزول کیا جائے۔ چنانچہ آپ جب پولیسکل مصائب میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کا ایک پرائیویٹ ملازم ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پیغام لایا اور کہا کہ ہمارا جیو بلنا چاہتے ہیں۔ میں اس شخص کے ساتھ دیو اس گیا۔ برسات کا موسم تھا گیسٹ ہاؤس بہت اچھی جگہ پر ہے۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ سنٹرل انڈیا کی برسات۔ ایسا دلکش منظر

سوائے منصوری۔ شملہ وغیرہ پہاڑوں کے شمالی ہندوستان میں کم نصب ہوتا ہے اس گیسٹ ہاؤس میں تین روز رہا۔ ہمارا جہ سے دن میں کئی بار ملتا اور مشورہ ہوتا کہ پرنسپل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا کیا علاج ہو۔

گیسٹ ہوس کے کمرے میں میرے بلینگ کے پاس میرا کوٹ لٹک رہا تھا اور وہیں ہر سات کے خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے باہر صحن میں ٹہل رہا تھا۔ ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتا رہا۔ اتنے میں ہمارا چکاموٹر مجھے لینے کو لے آیا۔ میں کوٹ پہننے کے لئے کمرے کے اندر گیا۔ کوٹ پہنا۔ اور پاکٹ بک کو کوٹ میں سے نکال کر اس میں اپنے وزٹنگ کارڈ درست کرنے لگا۔ نوڈ لکھا۔ کہ دس روپے کا نوٹ غائب ہے۔ جو وقت بے وقت کے لئے اس پاکٹ بک میں ہمیشہ پڑا رہتا تھا۔ جب اس نوٹ کو غائب دیکھا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ مجھے میں کمرہ دہی ہے کہ جب میرے گھر میں یاد فتر میں چوری ہو یا کوئی جھوٹ بولے تو میں صبر نہیں کر سکتا۔ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے والے چڑا اسی یا ملازم کو پھینا شروع کر دیتا ہوں اور پینے کے بعد اکثر نکال دیتا ہوں۔ اس دس روپے کے نوٹ کو غائب دیکھ کر بھی میں خاموش نہ رہ سکا۔ گیسٹ ہوس کے انچارج کو بلایا اور کہا کہ ابھی دو تین گھنٹہ کے اندر جیب میں سے دس روپیہ کا نوٹ غائب ہو گیا ہے۔ میری اس شکایت کو سن کر گیسٹ ہوس کے انچارج نے جواب دیا:-

”سرکار کیا عرض کروں اس سے پہلے بھی کئی امانوں کی جیب سے روپیہ نکل چکا ہے۔ ان ملازموں کو چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتی۔ یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ بددیانتی نہ کریں۔ مگر باز نہیں آتے۔ کھانے پینے کے سامان میں سے بھی چوری کرتے ہیں اور جو ہان آتے ہیں ان کی جیب میں سے بھی روپیہ نکال لیتے ہیں۔ ان کو خیال نہیں آتا کہ اس طرح ریاست کی اور ہمارا جیک بڈ نامی ہوتی ہے“

دس روپیہ بہت معمولی رقم تھی۔ میں نے اس کا تو کوئی خیال نہیں کیا۔ نہ ریاست کے کسی افسر سے ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ مگر اس سپرنٹنڈنٹ گیسٹ ہوس کے یہ الفاظ اس کے بعد ہمیشہ ہی میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

”چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتی۔“  
”یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے“

ان الفاظ کا اثر یہ ہوا کہ میں نے اس کے بعد ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ملازم بد دل نہ ہوں۔ ان کو پیٹ بھرنے کے لئے کافی اور وقت پر تنخواہ دی جائے کہ کو کبھی عجز دے کی باعث دیر ہوئی رہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفتر ”ریاست“ کے ملازم یہاں سے چلے جاتے۔ بعد بھی پھر اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ دفتر ”ریاست“ کی ملازمت کریں اور اب ”ریاست“ کے اس نئے دور میں تو فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور اب تک اس پر عمل کیا جا رہا ہے کہ ملازموں کو وقت پر اور کافی تنخواہ دی جائے۔ تاکہ ملازم کو خود ملازمت کی خواہش نہ ہو نہ کہ ملازم سے ملازمت نہ چھوڑنے کے لئے درخواست کی جائے۔

میری رائے ہے کہ معمولی تنخواہ پر نکتے دس ملازموں کی جگہ اچھے مفتی اور کام کرنے والے پانچ ملازم

زیادہ تنخواہ پر رکھنا اچھا ہے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ ملازم خوش اور مطمئن رہیں۔ اور ان کو وقت پر تنخواہ ملتی رہے۔ غیر مطمئن اور بددل ملازم کو کسی صورت میں نہ رکھا جائے۔ کیونکہ وہ دشمنوں کی طرح نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

## ”ریاست“ سر جان تھا مپسن اور والیان ریاست

جب ”ریاست“ میں والیان ریاست کو سختی کے ساتھ بے نقاب کیا جا رہا تھا اور سر جان تھا مپسن گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل سیکریٹری تھے تو سر جان نے تمام ریاستوں کو ایک سرکلر بھیجا جس میں لکھا کہ ”ریاست“ کے نمائندے اور نامہ نگار ریاستوں میں پھر کر حالات معلوم کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور خطرہ ہے کہ یہ لوگ کوئی ایسی کانفی ڈینشل خط و کتابت حاصل نہ کریں جو دہائی ریاست اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے درمیان ہو۔ بہت احتیاط کی جائے۔

اس سرکلر کی اطلاع مجھے ایک ریاست کے وزیر اعظم نے دی جو گہرا دوست تھا۔ اس اطلاع کے بعد میرے ذہن پر یہ اثر رہا کہ سر جان تھا مپسن بھی ”ریاست“ کے خلاف ہیں۔

سر جان تھا مپسن کے پولیٹیکل سیکریٹری کے عہدہ سے علیحدہ ہونے کی داستان بھی بے حد دلچسپ ہے۔ آپ نہایت شریف، غیر معمولی دیانتدار، بہت لائق، انصاف پسند، قوت ارادی کے مضبوط اور ایک مہربان شخص تھے۔ جب آپ مارشل لا کے بعد چیف سیکریٹری پنجاب گورنمنٹ کے عہدہ سے تبدیل کر کے پولیٹیکل سیکریٹری گورنمنٹ ہند مقرر کئے گئے اور آپ نے ریاستوں کے حالات دیکھے تو آپ کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کو حیرت ہوئی کہ اس زمانہ میں بھی ریاستوں کے اندر ایسے ناقابل برداشت مظالم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس حیرت کا نتیجہ تھا کہ آپ دل سے والیان ریاست کے خلاف ہو گئے۔ یہ جذبات ہی ہمارا جہ نابعہ اور ہمارا جہ اندور وغیرہ کو گدیوں سے علیحدہ کرنے اور نظام کن کو تاریخی خط لکھنے کا باعث ہوئے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ پانچ سال اور پولیٹیکل سیکریٹری رہتے تو مرحوم ہمارا جہ پٹیل اور ہمارا جہ اور وغیرہ ایک درجن کے قریب اور والیان ریاست گدیوں سے علیحدہ کر دیے جاتے۔

سر جان تھا مپسن جب پولیٹیکل سیکریٹری شپ سے علیحدہ ہوئے اور دہلی میں چیف کمنشنر مقرر ہوئے تو ریاست اور کے ایک دانشور اہلکار نے ایڈیٹر ”ریاست“ کو بتایا کہ سر جان تھا مپسن کی اس تبدیلی پر ساٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس ساٹھ لاکھ روپیہ میں ہمارا جہ پٹیل اور ہمارا جہ اور اور جام صاحب نو بنگلے میں ہیں لاکھ روپیہ چندہ دیا۔

سر جان تھا مپسن چیف کمنشنر مقرر ہو کر جب دہلی آئے تو ایڈیٹر ”ریاست“ کے ذہن پر اس سرکلر لیٹر (جو آپ نے ”ریاست“ کے متعلق والیان ریاست کو بھیجا تھا) کے باعث یہ اثر تھا کہ سر جان ”ریاست“ کے خلاف ہیں یہ بہت مضبوط قوت ارادی کے انسان ہیں۔ اگر دشمن ہوئے تو نقصان پہنچائیں گے چنانچہ دین ہمنہ ایڈیٹر ”ریاست“ سوچتا رہا کہ یہ بان کے ”ریاست“ کے متعلق خیالات کا یہ دیکر نہ بچا جائے

آخر ایک شزارت سوچی۔ ایک درست مسٹر گوپال پلے ایڈیٹر ”پرنسلی انڈیا“، ذریعہ اخبار بھی ریاستوں کے متعلق تھا۔ آج کل کھنڈوہ (سی پی) سے نکلتا ہے۔ اُس زمانہ میں دہلی سے نکلتا تھا۔ گوپال پلے اور اُس کو سمجھا کر بھیجا، سر دہ سر جان تھا میں سے ملنے کے لئے جائے اور باتوں باتوں میں ایڈیٹر ”ریاست“ کا ذکر اس طریقہ سے کرے کہ ہمارا جیشیالہ کے ایکسٹراڈیشن وارنٹوں کی مخالفت کر کے سر جان تھا میں نے اخبار ”ریاست“ کی بہت امداد کی۔ تاکہ آپ کے ذہن میں ”ریاست“ کے متعلق جو جذبات ہوں۔ وہ ان کو اپنی زبان سے آگلی دیں مسٹر گوپال پلے نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ وہ سر جان سے ملے۔ تو انھوں نے اُس طریقہ سے ہی ”ریاست“ کا ذکر کیا۔ سر جان نے ”ریاست“ کے متعلق سننے ہی مسٹر پلے سے پوچھا کہ دیوان سنگھ آج کل کہاں ہے۔ مسٹر پلے نے جواب دیا کہ یہیں بی بی میں ہے سر جان نے کہا کہ ”ریاست“ بہت اچھا اخبار ہے۔ آپ اس کو پسند کرتے ہیں اور دیوان سنگھ اگر پہلے تو اُس سے کہا جلتے کہ وہ کسی روز آپ سے ملنے کے لئے آئے۔ مسٹر پلے سر جان سے ملنے کے بعد سیدھے دفتر ”ریاست“ میں آئے انھوں نے حالات بتائے تو معلوم ہوا کہ سر جان نہ صرف ”ریاست“ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے مدافع ہیں۔ اور آپ ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد ایڈیٹر ”ریاست“ سر جان سے ملنے کے لئے چیف کمنشنر کی کوٹھی پر گیا۔ اس پہلے چیف کمنشنر کی کوٹھی پر جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہاں کوٹھی کے احاطہ میں ہی لکڑی کا ایک ہرآمدہ بنا ہوا تھا جس کے اندر دس پندرہ کرسیاں تھیں۔ ان کرسیوں پر رائے بہادر، خاں بہادر، خطاب یافتہ، آئزبری، جسٹریٹ اور مینپل کمنشنر وغیرہ بیٹھے تھے۔ میری ان میں سے کسی سے بھی ذاتی گفتگو نہ تھی۔ کیونکہ میں بغیر کام کبھی کسی سے ملتا نہیں اور ز پارٹیوں میں جاتا ہوں۔ دفتر گھر اور مدرٹکی سیر کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اور دوستوں کا حلقہ بھی کوشش کر کے زندگی بھر بہت محدود رکھا۔ میں ایک کونہ میں ایک ہری جن کے طور سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور چٹرا سی میرا وزٹنگ کارڈ مجھ سے لے گیا۔ دوسرے لوگوں کے وزٹنگ کارڈ پہلے جا چکے تھے۔ اور ایک صاحب چیف کمنشنر کے پاس کمرہ کے اندر ملاقات کر رہے تھے مجھے وزٹنگ کارڈ بھیجے دوںٹ ہوئے تھے کہ چیف کمنشنر کے ملاقاتی کی ملاقات ختم ہوئی۔ اور چٹرا سی نے آکر کہا کہ چیلے صاحب بلانے ہیں میں جانے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو خطاب یافتہ آئزبری مجسٹریٹ اور مینپل کمنشنر تعجب کے ساتھ مجھے دیکھنے لگ گئے کہ یہ شخص سب سے پیچھے ابھی آیا اور سب سے پہلے بلایا گیا۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ ان لوگوں کے چہرہ کو دیکھ کر میں بھی کچھ خفیف سی ندامت محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ اپنے دل میں خیال کرتے ہوں گے کہ شاید میں بھی اندرونی طور سے سرکاری یا نیم سرکاری آدمی ہوں۔ بہر حال میں چیف کمنشنر سے ملنے کے لئے گیا۔ سر جان کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ میلایا۔ رسمی گفتگو کے بعد بانیں شروع ہوئیں تو آپ نے فرمایا کہ جب آپ پولیٹیکل سیکریٹری تھے ”ریاست“ کو باقاعدہ بڑھتے تھے اور آپ ”ریاست“ اور ”ریاست“ کی پالیسی کو بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ سر جان پانچ سال تک پولیٹیکل سیکریٹری رہے۔ آپ کو ریاستوں کے بھی بہت دل چسپی تھی۔ مختلف ریاستوں اور دلیان ریاست کے متعلق پوچھتے رہے کہ فلاں کا کیا حال ہے اور فلاں ریاست میں کیا کیا ظلم ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ یہ ملاقات مختصر سی تھی۔ شاید نصف گھنٹہ کے قریب بانیں کرنے کے بعد یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا کہ آپ کا بہت وقت

منافع کیا۔ اس پر سر جان نے کہا کہ انہیں مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اور آئندہ بھی میں ہمیشہ میں ایک دبا ضرور ملتا کروں  
میں چیف کسٹمر سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے افسروں کی دوستی کی ضرورت نہ تھی۔ میں یہ چاہتا  
تھا کہ یہ لوگ بلاوجہ دشمن ہو کر نقصان بھی نہ پہنچائیں۔ اور اس مرض کے لئے ایک دفعہ ملنا کافی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ملاقات  
کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ سر جان جیسے خلاف نہیں بلکہ جیسے محض نہیں ہے سر جان سے ملنے کی بجز ضرورت محسوس نہ کی۔  
اور ڈیڑھ ماہ کے قریب عرصہ ہو گیا۔ تو ایک روز شام کو سر جان نے چیٹر ایسوں سے کہا کہ دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست  
کو اطلاع کر دی جائے کہ وہ صبح ساڑھے نو بجے آپ سے مل جائے۔ اگلے روز چیٹر ایس نے نو بجے کے قریب ٹیلی فون کیا۔  
کہ چیف کسٹمر ملاقات کے لئے بلاتے ہیں۔ اس زمانہ میں لالہ شیونرائن جھٹلا گراڈیٹر، وطن اور ایڈیٹر ریاست کے  
درمیان ٹیلی فون پر بہت مذاق ہو رہا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کو آواز بدل کر یا دوسرے شخص سے ٹیلی فون کر کر  
بے وقوف بنایا کرتے۔ مثلاً دوسرے آدمی کی طرف سے ٹیلی فون پر یہ کہا کہ فلاں ریاست کے وزیر اعظم آئے ہوئے ہیں۔  
میدان ہول میں ٹھہرے ہیں۔ اور ملنے کے لئے بلاتے ہیں۔ جب وہاں جاتے تو پتہ چلتا کہ وہ صاحب وہاں آئے ہی  
نہیں۔ بعد میں ٹیلی فون پر بتاتے کہ بے وقوف بنایا تھا۔ اس چیٹر ایس کا خلاف توقع یہ کہنا کہ چیف کسٹمر ملنے کے لئے بلاتے ہیں  
میں نے سمجھا کہ یہ شرارت لالہ شیونرائن جھٹلا کر کی ہے۔ ناکہ میں کام چھوڑ کر چیف کسٹمر کی کوٹھی جاؤں اور شرمندہ ہو کر  
واپس آؤں میں نے چیٹر ایس کو جواب دیا کہ میں نہیں آتا۔ چیٹر ایس حیران کہ لوگ تو خطوط لکھ لکھ کر ملاقاتوں کے لئے  
درخواستیں کرتے ہیں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ چیف کسٹمر سے ملنا نہیں چاہتا اس نے پھر کہا کہ تھا میں صاحب چیف کسٹمر  
آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ساڑھے نو بجے چیف کسٹمر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ جائے۔ میں نے پھر جواب دیا۔ کہ  
میں نہیں آتا۔ اُس نے پھر کہا کہ وہ چیف کسٹمر کو کیا جواب دے میں نے سختیں کہا کہ وہ میں چیف کسٹمر کے باپ کا  
نوکر نہیں ہوں میں نہیں آتا۔ یہ کہہ کر میں نے غصہ سے ٹیلی فون بند کر دیا کیونکہ کام کر رہا تھا اور ٹیلی فون کام میں خلل ہوا۔  
اُدھر تو چیٹر ایس نے سر جان سے یہی الفاظ کہے کہ دیوان سنگھ کہتا ہے۔ میں چیف کسٹمر کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ کہہ دو کہ نہیں آتا۔  
اُدھر اس ٹیلی فون کے پانچ منٹ بعد چیف کسٹمر کے دفتر کا دوسرا چیٹر ایس آیا اس کے خود آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ بلا لیا  
یا دستور ایک دور وہ یہ وصول کرنا چاہتا تھا اس نے بتایا کہ کل شام کو چیف کسٹمر صاحب نے چیٹر ایسوں سے کہا  
تھا کہ دفتر ریاست میں اطلاع کر دی جائے کہ ایڈیٹر صاحب ساڑھے نو بجے مل جائیں۔ اس چیٹر ایس کے  
کہنے سے علم ہوا کہ لالہ شیونرائن نے یہ مذاق نہ کیا تھا۔ بلکہ فی الحقیقت سر جان تھا میں نے بلایا ہے میں نے فوراً کپڑے  
پہنے اور کار میں چیف کسٹمر کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ ٹینگ کار ڈوبھیجا۔ سر جان نے بلایا۔ اندر گیا تو سر جان کی پیشانی پر ناراضی  
کے شکن تھے۔ مگر اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملایا تو میں نے فوراً کہا کہ میں سب سے پہلے اس ندامت  
کا قہر اگرتا ہوں کہ میں نے آپ کے چیٹر ایس کو سخت اور غیر مناسب الفاظ میں جواب دیا۔ جس کی وجہ غلط فہمی تھی بلکہ  
شیونرائن جھٹلا کر آواز بدل کر کہنے کی بار دھوکہ دے چکے ہیں اور میں بھی ان کو بے وقوف بنا چکا ہوں۔ میں نے سمجھا  
کہ یہ ٹیلی فون بھی لالہ شیونرائن نے مذاق کے طور پر کیا کیونکہ آپ کے ٹیلی فون کی کوئی توقع نہ تھی۔ اب چیٹر ایس  
سے معلوم ہوا کہ آپ نے فی الحقیقت بلایا ہے تو میں آیا۔ مجھے اس واقعہ کا بہت افسوس ہے۔ سر جان تھا میں  
یہ سن کر قبضہ مار کر ہنس پڑے۔ اور آپ نے کہا کہ آپ حیران تھے کہ جس صورت میں ایڈیٹر ریاست کو آپ سے  
کوئی شکایت نہیں۔ ایسا سخت اور خلاف اخلاق جواب کیوں دیا اور چونکہ آپ کا ملنے کو جی چاہتا تھا۔ اس لئے

آپ نے آنے کے لئے پیغام بھیجا۔

سر جان تھا پسین سے ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں۔ باتیں ہی فلاں ریاست کا کیا حال ہے فلاں ہمارا جے جو قتل کیا اس میں کون کون شامل تھا؟ ریاست کے فلاں مضمون میں بہت جرات دکھائی گئی۔ ریاستیں ختم ہو جائیں تو اچھا ہے سر جان مجھ سے ریاستوں کے متعلق سوال کرتے اور دالیان ریاست کے مظالم مزہ لے لے کر پوچھتے۔ کیونکہ وہ فطرتاً زابوں اور ہمارا جوں کے دشمن تھے اور ریاست میں ان مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ خود بھی واقعات کا اظہار کریں اور کھلیں۔ مگر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے نہ کھلتے تھے۔ کیونکہ میں جنرلسٹ تھا۔ ان کو خیال تھا کہ زبان سے بات نکلی اور اخبار میں چھپی۔ باتیں کر کے میں چلا آیا۔ آتے ہوئے آپ نے پھر تاکید کی کہ میں دس پندرہ روز کے بعد ان سے مل جایا کروں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اخبار ان کو باقاعدہ بھیجا جائے ہر مہفتہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ اردو فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ان زبانوں کے آپ نے امتحانات بھی پاس کئے تھے۔

اس کے بعد میں سر جان تھا پسین سے کبھی کبھی ملتا۔ ایک بار دالیان ریاست اور میرے مقدمات کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے کہا کہ آپ کو بھی تو دالیان ریاست نے ہی پولیس کی سیکرٹری شپ سے علیحدہ کرایا۔ آپ نے تعجب کے ساتھ پوچھا وہ کیونکر میں نے کہا کہ چٹان، اور اور زواں نگر نے ساٹھ لاکھ روپیہ جمع کیا۔ اتنا روپیہ فلاں شخص کو دیا گیا۔ اور اتنا روپیہ فلاں آدمی در بیان میں کھا گیا۔ سر جان نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ دالیان ریاست میں چھپوٹے سے لے کر نظام تک آپ کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی مطلق العنانی کو آپ نے نقصان پہنچایا اور کئی زابوں اور ہمارا جوں کے اختیارات کم کئے۔ مگر ان لوگوں کے اندر اتنی قوت کہاں کہ یہ پولیس کی سیکرٹری کو تبدیل کر سکیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا آفس میں آپ کا کوئی گہرا دوست ہے آپ نے کہا۔ ہاں فلاں شخص امیر خیال ہے انھوں نے کرنل ہالینڈ سابق ریڈیٹنٹ راجپوتانہ کا نام لیا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ہاں جو وزیر ہند کا پولیسکل ایڈوکیٹ رہے۔ گہرا دوست ہے۔ میں نے کہا ان سے یہ تمام حالات لکھ پوچھے کہ یہ واقعات غلط تو نہیں۔ آپ نے کہا۔ بہت اچھا۔ چنانچہ آپ نے ہوائی ڈاک کے ذریعہ اپنے اس دوست کو کانفیڈنشل خط لکھا جس کا دو ہفتہ میں جواب آیا کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے لفظ لفظ سچ ہے۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد سر جان نے پھر ٹیلی فون کر کے مجھے بلایا اور کہا کہ لندن سے جواب آگیا ہے وہ واقعات بالکل سچ تھے۔ اس جواب کے بعد تو سر جان ”ریاست“ کی اطلاعات پر بہت اعتماد کرتے تھے اور دالیان ریاست کے اور زیادہ دشمن ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے ایک روز باتوں باتوں میں کہا۔

”سردار صاحب۔ اب شاید زندگی میں موقع نہ مل سکے۔ مگر میری خواہش ہے کہ اگر ایک بار پھر مجھے دالیان ریاست پر اختیارات حاصل ہوں۔ تو میں ان میں سے نصف کو پانچ سال کے اندر ختم کروں یہ لوگ اس قابل نہیں کہ پبلک ان کے رحم پر چھوڑی جائے۔“

سر جان تھا پسین نے پٹیل اور بھوپال وغیرہ کے مقدمات پر میری بہت امداد کی۔ یہ دالیان ریاست جب بھی مجھ پر کبھی وار کرتے تو اس وار کو ناکام بنانے میں آپ میرے لئے کھڑے ہو جاتے۔ کیونکہ میں ان کے صوبہ میں تھا۔ اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی دالی ریاست مجھے نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔

سرجان بہت لائق، نصف مزاج اور مدبر تھے اور میرا تو خیال ہے کہ شاید آج تک کوئی پولیٹیکل سیکریٹری آپ کے پایہ کا نہ تھا۔ مارشل لا کے زمانہ میں آپ پنجاب کے چیف سیکریٹری تھے۔ اور پبلک میں مارشل لا کی خلاف آئین اور سخت کارروائیوں کی ذمہ داری آپ کی گردن پر بھی بیان کی جاتی ہے۔ مگر جو لوگ اصل حالات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ سرمائیکل اوڈوارٹر جیسا خود سر شخص کسی سیکریٹری کے ہتھوں میں کبھی بھی نہ رہا، بلکہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے سیکریٹریوں کو ہمیشہ ہی ایک کلرک سمجھا۔ اور جو کرنا خود اپنی مرضی سے۔ اور سرجان قطعی بے قصور اور سرمائیکل اوڈوارٹر کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔

سرجان تھا مہینہ انتقال کر چکے ہیں۔ اور وہ اس وقت اس دنیا میں موجود نہیں۔ ریٹائر ہوئے کے بعد بھی ان کی خط و کتابت کا سلسلہ ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ جاری رہا۔ اور جب کبھی دہلی کا کوئی شخص لندن جانا اور آپ سے ملتا۔ تو آپ "ریاست" اور ایڈیٹر "ریاست" کے متعلق ضرور پوچھتے۔

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا۔ معذرت سرجان تھا مہینے کے متعلق وہ واقعات لکھوں گا۔ جن کو بے زندگی میں بھول نہیں سکا۔ اور جو "ریاست" کو موت کے منہ سے بچانے کا باعث ہوئے۔ اور اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُس زمانہ میں اگر سرجان تھا مہینے دہلی کے چیف کمشنر نہ ہوتے۔ یا آپ والیان "ریاست" کی مطلق العنانی کو نفرت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تو "ریاست" کو شاید ایسی مصائب کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ جو اس کے لئے قابلِ برداشت نہ ہوتیں۔

## جرنلزم کی چاٹ اور عشق

میں نے "ریاست" میں "ناقابلِ فراموش" کے تحت جو اپنے حالات شائع کئے۔ وہ پبلک میں نہ صرف دلچسپی سے پڑھے گئے۔ بلکہ ان کا اثر بھی ہوا۔ چنانچہ دو درجن کے قریب نوجوانوں نے خطوط لکھے۔ کہ وہ دہلی آکر اُس طرح ہی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرتے ہوئے جرنلزم سیکھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح ایڈیٹر "ریاست" "سید جالب کے پاس" "مہدم" میں کام کرنے کے لئے لکھنؤ گیا۔ چنانچہ ایک سہ ماہی کا تو مردان (سرمہ) سے بغیر خط و کتابت ابھی پہنچا۔ ان تمام نوجوانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جو جرنلزم کے لئے فٹ ہوتا۔ کیونکہ اس پیشہ کے لئے اخبارات۔ رسائل، ٹریڈر کی چاٹ یا عشق کا ہونا ضروری ہے اور ان لوگوں میں شوق تھا تو صرف یہ کہ وہ بلندی پر پہنچیں۔ اور آئندہ ایڈیٹر بن سکیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان نوجوانوں میں سے میں کسی کے لئے بھی مفید نہیں ہو سکا۔ اور آج وہ واقعات بتا رہا ہوں۔ جن کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ کسی کام میں کامیاب ہونے کے لئے اُس کام کا عشق ہونا کتنا ضروری ہے۔

میری تعلیم کچھ نہ تھی۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد خالصہ ہائی سکول گرجا نوالہ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا۔ سکول بس تین روز گیا۔ تو اسٹریٹ فیس کا مطالبہ کیا۔ دو روز تو یہ کہہ کر جاتا رہا کہ فیس لا دوں گا۔ اس کے بعد سکول نہیں گیا۔ کیونکہ حالات اس قابلِ ہی نہ تھے کہ فیس دے سکتا آخر مجبوراً سکول چھوڑنا پڑا۔ اُس کے بعد سکول میں پڑھنے کا زندگی میں اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی میری تعلیم صرف پانچویں جماعت تک ہی

رہی۔ ادراپ اگر باتوں باتوں میں کوئی صاحب تعلیم کے شغلق پر چھٹے ہیں اور میں ان کو بتاتا ہوں کہ ہاں نہیں عجت پاس کی ہے اور چھٹی جماعت میں چار پارچہ روز پڑھا ہوں۔ تو وہ اس پر یقین نہیں کرتے۔ ایک خان سمجھتے ہیں۔ اور بار یقین دلائے پھر بھی میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

تعلیم کی کیفیت تو یہ تھی مگر مطالعہ کے شوق کی حالت یہ کہ فیروز پور کے سول ہسپتال میں کپوٹڈ تھا۔ چھ روپیہ بارہوا تنخواہ تھی۔ عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ مگر رسالہ ”زمانہ“ کانپور کا خریدار تھا۔ اور رسالہ ”مخزن“ دہلی دوسرے لوگوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کا مجھے واقف یا نہیں کہ میں نے کبھی ادبی رسالہ دیکھا ہو۔ یعنی میری ادبی چاٹ کا سلسلہ سولہ سترہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں ابوہر کے ہسپتال میں رہا۔ وہاں بھی ادبی رسائل پڑھا کرتا۔ اور پڑھنے کی کیفیت یہ ہوتی کہ ایک ایک مضمون۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک شعر کو بار بار پڑھتا۔ چنانچہ اپنی بے وقوفی کا ایک واقف بتاتا ہوں۔ ابوہر میں ہی ایک روز خیال آیا کہ اگر میں اردو لٹریچر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف ایک کتاب یعنی اردو کی کوئی لغات کیوں نہ یاد کروں تاکہ کوئی لفظ بھی ایسا بنا نہ رہے جس سے میں واقف نہ ہوں۔ اس خط کو پورا کرنے کے لئے میں نے چھ آٹے میں کریم اللغات، کی ایک جلد خریدی۔ اور لغت کی تختی سے الفاظ شروع کئے۔ ان الفاظ کو یاد کرنا تھا یا نہ ہوتے تھے۔ یاد ہوتے اور آگے چلنا تو پیچھے کے یاد کئے ہوئے بھول جاتے۔ آخر کئی روز کی اس کش مکش کے بعد اپنی بیوقوفی کو محسوس کیا۔ اور ڈاکٹر آف لغات“ کی ڈگری کے خیال کو ترک کر دیا کیونکہ یہ طریقہ غلط۔ ناقابل عمل اور قطعی لاعمل تھا۔

ابوہر کے بعد میں پھر فیروز پور کے ہسپتال میں آ گیا وہاں چھ ماہ کے قریب رہا تھا کہ موگا کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر رسائل اور کتابیں کا پڑھنا جاری رہا۔ موگا میں مجھے پہلے نو روپیہ بعد میں بارہ روپیہ تنخواہ ملتی تھی اس زمانہ میں میرے پاس ”ادب“ الہ آباد جس کو نوبت رائے صاحب نظر ایڈیٹ کرتے تھے۔ اور ”زمانہ“ کانپور (جس کے ایڈیٹر منشی دیانند سنگھ تھے) آیا کرتے۔ ان کے علاوہ روزانہ اخبار ”عام“ کا بھی خریدار تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان کے اندر صرف وہی روزانہ اردو اخبار تھا۔ اس کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ تھا۔ میری مالی پوزیشن ان دور رسائل اور ایک روزانہ اخبار سے زیادہ کے خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ دوسرے اخبارات۔ رسائل اور کتابیں لوگوں سے لے کر پڑھتا۔ اور شاید ہی اوروں کا کوئی کتاب یا اخبار کیسا تنہا جیسے میں نے اُس زمانہ میں پڑھا نہ ہو۔

اس زمانہ میں خیالات محدود، ذریعہ معاش محدود، پوزیشن محدود، معلومات محدود اور دوستوں کے تعلقات کا حلقہ محدود۔ چنانچہ خیالات کے محدود ہونے کی تو حالت یہ تھی کہ جب اخبار ”عام“ آتا اور اس پر پتہ کی چھٹی ہوتی چٹ اپنے نام کی دیکھتا تو ایک مسرت سی محسوس ہوتی کہ میرا نام بھی چھپا ہوا ہے۔

موگا میں ایک علم دوست شخص پنڈت دشنودت وکیل تھے۔ اچھے مضمون لکھنے والے۔ اردو لٹریچر میں دل چسپی۔ آریہ سماج کے لبرٹاردر آریہ سماجی رسالہ ”آریہ مسافر“ کے ایڈیٹر تھے۔ ”آریہ مسافر“ شائع تو شاید آگرہ یا لاہور سے ہوتا تھا۔ مگر پنڈت جی اس کو موگا میں ہی ایڈیٹ کرتے اور وہاں سے ہی مضمون بھیجتے۔ پنڈت دشنودت میرے لٹریچر شوق کو دیکھ کر مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے۔ اور میں کتابیں اور رسائل ان سے بھی کافی تعداد میں پڑھنے کے لئے لیتا۔



اخبار ”عام“ اور رسائل ہسپتال کی ڈاک میں آتے۔ کیونکہ ایک چپڑاسی ہر روز صبح ڈاک خانہ سے ڈاک لیا کرتا تھا۔ یہ ڈاک ڈاکٹر متھرا داس کے ہاتھوں میں جاتی اور وہ جس کسی کا کوئی خط یا اخبار ہوتا۔ اس کو دیتے۔ میرے رسائل اور اخبار کو دیکھ کر وہ اپنی پیشانی پر شکن ڈالتے۔ اور میری اس فضول خرچی کو برا سمجھتے کہ میرے کچھ نہ کہتے۔ کیونکہ میں نہ صرف ان کے ماتحت تھا، بلکہ ان کے مجھ پر احسانات بھی تھے۔ خاندانی تعلقات کے باعث میرے بزرگ تھے۔ اور ان کو حق حاصل تھا کہ میری اور میرے کیرئیر کی نگرانی کرتے۔

جب اخبار ”عام“ میرے نام جاری ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ شاید ایک دو پیہ دے کر ایک مہینہ کے لئے یہ ادنیٰ عیاشی کی گئی ہوگی۔ انھوں نے درگزر کیا۔ مگر اخبار کو دیکھ کر ان کی پیشانی کے شکن ظاہر کرتے تھے کہ یہ میری اس ”فضول خرچی“ کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ میں نے ایک ماہ سے زائد عرصہ کے لئے چندہ بھیج دیا ہے تو آپ مجھ پر بہت غصا ہوئے اور کہا۔ نور دو پیہ ماہوار تنخواہ اور روزانہ اخبار کی خریداری۔ اس فضول خرچی پر شرم آنی چاہئے۔ اس ڈانٹ کے بعد میں نے ان سے تو کہا کہ بند کر دوں گا۔ مگر شام کو ڈاک خانہ پہنچا۔ وہاں چٹھی رساں اور پوسٹ ماسٹر سے بلا اور ان سے کہا کہ میرے نام کا کوئی خط یا اخبار ڈاکٹر صاحب کی ڈاک میں نہ بھیجا جائے اور چٹھی رساں کے ہاتھ میرے کوارٹر میں بھیجا جائے۔ جہاں میری رہائش تھی۔ چنانچہ اخبار ”عام“ اور رسائل مجھے میرے کوارٹر میں ملنے شروع ہوئے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ میں اب فضول خرچ نہیں رہا۔ شریف ہو گیا ہوں۔

ایک باڈیٹھ ماہ تک میں اخبار ”عام“ ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ پڑھتا رہا۔ ایک روز پہلا چٹھی رساں بیمار ہو گیا۔ اس کی جگہ دوسرا چٹھی رساں ڈاک تقیم کرنے کے لئے آیا۔ تو اس کمبخت نے میرا اخبار میرے کوارٹر میں دینے کی بجائے میرے ہاتھوں میں دیا۔ جب کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑا آؤٹ ڈور بیادوں کا رجسٹر لکھ رہا تھا۔ اخبار کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ ان کو دھوکہ دیا گیا تھا۔ اخبار سلسل آ رہا ہے اور یہ فضول خرچی جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض ہوئے۔ میں نے پھر وعدہ کیا کہ اخبار بند کر دوں گا۔ چنانچہ سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہسپتال سے دوسری دوسری شخص کے نام اخبار جاری کر دیا جائے اور میں وہاں سے منگاکر پڑھا کر دوں۔ چنانچہ اخبار موگا کے قصبہ میں حکیم محمد عمر صاحب مرحوم دجویرے بھائیوں کی طرح دوست۔ دیو سماجی خیالات کے خدا سے منکر مگر بہت بلند کیرئیر اور مخلص تھے) کے نام جاری کر دیا گیا۔ اخبار ان کے نام پہنچا۔ ہر روز چھٹی ہوئی پتہ کی چٹ ویٹھنے کی مسرت اور اخبار کو خود کھولنے کے لطف سے محروم ہو گیا۔ اخبار کو پہنچتے ہی حکیم صاحب اس کو کھولتے اور پڑھتے۔ اور میں رات کو کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر جاتا۔ اور کھٹلا اور پڑھا ہوا اخبار لیتے ہوئے ایسا محسوس کرتا۔ گویا کہ گرم گرم پراٹھوں سے محروم ہو کر اب باسی ردی کھانے پر مجبور ہوں مگر کیا کرنا اس سنگناہ“ کو جاری رکھنے کا اور طریقہ بھی کیا تھا کیونکہ اخبارات اور رسائل کے متعلق اس وقت میرے جیسے اور عشق کی ہی کیفیت تھی۔ جو آج جو ش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی سکاچ وکی سے متعلق ہے۔ چنانچہ میں جب تک موگا میں رہا میرے نام کے اخبارات تو حکیم محمد عمر صاحب کے نام آتے رہے۔ اور رسائل میرے کوارٹر پر میرے نام۔ میرے موگا کے تین سال کے قیام میں پنڈت و شندوت میری بہت رہنمائی کرتے رہے، رسائل، اخبارات

اداکار میں دیتے۔ اور انھوں نے اس بات کا اُس زمانہ میں متعدد بار مجھ سے غلطاً اظہار کیا کہ میں ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں۔ یہ سنتا اور شرمناک سر جھکا لیتا اور منہ سے کہتا کہ نہیں صرف دل چاہی کے لئے پڑھتا ہوں۔ آہ وہ اخلاص و محبت بے غرض لوگ آج اس دنیا میں موجود نہیں۔ اور زمانہ دن بدلیں خود غرض ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میری انتخابی اور اخبار نویسی کی زندگی میں مجھے کامیاب بنانے کے لئے ایک ادب بات نے بڑا پارٹ ادا کیا میں پورے جماعت تک پڑھا۔ پنجاب کا رہنے والا اسکھ۔ اردو زبان کے جاننے کا جن میں سوال ہی نہیں۔ زندگی بھر محنت کر۔ زبان کو سیکھا۔ پنجاب کے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کو ایڈٹ کرتا رہا۔ اور دہلی جیسے اردو کے مرکز سے اردو زبان میں ایسا کامیاب اخبار جاری رکھا جس کی نظیر بھی اردو جرنلزم میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایمان داری کے ساتھ ادا کرتا ہوں کہ میں اب تک اپنے آپ کو نالائق سمجھتا ہوں۔ اور جب کبھی دوستوں میں ذکر آتا ہے۔ تو نالائق ہی کہتا ہے کہ بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھلاڑ جھوٹے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے ذہن کی یہ کیفیت یعنی اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھنا۔ اپنی کامیابی کو کامیابی قرار نہ دینا۔ اور کوشش میں دن رات مصروف رہنا نہ ہوتی۔ میں اپنے آپ کو نالائق سمجھتا تو آج اخبار ریاست کو چلانے کی جگہ کسی ہسپتال میں بونٹیں دھونے کا کام کرتا لوگ کامیاب ہوتا چاہتے ہیں کبھی بھی اپنے آپ کو اُس فن میں نالائق سمجھیں ہمیشہ نالائق تصور کرتے ہوئے زیادہ کھینے کی کوشش کریں۔ اور ایسا عشق پیدا کریں جیسا کہ لٹریچر اور اخبارات کے ساتھ ایڈیٹر ریاست زندگی بھر کے رکھا۔

## دوستوں کے لئے قربانی کرو

ریاست بھوپال نے ایڈیٹر ریاست پر ایک مقدمہ توپن کا دہلی میں بھی کیا تھا۔ یہ مقدمہ ایڈیشنل مسٹر ججسٹریٹ مسٹر پول کی عدالت میں تھا مسٹر پول اینگلو انڈین تھے جو ہندوستان کی آزادی کے انگریزوں سے زیادہ سمجھے۔ ادھر ملزم ایک اخبار نویس۔ جو گورنمنٹ کی نظروں میں دس مہری بر معاشوں سے زیادہ خطرناک اور بد چل (میں بد چلن اس لئے لکھ رہا ہوں کہ گورنمنٹ کے احکام میں عام طور سے یہ لکھا جاتا ہے کہ فلاں پولیسکل ور چال چلن قابل اعتراض رہا۔) اور خان بہادر عبدالرحمن ایڈووکیٹ (جو آجکل سر عبدالرحمن جج ہائی کورٹ لاہور میں) نواب بھوپال کے وکیل مسٹر پول کے دوست تھے۔ چنانچہ اس مقدمہ میں میرے لئے عام طور سے خطرہ کیا جا رہا تھا۔ اور مختلف ختم کی افواہیں بھی مسٹر پول کے متعلق پبلک میں مشہور تھیں۔ جن پر میں نے کبھی یقین نہ مگر محسوس کیا کہ عدالت میں جب جاتا ہوں تو مسٹر پول کا چہرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف ہے۔ یا کہ ان کو کم وہ ایڈیٹر ریاست کو بادل جو اس کے مجرم ثابت نہ ہونے کے دہر مسٹر پول کا اخلاقاً فرض چاہتے کہ جب تک ملزم مجرم ثابت نہ ہو۔ اس کو بے گناہ سمجھے) ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میں سوچتا رہا کہ جب تک ملزم مجرم ثابت نہ آتا تھا۔ اور مسٹر پول کا رویہ دن بدن ہیرے خاں ہوتا چلا رہا تھا۔

ان حالات سے پہلے سر جان تھا مپسن چیف کمنشنری دوست ہو چکے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور

مجھے مسٹر پول سے انصاف کی اُمید نہیں اور شہر میں مسٹر پول کے متعلق مختلف افواہیں ہیں۔ سر جان غیر معمولی انتہا اور ان کی زندگی میں ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ انھوں نے کبھی کسی سیاست یا پبلک سے ایک پیسہ لیا ہو۔ اور آپ اس بات کے ہمیشہ خواہاں رہے کہ ان کا ہر ماتحت دیانتدار ہو۔ سر جان نے جواب دیا کہ مسٹر پول دیانتدار دی ہیں۔ سب کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کے جواب میں کہا میں مسٹر پول پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ اور جب تک وہ نہ ہو۔ الزام لگانا ایک گناہ ہے۔ مگر مسٹر پول ریلوے گارڈ کلاس کے آدمی ہیں۔ پہلے کلرک تھے پھر ڈپٹی کمشنر، دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ گورنر کے دفتر میں چاہے۔ وہاں سے مجسٹریٹ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اب ایڈیشنل مسٹر کلکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کی قیمت ہوتی ہے۔ اور کم انسان ہیں جو کسی قیمت پر خریدے نہ جاسکیں۔ خان پر الزام تو نہیں لگانا۔ مگر بے فکر بھی نہیں ہوں۔ سر جان نے وعدہ کیا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں گے میرے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ چنانچہ سر جان نے اگلے روز مسٹر پول کو بلوا کر فائین کی کرنا اب بھوپال چاہے نہ بڑی پوزیشن کے ہوں۔ مگر ایڈیٹر ریاست کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔

ادھر تو سر جان تھا آپس نے مسٹر پول سے کہا۔ اُدھر ایک روز مرحوم خان بہادر قنصل حسین ملے۔ انھوں نے پوچھا کہ مرہ کا کیا حال ہے۔ تو میں نے بتایا کہ مسٹر پول کا رویہ ایسا ہے جیسا قمار بازوں اور چوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان بہادر بہت مخلص، بہت بلند اور دوستوں کے لئے جان قربان کر دینے والے انسان تھے۔ آپ نے مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر وہ دن کے بعد مجھے ٹیلی فون کیا۔ کہ میں آج رات کو کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ چنانچہ رات میں ان کے ہاں کھانے پر گیا۔ تو دیکھا کہ وہاں ڈنر کے لئے ایک درجن کے قریب معزز جہان موجود ہیں جن میں مدمبران اسمبلی اور مسٹر پول بھی ہیں۔ خان بہادر نے میرے پہنچتے ہی مسٹر پول سے تعارف کرایا۔ کہ آپ مسٹر پول ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی اور آپ سٹراڈیوٹنگ ایڈیٹر ”ریاست“ میرے گھر سے اور افسر دوست جو مجھے حقیقی بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔ مسٹر پول اور ایڈیٹر ”ریاست“ نے دستور مطابق ہاتھ ملایا۔

سر جان تھا میں اور خان بہادر قنصل حسین کے ان دو واقعات کا اثر یہ ہوا کہ پہلے تو مسٹر پول ایڈیٹر ”ریاست“ کو ایسا سمجھتے تھے جیسا سنا تھیں دھرمی حضرات اچھوتوں اور ہری جنوں کو۔ اب ایڈیٹر ریاست ”جب عدالت میں جاتا تو پہنچتے ہی مسٹر پول فرماتے۔ ہیلو سر دار دیوان سنگھ کیا حال ہے۔ آج ہم تو بہت اچھا ہے۔ دہلی میں برسات کا موسم پنجاب کے مقابلہ پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس سال مئی بہت بہت بڑے گی وغیرہ۔ ایڈیٹر ”ریاست“ اس اخلاق کے سلوک کا شکر اور مسٹر پول کو جواب دیتا۔ اور ب دیکھوں کے پاس بار دوم میں جا کر بیٹھتا۔ تو میں مسٹر پول کی ایڈوکیٹ اور سر دار بہادر جھگڑاؤں سنگھ میریٹر فینڈل کا ناچھوئی کرتے ہوئے کہتے۔ کہ سر جان اور قنصل حسین کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔ اب دیکھیں گے کہ پمپل ح مسٹر پول کو ہاتھوں میں لیتا ہے۔ اس مخالفت کو بھی ہم نے سیدھا کر لیا۔ مقابلہ کا اب آئے گا۔

پچھلے بھوپال والوں کو کچھ علم نہ تھا کہ اس کانٹے کے بدلے کا باعث کیا ہے۔ یہ اسی زعم میں تھے مسٹر پول کا اخلاق صرف ظاہر اظہار سے ہے اور ہر مجسٹریٹ جب کسی ملزم کو سزا دینا چاہتا ہے تو ملزم

سے مسکرا کر باتیں کرتا ہے تاکہ یہ اسے مخالف نہ سمجھے اور مقدمہ تبدیل نہ کرالے۔ ورنہ اندرونی طور سے وہ بھوپال کا بھدر رہے۔ اتنے میں مسٹر پول تو قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہو گئے۔ اور مسٹر ایسراں کی جگہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ۔ مسٹر ایسراں جرات اور دیانتداری کے لئے بہت بڑی شہرت رکھتے تھے۔ آپ نے شملہ میں ایک بہت بڑے فوجی انسپکٹر کو ایک قلی کو مارنے کے جرم میں کئی برس قید کی سزا دی تھی۔ اور دلی میں بھی پچھلے تمام مجسٹریٹوں میں ایک نمایاں حیثیت کے افسر تھے۔ بھوپال والے مسٹر ایسر کے نام سے بہت پردے۔ انھوں نے چاہا کہ مسٹر پول اس مقدمہ کو اپنے ساتھ ہی اپنے نئے عہدہ یعنی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں لے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے مسٹر پول کی عدالت میں یہ درخواست دی کہ چونکہ آپ مقدمہ کے پچھلے حالات سے واقف ہیں اس لئے مقدمہ نئے اے۔ ڈی۔ ایم مسٹر ایسر کی عدالت میں نہ لے۔ اور آپ نہیں۔ جب مقدمہ پیش ہوا۔ میری طرف سے مسٹر پول اور سردار بہادر بھنگوان سنگھ تھے۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے خان بہادر عبدالرحمن مقدمہ کے متغیث خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال بھی اپنی انسپکٹر جنرل پولیس کی پوری دردی پہنے عدالت میں نشر بیان فرماتے۔ اور ان لوگوں کو پورا یقین تھا کہ مسٹر پول پر مقدمہ خود ہی اپنی عدالت میں رکھیں گے۔ مگر ان لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ جب مسٹر پول نے اس درخواست کا فیصلہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مسل بیعت کی طرح ان کے پیچھے پیچھے کیوں پھرتی رہے اور کیوں مسٹر ایسر اس صفت مدعا فیصلہ نہ کریں۔

بھوپال کے نمائندے مسٹر ایسر کی زبردست قوت ارادی اور قوت فیصلہ سے گھبراتے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ آپ ہی فیصلہ کریں۔ کیونکہ ہمارے لئے وہی ججسٹریٹ مفید ہو سکتا تھا جو نواب بھوپال تو کیا نظام دکن کی بھی پروا نہ کرے۔ چنانچہ مقدمہ شروع ہوا۔ تو بھوپال والوں نے مقدمہ تبدیل کرنے کی درخواست دی۔ اور مقدمہ تبدیل کرانے کی وجہ یہ لکھی کہ مسٹر ایسر اور دیوان سنگھ کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ میں اس سے پہلے مسٹر ایسر سے کبھی بھی عدالت سے باہر نہ ملتا تھا۔ تعلقات کا تو سوال ہی کیا ہے۔ بھوپال کے نمائندوں نے اپنے اس الزام کی تائید میں مسٹر ایسر کے ایک موقوف شدہ موٹر ڈرائیور کا بیان شامل کیا۔ جس نے کہا کہ اس نے دیوان سنگھ کو مسٹر ایسر کے مکان پر ایک بار دیکھا تھا۔ بھوپال والوں کی اس درخواست کا بھی وہی حشر ہوا جس کی پیشین گوئی خارجی ہو گئی اور مقدمہ مسٹر ایسر کی عدالت میں ہی رہا۔ نواب بھوپال کی طرف سے جوائینس گواہ پیش ہوئے۔ جن میں اکثر دفن ریاست کے موقوف شدہ یا خریدہ وہ غدار ملازم تھے۔

یہ مقدمہ کئی اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ نواب بھوپال کی طرف سے ایک دستاویز پیش کی گئی جو جلی تھی۔ اور ہماری اطلاع کے مطابق یہ جیل چاندنی چوک کے ایک کمرے میں نواب بھوپال کے نمائندوں کی نگرانی میں بدلیوں کے ایک جمل ساز نے تیار کیا۔ یہ دستاویز ثابت کرتی تھی۔ کہ دیوان سنگھ نے نواب بھوپال کے خلاف ایک پمفلٹ لکھوایا۔ یعنی دیوان سنگھ کا اس میں اتنا ہے۔ بھوپال کے نمائندے اس دستاویز کو ملے کر مختلف بیڈر، رائٹنگ اکسپرٹوں کے پاس گئے۔ اگر بھوپال والے اپنی پوزیشن کو قبلے بغیر غر جانبداری کی رائے لیتے تو مینڈرائٹنگ اکسپرٹ ان کو بتاتے کہ یہ جلی ہے یہ لوگ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے بتایا کہ نواب بھوپال کے نمائندہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے اپنی شہادت کے لالچ میں ہی کہا کہ یہ دیوان سنگھ کی تحریر ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک اکسپرٹ نے پرائیویٹ طور سے

ہمیں بتایا کہ بھوپال کے نمائندے جب اس کے پاس گئے اور دستاویز دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ ادنیٰ قسم کی فوری یعنی جعل سازی ہے۔ اور ہر شخص آسانی کے ساتھ اس جعل سازی کی خامیوں کو معلوم کر سکتا ہے۔ مگر اس نے اس خیال سے کہ یہ بڑی مرغی ہے۔ ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔ اس نے کہا کہ بہت اچھی دستاویز ہے۔ مادیہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس طرح سے ایک ایک ہیڈنگ رائٹنگ اکسپرٹ نے پانچ پانچ دس دس ہزار روپیہ فیس اور شہادت کے خرچہ کا بھوپال کے خزانہ سے وصول کیا۔ اور عدالت نے آخر ان ہیڈنگ رائٹنگ اکسپرٹوں کے خلاف بھی بہت سخت الفاظ کے ساتھ ریمارکس پاس کئے۔ اور ان کی شہادت کو ناقابل قبول قرار دیا۔ بھوپال کے یہ لوگ اس دستاویز کو عدالت میں پیش کرنے کی حماقت تو کر بیٹھے۔ مگر یہ ان کے لئے ناقابل برداشت مصائب کا باعث ہوئی۔

بھوپال والوں نے دفتر تریاست کے متعدد آدمی خرید کر ان کو خدّار اور مکھرام بنایا یہ ان لوگوں سے میرے متعلق اِطّلا عین لیتے۔ اور ان کو گواہوں کے طور پر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس جو ان مقدمات کے انچارج تھے کے دفتر کے ایک ماتحت کو جس کا ان مقدمات سے تعلق تھا تقریباً ایک سو روپے ماہوار دیا کرتا۔ اور یہ شخص مجھے دہلی اور بھوپال کی ہر دوسرے تیسرے روز تمام اِطّلا عین دیتا۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا رہتا کہ میرے دفتر کا کون کون شخص خرید لیا گیا۔ میرا کون کون دوست خواجہ محمد اکرم سے ملا۔ اور اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور کون کون لوگ روپیہ کے لالچ میں دوست ہوتے ہوئے دشمن ہونے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ پنجاب کے ایک لنگڑے جرنلسٹ لاہور سے آئے۔ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور مجھ سے پوشیدہ خواجہ محمد اکرم سے ملے۔ اور کہا کہ دیوان سنگھ کے مقابلہ پر ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہاں تک کہ گواہی بھی دیں گے۔ بھوپال والوں کے کیمپ کا میرا وہ الفاظ تمام کام سے فارغ ہو کر رات کو گیارہ بجے سبزی منڈی کے بروت خانہ کے پاس پہنچ جاتا۔ میں اپنے گھر سے موٹر میں دہاں پہنچتا۔ بروت خانہ کے پاس پہاڑی پر ہم گھنٹہ آدھا گھنٹہ بیٹھتے۔ اور وہ مجھے دن بھر کے تمام حالات بتاتا۔ گواہوں کی شہادت جو اگلے روز ہوتی اس کی ایک کاربن کاپی دیتا اور بارہ بجے واپس چلا جاتا۔ اس شخص نے ہی مجھے ایک روز ملاقات میں بتایا کہ فلاں جرنلسٹ جن کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے اور لکڑی کے سہارے چلتے ہیں۔ کارڈینیشن ہوٹل میں انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال سے ملنے کے لئے آئے۔ اور انھوں نے اپنی خدمت پیش کیں۔ مگر چونکہ ان کے پاس کوئی خاص اِطّلا ع نہ تھی۔ اور مفید نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ان کو خرید نہیں گیا۔ اور واپس کر دیا گیا۔ چنانچہ اگلے روز ان لنگڑے جرنلسٹ صاحب (جو میرے مکان پر ہی بطور جہان تشریف فرما تھے) سے درخواست کی گئی کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ آپ نے پوچھا کیا وجہ ہے جو یہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ تو ان سے کہا گیا۔ کہ کوئی وجہ نہیں۔ آپ سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کوئی خدّاری نہ کر بیٹھیں۔ اس لنگڑے جرنلسٹ کی طرح لاہور کے متعدد اور اخبار نویس بھی بھوپال والوں کے پاس پہنچے۔ اور خدمات پیش کیں مگر ان کی خدمات قبول نہ کی گئیں۔ کیونکہ ان کے پاس دیوان سنگھ کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی مواد نہ تھا۔

بھوپال کے اس شخص نے ہی مجھے اِطّلا ع دی کہ بھوپال والے کوشش کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا

کا ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ بھی دستاویز کے متعلق یہ فتویٰ دے کر یہ جعلی نہیں اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور یہ دستاویز پولیسکل ایجنٹ بھوپال کی معرفت گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کو بھیجی جاسکتی تاکہ ڈائریکٹ سمجھنے کی صورت میں جانبداری کا شبہ نہ ہو۔ اس اعلان سے میں بہت پریشان تھا کہ اگر گورنمنٹ ہند کے اکسپرٹ نے بھی یہ کہہ دیا کہ یہ جعلی نہیں۔ دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ تو اس کا نتیجہ ہمارے لئے بہت نقصان کا باعث ہوگا۔ اور عدالت کو متاثر پڑے گا کہ یہ دستاویز دیوان سنگھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور وہ مجرم ہے۔ میں کئی روز سوچتا رہا کہ اس شکل کو کیوں کر حل کیا جائے۔ آخر رات کو خیال آیا۔ کہ اس سرکاری ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کے بڑے انسر سے ملنا چاہیے تاکہ اس معاملہ میں کوئی بددیانتی نہ ہو۔ اس حکمہ کے سب سے بڑے انسر سر ڈیوڈ پیٹری تھے۔ سر ڈیوڈ پیٹری ایک غیر معمولی قابلیت کے انسر تھے۔ غیر معمولی دیانتدار۔ نہایت نیک اور انصاف پسند۔ چنانچہ اپنی ان صفات کے باعث ہی آپ بعد میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے پریزیڈنٹ ہوئے۔ یہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن بڑے بڑے عہدوں مثلاً آل انڈیا سروس کے لئے امیدواروں کو انتخاب کرتا ہے۔ میں نے دن کو دس بجے کے بعد سر ڈیوڈ پیٹری کو ٹیلی فون کیا کہ میں ملتا چاہتا ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ پنج کے بعد ان کے دفتر میں دو بجے ہوں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے گھر ملنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ آپ کے دفتر کے خلاف شکایت ہے۔ سر ڈیوڈ حیران ہوئے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں ان کے دفتر کے خلاف شکایت۔ جہاں ایک ایک ہزار روپیہ ہمارے زیادہ تنخواہ پانے والے ایک درجن سے زیادہ آدمی ہیں۔ میں نے جب یہ کہا۔ کہ فی الحقیقت آپ کے دفتر کے خلاف شکایت ہے۔ تو انھوں نے شام کو سات بجے اپنی کوٹھی پر آئے کہ کہا۔ جو اکبر روڈ پر نئی دہلی میں تھی۔ میں سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ سر ڈیوڈ کی کوٹھی سے باہر ٹرک پر دو آدمی در دی میں اور دو سفید کپڑوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ اور چاروں کے پاس سائیکل اور ریو لور تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں صاحب سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کسی کو کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا۔ بہرہ کو بلا دو۔ جو صاحب کے پاس میرا ڈرائیونگ کارڈ لے جاتے۔ ان میں سے ایک شخص کوٹھی کے اندر گیا۔ بہرہ کو بلا لایا۔ وہ میرا کارڈ لے گیا۔ سر ڈیوڈ نے کوٹھی کے اندر لے آئے کے لئے کہا۔ میں گیا۔ اور آپ سے باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ بھوپال والوں نے جعل سازی کی ہے۔ اور اس جعلی دستاویز کی بنیادوں پر وہ مجھے پھنسا ناچاہتے ہیں۔ اور اس کوشش میں ہیں کہ آپ کے ماتحت جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ ہیں۔ وہ بھی یہ فتویٰ دیں کہ یہ جعلی دستاویز اصلی اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میرے اس الزام پر سر ڈیوڈ حیران ہوئے اور آپ نے کہا۔ یہ ممکن نہیں کہ ان کے دفتر کا کوئی آدمی رشوت لے یا بددیانت ہو۔ میں نے کہا۔ میں تو دنیا میں بہت کم آدمیوں کو دیانتدار سمجھتا ہوں۔ ان شخص کی قیمت ہوتی ہے۔ آپ تین ہزار روپیہ ہمارے تنخواہ پانے ہیں۔ آپ کو تین لاکھ روپیہ دیا جائے تو شاید آپ بھی بددیانت ثابت ہوں۔ داکٹر رائے بانیس ہزار روپیہ ہمارے تنخواہ پانے ہیں۔ داکٹر رائے کو ایک کروڑ روپیہ رشوت دی جائے۔ تو شاید انسر لے بھی دیا تنخواہ کی چھوڑ دیں۔ اس طرح یہ سو دو سو روپیہ کا سوال نہیں۔ نواب بھوپال کے خزانہ کے ہزار روپیہ کا سوال ہے۔ میں الزام نہیں لگاتا۔ آپ سے صحت احتیاطا کہہ رہا ہوں۔ کہ آپ کے دفتر میں جھوٹ کو بیچ اور سچ کو جھوٹ نہ بنایا جائے کیونکہ اس مقدمہ میں نواب بھوپال کی

عزت کا سوال ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ لے کر اس جعلی دستاویز کو اصلی میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائے۔ سر ڈیوڈ نے کہا کہ اگر یہ دستاویز اصلی ہوئی۔ تو آپ کے دفتر سے اس کے اصلی ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ میں نے کہا۔ میں جیلج کرتا ہوں کہ آپ اس دستاویز کے متعلق ایمان داری کے ساتھ وہی فیصلہ دیجئے جیسی یہ فی الحقیقت ہے۔ اور یہ انتظام کر دیجئے کہ نہ نواب بھوپال کا اثر استعمال ہو۔ اور نہ میری کوئی رعایت۔ سر ڈیوڈ نے اس کو منظور کر لیا۔

سر ڈیوڈ پیٹری نے اگلے روز اپنے دفتر میں حکم دیا کہ اگر کوئی دستاویز مینڈرائٹنگ کے متعلق ان کے دفتر میں بھوپال سے آئے۔ تو اس لفافہ کو کوئی شخص نہ کھولے۔ اور بند کا بندناں کو دیا جائے۔

فاران منسٹر بھوپال نے دستاویز پر ٹیپل ایکٹ بھوپال کو بھیجی۔ پولیس ایکٹ نے سیکریٹری پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اور پولیس سیکریٹری نے سر ڈیوڈ کے دفتر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے مینڈرائٹنگ اکسپرٹ کو بھیجی۔ کہ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ جب یہ تحریر سر ڈیوڈ سے دفتر میں پہنچی۔ تو بند لفافہ سر ڈیوڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ یہ لفافہ لے کر خود مینڈرائٹنگ اکسپرٹ کی لیسوریٹری میں گئے۔ وہاں خود موجود رہے۔ اور مسٹر سٹائسن مینڈرائٹنگ اکسپرٹ۔ مسٹر جسن اسٹنٹ مینڈرائٹنگ اکسپرٹ اور دوسرے اس فن سے واقف اسٹنٹوں سے کہا۔

کہ بہت احتیاط کے ساتھ معلوم کر کے بتایا جائے۔ کہ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ سر ڈیوڈ وہاں کافی عرصہ موجود رہے ان کی موجودگی میں دستاویز کے فوٹے لے گئے۔ اور دوسرے سائنٹفک عمل ہوئے۔ آخر سب نے یہ کہا کہ یہ دستاویز قطعی طور پر جعلی ہے۔ اور مجلسازی بھی کسی ادنیٰ قسم کے جعل ساز نے کی ہے جو اس فن سے اچھی طرح واقف نہیں۔ سر ڈیوڈ یہ سن کر حیران رہ گئے۔ کہ اتنی بڑی ریاست کی طرف سے جعلی دستاویز عدالت میں پیش ہوئی۔ سر ڈیوڈ پیٹری نے فوراً سر جارجس وائٹن پولیس سیکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو ٹیلی فون کیا۔ پولیس سیکریٹری نے کہا۔ کہ فوراً تمام مینڈرائٹنگ اکسپرٹوں کے بیانات تلمبہ کئے جائیں۔ چنانچہ ان کے بیانات لئے گئے اور دستاویز یہ لکھ کر واپس بھوپال کے فاران منسٹر کو بھیج دی گئی کہ یہ جعلی ہے۔ اس دستاویز کے پہنچنے پر میرے اس اطلاع دینے والے مجھ نے (جو انسپکٹر جنرل بھوپال کے دفتر میں ملازم تھا) اطلاع دی کہ دستاویز واپس آگئی ہے۔ اور اس کے متعلق جعلی ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ اور بھوپال والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا مینڈرائٹنگ اکسپرٹ کی اس رائے کو راز میں ہی رکھا جائے۔ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ عدالت کو نہ بتایا جائے۔ اور صرف دوسرے کرایہ کے غیر سرکاری مینڈرائٹنگ اکسپرٹوں کی رائے اور شہادت ہی عدالت میں پیش کی جائے۔

ہم ہر شخص کے متعلق اطلاعیں حاصل کرتے رہتے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ایک ماہ تک مسٹر سٹائسن گورنمنٹ آف انڈیا کے سینئر مینڈرائٹنگ اکسپرٹ ایک سال کی طویل خدمت پر ولایت جانے والے ہیں اور چونکہ انھوں نے اس دستاویز کے جعلی ہونے کی بطور سینئر مینڈرائٹنگ اکسپرٹ تصدیق کی ہے۔ یہ اگر ولایت چلے گئے۔ اور ان کی غیر حاضری میں عدالت کا فیصلہ ہوا۔ تو ان کی شہادت نہ ہو سکے گی۔ سر واد بہادر بھگوان سنگھ اور مسٹر توکل نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا۔ کہ عدالت میں درخواست دے کہ مسٹر سٹائسن کی شہادت کر لی جائے چنانچہ درچار روز کے بعد مقدمہ کی عدالت میں پیشی ہوئی۔ ہم نے ایک درخواست دی کہ گواہ استغاثہ کی تمام شہادتیں

ختم نہیں ہوئیں۔ گرو سٹر شاٹ (جس نے بھوپال والوں کی درخواست پر اس دستاویز کا معائنہ کیا ہے) کی شہادت لے لی جائے کیونکہ آپ طویل رخصت پر ولایت جا رہے ہیں۔ اور مقدمہ کے ختم ہونے سے پہلے وراثت سے واپس نہ آسکیں گے۔ ہمارے اس درخواست دینے سے پہلے بھوپال کو میرے سر ڈیوٹ سے ملنے وغیرہ کے متعلق قطعی کوئی علم نہ تھا۔ اور وہ یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ لازم یا کم از کم کے وکیلوں کو سٹر شاٹ کی رائے کا کوئی علم نہیں۔ اس رائے کو وہ ہضم کر جائیں گے۔ اور عدالت سے اسے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ تاکہ اس رائے سے نئی مصیبت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب یہ درخواست دی گئی۔ تو اس درخواست کو مجسٹریٹ نے پڑھا پڑھنے کے بعد مجسٹریٹ نے اسے خان بہادر عبدالرحمن کو دیا کہ اس کے متعلق آپ کا کیا جواب ہے۔ اس لمحہ سے پہلے بھوپال کے دیل اور انسپکٹر جنرل پولیس ہمارے کوششوں سے بالکل بے خبر اور تاریکی میں تھے۔ اس درخواست کو دیکھ کر خان بہادر عبدالرحمن بھی حیران ہوئے اور خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال راج کے متعلق اسے انچارج تھے کی پیشانی پر تو پینہ آگیا۔ اب ہم تو کہہ رہے ہیں کہ سٹر شاٹ کی شہادت بھوپال کے گواہ کے طور پر ہو۔ کیونکہ اس نے بھوپال کی درخواست پر دستاویز کا معائنہ کیا ہے۔ اور بھوپال والوں نے کہا کہ وہ سٹر شاٹ کی شہادت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اس کو پیش کرنا نہیں چاہتے۔ یہ واقعہ عدالت میں ایک بہت بڑی سنی پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوا۔ اور مجسٹریٹ کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ کہ بھوپال کی درخواست پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ نے دستاویز کا معائنہ کیا۔ اور اس نے بھی اس کو جعلی قرار دیا۔ چنانچہ آخر سٹر شاٹ کے نام مجسٹریٹ نے عدالت کی طرف سے من جاری کئے۔ سٹر شاٹ عدالت میں آئے۔ آپ کی شہادت ہوئی۔ اور آپ نے قرار دیا کہ یہ دستاویز جو فو اب بھوپال کے نمائندوں نے عدالت میں پیش کی ہے سو فی صدی جعلی ہے۔ چنانچہ بھوپال کے جو ایس گواہوں اور اس اکسپرٹ کی شہادت کے بعد اس مقدمہ میں مجسٹریٹ سٹر ایسیر نے فیصلہ دیا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ اور اخبار "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کو پکھنچنے اور پھنسانے کے لئے جھوٹے مقدمہ کی سازش کی گئی۔ اس فیصلہ سے بھوپال والوں کی جو حالت بری۔ ظاہر ہے۔ اپیل کی گئی جو بانی کورٹ میں خارج ہوئی اور ایڈیٹر "ریاست" بری نہیں بلکہ ڈسچارج ہوا۔

اس مقدمہ کے فیصلہ تک ایڈیٹر "ریاست" کا سٹر ایسیر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کبھی بھی ایڈیٹر "ریاست" کو سٹر ایسیر سے پرائیویٹ طور سے ملنے یا آپ کے گھر جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

مقدمہ کے فیصلہ کے عرصہ بعد سٹر ایسیر بیمار ہو گئے۔ آپ کی انگریزوں میں زخم تھا۔ اور خون بہ رہا تھا۔ آپ ہندو راتو ہسپتال (جہاں انگریز انصروں وغیرہ کا علاج ہوتا ہے) داخل کئے گئے۔ آپ کی زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ اور مجھے جب یہ حالت معلوم ہوئی۔ تو میں بطور ہمدردی آپ کے گھر گیا۔ آپ کی میم صاحبہ پریشانی کی حالت میں منہم تھیں۔ میں نے پوچھا کیا حالت ہے۔ تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آپ نے کہا کہ خدا رحم کرے۔ حالت بہت نازک ہے۔ کسی کو سٹر ایسیر کے پاس جانے کی اجازت نہیں۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہے۔ اور آپ خود بھی صرف چند منٹ کے لئے شام کو اپنے شوہر کو دیکھنے جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنے اور بات چیت کرنے کی اجازت نہیں۔



یہ پہلا موقع تھا کہ میں مسٹر ایسر کے مکان پر گیا۔

مسٹر ایسر کچھ اچھے ہو گئے اور ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ انگلینڈ جا کر وہاں اورپیشن کر انیں۔ چنانچہ اس بیماری اور کمزوری کی حالت میں ہی آپ ولایت گئے۔ وہاں ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اور کئی ماہ تک علاج کراتے رہے۔ ان کی غیر حاضری میں بھی سب مسٹر ایسر کی حالت دریافت کرنے ان کے گھر کبھی کبھی جایا کرتے۔ ایک روز میں نے مسٹر ایسر سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ مسٹر ایسر کا اس بیماری میں روپیہ تو کافی خرچ ہوا ہو گا۔ مسٹر ایسر نے معمولی طور سے ہاں کہہ دیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کے کئی بچے ہیں۔ جدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ رشوت نہ کھانے والا دیانتدار شخص۔ پوزیشن کا قایم رکھنا کوٹلی، موٹر، ملازم اور اس پر بیماری کی یہ مصیبت اور انگلینڈ کا خرچ۔ میں سوچتا رہا کہ یہ بچارے کیا کرتے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے معلوم ہوا کہ رخصت کی نصف تنخواہ تو میم صاحبہ اپنے پاس رکھتی ہیں۔ اور نصف اپنے شوہر کو ولایت خرچ کے لئے بھیج دیتی ہیں۔

میں یہ حالات سن کر واپس آگیا۔ مگر کچھ بے چینی سی محسوس کرتا رہا۔ رات کو بھی یہی خیال کہ اگر ولایت میں مسٹر ایسر کے پاس خرچ کے لئے کافی روپیہ نہ ہو گا۔ لڑکیا کریں گے۔ ایسے نیک آدمی کے لئے اتنی مصیبت اگر مسٹر ایسر کی زندگی نہ رہی۔ تو ان کے بچے کیا کریں گے۔ ان لوگوں کو کس جرم میں یہ سزا ملے گی۔ اور کیا نیک لوگوں کے لئے مصائب ضروری ہیں۔ ان ہی خیالات میں نیند آگئی صبح اٹھا۔ تو رات کے خیالات کا اثر موجود تھا۔

میری فطرت ہے کہ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو جب تک میں اس مشکل کا کوئی حل نہ سوچ لوں مجھے بے چینی سی رہتی ہے اور کام نہیں کر سکتا۔ نو بجے دفتر کے لوگ آئے میں نے ایک خط لندن کی ایڈورٹائزنگ فرم ڈی۔ جے کیر اینڈ کو کو لکھوایا کہ ہمارے حساب میں ایک سو پونڈ مسٹر ایسر آت دہی کو معرفت تمہارے گاہک اینڈ ٹھکانہ لندن بھیج دیا جائے۔ یہ خط پہنچتے ہی کیر اینڈ کو نے ایک سو پونڈ کا چیک مسٹر ایسر کو تمہارے گاہک کی معرفت بھیج دیا۔ مسٹر ایسر اس وقت ہسپتال میں بیمار پڑے تھے۔ اور اتفاقاً انکی بات ہے کہ آپ کے پاس اس وقت صرف پانچ پونڈ باقی تھے اور سوچ رہے تھے کہ کسی دوست سے قرض اس مسٹر ایسر کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ ان سگہ کا بھیجا ہوا ایک سو پونڈ کا چیک آپ کے پاس آئے گا۔ ہسپتال میں ہی بستر پر آپ کو یہ چیک ملا۔

مسٹر ایسر غالباً چار ماہ کے بعد انگلینڈ سے واپس آئے۔ آپ کا اورپیشن ہوا۔ اور آپ اچھے ہو گئے۔ جب دہلی پہنچے۔ تو میں خیریت پوچھنے کے لئے دوسرے تیسرے روز آپ کے پاس گیا۔ خیریت پوچھی۔ باتیں ہوئیں۔ تو آپ نے امپیریل بینک دہلی کا میرے نام کا ایک ہزار تین سو تیس روپیہ کا چیک دیا۔ اور کہا کہ آپ کے دل میں ایڈیٹر ریاست کے جذبات اور اخلاص کی انتہائی قدردان اور عزت ہے۔ مگر آپ یہ روپیہ نہیں لے سکتے کیونکہ ایڈیٹر ریاست کا مقدمہ آپ نے کیا اور اسے اپنے ضمیر پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں نے بہت کہا اور بار بار درخواست کی کہ یہ بیماری کی حالت میں ایک دو سانس نہ رتھی اس کو قبول کیا جائے۔ مقدمہ ختم ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کا کافی کورٹ میں بھی فیصلہ ہو چکا اب احسان یا معاوضہ کا سوال ہی کیا ہے۔ مگر آپ نہ مانے اور آپ نے چیک دے دیا۔ جنک سے کیش کر لیا گیا۔

اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد اس مقدمہ کا بھی آخری فیصلہ ناگہور ہائی کورٹ سے ہوا۔ جو ذرا اب بھوپال نے ہوشنگ آباد میں چلاؤ کھاتہ اور دہلی کے مقدمہ کی جعل سازی کے سلسلہ میں قلم انتظامات تکمل کئے کہ بھوپال کے نمائندہ جیل پر جعل سازی کے جرم میں فوجداری اور ایک لاکھ روپیہ ہرجانہ کا دیوانی مقدمہ دائر کیا جائے۔ مگر صرف اس خیال سے عدول مقدمات کا ارادہ نہ کر دیا گیا کہ چونکہ مسٹر ایسیر کے ایک سو پونڈ ان کی بیماری کے وقت ایڈیٹر "ریاست" نے بھی کھاتہ اگر مقدمہ چلا۔ تو شاید اس مقدمہ میں بے قصور۔ معصوم اور نیک سیرت مسٹر ایسیر کا نام بھی اس روپیہ کے سلسلہ میں زیر بحث آئے۔ آپ پر کوئی غلط الزام لگایا جائے۔ اور آپ کی شہرت کے لئے ایڈیٹر "ریاست" نقصان کا باعث ہو۔

مسٹر ایسیر کے روپیہ واپس کرنے کے بعد میرے اور مسٹر ایسیر کے تعلقات فی الحقیقت گہرے دوستانہ ہو گئے۔ اور یہ تعلقات میرے لئے نقصان کا باعث بھی ہوئے۔ چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا۔ نوٹوں کا مقدمہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس نیک نے مسٹر ایسیر کو غیر معمولی دیانتدار اور قوت ارادی کا مضبوط اور انصاف پسند مجسٹریٹ سمجھ کر آپ کی عدالت میں بھیجا۔ اور کھاتا کہ مسٹر ایسیر اس کا فیصلہ کریں۔ مگر مسٹر ایسیر کا ضمیر اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ آپ نے اس حکم کی پشت پر ہی لکھ کر یہ حکم واپس کر دیا کہ دیوانہ شنگ سے آپ کے ذاتی تعلقات میں اس لئے آپ مقدمہ مستنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ اگر ایک سو پونڈ کا چیک مسٹر ایسیر کو دلالت نہ بھیجا گیا ہوتا تو آپ نے ہندوستان آتے ہی واپس کر دیا۔ تو نوٹوں کا یہ مقدمہ بھی مسٹر ایسیر جیسے انصاف پسند اور قوت ارادی کے مضبوط مجسٹریٹ کے ہاتھوں فیصلہ ہوتا۔ اور جعل سازی والے بھوپال کے مقدمہ میں بھوپال کے نمائندوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آج جیل میں ہونے کے علاوہ ایڈیٹر "ریاست" ایک کافی رقم بطور ہرجانہ بھوپال کے خزانہ سے وصول کر لیتا۔

ان تمام واقعات کے بعد اگر ایڈیٹر "ریاست" کے دل کی اصلی آواز معلوم کی جائے۔ تو یہ ایماذاری کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہے کہ مسٹر ایسیر کی بیماری کی حالت میں ایک سو پونڈ کے لئے لندن خط لکھتے وقت میرے دل کو جو مسرت اطمینان اور خوشی محسوس ہوئی اس پر درجنوں دشمنوں کی جعل سازیوں کو معاف اور لاکھوں روپیہ قربان کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دوستوں اور مستحق لوگوں کی ضرورت کے وقت خدمت کرنے میں وہ مٹھ ہے۔ جو شاید حد فیل کے مراقبہ میں اور ہندو جھگڑوں کو انہد شہد یعنی دل کا خدا سے ہم کلام ہونا میں بھی میسر نہیں۔ اور میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ میں جب تک دوستوں اور مستحق لوگوں کی ضروریات میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ میرے پاس بہت روپیہ آیا۔ جب کبھی میں نے دوستوں کی امداد سے ہاتھ کھینچا۔ میں افلاس میں مبتلا ہوا۔ اور اب جو سرمایہ امت کے موبودہ نئے قدر میں اس غیر معمولی کامیابی کا سب سے بڑا باعث دوستوں اور دوستوں کے مستحق لوگوں کی دعائیں ہی ہیں۔

## ایڈیٹر "ریاست" کی عدالتی قمار بازی

اس سے پہلے "ریاست" میں دہلی والے مقدمہ نواب بھوپال ہاشم ایڈیٹر "ریاست" کے حالات مسٹر

کے فیصلہ تک کیے گئے تھے۔ ان حالات نے "ریاست" کے اڑھائی صفحہ کی جگہ لی۔ حالانکہ اس ناقابل فراموش کالم کے لئے مستقل طور سے جگہ صرف دو کالم وقت تھی۔ اب اس سخت دھکی لیل کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔ جو دلچسپ ہیں۔

مسٹر ایس کے فیصلہ کے بعد نواب بھوپال کی طرف سے سشن جج دہلی کی عدالت میں نگرانی دائر کی گئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ استغاثہ کے چوالیس نگرانوں کے گزرنے کے بعد دیوان سنگھ کے خلاف فرد جرم لگنا چاہیے۔ ہمارے وکیل کہتے تھے کہ جس صورت میں نواب بھوپال کے منتخب کردہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سرکاری ہیڈکوارٹر ٹیگ اکسپریٹ کی شہادت بھی موجود ہے۔ کہ نواب بھوپال کی طرف سے جلی کاغذات عدالت میں پیش کئے گئے۔ اور استغاثہ کے گواہ بھی دیوان سنگھ کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں کر سکے۔ اس لئے قانوناً دیوان سنگھ کو دس چار جہاز ہونا چاہیے۔ فرد جرم کی ضرورت نہیں۔ یہ مقدمہ مسٹر بیگٹ آئی۔ سی۔ ایس سیشن جج کی عدالت میں تھا۔ مسٹر ایس کی عدالت میں تو بھوپال کی طرف سے مقدمہ کے انچارج وکیل خان بہادر عبد الرحمن تھے۔ مگر مسٹر بیگٹ کی عدالت کے لئے انھوں نے ایک انگریز مسٹر کارڈن نوڈیر مسٹر کو ہیٹ کافی فیس پر وکیل کر لیا۔ یہ مسٹر کارڈن نوڈیر کسی برس تک مسٹر بیگٹ سشن جج کے ساتھ ایک ہی کونٹری میں مقیم ہے۔ جب کہ مسٹر بیگٹ لاہور میں رجسٹرار ہائی کورٹ یا لیگل ایڈمرسٹر تھے۔ اور مسٹر بیگٹ کے گھرے دوست تھے۔ مسٹر کارڈن نوڈیر وکیل ہونا ہمارے دل میں شبہات پیدا کرنے کا باعث ہونا چاہئے تھا۔ مگر آپ کا مسٹر بیگٹ کی عدالت میں وکیل مقرر ہونا خلاف قانون نہ تھا۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔ خاموش رہے۔ مسٹر بیگٹ کوئی الزام لگانا غیر مناسب تھا۔ چنانچہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ اور مسٹر کارڈن نوڈیر مسٹر بیگٹ کی عدالت میں آئے۔ تو مسٹر بیگٹ نے عدالت میں ہی کہا کہ مسٹر کارڈن نوڈیر آپ کے دوست ہیں۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ عدالت کو مسٹر کارڈن نوڈیر کو اپنے ہاں ڈنر پر بلا لیں۔ کسی پارٹی کو کوئی اعتراض تو نہیں جہاں تک حملے شبہات کا تعلق تھا۔ مسٹر بیگٹ کا مسٹر کارڈن نوڈیر کو اپنی کوشش پر دعوت دینا بخیر پہلے والی بات تھی۔ ہمارے شبہات میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ مگر مقدمہ عدالت میں پیش ہے۔ سشن جج پر الزام کیونکر لگاتے۔ ہم نے بھی دہلی کے ساتھ کہہ دیا کہ میں مسٹر کارڈن نوڈیر کے آپ کے ہاں ڈنر پر جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

مسٹر کارڈن نوڈیر مسٹر بیگٹ کے ہاں ڈنر پر گئے۔ مقدمہ اس کے بعد کئی روز تک رہا۔ بحث ہوئی۔ بحث کے بعد مسٹر بیگٹ نے مقدمہ کا فیصلہ "ایڈیٹر" ریاست کے خلاف دیا۔ اور فیصلہ میں لکھا کہ دیوان سنگھ پر چارج شیڈ کی سبھی فرد جرم لگائی جائے۔ اور پھر دیوان سنگھ کی طرف سے صفائی پیش ہو کر مقدمہ کا فیصلہ ہو۔ مسٹر بیگٹ کے اس فیصلہ کے خلاف ہم ہائی کورٹ میں گئے۔ وہاں نگرانی داخل کی۔ رجسٹرار نے یہ مقدمہ بخشی سرٹیک چند جج ہائی کورٹ کی عدالت میں سماعت کے لئے بھیج دیا۔ اس زمانہ میں ہائی کورٹ کے مستقل چیف جج سر شادی لال ایک قانونی کمیشن کے سلسلہ میں دلایت گئے ہوئے تھے۔ اور قائم مقام چیف جسٹس ایک انگریز سر امین براڈوے تھے۔ جن کے متعلق ہمارے پاس اطلاع تھی کہ وہ بھی مسٹر کارڈن نوڈیر کے دوست ہیں۔ مگر ہم کیا پروا کرتے جس صورت میں کہ مقدمہ بخشی شیک چند کی عدالت میں لگ چکا تھا۔ اور انصاف اور قابلیت کے اعتبار سے بخشی صاحب شاید تمام ججوں میں ہی ایک نمایاں ترین حیثیت رکھتے تھے۔ بھوپال

دارال کو جب یہ علم ہوا کہ مقدمہ بخفی ٹیک چند کی عدالت میں لگ چکا ہے تو ان لوگوں نے کوشش کر کے مقدمہ سرالین براڈوے کی عدالت میں لگا دیا۔ اور عدالت کی اس تبدیلی کا حکم سرالین براڈوے نے خود بطور قائم مقام چیف جسٹس دیا۔ چیف جسٹس کا حکم ہائی کورٹ میں خدائی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اپیل کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور ہر قسم چاہے وہ دل میں کیا کچھ سمجھتا ہو۔ اس حکم کے سامنے سر جھکائے کے لئے مجبور ہے۔ چنانچہ ہم بے بس تھے۔ دہلی میں اسپیل مئی تو مسٹر ہیکٹ سیشن جج کے ذاتی دوست مسٹر کارڈن نوٹ۔ اور اب ہائی کورٹ میں آئے ہیں تو مقدمہ بخفی ٹیک چند کی عدالت سے سرالین براڈوے اپنی عدالت میں لے گئے۔ اور مسٹر کارڈن نوٹ سرالین کے دوست۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔ بہت سوچا اس بیماری کا علاج سمجھ میں آیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ مقدمہ انگریز جج کی عدالت میں ہو گا۔ استغاثہ کے وکیل انگریز۔ اس لئے اس انگریزیت کے زہر کے اثر کو کچھ نرم کرنے کے لئے ہم بھی کوئی انگریز وکیل کر لیں۔ بیکار مسٹر کارڈن نوٹ کا بطور مشورہ انگریز اگر اثر ممکن ہو زیں مسٹر کارڈن نوٹ پر کوئی الزام نہیں لگایا ہوا۔ صرف اپنے دل کی کیفیت اور شہادت بیان کر رہا ہوں تو وہ اثر ایک حد تک زائل ہو سکے۔ اس زمانہ میں انگریز وکیلوں میں سب سے زیادہ لائق وکیل مسٹر پٹل ہیں۔ ہر سال کے ضعیف۔ مگر بہت محنتی۔ بہت لائق اور بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ آپ پنجاب کے سائنس دان و دیگر کے بڑے مقدمات میں بطور سرکاری وکیل یا ملازموں کے وکیل کی حیثیت سے پیروی کر چکے تھے۔ اور غالباً جج ہائی کورٹ بھی رہے۔ مسٹر پٹل میں اس زمانہ میں فلیٹی ہوٹل کی اوپر کی منزل کے کمروں میں مستقل رہائش رکھتے تھے۔ ایڈیٹر "ریاست" اور سردار بہادر بھگوان سنگھ فلیٹی ہوٹل پہنچے۔ مسٹر پٹل میں سے بٹے مسٹر پٹل میں کی فیس پانچ سو روپیہ روزانہ تھی۔ آپ نے پوچھا۔ مقدمہ کیا ہے تو جواب دیا گیا۔ توہین کا مقدمہ ہے۔ اور اس کی ہائی کورٹ میں لگائی ہے۔ مسٹر پٹل میں نے سمجھا ایک دو گھنٹہ کا کام ہے۔ اور چند منٹ سسل کو دیکھنے پر صرف ہوں گے۔ آپ نے فرمایا۔ پانچ سو روپیہ فیس ہوگی۔ ہم نے کہا۔ بہت اچھا۔ پانچ سو روپیہ فیس اور پچاس روپیہ منشیانہ ہم نے نذر کیا اور یہ وعدہ کر کے چلے آئے۔ مگر شام تک سسل کی نقل بھیج دیں گے۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ دیر سٹراہیرا جو مسٹر توکی کے ساتھ میرے وکیل تھے۔ مقدمہ کی سسل کے گھر سے ہیں۔ اور شاید تمام ہندوستان میں کوئی وکیل بھی اتنا محتاط۔ ڈوراندیش اور محنتی نہ ہو گا۔ یہ فہم ممکن تھا کہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی عدالت کی سسل میں ہو اور اس کی مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ اس مقدمہ کی سسل بھی ایک ہزار صفحات سے زیادہ ضخیم تھی۔ کیونکہ مقدمہ کی کارروائی۔ چوالیس گواہوں کے بیانات اور ایک ایک گواہ کی کئی ہفتہ جرح۔ شام کو ہم نے سسل کی مکمل نقل مسٹر پٹل میں کو بھیج دی۔ تاکہ وہ پانچ سات روز میں اطمینان کے ساتھ معائنہ کر لیں اور ہم واپس دہلی چلے آئے۔ کیونکہ مقدمہ کی پیشی میں چند روز باقی تھے۔

دہلی پہنچ کر ایڈیٹر "ریاست" سرالین براڈوے کی عدالت سے بے فکر نہ تھا۔ سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے آخر میں نے اپنی پوری وقت ارادی کے ساتھ فیصلہ کیا کہ نتیجہ چاہے کچھ ہو۔ اور چاہے توہین عدالت کے جرم پر بھی سزا ہو جائے جب سرالین براڈوے کی عدالت میں جاؤں گا تو مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے علانیہ طور سے عدالت کو خط طلب کرتے ہوئے کہوں گا کہ چونکہ سرالین براڈوے نے خود ہی مقدمہ بخفی ٹیک چند

کی عدالت سے منتقل کر لیا ہے۔ مجھے اس عدالت کے انصاف پر بھروسہ نہیں۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مقدمہ کسی دوسرے جج ہائی کورٹ کے پاس بھیجا جائے۔ اور اگر یہ عدالت کو منظور نہیں۔ تو میں عدم تعاون کرتا ہوں۔ عدالت جو چاہے مقدمہ کا فیصلہ دے۔ میں مقدمہ کی کارروائی میں حبیبتہ نہ لوں گا اور میں اس توہین عدالت کے جرم کی سزا بھگتنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

میں نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ ہائی کورٹ توہین عدالت میں بہت سخت سزا دے سکتی ہے۔ راناظربین کو یاد ہوگا۔ مرحوم لالہ ہرکشن لال کو چیف جسٹس ہائی کورٹ لاہور نے توہین عدالت کے جرم میں عمر قید کی سزا دی تھی۔

ابھی مقدمہ کی پیشگی میں ایک ہفتہ کے قریب باقی تھا۔ خوش نصیبی سمجھئے یا حسن اتفاق کہ صبح کو میں نے مشینیں دیکھا۔ اس میں ایسی سی ایڈٹریس کا ایک نام تھا کہ لندن کے اس قانونی کمیشن کا کام خلافتِ توقع جلدی ختم ہو چکا ہے جس میں سرشادی لال چیف جسٹس ممبر تھے۔ اور سرشادی لال جہاز کے ذریعہ آج واپس بمبئی پہنچ گئے۔ اور شام کو فریئر میل میں پنجاب روانہ ہو رہے ہیں۔ اس خبر کو پڑھتے ہی ذہن میں مختلف خیالات آنے شروع ہوئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ سرشادی لال واپس آگئے ہیں۔ مقدمہ سرالین براؤڈے کی عدالت سے نکلوا یا جاسکتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔ میں اس سے پہلے کچھ چکا ہوں کہ جب کوئی بھی مشکل پیش آئے مجھے اس وقت تک بہت بے چینی سی رہتی ہے جب تک کہ اس مسئلہ کا حل اور اس حل کا پروگرام تیار نہ کروں۔ اس حالت میں مجھ سے نہ کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ میں کوئی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ جب کوئی حل تجویز کروں۔ اور اس حل کا پروگرام بناؤں۔ تو پھر قلمی طور سے مطمئن ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا ہوں۔ میں نے اس خبر کو صبح چھ بجے کے قریب پڑھا۔ دوپہر کے دو بجے تک بچہ نہیں رہا اور سوچا رہا کہ کیا کرنا چاہئے۔ آخر فیصلہ کیا کہ تمام حالات کے متعلق سرشادی لال کو اطلاع کیجی جائے۔ چنانچہ میں نے سرشادی لال کو ایک خط لکھا۔ جس میں مقدمہ کے تفصیل کے ساتھ حالات تھے۔ مسٹر ایسیر کا فیصلہ چاہیں گے کہ ان کی شہادت۔ گورنمنٹ ہند کے ہینڈلڈ آرٹیکلنگ اکسپریٹ کی گواہی مسٹر بیکٹ کی عدالت میں مسٹر کارڈن نوڈ کا دلیل مقرر ہونا۔ عدالت میں ڈنڈا کو ڈر۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا۔ اور وہاں سے مقدمہ بلاؤ چیف جسٹس سرالین براؤڈے کا اپنی عدالت میں منگوانا وغیرہ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ پیشی کے روز میں توہین عدالت کی پروا نہ کرتے۔ اور عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے جسٹس ایلن پر علانیہ جانبداری کا الزام لگاؤں گا۔ اور کہوں گا کہ اس عدالت یا ہائی کورٹ سے مجھے انصاف کی توقع نہیں۔ یہ خط غالباً سولہ صبح کا تھا۔ اور ریاست کے فارموس پر تھا۔ میں نے خط کو لکھنے کے بعد پھر پڑھا۔ بند کیا۔ اس کی اسٹیمپنگ لگائے۔ اور آدمی کے ہاتھ سارے تین بجے کے قریب رجسٹری کے لئے ڈاک خانہ بھیج دیا۔ اور اس کی رسید میرے پاس آگئی۔ یعنی جس شام کو اور جس فریئر میل میں جسٹس سرشادی لال دہلی سے گزرے۔ اسی شام کو اور اسی فریئر میل میں میری رجسٹری لاہور گئی۔ سرشادی لال آٹھ بجے کے قریب لاہور پہنچے۔ اور دوپہر کو بارہ بجے کے قریب یہ رجسٹری خط ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

جسٹس سرشادی لال نے اگلے روز چیف جسٹس کے حوالہ کا حارج سرالین براؤڈے سے لیا۔ حارج لینے کے بعد آپ نے فریئر رجسٹری راجہ انگریز تھا اور جو مقدمات کو عدالتوں کے سپرد اور عدلیہ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ میں بس ڈپٹی رجسٹرار کا نام بھول گیا ہوں، کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس مقدمہ کے متعلق عدالت کی تبدیلی کے

واقعات دریافت کئے۔ ڈپٹی رجسٹرار نے تمام حالات یعنی پہلے یہ مقدمہ بخشی ٹیک چندکی عدالت میں لگا۔ اور بعد میں سر امین کے حکم سے سر امین براؤڈے کی عدالت میں گیا وغیرہ بتائے۔ یہ واقعات سننے کے بعد سر شادی لال نے حکم دیا کہ سل ان کے پاس بھیجی جائے۔ وہ سل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر شادی لال تین روز تک سل کو دیکھنے رہے اور دیکھنے کے بعد سل پر حکم لکھا کہ مقدمہ جسٹس سر امین براؤڈے کی عدالت سے پھر جسٹس بخشی ٹیک چندکی عدالت میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ سل بخشی ٹیک چندکی عدالت میں بھیج دی گئی۔

مقدمہ کی پیشی سے دو روز پہلے میں سٹر تو کلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ لاہور پہنچ گئے۔ امیر ملی ہوٹل میں مقیم تھے۔ سٹر پٹ میں سے ملے۔ تو سٹر پٹ میں نے کہا کہ ان کو علم نہ تھا کہ سل ایک ہزار صفحہ سے زیادہ ضخیم ہے۔ اور اس کا معائنہ کرتے ہوئے ان کے سات روز صرف ہرے اگر یہ معلوم ہوتا کہ سل اس قدر ضخیم ہے اور اتنی محنت کرنی پڑے گی۔ تو آپ کم از کم پانچ ہزار روپیہ غتنا نہ طلب کرتے۔ کہاں پانچ سو اور کہاں پانچ ہزار ہم حیران تھے کہ ان کے اس اعتراض کا کیا جواب دیا جائے۔ ایڈیٹر ریاست اپنی تمام زندگی وکیلوں اور ڈاکٹروں کے متعلق بہت غناظر رہا ہے۔ اور ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ ان کو غیر مطمئن نہ ہونا چاہئے۔ اور چاہے کتنے گہرے تعلقات ہوں۔ ان کو ہمیشہ فیس دی دسوائے سٹر تو کلی کے جو فیس قبل نہیں کرتے۔ اور کرتے ہیں تو کبھی وہ بھی بڑے تمام۔ اور اگر کوئی ڈگری ہو تو اپنے پاس سے اس ڈگری کا روپیہ بھی ادا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ان کا میرے ذمہ ڈیڑھ ہزار روپیہ کے قریب باقی ہے۔ جو آپ نے ایک عدالت میں میری جگہ ادا کیا۔ خدا کرے کہ میں یہ روپیہ ان کو جلدی واپس کر سکوں۔ گو نہ صرف انھوں نے کبھی تقاضہ نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ روپیہ وہ نہ لیں گے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ نہیں۔ میں لازمی طور سے واپس کر دوں گا۔ مجھے خیال آیا۔ کہ سٹر پٹ میں پانچ سو روپیہ فیس سے مطمئن نہیں۔ شاید ہمارے مقدمہ میں دل چسپی نہ نہیں۔ تو میں عدالت کی کاروائی بھی ہوگی۔ نہ معلوم عدالت میں کیا حالات ہوں۔ پانچ سو روپیہ دے چکے ہیں۔ ان کو اور فیس جو طلب کریں نذر کی جائے۔ چنانچہ ایڈیٹر ریاست نے کہا کہ آپ اور کم از کم کیا چاہتے ہیں۔ اگر وہ نذر کیا جائے۔ سٹر پٹ میں بہت بلند انسان تھے۔ آپ کا کیرئیر ملاحظہ ہو۔ آپ نے فرمایا۔

”دیوان سنگھ۔ یہ سوال زبان اور کیرئیر کا ہے۔ میری غلطی تھی کہ میں نے مسل کو دیکھے بغیر آپ کے

پانچ سو روپیہ فیس طلب کی۔ اب جب کہ میں اس فیس میں معذرت لے چکا ہوں تو میرا ایمان ہے کہ میں لال نہ کروں۔ اور اس فیس میں ہی پوری محنت اور کوشش سے تیاہی کروں۔ آپ اب اگر

ایک لاکھ روپیہ بھی مجھے دیں۔ تو میں اس میں سے ایک پیسہ نہ لیں گا۔“

کیسے بلند کیرئیر لوگ تھے۔ سٹر پٹ میں کا انتقال ہو چکا ہے، اور اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ مگر جب ان کا خیال آتا ہے تو عزت و احترام کے ساتھ دل کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ سٹر پٹ میں نے کوئی مزید فیس قبول نہ کی۔

سٹر پٹ میں سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ رجسٹرار کے دفتر میں گئے تاکہ معلوم کریں کہ میرے اس خط کا کیا نتیجہ ہوا۔ جو میں نے سر شادی لال کو بذریعہ رجسٹری بھیجا تھا۔ وہاں کے کلرکوں سے معلوم ہوا کہ چیف جسٹس سر شادی لال نے سل طلب کی۔ تین روز تک سل کا معائنہ کرتے رہے اور حکم دیا کہ مقدمہ پھر جسٹس

بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جائے۔ یہ سن کر ہم مطمئن ہو گئے۔ اور مسٹر ہٹ مین کو اطلاع دی کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہوگا۔

تیسرے روز چوتھی تھی۔ بھوپال والوں کو با مسٹر کارڈن نوڈ کو مقدمہ کی اس تبدیلی کا کوئی علم نہ تھا۔ نوڈ کے قریب ہم لوگ ہائی کورٹ پہنچے۔ رجسٹرار کے دفتر کے برآمدے میں کھڑے تھے کہ بھوپال کے انپیکٹر جنرل پولیس خواجہ محمد اکرم اپنی پوری دردی کے ساتھ۔ خان بہادر عبدالرحمن ترکی ڈپٹی اور سوٹ پہنے ہوئے۔ اور مسٹر کارڈن نوڈ فاتحانہ انداز میں شکر اترتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ اس لمحہ تک ان بچاروں کو نہ تو میرے اس خط کا علم تھا جو میں نے سر شادی لال کو لکھا اور نہ یہ خبر تھی کہ حالات چو پٹ ہو چکے ہیں۔ اور مقدمہ چیف جسٹس کے حکم سے سر امین کی عدالت سے بخشی ٹیک چند کی عدالت میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہائی کورٹ کے دکیوں کا قاعدہ ہے۔

کہ وہ جب ہائی کورٹ میں پہنچتے ہیں۔ تو ایک چکر رجسٹرار کے دفتر کا ضرور لگاتے ہیں تاکہ مقدمات کے حالات معلوم کر سکیں۔ یہ لوگ بھی رجسٹرار کے دفتر میں گئے۔ تو ان کو معلوم ہوا کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہوگا۔ مسٹر کارڈن نوڈ بہت تیز طبیعت کے انگریز تھے۔ آپ بہت غصہ میں آئے۔ فوراً سر امین براڈوے کی عدالت میں پہنچے۔ سر امین ابھی تک عدالت میں نہ آئے تھے۔ اپنے پرائیویٹ چیمبر میں تشریف رکھتے تھے۔

ان سے ملے اور کہا کہ اس طرح مقدمہ آپ کی عدالت سے تبدیل ہو چکا ہے۔ سر امین کے لئے بھی یہ خبر خلاف توقع تھی۔ کیونکہ وہ سبجے ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہونا تھا۔ اور وہ مقدمہ سننے کی تیاریاں فراپہلے تھے۔ آپ پر بھی بہت جوش اور غصہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ ڈپٹی رجسٹرار کو طلب فرمایا۔ حالات پوچھے۔ اور حالات پوچھنے کے بعد آپ نے ڈپٹی رجسٹرار کو سر شادی لال کے پاس یہ کہلوا کر بھیجا کہ سر امین نے یہ مقدمہ بطور چیف جسٹس اپنی عدالت میں منتقل کیا ہے۔ سر شادی لال کو حق حاصل نہیں کہ وہ اس مقدمہ کو ان کی عدالت سے منتقل کریں۔ اور مقدمہ کا پھر جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا سر امین کی توہین ہے۔ ڈپٹی رجسٹرار یہ پیغام لے کر چیف جسٹس سر شادی لال کے پرائیویٹ چیمبر میں پہنچے۔ پیغام دیا تو سر شادی لال نے ڈپٹی رجسٹرار کی معرفت سر امین کو جواب بھیجا کہ اگر بطور چیف جسٹس سر امین یہ مقدمہ اپنی عدالت میں لے گئے ہیں تو میں اب بطور چیف جسٹس ہی پھر حکم دیتا ہوں کہ یہ مقدمہ سر امین کی عدالت میں نہ رہے۔ اس کی سماعت بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہو۔ اور یہ سر امین کے فائدہ کے لئے ہے۔ کہ وہ اس مقدمہ کو نہ سنیں۔ ورنہ دیوان سنگھ سر امین کی عدالت میں کہے گا کہ اسے اس عدالت سے انصاف کی اُمید نہیں۔ اور مقدمہ اس طرح بخشی ٹیک چند کی عدالت سے تبدیل کیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سر امین براڈوے اور لاہور ہائی کورٹ دونوں کی تمام ہندوستان کے اخبارات اور پبلک میں سنی پلید ہوگی۔

سر شادی لال کا یہ جواب سن کر سر امین براڈوے کے جوش ٹھکانے آ گئے۔ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں رہا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد ہم لوگ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں پہنچے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ نواب بھوپال کی طرف سے مسٹر کارڈن نوڈ خان بہادر عبدالرحمن وغیرہ وکیل تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست کی طرف مسٹر ہٹ مین۔ سر مار ہارن بھگوان سنگھ اور مسٹر توکلی۔ تین روز بحث ہوئی تین روز کی کاروائی کے بعد جسٹس بخشی ٹیک چند نے ایڈیٹر ریاست کی نگرانی منظور کرتے ہوئے مسٹر ایسکرادہ فیصلہ بحال رکھا۔ جس میں مسٹر ایسکرادہ لکھا تھا کہ مقدمہ

جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ اور خواب بھولال کے نایزدوں نے خواب بھولال کی طرف سے دیدار سسٹم کو نقصان پہنچانے اور اخبار ریاست کو کچلنے کے لئے مقدمہ کی سازش کی۔ اور جلی دستاویز عدالت میں پیش کیں۔ انگریزی زبان کے ایک مشہور مصنف نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔

”کامیاب لوگوں کی زندگی دنیا میں قمار بازی کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انتہائی نفع اور انتہائی نقصان دونوں ممکن ہیں۔“

انگریزی کے اس مصنف کے قول کے مطابق ایڈیٹر ریاست کی تو تمام زندگی ہی قمار بازی میں گزری۔ چاہے یہ سیاسی تھی یا عدالتی۔ اور اس قمار بازی میں قدم قدم پر خطرہ کو لیبیک کہا۔ اس سے نادمے بھی پہنچے اور نقصان بھی۔ چنانچہ اگر جس سر شادی لال کو خط لکھنے اور سر امین برادرس کی عدالت میں عدم تعاون کرنے کے فیصلہ کی عدالتی قمار بازی نہ کی جاتی۔ اور ایڈیٹر ریاست ”خطرہ میں نہ کودتا۔ تو یہ مقدمہ بخشتی سرٹیک چند کے ہاتھوں سے فیصل نہ جرتا۔ اور یہ سر امین برادرس کی عدالت میں رہتا جس کا نہ معلوم نتیجہ کیا ہوتا جو لوگ دنیا میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ قمار بازی کا ثبوت دیں۔ اور اپنے لئے خطرات برداشت کریں۔ کیونکہ گوان قمار بازوں میں نقصان کا بھی خدشہ ہے۔ مگر کامیابی بھی صرف قمار بازی اور خطرات کو لیبیک کہنے میں ہی ہے اور وہ لوگ زندگی میں ہمیشہ کام نامہ راہیں گے۔ جو خطرات کو لیبیک کہنے کی جرات نہیں رکھتے۔

## گناہوں کی سزا

ایڈیٹر ریاست ”نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے۔ نہ خدا سے منکر ہے۔ اور نہ اس نے کبھی یہ معلوم کرتے کی کوشش کی کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے یا کوئی اور قدرت۔ مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے (۱) جو تشیع یعنی ستاروں کی گردش کا اثر انسانوں پر (۲) کچھلا اور آئینہ جہم یعنی مسئلہ تنازع اور (۳) دُعا یا بددُعا کا اثر۔ یعنی اس کے خیال۔ یقین اور تجربہ میں ستاروں کا اثر ہوتا ہے۔ جو جو تش کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس جو تش کے ذریعہ ہی انسان معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کچھلے جہم میں کون تھا۔ اور کہاں کا رہنے والا تھا اور آئینہ جہم کہاں ہوگا اور دُعاؤں اور بددُعاؤں کا اثر بھی لازمی ہے چاہے وہ کسی صورت میں اُس کب ہو۔ چنانچہ گناہوں کی سزا کے متعلق ایک واقعہ لکھتا ہوں۔

مرحوم لال رام رچھپال سنگھ شیدا سابق ایڈیٹر ہندوستان ”الامود بہت غلص اور محبت کے بزرگ و دوست نور شخصیت تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست پر ہمیشہ کرم فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ اپنے بال بچوں کی خواہش کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی دہلی آتے اور ایڈیٹر ریاست کے ہاں چھ چھ ماہ تک قیام کرتے اور ان کے معاذ اللہ کو یہ ہمیشہ شکایت رہتی کہ آپ اتنے عرصہ تک بڑھاپے میں خاندان کے ممبروں سے دُور دہلی رہتے ہیں۔ جب شیدا صاحب یہاں تشریف رکھتے تو میں شام کو ہر روز ان کو موٹر میں سیر کے لئے دہلی۔ نئی دہلی اور قرب و جوار کی دیہاتی شہروں پرے جاتا۔ اور کبھی کبھی جہنم میں ایک آدھ بار دو چار گھنٹہ کے طے ہم لوگ دہلی سے دُور میرٹھ وغیرہ بھی چلے جاتے۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ میں، شیدا صاحب، سردار بیکران سنگھ ونگو دالیہ سکریٹری پنجاب سٹیشن



پیلز کا نفرین، مسٹر محمد یوسف جہاں اور لالہ امیر چند گھنٹہ شام کو بیٹھے چلے پی رہے تھے کہ یہ فیصلہ ہوا کہ آج میرٹھ سیر کے لئے چلیں۔ چنانچہ ہم پانچوں کار میں میرٹھ کے لئے روانہ ہوئے۔ میرٹھ کے راستہ میں جب ٹری نہر کے دوسری طرف پہنچے۔ تو کسی نے کہا کہ جنگل کی تازہ ہوا کا ٹھٹھ لینے کے لئے تھوڑی دیر سڑک کے کنارے بیٹھا جائے۔ جہاں ایک گڑھا اور چند درخت تھے۔ ہم نصف گھنٹہ کے قریب یہاں بیٹھے تھے کہ قریب کی جھاڑی میں سے ایک خرگوش نکلا، ایڈیٹر "گویا ست" نے جب اس خرگوش کو دیکھا۔ تو اس نے دفعتاً شیدا صاحب کی لکڑی رجوکانی موٹی تھی، اٹھا کر اس خرگوش کو ماری۔ یہ لکڑی خرگوش کے لگی۔ اور خرگوش لنگراتا ہوا ایک دوسری جھاڑی میں چھپ گیا۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اس چوٹ کے باعث صرف لنگراتا ہوا یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا یہ مر گیا۔

اس کے بعد ہم لوگ میرٹھ گئے۔ وہاں ایک کانگریسی دوست بل گئے شیدا صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اور آپ اکثر راگوں اور راگینوں سے واقف تھے۔ ان کانگریسی دوست کے ساتھ ہم بازار گئے۔ میرٹھ کے پیرے اور ایک جگہ گانا سنا، گانا سننے کے بعد ان کانگریسی دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ اور رات کو گیارہ بجے کے قریب موٹر میں ہی واپس دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اور غالباً نومبر یا دسمبر کا مہینہ تھا۔ سڑک پر موٹر دوں۔ بیل گاڑیوں اور لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ میں موٹر کو پینتالیس میل کی رفتار سے چلا رہا تھا۔ کیونکہ چالیس میل کا سفر تھا۔ اور خیال تھا کہ جلدی گھر پہنچ کر آرام کریں۔ موٹر نیز رفتار کے ساتھ جاری تھی۔ جس نے سانسے دیکھا کہ سڑک سے بائیں طرف ایک بیل گاڑی جاری ہے۔ چونکہ وہ بیل گاڑی سڑک سے بائیں طرف تھی۔ میں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم نہ کی۔ مگر جس وقت موٹر اس بیل گاڑی کے قریب پہنچی۔ تو تیز روشنی کو دیکھ کر بیل چونک اٹھے۔ اور وہ گاڑی چلانے والے سے بے قابو ہو کر داہنی یعنی سڑک کے درمیان کی طرف مڑے۔ اب اس وقت اگر میں موٹر کو روکتا نہیں۔ تو موٹر سیدھی اس بیل گاڑی میں جا کر لگتی۔ چنانچہ میں نے فوراً بریکیوں کو زور سے دبایا۔ موٹر بہت تیز رفتاری سے جاری تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیل گاڑی تو بج گئی مگر کار ایک تخت کھڑے ہونے کے باعث سڑک سے پھسل گئی جس کو سبکدھونا پڑتا ہے۔ کار کو سخت دھکا لگا۔ شیدا صاحب اچھل کر زمین پر گرے اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میرے دماغ پر چوٹ آئی اور میں بیہوش ہو گیا۔ موٹر کے دروازے ٹوٹ گئے اور ہم جا تو رہے تھے شمال سے جنوب کی طرف۔ مگر سبکدھونے کے باعث موٹر کا رخ شمال کی طرف پھر گیا۔ چنانچہ لالہ امیر چند یوسف صاحب اور سردار بھگوان سنگھ نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی موٹر کے نیچے سے نکالا۔ شیدا صاحب شدت درد کے باعث بہت سبے چین تھے اور دیکھا گیا کہ ہم بالکل اس جگہ ہی اس وقت اس حالت میں پڑے ہیں۔ جہاں کہ میرٹھ جاتے ہوئے گڑھے اور درختوں کے پاس بیٹھے تھے اور جہاں میں نے شیدا صاحب کی لکڑی کے ساتھ خرگوش کو زخمی کیا تھا ہم لوگ اس بے بسی کی حالت میں نصف گھنٹہ تک وہاں ہی رہے۔

اتنے میں میرٹھ کی طرف سے ایک موٹر آتی دکھائی دی۔ یوسف صاحب نے سڑک پر کھڑے ہو کر موٹر کو روکنے کا اشارہ کیا۔ موٹر رُک گئی۔ اس موٹر میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک صاحب مسٹر ہریش چندر تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میری موٹر ہے اور میں بے ہوش پڑا ہوں۔ تو انھوں نے مجھے اپنی موٹر میں ڈالا۔

میری موٹر کے دروازے وغیرہ گولٹ گئے تھے۔ مگر انجن درست حالت میں تھا۔ اور موٹر چل سکتی تھی۔ شیدا صاحب کو میری موٹر میں ڈالا گیا۔ جسے یوسف صاحب نے چلانا شروع کیا۔ اور دونوں موٹریں آہستہ آہستہ دہلی پہنچیں۔ شیدا صاحب کو تو موٹر سول ہسپتال میں لے گئی۔ جہاں ان کے فریگر کو سیٹ کیا گیا۔ اور آپ دو ماہ کے قریب ہسپتال میں رہے۔ مجھے ہریش چندر جی میرے مکان پر لے آئے۔ مکان پر پہنچ کر مجھے چار پائی پر ڈالا گیا۔ ڈاکٹر میری کو ٹیلی فون کیا۔ رات کو دو تین بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آئے میں بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کنکشن آف برین (دماغی حادثہ) ہے میں بھی دو ماہ کے قریب چار پائی پر پڑا رہا اور علاج کرانا رہا۔ دو ماہ کے بعد ہم دونوں اچھے ہوئے۔ اس کے بعد شیدا صاحب مرحوم ہمیشہ کہا کرتے کہ بے گناہ خرگوش کو دیوان سنگھ نے میری لاکھی سے زخمی کیا اور دونوں کو سزا ملی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خرگوش کو زخمی کرنا یا مارنا گناہ نہیں۔ اور یہ حادثہ بھی اتفاقاً ہوا تو اس کی وجہ کیا ہے کہ یہ حادثہ عین جگہ ہوا جہاں چند گھنٹے پہلے ہم لوگ بیٹھے تھے اور جس جگہ خرگوش زخمی کیا گیا تھا۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کا ایمان ہے کہ ہر گناہ کی سزا ملتی ہے۔ چاہے وہ اس جہنم میں لے یا اگلے جہنم میں۔ اور فوراً ملے یا دیر میں اور چند ماہ یا چند سال کے بعد۔ مگر یہ ہونہیں سکتا کہ انسانوں اور جانوروں (جن میں دھکے یا شکے محسوس کرنے کا احساس موجود ہے) کی دعاؤں یا بددعاؤں کا اثر نہ ہو۔ اور اگر ہم کوئی گناہ کرتے ہیں۔ ریڈیٹر ”ریاست“ کے خیال میں گناہ صرف وہ ہے۔ جو کسی کا دل دکھانے یا کسی کا حق غصب کرنے کی ذیل میں آئے) تو اس کی سزا کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہئے۔

## ریاستی رعایا اور اہلکاروں کی ”وفا شنکاری“

میں ریاست نا بھرم میں ملازم تھا۔ دوسروں پر یہ مہوار تنخواہ ملتی تھی ہمارا جہ کے دل میں نہ صرف میرے جرنلٹ ہونے کے باعث عزت تھی۔ بلکہ وہ ایک حد تک مجھے اپنا خیر خواہ دوست بھی سمجھتے تھے۔ اس زمانہ ہمارا جہ پر ریاستی بادلوں کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا عتاب اور ہمارا جہ پیالہ دشمن۔ جو چاہتے تھے کہ ہمارا جہ نا بھرم سے انتقام لیں۔ پہلے غیر مطمئن۔ کیونکہ ہمارا جہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے جھگڑوں کے باعث ریاست کی ایڈمنسٹریشن میں دل چسپی نہ لیتے تھے۔ یہ تمام حالات ہمارا جہ کے لئے بہت پریشانی کا باعث تھے۔ ایک روز ہمارا جہ کو اطلاع ملی کہ جسٹس سٹوارٹ (جو نا بھرم اور پیالہ کے جھگڑوں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے انبالہ میں بیج معزز ہوئے تھے) کی رپورٹ برگرڈمنٹ ہمارا جہ کو گڈی سے معزول کرنا چاہتی ہے۔ یہ رپورٹ ہمارا جہ کے لئے مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ ہمارا جہ نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری۔ ناراین سنسر۔ ہوم سنسر اور دوسرے پراسن خانہ دانی اہلکاروں کو مشورہ کے لئے طلب کیا۔ ریاستوں کے یہ لوگ نالائق۔ جاہل۔ سازشی اور پراسن ٹائپ کے خوشامدی۔ سیاسی جھگڑوں کو پنڈانے کے بالکل اہل نہ تھے۔ ان میں سے جن لوگوں کی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں سے ذاتی واقفیت تھی۔ انھوں نے تو مشورہ دیا کہ پولیٹیکل ایجنٹس کے کپڑوں پر کڑے جائیں۔ دوسرے جوتھے۔ انھوں نے کہا کہ سرکار آپ ہمارا جہ ہیں۔ خود مختار ہیں آپ کو کون ہاتھ نکا سکتا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹوں

کی حیثیت کیا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیجئے۔ گورنمنٹ کو حوصلہ نہ ہو گا کہ وہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ مشورے ہو رہے تھے کہ اتنے میں اکالی لیڈروں اور ایک تعلیم یافتہ سادھو سمیت تینا سنگھ ایم۔ اے (جو ہمارا جے دوست تھے) کو قتل ہوا۔ یہ لوگ حالات معلوم کرنے کے لئے نا بھہہ پیچھے۔ ان لوگوں نے بھی ہمارا جے کو مشورہ دیا کہ گورنمنٹ کی پروا نہ کی جائے۔ تمام بلکھ قوم آپ کے لئے مرے گی۔ ان دو بار ٹیوں (ایک گورنمنٹ سے صلح کرنے کے حق میں اور دوسری گورنمنٹ کی پروا نہ کرنے کا مشورہ دینے والی) کے درمیان ہمارا جے کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ صبح گورنمنٹ سے صلح کرنے کے حق میں ہیں۔ تو شام کو اس کے خلاف ہمارا جے کئی روز تک اس ذہنی کش کش میں مبتلا رہے۔ آخر ان تمام لوگوں پر آپ کے سابقہ انا بقی سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ کی رائے غالب آئی۔ سر پرنسپل ایجنٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ ان کے مشورہ سے کرنل منجن ایجنٹ گورنر جنرل پنجاب سٹیٹس کو میٹلے کے لئے خط لکھا گیا۔ کرنل منجن اُس وقت کسولی میں مقیم تھے۔ ان کا جواب آیا کہ فلاں دن کسولی میں مل سکتے ہو۔ اس جواب کے آنے کے بعد اکالی لیڈروں کا مشورہ پھر غالب آگیا۔ ہمارا جے نے پھر چاہا کہ وہ کرنل منجن سے نہ ملیں۔ اس کے بعد بھائی کا ہن سنگھ نے پھر کہا کہ میٹلے کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد کرنل منجن سے نہ ملنا زیادہ مصائب کا باعث ہو گا۔ ہمارا جے نے پھر اپنا خیال بدل لیا۔ آخر ملاقات کے لئے ہمارا جے صبح اپنے پرائیویٹ سکریٹری و چند اہلکاروں کے موٹر میں کسولی تشریف لے گئے۔ کسولی جب پہنچے اور ملاقات ہوئی تو کرنل منجن نے بغیر کچھ سٹے سب سے پہلے ہمارا جے سے کہا کہ آپ بطور ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب ہمارا جے کو مطلع کرتے ہیں کہ کیا تو گدڑی سے خود بخود دستبردار ہو جاؤ۔ ریاست نا بھہہ ہی نہیں بلکہ پنجاب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو اور معزوری کے زمانہ میں آپ کو ریاست نا بھہہ کے مالکان کا دس فی صدی بطور الاؤنس ملے گا۔ اور اگر یہ شرائط منظور نہیں۔ تو کھٹکی عدالت میں معمولی کمزموں کی طرح مقدمہ چلانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس عدالت میں آپ کے جو جرائم ثابت ہوں گے۔ ان کی آپ کو معمولی کمزموں کی طرح سزا دی جائے گی۔ چاہے وہ قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا جے نا بھہہ اس وقت تک حالات کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کو خیال بھی نہ تھا کہ ایجنٹ گورنر جنرل یہ کہے گا۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل کے اس فوش پر بھی آپ نے ہی سمجھا۔ کہ کرنل منجن صرف دھمکی دے رہے ہیں اور خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ گورنمنٹ اسیانہ کرے گی۔ ہمارا جے نے جواب دیا کہ آپ کے لئے ایسا کہنا مناسب نہیں۔ میں تو آپ کے ساتھ درستانہ تعلقات کے لئے ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ کرنل منجن نے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں گورنمنٹ کی اتھارٹی سے کہہ رہے ہیں۔ مذاق نہیں کر رہے۔ اگر آپ چاہو تو سر جان تھا میں پرنسپل سکریٹری سے ٹیلی فون پر بات کر لو۔ چنانچہ کسولی سے سر جان تھا میں کا شملہ میں ٹیلی فون نمبر ملا گیا۔ اور سر جان سے بات ہوئی۔ تو سر جان نے کہا کہ کرنل منجن جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ لارڈ ڈریٹنگ وائسرائے کے حکم کے مطابق کہہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں۔ سر جان تھا میں سے ٹیلی فون کرنے کے بعد ہمارا جے کو یقین ہوا کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اور تباہی بالکل قریب ہے۔ چنانچہ ہمارا جے کے داغ پر اس گفتگو کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اور نا بھہہ واپس آتے ہوئے ہمراہی اہلکاروں نے محسوس کیا کہ ہمارا جے اپنے دماغی توازن سے محروم ہو چکے ہیں۔

نا بھہہ پہنچنے کے بعد شہر میں مٹی گٹھائیں چھا گئیں۔ چاروں طرف حسرت برس رہی تھی۔ اہلکاروں کے

پھر مشورے شروع ہوئے۔ کچھ لوگ اس بات کے حق میں کہ دستبرداری کو لیبیک کہا جائے کچھ لوگ یہ چاہتے کہ گورنمنٹ کی پردہ دانی جائے۔ چنانچہ کسولی جانے سے پہلے زہارا جہ کی رائے دن میں دوبار بدلتی تھی۔ یعنی صبح کچھ اور شام کچھ۔ اب ایک ایک گھنٹہ کے بعد بدلتی مشورے ہوتی یعنی اگر ہمارا جہ اب دستبرداری کے لئے تیار ہیں۔ تو ایک گھنٹہ کے بعد اس کے خلاف اور مقدمہ چلوانے کے حق میں۔ اور پھر ایک آدھ گھنٹہ کے بعد دستبرداری کے لئے تیار۔ کرنل مینج نے جواب کے لئے چند دن کی جہالت دی تھی۔ ہمارا جہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ یہ میعاد ختم ہو رہی تھی۔ لیما نڈر آئے شروع ہوئے۔ تو آخر کرنل مینج کو خط لکھا گیا۔ جس میں ہمارا جہ نے شرائط قبول کر لیں۔ یہ خط ہمارا جہ کے انگریز موٹر گیرج سپرٹنڈنٹ مسٹر اوگرڈی ریجو مسٹر اوگرڈی ممبر پارلیمنٹ کے بھائی تھے کہ دیا گیا کہ وہ موٹر میں کسولی جاکر کرنل مینج کو دیں۔ مسٹر اوگرڈی شام کو نا بھ سے روانہ ہوئے رات کو انھیں انبالہ چھاؤنی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔ اور صبح کسولی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ مسٹر اوگرڈی کے نا بھ سے روانہ ہونے کے بعد ہمارا جہ کے خیال میں پھر تنبیہی پیدا ہوئی۔ چنانچہ رات کو ایک تیز رفتار موٹر میں دو اہلکار انبالہ چھاؤنی بھیجے گئے کہ وہ اوگرڈی کو صبح خط داپس لے آئیں۔ یہ لوگ انبالہ چھاؤنی پہنچے۔ اور اوگرڈی سے ہوٹل میں ملے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ اوگرڈی کو داپس آنے کے لئے کہتے۔ انھوں نے اوگرڈی سے کہا کہ کسولی جلدی چلے گا۔ تاکہ تم کو داپس لانے کے لئے کوئی اور شخص نہ آجائے۔ اوگرڈی صبح سورج نکلنے سے پہلے انبالہ چھاؤنی سے چلا۔ تین چار گھنٹہ میں کسولی پہنچ گیا۔ اور اس نے ہمارا جہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستبرداری کا اقرار نامہ کرنل مینج کے حوالہ کر دیا۔ کرنل مینج نا بھ کے لمحہ لمحہ کے حالات سے واقف تھے۔ اور ہمارا جہ کے بعض معتدز بن اہلکار ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ اس خط کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے۔ خط کے پہنچنے ہی انھوں نے انبالہ چھاؤنی کے فوجی افسروں سے فوج تیار کرنے کے لئے ٹیلی فون پر کہا۔ شملہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ٹیلی فون کر کے مسٹر اوگلوی ریجو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈیفنس سکرٹری تھے کہ انبالہ بھیجنے کے لئے کہا۔ انبالہ پہنچنے کے بعد کرنل مینج مع مسٹر اوگلوی اور گورکھا، انگریزی پلٹن کے پٹیل سینجے۔ دہلی تھوڑی دیر قیام کیا۔ اور مشورے ہوئے اور یہ تمام قافلہ رات کو چار بجے نا بھ پہنچ گیا۔ نا بھ پہنچنے کے بعد گورکھا اور انگریزی پلٹن شہر کے دروازوں پر، قلعہ پر، خزانہ پر، بارود خانہ پر، نا بھ کی ریاستی پلٹن کی بازوؤں پر اور ہیرا محل (جہاں ہمارا جہ رہتے تھے) کے ارد گرد تعینات کر دی گئی۔ کیونکہ کرنل مینج کو ہمارا جہ نا بھ کے بعض غدار اہلکاروں نے اطلاع دی تھی کہ اکالی بہت بڑی تعداد میں مقابلہ کے لئے نا بھ پہنچ چکے ہیں۔ جگہ جگہ انگریزی اور گورکھا فوج مقرر کرنے کے بعد کرنل مینج مع مسٹر اوگلوی اور ایک فوجی افسر ہیرا محل کے باہر کے پھاٹک پر گئے اور پہرہ والے سپاہی سے کہا کہ آپ پولیس ایجنٹ ہیں۔ ہمارا جہ سے ملنے کے لئے محل میں جانا چاہتے ہیں۔ پہرہ والے نے جواب دیا کہ جب تک ہمارا جہ کا حکم نہ ہو۔ وہ اندر نہ جائیں گے۔ اجازت نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس پہرہ والے نے محل کے اندر سے ہمارا جہ کے ڈی۔ سی ڈاکٹر دیپام سنگھ کو بلایا۔ اے۔ ڈی۔ سی ہمارا جہ کے پاس گیا اور اطلاع کی کہ کرنل مینج آئے ہیں۔ ہمارا جہ نے کہا اے۔ ڈی۔ سی کہ کرنل مینج ہمارا جہ کے پاس پہنچے۔ تو آپ نے ہمارا جہ سے کہا کہ نا بھ چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائیے۔

میں اس روز صبح چھ بجے کے قریب اپنے مکان پر ضروریات سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک آدمی میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ شہر کے دروازوں پر انگریزی فوج کا پہرہ ہے۔ اور شہر میں بھی

گورکھا فوج بدروہوں کے ساتھ گشت نگار رہی ہے۔ یہ خبر میرے بے باطل خلاف توقع تھی۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور حالات معلوم کرنے کے لئے بازار میں گیا۔ تو دیکھا کہ جگہ جگہ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور تعجب و پریشانی کی حالت میں ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اصل حالات کا کس سے پتہ لوں۔ ایک دوست کے ہاں گیا۔ تو وہاں معلوم ہوا کہ کرنل منچن آٹھ بجے قلعہ میں ایک شاہی دربار کر رہے ہیں۔ جہاں گورنمنٹ کا اعلان سنایا جائے گا۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ ہر سرکاری ملازم اس دربار میں موجود ہو۔ اور میرا محل میں کسی شخص کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ میں پریشان تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اپنے مکان پر واپس آیا۔ اتنے میں ایک بنگالی دوست سٹریٹری پر شاہ سوار دھونا بھہ سکر بیٹھ میں اسٹنٹ سکرپٹی تھے آئے وہ بھی پریشان تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے کہا کہ جہاں ملاج تباہ ہوا۔ وہاں کشتی کی سواریاں بھی غرق ہوں گی۔ ہمارا جہ کی ذاتی دوستی اور ہرماتی کے باعث ہم لوگ یہاں تھے۔ اب یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک دو اور دوست آئے چونکہ حکم تھا اس لئے ہم لوگ قلعہ میں پہنچے۔ وہاں ریاست کے تمام ملازم جمع ہو رہے تھے اور دربار ہال میں کرسیاں بچا دی گئی تھیں ہر شخص کا چہرہ اُداس اور اترا ہوا تھا کرنل منچن مسٹر اوگلوی کے ساتھ دربار میں آئے۔ درباری کرسی پر بیٹھے۔ تو آپ نے بیٹھے ہی فوراً اعلان کیا کہ ہمارا جہ نا بھگتسی سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص آئندہ ہمارا جہ کو ریاست کا حکمران نہ سمجھے۔ اور جو شخص آئندہ ہمارا جہ کا دفا شعار ہو گا۔ یا ان کے ساتھ تعلق رکھے گا۔ اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس دربار میں ہی اہلکاروں سے پتہ چلا کہ ہمارا جہ فوج کے قریب میرا محل سے بذریعہ موٹر ہمیشہ کے لئے نا بھ سے روانہ ہو جائیں گے۔

قلعہ سے چلے کے بعد میں پریشان تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص میرا محل جا نہیں سکتا۔ میں ہمارا جہ نا بھ کے سرت ذاتی تعلقات کے باعث نا بھ میں آیا اور ملازم ہوا۔ میرا سولے ہمارا جہ کے کسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمارا جہ اس حالت میں جلا وطن کیے جا رہے ہیں کس قدر کیمینہ پن اور فرض ناشناسی ہوئی رہیں ان کی روانگی کے وقت بطور ہمدردی میرا محل بھی نہ جاؤں۔ میں قلعہ سے اپنے گھر کو چلا جا رہا تھا۔ اور میرا بہن ان خیالات میں غرق اور پولیٹیکل ایجنٹ کے حکم اور ہمارا جہ کو اوداع کہنے کی فرض شناسی کی کش کش میں مبتلا تھا۔ میں اس پریشانی اور آسودوں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے مکان کے قریب درج میرا محل کے راستہ میں تھا پہنچا۔ تو میرے پاؤں نے گھر کی طرف چلنے سے انکار کر دیا۔ میں سیدھا میرا محل کو جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ میرا محل کے باہر کے پھاٹک پر پہنچا۔ تو پہرہ والے نے پہلے تو بندہ دق پر ہاتھ رکھ کر حسب دستور سلیوٹ کیا اور ریاست میں دستور تھا کہ پہرہ والے ہر اہلکار اور باری تنخواہ کے ملازم کو سلیوٹ کرتے تھے پھر کہا کہ اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا میں ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں۔ اور مجھے محل میں سے آدمی بھیج کر طلب کیا گیا ہے۔ میرے اس جواب پر پہرہ والے نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اندر چلا گیا۔ تمام محل اُداسی اور حسرت کا مگر تھا۔ ہر شخص غمزدہ اور مستقبل سے نا آشنا جیسے کشتی بھنور میں ہو۔ اور نہ کہا جاسکتا ہو کہ نتیجہ کیا ہو گا۔ میرا محل کے نیچے ہمارا بی کے بڑے بھائی مراد علی سنگھ۔ مراد کو دربال سنگھ پر ابیوٹ سکرپٹری ہمارا جہ کے ٹائیسٹ باؤنٹ سنگھ اور ہمارا جہ کے کچھ ذاتی ملازم کھڑے تھے۔ میں بھی غمزدہ حالت میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے پہلے کرنل منچن اور مسٹر اوگلوی دفتر محل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ مجھے وہاں پہنچے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ اوپر سے پہلے ہمارا بی اور نیچے اور بعد میں ہمارا جہ۔

کر نل منجن اور مسٹر اوگلی وغیرہ انگریزوں کے ساتھ نیچے اترے۔ دو روز رانس موٹر گاڑیاں تیار تھیں ایک سیاہ رنگ کی اور دوسری سفید۔ پہلے ہارانی اور نیچے اترے۔ جو سفید رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ اس کے بعد ہاراجہ سیاہ رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ تو کر نل منجن نے ایک انگریز انسپکٹر پولیس کو جو اہلالہ سے ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ ہاراجہ والی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ انگریز انسپکٹر موٹر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور یہ گاڑی بھی ہارانی والی گاڑی کے بعد روانہ ہو گئی۔ یہ منظر کس قدر دردناک تھا۔ نا بھہ کا حکمران اپنی ریاست کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جلا وطن ہو رہا ہے۔ مگر اس کے سینکڑوں خاندانی اہلکاروں۔ بڑی بڑی تنخواہ پانے والے ملازمین۔ دروازا۔ اور ساتھ مرٹنے کا دم بھرنے والے نکلخو اردوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں۔ جو اس کو الوداع کہنے کے لئے ہیرا محل پہنچنا یا کم از کم راستہ میں ترک پہنچی الوداع کہتا۔

ہاراجہ کے جانے کے بعد ہیرا محل کے ملازموں سے جو حالات معلوم ہوئے۔ ان میں ایک دل چسپ واقعہ بھی ہے کہ ہاراجہ جب کسلی سے واپس آئے اور ان کو معزنی کا یقین ہو چکا تو آپ نے اپنی بیچ کی تمام خالیں۔ اپنے دوستوں کے تمام پچھلے خطوط۔ اور راز کے تمام کاغذات الماریوں کو خالی کر کے ہیرا محل کی سب سے اوپر کی چھت پر منگائے اور ان کو آگ لگا دی ان کاغذات کے ضائع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائیں۔ کیونکہ ہاراجہ انتہائی نیشلسٹ تھے۔ اور ان کاغذات میں خط و کتابت کی وہ تمام خالیں تھیں جو ہندوستان کے نیشلسٹ لیڈروں کے ساتھ مختلف موضوع پر آپ کے ساتھ ہوئی کاغذات کا یہ ڈیپو رینڈرہ میں من ہوگا۔ جب یہ ڈیپو جل کر خاک ہو گیا۔ اور اس کی راکھ کو اٹھایا جا رہا تھا۔ تو اس میں سے سونے کی کئی ٹہنیاں پائی گئیں۔ ان گینوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ ان کاغذات میں کئی لاکھ روپیہ کے کرنسی نوٹ بھی جل گئے۔ اور یہ گینیاں اور نوٹ لکھ نا بھہ (موجودہ ہاراجہ نا بھہ) کے پیدا ہونے پر رعایا کے لوگوں اور ہاراجہ کے دوستوں نے تمام ہندوستان سے بطور نذر بھیجے تھے۔ اور ہاراجہ نے ان کو اس طرح ہی لفافوں کے اندر خطوط کے ساتھ بطور یادگار رکھ دیا تھا۔ ہاراجہ کی معزنی اور جلا وطنی کے بعد اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہاراجہ کے ملازموں اور اہلکاروں میں تو سہ فی صدی لوگ ہاراجہ کے دشمن ہو گئے۔ ان میں ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ وہ ہاراجہ کے بعد ہاراجہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ غناری کرے۔ تاکہ انگریز ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلی کا منظور نظر ہو۔ پانچ چھ روزان انقلابات کو دیکھتا رہا۔ اور حیران تھا کہ وہ لوگ جو ایک ہفتہ پہلے ہاراجہ کے خوشامدی تھے۔ آج سب سے بڑے دشمن ہو رہے ہیں کسی کا نہ کوئی ضمیر ہے۔ نہ ایمان۔ چند لوگ جو ہاراجہ کے فی الحقیقت ناشعاً تھے گھر میں خاموش بیٹھ گئے میرے لئے نا بھہ میں رہنا کیونکہ مناسب یا ممکن تھا جب کہ میں صرف ہاراجہ کے باعث نا بھہ میں آیا۔ اور اب ہاراجہ ہی جلا وطن ہو گئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کروں۔ اور کہہ جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ نا بھہ سے چلا جاؤں۔ سب سے پہلے ڈیرہ دون پہنچوں ہاراجہ مصیبت میں ہیں۔ اگر میری ان کو ضرورت ہو۔ اور میں ان کے لئے مفید ہو سکوں۔ تو ان کے پاس رہوں در نہ لاہور جا کر کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر لوں۔ اپنی روانگی کے دن میں دوستوں سے ملنے کے لئے گیا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ درج ہاراجہ کے اتالیق رہ چکے تھے۔ سکھوں میں بڑی پوزیشن کے لیڈر۔

کئی کتابوں کے مصنف اور ادبی ذوق کے بزرگ تھے) سے بھی ملنے کے لئے گیا۔ بھائی صاحب مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آج رات جا رہا ہوں۔ اس لئے ملنے آیا۔ پھر نہ معلوم زندگی میں ملنے کا کب اتفاق ہو۔ بھائی صاحب نے پوچھا کہان جاؤ گے۔ میں نے کہا، شاید لاہور کے کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر دوں۔ بھائی صاحب نے مشورہ دیا کہ میں جاؤں تو استعفیٰ دے کر۔ بغیر استعفیٰ نہ جاؤں۔ تاکہ جانے کے بعد کوئی کارروائی میرے خلاف نہ ہو سکے۔ بھائی کا میں سنا کہ بہت اچھے سیاست دان تھے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا۔ گھر پر آیا۔ فلسکیپ کے کاغذ پر استعفیٰ لکھا۔ اور استعفیٰ لے کر شام کو مسٹر اوگلوی کے پاس پہنچا۔ مسٹر اوگلوی اس وقت دوسرے انگریزوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں پہنچا۔ تو وہ موٹر میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لئے باہر جانے والے تھے۔ میں نے وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے جاتے ہی ان کو استعفیٰ دیا۔ انھوں نے پوچھا، ملازمت کیوں چھوڑتے ہو۔ میں نے کہا۔ میں یہاں صرف ہمارا جہ کے ذاتی تعلقات کے باعث آیا تھا۔ اب ہمارا جہ یہاں سے چلے گئے۔ میرا یہاں کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ کسی سے میرا واسطہ ہے۔ مسٹر اوگلوی نے کہا کہ نہیں نا بھیرا راست کو اب اچھے اور لائق ملازموں کی ضرورت ہے۔ میں استعفیٰ نہ دوں۔ میں نے کہا کہ میں ہمارا جہ کے جانے کے بعد ملازمت کرنا غیرت اور حیثیت کے خلاف اور ذلت سمجھتا ہوں۔ اس لئے میرا استعفیٰ منظور کر لیا جائے۔ مسٹر اوگلوی نے مجھے پھر سمجھایا، اور جب میں نہ مانا۔ تو آپ نے میرا استعفیٰ رکھ لیا اور کہا کہ دو ہفتہ کی رخصت منظور کی جاتی ہے۔ دو ہفتہ کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے گا۔ رخصت کی اس منظوری کے بعد میں واپس گھر آیا۔ میرے گھر میں فرنیچر وغیرہ سامان بہت کافی تھا۔ مجھے یہی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ سامان کہاں لے جانا ضروری اور مختصر سامان اپنے ساتھ لیا۔ باقی سامان اسی مکان میں بند کر کے ایک دوست پنڈت دیونا سنگ کے سپرد کیا۔ اور رات کی گاڑی سوار ہو کر اگلے روز ڈیرہ دون ہمارا جہ کے پاس پہنچا۔ ہمارا جہ سے ملا اور کہا کہ اگر آپ کو میری ضرورت ہو اور میں مفید ہو سکوں تو تنخواہ کا کوئی سوال نہیں۔ بغیر تنخواہ جب تک آپ چاہیں میں آپ کے پاس رہوں گا۔ اور اگر آپ میرا یہاں رہنا مناسب نہ سمجھیں۔ تو میں لاہور چلا جاتا ہوں وہاں کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر لوں گا۔ ہمارا جہ نے کہا کہ اس معزولی کے خلاف اکالی ایجنیشن شروع ہو چکی ہے۔ اگر میں ہمارا جہ کے پاس رہا تو گورنمنٹ شاید یہ خیال کرے کہ اکالیوں اور ہمارا جہ کے درمیان میں ایجنیشن پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہوں۔ اس لئے دو تین ماہ کے لئے اپنے گھر چلا جاؤں۔ اور دو تین ماہ کے بعد ڈیرہ دون آکر پھر ہمارا جہ کے پاس رہوں۔ اس پروگرام کے فیصلہ کے بعد ہمارا جہ نے مجھے نظام دکن کے پاس ایک ضروری پیغام دے کر حمید آباد بھیجا۔ وہاں میں ہمارا جہ کے خسر بھیرا سردار پریم سنگھ (جو راناں نظام گورنمنٹ کے ملٹری سیکریٹری تھے) سے ملا۔ دو تین روز وہاں رہا۔ نظام دکن سے کیا توقع تھی۔ وہ خود سہمے بیٹھے تھے۔ واپس ڈیرہ دون پہنچا۔ دو تین روز وہاں رہا۔ اور پہلے نا بھہ جانے۔ وہاں سے گھر کا سامان مال گاڑی میں اپنے دلہن حافظ آباد بھجوا دئے اور پھر خود اپنے وطن چلے جانے کا پروگرام تیار کر لیا۔ ہمارا جہ نے کہا کہ میں نا بھہ نہ جاؤں۔ شاید وہاں گزرتاری ہو جائے۔ میں نے کہا کہ میری گزرتاری کیونکر ممکن ہے۔ جب کہ میرا کسی معاملہ سے تعلق ہی نہ تھا۔ ہمارا جہ کے کہنے کا میں نے خیالی نہ کیا۔ ڈیرہ دون سے سوار ہو کر رات کو نا بھہ پہنچا۔ مکان پر گیا صبح دو تین آدمی لگا کر سامان بندھوانا شروع کیا۔ اس عرصہ میں جوں جوں دوستوں کو میرے آنے کا علم ہوا وہ

ملنے کے لئے آتے رہے۔ فوج کے قریب سردار گوردیال سنگھ رجوہاراج کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ اور برٹش ایڈمنسٹریشن کے زمانہ میں وہاں ہوم ممبر ہوئے) سے ملا۔ بارہ بجے کے قریب دوسرے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا کہ نیچے باہر سے کسی نے آواز دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نیچے سپرنٹنڈنٹ پولیس مع دو سب انسپکٹروں اور کئی کنسٹیبلوں کے موجود ہیں۔ مجھے نیچے آنے کے لئے کہا میں نیچے گیا۔ تو انھوں نے بتایا کہ میں ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہوں۔ گرفتار کرنے کے بعد یہ لوگ مجھے لے گئے۔ کئی ماہ بغیر مقدمہ قید رکھا گیا۔ میرے دوستوں نے واسرائے پر اپنا اثر استعمال کیا۔ اور آخر واسرائے لارڈ ریڈنگ کے حکم سے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا

ان حالات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ریاستوں کی رعایا اور وہاں کے سرکاری ملازم اور اہلکار چونکہ شخصی حکومت کے باعث مطمئن نہیں تھے۔ ان لوگوں کو دایان ریاست کے ہمدرد جاننا کہنا ایک غلطی تھا۔

## خودکشی کرنا بزدلی نہیں

حیدر آباد (دکن) اور ڈبرہہ دونوں سے واپس آنے کے بعد جب نا بھہ میں میری گرفتاری ہوئی۔ تو پولیس مجھے وہاں کی ایک نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادیات میں لے گئی۔ یہ بلڈنگ کئی لاکھ روپیہ کے مصارف سے بنائی گئی تھی اس کے لئے نصف روپیہ تو ہمارا جہنا بھہ نے دیا تھا۔ اور نصف پبلک سے چندہ کے ذریعہ جمع کیا گیا تھا۔ اس میں بہت وسیع ہال اور متعدد چھوٹے چھوٹے کابینے مارہائشیں کرے ہیں جن کے ساتھ غسل خانے اور باورچی خانے بھی ہیں یہ عمارت ریاست کی سرکاری اور پبلک دونوں ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہے یعنی سرکار کے یہاں بھی اس میں ٹھہرتے ہیں اور پبلک میں کسی کی شادی وغیرہ ہو۔ تو راتیں بھی اس میں قیام کرتی ہیں۔ چنانچہ سٹرپوشم و اسٹنڈن (پریزیڈنٹ) نا بھہ میں ملازم تھے۔ تو اس بلڈنگ میں ہی رہتے تھے۔ مسٹر اس رنگا آکر بھی طویل مدت تک اس میں رہے۔ اور میں بھی جب ملازم ہوا تو شروع میں دو ماہ کے قریب اس بلڈنگ میں ہی سرکاری یہاں کے طور پر رہا تھا۔ جب میری گرفتاری ہوئی۔ تو اس وقت لالہ نتھورام جو انگریزی علاقہ میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ اور نا بھہ کے اس انقلاب کے بعد فوراً ہی ریاست نا بھہ کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کیئے گئے (جو بعد میں رائے بہادر اور دہلی میں جی مجسٹریٹ تھے) کا دفتر اور رہائش بھی اس بلڈنگ میں ہی تھی۔ چنانچہ پولیس نے مجھے لالہ نتھورام کے سامنے پیش کیا۔ تو آپ نے بتایا کہ میں ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہوں میں نے الزام اور دفعہ پوچھی۔ تو جواب ملا کہ کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔ چنانچہ پولیس اس بلڈنگ کے کونہ کی ایک کابینہ میں مجھے لے گئی۔ میرا بسترہ منگایا گیا اور چار کنسٹیبل اور ایک ہیڈ کنسٹیبل کا پہرہ لگا دیا گیا کہ نہ تو میں اس نظر بندی سے باہر جاؤں اور نہ کوئی شخص مجھ سے بات چیت کر سکے۔

ریاستی پولیس کے کنسٹیبل جن کی تمام زندگی ہی غلامی میں گزری۔ شاید آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ یہ لوگ لگائے گئے تھے۔ مجھے پھر پہرہ کے لئے۔ مگر ان لوگوں کی ہمدردی میرے ساتھ تھی۔ پچارے اس کوشش میں رہتے کہ میں خوش رہوں۔ یہ لوگ شہر میں درپردہ طور پر میرے دوستوں کے پاس میرے پیغام لے جاتے اور لاتے۔



چنانچہ اس نظر بندی اور کڑی نگرانی میں ہی میرے اور ہمارا جہ تا بھ کے درمیان میرا پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک آدمی مقرر کر لیا گیا جو تا بھ سے ڈیرہ دون جانے اور ڈیرہ دون سے تا بھ آئے میں ہمارا جہ کو تا بھ کے تعقیب کے ساتھ تمام حالات کی اطلاع میں اس حراست یا نظر بندی سے ہی بھجواتا رہا۔ کئی برٹش ایئر مسٹرین ہمارا جہ کے خلاف کیا کچھ کر رہی ہے میں اس بلڈنگ میں تین ماہ کے قریب رہا۔ پہلے چند روز مجھے ذہنی کوشت ہی محسوس ہوئی، ایک سکھ کنسٹیبل نے رائے دی کہ میں سکھنی صاحبہ کو گرفتار کر لیتا ہوں صاحبہ کا ایک ہتھ پکڑ کر دوں۔ چند روز سکھنی صاحبہ پر حصار رہا، مگر ہاتھ کرنے کو جی نہ چاہا۔ ایک تراس کی وجہ یہ کہ میں نے زندگی میں نہ کبھی عبادت کی اور نہ کبھی پٹھ کیا، دوسرے اصول بھی کسی پٹھ یا ملتر یا کلام کو بار بار پڑھنا حاصل سمجھتا ہوں۔ وقت کو گزارنے کے لئے میں نے ہندی پڑھنا شروع کی۔ مکان پر میرے پاس ایک نہایت خوبصورت سپینیل نسل کی لمبے کانوں والی سیاہ رنگ کی کتیا تھی جس کا نام رانی تھا۔ میری گرفتاری کے بعد یہ رانی میرے مکان کے سامنے ایک گھر میں رہتی تھی۔ میں نے کنسٹیبل کیس کر اس کو اپنے پاس منگایا۔ سپینیل نسل کے کتے فطرتاً بہت محبت کرنے والے جانوروں، اس رانی کو نہلانے، کھانا کھلانے اور اس کے ساتھ کھیلنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ اس کے علاوہ قاش اور کنسٹیبلوں کے ساتھ گپ بازی میں میرا وقت اچھی طرح گزارا رہا۔

مجھے اس بلڈنگ میں نظر بندی یا قید ہونے چند روز ہوئے تھے کہ ہمارا جہ کا ایک نفر یعنی ذاتی ملازم بھان سنگھ گرفتار کیا گیا۔ اور اس کو میرے کمرے کے قریب ہی اس بلڈنگ کے ایک کمرہ میں رکھا گیا۔ میں نے ہندیا تو معلوم ہوا کہ اس شخص نے ہمارا جہ کے خلاف بہت سخت بیان دیا ہے۔ اور اپنے بیان میں ہمارا جہ کے خلاف سنگین الزامات لگائے ہیں، میں نے اس بھان سنگھ کے ساتھ پیغام بازی شروع کر دی، اور موقع دیکھ کر کبھی کبھی اس سے بات بھی کر لیتا۔ کیونکہ اس کے اور میرے درمیان چند کمرے کا فاصلہ قطعاً نہیں ہے ایک روز اس سے پوچھا کہ آیا یہ واقعہ سچ ہے کہ تم نے ہمارا جہ کے خلاف بیان دیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں دیا ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ غلطی کیوں کی۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے اس کو بہت پٹایا تھا۔ چنانچہ پانچ سات روز کی گفتگو اور میرے سمجھانے کے بعد یہ اپنے بیان کی تردید کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اس نے ہمارا جہ کے نام ایک خط لکھا کہ اس نے جو بیان ایئر مسٹرین کے پاس دیا ہے بے بنیاد اور غلط ہے۔ اور اس سے یہ جھوٹا بیان جبراً لیا گیا۔ یہ خط میں نے اس سے لے کر ڈیرہ دون ہمارا جہ کے پاس بھیج دیا۔

میں نے اس نظر بندی یا قید کی حالت میں لالہ نتھورام سے کئی بار پیغام کے ذریعہ پوچھا کہ میری نظر بندی کی وجہ کیا ہے۔ کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ آخر ایک روز لالہ نتھورام نے مجھے ملوا بھجلا میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے بتایا کہ مجھ پر الزام یہ ہے کہ میں نے ہمارا جہ تا بھ کے ساتھ مل کر ہمارا جہ پٹیلہ کے خلاف بغاوت کی۔ اس الزام میں ہمارا جہ پٹیلہ نے میرے وارنٹ گرفتاری جاری کئے ہیں۔ یہاں پٹیلہ ایکسٹرا ڈیوٹی ایکٹ کے مطابق میرے تا بھ سے پٹیلہ نے بھیجے جانے کا مطالبہ کر رہی ہے اور معاملہ ایکسٹرا جرنل ریاستہائے پنجاب کے زیرِ غور ہے۔

لالہ نتھورام کے یہ الفاظ سن کر مجھے احساس ہوا کہ معاملہ معمولی نہیں۔ جیسا کہ میں سمجھتا تھا۔ اگر پٹیلہ کے حوالہ کیا گیا۔ تو زندگی میں پٹیلہ کے جیل سے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ اور چونکہ ہمارا جہ پٹیلہ میرے دشمن ہیں۔ پٹیلہ

جیل میں جو عذاب دیئے جائیں گے ان کو برداشت کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

لالہ تنخواہ کے ٹھہرے یہ اطلاع سن کر میں اپنی نظر بندی کے کمرہ میں واپس آگیا۔ بہت سخت بے چین تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ میری فطرت ہے کہ جب تک کسی شکل کے متعلق پروگرام تیار نہ کروں۔ نہ کھا سکتا ہوں نہ سو سکتا ہوں پروگرام تیار کرنے کے بعد مستقبل سے بالکل بے پردا ہو جاتا ہوں۔ میں رات کو سو بھی نہ سکا۔ اور نہ کھانا کھایا۔ سامنے موت نظر آرہی تھی اور موت ہی نہیں بلکہ موت سے ہزار گنا زیادہ ہیبت ناک پشیمانہ جیل کے عذاب کا خوف تھا۔ میں سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس نظر بندی سے فرار ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر فرار نہ ہو سکوں۔ تو پشیمانہ کو حوالہ کئے جانے سے پہلے اپنی زندگی کو ختم کروں۔ دین اصولاً خودکشی کو بُز دلی نہیں سمجھتا۔ بلکہ بہت بُری بہادری کیونکہ موت جیسی خوفناک شے سے بے گلیہ ہونا بُز دلی نہیں بہادری ہے) چنانچہ میں نے ان کنشیلوں میں سے ایک کنشیل چھوٹا سنگھ کو اپنے راز میں لیا۔ اس سے کہا کہ میرے سر میں درد ہے میں تنخواہ کی سی انیون کھانا چاہتا ہوں۔ چھوٹا سنگھ بازار سے ایک پیہ کی انیون لے آیا۔ دو دو دن کے بعد میں نے کئی بار پھر منگوائی۔ اس طرح جب یہ انیون ایک انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہوگئی تو میں نے اس کو کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں باندھ کر اس کو اپنے بکس میں رکھا اور نکلیے لیا۔ انیون کو اس طرح رکھنے کا علم سوائے میرے کسی کو نہ تھا۔

حراست سے فرار ہونے کے متعلق میں نے چھوٹا سنگھ کو راز میں لے کر اس سے مشورہ کیا۔ تو چھوٹا سنگھ نے کہا کہ رات کو جب اُس کا پہرہ ہو۔ تودہ اور میں دروں جھاگ چلیں گے جن کمرہ میں ہم تھے۔ اُن کروں کے بالکل ساتھ ایک زینہ تھا۔ یہ زینہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے اندر ایک تال لگا ہوا تھا تاکہ کوئی آجائے سکے یہ زینہ تاریک تھا۔ اور مدت سے اس کی کبھی صفائی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس راستہ سے کوئی نہ آتا تھا نہ جاتا تھا۔ چھوٹا سنگھ دوسرے کنشیلوں سے پریشیدہ اس زینہ میں گیا۔ اور اس نے تال توڑا اور تال کی جگہ ایک رتی باندھ دی گئی تاکہ باہر سے کوئی کھول بھی نہ سکے۔ اور جب ہم فرار ہوں۔ تو اس رتی کو توڑ کر اندر سے دروازہ کھول لیا جائے۔ چھوٹا سنگھ کے ساتھ فراری کا پروگرام تیار کیا۔ تو اُس نے کہا کہ نا بھ سے جانے کے لئے وہ ایک تیز رفتار اونٹ کا انتظام کر سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا کسی صورت سے موٹر کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ چھوٹا سنگھ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے مشورہ کیا کہ یہاں سے فراری کے بعد کیا میں پانچ سات روز شہر میں کسی کے ہاں پوشیدہ طور پر رہ سکتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ یہ انتظام ہو سکے گا۔ ہم یہ تمام سکیم تیار کر رہے تھے۔ مگر اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اور دانسرائے نے راکرے کا حکم دیا۔ ورنہ حراست سے فرار ہونے کے خطرہ کو بھی میں نے خودکشی سے پہلے لیک لیا تھا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہوتا۔

انیون دیکھنے کے بعد میں نے ایڈمنسٹریٹر کو ایک خط بھیجا۔ جس میں لکھا۔ کہ ہمارا جیٹیا میرے دشمن ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی یہ بے انصافی ہوگی اگر تجھے ہمارا جیٹیا لے کے حوالہ کیا گیا۔ اگر گورنمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ میں نے ہمارے نا بھ کے ساتھ مل کر فیاضیت ہمارا جیٹیا لے کے خلاف بغاوت کی ہے۔ تو اس جرم کی جو زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔ بغیر مقدمہ کے ہی اس سزا کو میں منگوانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر مجھے برٹش طاقت کے کسی جیل میں رکھا جائے۔ اور اگر گورنمنٹ برٹش جیل میں نہیں رکھ سکتی۔ اور میرا میرے دشمن ہمارا جیٹیا لے کے حوالہ کرنا ضروری ہی ہے۔ تو میں پھر چھوٹا سنگھ کو راز میں لے کر آپ میری لاش تو ہمارا جیٹیا لے کے حوالہ کر سکتے ہیں۔ مگر دیوان سنگھ کو زندہ حالت میں ہمارا جیٹیا لے کے حوالہ

نہیں کر سکتے۔ کیونکہ موت کی تکلیف کے مقابلہ پر پشیمال جیل کا عذاب ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ ایڈمنسٹریٹر کو یہ خط بھیجنے کے بعد میں نے ہمارا جہ نامہ جو کو تمام حالات لکھے۔ اور ساتھ یہ بھی لکھ بھیجا کہ اب شاید آپ سے اس جہ میں ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ اگر پشیمال بھی گیا۔ تو پشیمال حدود میں پہنچنے سے پہلے دیوان سنگھ اس دیبا میں نہ ہوگا۔ میرے اس خط کو پڑھ کر ہمارا جہ کے آفسر مکمل آئے۔ اور انھوں نے اپنے دوست ممبران اسمبلی کو خط لکھے کہ دیوان سنگھ پر اس طرح ظلم ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے وائسرائے کو لکھا۔ راجہ ہارچودھری لال چنداں بہتک راجہ بعد میں پنجاب کے منسٹر اور ممبر پنجاب پبلک سروس کمیشن ہوئے میرے بہت غلصہ اور مہربان تھے۔ اور سر جان تھا مپن پولیسکل سیکریٹری کے گرنے زسرت۔ ان کو پیغام بھیجا۔ اور تمام حالات بتائے۔ یہ سر جان تھا میں سے ملے اور دہلی میں کسی ایک دوست سر کڈری ملازم تھے۔ ان کی معرفت کو شمش کی بیٹی جو یہ ہوا کہ آخر لارڈ رڈنگ نے میرے اور ناہجہ کے نصف درجن کے قریب دوسرے اصحاب راجہ پر بھی ہمارا جہ نامہ کے ساتھ مل کر ہمارا جہ پشیمال کے خلاف سڈیشن پھیلانے یا بغاوت کرنے کا الزام تھا۔ ان کی فائل پر حکم لکھا۔ کہ اگر دیوان سنگھ اور ان دوسرے لوگوں نے ہمارا جہ پشیمال کے خلاف سڈیشن میں حصہ لیا ہے تو اپنے آقا ہمارا جہ نامہ کے حکم سے۔ اور ان کا یہ فعل اپنے آقا کی وفا شعاری کے خیال سے قابلِ تعریف تھا۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ اس لئے فوراً راکھا گیا جائے۔ لارڈ رڈنگ نے یہ حکم چار میں لکھا۔ جب کہ آپ ہرما کے دورہ سے واپس ہندوستان آ رہے تھے (اس زمانہ) براہ ہندوستان سے الگ نہ ہوا تھا۔ اور براہ طور ایک صوبہ کے وائسرائے کے ماتحت تھا) میرا ایک آدمی دہلی میں اطلاعوں کے لئے موجود تھا۔ وائسرائے جب دورہ سے واپس دہلی پہنچے تو اس کو پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک کلرک سے معلوم ہو گیا کہ وائسرائے نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ وائسرائے کے پہنچنے کے چار روز بعد مجھے یہ اطلاع نامہ میں پہنچ گئی۔ اور میں مطمئن ہو گیا۔

اس اطلاع کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ایک سب انسپکٹر پولیس میرے پاس پہنچا۔ اس نے کہا۔ کہ لالہ تنہورام کے پاس چلے۔ وہ بلاتے ہیں۔ میں نے چھوٹا سنگھ کنسٹیبل سے کہا۔ کہ میرا بسترہ اور سامان وغیرہ ہانڈہ کو تیار رکھو۔ سب انسپکٹر کو حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ حیران کہیں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا کچھ دریافت کرنے کے لئے بلایا گیا ہوں۔ ابھی تو پھر واپس آنا ہے۔ بسترہ وغیرہ کیوں بندھوا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا آپ کو علم نہیں۔ مجھے پتہ ہے۔ کہ آج میری رہائی ہوگی چنانچہ سب انسپکٹر مجھے لالہ تنہورام کے پاس لے گیا لالہ تنہورام نے ہاتھ ملایا۔ اور کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھتا تو آپ نے نہایت ہمدردی کے اوجہ میں وجہ طرح پولیس اور جیل کے آفسر کی لازمہ مہاجر کو رہا کرتے وقت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ تاکہ یہ رہائی کے بعد مخالفت نہ کرے) فرمایا بسترہ اور صاحب آپ نے بہت تکلیف اٹھائی۔ کیا کیا جائے۔ میرا فرض ایسا تھا میں نے تو ایڈمنسٹریٹر کے حکم کی تعمیل کی۔ جو آپ کو اتنا عرصہ نظر بند رکھا گیا۔ ورنہ آپ کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اب گورنمنٹ کے حکم سے آپ کو رہا کیا جانا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ میں میں ہر شخص کو فرض ادا کرنا چاہئے۔ معمولی بات ہے۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اس کے بعد لالہ تنہورام نے پوچھا کہ اب آپ کا آئندہ پروگرام رہائی کے بعد کیا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ نامہ آنے سے پہلے کاغذ سیاہ کر کے روٹی پیدا کرنا تھا۔ اور اب بھی کاغذ سیاہ کر کے روٹی پیدا کروں گا۔ لالہ تنہورام نے کہا کہ وہ دستاورد رائے ہے۔

اب کسی ایجنٹ میں حصہ نہ لیجئے۔ آپ نے بہت تکلیف اٹھائی جس نے جواب دیا۔ بد نصیبی یا غرض نصیبی سے خدا نے رزق ہی ایجنٹیشن کے ذریعہ تمہارے نوکریاں کریں۔ اگر ایجنٹیشن نہ کریں تو رونی کہاں سے کھائیں۔ جرنلزم نام ہی ایجنٹیشن کرنے کا ہے۔ لالہ فقہورام نے کہا کہ آپ صرف دوستانہ رائے دے رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ افسوس ہے کہ میں آپ کی دوستانہ رائے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ لالہ فقہورام نے مجھے سرکاری حکم سنایا کہ میں آئندہ کبھی ریاست نامہ کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ آپ نے پولیس کی ایک گارڈ طلب کی۔ یہ گارڈ مجھے رہائے سٹیشن پر لے گئی۔ میرا سامان بستر وغیرہ سٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ اور یہ گارڈ اس وقت تک ریلوے سٹیشن پر موجود رہی۔ جب تک کہ میں گاڑی میں سوار نہ ہو گیا۔ اور گاڑی چل نہ پڑی۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اگلے روز صبح میں ڈیڑھ دن پہنچا۔ ہمارا جہ سے بلا۔ تمام حالات بیان کیے۔ اور دس روز کے قریب ہمارا جہ کے پاس رہا۔

## ریاستوں کے مظالم اور پریش حکام

”ریاست“ کو جاری ہوئے دو برس کے قریب ہو چکے تھے۔ میرے پاس نالہ گڑھ سے بند لیڈر جسٹری ایک خط پہنچا۔ جو بارہ یا سولہ صفحہ کا تھا۔ اس خط میں رانی نالہ گڑھ دوجوہ راجہ نالہ گڑھ جو حال میں پٹیالہ زمین میں منسٹر تھے کی والدہ کی مصائب کا ذکر تھا کہ وہ دس قیدی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ انتہائی تکلیف میں ہیں۔ اور وہاں کا وزیر جو گورنمنٹ کا بیجا ہوا ایک سرکاری انسپکٹر تھا نہ صرف رانی کو بہت تنگ کر رہا ہے بلکہ ریاست نالہ گڑھ کو بھی روٹ رہا ہے۔ اور پبلک بے حد پریشان ہے۔ اس خط میں اس وزیر پر بہت سخت اور سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ اس خط کے ملنے پر میں سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے کچھ مجھے میں نہ آتا تھا۔ اگر ان الزامات کو شائع کرتا ہوں۔ تو مقدمہ ہونے کا خوف۔ کیونکہ الزامات چاہے سچ ہوں۔ ان کی سچائی کے متعلق ثبوت موجود نہیں تھے۔ صرف یہ خط الزامات کو عدالت میں ثابت کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ چاہے کتنی بھی ذمہ دار شخصیت کے ہاتھ کا کھلم ہوا تھا۔ میں چند روز سوچتا رہا۔ اس کے بعد ایک اور خط ملا۔ جس میں پہلے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حالات دیے گئے تھے۔ اور کچھ شمار دے دینے کے علاوہ لکھا تھا کہ رانی نالہ گڑھ کی زندگی خطرہ میں ہے۔ کیونکہ راجہ نالہ گڑھ رانی کے خلاف ہے۔ اور وزیر راجہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ اور کسی شخص کو بھی اجازت نہیں کہ وہ رانی سے مل سکے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد میں پھر غور کرنا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ جب ان حالات کے درست ہونے کے متعلق میری تسلی ہو گئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ ریاست نالہ گڑھ کے مسئلہ کو ہاتھ میں لینا چاہئے۔ اور اس وقت تک نہ چھوڑنا چاہئے۔ جب تک کہ وہاں کے مظالم کا خاتمہ نہ ہو میں نے ان خطوط میں سے الزامات کی ایک فہرست تیار کی۔ اور اس فہرست کو تائپ کرایا۔ اس فہرست کو لے کر میں شملہ گیا۔ سوامی رام چندر اس زمانہ میں کانگرس کے مشہور وکر تھے۔ اور شملہ کی ریاستوں کی پبلک میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں مصروف تھے۔ ان سے ملا۔ ان کی معرفت ریاستوں کے دوسرے واقف کاروں کو مل گیا۔ بات چیت کی۔ معلوم ہوا کہ گورنمنٹ نہ ہو۔ مگر

الزامات تمام کے تمام درست ہیں جب ان الزامات کے متعلق مجھے تعلق ہوگئی تو میں ڈپٹی کمشنر دھرم پور میں اس وقت تھے۔ اس پر سنڈنٹ بھی تھا۔ اور جس کے ماتحت ریاست نالگرہ تھی اس کے دفتر میں گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر مجھے ٹھیک نام یاد نہیں رہا۔ غالباً ان کا نام مسٹر وکیلہ تھا۔ موجود ہیں۔ میں نے پچاسی کے ہاتھ ورننگ کارڈ بھیجا۔ ڈپٹی کمشنر نے انڈر لکھا کیا۔ میں نے سب سے پہلے پوچھا۔ یہ بتائیے کہ ریاستوں کے متعلق گورنمنٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ کیا حکام جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں فی الحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ ریاستوں کی بد انتظامی۔ رشوت اور مظالم بند ہوں یا آپ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ریاستوں کے مظالم اور بد انتظامی جاری رہے۔ میری یہ بات سن کر ڈپٹی کمشنر مسکرا دیا اور کہا کہ گورنمنٹ فی الحقیقت چاہتی ہے کہ ریاستوں کی اصلاح ہو۔ ڈپٹی کمشنر کے ایسا کہنے پر میں نے اپنے حبيب سے نالگرہ کے متعلق الزامات کی ٹاپ شدہ فہرست نکالی اور ڈپٹی کمشنر کو دے کر کہا کہ آپ مجھ پر یا کسی دوسرے شخص پر اعتبار نہ کیجئے۔ کسی دوسرے صوبہ سے یا اس صوبہ سے کوئی انسر جیسے کوئی بھی نالگرہ میں نہ جاتا ہو اور جو دیانت دار اور ہوشیار ہو نالگرہ بھیجئے۔ اور معلوم کیجئے کہ یہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں یا نہیں۔ اور اگر آپ کی نسلی ہو جائے کہ یہ الزامات درست ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس ریاست کی اصلاح کے لئے قدم اٹھائیے۔ ڈپٹی کمشنر نے ان الزامات کی تحقیقات کا وعدہ کیا اور میں واپس دہلی چلا آیا۔

دہلی پہنچے مجھے تین ہفتے ہوئے تھے۔ اس ڈپٹی کمشنر کا میرے پاس تاریخ پانچواں تھا۔ میں فلاں تاریخ سوموار کے دن گیا رہے تھے ان سے بلوں میں سینچر کی رات کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اتوار کی دوپہر کو شملہ پہنچا۔ وہاں لالہ ٹھاکر داس کے پنجاب ہوٹل میں قیام کیا اس روز سو امی رانا ندر وغیرہ دوستوں سے ملا۔ سوموار کو گیا رہے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں گیا۔ ورننگ کارڈ بھیجا اور ملا تو ڈپٹی کمشنر نے بتایا کہ آپ نے گورنمنٹ ہند کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو لکھ کر وہاں سے ایک دیانت دار انسر کو بلایا تھا۔ اس کو تحقیقات کے لئے نالگرہ بھیجا وہ وہاں بغیر کسی کو اطلاع دیئے ایک ہفتہ کے قریب رہا۔ اس نے رپورٹ کی ہے کہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں۔ اس رپورٹ کو گورنر پنجاب کے پاس بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے حکم آیا ہے کہ اس وزیر کو معطل کر کے اس پر رشوت اور غلبہ وغیرہ کے مقدمات چلائے جائیں۔ چنانچہ گورنمنٹ اس کو معطل کر کے اس پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ ان الزامات کے متعلق ثبوت دیا جائے جو مقدمہ میں بطور شہادت کام آسکے۔

ڈپٹی کمشنر کے اس انکشاف کو سن کر میں مطمئن تھا اگر حیران کر کیا کروں اخبار کی مصروفیت۔ ایک دن کی فرصت نہیں۔ شملہ بھی بہت وقت کے ساتھ آیا ہوں۔ میں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ کیا آپ کا ضمیر مطمئن ہے کہ یہ الزامات درست ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے بتایا کہ ہاں الزامات درست ہیں اور گورنمنٹ مقدمہ چلانے کے لئے ثبوت چاہتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو الزامات کے درست ہونے کے متعلق یقین ہے تو میرا مقصد حل جہاں ہے۔ آپ اس وزیر کو نالگرہ سے تبدیل کر دیجئے تاکہ رانی نالگرہ اہل واپس کی پبلک کی مصائب کا خاتمہ ہو۔ ڈپٹی کمشنر نے بار بار کہا کہ گورنمنٹ صرف تبدیل کرنے پر مطمئن نہیں۔ مقدمہ چلانا چاہتی ہے اور اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے جو عدالت میں پیش ہو سکے۔ میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا کہ تو میرے پاس اس وقت کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ اتنا وقت ہے کہ نالگرہ جاکر ثبوت جمع کروں۔ میرا جو فرض تھا میں نے ادا کر دیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس طافات کے ایک ہفتہ کے اندر ہی معلوم ہوا کہ یہ وزیر جو گورنمنٹ کی ملامت میں تھلا لورن نالگرہ میں

بطور لینٹ آفیسر تھا۔ منزل کر کے مارگھٹ سے واپس برٹش علاقہ میں پہنچ دیا گیا۔ اور ناگہلک بیلک اور زانی کو اس جھلکارا بل گیا ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی اخبار نویس ذاتی لالچ اور خوف سے پسند نہ کر ظلم کو دور کرنے کے لئے قدم اٹھائے تو گورنمنٹ کے انصاف پسند حکام بھی اس ظلم کو دور کرنے میں اس کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انگریز قوم انگریز اور ہندوستانی کے درمیان انصاف نہ کرتی تھی مگر ہندوستانی اور ہندوستانی کے درمیان انصاف ضرور کرتی تھی۔ بشرطیکہ ہندوستانی ہی انصاف میں روٹا اٹکائے کا باعث نہ ہوتے۔

## اگر وال ذہنیت

دہلی میں جب روزانہ ”رعیت“ جاری تھا تو دیوبند کے ایک لالہ اوگر سین تشریف لائے۔ پہلے آپ کی بزاز کی دکان تھی۔ اور آپ نے اپنا کاروبار بند کر دیا تھا۔ آپ نے ”رعیت“ میں اشتہار دیا کہ آپ بہت تجربہ کار بزنس مین ہیں۔ اگر کوئی صاحب روپیہ لگائیں۔ تو آپ اس کے بزنس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اشتہار کے نیچے جو کہ چتر معرفت دفتر ”رعیت“ تھا اس لئے آپ اپنے خط خطا لینے کے لئے ہر روز دفتر ”رعیت“ میں تشریف لایا کرتے۔ جب کبھی آتے۔ صبح آئیں۔ دوپہر کو یا شام کو۔ دیکھتے کہ ایڈیٹر ”ریاست“ مصروف ہے۔ آپ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرتے۔ دس بارہ روز آتے رہے۔ تو آپ نے فرمایا ”سردار صاحب کیا اخبار میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ آپ اس قدر مہنتی ہو۔ اگر آپ میرے ساتھ بیٹھ چلو۔ تو وہاں تجارت کی جائے۔ مجھے بہت تجربہ ہے میرے پاس تجارت کے لئے روپیہ بھی کافی ہے۔ آپ ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم بیٹھیں میں لاکھوں روپیہ پیدا کریں گے۔“

لالہ صاحب کے اس خیال کی میں نے پر دانہ کی کیونکہ اگر روپیہ پیدا کرنے کا سوال ہوتا تو میں تین چار روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر جرنلزم کیلئے اختیار کرتا۔ لالہ صاحب اس کے بعد بھی کبھی کبھی جئے رہے۔ کیونکہ سیکار تھے۔ وقت گزارنے کے لئے ان کو کسی باتیں کرنے والے کی ضرورت ہوتی۔ اور میں بھی زیادہ محنت کے باعث تھک جاتا۔ تو لالہ جی کے ساتھ گپ بازی میں چند منٹ یا نصف گھنٹہ گزارنا ایک تفریح سمجھتا۔ کچھ روز کے بعد خواجہ حسن نظامی نے کہا کہ آپ ”رعیت“ کے لئے زیادہ گھانا برداشت نہیں کر سکتے اس لئے اخبار بند کر دیا جائے (اس اخبار کی پوزیشن یہ تھی کہ اٹھائی سو روپیہ تو میں نے دیا تھا۔ باقی روپیہ خواجہ صاحب نے اور فیصلہ یہ تھا۔ کہ ایک پورا نصف تو خواجہ صاحب کی کتابوں کا اشتہار بغیر اجرت چھپے اور ایڈیٹر ”ریاست“ اپنے خرچ کے لئے ایک دو روپیہ روز لے۔ اس کے بعد کہ نقصان ہو تو خواجہ صاحب پورا کریں۔ اور اگر نفع ہو تو دونوں برابر کے شریک خواجہ صاحب اس وقت تک چھ سو روپیہ گھانا دے چکے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اخبار بند کیا جائے کسی دوسرے کو دے دیا جائے تاکہ ایڈیٹر ”ریاست“ اس میں کام ہی کرتا رہے اور اخبار بھی زندہ رہے۔ ”رعیت“ پہلے شام لالہ کی پور ایڈیٹر ”گور و گھٹال“ نے لیا۔ وہ شاید ایک ہفتہ بھی نہ چلا سکے۔ پھر دھادی صاحب نے لیا۔ اور پھر بھینیا احسان الحق صاحب نے اور آخر اس آ

بند کر دیا گیا۔ "رعیت" کے بند ہونے پر اب پھر سوال پیدا ہوا کہ میرا مستقبل کیا ہو۔ لالہ اوگر سین ملکر تھے۔ آپ سے فیصلہ ہوا کہ دونوں تجارت کے لئے بمبئی چلیں۔ میرے پاس چونکہ سرمایہ نہ تھا۔ نہ میں بمبئی کی تجارت سے واقف تھا۔ میں نے کہا اور لالہ اوگر سین اس سے متفق ہو گئے کہ میرا حصہ نہ ہو۔ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ لوں اور ان کے ساتھ بمبئی چلوں۔ ہم لوگ بمبئی چلے گئے۔ وہاں مرچی سٹریٹ میں ایک کرد دفتر کے لئے گرا یہ پر لیا۔ لالہ اوگر سین بہت خوشیار آدمی تھے۔ کچھ قہوڑا سا فرنیچر، ایک بڑا کدو آ۔ بڑے بڑے ٹیکے کدو کے لئے سفید چادریں بھی کھاتے کتابیں۔ اور لوہے کی ایک الماری یعنی آئرن سیف۔ یہ سامان خرید لیا۔ تاکہ ہم سیٹھ بن سکیں۔ دکان کا نام سیٹھ ٹرسٹن اینڈ کمپنی رکھا گیا اس نام کے فارم چھاپے گئے۔ اور ٹیلی گرافک ایڈریس بھی ڈاک خانہ میں رجسٹرڈ دیا گیا۔

دکان کا سامان وغیرہ ٹھیک ہونے کے بعد ہم نے لاہور سے اردو کی ایک تجارتی ڈاکٹر ٹری منگائی جس میں باب کی تمام منڈیوں کے آرٹینوں اور دکانداروں کے نام اور پتے تھے۔ ان پتوں پر میں نے خط لکھنے اور سرکلر بننے بھیجنے شروع کئے۔ کہ یہ دکان بہت قابل اعتماد ہے۔ اگر کوئی صاحب بمبئی سے کچھ منگانا چاہیں تو ہم بہت کم آرٹھسٹ پر یہاں سے سامان بھیجتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایک ہزار کے قریب سرکلر لیٹر بھیجے تھے۔ آرڈر آنے شروع ہوئے۔ کوئی شخص مصر کی کھجوریں منگاتا ہے، کوئی بزازی اور کوئی کچھ اود۔ اور کوئی پناغلہ اور دوسرا سامان بمبئی میں فروخت کرنا چاہتا ہے۔ میں کام تو بہت محنت سے کرتا رہا۔ مگر میں محسوس کرتا کہ مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پنجاب سے ایک شخص نے خط لکھا کہ وہ بمبئی سے سبز اور سرخ کیلا منگانا چاہتا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر میں خیال ہوا کہ بمبئی کا کیلا تمام ہت۔ درستان میں جاتا ہے۔ ہم لوگ اس بزنس کو بھی کیوں نہ شروع کریں۔ ناچہ مشورہ کے بعد میں اس بزنس کے لئے بسین گیا۔ جہاں یہ کیلا پیدا ہوتا ہے اور اس کی مارکیٹ ہے۔ وہاں ملموم ہوا کہ بسین میں صرف دو پنجابی خاندان ہیں جن کے ہاتھوں میں یہ تمام بزنس ہے۔ اور یہ لوگ تمام ہندوستان کا کیلا سبلائی کرتے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں کہ صرف دو دکانیں اور اتنا بڑا بزنس ہم اس دکان کھول کر لاکھوں روپیہ پیدا کر سکیں گے۔ مزید واقفیت کے لئے میں ان پنجابیوں کی دکان پر گیا۔ اب کے اندر ایک پنجابی چاہے دوسرے پنجابی کا دشمن ہو۔ مگر پردیس میں پنجابی، پنجابی کی بہت خاطر تواضع نے ہیں۔ یہ لوگ بہت اخلاص کے ساتھ پیش آئے۔ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا۔ اور میں رات کو ان کے ہی رہا۔ ان کو کچھ پتہ نہیں کہ میں کس مقصد کے لئے بسین آیا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ بمبئی سیر و تفریح کے لئے اور بسین بھی چلا آیا۔ رات کو جب ہم کھانا کھا چکے اور باتیں شروع ہوئیں۔ تو میں نے پوچھا۔ اس کی وجہ ہے کہ یہاں اتنی بڑی مارکیٹ میں آپ کے خاندان کی صرف دو دکانیں ہیں۔ اور دوسرے لوگ کاروبار نہیں کرتے۔ میرے اس سوال کو سن کر میزبان نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔ کہ پچھلے پندرہ بیس برس میں سینکڑوں لوگوں یہاں آکر کھیلے کا کاروبار کرنا چاہا۔ مگر سب دیوالہ نکال کر چلے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی دکان ہے تو ہم لوگ فوراً مارکیٹ کو چڑھا دیتے ہیں۔ یعنی زیادہ قیمت پر کیلا خرید کر دوسروں کو کم قیمت پر بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پندرہ بیس یا پچاس ہزار روپیہ کھانا برواشت کر لیتے ہیں۔ نئے کاروبار والے کو

بھی مجبوراً ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ قیمت پر مال خرید کر اداں نروں پر باہر بھجنا پڑا ہے۔ ہمارے لئے تو گھانا کوئی مشکل نہیں۔ ہمارے پاس کئی کئی لاکھ پینڈہ کیا ہوا موجود ہے۔ اس میں سے دس بیس لاکھ اس ہزار روپیہ گھانا پر داشت کر لیں تو ہمیں کوئی پرہہ نہیں مگر نیا کا رو با کرنے والا شخص دو چار ماہ میں اپنا دس بیس ہزار روپیہ تباہ کر کے میدان سے نکل جاتا ہے۔ اور اس کے میدان سے نکلنے کے بعد ہم پھر مال اداں قیمت بڑھ کر گراں فروخت کرتے ہیں۔ اور دو تین ماہ میں گھانا پورا کر لیا جاتا ہے۔ ان باتوں کو سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہاں کاروبار کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ میں واپس یہی پہنچا۔ لالہ اوگر سین سے تمام حالات بیان کئے۔ لالہ اوگر سین اس کام میں دس بارہ ہزار روپیہ تو لگانے کے لئے تیار تھے۔ گھائے کے لئے اور وہ بھی اس سے کافی زیادہ روپیہ کیونکر لگاتے۔ چنانچہ ہماری یہ سیکم شروع نہ ہو سکی۔ اور ہم نے کیلے کے بزنس کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں لالہ اوگر سین کے پاس چار ماہ کے قریب رہا۔ کام چل نکلا۔ میری رہائش دھوبی تلاء کے قریب سندھیلو کے ایک ہوٹل میں تھی۔ جہاں میں پچتر روپیہ ماہوار کھانے اور رہائش کا دیتا تھا۔ چار ماہ گزر گئے مگر اس کام میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ لالہ اوگر سین میرا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کچھ بار محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا جہاں بھ کے ساتھ اس سے پہلے سردار سردول سنگھ کویشر کے ذریعہ تعارف ہو چکا تھا۔ میں نے ہمارا جہاں کو خط لکھا کہ ”رعیت“ کے بندہ ہونے کے بعد یہی آگیا ہوں اور یہاں ملازم ہوں۔ مگر میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ ملازمت دیں تو میں آپ کے پاس نا بھ آئے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے اس خط میں اپنا پتہ معرفت پوسٹ ماسٹر یہی لکھا کیونکہ اپنے تمام خطوط اس پتہ پر ہی منگایا کرتا تھا۔ دس بارہ روز کے بعد ہمارا جہاں کا جواب آیا کہ میں ان کے پاس ڈیڑھ دو سو پینچ جاؤں۔ یہ خط سردار گوردیال سنگھ پرایو بیٹ سکریٹری کے ہاتھ کاٹھل سے لکھا ہوا تھا۔ کیونکہ ہمارا جہاں اس وقت شلم میں تھے۔

اس خط کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ میں ممبئی سے جاؤں تو کیونکر حساب کیا تو لالہ اوگر سین کے ذمہ میرا ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ نکلتا تھا۔ اگر لالہ اوگر سین مجھے یہ روپیہ دے دیتے۔ اور خوشی کے ساتھ میرا استعفیٰ منظور کرتے تو بہت اچھا تھا۔ مگر لالہ جی بنے تھے۔ میں ان کی ذہنیت سے خوب واقف ہو چکا تھا کہ وہ مفت تو دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ مگر روپیہ خرچ کرنا ہو تو بہشت کی بھی پروا نہ کرنے والوں میں سے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اصل حالات لالہ جی کو بتائے تو یہ میرا بقایا ڈیڑھ سو روپیہ ضبط کر لیں گے۔ نا بھ جانے کے لئے میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔ کہ مل تو کیا۔ سوچا رہا۔ آخر لالہ جی سے کہا کہ اگر ہم میں سے ایک شخص پنجاب جا کر منڈیل کا چکر لگائے۔ اور وہاں خود ڈکانداروں سے ملے تو یہی سے مال منگائے والے بہت گاہک پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے میں نے لالہ جی سے اپنا ڈیڑھ سو روپیہ اخراجات کے نام پر لیا اور پنجاب جانے کی منظوری حاصل کی۔ لالہ صاحب بہت ہوشیار تھے انہوں نے مجھ سے ایک تحریر لکھوائی۔ کہ یہ ڈیڑھ سو روپیہ بطور امانت ہو گا۔ میں ہر روز اپنے کام کی رپورٹ بھیجوں گا۔ اگر میں واپس نہ آؤں تو اس ڈیڑھ سو روپیہ کو بقایا اتنا خرچ نہیں بلکہ امانت میں خیانت سمجھا جائے گا۔ تاکہ فوجداری مقدمہ قائم ہو سکے۔ میں ہر قیمت پر نا بھ جانے اور اپنی قیمت آزمائنے کے لئے تیار تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ لے کر فریڈرسل میں سوار ہوا۔ اس زمانہ میں فریڈرسل بھٹنڈہ کے راستہ لاہور جاتی تھی۔ یہی سے سوار ہوا



بھٹنڈہ پہنچا۔ وہاں ایک دوست لالہ ہنسراج دکیل تھے۔ ان کے مکان پر گیا۔ میرے پاس کپڑے کافی نہ تھے۔ بازار سے لٹھ خرید کر چھ قمیضیں اور چھ پاجامے بنوائے۔ ایک رضائی تیار کرائی۔ جب کپڑے تیار ہو گئے تو بھٹنڈہ سے راجپورہ انبالہ کے راستہ ڈیرہ دون پہنچا۔ ڈیرہ دون ریلوے سٹیشن کے قریب سکھوں کے ایک معمولی سے ہوٹل میں چار آٹہ روز پر ایک کرہ لیا۔ اور کپڑے بدل کر ہمارا جہ نامبھ کی کوٹھی ایسٹ کینال روڈ گیا۔ وہاں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا۔ سردار گوردیال سنگھ بہت با اخلاق شخص تھے۔ دلیان ریاست سے ملنا بے حد مصیبت تھا۔ گیارہ روز کے قریب اس ہوٹل میں رہا۔ ہر روز کوٹھی پر ہمارا جہ سے ملنے کی توقع پر جاتا۔ وہاں سے کبھی تو جواب ملتا کہ ہمارا جہ کی طبیعت اچھی نہیں۔ کبھی غل خانہ میں ہیں۔ کبھی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کبھی فرصت کم ہے۔ کبھی کھانے پر بیٹھے ہیں اور کبھی آرام فرما رہے ہیں۔ جواب سن کر واپس آ جاتا۔ ہوٹل میں جی مگناتما تو بار بار چلا جاتا۔ وہاں وقت نہ گستا تو کسی پارک میں چلا جاتا۔ ایک دن اتوار کو دیکھا کہ عیسائیوں کے سکول کے لڑکے کرے جارہے ہیں۔ ان کے پیچھے جا کر گرے میں کچھ عرصہ پادری کا دغظ سنتا رہا۔ چنانچہ بہت مشکل کے ساتھ دس روز گئے۔ گیارہویں روز ہمارا جہ کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ سیاسی اور دوسرے مختلف موضوع پر باتیں ہوئیں یہ انٹر دیوٹیاں ڈیوٹے دو گھنٹے ٹمک ہا انٹرفیو کے بعد واپس چلا آیا۔ اگلے روز گوردیال سنگھ نے بتایا کہ ہمارا جہ نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔ میں نا بھہ چلا جاؤں۔ وہاں ہوم ممبر کے پاس حکم بھیج دیا جائے گا۔ اور ہمارا جہ مع سٹاف کے کنسرور کے جنگل میں شیر کا شکار کیلئے جا رہے ہیں۔ پندرہویں روز کے بعد نا بھہ پہنچ جائیں گے۔

پہلے تو میں جب کبھی نا بھہ جانا تو دستور کے مطابق بطور رخصتانہ مجھے ایک یا دو سو روپیہ دیا جاتا۔ اب میں چونکہ ملازم ہو گیا۔ اس لئے اس موقع پر مجھے رخصتانہ بھی نہ ملا۔ یہ حکم سن کر میں ہوٹل گیا۔ بستروں کو نکال دیا اور شیٹیں کیا۔ گاڑی میں سوار ہو کر نا بھہ سٹیشن پہنچا تو میرے پاس اس وقت گیارہ روپیہ کے قریب تھے۔ ڈیڑھ سو روپیہ میں سے باقی تمام کا تمام روپیہ کپڑوں اور سفر میں خرچ ہو گیا۔

نا بھہ میں میرے ایک چچا (میرے والد کے حقیقی چچا) بھائی (سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ) رہتے تھے۔ یہ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ، اور کئی لاکھ روپیہ کی جائیداد کے مالک تھے۔ یہ اس وقت ریاست نا بھہ میں پنشن پر تھے۔ اور پہلے مرحوم ہمارا جہ سر میرا سنگھ (موجودہ ہمارا جہ نا بھہ کے دادا) کے میڈیکل ایڈوائزر تھے۔ میرے چچا خرچ کرنے کے اعتبار سے میری طبیعت کے بالکل خلاف اور ضد تھے۔ یعنی میں تو روپیہ اگر پاس ہو تو جب تک خرچ نہ کر لوں۔ رات کو سو نہیں سکتا۔ گران کے گھر میں دال کے ساتھ آٹو اس روز پکتے جس روز ان کے ہاں کوئی مہمان آئے۔ میرے لئے ان کے ہاں جا کر قیام کرنا اپنی طبیعت پر ایک قسم کا جبر تھا۔ مگر کیا کرتا۔ جیب میں تو صرف گیارہ روپیہ تھے۔ اور دوسرا کوئی واقف نہیں تھا۔ دل بردہ کر کے ان چچا کے مکان پہنچا تاں نگ میں سے ساٹھ روپے گران کے گھر کے اندر گیا۔ تو آپ صحن میں بیٹھے تھے۔ انکی نظر کڑوا مئی۔ دُور سے دیکھا تو پوچھا کون ہے میں نے جواب دیا کہ میں دلیان سنگھ ہوں۔ تشریف جاکران کے پاؤں کو کچھوا کیونکر بزرگ تھے۔ بہت محبت سے میں نے اسے پچھلے زمانہ کے لوگوں میں چاہے ہزار نقصان ہوں۔ اخلاص و محبت اور رخصتاری کے اعتبار سے بروگ زشتہ تھے۔ بہت ہی اخلاص سے پیش آئے۔ ان کے گھر میں کھانا پکانے پر ایک بڑی عورت ہر نامی

کئی برس سے ملازم تھی۔ اس کو آنر کی سبزی پکانے کا حکم ملا۔ میں ایک ماہ کے قریب ان چچا کے ہاں ہان رہا۔ جب تک کہ ہمارا جھکار سے واپس نا بھہ نہ پہنچ گئے۔ ہمارا جہ کے پہنچنے پر میں سرکاری جہان کی حیثیت سے نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادبات کی ایک کاشیچ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر سید اسنگھ صاحب کے ہاں ایک ماہ کے قیام کے حالات بہت دل چسپ ہیں جو پھر لکھوں گا۔

نا بھہ جب پہنچا تو میں نے اپنے وطن اور عزیزوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر اخبار ہندوستان کو بھی لاہور لکھا۔ کہ میں نا بھہ میں سرکاری ملازم ہو گیا ہوں۔ لالہ اوگر سین کو علم تھا کہ لالہ دینا ناتھ اور لالہ شام لعل کپور ایڈیٹر درگرو گنیشال "میرے دوستوں میں سے ہیں۔ لالہ اوگر سین نے ایک ہفتہ تک میرا انتظار کیا۔ جب میری طرف سے کوئی اطلاع نہ پہنچی تو آپ نے لالہ دینا ناتھ کو خط لکھا کہ دیوان سنگھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور ایڈوانس لے کر پنجاب میں دورہ کے لئے گیا تھا۔ اب تک اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ اور امانت میں خیانت کے الزام میں پولیس کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ تاکہ دیوان سنگھ گرفتار ہو کر واپس بھی لایا جاسکے۔ اور اس پر فوجداری مقدمہ قائم ہو۔ میں نے جب لالہ دینا ناتھ کو اپنے ملازم ہونے کی اطلاع دی تو انھوں نے اس کے جواب میں میرے ملازم ہونے کی خوشی کے اظہار کے ساتھ لالہ اوگر سین کا یہ خط بھی بھیجا جس میں مجھ پر امانت میں خیانت کا الزام اور پولیس کو اطلاع دینے کی دھمکی تھی۔ اور لالہ دینا ناتھ نے لکھا کہ آپ کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کے خیانت دار ہونے کے باعث بہت عزت تھی۔ اور توقع نہ تھی کہ ایڈیٹر "ریاست" اس قدر پست کیرکٹر ہو گا۔ اور یہ حالات، اور ایڈیٹر "ریاست" کی بیہی کی بددیانتی کے واقعات سن کر آپ کو بے حد صدمہ ہوا ہے۔ لالہ دینا ناتھ کے خط جن میں لالہ اوگر سین کا خط محفوظ تھا کو دیکھ کر مجھے نہ صرف بے حد تعجب ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میرے ہوش اُڑ گئے کیونکہ میں ایک معروف تر لالہ دینا ناتھ کی نظروں میں ذیل ہوا۔ دوسرے یہ خوف کہ میں بیہی میں لالہ اوگر سین کو تھری دے آیا ہوں۔ اگر لالہ جی نے پولیس کو اطلاع دے دی اور وہاں سے وارنٹ جاری ہو گئے۔ اور میں نا بھہ میں گرفتار ہو گیا۔ تو یہاں نہ صرف ملازمت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ بلکہ لوگ کہیں گے کہ "اچھا معتبر اور شریف" آدمی تھا جس کو ہمارا جہ نے دوست سمجھ کر ملازم رکھا۔ ان خطوط کو دیکھ کر میں بے حد پریشان ہوا۔ رات کو نیند نہ آئی۔ سوچنا رہا کہ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر اس بدیشائی کی حالت میں بھٹنڈہ لالہ ہنسراج وکیل کو خط لکھا کہ فوراً نا بھہ پہنچو۔ لالہ ہنسراج خط ملتے ہی نا بھہ پہنچ گئے۔ جن سے تمام حالات بیان کیے تو انھوں نے کہا۔ کوئی ٹکڑ کی بات نہیں۔ آپ نے لالہ اوگر سین کے نام اپنی طرف سے ایک نوٹس تیار کیا جس میں لکھا کہ لالہ اوگر سین نے لالہ دینا ناتھ کو جو خط لکھا وہ واقعات کے خلاف اور توہین آمیز ہے۔ ان کے موکل دیوان سنگھ نے ڈیڑھ سو روپیہ جو لیا ہے وہ اس نے اپنی تنخواہ میں وضع کر لیا ہے۔ اور وہ لالہ جی کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ ریاست نا بھہ میں سرکاری ملازم ہو گیا ہے۔ اور چونکہ لالہ جی نے ان کے موکل دیوان سنگھ پر غلط الزام لگا کر توہین کی ہے اس لئے دو ہفتہ اندر بطور ہرجانہ لالہ جی دس ہزار روپیہ ادا کریں۔ اور معافی مانگیں ورنہ دیوانی اور فوجداری مقدمات دائر کیے جائیں گے۔

اس نوٹس کے پہنچنے کے بعد لالہ اوگر سین کا میرے پاس خط آیا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"پیارے دیوان سنگھ جی! آپ میرے چھوٹے بھائی کے برابر ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی

ہوئی کہ آپ نا بھ میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ میں نے تولال دینا نا نھ کو دیے ہی لکھ دیا تھا۔ ڈیرہ سو روپیہ کاٹ کر پندرہ روپیہ کے قریب ادا آپ کے میرے ذمہ نکلے ہیں۔ آپ لکھے تو میں وہ بھی بھیج دوں۔ میں تو آپ کا نیاز مند ہوں۔ کسی چیز کی بیٹی سے ضرورت ہو تو لکھنا تاکہ بھیج دوں۔ اب آپ نا بھ میں سرکاری ملازم ہو گئے ہیں۔ ہمارا بھی خیال رکھنا۔ اور اگر ہو سکے تو وہاں سے کوئی بڑا سرکاری آرڈر بھی بھجوانا۔ جس سے بہت فائدہ ہو۔ میرے گھر سے اور میرا چھوٹا بھائی آپ کو رام رام کہتے ہیں۔ اور میری چھوٹی لڑکی کا نا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اپنی خیریت کا خط لکھتے رہا کیجئے۔

آپ کا داس

اگر سین

میرے نوٹس پہنچنے پر نہ معلوم لالہ اگر سین کا کیا حال ہوا ہوگا۔ مگر ان کا یہ جواب ملنے پر میں مطمئن ہو گیا۔ کہ اب لالہ صاحب میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ لالہ اگر سین میرے بیٹی سے آنے کے بعد شاید تین چار سال وہاں رہے۔ اُس کے بعد وہ اپنے وطن آ گئے۔ آج کل میرے گھر میں رہتے ہیں۔ اور جب بھی دہلی آتے ہیں تو ضرور ملتے ہیں۔ بلکہ اس نیاز مند کے مکان پر ہی قیام فرماتے ہیں۔ اب نئے دور میں "ریاست" نکلنے والا تھا۔ اور انھوں نے اخبارات میں پڑھا۔ کہ میں رہا ہو کہ دہلی پہنچ گیا ہوں۔ تو آپ دہلی آئے۔ تلاش کرنے پر بہت دقت کے ساتھ آپ کو موجودہ مکان ملا۔ جب ملے تو اخلاص و محبت کے باعث ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور آپ نے چاہا اور بار بار کہا کہ اخبار جاری کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو لے لوں۔ مگر ایک تو ضرورت نہ تھی دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ لالہ جی اگر دال ہیں۔ روپیہ دیں گے تو بطور قرض۔ ویسے دوستانہ امداد کے طور پر نہیں۔ مشکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

لالہ اگر سین کے لئے میرے دل میں بہت عزت اور احترام ہے۔ اور جب ملتے ہیں۔ اور میں لوگوں سے ان کا تعارف کرتا ہوں۔ تو یہی کہہ کر کہ میرے سابق آقا ہیں۔ جن کے پاس میں نے ملازمت کی ہے۔

## نفرت اور محبت کے اسباب

میں ملازم ہو کر جب ڈیرہ دون سے نا بھ پہنچا۔ اور اپنے چچا سردار صاحب ڈاکٹر سید اسٹیک کے ہاں مقیم ہوا تو پہلے روز میری خاطر تواضع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ ہر نامی ملازمہ کو دال کے ساتھ میرے لئے پیٹیل ڈش یعنی آر پکانے کا بھی حکم دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں نیشن پر تھے۔ اور ریاستوں میں انسان چاہے کتنا ضعیف ہو جائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کو مرتے دم تک ملازم رہنے کا حق حاصل ہے اور اگر اس کو فیشن پر ریٹائر کر دیا جائے۔ تو اس کے اپنے خیال میں اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی وہ سرکار کا مستوب سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ دالی ریاست اگر غریب ہو تو وہ لوگ بھی سلسلہ ملازمت میں رہتے ہیں جہاں پائی سے اٹھ نہیں سکتے میرے چچا ہمارا جہ میرا سٹیک مرحوم نے نظر بند ہمارا جہ کے والد اور موجودہ ہمارا جہ نا بھ کے دادا کے میڈیکل ایڈوائزر تھے۔ اور جب ہمارا جہ میرا سٹیک کا انتقال ہوا۔ تو

نا بھڑکی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ڈاکٹر سیوا سنگھ کو بھی ریٹائر کر دیا گیا جہاں تک میرا خیال ہے۔ آپ کے ریٹائر ہونے کا باعث یہ تھا کہ ہمارا جہ نے گزری پریکٹس ہی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کی اصلاح کرنی چاہی اور دوسری تبدیلیوں کے ساتھ بڑی عمر کے ملازموں کو پنشن دے کر نو جوان اور مستعد لوگوں کو ملازم رکھا مگر میرے چچا اپنے ریٹائر ہونے کو بھی سمجھتے رہے کہ ہمارا جہ آپ کے خلاف ہیں۔ اور آپ معصوب ہیں جس روز میں پنچا کھانا کھانے کے بعد باتیں ہوتیں تو آپ نے دریافت کیا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ اور نا بھڑ آئے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں ڈیرہ دون سے آتا ہوں۔ اور ہمارا جہ نے مجھے سرکاری ملازمت دے دی ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو یقین نہ آیا۔ اور انھوں نے نہایت حیرانی کے ساتھ پوچھا کیا یہ سچ ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ ریاست میں ملازمت کا ملنا بہت مشکل ہے۔ والیان ریاست سے ملنا تو کیا۔ ان کی کوٹھیل اور محلات کے قریب جانا بھی خوش نصیبی میں داخل ہے۔ پھر دیوان سنگھ کی ہمارا جہ تک رسائی کیوں کر ہوئی۔ اور ملازمت کس طرح ملی۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ میں مختلف اخبارات میں بطور سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کام کرتا رہا۔ ہمارا جہ سے مضامین کو پسند کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے تعلقات ہوئے اور اب جب کہ میں نے ان سے ملازمت کے لئے کہا تو ہمارا جہ نے مہربانی کی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو ہمارا جہ کا معصوب سمجھتے تھے۔ اور ہمارا جہ کے خلاف تھے۔ یہ سن کر ہمارا جہ پر برس پڑے۔ اور غصہ۔ نفرت اور طعنے دینے کے لہجہ میں آپ نے فرمایا اس ہمارا جہ کو سوائے اخبارات پڑھنے کے دوسرا کوئی کام نہیں۔ دن رات یا تو کتابیں پڑھتا ہے یا اخبارات۔ گورنمنٹ کے خلاف جو لیدر ہیں۔ ان سے ملتا ہے۔ رعایا تباہ ہو رہی ہے۔ رعیت کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس کا باپ بہت اچھا آدمی تھا۔ ہم نے اس کا زمانہ دیکھا ہے۔ ہر روز لوگوں کے حالات سنتا تھا۔ یہ کسی سے ملتا تک نہیں۔ اس کی دوستی ہے تو گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کرنے والے لیڈروں سے بہ گدھی سے اتر جائے گا۔ گورنمنٹ کا مقابلہ کن کر سکتا ہے اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ یہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔ پولیسکل ایجنٹ اس کے خلاف ہے۔ ہمیں کبھی پوچھتا تک نہیں۔ جب سے پنشن لی ہے گھر میں پڑے ہیں۔ بڑے ہمارا جہ کہتے اچھے تھے۔ ہم نے لاکھوں روپے پیدا کئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں سنتا رہا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ہمارا جہ کے خلاف اپنے دل میں بہت سخت بغض کے جذبات رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ سن کر کہ میرے ہمارا جہ کے ساتھ تعلقات ہیں اور ہمارا جہ نے مجھے سرکاری ملازمت دی ہے مجھے بھی کچھ غم حاسدانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈیرہ دون میں جب سردار گوردیال سنگھ نے مجھے ملازمت دے دی ہے اور میں نا بھڑ چلا جاؤں۔ تو آپ نے کہا تھا کہ آپ ایک دور دراز میں ہی ہوم ممبر اور گورنمنٹ جنرل کے نام میری ملازمت کے منتظر حکم بھیج دیں گے مگر ریاست کی گاڑی کے پڑے بہت آہستہ چلتے ہیں سردار گوردیال سنگھ مصر رفیت کے باعث ہوم ممبر اور گورنمنٹ جنرل کو حکم بھیجنا بھول گئے۔ اور دین دن روز کے بعد کنسر و کے جنگلات میں ہمارا جہ کے ساتھ شیر کے شکار کے لئے چلے گئے۔ یعنی میں نا بھڑ میں جبکہ ہمارا جہ ملازم تو ہوں مگر میری تقرری کا کہیں کوئی حکم نہیں اور نہ کسی کو علم ہے۔ ڈاکٹر سیوا سنگھ کو میرے کہنے کے باوجود یقین نہ آتا تھا کہ میں نا بھڑ میں ملازم ہو گیا ہوں۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ریاستوں میں ملازم ہونا اور کسی ہمارا جہ یا نواب

بیک رسائی حاصل کرنا بہت ہی مشکل اور پچھلے جنم کے اچھے کاموں کے باعث ہی ممکن ہے۔ وہ کئی روز تک یہی سمجھتے رہے کہ شاید میں غلط بیانی کر کے ان کے پاس چند روز گزارنے کے لئے آیا ہوں اور دراصل ملازم نہیں ہوا چنانچہ آپن میں ایک آدمی بار یہ ضرور کہہ دیتے کہ انسان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ بیکار نہیں رہنا چاہئے کام کرنا چاہئے۔ دھوکہ نہیں دینا چاہئے۔ اور اگر کم تنخواہ پر ہی کہیں ملازمت مل جائے تو کر لینی چاہئے۔ اس تمام نصیحت کا مقصد یہ تھا کہ ان کے گھر میں پڑا اپنا وقت ضائع نہ کروں اور کہیں جا کر کوئی کام کروں۔

ڈاکٹر سید سنگھ ہمارے غیر ضروری طور پر کفایت شعار تھے۔ اور ہاؤس کی صورتیں دیکھنا ان کے لئے مسرت اور خوشی کا باعث نہ تھا۔ اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ گریہ چاہیں۔ مگر ان کے گھر پر رہنا اور ان کے لئے بار ثابت ہونا مناسب نہیں۔ مگر کر لیا۔ وہ گیارہ روپے بھی خرچ ہو گئے جو نا بھہ سٹیشن پر اترتے وقت جیب میں تھے۔ نا بھہ میں کوئی ایسی دوسری جگہ نہ تھی جہاں رہتا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی ”نصیحتوں“ کا سلسلہ زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع ہوا۔ جب بھی میں ان کے سامنے جاتا۔ وہ یہی فرماتے کہ جھوٹ نہ بولنا چاہئے۔ انسان کو کام کرنا چاہئے۔ وقت کی قدر کرنی چاہئے۔ بیکار رہنا باعث عزت نہیں۔ میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظروں سے جتنا بھی ممکن ہو دور رہوں میں صبح ان کے جاگنے سے پہلے بیدار ہوتا۔ کوئی کتاب لے کر شہر سے باہر یا ریل کی ٹھہری کے ساتھ ساتھ کئی میل دور نکل جاتا۔ کسی کنویں یا نہر پر عمل کرتا۔ کھیتوں یا نہر کے کنارہ بیٹھا کتاب پڑھتا۔ اور جب بارہ بجے کھانے کا وقت ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کے گھر واپس پہنچتا۔ گھر پر کھانے کے لئے بیٹھتا تو ڈاکٹر صاحب پھر وہی نصیحتیں شروع کر دیتے۔ میں بے غیرت اور ڈھیٹ لوگوں کی طرح یہ نصیحتیں سنتا۔ کھانا کھانے کے بعد پھر گھر سے نکلتا۔ اور شہر سے باہر کھیتوں میں یا ریلوے کی ٹھہری پر جا بیٹھا اور رات کو آٹھ بجے پھر واپس آتا۔ کھانا کھاتے ہوئے پھر نصیحتیں سنتا اور سو جاتا۔ یہ دن میرے لئے بہت تکلیف کے تھے۔ مگر کرتا بھی کیا۔ اگر ملازم نہ ہوتا تو چلا جاتا۔ یہ سوچ کر دن گزار رہا تھا کہ ہمارا جہ آئیں۔ تنخواہ ملے تو کوئی مکان لے کر رہوں۔

کئی دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی پنشن لینے خزانہ میں تشریف لے گئے۔ خزانہ کے قریب ہی اکونٹنٹ جنرل کا دفتر تھا۔ خزانہ سے اپنی پنشن کا روپیہ لے کر اکونٹنٹ جنرل سے ملنے چلے گئے۔ اکونٹنٹ جنرل سے آپنے پوچھا۔ آپ کے پاس کسی دیوان سنگھ کے ملازم ہونے کے متعلق ہمارا جہ کا حکم پہنچا ہے۔ اکونٹنٹ جنرل نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ جواب ملا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب واپس گھر پہنچے۔ اب ان کو پورا یقین ہو گیا۔ کہ میں ان کو دھوکہ دے کر ان کے مکان پر مقیم ہوں۔ ملازم نہیں ہوا۔ اور ان کے ساتھ چار سو روپے کی جارہی ہے۔ میں رات کو نو بجے حسب معمول باہر سے واپس کھانے کے وقت پہنچا تو آپ بہت غصہ میں تھے۔ دیکھتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ کہ بغیر کام کے زندگی کے دن گزارتے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ آجکل کے زمانہ میں جھوٹ بولنے کو تو کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور آپ نے اکونٹنٹ جنرل سے پوچھا ہے۔ میں فی الحقیقت ملازم نہیں۔ اور دھوکہ دیتے ہوئے ان کے مکان پر پڑا ہوں میں ڈاکٹر صاحب کے اس سلوک کو بہت بری طرح محسوس کرتا تھا میں نے بتلایا کہ اپنے ایک چچا زاد بھائی سردار صاحب سنگھ کو جو وہاں سب انسپکٹر پولیس تھے خط لکھ کر روپے منگائے۔ مگر وہ صرف پچیس روپیہ تھے۔ ان پچیس روپیہ میں نہ مکان کرایہ پر لے سکتا تھا۔ نہ کھانا پکانے

کے لئے ملازم رکھ سکتا تھا۔ نہ یہ اخراجات کے لئے کافی تھے۔ کرتا تو کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر رہنے اور وقت گزارنے کے لئے مجبور تھا۔ ہمارا جہ کے انتظار کا ایک ایک دن سال سال بھر کا محسوس ہوتا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی "نصیحتوں" کے سلسلہ میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس زندگی سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ اور کئی دفعہ خیال آیا کہ نا بھہ سے چلا جاؤں۔ مگر اس توقع پر کہ ہمارا جہ آج آتے ہیں کل آتے ہیں نہ جاسکا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر غالباً ایک ماہ کے قریب رہا۔ ایک دن صبح کے وقت شہر میں توپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ توپیں ہمارا جہ کے واپس نا بھہ میں پہنچنے کی سلامی کی تھیں۔ میری روزانہ زندگی اور ڈاکٹر صاحب کی نصیحتیں میرے لئے ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا جہ واپس نا بھہ پہنچ گئے ہیں۔ تو میں نے ہمارا جہ کو ایک خط بذریعہ رجسٹری بھیجا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"پورا مینس!

ڈیرہ دون میں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سکریٹری نے مجھے بتایا تھا کہ میں ملازم ہو گیا ہوں اور ملازمت کے متعلق حکم ہوم ممبر اور کنونشنٹ جنرل کو ایک دو روز میں ہی پہنچ دیا جائے گا۔ مگر اب تک کوئی حکم نہیں پہنچا۔ میں یہاں نا بھہ میں سردار صاحب ڈاکٹر سید سنگھ کے مکان پر مقیم اور ہمان ہوں۔ کیونکہ میرے پاس ایک مہینہ خرچ کے لئے نہیں۔ نہ کوئی رہنے کے لئے دوسری جگہ ہے۔ میں اس موجودہ زندگی سے انتہائی تنگ آ چکا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو ہمانوں کی منحوس صورت دیکھنا گوارا نہیں۔ گو وہ میرے چچا ہیں۔ یہ خط آپ کے پاس کل پہنچ جائے گا۔ اور میں پرسوں شام تک انتظار کروں گا۔ اگر پرسوں شام تک جناب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اور میری ملازمت کا حکم کنونشنٹ جنرل کے پاس نہ پہنچا۔ تو تین پرسوں رات کی گاڑی یہاں سے لاہور چلا جاؤں گا۔ میرے لئے اب مزید عرصہ تک انتظار کرنا ممکن نہیں۔"

اس خط کو میں نے بذریعہ رجسٹری بھیجا اور لغات پر پرنٹل بھی لکھ دیا تاکہ ہمارا جہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ خط بھیجے کے بعد میں نے لاہور جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کیونکہ میں نے خیال کیا کہ ہمارا جہ بڑے آدمی ہیں۔ اس خط کا جواب جلدی کیا دیں گے۔ میرے لئے مزید عرصہ تک نا بھہ میں رہنا ممکن نہیں۔ اگر ہمارا جہ چاہیں گے تو میں لاہور سے پھر آ جاؤں گا۔

یہ خط ہمارا جہ کو اگلے روز پہنچ گیا۔ آپ نے خط پڑھتے ہی سردار زور سنگھ موس ہولڈ منسٹر کو طلب فرمایا اور کہا کہ ڈاکٹر سید سنگھ کے مکان پر دو ان سنگھ بھیرا ہوا ہے۔ اس کے پاس جائے سرکاری مکان کا رہنے کے لئے انتظام کر دیجئے۔ سرکاری ملازم دیجئے۔ جتنے روپیہ کی ضرورت ہو وہ دیجئے۔ اور بطور سرکاری ہمان ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائیے۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس حکم کے جلتے ہی شام کو چار بجے کے قریب سردار زور سنگھ ڈاکٹر سید سنگھ کے مکان پہنچے۔ میں حسب معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ "دورہ" پر تھا۔ یعنی ریل کے پٹری کے ساتھ ساتھ جا کر شہر سے کئی میل دور بیٹھا تھا۔ سردار زور سنگھ نے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی کہ سردار زور سنگھ آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب کو اندر بلایا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد سردار زور سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ

آپ کے ہاں جو سردار جیون سنگھ رہتے ہیں۔ ہمارا جہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ ان کے لئے سرکاری کوٹھی۔ سرکاری ہمانداری۔ روپیہ اور جس شے کی ضرورت ہو۔ انتظام کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک ملازم جیون سنگھ جو پہلے فوج میں تھا۔ اور فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے پاس جا پیدا کر اہر وغیرہ وصول کرنے پر ملازم ہو گیا تھا) پاس کھڑا تھا ڈاکٹر صاحب نے جب سردار زوردا سنگھ کے منٹے سے یہ سنا کہ ہمارا جہ نے جیون سنگھ کو روپیہ اور کوٹھی کا حکم دیا ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب بہت حیران ہوئے۔ اور ان کو خیال ہوا کہ ریاستوں کا معاملہ ہے۔ یہ جیون سنگھ شاید ان کی مخبری کرتا ہو گا۔ جو اس کو روپیہ اور کوٹھی دینے کا حکم ہوا۔ جیون سنگھ پریشان کر ہمارا جہ نے بغیر درخواست کے اتنی مہربانی کیوں کی۔ حیرانی کی اس فضا کو دیکھ کر سردار زوردا سنگھ حیران کر محالہ کیا ہے۔ ہمارا جہ نے حکم کیوں دیا اور کس کے لئے دیا۔ چنانچہ سردار زوردا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

گو کیا یہ سردار جیون سنگھ ہیں۔ جو آپ کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ منٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق ہو گا۔ آپ نے پوچھا کہ سرکار کا حکم دیوان سنگھ کے متعلق تو نہیں۔ اس پر سردار زوردا سنگھ نے کہا۔ ہاں ہاں سردار۔ دیوان سنگھ کے متعلق ہے۔ جو نے سرکاری ملازم ہوئے ہیں۔ میں نام بھول گیا تھا۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ ہمارا جہ نے یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق دیا ہے اور دیوان سنگھ دراصل ملازم ہو گیا ہے۔ اور اس کے فی الحقیقت ہمارا جہ کے ساتھ تعلقات ہیں۔ آپ نے سردار زوردا سنگھ کو جواب دیا کہ آپ ہمارا جہ صاحب سے کہتے کہ دیوان سنگھ ڈاکٹر صاحب کا حقیقی بھتیجا ہے۔ کوئی بیگانہ نہیں۔ اس کا اپنا گھر ہے اور وہ بہت آرام سے ہے۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے۔ کوئی کمی نہیں۔ وہ جو کچھ چاہے یہاں اپنے گھر سے لے سکتا ہے۔ ہم حضور کے قیدی نہ بنیں۔ اور شکر گزار ہیں کہ سرکار نے ہمارے خاندان کے ایک اور ممبر کو سرکاری خدمت کا موقع دیا۔ ہماری تو خواہش ہے کہ ہمارے خاندان کا بچہ بچہ حضور کی وفا شکاری کے ساتھ خدمت انجام دے یہ عین کہ سردار زوردا سنگھ اپنے گھر چلے گئے۔

میں حسب معمول آٹھ بجے کے قریب واپس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب میرا انتظار فرما رہے تھے۔ جب میں نے صحن میں قدم رکھا۔ اور انھوں نے میرے پاؤں کی آہٹ سنی۔ تو آپ نے کمرہ کے اندر سے آواز دے کر پوچھا۔ کون ہے۔ میں نے جھپکی اور بھی ہوئی بی کی طرح آہستہ سے جواب دیا۔ جی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت شفقت کے ساتھ مجھے اپنے پاس اندر بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں بیٹھنے کے لئے سرکنڈے کے چھ سات سوئڈے تھے۔ جن پر ہر طرف کی کھالیں منڈھی ہوئی تھیں۔ ایک سوئڈے پر بیٹھنے کے لئے مجھے حکم ملا۔ میں بیٹھ گیا۔ تو آپ نے ہرنامی ملازمہ کو آواز دی۔ ہرنامی کے کپیلے کھانا لاؤ (دبا بھ پٹیل اور جیند کی ریاستوں میں دایان دیت کے لڑکوں اور عزیزوں کو تو کنور صاحب کہتے ہیں۔ اور اہلکاروں اور افسروں کے لڑکوں اور چھوٹی عمر کے رشتہ داروں کو "کاکا جی" کہتے ہیں) ہرنامی جب کھانا لائی۔ میں سوئڈے پر بیٹھا اور آگے تپائی رکھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ تو ہرنامی کو حکم ملا کہ آئندہ دونوں وقت دال کے ساتھ آویا کوئی سبزی بھی بنائی جائے۔ جیون سنگھ ملازم کو حکم دیا گیا کہ کل صبح اوپر کے چوبارہ میں ایک پلنگ بچھا دیا جائے۔ ایک چھوٹا تخت پوش رکھا جائے۔ گودام کے کمرہ میں سے پانی کے لئے ٹب نکال کر وہاں پہنچا دیا جائے۔ اور کوئی چمٹے والا آنے تو اس کے لئے ایک کرسی اور ایک سوئڈھا بھی وہاں رکھ دیا جائے۔ لڑکوں کی سیاسی قیدی کو سی کلاس سے ایک تخت اسے کلاس میں رکھنے

کا حکم دیا گیا، میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب آج بہت ہی ہربانی فرما رہے ہیں، جو کیا ہے میں نے سنا تھا کہ ڈاکٹر سیدواسنگھ جب تعلیم حاصل کرتے تھے تو میرے والد مرحوم اس زمانہ میں ڈاکٹر تھے۔ اور ان کے زور دینے پر ہی ڈاکٹر سیدواسنگھ کو ڈاکٹری پڑھنے کے لیے داخل کیا گیا تھا۔ اور میرے والد نے اکثر آپ کی مالی امداد بھی کی تھی، بشاید پڑانے زمانہ کے تعلقات اور والد مرحوم کے احسان کا احساس ہوا ہے یا یہی اس کو خیال آیا ہے یا خاندانی محبت کے باعث ہربانی فرما رہے ہیں۔ میں نے کہا، آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ میں تو غالباً کل رات واپس لاہور جا رہا ہوں۔ اتنے روز تک تو میری ملازمت کا حکم جاری نہیں ہوا۔ اب کیا توقع ہے میرے یہ الفاظ سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انکشاف فرمایا کہ سردار زورواسنگھ ہوس ہولڈ منسٹر شام کو آئے تھے۔ ہمارا جہ نے رامپن کے لئے کوٹھی، ملازم، سرکاری بہانداری اور روپیہ دینے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اور آپ نے سردار زورواسنگھ سے کہہ دیا ہے کہ دیوان سنگھ آپ کا بھتیجا ہے اپنا گھر چھوڑ کر باہر نہیں رہ سکتا۔ اور اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

میں یہ سن کر سمجھ سکا کہ ڈاکٹر صاحب آج کرم کیوں فرما رہے ہیں میں متفکر تھا معلوم کر دوں کہ ہمارا جہ نے کیا حکم دیا میں نے پوچھا، سردار زورواسنگھ کا مکان کہاں ہے اس پر ڈاکٹر صاحب بہت غصہ کی حالت میں بولے کہ جو کہنا تھا، سردار زورواسنگھ سے کہہ دیا، ان سے ملنے کی ضرورت نہیں۔

میں صبر کیونکر کرتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ملازم جیون سنگھ میرے ساتھ بہت اخلاص سے بیٹھ آتا تھا۔ اور میری بہت عزت کرتا تھا۔ بلکہ وہ ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ مجھے کھانے کے ساتھ آم کا اچار بھی دیا کرتا تھا۔ جو دال کے ساتھ ایک ایکسٹرا ڈش کی حیثیت رکھتا، میں نے اس کا اشارہ سے باہر چلنے کو کہا اس کے باہر جانے کے بعد میں بھی میٹاب کے بہانہ اٹھا، باہر گیا۔ اور باہر جا کر میں نے جیون سنگھ سے سردار زورواسنگھ کے آنے اور بات چیت کے تمام حالات پوچھے۔ حالات معلوم کرنے کے بعد دریافت کیا کہ سردار زورواسنگھ کہاں رہتے ہیں۔ جیون سنگھ نے بتایا کہ ریلوے سٹیشن کے پاس منڈی ہے۔ اس منڈی میں ان کی اپنی ذاتی بلڈنگ ہے اس بلڈنگ کے اوپر کے حصہ میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے سردار زورواسنگھ کا مکان ایک میل کے فاصلہ پر تھا میری جیب میں ٹانگہ کے لئے بھی پیسے نہ تھے میں پیدل چلا گیا۔ سردار صاحب کے مکان پر پہنچ کر آواز دی کہ سردار صاحب کا ملازم نیچے آیا۔ اس نے نام پوچھا میں نے کہا۔ ڈاکٹر سیدواسنگھ کے مکان سے دیوان سنگھ ملازم نے اطلاع دی۔ تو سردار زورواسنگھ نیچے آگئے۔ آپ نے ہاتھ جوڑ کر سکھ کی طرح ست سری اکال کہا۔ میں نے بھی اسی طرح جواب دیا میں نے کہا، میں شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے تھے۔ بے وقت آپ کا تکلیف اس لئے دی کہ میں آپ مجھ سے ملے اور بات کے بغیر ہمارا جہ کو وہ نہ کہ دیں جو ڈاکٹر صاحب نے آپ سے کہا ہے۔ سردار زورواسنگھ نے کہا کہ ذمہ داری کا سوال تھا آپ مجھ سے ملے بغیر ہمارا جہ سے کچھ نہ کہے اور آپ صبح مجھ سے ملنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پھر آنے والے تھے۔ سردار زورواسنگھ کے ساتھ فیض ہوا کہ آپ کل صبح آٹھ بجے تشریف لائیں گے۔ میں ان کا انتظار کروں۔ سردار زورواسنگھ سے ملنے کے بعد میں واپس آیا۔ ڈاکٹر صاحب میرے انتظار میں تھے کہ کہاں چلا گیا۔ آپ نے پوچھا کہاں تھے میں نے کہا، کھانا کھانا کے بعد چل تہی کرنے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید ہربانی فرماتے ہوئے ہرنای کو حکم دیا کہ کاکا کے لئے ایک



گلاس دودھ لاؤ۔ پورے ایک بیسے میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے "کاکاجی" کا لقب نصیب ہونے کے بعد ایک گلاس دودھ بھی ملا۔ اگلے روز میں صبح چھ بجے حسب معمول جاگا۔ مگر آج "دورہ" ملتوی تھا۔ ضروری حاجات سے فائدہ ہو کر پھر رضائی اور بستر کر لیٹ گیا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ہنکار فارغ ہو اکیڑے پہننے اور گھر سے باہر نکل کر گلی میں سردار نور سنگھ کا انتظار کرنے لگا۔ صبح میں مختلف خیالات تھے۔ رات کو سردار نور سنگھ نے کہا تھا کہ ہمارا جہانے رہائش کے لئے کوٹھی دینے کا حکم فرمایا ہے۔ مگر میرے پاس ایک بستر اور ایک ٹرنک ہے جس کو بھی میں جا کر رہوں گا۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ کہ یہ سننے اہلکار کہاں سے لشکر ترقی لے آئے جن کا اثاثہ اہلیت صرف ایک بستر اور ایک ٹرنک ہے۔ اس ایک بستر اور ایک ٹرنک کو ڈرائنگ روم میں رکھوں گا۔ بیدار دم میں، ڈرائنگ روم میں یا سٹور روم میں۔ ملازم لوگ کیا کہیں گے۔ اسی خیال میں غرق تھا کہ سامنے سے سردار نور سنگھ دو سفید گھوڑوں والی سرکاری نشی ہیں آستہ ہوئے دکھائی دیئے۔ میں آگے بڑھا گاڑی کھڑی ہو گئی۔ سردار صاحب نے نیچے اتر کر ہاتھ ملایا۔ پھر بائیں بٹھایا۔ اور کوچان کو حکم دیا کہ چلو گیسٹ ہوس والی سڑک پر سردار نور سنگھ نے کہا کہ پہلے گیسٹ ہوس کی طرف چلے ہیں۔ وہاں کئی ایک سرکاری کوٹھیاں ہیں، آپ ان میں سے جو پسند کیجئے اس میں آپ کے تمام کا انتظام کر دیا جائے۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ میں تنہا بغیر بیوی و بیٹوں کے ہوں۔ اور میری زندگی بھی بالکل سادہ ہے میں اپنے ساتھ بالکل مختصر سا مال رکھتا ہوں۔ کوٹھی لیکر دوں گا میرے لئے تو اگر دو تین کروں والے پھر ٹے سے مکان کا انتظام ہو جائے۔ تو کافی ہے اس پر سردار نور سنگھ مجھے ناجائز کی سرانے شادیات دیہ وسیع بلڈنگ کی لاکھ پڑی کی لاکھ سے تیار ہونے لگی نصیحت و پیہ ریاست نا بھگنے دیا تھا۔ اور نصف پبلک۔ پھر چندہ کے ذریعہ جمع کیا تھا یہ سڑک کی ہماروں کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی اور اس میں راتیں بھی ٹھہرتی تھیں۔ اس میں بستر بانی بہت سے کمرے اور کون پر چار بارغ چھوٹی چھوٹی خوبصورت کالچ بھی تھیں، میں نے گئے۔ اس بلڈنگ کی ایک کالچ کو دکھایا۔ جسے میں پسند کیا۔ ایک چھوٹا سا سونے کا کمرہ۔ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم غسل خانہ۔ باورچی خانہ وغیرہ صاف ستھرے کمرے سردار صاحب نے اس کو فرنش کرنے کا حکم دیا۔ سرکاری باورچی اور ایک ملازم کا انتظام ہو گیا۔ سرکاری رسید یعنی سالن خوراک کے روز بھیجنے کے لئے چٹ بھیج دی گئی یہ تمام انتظام ہونے کے بعد سردار نور سنگھ نے پوچھا۔ کتنا دیر یہ نقد چاہئے۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہ تھا۔ مگر "بھلا بھلا" پرانے ریاستی اہلکار سے اپنے اخلاص کا اظہار کیونکر کرتا۔ میں نے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ نہیں روپیے کی ضرورت نہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ سردار صاحب اپنے کام پر واپس چلے گئے میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آ گیا۔ میرے آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مکان کا ادھر کا چوبارہ بھی میرے لئے فرنش ہو چکا تھا۔ اس چوبارہ میں ایک پلنگ ایک تخت پرش۔ ایک کرسی۔ ایک مونڈھا۔ ایک چھوٹی میز اور غسل کے لئے ایک ٹب۔ پینچ لگیا تھا میں جیران کو ڈاکٹر صاحب کی اس مہربانی سے کیونکر انکار کیا جائے۔ جرات نہ ہوتی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے قریب سوچا رہا۔ آخر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ کھانا کھانے کے بعد نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ سردار نور سنگھ بٹے تھے۔ انھوں نے ہمارا جہانے کے حکم کے باعث مشورہ دیا ہے کہ میں ضرور دوسری جگہ رہوں۔ چنانچہ انھوں نے سرانے شادیات کی بلڈنگ کی ادھر کی ایک کالچ میں میرے لئے انتظام کیا ہے میں اب وہاں جاؤں گا۔ یہ ٹھنڈے ہی ڈاکٹر صاحب چھوٹا ہونے بزرگانہ نصیحتیں شروع ہوئیں کہ کھر کا مکان چھوڑ کر دوسری جگہ جانا بدنامی کا باعث ہے۔

یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سامان جو بارہ میں بیچ چکا ہے۔ بھتیجی کو ریشن بیٹے کے برابر ہوتی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ خاندان کے لوگوں میں اتفاق ہو۔ تو اس میں شرکت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ میں سُتار دیا۔ دو گھنٹہ تک کی کشش جاری رہی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے جانے نہ دیتے تھے۔ میں جانا چاہتا تھا۔ دو گھنٹہ کی کش کش کے بعد یہ فیصلہ ہوا۔ اور مجھے اس شرط پر جانے کی اجازت ملی۔ کہ میں گورہوں کو سرائے شادیات کی کاٹنج میں۔ مگر کھانا دو دنوں وقت ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں نے جیون سنگھ کو مزدور لینے کے لئے بھیجا۔ مزدور سے سامان اٹھا کر جیون سنگھ کے ساتھ سامان سرائے شادیات میں بھجوایا۔ اس کے بعد خود وہاں گیا۔ میرے جانے سے پہلے اس کاٹنج میں دریاں بچھ چکی تھیں۔ برتن وغیرہ بیچ چکے تھے۔ میزوں پر چھینیاں صاف کر کے لیمپ رکھے گئے تھے۔ کھانے کا سامان۔ آٹا، مہزی۔ گوشت۔ دال گھی وغیرہ بیچ چکا تھا۔ اور ایک بادرچی اور ایک ملازم موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر ممکن ہو۔ تو آپ پچاس روپے قرض دیدیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً پچاس روپیہ دے دیئے اور دیتے ہوئے کہا بیٹا یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ اگر تم چاہو۔ تو ہزار روپیہ لے سکتے ہو پچاس کا کیا سوال ہے۔ روپیہ لینے کے بعد میں سرائے شادیات میں چلا گیا۔ میری تقرری کا حکم اُس روز سے جاری ہوا۔ جس روز میں ڈیرہ ودن ہمارا ج سے ملا تھا۔ اس سرائے شادیات میں تین ماہ کے قریب بطور سرکاری جہان رہا پھر میں نے یہاں ہٹا سبب نہ سمجھا۔ کراہیہ پر مکان لے کر اُس میں چلا گیا۔ بالی نا بھ میں اڑھائی تین سال کے قریب رہا۔ پھر میری موجودگی میں ہی وہاں انقلاب ہوا اور ہمارا جگہ گدی سے دستبردار ہوئے۔ ہمارا جکی دستبرداری کے بعد ریشن اینڈ سٹریٹ نے مجھے گرفتار کیا۔ تو پھر اسی سرائے شادیات کی بلڈنگ کی کاٹنج میں مجھے تین ماہ نظر بند رکھا گیا اور جب رات جوتی تو میرا ریاست نا بھ میں داخلہ بند کرویا گیا کسی بار وہاں کی گورنمنٹ کو کھٹا کر مجھے نا بھ آنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ میں ان لوگوں سے مل سکوں جن کے ساتھ دل کو تعلق رہا۔ مگر نا بھ گورنمنٹ نے یا تو جواب نہ دیا۔ اگر دیا تو یہی کہ اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مگر دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر کبھی نا بھ گیا تو اس سرائے شادیات کی بلڈنگ کو ضرور دیکھوں گا۔ جہاں شروع میں بطور جہان ادا آخریں بطور قیدی کے رہا۔ ان تمام واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حالات غیر موافق ہوں تو عزیز داتا رب بھی نفرت کرتے ہیں۔ اور حالات موافق ہوں تو یہ نفرت محبت میں بدل جاتی ہے۔

## نسل اور محبت کا اثر

دہلی میں میرے ایک دوست ٹھکریوسف صاحب تھے جو خواجہ خن نظامی اور ان کے دوستوں میں بھی عزیز سمجھے جاتے۔ ان یوسف صاحب کو مالیر کوٹلہ کی ایک حسین طوائف شریفین سے عشق ہو گیا۔ اس شریفین کا پہلے تعلق نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ساتھ تھا۔ یوسف صاحب خوبصورت ہیں۔ شریفین کو بھی یوسف صاحب سے بے حد محبت ہو گئی۔ بلکہ واقعیہ ہے کہ اس محبت کے سلسلہ میں شریفین نے ہی پہلے قدم اٹھایا۔

یوسف صاحب اور شریفین کا تعلق پہلے تو راز میں رہا۔ اور شریفین کی والدہ اور اُس کے بھائیوں کو کوئی علم نہ ہوا۔ ان تعلقات کے زیادہ بڑھنے پر جب شریفین کے خاندان کے لوگوں کو علم ہوا۔ تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور قدم قدیم پر غل ہونا چاہا۔ کیونکہ یہ لوگ خواہیں اور ہمارا جس کے متلاشی تھے یوسف صاحب کے ذرائع آمدنی محدود تھے۔ اور وہ مالی اعتبار سے شریفین کے گھروالوں کی خواہش پوری نہ کر سکتے تھے۔ آخر کش مکش شروع ہوئی۔ شریفین اور یوسف صاحب آپس میں تعلقات قائم رکھنا چاہتے تھے۔ مگر شریفین کے والدین قدم قدم پر غل ہوتے۔ یہ تعلقات کچھ عرصہ تک تو درپردہ جاری رہے۔ آخر یوسف صاحب کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں اور آپ نے چاہا کہ آپ کی شریفین کے ساتھ شادی ہو جائے۔ شادی کے لئے آپ نے مشورہ کیا تو ایڈیٹر "ریاست" نے کہا کہ شریفین کے خاندان کے لوگوں کو سمجھا کر ان کو بھی شادی پر آمادہ کر دیا جانا چاہیئے چنانچہ مشورہ کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے شریفین کی والدہ کو درویشاں ٹوٹا ٹوٹا ٹھیکس (بٹو بٹو) جب وہ آئیں۔ تو ان کو اور یوسف صاحب کو میں بات چیت کرنے کے لئے موٹرس لے گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ کنٹاٹ پلیس کی گھاس بھائیٹھے۔ یوسف صاحب نے عزت و احترام یا غشام کے باعث اپنا سلک کا کرٹ "ٹاکر" مان جی "کے لئے گھاس پر بچھا دیا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے محبت کے فلسفہ پر ایک طرح سے غلط شروع کیا۔ کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت۔ رسول اللہ بھی محبت کو پسند کرتے تھے۔ اور تمام نبیوں۔ اوتاروں اور گروؤں نے محبت کے درجہ کو بہت بلند قرار دیا ہے۔ محبت سے روح پاک ہوتی ہے۔ اور اُس شادی کو شادی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جس کی تہ میں محبت نہ ہو۔ وغیرہ۔ آخر میں کہا کہ چونکہ یوسف صاحب اور شریفین کی آپس میں محبت ہے اس لئے ان دونوں کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ تاکہ شریفین حرام کی زندگی کو چھوڑ کر ایمان و راحت کی زندگی بسر کرے۔ شریفین کی والدہ کو میں نصعت گھنٹہ کے قریب سمجھانا ہوا اور وہ میرا منہ دیکھتی رہیں اور خاموشی کے ساتھ سننے لگیں۔ میں جب اپنی تمام نصیحتوں کا ذخیرہ ختم کر چکا۔ تو شریفین کی والدہ نے بیجا بی زبان میں درجہ کر یہ مایہ کرکٹ کی تھیں اجواب دیا۔ جس کا ترجمہ یہ تھا۔

"سردار جی۔ آپ کس خیال میں پھر رہے ہو۔ ہمارے گھر دل میں تو محبت کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔

ہماری بچیاں جب پیدا ہوتی ہیں۔ تو ان کے کانوں میں کہا جاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں جودل چاہیے کرنا۔ مگر کسی سے محبت نہ کرنا۔ جب یہ بڑی ہوتی ہیں۔ تو ایک ہی سبق دیا جاتا ہے کہ محبت محبت کہنے والے لوگ خود غرض اور بد معاش ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ یہ شریفین لڑکیوں کو گھروں سے نکال کر لے جائیں اور برباد کر دیں۔ ہمارے دل سے بچھوڑ تم کہتے ہیں اگر رز کی نے کسی آشنا یا دوست سے محبت کرنی ہو۔ تو بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ اور ہم اس سے جتنا کہ بھی کدہا نہ دیں۔ میں تو سننے لگی کہ اخبار دالے بڑے شریف آدمی ہوتے ہیں۔ آپ کہاں کے شریف ہیں جو لوگوں کی لڑکیوں کو بہا کرے پر شے بیٹھے ہیں۔ ہمارا گھر تباہ ہو جائے گا تو آپ کے ماتھے کیا آئے گا؟"

شریفین کی والدہ کا جواب سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس سے کیا کہنا میں نے سمجھ لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہم دہاں سے آئے۔ شریفین کی والدہ کو بڑا شاہ بولا پر اس کے مکان کے قریب چھوڑا۔ اور ہم دونوں واپس دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ دیر تک مشورہ ہوتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شریفین باغ ہے۔

دو غنہ چاہتی ہے کہ اس کی شادی ہو۔ اس لئے اس کی ماں کی پروا نہ کرتے ہوئے نکاح کر لیا جائے۔  
 شریفین کی والدہ اور اس کے بیٹائی شریفین کی بہت حفاظت کرتے تھے کہ یوسف اس کو کہیں نہ لے  
 کر نہ لے جائیں۔ اس کو اکیلے کبھی نہ جانے دیتے۔ ہمیشہ ساتھ جاتے ہیں لے شریفین کے بڑے بھائی محمد عمر کو  
 پیغام بھیجا کہ دو شام کو شریفین کے ساتھ آکر مجھ سے مل جائے۔ یوسف کے ساتھ مشورہ کرنا ہے محمد عمر شریفین  
 کو ساتھ لے کر کچھ بجے کے قریب میرے مکان پر آگیا۔ یوسف موجود تھے۔ کچھ دیر تک توہم باتیں کرتے رہے۔  
 اس کے بعد میں نے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایک ضروری معاملہ کا پتہ لینا ہے اس زمانہ میں  
 لو اب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ کا مفقہ مدخل رہا تھا بھوپال کے دو افسر آج شام کسی گاڑی  
 دہی سے جائیں گے اور معلوم کرنا ہے کہ وہ کس گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ یوسف صاحب  
 نے بناؤنی تشویش کا اظہار کیا کہ کس طرح پتہ لینا چاہئے۔ محمد عمر پنجاب کا رہنے والا مستعد آدمی تھا۔  
 ہماری تشویش کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”کس بات کی تشویش ہے۔ مجھے بہت اذیت میں پتہ لانا ہوں۔“

محمد عمر کو میں نے ایک روپیہ مانگ کر دے دیا اور کہا کہ وہ شخص ہیں۔ دونوں نے اچکن اور میٹ پہن رکھی ہیں  
 تم ریلوے سٹیشن پر سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس جا کر کھڑے ہو جانا۔ جب یہ دونوں آئیں تو  
 پلیٹ فارم پر چلے جانا اور دیکھنا کہ کس گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ اور جب تک کہ رات کو جانے والی تمام  
 گاڑیاں چلی نہ جائیں ان کی نگرانی کرنا کہ ان سے کون کون جلتا ہے۔ محمد عمر اس ہدایت کے مطابق سٹیشن  
 چلا گیا اور سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس رات کو دس بجے تک کھڑا رہا۔ جب تمام گاڑیاں نکل گئیں۔  
 تو یہ بچار واپس آیا۔ اور اس نے آکر بتایا کہ اس نے خوب نگرانی کی۔ اچکن اور میٹ والے بھوپال کے  
 کوئی آدمی کسی گاڑی پر سوار نہیں ہوئے۔ بھوپال کے آدمی کہاں آنے لگے۔ اس پچاسے کو تو صرف اس لئے  
 ریلوے سٹیشن بھیجا تھا کہ دو اٹھائی گھنٹہ کے لئے ہمیں شادی کا موقع مل جائے۔

محمد عمر کے جلسے سے پہلے تمام انتظام ہو چکا تھا اس کے جانے کے بعد دلی کے تحصیلدار میر حسین۔ رائے صاحب  
 لالہ گہال واس ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و انزیری مجسٹریٹ۔ مسٹر برج بہاری توگی ایڈوکیٹ اور دو تین  
 اور اصحاب آگئے۔ قاضی صاحب تشریف لے آئے۔ بتائے، چھوٹے اور مٹھائی شکائی گئی۔ ”ریاست“  
 پر میں کے فورین آستانہ تصدق حسین نے لڑکی کے دلی کے فرائض ادا کیے۔ تصدق حسین پہلے تو ہچکچاتے  
 مگر جب ان سے یہ کہا گیا کہ یہ کارِ ثواب ہے تو آمادہ ہو گئے۔ حق مہر لکھا گیا۔ نکاح نامہ تیار ہوا۔ اور اس پر  
 تحصیلدار صاحب۔ انزیری مجسٹریٹ اور وکیل صاحبان اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے بطور گواہوں کے دستخط  
 ہوئے۔ قاضی صاحب نے شریفین بی بی سے ”قبل ہے“ وغیرہ پوچھا۔ شریفین نے بھی ”ہاں قبل ہے“ کہا۔  
 نکاح ہوا۔ چھوٹے بتائے اور مٹھائی ”لڑکی دالیں“ اور ”برات“ میں تقسیم ہوئی۔ اور یہ تمام کارروائی نو بجے  
 سے پہلے ختم کر دی گئی۔

دس بجے محمد عمر صاحب تشریف لائے۔ تو اس سے پہلے ”لڑکی والے“ اور ”برات“ والے چھوٹے  
 اور مٹھائی کھا کر روانہ ہو چکے تھے۔ مگر میں صرف ”دلہن“ یعنی شریفین ”دلہا“ یعنی یوسف صاحب اور

ایک "گواہ" یعنی ایڈیٹر ریاست "بیٹھا تھا۔ اور پاس پھولوں کے دو تین ہار پڑے تھے۔ جو دھلا اور دھن کو شادی کے وقت پہناتے گئے تھے۔ مخدوم پچارے کو کیا علم کہ اس کے سٹیشن سے دایں آنے سے پہلے بقول اُس کی والدہ کے اُن کا گھر برباد ہو چکا ہے۔ اور یوسف صاحب کا گھر آباد ہو چکا ہے۔ مخدوم کے آگے پشیمین اپنے بھائی مخدوم پر برس پڑیں۔ کہ اتنی دیر سے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اُن گھر میں ناراض ہوتی ہوں گی۔ کہاں چلا گیا تھا۔ اور اس نے سٹیشن پر اتنی دیر کیوں لٹکائی۔ مخدوم کو گھر میں شریفین سے کافی بُرا تھا۔ مگر انہوں میں جھوٹی طعنے کی لڑکیاں بھی بڑی گھر کے بھائی۔ ماں اور باپ کو ڈانٹا بیٹھی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ تمام لوگ مگر ان کے رحم پر ہیں۔ مخدوم پچارے نے اس ڈانٹ کا صرف یہی جواب دیا کہ اگر کام پورے طور پر نہ کر کے آتا۔ تو سرور صاحب (یعنی دیوان سنگھ) ناراض ہوتے۔ اب میں اگر حکم کی پورے طور پر تعمیل اپنی بھال کے لوگوں کی اچھی طرح سے نگرانی کر کے آیا ہوں تو تم ڈانٹتی ہو۔ اس کے بعد شریفین اور اس کا بھائی تو اپنے گھر چلے گئے۔ اور یوسف صاحب اپنے گھر۔

اس شادی کا علم سوائے قاضی صاحب۔ دھلا دھن یا گیا ہوں اور لڑکیوں کے کسی دوسرے کو نہ تھا۔ اس وقت تک شریفین کی والدہ اپنی لڑکی کے بچہ کو گھر پر صرف اس حد تک آباد نہ تھی کہ اس کا اتفاق یوسف سے بھی رہے۔ اور وہ بیٹے کے ذریعہ امر کے طبقہ سے روپیہ بھی پیدا کرتی رہے۔ مگر شادی کے بعد نے بھگڑے شروع ہوئے شریفین نے دوسرے لوگوں کے ہاں جائیداد سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی والدہ اور اس کے بھائی چسور کرتے ہوئے تقریباً نہیں آئیں۔ نواب صاحب مالیر کوٹہ کے پیغام چلے آتے ہیں۔ کہ مالیر کوٹہ آؤ۔ مگر شریفین دہلی چھوٹا نہیں جانتیں۔ اور نواب صاحب کی پروا کرنے کی تیار نہیں۔ دوسرے لوگ آتے ہیں تو ان کے سامنے نہیں ہوتیں ایک دواہ تک جھگڑے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر شریفین نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ چونکہ اس کا نکاح یوسف صاحب کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ تعلق نہ رکھیں گی۔ اس کو وہ حرام سمجھتی ہیں اور اگر ان لوگوں نے تنگ کیا۔ تو یہ گانا بھی چھوڑ دیں گی۔ اور یوسف صاحب کے گھر جا کر پروہ میں بیٹھ جائیں گی۔ شریفین سے اس انکشاف کو سن کر شریفین کی ماں اور بھائی سرسپے کر بیٹھ گئے۔ اُن کو اب پتہ چلا کہ اُن کا گھر تباہ ہو گیا ہے اور وہ لٹ چکے ہیں۔ ان لوگوں کی نگاہ میں سب سے بڑا انجیم دیوان سنگھ تھا جس نے نکاح کا انتظام کیا۔ ہر روز شکوے۔ ہر روز شکایتیں۔ کبھی یہ کہ شریفین نے روپیہ کمانا چھوڑ دیا۔ کھائیں کہاں سے۔ نواب صاحب مالیر کوٹہ اتنے سرد پیہما ہمارے دیتے تھے۔ اب پیہہ کی آمدنی نہیں برباد ہو گئے۔ کہاں جائیں۔ کیا کریں۔ یوسف صاحب ان آدمی کم ہے۔ ہمارے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ جب ان شکایتوں کا سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا۔ تو یوسف صاحب شریفین کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ اور انہوں نے اپنی بیوی کو پروہ میں بٹھا دیا۔ اور شادی کے بعد دو تین سال کے اندر وہ لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یوسف صاحب کی آمدنی محدود تھی۔ دو تین سال تو ان کے چھ گزرے۔ بچوں کے ہونے کے بعد شریفین کی محبت قدرتی طور پر اپنے شوہر سے کم ہو کر بچوں میں منتقل ہو گئی۔ وہ پہلے تو ساتھ مرنے کا دم بھرتی تھیں۔ اب شکایت ہے کہ فلاں بچے کے لئے ناشی فراک نہیں آیا۔ اور فلاں بچے کے لئے جتا اور ٹوپی نہیں۔ ان شکایتوں نے سنجیدہ صورت اختیار کی۔ اور شریفین کی ماں کو بے بے معلوم ہوا کہ شریفین مطمئن نہیں۔ اس نے پھر اپنی بیٹی پر دُرے ڈالنے شروع کئے۔ وہ جب شریفین

سے ملتیں یہی کہتیں کہ نواب صاحب نے دود و سدر پہ کی سازجیاں لے دی تھیں۔ فلاں راجہ صاحب نے جزا و گنہگار لے دیا تھا اور فلاں سیٹھ نے موٹر لے ویٹے کا وعدہ کیا تھا۔ ان باتوں کا ذکر شریفین کی آنکھوں سے آنسو نکال دیتا کیونکہ اگر اچھے دن دیکھے ہوں۔ تو پھر بڑے دنوں کا مقابلہ کرنا بہت مصیبت ہوتا ہے۔ شریفین خانہ دانی طوائف ملتی اس نے بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ ان کے آنکھ کے اشارے پر کیونکر ٹکڑے سے بڑے نواب راجے اور امیر و امراں کرتے ہیں۔ ایک متوسط درجہ کے گھر میں رہ کر معمولی گزارہ پر کیونکر مطمئن ہوتی۔ قیصر یہ ہوا کہ دن رات جھگڑے رہنے لگے۔ اور وہ پھر اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد یوسف صاحب نے بہت کوشش کی کہ یہ واپس آجائے۔ اور گھر کی زندگی بسر کرے۔ مگر یہ اپنے والدین کے ہاتھوں میں تھی۔ یوسف صاحب کو قدرتی طور پر صدمہ ہوا۔ آپ نے اپنی بیوی اور اس کی والدہ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ بھی کچھ عرصہ چلتا رہا۔ آخر یوسف صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ جس صورت میں شریفین ان کے پاس رہنا نہیں چاہتی ان کو اپنا خیال بدل دینا چاہئے۔ چنانچہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ اب شریفین پھر اپنی ماں اور بھائیوں کے پاس غالباً المیر کوٹہ میں ہی رہتی ہے۔ اس نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا ہے۔ اس کی چھٹی ٹہنیں اس کے بعد پیشہ کرتی رہیں جن سے ان کو کافی آمدنی تھی۔ اب نہیں کہا جاسکتا۔ کہ ان کی آمدنی کی صورت کیا ہے۔ یوسف صاحب سے اب باتوں باتوں میں کبھی شریفین کا ذکر آجائے تو ان کی پیشانی پر ریل سے بڑ جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں محبت کی جگہ انتقام اور انتقام کے بعد نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہ شریفین کا نام سُنتا بھی پسند نہیں کرتے۔

اوپر کے ان واقعات سے طوائفوں کی فطرت کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ جب طوائف محبت کے جذبات سے مغلوب ہو تو اپنی طوائفیت کو عارضی طور پر بھول جاتی ہے۔ مگر اس کے بعد جب محبت کے یہ جذبات کم ہونے لگتے ہیں تو اس کی وجہ محبت کا بچوں میں منتقل ہونا ہی کیوں نہ ہو۔ دہر عورت کی فطرت ہے۔ کہ اس کی سگائی کے دن سے لے کر کچھ ہونے تک اس کی محبت کا مرکز سونی صدی اس کا شہر ہوتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد یہ محبت در حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دسواں حصہ اس کے شوہر کے لئے وقف رہتا ہے۔ باقی نوے فی صدی بچہ پیدا ہوتے ہی بچہ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ اولاد دہونے کے بعد اپنی بیویوں سے محبت کے کم ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ محبت کے فلسفہ سے نا آشنا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ عورت فطرتاً عبور ہے کہ اس کی محبت بچہ ہونے کے بعد فوراً بچہ میں منتقل ہو جائے تو یہ زیادہ طویل عرصہ تک گھریزہ زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں۔ تو ان کو ان کے عاشقوں اور مرنے والوں کی یاد ہمیشہ تڑپاتی ہے۔

بھدہ بالی اور شیر پور میں اس کے مرحوم منسٹر فلاں بہادر سر اسرار حسن بہت تجربہ کار اور صنعتدار ہزرگ تھے۔ ایڈیٹر ”دیپا ست“ کو اپنا عزیز سمجھتے۔ اور حب بھی دہی آتے۔ ان سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ انسان گھڑا، کتا اور بلی خریدتا ہے تو خریدنے سے پہلے دیکھتا ہے کہ یہ کس نسل کا ہے۔ دو نظر تو نہیں۔ یعنی گھڑا ہے تو کیا خالص عربی ہے۔ کتا ہے تو کیا خالص چینی یا فاکس شیر میر ہے۔ اور کیا بلی خالص پرشین ہے۔ اگر جانوروں کے متعلق یہ احتیاط ہے۔ تو انسانوں کے ساتھ دینی

رشتہ داری یا تعلقات کرتے ہوئے کیوں نہ نسل یا خاندان دیکھا جائے۔ ہر اسرارِ حق خاں صاحب کے اس خیال کی تائید میں ایڈیٹر ”ریاست“ کا بھی یہی تجربہ ہے کہ انسان جس خاندان میں پیدا ہوا جس فضا میں اس کی پرورش ہو۔ اُس کا انسان کے کیریکٹر پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اول تو یہ کیریکٹر بدلتا نہیں۔ اور اگر بدلتا بھی ہے تو اس شخص کے طویل عرصہ تک مسلسل بہت بڑی کوشش اور ضمیر کے ساتھ بار بار جدوجہد کرنے کے بعد۔ دنیا کے کاروبار میں یہ وجہ لینا چاہئے کہ جس کے ساتھ واسطہ پڑے گا اس کا پچھلا کیریکٹر کیا ہے۔ اور اگر کیریکٹر میں کمزوریاں ہیں تو کیا ان کی اصلاح ممکن ہے۔

## راز داری اور کامیابی

دہلی سے روزانہ ”ترغیث“ اخباری ہونے سے کچھ عرصہ پہلے میں ریاست حیدر آباد گیا۔ راستہ میں چند روز نانڈیڑ دجھاں کو گورو گوبند سنگھ صاحب کا وصال ہوا اور جہاں ہندوستان کے اس ایک سب سے بڑے شاعر شجاع اور محب الوطن کا مزار بھی ہے، ٹھہرا۔ نانڈیڑ میں گورو گوبند سنگھ اور شہنشاہ عالم گیر اورنگ زیب کی خط و کتابت کے متعلق مجھے کچھ ایسے حالات معلوم ہوئے جو سکھ تاریخ میں درج نہ تھے (یہ حالات حیدر آباد سے واپسی پر بمبئی کی صورت میں اور امرتسر کے روزانہ ”اردو“ اکالی کے گورو گوبند سنگھ نمبر میں شائع ہوئے) نانڈیڑ سے میں حیدر آباد گیا۔ اور وہاں سے واپسی پر اورنگ آباد آ کر اس گورو داروہ میں گیا جو بھائی دیاسنگھ (گورو گوبند سنگھ کے زمانہ کے مشاہیر میں سے ایک بزرگ) کے نام سے مشہور ہے۔ اور جہاں بھائی دیاسنگھ اُس وقت مقیم ہوئے جب وہ گورو گوبند سنگھ کا خط (ظفر نامہ) لے کر اورنگ آباد اورنگ زیب کے پاس پہنچے۔ اس گورو داروہ میں کرنٹھ صاحب کے سامنے ایک روپیہ بطور نذر رکھ کر میں نے ماتھا ٹیکا دسجدہ کیا، اور بیٹھ گیا۔ اس گورو داروہ کا سفید ریش بڑھا سکھ مہنت اور اُس کی بیوی بھی وہاں موجود تھے۔ میں جب بیٹھ گیا تو اس مہنت کے اور میرے درمیان یہ گفتگو ہوئی:-

مہنت:- آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔

میں:- میں حیدر آباد سے آ رہا ہوں۔

مہنت:- کہاں کے رہنے والے ہو۔

میں:- میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

مہنت:- کونسا ضلع۔

میں:- گوجرانوالہ۔

مہنت:- کونسی تحصیل۔

میں:- حافظ آباد۔

مہنت:- کونسا گاؤں۔

میں:- خاص حافظ آباد۔

مہنت :- آپ کون مسکے ہیں۔  
میں :- کھتری گھنٹہ۔

مہنت :- آپ کا مکان حافظ آباد میں کس طرف ہے۔  
میں :- جس گلی کے پورے پرٹھا کر دوارہ اور لالہ جوتی رام کپور کا مکان ہے۔

مہنت :- کیا آپ سردار میوہ سنگھ کے لڑکے ہیں۔  
میں :- نہیں میں ڈاکٹر مدھان سنگھ کا لڑکا ہوں۔ سردار میوہ سنگھ میرے چچا ہیں۔  
مہنت :- کیا آپ کا نام کرتا سنگھ ہے۔

میں :- نہیں میں کرتا سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں میرا نام دیوان سنگھ ہے۔

میرے اس کہنے کے بعد ایک خاموشی سی طاری ہوئی۔ اور میں نے غصے میں کیا کہ اس بوڑھے سفید پیش مسکے مہنت کی آنکھیں کچھ ترسی ہو گئی ہیں۔ میں حیران کر یہاں ہزار ہا میل دور یہ کون شخص ہے۔ جو مالے گھر کے تمام لوگوں سے واقف ہے۔ کیونکہ اس نے ایک ایک کا نام لے کر پوچھا کہ فلاں کیسے ہیں۔ اور فلاں کی صحت کیسی ہے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ کس طرح ہم لوگوں کو جانتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بہت برس ہوئے ایک بار حافظ آباد جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

یہ باتیں جب ہو چکیں۔ تو مہنت صاحب اپنی بیوی کو اندر لے گئے۔ ان کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد ان کی بیوی نے میرے لئے بازار سے بھائی منگائی۔ سنگترے وغیرہ بچل ان کے گھر میں موجود تھے۔ انھوں نے میرے سامنے رکھے میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا ان کے گھر آنا ان کے لئے مسرت کا باعث ہے۔ ان لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میں دو چار روزان کے ہاں ہجان رہوں مگر میرا بسترہ اور ٹرنک ایک ریٹائرڈ مسکے صوبہ دار کے ہاں پڑا تھا۔ جو مجھے نامور ٹریڈ تھے۔ اور جنھوں نے مجھے اورنگ آباد آنے کی دعوت دی تھی۔ ان کے ہاں میں صوبہ دار کے ہاں پہنچا۔ ہاں کھانا کھایا۔ انھوں نے میرے لئے مرغ پکا رکھا تھا۔ یہ مرغ بہت مرض تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے محسوس کیا کہ انھوں نے کئی بہت زیادہ ڈال دیا ہے۔ تو انھوں نے مجھے ایک کٹوری چربی کی دکھائی۔ جو مرغ بکاتے ہوئے انھوں نے پکانے والے برتن میں سے نکالی تھی۔ اور کہا کہ گھی کا تو ایک قطرہ بھی اس میں نہیں ڈالا۔ بلکہ یہ چربی اس مرغ کی ہے۔ جو پکتے پکتے نکال لی گئی۔ میں حیران۔ کیونکہ میری زندگی میں یہ سننے کا پہلا موقع تھا کہ مرغ میں تو بھی چربی نکال لی جاتی ہے۔ میری حیرانی کو دیکھ کر صوبہ دار صاحب نے بتایا کہ ان کے ہاں پانچ چھ پھینسیں ہیں۔ یہ رات کو پھینس کے دودھ میں چنے کی وال بھگو دیتے ہیں۔ اور صبح دودھ والی وال ان مرغوں کو کھلاتے ہیں۔ اور ایسی وال پر ہی ان پرندوں کی ہمیشہ پرورش کی جاتی ہے جس کے باعث یہ پرند بہت فربہ اور جلی والے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان مرغوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اتنے فربہ مرغ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اور کبھی سنا بھی نہ تھا کہ بغیر گھی کے مرغ پکایا جائے۔ اور اس کے پکتے پکتے ایک کٹوری چربی نکال لی جائے۔

اورنگ آباد میں ایک رات رہا۔ اگلی صبح روانہ ہوا تو مہنت صاحب بیٹے کے لئے تشریف لائے۔ میں پنجاب آیا۔ حافظ آباد پہنچا۔ تو میں نے اپنے چچا سردار میوہ سنگھ کو بتایا کہ اورنگ آباد میں اس طرح



ہنت صاحب سب کے متعلق پوچھتے تھے۔ میں نے علیہ بیان کیا تو خیال ہوا کہ اورنگ آباد والے ہنت صاحب ہاں سے ایک رشتہ دار ہیں جنہوں نے میری پیدائش سے پہلے حافظ آباد میں ایک عورت کا قتل کیا تھا۔ قتل کرنے کے بعد وہ بھاگ گئے۔ ریاست حیدر آباد پہنچے۔ اس قتل کے واقعہ کا انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ذکر نہ کیا اور حیدر آباد میں ہی مقیم ہو گئے۔ جب وہ قتل کرنے کے بعد حافظ آباد سے بھاگے تو نوجوان تھے۔ اور جب میں نے اورنگ آباد ان کو دیکھا تو وہ سفید ریش بڑھے تھے۔ میرے تمام حالات بیان کرنے کے بعد میرے چچا سردار میروہ سنگھ نے اورنگ آباد ہنت صاحب کو خط لکھا۔ تو ان کا جواب آیا کہ ہاں وہ فی الحقیقت وہی ہیں۔

یہ ہنت صاحب غالباً اب انتقال کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس وقت بھی کافی بڑھے تھے۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ ہنت صاحب اس قتل کے متعلق راز نہ رکھتے تو گرفتار کئے جا کر ساہا سال پہلے پھانسی پر چڑھ چکے ہوتے۔ مگر چونکہ انھوں نے راز رکھا۔ آپ نے کسی دوست یا متعلق والے بلکہ اورنگ آباد والی بیوی اور بچوں سے کبھی ذکر نہ کیا۔ اور زندہ رہے۔ اور اپنی طبعی عمر تک پہنچے۔ اس واقعہ کے ساتھ اس متم کا ہی ایک دوسرا دلچسپ واقعہ سنئے جو راز نہ رکھنے کے متعلق ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب میں دہلی جیل میں تھا تو اس وقت سینٹیل کلاس والی کالج کے سامنے کی کوٹھڑیوں میں دہلی کا رہنے والا ایک شخص موہن قتل کے الزام میں گرفتار تھا۔ اس موہن نے دہلی میں قتل کیا۔ تو قتل کرنے کے بعد یہ دہلی سے بھاگ کر ناگپور چلا گیا۔ ناگپور پہنچ کر اس نے پان سگرٹ کی دکان جاری کر لی اور زندگی گزارنے لگا۔ دہلی میں پولیس نے اس کے وارنٹ نکال دیئے۔ مگر پولیس کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کہاں ہے۔ یہ موہن عیاش طبیعت کا آدمی تھا۔ اور شراب پیتا تھا۔ انسان جہاں بھی رہے۔ وہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہو جاتے ہیں۔ موہن کی بھی ناگپور میں کئی لوگوں کے ساتھ واقفیت ہو گئی اور اس کے کئی دوست ہم نوالہ اور ہم پیاہ بھی ہو گئے۔ ان دوستوں میں سے ایک شخص اس کا گہرا اور رازدار دوست ہو گیا۔ دونوں اکٹھے شراب پیتے اور اکٹھے ہی عیاشی کرتے۔ چنانچہ ایک روز موہن نے اعتماد کرتے ہوئے اس دوست کو بتادیا۔ کہ وہ دہلی کا رہنے والا ہے وہاں اس نے ایک قتل کیا تھا اور اب وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد بھی دوستی کا سلسلہ جاری رہا۔ اور چھ ماہ کے قریب گزر گئے۔ اس کے بعد ان دونوں دوستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے دشمنی کی حد تک پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے پولیس والوں کو جاکر دیا۔ کہ موہن ایک قتل کے سلسلہ میں مفرد ہے۔ اور اس کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ پولیس نے غیہ شتمی اپنے وجوہ میں رپورٹ لکھی۔ اور اس کے دستخط کرائے۔ اور دستخط کرانے کے بعد موہن کی دکان پر پہنچ کر موہن کو گرفتار کر لیا۔ تھانہ لاہور دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) کے مطابق اس کو حالات میں بند کر دیا۔ اور دہلی پولیس کو تار دے کر پوچھا کہ کیا موہن نام کا کوئی شخص قتل کے الزام میں دہلی سے مفرد ہے۔ دہلی سے جواب گیا کہ ہاں ہے۔ چنانچہ موہن پر دفعہ ۱۰۹ کی بجائے ۳۰۲ (قتل) لگا کر اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر اسے دہلی جیل لایا گیا۔ اور قتل کے الزام میں اس پر سشن کرٹ میں مقدمہ چلا۔ اس موہن کا مقدمہ جیل رہا تھا کہ میں جیل سے رہا ہو گیا۔ بے جلم نہیں کہ اس مقدمہ میں موہن کو پھانسی ہوئی یا عمر قید۔ یا بری ہوا۔ مگر

ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہے کہ اس پر قتل کے الزام میں گرفتار ہونے اور مقدمہ چلنے کا باعث اس کا راز نہ رکھنا تھا۔ اور اگر یہ ناگیور میں اُس دوست پر اپنا راز ظاہر نہ کرتا تو اس پر یہ مصائب نازل نہ ہوتیں۔

اوپر کے ان دو واقعات سے رازد کھنے اور راز کے افشا کرنے کے نتائج ظاہر ہیں۔ یہ پوزیشن تو جرائم کے منتقل ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو سیاسی معاملات۔ زندگی کے ہر روز کے واقعات اور تجارت وغیرہ ہر کامیابی کے لئے انسان کو راز کی ضرورت ہے اور وہ لوگ بہت بے وقوف اور عاقبت نا اندیش ہیں۔ جو اپنا راز غیر ذمہ دار لوگوں کو بتاتیں اور یہ توقع کریں کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق ان کا راز کسی دوسرے پر ظاہر نہ کریں گے۔ اور راز کے افشا ہونے پر راز کے افشا کرنے کی شکایت یا گلہ کریں، چنانچہ میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی اہم راز کو غیر مناسب اور غیر ذمہ دار لوگوں پر ظاہر کرنا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں رستی ڈال کر دوسرے کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ اور پھر التجا کی جائے کہ اس رستی کو نہ کھینچئے۔ گلا گھٹ کر مر جاؤں گا۔

## روحانیت کا تجربہ

اب تو کئی برس سے وقت نہیں ملا۔ مگر پہلے یہ میرا معمول تھا کہ چھ سات دن کے قریب جب دہلی میں گرمی کا زیادہ زور نہ رہتا۔ تو میں دو ہفتہ کے لئے بمبئی چلا جاتا۔ بمبئی میں ہمیشہ آٹھ اور بارہ دن کے درمیان مون سون کی ہوا میں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور موسم بہت ہر فضا ہو جاتا ہے۔ دہلی میں بارش ۲۰ دن کے قریب شروع ہوتی ہے۔ اور بارش سے پہلے کے دو ہفتہ دہلی میں حشر سے کم نہیں ہونے چنانچہ میں بمبئی پہنچ کر جن کے ہفتی ہفتہ تک منتظر رہتا۔ جب یہاں سے بارش کے منتقل ہوتا رہتا تو وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ بمبئی کے یہ دو ہفتہ بہت دلچسپ ہیں گزرتے۔ چودھری عبدالغنی جنرل سیکریٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی (جن سے ہاتھ لگا کر میں نے بارہ اہل میں اُردو پڑھی، اور جن کا لندن میں انتقال ہو گیا تھا) اور مرحوم مولانا عفا (ذرائع نقل سیکریٹری خلافت کمیٹی) کا زیادہ وقت میرے ساتھ گزرتا۔ آہ ان دونوں دوستوں کا خلاص اور محبت میں کبھی نہ بھولوں گا۔

میں دہلی سے روانہ ہوا۔ جب گاڑی کلیان کے سٹیشن پہنچی تو میں نے "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ اُس روز کی قازہ خبریں پڑھنے کے لئے خریدا۔ خبریں دس پندرہ منٹ میں ختم ہو گئیں۔ میں سامان باندھ چکا تھا۔ اور ساتھ کی کتابیں میں بند تھیں۔ پڑھنے کے لئے صرف یہ "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ ہی تھا۔ خبریں پڑھنے کے بعد میں نے اس کے اشتہارات دیکھے شروع کیے۔ تو ایک اشتہار تھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے :-

روحانی تحریر

آئندہ کے اور پچھلے حالات روح کے ذریعہ کا غور رکھتے جاتے ہیں۔ مردہ اشخاص سے بھی بات چیت کی جاسکتی ہے۔

عمدہ بے مصری

یہ اشتہار میرے لئے کشش کا باعث ہوا۔ کیونکہ مجھے شروع سے ہی ادھوں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ایک خط ساتھ تھا۔ میں بسبی کے وکٹوریٹر میں پہنچا۔ تو دفتر ”ریاست“ بسبی کے منیجر مسٹر ہرنس لال موجود تھے۔ میں نے یہ اشتہار کاٹ کر ان کو دیا۔ اور کہا کہ کسی وقت ان کے پاس جا کر میری ملاقات کے لئے وقت مقرر کر لیجئے۔ مسٹر ہرنس لال اسی روز مسٹر محمود بے کے پاس پہنچے۔ اور جب ملاقات کے لئے پوچھا تو مسٹر محمود بہت خوش ہوئے۔ وہ اخبار ”ریاست“ سے واقف تھے۔ اور مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ آپ نے اگلے روز شام کا وقت مقرر کیا، اور کہا کہ ایڈیٹر ”ریاست“ شام کو چائے ان کے ساتھ ہے۔

میں اگلے روز شام کو مسٹر محمود بے کے پاس پہنچا۔ انھوں نے تحلف کے ساتھ چائے کا انتظام کیا تھا۔ اور وہ ایک خوبصورت یورپین لڑکی (جو ان کی سکرٹری تھیں) کے ساتھ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جب پہنچا تو آپ نے میرا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ہم تینوں نے بیچہ کچائے پی۔ مقدمہ اور اخبار کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم چائے پی چکے۔ تو میں نے کہا کہ آج میں اصل مقصد بیان کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ کی روحانی تحریر کو دیکھوں جس کا آپ نے اخبار میں اشتہار دیا ہے۔ مسٹر محمود بے نے میرا کو آواز دی۔ چائے کی میز خالی کر دی گئی۔ اور آپ نے میرے ہاتھ میں ایک بالکل کرا کا غذا دیا۔ اور کہا کہ بغیر اُن کو دکھائے اس کا غنہ پرستین یا پانچ سوالات لکھ لئے جائیں۔ اور لکھنے کے بعد اس کا غذا کو نہ کر دیا جائے۔ مسٹر محمود بے یہ کہہ کر اپنی سکرٹری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے تنہائی میں منسل کے ساتھ یہ سوالات لکھے۔

۱۔ آج دہلی میں بارش ہوئی یا نہیں ؟

۲۔ آج امریکہ میں گندم کا کیا نرخ ہے ؟

۳۔ مقدمہ میں جیتوں گایا یا ہاروں گا ؟

ان سوالات کو لکھ کر میں نے کاغذ کو تہ کیا۔ اور مسٹر محمود بے کو آواز دی کہ آج اپنے مسٹر محمود بے آکر میری دوسری طرف بیٹھ گئے۔ اور مجھ سے کہا کہ تہ شدہ کاغذ کو منسل کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھ لوں۔ میں نے ایسا کیا۔ مسٹر محمود بے مجھ سے دُور بیٹھے رہے اور مٹنہ سے کچھ پڑھتے رہے۔ پانچ سات منٹ پڑھنے کے بعد آپ نے مجھ سے کہا۔ کہ میں تہ شدہ کاغذ کھولوں۔ میں نے جب کاغذ کھولا۔ تو اس میں ہر سوال کے آگے جواب لکھا تھا۔

۱۔ آج دہلی میں بارش نہیں ہوئی۔

۲۔ امریکہ میں گہوؤں کا نرخ چار روپیہ من ہے۔

۳۔ میں مقدمہ جیتوں گا۔

یہ جوابات منسل سے ہر سوال کے آگے لکھے تھے۔ اور اس قسم کی تحریر جیسی بکھنے والے کے ہاتھوں میں عشاء ہو۔ اور لکھتے ہوئے ہاتھ کاٹنے ہوں۔

میں ان جوابات کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کورا کاغذ لیا۔ خود سوالات لکھے۔ کاغذ میرے ہاتھ میں آیا۔ مسٹر

محمود بے مجھ سے چھوڑے تک نہیں۔ یہ جوابات کون لکھ گیا۔ مسٹر محمود بے نے مجھ بے وقوف بنایا فی الحقیقت مسٹر محمود بے ایک روحانی بزرگ ہیں۔ کیا یہ جواب روح نے لکھے اور اگر محمود بے فی الحقیقت روحانی بزرگ ہیں۔ تو ان کے پاس یہ خوبصورت لڑکی کیوں۔ کیا روحانیت میں کمال حاصل کرنے کے لئے خوبصورت لڑکیوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ذہن میں مختلف خیالات تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ بنی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے مسٹر محمود بے سے کہا کہ آپ نے کمال کر دیا۔ میں ان واقعات کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اگر آپ روحانی بزرگ ہیں۔ اور یہ تحریر آپ کے حکم سے روح نے لکھی تو میرے دل میں آپ کے لئے بہت بڑی عزت ہونی چاہئے۔ کیونکہ روحانی بزرگ ہیں۔ اور اگر یہ روح کا کام نہیں۔ صرف ہتھکنڈے کا کام ہے تو میرے دل میں آپ کے لئے اس عزت اور آپ کے روحانی بزرگ ہونے کے باعث میرے دل میں ہونی چاہئے) اسے کئی سو گنا زیادہ قدر ہے۔ کہ آپ نے مجھ جیسے اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھنے والے کو بھی بے وقوف بنادیا۔ اور آپ کے اس کمال کے سامنے مجھے سجدہ کرنا چاہئے۔

مسٹر محمود بے اور ان کی سکرٹری یہ سن کر کھلکھلا پڑے۔ اور دونوں نے میری اس بے تکلفی اور صاف بیانی کی داد دی۔ مسٹر محمود بے نے میرے اس کہنے پر جواب دیا کہ یہ روح کا کام ہے۔ ہتھکنڈے کا نہیں۔ میں مسٹر محمود بے کے اس جواب سے مطمئن نہ تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اس راز کا کید نہ کر پتہ لیا جائے۔ میں نے مسٹر محمود بے کو اپنے ہوٹل میں ڈنر پر آنے کو کہا۔ وہ ایک روز بعد رات کو آئے۔ کھانے کے ساتھ انھوں نے دسکی پی۔ کھانے کے بعد ہم سیر کے لئے موٹر میں گئے۔ اور پھر میں ان کو ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس ہوٹل آ گیا۔

مسٹر محمود بے کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ اپنی اس ”روحانیت“ سے چار پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے ہیں۔ قیمتی موٹر۔ ہیرے خانے اور دوسرے اخراجات۔ طبعاً فیاض ہیں جس کا نتیجہ یہ کہ ہمیشہ مقررہ صلے میں ان سے باتیں کرنا تھا اور سوچتا تھا کہ اس سے پہلے تو ہمیشہ ہی سناتا رہا کہ روحانیت میں نہ کھاؤ نہ پیو، راتوں کو جاگتے رہو۔ دینیانانی ہے۔ اب تکلیف اٹھاؤ گے۔ تو بہشت میں مزے لوگے۔ اور زندگی کی کوئی قیمت نہیں وغیرہ باتیں ضروری ہیں۔ مگر اب پتہ چلا کہ روحانیت میں اچھا کھانا قیمتی شراب پینا۔ یورپین لڑکیاں بطور سیکرٹری رکھنا سینما دیکھنا۔ اور زندگی کو بڑے لطف بسر کرنا ممکن ہے۔ اور ایسی صورت میں روحانیت کا سودا ہنسنا نہیں۔

میں ابھی میں دو ہفتے رہا۔ اس عرصہ میں قریب قریب ہر روز مسٹر محمود بے سے ملا۔ اور ”روحانیت“ پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ مسٹر محمود بے نے یہ خواہش ظاہر کی کہ چمکن میں پر پانگنڈا اور اشتہارات کے فن سے واقف ہوں۔ ان کے ساتھ امریکہ چلوں۔ امریکن لوگ مشرقی روحانیت کے بہت دلدادہ ہیں۔ اس سے پہلے سرمایہ رام تیرہ اور دوسرے کئی سرمایہ داران روحانیت کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ اگر ہم چند ماہ بھی وہاں رہیں تو روح کے ساتھ کاغذ پر لکھ کہ ہم لاکھوں روپیہ پیدا کر میں گے میں مسٹر محمود بے کی اس سیکم سے بالکل متفق تھا۔ مگر چونکہ ذرا بھوپال والا مستعدہ عدالت میں تھا اور میرے لئے امریکہ جانا ممکن نہ تھا۔ یہ سیکم عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔

مسٹر محمود بے نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کاغذ پر روح کے ساتھ لکھنا مجھے دو ہفتے میں سکھادیں گے اور میں کبھی دو ہفتے اُن کے پاس رہوں مگر مقدمات اور اخبار کی مصروفیت کے باعث موقع نہ ملا۔ اس کے بعد مسٹر محمود بے تین چار بار دہلی آئے۔ اُن کا قیام امپیریل ہوٹل نئی دہلی پوسٹل ہوٹل دہلی میں ہوا کرتا۔ ان کے پاس ہمیشہ معتقد دل کا جگمگساں لگا رہتا۔ اور معتقدوں میں راجے اور نواب بھی ہوتے۔ چنانچہ ایک بار مرحوم ہمارا جہ پٹیلہ نے آپ کو پٹیلہ طلب کیا۔ اور میں ہزار روپیہ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ محمود بے روحانیت کے ذریعہ معلوم کر کے بتائیں کہ اُن کے ولیعهد موجودہ ہمارا جہ پٹیلہ (اُن کے خلاف ہیں یا نہیں۔ اور ایک بار نواب جھکا بہادر کی دعوت پر یہ بتانے کے لئے بہادر پور گئے۔ کہ اُن کے علاقہ کے ریگستانوں میں کہاں کہاں سونا اور پٹرول موجود ہے۔

مسٹر محمود بے سے ملے ہوئے مجھے کئی برس ہو گئے۔ کیونکہ مقدمات اور کاروبار کی مصروفیت کے باعث یہی جانے کا عرصہ سے اتفاق ہی نہیں ہوا مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر محمود بے آج کل بیٹی میں ہیں یا کہ اپنے وطن مصر کو واپس چلے گئے۔ مگر آپ کے دوستانہ اخلاص کو میں کبھی بھول نہیں سکا۔ اور ان کی ”روحانیت“ کا انتہائی قائل ہوں۔ جتنا خواجہ حسن نظامی کی ”روحانیت“ کا۔ یعنی جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں گے ایسی شخصیتیں اپنی ”روحانیت“ کے ذریعہ لوگوں کے جیب خالی کرتی رہیں گی۔

## بغیر نیت کے جرائم

میری عمر سولہ برس کی تھی جب کہیں موگا کے ہسپتال میں اپرنٹس کمپونڈر تھا۔ اس زمانہ میں کئی تنخواہ نہ لیتا تھا۔ ان پیڈ اپرنٹس تھا۔ چھ ماہ تک کام سیکھتا رہا۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ہسپتال میں رہائش اختیار کرنے والے (انڈور) بیماروں کو ڈاکٹر صاحب دونوں وقت دیکھا کرتے تھے تاکہ اگر کسی کو تکلیف ہو تو وہ رفقہ کی جائے۔ ایک روز شام کو ڈاکٹر صاحب مع کمپونڈروں کے بیماروں کو دیکھ رہے تھے تو معلوم ہوا کہ ایک ضعیف بوڑھی عورت دن بھر بچپن رہی اور دروسے چلائی رہی۔ کیونکہ اس کی ناک میں کیرٹے تھے اور وہ کیرٹے اس کو کاٹتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس عورت کو نصف ڈرام لاکوئرا ریفیواریو کا جوہر دیا جائے تاکہ رات کو یہ سو سکے۔ اور افیون کے نشہ میں تکلیف کم محسوس کرے۔ سب بیماروں کو دیکھنے کے بعد میں ڈسپنڈنگ روم میں گیا اور نصف ڈرام لاکوئرا ریفیواریو کے اس عورت کو پلا دیا۔ اگلے روز شام کو جب ہم بیماروں کو دیکھنے کے لئے پھر گئے تو اس بوڑھی عورت کے قریب کی چار پائیوں پر پڑی ہوئی بیمار عورتوں نے بتایا کہ یہ دن بھر تکلیف میں اسے کتنی رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ کیا رات کو اسے نیند آئی تھی یا نہیں۔ عورتوں نے جواب دیا کہ رات کو بھی نیند نہیں آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ رات کو مارفیا دیا گیا تھا؟ میں نے جواب دیا کہ نصف ڈرام دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا کہ چونکہ رات کو نصف ڈرام مارفیا کے ساتھ اس کو نیند نہیں آئی۔ آج اس کو ایک ڈرام مارفیا دیا جائے ہم سب نے یہ حکم سن لیا۔ بیماروں کو دیکھنے سے فارغ ہونے کے بعد میں ڈسپنڈنگ روم میں گیا اور ایک ڈرام

لاکھوار دنیا کے اس عورت کو پلا آیا۔ میرے جانے کے بعد انچارج ڈسپنسر ڈسپنسنگ روم میں گیا اور ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بھی ایک ڈرامہ لاکھوار دنیا کے اس عورت کو پلا آیا۔ عورت بیجاری دیہات کی رہنے والی اس کو کیا معلوم کہ دوائی کتنی بار دی جاتی ہے۔ اس نے اسلئے پینہ کو نہیں بتایا کہ پہلے بھی دوائی دی جا چکی ہے۔ یہ ڈسپنسر بھی دوائی پلا کر اپنے کو ارٹریں پلا گید ہم لوگ جب صبح اٹھے اور ہسپتال میں گئے تو معلوم ہوا کہ بڑھیا رات کو مر گئی۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ان کو خیال ہوا کہ موت کا باعث مار فیا کا دہر ہے۔ ان کو احساس ہوا کہ میں نا تجربہ کار ہوں شاید مار فیا کے اپنے میں غلطی کی ہو۔ پوچھا کہ رات کو کتنا مار فیا دیا تھا۔ میں اور انچارج ڈسپنسر دونوں موجود تھے۔ دونوں نے جواب دیا ایک ڈرامہ۔ اور دونوں جواب دینے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنے لگ گئے۔ یعنی میں کہتا تھا کہ میں نے دیا اور ڈسپنسر کہتا تھا کہ اس نے دیا۔ گویا کہ بغیر جرم کی نیت کے دونوں ہی اس موت کے ذمہ دار تھے۔

ہندوستان کے ہسپتالوں میں غلطیوں کے ساتھ ایسی مزیں ہر روز ہوتی ہیں۔ اول تو شاہی ایسی موتوں کے جرائم کے لئے تعزیرات ہند میں کوئی مندرجہ فیہ نہیں۔ اگر مندرجہ فیہ تو سرکاری ملازموں کو چاہے وہ کتنی بھی ادنیٰ حیثیت کے ہوں کون پوچھتا ہے۔ ہم دونوں کو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مگر بغیر نیت کے کئے گئے اس جرم کا بوجھ اب تک ضمیر پر موجود ہے۔

کئی برس کی بات ہے ریاست کا دفتر اجیری دروازہ کے باہر تھا۔ ایک رانی کا خط ملا کہ وہ مظلوم ہے۔ اس کی ریاست میں بلنا ممکن نہیں۔ وہ ہر دو مار جا رہی ہے۔ میں ہر دو مار اس کے ظالم کی معرفت بلوں وہ اس ظلم کی داستان بتانا چاہتی ہے جو اس کے شوہر کے ہاتھوں اس پر کیا جا رہا ہے۔ اس خط کے پلنے کے بعد میں اپنی کار میں یہاں سے روٹکی گیا۔ روٹکی سے نہر کے کنارے ہر دو مار پہنچا۔ میرے ساتھ موٹر ڈرائیور کہیر سنگھ تھا۔ ہم لوگ ہر دو مار ڈاک بنگلہ میں پھیرے اور میں نے وہاں سے رانی کے ملازم کو پیغام بھیجا کہ میں پہنچ گیا ہوں ڈاک بنگلہ میں مقیم ہیں۔ رانی صاحبہ جہاں کہیں دہاں آ جاؤں۔ رانی صاحبہ نے انتظام کر رکھا تھا۔ ایک دھرم شاپ میں ان سے بلاتین چار گھنٹے کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہیر سنگھ سے کہا کہ اب ہم ہر دو مار آ گئے ہیں۔ دہرہ دون قریب ہے وہاں ہوتے چلیں۔ ایک تو جنگل کی سیر ہو جائے گی۔ دوسرے دہرہ دون میں جا رانی نا مجھ اور ان کے والد اور بھائی ہیں ان سے بھی مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم ہر دو مار سے سید سے جنگل کے راستہ دہرہ دون روانہ ہوئے۔ ہر دو مار اور دہرہ دون کے درمیان شرک اس زمانہ میں اچھی نہ تھی۔ راستہ میں بغیر پلوں کے کسی چھوٹی چھوٹی نمایاں تھیں اور بعض جگہ راستہ نامور بھی تھا۔ ادب ملٹری نے فوجی ضروریات کے باعث یہ شرک بہت اچھی بنا دی ہے) میں اور کہیر سنگھ جا رہے تھے کہیر سنگھ موٹر چلا رہا تھا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دہرہ دون پہنچنے سے غالباً تین چار میل پہلے موٹر تیزی کے ساتھ جا رہی تھی شرک پر کھڑا ہوا ایک بچہ جو سات آٹھ سال کی عمر کا ہو گا موٹر کے دیکھنے کے شوق میں تیزی کے ساتھ موٹر کے سامنے آ گیا اور موٹر اس پر سے گزر گئی۔ اس بچے کے والدین قریب ہی جھونپڑیوں میں مقیم تھے جب بچہ موٹر کے نیچے آیا تو میں نے کہیر سنگھ سے کہا کہ موٹر فوراً کھڑی کرو۔ مگر کہیر سنگھ نے میرے اس کہنے کی کوئی پروا نہ کی اور اس نے موٹر کو اور تیز کر دیا میں نے بار بار کہا کہ موٹر کھڑی کرو ہم دیکھیں کہ اگر بچہ کی حالت خراب ہو تو اس کو ہسپتال لے جائیں

مگر گہر سنگھ نے میرے کہنے کی کوئی پروا نہیں کی تو یا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کا پابند نہیں تھا چنڈ بھد ہم ڈہرہ دوں پیچھے تو گہر سنگھ نے کہا کہ اگر وہ موٹر وہاں کھڑی کرنا تو اس بجے کے خاندان کے لوگ جو جیو پیٹریوں میں مقیم تھے اور خانہ بدوش قبیلہ کے تھے غصہ میں ہم لوگوں کو شاید قتل کر دیتے اور اگر یہ نہ بھی ہوتا تو وہ مقدمہ چلوانے اور قید ہونے کیلئے تیار نہیں۔ اس واقعہ کے باعث میں بے حد پریشان تھا بار بار خیال آتا کہ نہ معلوم وہ بچہ مر گیا یا زندہ رہا۔ گو میرا قصور نہ تھا بچہ خود ہی دوڑ کر موٹر کے سامنے آگیا۔ مگر ہمارا موٹر کھڑا کر کے اس بچہ کو نہ دیکھنا اور اس کو ہسپتال میں نہ لے جانا کتنا بڑا اخلاقی جرم تھا مجھے اس قدر ذہنی کوفت تھی کہ میں نے ہمارا فی ما جہاں اور اُن کے والد وغیرہ سے پہلے کا خیال ترک کر دیا۔ ڈہرہ دون میں پٹرول لیا اور ہم سہارن پور والی سڑک کے راستہ واپس دہلی روانہ ہو گئے۔ ڈہرہ دون اور دہلی کے درمیان میں نے کچھ نہ کھایا۔ دہلی پہنچ کر دو راتیں نیند نہ آئی اور اب بھی کئی بار یہ خیال آتا ہے کہ گویا اس میں کوئی قصور نہ تھا اور نہ جرم کرنے کی میری نیت ہی تھی۔ مگر گہر سنگھ کے جرم میں شریک ہوں، اور نہ معلوم مجھے اس جرم کی سزا کیا ملے۔

میں امانہ دریا ست پٹیاں، میں سیڈیکل پریکٹس کرنا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ ہوا خشک ہونے کے باعث سندھ میں لوگ کثرت کے ساتھ متنبانہ دیکھ کر شریک ہیں۔ میں اس سے پہلے متنبانہ کے کثرت کے ساتھ اپریشن کر چکا تھا۔ اور اس فن میں مجھے بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سندھ میں جا کر وہاں لوگوں کی آنکھوں کے اپریشن کئے جائیں۔ چنانچہ میں نے امانہ کے ایک لڑکے کو دیکھ کر اس لڑکے کا اب نام یاد نہیں رہا یہ وہاں کی سنگھ بھائے کے سکر میٹری سردار سندھ سنگھ کا بیٹا تھا) ساتھ لیا۔ یہ لڑکا بہت ہوشیار اور مستعد تھا ہم لوگ بھٹنڈہ اور سماٹہ کے راستہ جب خان پور پہنچے تو وہاں ایک سکھ بابو مل گئے جو ریلوے سٹیشن پر بجلی کے کام کے انچارج تھے۔ یہ واقعہ تھے بہت تپاک سے ریلوے اور چونکہ شام کا وقت تھا انھوں نے ہمارے کھانے کے لئے پچھلی انڈے، سبزی اور روٹی وغیرہ خریدی۔ اتنے میں گاڑی چلنے والی تھی تو انھوں نے کہا کہ انٹر کلاس میں (جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے) جگہ تنگ ہے کھانا کھانے میں تکلیف ہوگی سیکنڈ کلاس کا کوپے خالی ہے اس میں بیٹھ کر کھانا کھالیں اور اگلے سٹیشن پر اتر کر پھر انٹر میں چلے جائیں۔ ریلوے کے بابو اپنے حکم کو اپنے باپ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ صرف ان کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ٹکٹ لینا بھی فضل خرچی ہے۔ یہ سکھ بابو ہیں سیکنڈ کلاس کے کوپے میں لے گئے اور وہاں کھانا رکھا تو گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کے چلنے پر میں نے اور اس لڑکے نے کھانا کھایا۔ یہ گاڑی کراچی سیل تھی اور کئی کئی سٹیشنوں کے بعد ٹھہرتی تھی۔ ہم کھانا کھا چکے اور اگلے سٹیشن کا انتظار کر رہے تھے کہ جہاں گاڑی ٹھہرے اور ہم وہاں اپنے انٹر کلاس میں چلے جائیں۔ تو راستہ میں گاڑی بکھلتی ٹھہر گئی۔ اس وقت کچھ اندھیرا سا ہو چکا تھا۔ گاڑی کے ٹھہرنے کے بعد ٹرین کا ڈرائیور اور گارڈ گاڑی سے نیچے اترے اور انھوں نے دیکھا شروع کیا کہ کرنے ڈبہ کا دیکھ خراب ہے چنانچہ وہ دیکھتے دیکھتے اس سیکنڈ کلاس والی گاڑی کے پاس آ گئے تو حلوں ہوا کہ اس ڈبہ میں خرابی ہے۔ تو ان کو شبہ ہوا کہ شاید ہم نے تو بھیر کھینچا ہے۔ چنانچہ گارڈ نے ہم سے ٹکٹ دکھانے کو کہا ٹکٹ دکھایا تو وہ انٹر کلاس کا تھا۔ اس شبہ میں اور اضافہ ہوا۔ اس نے کہا کہ انٹر کا ٹکٹ ہے۔ یہاں کہیں آئے۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ وہاں جگہ تنگ تھی کھانا کھانے کے لئے یہاں چلے آئے یہ جواب تلی بخش نہ تھا۔

کیونکہ قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اینگلو انڈین گارڈز اس کو پورا شبہ ہو گیا کہ ہم لوگ کسی بد معاشی کی نیت سے یہاں آئے ہیں اور اس غرض کے لئے تاریکی دہنائی میں بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ آنٹر کلاس میں چلے گئے۔ مگر پریشان کہ نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے اور پولیس کے حوالہ کئے جائیں۔ حالانکہ قصور تھا تو صرف یہ کہ ریلوے کے سکے بابو نے اپنے حوصلہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہمیں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے کہا اور ہم نے بیوقوفی کے باعث ایسا کیا۔

ہم روہڑی ٹیشن پر اترے۔ گارڈ ہمیں پولیس کروینا چاہتا ہے۔ ہم اُس کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ آخر اُس نے ہم سے خان پور اور روہڑی کے درمیان کا آنٹر کلاس سے زاید سیکنڈ کلاس کا کرایہ بغیر رسید دینے وصول کیا اور بقول پنجابی کہادت کے ہمارا لالہ موسیٰ کا یہ سفر ختم ہوا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسے جرائم کرتا ہے جن کو کرنے کی اس کی نیت نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ جرائم آخر جرائم ہیں۔ انسان کو ان جرائم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ چاہے وہ سزا قانونی عدالت کے ذریعہ جیل یا قدرت اس کو کسی دوسرے ذریعے سے دے۔ اور صرف اس بات سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا کہ اس کی نیت جرم کرنے کی نہ تھی۔ کیونکہ جرم کرنا۔ مجرم کے جرم پر پیش پستی کرنا جرم میں حصہ لینا۔ جرم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا یا جرم کو بے نقاب نہ کرنا اخلاقاً سب ہی جرائم ہیں۔

## ”ریاست“ اور افغان گورنمنٹ

”ریاست“ کو جاری ہونے دو برس ہوئے تھے۔ لالہ لاجپت رائے اپنی آخری عمر میں ستر سا درکر اور ستر جناح کی طرح حربت پرستی و وطنیت اور ملک کی آزادی کی راہ چھوڑ کر فرقہ پرستی کی لعنت اختیار کر چکے تھے۔ اور ان کا ہر قدم ہندوہاسم کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف اٹھتا تھا۔ آپ نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں ارشاد تھا کہ ہندوستان افغانستان کے حملہ سے بے فکر نہیں ہو سکتا اور صوبہ سرحد کو آئینی اصلاحات نہ ملنی چاہئیں۔ کیونکہ اگر نئی اصلاحات کے مطابق صوبہ سرحد کی گورنمنٹ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی تو ہندو وہاں خطرہ میں ہوں گے اور افغانستان ہندوستان پر آسانی کے ساتھ حملہ کر سکے گا۔ لالہ لاجپت رائے کا یہ بیان پڑھ کر مجھے لالہ جی کے اگر وال ازم پر بہت غصہ آیا۔ اور میں نے ”ریاست“ میں آپ کے اس بیان کے خلاف ایک سخت نوٹ لکھا۔ کہ اگر صوبہ سرحد کے ہندو اس قدم پر بول اور مکر رہیں کہ وہ افغانستان کے حملہ کو ڈیفنڈ نہیں کر سکتے تو ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ صوبہ سرحد چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مدراس کو چلے جائیں مگر صوبہ سرحد کو صرف اس جرم میں سیاسی اصلاحات نہ دی جائیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس صوبہ کے ساتھ ظلم اور بے انصافی ہوگی۔ اور لالہ لاجپت رائے کا افغانستان کے خوف سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا ان کی بزدلی اور دنیا پرستی ہے جس کے ساتھ کوئی بہادر شخص متفق نہیں ہو سکتا۔

”ریاست“ اُس زمانہ میں افغانستان جاتا تھا۔ اور وہاں کے دفتر خارجہ میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا۔ دفتر خارجہ کی باگ ڈور جنگ امان اللہ کے خسر اور ملکہ ثریا کے والد سردار محمود طرزی کے ہاتھ میں تھی۔ اس



نوٹ کو شائع ہوئے دوماہ کے قریب ہوا تھا کہ ایک روز قونصل جنرل افغانستان کے دفتر سے ٹیلیفون آیا کہ سردار اکبر خاں قونصل جنرل بلنا چاہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ جب فرمائیے میں آ جاؤں ٹیلی فون کرنے والے نے مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹیلیفون کرنے والے غالباً منشی محمد فاضل سرکاتب یعنی سکریٹری تھے کہا۔ نہیں۔ قونصل جنرل صاحب خود تشریف لانا چاہتے ہیں۔ دفتر "ریاست" کس جگہ ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ پریڈ گراؤنڈ کے سامنے ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار اکبر خاں تشریف لائے۔

آپ نے فرمایا کہ "ریاست" میں افغانستان اور لالہ لاجپت رائے کے متعلق جو نوٹ شائع ہوا تھا آپ اس سلسل میں تشریف لائے ہیں۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے۔ میں نے کہا کہ مجھے فرماتے ہیں وہاں آ جاتا۔ آپ نے جواب دیا کہ نہیں افغان گورنمنٹ کے حکم سے آیا ہوں۔ کابل سے خط آیا ہے کہ حکمران ادا کیا جائے شکریہ ادا کرنے کے لئے دوسرے کے مکان پر بھی جانا چاہئے۔ اس لئے ضروری تھا کہ میں خود آتا۔ آپ تھوڑی دیر بیٹھے۔

اس کے بعد آپ نے خواہش ظاہر کی کہ میں اگلے روز شام کو ان کے ہاں بات چیت کرنے کے لئے آؤں۔ اور چائے ان کے ساتھ پیوں۔ میں اگلے روز افغانستان کے قونصل خانہ پہنچا۔ اس زمانہ قونصل خانہ انڈر ہل لین کی ایک دو منزلہ بلڈنگ میں تھا۔ میں گیا تو سردار اکبر خاں منتظر تھے۔ ہم بیٹھے چائے پیئے اور باتیں کرتے رہے۔ سردار اکبر خاں نے ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کی قسم افغانستان لوگ بات بات میں قسم کھاتے ہیں (افغانستان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ ہندوستان کی افغان پابندی سمجھتے ہیں) چاہتے ہیں کہ جس طرح افغانستان آزاد ہے۔ ہندوستان بھی آزاد ہو۔ لالہ لاجپت رائے جیسے لیڈر بلاد وجر افغانوں کو بڑا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ افغان گورنمنٹ کی ہمدردی ہندوستان کے ساتھ ہے۔ وغیرہ۔ سردار اکبر خاں نے خواہش ظاہر کی کہ میں کبھی کبھی ان سے ملتا رہوں۔ اور سوچ کر یہ بتاؤں کہ کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے دل سے افغانوں کے متعلق جو ہوا بیٹھا ہوا ہے نکل جائے۔

اس ملاقات کے بعد میرے تعلقات افغان گورنمنٹ کے ساتھ بہت گہرے ہوئے۔ دوسرے مقامات پر گئے۔ اور میں ہفتہ عشرہ کے بعد سردار اکبر خاں سے ملتا۔ چنانچہ ایک روز وہاں بیٹھا قونصل جنرل سے باتیں کر رہا تھا تو اچانک ہیمفرے صاحب جو افغانستان میں برٹش قونصل تھے اور ہندوستان میں آئے تھے سردار اکبر خاں سے ملنے کے لئے آ گئے۔ سردار اکبر خاں نے میرا تعارف کرایا۔ تو مسٹر ہیمفرے نے کہا کہ آپ "ریاست" کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور اسے پسند بھی کرتے ہیں۔

کچھ روز بعد میں نے سردار اکبر خاں کو لائے دی کہ ہندوستان کیوں کے دل سے افغانی ہوا انکے لئے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ یہاں سے سات آٹھ جرنلسٹوں کا ایک ڈیوٹیشن جس میں دو ہندو (دو مسلمان) دو سکھ اور ایک انگریز مسٹر فارغین ہوں۔ افغانستان مدعو کیا جائے۔ ان لوگوں کو اجازت دی جائے کہ یہ اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں جا کر افغانستان اور افغانستان کے ہندو باشندوں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر واپس آکر ایک مشترکہ بیان دیں کہ وہاں کی پبلک کی عموماً اور ہندو رعایا کی خصوصاً کیا حالت ہے۔ اس مشترکہ بیان کا بہت اثر ہوگا۔ سردار اکبر خاں نے میری اس

تجزیہ کو بہت پسند کیا۔ اور آپ نے سردار محمود طرزی کو کھانا، سردار محمود طرزی نے بھی اس خیال کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ افغان گورنمنٹ کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا کو اس ڈیپوٹیشن کی اجازت کے لئے لکھا گیا تو گورنمنٹ ہند نے اس کی منظوری دینے سے اس دلیل کے ساتھ انکار کر دیا کہ یہ سیاسی پراپاگنڈہ ہے۔ اور بین الاقوامی قانون اور افغانستان دہندوستان کی گورنمنٹوں کے تعلقات کے باعث ایسا ڈیپوٹیشن جانا مناسب نہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تجویز رد گئی اور اسکا سربراہ کبر خان افغان گورنمنٹ کو ہندوستان تو متصل خانہ پر سہمی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ نگرانی کرتے تھے اور میرا یقین ہے کہ تمام تو متصل خانہ کی نگرانی ہوتی ہے۔ نگرانی کرنے والے سی آئی ٹی کے لوگوں نے میری آمدت کی گورنمنٹ کو رپورٹ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن آفس کے حکم سے دفتر ریاست کی نگرانی منسوخ ہو گئی۔ اس نگرانی کا کوئلہ گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لوکل گورنمنٹ صرف فارن آفس کے حکم سے اپنے آدمی نگرانی کے لئے تعینات کرتی تھی۔ چنانچہ اس نگرانی کے متعلق میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ گورنمنٹ کے سرکاری کاغذات میں یہ رپورٹ کی گئی ہے کہ دیوان سنگھ روس سے روپیہ لے کر بالاشویکوں کا پراپاگنڈہ کرتا ہے۔ اور اس تعلق کے درمیان افغان گورنمنٹ اور توصل جزل افغانستان ایک کڑی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی اس بے وقوفی کا مجھے جب علم ہوا۔ تو میں حیران ہو گیا۔ کیونکہ میرا روس کے ساتھ نہ کبھی کوئی تعلق تھا اور نہ اب ہے۔

سردار اکبر خان کے ہندوستان سے تبدیل ہونے کے بعد ملی میں افغان توصل جزل سید قاسم مقرر ہوئے۔ جو کنگ امان اللہ کے ہم زلف اور ملکہ شریا کی چھوٹی بہن کے شوہر تھے۔ سید قاسم کے بھی ایڈیٹر ریاست کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ چنانچہ ہمارا جہ پٹیا لے کر جب ایڈیٹر ریاست کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر ایکسٹرا ڈیویشن ایکٹ کے مطابق وارنٹ جاری کئے اور دفتر ریاست کی تلاشی ہوئی تو سید قاسم کو اس کا بہت افسوس ہوا۔ اور آپ کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکریٹری رجو آپ کا درست تھا کا اثر استعمال کریں۔ مگر میں آپ کی اس رائے سے متفق نہ ہو اور میں نے کہا کہ فارن سیکریٹری کو کہنا زیادہ نقصان کا باعث ہوگا۔ گورنمنٹ پہلے ہی میرے اور افغان گورنمنٹ کے تعلقات کو پسند نہیں کرتی۔ اگر سفارش کی گئی تو نارن آفس کو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ تعلقات بہت گہرے ہیں۔ برٹش لوگ سب کچھ بھول سکتے ہیں۔ مگر کسی شخص کا ایسی برٹش ہونا نہیں بھول سکتے۔ فارن سیکریٹری پر اس سفارش کا بڑا اثر ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ زیادہ نقصان پہنچے۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس تجویز پر عمل نہ کرنے کے بعد سید قاسم نے ایڈیٹر ریاست سے یہ کہا کہ اگر میں چاہوں تو سید قاسم اپنے پشاور کے ٹریڈ ایجنٹ (مجھے نام یاد نہیں رہا۔ غالباً سردار عبدالحمید تھا) کی معرفت سرحدی قبائل کے ذریعہ مجھے افغانستان لے جائیں گے۔ اور وہاں افغان گورنمنٹ میرے لئے زیادہ سے زیادہ آرام و سہولت اور میری رہائش و اخراجات کا ہمیشہ کے لئے انتظام کر دے گی۔ چنانچہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا ہمارا جہ پٹیا لے کر ایکسٹرا ڈیویشن کے وارنٹوں کی تعمیل سے انکار نہ کرتی تو میں اپنے آئندہ زندگی جن مقامات پر گزارتا۔ ان میں سے ایک جگہ افغانستان بھی تھی۔ اور یہ ممکن تھا کہ میں آج

افغانستان میں ہوتا۔

ایڈیٹر ”ریاست“ اور افغانستان کے تعلقات کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور دلچسپ ہے۔ ہمارا جہاں بھہ جب ڈیرہ دون میں جلادہٹی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور گورنمنٹ ہند کے سلوک اور ہمارا جہاں بھہ کی مخالفت سے پریشان تھے تو میں نے ہمارا جہ سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو افغانستان جا کر اپنی زندگی آرام و راحت سے گزار سکتے ہیں میں افغانستان گورنمنٹ سے اس کے متعلق انتظام کر سکتا ہوں میں نے یہ بھی کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں گا۔ اور ہم اپنی آئندہ زندگی افغانستان یا کسی دوسرے آزاد ملک میں گزار دیں گے۔ چنانچہ اس کے متعلق میں نے سید قاسم سے بات چیت بھی کی۔ مگر ہمارا جہاں بھہ کسی خطرہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ ہمارا فی اور بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔

کنگ امان اندر کی گورنمنٹ اور میرے درمیان تعلقات بہت دوستانہ اور گہرے ہو چکے تھے۔ ان تعلقات میں ہی امان اندر افغانستان کو چھوڑ کر اٹلی چلے گئے۔ اس کے بعد میرے تعلقات اس گورنمنٹ کے ساتھ منقطع ہو گئے۔ حالانکہ موجودہ گورنمنٹ کے نمائندے ہمیشہ اخلاص و محبت کے ساتھ ملتے رہے۔ مگر میری وضع داری کی سپرٹ نے اجازت نہ دی کہ میں کنگ امان اندر کے جانے کے بعد آپ کے خالوں کے ساتھ تعلقات جاری رکھوں۔ میں سے ابن الوقتی سمجھتا تھا۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کنگ امان اندر کا شکریہ ادا ہے کہ آپ نے اپنی جلادہٹی کے زمانہ میں بھی ایڈیٹر ”ریاست“ کو یاد رکھا۔ اور سٹرچن لال جرنلسٹ اور سٹرڈیپ سنگھ وغیرہ اصحاب جب کبھی آپ سے اٹلی میں ملے تو آپ ایڈیٹر ”ریاست“ کی خیریت پوچھتے رہے۔

## پبلک واز واقعات کی بنیادوں پر

میری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق مختلف لوگوں کی ایک ہی رائے ہو تو وہ رائے بے بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے، مثلاً اگر ہمارا گاندھی کو عام لوگ نیک اور ہاتھ بکتے ہیں۔ تو گاندھی فی الحقیقت نیک تھے۔ اور اگر خواجہ حسن نظامی کو پبلک مکار سمجھتی ہے تو یہ آواز خالی زرداقت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پبلک رائے تب ہی قائم ہوتی ہے۔ جب لوگوں کو ان واقعات کے دیکھنے بار بار اتفاق ہو۔

جب ”ریاست“ کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا۔ اور کام زیادہ ہو گیا۔ تو ایک سب ایڈیٹر ضرورت محسوس ہوئی۔ ”ریاست“ میں اشتہار دیا گیا۔ اس اشتہار کے جواب میں جو درخواستیں آئیں۔ ان میں بک درخواست سٹر پیاسے لال شاکر بیرٹھی کی بھی تھی۔ یہ حضرت پہلے رسالہ ”زمانہ“ کا خور میں کام لے رہے۔ پھر ادیب“ اور آہاد کے ایڈیٹر تھے۔ اور دہلی سے علیحدہ ہوئے تو آپ نے اپنا رسالہ ”العصر“ جاری کیا۔ جو شاید ایک یا دو سال جاری رہا۔ اپنی درخواست میں شاکر صاحب نے اپنے تجربہ

کے سلسلہ میں یہ تمام کچھ لکھا۔ کہ آپ کہاں کہاں کام کرتے رہے۔ شاکر صاحب کی درخواست آنے پر راقم الحروف نے منشی دیا زائن صاحب نگم ایڈیٹر ”زمانہ“ دجا ایڈیٹر ”ریاست“ کے بہت مہربان دوست اور نیکو دوستانہ معرفت تھے) سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ شاکر صاحب آپ کے ہاں کام کرتے رہے، کیسے آدمی ہیں۔ دیا زائن صاحب کا جواب آیا کہ شاکر صاحب دوسروں کی نظلیں چوری کر کے اپنے نام کے ساتھ شائع کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔ اخبار یا رسالہ کو ترتیب اچھی دے سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی چوری کرنے کی ان کی عادت ہے۔ کوئی شے بھی دفتر میں دیکھیں اسے چوری کر لیتے ہیں۔ اور بہتر ہے کہ ان کو ملازم نہ رکھا جائے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ منشی دیا زائن صاحب کے اس خط کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ ایک شخص شاعر ہے۔ ادبی رسائل کا ایڈیٹر رہا۔ اور کافی شعر کا آدمی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ چوری جیسے ادنیٰ فعل کا بھی مرتکب ہو۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شاید نگم صاحب کو شاکر صاحب کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ آپ کو بطور مترجم یا سب ایڈیٹر بتایا گیا۔ اور دو اختارات میں سب ایڈیٹر کا کام عام طور پر انگریزی یا ہندی وغیرہ رسائل یا اخبارات سے ترجمہ ہوتا ہے۔ یا اگر کبھی ایڈیٹر غیر حاضر ہو تو ایڈیٹر بل وغیرہ کے حصہ کو بھی چھوڑا کر دیا جائے۔ چنانچہ شاکر صاحب کے ذمہ بھی دوسرے سب ایڈیٹروں کی طرح ہی کام تھا کہ وہ ترجمہ کریں۔ اور باہر سے آئے ہوئے انسانوں یا حضرات وغیرہ کی غلطیاں درست کر کے ان کو ترتیب دی جائے۔ شاکر صاحب نے دفتر ”ریاست“ میں کام شروع کیا ہی تھا کہ دفتر میں چوری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کبھی بینس غائب۔ کبھی نہیں آتا۔ کبھی ٹکٹ چوری ہو گئے۔ اور کبھی جیب سے پیسے نکل گئے۔ ان چوریوں پر ہمیشہ ہی چڑا سبوں سے باز پرس کی جاتی اور خیال بھی نہ آتا کہ شاکر صاحب مہربانی فرماتے ہوں گے۔ ان اونٹ چوریوں کا یہ سلسلہ باری تھا کہ ایک روز شاکر صاحب نے فرمایا ان کی ایک بھتیجی جو بیڈی ہار ڈنگ سیڈ میل کالج کی نرسنگ کلاس میں پڑھتی ہیں۔ کالج سے گھر آئی ہوئی ہیں۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ میں شام کو کھانا وہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں کھانے پر ان کے گھر گیا۔ اور ابھی کھانا کھانا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں تو میری نگاہ وہاں ایک ڈبیہ پر پڑی۔ جس میں شہری رنگ کے کاغذ کو لگانے کے کلپ پڑے تھے (ایڈیٹر ”ریاست“ کو شروع سے ہی شیٹری کا بہت شوق ہے۔ دفتر ”ریاست“ کی شیٹری ولایت سے چھپوائی جاتی تھی اور یہ کلپ کلکتہ کی ایک فم سے منگائے گئے تھے) اس ڈبیہ کو دیکھ کر یقین آیا کہ منشی دیا زائن صاحب نگم کی رائے درست تھی اور ان کی رائے کی پروا نہ کرنا غلطی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ واپس دفتر آ گیا۔ رات کو سوچتا رہا کہ شاکر صاحب کو کس طریقہ سے پکڑا جائے۔ اگلے روز جب دفتر کے لوگ آ گئے تو ایڈیٹر ”ریاست“ نے اوپر کی منزل میں اپنی میز پر دو پیہ والے دو روپیہ کے ٹکٹ گن کر رکھ دئے اور خود نیچے دفتر میں آکر کام شروع کر دیا۔ دفتر میں بیٹھے پانچ سات منٹ ہوئے تو میرے شاکر صاحب سے کہا کہ اوپر کے کمرہ میں میز پر نپل پڑی ہے، وہ لا دیجیے۔ شاکر صاحب نپل لینے کے لئے اوپر گئے اور نپل لے کر واپس آ گئے۔ تو ایڈیٹر ”ریاست“ فوراً اوپر گیا اور دو پیہ والے ٹکٹ جو گن کر رکھ آیا تھا۔ ان کو دیکھا۔ ان میں سے نصف کے قریب غائب تھے شاکر صاحب کو اوپر بلاوا۔ اور کہا مہربانی فرما کہ وہ ٹکٹ رکھ دو۔ جو چوری کیے ہیں۔ شاکر صاحب کے ہوش

اڑ گئے۔ ایڈیٹر ریاست نے آپ کے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکال لئے۔ اگرچہ اسی ہوتا۔ تو دستور کے مطابق اس چٹراسی کی اچھی خاصی مرست کی جاتی۔ مگر تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ عیائی ہونے کے باعث بوٹ سڑک پہنچے ہوئے۔ یہی کہا کہ بہت ہی کمینہ شخص ہو۔ اگر ضرورت تھی تو ٹکٹ مانگ لیتے۔ شاکر صاحب کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، چنانچہ ان کو اس شرط پر اور قسم کھانے پر معاف کر دیا گیا کہ آئینہ چوری نہ کریں گے۔

شاکر صاحب اس کے بعد کئی برس تک دفتر ”ریاست“ میں رہے۔ پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اور بطور ”الٹوٹس“ پانچ چھ روپیہ ماہوار کٹا، نے سامان چوری کر لیا تے تھے۔

نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر ”ریاست“ پر ہوشنگ آباد (سی پی) میں مقدمہ دائر کیا تو دفتر ریاست کے متور و ملازم خریدے گئے۔ ان سے وعدے کئے گئے کہ جو تنخواہ دفتر ریاست میں پاتے ہیں اس سے زیادہ تنخواہ ان کو ریاست بھوپال میں ملے گی۔ اور کچھ روپیہ بھی نقد دیا گیا۔ روپیہ کے لالچ سے خریدے گئے۔ ان لوگوں میں سسر پائے لال صاحب شاکر میرٹھی صاحب ایڈیٹر ”ادیب“ ”العصر“ بھی تھے۔ آپ نے لالچ میں آکر دفتر ریاست کی ملازمت چھوڑ دی، بھوپال سے بل گئے، اور آپ نے ایڈیٹر ریاست کے خلاف بطور سرکاری گواہ شہادت بھی دی۔

شاکر صاحب نے جب غدا ری کی اور بطور سرکاری گواہ عدالت میں تشریف لائے تو آپ چوہدری جہاڑی تو کلی ایڈووکیٹ نے جرح کی۔ مسٹر تو کلی کو جرح کرنے میں کمال حاصل ہے۔ کابیتہ ہونے کے باعث ذہین بھی بہت ہیں۔ اور قدرت آپ کو قوت گویائی کی نعمت بھی فراخ دلی کے ساتھ عطا کی ہے۔ جرح میں آپ نے شاکر صاحب سے پچھن سے لے کر اس زمانے تک کے تمام حالات دریافت کئے تو شاکر صاحب نے بھڑکے ہوئے کے سامنے حلف دینے ہوئے اقرار کیا کہ آپ دوبار عدالت سے چوری کے جرم میں ایک ایک یا دو دو سال کی سزا بھی پا چکے ہیں۔ ان واقعات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی شخص کے متعلق متعدد اصحاب یا اہل الرائے حضرات کے تجربہ کے بعد جو رائے ہو اس رائے کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ رائے بے بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے۔

## ایڈیٹر ریاست کی ”نیک طینی اور بد طینی“

دفتر ریاست ”دریا گنج“ کی کوٹھی نمبر ۱۱ میں تھا۔ اس کوٹھی میں بہت بڑے بڑے آٹھ کمرے تھے۔ اور اہر سڑک کی طرف موڑ کے لئے گیرج تھا۔ میرے پاس اس زمانہ میں موٹر دستی۔ ایک سکھ ٹیکسی ڈرائور بھائی اپنا سنگھ کے ساتھ مستقل انتظام تھا۔ کہ جب ضرورت ہو ازراں نرخ پر اس کی گاڑی منگایا کروں۔ چونکہ یہ گیرج خالی رہتا اس میں ردی اخبارات وغیرہ رکھ دیئے جاتے۔

مرحوم ہمارا بچہ پٹیل نے جب اپنی ریاست میں میرے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر اس دفتر کی تلاش کرائی اور تلاشی کے دو تین مہینے بعد اس گیرج کو کھولا تو دیکھا کہ باہر سے تار نو بہ دستور لگا ہوا ہے۔

مگر اندر کچھ ردی کا غذات چلے ہوئے ہیں۔ ان چلے ہوئے کا غذات کو دیکھ کر خیال ہوا۔ کہ شاید پٹیلہ والوں کی شرارت ہو۔ انھوں نے دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کی ہو۔ یا کسی نے جلتا ہوا سگرٹ پھینکا ہو۔ اور یہ سگرٹ دروازہ کے نیچے سے جہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اتفاق سے اندر چلا گیا ہو۔ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ اور اسے معمولی بات سمجھ کر اس کی برداشت کی۔

اس واقعہ کو گزرے ابھی دو ہفتے ہوئے تھے کہ میں ایک روز دوپہر کو ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں یلرنگ پٹال سے انگریزی کے رسائل خریدنے گئے۔ جب بک سٹال پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ وہاں پٹیلہ کے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی مسٹر فضل کریم خاں اور وہاں کے پہلک پر سیکیورٹری جو سکھ تھے۔ مجھے اب نام یاد نہیں رہا۔ مگر طے اخبارات دیکھ رہے تھے۔ اور پڑھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں ان کو غور سے دیکھتا رہا۔ کہ میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ یہ فضل کریم ہی ہیں۔ جو تلاشی کے لئے پٹیلہ سے تشریف لائے تھے۔ جب میری منتی ہو گئی۔ کہ یہی حضرت ہیں تو میں ان کے سامنے کی طرف آ گیا۔ اور کہا۔ خاں صاحب آداب عرض۔ خاں صاحب نے اس کا جواب اخلاق کے ساتھ دیتے ہوئے کہا آداب عرض ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔ فرمائیے خاں صاحب آج پٹیلہ سے کس مار پر آئے۔ کیا تلاشی لوگ یا گرفتاری کر دے گے۔ خاں صاحب کچھ جھپک گئے۔ اور آپ نے جواب دیا۔ نہیں سر در صاحب ہم آپ کے دشمن تو نہیں۔ نہ ہماری کوئی ذاتی عداوت ہے۔ ہر کاری ملازم ہیں۔ ہر کار کے حکم سے تلاشی لینے آئے تھے۔ اپنے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج تو ڈاکٹر شران کو آنکھیں دکھانے کے لئے آیا تھا۔ آنکھوں میں تکلیف ہے۔

اتنی بات کرنے اور رسائل خریدنے کے بعد میں سٹیشن سے باہر آیا۔ مگر بہت متفکر کہ پٹیلہ کے یہ دونوں انصراب دہلی میں کیوں آئے۔ کیا کوئی نیا مقدمہ قائم کیا۔ کیا نئی تلاشی ہو گئی۔ کیا وارنٹ ان کے پاس ہیں۔ کیا گریج میں آگ پٹیلہ والوں نے لگائی۔ دیا گنج کوٹھی پر گرفتاری کے لئے پولیس موجود تو نہیں۔ ان خیالات میں غرق تھا۔ کہ کیا کرنا چاہئے۔ دفتر جاؤں یا نہ جاؤں۔ ممکن ہے۔ وہاں پولیس گرفتاری کے لئے موجود ہو۔

میں نے اپنے دفتر جانا مناسب نہ سمجھا۔ سیدھا سوامی رامانند جی کے دفتر میں پہنچا۔ سوامی جی اس زمانہ میں سوامی شردھانند جی کے دست راست اور دولت ادھار سمجھا اور کانگریس وغیرہ کئی سوسائٹیوں کی روح رواں تھے انکا دفتر ”بیچ“ کے سامنے تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کے ہاں سے اپنے دفتر ٹیلی فون کیا اور پوچھا۔ کہ کیا وہاں پولیس وغیرہ تو نہیں۔ اور کوئی خاص بات تو نہیں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ سوامی جی سے میں مشورہ کرتا رہا۔ کہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ مسٹر فضل کریم پٹیلہ سے اب کیوں آئے ہیں۔ ہم کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ہوٹلوں میں ٹیلی فون کیا۔ کہ کیا کوئی صاحب پٹیلہ کے مسٹر فضل کریم وہاں ٹھہرے ہیں۔ تمام ہوٹلوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ کہ رائل ہوٹل کے کمر نمبر ۱۷ میں ٹھہرے ہیں۔ اور ہوٹل سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہاں موجود نہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ ان کے وہلی کے آنے کا مقصد کیا ہے۔

میں بہت سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کئی جگہ ٹیلی فون کیا۔ مگر کہیں سے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر مجھے ایک شرارت سوچنی۔ میں نے سوچا۔ کہ اگر یہ لوگ میری گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔ یا تلاشی لیں گے۔ تو یقیناً

یہ خود کچھ نہیں کر سکتے جو کچھ کریں گے۔ لازمی طور پر مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کی معرفت ہوگا۔ اور اس کا علم سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی کو ہونا چاہئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی کو بیلوں۔ اُس سے طریقہ کے ساتھ بات چیت کی جائے۔ اور اس کی باتوں سے معلوم کیا جائے کہ ہڈیٹن کیا ہے۔ اگر تو اس نے مسٹر فضل کریم کے دہلی میں آنے کی اطلاع کو تعجب کے ساتھ سنا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقامی پولیس کو کچھ علم نہیں۔ اور فضل کریم صاحب اپنے کسی پرائیویٹ کام کے لئے آئے ہیں۔ اور اگر باتوں میں اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو فضل کریم صاحب کے آنے کا علم ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پٹیلالہ سے یہ لوگ میرے متعلق ہی آئے ہیں۔ اور کوئی نہ کوئی کارروائی میرے خلاف ہوگی۔ اُس زمانہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ارگن تھے۔ میں نے ان کو ٹیلی فون کیا کہ ایک ضروری کام کے لئے بلنا چاہتا ہوں۔ مسٹر ارگن کو پہلی تلاشی اور جھوٹے مقدمہ کا تمام علم تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ضروری معاملہ ہو تو ابھی آجاؤ۔ اُس وقت چارنچ چلے تھے۔ اور وہ اپنی کوٹھی میں تھے۔ میں نے بھائی ہناسنگھ کو ٹیلی فون کرنے کے لئے ٹیلی فون کیا۔ ٹیلیسی۔ آئی۔ تو میں مسٹر ارگن کی کوٹھی پہنچا۔ مسٹر ارگن میرا انتظار کر رہے تھے۔ وزیٹنگ کارڈ اُتار بیچا۔ تو وہ خود ہی برآمدہ میں نکل آئے۔ گڈائیڈنگ ہوئی۔ تو مجھے تشویش میں دیکھتے ہوئے انھوں نے کھڑے کھڑے فوراً بات چیت شروع کر دی۔ جو یہ تھی۔

مسٹر ارگن :- کیا بات ہے۔ کیا کوئی نئی شکل یا مصیبت پیش آئی۔

میں :- جب تک کوئی شکل یا مصیبت نہ ہو۔ آپ کے پاس آتا ہی کون ہے۔ اور آنے کی کسی کو ضرورت ہی کیا ہے۔

مسٹر ارگن :- بتائیے کیا معاملہ ہے۔ کیا بات ہے۔

میں :- مجھے سب سے پہلے یہ بتائیے کہ کیا میں برٹش رعایا ہوں۔ یا پٹیلالہ کی رعایا۔

مسٹر ارگن یہ سن کر مسکرا دیئے اور کہا آپ برٹش رعایا ہیں۔ بتائیے معاملہ کیا ہے۔

میں :- پٹیلالہ کا سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی مسٹر فضل کریم جو تلاشی کے وقت آیا تھا۔ اب پھر دہلی میں کہیں آیا ہے۔ اس کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے یہ لوگ میرا بیچا کہیں کر رہے ہیں۔ اگر میں پٹیلالہ کی رعایا نہیں۔ تو ان کو حق کیا حاصل ہے کہ یہ اس طرح مجھے برٹش علاقہ میں تنگ کریں۔

برٹش رعایا اور پٹیلالہ کی رعایا کے میرے یہ الفاظ سننے ہی مسٹر ارگن آگ بگولہ ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر شکن تھی۔ اور یہ غصہ سے مٹ رہے ہو گئے۔ اور پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ فضل کریم پھر دہلی میں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے سٹیشن پر ان کو دیکھا۔ اور وہ چھ نمبر کے کمرہ رائل ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ مسٹر ارگن غصہ سے مٹ رہے ہوئے تھے۔ آپ نے کہا۔

”ویل دیوان سنگھ۔ تم جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو۔ ہم کبھی پٹیلالہ کو اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ وہ

دہلی میں کوئی بد معاشی کرے۔ ہم کبھی پٹیلالہ کے کسی انسر کو یہاں نہ آنے دے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ برٹش سبیکٹ کو برڈیکٹ کرے۔ پٹیلالہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر فضل کریم دہلی میں ہے۔ تو ہم ابھی تہہ لے گا۔ اس کو دہلی میں کبھی رہنے نہ دے گا۔ ریاستیں برٹش علاقہ میں

بد معاشی نہیں کر سکتیں، ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ دار ہے۔“

اس جواب سے میں سمجھ گیا۔ اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ فضل کریم صاحب میرے متعلق دہلی میں نہیں آئے کیونکہ اگر آتے۔ تو مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کو علم ہوتا۔ مسٹر مارگن کی باتیں اور ان کا جوشِ ظاہر کر رہا تھا۔ کہ ان کو فضل کریم کے آنے کا کچھ علم نہیں میں اطمینان کے ساتھ اپنے مکان پر چلا گیا۔ وہاں سے سواری رام مندیجی کو تمام حالات ٹیلی فون پر بتائے اور مجھے یقین ہو گیا۔ کہ فضل کریم اپنے کسی کام آئے ہوں گے۔ ان کے آنے کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

رات کو میں آرام سے سویا صبح جاگا۔ اور غسل کرنے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ تو سردار کریم سنگھ انسپکٹر پولیس سی۔ آئی۔ ڈی تشریف لائے۔ انھوں نے مست سری اکال کہا۔ بیٹھے۔ میں نے چائے پیش کی۔ انھوں نے چائے کی پیالی پینے ہوئے پوچھا۔ کہ گیارہ رات کو کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی میں نے کہا نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں جب مسٹر مارگن سے بل کر ان کی کوٹھی سے چلا آیا۔ تو مسٹر مارگن نے حکیم اکرام الحق ڈپٹی سیشن ڈپٹی پولیس سی۔ آئی۔ ڈی کو ٹیلی فون کر کے طلب کیا۔ اور کہا کہ وہ فوراً رائل ہوٹل جائیں۔ اگر فضل کریم وہاں ہوں تو ان کو حکم دیا جائے۔ اور انتظام کیا جائے کہ وہ پہلی گاڑی سے دہلی چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ دہلی نہ چھوڑیں تو ان کو حالات میں دے دیا جائے۔ اور اس حکم کی تعمیل کرنے کے بعد ان کو رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ حکیم اکرام الحق اس حکم کو سن کر رائل ہوٹل پہنچے۔ وہاں چیمبر کے کمرہ میں مسٹر فضل کریم موجود تھے۔ حکیم اکرام الحق نے فضل کریم صاحب کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی کا حکم سنایا۔ فضل کریم صاحب نے بہت داد دیا گیا۔ کہ ان کو کہیں دہلی سے نکالا جا رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر شرافت کے پاس آنکھوں کا علاج کرائے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ علاج کرانا ہے تو لاہور جائیے۔ دہلی کبھی مت آئیے۔ اور پہلی گاڑی میں پیٹالہ چلے جائیے۔ اور اگر آپ نہ گئے۔ تو آپ کو حالات میں دے دیا جائے گا۔ چنانچہ فضل کریم صاحب کا بسترو اور سامان مندرہا لیا گیا۔ حکیم اکرام الحق کی موٹر میں ہی فضل کریم صاحب کو صبح ان کے سامان کے بچھا لیا گیا۔ اور حکیم صاحب ان کو ریلوے سٹیشن لے گئے۔ فرنٹیر میل کے جانے میں ابھی کسی گھنٹے باقی تھے۔ ریلوے سٹیشن پہنچ کر ریلوے کے تقانہ سے حکیم اکرام الحق نے پولیس لائن میں ٹیلی فون کر کے ایک سب انسپکٹر منگایا۔ اس سب انسپکٹر کو ہدایت کی گئی۔ کہ جب تک فضل کریم صاحب گاڑی میں بیٹھ نہ جائیں۔ اور گاڑی روانہ نہ ہو جائے۔ وہ فضل کریم صاحب کے ساتھ رہے۔ ان کو گاڑی پر چڑھا کر سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کی کوٹھی جائے اور فضل کریم صاحب کی روانگی کی رپورٹ کرے۔ کیونکہ مسٹر مارگن نے یہی حکم دیا تھا۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے رات کو دس بجے کے بعد مسٹر مارگن کو اطلاع دی کہ فضل کریم صاحب دہلی سے تشریف لے گئے ہیں۔

سردار کریم سنگھ نے بتایا کہ ان کی بھی رات کو کوٹھڑی لگائی گئی تھی۔ کہ وہ اپنے آدمیوں کی معرفت نگرانی کریں۔ چنانچہ ان کے دو سپاہی رات بھر دفتر ریاست کا پہرہ دیتے رہے۔

مسٹر فضل کریم کا دہلی آنے کا یہ واقعہ اس کے بعد میں نے تو معمولی سمجھا۔ مگر دہلی کی مقامی گورنمنٹ نے پریسیل ڈیپارٹمنٹ کو لکھا۔ پریسیل ڈیپارٹمنٹ نے ہمارا چلیا کر تنبیہ کی کہ اگر چیلڈ کے آدمیوں کے انھوں برطانوی علاقہ میں برطانوی رعایا دیوان سنگھ کے خلاف کوئی بات ہوئی تو ہمارا جہ ذمہ دار ہوں گے اس کے



دو ہفتہ بعد ڈپٹی کمشنر کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ میں فوراً ریوالور کے لئے درخواست کر دوں  
خط ملنے پر میں میسرز ابھی بخش اینڈ کو بندوق سازوں کی دوکان پر گیا۔ وہاں ایک خوبصورت ریوالور  
انتخاب کیا۔ اس کا نمبر ۱۸۔ درخواست میں اس نمبر کو درج کیا۔ اور درخواست بھیجی تین چار روز کے اندر  
اس درخواست کی منظوری آگئی اور میں ریوالور خرید کر لے آیا۔

اس ریوالور کا شروع شروع میں ترشوق تھا۔ جب کبھی سفر میں جاتا تو ساتھ لے جاتا۔ بعد میں یہ بھیجہ  
ہی لوہے کی الماری میں بند پڑا رہتا۔ جہاں سے چوری ہو گیا۔ چوری ہونے پر اس کی تحقیقات شروع ہوئی  
تو پولیس کو معلوم ہوا کہ دفتر کے ایک شخص نے چوری کر کے اس کو ایک دوسرے شخص کے پاس اتنی پیسہ  
نیں فروخت کیا ہے۔ پولیس نے اس شخص کو اس خیال سے گرفتار نہ کیا۔ اور انتظار کیا کہ شاید آگے فریخت  
ہو۔ اور پھر کسی انارکسٹ کا سراغ لگ سکے۔ پولیس کے اس انتظار میں ہی خریدنے والے شخص کو پولیس  
کے پیچھا کرنے کا علم ہو گیا۔ اور وہ دہلی سے روپوش ہو گیا۔ پھر کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کہ اس ریوالور کا کیا  
ہوا۔ اور کہاں گیا۔

ریوالور کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ کا بیان کرنا بھی خالی از لطف نہ ہوگا۔ بھوپال کا مقدمہ چل  
رہا تھا۔ کئی دایان ریاست دشمن تھے۔ میں ہوشنگ آباد میں بیٹنی پر جانے کے لئے سامان بندھوا رہا تھا۔  
تو میرے پاس لالہ رام رھپال سنگھ شیدا ایڈیٹر ہندوستان "لاہور اور مسٹر پھن جوت (ایڈیٹر کوٹہ)  
جو اس زمانہ میں ہندوستان ٹائمز "کو ایڈیٹ کرتے تھے (میں نے ان سے مل کر رام رھپال سنگھ صاحب نے  
بزرگانہ محبت کے جذبات میں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ "اپنے ساتھ ریوالور بھی رکھ لو۔ تمھارے  
دشمن بہت ہیں۔ جب کبھی باہر جایا کرو تو ریوالور اپنے پاس ضرور رکھ کر دو۔" یہ سن کر  
مسٹر جوت نے کہا۔ "شیدا صاحب دیوان سنگھ اگر کبھی مارا جائے گا۔ تو کسی دالچے ریاست کے  
ہاتھوں سے نہیں مارا جائے گا۔ یہ جب کبھی مارا جائے گا تو دیوانی یعنی سول عدالتوں کے قریبی کرنے  
والے بلیفوں کے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔"

یعنی دیوان سنگھ دایان ریاست کے مقدمات اور ان کے صلوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہے۔  
اس کے لئے تعصبت ہے تو ملی پریشانیوں کی۔ کیونکہ وہ یہ صرف کرنے کی اس کی عادت بدل نہیں سکتی۔  
زندگی بھر اس کی یہ پریشانیاں کبھی کم نہ ہوں گی۔ اس کے خلاف قرضہ کے دیوانی مقدمات اور قریال  
ہوتی رہیں گی۔ اور ان پریشانیوں میں ہی یہ ختم ہو جائے گا

ریوالور کے چوری ہونے کے بعد تحقیقات کے سلسلہ میں پولیس میرا لائسنس لے گئی۔ اس کے بعد اس نے  
پھر دوبارہ ریوالور کا لائسنس مجھے نہیں دیا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا اور دیوانی الحقیقت چوری ہوا۔  
میں کاظم پولیس کو بھیجے۔

ریوالور کے چوری ہونے کے عرصہ بعد ایک سال محکمہ انکم ٹیکس نے مجھ پر زیادہ انکم ٹیکس لگا دیا۔ میں نے  
اس انکم ٹیکس کی لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس ایکسپرٹ سے شکایت کی۔ انھوں نے ٹیکس کم کرانے کی کوشش  
بھی کی مگر کامیابی نہ ہوئی قلابہ امیر چند نے کہا کہ اتنے زیادہ انکم ٹیکس کی صورت میں میں بندوق کا لائسنس

کیوں نہ لوں کیونکہ گورنمنٹ بندوق کا لائسنس دیتے وقت زیادہ تر انکم ٹیکس کو ہی دیکھتی ہے میں نے ان کی رائے سے درخواست لکھ کر بھیج دی۔ جو چندوں میں منظور ہو گئی۔ میں نے بیٹی کی ایک فرم سے اشتہارات کی اجرت میں بہت اچھی بندوق خرید لی۔ یہ بندوق میرے پاس کئی برس تک رہی۔ اور جب سٹاک ہاؤس گزٹار کیا جا کر کانگریسوں کے ساتھ نظر بند کیا گیا۔ تو میں جیل میں پونے کے باعث اس سال لائسنس کی تجدید نہ کر سکا۔ دلی آیا۔ اور لائسنس کو تجدید کے لئے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا تو اس نے لائسنس تجدید نہ کرانے کے تصور میں یہ لائسنس ضبط کر لیا۔ حالانکہ میں جیل میں تھا۔ وہاں خط و کتابت تک کی ممانعت تھی۔ لائسنس کیونکر تجدید کرانا۔ بندوق کا لائسنس ضبط ہونے کے بعد پولیس کا ایک کانسٹیبل ڈپٹی کمشنر کا حکم کر بندوق لینے کے لئے میرے پاس آیا۔ تو اس کے پاس جو کاغذات ضبطی کے متعلق تھے۔ میں نے وہ دیکھے۔ ان پر لکھا تھا: ”دیوان سنگھ کا چال چلن اس قابل نہیں کہ اس کو لائسنس عطا فرمایا جائے۔ اس لئے لائسنس ضبط کیا جاتا ہے۔“ یہ چال چلن کے الفاظ پڑھ کر میں نے برا محسوس نہیں کیا کیونکہ گورنمنٹ کے کاغذات میں ہندوستان کے تمام پولیس لیڈر اور ورکرز سے ہاتھ کاغذی بد چلن تھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی دفتری حکومت کے سایہ میں اس سنگھ میں کاغذات کی خانہ چوری کیونکر ہوتی تھی۔ اور سرکاری کتابوں میں نیک چلنی اور بد چلنی کے کیا معنی تھے۔

## اخبار نویس مصیبت نے وہ لوگوں کے لئے

مرحوم ہمارا جہاں بھ اور آپ کی فیملی کے ساتھ ایڈیٹر ریاست کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ان لوگوں کا ہمیشہ مخلص رہا۔ میں نے کبھی ان کی خوشامد نہ کی۔ اور سچی بات ان کے منہ پر کہہ دیا کرتا۔

چنانچہ یہ دلچسپ کیفیت ہے کہ ہمارا جہاں اور ہمارا فیملی کے بہن بھائی دھول پور کے درمیان اتھائی عداوت کے دھن میں بھی میرے تینوں کے ساتھ تعلقات گہرے رہے۔ یہ تینوں مجھ پر اعتراض کرتے اور تینوں ہی مجھے ایسا سمجھتے جیسے میں ان کی فیملی کا ایک ممبر ہوں۔ ہمارا جہاں مصوری پہاڑ پر تھے۔ آپ نے مجھے دہلی سے بلایا۔ اور کئی روز تک واپس آنے نہ دیا۔ ہر روز مشورہ ہوتا۔ ایک روز ہمارا جہاں نے انڈس کے بھج میں شکایت کی کہ فلاں ممبر اسمبلی اتنے ہزار روپیہ کھا گیا۔ مگر اس نے کچھ نہ کیا۔ فلاں لیڈر ایک لاکھ روپیہ چاٹ گیا۔ مگر اس نے دس سو روپے نہ کھا۔ اور فلاں پیرسٹریڈر وکیٹ اتنے لاکھ اڑا گیا۔ مگر خیمہ کچھ نہ نکلا۔ تمام لوگ روپیہ کھٹے داے لالچی ہیں۔ اور کوئی خیر خواہ یا بھروسہ نہیں۔

ہمارا جہاں نے یہ کہا تو انڈس کے بھج میں۔ مگر میں شکر ادا کیا۔ ہمارا جہاں نے پوچھا کہ شکایت کیوں ہو میں نے جواب دیا کہ سرکار۔ یہ لوگ صرف آپ کے مخلص یا بھروسہ پر بغیر غرض یا لالچ کے آپ کی خدمت کریں۔ تو کیوں۔ کیا آپ ہاتھ کاغذی ہیں۔ جو دنیا کے لئے تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ اور ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بغیر غرض کے آپ کے لئے تکلیفیں اٹھائیں۔ اور کیا خود آپ کا ان لوگوں سے تعلق بغیر غرض کے ہے۔

اور اگر آپ نا بھ میں اپنی گدی پر ہوتے اور آپ کو کوئی سیاسی تکلیف نہ ہوتی تو کیا پھر بھی آپ ان پولیسکلیڈروں اور ممبران اسمبلی کو روپیہ دیتے۔ آپ اگر ان لوگوں کو روپیہ دیتے ہیں۔ تو اپنی غرض کے لئے۔ اور یہ لوگ آپ کے ساتھ ہیں تو اپنی غرض کے لئے۔ آپ کالیڈروں کے لالچ اور غرض کی شکایت کرنا لا حاصل ہے ہمارے میرے ان الفاظ کو سن کر خوش نہ ہوئے اور ان کی پیشانی کے بل ظاہر کرتے تھے۔ کردہ اس صاف بیانی کو سننا نہ چاہتے تھے۔ چند لمحہ تک تو سکون کی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد ہمارا جے نے محسوس کیا کہ میں نے جو کچھ کہا۔ وہ صداقت سے خالی نہیں۔ دونوں اطراف غرض کی غلام ہیں۔

اس واقعہ سے چند روز بعد سٹراٹھم بارنیمیں ایڈیٹر "سینٹیل" بمبئی سے ہمارا جے کی دعوت پر مصوری لائے۔ ان کا قیام تو وہاں ہیکنس ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا۔ مگر زیادہ وقت ان کا بھی ہمارا جے کے پاس گزرتا۔ میں ہر روز صبح نو بجے سٹراٹھم بارنیمیں سے باتیں کرنے ان کے ہوٹل میں جایا کرتا۔ دو تین گھنٹہ ان کے ساتھ باتیں ہوتیں۔ ایک روز سٹراٹھم بارنیمیں سے ہمارا جے نا بھ کی مصائب کا ذکر چل پڑا۔ تو سٹراٹھم بارنیمیں نے جواٹھاؤ کچھ وہ آپ تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

"ذیل سٹرویان سنگھ۔ اخبار نویس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے پیدا ہوئے۔ جو مصائب میں ہوں۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ جو خوشی و آرام میں ہوں۔ ہمارا جے نا بھ مصیبت میں ہیں۔ اس لئے بطور اخبار نویس ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا ساتھ دیں۔ اور ہمارا جے نا بھ جب گدی پر واپس نا بھ چلے جائیں۔ آرام میں ہوں۔ تو کوئی تعلق نہ رکھیں۔"

سٹراٹھم بارنیمیں کے یہ الفاظ میرے لئے نہ صرف انتہائی دلچسپی اور روح کو ایک ناقابل بیان لذت دینے کا باعث ہوئے۔ بلکہ میں اب جب کبھی کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں سبے اختیار ان الفاظ کی گونج پیدا ہو جاتی ہے۔

ان واقعات کے عرصہ بعد ہمارا جے نا بھ کو ڈائی کنٹال (مدد اس) میں نظر بند تھے۔ ہمارا جے اور ہمارا جے (موجودہ ہمارا جے کی والدہ) کے درمیان سخت عداوت تھی۔ اور یہاں بیوی کے درمیان خط و کتابت تک کا بھی کوئی تعلق نہ تھا کہ ہمارا جے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب سے مل گئیں۔ اور انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا۔ کہ ہمارا جے نا بھ ہمارا جے اور دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر نا بھ چلی جائیں۔ نا بھ جانے سے پہلے ہمارا جے بچوں کو لے کر ڈیرہ دون سے دہلی آئیں۔ یہاں علی پور روڈ پر نا بھ جوئس میں مقیم ہوئیں۔ یہاں پہنچے ہمارا جے کے بھائی سرور نامیہ سنگھ نے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلی فون کیا۔ کہ ہمارا جے صاحبہ نا بھ جوئس میں تشریف فرما ہیں۔ اور میں ان سے ملنے کے لئے پنج جادوں میں کار میں گیا ہمارا جے اور بچوں سے ملا۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ تو ہمارا جے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ کہ آپ نا بھ جا رہی ہیں۔ اس کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نا بھ میں ہر وقت دیر ہوگی ریاست نا بھ آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ پولیسکلیڈیوارٹمنٹ آپ کی مدد ہوگا۔ اور آپ آرام و راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔ مگر میری رائے میں بغیر شوہر کی مرضی کے شوہر کے خلاف جوتے ہوئے نا بھ جانا آپ کے لئے عزت کا باعث نہ ہوگا۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ آپ ہمارا جے کو زیادہ ناواض کریں۔

اور لوگوں میں بھی ذلیل درُسا ہوں۔ ہمارائی نے کہا کہ ہمارا جہ کی تکالیف کے کم ہونے کا بھی مذہب صرف یہی ہے کہ وہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تعلقات اچھے کر کے نا بھ چلی جائیں۔ اور پھر وہاں پہنچ کر اپنے شوہر کے لئے کوشش کریں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ صرف بہانہ سازی ہے۔ یہ کرتی جواب نہیں۔ جو کسی معقولیت پسند شخص کو مطمئن کر سکے۔

ہمارائی کا اس کے بعد شاید چار پانچ روز دہلی میں قیام رہا میں ہر روز ملتا تھا۔ اس عرصہ میں آپ نے بہت کوشش کی۔ کہ میں اُن کے ساتھ نا بھ چند روز کے لئے چلوں۔ ہمارائی کی مجھے ساتھ لے جانے کے لئے گہری چال تھی۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ میں اگر آپ کے ساتھ نا بھ چلا گیا۔ تو ایک قراس کے بعد میں ہلاک کے نا بھ جانے کی مخالفت اخبار میں نہ کروں گا۔ کیونکہ خود اُن کے اس قدم میں شریک ہوں گا۔ دوسری اُن کی غرض یہ تھی کہ میرے اُن کے ساتھ نا بھ جانے کی صورت میں ہمارا جہ میرے بھی خلاف ہو جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دیوان سنگھ ہمیشہ ہمارائی کا ساتھ دے گا۔ اور ہمارا جہ سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ میں نے ہمارائی کو جواب دیا۔ کہ میں ایک تو اصولاً اس کے خلاف ہوں۔ کہ آپ اپنے شوہر کی خواہش کے خلاف نا بھ جائیں۔ دوسرے ریاست نا بھ میں میرا سرکاری طور پر داخلہ بند ہے۔ میں وہاں جا نہیں سکتا۔ تیسرے میں اس بات کا اہل نہیں ہوں۔ کہ ہمارا جہ نا بھ جیسے درست سے غذاری کر کے آپ کے ساتھ بل جاؤں۔ گویا آپ کو بھی اپنا دوست بھجنا ہوں۔ میرے لئے بہتر راستہ یہ ہے کہ میں آپ کے ان پرائیویٹ معاملات اور جھگڑوں سے بالکل الگ رہوں۔ اور کسی کا ساتھ نہ دوں۔ ہمارائی نے پھر زور دیا۔ اور کہا کہ نا بھ میں داخلہ کی ممانعت کے متعلق آپ ابھی ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب سے بذریعہ تار اجازت منگالیتی ہیں مگر میں نے پھر بھی انکار کر دیا۔ ہمارائی جس روز نا بھ جانے والی تھیں۔ موٹریں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہوتی تھیں۔ اور یہ دیگر ارم یہ تھا۔ کہ موٹریں راجپورہ تک جائیں اور وہاں سے شاہی داخلہ دیکر نا بھ ہمارا جہ اور اُن کی والدہ اور ہمارا جہ کی بھائی بہنیں کئی برس کے بعد واپس اپنی ریاست میں جا رہے تھے) کے لئے ریلوے کی سپیشل ٹرین نا بھ جانے میں اُس روز نو بجے کے قریب ہمارائی اور بچوں سے ملنے کے لئے نا بھ ہنس پہنچا۔ ایک گھنٹہ کے قریب ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ اور دس بجے واپس آیا۔ جب واپس آنے لگا۔ تو ہمارائی اور نا بھ ہمارا جہ دھن کو میں اُس روز تک محبت اور وضع داری سے مجبور ہو کر مکہ صاحب (یعنی ولیعہد) ہی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ ضمیر گوارہ نہ کرتا تھا۔ کہ ان کے باپ کی زندگی میں ان کو ہمارا جہ کہوں) مجھے رخصت کرنے کے لئے کرہ کے اندر سے باہر برآمدہ میں آئے۔ برآمدہ سے میں جب باہر نکلنے لگا۔ تو میں نے ہمارائی کو تو ہاتھ جوڑ کر دست مری اکال کہا۔ اور نو جوان ہمارا جہ کے گلابی رخساروں کو پیار کے ساتھ ہاتھوں سے چھوا۔ اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا سنگھ صاحب۔ گڈ بائی۔ اب تو شاید ہم زندگی میں کبھی آپ سے مل بھی نہ سکیں گے۔“ میرے یہ الفاظ سن کر ہمارائی چونک پڑیں۔ اور آپ نے گھبراتے ہوئے کہا۔ کیوں۔ کیوں۔ کیوں۔ دیوان سنگھ جی۔ آپ نے یہ کیا کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ہمارائی صاحبہ۔ میں دنیا کی حالت سے واقف ہوں۔ اب آپ لوگ آرام سے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ میرا آپ لوگوں کے ساتھ تعلق صرف اس وقت تک کے لئے تھا جب تک

کہ آپ کو تکلیف میں تھے۔ اب اس کے بعد آپ سے کہا واسطہ۔ ہمارا بی بی نے فوراً جوش کے ساتھ کہا: ”جہنم نہیں دیوانہ سنگھری۔ آپ کو کبھی ایسا خیال نہ کرنا چاہئے۔ آپ کے اور ہم لوگوں کے تعلقات فیملی کے سے تعلقات ہیں۔ یہ ممکن ہی کیونکر ہے کہ ہم لوگ زندگی میں کبھی جدا ہو سکیں۔ آپ کبھی ایسا خیال نہ کیجئے اور کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالئے۔“

میں رخصت ہو کر اپنی کار میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔ واپس آتے ہوئے کار چلا رہا تھا، مگر ذہن مسٹر ہارنہین کے ان الفاظ کو بار بار دہرا رہا تھا۔ جو آپ نے ہیکن ہٹل مصوری میں کہے تھے۔

”اخبار نویس دنیا میں صرف اُن لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے پیدا ہوتے۔ جو مصائب میں ہوں۔“

اُن لوگوں سے ہمارا کیا تعلق جو خوشی و آرام میں ہوں۔“

اس کے بعد میں نے نہ تو کبھی ہمارا بی بی پر دوبارہ ہمارا جہ کو کوئی خط لکھا اور نہ ملنے کی کوشش کی۔ نہ اُن دونوں کی طرف سے مجھے کبھی کوئی خط ملا۔ یہ کی بارہ مئی میں آئے۔ اور نہ انھوں نے کبھی مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں انبالہ جیل میں نظر بند تھا جب مرحوم ہمارا جہ نا بھہ کا کوڑائی کمال میں انتقال ہوا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں مجھے نظر بندی سے رہائی ملی اور دہلی جیل سے مسٹر پوتھن جرنل ایڈیٹر ”ڈان“ کے مکان پہنچا اور پہلے روز رہائی کی اطلاع کے متعلق جب اپنے دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط لکھتے۔ تو اُن خطوط میں ایک خط موجود ہمارا جہ نا بھہ کو بھی لکھا۔ جس میں ان کے والد کے انتقال کے متعلق اظہارِ افسوس کیا گیا تھا۔ اس خط کا جواب اب تک میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ اور نہ شاید کبھی آئے۔ کیونکہ اخبار نویس خطوط کے جواب کی بھی صرف اُن لوگوں سے توقع کر سکتے ہیں۔ جو مصائب میں ہوں۔ اُن لوگوں کا والد سے کیا تعلق جو آرام و راحت میں ہوں۔

## غلط تشخیص اور غلط علاج

میرے وطن حافظ آباد میں ایک درزی امام الدین تھے میں نے جب ہوش نبھالا تو وہ ہمارے گھر کے کپڑے سیا کرتے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو میری پیدائش سے پہلے میرے والد کے کپڑے بھی شاید وہی پہنتے تھے۔ بہت اچھا زمانہ تھا۔ چند مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا۔ میں امام الدین کو ہمارے گھر میں کسی نے نام سے کبھی نہ پکارا تھا۔ ہر شخص عزت کے ساتھ ان کو مخاطب کرتا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ جب کبھی ہمارے گھر میں سے گئے کپڑے لینے یا پہنے کے بعد کپڑے دیے آتے ہیں ان کو پنجابی زبان میں چاچا (یعنی چچا) کہتا۔ اور ان کی غیر حاضری میں بھی جب کبھی ان کا نام لیتا۔ تو میں امام الدین کے ساتھ چاچا ضرور کہتا۔ یعنی میں چاچا امام الدین کے ہاں گیا۔ یا چاچا امام الدین سے ملا۔ ہمارے خاندان کے تمام لوگ آپ کے ساتھ اس طرح ہی عزت و محبت کا سلوک کرتے۔ اور یہ سلوک صرف امام الدین تک ہی محدود نہ تھا۔ ہمارے گھر میں صفائی کرنے کے لئے ایک بھنگن روشن بی بی آباد کرتی۔ مجھے یاد ہے۔ میں اس کو بھی ہمیشہ چاچا (چچی) کہہ کر پکارتا۔

اس کی ایک لڑکی مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھی۔ اس سے بھی میں ہمیشہ بہن کہہ کر مخاطب ہوتا۔ کیونکہ تمام گھر بھر میں یہی دستور تھا۔ اور میرے حقیقی بھائی۔ بہن۔ چچا زاد بھائی اور عزیز دوسروں کے ساتھ اس طرح ہی پیش آتے۔

میری عمر پندرہ سال کی تھی جب میں تلماش نوگاہ کے لئے وطن سے چلا گیا۔ اس کے بعد اگر کبھی وہاں گیا۔ تو چند روز کے لئے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ پانچ بھ سال کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تو صرف ایک یا دو روز کے لئے۔ چنانچہ چچا امام الدین سے ملے بھی ساہا سال ہو گئے۔ مگر ان لوگوں کے اخلاص و محبت کا اب تک ذہن پر اثر ہے۔ اور جب کبھی ان کا خیال آتا ہے۔ تو اس اخلاص کی یاد سے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

کئی برس کی بات ہے۔ چچا امام الدین کا نواسہ جس کی عمر دس سال کی ہوگی۔ کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو بخار کی بھی شکایت ہوئی۔ کھانسی اور بخار دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ہندوستان کے تالاق حکیموں کے خیال میں سو فی صدی تپ دہ ہے۔ امام الدین اس بچہ کو جس حکیم کے پاس لے جائیں وہ کھانسی اور بخار سن کر نمض دیکھے۔ اور تپ دہ کا نسخہ لکھ دے۔ یہ بچہ دو برس تک اس "تپ دہ" میں مبتلا رہا۔ تمام حکیموں کے فترے کی صورت میں بچہ کے والدین کی تشویش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ امام الدین صاحب اس وقت بہت ضعیف تھے۔ (نہ معلوم اب زندہ ہیں۔ یا انتقال کر چکے) ان کو علم تھا کہ میں دہلی میں ہوں۔ اور "ریاست" اخبار بہت شان کے ساتھ نکل رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی سنا تھا کہ دہلی لائق حکیموں کا مرکز ہے۔ ان کو یہ بھی خیال ہوا کہ دیوان سنگھ کا ان حکیموں پر اثر ہوگا۔ یہ بچہ دہلی کے حکیموں کو دکھایا جائے۔ شاید اس کے تپ دہ کا علاج ہو سکے۔ اور لڑکا بچ جائے۔ امام الدین صاحب نے اپنے داماد یعنی اس بچہ کے باپ کے ساتھ اپنے نواسہ کو بھیجا۔ اور ساتھ بچے خط لکھا کہ یہ بچہ دو سال کے عرصہ سے تپ دہ میں مبتلا ہے۔ اس کو کھانسی و بخار ہے۔ تمام حکیموں نے جواب دے دیا۔ اسے دہلی کے حکیموں میں سے کسی لائق حکیم کو دکھایا جائے۔ تاکہ اس کا علاج ہو۔ شاید یہ بچ جائے۔

یہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ جب آیا۔ اور میں نے اس خط کو پڑھا تو مجھے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب امام الدین ہمارے دکھ سکھ کے شریک تھے۔ ہمارے ہاں شادی ہوتی۔ تو یہ کئی کئی روز تک ہمارے ہاں بیٹھ کر کپڑے میٹے۔ اور اگر کوئی موت ہو جاتی۔ تو یہ اس طرح ہی روتے۔ جیسے ان کے گھر کا کوئی عزیز مر گیا ہے میں نے ایک کمرہ میں امام الدین کے داماد اور نواسہ کی رہائش کا انتظام کیا۔ مرحوم حکیم محمد احمد خاں (مرحوم حکیم اجمل خاں کے بیٹے) کے ساتھ میرے حقیقی بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ دو! ایسے غلص۔ بے ریا اور محبت کے لوگ دنیا سے آٹھ گئے۔ اور اب ان کا نعم البدل کہیں نظر نہیں آتا، میں نے فیصلہ کیا۔ کہ بچے کو ایک دو روز بعد حکیم کو دکھاؤں گا۔ شام کو میں کام سے فارغ ہوا۔ تو میں نے امام الدین کے داماد کو اس غرض سے اپنے پاس بلایا کہ اس سے حافظ آباد کے تازہ حالات معلوم کروں۔ یہ باتیں کرنے کے لئے اپنے بچہ کے ساتھ میرے پاس آیا۔ تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ بچہ کے متعلق تمام حکیموں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے یہ دو سال سے بیمار ہے۔ اور اس کی زندگی کی گھر والوں کو کوئی اُمید نہیں کیونکہ اسے تپ دہ ہے۔

دوسالی کی طویل بیماری اور تپ دق کو سن کر میں نے جب بچہ کی طرف دیکھا۔ تو اس کے رخساروں پر  
 شرعی تپ۔ اور بچپن کے باعث وہ سکون کے ساتھ بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اس کا ذہن شرارتوں اور کھیلوں کی  
 تلاش میں تھا۔ چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بیٹھے کے بجائے کھیلنے کے لئے نیچے چلا جائے میں نے اس کی  
 اس کیفیت کو دیکھا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ یہ کس قسم کا تپ دق ہے۔ جس میں دو سال تک مبتلا رہنے کے بعد  
 بھی بچہ کے چہرہ پر شرعی تپ ہے۔ اور اس کی بچپن کی شرارت میں کمی نہیں ہوئی۔ میں تین چار برس تک میڈیکل  
 پریکٹس کرتا رہا۔ اور میں کامیاب پریکٹیشنروں میں سے تھا۔ اس سے پہلے موگا کے ہسپتال میں رہا اور اب بھی  
 ادویات کے ساتھ دلچسپی باقی ہے۔ اور جب کبھی کوئی ڈاکٹر ملے۔ تو نئی ایجادات کے متعلق باتیں کر لیتا  
 ہوں۔ میں نے بچہ کے متعلق پوچھا کہ اس کو تکلیف کیا ہے۔ تو بچہ کے باپ نے بتایا۔ کہ تپ دق ہے۔  
 میں نے پھر پوچھا۔ اور کہا کہ تپ دق تو بیماری ہے۔ اس کو تکلیف کیا ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ دن بھر  
 اور رات بھر کھانتا ہے۔ اور رات کو اسے بخار بھی ہو جاتا ہے۔ میں حیران کر یہ تپ دق کس قسم کا ہے۔  
 جو دو سال تک رہا۔ مگر بچہ کے چہرہ پر شرعی اور دق تپ ہے۔ کیونکہ تپ دق کا دو چار ماہ میں ہی اگر علاج نہ کیا  
 جائے۔ تو موت کے قریب لے جاتا ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ شاید اس کا گلا خراب ہو۔ اور گلے کی خرابی  
 کے باعث ہی یہ کھانتا ہو۔ اور بخار بھی ہو جاتا ہو۔ میں نے اس کو منہ کھولنے کے لئے کہا۔ اس نے  
 منہ کھولا۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کے گلے کے دونوں طرف لوکاٹ کے برابر گلینڈ بڑھے ہوئے ہیں۔ اور  
 تمام منہ غلیظ ہے۔ یعنی کبھی صاف نہیں کیا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہی اس کی بیماری کا باعث ہے۔  
 اس واقعہ سے ایک عرصہ پہلے کئی برس تک میرا گلا خراب رہا تھا۔ اور سور تھروٹ کے باعث  
 میں آرام سے سو بھی نہ سکتا تھا۔ اس زمانہ میں چاندنی چرک کے سرے پر ایک تھروٹ ایکسپرٹ ڈاکٹر  
 قریبی تھے۔ (میرا خیال ہے کہ یہ صاحب بعد میں غالباً ریاست رام پور میں چیف میڈیکل افسر  
 تھے) میں نے ان کو دکھایا۔ تو انھوں نے مجھے ناک اور گلے میں سپرے کے ساتھ استعمال کرنے کے  
 لئے دق دق صدی کی طاقت کا نیوسل دول سلوشن بتایا۔ میں نے اس لوشن کا استعمال کیا۔ تو میرا گلا  
 جو کئی برس سے خراب تھا۔ دو تین دن میں ہی بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ یہ لوشن اور سپرے میرے پاس ہمیشہ  
 موجود رہتا تھا۔ میں کئی درجن دوستوں کو یہ نسخہ بتا چکا تھا۔ اور کوئی طلب کرتا۔ تو معذرتاً اس کو دے بھی  
 دیتا۔ اور اگلے روز دنیا خرید لیتا۔ میں نے دو اسپرے میں ڈال کر اس کے گلے میں لگائی۔ اور ناک کے ذریعہ  
 ناک اور گلے کے درمیان کے جھنڈے میں پہنچائی۔ صبح پھر اس طرح سپرے کیا۔ اور غرارہ کے لئے میں نے اس کو  
 مرکوزون اور سٹرین دیا۔ (جو میں غرارہ کے لئے ہمیشہ خود استعمال کرتا ہوں) دو دن کے بعد میں نے دیکھا  
 تو اس کا گلا بہت حد تک اچھا ہو چکا تھا۔ میں نے حال پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ اب اس کو کھانسی کی  
 شکایت نہیں۔ اور رات کو بخار بھی نہیں ہوتا۔ اور کوئی تکلیف باقی نہیں۔

تین چار روز میں نے اس بچہ کو خود سپرے کیا۔ جب بچہ بالکل اچھا ہو گیا۔ تو میں نے اس کو ایک فیٹی  
 سلوشن۔ ایک سپرے۔ ایک شیشی مرکوزون اور ایک شیشی سٹرین دی۔ تفصیل سے سپرے کے ساتھ دوائی  
 کا لگانا بتایا اور غراروں کے متعلق سمجھایا۔ اور کہا کہ تپ دق نہ قتلہ گلا خراب تھا۔ اب بچہ اچھا ہو گیا ہے۔

یہ اردو بات لے کر واپس تشریف لے جائے۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس نے طووال کیا۔ کہ حکیم صاحب کو کب دکھاؤ گے۔ میں نے پوچھا کہ بچہ اب بالکل اچھا ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ بالکل اچھا ہے۔ نہ کھانسی ہے۔ نہ سکار۔ رات کو آرام سے سوتا ہے۔ اور کوئی شکایت نہیں۔ میں نے کہا کہ جب بالکل اچھا ہے۔ تو پھر حکیم صاحب کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میری تمام دلائل مننے کے بعد اس نے پھر کہا کہ حکیم صاحب کو تو ضرور دکھا دیجئے کیونکہ کئی سوہیل سے آنے کے بعد بھی حکیم صاحب کو نہ دکھایا جائے تو آنے کا کیا فائدہ۔ میں نے بہت کہا کہ جب بچہ بالکل اچھا ہے۔ تو اب دکھانے سے کیا حاصل۔ یہ نہیں مانا۔ بہت مایوسی محسوس کر رہا تھا۔ آخر مجبوراً مجھے بھی چالاکت کا ساتھ دینا پڑا۔ میں ان باپ بیٹے کو مرثیوں میں حکیم صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ تمام حالات بتائے۔ اور عرض کیا کہ اس طرح سے علاج کیا۔ اب بچہ بالکل اچھا ہے۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں۔ حکیم صاحب تمام حالات سن کر مسکرا دیئے۔ اور آپ نے نسخہ لکھ دیا۔ شربت شہتوت ایک تولا اور ظلاں معجون دن میں تین بار۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کے لوگوں میں حکیموں اور ویدوں کے متعلق کتنا کورناہ اعتقاد ہے۔ اور پبلک کس طرح سے غلط تفہیم اور غلط علاج کا شکار ہو کر نئی ایجادات اور سائنس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تباہ ہو رہی ہے۔

## ریاست نابھہ کا پراسرار رکن

ریاست نابھہ میں ایک صاحب پنڈت آسا سنگھ ہمارا جہ کے اے۔ ڈی۔ سی تھے۔ بڑے منکر مزاج۔ بات کہتے تو ہاتھ جوڑ کر نگاہیں نیچی کر کے خوشامدانہ طریقہ سے۔ ہمارا جہ ان کی خوشامدوں کے باعث ان سے بہت خوش تھے۔ ان کے والد بھی پہلے اس ریاست میں ملازم تھے۔ اور پنڈت آسا سنگھ نے بھی ایک ونی حیثیت سے اے۔ ڈی۔ سی تک ترقی کی تھی۔ اس لئے ان کو خاندانی اور فطرتاً و فاشعار سمجھا جاتا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے۔ ہمارا جہ نے اپنے ایک دوست سردار بہادر سردار سرگن سنگھ آف لڑھیانہ جس سے زانہ ممبر پنجاب کونسل تھے کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔ جو لکھ کر بھیجنا چاہتے تھے تو اس پیغام کو پہچانے والے پنڈت آسا سنگھ تھے۔ ہمارا جہ نے جو تغارنی خط پنڈت آسا سنگھ کو دیا۔ اس میں لکھا کہ ”پنڈت آسا سنگھ میرے معتد ترین مانبدہ ہیں۔ یہ جو کچھ کہیں گے وہ میری طرف سے اور سچا سمجھا جائے۔“ پنڈت آسا سنگھ کا نابھہ میں کافی عروج تھا۔ ریاستوں میں تو حکمران کے ہاتھ دھلائے اور کھانا کھلانے والوں سے بھی ان کو سبب حضوری سمجھ کر لوگ ڈرتے ہیں۔ پنڈت آسا سنگھ لے۔ ڈی۔ سی تھے۔ ان سے تو ذرا بھی خوف کھاتے اور بہت عزت سے پیش کرتے۔

جیمبر آف پرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا تھا۔ ہمارا جہ یہاں لڑو کیل روڈ کی ایک کوشی میں مقیم تھے۔ اس کوشی کے میدان میں پرائیویٹ سیکرٹری اے۔ ڈی۔ سی اور دوسرے ملازمین حضوری کے لئے



چیمے نصب تھے۔ سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ دو ڈبلینڈ ہوٹل میں مقیم تھے اور راقم السطور بھی تاروے کرنا بھ سے دہلی بلوایا گیا تھا۔ جو بعض دوسرے انسروں کے ساتھ ایک ہوٹل (مجھے ٹھیک یاد نہیں رہا۔ غالباً ہمارا جہ ہوٹل تھا۔ جو نارلٹی سینا کے پاس ہے) میں مقیم تھا۔

پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے انسدادران کا ڈیپارٹمنٹ ہمارا جہ کا اُن کے گہری پریشنے کے دن سے ہی دشمن تھا۔ اس خیال کے باوجود ہمارا جہ سرکاری خط و کتابت میں پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کو جواب دیتے رہے۔ پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے انسروں کے لئے خوشگوار نہ ہوتا۔ ان ایسے جوابات میں سے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب سے گورنمنٹ ہند کی ہدایت کے مطابق پنجاب کی تمام ریاستوں سے دریافت کیا۔ کہ ان کی ریاست میں سرکاری ملازمین اور ریاست کے لوگوں کے پاس کتنی بند و قیدیں کتنی تلواریں کتنی برچھیاں۔ کتنے بھالے اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ ہند تمام ہندوستان میں مسلح شکاری کرنا چاہتی تھی۔ گورنمنٹ کے اس سرکار کے جواب میں ہندوستان کی ہر ریاست نے مطالبہ اطلاع ہم پہنچایا۔ مگر ہمارا جہ نے جواب میں لکھا کہ آپ معاہدہ کی کونسی دفعہ کے مطابق یہ پوچھ رہے ہیں۔ اور ایسا پوچھنے کا آپ کو حق کیا حاصل ہے۔ اس قسم کے جوابات حالات کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتے چلے گئے۔ اور ہمارا جہ یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہنے لگا کہ گورنمنٹ ان کے خلاف کیا کچھ کر رہی ہے۔ چنانچہ ہمارا جہ نے پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے اپنے متعلق تمام حالات معلوم کرنے کے لئے پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے متعدد ڈپٹی انسروں اور کلرکوں کو کرایہ پر خرید رکھا تھا۔ ان کو جزا ہاروپہ ماہوار دیا جاتا۔ اور یہ لوگ تمام اس خط و کتابت کی نقلیں ٹائپ کر کے ہمارا جہ کو سپلائی کرتے۔ جو ہمارا جہ کے متعلق پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کی گورنمنٹ ہند کی ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب یا داسرائے کے درمیان کا نفیڈ نفل ہوتی۔ ہمارا جہ یہ تمام نقلیں اور کاغذات کلرٹی کے ایک کس میں رکھتے۔ اور ہمارا جہ جہاں سفر کرتے یہ کس اپنے ساتھ پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں لے جاتے۔ چنانچہ اس زمانہ میں یہ کس بھی ہمارا جہ کے ساتھ تھا۔ جو پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں آپ کے خیمہ میں رہتا۔

دایان ریاست۔ طوائفوں اور روزانہ اخبارات کے ایڈیٹروں کی زندگی کا پروگرام دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دنیا سوتی ہے۔ تو یہ جاگتے ہیں۔ دنیا جاگتی ہے۔ تو یہ سوتے ہیں۔ ہمارا جہ بھی دوسرے دایان ریاست کی طرح صبح و سب کے جاگتے۔ بارہ بجے چائے پیئے۔ دو بجے ناشتہ ہوتا۔ شام کو چھ بجے لچ رات کو دس بجے شام کی چائے۔ اور رات کو دو بجے ڈنک کھانے کے بعد تین بجے بیڈ روم میں جاتے آپ ایک روز رات کو دو بجے سو گئے۔ تو چابکے پنڈت آسا سنگھ نے زانچی (جو کیمپ میں ساتھ رہتا) سے دہزار روپیہ اخراجات کے نام پر لیا۔ اور کہا کہ آپ ہمارا جہ کے ایک ضروری کام کے لئے گوا لیار جا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک ٹانگہ منگایا۔ اس ٹانگہ میں کلرٹی کا وہ کس رکھوایا۔ جس میں پولیشیل ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کی ہوئی نقلیں اور رشوت دے کر حاصل کئے ہوئے کاغذات تھے۔ آپ کی روانگی سے پہلے پٹیل کی تیز رفتار موٹر میں اس کو بٹھی سے کچھ فاصلہ پر موجود تھیں۔ یہ کس ایک موٹر میں رکھا گیا۔ پنڈت جی بھی بیٹھ گئے۔ اور یہ موٹر پٹیل کے لئے روانہ ہوئیں۔ تیز موٹر دہلی سے پٹیل چار گھنٹہ میں پہنچا سکتی ہے۔ پنڈت

آساسنگھ معہ کاغذات آٹھ بجے کے قریب پشپال پہنچ گئے۔ دس بجے کے قریب ہمارا جہنم سے سیرا ہوئے۔  
 ضروری حاجات سے فائدہ ہوئے۔ تو پنڈت آساسنگھ کو طلب فرمایا۔ کیونکہ یہ سمرل تھا۔ کہ بیدار ہونے کے  
 بعد ہمارا جہنم کا یہ معتد ترین "اسے۔ ڈھی۔ سی ہر روز ہمارا جہنم کی خدمت میں حاضر ہونا۔ لگاؤم پنڈت آساسنگھ  
 کو بلانے گیا۔ تو پنڈت جی اپنے خیمہ میں نہ تھے۔ دوسروں کے خیموں میں تلاش کیا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ ہمارا جہنم  
 رپورٹ ہوئی کہ موجود نہیں ہیں۔ ہمارا جہنم نے سمجھا کہ شاید ہمیں کہیں ہوں گے۔ گیارہ بجے گئے۔ پنڈت آساسنگھ  
 پھر طلب کیے گئے۔ وہ پھر نہ ملے۔ تو پرائیویٹ سکریٹری کو بلایا گیا۔ پرائیویٹ سکریٹری سردار گوردیال سنگھ تھے  
 انھوں نے شاف کے دوسرے لوگوں سے دریافت کیا۔ تو خزانچی نے بتایا کہ قریب دو ہزار روپیہ لے کر  
 گویا گئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ساتھ ایکس بھی لٹا کر لیا۔ رکھوایا تھا۔ پنڈت جی کے خیمہ میں جا کر کہیں دیکھا۔  
 گیا تو وہ بھی غائب تھا۔ اب انٹرویو ہوئی کہ ہمارا جہنم تو پنڈت جی کو کہیں بھیجا نہیں۔ پنڈت جی گئے کہاں۔  
 ہمارا جہنم کی موٹریں پنڈت جی کی تلاش میں نکلیں۔ کوئی ریوڑے سٹیشن۔ کوئی دو ٹو لینڈ ہوٹل میں۔ کوئی دوسرے  
 ہوٹلوں میں۔ گویا گئے کہاں۔ آخر کوئی گھنٹہ مشورہ کر کے بعد فیہ ملہ ہوا کہ پولیس میں پولوڈٹ کی تلاش۔ چنانچہ  
 دو ہزار روپیہ اور سرکاری سامان لے کر بھاگ جانے کی رپورٹ تھا۔ میں لکھی گئی۔ مگر تحقیق ہو تو کہاں۔  
 اور کرے تو کون۔ پنڈت آساسنگھ کے بیٹا لالہ پنڈت جی کو چالیس ہزار روپیہ نوٹوں بطور انعام دیا  
 گیا۔ اور آپ کو دیاں ناچ بکھیل اور بھی مقرر کیا گیا۔ جو شاید بعد میں وہاں ترقی کر کے تعیندار بھی ہوئے۔  
 پنڈت آساسنگھ والے کہیں کو ہر دیا کشن کول وزیر اعظم پشپال دہلی لائے۔ یہ کہیں سر جان تھا۔ میں پشپال  
 سیکریٹری گورنمنٹ ہند کو لیا گیا۔ سر جان نے تمام کاغذات دیکھے۔ کاغذات دیکھنے کے بعد آپ ان  
 کاغذات کو لارڈ ریڈنگ کے پاس لے گئے۔ لارڈ ریڈنگ نے تمام کاغذات کو دیکھا۔ تو وہ  
 اس خط و کتابت کی نقلیں تھیں۔ جو ہمارا جہنم کے متعلق دایسراے اور پولیس سیکریٹری گورنمنٹ ہند  
 یا پولیس سیکریٹری گورنمنٹ ہند اور ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کے درمیان ہوئی تھی۔ اور قطعی  
 کانفیڈنشل تھی۔ لارڈ ریڈنگ نے ان کاغذات کو دیکھ کر حیرانی کے ساتھ اپنے ماتھے کی انگلی داغوں  
 میں لے لی۔ اور سر جان تھا۔ میں کو ہمارا جہنم کے متعلق حکم دیتے ہوئے کہا:-

”اس شخص کے ماتھوں سے گورنمنٹ ہند کا کانفیڈنشل ریکارڈ بھی محفوظ نہیں۔ اس شخص کو

لازمی طور پر ختم کیا جائے۔ اور گڈی سے اتارا جائے۔“

اس واقعہ سے پہلے ناچھ اور پشپال کے درمیان مقدمہ بازی جاری تھی۔ لکھنؤ چیت کورٹ کے ایک جج  
 جسٹس سوڈا انبار میں مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ ناچھ کی طرف سے مسٹر ایڈری نارٹن۔ سر علی امام۔  
 مسٹر حن امام اور سردار بہادر بھگوان سنگھ رجو آجکل اجیر میں وکالت کرتے ہیں (دیگرہ اور پشپال کی  
 طرف سے کلکتہ کے مسٹر سین اور نصف درجن دوسرے بڑے بڑے وکلاء) مجھے نام یاد نہیں ہے۔ میر خیال  
 ہے کہ شاید ڈاکٹر سپرد بھی تھے (پیر دی کر رہے تھے) وکیلوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لئے  
 کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی لاریاں ناچھ اور پشپال سے انبار لائی جاتیں شاید ہی کوئی گواہ ایسا ہوگا جس کو

دس ہزار روپیہ سے کم رشوت دی جاتی۔ بعض گواہوں کو تو ہاں کی جگہ صرف نہ کہنے کے لئے پکپکس پکپس اور پیچاس پیچاس ہزار روپیہ رشوت دی گئی۔ نا بھہ اور پٹیل کی رعایا کا پسینہ بہا کر پیدا کیا ہوا روپیہ مقدمہ کے نام پر وکیلوں اور گواہوں کے جیب میں گیا۔ اور ابھی حبش سٹارٹ کا فیصلہ نہ ہوا تھا۔ کہ ہمارا جہ نا بھہ کو گورنمنٹ ہند نے نوٹس دے دیا۔ کیا تو گدتی سے خود بخود دستبردار ہوا اور نہ جرائم کے لئے اس طرح بی کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی۔ جس طرح غلام ملازمین کو دی جاتی ہے۔ ہمارا جہ دستبردار ہو گئے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ان ملازمین پر راز افشا کرنے وغیرہ کے جرم میں مقدمہ چلا۔ جنہوں نے اپنے دفتر کے کاغذات کی نقلیں ہمارا جہ کو سپلائی کی تھیں۔ اس مقدمہ میں سرگور دیال سنگھ پرائیویٹ سیکریٹری ہمارا جہ نا بھہ اور فارن منسٹر ریاست نا بھہ بطور سرکاری گواہ پیش ہوئے۔ جنہوں نے بیان کیا۔ کہ وہ ان لوگوں سے کاغذات لے جا کر ہمارا جہ نا بھہ کو دیتے رہے۔ ملازمین کو دو دو تین تین سال قید سخت کی سزائیں ہوئیں۔ اور ملازمت سے برطرف کیے گئے۔

ان واقعات کے کئی برس بعد جب ہمارا بی نا بھہ موجودہ ہمارا جہ اور اپنے دوسرے بچوں کو ملے کر واپس اپنی ریاست نا بھہ میں چلی گئیں۔ تو ایک روز پنڈت آسا سنگھ ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملنے کے لئے دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے۔ ان بچاروں کو یہ وہم تھا۔ یا انھوں نے کسی سے سنا تھا۔ کہ ہمارا بی نا بھہ پریوان سنگھ کا بہت اثر ہے۔ اور دیوان سنگھ جو مشورہ دے۔ ہمارا بی اس مشورہ کو قبول کر لیتی ہیں۔ پنڈت آسا سنگھ جب تشریف لائے۔ تو وہی انگسار اور وہی ریاستیوں کا ساتھ جوڑ کر بانیں کرنا۔ دوسرا سلام کے بعد باتیں ہوئیں۔ تو آپ نے خواہش ظاہر کی۔ کہ چونکہ ہمارا بی نا بھہ اب واپس چلی گئی ہیں۔ اور وہ وہاں برسرِ اقتدار ہوں گی اور ہمارا بی کے دل میں ایڈیٹر ”ریاست“ کے لئے بہت عزت و قدر ہے۔ ہمارا بی سے ایڈیٹر ”ریاست“ یہ کہے کہ پنڈت آسا سنگھ نا بھہ کے شاہی خاندان کے بدستور و فاشعار ہیں۔ اور انھوں نے غداری نہ کی تھی۔ صرف غلط فہمی ہوئی۔ جو دور ہو جانی چاہئے۔ میں نے پنڈت آسا سنگھ سے جب یہ سنا۔ تو حیران رہ گیا۔ کہ دُنیا میں کتنے بڑے ہوشیور لوگ مر رہے ہیں۔ جو اپنے ذہن کو دھوکہ دیتے ہوئے خود بے وقوف بنتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بے وقوف سمجھتے ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا۔ کہ پنڈت جی میرا ہمارا بی پر بی الحقیقت کوئی اثر نہیں۔ اور اگر اثر ہوتا بھی تو میں آپ کے متعلق کچھ کہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ میں آپ کے تمام حالات سے واقف ہوں۔ اور ہمارا بی خود واقف ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ دونوں ہی اپنے ذہن کو دھوکہ دے کر یہ سمجھ لیں کہ آپ نے ہمارا جہ کے ساتھ غداری نہ کی تھی۔ آپ کا ہم دونوں کو بے وقوف سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اپنے ذہن کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ کبھی بھی یہ کوشش نہ کیجئے۔ کہ آپ درست فہمی کو غلط فہمی بتا کر اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں کامیابی ممکن نہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا۔ اس کی سزا بھی کافی ہے۔ کہ پٹیل اور بھونگل آپ کو غدار سمجھتے ہوئے آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور آپ کے دوستوں کے دل میں بھی آپ کے لئے عزت نہیں۔

مجھے علم نہیں کہ پنڈت آسا سنگھ آج کل دیاست پٹیل میں ملازم ہیں۔ یا نہیں۔ اور زندہ ہیں یا مر چکے۔ مگر پراسرار کس کا یہ واقعہ ریاست نا بھہ اور پٹیل دونوں کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے باعث دائرے

نے ہمارا جہ نا بھہ کر گدتی سے اُتارنے کا قطعی فیصلہ کیا۔

## مارشل لا کا زمانہ

میں لاہور میں لالہ شام لال کپور کے روزانہ اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ وقت ہفتہ وار ہندو (جن کو ایک پنڈت جی نکالتے تھے۔ یہ پنڈت جی آجکل غالباً ہردوار میں ایک سنیاسی کے طور پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اب بھی کبھی کبھی اخبار نکال لیتے ہیں) اور ایک دوسرے اخبار میں بھی کچھ وقت دیتا تھا۔ تاکہ میرا گزارہ ہو سکے۔ لاہور میں اطلاع پہنچی کہ ہاتما گاندھی بمبئی سے پنجاب آتے ہوئے ریلوے سٹیشن پول رپول دہلی کے قریب ہے اور یہاں سے ضلع گڑگناں (پنجاب) کا علاقہ شروع ہوتا ہے) پر گرفتار کر لیے گئے۔ ہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر گگ کی طرح تمام صوبہ میں پھیل گئی۔ لاہور شہر میں تمام دکانیں بند۔ پارے پانچ سات سات ہزار کا مجمع جگہ جگہ۔ بازار کا تمام کاروبار معطل اور ہاتما گاندھی زندہ باد کے نعرے۔ مجھے اطلاع ملی کہ شاہی مسجد میں ہاتما گاندھی کی گرفتاری کے خلاف اظہارِ ناراضی کے لئے جلسہ ہوگا۔ میں بھی اخبار کے لئے رپورٹ لینے شاہی مسجد میں گیا۔ اور جس جگہ تقریریں ہونی تھیں اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ تقریریں شروع ہوئیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد۔ ہاتما گاندھی کی گرفتاری اور انگریزوں کے مظالم پر تقریریں کیں۔ میں نے کانغ کی سلپوں کی کاپی پر پمپل سے اخبار کے لئے نوٹ لینے شروع کئے۔ تو قریب بیٹھے ایک شخص نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کہ یہ کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا۔ اخبار کے لئے تقریر لکھ رہا ہوں۔ یہ شخص میرا جواب سن کر خاموش تو ہو گیا۔ مگر اس کے چہرہ اور اس کی جھکاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ میرے جواب سے مطمئن نہیں اور مجھے غالباً سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی سمجھتا ہے میں نے خیال کیا کہ اس وقت پبلک راج ہے۔ اور ہر شخص لیڈر اور خود مختار ہے۔ لوگ جوش اور غصہ میں ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ شبہ ہی شبہ میں مجھ پر کوئی حملہ کر دے میں نے سلپوں کی کاپی اور پمپل اپنے جیب میں ڈال لی۔ اور تقریریں سننے لگا۔ تاکہ بعد میں اپنی یادداشت سے ان کے نوٹ لے لوں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈر تقریریں کر رہے تھے۔ تو مجھے کچھ غیرت سی محسوس ہوئی۔ کہ ان تقریریں کرنے والوں میں سکھ ایک بھی نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سکھ اس قومی تحریک (جن کو لوگ ملکی بغاوت سمجھتے تھے) میں حصہ نہیں لے رہے۔ میرے بالکل قریب ماسٹر موناسنگھ بی۔ اے (بیز بزرگ جنگ سے پہلے دس پندرہ برس جیل میں رہے۔ اور جنگ شروع ہوتے ہی پھر گرفتار کر لئے گئے۔ مرحوم کنگ نادر خان کے بہت گہرے دوست تھے۔ متعدد بار روس اور افغانستان گئے۔ تقریر کرنے کے اعتبار سے میرا خیال ہے کہ ملک میں کم آدمی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں) بیٹھے تھے۔ میرے دوست تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ماسٹر جی آپ سکھوں کے نمائندہ کے طور پر تقریر کیجئے۔ سکھوں کی طرف سے اس تحریک میں شامل نہ ہونا شرمناک ہے۔ ماسٹر جی نے انکار کیا۔ اور کہا کہ آپ شام کی گاڑی پر سوار ہو کر اگلی صبح بمبئی ڈر ریاست پشالہ) جہاں کہ آپ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ضرور پہنچنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ضروری کام ہے۔

میں نے ان کے اس بہانہ کو کسر نفسی سمجھا اور پھر زور دیا۔ ماسٹر جی نے پھر انکار کیا۔ تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک دوسرے صاحب تقریر ختم کر چکے۔ تو میں نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ کہ اب سکھوں کی طرف سے سکھوں کے لیڈر ماسٹر مونا سنگھ تقریر کریں گے۔ اس اعلان کے بعد ماسٹر جی کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ پنجاب کے ہندو اور مسلمان بھی ماسٹر جی کے نام اور ان کی جیلوں کی زندگی سے واقف تھے۔ امٹر اکبر۔ ہانا کا گاندھی کی ہے اور ماسٹر مونا سنگھ زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ ماسٹر جی نے تقریر کی۔ آپ کی تقریر دوسرے تمام مقررین سے زیادہ سخت اور پُر اثر تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے اس تقریر میں آپ نے فرمایا تھا۔

”ظلم کو برداشت کرنا خود ظلم کی تبلیغ کرنا ہے۔“

ماسٹر جی کی تقریر کے بعد دو تین اور اصحاب کی تقریریں ہوئیں۔ تو ہم لوگوں نے دیکھا کہ ہمارے قریب ہی ایک شخص کے ہاتھ میں کاغذ اور پینسل ہے۔ اور لوگ اُسے بری طرح مارنے ہوئے اُسے سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی کہہ رہے ہیں۔ مجھے فوراً خیال آیا۔ کہ یہ بچارا بھی شاید میری طرح کسی اخبار کار پورٹ ہوگا۔ میں فوراً اٹھا۔ اور مارنے والے لوگوں اور مارا کھانے والے شخص کے درمیان کھڑا ہو گیا تاکہ اس کو بچایا جاسکے میں نے ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ کہ اس کو چوٹ نہ پہنچے۔ لوگوں کا حملہ میرے ہاتھوں پر بھی ہوا۔ اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ میرے ساتھ تقریریں کرنے والے کئی لیڈر بھی اس شخص کو بچانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ ہماری درخواست پر جمع خاموش ہو گیا۔ اور یہ شخص جلسہ میں سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے تقریر کی تھی۔ کہ بعض لوگ دُور سے ایک فوجی وردی پہنے ہوئے شخص کو اٹھائے لارہے ہیں۔ اور امٹر اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مجمع میں شور پیدا ہو گیا۔ دریا فٹ کیا گیا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ تو لوگوں نے بتایا۔ کہ جالندھر چھاؤنی کی فوج میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور یہ فوجی نوجوان دہاں سے دس بارہ گوروں کو قتل کر کے بھاگ آیا ہے۔ اس خوشی میں لوگوں نے اس کو اٹھایا ہے۔ اور نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ تقریریں کرنے والے بعض لیڈر پریشان تھے۔ کہ کہاں ہانا کا گاندھی کا عدم تشدد اور کہاں عوام کی یہ سپرٹ۔ ملک کا کیا حال ہوگا۔ مگر ان لیڈروں کی کون سنتا تھا۔ لوگ بے قابو ہو رہے تھے۔ اس فوجی کے آنے کے بعد جلسہ منتشر ہو گیا۔ جب ہم لوگ جلسہ سے شہر کی طرف جانے لگے۔ تو دیکھا۔ کہ گھوڑوں پر پولیس سوار اُس دروازہ کے باہر پہنچ چکے ہیں۔ جو دروازہ شاہی مسجد سے شہر کو جاتا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ اس دروازہ سے نکل گئے۔ پولیس سواروں نے کچھ نہیں کہا۔

میں مجمع کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف گیا۔ تو آگے چوک میں (جہاں ایک قبر۔ جسے غالباً نوگزہ کی قبر کہتے ہیں) پولیس ہندو قبیلے کے موجود تھے۔ مجمع پولیس کو دیکھ کر ٹک گیا۔ پولیس کے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر تھا۔ اس نے مجمع سے کہا۔ کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ ایک جگہ جمع نہ ہو۔ مگر لوگ صرٹ خود متاثر نہ تھے۔ ناشائی بھی تھے۔ لوگ نہ گئے۔ تو اس پولیس انسپکٹر کے حکم سے پولیس نے بند دقین چلا دیں۔ ایک دو اشخاص مر گئے۔ تین چار زخمی ہوئے۔ تو لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور چوک صاف ہو گیا۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ایک بند دکان کے برآمدہ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

رات کو میں لالہ بانے دیال ایڈیٹر ”جھنگ سیال“ کے مکان پر بھائی دروازہ سویا کرتا۔ کیونکہ سونے سے زیادہ

دلچسپی موجودہ حالات کے متعلق باتیں اور بحث کرنے میں تھی۔ اس واقعہ سے اگلے روز یا ایک دو روز بعد رنجھے ٹھیک یا دہنیں صبح میں حالات کا پتہ لینے شہر میں گیا۔ تو معلوم ہوا کہ شاہی مسجد میں جو شخص رہتا تھا۔ اور جس کو بچاتے ہوئے میرے ہاتھ کی انگلیوں پر چوٹ آئی تھی۔ وہ علی گہرانپکٹر پولیس سی۔ آئی۔ ڈی تھا۔ جو جلسہ میں سرکاری رپورٹر کے طور پر گیا تھا۔ میں لا رہا تھا ایڈیٹر "دیش" کے مکان پر پہنچا۔ تو وہاں معلوم ہوا کہ مارشل لا نافذ ہو چکا ہے۔ اور رات کو ڈاکٹر کو کل چند نارنگ۔ پنڈت رام بیج دت چودھری اور لالہ کپشن لال وغیرہ تمام لیڈر ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ لا رہا تھا دینا تھ کے ہاں سے میں گوالہنڈ کی طرف نکلتا تھا۔ تو وہاں ایک دوست بیٹے۔ انھوں نے کہا کہ ساتھ گرفتار کیا ہو چکی ہیں۔ وہاں سے میں سردار سردل سنگھ کو میٹر کے مکان پر پہنچا۔ تو ان کے آدمی نے بتایا کہ سردار صاحب کو کل ہی علم ہو گیا تھا۔ کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ لاہور سے باہر کسی نامعلوم جگہ پر چلے گئے ہیں۔ اور وہ جلتے ہوئے میرے (یعنی دیوان سنگھ) کے لئے پیغام چھوڑ گئے ہیں۔ کہ میں بھی فوراً لاہور سے کسی پوشیدہ جگہ چلا جاؤں۔ سہ ماہیکل اوڈووانے جن اڑھائی سو اشخاص کے وارنٹ جاری کئے ہیں۔ ان میں میرا بھی نام ہے۔ کیونکہ میں شاہی مسجد میں آسٹرمزاسنگھ کا تعارف کرایا تھا۔ سردار سردل سنگھ کے مکان سے واپس لا رہا تھا کہ ہاں پھر مشورہ کے لئے آیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک سدا سو کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ وہاں سے لاہر ہانکے دیال کے مکان پہنچا حالات بتائے مشورہ کیا۔ تو لاہر ہانکے دیال نے کہا: "اب شہر میں مست جاؤ۔ فوراً لاہور سے باہر کسی مقام پر چلے جاؤ۔ اور دیر مست کرو۔ تاکہ ایسا نہ ہو۔ کہ گرفتاری ہو جائے۔" میں وہاں سے سیدھا دریائے راوی کی طرف پیدل چل دیا۔ کیونکہ مارشل لا کے باعث تمام لوگوں کی آمد و رفت بغیر اجازت ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اور ٹانگے وغیرہ چلنے سے ہی بند ہو چکے تھے۔ اس وقت میرے جیب میں صرف دو روپیہ تھے۔ اور میرے لئے ممکن ہی نہ تھا کہ میں دوبارہ شہر میں جا کر کسی سے روپیہ کا انتظام کرتا۔

میں جب دریائے راوی کے پل پر پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہاں مسلح پولیس کا پہرہ ہے۔ اور کسی شخص کو لاہور سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ مجھے بھی پولیس نے روک دیا۔ اور کہا کہ وہاں شہر کو جاؤ۔ پل پر سے گزرنے کی ممانعت ہے۔ پولیس کے یہ سپاہی مسلمان تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ میں ایک ضروری کام کے لئے صرف شاہدہ تک جا رہا ہوں۔ وہاں میرے عزیزوں میں ایک صاحب بیمار ہیں۔ دوا کی انتظام کرنا ہے۔ آپ ہر بانی کر کے مجھے جانے دیجئے۔ میں دوا کی انتظام کر کے ابھی واپس آ جاؤں گا۔ دوسرے سپاہیوں نے تو میری اس درخواست کی پروا نہ کی۔ مگر ایک شخص بہت نیک تھا۔ اس نے اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "یار کیا اندھیر آجائے گا۔ جانے دو۔ بیمار کے لئے دوا کی لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کوئی لیڈر ہے۔ کہ جتنا گناہ ہے۔ اس شخص کی سفارش پر اس کے ہمراہیوں نے بیٹھے کہا کہ اُچھا سردار بقی جلدی چلے جاؤ۔ کوئی انسردیکھ نہ لے۔ ورنہ ہماری۔ بے عزتی کر سہ گا۔" میں جلدی جلدی چلا گیا پل پار کرنے کے بعد گوجرانوالہ کو روانہ ہوا۔ شہر پر پیدل چل رہا تھا۔ پہلے اتنا زیادہ چلنے کا کبھی اشتیاق نہ ہوا تھا۔ بہت مشکل کے ساتھ چلا جاتا۔ صبح نو بجے کے قریب لاہور سے چلا تھا۔ رات کو

دس بجے وہ قریب تیس میل کا فاصلہ طے کر کے کامونکے پہنچا۔ راستہ میں کچھ نہ کھایا۔ دو ایک جگہ پانی پی لیا۔ پاؤں میں کثرت کے ساتھ آٹے پڑ گئے تھے۔ چلا نہ جاتا تھا۔ جب کامونکے پہنچا تو خیال آیا کہ ایک صاحب میرے معترف ہیں۔ لاہور میں کئی بار بل چکے ہیں۔ ان کے ہاں چلنا چاہئے۔ ان کا نام یاد نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کا یہ معمول رہا کہ اگر کوئی شخص ملنے کے لئے بھی آئے۔ تو کبھی نام نہیں پوچھتا۔ اور کوشش ہوتی ہے کہ یہ صاحب پھر دوبارہ ملنے کے لئے تشریف نہ لائیں۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ دوستوں کا حلقہ بہت ہی محدود رہے اور جو ہوں وہ بہت مخلص اور گہرے دوست ہوں۔ رام رام جے رام کرنے والے دوست نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ ان کے والد انجینئر تھے۔ ایک شخص کو چھ تو اس شخص نے بتایا کہ دوسری طرف ہتھانہ کے قریب ان کا مکان ہے۔ میں وہاں پہنچا۔ نو گھر کے لوگ سوئے ہوئے تھے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو مالک مکان اور پرکی منزل سے نیچے اترے (میرا خیال ہے کہ ان کا نام غالباً رگھویر سنگھ تھا) انھوں نے دروازہ کھولا۔ ان کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ روشنی سامنے کر کے بٹھے دیکھتا۔ توجہ ان رہ گئے۔ کہ جیسے ہوں۔ مجھے ادھر لے گئے۔ پنجاب کے لوگ بہت متواضع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے کھانے کے لئے پوچھا۔ میں دن بھر کی تھکاوٹ اور بھوک کے باعث بیہ حال ہو رہا تھا۔ جب دیکھا کہ یہ لوگ سو رہے ہیں۔ بغیر نے انکو ارادہ کیا کہ کھانے کی ان کو کتنا بہت دوس۔ میں نے اپنے دل میں جبر کر سنا ہونے لاپرواہی کے ساتھ کہا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ کوئی خیال نہ کیجئے۔ سیرایہ جواب سن کر یہ مطمئن ہو گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اس وقت کہاں سے آئے۔ میں نے تمام حالات بتائے۔ تو انھوں نے کہا کہ یہاں کامونکے کے قریب ہی ریلوے ٹیلی گراف کے ٹارکٹ گئے ہیں۔ اور پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ اور ان سے بھی کئی بار پوچھا گیا۔ اب رات کا وقت ہے۔ ابھی آئے ہو۔ اس وقت یہ کہنا مناسب نہیں۔ کہ ابھی چلے جاؤ۔ رات تو آرام کرو۔ مگر کل صبح ہی روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ مگر مجھے پانچ سات روپے قرض دے دیجئے۔ میرے پاس صرف دو روپے ہیں تاکہ اپنے وطن حافظ آباد پہنچ جاؤں۔ جہاں جانا ہوگا حافظ آباد مشورہ کر کے وہاں جاؤں گا۔ انھوں نے سات روپے مجھے اسی وقت دے دیئے میں سو گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ گہری نیند آئی۔ سردار صاحب نے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ چار بجے ان کے ٹائم پیس نے گھنٹی بجائی۔ تو آپ جا گئے۔ آپ نے مجھے جگایا۔ اور فرمایا کہ تشریف لے جائیے۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا۔ کہ میں گوجرانوالہ کے راستہ حافظ آباد جاؤں۔ کیونکہ گوجرانوالہ میں کثرت کے ساتھ گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ ریلوے سٹیشن وغیرہ جلا دیا گیا ہے۔ میں کامونکے سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ جاؤں۔ اور وہاں سے حافظ آباد۔ رات کے چار بجے تھے۔ تاریکی اور راستہ سے ناواقف تھا۔ یہ حضرت ذفر لانگ کے قریب گاؤں سے باہر میرے ساتھ آئے۔ اور ایک راستہ دکھا کر کہا کہ اس راستہ سے چلے جائیے۔

تھکاوٹ اور آبلوں کے باعث میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ چلا نہ جاتا تھا۔ نیند کا غلبہ تھا۔ تھوڑی دیر گیا تو لک بھوٹی نہر کا پل تھا۔ نہر ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور راستہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ چاہے گرفتاری ہو۔ یا نہ ہو۔ میں اس وقت آگے نہ جاؤں گا۔ نہر کے پل پر جو چھوٹی سی پختہ دیوار تھی میں

اُس پر سو گیا۔ اور اُس وقت آنکھ کھلی جب آفتاب کی کرنیں کھینٹوں کو منور کر رہی تھیں۔ میں اٹھا۔ نہر کے کنارہ ضروری حاجت سے فارغ ہوا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانچ دس منٹ کھینٹوں کا منظر دیکھا۔ اتنے میں ایک شخص آتا ہوا نظر پڑا۔ تو اُس سے پوچھا کہ قلعہ دیدار سنگھ کو راستہ کون سا جاتا ہے۔ اُس نے راستہ بتایا۔ وہاں سے چل پڑا۔ قلعہ دیدار سنگھ اور کامونکے کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اُس گاؤں میں گیا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ تمام لوگ کھیتوں میں تھے۔ اس گاؤں کے ایک گھر میں ایک بوڑھی مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا کیا پینے کے لئے پانی بل سکے گا۔ اس خاتون نے نہایت اخلاص اور محبت کے ساتھ جواب دیا کہ یہاں تمام کے تمام گھر مسلمانوں کے ہیں۔ کوئی گھر ہندو کا نہیں۔ میں نے کہا کہ میں مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لوں گا۔ اس خاتون نے مجھے اندر سے چار پانی نکال دی۔ میں بیٹھ گیا۔ یہ اندر سے منگے کا ٹھنڈا پانی پینے کے لئے لائی تو اس کو خیال آیا۔ کہ اگر یہ سکھ مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہے۔ تو شاید چھاچھ بھی پی لے۔ اس نے پوچھا کہ بیٹا اگر تم پانی پی سکتے ہو۔ تو کیا سستی چھاچھ نہیں پی سکتے۔ میں نے کہا کہ پی لوں گا۔ پنجاب میں چھاچھ کا بہت رواج ہے۔ اور شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو۔ جو دن میں کئی بار یہی کستی (چھاچھ) نہ پیتا ہو۔ یہ بچاری میرے لئے مکھن ڈال کر چھاچھ لے آئی۔ میں نے چھاچھ پی لی۔ تو یہ میرے قریب دوسری چار پانی پر بیٹھ گئی۔ اور اس نے باتیں شروع کیں۔ مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آ رہے ہو۔ اور کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ ہر سے آ رہا ہوں۔ اور حافظ آباد جاؤں گا۔ سواری نہ ملی تھی۔ اس لئے کامونکے سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ کے راستہ جاؤں گا۔ اس نے پوچھا کہ سنا ہے ہاتھ کا گندھی پکڑ لئے گئے۔ اور ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ہاں گاندھی پکڑ لئے گئے۔ اور ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں۔ اس نے پھر پوچھا کہ کیا میں اس لئے ہی مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں۔ میں تو کئی برس سے مسلمانوں کے ہاں سے پی لیتا ہوں۔ اس کے بعد یہ خاتون تھوڑی دیر خاموش ہو گئی۔ اور کچھ سوچتی رہی۔ پھر مجھ سے سوال کیا۔ جب ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں۔ تو کیا اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ بھی ہو کرے گا۔ یہ سوال سن کر میں مسکرا دیا۔ کیا جواب دیتا۔ میں نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ ابھی ہندو مسلمان اس حد تک ایک نہیں ہوئے۔ آئندہ جا کر ایسا کریں گے۔ میرا جی نہ چاہتا تھا۔ کہ میں اور سفر کرنا۔ مگر مجبور تھا۔ روانہ ہونے لگا۔ تو اس صنعت خاتون نے کہا کہ بیٹا تھوڑی دیر آرام کرو۔ کھانا کھا کے چلے جانا۔ میری خواہش تھی کہ۔ یہ مجھے ایسا کہتی ہیں نے نیم دلی کے ساتھ اٹھا کر رہتے ہوئے۔ اس کے دوبارہ کہنے پر ہاں کر لی۔ اس چار پانی پر ہی سو گیا۔ اتنے میں اس خاتون نے کھانا تیار کیا۔ بینکون کی سہری گھر کے کھانے کے کپڑے دی مکھن اور سستی۔ چالیس گھنٹہ سے کچھ کھانا نہ تھا۔ اس خاتون کی اخلاص و عفت کی وجہ سے میں وہ لطف آیا۔ جو اس کے بعد ہمارا جوں اور خوابوں کے دسترخوان پر جس کی نسبت ہاں نہیں ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک گھنٹہ کے قریب پھر سو گیا۔ جاگنے کے بعد وہاں سے چلنے لگا۔ تو میں نے چاہا کہ اس خاتون کے پرستے کو جو وہاں کھیل رہا تھا۔ دو روپیہ دوں۔ مگر اس خاتون نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا ”بیٹا گو ہم غریب آدمی ہیں۔ مگر روٹیاں فروخت نہیں کرتے۔ ہماری خوش نصیبی ہے۔ کہ تم جیسا مہان ہمارے گھر میں آیا۔ اگر اس طرف آنے کا پھر کبھی اتفاق ہو۔ تو ہمارے گھر ضرور آنا۔“ اس خاتون



کے اخلاص و محبت کے یہ الفاظ سن کر میری آنکھوں میں احسان شناسی کے آنسو بھرا آئے۔ پنجاب میں تو شہروں کے اندر بھی لوگ ہمارے کو کھانا کھلانا اور خاطر تواضع کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ گاؤں کی یہ حالت تو کیونکر دور درپیہ لے سکتی تھی۔ اس نے بچہ سے روپیہ لے کر مجھے واپس دیئے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ مگر اس نے پھر انکار کر دیا۔ میں نے بھی محسوس کیا۔ کہ کھانے کا معاوضہ لینا یہ اپنی توہین سمجھ گئی۔ اس گاؤں سے چل کر میں ایک دوسرے گاؤں میں پہنچا۔ اس وقت شام کے پانچ بج چکے تھے۔ مجھے اس گاؤں کا نام ٹھیک یاد نہیں رہا۔ غالباً قلعہ صوبھا سنگھ ہے۔ اس گاؤں میں چند پختہ دو منزل عمارتیں بھی ہیں۔ جو وہاں کے درزیوں کی ہیں۔ یہ درزی کسی بڑے شہر میں فوجی ٹھیکہ دار ہیں۔ اور لاکھوں روپیہ کے مالک اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس گاؤں میں پہنچا اور آرام کرنے کے لئے درخت کے نیچے بیٹھ کر دو درزیوں میں سے ایک صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے پاس آئے۔ اور پوچھا کہ کہاں سے آئے۔ اور کہاں جاؤ گے۔

میں نے کہا لاہور سے آ رہا ہوں۔ اور حافظ آباد جاؤں گا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پائے تیار کی گھر کے دوسرے لوگوں سے تعارف کرایا۔ بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ جب چائے پی چکے تو ان لوگوں نے اپنا گھر کا ٹانگہ میری سواری کے لئے تیار کرایا تاکہ یہ ٹانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ آئے۔ یہ ٹانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ گیا۔ وہاں کرایہ کے ٹانگے انتظاراً جا رہے تھے۔ ایک ٹانگہ میں بیٹھ کر میں حافظ آباد کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں رات کو گیا رہ بجے پہنچا۔

حافظ آباد پہنچ کر میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ کیوں آیا۔ اور کیا ہوا۔ خاموشی کے ساتھ چند روز گزار دیئے۔ اتنے میں سرانیکل اور ڈوڈا نیز بھی گورنری کا چارج دے کر چلے گئے۔ سرائیوور ڈیپلٹنگ گورنر مقرر ہو چکے تھے۔ تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں اور ڈوڈا نیز نے جو کچھ کیا حکومت اس پر نام نہ تھی۔ میں لاہور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ گرفتار کئے گئے جو گرفتار ہو سکے اور جو لوگ ادھر ادھر ہو گئے۔ پولیس نے ان کا بھیجا نہ کیا تھا۔ وہ گرفتار نہ ہوئے۔

## پولیس کے پہلے پریسک کا دہلہ

مارشل لا کے اعلان سے پہلے پنجاب کے ہر شہر اور قصبہ میں سیاسی جیٹان و جوش پیدا ہوا تھا۔ کہیں ریلوے کے مار کاٹے جا رہے ہیں کہیں سرکاری عمارتیں جل رہی ہیں کہیں بنک لوٹے جا رہے ہیں۔ اور کہیں انگریزوں اور سرکاری ملازمین پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان دنوں فوج کے ایک انگریز لفٹننٹ ٹانہم (غالباً ہی نام تھا) انٹرن لائل پور سے وزیر آباد کو جا رہے تھے۔ راستہ میں جب گاڑی حافظ آباد کے سٹیشن پر پہنچی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس گاڑی میں ایک انگریز بیٹھا ہے۔ انگریز کا دیکھنا ہی ان دنوں میں پریسک کے جوش اور مستقبل سے لاہر واپس ہونے کا کافی باعث ہو سکتا تھا۔ لوگ اس انگریز کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ اور جھوم نے اس پر حملہ کر دیا۔ کوئی باقاعدہ آئینہ نازکی ہوئی تحریک تو تھی نہیں۔ ایک قسم کا سیاسی آبال سا تھا۔ لوگوں نے اس انگریز کو جو توں پھڑوں۔ پھڑوں اور ٹکٹوں وغیرہ سے پٹیا۔ ریلوے ڈرائیو اور گاڑی کے جب یہ کیفیت دیکھی۔ تو انھوں نے ریلوے ٹرین کو قبل از وقت چلا دیا تاکہ یہ انگریز بچ جائے۔ چنانچہ گاڑی کے چلے ہی چلے جانے کے باعث اس انگریز کی جان بچ گئی۔ ورنہ یہ غیر ممکن نہ تھا کہ اس کو حافظ آباد کے سٹیشن پر ملاک ٹرڈا جاتا۔

اس واقعہ کے بعد پنجاب میں مارشل لا جاری ہوا۔ گرفتاریاں مقدمات اور سزائیں۔ پولیس نے لفٹنٹ ٹانہم کو پٹینے کے

جرم میں حافظ آباد میں گرفتاریاں شروع کیں۔ ملازموں کی شناخت کرنے کے لئے ٹائٹیم صاحب حافظ آباد تشریف لائے۔ پولیس نے سادھی کے ذریعہ حکم دیا کہ شہر کا ہر فرد کا ہوجوان یا بوڑھا جو بھی بے تحصیل کے سامنے حاضر ہو جائے جو حاضر نہ ہوگا۔ وہ کوئی سے اڑا دیا جائے گا۔ قہر و دلش برہان درمیش ہر شخص تحصیل کے سامنے پہنچ گیا تمام لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ اور لفٹ ٹائٹیم نے لمبائی کو بچانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ پولیس تھی۔ اور پولیس اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے بہت مستعد تھی جن لوگوں پر پولیس نے لفٹ ٹائٹیم نے یا سرکاری گواہوں نے رجوع اس بات کے لئے کمرے ہوئے تھے کہ وہ موقع وار دست اپنی ریلوے سٹیشن پر اس وقت موجود تھے جب کہ لفٹ ٹائٹیم کو پٹا گیا) ہنڈرنگا۔ وہ لوگ چاہے بے گناہ تھے یا گنہگار۔ ملک منظم جارج پیچ کے خلاف اعلان جنگ اور علم بغاوت بلند کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ ان گرفتار ہونے والوں میں میرے ایک چچا زاد بھائی ہوشیار سنگھ (یہ ابکل اترسر میں ہوشیار سنگھ ایٹا پینی اور بنزل انک ورکس وغیرہ کے نام پر کاروبار کرتے ہیں۔ اور کافی کامیاب ہیں ابھی تھے جن کو پولیس نے اس جرم میں گرفتار کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ یہ لڑکا کاخالصہ کالج اترسر کی بی۔ ایس۔ سی کلاس میں پڑھتا تھا۔ جب سیاسی بے تعلیق شروع ہوئی۔ اور اترسر میں بنک اور سرکاری عمارتیں پبلک نے ملائیں۔ تو میرے چچا سردار میا سنگھ ہوشیار سنگھ کے والد نے ہوشیار سنگھ کو احتیاطاً حافظ آباد ملا لیا۔ اس کا لفٹ ٹائٹیم کو پٹنے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر اس روز یہ حافظ آباد میں ضرور موجود تھا۔ اور وارداست کے وقت اپنے گھر پر تھا یعنی اس واقعہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

ہوشیار سنگھ نوجوان اور ہونہار لڑکا تھا۔ گورارنگ۔ بہت خوبصورت کالج کا ہر طالب علم اور کالج کے پروفیسر بھی اس کی بہت عزت دیتے تھے۔ گھر میں بھی اس کے لئے ہر شخص کے دل میں محبت تھی۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اس کو ملک منظم جارج پیچ کے خلاف جنگ میں حصہ لینے یا بغاوت کرنے کے جرم میں رجس کی سزا پھانسی یا عمر قید سے کم کوئی دوسری سزا ملے گی گرفتار کیا گیا۔ حالات میں بند کیا گیا۔ اس سے گھر کا کوئی شخص نہ مل سکتا تھا۔ اور نہ بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کے والدین اور گھر کے لوگوں کی کیا حالت ہوگی مگر کیا ہو سکتا تھا قانون اور انصاف صرف مجرموں اور گنہگاروں کو سزا دینے کے لئے ہی بنی ہیں۔ ہندوستان میں اس کے ذریعہ ہر روز درجنوں سینکڑوں اور ہزار ہائے گناہگار لوگ پھانسیوں پر چڑھائے اور جیلوں میں بھیجے جا رہے تھے۔

ہوشیار سنگھ چند روز تو حافظ آباد کے تھانہ کی حالات میں رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرے درجنوں لمبوں کے ساتھ لاہور بورڈر ٹل جیل میں بھیجا گیا۔ اور اس کے والد اس کے بھائی اور گھر کے دوسرے لوگ بھی مقدمہ کی پیروی کے لئے لاہور پہنچے۔ اس زمانہ میں رائے بہادر لال بدری داس لاہور کے بہترین وکلاء میں شمار ہوتے تھے چونکہ آپ رائے بہادر بھی تھے اس وقت کو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ شاید ان کی رائے بہادری کا عدالت پہلی کچھ رعب یا اثر پڑے۔ چنانچہ رائے بہادر صاحب کو بہت کافی فیس دے کر وکیل مقرر کیا گیا۔ اور مقدمہ ایک ٹریبیونل کے سپرد ہوا جس کا انگریز جج ریڈیٹ اور دو ہندوستانی ممبر تھے۔ اور یہ ٹریبیونل اس لئے مقرر کیا گیا تھا کہ اس ٹریبیونل کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کے فیصلہ کے بعد ہائی کورٹ وغیرہ میں کوئی اپیل نہ کی جاسکے گی۔

مقدمہ کی تیاریاں شروع ہوئیں میرے چچا ان کے صاحبزائے اور میں نے وکیل صاحب کے ہاں چکر کاٹنے شروع کئے۔ ایک روز ہم لوگ رائے بہادر بدری داس کے پاس بیٹھے ان کو مقدمہ کے واقعات سمجھا رہے تھے۔ تو میرے چچا نے کہا۔

”رائے بہادر صاحب ہم لوگ بہت مصیبت زدہ ہیں۔ میرا لڑکا واقعہ کے وقت سٹیشن پر موجود تھا۔ پولیس نے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکوں کو صرف رشوت لینے کی غرض سے گرفتار کیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں بہت سے لوگ بے گناہ ہیں۔ الزام بہت سخت لگایا گیا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کوشش کیجئے۔ اگر لڑکے کو سزا ہو گئی۔ تو ہم بقاء و برباد ہو جائیں گے۔“

رائے بہادر بدری داس نے میرے چچا کے یہ دردناک انصاف سننے کے بعد جواب دیا۔

”سردار صاحب۔ لڑکا کنبھار سے یا بے گناہ۔ یہ کوئی سوال نہیں۔ یہ عدالتیں ہیں۔ اور عدالتیں ہی نہیں مارشل لا کی عدالتیں۔ یہاں جھوٹ اور بے ایمانی کی دوڑ ہے۔ اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ بنا سکتے ہیں۔ تو لڑکا جھوٹ جائے گا۔ اور اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ نہیں بنا سکتے جو پولیس کے جھوٹ کو کاٹ سکے۔ تو یقیناً لڑکے کو سزا ہوگی۔ اور شاید لڑکے کو پھانسی بل جائے۔ یہاں انصاف اور قانون کا کوئی سوال نہیں۔ جھوٹ کی دوڑ کا سوال ہے۔ جو زیادہ جھوٹ بنا سکے گا۔ کیا سبب ہوگا۔ آپ ہوں یا پولیس ہو؟“

رائے بہادر کے یہ الفاظ سن کر یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ مقدمہ کا ڈیفنس کیا ہو۔ فوجداری مقدمہ میں یہ ڈیفنس قطعی پھر اور بے معنی ہوتا ہے کہ ملزم شریف ہے۔ خاندانی ہے یا بڑے لوگوں کا رشتہ دار ہے۔ فوجداری مقدمہ میں تو صرف وہی ڈیفنس کارآمد ہو سکتا ہے جو جرم کی ڈائریکٹ تردید کرے چنانچہ مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ڈیفنس صرف یہ ہونا چاہئے کہ ملزم واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہ تھا۔ بلکہ یہاں سے سینکڑوں میل دور تھا۔ جہاں سے اس کا اس روز حافظ آباد پہنچ کر مجرم کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

اب سوال پیدا ہوا کہ حافظ آباد میں جرم کی عدم موجودگی کیونکر ثابت کی جائے۔ اس مسئلہ پر غور ہوا۔ کہ کہاں کہاں گہرے تعلقات ہیں۔ جہاں سے کہ ڈاک خانہ کی ہر پوسٹ کارڈ پر لکوائی جاسکتی ہے یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم لوگوں نے ایک مضمون تیار کیا۔ جو ہر شیار سنگھ کی طرف سے پوسٹ کارڈ پر لکھا جائے۔ ہم نے بورٹل جیل لاہور کے ایک وارڈ کی سرخٹ ہوشیار سنگھ کو وہ مضمون اور ایک سادہ پوسٹ کارڈ لکھنے کے لئے جیل کے اندر بھیجا۔ اس پوسٹ کارڈ پر ہوشیار سنگھ نے لکھا۔ کہ وہ کارڈ لکھنے کے روز (یعنی ہاشم کے واقعہ کے دن) لاہریانہ میں ہے۔ ابھی لاہریانہ دو تین روز اور رہے گا۔ اس کے بعد سانگلہ (جہاں کہ ایک دوست کے نام خط لکھا گیا تھا) آئے گا۔ اور پھر حافظ آباد جائے گا۔ ہوشیار سنگھ نے یہ کارڈ لکھ کر ہمیں جیل سے باہر جیل کے وارڈ کے ذریعہ بھیج دیا۔ ہم میں سے ایک شخص اس خط کو لے کر پہلے لاہریانہ گیا۔ وہاں کے ڈاک خانہ کے ہر لگانے والے کو باغ و بیہ دے کر اس روز کی ڈیپچ کی تاریخ کی ہر لکوائی۔ جس روز ہاشم کے ساتھ واقعہ ہوا تھا۔ پھر یہ خط سانگلہ لایا گیا۔ اس طرح ہی وہاں کے ڈاک خانہ کے ہر لگانے والے کو باغ و بیہ دے کر واقعہ سے دوسرے روز کی تاریخ کی ہر لکوائی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہوشیار سنگھ نے واقعہ کے روز یہ پوسٹ کارڈ لاہریانہ سے لکھا۔ اور واقعہ کے اگلے روز یہ کارڈ سانگلہ (ضلع گوجرانوالہ) پہنچا۔

مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس کے سرکاری گواہوں کی شہادتیں ہوئیں کہ واقعہ کے روز انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوشیار سنگھ لکھنؤ ٹاٹھم کو مار رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط رہا۔

اور فروچرم بھی لگ گئی۔ مگر جب ڈیفنس شروع ہوا۔ تو لدھیانہ کے ہمارے گواہ پیش ہوئے جنہوں نے کہا کہ واقعہ کے روز ہوشیار سنگھ لدھیانہ میں تھا۔ ساٹھ لاکھ کے گواہ پیش ہوئے۔ کہ واقعہ سے اگلے روز زیر پوسٹ کارڈز ریوہ ڈاک بلا تھا جو ایک روز پہلے ہوشیار سنگھ نے لدھیانہ سے پوسٹ کیا۔ ہوشیار سنگھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ اور اس کی مہروں کو دیکھ کر ٹریبیونل اور اس کے یو۔ پی۔ این۔ جی کو یقین ہو گیا کہ ہوشیار سنگھ واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہ تھا۔ لدھیانہ میں تھا۔ چنانچہ ہوشیار سنگھ باعزت بری کر دیا گیا۔ کیونکہ ہندوستانی مجسٹریٹ کو اپنے ڈپٹی کمشنر کے اشارہ پر اپنے حقیقی بھائی کے بے گناہ ہونے ہوئے بھی اس کو قید کر سکتے تھے۔ تاکہ صاحب بہادر ناراض نہ ہو جائیں۔ مگر یو۔ پی۔ این۔ جیوں کے اندر پھر بھی ضمیر تھا۔ اور وہ اپنے ضمیر کے مقابلہ پر کسی بے گناہ کو سزا دیتے ہوئے کئی بار اپنے دماغ اور دلی سے مشورہ کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی نہیں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس طرح کوئی دوسرے صاحب مقدمہ میں عدم موجودگی ثابت کرتے ہوئے ایسے کارڈ بنانے کی اب حماقت نہ کریں۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد کئی انیسکروٹوں کے فیصلے ایسے خطوط کے متعلق صادر ہو چکے ہیں جن میں ایسے خطوط یا پوسٹ کارڈوں کو قابل یقین قرار نہیں دیا جاتا۔

ہوشیار سنگھ کے مقدمہ کے واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولیس کیونکر جھوٹے مقدمے تیار کرتی ہے۔ اور اس جھوٹ کو کاٹنے کے لئے کیونکر سپیک کو مجبوراً پولیس سے زیادہ جھوٹ بنانا پڑتا ہے۔ کیونکہ قانون چاہے کتنا بھی اچھا ہو۔ قانون کو استعمال کرنے کا طریقہ اس قدر غلط پیچیدہ اور قابل اعتراض ہے۔ کہ مقدمہ میں قدم قدم پر جھوٹ بولنے۔ جھوٹ بنانے۔ جھوٹ تصنیف کرنے اور جھوٹے حلیفہ بیان دینے کی ضرورت ہے۔ اور عدالتیں جھوٹ۔ بے ایمانی بے انصافی اور ظلم کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔

## والیان ریاست کا پرستار

مرحوم رائے بہادر سردار زاین سنگھ ٹھیکہ دار دہلی سیلف میٹ بزرگ تھے۔ آپ کی زندگی چھ روپیہ ماہوار کے ایک فوجی سپاہی سے شروع ہوئی۔ اور جب آپ نے انتقال کیا تو آپ کی جائیداد کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ ان رائے بہادر کے صاحبزادہ سردار بہادر رنجیت سنگھ نے چند سال ہوئے گورنمنٹ کو بائیس لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کیا ہے۔

رائے بہادر زاین سنگھ ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ چونکہ ”ریاست“ میں مرحوم ہمارا ج پٹیالہ کے مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا اور رائے بہادر زاین سنگھ ان تمام حالات سے واقف تھے۔ آپ ”ریاست“ کو بے حد پسند کرتے۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے بہت بڑے مداحوں میں سے تھے۔ میں ایک روز منصور علی جارما تھا۔ ڈیرہ دون جانے والی گاڑی میں سامان رکھا تو رائے بہادر بھی اُسی خانہ میں آگئے۔ کیونکہ دونوں کے لئے اُسی کمرہ میں جسکے ریزرو تھی۔ گاڑی میں بسترے بچا کر ہم بیٹھ گئے۔ تو رائے بہادر نے اخبار ”ریاست“ کی تعریف شروع کی۔ اور پچھلے متعدد مضامین کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آپ نے بتایا کہ پٹیالہ کے سردار بہادر جنرل خٹنیش سنگھ دہاں کی فوج میں جنرل تھے۔ انگریزی گورنمنٹ کے متعدد خطابات اور بہادری کے تمغے حاصل کر چکے تھے۔ اور آپ کو پٹیالہ میں بہت بڑا عروج حاصل تھا۔

مگر چونکہ ہمارے ذاتی طور پر آپ سے ناراض ہو گئے۔ اس لئے ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر جیل میں ڈال دیئے گئے۔ اور یہ مذبحی جرنل جیل کے قیدیوں کی دروی پیٹنے جیل کی کوٹھڑی میں جیل کی روٹی کھا رہا ہے۔ اور قید ہے۔ لائے بہا یہ تمام حالات سناتے رہے اور میں مستحارہ۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح جب جاگے تو ہرودار کا سٹیشن تھا۔ ہرودار اور ڈیرہ دون کے درمیان ہم لوگوں نے ہاتھ منہ دھو دیا۔ کپڑے بدلے۔ ڈیرہ دون پہنچے پورائے بہادر اپنی کوٹھی چلے گئے کہیں موٹر میں بیٹھ کر منصوری روانہ ہو گیا۔

میں منصوری سے جب واپس آیا۔ تو جنرل بخشیش سنگھ کا مسئلہ میرے ذہن میں کھٹکے ہاتھ تھا۔ دہلی پہنچے۔ بریس نے ”ریاست“ میں ایک بہت سخت لیڈر لکھا۔ جس میں جنرل بخشیش سنگھ کے واقعات درج تھے۔ اور کمانڈر انچیف ہند کی توجہ دلاتے ہوئے گورنمنٹ ہند سے کہا گیا تھا کہ سردار بہادری کا خطاب دروہی شجاعت کی تمغوں کی موجودگی میں جنرل بخشیش سنگھ کا پیشا ر جیل میں رہنا اس خطاب اور تمغوں کی سخت توہین ہے اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ جنرل بخشیش سنگھ کے جرائم کی تحقیقات کرے۔ اگر بخشیش سنگھ مجرم ہیں۔ تو ان کا خطاب اور تمغے ضبط کئے جائیں۔ اور اگر بے گناہ ہیں تو ان کو پیشا ر جیل سے نکالا جائے۔ کیونکہ ایک بے گناہ جنرل کا بلاوجہ قید کیا جانا۔ برٹش گورنمنٹ کے لئے رسوائی و ذلت کا موجب اور فوجیوں میں بددلی پیدا کرنے کا باعث ہے۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد دہلی کی مقامی گورنمنٹ کی سرکاری پریس براہِ رخ نے اس مضمون کا ترجمہ ملٹری سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو بھیجا (مرزا عبدالرحمن سپرنٹنڈنٹ پریس براہِ رخ دہلی نے ایک بار ایڈیٹر ”ریاست“ کو بتایا تھا کہ جس روز ”ریاست“ شائع ہو۔ اُن کے دفتر کے لئے مصیبت ہوتی ہے کیونکہ اُن کے لئے حکم ہے کہ ریاستوں کے متعلق تمام مضامین کا ترجمہ کر کے متعلقہ افسروں اور پولیسکلی ایجنٹوں کو بھیجا جائے) رائے بہادر نرائن سنگھ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے۔ اور اُردو بھی معمولی طور پر۔ مگر آپ دائرے اور بڑے سے بڑے انگریز سے لئے اور بہت بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتے۔ یہ مضمون جب آپ نے دیکھا تو آپ اس مضمون والے پرچہ کو ساتھ لے کر شملہ گئے۔ وہاں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سرولیم برڈوڈ سے ملے۔ اور سرولیم برڈوڈ کو ”ریاست“ کا پرچہ دیتے ہوئے کہا کہ اس مضمون کو پڑھئے۔ آپ کے خطابوں اور تمغوں کی کس قدر مٹی پیدا ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ یا تو یہ خطاب اور تمغے بخشیش سنگھ سے واپس لے۔ اور بخشیش سنگھ کو جیل سے نکالا جائے۔ ورنہ گورنمنٹ کی بہت سخت بدنامی ہے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ جب انگریزوں سے بات چیت کرتے تو بالکل اس طرح بے تکلفی کے ساتھ اُن کو دوست سمجھتے ہوئے جیسے ایک جاٹ دوسرے جاٹ سے کرتا ہے۔ اور انگریز اس بے تکلفی میں اخلاص محسوس کرتے ہوئے رائے بہادر کی بہت عزت کرتے۔ سرولیم برڈوڈ ویسے بھی ہندوستانوں کے بہت دوست اور وفادار افسر تھے۔ ان کی تمام زندگی ہندوستان میں گزری۔ اُن کو انگریزوں اور ملازموں کے بیمار ہونے پر اُن کے گھروں میں چلے جاتے جو میں میں برس پہلے اُن کے ماتحت تھے۔ سرولیم نے رائے بہادر سے کہا کہ اس مضمون کو وہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ملٹری سیکرٹری نے اُن کو اس کا ترجمہ بھیجا تھا۔ اور وہ اس معاملہ پر دائرے کی توجہ دلائی گئے۔

اس نعمتوں کو شائع ہوئے ایک ماہ ہوا تھا کہ مرحوم ہمارا چہ پٹیا ایک روز جیل میں گئے جیل کا۔ کیا تمام قیدیوں کی پریڈ دیکھی۔ پریڈ دیکھنے کے بعد آپ نے ساتھ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ ان ساتھ میں سردار بہادر جنرل بخشیش سنگھ بھی تھے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ ویرہ دون سے حسب واپس دہلی آئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ آپ سرولیم پر ڈوڈ تھے سرولیم نے داسرائے کو تمام حالات لکھے۔ داسرائے نے پولیٹیکل سیکریٹری کو کہا کہ ہمارا چہ پٹیا لکھتے ہیں سنگھ کے لئے لکھا جائے۔ چنانچہ پولیٹیکل سیکریٹری کا حکم جب ہمارا چہ پٹیا لکھ کے پاس پہنچا تو ہمارا چہ پٹیا جنرل بخشیش سنگھ کرنے کے لئے مجبور تھے۔ اس مجبوری کے باعث ہی ہمارا چہ پٹیا لکھ جیل دیکھنے گئے۔ اور سردار بخشیش سنگھ کے ساتھ۔ دوسرے عام قیدیوں کو رہا کرنے کا باعث یہ ہوا کہ ہمارا چہ پٹیا پر سیلخ قائم رہے۔ اور ان کی رعایا یہ سمجھے کہ انہوں نے اپنی دریا دلی کے باعث ساتھ قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اتفاق سے ان ساتھ میں جنرل بخشیش بھی رہا ہو گئے۔

## عادت کا قوت ارادی پر اثر

میں لاہور کے ایک روزانہ اخبار میں سب اڈیٹر تھا۔ اس زمانہ میرے پاس ایک دوسرے سنگھ آکر تھے۔ ان کی تعلیم بی۔ اے تک تھی۔ اچھے خاندان سے تھے۔ مگر کثرت کے ساتھ شراب پینے کے باعث ان کا ضمیر اور ان کی قوت ارادی بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ اور شراب چل کر ہل کر ہلنے کے لئے کوئی جسم اڈیٹر تھا جس پر یہ آمادہ نہ ہو سکتے ہوں۔ چنانچہ شراب کی کثرت کا ان کے اعصاب پر بھی اثر تھا۔ اور یہ زیادہ کرنے سے قابل بھی نہ رہے تھے۔

میرے پاس کئی روز آتے رہے اور جلتے ہے انہوں نے بتایا کہ یہ بے حد تکلیف میں ہیں کوئی شرم ان کا اعتبار نہیں کرتا۔ دوستوں کی نظروں میں گر چکے ہیں۔ گھر والوں کے لئے بار ہیں اور معمولی اخراجات پورے نہیں کر سکتے۔ ان کو کیا کرنا چاہئے۔

ان کے حالات پر میں کئی روز ہمدردی کے ساتھ غور کرتا رہا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کرنا چاہا۔ ادھر ان کی حالت یہ تھی۔ کہ کھانے کے لئے روٹی نہ ملے۔ مگر شراب ضرور ہو۔ دوستوں سے ایک ایک دھیمے قرض کے لئے بھی شراب کی طلب کو پورا کرتے۔

میری عمر جب اٹھارہ انیس برس کی تھی اور میری فیروز پور کے سکھوں کے حلقہ میں آمدورفت تھی۔ حد تک میرے دماغ میں بھی مذہبی دیوانگی تھی۔ اور بغیر سکھوں کے دوسرے تمام مذاہب کو برا سمجھتا تھا۔ حالانکہ نہ سکھ ازم سے واقفیت تھی۔ نہ اسلام سے اور نہ ہندو ازم سے۔ یہ اثر صرف صحبت کا تھا۔ ملنے والے سکھوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف باتیں کرنے دیکھتا۔ تو خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو اور بحث میں حصہ لیتا۔ مگر اس کے بعد یہ مذہبی دیوانگی دن میں کم ہوتی چلی گئی۔ جب یہ صاحب لاہور آکر آکر تھے۔ تو اس وقت میں ذہنی غلبہ ہندوؤں مسلمانوں۔ عیسائیوں اور سکھوں میں کوئی فرق

متا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کی بیماری حد سے گزر چکی ہے اور جو شخص قوت ارادی سے اس قدر دم ہو چکا ہو۔ اس کی اصلاح قریب قریب ناممکن ہے۔ مگر پھر بھی کوشش کرنی چاہئے۔ میرے خیال میں ان میں کوئی ایسی سوسائٹی موجود نہیں۔ جو آپ جیسے گئے گزرے شخص کی اصلاح کا بار لے سکے۔ میری تو رائے ہے کہ آپ عیسائی ہو جائیے۔ ممکن ہے کہ پادری لوگ آپ کی اصلاح کر سکیں۔ اور آپ کی زندگی بدل گئے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر یہ عصاب حیران ہوئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بخیرگی اور ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے دے رہا ہوں۔

میری رائے سن کر یہ چلے گئے۔ اور تین چار روز کے بعد پھر واپس آئے۔ تو پھر اسی مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ ان سے صاف کہا کہ آپ کی بیماری غالباً علاج حد تک پہنچ چکی ہے اور آپ آپ کی شاہدیری اصلاح کر سکتے۔ اور اگر اصلاح ہوئی بھی۔ تو آپ کو قوت ارادی پیدا کرنے کے لئے اپنے دل و دماغ کے ساتھ بہت ہی کش کرنی پڑے گی۔ آپ سوچ لیجئے کہ کیا کرنا چاہئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا اور چاہا یہ عیسائی ہو جائیں۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے عیسائی مذہب تبدیل کرنے کا انتظام کروں۔ میں کسی کو جانتا نہ تھا۔ نہ عیسائیوں کے حلقہ سے واقفیت تھی۔ انھوں نے پھر زور دیا کہ میں انتظام کروں۔

نیکہ یہ اس معاملہ میں کچھ شرم سی محسوس کرتے تھے۔ میں عیسائیوں کے حلقہ سے بالکل نا آشنا تھا مگر اخبارات میں ڈاکٹر دتہ میرا خیال بے یہی نام تھا۔ میں غلطی نہیں کرتا، پروفیسر فرمین کر سچن کالج کا نام کئی بار پڑھا تھا۔ میں نے اس جرنلسٹ کو اپنے لئے لیا اور ہم ڈاکٹر دتہ کے مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک دو جگہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ س ٹرک پر رہتے ہیں۔ جو ٹرک بنلا گنبد سے یوہسپتال کو جاتی ہے یا اس کے قریب دوسری ٹرک ہے۔ لوگ تلاش کرنے کرتے ڈاکٹر دتہ کی کوٹھی پہنچے۔ مجھے اسٹاک اچھی طرح سے یاد ہے کہ یہ کوٹھی سطح ٹرک سے کافی بلند تھی۔ اور اس کے عین میں پھولوں کے گئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اور ڈاکٹر دتہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کوٹھی کے باہر کے دروازہ کے پاس ان کا ملازم تھا۔ اس ملازم کو میں نے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا۔ جس پر لکھا تھا "دیوان سنگھ سب ایڈیٹر روزانہ اخبار خلائ" میرا کارڈ جب ڈاکٹر دتہ کے پاس آیا تو انھوں نے بلالیا۔ ہم برآمدہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بہت تپاک سے جرنلسٹ ہونے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص لئے سے انکار نہیں کرتا۔ اور لئے ہونے سے عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہم لوگ جب بیٹھے۔ تو خیر خیریت دریافت کرنے کے تبادلہ کے بعد میں نے ان کو ڈاکٹر صاحب میں ان صاحب کو لایا ہوں۔ آپ سے کوئی بات پچھانا نہیں چاہتا۔ یہ صاحب ہیں۔ بی۔ اے ہیں۔ جرنلسٹ ہیں۔ بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر شراب پیٹے ہیں زندگی بازی ہیں۔ سکرٹ کے کش لگاتے ہیں۔ تمار بازی بھی کبھی کبھی تفریحاً کر لیتے ہیں۔ فائدہ کش ہیں۔ ان کا ضمیر اور ت ارادی بالکل مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ عیسائی ہونا چاہتے ہیں۔ ان کو عیسائی کر لیجئے۔ شاید ان کی اصلاح جائے۔ ڈاکٹر دتہ میرے یہ الفاظ سن کر حیران ہو گئے کہ ایک سکھ دوسرے سکھ کو عیسائی کرنے کے لئے لایا ہے میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دتہ نے سمجھا کہ یہ یا تو نادان کیا جا رہا ہے۔ یا کوئی دھوکا یا فریب ہے۔

آپ نے جواب دیا کہ "آپ سمجھ ہیں۔ ایک سکھ کو عیسائی کرنے کے لئے لائے ہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے؟" میں نے پھر تجدد کی کے ساتھ عرض کیا کہ ان کے جو عیوب میں لے بتائے ہیں۔ فی الحقیقت وہ ان میں موجود ہیں۔ اور میں نے آپ کو تاریکی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاکہ بعد میں آپ کو علم ہو تو، میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یہ صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہ ان کو موجودہ قابل نفرت زندگی کے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ میں نے ان کو ایمان داری کے ساتھ رائے دی کہ عیسائی ہو جاؤ۔ شاید عیسائیوں کے پادریوں کی نیکی کا ان پر اثر ہو اور ان کی زندگی بدل سکے۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم لوگ پھر کسی روز ان سے ملیں۔ یہ پادریوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ کہ میرا کام تو ختم ہو چکا۔ اب میں آپ کے ہاں آنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اب یہ سردار صاحب خود ہی آئیں گے۔

میں اُس کے بعد ڈاکٹر دتہ سے کبھی نہیں ملا کئی ماہ کے بعد یہ سکھ جرنلسٹ پھر لے لے انھوں نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر دتہ کے ہاں گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک پادری کے سپرد کیا۔ اُس پادری نے ان کو منظم کر رکھا۔ وہاں چند روز ان کی نگرانی کے بعد۔ ان کو دوسرے یورپین پادری کے پاس منصورہ پھاڑ پر بھیجا یہ منصورہ میں پادری صاحب کے گھر پر غالباً درما رہے۔ پادری صاحب ان کے تمام اخراجات برداشت کرتے تھے۔ ایک روز پادری صاحب نے صبح دیکھا کہ سردار صاحب کے کمرہ میں شراب کی خالی بوتل پڑی ہے۔ اس لئے اُن کو بہت سلامتی کی۔ اُس کے بعد ایک رات پادری صاحب کے اُس کمرہ میں شور پیدا ہوا۔ جہاں کہ اُن کی نوجوان لڑکیاں سوئی ہوئی تھیں۔ پادری صاحب اس کمرہ میں پہنچے تو دیکھا کہ سردار صاحب شراب میں بدست شرمندہ حالت میں کھڑے ہیں۔ اور پادری صاحب کی نیکی دل لڑکی اُن کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ صبح پادری صاحب نے ان کو لاہور کا کرایہ دیا اور واپس کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت یسوع مسیح کی تعلیم کا بھی آپ جیسے "پختہ ارادہ" کے نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ لاہور آنے کے بعد ان کی وہی کیفیت تھی جو لاہور سے منظم کی جانے سے پہلے تھی۔ یعنی شراب۔ قمار بازی۔ تماشے۔ رنڈی بازی۔ خرضہ اور دستوں سے ایک ایک دو دور وہیہ طلب کرنا۔

میرا جیلوں کا اور جیلوں سے باہر کا تجربہ ہے کہ جب انسان کو چوری۔ شراب۔ ڈاکہ۔ دھوکہ بازی یا کسی قسم کی عادت پڑ جائے تو یہ عادت فطرت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس عادت کا جانا بے حد مشکل اور دقت طلب ہے۔ اور اس میں اگر تبدیلی ممکن ہے۔ تو کئی برس تک مسلسل دن رات اپنے ذہن کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد۔ اور وہ بھی اگر انسان کی قسمت اچھی ہو۔

## معقولیت باعثِ اطمینان

میں جب نابھہ میں سرکاری ملازم تھا۔ وہاں مجھے دوسروں پر مہار ترخواہ ملتی تھی تو میری سنگائی ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں سردار ہرنام سنگھ کی لڑکی سے ہو گئی۔ ہندوستان میں عموماً اور ملازمت پیشہ لوگوں میں خصوصاً تجارت یا صنعت و حرفت کی کوئی قدر نہیں۔ اگر کوئی شخص تجارت یا صنعت سے



ایک چار درہم یہ ماہوار بھی پیدا کرتا ہو۔ تو اس کو معمولی شخص سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس شخص کی زیادہ قدر ہے جو پچاس روپیہ ماہوار کا سرکاری ملازم ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ اگر میں روپیہ ماہوار بھی رشوت سے مزید آمدنی ہو تو یہ بیس روپیہ سو روپیہ کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہے۔ تو وہ سب سے پہلے پوچھے گا۔ تنخواہ کیا ہے۔ اور اوپر سے آمدنی (یعنی رشوت) کتنی ہے۔ اگر لڑکے والوں نے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ اور بیس روپیہ بالائی آمدنی بتادی۔ تو لڑکی والوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً رشتہ کر دیا جاتا ہے۔ چاہے شادی کے بعد میاں بیوی فاقہ کشی ہی کیوں نہ کریں۔ اور ان کی تمام زندگی مصائب کا شکار ہی کیوں نہ ہو۔ میں نا بھم میں دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ ریاست کی سرکاری ملازمت۔ ریاستوں کی لوٹ مشورہ ہے۔ بالائی آمدنی (یعنی رشوت) کے پوچھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا۔ کہ اگر دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔ تو ریاست کی ملازمت میں "ادپر کی آمدنی" چار پانچ سو روپیہ ماہوار سے کم کیا ہوگی۔ چنانچہ سردار ہر نام سنگھ نے اپنی لڑکی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا۔ اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

اس رشتہ کو چند ماہ ہوئے تھے۔ کہ ہمارا جانا بھ پر مصائب کے بادل چھا گئے۔ اور وہ گدھی سے اُتار دیئے گئے۔ ہمارا جہ کے گدھی سے اُتار دیئے جانے کے بعد انگریز ایڈمنسٹریٹر آگیا۔ میں نے استعفیٰ دیا۔ تو اس نے منظور نہ کیا۔ آخر بغیر استعفیٰ ہی میں نا بھم چھوڑنے والا تھا۔ مگر رفتار کیا جا کر پولیس کے پہرہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ تین ماہ کے قریب میں نا بھم میں اسیری کی حالت میں رہا۔ وہاں سے جب چھوڑا گیا۔ تو روزانہ اردو اخبار "اکالی" کو ایڈیٹر کرنے امرتسر چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ اس اخبار کو ایڈیٹر کرتا رہا۔ اس کے بعد اپنے وطن حافظ آباد گیا۔ وہاں بالکل بے کار تھا۔ نہ کوئی پروگرام۔ نہ ملازمت اور نہ کوئی ذریعہ معاش۔

سردار ہر نام سنگھ جن کی صاحبزادی سے میرا رشتہ ہوا۔ بہت شریف اور نیک آدمی تھے۔ ان کے گاؤں کے تمام لوگ محب الوطن تھے۔ جتنے لوگ کانگریس کی تحریک میں ماس گاؤں سے قید ہوئے۔ شاید پنجاب کے کسی دوسرے گاؤں سے نہ ہوئے تھے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو پنجاب میں صرف اس گاؤں نے ہی سرکاری ایوان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور قومی حلقوں میں اس گاؤں کو پنجاب کا بار دلی کہا جاتا تھا۔ سردار ہر نام سنگھ نے جب میرے متعلق سنا کہ میں نا بھم کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں۔ اور بیکار ہوں۔ تو وہ حافظ آباد آئے۔ میرے چچا سردار بھگوان سنگھ سے ملے اور انھوں نے میری بیکاری کے متعلق کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ قدرتی طور پر ان کو تشویش ہوتی چاہئے تھی۔ کیونکہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کہ میں آئندہ کمب برسر کار ہو سکوں۔ اور کہاں ملازمت ملے۔ میرے چچا نے بالکل اس طرح ہی غلط اُمیدیں دلاتے ہوئے۔ جن طرح عام لوگ ایسے موقع پر دلایا کرتے ہیں۔ سردار ہر نام سنگھ سے کہا کہ ظال ظالان جگہ ملازمت کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ جلد ہی ملازمت مل جائے گی۔ چند روز کی بات ہے۔ دیران سنگھ کو ملازمت کی کیا کمی ہے۔ اس کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سردار ہر نام سنگھ اور میرے چچا کی گفتگو کا جمل بھی سردار ہر نام سنگھ کے حافظ آباد سے واپس چلے جانے کے بعد اگلے روز ہولم میں نے جب تمام حالات سنے۔ تو میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سردار ہر نام سنگھ

بے حد شریف اور نیک شخص بہت اچھا معزز خاندان۔ اُن کی لڑکی جان شادی کے قابل۔ میں بیکار۔ اور مستقبل تاریک۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ میں آئندہ زندگی میں کیا کروں۔ اور کب کروں۔ معقولیت کے ساتھ دیکھا جائے۔ تو سردار ہر نام سنگھ کو میرے برسرِ کار ہونے کے لئے غیر معین عرصہ تک کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔ ادھر تو یہ خیال۔ دوسری طرف یہ احساس کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ تو رشتہ دار اور برادری کے لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اور کہیں گے کہ بیکاری کے باعث شادی نہ ہو سکی۔ میں رات کو کئی گھنٹے تک سوچتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہئے۔ آخر میں نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے معقولیت اور انصاف کا ساتھ دینا چاہئے۔ اپنی خود غرضی کے باوجود سردار ہر نام سنگھ کو غلط آئندہ دن اور توقعات میں رکھنا مناسب نہیں۔ چنانچہ اگلے روز میں نے سردار ہر نام سنگھ کو ایک رجسٹری خط بھیجا۔ رجسٹری کے ذریعہ خط بھیجنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ اُن تک پہنچ جائے۔ جس میں لکھا۔ کہ میں بیکار ہوں۔ ملازمت سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ میرا مستقبل تاریک ہے۔ میں نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ میرا ذریعہ معاش کیا ہو۔ اور میں کب برسرِ کار ہو سکوں۔ آپ کا انتظار کرنا مناسب نہیں میرے واسطے۔ میں آپ کی شرافت، اخلاق اور زندگی کی بہت عزت و قدر ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ اپنی صاحبِ جزاء کی شادی کسی دوسری جگہ کر دیجئے۔ اور میرے حالات کے بہتر ہونے کا انتظار نہ کیجئے۔ اس خط کو نیچے کے بند میں نے کچھ ایسی راحت سی محسوس کی جیسی ایک فرض کو ادا کرنے کے بعد انسان محسوس کرتا۔ میرے خط لکھنے کے بعد سردار ہر نام سنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی شیخ پورہ کی ایک فیملی سے کر دی۔

میں حافظ آباد غالباً پانچ چھ ماہ بیکار رہا یہ عرصہ میں نے حافظ آباد سے دو میل کے فاصلہ پر ایک میں بسر کیا۔ یہ باغ میرے عزیز دوست اور چچا زاد بھائی سردار حاکم سنگھ کپور کا تھا۔ اس باغ میں ایک نیچہ لگا گیا۔ جس میں شہر میں بہت کم جانا۔ اور دوست اکثر شام کو وہاں ہی پہنچ جاتے۔ چنانچہ اکثر آیا ہوتا کہ شام آٹھ آٹھ دس دس دوستوں کی دہاں ہی دعوت ہوتی۔ اور شاید ہی کوئی شام ہوتی تھکہ ہم چار پانچ دوستوں نے بل کر کھانا نہ کھایا ہو۔

پانچ چھ ماہ گزرنے کے بعد میں نے دہلی آکر یہاں سے ”ریاست“ جادی کیا۔ ”ریاست“ کو شروع سے ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ روز بروز ہشتہارات، اشاعت اور آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرے معتمد اور قدردان اصحاب کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ ”ریاست“ کو چند ماہ میں ہی بہت کافی شہرت نصیب اور اس کامیابی کی اطلاع سردار ہر نام سنگھ کو بھی ملتی رہی۔

پنجاب کے قریب قریب ہر قصبہ کے پاس تالاب ہیں۔ یہ تالاب نہر کے پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ اور تالابوں پر لوگ نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں۔ اور ان کا پانی مال مویشی کے پینے یا ان کو نہلانے وغیرہ کام بھی آتا ہے۔ مجھے یاد ہے میں خود بھی حافظ آباد کے تالاب پر بچپن میں نہانے اور اپنے کپڑے جایا کرتا تھا۔ اور تالاب کی سیڑھیاں مردوں اور عورتوں سے بھری رہتی تھیں۔ جو نہانے اور اپنے کپڑے دھونے کے لئے وہاں جایا کرتے۔

گورنمنٹ کی پیدائش شیخ پورہ کے ضلع میں ننکانہ صاحب کے مقام پر ہوئی۔ کانگ کی پورنا

مگر رونما کے پیم ولادت کو اس مقام پر لاکھوں زائرین جاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ آباد سے بھی دس دس بارہ میل گاڑیوں کا قافلہ نکانہ صاحب جایا کرتا تھا۔ ان گاڑیوں میں سے کسی میں مرد بھرے ہوتے۔ اور کسی میں عورتیں اور بچے۔ یہ قافلہ آٹھ یا دس میل کے بعد مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے جاتا۔ اور قافلہ کے لیگرو صاحب کے شہد پڑھتے ہوئے جاتے۔

”ریاست“ کو جاری ہوئے دو تین سال ہوئے تھے۔ کہ حافظ آباد سے نکانہ صاحب کیلئے ایک قافلہ روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں میری بعض دوسری رشتہ دار خواتین کے ساتھ میری والدہ اور میری مائی بھی تھیں۔ قافلہ سفر کرتے ہوئے شیخ پورہ پہنچا اور چونکہ میلں کو بانی پلانے وغیرہ کا سوال تھا۔ اس قافلہ کا قیام وہاں یہ قلاب کے کنارہ ہوا۔ گاڑیوں سے میلں نکول دیئے گئے۔ تاکہ اُن کو چارہ دیا جاسکے۔ اور لوگ آرام کر لیں۔ درتیں اور مرد الگ الگ ٹولیں کی صورت میں درختوں کے سایہ کے نیچے قلاب کے کنارہ بیٹھ گئے۔ خود تین ہاں بیٹھی تھیں وہاں قریب ہی شیخ پورہ کی عورتیں قلاب پر نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ جب عورتوں نے عورتوں کو دیکھا تو شیخ پورہ کی عورتیں حافظ آباد کی عورتوں کے پاس آگئیں لہذا درختاں دو عورتیں بھی ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ وہاں ایک کانفرنس کا منظر ہوتا ہے۔ اتنی عورتیں غموش رہ سکتی تھیں۔ ان کی آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے میکے کہاں ہیں۔ ساری سسرال کہاں ہے۔ تمہارا نشوونما کیا کرتا ہے۔ اور تمہارے بچے کتنے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اتفاق سمجھے کچھ جنم کے نقلقات کے باعث اس زندگی میں ملتا جلتا۔ (میں اس بات کا قائل ہوں کہ جن لوگوں کے اتنے اس زندگی میں نقلقات ہوئے اُن کے ساتھ کچھ جنم میں بھی نقلقات تھے۔ چاہے کسی صورت میں نہ تھے۔ اور آئندہ جنم میں بھی ہوں گے۔ اس کا میرے پاس قطعی ثبوت موجود ہے جو کبھی آئندہ بتاؤں گا) میری والدہ اور میری مائی کے پاس ایک لڑکی آٹھ مہینے کی تھی جس سے یہ باتیں شروع ہوئیں۔

میری والدہ :- بیٹی! تم کہاں کی رہنے والی ہو۔

لڑکی :- میں یہاں شیخ پورہ کی رہنے والی ہوں۔

میری والدہ :- تمہارے میکے شیخ پورہ میں ہیں یا یہاں تم بیاہی گئیں۔

لڑکی :- میری شادی یہاں ہوئی ہے۔ میرے میکے تو گوہند پورہ میں ہیں۔

میری والدہ :- میرے لڑکے کی شادی بھی گوہند پورہ میں ہوئے والی تھی۔ مگر وہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

لڑکی :- گوہند پورہ میں کس کے گھر رشتہ چھوڑا تھا۔

میری والدہ :- وہاں ایک سردار و مہنام سنگھ ہیں۔ اُن کی لڑکی سے رشتہ ہوا تھا۔

لڑکی :- آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔

میری والدہ :- ہم حافظ آباد کے رہنے والے ہیں۔

لڑکی :- آپ کون ہوتے ہیں۔

میری والدہ :- ہم کھنڑی کھنڈی ہیں۔

لڑکی :- آپ کا لڑکا کیا کام کرتا ہے۔

میری والدہ پہلے ریاست ناہر میں ملازم تھا۔ اب دہلی سے ”ریاست“ اخبار نکال رہا ہے۔ لڑکی یہ جواب سن کر کچھ حیران اور خاموش سی ہو گئی۔ اور اُس کی آنکھیں ڈبٹیا آئیں۔ میری والدہ نے پوچھا۔ بیٹی کیا بات ہے۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔ لڑکی پھر بھی خاموش رہی اور اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میری والدہ اور میری مائی نے پھر زور دے کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ تم خاموش ہو گئیں۔ تو لڑکی نے بتلایا۔ کہ وہ ہی سردار ہزام سنگھ کی لڑکی ہے۔ اور اُس کی سنگائی ہی حافظ آباد میں ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی اس کیفیت کو سن کر میری والدہ نے کہا۔ بیٹی جہاں جو گئیں وہاں ہی شادی ہوتی ہے۔ اگر تمہاری ہمت میں ہمارے گھر آنا لکھا ہوتا تو تم آتیں۔ ایسا نہ لکھا تھا۔ اُس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں۔ اور کچھ دیر کے بعد قافلہ نکلا نہ صاحب کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہ لڑکی اپنے گھر چلی گئیں۔ ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان خود غرضی سے بلند ہو کر معقولیت کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرے۔ اور پھر انصاف کا خیال کرتے ہوئے قدم اٹھائے۔ یہ قدم چاہے پیچھے ہی لے جانا پڑے۔ تو انسان کا ضمیر نقصان اٹھانے کی صورت میں بھی راحت اور اطمینان محسوس کرنا ہے۔ اور اگر انصاف حق اور معقولیت کا خیال نہ کرتے ہوئے فائدہ بھی اٹھایا جائے (جیسا کہ چوری، رشوت یا ڈاکو میں لوگ اٹھاتے ہیں) تو روپیہ اور دولت یا دوسرے سامان راحت موجود ہوتے ہوئے بھی ذہن غلاب محسوس کرنا ہے۔ اور صبر سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

## قانون اور نفس

میں اپنی زندگی میں پندرہ بار گرفتار کیا گیا۔ اور اتنی بار ہی میرے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں مجھے آٹھ جیلوں میں رہنے اور وہاں کے حالات کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ آٹھ جیل یہ تھے۔ جوشنگ آباد۔ ناگپور۔ دہلی۔ گورنگاوں۔ لٹان۔ اولڈ سنٹرل۔ ایشیا۔ فیروز پور۔ اور لاہور سنٹرل جیل کی زندگی کے متعلق میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر کوئی شخص انسانی فطرت اور انسان کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کرنا چاہے۔ تو جیل سے زیادہ بہتر دوسری کوئی جگہ نہیں۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ انسان اگر اپنے آپ کو بلند کرنا چاہے تو جیل بہترین ذریعہ ہے اور سستی کی طرف جانا چاہے تو انسان کی گروٹ کے لئے جیل سے زیادہ بہتر کوئی مقام نہیں کیونکہ جیل میں اپنی اور دوسروں کی حالت پر غور کرنے کے لئے بہت کافی وقت اور بہت مواقع ملتے ہیں ان جیلوں کے متعلق درجنوں دلچسپ واقعات سمجھ یاد ہیں۔ جن سے انسان سبق حاصل کر سکتا ہے۔ میں آج ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں سینچر کا دن اور دسمبر کا مہینہ تھا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ٹریٹ دہلی نے میری ضمانت نامہ منظور کی اور حکم دیا کہ میں دہلی جیل بھیجا جاؤں اور وہاں میرے ساتھ سپیشل کلاس کے قیدیوں کا ساتھ کیا جائے۔ سب انسپکٹر سمجھنے کے قابل کیا۔ اور وہاں دو دو ذریعہ دربان کے علاوہ کسے واپس چلا آیا۔ دربان نے نام۔ دلیرت وغیرہ پوچھا۔ اور یہ لکھنے کے بعد اس نے ایک نمبر انڈیکس جیل میں طویل عرصہ تک رہنے کے بعد قیدی کی کھنیر دبا دیا جاتا ہے۔ یہ نمبر وار خود کوئی کام نہیں کرتے۔ دو مہرے قیدیوں سے حکم لیتے ہیں)

سے کہا کہ اس نئے قیدی کو جیل کے اندر داخل کر دو۔ میں جیل کے اندر گیا۔ تو وہاں وسیع میدان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل میز کر سیٹھا گئے بیٹھے تھے۔ سامنے بہت سے قیدی اپنے ہاتھوں میں اپنا گھٹا دیہی اعمالنامہ جس پر قیدی کا نام۔ پتہ۔ قیدی کی میعاد۔ کام۔ چال چلن اور مشقت وغیرہ لکھی جاتی ہے) لئے تھے۔ ایک نمبر ڈپٹی صاحب کے قریب تزیینہ ناک پر لٹے کے ساتھ اس طرح مکھیاں بٹا رہا تھا جس طرح ہومان سری رام چندرجی کے پیچھے کھڑے ہو کر چنڈر کرتا ہے۔ سردی کا موسم تھا۔ دسمبر کا مہینہ۔ شام کا وقت اور مکھی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ مگر چونکہ جیل میں افسروں کو بغیر تنخواہ ملازم ملتے ہیں۔ اس لئے گرمی ہو یا سردی ہر افسر کے ساتھ مکھیاں اور بچھر اڑانے والا ایک نمبر دار ضرور ہوتا ہے۔ جو مکھیاں نہ ہونے کی صورت میں بھی بطور خوشامد کپڑا ہلاتا رہتا ہے۔

مجھے کچھ علم نہ تھا کہ اب کہاں جانا ہے۔ اور کیا کرنا ہے۔ میں ڈپٹی صاحب کے قریب گیا۔ اور کہا۔ ”میں ابھی باہر سے آیا ہوں اور جیل کے اندر داخل کیا گیا ہوں۔ میرے لئے کیا حکم ہے۔“ اس وقت میں نے سیاہ سرخ کا گرم کوٹ اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ کوٹ کے ٹین کھلے تھے۔ میرے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ کے بازوؤں والی جگہ (یعنی کندھوں کے قریب) سے واسکٹ کے اندر تھے۔ اور ہاتھ باہر۔ (جب انسان سوچ رہا ہو۔ وہ سوچنے کی صورت میں اکثر ہاتھوں کے ذریعہ اس طرح واسکٹ کا سہارا لیتا ہے) دوسرے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ میری یہ بے تکلفی ڈپٹی صاحب کو پسند نہ آئی۔ آپ نے فرمایا۔ ”انسانوں کی طرح کھڑے ہو۔“

میں نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ میں سے نکال دیئے۔ ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔ کون ہو۔ اور کب آئے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ ایک ملازم ہوں۔ ابھی آیا ہوں۔ اور عجیب ٹیٹ نے سپیشل کلاس میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے قریب کھڑے نمبر داروں میں سے ایک نمبر دار کو حکم دیا کہ اس قیدی کا وارنٹ لاؤ۔ نمبر دار دربان کے پاس جا کر وہ وارنٹ لایا۔ چوپائیس نے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے دیکھا تو اس پر سپیشل کلاس نہ لکھی تھی۔ جب آپ وارنٹ دیکھ چکے تو آپ نے حقارت اور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور جیل کے حکام کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر جیل کے حکام کافی ہوشیار ہیں جو دھوکہ میں نہیں آ سکتے۔ اس مسکراہٹ اور حقارت کے ساتھ دیکھنے کے بعد آپ نے نمبر دار کو حکم دیا کہ اس قیدی کو چالیس علی کی طرف لیجاؤ۔ چالیس چکی وہ جگہ ہے۔ جہاں کہ چالیس کوٹھڑیاں قیدیوں کو تنہائی میں رکھنے کے لئے ہیں۔ اور ہر کوٹھڑی میں بیچنے کے لئے چکی موجود ہے۔ نمبر دار مجھے ان کوٹھڑیوں کی طرف لے گیا اور جاتے ہوئے اس نے کپڑا گودام کے انچارج نمبر دار کو پیغام بھیجا کہ ایک نئے قیدی کے لئے کسبل اور تیرہڑی بھیج دو۔ میں جب کوٹھڑیوں کے پاس پہنچا۔ تو ایک کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ اس کوٹھڑی میں رہو گے۔ مجھے وہاں پہنچے دو تین منٹ ہوئے تھے۔ کہ کپڑے گودام کا نمبر دار میرے لئے تین پٹے جوڑے پڑائے گئے۔ اور سیلے کسبل اور ایک موچ کی تیرہڑی (تیرہڑی نیچے بچھانے کا ایک ماتم کا فرش ہوتا ہے۔ جو چھوٹا لبا اور تین منٹ جوڑا تیار کیا جاتا ہے۔ اور اسے ہر قیدی کو پہنچانے کے لئے دیا جاتا ہے) لے کر آتا ہے۔ اس لئے مجھے دیکھا۔ نو سو پتار لایا۔ کہ میں کون ہوں۔ مجھے غور سے دیکھا تو پتار پھر اس لئے بچھا۔

کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے جواب دیا دہلی میں ہی رہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر سوچا رہا تو سوچنے کے بعد اس نے پوچھا: کیا آپ سردار دیوان سنگھ اخبار ریاست "دالے تو نہیں" میں لے گیا۔ ہاں میرا نام دیوان سنگھ ہی ہے۔ یہ پچار سے حیران ہوئے کہ میں کیوں جیل آیا۔ پھر انھوں نے بتایا کہ وہ لائیل پور کے ایک زمیندار سردار نرائن سنگھ ہیں۔ کئی برس سے ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کا کام کرتے رہے۔ پنجاب ریاستی پر جامنڈل کو کام کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ایک ڈاکہ تو ریاست جیند میں اور دوسرا انگریزی علاقہ میں ڈالنا کہ روپیہ حاصل کر کے پر جامنڈل کے کام پر صرف کریں۔ ڈاکہ ڈالنے کے کچھ عرصہ بعد پولیس نے گرفتار کر لیا۔ سات سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ قید ہونے سے ایک سال پہلے پنجاب ریاستی پر جامنڈل کے سیکرٹری سردار بھگوان سنگھ لوگوں کو دلیہ کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لئے دفتر "ریاست" میں بھی آئے تھے۔

میں ان کو پہچان نہ سکا اور ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہ آیا کہ یہ کب ملے تھے۔ انھوں نے جو واقعات اور سردار بھگوان سنگھ کے ساتھ آنے کے حالات بتائے۔ اُن سے یقین آ گیا کہ سردار نرائن سنگھ نیک دل اور قومی دگر ہیں۔ آپ اُن پہلے اور گندے کپلوں کو لے کر پھر واپس کپڑا گودام میں گئے۔ وہاں سے آپ نے تین اچھے کپسل اور ایک نئی تپڑی انتخاب کی۔ اور پھر واپس میرے پاس پہنچے۔ اور یہ سامان آپ نے میری کٹھڑی میں رکھ دیا۔ سامان رکھنے کے بعد آپ نے کھانے کے لئے پوچھا۔ میں نے انکار کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ جیل کے اندر وہ اس سے زیادہ میرے ساتھ بہتر سلوک یا جمد رومی کا ثبوت دے بھی کیا سکتے تھے۔

چند منڈل کے بعد کوٹھڑیوں کے نمبر دار نے مجھے کوٹھڑی کے اندر جانے کے لئے کہا۔ اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں کوٹھڑی کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ کپلوں کو دیکھا تو وہ بالکل ایسے تھے جیسے دیہات میں سردیوں کے زمانہ میں رات کو گائے بھینس وغیرہ جانوروں پر ڈالے جاتے ہیں۔ مجھے بہت کراہت محسوس ہوئی۔ کپلوں کو میں نے کھڈی دھیل میں کھڈی اُس ادبھی جگہ کہتے ہیں جو قیدی کے سونے کے لئے کوٹھڑی میں بنائی جاتی ہے۔) پر ایک طرف رکھ دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ ان گندے اور سیلے کپلوں کو اسٹینل نہ کروں گا۔ اور گم کوٹ وراسکٹ کو پہنے ہوئے ہی سو جاؤں گا۔ میں کھڈی پر بیٹھ گیا۔ سوچا رہا کہ مقدمہ کے متعلق مجھے آئندہ کیا کرنا چاہئے۔ اگر کئی برس کے لئے قید ہو گیا۔ تو اخبار کا انجام کیا ہو گا۔ دین گھنٹے تک سوچا رہا۔ تپڑی بھی ہوئی تھی۔ پھر اُس پر لیٹ گیا۔ جب رات کو دس بجے تو سردی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا۔ کپلوں کو پاؤں پر کیوں نہ ڈال لوں۔ میں نے بوٹ کھوئے نہیں تھے۔ پہنے ہی لیٹ گیا تھا۔ کپلوں کے ایک جھتہ کو میں نے سنے پاؤں پر ڈال لیا۔ تاکہ پاؤں ٹوکر م رہیں۔ لیٹنے کے بعد کوٹھڑی دیر بعد مجھے کچھ فینڈی آگئی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد زیادہ سردی ہو گئی۔ مجبور تھا۔ میں نے کپلوں کو سر کا کر گھنٹوں تک کر لیا۔ اس کے بعد اور سردی بڑھی۔ تو ذرا اور اوپچے۔ چنانچہ صبح جب پارچہ بچے میری آنکھ کھلی تو کپل آہستہ آہستہ میرے کندھوں تک پہنچ چکے تھے۔ اور جہی کپلوں کو دیکھ کر شام کے وقت کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح پارچہ بچے وہ کپل میرے اوپر تھے۔ انسان کی قوت ارادی کو زور و قوت کے باعث انسان گھٹے ٹیک دیتا ہے۔ آنکھ کھلنے پر سوچا رہا۔

کہ اگر کیپلوں کی یہی کیفیت ہوتا تو گاندھی کے ساتھ پیش آتی۔ اور جہاں تا گاندھی ان کیپلوں کو استعمال کرنا نہ چاہتے۔ تو وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے باعث جان ویریتے اور کیل استعمال نہ کرتے مگر یہاں دیوان سنگھ ہے۔ شام کو ان کیپلوں سے نفرت تھی۔ قوت ارادی کے کمزور ہونے کے باعث اب ان میں پشیمان ہے۔

جمع روشنی ہوتے ہی نمبر دار نے دروازہ کھولا۔ اس نمبر دار کا نام تھوڑا تھا۔ اور ایک قتل کے مقدمہ میں سات سال کے لئے کیا ہوا تھا۔ اس کے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اور دو سال باقی تھے۔ یہ جیل کے افسروں کا گڑ گا تھا۔ اور تمام قیدیوں کو اس سے شکایت تھی کہ یہ افسروں کے کہنے پر قیدیوں سے برا سلوک کرتا ہے۔

دہلی شہر میں ہی کم آدمی ہیں جو مجھے پہچان سکتے ہیں۔ حالانکہ اخبار اور میرے نام سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ کیونکہ میں کبھی پبلک جلسوں، جلسوں، یا میٹنگوں میں نہیں جاتا۔ موٹر سے دفتر اور موٹر میں ہی سے دفتر سے گھر۔ شہر باہر دہلی میں جانا بھی ہوتا تو موٹر میں۔ مجھے جیل میں کون جانتا تھا۔ تھوڑا نمبر دار نے مجھے بھی چروٹن ڈاکوؤں

اور دوسرے مجرموں کی طرح ایک قیدی سمجھا۔ اس نے مجھے اُس کوٹھڑی کی صفائی کرنے کے لئے کہا۔ میں نے اسے کہا کہ بتا دو کس طرح کروں۔ اُس طرح ہی آئندہ کر دیا کروں گا۔ اُس روز اُتار دیا۔ اور جیل میں قیدیوں کی چھٹی تھی۔ جب چھٹی ہو تو قیدی تمام جیل کی صفائی کرتے ہیں۔ زمین کو پوتا جاتا ہے تاکہ مٹی بیٹھی رہے۔ اس نے مجھے

اس کوٹھڑی کے کچھ حصہ کو پوت کر بتایا کہ اس طرح پوت دو۔ میں نے کوٹھڑی کے باقی حصہ کو پوت دیا۔ کیونکہ میں اس اصول کے حق میں ہوں اور ہمیشہ اس کا پابند رہا۔ کہ جیل کے اندر وہ سب کام کیا جائے جو جیل کے قوانین کے مطابق قیدی کو کرنا چاہئے۔ میں اس کو ایک فرض سمجھتا ہوں۔ کوٹھڑی کو پوتے کے بعد میں نے تل پر ہاتھ دھوئے

پھر باخانہ کیا۔ ہاتھ صاف کئے۔ بہت برسوں سے کبھی مٹی سے ہاتھ صاف نہ کئے تھے۔ ہمیشہ صابن سے کرتا تھا۔ بلکہ گھر میں باورچی کے لئے بھی یہ سخت پابندی تھی کہ وہ برتنوں کو کبھی مٹی سے صاف نہ کرے۔ ہمیشہ صابن سے کرے۔ مگر جیل میں صابن کہاں ہیں آج سی کھاس کا قیدی تھا۔ مجھے اُس طرح ہی زندگی بسر کرنی چاہئے

جیسے دوسرے عام قیدی کرتے ہیں۔ میں نے مٹی سے ہاتھوں کو صاف کیا۔ ایک طرف دھوپ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دوسرے قیدیوں کو دیکھتا رہا۔ کہ وہ اپنی زندگی جیل میں کیونکر بسر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد قیدیوں میں مجھے ہوئے چنے تقسیم ہوئے۔ قیدی وہ کھاتے رہے۔ اتوار کی چھٹی کے باعث خوش

غلیباں ہو رہی ہیں۔ اظہار محبت میں ایک دوسرے کو گندی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ بعض قیدی ان میں ایسے تھے جو کئی کئی برس سے جیل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور بعض ایسے رنگروٹ تھے۔ جو پہلی بار آئے

دس بجے کے قریب ان میں کھانا تقسیم ہوا۔ کٹی مٹری کی ہوئی سبزی اور دو دو روٹیاں۔ تھوڑا نمبر دار اور دوسرے ایک دو قیدیوں نے مجھے بھی روٹی اور سبزی کھانے کے لئے کہا۔ مگر میں بھوک محسوس نہ کر رہا تھا۔ اٹکار کر دیا۔ چائے کے لئے جی چاہتا تھا۔ مگر وہاں چائے کہاں۔ قیدیوں کے حالات دیکھتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب تھوڑے آواز دی کہ تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑی میں چلے جائیں۔ میں بھی کوٹھڑی میں گیا۔ تو تھوڑے

باہر سے حسب دستور نالا لگا دیا۔ کیونکہ جیل کے قواعد کے مطابق قیدیوں کو اتوار کے روز دو پہر کے وقت بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کوٹھڑی کے منظر میں بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ کوٹھڑی جو مغرب کی طرف ایک چھوڑ کر آخر میں ہے۔ ان تین چار کوٹھڑیوں میں سے ایک ہے جس میں لاسٹ مار ڈنگ پر بمب پھینکنے والے

دلی سازش کیس کے وہ ملزمان رہے جن کو بعد میں بھانسی ملی۔ یہ مجھے لالہ ہنونت سہائے نے بتایا۔ جو خود اس مقدمہ میں ملزم تھے۔ میں کوٹ داسکٹ آنا کر کوٹھڑی کے صحن میں بیٹھ گیا اور آئندہ کے متعلق سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سوچتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ اخبار کو بغیر کسی معاوضہ کے ڈاکٹر اشرف رجو کیڈوشٹ پارٹی کے لیڈر رہیں۔ اور میری اس گرفتاری سے چند روز پہلے مجاز صاحب کے ساتھ چلنے کے لئے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے تھے) کے پھر دو کر دیا جائے۔ اور اس ستم کی ایک تحریر ڈاکٹر صاحب کو دے دی جائے۔ کہ میں یہ اخبار ان کو بغیر کسی معاوضہ کے دیتا ہوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تھو نہرو دار آیا۔ اس نے آنا لکھو لا اور کہا کہ دفتر میں ڈپٹی صاحب جاتے ہیں۔ میں نے کوٹ داسکٹ پہنا اور تھوکے ساتھ دفتر میں گیا۔ تو وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سردار رگھونندن سنگھ تشریف فرما تھے اور ان کے پاس دفتر "ریاست" کے مسٹر ظفر احمد میرا بسترو کپڑے، سامان اور کھانا لائے بیٹھے تھے۔ میں جب پہنچا تو ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے۔ آپ نے مصافحہ کیا۔ اور کہا:-

”سردار صاحب میں بہت سخت نادوم اور شرمندہ ہوں۔ مجھے کل شام کو معلوم نہ تھا کہ آپ کون ہیں۔ میں نے آپ سے جو الفاظ کل شام کو کہے ان کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور فی الحقیقت مجھے سخت افسوس ہے۔ اور میں نادوم ہوں۔“

میں نے کہا۔ آپ اس کا کوئی خیال نہ کیجئے۔ آپ کا کیا قصور ہے۔ آپ کو علم نہ تھا کہ میں کون ہوں بالکل معمولی بات ہے۔ اور آپ نے کہا بھی کیا۔ کوئی غیر مناسب بات نہ تھی۔ ڈپٹی صاحب سے مجھے معلوم ہوا۔ کہ تھوڈی دیر پہلے کسی دوسرے کام کے لئے انھوں نے مسٹر لوئیس ایڈریشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے) کو ٹیلی فون کیا تو اس وقت مسٹر لوئیس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو تاکید کی کہ ایڈیشنل ریاست کو کل شام جیل بھیجا گیا ہے۔ وہ سپیشل کلاس میں رہیں۔ بڑی پوزیشن کے آدمی ہیں۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ظفر صاحب نے مجھے بتایا کہ کل شام کو ہی جب دفتر کے لوگوں نے سنا کہ مجھے جیل بھیج دیا گیا ہے تو وہ میرا بسترو۔ کھانا اور سامان لے کر جیل آئے تھے مگر کسی نے ان کی پروا نہیں کی۔ ظفر صاحب کا یہ بیان سن کر ڈپٹی صاحب نے پھر معافی چاہی۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ معمولی بات ہے۔ آپ خیال نہ کیجئے۔ اس بات حیت کے بعد میں نے ڈاکٹر اشرف کے نام ڈاکٹر شرکت اشرف انصاری کی کوٹھڑی کے پتہ پر خط لکھا۔ جس میں اخبار "ریاست" بغیر کسی معاوضہ کے دینے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ جیل آکر اس کے متعلق تحریر لکھوالی جائے۔ یہ خط میں نے ڈپٹی صاحب کے حوالہ کیا۔ مگر پولیس نے اسے روک لیا۔ ڈاکٹر اشرف کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ وہ اب تک مقدمہ کی مثل میں موجود ہے۔ اب ڈپٹی صاحب نے ایک نمبر دار کو بلوایا۔ اور حکم دیا کہ میرے لئے وہاں انتظام کیا جائے جہاں سپیشل کلاس کے لوگ رکھے جاتے ہیں۔ یہ جگہ بہت اچھی صاف ستھری روشن اور ہوا دار ہے۔ یہاں چار پانی، میز اور چھوٹی الماری وغیرہ سامان بھیج دیا گیا۔ میرا سامان غسل کپڑے اور بسترو وغیرہ جو ظفر صاحب لائے تھے وہی وہاں پہنچ گیا۔ ان مردوں میں مجھ سے پہلے وہاں احراری لیڈر عبدالہ القیوم صاحب کا بھوری بھی مقیم تھے۔



تین چار سال ہوئے میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ اُس فلم میں ایک جگہ فلم ایکٹر کہتا ہے: ”دنیا جھکتی ہے۔ جھکانے والا چاہیے۔“ جیلوں میں عام قیدیوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے اسانیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر جیل کے حکام اخبار نویسوں اور پولیٹیکل لیڈروں کے ساتھ جس خوشامد چال پھری فرضی محبت اور دلزاری کا سلوک کرتے ہیں اس کی مثال سسرال کے گھر کے بغیر انسان کو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ چنانچہ اس بار میں دہلی جیل میں پانچ ماہ کے قریب رہا۔ کھانا دونوں وقت گھر سے آتا۔ کتا ہیں۔ کاغذ قلم دوات۔ لکھنا پڑھنا۔ اخبارات سب سہولتیں۔ دوسرے لوگوں کو تو اپنی برک یا کوٹھڑی سے بھی نکلنے کی اجازت نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ رہنے والے ایک یورپین مشرواٹن اپنے کمرہ سے بھی نہ نکل سکتے تھے۔ مگر میں تمام جیل میں پھرتا۔ دوپہر کو گھنٹہ دو گھنٹہ غلہ گودام کے انچارج سردار جاگیر سنگھ (جو آجکل دہلی جیل میں سسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں اور غیر معمولی طور پر دیانت دار اور شریف ہیں) کے پاس چلا جاتا۔ اور جس قیدی سے چاہتا بات چیت کرتا۔ مگر مجھے کوئی نہ روکتا۔ اس ”رعایت“ کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ یہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد جیل کی خرابیوں کو بے نقاب کر سکتا ہوں اور بے نقاب کرنا ان کے لئے مصائب و مضحکات کا باعث ہوگا۔

میں جیل میں ہی تھا۔ تو دس ایک قتل کے سلسلہ میں تین سادہ لوح دیہاتی جاٹ جیل میں آئے۔ ایک اٹھارہ برس کا لڑکا جس نے چار پانچ سال کے بچہ کو زہر کے لپٹ میں قتل کیا تھا۔ اور در بڑی عمر کے جاٹ جن کے متعلق پولیس نے لڑکے سے بیان دلوا دیا۔ کہ وہ دونوں بھی قتل میں شریک تھے۔ اس قتل کے صل اور صحیح واقعات یہ ہیں۔ مسلح دہلی کے ایک گاؤں میں چار پانچ برس کا ایک بچہ کھیل رہا تھا۔ اور اس چار پانچ سات روپے کے چاندی کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ بچہ جب نگلی میں اکیلا تھا۔ تو ایک اٹھارہ سالہ جاٹ نوجوان اس بچہ کو اپنے گھر (جہاں وہ اکیلا رہتا تھا) لے گیا۔ اس نے بچہ کا زہر آتا رہا۔ بچہ جب رونے لگا۔ تو اس نے بچہ کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ یہ نوجوان ملزم بہت بے وقوف اور ہونق کلاس کا دیہاتی تھا۔ بچہ کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے بچہ کی لاش کو اپنے گھر کی دیوار کے ایک بڑے سوراخ میں رکھ دیا اور اوپر سے اینٹیں چھن دیں۔ مقتول بچہ جب گھر نہ پہنچا۔ تو اُس کی ماں تلاش کرنے کے لئے نگلی میں نکلی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی پتہ نہ چلا۔ تشوین ہوئی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ تو ایک شخص نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے اس نے نوجوان جاٹ کو بچہ کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں نے نوجوان جاٹ کو جب دھمکایا اور دو چار تھپڑ مارے۔ تو ملزم نے بتا دیا کہ اُس نے زہر کے لپٹ میں بچہ کو ہلاک کیا ہے۔ اور لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔ لوگوں نے لاش نکال لی۔ پولیس میں اطلاع ہوئی۔ پولیس آگئی۔ ہر گاؤں اور قصبہ میں کچھ لوگ پولیس کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو پولیس اور ملزموں کے درمیان رشتہ کے سودے کرتے ہیں۔ چھوٹے گواہ تیار کرتے ہیں۔ خود شہادتیں دیتے ہیں۔ مخبروں کرتے ہیں۔ اور پولیس ان کے تمام جرائم پر پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس گاؤں کے پولیس کے ایجنٹ کی دو جاٹوں (جو اصلی نوجوان ملزم کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل میں آئے) سے عداوت تھی۔ پولیس کے اس ایجنٹ نے پولیس کے ساتھ مل کر اصلی ملزم سے بچہ کے زیورات لئے۔ اور گاؤں کے باہر فرضی ملزموں کے کھیت میں دفن کر دیئے۔ ادھر نوجوان ملزم کو پہلے تو پولیس نے مارا اور دھمکایا۔ پھر جب یہ پولیس کے اشارہ پر بیان

دبے کے لئے تیار ہو گیا۔ تو اس کی خاطر نواضع شروع ہوئی۔ اس کو جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے۔ اور اس سے کہا گیا کہ اگر وہ عدالت میں یہ بیان دے کہ اس نے دونوں فرضی لمزموں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ فرضی لمزم تو سزا پایا جائیں گے مگر یہ خود پتہ چلے گا۔ کیونکہ اگر کسی دوسرے کے کہنے پر جرم کیا جائے تو جرم کرنے والے کو سزا نہیں ملتی۔ زیر غیب دینے والے کو یہی ملتی ہے۔ چنانچہ اس نوجوان ہونٹ نے پولیس کے کہنے پر یقین کر لیا اور اس نے بیان دے دیا کہ دونوں فرضی لمزموں نے اس سے جرم کرنے کے لئے کہا۔ دونوں لمزموں کے کہنے پر اس نے بچہ کو ہلاک کیا۔ دونوں لمزم زلیور لے گئے۔ اور انھوں نے اپنے کھیت میں نہ پورہ من کیا۔ چنانچہ اس بیان کے مطابق کھیت میں سے گواہوں کے سامنے زیور نکالا گیا۔ شہادتیں تیار کی گئیں۔ اور دونوں بے گناہ غریب معصوم اور سادہ لوح جاٹ جن کو جرم کا کچھ علم نہیں تھا۔ بھی اعلیٰ نوجوان لمزم کے ساتھ گرفتار کئے جا کر جیل بھیج دیئے گئے۔ جیل میں یہ لوگ جب پہنچے تو جیل کے حکام نے پولیس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نوجوان لمزم کو تو جیل کے شمال کی جانب آخری کوٹھڑیوں میں رکھا۔ اور دونوں فرضی لمزموں کو جنوب کی طرف کی کوٹھڑیوں میں تاکہ یہ لوگ آپس میں مل کر نوجوان لمزم کے بیان کو بدلنے کا باعث نہ ہوں اور مقدمہ ”سکایا پ“ ہو سکے۔ یہ تمام حالات مجھے وہ دنوں فرضی لمزموں نے بتائے۔ میں نے ان پر مختلف سوالات بھی کیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ جھوٹ تو نہیں بول رہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ سچ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ بہت تشریل میں تھے۔ بے گناہ قتل کا مقدمہ جس میں پچاسی کی سزا دی جاسکتی ہے۔ قانون اور مقدمہ سے ناواقفیت کریں تو کیا۔ سوائے تشویش میں گھٹنے اور رات کو نہ سونے کے اور کبھی کیا سکتے تھے۔ میں اگلے روز صبح نوجوان جاٹ لمزم کی کوٹھڑیوں کی طرف گیا۔ تو اس کے ساتھ تھاک کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے بیٹھ آیا۔ تاکہ یہ اہل حالات بتا دے۔ یہ سادہ لوح بے وقوف تو تھا۔ اس سے جب میں نے ایک دو باتیں ہمدردی کے ساتھ کیں تو اس نے سب حالات سن و سن بتا دیئے۔ جو اہم بیان کیے گئے ہیں۔ کہ کس طرح پولیس اور پولیس کے ایجنٹ کے کہنے پر اس نے جھوٹا بیان دیا۔ بے گناہوں کو پھنسا یا۔ اور اسے جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے وغیرہ۔ میں اس سے باتیں کہے واپس اپنے کمرہ میں آیا تو کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ قانونی پوزیشن یہ ہے کہ اگر ایک لمزم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے ہمراہی لمزموں کا نام بھی لیتا ہے۔ تو ہمراہی لمزم چاہے قطعی بے گناہ ہوں وہ بھی مجرم سمجھے جائیں گے کیونکہ ایک مجسٹریٹ یا جج اس لمزم کے تمام کے تمام بیان پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہے (مجھ پر پندرہ کے قریب مقدمات قائم ہوئے۔ جہاں تک نوجوانی مقدمات کے ڈیفنس کا سوال ہے معمولی دکیوں سے میں زیادہ مقدمہ کی نوعیت کو سمجھتا ہوں) اور وچسپ کیفیت ہے کہ ہر شنگ آباد والے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ میں چھ سال دکیوں کی پیروی کرنے کے بعد آخری بحث ایڈیٹر ”ریاست“ نے خود کی کیونکہ ایڈیٹر ”ریاست“ کے وکیل مصروفیت کے باعث اس روز پہنچ نہ سکے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے اپنی طرف سے بحث خود کی۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے بحث کرنے والے سرحد الرحمن تھے۔ جو بعد میں پنجاب کی جج ہائیکورٹ ہوئے بحث کے بعد مجسٹریٹ سٹراؤٹک نے کہا۔ ”سرحد الرحمن سنگھ میں آپ کو اس بحث پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اس سے بہتر بحث کوئی وکیل بھی نہیں کر سکتا“ میں اپنے کمرہ میں پہنچا۔ تو تمام حالات پر غور کر رہا اور سوچتا رہا کہ ہم لوگ اخبارات میں دعویٰ تو کرتے ہیں۔ دنیا سے مطالبہ کو ختم کرنے کی کوشش کا۔ مگر یہ ظلم

سامنے ہو رہا ہے۔ بے گناہ لوگ پھانسی پر چڑھیں گے۔ دن بھر میں آرام سے بیٹھ نہ سکا۔ کبھی دو دنوں بے گناہ مجرموں کے پاس جا کر پھر باتیں کرتا۔ کبھی واپس آکر سوچتا۔ جن نے خیال کیا کہ سشن نیچ جس کے پاس مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔ کو تمام حالات لکھ کر بھیج دیا۔ پھر خیال آیا کہ اس لکھنے کی کافی حیثیت کچھ بھی نہ ہوگی۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ سوچا رہا کہ کیا قدم اٹھایا جائے۔ صبح چار بجے چار پائی سے اٹھا پاؤں لگایا۔ ہاتھ منہ صاف کئے۔ انگلیٹھی میں کونے شلگائے۔ چائے کے لئے پانی رکھا۔ گلاس میں دو دو کے پوڈر کھم سے دو دو تیار کیا۔ چائے بنائی اور چائے پی رہا تھا۔ تو خیال آیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اصلی نوجوان مزم کا بیان تبدیل ہونا چاہئے۔

بے گناہوں کے پھانسی کی رسی سے نیچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اصلی مزم اپنے بیان کو بدل دے۔ جب دن نکلا۔ آٹھ بجے کا وقت ہو گا میں سیر کے بہانے ٹہلے ٹہلے نوجوان مزم کے پاس پہنچاؤں گا۔ کیا حل ہے۔ یہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ پولیس کے کہنے کے مطابق اس کو یہ یقین تھا کہ قتل کرنے والے سزا نہیں پاسکتے۔ صرف قتل کی ترغیب دینے والے سزا پاتے ہیں۔ یہ بالکل بری ہو جائے گا۔ اور اس کے ہمراہی جاٹ پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔ مزے میں ہوں۔ یہ مجھے ہمدرد وار ہے تعلق سمجھتا تھا۔ میں نے

اس سے کہا۔ خدا کرے تم ہی ہو جاؤ۔ مگر تمہارے بری ہونے کی کوئی توقع تو نہیں۔ تم تو لازمی طور پر پھانسی پاؤ گے۔ یہ میرا ہونے پر چھنے لگا۔ یہ کس طرح ممکن ہے میں نے کہا تم قانون سے واقف نہیں بے وقوف جاٹ ہو۔ پولیس کے چکر میں آ گئے۔ تم اتنا سوچو کہ جو شخص قتل کرے گا خود اقرار کرے کبھی بری ہو سکتا ہے اور عدالت اس کو کبھی چھوڑ سکتی ہے۔ پولیس نے تو تمہیں بے وقوف بتایا ہے میری بات سن کر یہ سوچنے لگ گیا۔ اتنے میں وہاں کا ایک پرانا قیدی جا رہا تھا۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلالیا۔ اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ یہ جاٹ کتنا گدھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قتل کا اقرار کرتے ہوئے یہ پھانسی سے بچ جائے گا پڑا ہے قیدی بھی مقدمات کی نوعیت سے واقف ہوتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ”سر دار جی ایسے بے وقوف ہی تو پھانسیوں پر لٹکتے ہیں۔ عدالتوں میں اقرار نہ کرنے والے تو سزا پا جاتے ہیں۔ اور اقرار کر کے ڈالا یہ تو کچھ ہماری ہو جائے گا ان لوگوں کی ایسی ہی حالت ہے۔ یہ جاٹ پیدا نشی بے وقوف ہوتے ہیں۔“ اس پر اسے قیدی کی رائے سن کر نوجوان جاٹ کی آنکھوں میں آنسو پھرائے۔ اور یہ میرے ہاؤس پر گھڑا۔ اور کہا ”خدا کے لئے بچاؤ۔ میں مر جاؤں گا۔“ میں نے اس سے کہا۔ تمہارے نیچے کی صورت ہے۔ تو صرف ایک ہی کو تم جبکہ سشن کورٹ میں جاؤ۔ تو زور زور سے رونا شروع کر دو۔ اور سشن نیچ سے کہو کہ تم بالکل بے گناہ ہو۔ پولیس کے کہنے پر تم نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ تم نے بچہ کو قتل نہیں کیا۔ اور تمہارا بیان مارا کر لیا گیا ہے۔ میری اس رائے کو سن کر پڑا اسے قیدی نے کہا۔ ”اگر یہی صورت بہتر ہے۔ سیشن میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤ۔ تب نیچ کو کہو۔“

یہ نوجوان جاٹ مجھے ہمدرد سمجھتا تھا۔ میری بات اس کے دل میں لگی۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ میں نے جیسا کہا ہے۔ دیکھا ہی وہ کرے گا۔ اس لڑکے نے مجھے بتایا کہ جب یہ پیشی پچاتا ہے۔ تو پولیس کے لوگ اس کو اپنے بیان پر پختہ رہنے کے لئے تاکید کرتے ہیں۔ اور کبھی پکندے لے دیتے ہیں۔ کبھی مٹھائی۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ فیصلہ کے روز یہ بری ہو جائے گا۔

میں نے اس نوجوان جاٹ کے پاس ہر روز جانا شروع کیا۔ اور اسے سمجھا دیا۔ کہ جب پولیس اس کو مٹھائی وغیرہ

دے اور بیان پر قائم رہنے کے لئے کہے۔ تو یہ پولیس سے یہی کہتا رہے کہ وہ بیان پر قائم رہے گا۔ تاکہ پولیس کو اس کے بیان کے بدلے کا علم نہ ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ پولیس بھی سمجھتی رہی کہ اقراری ملزم اپنے بیان پر قائم ہے۔ یہ مجھے ہر پیشی کے حالات بتاتا رہتا۔ اور میں بھی اس کو اچھی طرح تاکید کرتا اور سمجھاتا۔ آخر جب سیشن جج نے اس کا بیان لینا چاہا۔ تو عدالت میں زار زار رونے لگ گیا۔ اور اس نے کہا ”حضور میں نے قتل نہیں کیا۔ اور نہ مجھے قتل کا علم ہے۔ کہ کس نے کیا۔ پولیس نے مارا کہ مجھ سے جرم کا اقرار کرایا۔ اور دوسرے بے گناہ لوگوں کے متعلق بیان لے لیا۔ نہ میں نے قتل کیا۔ نہ مجھ سے کسی نے قتل کرنے کو کہا۔ ہم تینوں بے گناہ ہیں۔ پہلا بیان میں نے بالکل غلط اور پولیس کے کہنے پر دیا ہے۔“

سیشن جج نے یہی بیان کھ لیا۔ پولیس اور سرکاری وکیل حیران کہ یہ کیا ہو گیا۔ اقراری بیان کی قانوناً پوزیشن یہ ہے۔ کہ اگر اقرار کے بعد ملزم اپنے بیان سے پھر جائے۔ تو بعض حالتوں میں اس کا بیان اس کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں نہیں۔ مگر ساتھی ملزموں کے خلاف تو یہ قطعی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس مقدمہ میں چونکہ لاش نوجوان ملزم کے گھر سے برآمد ہوئی۔ سیشن جج نے اس کو تو عمر قید کی سزا دی مگر چونکہ اس نے اپنے اقراری بیان کی تردید کر دی۔ دونوں بے گناہ ملزم بری کر دیئے گئے۔

اس مقدمہ میں قانوناً تو شاید میں بھی ملزم کو ورغلائے اور اس کا بیان بدلوانے کا مجرم ہوں۔ مگر جہاں تک اخلاقی فرض کا سوال ہے میں نے نہ صرف کوئی جرم نہیں کیا۔ بلکہ میں سترت اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دو بے گناہوں کو پھانسی کے تختے سے بچا کر اپنا فرض ادا کیا۔ اور آئندہ زندگی میں بھی اگر کوئی ایسا موقع آیا۔ جہاں کہ قانون اور فرض میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑا تو یقیناً فرض کو ہی انتخاب کروں گا۔ قانون کی کبھی پروا نہ کروں گا۔ چاہے قانون کی پروا نہ کرنے کے جرم میں قابل تعزیری کیوں قرار نہ دیا جاؤں۔

## ریاستوں کے جرائم اور ان کی سزائیں

ریاستوں میں ہر افسر اور اہلکار کا گھر خاندان کا مرکز ہوتا تھا۔ اور شاید ایک ہی افسر یا اہلکار ایسا نہ ہوگا جس کے ہاں ہر روز باغیچہ سات دس خوشامدی نہ آتے ہوں۔ یہ خوشامدی نہ کوئی اس افسر سے تنخواہ پاتے۔ تھے۔ نہ کوئی اور معادضہ اور یہ اس بات میں ہی خوش رہتے۔ کہ ان کا اس افسر سے تعلق ہے۔ کیونکہ اس تعلق کے باعث عام لوگوں پر خوشامدی کا کچھ رعب سارہتا۔

میں جب ریاست ناچھ میں ملازم ہوا۔ اور لوگوں کو یہ علم ہوا۔ کہ ہمارا جہ نے مجھے ذاتی و نہاد تعلق رکھتا ہے۔ باعث ملازمت دی ہے۔ تو میرے ہاں بھی چند خوشامدیوں نے آنا شروع کیا۔ یہ لوگ دن میں ایک آدمہ بار بار دوسرے دوسرے روز آتے۔ کوئی کام نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی غرض نہیں۔ صرف آئے۔ سلام دعا کی۔ میٹھے۔ شہر کے حالات بتائے۔ میرے سامنے میری تعریف کی۔ اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اور چلے گئے۔ ان لوگوں میں جہاڑہ کے بادچی خانہ کا ایک سرکاری بادچی ہری سنگھ (میرا خیال ہے کہ یہی نام تھا۔ اگر میں

محول نہیں گیا، بھی تھا۔ جو دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتا۔ ہمارا جہ کے حالات سناتا۔ اور شہر کے متعلق واقعات بتاتا۔ یہ کھانا پکانے میں بہت ماہر تھا۔ ہندوستانی رانگریزی ہر قسم کا کھانا پکا سکتا تھا۔ یہ کبھی کبھی سیر ہاں آکر میرے لئے کھائے کی ایک آدھ اچھی ڈش بھی تیار کرتا۔ چنانچہ میں نے اس سے فریج ٹوسٹ اور دو چائے دوسرے انگریزی کھانے پکانا بھی سیکھ لئے۔ میں اس کا بہت لحاظ کرتا۔ اور یہ میرا کھوکھو کہ یہ ہمارا جہ کا باؤچی تھا۔ مجھے خیال تھا کہ ایسے لوگ اگر خلاف عمل۔ تو ہمارا جہ کے پاس بگڑ گئی کر کے ہمارا جہ کو خلاف کر سکتے ہیں۔ اس کو یہ خیال کہ ہمارا جہ سے میرا ذاتی تعلق ہے۔ شاید میں اس کی ترقی کے لئے ہمارا جہ کے کبھی سفارش کروں۔ اور اس کے لئے مقید ثابت ہوں۔

یہ میرے پاس کئی ماہ تک آتا رہا۔ اس کے بعد گر میوں کے شروع ہونے پر ہمارا جہ منصوری پہاڑ پر چلے گئے۔ تو یہ بھی سٹاف کے ساتھ وہاں گئے۔ ہمارا جہ منصوری میں عام طور پر سال میں آٹھ دنہ روزہ رہتے تھے۔ یعنی مارچ میں جاتے اور اکتوبر یا نومبر میں واپس ناہم آتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سرکاری سٹاف کے لوگ اتنا طویل عرصہ اپنے وطن اور بال بچوں سے دور رہ کر تنگ آ جاتے۔ اور اگر کسی کو رخصت ملتی۔ یا سرکاری کام کے لئے ناہم آتا۔ تو وہ اسے غنیمت سمجھتا۔ منصوری میں ہمارا جہ کے باؤچی خانہ میں سے ایک چمچ اور کھانا کھانے کا ایک کاناگم ہو گیا۔ اس چمچ اور کاناگم کے ہونے کے متعلق ہمارا جہ کے ایک نفر پنجاب کی سکھ ریاستوں میں ذاتی خدمت کرنے والے بیرو۔ بوائے یا ملازم کو نفر کہتے تھے) نے ہمارا جہ سے شکایت کی، کہ ایک چمچ اور ایک کاناگم ہے۔ اور اس کو شک ہے۔ کہ اس چمچ اور کاناگم کی چوری ہری سنگھ باؤچی نے کی ہے۔ نفر کا یہ کہنا تھا کہ ہمارا جہ فحش میں آگئے۔ سرکاری سٹاف کی چوری ہمارا جہ کے پاس رہنے والا سرکاری ملازم کرے۔ منصوری انگریزی علاقہ میں تھی۔ وہاں ہمارا جہ کی جو رسد کنشن نہ تھی۔ ہمارا جہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے۔ کہ انگریزی پولیس کو رپورٹ کرتے۔ اور پولیس اس چوری کے متعلق تحقیقات کرتی۔ مگر ہمارا جہ کو یہ کیونکر گوارا تھا کہ انگریزی پولیس ناہم کے شاہی محل میں آکر تحقیقات کرے۔ یہ تو بہت ہتک تھی۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد ہمارا جہ نے سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس ناہم کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں تحریر تھا کہ اس خط لانے والے ہری سنگھ نے سرکاری سٹاف کی چوری کی ہے۔ اس کو ناہم ٹائی جیل بھیج دیا جائے۔ ہمارا جہ نے یہ خط لکھ کر لفظ میں بند کیا۔ اور لفظ کی پشت پر شریخ لاکھ کے ساتھ ہرین لگائیں۔ اور لفظ تیار ہونے پر ہری سنگھ کو طلب فرمایا۔ اور حکم دیا کہ یہ خط لے کر فرانا ناہم چلے جاؤ۔ ضروری کام ہے۔ اور یہ خط سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس کو پہنچاؤ۔ ہری سنگھ اس حکم کو سن کر بے حد خوش ہوا۔ کیونکہ کئی ماہ کے بعد سرکاری سفر خرچ پر ناہم جا رہا تھا۔ ایک دو روز وہاں اپنے وطن رہ کر بیوی بچوں سے ملے گا۔ اس نے لفظ کو نہایت احتیاط کے ساتھ پہلے ایک کاغذ میں لپیٹا۔ اور پھر اس کو کپڑے میں تاکر یہ میٹلا ہوا۔ اور بکھالٹ ناہم پہنچا سکے۔ چنانچہ یہ منصوری سے اپنا ٹک بستر وے کر دانا ہوا۔ ڈیرہ دین تک ڈانڈی داس زمانہ میں منصوری تک موٹریں نہ جاتی تھیں۔ راجپورہ سے منصوری تک ڈانڈی جاتی تھی۔ جس کو چار یا چھ آدمی اٹھایا کرتے تھے) میں گیا۔ ڈیرہ دونوں سے ریل میں سوار ہو کر اگلے روز صبح ناہم پہنچ گیا۔ ناہم ریلوے سٹیشن پر آتے تو پہلے سیدھا انسپکٹر جنرل پولیس سردار کاہلا سنگھ کے مکان پر گیا۔ تاکر

سرکاری لغاذ کو پہلے وہاں پہنچا دے اور پھر اپنے گھر جا سکو سرکاری کام میں ہرج نہ ہو کیونکہ ہمارا جہ نے کہا تھا کہ یہ لغاذ ضروری ہے یہ بچارا سردار کھلا سنگہ کے مکان پر پہنچا تو اس نے ملازم کے ذریعہ سردار صاحب کی خدمت میں اپنے منصوری سے آئے اور ایک ضروری لغاذ لانے کی اطلاع کی۔ ملازم نے سردار صاحب کو اطلاع دی تو سردار صاحب نے ہری سنگہ کو مکان کے اندر بلا لیا۔ ہری سنگہ نے نہایت ادب کے ساتھ سردار صاحب کو خط دیا۔ سردار صاحب نے خط کھولا۔ اور پڑھا۔ تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ باہر پہرہ پر پولیس کا سپاہی ہے سردار صاحب کے مکان پر پولیس کا دن رات پہرہ رہتا تھا، اس کو مجازہ ملازم سپاہی کو بکھلایا۔ جب سپاہی آیا تو سردار صاحب نے سپاہی کو حکم دیا۔ کہ ہری سنگہ کو جھکڑی لگاؤ۔ ہری سنگہ پریشان کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ قابل اعتماد سمجھا جا کر منصوری سے کانفیڈنشل خط لایا ہے۔ اور یہاں گرفتاری ہو گئی۔ یہ غریب رونے لگا۔ انہیں کٹر جیل پولیس نے داروغہ جیل کے نام پر دیکار بھیجی۔ کہ ملازم ہری سنگہ حکم سری حضور ہمارا جہ صاحب بالونڈ بہاؤد جیل میں بھیجا جاتا ہے۔ اس کو تا حکم ثانی جیل میں قید رکھا جائے۔ کنسٹیبل پولیس اس رو بکار اور ہری سنگہ کو لے کر جیل گیا۔ اور ہری سنگہ بجائے اپنے گھر میں بال بچوں سے ملنے کے مددگار صاحب جیل کے سامنے بیٹھ گیا گیا۔ جس نے کانٹا اور چھچھ کی چوری کے شاہی ملازم کو بغیر مقدمہ بغیر سزا۔ بغیر اپیل یا بغیر کسی قانونی مشورہ یا فیصلہ کے قیدیوں کے ڈربے میں داخل کر دیا۔ جہاں کہ یہ بچارا اسی حالت میں اس مددگار قید رہا جب تک کہ ہمارا جہ کی معزولی کے بعد انگریز ایڈمنسٹریٹر نا بھیم میں نہیں پہنچ گیا۔ اور اسی قسم کے بغیر کسی مقدمہ کے قید کیے گئے۔ انہی کے قریب دوسرے شاہی قیدی رہا نہیں کیے گئے۔

ہری سنگہ نے اپنی قید کے زمانہ میں میرے پاس کئی بار جیل سے پیغام بھیجا۔ جس میں اس نے گرتھ صاحب کی قسمیں کھائیں کہ اس کے چچے اور کانٹے کا کچھ علم نہیں۔ یہ بے گناہ ہے اور اس کی رہائی کے لئے میں ہمارا جہ سے سفارش کروں۔ مگر میں بے بس تھا۔ ہمارا جہ سے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ جس صورت میں کہ قلم رہا ست کا ایک ملازم یا ایک اہلکار بھی ایسا نہ تھا۔ جو اس اطمینان کے ساتھ رات کو سوتا ہو۔ کہ اگلے روز جب سورج نکلے گا۔ تو اس دقت وہ اپنے بستر پر ہی ہوگا۔ جیل میں نہ ہوگا۔ یعنی ایک آدمی بھی تمام ملازموں میں ایسا نہ تھا چاہے وہ کتنا بھی بے گناہ اور معصوم کیوں نہ ہو۔ جو اپنے آپ کو خطرہ میں نہ سمجھتا ہو۔

یہ تو ریاست نا بھیم کا ایک واقعہ ہے جن کا مجھے ذاتی علم ہے۔ مگر ہندوستان کی چھ سو ریاستوں میں نظام یہی کوئی ایسی ریاست ہوگی جس میں اس قسم کے جھوٹے بے بنیاد۔ اور بے معنی مقدمات نہ بنائے جاتے ہوں۔ اور سرکاری ملازم یا رعایا کے لوگ دالئے ریاست کی ناراضی اور غصہ کا شکار ہوتے ہوئے "تا حکم ثانی" جیلوں میں نہ بھیج دیئے جاتے ہوں۔ ریاستوں کے ایسے حالات میں یہ خواہش کرنا کہ رہا ستوں کی احست ہندوستان میں ہمیشہ قائم ہے۔ انتہائی محافت تھی۔ اور اگر انسانوں کی سول برٹری کی دنیا میں کوئی حیثیت ہے۔ تو ریاستوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جانا ہی بہتر تھا۔

## ریاستی جرنلزم

ریاست دنیا میں ایک صاحب شیر خاں بارہ یا پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے (مگر میں غلط نہیں کرتا تو قابل)

پولیس میں کنسٹیبل تھے آپ جی بید دیکھتے کہ ہمارا دو چار ایڈیٹر صاحبان دیتا میں تشریف لاتے۔ سرکاری ہمان خانہ میں بیٹھتے۔ اچھے سے اچھا کھانا کھاتے۔ مٹریا دو گھنٹہ کی گاڑی ان کی سیر کے لئے موجود رہتی۔ دتیا کے بلوچے بڑے سرکاری ملازم اگر وزیر اعظم یا ہمارا ج سے ملنا چاہیں۔ تو پہلے کے راستہ میں دقتیں۔ مگر یہ ایڈیٹر صاحبان جب دیتا آتے۔ وزیر اعظم یا ہمارا ج نے فوراً ان سے ملاقات کی اور دو چار یا پانچ روز سرکاری ہمان رہنے کے بعد جب واپس جاتے تھے۔ تو ان کو پچاس یا سو دو سو روپیہ بطور رخصتہ دیا جاتا۔ شیر خاں صاحب نے سوچا کہ اس بارہ ہندو روپیہ ہمارا کی ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ ایڈیٹر کا پیشہ سب سے اچھا ہے جس کے خلاف چاہو گھو۔ ایڈیٹر صاحب کہلاؤ۔ ریاستوں کے دورے کرو۔ اچھا کھاؤ۔ رخصتہ دے دو۔ والیہان ریاست اور حکام سے ملاقاتیں سیناؤں کے پاس مفت۔ دعوتوں اور تقریروں میں شمولیت اور عزت و وقار۔ آپ نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور دنیا سے سولہ میل کے فاصلہ پر جھانسی تشریف لے آئے۔ سنٹریل انڈیا کے رہنے والے تھے۔ ہندی جانتے تھے۔ آپ نے ہندی زبان کے اخبار رنجیٹیک نام یاد نہیں رہا۔ اس اخبار کا نام غالباً ”ریاستی سنار“ یا ”ریاستی پر جا“ تمام گاڈیکریشن کلکٹر جھانسی کی عدالت میں داخل کر دیا۔ اور اخبار نکال دیا۔ اخبار نکالنے کے علاوہ آپ نے کھدرپن لیا جھانسی میں کانگریس قائم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی کانگریس میں باطل وہی پوزیشن تھی۔ جو پاکستان کے حق میں بیانات دینے والے کسی ہندو یا ہندوستان کی مکمل آزادی کے حق میں مضمون لکھنے والے ایک انگریز کی ہو سکتی تھی۔ جھانسی کے کانگریسوں نے بھی ان کے مسلمان ہونے کے باعث ان کا کانگریس میں آنا غنیمت سمجھا۔ چنانچہ آپ اب شیر خاں پولیس کنسٹیبل دتیا نہ تھے۔ بلکہ مسٹر شیر خاں ایڈیٹر ”ریاستی سنار“ دمبر کانگریس کمیٹی جھانسی تھے۔

مسٹر شیر خاں نے اختیار نکالنے کے بعد ریاستوں کے خلاف اور حق میں لکھنا شروع کیا۔ اور گوا اخبار ہفتہ وار تھا۔ مگر ایڈیٹر صاحب کو ریاستوں کے دورہ پر بھی جانا ہوتا۔ اس لئے اخبار کبھی کبھی لکھتا۔ آپ کا کام اچھا چل نکلا۔ تمام اخراجات نکالنے کے بعد آپ اس کاروبار میں اتنا بچا لیتے جتنی ایک سینئر گریڈ کے انسپکٹر پولیس کو تنخواہ ملتی ہے۔ یعنی ان کی آمدنی دتیا کی ملازمت سے کہیں زیادہ تھی۔

شیر خاں صاحب ریاستوں کا دورہ کرتے بیکانیر تشریف لے گئے۔ مرحوم ہمارا بیکانیر کا دور تھا۔ ہمارا بہت بڑے مطلق العنان جو سوائے انگریزوں کے دوسرے کسی شخص کو انسان ہی نہ سمجھیں۔ اور کھدر کے ہزاروں بغاوت کی فوجیں کیں۔ آپ جب بیکانیر پہنچے۔ اور پولیس نے ایک کھدر پوش کو گاندھی ٹوپی پہنے دیکھا۔ تو آپ کو بغیر کچھ دریافت یا تحقیقات کے گرفتار کر لیا گیا۔ اور حالات میں بند کر دیا گیا یعنی آپ ریاستوں کے دورہ میں بھی سرکاری ہمان ہو کرتے۔ اور اب بھی سرکاری ہمان۔ فرق صرف یہ کہ پہلے سرکاری گیسٹ ہوس میں مگر اب حالات میں احوالات میں بند کر دینے کے بعد پولیس نے حکام کو دبوڑنے کی۔ کہ ایک گاندھی ٹوپی والے کھدر پوش کو گرفتار کیا گیا ہے۔ جو اپنا نام شیر خاں اور اپنے آپ کو جھانسی کے کسی اخبار کا ایڈیٹر بتاتا ہے۔

یہ رپورٹ تحقیقات کے لئے جھانسی پولیس کے پاس گئی۔ وہاں سے دس بارہ روز میں جواب آیا۔ کہ شیر خاں معمولی اور بے ضرر آدمی ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ ریاستوں کا دورہ کر کے گاندھی ٹوپی اس کو نہ کوئی اہمیت حاصل ہے۔ اور ذیہ خطرناک آدمی ہے۔ اس جواب کے آنے کے بعد بیکانیر پولیس نے شیر خاں صاحب کو چھوڑ دیا۔ اور

زبانی حکم دیا۔ کہ فوراً ریاست بیکانیر سے چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ بیکانیر سے واپس دہلی تشریف لائے۔ یہاں سرائے احمدپانی میں ٹھہرے۔ اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد دوپہر کو دفتر ریاست میں پہنچے۔ تاکہ ریاست بیکانیر کے ظلم اور زیادتی کے خلاف ایجنیشن پیدا کی جائے۔ یہ بزرگ جب ایڈیٹر "ریاست" سے ملے۔ تو ایڈیٹر "ریاست" نے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہ بے وقوف کلاس کے سادہ لوح مگر اچھے آدمی ہیں۔ پانچ سات روزانہ کے ساتھ دلچسپی رہے۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ تفریق کا وقت گزارنے کے اعجاب سے معذور ہو گئے۔ تمام حالات سننے کے بعد آپ سے درخواست کی گئی کہ اس وقت تو کام زیادہ ہے۔ آپ شام کو تشریف لائیے۔ چائے بھی یہاں پیجئے۔ اور باتیں بھی کریں گے۔ اس زمانہ میں ان بھر کام کرنے کے بعد ایڈیٹر ریاست نے شام کا وقت تفریق کے لئے وقف کر رکھا تھا چائے پر دو تین دوست آگئے چائے کے بعد موٹر میں سینٹیا سیر کے لئے چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد دوستانہ کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور سو گئے۔

یعنی شام کو چھ بجے سے نو بجے رات تک گپ بازی اور سیر و تفریق ہوتی۔ شیر خاں صاحب شام کو چھ بجے تشریف لائے۔ تو اس وقت ایڈیٹر "ریاست" کے ایک دوست مسٹر محمد یوسف بیٹھے تھے۔ یوسف صاحب اس زمانہ میں قریب قریب ہر روز شام کو آیا کرتے۔ شیر خاں صاحب تشریف لائے۔ تو میں نے انٹروڈیوس کر آیا۔ مسٹر شیر خاں صاحب ایڈیٹر ریاستی سنسار" جھانسی اور میرے دوست مسٹر محمد یوسف شیر خاں صاحب بیٹھ گئے۔ چلنے آئی۔ چائے پی رہے تھے۔ تو باتیں شروع ہوئیں۔ مسٹر شیر خاں نے یوسف صاحب سے پوچھا۔ کہ آپ کہاں رہتے ہیں۔ اور کیا کام کرتے ہیں۔ مسٹر یوسف ابھی جواب نہ دے سکے تھے۔ تو میں نے شرارتاً بات کاٹ کر کہا۔ اودہ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں چورے طور پر تعارف نہ کرا سکا۔ بھول گیا۔ آپ کا نام خاں صاحب مسٹر محمد یوسف ہے۔ اور آپ دلی جہد جونا گڑھ کے پرائیویٹ سکریٹری ہیں۔ دلی جہد صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست ہیں۔ اور میٹلن ہوٹل میں دلی جہد صاحب کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ اور آپ مسٹر شیر خاں صاحب ہیں۔ جھانسی کے مشہور اخبار ریاستی سنسار" کے ایڈیٹر ہیں۔ جھانسی کانگریس کے لیڈر ہیں۔ اور آپ کا اخبار تمام سنٹرل انڈیا اور راجستھان میں بہت با اثر سمجھا جاتا ہے۔ اس اخبار میں ریاستوں کے متعلق ہی مضامین ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں آپ بیکانیر گئے تھے۔ وہاں سے واپس تشریف لائے ہیں۔ اور اب اپنے ہیڈ کوارٹر جھانسی تشریف لے جائیں گے۔ یوسف صاحب غیر معمولی ذہین آدمی ہیں۔ فوراً سمجھ گئے۔ کہ ان حضرت کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ تاکہ وقت تفریق بچا اچھا گزر جائے۔ آپ فوراً اٹھے۔ اور آپ نے شیر خاں صاحب سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور کہا۔ کہ آپ سے بل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ جب چائے پی چکے۔ تو شیر خاں صاحب نے ایڈیٹر ریاست" سے کان میں کہا۔ کہ ذرا دوسرے کمرے میں چلے۔ کچھ پرائیویٹ بات کرنی ہے۔ میں شیر خاں صاحب کے کمرے پر آمدم۔ تو آپ نے فرمایا۔

"خاں صاحب مسٹر یوسف آپ کے گہرے دوست ہیں۔ آپ کا اشارہ ہی کافی ہو گا۔ اگر آپ ان سے کہ دیں۔ تو یہ کچھ روپیہ مجھے دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس وقت میرے پاس صرف چھ روپیہ ہیں۔ میں جھانسی جاؤں گا۔ تو میرے پاس کوئی پیسہ نہ ہو گا۔ چائے کے بعد اخبار کا پرچہ نکالنے



جور و پیہ جھانسی سے لے کر چلا تھا۔ سفر میں تمام خرچ ہو گیا۔ بیکانیر سے ایک پیسہ نہ ملا۔ بلکہ تکلیف مفت کی ہوئی۔ آپ کا احسان ہوگا۔ اگر آپ ان سے کچھ روپیہ لے دیں گے۔ اور سفارش کریں گے۔“

میں نے جواب دیا۔

”شیر خاں صاحب۔ یہ ریاستوں کے لوگ بہت بے ایمان ہیں۔ شرافت کے ساتھ ایک پیسہ نہیں دیتے۔ ان سے طریقہ کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ دیکھئے۔ یہ میرے دوست ہیں میں ان کے خلاف کچھ لکھ نہیں سکتا۔ دلی عہد جو ناگرٹھ کے پرائیویٹ سیکریٹری ہیں۔ مگر دلی عہد کو طوائفوں کی چاٹ لگا رہے ہیں۔ پورے دلی عہد کو ایک طوائف کے ہاں لے گئے تھے۔ وہاں اڑھائی ہزار روپیہ اڑا دیا۔ مگر ایڈیٹروں کے لئے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ خیر دیکھئے سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں پوری کوشش کر دوں گا۔“

طوائف کے ہاں جانے کا نام سن کر یہ اُچھل پڑے اور کہا۔

”اُس طوائف کا کیا نام ہے۔ مجھے بتائیے۔ میں ایک پمفلٹ لکھتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ یہ کس طرح روپیہ نہیں دیتے۔ ان لوگوں کے پاس زندگی بازی کے لئے ہزار ہا روپیہ ہے۔ مگر اخبارات کے ایڈیٹروں کے لئے ایک پیسہ نہیں۔“

اس زمانہ چاؤڑی بازار کی طوائفوں میں ایک طوائف ہما کی بہت شہرت تھی۔ یہ خوبصورت بھی بہت تھی اور گاتی بھی اچھا تھی۔ اس لئے دلیان ریاست کے ہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ میں نے اسی کا نام لے دیا۔ اس کا لقب نضل، گنگا کے بعد ہم لوگ پھر کرہ کے اندر چلے آئے۔ یوسف صاحب گریٹ پنی رہے تھے جب ہم بیٹھ گئے۔ تو میں نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا۔ اور یوسف صاحب دجن کریں نے اب یوسف صاحب نہیں خاں صاحب کہنا شروع کیا) سے کہا۔

”خاں صاحب۔ مسٹر شیر خاں کا اخبار بہت با اثر ہے۔ ہندی زبان میں ہے۔ اور تمام سنسٹرل انڈیا۔

راجپوتانہ اور سی پنی میں پڑھا جاتا ہے۔ دیکھئے۔ آپ طوائفوں کے ہاں اتنا روپیہ برباد کرتے ہیں۔

پورے رات کو اڑھائی ہزار روپیہ ہا طوائف کے ہاں خرچ کر آئے۔ آپ مہربانی فرما کر دلی عہد سے

لکھئے کہ وہ شیر خاں صاحب کو بھی کچھ دیں۔ شیر خاں صاحب اپنے اخبار میں آپ کی ریاست کی

تعریف کریں گے۔ دلی عہد اور آپ کا فوٹو چھاپ دیں گے۔ اور یہ ہمیشہ آپ کا پراپا گندہ کریں گے۔“

مسٹر یوسف ایسے ڈراموں میں پارٹ کرنا خوب جانتے ہیں۔ آپ نے میری بات سن کر جواب دیا۔

”ہم اردو اور ہندی اخبارات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ان اخبارات کی قیمت ہی کیا ہے۔ یہ خلاف لکھیں

تو ہمیں پروا نہیں۔ حق میں لکھیں تو ہم خیال نہیں کرتے۔ ہم تو ان ایسے چھوٹے چھوٹے اخبارات کو گداگر

سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ناگرٹھ میں اگر اثر ہے۔ تو ممبئی کے ”ٹائمز آف انڈیا“ یا ”اسٹریٹ ویکی“

کا اور کچھ حقوڑا بہت ”مبئی کرانیکل“ کا۔ جھانسی کے اخبارات کی کیا حیثیت ہے۔ میں دلی عہد

صاحب بہادر سے سفارش نہیں کر سکتا۔“

مسٹر یوسف کے منہ سے جھانسی کے اخبارات کی توہین کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ شیر خاں صاحب جوش میں آگئے اور آپ نے ذرا زیادہ بلند آواز سے کہا۔

”میں ایڈیٹروں کی توہین نہیں کر سکتا۔ آپ لوگ دایبان ریاست کو بد معاشی سکھاتے ہیں۔ آپ نے دہلی کے چادڑی بازار میں ہزار روپے ناجائز صرت کئے۔ یہ روپیہ ریاستوں کی پبلک کا تھا۔ آپ کو کوئی حق چل نہ تھا کہ روپیہ اس طرح برباد کرتے۔ میں اپنے اخبار میں تو پھر لکھوں گا۔ آپ کو کل ہی بتاؤں گا کہ آپ دہلی میں کیا کر رہے ہیں۔ میں ابھی ایک پمفلٹ لکھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایڈیٹروں کے قلم میں کتنا زور ہے۔ میں نے ہمارا جہ کو الیاء کر سیدھا کر دیا۔ ہمارا جہ دیتا میرے اخبار سے خوف کھاتے ہیں۔ آپ کی حیثیت ہی کیا ہے۔“

شیر خاں صاحب کے اس غصہ کو دیکھ کر میں اور یوسف صاحب بعد مشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ اور اس ڈراما کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے میں نے کہا۔ میری پوزیشن سیدنا زک ہے۔ خاں صاحب آپ بھی میرے دوست ہیں۔ اور شیر خاں صاحب آپ بھی میری برادری کے جڑ ملٹ ہیں۔ میرے مکان پر آپ لوگوں کا جھگڑا ہونا مناسب نہیں۔ خدا کے لئے یہاں تو توہین میں نہ کیجئے۔ بہتر تو یہ ہے۔ خاں صاحب آپ شیر خاں صاحب کی روپیہ سے امداد کیجئے۔ یہ جڑ ملٹ ہیں۔ آپ کی ہمیشہ تعریف کریں گے۔ ان کا اخبار بہت با اثر ہے۔ اور یو۔ پی۔ کی کانگریس کے لیڈر بھی ہیں۔ آپ کے لئے مفید ہوں گے۔ مسٹر یوسف نے پھر دہی کہنا شروع کیا۔ کہ آپ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں سے طوائفیں اچھی ہیں۔ طوائفوں میں کچھ تو کیر کیڑے ہیں۔ مگر آدو دہندی اخبارات کے ایڈیٹر تو انسانی کیر کیڑے بھی محرم ہیں۔ آج حق میں کہتے ہیں۔ توکل خلافت۔ پرسوں پھر حق میں لکھتے ہیں۔ تو اگلے روز پھر خلافت۔ جب کافی دیر جھگڑا ہوتا رہا۔ تو میں نے کہا کہ اچھا آج تو اس میٹنگ کو ختم کیا جائے۔ کل شام کو فیصلہ کریں گے۔ میں نے یوسف صاحب اور شیر خاں صاحب دونوں سے درخواست کی۔ کہ کل شام کو پھر جائے۔ پر تشریف لائے تاکہ ٹھنڈے دل کے ساتھ بات چیت کی جاسکے۔

شیر خاں صاحب تو سرائے احمد پائی میں چلے گئے۔ میں اور یوسف صاحب موٹر میں سیر کے لئے نئی دہلی گئے۔ راستہ میں شیر خاں صاحب کی بڑی قوی کا ہی ذکر رہا۔ کیونکہ جو ناگڑھ کے دلی عہد پالے تو ابھی نابالغ بچے تھے۔ اور شاید کسی سکیل میں پڑھتے ہوں گے۔ اور یوسف صاحب کا جو ناگڑھ سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر ایڈیٹر صاحب یاسی سنس“ پمفلٹ اور اخبار میں لکھنے کے لئے آستینیں چڑھا رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو شیر خاں صاحب اور یوسف صاحب چائے پر پھر تشریف لائے۔ شیر خاں صاحب نے مجھے کمرہ سے باہر لے جا کر بتایا کہ وہ تمام رات جاگتے رہے۔ رات رات میں آپ نے دلی عہد جو ناگڑھ کے خلافت ہندی میں ایک پمفلٹ لکھا۔ یہ پمفلٹ صبح ختم ہوا۔ تو یہ ایک پریس میں گئے۔ وہاں دو دو پیہ پیہنگی دے کر اس پمفلٹ کو کمپوز کرنے دے آئے ہیں۔ دو دن میں پروف ہل سکے گا۔ ان سے بات کرنے کے بعد میں اور شیر خاں کمرہ کے اندر آئے۔ چائے لائی گئی۔ اور باتیں شروع ہوئیں۔ تو میں نے یوسف صاحب سے پوچھا۔ فرمائیے۔ دلی عہد صاحب اچھے ہیں۔ کیا پروگرام رہا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا۔ ہاں اچھے ہیں۔ رات کو سینما گئے تھے۔ ہمارا جہ ٹیالہ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں ڈرن تھا۔ وہاں رقص کی محفل گرم تھی۔ نصف درجن کے قریب طوائفیں تھیں۔

رات کو چاراجہ پٹیل کے ہاں ہی ایک بچ گیا۔ آج جوہری آئے ہوئے تھے۔ اڑھائی لاکھ روپیہ کے قریب قیمت کے جو اجرات خریدے ہیں۔ دلی عہد صاحب کو کچھ کمزوری کی شکایت ہے۔ حکیم محمد احمد خاں صاحب تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بمقامی ماہ ادویات دی ہیں۔ دو ہزار روپیہ تو حکیم صاحب کو فیس کا دیا۔ اور ڈیڑھ ہزار روپیہ کا منہ تیار ہو گا۔ اس میں سونا۔ موتی اور جواہرات ڈالے جائیں گے۔ دلی عہد صاحب کے ساتھ ان کی بیوی بھی ہیں۔ ان کے لئے کپڑا خریدا گیا۔ لیلارام کی دوکان کابل بائیس ہزار روپیہ کا تھا۔ ایک ایک ساڑھی کا دو ہزار روپیہ لگایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

جوں جوں یوسف صاحب اخراجات بتا رہے تھے بشیر خاں صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ جب یوسف صاحب پچھلے دن کی تمام کارگزاری "بتا چکے تو میں نے یوسف صاحب سے کہا کہ آپ اتنا روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ آپ کے پاس اخبارات کے ایڈیٹروں کے لئے کچھ نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے مکان پر آپ لوگوں کا تعارف ہوا۔ آپ ہیں کہ شیر خاں صاحب کے لئے آپ کے جیب میں کچھ نہیں۔ اور اُدھر بشیر خاں صاحب ہیں کہ آپ نے رات بھر جاگ کر آپ کے دلی عہد کے خلاف پمفلٹ لکھا۔ جو پریس میں چھپنے کے لئے دے دیا گیا ہے۔ اگر یہ پمفلٹ چھپ گیا۔ تو کتنی بڑائی کی بات ہوگی۔ ذاب صاحب جو ناگڑے میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ کہ میں نے تعارف کر لیا تھا۔ میری سبھو میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میری پریشانی بے حد نازک ہے۔

یوسف صاحب نے کچھ تیز ہو کر کہا کہ ایک بار نہیں ہزار بار پمفلٹ چھپیں۔ ہم پروا نہیں کرتے۔ اگر پمفلٹ چھپا۔ تو ٹیکسل ڈیپارٹمنٹ کی معرفت اس کو ضبط کرایا جائے گا۔ اور پمفلٹ لکھنے والے کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ ذاب صاحب یہاں پر ناگڑے کا ٹیکسل ڈیپارٹمنٹ پر بہت کافی اثر ہے۔ چائے پی جا رہی تھی۔ یوسف صاحب قیرمی سے جواب دیتے تھے۔ بشیر خاں صاحب غصہ میں آنکھیں مٹخ گئے اپنے چہرہ سے اہتمام لے کر اور سیدھا کر دینے کا اظہار کر رہے تھے۔ اور میں اپنی جہتی کو سختی کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر دونوں کو خاموش رہنے اور ٹھنڈے دل سے بات چیت کرنے کی درخواست کرتا تھا۔ آخر بہت کوشش کے بعد جب فضا کچھ پرسکون ہوئی۔ تو یوسف صاحب

نے دریافت کیا کہ شیر خاں صاحب کتنا روپیہ چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ آپ جانتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ آپ خود ہی آپس میں فیصلہ کر لیجئے۔ اس پر بشیر خاں صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں جو فیصلہ کروں۔ ان کو منظور ہوگا۔ میں نے جواب دیا۔ میں اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ میرے انکار کرنے پر شیر خاں صاحب پھر مجھے باہر لے گئے۔ اور پوچھا کہ کتنا روپیہ کہا جائے میں نے پہلے تو دخل نہ دینے کا بہانہ کرتے ہوئے انکار کیا۔ مگر جب انھوں نے پھر بھی میری رائے پوچھی تو میں نے کہا کہ کچھ ہزار روپیہ طلب کرو۔ تو یہ پانچ ہزار تک آئیں گے۔ اور میں ان سے کہوں گا کہ پانچ ہزار دے دیں۔ شیر خاں صاحب بہت خوش ہوئے ان کو سو سو روپیہ کے پچاس نوٹ نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ پھر اندر آئے۔ تو میں نے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ شیر خاں صاحب اس شرط پر پمفلٹ نہ لکھیں گے۔ اگر ان کو پچیس ہزار روپیہ دیا جائے پچیس ہزار کا نام سن کر یوسف صاحب پھر تیز ہوئے اور کہا کہ کیا کٹر پریس کی قیمت پچیس ہزار روپیہ ہو سکتی ہے۔ جو ناگڑے میں خود جنوی ایسے ایڈیٹر تھے کہ پچیس ہزار روپیہ دے دیں۔ ان کو پچاس یا زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دیا جاتا ہے تو آپ شیر خاں صاحب کو بطور شیرازہ زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

شیر خاں صاحب پانچ ہزار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پچاس روپیہ اور خیرات سن کر پھر تیز ہوئے۔ اُدھر یوسف صاحب نے بھی تیزی دکھائی۔ میں دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ کہ خدا کے لئے میرے مکان پر تو تو میں میں نہ کرو۔ میری پوزیشن بہت نازک ہے چنانچہ یہ شام بھی ان کے آپس میں جھگڑنے اور میرے صلح کی کوشش میں صرف ہوئی۔ اور دو گھنٹہ کے بعد یہ ڈرامہ یہ کہہ کر ختم ہوا کہ اگلے روز شام کو پھر رات چیت کی جائے۔ سٹر شیر خاں اپنی سرائے میں تشریف لے گئے۔ اور میں یوسف صاحب کے ساتھ موٹر میں سیر کر چلا گیا۔

اگلے روز شام کو شیر خاں صاحب پھر تشریف لائے۔ پمفلٹ کا پروف ان کے پاس تھا۔ یوسف صاحب ابھی نہ آئے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے باتیں ہوئیں۔ تو میں نے ان کو ناکہ کی۔ کہ بچپن ہزار روپیہ ہی ملے گی اور اس پر اڑے رہیں۔ تو خاں صاحب پانچ ہزار تک آئیں گے۔ اور پمفلٹ دیکھ کر ان کے حواس اُڑ جائیں گے شیر خاں صاحب میری تجویز پر بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی آگئے۔ چائے منگائی گئی۔ چائے پیتے ہوئے پھر باتیں شروع ہوئیں۔ تو میں نے اپنی ہنسی کو بہت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ کیا عرض کیا جائے۔ مجھے ایسی مشکل کے ساتھ زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ بہت پریشان ہوں۔ شیر خاں صاحب ہیں۔ کہ ان کے پمفلٹ کا پروف بھی نیا ہو گیا۔ اور یہ چھپنے کے لئے پریس میں کاغذ دے آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے شیر خاں صاحب سے کہا کہ وہ پروف تو دکھائیے۔

شیر خاں صاحب نے فخر و صلہ اور فاتحانہ انداز میں اپنے جیب میں سے پروف نکالا۔ یوسف صاحب بھی بہت مشکل کے ساتھ اپنی ہنسی ضبط کر کے۔ اور پروف کو دیکھ کر نفرت و حقارت کے ساتھ کہا۔ کہ وہ ایسے پمفلٹ کی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ پھر وہی پہلے اور دوسرے دن والا منظر تو تو میں میں تیزی۔ ایک دوسرے پر الزامات اُدھر بچپن ہزار کا مطالبہ۔ اُدھر پچاس روپیہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ۔ میں دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ اور یوسف صاحب سے رقم بڑھانے کی منتیں کر رہا ہوں۔ آخر یوسف صاحب صبر و تحمل میری سفارش پانچ سو روپیہ تک پہنچے۔ شیر خاں صاحب بار بار مجھے کمرہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ اور مشورہ لیتے ہیں۔ کہ پانچ سو روپیہ قبول کر لیں یا نہیں۔ میں نے اپنی ہنسی کو بہت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔ کہ بچپن ہزار سے کم پر بات نہ کیجئے۔ پمفلٹ کو دیکھ کر ان کا اندر سے تو پیناب خطا ہو رہا ہے۔ صرف ظاہر طور پر حوصلہ دکھا رہے ہیں۔ ہم لوگ پھر اندر آئے۔ پھر جھگڑا شروع ہوا۔ وہی تو تو میں میں یوسف صاحب کہتے ہیں کہ وہ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ شیر خاں صاحب سیدھا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں دونوں کی خوشامد کرنا ہوں۔ اور اپنی نازک پوزیشن بیان کرتے ہوئے درخواستوں پر درخواستیں کرتا ہوں کہ دو سانس مصالحت کیجئے۔ یہ شام بھی مدی طرح پُر لطف صحبت میں بسر ہوئی۔ اور پھر اگلے روز بات چیت کرنے کا فیصلہ ہوا۔

چار پانچ روز یہی کیفیت رہی۔ تو آخر یوسف صاحب نے ایک پیسہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ کہہ لو جو کرنا ہو۔ اور بہت غصہ میں کہا۔ کہ وہ اس تمام واقعہ کی اطلاع پولیس اور پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کو دیں گے۔ یوسف صاحب کے اس کہنے پر شیر خاں صاحب بہت نرم ہوئے۔ آخر مجھے پھر ہار لے گئے۔ اور کہا کہ اچھا پانچ سو روپیہ ہی دلو اور۔ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وہ میری ہنسی کو دیکھ کر حیران و حیران رہ گیا ہے۔

ہم لوگ اندر آئے۔ میری ہنسی کو دیکھ کر یوسف صاحب بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ شیر خاں صاحب جبران کو معاملہ کیا ہے۔ جو دونوں ہنس رہے ہیں جب ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور آپ نے بار بار ہنسی کا سبب پوچھا۔ تو آخر ان کو اصل واقعہ بتایا۔ کہ نہ تو یوسف صاحب دلی عہد و نگرہ کے پرائیویٹ سیکریٹری ہیں۔ نہ دلی عہد دہلی میں ہیں۔ وہ بجائے نابالغ بچے ہیں کسی سکول میں پڑھتے ہیں صرف تفریح کے لئے یہ ڈراما کیلایا گیا شیر خاں صاحب کو ایک تو پانچ ہزار یا پانچ سو روپیہ کے لئے کا مقدمہ اور دوسرے اپنی بیوقوفی کی مذمت۔ میں نے ان کی اس کیفیت پر پردہ ڈالنے کے لئے موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ لطافت سناتے جب فضا کچھ بدل گئی۔ تو شیر خاں صاحب نے فرمایا کہ جب وہ دہلی تشریف لائے تھے تو ان کے پاس چھ روپیہ موجود تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ وہ چھ روپیہ میں جھانسی پہنچ جائیں گے۔ اس چھ روپیہ کی رقم میں سے دو روپیہ نوپریس والوں کو کمپوزنگ کے لئے پیشگی دے دیئے۔ باقی چار روپیہ کھانے پر صرف ہو گئے۔ اب ان کے پاس نہ تو سرائے والے کو دینے کے لئے کچھ ہے۔ اور نہ جھانسی پہنچنے کے لئے کرایہ۔ چنانچہ ان کو آٹھ روپیہ زریعے ملے۔ تو وہ سرائے کا حساب صاف کر کے جھانسی پہنچے۔ اس ڈراما میں میرا خیال ہے۔ کہ ہم دونوں بلکہ تینوں یوسف صاحب بھی اگکھاٹے میں نہ رہے۔ شیر خاں صاحب پانچ روز تک ہزار مار روپیہ کے خیال سے خوش ہوتے رہے۔ میں نے صرف آٹھ روپیہ صرف کر کے پانچ روز ایسی تفریح حاصل کی جو ہزار روپیہ صرف کرنے پر بھی میسر ہونی ممکن نہیں۔ اور جو اب تک ناقابل فراموش ہے۔ اور یوسف صاحب مفت میں مرنے لیتے رہے۔ شیر خاں صاحب کا اس کے بن رکھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔ عرصہ ہوا۔ شننا تھا کہ آپ نے ہمارا جگر الیار اور ریاست گوالیار کے ایک سیٹھ کے خلاف کئی مضامین لکھے۔ اس سیٹھ سے بات چیت ہو رہی تھی کہ آپ ریاست گوالیار میں مزید گفت و شنید کے لئے چلے گئے۔ ریاست گوالیار کی پولیس آپ کے خلاف تھی۔ اس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ سیٹھ صاحب نے توہین کا مقدمہ چلایا۔ آپ دو سال کے لئے بنجر موئے اور گوالیار جیل میں رہے۔

## اخبار نویس ہوئے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخبار نویسوں کی زندگی قابل رشک ہے۔ اور دنیا ان کے لئے آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی پارٹی جلسہ یا میٹنگ ہو۔ تو اخبار نویسوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ اور ان کو عزت و احترام کے ساتھ قریب بٹھایا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ اپنے اخبار میں اس پارٹی یا جلسہ کی تعریف کریں۔ اور تقاضا پر چھاپیں۔ اور سینما کے پاس بھی مفت دیئے جاتے ہیں۔ مگر ذیل کے واقعات سے اندازہ ہو سکے گا کہ اخبار نویس اکثر ایک ہزار کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ اخبار نویس کو صاف کر۔ بے لاگ۔ بندر اور خطرہ برداشت کرنے والا بنینا پڑا۔

ایڈیٹر ”ریاست“ جلی نوٹوں کے الزام میں لاہور سنٹرل جیل میں بھیجا گیا۔ تو جیل میں داخل ہونے کے بعد اسے سب سے پہلے جیل کے دفتر میں لایا گیا۔ تاکہ نام۔ پتہ اور حلیہ وغیرہ لکھا جائے۔ جیل کے ایک مسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے نام وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ وہ پولیس سے آئے ہوئے میرے وارنٹوں کو

بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اور نام، دلریت اور سکونت وغیرہ بھی پوچھتا جاتا تھا۔ جب وہ تعزیرات ہنسکی لگا کی گئی  
 و نقد والے خانہ پر پہنچا۔ تو اس خانہ میں چار دفعت تھیں۔ نوٹ بنانے کا سامان رکھنا۔ نوٹ بنانا۔ نوٹ چلا  
 اور نوٹ قبضہ میں رکھنا۔ اس سسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو کچھ ہتہ نہ تھا۔ کہ میں کون ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ  
 اس نے کبھی اخبارات بھی نہیں پڑھے۔ کیونکہ اخبارات پڑھنا۔ تو اس کو مقدمہ کی کیفیت کا علم ہوتا۔ مقدمہ  
 کی تفصیلات اخبارات میں چھپتی رہی تھیں۔ جب اس نے یہ دفعت دیکھیں۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے  
 طنز اُکھا۔ ”ادھر آپ کا رسی نوٹ بنانے کے جرم میں تشریف لائے ہیں۔ سنا ہے سردار جی کتنے نوٹ آپ نے  
 بنائے۔“ میں اس کجنت کو کیا جواب دیتا۔ اور اگر کچھ کہتا بھی تو یہ میرا اعتبار کیوں کرتا۔ میں نے مسکراتے ہوئے  
 جواب دیا۔ ”اگر بنائے ہیں۔ تو دو چار دس روپیہ کی مالیت کے نہ بنائے ہوں گے۔ یقیناً لاکھوں روپیہ کے بنائے  
 ہوں گے۔ جو بنانا ہے۔ لاکھوں روپیہ کے بنانا ہے۔“ میرا یہ جواب سن کر میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شرمندہ ہوا یا جلی  
 بہر حال یہ میرے منہ کی طرف دیکھتے لگا۔ کیونکہ اس کو توقع یہ تھی کہ دوسرے تمام کمروں کی طرح میں بھی اس سے  
 کہتا۔ ”نہیں حضور میں نے کہاں بنائے ہیں۔ مجھے دیے ہی رشتہ دار دل نے بھنایا ہے وغیرہ۔“ وہ میرے چہرہ  
 کی طرف غور اور حیرانی کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں جبل کے ایک دوسرے افسر آگئے۔ جن سے میں پہلے  
 مل چکا تھا۔ اور جو میرے تمام حالات سے واقف تھے۔ یہ آئے تو انھوں نے جبریزی۔ انوس۔ اخلاص اور محبت  
 کے مجوسی جذبات کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور کہا۔ ”میں نے اخبارات میں آپ کے مقدمہ کے فیصلہ کے متعلق  
 پڑھا تھا۔ مجھے بہت ہی انوس ہوا۔“ اس افسر کا تپاک اور ہمدردی سے لہنا تھا کہ علیہ لکھنے والے سسٹنٹ  
 سپرنٹنڈنٹ کچھ حیران سا ہو گیا۔ آپ نے دوسرے افسر سے پوچھا کہ یہ کیوں ہیں۔ تو اس افسر نے کہا۔ ”آپ کو  
 ظلم نہیں۔ آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ”نیاسنٹا“ ہیں۔ جن کے مقدمہ کا تمام ہندوستان میں چرچا ہے۔“  
 یہ سن کر علیہ لکھنے والے سسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے بھی کچھ ہمدردی اور افسیں بکھانچا کر گیا۔

اس مقدمہ سے پہلے میں ہمیشہ خیل میں لے کر اس میں لکھا جاتا رہا۔ مگر اس مقدمہ میں محبٹریت دیوان  
 سکھانے نے مجھے بی کلاس دی رہی محبٹریت سلطان کے رہنے والے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی دیوان شرر  
 ڈراما نویس میرے کئی برس کے دوست تھے۔ اور مقدمہ کے دوران میں بھی دلی جی دوسرے چوتھے روز اکثر ملا  
 کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ پُر لطف ہے کہ ہائیکورٹ نے جب اس مقدمہ میں مجھے بری کیا۔ اور ہائی کورٹ  
 نے بحث سُننے کے بعد عدالت میں دیوان سکھانہ کے ”انصاف“ کی بھی وجہیاں اٹھائیں۔ تو  
 ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد دیوان سکھانہ نے جب کہ آپ کس کی چھٹیوں میں لاہور تشریف لائے ہوئے  
 تھے۔ تو میرے ایک عزیز دوست کو جو پنجاب میں سب جج تھے۔ میری باعزت دہائی پر رہا لکھا دی (نام اور  
 علیہ وغیرہ لکھنے کے بعد مجھے بی کلاس کے انچارج کے سپرد کیا گیا۔ دے لے اور بی کلاس میں فرق صرف یہ ہے کہ  
 اسے کلاس میں تیری جیسے کپڑے چاہے اپنی مرضی کے مطابق پہن سکتا ہے۔ مگر بی کلاس میں کپڑے چاہے اپنے  
 گھر سے پہنائے جائیں۔ سفید کھد کے ہونے چاہئیں (بی کلاس کے ہارڈ میں پہن کر میرے لئے چار ہائی۔  
 تپائی اور انارسی وغیرہ کا انتظام کیا گیا جو بی کلاس کے ہر قیدی کو دی جاتی ہے۔  
 جیل میں پہننے کے بعد دو یا تین روز ہونے تھے۔ کہ میری ڈیوٹی سپرنٹنڈنٹ نے جیل کے بریس میں لگائی۔

رجیل میں ہر قیدی کو بشرطیکہ قید محض نہ ہو۔ یا نظر بندی نہ ہو۔ کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام اس کی پوزیشن کے مطابق دیا جاتا ہے) میں پر ہیں، انچارج کے پاس بھیجا گیا۔ پریس کے انچارج نے میری ڈیوٹی بطور کلرک ایک سیکشن میں لگائی۔ جہاں کہ ہوا ریلوں کے دفتر کے فارم چھپتے ہیں۔ میرے جیل میں جانے کے بعد وہ دن کے اندر تمام سرکاری ملازموں اور قیدیوں کو میرے جیل میں پہنچنے کا حکم ہو چکا تھا۔ میں جب اس سیکشن میں پہنچا۔ تو اس سیکشن کے انچارج (جو سرکاری ملازم تھے۔ ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ لوگ ان کو شاہ جی کہتے تھے) نے میرے لئے ایک چھوٹا سا بیغ خلا کر دیا۔ اس پر بوریا اور ایک چادر بچھوا دی۔ اور کہا کہ تشریف رکھئے۔ کئی گھنٹوں میں وہاں بیٹھا رہا۔ تو میں نے عرض کیا کہ کوئی کام بتائیے۔ اس کے جواب میں شاہ جی نے فرمایا: "میں کوئی کام نہیں دے سکتا۔ آپ آرام کیجئے۔" یہ تمام دن میرا اس طرح بیٹھے گزار گیا۔ اگلے روز گیا۔ تو پھر وہی کیفیت۔ شاہ صاحب بہت تپاک سے ملتے۔ بہت خاطر کرتے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دن میں کئی بار پانی کے لئے پوچھتے۔ گرمیوں میں کہتا۔ تو میرے لئے برت کا پانی منگایا جاتا۔ کوئی کام نہیں۔ دن بھر اس گندی دار بیغ پر بیٹھا رہتا۔ میں تنگ آ گیا کہ وقت کس طرح گزرے۔ آخر قید میرے روز جب میں اس پریس میں کلرک کی کرنے کے لئے گیا۔ تو ساتھ ایک کتاب لے گیا۔ دن بھر یہ کتاب پڑھتا رہا۔ وہاں کے تمام لوگ مصروف۔ ایک لمحہ کے لئے آرام نہیں۔ مگر میں اس گندی دار بیغ پر ہنٹ بنا بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوں۔ تین چار روز گزرے تو میں نے ایک دوسرے قیدی کو جو اس سیکشن میں کام کرتا تھا۔ راز میں لے لیا۔ اور پوچھا کہ یہ شاہ صاحب مجھے کوئی کام کیوں نہیں بتاتے۔ میں نے بڑے شریفانہ۔ میری آسائش کا بہت خیال کرتے ہیں۔ بار بار ٹھنڈے پانی کے لئے پوچھتے ہیں۔ بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ اور مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مجھے کوئی کام کیوں نہیں بتایا جاتا۔ میرے اس پوچھنے پر اس قیدی نے بتایا۔

"شاہ صاحب آپ کو بہت بڑا خطرناک آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ آپ کو یہاں کے حالات کا حکم ہو گیا۔ اور آپ جیل سے چلے گئے۔ تو اپنے اخبار میں ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کریں گے۔ اور پھر شاہ جی یہ موقف ہو جائیں۔ اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ آپ کو یہاں کے کسی راز کا حکم ہو۔ اور یہ اس کو شش میں ہیں کہ آپ کو کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کیا جائے۔"

یہ جواب سن کر میں حیران کر کیا کروں۔ شاہ صاحب سے کچھ کہ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس قیدی نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے شاہ صاحب کے خیال سے آگاہ کیا۔ کتاب کہاں تک تمام دن پڑھتا رہوں۔ بغیر کام کے وقت اگر نا مصیبت۔ اور جب شاہ صاحب سے کام کے لئے کہتا ہوں۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ "تشریف رکھئے۔ رام کیجئے۔ کیا پاس تو نہیں لگی۔"

ایک ہفتہ کے قریب اس سیکشن میں گزرا ہوگا کہ شاہ صاحب نے پریس کے انچارج کو کاغذ نفل پورٹ کی جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ دیوان سنگھ اس کے سیکشن میں فالتو ہے۔ کام بھڑا ہے۔ اور آدمی زیادہ ہیں۔ اس لئے دیوان سنگھ کو کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کیا جائے۔ اس کاغذ نفل پورٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ صاحب کے پاس حکم پہنچا۔ دیوان سنگھ کو دوسرے سیکشن میں (جہاں انگریزی کے

فارم چھپتے تھے، بھیج دیا جائے۔ چنانچہ میں دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ اس سیکشن میں پہنچا تو وہاں بھی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ ایک چھوٹی سی بیچ پر اسی طرح سے گدی بچھا دی گئی۔ اور ارشاد ہوا کہ آرام کرو۔ میں اس ”آرام“ سے تنگ ہوں۔ مگر کوئی کام نہیں بتایا جاتا۔ تمام دن کتاب پڑھتے پڑھتے تنگ آگیا۔ جب کام کے لئے کہتا ہوں تو دی ارشاد ہوتا ہے: ”آرام کیجئے۔ کوئی کام نہیں۔“ آپ تو بہت اچھے اور لائق ہیں۔ آپ سے تو کام کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ گری ہے۔ پانی نہیں گئے۔ پیاس تو نہیں لگی، میں اس خاطر تواضع سے تنگ آگیا۔ بغیر کام وقت نہیں گزرتا۔ اور جب کام کے لئے کہتا ہوں۔ تو انچارج صاحب مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ اور میری دلچسپی کے لئے دوسری باتیں شروع کر دی جاتی ہیں۔

دس روز کے قریب میں اس سیکشن میں بھی جاتا رہا۔ اس عرصہ کے بعد اس سیکشن کے انچارج نے بھی رپورٹ کی۔ کہ اس کے سیکشن میں کام کم ہے۔ اور آدمی زیادہ ہیں نئے آدمی یعنی دیوان سنگھ کو کسی دوسرے سیکشن میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ان کی رپورٹ پر میں جلد سازوں کے سیکشن میں تبدیل کیا گیا۔ جس روز مجھے اس سیکشن سے دوسرے سیکشن میں تبدیل کئے جانے کا حکم ہوا تو جمعہ تھا۔ اس جمعہ کو میں صبح ہی جلد سازوں کے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی میری بہت خاطر تواضع کی گئی۔ انچارج صاحب نے بجلی کے نیچے میرے لئے گدی دار بنچ بچھوادی کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جب بیٹھا۔ تو میں نے عرض کیا فرمائیے۔ کیا کام کروں۔ اس کے جواب میں سیکشن کے انچارج صاحب نے فرمایا۔

”میرے دل میں آپ کے لئے بڑی عزت ہے۔ آپ نے تو ملک کے لئے بہت تکلیفیں برداشت کیں اور زندگی بھر مصائب کا مقابلہ کیا۔ آپ کا تو نیاز حاصل کرنا ہی خوش نصیبی ہے۔ آپ آرام کیجئے۔ اگر فرمائیے۔ تو پڑھنے کے لئے میں آپ کو اور کتابیں دوں۔ کیا ٹھنڈا پانی پیجئے گا۔“ یہ انچارج بھی مسلمان تھے۔ پریس میں مسلمان انصروں کو دہ بجے کے قریب جمعہ کی نماز کے لئے چھٹی ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد وہ واپس دفتر میں نہیں آتے یعنی اس روز ان کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے۔ دہ بجے کے قریب یہ صاحب آداب عرض کہ کر نماز کے لئے چلے گئے۔ اور آپ نے فرمایا کہ اب تو کل نیاز حاصل ہو گا۔ سپر کور میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ میں پریس میں نہیں گیا۔ اتوار کو پریس بند تھا۔ پیر یعنی سوموار کو سپرنٹنڈنٹ جیل تمام قیدیوں کو دیکھنے کے لئے ہر دارو میں آتے ہیں۔ اور ہر قیدی کے پاس جاتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی تکلیف یا شکایت ہو۔ تو بتائی جائے سپرنٹنڈنٹ کے اس دورہ کو پریٹر کہا جاتا ہے۔ سوموار کو صبح سپرنٹنڈنٹ جیل سیر شاہ دیہ بزرگ بہت شریف۔ دیانتدار۔ نیک اور مذہبی خیال کے بزرگ تھے۔ قادیان کی احمدی جماعت کے پیشوا کے عزیزوں میں سے تھے۔ قیدیوں کے بہت ہمدرد تھے۔ مگر ان کی دماغی کیفیت کچھ ایسی تھی جسے دماغ بیکل کہا جاسکتا ہے۔ یعنی خیال آجائے۔ توقیدی کے لئے سب کچھ کر دیں۔ اور خیال نہ آئے۔ تو قیدی کی کسی خواہش کی پروا نہ کریں۔ یہ ہمیشہ میرے احساس کا خیال کرتے رہے۔ ”پریٹر“ میں تشریف لائے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ پریس کی بجائے اگر میری ڈیوٹی کسی اور جگہ لگا دی جائے۔ تو اچھا ہو۔ سیر شاہ نے فوراً حکم دیا کہ میں اپنی رہائش دالی جگہ پر ہی رہوں اور جگہ دینا ہر یہاں ہی دے دیا جائے۔

میں سوموار کو پریس میں نہ گیا۔ اور اپنی رہائش والے دارو میں ہی رہا۔ مگر پریس کے دوسرے لوگوں سے



معلوم ہوا کہ سوداگر کو جب جلد سازی والے سیکشن کے انچارج نے سنا کہ میں اب پریس سے تبدیل کر دیا گیا ہوں۔ تو اپنے ماتحت سے کہا:-

”خدا کا شکریہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب ریاست پریس سے چلے گئے۔ میں نے جمعہ کے روز نماز کے بعد دُعا کی تھی کہ یا اللہ ایڈیٹر ریاست“ کو کسی دوسرے سیکشن میں بھیجا جائے مجھے خطرہ تھا کہ اگر یہ یہاں کے تمام رازوں سے واقف ہو جاتا۔ تو نہ معلوم میرے لئے کیا مصائب پیدا ہوتیں۔ کیونکہ یہ شخص جس کے پیچھے پڑ جائے۔ نہ صرف موقوف بلکہ قید کر لئے تک جاتا ہے۔ اور کئی بڑے سرکاری افسروں کے لئے معصیت کا باعث ثابت ہو چکا ہے“

پریس سے آنے کے بعد میں کئی ماہ چیل میں رہا۔ وہاں میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ کاغذات میں میرے ذمہ کام یہ تھا کہ میں کاغذ منتقلی کرنے والے ٹیک تیار کروں۔ بطور آرٹ اور تقریر کے میں نے یہ کام سیکھ لیا تھا۔ اور بہت اچھے ٹیک بنالیتا تھا۔ مگر کام دینے والا شخص جیسا کام لانا تھا۔ دیا ہی بغیر گئے اٹھالے جاتا تھا۔ مگر کاغذات میں درج ہوتا تھا کہ میں نے بارہ سو ٹیک تیار کیے۔ چیل والوں کی اس ”مہربانی“ کو گواہی دل سے ناپسند کرتا رہا۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے ہوا سمجھتے ہوئے مجھ سے کام نہ لینے، نہ مگر میں پھر بھی ان کی اس مہربانی کا شکر گزار ہوں۔

## جر تلزم کار و شن پہلو

میرے چچا سردار میوہ سنگھ کھنہ کے داماد لالہ ہنسراج ہیں۔ یہ گوجرانوالہ میں لوہے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے کارخانہ میں آئرن سیمنٹ لوہے کی الماریاں۔ لوہے کی کرسیاں اور لوہے کا دوسرا سامان تیار ہوتا تھا۔ لالہ ہنسراج اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ریاست اندر گئے۔ اور وہاں ایک سوداگر سے جو بہرہ قوم میں سے تھے۔ انہوں نے دوسرا پی کر میوں کا آرڈر لیا۔ جب اس دورہ سے واپس آئے تو انہوں نے سوچا کہ اگر دوسو کرسیاں بذریعہ ریل بھیجیں گے۔ ان کی بلٹی بند بیوہ دی پی گئی اور اس سوداگر نے یہ دی پی واپس کر دیا۔ تو نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دوسو کرسیاں اندر سے پھر واپس گوجرانوالہ منگانی پڑیں گی۔ ان کے بھیجنے اور واپس منگانے کا خرچ ادا کرنا پڑے گا۔ اور کرسیاں الگ خراب ہوں گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ کرسیاں فی الحال صرف دس بھیجیں جائیں تاکہ نقصان ہو۔ تو زیادہ نہ ہو۔ جب دوسو کرسیوں کی قیمت وصول ہو جائے۔ تو پھر ایک سو نوے کرسیاں بغیر دی پی معمولی بلٹی کے ذریعہ بیچ دی جائیں۔ چنانچہ آپ نے دس کرسیاں اندر ریلوے اسٹیشن کے لئے بلٹی کروا دیں اور دوسو کرسیوں کی قیمت کا دی پی اس سوداگر کے نام بھیج دیا۔ اس سوداگر نے دوسو کرسیوں کی بلٹی کا دی پی وصول کر لیا۔ اور اس نے کرسیاں لینے کے لئے جب اندر دیکھو اسے اسٹیشن پر آدمی بھیجا۔ تو وہاں دوسرے کی جگہ صرف دس کرسیاں تھیں۔ چنانچہ اس سوداگر نے دس کرسیاں تو اسٹیشن سے منگالیں۔ اور فوراً ریاست اندر کی پولیس کو رپورٹ کی کہ اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ دس کرسیاں بیچ کر دوسو کرسیوں کی قیمت بذریعہ دی پی وصول کر لی ہے اور ساتھ لالہ ہنسراج کو بھی لکھا کہ آپ پر غور واری مقدمہ کیا گیا

ہے کیونکہ آپ نے دھوکہ کیا۔

لالہ ہنسراج کی نیت گویا نہ تھی۔ اور انھوں نے نقصان سے بچنے کے لیے ایسا کیا۔ مگر جہاں تک قانون کا سوال ہے۔ مقدمہ صاف تھا اور جرم ثابت۔ لالہ ہنسراج کو جب مقدمہ کی اطلاع ہوئی۔ تو وہ پریشان ہوئے۔ اور اس سبچ میں پڑ گئے کہ اب بتایا ایک سو نوے کرسیاں بھیجی جائیں۔ یا نہیں۔ انھوں نے کیلوں سے مشورہ لیا۔ وکیلوں کے مشورے مقدمہ کو پیچھاڑنے کے حق میں ہوتے ہیں۔ ان کو بتایا گیا۔ کہ اگر اب انھوں نے بتایا کرسیاں بھیجیں۔ تو مستغنیٹ کو جرم کا مزید ثبوت مل جائے گا۔ مقدمہ کے دوران میں کرسیاں اب نہ بھیجی جائیں۔ چنانچہ لالہ ہنسراج نے کیلوں کی اس رائے پر عمل کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ مقدمہ کے بعد کرسیاں بھیجی جائیں۔

ادھر اندرونی پولیس نے مقدمہ دھوکہ کے جرم میں اندراج رجسٹر کیا۔ قانونی حوالگی اپنی ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت وارنٹ گرفتاری ایجنٹ کو رنر جنرل ریاستہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجے گئے۔ ایجنٹ گورنر جنرل نے وارنٹوں پر تصدیق کر کے یہ وارنٹ پنجاب گورنمنٹ کو بھیجے۔ کہ ملزم کو گرفتار کر کے ریاست اندور کے حوالہ کیا جائے۔ لالہ ہنسراج کے تعلقات گورنر اندور پولیس کے کئی اصحاب کے ساتھ ذاتی دوستانہ تھے۔ وارنٹ جب گورنر اندور پہنچے۔ تو ان پر پولیس سے گفتگو دیا گیا۔ کہ ملزم موجود نہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔ اس کے بعد وارنٹ پھرتے۔ پھر ایسا ہی لکھا گیا۔ اس عرصہ میں لالہ ہنسراج نے ہائیکورٹ میں درخواست کی کہ ان کو ریاست اندور کے حوالہ نہ کیا جائے۔ ہائیکورٹ نے دخل دینے سے انکار کر دیا کیونکہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق پولیس ایجنٹوں کے اختیار میں تھا کہ وہ انگریزی علاقہ سے جس ملزم کو پکڑیں۔ منگالیں۔ کوئی عدالت اس میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔

لالہ ہنسراج کے وارنٹ جب تین بار واپس چلے گئے۔ تو ریاست اندور کے انسپکٹر جنرل پولیس نے محسوس کیا کہ وارنٹ کو جرنل اندور پولیس سے مل کر واپس کئے جاتے ہیں۔ اس نے اپنا ایک سب انسپکٹر اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اور وارنٹ دستی دے کر ملزم کی گرفتاری کے لیے گورنر اندور بھیجا۔ یہ سب انسپکٹر جب گورنر اندور پہنچا۔ تو وہاں ایک مزید حافست کی گئی۔ اس خیال سے کہ اندور پولیس کا کوئی شخص دوبارہ گورنر اندور آئے۔ اس سب انسپکٹر کے پیچھے چندے لگا دیئے گئے تاکہ وہ اس کو تنگ کریں۔ ان غنڈوں نے سب انسپکٹر کو مارا بھی۔ یہ سب انسپکٹر جب واپس اندور پہنچا۔ تو اس نے انسپکٹر جنرل پولیس کو تمام حالات بتائے۔ انسپکٹر جنرل کو قدرتی طور پر یہ حالات سن کر غصہ آنا چاہئے تھا۔ اس نے تمام واقعہ کی رپورٹ ریاست کے اعلیٰ افسروں کو کی۔ انھوں نے یہ رپورٹ ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجی اور معاملہ نازک سے نازک تر صورت اختیار کر گیا کیونکہ ریزرویشن نے محسوس کیا کہ نہ صرف اس کے حکم اور وارنٹوں کی تعمیل نہیں کی گئی۔ بلکہ سب انسپکٹر کو بھی مارا اور اس کی ہتک کی گئی۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل نے نہایت سختی کے ساتھ ان تمام واقعات کے متعلق پنجاب گورنمنٹ کو لکھا۔

جب حالات یہاں تک نازک ہو گئے۔ تو سٹر ہنسراج نے فیصلہ کیا کہ وہ یا تو افغانستان کو چلا جائے یا خیال گوئی تاکہ ریاست اندور میں وہاں کی پولیس کے انتظام کا شکار نہ ہو۔ اس نے گورنر اندور سے ہدایت کے لیے



یہ پیغام باپنا صاحب تک پہنچا دیں۔ درنہ میں اگر رات کو چلا گیا۔ تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ ریاستوں کے مکرر غلام ابن غلام۔ ان کے اندر جرأت کی کمی۔ یہ بچارا کرے بھی تو کیا مجھے کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس میں جرأت کہ باپنا صاحب کو اطلاع دے۔ اس نے اپنے اسٹریٹجی سپرنٹنڈنٹ حکمہ مہانداری کو ٹیلیفون کیا۔ وہ نشریہ لائے۔ میں نے ان سے بھی پوچھا کہ میں رات کو دہلی کی گاڑی سے واپس جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ہفتہ سے پہلے وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ کئی کئی روز سے لوگ منتظر بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ باپنا صاحب کو اطلاع کر دیجئے۔ اگر پھر بھی انکا ملنا عہدی ممکن نہ ہوا۔ تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرے لئے زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔ ان بچاروں میں بھی زیادہ جرأت نہ تھی۔ مگر یہ مجبور تھے۔ یہ سہمے ہوئے باپنا صاحب کے پاس اندر کھلب میں گئے۔ باپنا صاحب دہلی میں ٹین کھیل رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر وہ کچھ کہا۔ جو میں نے ان سے کہا تھا۔ باپنا صاحب نے سن کر کہا: ”سردار دیوان سنگھ سے جا کر کہئے کہ وہ دہلی سے ابھی آئے ہیں۔“ ننگے ہوئے ہوں گئے۔ مجھے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ابھی آکر مل سکتے ہیں۔ مگر بہتر یہ ہو کہ دو رات کو آرام کریں میں صبح آٹھ بجے ان کے پاس کاروبار دوں گا۔ وہ آٹھ بجے مجھ سے مل کر ۲ بجے دوپہر کی گاڑی سے واپس نشریہ لے جائیں۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب واپس نشریہ لائے انھوں نے باپنا صاحب کا جواب بتایا۔ تو میں نے کہا کہ بہت بہتر میں صبح ان سے مل کر دوپہر کو واپس چلا جاؤں گا۔ رات کو ہم نے کیسٹ ہاؤس میں آرام کیا۔ ریاستوں کے مہمان خستہ تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ اچھے سے اچھے کھانے۔ ہاتھ باندھے ہوئے ملازم۔ شان دار عمارت۔ بہترین تمام کافرینچر۔ اور جو طلبہ کہ حاضر ہوشیار سنگھ مجھ سے غریب تر ہیں۔ میں ان سے اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتا ہوں۔ رات کو میں نے سہیضہ صورت بنا کر مذاقاً ہوشیار سنگھ سے پوچھا کہ دیکھو پانچ پانچ سو روپیہ کا ایک ایک پلنگ ہے۔ اور ہزار ہزار روپیہ کا صرف صیغہ۔ کئی ملازم۔ کھانے پینے کا سامان بہت اعلیٰ۔ شاندار عمارت۔ سواری کے لئے موٹر۔ اگر اس تمام سامان کے ساتھ آپ کو دو تین سو روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لئے دے دیا جائے۔ تو اس کو ٹی میں کتنے عرصہ کے لئے تم نظر بند ہونے کے لئے تیار ہو۔ ہوشیار سنگھ سوچنے لگ گیا۔ مگر اس نے یہ محسوس کر لیا کہ میں تقریباً مذاق کر رہا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال چھ ماہ کا ایک سینٹ تو ریاست اندر کے ساتھ کرنے کو تیار ہوں چھ ماہ کے بعد اس اگر سینٹ میں مزید تجدید کر دی جائے گی۔

ایک روز صبح ہم جاگے اور سات بجے تک غسل کر کے اور کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ پورے آٹھ بجے باپنا صاحب کی موٹر آئی۔ اس میں ہم تینوں آپس کی کچھ بچھڑے۔ یہ کوئی دو منٹ نہ تھی۔ ایک ویٹنگ روم پہنچے، ایک ادب۔ پہنچے کے ویٹنگ روم میں ایک درجن سے زیادہ لوگ بہت اچھے اچھے درباری چرے اور مختلف قسم کی لچر پک پکھنے کے لئے منتظر بیٹھے تھے۔ ہم بھی ان میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیکھا اور دیا۔ وہ ویٹنگ کارڈ لے کر اوپر گیا۔ اوپر کے چوہدری نے یہ کارڈ لے کر باپنا صاحب کے میز پر رکھا۔ جہاں کہ اور کئی کارڈ رکھے تھے۔ باپنا صاحب نے یہ کارڈ دیکھا۔ تو انھوں نے چوہدری کو حکم دیا کہ ایک صاحب سردار دیوان سنگھ بھائی ہیں ان کو لے آؤ۔ یہ چوہدری مجھے کے ویٹنگ روم میں آیا۔ اور اس نے مجھے اپنے ساتھ

لے جا کر اوپر کے دیننگ روم میں بٹھا دیا۔ اور پانچا صاحب کو اطلاع کی کہ اوپر کے دیننگ روم میں آگئے ہیں۔ میں اوپر کے دیننگ روم میں اپنے ساتھ ہنسراج جی کو بھی لے گیا تھا۔ پانچا صاحب نے جب چوہدرار سے میرے اوپر کے دیننگ روم میں پہنچنے کے متعلق سنا تو کہا کہ بھلا ناؤ۔ میں نے ہنسراج جی سے کہا کہ آپ یہاں ہی بیٹھئے جب تک کہ میں آپ کو بلا نہ بھیجوں۔ میں پانچا صاحب کے کمرے میں گیا۔ پانچا صاحب خلافت کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کیا۔ بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ دہلی کا کیا حال ہے صحت کیسی ہے۔ موسم کیسا ہے وغیرہ۔ جب چند منٹ رسمی گفتگو ہو چکی۔ تو میں نے کہا۔ سلام دہقانی خانی از مطلب غیرت کے مصداق میں ایک عرض کے لئے آیا ہوں۔ اگر آپ امانت دیجئے تو میرے ساتھ ایک اور صاحب باہر بیٹھیں۔ ان کو بھی بلالوں۔ آپ نے کہا ضرور ضرور۔ آپ نے گھنٹی بجائی۔ چوہدرار حاضر ہوا تو اُسے حکم دیا کہ جو صاحب اوپر کے دیننگ روم میں تشریف رکھتے ہیں اور سردار صاحب کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کو لے آؤ۔ ہنسراج جی بھی پانچا صاحب کے کمرے کے اندر آئے۔ پانچا صاحب نے ہاتھ ملایا اور وہ بیٹھ گئے۔ میں نے اب ذکر شروع کیا کہ یہ صاحب لالا ہنسراج ہیں اور میرے چچا کے داماد ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کے خلاف آپ کی ریاست میں دھوکہ کا مقدمہ قائم ہے۔ اور جنہوں نے آپ کے مسبب انکسٹر کی توہین کی اور اُسے مار مار کر انہوں نے تمام کے تمام حالات من و عن پیچ پچ بتانے کے بعد کہا کہ یہ آپ کے حوالہ ہیں۔ ان کو کیا تو جیل بھیج دیجئے۔ یا میرے ساتھ واپس دھڑ۔ دونوں میں سے جو صورت پسند ہو گی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ریڈیٹ کے دارنٹوں کے سپرد تو نہ کیا مگر میں ان کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

پانچا صاحب ریاستوں کے وزراء میں غیر معمولی شریف اور نیک دل شخصیت تھے۔ ان کی شرافت ان کی زندگی میں کئی بار ان کے لئے ہنگامی ثابت ہوئی۔ مگر ان کے شعار اور کیریکٹر میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کو مقدمہ کے تمام حالات کا علم تھا کیونکہ ان کے ذریعہ سے ہی دارنٹ کمی بار ریڈیٹ کے پاس گئے اور آئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہنسراج جی کو فوراً ریلوے سٹیشن پر انگریزی جو رسڈکشن میں بھیج دیا جائے تاکہ ریاست کی حدود میں ریاست کی پولیس کا کوئی شخص شرارت نہ کر سکے ہنسراج جی کو موٹر میں ریلوے سٹیشن بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے میڈیچل کے پریزیڈنٹ کو ٹیلیفون کر کے طلب فرمایا کہ یہ صاحب میرے سٹریٹ اور ان کا نام فائبریز خان یا عبد العزیز خان تھا اور ان کو سمجھایا کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں اور پریزیڈنٹ میڈیچل کمیٹی موٹر میں ان بوہروں کے پاس گئے جنہوں نے مقدمہ دائر کیا تھا۔ پریزیڈنٹ صاحب نے ان کو وزیر اعظم صاحب کا پیغام دیا۔ بوہرے دنیا تم کے سوداگر ہوتے ہیں۔ جو ایک ایک پیسہ کا خیال رکھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مقدمہ میں ان کا ڈیڑھ سو روپہ خرچ آچکا ہے۔ میں نے کہا اس کا خیال نہ کیجئے۔ یہ ڈیڑھ سو روپہ میں دو لاکھ بات چیت کرنے کے بعد ہم دونوں بوہرہ سفیٹ کو لے کر ہائیڈرو گئے۔ وہاں سفیٹ کی طرف سے درخواست لکھی گئی کہ مقدمہ قابلِ رائے نامہ ہے اور یہ مقدمہ واپس لینا چاہتے ہیں اس درخواست کو لے کر ہم چیف جسٹس صاحب کے پاس گئے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ پانچا صاحب نے ان کو بھی کہہ دیا تھا۔ آجناچ سفیٹ کی درخواست پر چیف جسٹس صاحب نے حکم لکھا کہ چونکہ ملزم

اور مستغیث میں صلح ہو چکی ہے۔ اور مستغیث مقدمہ واپس لینا چاہتا ہے۔ عدالت کو اس میں کرنی اعتراض نہیں ملنم مقدمہ میں ڈسپازس کیا جائے۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو دارنٹیل کے منسوخ کرنے کے لئے لکھا جائے۔ یہ تمام کارروائی بارہ بجے سے پہلے پہلے ختم ہو گئی۔ میں نے خرچہ کا ڈیڑھ سو روپیہ بوبھر سوداگر کو دینا چاہا اور بہت زور لگایا۔ مگر پریڈنٹ میونسپلٹی نے نہ دینے دیا۔ کارروائی ختم ہونے کے بعد میں اپنا صاحب کی خدمت میں شکریہ کے لئے حاضر ہوا۔ وہ مقدمہ کے ختم ہونے پر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے دوستانہ اوجھا کے ساتھ درخواست کی کہ بوبھر سوداگر کے خرچہ کا دو پیہ مجھے دینے کی اجازت دی جائے۔ یہ روپیہ ہمارا دینا ہمارے لئے انتہائی غیر مناسب ہے۔ مگر اپنا صاحب نہ مانے۔ اور آپ نے کہا کہ سردار دیوان سنگھ دوست اور مہمان ہیں۔ یہ ممکن نہیں اور کسی صورت میں ایسا نہ ہوگا۔ یہ روپیہ وہ خود اپنے جیب سے دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں نے پھر احتجاج کیا۔ مگر انھوں نے پھر انکار کیا۔ اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔

اپنا صاحب سے رخصت ہو کر میں ہوشیار سنگھ جی کے ساتھ موٹر میں ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں ہنسراج جی کو ساتھ لیا۔ ہم تینوں گیسٹ ہاؤس میں پہنچے وہاں لچ کھایا۔ سالانہ ہندو ایاء گیسٹ ہاؤس کے ملازموں کو دس روپیہ بطور انعام دیئے اور ہم موٹر میں ریلوے سٹیشن پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد نظام چائے والی گاڑی آئی۔ اور ہم اس میں سوار ہو کر دہلی واپس آئے۔ لاہور ریل کے واقعات بتائے گئے تھے کہ جرنلسٹوں کو کیونکر ہوا سمجھا جاتا ہے۔ اندور کے اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا کہ جرنلسٹوں کو بعض ایسی سہولتیں بھی حاصل ہیں جو دوسرے کم لوگوں کو حاصل ہوں گی۔

## گورنٹ کی کانڈمی شینری

ہمارا جہنا بھہ مغز دل ہونے کے بعد جب ڈیرہ دون میں مقیم تھے۔ تو آپ کے ملازموں نے ایک روز دیکھا کہ سردار حضور سنگھ ڈھولوں اور ڈھپالوں میں مختلف جہدوں پر رہے۔ ایک زمانہ میں انسپکٹر جنرل پولیس بھی تھے اور بعد میں منسٹر بھی ہو گئے تھے ڈیرہ دون آئے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی دیکھا گیا کہ آپ ایسٹ کینال ریڈر جہاں ہمارا جہنا بھہ کی کوٹھی تھی اکی سڑک پر اکثر موٹر سائیکل پر آتے جاتے ہیں۔ والیان ریاست ذہنی اعتبار سے عام طور پر وہم میں مشغول ہوتے ہیں اور ہمارا جہنا بھہ کا ذہن بھی ایسا ہی تھا آپ نے جب سردار حضور سنگھ کے متعلق ملازموں سے ایسٹ کینال روڈ کی سڑک پر موٹر سائیکل پر آئے جانے کے متعلق سنا۔ تو آپ کو شک ہوا کہ شاید ڈھپالہ کے لوگ کوئی نئی مشنارت کرنے والے ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیرہ دون سے ٹیلی فون پر کہا کہ میں فوراً ڈیرہ دون پہنچ جاؤں۔ ضروری کام ہے۔ میں رات کی گاڑی دہلی سے سوار ہوا اور صبح ڈیرہ دون پہنچا۔ ہمارا جہنا بھہ سے ملے تو آپ نے سردار حضور سنگھ کا ڈیرہ دون کی سڑکوں پر موٹر سائیکل پر پھرنے کا واقعہ سنایا۔ ہمارا جہنا بھہ حد تشویش میں تھے کہ شاید ہمارا جہنا بھہ کی نئی مشنارت کرنے والے ہیں۔ میں نے ہمارا جہنا بھہ سے کہا کہ ڈیرہ دون ہمارا خریدنا ہوا نہیں۔ کہ یہاں ڈھپالہ کا کوئی شخص ابھی

نہ سکے۔ چرنا مقام ہے۔ اکثر لوگ آب و ہوا کے لئے آتے ہیں۔ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر میرے اس جواب سے ہمارا جی متلی نہ ہوئی۔ آپ گھبرائے ہوئے تھے۔ اور آپ نے چاہا کہ میں اُن کے پاس کچھ روز رہوں۔ میں تین چار روز ڈیرہ دون میں رہا۔ مگر ادھر اخبار کے کام کی فکر کو غیر حاضری کے باعث اچھی طرح سے نہ ایڈیٹ ہوگا اور نہ انتظام قابل اطمینان ہو سکے گا میں نے چاہا کہ وہاں دہلی چلا جائوں۔ آخر ہمارا جہ سے فیصلہ ہوا کہ میں چند ہفتے تک ہفتہ میں دو تین روز دہلی میں رہا کروں گا۔ اور تین چار روز ڈیرہ دون رہوں گا۔

میں جب دہلی پہنچا۔ تو اگلے روز رائے بہادر لال بھگوان داس کپور پور ٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی ملنے کے لئے تشریف لائے۔ یہ بڑی بگ میرے ہم وطن ہیں۔ اور دور کے کچھ رشتہ دار برادری میں سے بھی ہیں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی کے ماتحت سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ آپ کا بیٹہ گوارڈ لاہور میں تھا۔ پندرہ روز لاہور میں تشریف رکھتے تھے۔ اور پندرہ روز دہلی میں ان کے والد رائے بہادر لال دریائی لال کپور بھی پولیس کے ایک بڑے افسر تھے۔ یعنی رائے بہادر بھگوان داس پولیس کے محکمہ میں ہونے کے اعتبار سے دو آتشہ تھے۔ آپ جب دہلی تشریف لائے۔ تو کبھی کبھی ملنے کے لئے آیا کرتے۔

رائے بہادر پولیس سے خاندانی تعلقی ہونے کے باعث گورنمنٹ کے بہت بڑے دفاتر داروں میں سے تھے۔ اور آپ نے اور آپ کے والد مرحوم نے ہندوستان کی آزادی کی سپرٹ کو چلنے کے اعتبار سے گورنمنٹ کی بہت بڑی خدمات انجام دی تھیں آپ کے والد تینہ کی شریک میں جب کہ لال لاجپت رائے کو مانڈل بھیجا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ کے دست راست تھے۔ اور رائے بہادر بھگوان داس نے نوالال لاجپت رائے

اور لال ہریال کمار کیہ ایک بھیجا گیا۔ اور یہاں ہندوستان میں ڈیڑھ لاکھ سبب کیس سے لے کر اردن سبب کیس اور اس کے بعد لکھنؤ میں تقیثوں میں نمایاں حصہ لیا۔ مگر میرا خیال ہے۔ اور آپ کی پولیس کی برادری کے بھی بعض اصحاب میرے اس خیال سے متفق ہیں کہ آپ ذہنی اعتبار سے کوئی بہت زیادہ ہوشیار لوگوں میں سے نہیں تھے آپ جب ملنے کے لئے تشریف لائے اور چائے پی لے رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اٹھوں نے دو تین بار ٹیلی فون کیا میں دہلی میں موجود نہ تھا۔ اور میں کہاں گیا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ ڈیرہ دون ہمارا جہ سے ملنے کے لئے گیا تھا۔

پولیس والوں کی یہ فطرت ہے کہ یہ ہر بات کو کریدتے ہیں کہ شاید اس میں سے بھی کوئی مواد مل جائے۔ یہ اگر کسی رات میں جائیں گے۔ تو وہاں بھی لوگوں کو غور سے دیکھیں گے۔ کہ اس رات میں کوئی مفرد ملازم تو نہیں کسی گوردوارہ اور درہم سالہ میں جائیں گے تو وہاں عبادت کرنے والوں پر بھی ان کی نگاہ ہوگی۔ کہ کوئی انارکسٹ تو موجود نہیں جس کو گرفتار کیا جائے۔ میں رائے بہادر کی ذہنیت سے واقف تھا۔ آپ نے جب میرے منہ سے ہمارا جہ نا بھہ اور ڈیرہ دون نہ تو سوالات شروع کر دیے۔ کیوں گئے تھے۔ کیا کام تھا۔

ہمارا جی صحت کیسی ہے۔ وغیرہ وغیرہ میں نے ان کے سوالات کو غنیمت سمجھا اور سوچا کہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ لوگ دوسرے لوگوں کے وقت سمجھ کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کو یہ وقت سمجھ کر کام نکالا جائے تو کیا ہرج ہے۔ رائے بہادر اور میرے درمیان یہ باتیں ہوئیں:-

راستے بہادر :- ڈیرہ دون کیوں گئے تھے۔  
 میں :- ہمارا جہ کا ٹیلیفون آیا تھا کہ آکر مل جاؤ۔  
 راستے بہادر :- کیا کوئی ضروری کام تھا۔

میں :- کیا ضروری کام تھا ان لوگوں کے آپس میں جھگڑے ہیں مجھے خواہ مخواہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔

راستے بہادر :- کیوں کیا بات تھی کیا جھگڑا ہے۔

میں :- کچھ بات نہیں۔ یہی پٹیلانا بھگتے جھگڑے۔ ہمارا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔ راستے بہادر صاحب چھوڑ دیئے ان قصوں کو۔ آپ پاسے پیچھے کتنے چپے شکر کے ڈالوں۔

راستے بہادر :- ایک چمچ کافی ہو گا۔ میں شکر بہت کم پیتا ہوں۔ کیا نا بھ پٹیلہ کا کوئی نیا جھگڑا پیدا ہو گیا۔  
 میں :- جی نہیں۔ وہی پٹیلہ داسے شہر آتے ہیں۔ ڈیرہ دون میں حضور اسٹنٹ کے ڈھانچے میں  
 پچیس غنڈوں کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ موٹر سائیکل پر ہمارا جہ نا بھگتے کو بھی لے چکے لگاتے تھے۔ ہمارا جہ نے مشرورہ  
 کے لئے بلایا تھا۔

راستے بہادر :- پھر ہمارا جہ نے کیا کہا۔ کیا کریں گے۔

میں :- (اپنی بے تعلقی اور لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے) اچی چھوڑ دیئے راستے بہادر یہاں حساب ان لوگوں کو  
 یہ قسط تو پلٹے ہی رہیں گے۔ آپ چائے پیچھے یہ فرنیچ ٹوسٹ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ کھائیے۔  
 راستے بہادر کو ایسی "اہم خبر" ملے۔ اور وہ صبر کریں۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔ ان کے دل میں تو "کچھ کچھ"  
 ہو رہا تھا۔ یہ بجائے چائے سے کیا دلچسپی لیتے۔ انہوں نے میرے کہنے سے ایک فرنیچ ٹوسٹ کھایا۔ اور پھر باتیں  
 شروع کر دیں۔ مگر میں لاپرواہی کا اظہار کر رہا ہوں۔ تاکہ راستے بہادر یہ نہ سمجھ لیں کہ میں ان کو سنا کر کہہ رہا ہوں  
 اور میرے کہنے میں کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ راستے بہادر نے تھوڑی دیر کے بعد پھر بٹا کھایا اور پوچھا۔  
 راستے بہادر :- ہمارا جہ نے کیا سوچا ہے۔ کیا فی الحقیقت پٹیلہ کے لوگ ڈیرہ دون میں موجود ہیں۔

میں :- ہمارا جہ نے تو بردا نہیں کی۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا برد کرتے ہیں۔ ہاں ڈیرہ دون کے  
 اکائیوں کو ان واقعات کا علم ہو گیا۔ انہوں نے امرتسر شہر میں گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کو اطلاع کر دی  
 اور اب معلوم ہوا تھا کہ شہر میں گوردوارہ کمیٹی اکالی دل کے پانچ سو آدمی ڈیرہ دون بھیج رہی ہے۔ جو  
 ہمارا جہ کی کوٹھی کے ارد گرد اور ایسٹ کیننل روڈ پر پہرہ دہیں گے۔ تاکہ پٹیلہ داسے کوئی شرارت نہ کر سکیں۔  
 میرا یہ کہنا تھا کہ راستے بہادر کا چہرہ دلچسپ اور جیرانی کا مرکز بن گیا۔ راستے بہادر نے پوچھا کہ امرتسر  
 اکالی کب ڈیرہ دون پہنچ رہے ہیں۔ میں نے پھر ہتھالی۔ غیر دلچسپی اور لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا  
 کہ چھوڑ دیئے راستے بہادر یہاں ان باتوں کو۔ یہ لوگ کریں جیسا کہنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنا وقت ان لوگوں پر کیوں  
 ضائع کریں۔ فرمایئے حافظ آباد میں تو سب خیریت ہے۔ آپ کب وہاں گئے تھے۔

راستے بہادر کو صبر کہاں۔ انہوں نے اور کہنا چاہا۔ میں نے پھر لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرا  
 باقی مشرورہ کر دیں۔ اور اگر دوسری باتیں شروع نہ کرتا تو ڈیرہ دون کی بات ہی کو منی تھی۔ جو ان سے کرتا۔



چائے کے لیدر رائے بہادر دفتر ”ریاست“ سے سید سے اپنے انسر سر ڈیوڈ پیٹری ڈائریکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی کی کوٹھی پہنچے۔ وہاں تمام واقعات بیان کیے۔ ان ”سنٹی خیر“ اور ”اہم“ واقعات کے متعلق سر ڈیوڈ پیٹری نے پلاننگل سیکریٹری گورنمنٹ ہند کو ٹیلی فون کیا۔ اور کہا۔ مقتدر راجہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ راجہ سدا کا لیل کا ہتھ ہمارا راجہ نا بھ کی کوٹھی کا پہرہ دینے کے لئے امرتسر سے روانہ ہو رہا ہے۔ اور پنجاب میں سکھوں کے مذہب و سخت ایجنڈیشن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ پلاننگل سیکریٹری نے فوراً بذریعہ تار ہمارا راجہ پٹیل سے جواب طلب کیا۔ اور حکم دیا کہ سردار حضور اسنگھ اور پٹیل کے دوسرے آدمیوں کو فوراً ڈیرہ دون سے واپس بلا لیا جائے۔ ہمارا راجہ پٹیل نے جواب دیا کہ پٹیل سے انھوں نے آدمی نہیں بھیجے۔ سردار حضور اسنگھ پر ایمبیٹ جھیشیت سے ڈیرہ دون گئے ہیں۔ اور ان کو بذریعہ تار واپس آنے کے لئے حکم دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ احکام بذریعہ تار جاری ہوئے اور اگلے روز سردار حضور اسنگھ واپس پٹیل چلے گئے۔

میں تین روز کے بعد پھر ڈیرہ دون گیا۔ ہمارا راجہ کو رائے بہادر بھگوان داس کی ملاقات کا دانہ بتایا۔ ہمارا راجہ کے ہنسنے ہنسنے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہمارا راجہ نے بتایا کہ سردار حضور اسنگھ ڈیرہ دون سے واپس پٹیل چلے گئے ہیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ کی کاغذی مشینری کیونکر چلتی ہے۔ اس مشینری کے باعث جہاں ہر روز بے گناہ لوگ قیادہ نظر بند ہوتے ہیں۔ وہاں اس مشینری کو بھی اگر بے وقوف بنایا جائے تو اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

## ریاستوں کی عدالتیں اور محبہ طریٹ

نواب صاحب بہاول پور کی دادی نے عید کے روز اپنی بھتیجی نواب صاحب کی بہن کو عہدی کے طور پر ایک پٹا دیا۔ نواب صاحب کی بہن نے یہ پٹا اپنے شوہر دران کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ بہادر پور کی پٹیشن میں بیج رہیں۔ اور ان کو محبت سے بیچ کر بلا لیا جاتا ہے (کو دیا۔ اس پٹا کی قیمت تین چار لاکھ روپیہ کے قریب تھی۔ بیچنے والے نے یہ پٹا بہاول پور کے ایک مقامی جوہری کو دکھایا۔ اور پوچھا کہ کیا قیمت ہے۔ تو اس جوہری نے اس کی قیمت سولہ ہزار روپیہ بتائی۔ اس کے بعد یہ پٹا بہاول پور کے قریب مظان کے ایک جوہری کو دکھایا گیا۔ تو اس نے بھی سولہ سترہ ہزار روپیہ قیمت بتائی۔ بیچ کر بلا لیا۔ اور پھر یہ کاروبار ان تھے۔ انھوں نے اس پٹا کو فروخت کر دینا چاہا تو کچھ دن بات چیت کرنے کے بعد یہ چار جوہری ایک جہد میں دو بہادر پور اور وہ مظان کے تھے۔ انیس ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا۔ اور اس سولے کا علم نہ تو نواب صاحب بہاول پور کو ہوا۔ نہ ان کی بشیرہ کو اور نہ ان کی دادی کو۔

یہ چاروں جوہری اس پٹا کو نہ کر دہلی آئے۔ انھوں نے یہاں کے جوہریوں کو دکھایا۔ جوہری لوگ دوسرے کا جیب کھٹنے کے اعتبار سے بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑے جوہر شناس کو بھی بے وقوف بنالیتے ہیں۔ اور والیان ریاست کے جیب میں سے تو دہلی کے جوہری ہر سال لاکھوں روپیہ مائل کرتے تھے۔ دہلی کے

ان جوہریوں نے اس پٹائی قیمت چالیس پچاس ہزار روپیہ تک لگائی۔ اس کے بعد عثمان اور بہاول پور کے جوہری پٹا کو لے کر بمبئی گئے۔ وہاں کے جوہریوں کو دکھایا گیا۔ تو اس سے کچھ زیادہ رقم بتائی گئی۔ آخر یہ پٹا بے پور کے کروڑپتی جوہری لال سند رلال جو بمبئی میں سند رلال اینڈ کو کے نام سے جواہرات کا کام کرتے ہیں۔ یہ پٹا پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا گیا۔

پٹا بمبئی میں فروخت ہوا تھا۔ کہ گمٹان کے جوہریوں میں سے ایک نے جو کافی حصہ نہ ملنے یا کسی دوسری وجہ سے اپنے ہمارے میں سے بدل ہو گیا تھا۔ ایک خط کے ذریعہ نواب صاحب بہاول پور کو تمام واقعہ کی اطلاع دے دی۔ نواب صاحب نے اپنے بہنوئی سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ درست ہے۔ ایک توقیتی شے کا کوڑیل کے محل فروخت ہونا دوسرے پر شیخ کا سوال نواب صاحب کو اس کا بے حد افسوس ہوا۔

نواب صاحب کے حکم سے بہاول پور پولیس نے مقدمہ کو درج رجسٹر کیا۔ مقدمہ درج ہونے کے بعد جوہریوں پر دھوکہ اور امانت میں خیانت وغیرہ کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ اور کاغذات ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کو اس درخواست کے ساتھ بھیجے گئے کہ تا فیصلہ مقدمہ پٹا کو فروخت قبضہ میں کر لیا جائے۔ تاکہ گمٹان اس کو خرید نہ کر لیں ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب نے بمبئی پولیس کو تفصیل کے ساتھ بذریعہ تار حکم دیا۔ اور بمبئی پولیس نے لال سند رلال کے ہاں پہنچ کر پٹا جو اس وقت پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت ہو چکا تھا۔ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس حکم کے پہنچنے سے پہلے چاروں جوہری روپیہ لے کر بمبئی سے روانہ ہو چکے تھے۔ ایجنٹ گورنر جنرل کا حکم دہلی اور لاہور پولیس کو بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ جوہری روپیہ لے کر جب لاہور میں پہنچے۔ تو پنجاب ویلے پولیس نے ان کو سب روپیہ کے گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری کے بعد ان سے روپیہ لے کر لاہور کے سرکاری خزانہ میں جمع کر دیا گیا۔ اور جب گمٹانوں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو ان سے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔

ریاستوں کے مظالم برطانوی علاقہ میں کافی شہرت رکھتے تھے اور لوگ جانتے تھے کہ ریاستوں کی حدود میں اگر سرکار مستعفی یا مدعی ہو۔ تو نہ دلیل کا سوال ہے نہ مکمل کا اور نہ اپیل کا۔ ان جوہریوں نے جب یہ سنا کہ ان کے خلاف ریاست بہاولپور میں مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل نے وارنٹ گرفتاری جاری کئے ہیں۔ تو ان بچاروں کے جوش اڑ گئے۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ان کو ریاست بہاول پور کے حوالہ کر دیا تو نہ معلوم کتنے برس تک یہ وہاں جیل میں رکھے جائیں۔ ان لوگوں نے لاہور میں اپنا وکیل مسٹری۔ این۔ کول بیرسٹر کو مقرر کیا۔

یہ لوگ بے حد پریشان تھے۔ تو ان کو خیال آیا کہ ایڈیٹر ریاست ریاستوں کے معاملات اور ایکسٹراڈیشن ایکٹ وغیرہ سے واقف ہے۔ اس سے رائے اور امداد لینی چاہیے۔ یہ لوگ دہلی آئے اور ایڈیٹر ریاست سے ملے۔ انھوں نے تمام حالات سنائے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ گو سودا کرتے وقت انھوں نے چروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز کے مصداق تین چار لاکھ روپیہ کا پٹا انیس ہزار میں آڑا لیا۔ مگر غور کیا جائے۔ تو انھوں نے یہ تجارت کی تھی۔ دھوکہ یا امانت میں خیانت کا جرم نہ کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اخبار میں لکھ کر ان کی ہر ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ مقدمہ عدالت میں ہے۔ اگر مقدمہ کے لئے ریویژنٹ نے ان کو بہاول پور کے حوالہ کر دیا تو پھر یہ بہاولپور کے حکام کے رحم پر ہوں گے۔ وہ جو چاہیں کریں۔

اور نہیں کہا جاسکتا کہ نتیجہ کیا ہو۔ ان اگر مقدمہ برطانوی علاقہ میں ہو۔ تو قانونی اعتبار سے مقدمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور وہ قطعی بری ہو جائیں گے۔ مگر برطانوی علاقہ میں مقدمہ کا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے ان کو اس مقدمہ کے تمام روشن اور تاریک پہلو بتا دیئے۔ اس کے بعد انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ چونکہ میں نواب صاحب بہادر لیپور کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اس لئے ان کی سفارش کروں میں نے ان سے کہا کہ دیئے سفارش کرنا تو بے معنی ہوگا۔ اور نہ ایسی سفارش کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ پوزیشن ہو کہ لالہ سندھ لال اپنا کچھ بھڑا روپیہ واپس لے لیں۔ انیس ہزار روپیہ جو آپ نے میجر بلا کو دیا وہ نواب صاحب بہادر لال پور آپ کو دے دیں اور نواب صاحب کو پتا واپس مل جائے۔ تو یہ تینہیں کے لئے مناسب و مفید ہوگا۔ اور اس تجویز پر نواب صاحب سے مقدمہ واپس لینے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ نواب صاحب کو اس تجویز سے متفق ہونے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔ میری یہ تجویز ان لوگوں نے پسند کی۔ کیونکہ ان کو ریاستی جبل خانہ نظر آ رہا تھا۔ اور بہت خوف نہہ تھے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو جیل جانے کا سوال تھا۔ نہ انیس ہزار روپیہ کے مارے جانے کا۔

نواب صاحب بہادر لیپور میں بھی کئی کردار ہوں گی اور کوئی انسان کمزوروں سے بلند نہیں۔ مگر طبیعت کے اعتبار سے نواب صاحب نہایت اچھے۔ نہایت مخلص۔ بہت فیاض اور بے ریا و اسلئے ریاست ہیں۔ اور ان سے ملنے اور باتیں کرنے والا شخص ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ گریوں کا زمانہ تھا۔ اور نواب صاحب اس وقت پالم پور (ضلع کانگڑہ) بہادر پر تھے۔ میں نے ان کو تمام حالات اور وہ تمام بات چیت لکھی جو میرے اور ملزموں کے درمیان ہوئی۔ اس خط کے ملنے پر نواب صاحب کا تار آیا۔ کہ میں ان سے پالم پور ملوں چنانچہ میں پالم پور گیا۔ وہاں بات چیت ہوئی۔ تو نواب صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ کیونکہ وہ خود نہ چاہتے تھے کہ ملزم قید ہوں۔ اس مرحلہ کے ملے ہوئے کے بعد میں لالہ سندھ لال سے دہلی میں ملا اور کئی روز کی بات چیت کے بعد میں سندھ لال جی کو نواب صاحب سے ملانے کے لئے پالم پور لے گیا تاکہ نواب صاحب لالہ جی کی بھی تشکی کر دیں۔ کیونکہ وہ بھی امانت میں خیانت کا مال لینے کے ملزم گردانے جاسکتے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد لالہ سندھ لال نے چیف پریزیڈنسی ججسٹریٹ میپٹی کو جس کے قبضہ میں میپٹی پولیس نے یہ پتار رکھا ہوا تھا لکھ دیا۔ کہ پتا نواب صاحب بہادر لیپور کو واپس کر دیا جائے۔ ان کو کوئی اعتراض نہیں۔

یہ تمام مرحلے ملے ہوئے کے بعد اب باقی مسئلہ بہادر لیپور کا مقدمہ واپس لینے کا تھا۔ اور یہ شبہ ہی ممکن تھا کہ ملزم بہادر لیپور کی عدالت میں حاضر ہوتے۔ بیان دیتے۔ ان کا انیس ہزار روپیہ ان کو واپس ملتا۔ عدالت ان کو سچا کر دیتی۔ اور پریزیڈنٹ کے جاری کئے ہوئے ایکسٹراڈیشن وارنٹ منسوخ ہوتے۔ چنانچہ باوجود اس بات کے کہ نواب صاحب سے فیصلہ ہو چکا ہے ملزم بہادر لیپور جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اور خوفزدہ تھے۔ میں درمیان میں پھر کڑمہ داری لے چکا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں بہادر لیپور چل کر مقدمہ کی کارروائی بھی اپنے سامنے ختم کرادوں۔ چنانچہ میں ان چاروں ملزموں اور ان کے وکیل کے ساتھ بہادر لیپور گیا۔ تمام راستہ میں یہ لوگ پریشان رہے کہ ریاستوں کا معاملہ ہے۔ وہاں جا رہے ہیں۔ دلیان ریاست اور ان کے اہلکاروں کا کیا اعتبار۔ انشانہ ہو جیل میں ڈال دیئے جائیں۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے بہادر لیپور خان بہادر کرل مقبول حسین قریشی کو تار دے دیا تھا۔ ہم لوگ جب بہادر لیپور پریشیں پہنچے۔ تو کار میں ہمارے لئے موجود تھیں۔ گیسٹ ہوس میں گئے۔

وہاں کے انسروں کو ہلکے پہنچنے کی اطلاع ہو چکی تھی غسل کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد میں اس قافلے کو لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا تاکہ قانونی کارروائی ختم ہو۔ ہم وہاں جا کر بیٹھے تھے کہ پولیس کے چار کنسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر جنھنکیاں لے کر گڑھ میں کوٹھنکڑیاں لٹکائے رکھے لے آئے۔ ہم لوگوں نے جب ہتھکڑیاں لگوا دیں تو نہ صرف گڑھوں کے چوڑے آٹھ گئے۔ میں بھی شرم اور غصہ امت کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ کیونکہ گڑھوں کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ لوگ مجھے خدا دار ہے ایمان سمجھتے ہیں۔ اور ان کو یقین ہے کہ میں نے دھوکہ دے کر ان کو کپڑا دیا۔ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ دھوکہ غلطی ہو رہی ہے۔ نواب صاحب نے مجھ سے ذاتی طور پر وعدہ کیا تھا کہ گڑھوں کو بہادل پور میں کوئی ٹھکانہ نہ ہوگی۔ ان کو عدالت میں پیش کر دیا جائے۔ اور مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔ ایسا کرنا ریاست بہاولپور کے لئے شرمناک ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے غصہ اور عرش میں آکر بلند آواز سے کہا کہ اچھا اگر یہ لازم چلے میں گئے۔ تو جیل سے باہر رہنا میں اپنے لئے بھی کمینہ بن چکا ہوں۔ اور یقیناً ان کے ساتھ جیل جاول گار۔ میرے اس جیل پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اندر کچھ افسانیت پیدا ہوئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ معاملہ بہت زیادہ بگڑ چکا ہے اس پر اس نے کہا کہ چونکہ گڑھوں کے خلاف وارنٹ جاری ہوئے تھے۔ اور لازم عدالت میں ہیں۔ عدالت کا فرض ہے کہ وہ ان کو حراست میں لے میں لے گیا۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔ ان کو ہتھکڑیاں نہ لگائیے۔ میں ابھی منسٹروں سے مل کر انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ عدالت سے باہر دو موٹر گھڑی تھی جس میں ہم لوگ گیسٹ ہوس سے آئے تھے۔ میں اس موٹر میں وہاں کے منسٹر لارڈ ہودو اس کے پہنچا۔ اول تو ان سے ملنے کے لئے ہی مجھے کئی منٹ پر آمدہ میں انتظار کرنا پڑا۔ اور جب ملے تو بڑے آدمی۔ تنخواہ کا مضبوط۔ نہ دکانہ دکانہ یعنی نہ پاں کرتے ہیں نہ نہیں۔ نہ کوئی متلی بخش جو اس۔ ریاستی اہلکاروں والی چالبازیاں۔ اور چالاکیاں۔ نواب صاحب کا حکم نہیں آیا پالم پور سے کوئی تحریری اطلاع نہیں آئی۔ پولیس کے اختیار میں ہے مجسٹریٹ سے کہئے۔ مجبور ہوں۔ یہ سچہ۔ اور وہ ہے۔

افسوس کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ میں بچہ پریشان کہ نواب صاحب پالم پور میں ہیں۔ یہاں کے منسٹروں کی حالت یہ ہے کہ وہ تو کیا اور حائل تو کبھی یہاں سے کرل قریبی کے ہاں گیا۔ وہ مکان پر موجود نہ تھے۔ پھر آغا محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس کے مکان پر گیا۔ یہ برٹش پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر تھے۔ سی۔ پی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس وہ چکے تھے۔ ان سے بلا تمام حالات بیان کئے۔ تو ان کو بے حد افسوس ہوا۔ یہ فوراً میرے ساتھ عدالت میں آئے مجسٹریٹ سے پوچھا۔ تو مجسٹریٹ نے دہی قانون بازی شرمناک کی کہ آپ دائرہ کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس پر آغا صاحب نے اپنے سب انسپکٹر کو منہر بیچ کر دوشا ہو کاروں کو بلایا۔ اور ان سے کہا۔ کہ یہ ان چاندوں گڑھوں کی پانچ پانچ سو روپیہ کی ضمانت طلبت ہیں داخل کر دیں۔ چنانچہ ضمانت مانے لگے گئے۔ اور داخل ہوئے۔ اس کے بعد آغا صاحب نے اپنے سامنے تمام کارروائی جو ہوئی چاہئے تھی۔ کرائی۔ اور لازم ڈسپارچ کیجئے گئے۔

گڑھوں کے ڈسپارچ ہونے کے بعد ہم لوگ واپس گیسٹ ہوس آئے۔ پتا اس سے پہلے بہادل پور کے خزانہ میں پہنچ چکا تھا۔ گڑھوں کا روپیہ گڑھوں کو ملا۔ اور میں رات کی گاڑی سے سوار ہو کر دہلی واپس آیا۔

دہلی پہنچے کے بعد جس نے بہاول پور کا ہتھکڑیوں کا واقعہ اور تمام حالات نواب صاحب کو لکھے۔ نواب صاحب کو حالات معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ریاستوں کے مجسٹریٹوں کے اندر شے لطیف اور انسانیت پیدا ہونے کے لئے ابھی نصف صدی کی اور ضرورت تھی۔ اچھا ہوا کہ آغا محمد اکرم نے لمبوں کی ضمانت کا انتظام کر دیا ورنہ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مژم توجیل میں جانے۔ اور میں جس کے وعدہ اور بھر دس پر وہ بہاول پور کی مدد میں داخل ہوئے باہر رہتا۔

## عذارِ ناقابلِ معافی ہیں

جس زمانہ نواب بھوپال کے ساتھ میرے مقدمات چل رہے تھے۔ دفتر ”ریاست“ میں ایک چپڑا سی مبارک حسین تھا۔ اس زمانہ چپڑا سیوں کی تنخواہ عام طور پر بارہ ہندو روپیہ ماہوار تھی۔ مگر یہ مبارک حسین تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتا تھا۔ اور اس کا دوسرا تمام خرچ یعنی کھانے پکڑے وغیرہ کا بھی میرے ذمہ تھا۔ کیونکہ یہ قابلِ اعتماد تھا۔ میرے گھر کے لئے سامان کی خرید و فروخت بھی ہی کرتا۔ میری والدہ بھی اس کو بچوں سے زیادہ عزیز سمجھتیں۔ قابلِ اعتماد ہونے کے باعث یہ میرے خط خط مرحوم ہمارا جانا بھ کے پاس ڈیوہہ مدین لے جایا کرتا۔ اور ان کے جواب لاتا۔ گویا کہ یہ ہمارے ہاں ایک فیملی ممبر کی حیثیت رکھتا۔ چنانچہ اس کی جب شادی ہوئی۔ تو اس کی شادی کے اخراجات کے لئے تین سو روپیہ میں نے اور تین سو روپیہ مرحوم ہمارے ہاتھ لے بھی دیا۔

نواب بھوپال بھٹا ”ریاست“ کے مقدمات کے دوران بھوپال والوں نے لاپٹو دے کر دفتر ”ریاست“ کے آدمی توڑنے شروع کیے۔ ان آدمیوں کی ان کو شہادت وغیرہ کے لئے ضرورت تھی۔ چنانچہ بھوپال والوں نے دفتر ”ریاست“ کے جن لوگوں کے ضمیر خریدے ان میں ایک یہ مبارک حسین چپڑا سی بھی تھا۔ اس کو پانچ سو روپیہ تو پیشگی دیا گیا۔ اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ اگر اس نے ایڈیٹر ”ریاست“ سے غداری کرتے ہوئے نواب بھوپال کی خدمات انجام دیں تو وہ ان مقدمات کے بعد بھوپال میں اچھی جگہ پر سرکاری ملازم مقرر کر دیا جائے گا۔

بھوپال والوں کی اطلاعیں حاصل کرنے کے لئے بھوپال کے ایک سب انسپکٹر پولیس درجہ مقدمات کے فائلوں کا انچارج تھا اور جس کے بعد میں بھوپال والوں نے وارنٹ جاری کر دیے۔ اور وہ بھاگ گیا تھا۔ تو میں ایک سو روپیہ ماہوار کے قریب دیتا تھا۔ تاکہ یہ مجھے مقدمہ کے تمام حالات کی اطلاعیں دیتا رہے۔ مبارک حسین کو خریدے ابھی چند روز ہوئے تھے۔ تو اس سب انسپکٹر پولیس نے مجھے بھوپال سے اطلاع دی کہ دفتر ”ریاست“ کا چپڑا سی مبارک حسین بھی پانچ سو روپیہ دے کر خرید لیا گیا ہے اور اس کی معرفت وہ دوی کاغذات حاصل کیے جا رہے ہیں۔ جو ایڈیٹر ”ریاست“ کے ہاتھ کے کٹے ہوئے ہیں۔ تاکہ ان کو دیکھ کر اور ان کی امداد سے جلسہ سازی تیار کی جاسکے۔ اس اطلاع کے ملنے پر میں مبارک حسین پر عتاب کرنا چھوڑ دیا اور دفتر میں بھی تاکید کر دی کہ اس کی نگرانی کی جائے۔ جب اس کی نگرانی ہونے لگی۔ اور اعتبار نہ کیا

جارا تھا۔ تو اس نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس کی غذاری کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ دفتر سے غائب ہو گیا۔ اور بعد میں علانیہ طور پر بھوپال والوں سے مل گیا۔ اور اس نے ایڈیٹر ”ریاست“ کے خلاف عدالت میں شہادت بھی دی۔ گو اس کی شہادت کی فائدہ بھر قیمت نہ تھی کیونکہ اس پر جو جرح کی گئی۔ وہ بھوپال والوں کے لئے اور زیادہ ہنگامی ثابت ہوئی۔

مبارک حسین امر دہہ کا رہنے والا تھا۔ اور وہاں کے سیدوں کے خاندان میں سے تھا۔ امر دہہ کے سیدوں کو اپنے نسب کے متعلق بہت فخر ہے۔ اور میرا تجربہ ہے کہ یہ جب کبھی کوئی اخلاقی کمزوری یا جرم کر لے لیں۔ تو ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے۔ اور ایک شخص دوسرے کو طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ گو تم ایسا کرتے ہو۔ امر دہہ کے سادات میں سے ہوتے ہوئے تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس غذاری کے بعد مبارک حسین اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی نظروں میں گر گیا۔ یہ دہلی میں جب تک رہا۔ اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم محسوس کرتا۔ امر دہہ گیا۔ تو وہاں بھی اس ندامت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا کیونکہ امر دہہ کے لوگوں کو اس کے حالات کا علم ہو چکا تھا۔ آخر یہ مستقل طور پر اپنی سسرال چلا گیا۔ جہاں غالباً یہ آجکل سائبکلوں کی مرمت کی دکان کرتا ہے۔

مقدمہ کا فیصلہ ہونے لگی ریس ہو چکے تھے۔ مبارک حسین کا مجھے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔ چند برس ہوئے۔ اس کا ایک خط پہنچا جس کا مفہوم یہ تھا۔

”میں نے آپ کا نام کھایا اور نمک حرامی کی۔ مجھے آپ کی ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اور نہ میں یہ خط اس غرض کے لئے لکھ رہا ہوں کیونکہ میں یہاں اپنے گزارہ کے لئے کافی پیدا کر رہا ہوں۔ میرے اس خط لکھنے کی غرض یہ ہے کہ میں جب سے آپ کے ہاں سے آیا ہوں بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے رات کو اچھی طرح سے نیند بھی نہیں آتی۔ میری صرف ایک خواہش ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔ تاکہ میری روح کو تسکین نصیب ہو۔ اور مرنے کے بعد بھی مجھے عذاب برداشت نہ کرنا پڑے۔“

غذاردوں کو معاف کرنے کے اعتبار سے میں بھی سخت ہوں۔ اور اسے چاہے بے رحمی ہی کیوں نہ کیجئے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے غذاردوں سے اتنی نفرت ہے جتنی کسی شخص کو گندگی کے ایک ڈھیر یا ڈلاؤ سے ہو سکتی ہے۔ میں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر اس کا خط آیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔

”میں نے آپ کی خدمت میں خط لکھا تھا مجھے اب تک اس خط کا جواب نہیں ملا۔ میں ذہنی گرفت میں مبتلا ہوں۔ مجھے رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ نہ معلوم مرنے کے بعد میری کیا حالت ہو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ سے غذاری کر کے بہت بڑا گناہ کیا۔ میری آپ سے صرف یہی درخواست ہے کہ مجھے معاف کر دو۔ اور اگر آپ مجھے کسی صورت سے بھی معاف نہ کر سکیں۔ تو میری طرف سے والدہ صاحبہ کی خدمت میں درخواست کیجئے کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ شاید میری روح کو تسکین نصیب ہو۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں میں نے غذاری کر کے بہت بڑا گناہ کیا۔“

میں نے اس خط کے بعد مبارک حسین کو جواب دیا وہ یہ تھا۔  
 ”آپ کے دو خط ملے۔ میں دُنیا میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں۔ مگر عذاری معاف نہیں کر سکتا۔  
 اور نہ تمہاری عذاری کو معاف کرنے کے لئے والدہ سے کہہ سکتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں  
 عذاری کی سزا قدرت کی طرف سے ملے۔ وہ چاہے اس دُنیا میں ہو۔ یا دوسری دُنیا میں۔ اور یقیناً  
 ملے گی کیونکہ میرا یہ ایمان ہے۔ کہ خدا عذاروں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ آپ آئندہ مجھے کہیں  
 خط نہ لکھئے۔“

مبارک حسین کے متعلق میرا بیرونیہ رحم دِل لوگوں کے طبقہ میں سنگدلی اور بے رحمی قرار دیا جائے گا مگر واقعہ  
 یہی ہے۔ جو میں نے لکھا۔ اور عذاری کے متعلق میرے جذبات یہی ہیں۔ جن کا میں نے اظہار کیا۔ اور اس کی وجہ  
 یہ ہے۔ کہ بچپن میں میری والدہ نے بہت کوشش کی۔ کہ میرے خیالات مذہبی ہوں۔ میری عمر بہت چھوٹی تھی۔  
 جب کہ مجھے سردیوں میں بھی سورج نکلنے سے پہلے غل کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا۔ جب جی صاحبِ غیرہ  
 کا پاٹھ کرنا اور گردوارہ میں جانا۔ تو کھانا دیا جاتا اور نہ نہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں سنتوں۔ سادھوؤں اور  
 مہاتماؤں کے ہاں جا کر کٹھا وغیرہ سُننے کے لئے ناکید ہوتی۔ اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا جاتا۔ مذہبی  
 اعتبار سے میرا ذہن بائیس برس کی عمر تک توان اثرات کو قبول کرتا رہا۔ مگر اس کے بعد خیالات میں انقلاب  
 سا پیدا ہوا۔ اور اب جو کیفیت ہے وہ کوئی راز نہیں۔ اس کا اظہار ”ریاست“ کے صفحات سے ظاہر ہے۔  
 مگر بچپن میں بھائی گورداس ریہ سکھوں میں گورد صاحب کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیت ہیں  
 کے کلام میں سے چند اشعار پڑھے تھے۔ جو اب تک ذہن میں تازہ ہیں۔ مبارک حسین کو جواب دیا گیا۔ وہ  
 بھی ان اشعار کے اثرات کا نتیجہ ہے ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

”ایک بھنگن مرے ہوئے کتے کے گوشت کو مُردہ انسان کی کھوپری میں ڈال کر بے جا رہی تھی۔ یہ  
 گوشت شراب میں پکایا گیا تھا۔ اس میں سے گندی بو آ رہی تھی۔ اور اسے ایک ایسے گندے  
 کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا جو عورت کے حیض کے خون میں آلودہ تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ایک  
 شخص نے بھنگن سے سوال کیا کہ کتنا پلید مردہ انسان کی کھوپری قابلِ نفرت۔ شراب پلید عورت  
 کے حیض کا کپڑا پلید۔ جس سے کوئی چھوڑنا بھی پسند نہ کرے۔ اس میں سے بدبو آ رہی ہے۔ پھر  
 اس کھوپری پر نقاب کیوں ڈال رکھا ہے۔ اس کو چھپانے کا کیا فائدہ۔ تو بھنگن نے جواب دیا۔ کہ  
 گو یہ تمام ہشیا اُنہما ہی گندی اور قابلِ نفرت ہیں۔ مگر عذار کی نگاہ ان سے بھی بُری ہے۔ ان اشیاء کو  
 ڈھانپ کر اس لئے جا رہی ہوں۔ کہ کسی عذار کی بُری نظر گھٹنے سے یہ اور زیادہ خراب  
 ہو جائیں گی۔“

عذاروں کے متعلق میرے دلی جذبات کا اظہار ایک اور واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ ابھی حال کا ذکر ہے۔  
 ”ریاست“ کے ناقابلِ فراموش ”کالم میں ایک جگہ سٹوپیاء لال شاگر میرٹھی کا ذکر آگیا تھا۔ جو ”ریاست“  
 میں مترجم تھے۔ اور بعد میں مبارک حسین کی طرح ڈاب بھوپال کے روپیہ سے خرید لئے گئے۔ اس مضمون کو  
 دیکھ کر میرے دوست تیار صاحب فقہوری ایڈیٹر ”نکار“ لکھنؤ کا خط ایڈیٹر ”ریاست“ کے نام پہنچا جس میں

آپ نے لکھا کہ پیارے لال صاحب شاکر آجکل بہت مصیبت میں ہیں۔ لکھنؤ میں ایک دوست کے مکان میں رہتے ہیں۔ بیمار اور قابل رحم حالت میں ہیں اور یہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ان کے متعلق آئندہ کچھ نہ لکھا جائے۔ اور معاف کر دیا جائے۔ اس خط کا جواب ایڈیٹر ریاست نے نیاز صاحب کو بہت مختصر دیا۔ جریہ تھا:-

”غدار مستحق ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر کو بھی ٹھوکر لگائی جائے۔“

میرے یہ جذبات شاید بعض حلقوں میں ناپسند کیے جائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے غداروں سے بہت سخت نفرت ہے۔ اور کوئی غدار کسی فرد واحد کے ساتھ غدار کی کرے یا ملک و قوم کے ساتھ میرے خیال میں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی زندگی مصائب و مشکلات میں بسر ہو۔ مرنے کے بعد اس کو دوزخ یا عذاب نصیب ہو۔ اور لوگ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کو ٹھوکر لگائیں۔

## سی۔ آئی۔ ڈی کے معتبر رپورٹر

کرسمس کا زمانہ کلکتہ میں بہت پُر رونق ہوتا ہے۔ اور لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ چند برس پہلے میں بھی کئی بار کرسمس کے دنوں کلکتہ گیا۔ ایک بار کلکتہ گیا۔ تو وہاں سوشل ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ ہوٹل اخبار نویسین کے دفتر کے قریب تھا۔ اور اس کے مالک ہاشم کرشن ایڈیٹر ”ہمراہ“ کے داماد تھے۔ میں نے ہوٹل کی کتاب میں اپنا نام و پتہ لکھا۔ تو ہوٹل کے مالک کو معلوم ہو گیا۔ کہ میں فلاں شخص ہوں۔ مگر میری کوئی بات چیت نہ ہوئی کیونکہ میں بغیر ضرورت کے بلا وجہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ریل کے طویل سفر میں بھی ہمراہیوں سے کبھی نہ پوچھا کہ کہاں جاؤ گے اور نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور پڑوسیوں کے متعلق کئی کئی برس تک علم نہ ہوا کہ یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

میں جب کبھی ممبئی کلکتہ یا کسی دوسرے بڑے شہر میں جاؤں۔ تو میں اپنے جانے کی اطلاع سوائے ایک آدمی کے دوسرے کسی دوسرے کو نہیں دیتا۔ کیونکہ اطلاع ہونے کی صورت میں سیر و تفریح اور بزنس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ عام دوستوں سے اس روز ملتا ہوں۔ جب واپس جانے کے لئے تیار ہواؤں میں اس سفر میں کلکتہ ایک ہفتہ کے قریب ٹھہرا۔ سیر و تفریح میں بھی مصروف رہا۔ اور بزنس کے لئے بھی بڑی بڑی فرموں کے مالکان سے ملا جب وہاں سے روانہ ہونے میں دد دن باقی تھے تو عنایت صاحب مرحوم ایڈیٹر اخبار ”چونچ“ کو معلوم ہوا کہ میں کلکتہ میں ہوں۔ عنایت صاحب فلمی اخبار نکالتے تھے۔ بہت دلچسپ آدمی تھے۔ اور آپ کا زیادہ وقت طوائفوں اور فلم ایکٹرسوں کے ہاں گزرتا تھا۔ آپ صبح کے وقت ملنے کے لئے تشریف لائے۔ بہت دیر تک باہیں ہوتی رہیں۔ اس زمانہ فلم ایکٹرس میں کون کون بہت عروج حاصل تھا۔ آپ مجھ سے مل کر گئے۔ تو میں کون کون کے ہاں پہنچے۔ اور آپ نے میں کون کو بتایا کہ دیوان سنگھ کلکتہ میں ہے اور کون ہوٹل میں مقیم ہے۔

میں دوپہر کے وقت اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا تو ہوٹل کے دفتر کا چٹراسی آیا۔ کہ کوئی صاحب ٹیلی فون پر ملتا ہے



میں ٹیلی فون پر گیا۔ اور پوچھا۔ کہ کون صاحب ہیں۔ تو جواب ملا کہ ”میں مس کچن ہوں۔ غنایت صاحب ایڈیٹر  
 ”چرچ“ سے معلوم ہوا کہ آپ کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر شام کو میرے ہاں چائے پر آئیے۔“  
 میں نے جواب دیا۔ کہ میں ایک دو دن میں واپس جا رہا ہوں۔ کام بہت زیادہ ہے۔ اس لئے حاضر نہ  
 ہو سکوں گا۔ معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ کا شکریہ ادا رہوں۔ اس پر مس کچن نے کہا کہ نہیں چاہے کچھ ہو۔  
 آپ ضرور تشریف لائیے۔“ میں نے پھر کہا کہ میں نہ آسکوں گا۔ آپ نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ میں ہوٹل میں  
 ہی رہوں۔ شام کو چار بجے وہ اپنی کار لینے کے لئے بھیجیں گی۔ یہ کہہ کر آپ نے ٹیلی فون بند کر دیا  
 شام کو چار بجے مس کچن کی موٹر میں غنایت صاحب تشریف لائے۔ میں ان کے ساتھ مس کچن کے  
 ہاں گیا۔ دو تین اور اصحاب بھی موجود تھے۔ چائے پر باتیں ہوتی رہیں مس کچن نے اپنے گانے کے گراموفون  
 ریکارڈ ڈنڈائے۔ جو اسی ہفتہ بھرے گئے تھے۔ جب رخصت ہونے لگا۔ تو مس کچن نے کہا کہ رات کو دس بجے  
 تھیٹر میں آئیے۔ جہاں کہ وہ کام کرتی ہیں۔ وہ اپنا کام دکھانا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا میں نہ آسکوں گا۔ مگر اپنے  
 غنایت صاحب سے کہا کہ لازمی طور پر لے کر آئیے۔

اُس روز میں کچھ تو دوستوں سے مل چکا تھا کیونکہ کلکتہ سے واپس دہلی جانے والا تھا۔ ہوٹل واپس  
 پہنچنے کے بعد مس کچن کی کار کو تو جھڑو دیا۔ ایک ٹیکسی لی۔ اور سردار سمپورن سنگھ انپیکٹر پولیس کے مکان  
 پہنچا۔ یہ میرے ہم وطن اور رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے۔ چند منٹ ان سے باتیں کیں۔ اور ان کے بچوں کو کچھ لے کر  
 دوسرے دوستوں سے ملنے گیا۔ دو سنتوں سے ملنے کے بعد مارکیٹ میں گیا۔ وہاں سے کچھ سامان اور ایک درجن  
 چھوٹے طوطے خریدے (یہ طوطے چڑیوں کے سائز اور مختلف رنگوں کے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور  
 غالباً جاپان سے آتے ہیں) سامان خریدنے کے بعد واپس ہوٹل پہنچا۔ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب غنایت صاحب  
 تشریف لائے اور ان کے ساتھ تھیٹر گیا (یہ تھیٹر نہ لیا) ایک رائے بہادر کا تھا جس میں مس کچن ایڈیٹر۔ ہزار روپیہ وار  
 پر ملازم تھیں۔ اور چونکہ رائے بہادر ان پر بہت مہربان تھے۔ ان کی پوزیشن تھیٹر میں ایک ڈائریکٹر کی سی تھی۔  
 یعنی جو چاہتیں کرتیں (ہم لوگ تھیٹر میں پہنچے۔ وہاں رائے بہادر صاحب ملے۔ رائے بہادر بھی تشریف فرما  
 تھے۔ رات کو دو بجے تک تھیٹر دیکھا۔ تھیٹر دیکھنے کے بعد میں ہوٹل پہنچا۔ اور کپڑے بدل کر بیٹھا تھا۔ کوئینڈا لگتی  
 ابھی آنکھ لگے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ کہ میرے کمرہ کے دروازہ کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے سمجھا کہ ہوٹل  
 ہے کسی شخص نے غلطی کے باعث اس کمرہ کو کسی دوسرے کمرہ سمجھ لیا ہو گا۔ میں نے آواز دی۔ آپ غلط کمرہ  
 کو کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اس کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی مسافر شراب پئے آیا ہے۔  
 جو میرے کمرے کے باوجود پھر کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا کہ کون ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔“ میرے اس  
 ڈانٹنے کے بعد کوئی جواب نہ آیا۔ مگر دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ مجھے سید غصہ آیا۔ میں اٹھا۔ اور دروازہ کھولا۔ تاکہ  
 رات کے اٹھائی تین بجے دروازہ کھٹکھٹانے والے کو دیکھوں کہ کون ہے۔ اور کہیں ایسا کر رہا ہے جیسے دروازہ  
 کھولا۔ تو دیکھا کہ ایک انپیکٹر پولیس اور اس کے ساتھ چھ سات سب انپیکٹر اور کنسٹیبل دروازے میں موجود  
 ہیں۔ انپیکٹر نے پوچھا کہ کیا آپ کا نام سردار ویران سنگھ ہے۔“ میں نے جواب دیا ہاں۔ میرے اس کہنے پر  
 یہ لوگ کمرہ کے اندر آ گئے۔ اور انپیکٹر نے کہا کہ ”تماشی لینی ہے۔ اور آپ کو گرفتار کرنا ہے۔“ میں نے اطمینان کے ساتھ

کہا۔ بہت اچھا پہلے تلاشی لے لیجئے۔

ان لوگوں نے میرے سامان کی تلاشی لمبی شروع کی۔ ہر چیز اور ہر کاغذ کو غور کے ساتھ دیکھتے اور پڑھتے۔ ان کے ساتھ ایک سکریٹریز بھی تھے۔ جو غالباً ایڈکسٹریبل ہوں گے۔ یہ اس لئے تھے کہ اگر کوئی گورنمنٹی کا خطادفیہ ہو تو پڑھ سکیں۔ جب انھوں نے میرے اٹاچی کیس کی تلاشی لی۔ تو اس میں انھوں نے ریو اور دیکھا۔ ریو اور کو دیکھتے ہی ان کی باجیں کھل گئیں جیسے کوئی گم شدہ۔ شے مل گئی ہو۔ یہ مسرت و خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ریو اور کو انھوں نے لیا تو اس میں اسے گولیاں نکال کر بیٹھ گئیں۔ یہ چھ گولی کا ریو اور تھا۔ ریو اور پر قبضہ کرنے کے بعد انسپکٹر نے مجھے "اینٹر وکشن" شروع کیا۔ ریو اور کہاں سے آیا۔ میں نے کہا دہلی سے۔

کیس سے کیا۔

ابھی بخش اینڈ سنز سے۔

یہ الہی بخش اینڈ سنز کون ہیں۔

سوداگراں بندوق۔

تو کیا یہ ناجائز ریو اور بھی فروخت کرتے ہیں۔

نہیں۔

تو پھر یہ ریو اور انھوں نے آپ کو کیوں کر دیا۔

لائسنس کے باعث۔

اوہ۔ ہمیں اب یہ بھڑا دیتے ہو۔ کہ لائسنس کے ساتھ۔ لائسنس کہاں ہے۔

میں نے اسی اٹاچی کیس کے اوپر کے حصہ میں سے ریو اور کا لائسنس نکال کر ان کو دیا۔ انھوں نے لائسنس کو دیکھا کبھی اسے اور دیکھتے ہیں۔ کبھی بیچتے، کبھی دھنوں کو۔ کبھی ہر کہ جب انھوں نے اس لائسنس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ تو اس کے بعد یہ لوگ بہت مایوسی محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ ہاتھ کر یا شکار جال سے نکل گیا۔ ان لوگوں نے سامان کو اچھی طرح سے دیکھا۔ جب اور کوئی شے نہ نکلی تو مجھے گرفتار کر کے اپنے ساتھ ایک تھانہ میں لے گئے۔ وہاں انھوں نے روزانہ پانچ میں پورٹ درج کی۔ تلاشی لی گئی۔ تلاشی میں ایک ریو اور اور ایک لائسنس نکلا جو قبضہ میں لیا گیا۔ یہ لائسنس غالباً جعلی ہے۔ اور نم نم کو صبح کسٹمر صاحب بہادر پولیس کے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت رات کے چار بجے ہوں گے۔ سردیوں کا زمانہ۔ دسمبر کا مہینہ۔ آٹھ بجے سورج نکلا۔ اور میں دس بجے تک تھانہ کے دفتر کے اسی کمرہ کے اندر ایک پولیس کنسٹیبل کی نگہبانی میں بیٹھا رہا۔ دس بجے یہ لوگ بچے سی۔ آئی۔ ڈی (جس کو کلکتہ میں سپیشل برانچ کہتے ہیں) کے دفتر لے گئے۔ وہاں بچے ایک برآمدہ میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اور میں انتظار کرنے لگا کہ اب کسٹمر پولیس کے سامنے پیش کیا جاؤں گا۔ اس سپیشل برانچ کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ دی دفتر ہے جس کو بنگال کے انارکسٹوں کے متعلق سپیشل حقوق حاصل ہیں۔ یعنی کسٹمر پولیس جس شخص کو چاہے پندرہ روز کے لئے بغیر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے یا ریماڈن لے اپنے قبضہ میں جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔ وہاں کے کنسٹیبلوں سے جو میری نگہبانی پر تھے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ تمام بنگال کے انارکسٹوں کے معاملات اس دفتر کے ماتھ میں ہیں۔ اور اس کا شائبہ تمام بنگال میں ایک جال کی طرح پھیلنا ہوا ہے۔

کیونکہ بنگال میں انارکسٹ کافی تعداد میں ہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ کشر پولیس نو انگریز ہے۔ جو دوسرے صوبجات کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اور ڈپٹی کشر پولیس ایک ہندوستانی عیسائی ہیں۔ جن کا نام غالباً مسٹر بڑی تھا۔ اور یہ اس اسپیشل برانچ کی ادھر کی منزل میں ہی رہتے تھے۔ میں دس بجے سے چار بجے شام تک اس اسپیشل پولیس دفتر کے روم میں ایک کرسی بیٹھا بیٹھتا ہوں۔ کسی دوست کو میرے متعلق کوئی علم نہیں کہ کیا ہوا۔ اور میں کہاں ہوں۔ بیٹھا بیٹھا تنگ آ گیا۔ نہ کوئی بات کرنے والا۔ نہ کوئی اخبار نہ کتاب جس سے وقت گئے۔

چار بجے ڈپٹی کشر پولیس اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر دفتر میں تشریف لائے۔ تو مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور انٹرویویشن یعنی گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو یہ تھا:-

آپ کا نام

دیوان سنگھ

کہاں رہتے ہیں۔

دہلی میں

کھانہ کب آئے۔

ایک ہفتہ ہوا۔

کیوں آئے۔

کرسس دیکھنے اور بزنس کے متعلق لوگوں سے ملنے۔

آپ یہی کیوں نہیں گئے۔ کھانہ کیوں آئے۔

کیونکہ کرسس کے دنوں کھانہ میں بہت رونق ہوتی ہے۔

کیا آپ کو کبھی سزا ہوئی۔

میرا خیال ہے کبھی نہیں ہوئی۔

کیا آپ کبھی گرفتار کئے گئے۔

درجنوں بار۔

(جبران ہو کر) درجنوں بار کس الزام میں۔

مختلف الزامات میں۔

وہ الزامات کیا تھے۔

کو کین۔ امانت میں خیانت۔ پرنسپس پر دیکشن اکیٹ۔ بغاوت۔ توہین۔ مار پیٹ کرنا اور موٹر کو تیز چلانا وغیرہ

خوب۔ یہ گرفتاریاں کب ہوئیں۔

پچھلے کئی برس میں۔

کھانہ میں کس کس سے ملے۔

سردار نجن سنگھ، طالب ایڈیٹر "دیش ورین"، سہرا میں سرما ایم۔ ایل۔ اے۔ ایڈیٹر "دپ"

عنایت صاحب ایڈیٹر چونچ۔ سردار سپہوں سنگھ انپکٹر پولیس اور مس کچن وغیرہ سے۔  
 ”نشواتر“ سردار سپہوں سنگھ انپکٹر پولیس اور مس کچن وغیرہ سے۔

آپ مس کچن سے کیوں ملے۔

اُس نے چائے پر بلایا تھا۔

رہسکراتے ہوئے) خوب ایڈیٹروں کی چائے پارٹی فلم ایکٹرسوں کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔

میں مسکراتے ہوئے) آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری گرفتاری ہوٹل میں ہوئی۔ اگر مس کچن کے ہاں آپ گرفتار کرتے۔ تو آج اخبارات میں شائع ہوتا۔ ایڈیٹر ”ریاست“ مس کچن کے ہاں پکڑا گیا۔  
 یہ سن کر ڈپٹی کمشنر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

اس قہقہہ کے بعد میں نے سنجیدگی کے ساتھ ڈپٹی کمشنر سے پوچھا کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو۔ تو یہ بتائیے کہ میری گرفتاری کیس کیس ہوئی۔ اور اس کا سبب کیا ہے۔

ہمارا جیٹیا کرکس کے باعث کلکتہ آئے ہیں اور یہاں ہیں۔ ہماری اطلاع ہے کہ آپ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ بہت بڑے اناکرکسٹ ہیں۔

یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ اور کہا کہ آپ لوگوں کے ذرائع واقفیت بلاشبہ بہت وسیع اور قابل اعتماد ہیں میرے یہ الفاظ سن کر ڈپٹی کمشنر کچھ تھوڑے سے بھیپ گئے اور پھر باتیں شروع ہوئیں۔ آپ نے کہا۔  
 ریوالورکب لیا۔

چند برس ہوئے۔

کیا یہ لائنس اصلی ہے یا جعلی۔

آپ دیکھ لیجئے۔ کہ اصلی ہے یا جعلی۔

ہاں ہم نے دہلی سے پوچھا ہے۔ ابھی تک وہاں سے جواب نہیں آیا۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ جعلی نہیں۔ کیونکہ کسی شخص کو جعلی لائنس رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ ناجائز ریوالور رکھنے والا ریوالور کو چھپا کر پونڈرہ رکھ سکتا ہے۔ آپ کا سردار سپہوں سنگھ انپکٹر پولیس سے کیا تعلق ہے۔

وہ میرے رشتہ میں بھتیجے ہوتے ہیں۔

اس پر آپ نے سردار سپہوں سنگھ کے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کی جو یہ تھی۔

کیا آپ دی کے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ”ریاست“ کو جانتے ہیں۔

ہاں۔ اچھی طرح سے۔ وہ میرے رشتہ میں چچا ہوتے ہیں۔ کل مجھ سے ملنے کے لئے بھی آئے تھے۔ آج وہ چلے گئے۔ کیونکہ انھوں نے سٹیشن پر اپنے لئے سیٹ ریئر روکرائی تھی۔  
 کیا وہ آج جانے والے تھے۔

ہاں وہ کل مجھ سے کہنے تھے کہ آج جائیں گے۔ انھوں نے اپنے لئے تین بجے والی گاڑی میں ایک برتھ ریزرو کرائی تھی۔

وہ گرفتار ہیں۔ اور یہاں سپیشل برانچ میں ہیں۔  
گرفتار ہیں کس مجرم میں؟  
اُن پر الزام یہ ہے کہ وہ ہمارا جہ پٹیل کو قتل کرنے کے لئے کلکتہ آئے۔  
کیا ان کی تلاشی میں بھی کچھ نکلا۔  
ہاں ایک ریو اور۔

رحیرانی کے ساتھ، ریو اور۔ بغیر لائسنس کے ریو اور۔  
ریو اور کا لائسنس بھی ساتھ ہے۔

اگر ریو اور کا لائسنس بھی ساتھ ہے تو یہ تو سردار دیوان سنگھ کے لئے گریڈ میٹ کی بات ہے کہ وہ قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔

ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر ہمارے آدمی نے جو پنجاب کا سکیم ہے۔ اور ہمارے محکمہ میں ملازم ہے۔ اطلاع دی تھی کہ سردار دیوان سنگھ ہمارا جہ پٹیل کے چرانے دشمن ہیں۔ اور ہمارا جہ کو قتل کرنے کے لئے کلکتہ آئے ہیں۔  
سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ فوراً موٹر میں میرے پاس آئیے۔  
ڈپٹی کمشنر کا یہ ٹیلی فون سن کر سردار سمپورن سنگھ سپیشل برانچ میں پہنچے۔ وہاں ان سے ڈپٹی کمشنر کی وہی باتیں ہوئیں۔ جو ٹیلی فون پر ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔  
آپ کو ریو اور کا لائسنس کیوں ملا۔

ہمارا جہ پٹیل وغیرہ متعدد وادایان ریاست دشمن تھے۔ اور خیال تھا کہ یہ لوگ شاید نقصان پہنچائیں۔  
آپ نے اگر دہلی جانے کے لئے اپنی برتھ ریزرو کرائی تھی۔ تو کیا آپ کے پاس وہ ٹکٹ موجود ہے۔  
جو آٹھ آنہ ریزرویشن فیس بے کر لیا جاتا ہے۔

ہاں۔ میں نے اپنی پاکستان بکس سے ٹکٹ نکال کر دکھایا، یہ ٹکٹ ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے جب یہ ٹکٹ دیکھا۔ تو ان کو یقین ہو گیا کہ ان کسی سی۔ آئی۔ ڈی کے برخوردار نے جو اطلاع اپنے محکمہ کو دی تھی۔ وہ غلط تھی۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے افسوس کا اظہار کیا کہ خواہ مخواہ تکلیف ہوئی ہیں نے کہا معمولی بات ہے۔ ہم لوگ تو تحقیقوں کے لئے ہی پیدا ہوئے۔ ہمارے لئے یہ کوئی نئی اور غیر متوقع بات نہیں۔  
جب تک زندگی ہے تکلیفیں ہمارا ساتھ دیں گی۔

اس گفتگو کے بعد ڈپٹی کمشنر پولیس نے فیصلہ کیا کہ میں سردار سمپورن سنگھ کے ساتھ ہوٹل میں جاؤں۔  
وہاں سے سامان لے کر سردار سمپورن سنگھ مجھے اپنے تھانہ میں لے جائیں۔ وہاں اپنے پاس رات کو رکھیں۔ کیونکہ دہلی کے لئے میل شام کو تین چار بجے چلتی تھی۔ اگلے روز مجھے وہ سٹیشن پر لے جائیں۔  
اور گاڑی میں بٹھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کریں۔ کہ دیوان سنگھ کلکتہ سے چلا گیا ہے۔ چنانچہ سردار سمپورن سنگھ سرکاری موٹر میں میرے ساتھ ہوٹل آئے۔ خریدے گئے طوطوں کے لئے دن بھر نہ داند نہ پانی۔ مجھ بہت تکلیف ہوئی۔ ان کو دانا اور پانی ڈالا۔ سامان باندھا۔ اور اسی گاڑی میں ہم لوگ مع سامان سردار سمپورن سنگھ کے گھر گئے۔ ان کا مکان ان کے تھانہ کے اوپر تھا۔ سردار سمپورن سنگھ نے میری یعنی

ملزم کی آمد کی رپورٹ تھا کہ روزنامہ میں لکھی کہ میں ڈپٹی کمشنر پولیس کے ہاں سے اس تھانہ میں گرفتاری کی حالت میں لایا گیا ہوں۔ ملزم رات بھر رکھا جا کر کل دوپہر کو گاڑی میں سوار کرایا جائے گا۔ رپورٹ لکھنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ موٹر میں سیر کرنے گئے۔ دو تین گھنٹہ تک سیر کرتے رہے۔ واپس آئے۔ بسترہ تیار تھا۔ میں سرگیا۔ صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہوا۔ چائے پی۔ سردار نوجن سنگھ وغیرہ دوستوں کو رات کو ہی علم ہو گیا تھا۔ کہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اور رات کو سردار سمپورن سنگھ کے تھانہ میں ہوں۔ یعنی چچا جان بر غرور دار بھتیجہ کی حراست میں ہیں۔ یہ دوست یہاں بیٹھنے کے لئے آئے۔ دو تین بجے تک یہاں ہی دوستوں کی محفل گرم رہی۔ تین بجے میں دوستوں اور اپنے سامان کے ساتھ سردار سمپورن سنگھ کی "حراست" میں ہی شیش آیا۔ اور گاڑی میں سوار ہوا۔ اور سردار سمپورن سنگھ نے اپنے افسروں کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد سپیشل پولیس میں رپورٹ کی ہوگی۔ کہ ملزم دیوان سنگھ ان کی موجودگی میں ریل میں سوار ہو کر دہلی چلا گیا ہے۔ اور اب ہمارا چہ پٹیا لکھ لکھتے میں کوئی خطرہ نہیں۔

## علامہ مشرقی کی گرفتاری "رمانی"

میں دہلی جیل میں تھا۔ رات کا وقت تھا کہ بڑے دروازہ کی طرف سے اُس وارڈ کی طرف جو جیل کے جنوب مغربی کونہ میں ہے۔ کچھ آدمی آتے جاتے معلوم ہوئے۔ میں نے پہرہ والے ایک نمبر دار سے پوچھا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ آج یہ گڑ بڑ کیسی ہے۔ تو اس نمبر دار نے جاکر پتہ لیا۔ اور واپس آکر بتایا کہ کوئی ٹرالیڈر جیل میں لایا گیا ہے۔ اس نمبر دار کو اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ کون ہے۔ میں معلوم کرنے کا خواہشمند تھا۔ کہ کون ہے۔ مگر رات کو کچھ پتہ نہ چل سکا صحیح آٹھ بجے ہی جب اُس کمرہ کا جس میں ہم لوگ تھے۔ دروازہ کھلا تو میں نے ایک وارڈ سے پوچھا۔ اُس وارڈ نے بتایا کہ فاکسارڈ کے بیڈر علامہ مشرقی صاحب گرفتار کیے جا کر جیل میں لائے گئے ہیں جیل کے اندر بھی ان پر سخت پہرہ ہے۔ کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے۔ تاکہ یہ اپنے مقلدین کو جیل سے باہر کوئی پیغام نہ پہنچ سکیں۔ کچھ دیر کے بعد ظہور ہوا کہ جیل سے باہر خیمے نصب ہو چکے ہیں۔ اور پولیس جیل کی دیوار سے باہر بند و قوف کے ساتھ پہرہ دے رہی ہے۔ تاکہ اگر کھانا جیل پر حملہ کریں۔ تو ان کو روکا جاسکے۔

میں نے دوپہر کے وقت بھتیگیوں کے نمبر دار کو بلایا۔ اور اس کی معرفت (جو کہ علامہ مشرقی کے پاس صرف بھنگی ہی مصطفیٰ کے لئے پاسکے تھے) علامہ کو پیغام بھیجا کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ میں یہاں ہوں اس لئے ایک طرح سے میرا فرض ہے۔ کہ میں بطور میزبان کے آپ کی خدمت انجام دوں۔ علامہ کا جواب شکر یہ کی صورت میں پہنچا۔ اس "دایر ادوسی" (دایر ادوسی اُس امتحان کر کہتے ہیں۔ جو بغیر پرچوں یا کتابوں کے صرف زبانی سوالات پوچھ کر لیا جاتا ہے۔ انڈین سول سروس کے امتحان میں اکثر لڑکے دایر ادوسی کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے کتابوں کی رٹ لگائی ہوتی ہے۔ عام واقفیت نہیں ہوتی اور مختلف قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی سوالات کا جواب نہیں دے سکتے) کی ہمانی اور میزبانی کے علاوہ جیل میں کوئی خدمت

انجام بھی کیا دی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں ہی سرکاری مہان تھے میں مولانا سے مل نہ سکا کیونکہ ان کے پاس سوائے دو تین خدمت گزار قیدیوں اور بھنگی کے کسی دوسرے قیدی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی مگر آپ کے حالات سے دیکھی جاتی ہیں یہ حالات معلوم کرنا رہتا جس روز لاہور میں خاکساروں پر فائر ہوا۔ اور غالباً بیس کے قریب خاکسار مارے گئے۔ اور بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ اسی رات کو مولانا قریل بارغ دہلی سے گرفتار کئے جا کر دہلی جیل میں لائے گئے تھے۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کے چند گھنٹہ بعد یعنی اگلی صبح کو جو اخبارات آئے۔ ان میں مولانا کی گرفتاری اور لاہور کے فائرنگ کی تفصیلات تھیں۔

میں علامہ مشرقی سے آج تک کبھی مل نہیں سکا۔ کیونکہ کسی ایسے سے بھی نہیں ملے کی کوشش یا خواہش نہیں کی۔ اور صرف اُن لیڈروں سے واقفیت ہے۔ جن کے ساتھ ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں جیل میں میری خواہش تھی کہ آپ سے ملتا۔ اور خاکسار ازم کے متعلق باتیں ہوتیں۔ مگر میں آپ سے مل نہ سکتا تھا کیونکہ اس کی اجازت نہ تھی میں آپ کے حالات معلوم کرنے میں مسلسل دلچسپی لیتا رہا۔ دوپہر کو گو دام کے قیدی کلرک میرا پیارا سنگھ (یہ صاحب پہلے پڑاٹر تھے اور تین تارن کے رہنے والے تھے۔ ایک مقدمہ میں قید ہو گئے تھے) سے معلوم ہوا کہ علامہ مشرقی نے اپنی خوراک اور ضروریات کے لئے ایک طویل فہرست پینل سے لکھ کر بھیجی ہے جس میں چاول، گڑشت، چھلی، انڈے، مرغی، تبا کو قہم اعلیٰ، خالص گھی اور مصالحہ وغیرہ میں کے قریب اثنا ہیں۔ مولانا کے لئے منظور دی تو سو اور دوپہر روزانہ کی ہے۔ مگر یہ انڈا ٹٹ کافی رقم کا ہے جیل والے مولانا کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ کل تو لاہور میں فائرنگ ہوا۔ خاکساروں کا ابھی پڑاٹر ٹٹ بھی ختم نہیں ہوا۔ اور جو خاکسار گرفتار ہوئے ان کے گھروں میں قائم چھار ہا ہو گا۔ مگر یہ علامہ یہاں تو رہے۔ پلاؤ اور چھلی کے کباب اڑانے کی فکر میں ہیں۔ میں نے سردار پیارا سنگھ سے کہا کہ وہ فہرست مجھے دکھائیے۔ اس فہرست کے نہ تو جیل میں کسی ریکارڈ کے رکھنے کی ضرورت تھی۔ اور نہ یہ کوئی سرکاری دستاویز تھی۔ سردار پیارا سنگھ نے علامہ مشرقی کے ہاتھ کی پینل سے لکھی ہوئی یہ فہرست مجھے لادی۔ اور میں اس فہرست کو دیکھ کر زبان رہ گیا۔ اور مجھے خیال آیا کہ اگر بھی واقعات ہمارا گناہی کے ساتھ پیش آتے۔ تو وہ آج یقیناً اگر مرن برت نہیں۔ تو تین ہفتوں کا فاقہ ضرور شروع کر دیتے۔

اس فہرست کے پہنچنے کے دو گھنٹہ بعد سردار پیارا سنگھ ایک اور سلیپ لے آئے۔ جو مولانا نے سخت الفاظ کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجی اور جس میں ٹھکانہ لہجہ میں شکایت کی گئی۔ کہ سامان اسباب کیوں نہیں پہنچا۔ اس کے بعد شام کو ایک اور سلیپ پہنچی۔ جس میں دوسری اشیا کے علاوہ کاغذ پینل وغیرہ کا بھی مطالبہ تھا۔ یہ سلیپ سردار پیارا سنگھ میرے پاس ہی چھوڑ گئے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ ایک بے معنی پڑے تھے۔ مگر میں نے ان کو بطور "تبرک" کے احتیاط سے اپنی کتابوں میں رکھ لیا۔ جو اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اور شاید پچاس ساٹھ یا سو سال کے بعد یہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر سکیں۔

مولانا بچارے کو تو علم نہیں۔ مگر ان کی ان تحریروں کو دیکھ کر جیل کے افسران کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور میں جب اس مذاق کے متعلق سنتا تو مجھے بے حد اندوس ہوتا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر پنجاب میں سے سرسکندر حیات کی ہر دیکری ختم کی جا سکتی ہے۔ اور پنجاب کے زمیندارہ مسلم پر چٹ لگائی جا سکتی ہے تو

صرف خاکساروں کے ذریعہ کیونکہ احراریوں کا اثر وقتاً در وقت ختم ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ میں کوئی جان نہ تھی۔ اور مسلم لیگی خود خان بہادروں اور خاں صاحبوں کا ایک مجموعہ تھے۔ چنانچہ میں اسی لئے خاکسار تحریک کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا اور ان کے حق میں لکھتا۔ اور میری اس خدمت یا تعریف کے باعث خاکساروں نے میری سلامی مقرر کی تھی۔ یعنی جب میں ان کے کیمپ میں جاؤں تو یہ سلامی دیں۔ مگر جب علامہ مشرقی کا ذہنی افلاس اور ان کی حرکات دیکھیں۔ تو مجھے یقین ہو گیا۔ کہ علامہ کی رہنمائی میں خاکسار تحریک کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا۔ کہ علامہ کا کانگرس گورنمنٹوں کے زمانہ میں یوپی گورنمنٹ سے معافی مانگنا اور رہائی حاصل کرنا تعجب انگیز نہ تھا۔ اور ایسا کمزور، بزدل۔ لالچی اور عاقبت ناپائیدار لیڈر گورنمنٹ کے ہاتھوں ہر وقت مارا جاسکتا ہے۔

مولانا چند روز دہلی جیل میں رہے۔ ان کے حالات کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا کی تحریک کو اگر گناہ کرنے میں یقیناً ایک لاجواب شخصیت ہیں۔ مگر اس تحریک کو چلانا اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ مولانا کے متعلق جیل کے ان حالات کے بعد آپ کی دہلی جیل سے روانگی بے حد دلچسپ ہے۔

سہ پہر کا وقت تھا جیل کے دروازہ کے باہر اور جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ سلیج پولیس کا پہرہ تھا۔ تاکہ کوئی شخص جیل پر حملہ نہ کر سکے جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹوئس (جو دہلی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھے) جیل میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ شہرک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس متعدد انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور موٹریں تھیں۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ علامہ کو ریل میں سوار کر کر دیلور جیل (صوبہ مدراس) میں لے جائیں۔ جہاں کہ آپ نظر بند رکھے جائیں گے۔ مسٹر ٹوئس جب ان کو جیل سے روانہ کرنے کے لئے جیل میں آئے۔ تو بہت پریشان تھے۔ کیونکہ جیل سے کچھ نا معلوم پر خاکسار چکر لگا رہے تھے۔ شہر میں خاکساروں کا اجتماع تھا۔ خاکسار عدم تشدد ہیں یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ علانیہ تشدد کے حق میں ہیں۔ مسٹر ٹوئس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ فکر کہ جب وہ علامہ کو جیل سے باہر نکالیں گے۔ اگر علامہ نے دروازہ پر ہی جلسے سے انکار کر دیا۔ یا موٹر سے چھلانگ لگا دی۔ اور خاکساروں اور جیل یا پولیس کے حکام کے درمیان تصادم ہو گیا۔ تو بہت بدنامی ہو گی۔ اور شاید لاہور کی طرح یہاں بھی فائرنگ ہو۔ یہ افسر اس تشویش میں تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ علامہ کو کس طریقہ سے جیل سے نکال کر ان اضریت کے ساتھ گاڑی میں سوار کرایا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال تھا کہ خاکساروں کو علم ہو گیا۔ تو شاید یہ بلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم یا ٹرین پر حملہ کریں۔

اس زمانہ دہلی جیل میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر گینیش داس آند بہت ہوشیار اور سمجھدار افسر تھے۔ یہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں جیل میزول پر اقتدار پیجھے جاتے۔ اور جب کبھی کسی افسر کو کوئی مشکل پیش آتی۔ تو وہ ان سے مشورہ لیتا۔ ان کی قابلیت کے باعث مسٹر ٹوئس ان پر بہت بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔ جب مسٹر ٹوئس کو لاگنیش داس نے پریشان دیکھا۔ تو آپ نے مسٹر ٹوئس سے کہا کہ فکر نہ کیجئے۔ وہ خود سب انتظام کر دیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طریقہ سے کام ہونا چاہئے۔ چنانچہ علامہ کی روانگی وغیرہ کا تمام کام لاگنیش داس کے سپرد کر دیا گیا۔ آپ علامہ مشرقی کے پاس گئے اور جاتے ہی ایک سنسنی پیدا کرنے والی خبر سناتے ہوئے



علامہ سے ذیل کی گفتگو کی۔

لاگنیش داس :- علامہ صاحب مبارک صبح

علامہ :- کیوں کیا بات ہے۔

لاگنیش داس :- آپ کی رہائی کا حکم ہو گیا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ آپ صوبہ دہلی سے باہر نکل جائیں اور کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ تاکہ یہاں صوبہ دہلی کے علاقہ میں شور و شر نہ ہو۔ دہلی سے باہر آپ یو۔ پی میں جائیے یا پنجاب میں جہاں بھی آپ کی مرضی ہو جائیے۔ دہلی کا جیت کشتن صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے علاقہ میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

علامہ :- مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ میں چپ چاپ یہاں سے جانے کے لئے تیار ہوں۔

لاگنیش داس :- گورنمنٹ چاہتی ہے کہ آپ پولیس کی نگرانی میں یہاں سے متحرک نہ ہوں کہ یو۔ پی کا علاقہ ہے) تک جائیں۔ اور وہاں سے جہاں چاہیں چلے جائیں۔

علامہ :- میں تیار ہوں۔ کسی کو اس کا علم نہ ہو گا اور میں خاموشی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

لاگنیش داس :- میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں جیل سے باہر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان سے آپ کے شرط قبول کرنے کے متعلق کہہ آؤں۔

لاگنیش داس یہ کہہ کر علامہ کے وارڈ سے باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر ادھر آئے مگر گھوم کر پھر واپس گئے۔

اور کہا کہ سب فیصلہ ہو گیا ہے۔ سامان بندھوا لیے۔ چنانچہ دو قیدی لگا کر علامہ کا سامان بندھوا دیا گیا۔

علامہ نے خوشی و مسرت کے ساتھ خود اپنے سامان کو بندھوا لے کر نگرانی کی۔ آپ نے حقہ اور قہا کو کر

احتیاط سے علیحدہ رکھا۔ تاکہ متحرک راستہ میں دقت نہ ہو۔ کیونکہ مولانا ظفر علی کی طرح آپ بھی حقہ کے بہت

شوقین ہیں۔ سامان تیار ہو گیا۔ تو لاگنیش داس نے علامہ کو نقیبن دلاتے کے لئے کان میں کہا کہ چونکہ لاہور

میں بہت سے فاکسار مارے جا چکے ہیں۔ اس لئے چند روز یو۔ پی کے کسی مقام پر رہئے۔ فی الحال پنجاب

میں نہ جائیے۔ تڑا چھا ہو۔ علامہ نے اس نیک رائے "کاشکریہ ادا کیا۔ اور آپ مع سامان مقرر کے لئے

روانہ ہوئے۔ جیل پر آپ کے استقبال یاروانگی کے "پرڈیشن" میں شامل ہونے کے لئے مسٹر رائس۔ سٹی

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خان بہادر خواجہ (مجھے نام یاد نہیں رہا۔ یہ بچا رہے دہلی میں ہی بیمار ہو گئے تھے۔ اور غالباً

ان کا اردن ہسپتال میں ہی انتقال ہو گیا تھا) اور کئی فیکٹری سب ان پکٹر وغیرہ مع کار کے موجود تھے۔ علامہ مع سامان

و حقہ کے موٹر میں بیٹھے۔ ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے۔ آپ کو خاموشی کے عالم میں نئی دہلی کے سٹیشن پر لایا گیا۔

جہاں در اس جلسے والی گریڈ ٹرنک ایکسپریس منتظر تھی۔ ریلوے سٹیشن پر پہنچے ہی آپ کو سینکڑے کلاس کے

ریزرو خانہ میں سوار کرایا گیا۔ جو پولیس کو لے کر بڑے سٹیشن سے لیا تھا۔ دہلی پولیس کے انسروں نے علامہ کو خدا حافظ

کہا۔ اور گاڑی روانہ ہوئی۔

مقرر کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں پہنچنے سے پہلے علامہ اسی خیال میں تھے کہ وہاں آپ آزاد کر دیئے جائیں گے

گاڑی جب مقرر کے سٹیشن پر پہنچی۔ تو آپ اپنا سامان منہالنے اور قلیوں سے سامان اٹھانے کے لئے اپنی سیٹ

سے اُٹھے۔ آپ کی اس جلد بازی کو دیکھ کر ساتھ جانے والی پولیس کے قافلہ کے افسر نے آپ کو تیار کیا کہ حضرت متھرا

آپ نہ آتر سکیں گے۔ صوبہ مدراس کے دیلورجیل میں جائیں گے۔ جہاں کہ آپ کو تا حکم نامہ نظر بند کیا جائے گا۔ علامہ مشرقی کے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی شے کو حاصل کرنا اھل اس کو قائم رکھنا علیحدہ علیحدہ حیثیتیں ہیں۔ یعنی بعض لوگ ایک شے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ بعض حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور بعض حاصل بھی کر سکتے ہیں۔ اور اس کو قائم بھی رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کا گندھی کسی تحریک کو جاری بھی کر سکتے تھے۔ اور اس کو قائم بھی کر سکتے تھے۔ پنڈت جواہر لال کسی تحریک کو غالباً جاری نہیں کر سکتے۔ مگر اس کو قائم خوب رکھ سکتے ہیں۔ اسٹرنار اسٹیک نئی تحریک جاری نہیں کر سکتے اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ مسٹر جناح تحریک جاری کر سکتے تھے۔ اس کو قائم رکھنے کی ان میں صلاحیت بہت کم تھی۔ مرحوم مولانا محمد علی کسی تحریک کو جاری کرنے کی بھی قابلیت رکھتے تھے۔ اور اس کو قائم رکھنے کی بھی۔ بھائی پرانند میں کسی تحریک کو جاری کرنے کی قابلیت بالکل نہ تھی تحریک کو قائم ایک حد تک رکھ سکتے تھے۔ مرحوم لالہ لالہ جی میں تحریک کو جاری کرنے کی بہت بڑی قابلیت تھی۔ مگر تحریک کو قائم نہ رکھ سکتے تھے اسی طرح علامہ مشرقی میں کسی تحریک کو آگے نہ لگانے کرنے اور اس کو جاری کرنے کی بہت بڑی قابلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ مگر چونکہ آپ طبعاً بزدل اور کمزور ہیں۔ اور خطرات کو لبیک نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے آپ کسی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلا نہیں سکتے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ خاکسار تحریک موت کی پٹھیاں لے رہی ہے۔ اور اگر یہ تحریک کسی ایسے لیڈر کو سپرد کر دی جاتی جو قربانی کر سکتا۔ اور ہاتھ کا گندھی کی طرح موت کی پروا کرنے والا ہو تو اس مفید اور اچھی تحریک میں پھر زندگی پیدا کی جاسکتی تھی۔

## برٹش گورنمنٹ کی ایوان ریاست کے متعلق مصلحتیں

کئی برس کا ذکر ہے سنٹرل انڈیا اور دہلی و تانہ کے علاقہ میں جبل ندی کے قریب ایک مشہور ڈاکو ڈنگر سنگھ تھا۔ یہ ڈنگر سنگھ ریاست گوالیار اور دھولپور کے درمیان کے جنگلات میں رہتا تھا۔ اور گوالیار اور راجپوتانہ کی ریاستوں اور جڑیلو آگرہ کے جاگیرداروں اور شاہی کاروں کے ہاں ڈاکے ڈالتا۔ اس نے اپنی زندگی میں ڈاکے ڈال کر لاکھوں روپیہ پیدا کیا۔ اور غریبوں، محتاجوں اور ضرورتمندوں کو لاکھوں روپیہ ہی خیرات میں دیا۔ جس جن علاقہ میں اس نے ڈاکے ڈائے وہاں کے امیر لوگ اس کا نام سن کر کانپ اُٹھتے تھے۔ اور غریب لوگ اس کو ڈھائیں دیتے تھے۔

ریاستوں نے تو اس ڈنگر سنگھ کی گرفتاری کے لئے کوشش نہ کی۔ اور اگر کی تو برائے نام یعنی جب کبھی کوئی ڈاکہ چڑا۔ ڈاکہ کے دو چار روز بعد پولیس تفتیش و تحقیقات کے لیے ڈاکہ کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور پڑوسیوں کے بیانات لے لئے۔ مگر آگرہ کے علاقہ کے لوگوں نے جب دوا دیا کیا۔ تو گورنر پولی نے ڈنگر سنگھ کی گرفتاری کے لیے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر نیگ کو مقرر کیا۔ یہ مسٹر نیگ غیر معمولی جفاکش انسان تھے۔ ریاست جے پور میں بھی انگریز جنرل پولیس اور بعد میں غالباً پولی میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ جب مسٹر نیگ انگریزی پولیس کی ایک بری جمیٹ کے ساتھ دھولپور اور گوالیار کے درمیان علاقہ کی

پہاڑیوں میں ڈونگر سنگھ کا تقاب کر رہا تھا۔ تو ڈونگر سنگھ کا میرے پاس خط پہنچا۔ جو ہندی زبان میں لکھا تھا۔  
 (یہ خط پڑانے کا غنڈت میں شاید اب بھی کہیں پڑا ہوگا) اس میں ڈونگر سنگھ نے لکھا کہ راجپوتانہ کی ایک  
 ریاست کا مہاراجہ جو اس کے ڈاکے ڈالنے میں امداد دیتا تھا۔ اور اس سے ڈاکہ کے مال میں سے حصہ لیتا  
 تھا۔ وہ اب مشہرہ نگ کی امداد کر کے اُسے پکڑ ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اور وہ (یعنی ڈونگر سنگھ) ایڈیٹر ریاست  
 سے بل کر تمام اصل واقعات بتانا چاہتا ہے۔ اس خط میں اس نے یہ بھی لکھا کہ یہ اخبار ریاست کا  
 باقاعدہ مطابعہ کرتا ہے۔ اس کے دل میں ایڈیٹر ریاست کی مہادری کے لئے بہت عزت ہے۔ اور  
 اس نے اخبار ریاست کی امداد کے لئے بیس ہزار روپیہ نقد اور کچھ جواہرات محفوظ رکھے ہیں۔ اور جب  
 کبھی ایڈیٹر ریاست سے ملے گا۔ تو یہ روپیہ اور جواہرات اس وقت اُسے خود دے گا۔  
 جیسی اس خط کو دیکھ کر حیران تھا کہ یہ خط کس نے بھیجا۔ اس لفاظی پر میری ریاست گوالیار کے ایک ڈاکہ خانہ کی تھی۔  
 اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خط کھنڈے والے کو جواب دوں تو کہاں کیونکہ اس پر کوئی پتہ نہ لکھا تھا۔  
 پانچ چھ روز کے بعد ایک اور خط ملا۔ یہ خط بھی ڈونگر سنگھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لکھا کہ اس کا لڑکا جھانسی  
 کے سکول میں پڑھتا ہے۔ اور اس نے اپنے لڑکے سے کہا ہے کہ وہ خود دفتر ریاست میں جا کر ایڈیٹر ریاست سے  
 ملے۔ اور تمام حالات بتائے۔

اس خط کے بعد ایک اور خط ملا جس میں ڈونگر سنگھ نے لکھا کہ اس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا۔ مگر نہ تو لڑکے  
 میں ایڈیٹر ریاست کے پاس جانے اور تمام حالات بتانے کی جرات ہے۔ اور نہ خود اس نے مناسب سمجھا۔  
 کہ لڑکا جائے کیونکہ لڑکا چھوٹی عمر کا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بچہ کسی وجہ سے گرفتار ہو جائے۔ تو پولیس کے نوڈ میں  
 آکر تمام حالات بتا دے۔ یہ خود دہلی آکر بیٹے گا۔

اس خط کے ایک ہفتہ کے بعد ایڈیٹر ریاست کو ایک ٹیلی فون آیا۔ ٹیلی فون کرنے والے نے اپنا نام ڈونگر سنگھ  
 بتایا۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بند جیل کھنڈ کا رہنے والا ہے۔ کیونکہ اس کی بات چیت میں  
 بند جیل کھنڈی زبان رچ جھانسی گوالیار اور دنیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے) کے الفاظ زیادہ تھے۔ اس نے پوچھا۔  
 کہ یہ بلنا چاہتا ہے کہاں بل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ دفتر ریاست میں آجائیے۔ اس نے کہا کہ وہاں  
 لوگ ہوں گے۔ شاید اس کو کوئی پہچان لے۔ اس نے دفتر ریاست میں آنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا کہ  
 آپ رات کو آ سکتے ہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ اس کی فزنگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ کسی شخص پر ہتیار نہیں  
 کرنا کیونکہ اس کی گرفتاری کا بہت بڑا انعام مقرر ہے۔ اگر گرفتار ہو گیا۔ تو جھانسی کی سزا کا سوال ہے کیونکہ اس نے  
 اپنی زندگی میں کئی قتل کئے۔ یہ قدم قدم پر عطا ہے اور میں اس سے کہیں شہر سے باہر لوں۔ چنانچہ بات چیت کے بعد  
 فیصلہ ہوا کہ اگلے روز شام کے وقت میں دہلی وردانہ سے باہر جہاں پولیس کا سپاہی ٹریفک کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔  
 پینچ جاؤں پہچان کے لئے میرے ہاتھ میں اخبار ریاست کا ایک پرچہ ہو۔ اور ڈونگر سنگھ وقت مقررہ پر وہاں پہنچ  
 جائے گا۔ وہاں سے ہم شہر سے باہر دوڑ جا کر باتیں کریں گے۔

میں اگلے روز وقت مقررہ پر اپنی کار میں دفتر ریاست سے روانہ ہوا چونکہ کئی والیان ریاست مخالف  
 ہیں۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی سازش ہو۔ میں نے اپنے ریوایر میں گولیاں بھر کر اور لاک لگا کر ریوایر اپنے جیب

میں ڈال لیا اور زیباست کا ایک پرچہ لے کر دہلی دور وازہ سے باہر سفر کر رہے جگہ پر پہنچ گیا۔  
 میں ایک گھنٹہ کے قریب وہاں ڈونگر سنگھ کا انتظار کرتا رہا۔ مگر ڈونگر سنگھ نہ آیا۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی۔  
 کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس ہمارا جہ کے تمام حالات معلوم کرنا۔ جو ڈاکوؤں سے جھڑپ کے خوف ڈاکے ڈولنا ہے۔ یا اس  
 ہو کر واپس دفتر میں چلا آیا۔ رات کو سوچتا رہا کہ کیا معاملہ ہے۔ ڈونگر سنگھ کیسے نہ پہنچا۔  
 اگلے روز دس بجے کے قریب پھر ٹیلی فون آیا۔ ڈونگر سنگھ نے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اپنی وعدہ شکنی کے  
 لئے معافی چاہی اور کہا۔ کہ جب وہ جائے مقررہ پر جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو اس کو خیال آیا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائے۔  
 اس کو وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس لئے نہیں آسکا۔ اور وہ اپنے کسی عزیز سے عزیز پر بھی بھروسہ نہیں کیا۔  
 کیونکہ اس کو زندگی میں بہت لوگوں نے دھوکہ دیا۔ اور خدائیں کہیں میں نے جواب دیا۔ کہ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد  
 نہ تھا۔ تو آپ خط ہی نہ لکھتے۔ اور نہ ملنے کی کوشش کرتے۔ اس بات حقیقت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں  
 کسی شخص کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اور اس کو ہر وقت یہ خوف ہے کہ نہ معلوم کون شخص روپیہ کے لئے  
 میں اس کو گرفتار کرادے۔ اور انجامِ جہل کرے۔ ٹیلی فون میں اس نے بتایا کہ یہ واپس دھوپور کے جنگلوں میں  
 جا رہا ہے۔ اور وہاں سے تمام حالات تفصیل کے ساتھ لکھے گا۔

اس ٹیلی فون کے دس پندرہ روز بعد ڈونگر سنگھ کا ایک طویل خط ہندی زبان میں ملا جس میں اس نے  
 اپنے جھنڈ اور ہمارا جہ کے تمام حالات لکھے اور تاریخ وار بتایا کہ اس نے کہاں کہاں ڈاکے ڈالے۔ کتنا لٹنا روپیہ  
 اس نے ڈاکوؤں میں لیا۔ کتنا اس ہمارا جہ کو دیا۔ اور ڈاکے کے سامان میں سے کون کون سا سامان اس وقت ہمارے  
 کے ہاں کس کس جگہ کام آ رہا ہے۔ اس خط میں اس نے مجھ سے درخواست کی۔ کہ میں یہ تمام واقعات گورنمنٹ  
 تک پہنچا دوں۔ اور ان کو اپنے اخبار میں بھی لکھوں۔

اس خط کو پڑھ کر میں کئی روز سوچتا رہا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک دالے ریاست کا روپیہ کے لئے ڈاکے  
 ڈولنا۔ جھنڈ لینا۔ اس ڈاکو کو پناہ دینا۔ اور جب اس ہمارا جہ پر شک کیا گیا۔ تو اس ہمارا جہ کا اس ڈاکو کے  
 ساتھ غداری کر کے اس کو گرفتار کرانے میں امداد دینا کتنا بڑا ظلم اور بے ایمانی ہے۔

میں کئی روز سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے ریاست میں ان واقعات کے  
 متعلق اس ہمارا جہ کا نام لکھے بغیر ایک نوٹ بھی لکھا۔ مگر وہ کافی نہ تھا۔ اگر نام لکھتا ہوں۔ اور کھلے الفاظ میں  
 الزام لگاتا ہوں۔ تو ان واقعات کا میرے پاس ثبوت کیا ہے۔ کئی روز سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا۔ کہ  
 سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کی معرفت یوپی کے گورنر تک یہ معاملہ پہنچانا چاہئے۔ کیونکہ یہ ڈاکے زیادہ تر ضلع آگرہ  
 میں ڈالے گئے تھے۔ اور ڈونگر سنگھ کے خط کے مطابق واقعات کا ثبوت ضلع آگرہ سے مل سکتا تھا۔  
 میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کو لکھا۔ کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس ڈونگر سنگھ کا خط آیا ہے۔

جس میں اس نے اپنے جرائم کا اقرار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ اس کے جرائم میں ایک ہمارا جہ بھی سفر کیا ہے  
 اور اس نے اپنے خط میں اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جواب آیا کہ میں اس سے فوراً  
 بلوں۔ مگر میں اس کے بعد بیمار ہو گیا۔ خیال تھا کہ جب نواب بھوپال دالے مقدمہ میں ہوشنگ آباد  
 جاتے گا۔ تو راستہ میں آگرہ آکر اس سپرنٹنڈنٹ پولیس سے بھی ملوں گا۔ اور خط دکھاؤں گا۔ میں

بیماری کے باعث کئی روز تک ہوشنگ آباد نہ جاسکا۔ اتنے میں ڈوگر سنگھ کے بھائی (جس کا نام غالباً بیٹا تھا) کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ڈوگر سنگھ غنیمت میں بیمار ہو کر جیل ندی کے کنارہ محل میں انتقال کر گیا ہے۔ اور وہ آخری وقت بھی ایڈیٹر تریاست "گریا دکر تار" اور اس نے مرتے ہوئے کہا تھا کہ ایڈیٹر تریاست کو باقہ جوڑ کر جے رام جی کی لکھی جائے۔

ڈوگر سنگھ کے مرنے کے بعد اس خط کے مطابق گورنمنٹ کا تحقیقات کرنا اور ہمارا جو کمزور دنیا ممکن نہ تھا۔ میں اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملنے کے لئے نہیں گیا۔ کیونکہ اسے لاحق سمجھا۔ اس کے عرصہ بعد ایک بار ان واقعات کے متعلق خان بہادر تصدق حسین ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ایٹمی جیس بیورو گورنمنٹ ہند ایک ڈیڑہ ذکر آیا۔ تو تصدق حسین صاحب نے بتایا کہ تمام واقعات اور اس ہمارا جے کے خلاف لگائے گئے الزامات درست تھے۔ اور بی بی کی پولیس کے اعلیٰ افسران کو اس کا علم تھا مگر گورنمنٹ مصلحتاً کچھ کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ایک ہمارا جے کے خلاف اتنے بڑے الزام کے متعلق تحقیقات کا ہونا خود گورنمنٹ کے لئے بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوتا۔

## پانی کا اثر طبائع پر

پروفیسر سراج الدین آذر دہلی میں انسپکٹر آف سکولز تھے۔ بے تکلف پنجابی۔ یوپی اور دہلی کی تقصیر کے دشمن۔ بے مدد شخص شعر و ادب کے دلدادہ۔ نہ صرف اعلیٰ درجے کے سخن فہم بلکہ سخن گو بھی۔ آردو فارسی دونوں سے دلچسپی۔ ڈاکٹر اقبال کے دوستوں میں سے۔ اور آردو زبان کے عاشق۔ آپ کا کوئی دن ایسا نہ گزرتا۔ جب کہ آپ انجمن ترقی ہند کے دفتر میں مولانا عبدالحق کے پاس چند گھنٹے نہ گزارتے۔ پروفیسر آذر ایڈیٹر "تریاست" کے بھی کرم فرما اور گہرے دوستوں میں سے تھے اور باوجود اس بات کے کہ میں زیادہ مصروفیت کے باعث دوستوں کو اپنے ہاں بہت کم دعوں دیتا کوئی ہمدینہ ایسا نہ گزرتا۔ جب کہ آذر صاحب گپ بازی کے لئے اپنے ہاں ڈیڑہ نہ بگاتے۔ ایک روز آپ نے رات کو کھانے پر بلایا۔ میں جب گیا۔ تو وہاں ایک درجن کے قریب دوسرے اصحاب بھی موجود تھے جو سب کے سب پنجابی تھے۔ آذر صاحب نے فرمایا کہ یہ مجلس خالص طور پر پنجابی اصحاب کی ہے۔ سرسکندر جات کی جو رسد کش یعنی پنجاب سے باہر کے کسی شخص کو نہیں بلایا گیا۔ اور بات چیت صرف پنجابی زبان میں ہوگی۔ اس دعوت میں مختلف موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ پنجابی لطائف نے بھی بہت دل چسپی پیدا کر دی۔ اور باتوں باتوں میں آذر صاحب نے سب سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ ہر شخص ایمان داری کے ساتھ بتائے کہ دہلی میں اگر اس نے کیا کچھ حاصل کیا۔ یعنی علمی۔ مالی یا دوسرے اعتبار سے اس نے دہلی میں اگر کیا فائدہ حاصل کیا۔

سب لوگوں نے بتانا شروع کیا کسی نے کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ پیدا کیا۔ کسی نے بتایا کہ اس نے علمی اعتبار سے یہ مبالغہ طے کئے کسی نے ظاہر کیا کہ اس نے فلاں فلاں ترقی و پرویش حاصل کی۔ جب میری باری آئی۔ تو میں نے کہا کہ چونکہ آپ لوگ سچ بتا رہے ہیں۔ اور سچ پوچھ رہے ہیں۔ اس لئے میں سچ عرض کرنا ہوں۔

کہ دہلی میں آنے کے بعد مالی اعتبار سے میرے قرضہ میں تو کئی گنا اضافہ ہوا۔ اور جب دہلی میں آیا تھا۔ تو بے ہ  
 خلص اور ہماں نواز تھا۔ مگر اب طبیعت میں کمی نہ بن اور خرد غرضی پیدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ پہلے اگر کوئی دوست  
 ایک در روز کے لئے بھی آ جاتا۔ تو اس کو کئی کئی ہفتہ تک جانے نہ دیا جاتا۔ وہاں کی خدمت گزاروں میں لطف  
 اور حظ محسوس ہوتا کہ کئی بار ایسا ہوا کہ چھ چھ ماہ اور ایک ایک سال تک دست منتقل ہماں کی صورت میں مقیم  
 اور ایک دوست سٹر محسن ایڈیٹر ”ادوہ اخبار“ لکھنؤ بعد میں ایسی ایڈیٹر میں ملازم ہو کر دہلی تشریف لا  
 تھے۔ غالباً دو سال تک بطور ہماں رہے۔ اور جب بھی وہ اپنے لئے مکان کے کر جانا چاہتے تو ان کو روک لیا جا  
 مگر اب کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی دوست دہلی میں تشریف لائے کی اطلاع خط یا زار کے ذریعہ دیتا ہے۔ تو میر  
 سببشن نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسری جگہ قیام کر لے۔ اگر وہ پھر بھی آجائے۔ تو ہماں کی خدمت گزاروں کی طبیعت پر ایک  
 باری محسوس ہوتی ہے۔ اور اس فرق کی وجہ دہلی کا پانی اور دہلی کی فضا ہے۔ جس کا اثر طبیعت پر ہوا۔ گویہ نہ  
 دوست خود بھی دہلی کی فضا کے اس اثر کو اپنے اندر محسوس کرتے تھے۔ مگر تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ فکر  
 یہ خیال بھی نہ تھا کہ میں اس کمزوری کا اقرار کروں گا۔ چنانچہ میں نے اس کے ثبوت میں تفصیل کے ساتھ ان کو  
 کے وہ واقعات بتائے جن کا میری ذات کے ساتھ تعلق تھا۔

میں جب مانسہرہ ریاست پٹیاں میں سیٹھ بیل پرکاش کرنا تھا۔ اس زمانہ دہلی میں ایک شاعر فشی عبدالحق  
 قلیق رہتے تھے۔ ان سے خط و کتابت تھی۔ ان کے خط آیا کرتے۔ کہ میں کبھی دہلی آؤں۔ چھ ماہ تک جب ان کے خ  
 آتے تھے اور انھوں نے دہلی آنے کے لئے بار بار لکھا۔ تو میں ان سے ملنے کے لئے مانسہرہ سے دہلی آیا۔ میں دہلی او  
 دہلی کے لوگوں کے حالات سے قطعی ناواقف تھا۔ اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی دوست کے بار  
 کھنے کے بعد ملنے کے لئے جائے تو وہ دعوت دینے والے کے مکان پر نہ ٹھہرے۔ میں نے دہلی ریلوے سٹیشن  
 اترنے کے بعد ننگے میں سامان رکھ دیا۔ اور بازار لال کنواں میں پہنچا۔ وہاں گلی چابک سواران کے سرے پر  
 ٹانگہ والے سے یہ کہہ کر ٹانگہ کھڑا رکھنے کے لئے کہا کہ میں ابھی آکر سامان لے جاتا ہوں۔ میں گلی چابک سواران  
 کے اندر فشی عبدالحق صاحب قلیق کے مکان پر پہنچا۔ قلیق صاحب کو آواز دی۔ اپنے دہلی آنے کی اطلاع  
 پہلے دے چکا تھا۔ میری آواز سن کر قلیق صاحب مکان سے باہر نکلے۔ اور بہت اخلاق اور تپاک سے  
 خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد آپ نے پوچھا کہ میرا قیام کہاں ہے۔ میں اس کا کیا جواب دیتا۔ یہ خیال  
 بھی نہ کر سکتا تھا کہ اگر کوئی شخص ڈیڑھ سو میل کا سفر کر کے ملنے کے لئے آئے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ  
 قیام کہاں ہے۔ کیونکہ پنجاب میں اگر کوئی شخص کسی سے ملنے کے لئے جائے۔ تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ہوٹل  
 یا سرائے میں ٹھہرے۔ میزبان اس کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اور تمام پنجاب میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا کہ  
 ہانڈو کو اپنے ہاں بٹھو کر رکھ لیں۔ خط اور اپنی عزت محسوس نہ کرتا ہو۔ قلیق صاحب کا یہ دال سن کر کہ میں  
 کہاں ٹھہرے گا۔ میں نے کچھ حیران سا ہو گیا اور میں نے کھینا مانسا ہو کر جواب دیا کہ ایک  
 ہوٹل میں ٹھہراؤں گا۔ چنانچہ ان سے شام کو پھر ملنے کا وعدہ کر کے میں گلی سے باہر آیا۔ اور ٹانگہ والے سے  
 کہا کہ کسی ہوٹل میں لے جاؤ۔ ٹانگہ والا مجھے ہمارا ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں میں نے قیام کیا۔ اور شام کو قلیق ج  
 کا نیاز حاصل کرنے کے لئے پھر ان کے مکان پر آیا۔ وہ مجھے حکیم محمد علی خاں امیر اکبر آبادی جو بعد میں

ہلی میں آنریری مجسٹریٹ اور خطاب یافتہ خاں صاحب تھے کے مکان پر لے گئے جہاں ہم کچھ دیر بیٹھے اور  
 اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ بیس دو تین دن دہلی میں رہ کر اور دہلی دیکھ کر واپس مانسہ جلا گیا۔  
 یہ کیفیت تو ہمان نوازی کے متعلق دہلی کی فضا کی ہے۔ میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ میں جب دہلی آیا تو  
 ان نوازی کے اعتبار سے خالص طور پر پنجابی تھا دو دو چار چلوں کے ماضی ہمانوں کے علاوہ چھ چھ ماہ اور سال سال تک  
 ہنے والے مستقل ہمان بھی ہو کرتے۔ وہ پہر کونچ پر اور رات کو ڈنپر آٹھ آٹھ دس دس اصحاب ضرور ہوتے۔ اگر کوئی  
 مان جانا چاہتا تو اسے مختلف طریقوں سے یعنی گاڑی جانے کا وقت غلط بتا کر یا گھڑی کو پیچھے کر کے اسے روک دیا جاتا۔  
 ورنہ اگر کوئی ہمان آجانا۔ تو دل کو سترت سی محسوس ہوتی مگر دہلی کے پانی اور یہاں کی فضا کا اثر آہستہ آہستہ کیا ہوا۔ اس کے  
 تعلق ایک واقعہ جو آدرا صاحب کی دعوت سے دو تین ہفتہ پہلے ہی پیش آیا تھا) بھی سن لیجئے۔

میں جب سے دہلی آیا ہوں۔ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس میرے ہاں ہی قیام فرماتے تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب  
 اخلاص احسان اور ذوق نوازی ہے۔ ورنہ دہلی میں بڑی سے بڑی پوزیشن کے ان کے سینکڑوں دوست ہیں۔  
 ڈاکٹر صاحب جب بھی تشریف لاتے۔ ایک دو روز پہلے ان کا تار آجاتا آج کل کا مطلب یہ ہوتا کہ میں ان کے تمام  
 رستوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دوں تاکہ جو لوگ آنکھیں دکھانا چاہیں۔ وہ میرے مکان پر یا ریلوے سٹیشن پر  
 بیچ جائیں۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دہلی تشریف لانے کے متعلق مار آیا۔ تو میں دوسرے لوگوں کے  
 نادہ نمی دہلی پلاؤ سینما کے پردہ پر انٹر لاک کد رانا تھا دراز دراز سے بہادر میں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے قریبی رشتہ دار  
 ی ہیں ان کو بھی ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹر صاحب کل صبح فریڈر میل میں تشریف لا رہے ہیں۔ لالہ کد رانا تھا نے  
 بلی فون پر جواب دیا کہ ان کے پلاؤ سینما کا اوپر کا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔ تمام کمرے فریڈر سے آراستہ  
 دیکھے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب اس نئی بلڈنگ میں قیام کریں میں نے کہا بہت اچھا۔ اگلے روز صبح میں  
 رنڈر میل کے آنے کے وقت ریلوے سٹیشن پہنچا۔ تو وہاں لالہ امیر چند کھنہ سیٹھ آنند راج سورانا۔ لالہ  
 دراز نا تھا ورماد وغیرہ ایک درجن کے قریب اصحاب اور نیس چالیس کے قریب آنکھوں کے مریض آنکھیں  
 کھانے کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب گاڑی سے اترے۔ تو آپ نے سب سے پہلے  
 یاروں کو دیکھا۔ پندرہ بیس منٹ ان کے پلیٹ فارم پر صرف ہوئے۔ اس کے بعد ہم سٹیشن سے باہر آئے  
 یہاں سے پہنچنے سے پہلے لالہ کد رانا تھا ڈاکٹر صاحب کا سامان اپنی موٹر کے پیچھے کیرئیر پر بندھوا چکے تھے۔ ڈاکٹر  
 صاحب میری کار کے پاس سوار ہونے کے لئے پہنچے۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیا ابھی تک سامان نہیں بندھوایا  
 میں پر لالہ کد رانا تھا نے کہا کہ سامان دوسری گاڑی میں بندھوا دیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ پلاؤ بلڈنگ میں قیام  
 کریں گے۔ وہاں سے کمرے فرنش کئے گئے ہیں۔ لالہ کد رانا تھا کی اس درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نہیں  
 آپ دیران سنگھ کے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ اس پر لالہ کد رانا تھا نے پھر کہا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے پھر ہی جواب  
 دیا۔ چنانچہ لالہ کد رانا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان قیام کے متعلق پانچ چھ بار تکرار ہوئی۔ کد رانا تھا صاحب  
 ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہاں بچانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب میرے ہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتے تھے۔ میں اس عرصہ  
 میں خاموش رہا۔ اور دونوں کا اصرار سنتا رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اثرات کے باعث جو دہلی میں میری طبیعت  
 پر ہمان نوازی کے متعلق اثر انداز ہو چکے تھے میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پلاؤ بلڈنگ میں ہی چلے جائیں۔

حالات کا ذکر صاحب کے احسانات، ان کا اخلاص، ان کی محبت اور ذاتی تعلقات کا اب بعد میں جب خیال کرتا ہوں تو ان کینہہ جذبات پر شرم اور ندامت محسوس کرتا ہوں۔ جو اس وقت ان کی مہاں نوازی کے متعلق میرے ذہن میں پیدا ہوئے۔

آذرما صاحب کے ہاں ڈن پارٹی والے دوستوں کو میں نے دونوں واقعات بیان کرنے کے بعد بتایا کہ اگر دہلی کی فضا مہاں نوازی کے خلاف ہے۔ تو اس میں دہلی والوں کا قصور نہیں یہ پانی کا اثر ہے۔ ہر دریا کے اندر فطرت اجزا ہوتے ہیں۔ اور ان اجزا کا دل، دماغ اور قوی پر اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں سب سے زیادہ مہاں نواز صوبہ سرحد کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد پٹواریہ (درادلپنڈی)۔ جہلم کا علاقہ کے لوگ۔ ان سے کم گوجرانوالہ لاہور اور امرتسر کے لوگ۔ اور ان سے کم لدھیانہ اور انبالہ کے لوگ۔ اس کے بعد بنیالہ خرق شروع ہوتا ہے۔ اور جہاں جہاں جہاں کا پانی سیراب کرتا ہے۔ وہاں مہاں نوازی کے اعتبار سے بالکل ہی صفائی ہے۔ چنانچہ پنجاب کے صوبہ کے لوگوں میں شاید اس بات پر یقین نہ کیا جائے گا کہ دہلی۔ لکھنؤ۔ الہ آباد اور بنارس وغیرہ میں پانی پلانے والے پانی کی قیمت پیسہ یا دو پیسہ لے بیٹے ہیں حالانکہ پنجاب میں پانی کی قیمت لیٹا ایک گناہ اور پاپ سمجھا جاتا ہے اور پانی پلانے والا چاہے کتنا بھی غریب ہو۔ پانی کی قیمت قبول نہیں کر سکتا۔

اگر اپنی کمزوری کا انہماک کرنا اس کمزوری کو رفع اور دل میں مہارت پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ تو میں یہ صاف الفاظ میں اقرار کرتا ہوں کہ جہاں کے پانی کے باعث میں اپنی اس خوبی سے محروم ہو چکا ہوں جو اخلاص اور مہاں نوازی کے متعلق مجھ میں چند برس پہلے موجود تھی۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر یوپی اور دہلی کے اصحاب بھی دس چند روپے یا بیس برس پنجاب یا صوبہ سرحد میں قیام کریں تو ان کے اندر مہاں نوازی کا وہ کیریکٹر پیدا ہو جائے گا۔ جو وہاں کے لوگوں میں موجود ہے۔ کیونکہ اس کا سبب پانی کے وہ اجزا ہیں جو پنجاب کے دریاؤں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر جمنا اور یوپی کے دریا ان سے محروم ہیں۔

## عزت مرنے کے بعد

عزت کا فلسفہ دوسرے تمام فلسفوں سے زیادہ عمیق اور گہرا ہے۔ اور اگر اس فلسفہ پر غور کیا جائے۔ تو انسانی فطرت کے بہت دلچسپ مظاہرے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے لئے عزت سے زیادہ دوسری کوئی شے عزیز نہیں۔ اور عزت پر انسان روپیہ، مال، دولت، بیوی، بچے، بہن، بھائی، صحت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ مگر عزت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔ مثلاً عزت کے لئے ہر شخص روپیہ صرف کرتا ہے۔ یہ عزتی کے خوف سے اکثر ایسا ہوا کہ لوگوں نے اپنی بیوی بچوں، بہن اور بھائی تک کو قتل کر دیا۔ اور خود بھی اپنی جان پر کھیل گئے۔ مگر سوائی برداشت نہ کی۔ یعنی اس دنیا میں انسان کے لئے عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں۔ عزت پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنی عزت کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیں۔ وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ اور جو لوگ اپنی عزت کو بھی جیروا بہ سندھ کے دیوان دیارام گدمل مرحوم کی طرح ریٹیرٹریا ست، کو اپنی تمام زندگی میں صرف اس شخصیت



کا علم ہو سکا جس نے غریبوں، ضرورتمندوں، محتاجوں اور سحق لوگوں کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے علاوہ اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا، دوسروں پر بغیر غرض کے قربان کر دیں۔ وہ انسان نہیں فرشتہ۔ بلکہ فرشتوں سے بھی بلند کہلائے جانے کے سحق ہیں۔ کیونکہ نیک سے نیک اور پارہا پارہا سے پارہا شخص بھی نہیں چلتا کہ وہ عزت حاصل نہ کرے۔ یا ذیل ہو۔

عزت کے متعلق اس مختصر تہبید کے بعد میں چند چشم دید واقعات بیان کرنا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ انسان زندگی میں تو کیا، چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ عزت حاصل کرے۔

میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں مجھے سوائے گناہوں کے پڑھنے یا مقدمہ کے حالات پر غور کرنے کے دوسرے کوئی کام نہ تھا۔ جو شخص زندگی بھر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا رہا ہو۔ اس کے لئے یہ مصروفیت کافی نہ تھی۔ میز زیادہ وقت وہاں انسانی فطرت پر غور کرتے گزرتا۔ اور میں اس سلسلہ میں ہر قسم کے قیدیوں سے ملتا۔ اور ان سے گھنٹوں باتیں کرتا۔ چنانچہ وہاں مجھے قتل کے مجرموں سے بھی ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ جو موت کے منتظر تھے۔

مولانا مظہر الدین ایڈیٹر اخبار "الامان" کا قاتل بھی اس زمانہ دہلی جیل میں تھا۔ اس کے لئے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا اور ایسٹین وغیرہ خارج ہونے کے بعد وہ پھانسی کی رسی کا منتظر تھا۔ میں اس سے اکثر ملتا کرتا۔ میں جب بھی ملتا یہ مجھ سے ہی سوال کرتا کہ اس کے متعلق پہلے کیا خیال ہے۔ کیا لوگ اس کے اس فعل کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اس کے حق میں تعریف بلند ہوتے ہیں یا نہیں۔ میں اس کی دل داری کے خیال سے اسے جب یہ کہتا کہ لوگ اس کو بہت پکار رہے تھے ہیں۔ تو اس کو پھر خوشی کے باعث مٹھ مٹھاتا تھا۔ جس روز اس کو پھانسی ملنے والی تھی۔ اس سے ایک روز پہلے اس کی آخری ملاقات کے لئے اس کی ماں۔ باپ اور عزیز و رشتہ دار آئے۔ یہ لوگ ہمیں بائیس برس کی عمر کا جوان، گورے رنگ کا خوبصورت تھا۔ جب بھی کسی کو جیل میں پھانسی ہو تو جیل کے تمام قیدی سجدہ ہو جاتے ہیں۔ اس لوگ کی آخری ملاقات کے وقت تمام جیل میں کھرام مچا ہوا تھا۔ ملاقات ہوتی۔ جرم۔ اس کے والدین اور عزیز و اقارب، چھین بار بار کر روتے۔ چھوٹے چھوٹے بیچے اپنی ماؤں کو روتا دیکھ کر رو چکے تھے۔ شاید ہی کوئی سنگ دل انسان ہوگا۔ اس منظر کو دیکھ کر جس کی آنکھیں تر نہ تھیں۔ جیل کے حکام بھی جو دن رات کی بے رحمی کے باعث ایک حد تک سنگ دل ہوتے ہیں اس دردناک منظر سے متاثر تھے۔ قاتل کی پردہ میں رہنے والی ماں برقع میں تھی۔ مگر اس کی دوانگی اس کو بے پردہ کئے جا رہی تھی۔ اور اس خاتون میں برقع کو سنبھالنے کی ہمت نہ تھی۔ نصف کھٹہ کے قریب کھرام کی یہ کیفیت رہی۔ نہ ماں کوئی بات کر سکتی تھی نہ باپ۔ ان میں بہت نہ تھی کہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکیں۔ دوسرے رشتہ دار پھانسی ملنے والے سے باتیں کرتے تھے۔ اور باتیں یہی یہ کہ تم آخری وقت مغرب کی طرقت اپنا منہ رکھنا۔ کلمہ کو نہ بھولنا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا۔ رات کو نماز ضرور پڑھنا۔ وغیرہ۔ چنانچہ ان رشتہ داروں میں سے ایک نے پوچھا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو بتا دیا کوئی خواہش ہو تو اس کا اظہار کر۔ تاکہ وہ پوری کی جائے۔ تو قاتل نوجوان نے اپنی جس آخری خواہش کا اظہار کیا۔ وہ یہ تھی کہ اس کے پھانسی ملنے کے بعد اس کی لاش کو جامع مسجد لے جانا۔ وہاں نماز جنازہ پڑھنا اور مجلس

نکلنا۔ چنانچہ اس نوجوان کی اس خواہش کے مطابق ایسا ہی کیا گیا تھا۔ گویا کہ اس نوجوان کی مرنے ہوئے آخری خواہش یہ تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

ایک دوسرا شخص قتل کا مجرم تھا۔ یہ چینیہ ور غنڈہ تھا۔ اور اس نے ایک دوسرے شخص کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کو بھی موت کی سزا دیئے جانے کا حکم ہو چکا تھا۔ جس روز اس کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ اسے ایک روز پہلے اس کے رشتہ دار بھی اس سے ملنے کے لئے آئے۔ یہاں بھی وہی چیزوں کا منظر تھا۔ جب یہ روز ہوا تھا۔ تو جیل کے ایک میاں نے اس سے نیم طنز یہ انداز میں (گو کیا کہ تو چاقو مار تے دفت بہادر تھا اب پھانسی کے وقت روتا ہے) کہا۔ کہ ”حوصلہ کر۔ روتے سے کیا حاصل“ اس سپاہی کے یہ نیم طنز یہ الفاظ سن کر اس نے فوراً سر اٹھایا اور فاتحانہ انداز میں (گو موت کو سامنے دیکھتے ہوئے اس کی قوت گویائی جواب دے ہی تھی۔ اور اس کے منہ سے بات نکل نہ نکلتی تھی) کہا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ میں میں گھبرایا نہیں۔ نہیں میں حوصلہ میں ہوں“ یعنی یہ موت کو دیکھتے ہوئے زندگی میں ہی نیم مژدہ ہو چکا تھا۔ منہ سے بات نکل نہ نکلتی تھی۔ مگر یہ چاہتا تھا کہ لوگوں پر اس کے غنڈہ پن (جس کو یہ خود بہادری اور شجاعت سمجھتا تھا) کے اثرات قائم رہیں۔ چنانچہ اگلے روز جب اس کو پھانسی کی کوٹھڑی سے پھانسی گھر میں پھانسی پر چڑھانے کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ تو اس کے چہرہ پر ایک فریاد اور بناؤنی باتیں سنا کہ اس کی موت مر رہا ہے اس کی شجاعت پر موت اثر انداز نہیں ہوئی اور لوگ اس کو مرنے کے بعد اس کو بہادر ہی سمجھیں۔ گویا کہ اس کی بھی آخری خواہش یہی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

مجھے اور بھی کئی ایسے واقعات یاد ہیں کہ لوگوں نے مرنے ہوئے اگر کسی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ صرف یہ تھی۔ کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی عزت ہو۔ چنانچہ ہماری زندگی کے ہر روز کے واقعات نگہا جا رہا ہے۔ کہ عزت ایک ایسی شے ہے جس پر زندگی میں سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے۔ لوگ عزت کی موت مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔ یعنی عزت ایک ایسی شے ہے جس کو انسان زندگی میں تو کیا مرنے کے بعد بھی چاہتا ہے۔

میں جید آباد سندھ کے دیوان دیارام گد دل مرحوم پریزیڈنٹ آل انڈیا سوشل کانفرنس کے حالات عرض کروں گا جن کا پہلک پر ظاہر کرنے کا غرض سب سے پہلے ایڈیٹر ”ریاست“ کو حاصل ہوا یہ حالات لاہور کے اخبار ”ہندوستان“ میں شائع ہوئے جبکہ ایڈیٹر ”ریاست“ اس اخبار میں کام کرتا تھا ان حالات میں بتایا جائے گا کہ قربانی کے اس فرشتہ نے کیونکر ایک خاندان کی عزت کو بچانے کے لئے اپنی عزت کو قربان کر دیا اور دنیا میں سب سے اہم قربانی وہ ہے۔ جو ذاتی اغراض سے بلند رہ کر دوسروں کے لئے کی جاتی ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً سے نہ اس دنیا میں محروم ہونا چاہتا ہے۔ نہ اگلی دنیا میں۔

## عزت کی قربانی

میں نے لکھا ہے کہ مجھے میری پچھلی تمام زندگی میں سوائے دیوان دیارام گد دل آف جید آباد سندھ

کے کسی ایسے دوست شخص کا علم نہ ہو سکا۔ جس نے دوسروں کے لئے اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا ہو۔ جس ذیل میں دیوان دیارام گدمل کی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ جو مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے والے مسٹر ویدول بیگمہ راج ایڈیٹر سندھی "سکھرنے بتایا۔ اور جس کی تصدیق بعد میں مرحوم ہمارا جانا بھواری کے بعض اصحاب نے بھی کی۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اگر میں اس بات کا اقرار کروں۔ تو یہ غیر مناسبت نہ ہوگا۔ کہ اس واقعہ نے میرے کیرئیر پر بہت بڑا اثر کیا ہے۔ میں دوسروں کے لئے اپنی عزت کو قربان کرنے کا اہل تو نہیں ہو سکا۔ مگر یہ سچ ہے کہ دوسروں کی خدمت گزاری اور اس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا احساس اگر مجھ میں موجود ہے۔ تو اس کا باعث صرف یہ واقعہ ہے۔ جو ہمیشہ ہی میری زندگی میں میرے لئے نصب العین رہا۔ خدا کرے کہ ان حالات کو پڑھنے والے بھی وہی اثرات حاصل کریں جو مجھے نصیب ہوئے۔

دیوان دیارام گدمل حیدر آباد (سندھ) کے ایک سترز خانہ میں سے تھے۔ آپ بمبئی پراڈشل ہل سروس کے جج تھے۔ اور آپ کے صاحبزادگان حیدر آباد میں رکالت کرتے تھے۔ دیوان دیارام گدمل کی زندگی کا زیادہ حصہ سندھ اور بمبئی (چونکہ اس زمانہ میں سندھ علیحدہ صوبہ نہ تھا بمبئی سے ملحق تھا) کے اضلاع میں بطور سیشن جج گزارا۔ آپ ہزار روپیہ سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔ مگر آپ کا ذاتی خرچ چالیس پچاس روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھا۔ آپ کے پاس صرف ایک کوٹ تھا جو کئی برس تک آپ نے استعمال کیا۔ اور اپنی تنخواہ کا تمام کام روپیہ اور جدی جاہلاد کی آمدنی کا ایک محض حصہ آپ غریبوں، محتاجوں، یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت میں صرف کرتے۔ چنانچہ سندھ میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن کے والدین چپڑاسی، مزدور، قلی، برتن صاف کرنے والے گھروں کے ملازم اور ادنیٰ قسم کے لوگ تھے۔ مگر یہ دیوان دیارام کے روپیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہت بڑے عہدوں پر پہنچے۔ دیوان صاحب ٹرونگ یعنی سفری لائبریریوں اور بیوہ آشرموں کے بانی تھے اور آپ کے روپیہ سے سندھ میں بہت سی ٹرونگ لائبریریوں موجود ہیں۔ جو گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں کو کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان مفت تقسیم کرتی ہیں۔ اور درجنوں بیوہ آشرم، بیواؤں کی پناہ گاہ ہیں۔

دیوان دیارام گدمل ملک کے بہت بڑے سوشل لیفادر تھے۔ آپ مرحوم مسٹر مالاباری کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اور آپ کے پرانے دوستوں میں سے مرحوم سر جوگندر سنگھ (ممبر انتظامیہ کونسل داسرائے) وغیرہ کئی اصحاب تھے، (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سر جوگندر سنگھ نے اپنی ایک تصنیف دیوان دیارام سے نام ڈیٹیکٹ بھی کی تھی) دیوان صاحب کئی بار آل انڈیا سوشل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور آپ کی سندھ میں جو عزت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ حیدر آباد میں جب لوگوں کو یہ علم ہوتا کہ آپ اس بازار میں سے گزریں گے۔ تو لوگ وقت سے پہلے انتظار میں کھڑے ہو جاتے اور آپ کو اس طرح ہی جھگ کر سنا کر یا ڈنڈت کیا جاتا جس طرح گوروں یا مسیاسیوں یا ہاتھمادوں کو کیا جاتا ہے۔ مرحوم ہمارا جانا بھو نے مجھے بتایا۔ کہ ہمارا جہ جب نا بھگہ کے ٹک (دلیہند) اور داسرائے کی کونسل (جوان دنوں اسپر بل کونسل کہلاتی تھی) ہمارا جانا بھو داسرائے کے نامزد ممبر تھے۔ مگر اس کونسل میں جاتے ہی آپ مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالفینوں پر جا بیٹھے اور آپ کا حب الوطنی کا یہ قدم آپ کے لئے زندگی بھر مصائب کا باعث ثابت ہوا) کے ممبر تھے۔ تو

دیوان دیارام گد دل کے درشن کرنے کے لئے ناجھ سے احمد نگر (صوبہ بمبئی) گئے تھے۔ جہاں کہ دیوان صاحب اُن دنوں سیشن جج تھے۔ گویا کہ دیوان دیارام گد دل کے لئے احترام و عزت غریبوں اور عام لوگوں سے لے کر اہل بیان ریاست تک کے دلوں میں بھی تھی۔ اور آپ تمام ملک میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے۔

دیوان دیارام گد دل کا ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جو آپ کو لاہور میں پیش آیا۔ لاہور ڈائریکٹ افسرانے پر چاندنی چوک دہلی میں شاہی داخلہ کے وقت بمب پڑا تھا۔ پنجاب پولیس دن رات تفتیش میں مصروف تھی۔ مگر بمب پھینکنے والے کا کوئی پتہ نہ چلنا تھا۔ ہر صوبہ میں تعلیم یافتہ پبلک و کرور کمونٹی کی نظر سے دیکھا جانا۔ دیوار دیارام بھتی سے کشمیر جا رہے تھے۔ آپ کا لباس سادہ ہونے کی طرح سادہ تھا۔ آپ نے لاہور ریلوے اسٹیشن فارم پر کسی شخص سے انگریزی میں بات چیت کی۔ قریب ہی سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک شخص کھڑا بات چیت کر رہا تھا۔ سادہ ہونے کے لباس میں انگریزی میں بات چیت کرنا پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی کی نظروں میں شبہ پیدا کرنے کا باعث بن گیا۔ آپ کو گرفتار کر کے ریلوے اسٹیشن کی حوالات میں دھریا گیا۔ آپ جب رات بھر حوالات میں لپک رہے تو انکی بیج پولیس نے آپ سے انٹرویویشن کرگفت۔ شنیدہ شریعت کی۔ دیوان صاحب نے پوچھا کہ کس الزام پر گرفتار کیا ہے۔ تو پولیس افسرانے بتایا کہ داسرا نے پر بمب مارنے کے شبہ میں۔ دیوان صاحب مشکوک دینے پولیس افسرانے کہا کہ اپنا حسب نسب بتاؤ اور کوئی ضمانت دینے والا ہو۔ تو پیش کر دیتا۔ تب جا سکتے ہو۔ اس پر دیوان صاحب نے کہا لاہور ڈائریکٹ افسرانے آپ کو جانتے ہیں اور وہی ضمانت دینگے۔ چنانچہ پولیس نے داسرا کے پرائیویٹ سیکرٹیری کو تار دیا کہ ایک شخص مسند کا اپنے دالا دیارام گد دل اپنے آپ کو داسرا کے کا واقعہ بتاؤ۔ پرائیویٹ سیکرٹیری نے لاہور ڈائریکٹ افسرانے کو اس تار کے مضمون سے اطلاع دی تو داسرا نے سنے جواب لکھوایا کہ مسٹر دیارام گد دل ہندوستان کے چند نیک ترین اصحاب میں سے ہیں۔ انارکسٹ نہیں۔ اور داسرا نے کے ذاتی دوست ہیں۔ ان کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس تار کے پہنچنے کے بعد آپ کشمیر روانہ ہوئے۔

دیوان دیارام گد دل جب زندگی بھر غریبوں اور ضرورتمندوں کی خدمت انجام دیتے رہے تو آپ کو خیال آیا اگر امیر طبقہ کے نوجوانوں میں غریبوں کی خدمت کی سپرٹ پیدا کی جائے۔ تو امیر طبقہ کے نوجوان دوسرے ہزار ہا لوگوں کے لئے مسند ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی میں آپ نے ایک اخلاقی آشرم کی بنیاد قائم کی۔ جس میں صرف امیر طبقہ کے کئی سو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر روز دو گھنٹہ کے لئے آتے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو لیکچروں کے ذریعہ بتایا جاتا کہ غریبوں کی خدمت کرنی چاہئے۔ دوسروں کا دھماچاؤ کھا کھنا انسان کا فرض ہے۔ رویم کا سب سے استعمال یہ ہے کہ ضرورت مندوں کے کام آئے۔ اور اس شخص کا پیدا ہونا اور زندہ رہنا ناقابل ہے جو عرف اپنے لئے زندہ ہے۔ اور دوسروں کے کام نہیں آتا۔ یہ آشرم کئی برس تک چلتا رہا اور اس کے ذریعہ بمبئی کے امیر گھرانوں کے نوجوانوں کے دلوں میں پبلک خدمت اور دوسروں کے دکھوں کو دور کرنے کی سپرٹ پیدا کی گئی۔

اس آشرم کو جاری ہونے کی برسوں چکے تھے کہ ایک روز ایک نوجوان لڑکی اس کے والد بمبئی میں

بہت بڑے عہد ذیر سرکاری ملازم تھے۔ اور جس کا منگینتر بیرسٹری کر چکا تھا۔ اور انڈین سول سروس کے امتحان کے لئے انگلستان میں تھا۔ دیوان دیارام گردل کے پاس آئی اور تنہائی میں کہا۔ کہ چٹاچی (آشرم کے تمام لڑکے اور لڑکیاں دیوان صاحب کو چٹاچی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے) میں بہت ڈکھی ہوں۔ مجھے ایک شخص کا ناجائز حمل ہے۔ غافلان کی عزت کا سوال ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ خودکشی کر کے بھی غافلان کے ناموس کو بچاؤں۔ آپ کی اپنے باپ کی طرح عزت کرتی ہوں۔ آپ مجھے راستے دیجئے کہ میں کیا کروں۔

دیوان دیارام نے بسبب یہ سنا تو آپ کو حالات سن کر بہت اندیس ہوا۔ آپ نے اس لڑکی کو رائے دی۔ کہ جس شخص کا ناجائز حمل ہے۔ اس سے شادی کر لی جائے۔

اس رائے کے بعد لڑکی نے چاہا کہ اسی شخص سے شادی کرے جس کا ناجائز حمل ہے۔ مگر لڑکی براہمن غافلان سے تھی اور لڑکا دنیا غافلان سے۔ سو سناٹا میں ایسی شادی میسر نہ ہو سکی تھی لڑکے نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد لڑکی نے حالات دیوان صاحب کو بتائے۔ تو دیوان صاحب نے بھی کیشش کی۔ مگر لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہو جائے۔ کیونکہ لڑکا بھی اس آشرم میں آتا تھا۔ دیوان صاحب کے کہنے کا لڑکے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس نے نہ صرف لڑکی کی شادی کا اہتمام قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ آشرم میں آنا بھی چھوڑ دیا۔ اور اگر لڑکی اشتاف سے اس کو راستہ میں آتے جاتے کہیں ملتی۔ تو یہ راستہ نہ چھوڑ کر دوسری طرف ہو جاتا۔

یہ لڑکی کئی روز تک دیوان دیارام سے مشورہ کرتی رہی اور دیوان صاحب نے یہ سنی کوشش کی کہ کوئی اور نوجوان اس لڑکی سے شادی کرے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور کئی اچھی حیثیت کا لڑکا اس لڑکی سے اس حالت میں شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ وادھر جمل جوں دن زیادہ گزرتے لڑکی کو حمل کے ظاہر ہوجانے کا خوف۔ آخر ایک روز لڑکی دیوان صاحب سے پھر تنہائی میں ملی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے دیوان صاحب سے کہا۔

”چٹاچی میں بہت ڈکھی ہوں میں تجھے حمل قرار پانے پر شروع میں حل علیہ کرنے کی کوشش کی اس میں ناکام رہی۔ اس کے بعد اس لڑکے سے شادی کرنی چاہی۔ جس کا حل تھا۔ اس نے ٹھکرا دیا۔ پھر چاہا کہ کوئی اور شخص اپنی پناہ میں لے۔ مگر کوئی تیار نہ ہوا۔ اب میرے لئے اپنے والدین اور غافلان کی عزت و ناموس کو بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ کہ میں خودکشی کر کے اپنی جان کو ختم کر لوں۔ اور میرے حل کا کسی کو علم نہ ہو۔“

یہ کہتے ہوئے روتے روتے لڑکی کی پہلی بندہ گئی۔ دیوان صاحب لڑکی کی مصیبت کو دیکھ رہے تھے۔ اور ڈکھی تھے۔ مگر کچھ کر سکتے تھے۔ انھوں نے لڑکی سے کہا کہ ”بڑی خودکشی کرنا باپ ہے۔ خودکشی مست کرد۔ اور جس طرح می ممکن ہو کسی نوجوان سے شادی کرو۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”چٹاچی نوجوان ترکیا اس حالت میں تو مجھے کوئی بڑھا بھی پناہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارنے کا سوائے خودکشی کے دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“

دیوان دیارام اس لڑکی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور بیدار متفکر تھے کہ اس نوجوان لڑکی کی مصیبت سے

کیونکہ نجات ہو۔ بہت دیر سوچتے رہے۔ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد آخر آپ نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹی اگر تم کو دنیا میں کوئی پناہ دینے اور تمہیں بے عزتی سے بچانے کے لئے تیار نہیں۔ تو میں تمہیں

پناہ دینے اور بے عزتی سے بچانے کے لئے تیار ہوں۔ میں تم سے شادی کرتا ہوں۔“

یہ کہنے کے بعد دیوان صاحب بیسی سے چند میل کے فاصلہ پر باند رہ گئے وہاں آپ نے ایک ایسی کوٹھی کرایہ پر لی جو سمندر کے کنارہ اور آبادی سے کچھ فاصلہ پر تھی۔ کوٹھی کرایہ پر بیٹے کے بعد بیٹی واپس آئے۔ آخر تم کے طلباء اور

طالبات کو بلایا اور ان سے کہا کہ آج کے بعد یہ آخر تم بند کیا جاتے۔ اس اعلان کے بعد لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ دیوان صاحب نے آخر تم کو تالا لگایا۔ اور اس لڑکی کو بیکر سکھوں کے گوردوارہ میں،

لگے۔ آئندہ بیچ (سکھ طریقہ شادی) ایکڑ کو کونسل میں پاس ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ آپ نے گوردوارہ کے گرنہتی سے درخواست کی کہ آپ کی اس لڑکی کے ساتھ شادی کرادی جائے۔ مگر نفی کیوں انکار کرتا۔ کڑا ہوشیاری

رہا۔ راگبوں نے شدید پڑھے اور گرنہتی نے اس سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی اور سترہ سال کے سفید ریش دیوان صاحب کے سفید بیوی (واٹھی بھتی) بڑھنے کی شادی گوردوارہ صاحب کے سامنے کرادی۔

دیوان صاحب اپنی نوجوان بیوی کو بیکر باند رہ گئے کوٹھی میں چلے گئے جو آئندہ زندگی گزارنے کے لئے کرایہ پر لی گئی تھی۔ یہاں بیوی نے اس کوٹھی میں رہائش اختیار کی۔ دیوان دیارام آکل اندیا شہرت کے مالک تھے۔ اور انڈین

سوشل کانفرنس کے کئی برس سے صدر۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوتے جن کے عنوانات تھے۔ ”باب کی بیٹی سے شادی“۔ ”نفس پرستی کی انتہا“۔ ”سوشل کانفرنس کے صدر کی گراؤٹ“۔ دیوان دیارام گدول کا دلالت آفریں قتل وغیرہ۔

دیوان دیارام گدول کی مخالفت صرف اخبارات تک ہی محدود نہ رہی۔ اسی سال آپ کو اپنی خاندانی جائیداد کی چٹری کرائے کے لئے حیدر آباد جانا پڑا تو جب آپ بازار میں سے گزرے۔ لوگوں نے آپ پر اینٹیں پھینکیں۔ اور یہ کہہ کر

ماں بہن کی گالیاں دیں کہ اس نے حیدر آباد کو تمام دنیا میں رسوا و ذلیل کر دیا ہے۔ سٹرویر دمل بیکہ راج، رایدیٹر سندھی سکھر نے جب اس شادی کی اطلاع سنی تو ان کو بہت صدمہ ہوا

کیونکہ دیوان صاحب ویر دمل جی کے ساتھ ہیں۔ پچیس برس تک سندھ کے اندر سوشل اصلاح میں مصروف رہے تھے۔ آپ نے شادی کی خبر سنی ہی دیوان دیارام کو باند رہ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے۔

”میں اخبارات میں پڑھ رہا ہوں اور لوگوں سے سنا رہا ہوں کہ آپ نے اتنے بڑے سوشل لیڈر اور سوشل کانفرنس کے صدر ہوتے ہوئے اس بڑھاپے میں سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سے

شادی کی۔ مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا کہ آپ اتنا بڑا باپ کر سکتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر بواچی ڈاک حمل حالات سے مطلع فرمائیے کیونکہ اگر یہ واقعہ سچ ہے۔ تو میرا بھی منظور ایک پہاگ وکر اور

اخبار نویس کے فرض ہے کہ میں آپ کی اس شہسخت کے خلاف لکھوں۔“

دیوان دیارام نے اس طویل خط کا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر دیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے۔

”میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔“

اس جواب کے بعد دیوان دیارام کے قریبی دوست اور ویرینہ سافٹی سٹرویر دمل بیکہ راج ورسندھ میں ہندو

مہاں سبھا کے صدر بھی تھے، نے اپنے اخبار ”سندھی“ میں دیوان صاحب کے خلاف متعدد سخت مضامین لکھے۔

دیوان دیارام کی ”بیوی“ کے بطن سے اس حمل کا میجر ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ دیوان صاحب شادی کے

بعد دنیا ہے بالکل الگ رہے۔ وہ اپنی ”بیوی“ اور بچی کے ساتھ سمندر کے کنارے اُس کوٹھی میں تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اور اس طرح دس سال گزر گئے۔ دنیا کو کچھ علم نہیں کر کیا ہوا۔ شادی کے دس سال بعد دیوان صاحب کی ”بیوی“ تپ دن میں مبتلا ہو گئیں۔ کئی ماہ تک اس موزی مرض میں مبتلا رہیں۔ اور جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اُس کی والدہ اور والد اپنی بیٹی کی عیادت کے لئے بیٹی سے آئے۔ یہ لوگ کئی روز تک باہر رہیں۔ ایک روز دیوان صاحب کی ”بیوی“ نے اپنی ماں سے تنہائی میں کہا۔

”اماں۔ میں اب زندہ نہ رہوں گی۔ چند روز کی جہان ہوں۔ مگر ایک راز میں تم سے ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ اس راز کو لے کر اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاؤں۔ وہ راز میں تمہیں بتاتی ہوں۔ اور وہ راز یہ ہے۔ کہ دیوان صاحب نے میرے ساتھ شادی میری عزت کو بچانے کے لئے کی۔ مجھے ایک لڑکے کا ناجائز حمل تھا۔ اس لڑکے نے حمل کے بعد مجھ سے شادی تو کیا بات تک کرنے سے انکار کر دیا۔ کوئی دوسرا بھی مجھے پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری عزت کو بچانے کے لئے دیوان صاحب نے اپنی آل انڈیا شہرت اور عزت کو میرے لئے قربان کر دیا اور مجھ سے کھٹے طور پر شادی کر لی۔ ورنہ دھسل حقیقت یہ ہے کہ میرے اور ان کے آج تک تعلقات باپ اور بیٹی کے سے ہیں۔ دنیا مجھے ان کی بیوی سمجھتی ہے۔ مگر میں ان کی دیے ہی بیٹی ہوں جیسے شادی سے پہلے تھی۔“

اس راز کے اظہار کے بعد دیوان صاحب کی ”بیوی“ کا انتقال ہو گیا۔ مرنے والی کی ماں نے یہ راز اپنے شوہر کو بتایا۔ اُس نے اپنے خاص دوستوں سے ذکر کیا۔ وہاں سے یہ راز مسٹر دیول سنگھ راج کے پاس پہنچا اور مسٹر دیول سنگھ راج سے ایڈیٹر ”ریاست“ کو یہ حالات معلوم ہوئے جن کی بعد میں بیٹی کے کئی اصحاب نے بھی تصدیق کی۔ چنانچہ ایڈیٹر ”ریاست“ جس زمانہ میں ایک فرم آگر سیدین اینڈ کمپنی میں ملازم تھا۔ بیٹی سے باہرہ گیا۔ تاکہ دیوان دیوارام کے قدموں کو بوسہ دے کر اپنے لئے عاقبت میں جگہ بنائے۔ مگر افسوس کہ دیوان صاحب اُس روز باہرہ میں نہ تھے۔ اُن کا نیاز صہیل نہ ہو سکا۔ ایڈیٹر ”ریاست“، ناکام واپس بیٹی آگیا۔ اور چند روز سے بعد اُسے بیٹی چھوٹا ناٹرا کیونکہ اُسے ہمارا چنا بھم نے اپنی ریاست میں بلا کر ملازمت دے دی۔

جو لوگ کسی پرتھوڑا سا احسان کر کے اُس احسان کو جانتے ہیں یا اُس کا معاوضہ چاہتے ہیں اور یا جن کی پبلک خدمت کا مقصد ذاتی شہرت یا عزت حاصل کرنا ہے۔ اُن کے لئے دیوان دیوارام گدوہل کے یہ حالات آنکھیں کھولنے کا باعث ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اپنی ذات، اپنے پیٹ یا اپنی عزت کے لئے کسی کے ساتھ احسان کرنا قابلِ تعریف و فخر نہیں۔ اس کی تہہ میں ذاتی اغراض پر شہید ہیں۔ انسان وہ ہے جو کسی غرض یا معاوضہ کے بغیر دوسروں کے کام آئے۔ اور دیوان دیوارام گدوہل جیسے لوگ تو فرشتہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے اپنی عزت و آبرو کو بھی بغیر کسی غرض کے دوسروں پر قربان کر دیا۔

## والیان ریاست کا پریست

”ریاست“ کا دفتر پانچ گنج میں تھا۔ اخبار کو جاری ہونے تین برس ہو چکے تھے۔ ”ریاست“ کے مضامین

کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اور اس کے درجنوں دوست اور دشمن پیدا ہو چکے تھے۔ میرے پاس مرحوم ہمارا جہ اور کے سیکریٹری مسٹر ایس رنگا آئر آئے مسٹر آکر میرے پڑانے دوست تھے۔ ہم دونوں نا بھیس میں ملنا دم نہ رہے تھے۔ بلکہ اُس ملنا دم کے زمانے میں مسٹر آکر ایک عرصہ تک میرے مکان پر ہی رہے۔ جب کہ ان کے بیوی بچے نا بھیس میں نہ تھے۔ مسٹر رنگا آکر سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تو آپ نے کہا کہ جمپیر آف پرنس کے اعلا س کے باعث ہمارا جہ اور دہلی میں ہیں۔ اگر میں اُن سے ملنا چاہوں۔ تو وہ ملاقات کا انتظام کریں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ بغیر کام یا ضرورت کے کسی سے ملنا نا قابل ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو دیان ریاست کے درشن کرنے کو سعادت یا ثواب سمجھتے ہوں۔ اس لئے پہلے کی ضرورت نہیں۔ مسٹر رنگا آکر نے پھر زور دیا۔ کہ ہمارا جہ سے ملنا چاہئے۔ بہت اچھے اور لائق آدمی ہیں۔ میں نے پھر انکار کیا۔ اور کہا کہ ہمارا جہ اور کے مقابلہ پر اُن کے سیکریٹری مسٹر رنگا آکر سے ملنا زیادہ اچھا ہے۔

میرے اس انکار کرنے پر مسٹر رنگا آکر نے پھر زور دیا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی دعوت علت سے خالی نہیں۔ میں نے زور کے ساتھ پھر انکار کیا۔ اور کہا کہ مجھے کسی دالیے ریاست سے پہلے کی ضرورت نہیں ہاں اگر ہمارا جہ اور کے پہلے کی خواہش ہو۔ تو کوئی حرج نہیں۔ میں مل سکتا ہوں۔ اس کے بعد مسٹر آکر نے مجھے راز میں کہا کہ ہمارا جہ خود ملنا چاہتے ہیں۔ اور اُنہوں نے اس غرض کے لئے ہی بھیجا ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں۔ کہ دیان سنگھ کی طرف سے پہلے کی درخواست ہونا کہ اُن کے پرستار پر اثر نہ پڑے۔ کیونکہ وہ ہمارا جہ ہیں۔ مسٹر آکر کی اس رائے اور اسی کی بات کو سن کر میں ضبط نہ کر سکا۔ میری ہنسی پھیل گئی۔ اور میں نے کہا۔ کیا ہمارا جہ عورت ہیں کہ محبت کی خواہش کا اظہار کرنا ان کی فطرت کے خلاف ہے اور وہ چاہتے ہیں۔ کہ اظہارِ عشق میں دوسرے ہی قدم اٹھائیں۔ اور اُنہوں نے آپ کو بطور گنجل بھیجا ہے۔ اس طرح سے مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ تو مسٹر رنگا آکر نے کہا کہ ہمارا جہ کو علم ہے کہ ایڈیٹر ”ریاست“ اور رنگا آکر دوست ہیں۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ کو کیا ہمارا جہ پر اثر نہ ہوگا کہ یا تو مسٹر رنگا آکر نے ایڈیٹر ”ریاست“ سے کہا ہیں۔ یا اگر کہا ہے تو دیوان سنگھ پر مسٹر رنگا آکر کا اثر نہیں۔ اور یہ دونوں صورتیں مسٹر رنگا آکر کے لئے مفید نہ ہوں گی مسٹر رنگا آکر کے بار بار زور دینے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میں ہمارا جہ سے پہلے کے لئے جاؤں۔ اور ہمارا جہ کو یہ علم بھی نہ ہو۔ کہ مسٹر رنگا آکر نے راز میں ہمارا جہ کی پہلے کی خواہش کا اظہار ایڈیٹر ”ریاست“ سے کر دیا ہے۔

مسٹر رنگا آکر واپس اور کیمپ میں چلے گئے۔ یہ کیمپ ریاست اور کی خالی زمین پر تھا۔ جو بیکانیر دوس کی پشت پر ہے۔ میرا خیال ہے۔ آج کل اس زمین پر پلائی ڈیٹا رٹنٹ کے عارضی دفاتر یا رہائشی مکانات ہیں۔ مسٹر رنگا آکر اگلے روز وقت مقرر کر کے پھر مجھے لینے کے لئے تشریف لائے۔ میں اُن کے ساتھ ریست اور کی کار میں گیا۔ کیمپ جیوں میں تھا۔ ہمارا جہ ایک بڑے خیمہ میں تھے۔ اور اس بڑے خیمہ کے پاس ہی ایک چھوٹے خیمہ میں ڈینک روم تھا۔ میں جب مسٹر رنگا آکر کے ساتھ ڈینک روم والے خیمہ میں داخل ہوا۔ تو وہاں مرحوم مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مرحوم مولانا ایڈیٹر ”ریاست“ پر بہت مہربانی فرماتے۔ اور آئینا سوک کر تے۔ جیسا بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ نقد و طی دہر کے بعد چوہدری مولانا کو لینے آیا۔ مولانا ہمارا جہ سے پہلے کے لئے تشریف لے گئے۔ میں رنگا آکر سے باتیں کرتا رہا



مولانا ملقات نے فارغ ہوئے تو میں ہمارا جہ کے خیمہ میں گیا۔

مرحوم ہمارا جہ اور اپنے دور کے دایان ریاست میں سب سے زیادہ لائق تھے۔ اور آپ کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ بہت اعلیٰ درجہ کے مقرر اور سیاست دان۔ مگر اعمال کے اعتبار سے سب سے بدتر۔ نہ صرف آپ کی ایڈمنسٹریشن کی حالت بہت قابلِ رحم تھی۔ بلکہ آپ کے ذاتی حالات بھی انتہائی قابلِ نفرت تھے۔ میں جب ہمارا جہ سے ملنے گیا۔ تو آپ تپاک سے بے خبر و خیریت پر چھنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ تو ہمارا جہ نے اپنا رعب قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے ویدانت کا فلسفہ شروع کر دیا۔ پر ماننا ایک ہے۔ ہم سب اسی کا زور ہیں۔ نہ پر ماننا میں فرق ہے۔ نہ آتما میں۔ پر ماننا غیر فانی ہے۔ اور روح بھی غیر فانی ہے۔ پر ماننا کے بعد آتما ہے۔ اور آتما کے بعد پر ماننا وغیرہ۔ میں ان کے ویدانت کے اس فلسفہ کو سننا رہا۔ مگر میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور یہاں اس فلسفہ کے بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ آخر اس تمام ویدانت بازی کا پتھر آپ نے یہ ظاہر کیا۔ کہ دایان ریاست بھی ذی روح ہیں۔ انسان ہیں۔ ہندوستانی ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کے ہندوستانی بھائی ہیں۔ مگر منٹ دایان ریاست کی خیر خواہ نہیں۔ نہ دایان ریاست گرو منٹ کے خیر خواہ ہیں۔ انسان سب برابر کے ہیں۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ دایان ریاست کے خلاف سخت مضامین نہ لکھتے۔ کیونکہ اس سے دایان ریاست کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ہمارا جہ جب ناصحانہ انداز میں اپنی تمام تقریر ختم کر چکے۔ تو ایڈیٹر ”ریاست“ نے چند الفاظ میں عرض کیا کہ دایان ریاست اپنی رعایا پر اس قدر شرمنگ مظالم کرتے ہیں کہ ایڈیٹر ”ریاست“ ان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ اور یہ لوگ اس سلوک کے سحق ہیں۔ جو سلوک آدم خور درندوں کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ ہمارا جہ کے لئے میرے یہ الفاظ غیر متوقع تھے۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ وہ اپنے ویدانت اور پر ماننا و آتما کے فلسفہ کو بیان کر کے مجھ پر چھا جائیں گے۔ اور میں حضور حضور کہہ کر آئندہ کے لئے توبہ کروں گا۔ ان کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ لوگوں کو اس طرح ہی اپنی باتوں سے قائل کرنے کے عادی تھے۔ میرا یہ جواب سن کر حیرانی کی حالت میں میری طرف دیکھنے لگ گئے۔ آدمی بہت ہوشیار تھے۔ آپ نے فوراً گفتگو کا پہلو بدل کر اور باتیں شروع کر دیں۔ اخبار کا کیا حال ہے۔ کتنا چھپتا ہے۔ اس کا حلقہ اثر تو بہت کافی وسیع ہے۔ کبھی اور نہیں آئے۔ وغیرہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا جہ کا پروگرام یہ تھا کہ وہ مجھ سے ملیں گے۔ مجھ پر اپنا رعب قائم کریں گے۔ میں اپنے گزشتہ مضامین پر جو اور کے متعلق لکھتے گئے۔ اظہارِ مذمت و انسوس کروں گا۔ آئندہ کے لئے ”نیک چلن“ رہنے کا یقین دلاؤں گا۔ ہمارا جہ اس کے بعد پانچ سات یا دس ہزار روپیہ بطور رخصتانہ امداد مجھے عطا فرمائیں گے۔ اور ”ریاست“ میں آئندہ ہمارا جہ کی تقریریں چھپا کر دیں گی۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد ہمارا جہ نے پوچھا کہ ”ریاست“ کی مالی حالت کیسی ہے، میں نے جواب دیا کہ خدا کا شکریہ ہے۔ کھانے کے لئے روٹی مل جاتی ہے۔ ہمارا جہ کے اس پوچھے کا مقصد یہ تھا کہ میں مالی پریشانی کا اظہار کروں اور ہمارا جہ امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہمارا جہ کے لئے میرا یہ جواب بھی خلاف توقع تھا۔ مالی حالت

کے دریافت کر نیکی سلسلہ میں مجھے موقع مل گیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو روپیہ کی ضرورت نہیں میں اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ پیدا کر لیتا ہوں مگر ایک درخواست ہے۔ آپ کے کھنے پر رائے بہادر ڈاکٹر مسٹر اداس آپ کے گورو کی آنکھوں کا ادب پریش کرنے کے لئے اور گئے آپ نے دس ہزار روپیہ فیس کا وعدہ کیا۔ اور پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد متعدد بار پھر اور گئے مگر آپ نے فیس نہ دی۔ ڈاکٹر صاحب کی ہزار روپیہ ماہوار سکولوں اور کالجوں وغیرہ پبلک انسٹی ٹیوٹیشنوں کو خیرات دیتے ہیں۔ ایسے نیک شخص کی فیس کا ادا نہ کرنا مناسب نہیں۔ اگر آپ ان کی یہ فیس ادا کر دیجئے۔ تو نہ صرف یہ انصاف ہوگا بلکہ اسے میں اپنی ذات پر بھی ایک احسان سمجھوں گا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب میرے بزرگ اور محترم ہیں۔ ہمارا جہ کے لئے یہ صاف بیانی بھی خلاف توقع تھی۔ کیونکہ یہ ہمارا جہ بر نادہندگی کا الزام تھا۔ آپ نے ٹالتے ہوئے کہا کہ آپ اور جائیں گے۔ تو گورو جی سے پرچہ کر گورو جی جو رقم فرمائیں گے وہ بھیج دیں گے۔

اس ملاقات کے بعد میں ہمارا جہ کے خیمہ سے باہر آیا۔ ویٹنگ روم میں مسٹر رنگا آرمیر انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھے چھوٹنے کے لئے دریا گنج دفتر ریاست "میں آئے۔ راستہ میں انھوں نے پوچھا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے رنگا آرمیر سے کہا کہ اگر اس شخص سے میں نہ ملتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مجھ پر سبب لڑا اثر پہلے تھا۔ اس میں کافی اذرا اضافہ ہو گیا۔

ایک روز مسٹر رنگا آرمیر آئے۔ ہمارا جہ نے ان کو اس غرض کے لئے بھیجا کہ ایک تو معلوم کریں کہ مجھ پر اس ملاقات کا کیا اثر ہوا۔ اور میں ہمارا جہ کی قابلیت کا قائل ہوا یا نہیں۔ اور دوسرے اگر میں مالی امداد چاہتا ہوں۔ تو اس کے متعلق بات چیت کی جائے۔ اثرات کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آرمیر سے وہی کچھ کہا۔ جو میں نے اور کمپ سے واپسی کے وقت ان سے سوچ میں کہا تھا۔ مالی امداد کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آرمیر سے کہا۔ کہ تم میرے دوست ہو۔ میں اور سے روپیہ لوں گا۔ تو پھر بھی اس شخص کو بے نقاب کرنے سے باز نہ آؤں گا۔ یہ شخص اپنی رعیت کے لئے بہت بڑی لعنت ہے۔ تمھاری پوزیشن ناؤک ہو جائے گی۔ تم ہمارا جہ کو ٹال دو۔ چنانچہ مسٹر رنگا آرمیر میں یہ جرات تو کہاں تھی۔ کہ وہ ہمارا جہ سے ان بڑے اثرات کا اظہار کرتے جو میرے ذہن پر ہمارا جہ کے متعلق ہوئے۔ اگر اتنی جرات ہوتی۔ تو وہ ریاست اور میں ملازمت ہی کیوں کرتے۔ مالی امداد کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ دیوان سنگھ کو آمدنی کافی ہے۔ اس کو روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اس نے مالی امداد لینے سے شکر یہ کہ ساتھ انکار کر دیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرے دل میں ہمارا جہ کے لئے نفرت کے جذبات زیادہ ہوتے چلے گئے۔ جوں جوں "ریاست" میں مضامین شائع ہوتے۔ اور کی رعایا کی طرف سے مواد اور زیادہ آتا۔ ہمارا جہ کے بے اختیار ہونے تک "ریاست" میں ہمارا جہ کے خلاف ہمارا جہ کو بے نقاب کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ہمارا جہ نے بیبی میں ایک بار جب کہ آپ کئی ماہ تک وہاں مقیم رہے اپنے اہلکاروں سے کہا۔ کہ آپ کی مصائب کا ایک بڑا سبب اخبار "ریاست" بھی ہے جس نے پبلک رائے کو آپ کے خلاف کر دیا۔ اور جب گورنمنٹ نے آپ کے خلاف قدم اٹھایا۔ تو پبلک رائے بھی آپ کے خلاف تھی۔

## خاندانی وقار فحش کر دیا

میرے جرنلزم کے پیشہ کو اختیار کرنے کے ابتدائی زمانہ کا ذکر ہے۔ میں خالصہ اخبار سے ملجودہ ہو چکا تھا۔ اور لاہور کے متعدد چھوٹے چھوٹے اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹہ کام کرنا نقد شام کو مرحوم لالہ بانکے دیال ایڈیٹر "جنگ سیال" کے مکان پر چند اخبار نویس جمع ہو کر کرتے۔ ان میں ہر روز شامل ہونے والوں میں مرحوم لالہ رام راجپال سنگھ شیدا۔ پنڈت رتن چند موہن دوج بعد میں پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ انفارمیشن میں کام کرنے گئے) اور ایڈیٹر "ریاست" تھے۔ دو تین غیر جرنلسٹ دوست بھی آتے۔ جن کے لالہ بانکے دیال سے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔

اس زمانہ گورنمنٹ کی پالیسی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ اور حکومت نے محسوس کیا تھا کہ اخبار نویسوں اور پبلک کے درمیان جرم پیشہ سمجھنا غلطی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ حقوڑا بہت تعاون ہونا چاہیے۔ اور اگر اخبار نویسوں میں سے کچھ کام کے آدمی مل جائیں۔ تو ان کو گورنمنٹ کی ملازمت میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اس پالیسی کے تحت ہی مرحوم مسٹر عبدالعزیز جولاہور میں ایک ہفتہ دار انگریزی اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سرکاری ملازمت میں لے گئے تھے۔

ایک روز ہم لوگ شام کے وقت جمع ہوئے۔ اور مختلف موضوع پر گپ بازی ہو رہی تھی اور گورنمنٹ کی اخبارات اور جرنلسٹوں کے متعلق پالیسی کی تبدیلی کا ذکر آیا۔ تو لالہ بانکے دیال نے ایڈیٹر "ریاست" سے طعنہ لگایا کہ "تم دو دو تین تین گھنٹہ کئی اخبارات میں کام کرتے ہو۔ کیوں نہ سرکاری ملازمت کر لو؟ میں نے اس طعنہ کا جواب فوراً دیا۔ "بہت اچھا۔ خیال ہے۔ آئیے ہم دونوں سرکاری ملازم ہو جائیں"۔ میرے اس جواب کے بعد پنڈت رتن چند نے مذاقاً کہا کہ "آئیے آپ دونوں کی طرف سے درخواست لکھ لی جائے" وہاں قلم دوات اور کاغذ موجود تھا۔ پہلے میری طرف سے درخواست لکھ لی گئی۔ پنڈت رتن چند نے کہا۔ سب سے پہلے اپنے خاندانی حالات بتائیے۔ کیونکہ ہر درخواست میں یہ ضروری ہے کہ خاندان کے حالات ہوں۔ میں نے حالات بتائے شروع کئے۔ میرے والد گورنمنٹ کی ملازمت میں ڈاکٹر تھے۔ میرے چچا سردار سیدو سنگھ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ "سردار صاحب" اور ریاست نامہ میں چیف میڈیکل آفیسر ہیں۔ میرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر امریک سنگھ گورنمنٹ کی ملازمت میں اسپیشلسٹ سرجن ہیں۔ میرے ایک چچا زاد بھائی سردار گرجن سنگھ وکیل ہیں۔ اور ایک چچا سردار سوہن سنگھ آنریری ججسٹریٹ ہیں۔ جب میں نے اتنا ہی بتایا۔ تو پنڈت رتن چند نے کہا۔ "گو یا کہ خاندان کے سب لوگ ہی اچھے جگہ پر ہیں صرف تم ہی بے وقوف اور بد نصیب ہو۔ جو اخبارات کے دفاتر میں فاقہ کشی کرتے ہوئے دھتے کھا رہے ہو۔" پنڈت رتن چند کے ان الفاظ پر تمام لوگ ہنس پڑے۔ اور ان لوگوں کی ہنسی کے ساتھ میں بھی کھبانی حالت میں ہنس پڑا۔ کیونکہ گو کہ دل میں تمیز اپنی ناکامی اور کمزوری پر نادام اور شرمندہ تھا۔ مگر ان کے ساتھ شامل ہو کر ہنسنے کے ملاوٹ دوسری مناسب صورت بھی کیا تھی۔

عام طور پر لوگ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اثر نہیں لینے۔ مگر میں بہت چھوٹے واقعات سے بھی متاثر

ہو جاتا ہوں۔ اور پھر زندگی بھر یہ واقعہ میری اصلاح کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد آج تک میں نے اپنے خاندان کے کسی بڑے شخص پر کبھی بھی خیر نہیں کیا۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ انسان بھی بڑا ہے۔ جو خود اپنی قوت بازو سے بلند ہو۔

درخواستوں کے خاندانی وقار کے سلسلہ میں ایک صاحب نے جو ایک امریکن دفتر ٹریڈی میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ مجھے بتایا کہ ان کے دفتر میں بھی جب کلر کی کی ملازمت کے لئے لوگ درخواست دیتے ہیں۔ تو ان میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ درخواست کرنے والے کا باپ فلاں عہدہ پر ہے۔ چچا فلاں عہدہ پر۔ بھائی نے فوج میں یہ خدمت انجام دی۔ اور بہنوئی پنشن پار ہے ہیں۔ ان ایسی درخواستوں کو دیکھ کر امریکن بے حد نفرت کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں۔ کہ ان واقعات سے ملازمت کا کیا تعلق۔ درخواست میں تو صرف یہ لکھا جانا چاہئے کہ درخواست دینے والے کی اہلیت کیا ہے۔ اور وہ کیا کام کر سکتا ہے۔ مگر درخواستوں میں خاندانی وقار کو اس طرح لکھا جاتا ہے۔ گویا کہ امریکن شادی کے لئے لڑکیاں تقسیم کر رہے ہیں۔ اور جو شخص خاندانی وقار کے لحاظ سے بلند ہوگا۔ اس کو خوبصورت لڑکی دی جائے گی۔

اس واقعہ کو دیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذاتی قابلیت اور کامیابی حاصل کرنے کی جگہ اپنے خاندان پر فخر کر کے کاہلی بستی اور بے ہمتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کو دھوکہ دینے کا باعث ہیں۔ وہ زمانہ چلا گیا اور یہ زمانہ بکبھی بھی واپس نہ آئے گا۔ جب خاندان کو دیکھ کر حکومتیں پنشن مقرر کر دیتی تھیں۔ یا لوگ لڑکیاں دیتے تھے۔ اب لڑکا وہی شخص ہے۔ جو اپنی قوت بازو کے ذریعہ بلند ہو۔

## ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کرو

جب "ریاست" جاری کیا گیا۔ تو سب سے پہلے دفتر اور رہائش کے لئے مکان دہلی دروازہ کے بالکل قریب موجود تھا۔ جسے میں سامنے۔ کوچہ لال سن میں تھا۔ یہ مکان چودھری پت رام کا تھا۔ چودھری صاحب بہت شریف اور نیک بزرگ تھے۔ یہ محلہ تمام کا تمام ہندوؤں کا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی مسلمان وگرا کر یہ بھی دیتا۔ تو اسے مکان کرایہ پر نہ مل سکتا تھا۔ میں اس مکان کا کرایہ اٹھاؤں روپے ماہوار دیتا تھا۔ اور بارہ روپیہ ماہوار میں اس کا ایک حصہ میں ملے ایک بابو صاحب کو دیا ہوا تھا۔ جو ریلوے میں گارڈ تھے۔ یعنی یہ مکان میرے پاس صرف سولہ روپیہ ماہوار میں تھا۔ اور اس میں دفتر "ریاست" اور میری رہائش وہ دن کے لئے جگہ تھی۔

میں نے جب مکان کرایہ پر لیا۔ تو چودھری پت رام تو مجھے مکان دینے پر آمادہ تھے۔ مگر اس مکان کے قریب کے براہمن اور بننے مجھے دیکھ کر ناک چڑھا رہے تھے۔ اور انھوں نے چودھری پت رام سے اس وقت جبکہ میں کرایہ پر لینے کے لئے مکان دیکھ رہا تھا۔ اشارہ کیا کہ یہ مکان مجھے کرایہ پر نہ دیا جائے۔ ان لوگوں کے پاس جیسے مکان نہ دیئے جاتے تھے حتیٰ میں اگر کوئی دلیل تھی۔ تو صرف یہ کہ میں پنجابی ہوں۔

اور سکھ ہوں۔ اس زمانہ میں (اور شاید اب بھی) دہلی کے لوگ پنجابیوں کو نا پسند کرتے تھے۔ اور سکھوں سے تو اس قدر ہیبت زدہ تھے۔ جیسے پنجاب کے لوگ افغانستان کے پٹھانوں سے خوف کھاتے تھے۔ یعنی یہ پنڈت اور بٹے نہیں چاہتے تھے۔ کہ ان کے پڑوس میں کوئی ایسا پنجابی یا سکھ آباد ہو۔ جس پر ان کا رعب نہ رہے۔ چودھری پت رام فطرتاً شریف اور نیک بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ ان کو کراہیہ سے غرض تھی۔ آپ نے ان بیٹوں اور براہمنوں کی کانا پھوسی کا جواب یہ دیا۔ کہ سکھ مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک قسم کے ہندو ہیں۔ اور مکان کراہیہ پر لینے والا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مکان دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ چنانچہ چودھری پت رام نے مکان مجھے کراہیہ پر دے دیا۔ اور ایک ماہ کا کراہیہ پیشگی لے کر چابی میرے حوالہ کی۔ جب چابی میں لے رہا تھا۔ تو ان پڑوسیوں میں سے ایک نے نیم بد دلی اور غیر اطمینان کے سے بے جھلے جذبات میں کہا۔ کہ اچھا سردار جی مکان لے لیجئے۔ آپ ہندو ہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ مگر آپ نے پیارا زور گوشت نہ پکھانا۔ کیونکہ یہ محلہ براہمنوں اور بیٹوں کا ہے۔ میں نے اس کا کچھ جواب دیا اور صرف مسکرا دیا۔ میری اس مسکراہٹ کے دو معنی تھے۔ لالہ جی تو یہ سمجھیں کہ میں نے آپ کی اس شرط کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ میں نے دل میں یہ کہا کہ لالہ جی مجھے مکان میں اسباب لے آنے دو۔ پھر دیکھوں گا کہ مجھے پیاز اور گوشت پکانے سے کون روکتا ہے۔

میں اب تو گوشت بہت کم کھانا ہوں، اور اسے گناہ بھی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انسان کا اپنی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا بے رحمی ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں گوشت کثرت کے ساتھ کھایا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ساہا سال تک بلاناغہ ہر روز کھانا رہا۔ میں نے جب اس مکان میں رہائش اختیار کی۔ تو ہمیشہ کی طرح میرے لئے وہاں بھی گوشت پکنا شروع ہوا۔ پانچ سات روز میں ہی پڑوسیوں کو مصالحو کی خوشبو سے یہ احساس ہوا کہ میں شاید گوشت پکھانا ہوں۔ اور اگر گوشت نہیں۔ تو میرے ہاں پیاد کا مصالحو تو ضرور پھونکا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر کانا پھوسی شروع ہوئی۔ مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے دریافت کرے۔ اس طرح سے ہی دو تین مہینے گزر گئے۔

میں جہاں بھی اور جس مکان میں بھی رہا ہوں۔ پڑوسیوں کے متعلق میری پوزیشن ہمیشہ ہی دلچسپ رہی۔ میں نے کسی پڑوسی کے متعلق کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ یہ دانتہ ہے۔ کہ پانچ پانچ سات سات سال تک رہنے کے باوجود مجھے علم نہیں ہوتا۔ کہ پڑوسیوں کا نام کیا ہے۔ نہ ان کے ہاں کبھی جاتا ہوں اور نہ ان کے اپنے ہاں آئے گی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑوسیوں سے جتنا بے تعلقی رہا جائے انسان آرام میں رہتا ہے۔ تعلقات جوڑنے پر پہلے دوستی ہوتی ہے۔ پھر یہ دوستی عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور تو تو میں میں تک نسبت پہنچتی ہے۔ میں پڑوسیوں کے جھگڑوں اور ان کے حالات سے اس قدر بے تعلقی رہتا ہوں۔ کہ اگر میرے دروازے کے سامنے دو پڑوسی لڑ رہے ہوں۔ تو میں اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پڑوسیوں سے باوجود اس بے تعلقی کے یہ لطیفہ اور بھی دلچسپ ہے۔ کہ پڑوسیوں کے تمام چھوٹے بچے مجھ سے بے حد مانوس ہو جاتے ہیں۔ اور میں ان سے بہت بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ یہ جب بھی میرے ہاں آئیں ان کی خاطر اور ان سے محبت کا سلوک

کرتا ہوں۔ اور یہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ میں کب کام سے فارغ ہو جاؤں۔ اور یہ میرے پاس آئیں۔

مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے پانچ ہفتے ہوئے تھے۔ تو میرے مکان کے سامنے والے پنڈت جی تشریف لائے۔ اور میرے ساتھ ان کی یہ بات چیت ہوئی :-

پنڈت جی :- سر دار جی مزاج اچھے ہیں۔

میں :- پنڈت جی آپ کی ہر بانی ہے۔

پنڈت جی :- سر دار جی آپ پیاز کھاتے ہیں۔

میں :- جی ہاں۔ میں کھاتا ہوں۔

پنڈت جی :- اور کیا گوشت بھی کھاتے ہیں۔

میں :- جی ہاں گوشت بھی کھاتا ہوں۔

پنڈت جی :- تو کیا گوشت اور پیاز یہاں ہی پکاتے ہیں۔

میں :- جی ہاں یہاں ہی پکاتا ہوں۔

پنڈت جی :- یہ حملہ ہندوؤں کا ہے۔ آپ گوشت نہیں پکا سکتے۔

میں :- پنڈت جی! میں پڑوسیوں کے احساس کا ہمیشہ احترام کرتا ہوں۔ اور میرا یہ فرض ہے۔ مگر اس

صورت میں کہ میں گوشت اور پیاز اپنے گھر کے اندر پکاؤں اس میں آپ کا کیا ہرج ہے۔ آپ کو اس سے برا نہ ماننا چاہیے۔

پنڈت جی :- نہیں صاحب ہم تو حملہ میں گوشت یا پیاز نہیں پکنے دیں گے۔

میں :- میں تو گوشت ہر روز کھاتا ہوں۔ لازمی طور پر کچھ اڑن گا۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

پنڈت جی یہ بات چیت کر سکے چلے گئے۔ میں ان سے مخاطب تو پہلے ہی کہی نہ ہوا تھا۔ اس روز کے

بعد تو صاحب سلامت بھی موقوف۔ یہ کبھی گلی میں سے دکھائی بھی دیتے۔ تو پیشانی پر بل ڈال کر دوسری

طرف منہ پھیر لیتے۔ اس کے علاوہ آپ نے نکلے کے دوسرے لوگوں کے پاس میری برائی شروع کی۔ مگر میں نے

کوئی پروا نہ کی۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اثر لینا صرف چھوٹے خیال کے لوگوں کا کام ہے۔ جو لوگ بلند

ہونا چاہیں۔ انہیں چھوٹی باتوں سے ہند رہنا چاہیے۔

کئی دن گزر گئے۔ پنڈت جی روز بروز زیادہ مخالفت ہوتے چلے گئے۔ ہر جگہ میرے خلاف باتیں کرتے۔

اور میں چونکہ ان کی مخالفت کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ یہ مجھے کمزور سمجھتے۔ میں نے ان کو ایک روز سمجھایا

کہ انسان کو دنیا میں نہ تو کسی پر زیادتی کرنی چاہیے۔ اور نہ ہی زیادتی برداشت کرنی چاہیے۔ میں نے آپ کے

ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ مگر آپ خواہ مخواہ میری مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کے لئے یہ مناسب نہیں۔

پنڈت جی پر میری اس درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور آپ میری اس مخالفت میں اضافہ ہی کرتے

چلے گئے۔ اور ان کی مخالفت کیلئے اور کوئی بات نہ ملتی تو بار بار پیاز اور گوشت کا نام لے کر ہی اپنے دل کی

پھر اس نکال لیتے۔

ایک روز میرے ہاں مرغی پکائی گئی۔ اور مرغی کی کھال، بچے اور انتہائی غیرواہی بھنگن اٹھا کر نہ لے  
 گئی کہ جی ان میں سے ایک بچہ اٹھا کر لے گئی۔ اور اس کینجٹ نے پنڈت جی کی ڈیورٹھی میں لے جا کر اسے کھانا  
 مزین کر دیا۔ پنڈت جی گھر پر نہ تھے۔ باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس تشریف لائے۔ تو جی اپنے شکار میں مصروف  
 تھے۔ پنڈت جی کے صبر کا پیالہ بھر نہ ہو گیا۔ محلہ میں کوئی دوسرا شخص گوشت نہ کھانا تھا۔ اس جرم کا  
 جرم ہو سکتا تھا۔ تو صرف میں ہی۔ پنڈت جی آگ بگولا صورت میں ڈیورٹھی سے باہر نکل آئے۔ اور آپ نے اُس  
 روحی داد دیا شروع کیا۔ جیسے کوئی ڈاکٹر ہو۔ گلی کے لوگ بھی تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ پنڈت جی مجھ پر الزام  
 ٹارہے ہیں کہ میں نے اُن کا جنم بھر شط کر دیا۔ اُن کی ڈیورٹھی میں مرغی کا بچہ آگیا۔ میں اپنے متعلقہ شرمین کر  
 ہر نکلا۔ تو دیکھا کہ پنڈت جی چلا رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ میرا تہہ در  
 میں جی بچہ اٹھا لے گئی۔ اگر فرض کیا کہ جی کوئی مراد ہو چکا آپ کی ڈیورٹھی میں لے جاتی تو پھر کس کا قصور  
 غا۔ مگر پنڈت جی نہیں مانتے تھے۔ اور اس بات پر صدمہ کر رہے تھے کہ میرے ہاں پیاز اور گوشت کیوں آتا  
 ہے۔ میں نے آخر کہا۔ اچھا پنڈت جی۔ اگر آپ غیر معفویت پر اتر آتے ہیں۔ تو لیجئے اب آپ منہ سے  
 ایک لفظ نکالے میں آپ کا سر موری میں دے کر آپ کو مار مار کر دُنبہ بنا دوں گا۔ چنانچہ میں پنڈت جی کی  
 رست کے لئے تیار ہو گیا۔ اور ان کو پیٹنے والا ہی تھا کہ آپ نے اپنی بڑی کا اظہار کرتے ہوئے جھٹک دیا۔  
 تھم دار جی آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ آپ ذرا احتیاط کیا  
 جئے۔ تاکہ جی کسی بدعتی وغیرہ کو اٹھانہ لائے۔ ہم تو آپ کے سیدک ہیں۔ آپ اپنے گھر میں جو چاہیں کیجئے۔ آپ کو  
 دن روکتا ہے۔ اس کے بعد پنڈت جی ہمیشہ کے لئے سیدہ ہو گئے۔ گلی میں اگر ملے۔ تو فوراً نئے کہتے ہوئے  
 ال کے ساتھ پوچھتے خراج کیسے ہیں۔ اور سلام دعا کا سلسلہ میرے اُس مکان کو چھوڑنے کے بعد ہی  
 رخصت تک قائم رہا۔

سکھوں کے گور و صاحب کا ایک مٹا ہوا ہے جس کے معنی ہیں: "عارف اللہ وہ ہے۔ جو نہ کسی کو خوف  
 دے اور نہ کسی کا خوف برداشت کرے۔" اس اصول کے مطابق انسان کا فرض ہے کہ وہ کسی کے ساتھ  
 یادنی کرنے کو گناہ سمجھے۔ اور اگر کوئی دوسرا یادنی کرے۔ تو اس زیادتی کو برداشت نہ کرے۔ کیونکہ زیادتی  
 داشت کرنا مجبوری ہے۔ اور بہادر و بزدل انسان میں یہی فرق ہے۔ بہادر شخص نہ تو کسی دوسرے پر  
 لہم کرتا ہے۔ نہ خود ظلم برداشت کرتا ہے۔ اور بزدل شخص ظلم اسی پر کرتا ہے۔ جو ظلم برداشت کرے اور کمزور ہو۔  
 رہا اس پر ظلم نہیں کرتا جو بہادر ہو۔

## لابق سمجھنا ہی نا لابیقی کا ثبوت ہے

ایڈیٹر ریاست: "کی بزرگزم کی تمام زندگی میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو گا جس روز اس کے  
 میں باپ سات مضامین،، سائے پانچویں ایسی نہ پچی ہوں۔ جن کو ریاست،، میں شائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اور صرف ”ریاست“ کا ہی کیا سوال ہے۔ دنیا کے ہر اخبار کے دفتر میں چھپنے والے مضامین سے زیادہ مواد ناقابل اشاعت پہنچتا ہے۔ جو لکھنے والوں کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ مگر ایک اخبار نویس کی حالت اس وقت قابل رحم ہوتی ہے۔ جب مضمون نگار مضمون کے واپس پہنچنے کے بعد یہ دریا فٹ کرے کہ مضمون شائع نہ کرنے کی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ دفتر ”ریاست“ سے ایسے حضرات کو صرف یہی جواب دیا جاتا ہے۔ کہ ہماری قابلیت بہت محدود ہے۔ آپ کے بلند مضمون کو سمجھنے کی ہم اہلیت نہیں رکھتے۔

انسان کی فطرت حق و صداقت اور معقولیت کی پروا نہیں کرتی۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو معقولیت کو اپنی فطرت پر غالب آنے دیں۔ چنانچہ مضامین کے سلسلہ میں بھی یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی مضمون نگار کا مضمون اخبار میں شائع ہو۔ تو مضمون نگار کا خوش ہونا فطرتاً ضروری ہے اور اگر مضمون شائع نہ ہوا وہ واپس کر دیا جائے تو مضمون نگار یقیناً خوش ہی نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے دل میں اخبار کے لئے نفرت بھی پیدا ہو جائے گی۔ اور مضمون نگار آئندہ کرنے کے لئے انسانی فطرت کے باعث مجبور ہے۔ کیونکہ جب وہ مضمون لکھتا ہے۔ تو وہ سمجھتا ہے کہ مضمون بہت اچھا ہے۔ اسے اخبار میں شائع ہونا چاہئے اور جب مضمون ناقابل اشاعت قرار دیا جا کر اس کے پاس واپس پہنچے۔ تو اس کو یہی احساس ہوتا ہے کہ مضمون تو اچھا تھا۔ ایڈیٹر نے اپنی نالایقی۔ قدر نامشناسی یا کسی اور وجہ سے واپس کر دیا۔ چنانچہ اگر مضمون لکھنے والے کو مضمون کے بلند اور بہتر ہونے کا یقین نہ ہوتا۔ تو وہ مضمون کو بھیجتا ہی کیوں۔ یا اسے مضمون کی غلطیوں کا حساس ہوتا تو وہ بھیجے سے پہلے اپنی غلطیوں کو درست کر لیتا۔

مضامین کے سلسلہ میں ذیل کا ایک واقعہ لکھتا ہوں جو زندگی بھر میری رہبری کا باعث ہوا۔ اور جس کے بعد میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہی رنگروٹ۔ نالایق یا ایک طالب علم سمجھا۔ اور میرا یہی احساس میری جرنلزم کی زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا باعث ہے۔

لارڈ شام لال کپور ڈائریٹر ”گورنمنٹ پریس“ لاہور سے ایک روزانہ ”اردو اخبار“ لیٹن نکالتے تھے۔ آپ سنسنی پیدا کرنے والے مضامین لکھنے میں بہت مشاق تھے۔ اور اس اعتبار سے شاید اس زمانہ میں لاہور کا کوئی اخبار نویس آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا مگر علم و ادب۔ انسانہ یا نظم و خیرہ سے آپ کو کوئی ستاؤ نہ ملتی۔ میں اس زمانہ میں لالہ شام لال کے اخبار میں روزانہ چند گھنٹے کام کرتا تھا۔ اور کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں شام کو سینما بھی جایا کرتے ایک روز کام ختم کرنے کے بعد ہم سیر کے لئے نکلتے تھے۔ تو ہمیں سائے سے آتے ہوئے ہاشدہ سدرشن دجن کی اس زمانہ میں بطور انسانہ نویس بہت بڑی شہرت تھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور آج کل ممبئی کی کسی فلم کمپنی میں بطور ڈراما نویس دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں (میلے نمٹے نمٹے ہونے کے بعد لارڈ شام لال نے ہاشدہ سدرشن سے کہا ”سدرشن صاحب۔ میں تو زندگی بھر یہی سمجھتا رہا۔ کہ انسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے کئی برس کی ضرورت ہے۔ مگر آپ حیران ہوں گے۔ آج میں نے انسانہ لکھنے کی پہلی بار کوشش کی۔ اور میں نے نصف گھنٹہ کے اندر بہت اچھا انسانہ لکھ لیا۔ جو کل کے اخبار میں شائع ہو گا۔“

ہاشدہ سدرشن نے لارڈ شام لال کے یہ الفاظ سن کر جو جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔



”شام لال جی، آپ نے تو نصف گھنٹہ میں افسانہ لکھ لیا۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ پانچ سات برس تک مسلسل افسانہ لکھتے رہیں تو پانچ سات برس کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ افسانہ کہتے کیسے ہیں۔ آپ کو افسانہ لکھنا پھر بھی نہ آئے گا۔ یعنی افسانہ جو صرف سمجھنے کے لئے ہی پانچ سات برس کا عرصہ چاہئے لکھنا تو بہت بڑی بات ہے۔“

جو لوگ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں۔ یا جن اصحاب کو مضمون نگاری یا افسانہ نویسی کا شوق ہو۔ وہ اگر ہمارے سر مشق کے ان الفاظ کو ذہن میں رکھیں۔ تو ان کے لئے کامیابی میں مل کرنا مشکل نہیں۔ کیونکہ دنیا میں کسی فن کو وہی شخص سیکھ سکتا ہے۔ جو بطور طالب علم سیکھنے کی کوشش کرے۔ اور اگر طالب علم اور ناواقف ہوتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو لائق اور بلند سمجھا تو اُس نے اپنی ترقی کی راہیں بند کر لیں

## ستاروں کے اثرات

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب کہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کئے گئے تھے۔ مگر اعرصہ ہی ہوا تھا۔ میں لاہور میں تھا۔ مختلف اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹہ کام کرنا مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اور اپنی زندگی کو انتہائی ناکام سمجھتے ہوئے کچھ مایوس سا تھا۔

میرا کچھ وقت مرحوم لالہ رام رچپال سنگھ شیدا اور مرحوم لالہ بالکے دیال کے ساتھ صرف ہوتا۔ ایک بار ان دونوں حضرات سے پنڈت راج ٹرائن ارمان کھٹے شامتری بھٹے کے لیے آئے۔ اور باتیں ہو رہی تھیں۔ تو پنڈت جی نے فرمایا۔ کہ بھرگو سنگت کا کچھ حصہ ان کے پاس موجود ہے، یہ سن کر ان دونوں حضرات کے دل میں بھرگو سنگت یاد رکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اگلے روز ہم تینوں بھرگو سنگت دیکھنے کے لئے پنڈت راج ٹرائن جی کے مکان پر گئے۔

بھرگو سنگت کیا ہے۔ اس کے متعلق بعد میں جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں۔ وہ یہ ہیں کہ یہ نام درودنا باب کتاب علم جوتش کے موجد بھرگو رشی کی تصنیف ہے۔ جسے ہزار بار س جوتے تصنیف کیا گیا۔ یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصہ دو دریاؤں کے درمیانی حصہ کے لوگوں کے حالات کے متعلق ہے۔ یعنی ہر وہ آب کے لئے جو بلند و بلند ہے تمام کی تمام کل کتاب کا وزن کئی من بتایا جاتا ہے۔ اور مختلف لوگوں کے پاس مختلف حصے ہیں۔ اس کتاب کے کچھ حصے تو جرمنی کے پروفیسر میکس مولر (یہ بزرگ سنسکرت زبان کے بہت بڑے عالم تھے) ہندوستانی پنڈتوں سے خرید کر جرمنی لے گئے اور انہوں نے وہاں کے سرکاری کتب خانے میں رکھے۔ بعض حصے ہندوستان میں چھپ بھی گئے ہیں۔ مگر زیادہ تعداد ایسی ہے جو ابھی نہیں چھپی۔ اس کتاب پر جو دنیا میں پیدا ہو چکے، اب موجود اور آئندہ پیدا ہونے والے ہر انسان کا راز چھ اور زندگی کے حالات ہیں۔ اور صرف اس زندگی کے حالات ہی نہیں۔ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ انسان کچھ جہنم یعنی اب پیدا ہونے سے پہلے کی زندگی میں کہاں تھا۔ اور مرنے کے بعد پھر کہاں پیدا ہو گا۔

ہم لوگ پنڈت جی کے پاس پہنچے۔ شکار اور بھتے ہونے کے جذبات میں شروع ہوئیں۔ تو ہم لوگوں نے

بھر گونگتا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پنڈت جی کے پاس ایک حصّہ تھا۔ ہم لوگ اپنی کنڈلیاں یعنی راجپے  
ساتھ لے گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی کنڈلی پنڈت جی کو دی۔ انھوں نے ہمدست کافی دقت  
صرف کر کے میری کنڈلی کو بھر گونگتا کی ہزار ہا کنڈلیوں میں سے ایک  
کے ساتھ ملائی۔ کنڈلی کے بدلنے کے بعد اس کنڈلی کا جو پہل یعنی نتیجہ پنڈت جی نے پڑھا۔ وہ مجھے اچھی نظر  
سے یاد ہے جو یہ تھا:-

”یہ انسان اپنے باپ کے لئے بہت ہی نقصان کا باعث ہو چلا۔ اس میں ہرگز تو والد کی صحت گرنی  
شروع ہوگی۔ پیدا ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر اس کا باپ انتقال کر جائے گا۔ اس انسان کو  
علم کچھ نہ ہو۔ مگر بہت ہوشیار ہو۔ اٹھارہ برس کی عمر میں زمین بے سترہ برس کی عمر میں ایک  
لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو۔ اور بہت تکلیف اٹھائے۔ اس لڑکی کے ساتھ اس انسان کا  
پچھلے جنم میں بھی تعلق تھا اس لئے اس لڑکی کو پچھلے جنم میں تکلیف دی تھی۔ یہ لڑکی پچھلے جنم کا بدلہ اس کے  
اس جنم میں لے گی۔ جب کہ اس انسان کی عمر سترہ برس کی ہوگی۔ یہ انسان پچھلے جنم میں بنارس کے ایک  
برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اور آئندہ جنم میں بھی بنارس میں ہی پیدا ہوگا۔ یہ انسان بہت خوش  
نصیب اور خوش بخت ہے۔ زندگی میں لاکھوں انسانوں کے دماغوں پر حکومت کرے۔ چڑھنے کے  
لئے اسے سوار کی نصیب ہو لاکھوں روپیہ پیدا کرے۔ اور لاکھوں خرچ کرے۔ ہمیشہ مقررہ لئے۔  
زندگی بھر دشمنوں کا مفت بلا کر رہے۔ اور ان کو نچا دکھاتا رہے۔ راجوں ہمارا جوں کے لئے خوشاک  
ہو۔ اس کا رزق اس کے وطن سے مشرق کی طرف ہو۔ اسی برس کی عمر کے بعد کالج کی حرکت قلب کے  
بند ہونے کے باعث اس کی موت واقع ہو“

یہ مختصر حالات جب میں نے سنے تو میں حیران تھا کہ اس دقت تک کے گزر چکے تمام واقعات درست ہیں  
مگر اس بات پر یقین نہ آتا تھا۔ کہ میری آئندہ زندگی اس قدر شاندار ہوگی۔ کیونکہ میں اُس دقت کی حالت سے  
بہت باپوس تھا۔ چنانچہ گزر چکے حالات یہ تھے۔ میرے والد کا انتقال جب ہوا۔ تو میری عمر صرف چالیس  
کی تھی۔ علم سکول میں صرف پانچویں جماعت تک حاصل کیا۔ اس کم تعلیم میں ہی لاہور کے اخبارات کو ایڈیٹر  
کر رہا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر تھی۔ جب ہماری زمین تقسیم ہوئی۔ اور مجھے میرا حصّہ ملا۔ سترہ برس کی عمر تھی۔ جب  
میں دھرم کوٹ (ضلع فیروز پور) میں تھا۔ اور مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔ میں نے اس لڑکی سے کہہ  
کئی باتیں کہ نہ تھیں۔ مگر ایک برس تک رات کو مجھے نیند نہ آتی۔ اور بے چین رہتا۔ اگر میری با  
پر یقین کیا جائے تو میں سچ کہتا ہوں کہ اس عمر میں مجھے عورت اور مرد کے تعلقات کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔  
اپنے ہم عمر میں اس عہد بار سے انہماجی بے وقوف اور ناز افش سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے۔ ۳۱  
میں جب باتیں کرتے ہوئے ایک صاحب سے حیض کا لفظ سنا۔ تو میں نے پوچھا کہ حیض کسے کہتے ہیں تو میر  
اس سوال کو میں کر میرا ذاق اُڑا یا گیا۔ اور ایک صاحب بابو نور محمد نے کہا۔ کہ میں بہت ہی احمق ہوں، ۱۱  
سال تک اس لڑکی کے عشق میں مبتلا رہا۔ اُس کے بعد اس لڑکی کا انتقال ہو گیا اور مجھے بے حد صدمہ  
جب میں نے اس کے انتقال کی خبر سنی۔ تو میرے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ جو ہاتھوں میں سے گر گیا۔ اور ۱

ی جب کبھی اس رات کی اور اس کے گھر کے لوگوں کا خیال کرتا ہوں۔ تو ایک ناقابل بیان کیفیت کے باعث ہم میں کچھ سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ واقعات تو ایسے تھے۔ جو میری زندگی میں اس سے پہلے گزرنے لگے تھے۔ اور ذمہ یہ واقعات میری زندگی میں پیش آئے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ آئندہ کے خوش گوار زمانہ کے متعلق بھی مجھے یقین آتا مگر جب اس وقت کی حالت پر غور کرتا۔ تو خیال آتا کہ بھر گوسنگتا کے کچھ حالات شاید درست ہوں۔ اور کچھ غلط۔ کیونکہ یہ تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ لاکھوں روپیہ پیدا کروں گا۔ اور بیک میں اتنی شہرت ہوگی۔ بھر گوسنگتا سے یہ حالات معلوم کرنے کے بعد جوتشی کے متعلق مجھے بہت دل چسپی ہو گئی۔ میں نے مختلف روشیوں سے اپنی جنم پتری اور درش پھل بنوانے شروع کئے۔ اور ہمیشہ تمام حالات ملتے رہے۔ جن میں سے کچھ واقعات اور اپنے ذاتی تجربات بیان کرتا ہوں۔

میں نابھہ میں ملازم تھا۔ مرحوم ہمارا جہا نا بھہ پر بہت خوش اور مہربان تھے۔ کیونکہ مرحوم ہمارا جہا نا بھہ نے مجھے مارشام لال کپڑا، ٹیڑ، گور و گنگشاں، کی معرفت چالیس ہزار روپیہ دینا چاہا۔ تاکہ میں ہمارا جہا نا بھہ سے فدا ری رکے۔ نابھہ سے جلا جاؤں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ ہمارا جہا نا بھہ سے میں نے اس کا ذکر نامناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ ان کی طبیعت مشکوک تھی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر میں نے ان سے ذکر کیا۔ تو ان کو ممکن ہے میرے متعلق کوئی شبہ پیدا ہو۔ مگر ہمارا جہا کو دوسرے ذرائع سے اس کا علم ہو گیا۔ تو میری تنخواہ دو گنی کر دی گئی۔ اور ہمارا جہا مجھے رہائش کے لئے ایک کوٹھی اور زمین دے کر اپنی رعایا بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اس حالت میں جب کہ ہمارا جہا مجھ پر بہت خوش اور مہربان تھے۔ ریاست کچن کے ایک جوتشی کا لکھا ہوا میرا درش پھل (ساٹنامہ) جو میں نے مسٹر رنگا آڑ کی معرفت ان کے خسر کے ایک دوست جوتشی سے منوایا تھا۔ دیکھا۔ تو اس میں لکھا تھا۔ کہ میں اس میں ملازمت سے موقوف کیا جا کر جیل میں قید کر دیا جاؤں۔ اس درش پھل کے لکھے ہوئے حالات اور ہمارا جہا لہرانی دونوں متضاد صورتیں تھیں۔ اور یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہو گا۔ مگر اس درش پھل کے آنے کے دو ماہ بعد ہمارا جہا نا بھہ گدی سے اتر گئے۔ ایڈمنسٹریشن انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اور میں نہ صرف موقوف کر دیا گیا۔ بلکہ کمپرائزمنٹ ٹیڑ مسٹر اگلو (جو بعد میں سکریٹری ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند تھے) نے مجھے بغیر مقدمہ چلائے یا جرم بتائے نابھہ میں قید کر دیا۔ اور ستاروں کا انٹریل نہ سکا۔

موجودہ ہمارا جہا نا بھہ حسب پیدائش۔ تو ان کے والد مرحوم ہمارا جہا نا بھہ نے بچہ کی جنم پتری تیار کرنے کے لئے کئی جوتشی بلائے۔ اس زمانہ میں نابھہ میں وزیر اعظم مسٹر نرسنگا راؤ تھے۔ ان کی معرغب بھی جنوبی ہندوستان سے ایک مشہور جوتشی دوسرہ دہرہ رزانہ فیس پر آئے۔ اور نابھہ میں ایک ماہ کے قریب ٹھہرے۔ اس جوتشی نے ہمارا جہا کو بتایا کہ یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اپنے باپ کی جگہ چھل کرے گا۔ یعنی نابھہ کے تخت پر بیٹھے گا۔ چھ ماہ کو اس وقت تو اس کا یقین نہ آیا۔ بلکہ اس جوتشی کے متعلق ہمارا جہا کے خیالات کچھ نفرت کے سے ہو گئے تھے۔ مگر ہمارا جہا کی یہ نفرت برصغیر اور برصغیر کے اثرات کو کیونکر بدلتی۔ بچہ کی پیدائش کے بعد ہی بڑے دن شروع ہوئے۔ اور یہ برغور دارا بھی دو تین برس کا ہی تھا کہ باپ گدی سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اس جوتشی کے قول کے مطابق بیٹے نے باپ کی جگہ یعنی گدی پر قبضہ کر لیا۔

نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کا ہر شگ آباد والا مقدمہ چل رہا تھا۔ مجھ نے ایڈیٹر ریاست کو

تین سال قید کی سزا دی۔ سشن جج نے یہ سزا نو ماہ کر دی۔ مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا۔ تو سزا موقوف ہو کر مقدمہ کو پھر نئے سرے سے شروع کرنے کا حکم ہوا۔ مقدمہ کے پھر دوبارہ شروع ہوتے پر جسٹریٹ نے نو ماہ کی سزا دی۔ تو اس کی اپیل ڈاکٹر کیٹ ہائی کورٹ میں ہوئی اور ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا کہ جسٹریٹ کی اپیل ڈاکٹر کیٹ ہائی کورٹ میں گئی (ایڈیٹر ریاست) مع اپنے وکلاء مسٹر توکلی اور سردار بھگوان سنگھ اپیل کے سلسلہ میں ناگپور گئے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ رہاں بیتا بلدی میں ایک مرہٹہ مسٹر کرگے جوش میں بہت لائق ہیں یہ پہلے کوئنٹنٹ جنرل کے دفتر میں اعلیٰ نمبندہ پر تھے۔ رہا کر ہوئے کے بعد تفریقاً جوتش کا کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت سن کر میں ان سے ملنے گیا۔ میری جنم کنڈلی (رزا پنچ) میرے ساتھ تھی۔ ان کے مکان پر پہنچ کر میں نے وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ تو لینے کے لئے باہر آ گئے۔ مقدمہ کی کارروائی چھ سال سے اخبارات میں چھپ رہی تھی۔ اور یہ اخبارات پڑھا کرتے تھے۔ بہت عزت کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ بتایا کہ آپ کی شہرت سن کر آیا ہوں کنڈلی دکھانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں ان کو اپنی کنڈلی دے آیا۔ انھوں نے تین روز کے بعد آئے کیلے کہا۔ میں تین روز کے بعد پھر گیا۔ تو انھوں نے کہا۔

”جس طرح بھی ممکن ہو۔ آپ ۱۲ فروری تک مقدمہ کر لیا جائے۔ اگر یہ مقدمہ ۲۰ فروری سے پہلے فیصلہ ہوا۔ تو آپ لازمی طور پر قید ہو جائیں گے۔ تو قید میں آپ کے جسم یا آپ کی آتما (روح) کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مگر آپ کی آزادی لازمی طور پر ایک جگہ محدود ہو جائے گی۔ اور اگر اس مقدمہ کا فیصلہ ۲۰ فروری کے بعد ہو۔ تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس مقدمہ میں قید نہیں کر سکتی۔ آپ لازمی طور پر اس تاریخ کے بعد بری ہوں گے۔“

یہ واقعہ آخر نمبر کا ہے جس نے گزشتے صاحب سے کہا کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں ہے۔ چھ سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ پہلے کئی بار ہائی کورٹ میں پیشیاں ہوئیں۔ یہ آخری پیشی ہے کیونکہ ہائی کورٹ اس مقدمہ کو خود ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ تاریخ کے تبدیل یا مقدمہ کے ملتوی ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ مگر کے حساب سے بتایا کہ اگر مقدمہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر قید کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مگر ۲۰ فروری کے بعد میں جیل میں نہ رہ سکوں گا۔

پنڈت جی سے باتیں کر کے میں واپس چلا آیا۔ مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ تین روز تک بحث ہوتی رہی۔ میری طرف سے ڈاکٹر کمار (جو اسمبلی میں مخالفت پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہے) مسٹر شریف شریف (جو پی کے منسٹر تھے) مسٹر بی۔ بی۔ توکلی ایڈوکیٹ دہلی اور سردار بھگوان سنگھ میر مسٹر اجیر دھیرہ وکلاء تھے۔ اور ذاب بھوپال کی طرف سے ڈاکٹر سرنیج بھادوہرہ۔ سرسی۔ پی۔ راماسوامی آکر (جو بعد میں گورنمنٹ مین کے ممبر انتظامیہ کونسل اور وزیر اعظم ریاست ٹراونکور تھے) سر عبدالرحمن (جونج لاہور ہائی کورٹ تھے) وغیرہ تھے۔ جہان میں ایک ہندوستانی مسٹر نیوگی اور ایک انگریز تھے۔ عدالت نے فیصلہ کے متعلق کہا کہ پھر سنایا جائے گا میں داپس دہلی چلا آیا۔ عدالت نے مجھے حکم دیا کہ میں ۵ دسمبر کو مسٹر کٹ جسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں حکم سننے کے لئے پہنچ جاؤں۔ حکم دیاں بھیج دیا جائے گا۔

دہلی پہنچ کر میں اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ اور مجھے پورا یقین تھا کہ میں بری ہو جاؤں گا۔ کیونکہ

نواب بھوپال کے دکن کے پاس اس قانونی پرائنٹنگ کارٹی جواب نہ تھا کہ اخبار دہلی میں چھپا اور شائع ہوا۔ اور ہوشنگ آباد کی عدالت جس کی جو رسد گمشدہ ضلع ہوشنگ آباد تک محدود ہے۔ اور جس کی اشاعت کو نواب بھوپال ہوشنگ آباد کے علاقہ میں ثابت نہیں کر سکے۔ لازم کو دہلی میں کیے گئے جرم کے لئے ہزارے۔ مگر مجھے ۳۰ روپے کی جرمانہ دیا۔ دفت ڈاکٹر کدرا کا تار لایا کہ مجھے تین ماہ کی سزا ہوئی ہے۔ اور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں ۵ دسمبر کو پہنچ جاؤں تار کے بلے پر میں شام کو گریڈ ٹرنک ایکسپریس میں سوار ہوا۔ اگلے روز شام کو ناگپور پہنچا۔ تاکہ کدرا صاحب سے فیصلہ کے متعلق مزید واقفیت حاصل کروں۔ وہاں ڈاکٹر کدرا سے دو تین گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد رات کو دس بجے سوار ہوا۔ ۵ دسمبر کی صبح ہوشنگ آباد پہنچا۔ ڈاکٹر کدرا میں جہاں ہمیشہ قیام ہوا کرتا تھا۔ گیا غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اور بریک فاسٹ کھا کر دس بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یورپین تھے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے انھوں نے کاغذات کی ضروری خانہ دہی کی اور ایک سب انسپکٹر پولیس کے ساتھ مجھے ہوشنگ آباد جیل میں بھیج دیا۔

میں ہوشنگ آباد جیل میں غالباً دس روز رہا۔ وہاں جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ سی بی۔ کو لکھا کہ دیوان سنگھ لے کلاس کا قیدی ہے۔ اس جیل میں اسے کلاس کے قیدیوں کے لئے معقول انتظام نہیں۔ اس لئے اسے سنٹرل جیل ناگپور میں بھیجا جائے۔ وہاں سے جواب آیا۔ میں ناگپور گیا۔ وہاں اس کو رہ اور احاطہ میں مجھے رکھا گیا۔ جہاں اس سے پہلے ڈاکٹر کدرا سے اور سی بی کے دو سپرنٹنڈنٹ چکے تھے۔ اور جہاں میرے بعد جڑوں کے ہیڈ ریسرچر بھی قید رہے۔ میں یہاں بہت آرام سے تھا۔ جیل کے حکام دن میں کئی کئی بار اگر میری ضروریات کے متعلق پوچھتے اور دوستانہ سپرٹ کا اظہار کرتے۔ بلکہ اکثر شام کو میرے ہاں ہی چائے پیتے۔ کئی روز گزرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ جب اس مقدمہ میں پہلی بار مجسٹریٹ نے تین سال کی سزا دی۔ اور اس سزا کے سننے کے بعد میں ہوشنگ آباد جیل میں گیا۔ تو ضمانت کے دہوئے تک ایک ہفتہ جیل میں رہا۔ اس کے بعد چیپشن راج نے مجھے نو ماہ کی سزا دی تو اس وقت بھی ہائی کورٹ سے ضمانت ہونے تک ایک ہفتہ رہا۔ یعنی دو ہفتہ میں جیل میں پہلے رہ چکا ہوں۔ یہ دو ہفتے میری موجودہ تین ماہ کی قید میں سے کیوں بچا نہ دیئے جائیں۔ میں نے اس اپنے خیال کو اگلے روز کرنل موڈی آئی۔ ایم۔ ایس سپرنٹنڈنٹ جیل پر ظاہر کیا تو کرنل موڈی نے کہا کہ چونکہ مقدمہ کی پہلی تمام کارروائی جج ہائی کورٹ رہا اور ناقابل عمل قرار دی جا چکی ہے اس لئے اس کارروائی کے دوران میں بھگت چکی دو ہفتہ کی سزا تو بچا نہ دی جائے گی۔ میں نے کرنل موڈی سے پھر کہا کہ چاہے مجھ کو سزا دی جائے یا نہ دی جائے۔ آپ میری درخواست بھیج دیجئے۔ کرنل موڈی نے کہا۔ درخواست بھیج دو مگر اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ چنانچہ میں نے اسی روز درخواست لکھی۔ کہ اس مقدمہ میں ہی گو، ڈی نوڈو، ایل۔ یعنی نئی کارروائی ہوئی تھی اس جرم میں دو ہفتہ سزا بھگت چکا ہوں۔ اب تین ماہ میں سے مجھے وہ دو ہفتہ بچا دیئے جائیں۔

یہ درخواست میں نے قانون کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کو بھیجی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خود فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا کہ شاید لازم رہائی کے بعد ان دو ہفتوں کے عرصہ کے لئے جس بچا کا مقدمہ

دیکر دے۔ یا کوئی اور جھگڑا ہو۔ اس نے ذمہ داری نہ لینے کے لئے میری یہ درخواست ہائی کورٹ کو بھیج دی۔

شروع دسمبر میں میرے مقدمہ کا فیصلہ ہوتے ہی مقدمہ کے فیصلہ کی نقل گورنمنٹ ہند کے لا ممبر اور پریسیکل سیکریٹری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اور لا ممبر نے فیصلہ کو دیکھ کر اس پر ریمارک کئے۔ کہ جس جرم کے لئے ملزم کو سزا دی گئی اس میں ملزم کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ جرم مجسٹریٹ کی جو رسد کٹش میں نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہائی کورٹ کا فیصلہ خلاف قانون ہے۔ لا ممبر کے ریمارک ہائی کورٹ کے ججوں کی اطلاع کے لئے میری اس درخواست سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور وہ اپنے غلط فیصلہ کو محسوس کر چکے تھے۔ میری یہ درخواست جب پہنچی تو انھوں نے اس پر حکم لکھ دیا کہ ملزم کو دو ہفتہ کا عرصہ تین ماہ کی سزا میں سے کم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق میں ۲۲ فروری کی صبح کو یعنی ستر گز کے جوتشی کے حساب کے مطابق ٹھیک اس روز جس دن میرے ستاروں میں تبدیلی ہوئی۔ میں خلاف توقع اور خلاف قانون طور پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔

جوتشی کے متعلق ایک واقعہ اور دلچسپ ہے۔ اور جس کا ثبوت شاید اب بھی نوٹوں والے میرے مقدمہ کی مثل سے مل سکے۔ نوٹوں کے مقدمہ میں جب میری تماشائی ہوئی۔ تو تماشائی میں رائے صاحب گوپال داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی نے وہ کاپی بھی دیکھی جس میں میرے درش پیل کے ہر ماہ کے علیحدہ علیحدہ آنے والے واقعات تاریخ وار درج تھے۔ اسس کاپی میں لکھا تھا کہ میں دسمبر میں پھر گرفتار کیا جاؤں گا۔ چنانچہ میری گرفتاری دسمبر میں ہی ہوئی تھی۔ یہ کاپی پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی جس نے تماشائی کی برآمد شدہ اشیاء کے ساتھ اس کاپی کو بھی شامل کر لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر مثل تلف نہیں ہوئی تو یہ کاپی اب بھی مثل کے کاغذات کے ساتھ شامل ہے جس پر میری گرفتاری دسمبر میں لکھی ہے۔

میری جہنم کنڈلی یعنی میرے زانچہ کو دیکھا جاتے تو سورج پہلے گھر میں ہے جس کا اثر یہ ہے۔ کہ جسم رعب دار۔ آنکھوں میں مہر خ دورے مشکلات پر غالب۔ لوگ سخر ہوں۔ اور محبت کریں۔ مجھے کشمکش میں ہمیشہ فتح نصیب ہو۔ شخصیت با اثر۔ سورج کے علاوہ میرے دوسرے ستاروں کے اثرات یہ ہیں جس کے متعلق تمام جوتشی متفق ہیں۔ میں زندگی بھر حکومت کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ مجھ پر مقدمات قائم ہوں گے۔ اور ہمیشہ ہی ستارہ برہسپت مجھے بچاتا رہے گا۔ میں ہمیشہ فضل خرچ رہوں گا۔ اور زندگی بھر کبھی بھی قرض نہ اتر سکے گا۔ حالانکہ لاکھوں روپیہ پیدا کر لیا گا۔ میری صحت اچھی رہے گی۔ روپیہ سے کبھی محبت نہ کروں گا۔ بیوی سے تعلقات کشیدہ رہیں گے۔ زندگی میں کسی ملازم نہ آ رہا ہوں گے مگر کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ وہ خود نقصان اٹھائیں گے۔ میں غیر ممالک کا سفر کروں گا۔ اور مجھ سے محبت کرنے والے فلص دوست میری زندگی میں بہت کثرت کے ساتھ ملیں گے۔ میرے زانچہ میں چند راں یعنی جائز ایسٹنا میں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ میری شہرت دوزخ تک پہنچے۔ اور میری پوزیشن بڑے سے بڑے لوگوں یہاں تک کہ راجوں اور ہمارا جوں کے لئے بھی قابل رشک ہو۔

جس آئندہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا جو۔ اور ستاروں کے اثرات کیا صورت پیدا کریں گے۔ مگر جانتی کہ گزشتہ واقعات کا تعلق ہے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں۔ جو جوتشی کے مطابق نہ ہو۔ اور اس علم کے متعلق مجھے اتنا ہی یقین ہے۔ جتنا دن کی روشنی کو دیکھ کر سورج نکلنے کا ہو سکتا ہے۔

جو تپش کے ذریعہ حالات معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ پیدائش کا ٹھیک وقت جس میں ایک منٹ کا بھی فرق نہ ہو تاریخ، دن اور مقام کا علم ہو۔ اگر یہ معلوم نہ ہوں۔ تو پھر درست حالات معلوم کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ ٹھیک وقت کے معلوم نہ ہونے کے باعث کنڈلی غلط بنے گی۔ اور کنڈلی کے غلط بننے کی صورت میں حالات کا غلط ہونا لازمی ہے۔

## کیریکٹر کا بننا اور بگڑنا

ہندوستان کی آبادی میں ہر دس برس کے بعد کسی گروڈر نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ملک میں بچے تو اس زیادتی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں مگر بچوں کے کیریکٹر کو بنانے یا بلند کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بہت اعلیٰ طبقہ کے خاندان کے بچوں کو چھوڑ کر چھوٹے اور درمیانہ خاندان کے بچوں کی حالت یہ ہے کہ یہ جھوٹا بلند دوسرے کی شے کا اٹھانا۔ گالی دینا اور بد چلنی وغیرہ کو عیب نہیں سمجھتے۔ بلکہ عندہ پن کو بہادری اور شجاعت قرار دیا جاتا ہے۔ اور بچوں کی اس آوارگی میں فلم انڈسٹری نے اور اضافہ کیا۔ بازار میں دیکھئے یا گلی کوچوں میں بچے فحش اور عشقیہ فلمی گیت گاتے نظر آئیں گے۔ اور ایک اہل الرائے بزرگ کے قول کے مطابق ہندوستان کی آئندہ نسل ملک کے لئے جیلوں کے موجودہ سزایافتہ مجرموں سے زیادہ ذلت کا باعث ہوگی۔ اور کسی بچے کے والدین کو خیال نہیں کہ اس کی اولاد کا انجام کیا ہوگا۔

انسانی کیریکٹر کے بنانے یا بلند کرنے کے لئے بچپن کی عمر بہت زیادہ موزوں ہے۔ میں اپنی زندگی کے چند واقعات عرض کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اچھا یا بُرا بنانے میں بہت حصہ لیا۔ میری عمر دس برس کی ہوگی۔ ہمارے گھر میں یہ معمول تھا کہ میری والدہ صبح تین چار بجے کے قریب جاگتیں۔ ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ بلا جو ایک مکان مولوی صاحب کا تھا۔ مولوی صاحب تو میری پیدائش سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ ان کے مکان میں ان کی ضعیف بوڑھی بیوہ رہا کرتیں۔ اور دلچسپی کے لئے اس بوڑھی خاتون نے کچھ بکریاں پالی ہوئی تھیں۔ اس خاتون کو ہم تمام لوگ ”بیوی“ یا بی بی“ کہا کرتے۔ اس کی اپنے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ بچاری گلی محلہ کے لوگوں کے بچوں سے محبت کر کے اپنے امستہ کے جذبات کی سکن کر لیتیں جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچوں کے لئے ہوا کرتے ہیں۔ میں اور میری عمر کے دوسرے بچوں کا دن بھر میں کچھ وقت ان ”بیوی“ کے گھر میں ہی بسر ہوتا۔ کیونکہ بچے اس شخص سے فوراً مانوس ہو جاتے ہیں جو ان سے محبت کرے۔ یہ بوڑھی خاتون مسازر دوزہ کی بہت پابند تھیں۔ اور علی الصباح تین چار بجے ہتھوڑ کی ساز بھی ضرور پڑھتیں۔

میری والدہ کا معمول تھا۔ یہ علی الصباح تین چار بجے جاگتیں۔ تو ان بیوی صاحبہ کو آواز دیتیں۔ کہ کیا جاگ گئیں۔ بیوی صاحبہ کو فوراً جواب آتا: ”ہاں بیٹا میں جاگ رہی ہوں“ اگر میری والدہ کو کبھی جاگنے میں دیر ہوتی۔ تو بیوی کی پہلے آواز آتی۔ اور والدہ اس کا جواب دیتیں کہ ”ہاں میں جاگ رہی ہوں۔“

میری والدہ جاگنے کے بعد گھر میں جھاڑو دیتیں۔ برتن وغیرہ صاف کرتیں۔ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ آہستہ

آہستہ میں بائی کا بھجن گنگنایا کرئیں۔ جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔

”میرے تو سن رام نام دوسرا نہ کوئی“

اگر میراں بائی کے یہ بھجن نہ ہوتے۔ تو گرنتھ صاحب کے شہد ہوتے۔ میں اس تمام کیفیت کو نیم خوابیدہ حالت میں سنا کرتا۔ یعنی نہ تو میں پورے طور سے سوتا ہوتا اور نہ میں جاگتا۔

سورج نکلنے سے پہلے والدہ مجھے جگاتیں۔ اور سیتھل اور ہمیشہ کے لئے میرا فرض قرار دیا گیا تھا۔ کہ میں اس وقت گوردوارہ جاؤں۔ وہاں ہی ریسٹ کے تازہ پانی سے غسل کروں۔ غسل کے بعد گوردوارہ میں گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹھیکوں یعنی سجدہ کروں۔ اور کچھ دیر پاٹھ شری کر پھر واپس آؤں۔ میرے واپس پہنچنے سے پہلے میرے لئے زرد رنگ کے ٹیکین چاول تیار ہوتے۔ یہ میرا ناشتہ تھا۔ ان چاولوں پر باجے ملاؤ بھی کہا جاسکتا ہے) میں وہ لذت مٹتی۔ جو اس کے بعد کبھی دایان ریاست کے دسترخوان پر بھی نصیب نہیں ہوئی۔

مگر یہیں میں توجہ گوردوارہ رہائے گھر سے یہ گوردوارہ نصف میل ہوگا) جانا اور وہاں غسل کرنا زیادہ وقت کا باعث نہ تھا۔ مگر سردیوں میں اسے میں ایک بہت بڑی مصیبت سمجھتا تھا۔ مگر کیا کرتا۔ جس میں گوردوارہ نہ جاؤں۔ اور وہاں غسل نہ کروں۔ مجھے ناشتہ نہ ملتا تھا۔ اور والدہ کی ناراضی الگ تھی۔ میں کبھی کبھی طبیعت کے اچھا نہ ہونے یا سرمیں درد کا بہانہ کر کے صبح کے اس غسل کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیتا۔ مگر ایسا ہر روز ممکن نہ تھا۔

سردیوں کا زمانہ تھا۔ میں حسب معمول سورج نکلنے سے پہلے جاگا۔ ہاتھ پاؤں سن ہوئے جاتے تھے تھوڑے دیش بر جان درویش۔ گوردوارہ گیا۔ وہاں حسب معمول مردانہ میں سینکڑوں مرد اور زمانہ میں سینکڑوں عورتیں غسل کر رہی تھیں۔ مگر میرا ہانے کو جی نہ چاہا۔ میں نے ہاتھ دھوئے سمجھ دھویا۔ پاؤں دھوئے۔ اور گوردوارہ کے اندر گرنتھ صاحب کی حاضری دے کر واپس آگیا۔ انسان نے غسل کیا ہو۔ تو وہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جسم میں حسّی اور زندگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں جب گھر پہنچا تو والدہ نے مجھے دیکھتے ہی محسوس کیا کہ میں نے غسل نہیں کیا۔ پوچھا۔ کیا ہنا آئے۔ میں نے فوراً بغیر ضروری چپتی اور جرات کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں۔ والدہ نے میرے ہاتھ دیکھے۔ پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ دھلے ہوئے تھے۔ گردن کے پاس کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ تو میرا جسم دیسے ہی تھا جیسے ہاتھ غسل کے شخص کا ہو سکتا ہے۔ والدہ نے کہا کہ سچ بتاؤ۔ جھوٹ مست بولو۔ کیا ہنا آئے۔ میں نے پہلے سے زیادہ جوش اور جرات کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں نہایا ہوں۔ مگر یہ کہنا تھا کہ والدہ نے مجھے کڑا اور پشیمان شروع کیا۔ مجھے بہت مارا کیونکہ میرے دگر جرم تھے۔ ایک نہ نہانا۔ اور دوسرے جھوٹ بولنا کچھ دیر پیٹنے کے بعد میں نے اقرار کر لیا کہ میں نہ نہایا تھا۔ اور میں نے جھوٹ بولا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میں ساہا سال تک گوردوارہ جا کر وہاں غسل کرتا رہا۔ اور بچپن کے غسل کی اس عادت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں زندگی بھر ہمیشہ ہی ہر روز غسل کرتا رہا۔ پورے سال میں شاید ہی پانچ سات دن ایسے ہوتے ہوں۔ جب کہ میں نے بیماری یا کسی دوسری وجہ سے غسل نہ کیا ہو۔ اور کپڑے



نہ بدلے ہوں۔ ورنہ سردی ہو۔ گرمی ہو۔ سفر ہو۔ مصیبت میں ہوں یا راحت میں۔ میرے لئے غسل اور کپڑے بدلنے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کھانا۔ اور نہانا میری ایک فطرت سی بن چکی ہے۔ میں کھانے کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ مگر غسل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ہر روز غسل کرنا میرے کیریکٹر کی بناوٹ کے ساتھ ساتھ بطور عادت کے مجھے نصیب ہوا۔

میں موگا کے ہسپتال میں تھا۔ موگا عیسائیوں کا ایک ٹہٹ بڑا مرکز ہے۔ وہاں متعدد امریکن پادری رہتے تھے۔ ایک پادری کی پشت پر کمینہ ہوا۔ اس کا اوپریشن ہوا۔ تو وہ سرکاری ڈاک ہنگلہ میں چلا گیا۔ کیونکہ وہاں رہنے کے لئے جگہ اچھی تھی۔ میں اس پادری کے زخم کی ڈرینگ کے لئے ہر روز وہاں جاتا۔ ایک روز یہ امریکن پادری غسل خانہ میں تھا۔ اور میں اس کے کمرہ میں اس کا انتظار کر رہا تھا کہ میں نے اس کے میز پر پڑا ہوا ”اسٹریٹڈ ویکی آف انڈیا“ دیکر خیال ہے کہ اس زمانہ میں اس رسالہ کا نام ”ٹائمز آف انڈیا اسٹریٹڈ ویکی“ تھا، اٹھایا۔ اور اس میں سے تصاویر دیکھنا شروع کر دیں۔ میں تصاویر دیکھ رہا تھا کہ یہ پادری غسل خانہ سے باہر آیا۔ میرے ہاتھوں میں اپنا رسالہ دیکھ کر بہت برا مانا۔ مگر پادری لوگ بہت جاہل طبیعت ہوتے ہیں۔ میں عمر کے لحاظ سے بھی بچہ ہی تھا۔ اس نے نہایت نرمی کے لہجہ میں مجھ سے کہا:-

”کسی شخص کی کتاب۔ اخبار۔ خطوط۔ کا غذا کوئی دوسری شے بغیر مالک کے پوچھے بغیر اجازت کے اٹھانا بہت بڑی بد اخلاقی ہے۔ یہ بھی نہ ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے لوگ اس عیب کو محسوس نہیں کرتے۔“

میں اس زمانہ میں بھی بہت ذکی احس تھا۔ پادری کی اس شریفانہ تنبیہ کو میں نے بہت محسوس کیا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ ایک تو میری غلطی تھی۔ دوسرے اس زمانہ میں سفید رنگ کے پادری انگریز حاکموں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ ڈرینگ کر کے میں واپس آیا۔ بے حد نادام تھا۔ کہ میں نے ایشیا کیوں کیا۔ اس واقعہ کے بعد میری تمام زندگی میں شاید ایک واقعہ بھی ایشیا نہیں۔ کہ میں نے کسی عزیز سے عزیز دوست کی کتاب۔ اخبار یا دوسری کسی شے کو بغیر اجازت کے کبھی چھوا ہوا۔ اور اب جب ملنے والے اصحاب آتے ہیں۔ اور بیٹھتے ہی میرے دفتر کے اخبارات اور رسائل کو بے تکلفی کے ساتھ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں بے حد کوفت محسوس کرتا ہوں۔ دن میں ایک آدھ بار بعض اصحاب کے سامنے مجھے پادری کے اُن الفاظ کو دہرانا بھی پڑتا ہے۔ مگر یہ افسوسناک ہے کہ ان اصحاب پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اگر انسان اپنے کیریکٹر کو درست کرنا چاہے۔ تو اس کے لئے قدم قدم پر بیعت موجود ہے۔ اور اگر اپنی کمزوریوں کو درست کرنا نہ چاہے۔ یا اپنی غلطی ہی تسلیم نہ کرے تو اس کا کیا علاج ہے۔

میں چالیس روز کا تھا۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ مرحوم والد تو بڑی پوزیشن کے تھے۔ مگر میری پرورش ہوش سنہالتے ہی افلاس میں ہوئی۔ جب گھر میں کھانے کے لئے نہ ہو۔ اور بچہ باپ کے سایہ سے محروم ہو جائے۔ تو بچہ کو تربیت کون دے۔ میری والدہ مذہبی خیالات کی تھیں۔ اس لئے مذہب سے متعلقہ یعنی غسل وغیرہ ایسی باتوں کا تو نتیجہ پر اثر ہوا۔ مگر کیریکٹر کے دوسرے حصوں کے اعتبار سے میری تربیت

نہ ہو سکی۔ چنانچہ بچپن میں میرے پاس رومال نہ ہوتا۔ رومال کے نہ رکھنے کی عادت آئندہ زندگی میں بھی نہ بدل سکی۔ سیکٹر میں بار رومال خریدے۔ درجنوں رومال کپڑے کی الماریوں اور کپڑوں میں پڑے رہتے۔ اور بار بار رومال نہ ہونے کے باعث مذامت اور شرمندگی اٹھانی پڑی۔ مگر کیر کیٹر کی یہ کمزوری جس کی بنیاد بچپن میں رکھی گئی۔ آج تک دور نہیں ہو سکی۔ چنانچہ مجھے یاد ہے۔ چند برس ہوئے۔ مرحوم ہمارا جہا جہ سے بیٹے کے لئے کوڑائی کنال پھاڑا (صوبہ مدراس) پر گیا۔ طویل سفر کی تھکان اور گرمی سے سرد پھاڑ پر جانے اور آب و ہوا کی تبدیلی کے باعث مجھے شدت کا زکام ہو گیا۔ میں ہمارا جہ کے پاس بیٹھا ہوا بائیں کر رہا تھا۔ اور زکام کا اثر نمایاں تھا۔ مگر میرے پاس رومال نہ تھا۔ ہمارا جہ نے میری اس حالت کو محسوس کیا۔ اور آپ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک نیا رومال لائے۔ جب رومال آیا۔ تو ہمارا جہ نے شکراتے ہوئے اور رومال دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ مجھے رومال۔ آپ کو زکام کی تکلیف ہے۔“ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا جہ کے اس کہنے پر مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہو گی۔ کیونکہ میں زکام میں مبتلا تھا۔ تاک سے پانی پیر رہا تھا۔ اور میرے پاس رومال بھی نہ تھا یعنی بچپن میں کیر کیٹر بننے والے جہ کی کمزوری پیدا ہو گئی۔ وہ اب تک موجود ہے۔ اور بار بار مذامت اٹھانے کے بعد بھی یہ کمزوری وضع نہ ہو سکی۔ رومال کپڑے والی الماری یا کس میں پڑے رہتے ہیں مگر جیب میں نہیں رکھے جاتے۔ اور اگر کبھی جیب میں رکھ بھی لیا۔ تو خیال ہی نہیں آتا کہ رومال جیب میں پڑا ہے۔

جو لوگ اپنے بچوں کے بچپن سے لاپرواہ ہو کر ان کے کیر کیٹر میں غیباں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ والدین اپنے بچوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کیونکہ انسان کو بچپن کی تربیت سے جو خیالات چل رہے ہیں گے وہ چاہے اچھے ہوں یا بُرے مگر بھر تبدیل نہ ہو سکیں گے۔ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہو چکی کیر کیٹر کی کمزوریوں کا دور ہونا ممکن ہی نہیں جب تک قوت ارادی بہت ہی مضبوط نہ ہو۔ اور انسان ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اپنے دل و دماغ کے ساتھ کسی برس تک جنگ نہ کرے۔ اور جو لوگ قوت ارادی سے محروم ہیں۔ وہ مجبوراً دیکھیں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہو چکی کمزوریوں کا زندگی بھر شکار رہتے رہیں۔

## انگریزوں کے کیر کیٹر کی بلندی

مجھے کتوں کے رکھنے کا بہت شوق ہے۔ اور میں سب سے زیادہ کار سینیل نسل کے کتے پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ نسل اپنے مالک سے بہت محبت کرتی ہے۔ میں نے ”شیشین“ میں اشتہار دیکھا۔ جس دار برٹن کی طرف سے بچوں کی فروخت کے متعلق تھا۔ اس دار برٹن نے یہ قانون پنجاب کے مشہور انسپکٹر جنرل پولیس مرحوم مسٹر دار برٹن کی صاحبزادی تھیں۔ جنہوں نے پنجاب سے نکلی۔ ڈھکی اور دوسرے جرائم کا ہاتھ کیا۔ ڈاکوؤں کے پائی میں پہنائی جانے والی بھاری وزن کی میٹریاں اب بھی فنانوں اور جیلوں میں ”بارٹنی بیڑیاں“ کہلاتی ہیں۔ اور ضلع شیخوپورہ میں ایک گاؤں بھی ان مشہور دار برٹن کے نام پر دار برٹن آباد ہے اس زمانہ میں کسویں میں مقیم تھیں۔ ان سے خط و کتابت ہوتی۔ تو انہوں نے بتایا کہ وہ فی پل ایک سو روپیہ میں دیں گی۔ اور نیچے بہت خوبصورت لمبے کانوں والے سیاہ رنگ کے ہیں۔ میں نے ایک جوڑا

دوسرے روپیہ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اور لکھا کہ پلوں کو لینے کے لئے میں اپنا آدمی کسولی بھیجوں گا۔ اس فیصلہ کے بعد مس دار برٹن کا خط پہنچا۔ کہ پلوں کا دادا کسی برس ہوئے پلوں کے باپ کے پیدا ہونے کے بعد دیوانہ ہو گیا تھا۔ اور اگر مجھے کوئی شک ہو۔ تو میں سودا خچ کر سکتا ہوں۔ اُن کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا چنانچہ مجھے خیال ہوا کہ یہ پتلے بھی بڑے ہو کر اپنے دادا کی طرح دیوانے نہ ہو جائیں۔ میں نے ان پلوں کے لینے سے انکار کر دیا۔

اس واقعہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ سودا ہو چکا تھا اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا کہ پلوں کا دادا کبھی پاگل ہوا۔ مگر انگریزوں کا کیر کیٹر دیکھتے۔ اس خاتون نے کسی بات کو چھپا مانگنا سمجھا۔ اور صاف لکھ دیا کہ پلوں کا دادا ہائڈر فربیا یعنی دیرانگی میں مبتلا ہوا تھا۔ ان کی جگہ اگر کوئی ہندوستانی ہوتا تو کبھی یہ نہ لکھتا۔

”ریاست“ جب سے جاری ہوا ہے اس میں انگریزی۔ امریکن اور ہندوستانی فرموں کے اشتہارات ہمیشہ ہی شائع ہوتے رہے۔ مگر یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ ”ریاست“ کی پچھلی تمام زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں کہ کسی امریکن یا انگریزی فرم نے روپیہ ادا کیا ہو۔ اور ادا نہ کیا ہو۔ بلکہ اکثر ایسا ہوا۔ کہ دفتر ”ریاست“ نے غلطی سے بل کی رقم کم لکھ دی۔ تو ان فرموں نے غلطی کو درست کر کے رقم پوری بھیج دی۔

اس کے مقابلہ پر ہندوستانی فرموں میں شاید دو درجن سے زیادہ ایسی فرمیں نہ ہوں گی۔ جنہوں نے روپیہ وقت پر خود ہی بھیج دیا ہو۔ یا جن کی نیت روپیہ مارنے کی نہ ہو۔ باقی تمام فرمیں اس کرشمہ میں رہتی ہیں کہ اگر ممکن ہو۔ تو روپیہ کم ادا کیا جائے۔ یا مار لیا جائے۔ یہ حالت تو مشہور ترین کی ہے۔ ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر ہے اور جہاں انگریزی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں سے آج تک کبھی کسی ایک نے بھی روپیہ نہیں مارا۔ اور ایک ایک پائی ادا کرنا یہ اپنی ساکھ اور تجرباتی کیر کیٹر کے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ اور ریاست کے بننے کے بعد بھی انھوں نے پورا روپیہ ادا کیا۔

وہاں ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے پچھتر فی صدی تو ایسی ہیں جن کا سرمایہ۔ دفتر فرنیچر سٹاف یا بینک بیلنس وغیرہ اگر کچھ ہے۔ تو وہ صرف ان کے نام کے چھپے ہوئے بیٹرنارم کی صورت میں گویا کہ فرضی نام کی ایک کمپنی کے بیٹرنارم چھپوائے اور کام شروع کر دیا۔ نہ ان کے پاس کوئی آرٹھٹ۔ نہ بلاک بنانے کا سامان۔ نہ اثبات تیار کرنے کا تجربہ۔ اور بطور ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے اگر ان کو اخبار سے پچیس فی صدی کمیشن ملا۔ تو مشہور کمپنیاں بایں بلکہ بعض اوقات پچیس کا پچیس فی صدی کمیشن دے کر ان سے ہفتہ وار لیا۔ اور اخبار کو بھیج دیا۔ اور وہ کسرا اخبار کا روپیہ کم ادا کر کے یا بالکل مار کر پوری کر لی۔ اور شاید ہندوستان کے ہزار اخبارات میں سے ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو اس قسم کی ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی نادمندگی کا شکار نہ ہو ہو۔ چنانچہ ایک

ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ذمہ مار ۱۹۳۲ء کا روپیہ تھا۔ اخبار بند ہوا۔ تو اس ایجنسی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کو یہ روپیہ جھم کر سکے گی۔ مگر اس کی پڑوسی کے ساتھ اس میں اخبار جاری ہو گیا۔ اس کو سلسلہ کے روپیہ کی ادائیگی کے لئے درجنوں خط لکھے۔ جو اسے نادرہ۔ رجسٹرڈ نوٹس دینے پھر بھی کوئی جواب نہیں۔

اور آخر جب سطر رضا مرزا وکیل نے مقدمہ کی تیاری کر لی۔ تو پورا سطر صاحب مدنی پہنچے اور وعدہ کیا کہ روپیہ ادا کر دیں گے۔ مقدمہ نہ کیا جائے۔ مگر یہ وعدہ صرف میعاد گزرنے تک کے لئے تھا۔ چنانچہ آخر اس ”فرم“ سے تعلقات منقطع کر لئے گئے۔ اور اب اس کی معرفت کوئی اشتہار شائع نہیں کیا جاتا۔ گویا انگریزی و امریکن ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں جہاں اپنے مستقبل اور اپنی ساکھ کے خیال سے کسی کی ایک پائی رکھنا بھی اخلاقی اور تجارتی جرم سمجھتی ہیں۔ ہندوستانی ایجنسیوں میں زیادہ ایسی ہیں۔ جو اشتہارات کو بھی چار سو برس کا ایک نیامیدان سمجھ کر اس پیٹ میں داخل ہو گئیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات کسی ناواقف انگریزی یا امریکن ایجنسی کا ہنس تو آنکھیں بند کر کے چھاپ دیتے ہیں۔ مگر کوئی ہندوستانی ایجنسی اشتہار بھیجے۔ تو اعتماد کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ انگریزوں اور کمپنوں میں کیر کیئر ہے۔ مگر ہم ہندوستانی تجارتی کیر کیئر سے محروم ہیں۔

لندن سے ایک اخبار ”نیوز آف دی ورلڈ“ شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کا بہت زیادہ حصہ لندن کی عدالتوں کے مقدمات سے پُر ہوتا ہے۔ اس اخبار کو اگر غور کے ساتھ دیکھا جائے تو سو مقدمات میں سے شاید دو تین بھی ایسے نہ ہوں گے۔ جن میں کمزموں نے اپنے جرم کا اقرار نہ کر لیا ہو کیونکہ انگریز جرم ہوتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا اپنی اخلاقی موت سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر ہندوستان کی عدالتوں میں کمزموں کو تو چھوڑیے۔ وہ تو اپنی جان کے بچانے کے لئے جھوٹ بولنا اپنا پیرا دفعتی حق سمجھتے ہی ہیں۔ یہاں تو گواہوں میں سے بھی پچانوے فی صدی لوگ ایسے ہیں جو ایمان سے کہتا ہوں سچ کہوں گا۔ یا دھرم سے کہتا ہوں سچ کہوں گا۔ اگر کہ حلفیہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور شہادت دینے سے پہلے جھوٹی گواہی دینے کی ٹریننگ لیتے ہیں۔ گویا کہ انگریز کمزموں کے بچ بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر ہندوستانی بغیر کمزموں کے بھی جھوٹ بولتا ہے۔

آپ بازار میں سودا خریدنے جاتیے۔ ہندوستانی ایک روپیہ کہہ کر آہستہ آہستہ اٹھانے پر آجائیں گے اور انگریزی فرم میں دوسری بات کرنا بھی باعث شرم سمجھا جاتا ہے اور قدم قدم پر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے کیر کیئر کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

انگریزوں کے کیر کیئر کی بلندی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے غیر قوم ہوتے ہوئے بھی ہم تجارتی اعتبار سے ان کی عزتیں کرتے ہیں۔ ان کی ہر جی ہوتی شے پر اعتماد کیا جاتا ہے اور دگنی و سہ گنی قیمت پر بھی ان کا مال خریدتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ نہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور نہ دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ پر ہم جو کچھ ہیں۔ کاش کہ ہم اس پر شرم محسوس کریں۔ کیونکہ ہمارا اعمال نامہ نہ صرف ہماری تجارت کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی ہم اپنے ملک کی رسوائی و ذلت کا باعث ہیں۔

## نفس کو چھو کہ

انگریزی میں ایک لفظ ہے ”اور ایٹی بیٹن“ اس لفظ کا اردو زبان میں ہم معنی غلط فہمی و تامل

کرنے کے بھی مجھے مل نہیں سکا۔ اس لفظ کے معنی ہیں۔ اصل سے زیادہ اندازہ کرنا یا اپنے نفس کو دھوکہ دینا مثلاً ایک شخص کمزور ہو۔ مگر اپنے کو مضبوط سمجھے۔ نالائق ہو مگر لائق یقین کرے۔ یا مضمون لکھ سکتا ہو مگر اپنے میں مضمون نہیں سمجھے۔ میرا تجربہ ہے کہ میں نے اب تک جتنے ناکام لوگ دیکھے۔ ان کی ناکامی کا زیادہ سبب ان کا اپنے شغلیں اور ادبی میسٹ کرنا یا غلط اندازہ لگانا ہی تھا۔ اور یہ اور ایسی میٹن انسان کو بالکل تباہ کر دیتا ہے اور اپنی عقل۔ قابلیت۔ دولت اور قوت کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ یا اسے کم سمجھا جائے تو کامیابی کے لیے راہیں زیادہ فراخ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جب ”ریاست“ کو جاری ہوئے ایک سال ہوا۔ اس کو دوسرے اخبارات کے مقابلہ پر بہت کافی کامیابی ہوئی۔ اور اخبار کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی تو اس کے لئے بڑی بڑی انگریزی فرموں کے اشتہارات لینے کی کوشش کی گئی۔ اُس سے پہلے انگریزی فرموں کے اشتہارات اُردو اخبارات میں نہ ہوتے تھے یا ہوتے تھے۔ تو شاید زیادہ سے زیادہ دو چار۔ وہ بھی ”پیپہ اخبار“ اور ”اخبار عام“ جیسے بہت پُرانے اخبارات میں۔ جن کو جاری ہوئے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس ہو چکے تھے۔ اور اُردو اخبارات میں یہ ”فر“ ریاست“ کو ہی حاصل ہے کہ سب سے پہلے انگریزی اور بڑی فرموں کے اشتہارات حاصل کرنے کا سلسلہ اُس نے ہی شروع کیا۔ چنانچہ انگریزی فرموں کو یہ یقین دلانے کے لئے بہت محنت کی گئی۔ کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ملک کے ہر حصہ میں اس کو پورے اور پڑھنے والے موجود ہیں۔

اشتہارات حاصل کرنے کے لئے پراپگنڈا شروع کیا گیا۔ تو بعض فرموں کا جواب آیا کہ ”ریاست“ کو جاری ہوئے کتنے برس ہو چکے ہیں۔ گریٹر ان فرموں کی نظر میں ایک نیا اخبار چاہے دس ہزار چھپے۔ اُس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ پُرانا اخبار دو سو چھپنے والا بھی ان کے خیال میں زیادہ قابل قدر تھا۔ ہم جب ان کو لکھتے کہ ایک سال ہوا جاری کیا گیا۔ تو یہ انگریزی فرمیں پھر کوئی جواب ہی نہ دیتیں۔ جب اس طرح بے نتیجہ کوشش سے ہم تنگ آ گئے۔ تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ کسی بہت پُرانے اور بند ہو چکے اخبار کو برائے نام خرید لیا جائے۔ تاکہ انگریزی فرموں کو جواب دیا جاسکے کہ یہ آج سے چالیس یا پچاس سال پہلے جاری کیا گیا تھا۔ اور اس کا یہ نام تھا۔ چنانچہ کسی پُرانے اخبار کی تلاش شروع ہوئی۔ جو بند ہو چکا تھا۔

میں نے ملا دھری صاحب ایڈیٹر ”نظام المشائخ“ سے بھی اس کا ذکر کیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ کسی بہت پُرانے اور بند ہو چکے اخبار سے انتظام کر دیا جاسکے۔ اور اُس مرچکے اخبار کے ورثہ کو پچاس ساٹھ روپے دے دیئے جائیں گے۔ ملا دھری صاحب نے بتایا کہ پچاس ساٹھ برس ہوئے۔ ان کے کوچہ چیلان ہی سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا۔ اخبار نکالنے والے بہت برس ہوئے۔ انتقال کر چکے ہیں۔ اور ان کے دلاور زمینہ بھی کوئی نہیں صرف ایک نواسہ ہے۔ اُن سے بات چیت کی جائے گی۔ چنانچہ دو روز کے بعد ملا دھری صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ اور وہ صاحب بھی انشریٹ لائے۔ میں نے ان حضرات سے تمام بات سمجھائی کہ وہی کہہ رہی ہیں یہ وقت ہے۔ اگر

وہ ایک خط لکھ دیں۔ کہ ان کے نانا کا اخبار پر پورا اثر "ریاست" کے پاس فروخت کر دیا گیا ہے۔ تو اس خط کے معاوضہ میں ان کو پچاس روپیہ دے دیئے جائیں گے تاکہ ہم اس اخبار کا نام استعمال کر سکیں جس کو بند ہونے پر پچاس برس ہو چکے ہیں۔ ہماری اس درخواست کے جواب میں ان حضرت نے فرمایا کہ غور کر کے جواب دیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز جواب دینے کا انھوں نے وعدہ فرمایا۔

میں دوسرے روز پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ واحدی صاحب نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو تشریف لانے کے لیے کہلوایا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ بہت مصروف ہیں۔ آج نہیں آ سکتے ہیں۔ اگلے روز پھر گیا۔ پھر وہی جواب۔ تیسرے روز پھر گیا۔ پھر وہی مصروفیت کا بہانہ۔ ایک ہفتہ کے بعد میں پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ اور پھر کبڑا بھیجا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ طبیعت اچھی نہیں! آسٹ نہیں آ سکتے۔ آخر واحدی صاحب نے دوبارہ آدمی بھیجا۔ اور کہلوایا کہ دیوان سنگھ کسی بار آ چکا ہے۔ اگر آپ کو بات کرنی ہو۔ تو دو منٹ کے لیے آئیے۔ ورنہ اس کے بعد وہ نہ آئے گا۔ ہماری اس درخواست پر یہ حضرت تشریف لائے۔ تشریف لانے پر بہت تکلف اور مخیرانہ انداز کے ساتھ بات چیت شروع کی۔ جس طرح کوئی ہمارا جی یا تو آپ کسی غلام کو درامی جاگیر عطا کرنے والا ہو۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔۔۔ "نانا جان فرمایا کرتے تھے۔ کہ جب ان کا اخبار جاری تھا۔ تو یہ دایمیرائے تک کے ہاں جاتا تھا۔ اور پانچ چھ سو چھپتا تھا اور اس کی تمام ملک میں دھوم مچی۔ ایسے بڑے اخبار کا معاوضہ کم از کم دس ہزار روپیہ ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ واحدی صاحب نے سفارش کی ہے اس لیے میں اس اخبار کی قیمت پانچ ہزار روپیہ قبول کروں گا۔"

پانچ ہزار روپیہ میں میں نے "ریاست" جاری ہی ڈیڑھ ہزار روپیہ کے ساتھ کیا تھا اور وہ بھی یہ روپیہ ایک دوست کی معرفت ایک بٹے سے قرض لے کر۔ میں نے جواب دیا کہ جناب میں تو زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دے سکتا ہوں۔ کیونکہ یہ تو یہ اخبار جاری ہے۔ نہ کوئی رجسٹر ہے۔ نہ کوئی خریدار اور نہ کوئی اشتہار۔ اخبار کو دفن ہونے بھی پچاس برس ہو چکے۔ یہ حضرت نہیں مانتے۔ اور میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔

میں نے واپس آ کر سوچا کہ اگر میں پچاس برس کے دفن ہو چکے اخبار کا نام استعمال کروں۔ تو یہ میرے لئے غزنی کی بات نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ بند ہو چکے اخبار کا "ریاست" میں شامل کرنا قانوناً چاہیے تھا۔ نہ ہو۔ مگر اخلاقاً یہ ایک متم کا دھوکہ ہے۔ اور مجھے اس سے بلند رہنا چاہیے۔ چاہیے اشتہارات حاصل کرنے میں ہر پہلو سے حصہ لگنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ ایشیاء کروں گا۔ اور یہ پیش دلائے گا کہ اس کی اشاعت اتنی ہے۔ اور اشتہارات کے لئے یہ پڑا ہے۔ اس لئے اخبارات سے اشتہار لینے سے مشہورین کو بھیجنے کے لئے خط کا یا مصنفین تیار کر لیا۔

اخبار فروخت کرنے والے حضرت دوم ہفتہ تو میرا انتظار کرتے رہے کہ میں پہلے کی طرح پھر ان کی خوشامد کروں گا۔ اور پانچ ہزار روپیہ میں تو چار ہزار ہی دے دے دوں گا۔ دو ہفتہ کے انتظار کے بعد جب ان کی خدمت میں کوئی حاضر نہ ہوا۔ تو یہ واحدی صاحب کے پاس آئے اور فرمایا۔

”اس معاملہ کا کیسا ہوا اگر پانچ ہزار زیادہ رستم ہو تو چار ہزار ہی دلوادیکھے۔“  
 واحدی صاحب نے یہ پیغام میرے پاس پہنچایا۔ میں نے جواب دیا۔ کہ مجھے ضرورت نہیں۔ دو روز کے  
 مدد پر حضرت واحدی صاحب کے ہاں پھر آئے۔ تین ہزار پر فروخت کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اب آپ نے  
 مسلسل آنا شروع کیا۔ تین ہزار سے دو ہزار۔ دو ہزار سے ایک ہزار۔ پھر پانچ سو۔ چار سو۔ تین سو۔ آخر یہ پچاس  
 روپیہ تک آئے۔ اور کہہ کر پچاس روپیہ لے کر یہ اپنے نانکی ”اخباری جائیداد“ فروخت کر دیں گے۔  
 یہاں تو یہ خیال ہی بدل چکا تھا۔ گویا کہ پچاس برس پہلے کے بند ہو چکے اخبار کی قیمت دس ہزار روپیہ  
 چھنے والے اور اپنی ”اخباری جائیداد“ کی حیثیت کا اور ایسی ٹیٹھ کر کے واسے حضرت پچاس روپیہ  
 ہی کھو بیٹھے۔

نواب بھوپال نے جیپ ایڈیٹر ”ریاست“ پر مقدمات دائر کئے تو اس کے ساتھ ہی مجھ پر ٹیالہ اور خیر پور  
 برس کی ریاستوں نے بھی میانوالی اور سکھر میں مقدمات دائر کر دیئے۔ اُس ایک ہی وقت میں مجھ پر چار مقدمات  
 تھے۔ ایک ہوشنگ آباد میں دہلی سے چھ سو میل جنوب کی طرف۔ ایک دہلی میں۔ ایک میانوالی میں دہلی سے  
 ساڑھے پانچ سو میل شمال کی طرف۔ اور ایک سکھر (سندھ) میں دہلی سے چھ سو میل مغرب کی طرف۔ ان  
 مقدمات کا مقصد یہ تھا کہ میں پریشان ہو کر ہتھیار پھینک دوں۔ میرے مقدمات کی جب یہ حالت سردار  
 مردول سنگھ کو پیش کرنے دیکھی۔ اور محسوس کیا کہ ہر جگہ پیشیوں پر پہنچنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ آپ نے رائے  
 دی کہ میں اخبار کا پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کسی دوسرے کو مقرر کر دوں۔ تاکہ دالیان ریاست مجھ پر مقدمات  
 چلا سکیں۔ اور جھوٹے دے بیٹا و مقدمات کا جواب اس صورت میں دیا جائے۔ اس مشورہ کے بعد  
 میں نے ریاست نا بھہ کے ایک شخص سردار دھرم سنگھ کو ”ریاست“ کا ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر مقرر کر دیا۔ یہ صاحب  
 پرنٹر و پبلشر چند ماہ پہلے تھے۔ توان کو خیال آیا۔ کہ میں نے ان کو پچھائی کہ اخباریں لکھ کر کوئی اہم شخصیت ہوتی ہے تو  
 ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر ہی ہوتا ہے اور یہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک روز فرمایا کہ ڈاک خانہ  
 سے جو سی آر ڈاک آئیں گے۔ اُن پر یہ خود دستخط کریں گے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ کہا ہے تو  
 جس جبران رہ گیا۔ ان سے پوچھا۔ تو انھوں نے کہا کہ ہاں کہا ہے۔ اور یہ آئندہ تمام حساب کتاب بھی  
 کیجیے گے۔ کیونکہ ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر ہیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی پوزیشن کا غلط انداز نہ لگائے۔  
 آپ دفتر میں ملازم ہیں۔ میرے کہنے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور یہ مسلسل غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ ان کے  
 اس ارادہ کو دیکھ کر میں نے ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ کو خط لکھا کہ میں سردار دھرم سنگھ کو پرنٹر اور پبلشر کو  
 بر قوت کرتا ہوں۔ ان کی جگہ پنڈت دیونا نک داس کا ڈیکلریشن بطور پرنٹر و پبلشر منظور کیا جائے۔  
 پنڈت دیونا نک میرا خط اور پرنٹر پبلشر کا فارم خانہ پڑی کے بعد لے کر ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ کی عدالت  
 میں گئے۔ قاعدہ کے مطابق اس ڈیکلریشن کو داخل کرنے میں چند منٹ صرفت ہوتے ہیں۔ پنڈت جی  
 داخل کرنے کے بعد واپس دفتر پہنچے۔ تو میں نے سردار دھرم سنگھ کو بلایا۔ اور ان کی بقایا تنخواہ دے کر  
 ان کو رسید لکھ دیجئے۔ اور تشریف لے جائے۔ آپ کی ضرورت نہیں۔ سردار دھرم سنگھ اپنے ذہن  
 کا ڈنٹ کی کتابوں میں آرڈر دیا اور بینک کے چیکوں پر دستخط کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں

ملازمت سے ہی جواب مل گیا۔ پریشان کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے بہت خوشامد کی کڑ پوری نہیں۔ تو نصف تنخواہ پر ہی رکھ لیا جائے۔ مگر میں نے ان کو جواب دے دیا۔ کہ صفت بھی رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے بعد میرے اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں غالباً وہی ہل چلائے کا کام کرتے ہیں۔ جو ایڈیٹر پرستور دیپنشر ہونے سے پہلے کرتے تھے یہ سردار دھرم سنگھ بھی اور ایسی میٹن کا شکار ہوئے۔ ورنہ شاید زندگی بھر یہاں آرام سے رہتے۔

یہ واقعات تو دوسروں کے اور ایسی میٹن کے متعلق ہیں۔ میرے ذاتی اور ایسی میٹن کا واقعہ بھی بچپی سے خالی نہ ہو گا۔ میں جب ریاست نا بھہ میں ملازمت کے سلسلہ میں ہمارا جہ سے انٹرویو کے لئے گیا۔ تو ہمارا جہ نے مجھ سے بہت سے سوالات کئے۔ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا۔ ”آپ کیا کام کر سکتے ہیں۔“ اس سوال کا میں نے فوراً جواب دیا۔ ”ہر کام کر سکتا ہوں اور آپ کی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی سے چلا سکتا ہوں۔“ میرے اس جواب پر ہمارا جہ نے کہا تو کچھ نہیں مگر وہ مسکرا دیئے۔ ہمارا جہ نے بیٹھے ایڈمنسٹریشن میں کوئی ذمہ داری کا اہم کام سپرد نہ کیا۔ مگر ملازمت دے دی۔ میں اب جب کبھی ہمارا جہ کی اس مسکراہٹ کا خیال کرتا ہوں۔ تو اپنی بے وقوفی یا اپنے اور ایسی میٹن پر شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ کہ دیگر میں نے کبھی کہیں بھی ایڈمنسٹریشن کے صیغہ میں تجربہ حاصل نہ کیا تھا۔ اور نہ ایڈمنسٹریشن سے واقف تھا۔ مگر میں نے اور ایسی میٹن کرتے ہوئے کہ دیا کہ ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہوں۔

## قابل معافی گناہ

دہلی میں ایک صاحب منشی عبدالقدیر ہیں۔ یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ مگر ان کا خاندان پچاس برس سے دہلی میں مقیم ہے۔ آپ کا نگری خیالات کے بزرگ ہیں۔ بے حد نیک۔ غیر معمولی دیا مند بہت مخلص۔ بے دیا ر بے غرض کارکن۔ چنانچہ پچھلے پندرہ بیس برس کے اندر کانگریس کے جوائنٹس۔ پریسٹریڈ دوسرا لٹر پیپر جس کو گورنمنٹ نے باغیانہ قرار دیا۔ دہلی میں شائع ہوا۔ اسے منشی عبدالقدیر نے شائع کیا کیسی زمانہ کی بھی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں منشی جی کی ملاشی۔ گرفتاری یا نظر بندی نہ ہوئی ہو۔ اور آپ اب تک غالباً اٹھارہ بار جیل یا حالات میں گئے۔

دہلی پولیس منشی جی کی ملاشیں اور گرفتاریوں سے عاجز آ گئی۔ اور کبھی اُسیانہ ہوا۔ کہ آپ کے گھر سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی پکڑا گیا ہو کیونکہ آپ ہمیشہ محتاط رہا کرتے اور ایک محدود حلقہ کے دوستوں کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرتے۔ پولیس جب آپ کی ان سیاسی مصروفیات سے تنگ آ گئی۔ تو کرشمہ ش جاری ہوئی کہ کسی دوسرے مقدمہ کی لپیٹ میں ہی آپ کو رکھ لیا جائے۔ تاکہ دہلی میں ”باغیانہ“ لٹریچر کی اشاعت بند ہو۔

دہلی میں اخبار ”الامان“ کے ایڈیٹر مولانا منظر الدین کا قتل ہو گیا۔ مولانا مسلم لیگی تھے۔ اور وطن پرست مسلمانوں کے حلقہ کی آپ کے ساتھ سخت عداوت تھی۔ مولانا کو قتل کرنے والے درو مسلم نوجوان تھے۔



جو مولانا کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے قتل کے وقت موقع پر تو کمزور گرفتار نہ ہوئے۔ مگر چند روز کے بعد اتفاقاً گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی پولیس نے منشی عبدالقدیر کو بھی گرفتار کر لیا۔ حالانکہ منشی جی کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اور آپ عدم تشدد کے پابند تھے۔ اس قتل کے جرم میں جب منشی عبدالقدیر کی گرفتاری ہوئی تو دہلی کے کانگریسی اور قومی حلقوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جو منشی جی کے حالات سے واقف اور ان کے اخلاص اور ان کی حب الوطنی کا مداح نہ ہو۔ منشی جی تو حالات کے بعد جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے۔ مگر ان کے دوست ان کے مقدمہ کے باعث بے حد پریشان تھے۔ اور آپ کے ان پریشان دوستوں اور مداحوں میں سے ایک ایڈیٹر ”ریاست“ بھی تھا۔ کیونکہ قتل کا الزام۔ مقدمہ سنگین۔ پولیس کی پوری کوشش اور منشی جی بے گناہ۔

میں ایک عرصہ تک سوچتا رہا کہ منشی جی کے متعلق کیا کرنا چاہئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں چلا گیا۔ کیونکہ قتل کے لمبوں کے مقدمہ کی سماعت کسی مجسٹریٹ کے ہاں نہیں ہو سکتی۔ مجسٹریٹ صرف ابتدائی کارروائی کرتا ہے۔ مقدمہ جب سیشن میں گیا۔ تو اس زمانہ میں سیشن جج مسٹرائیں۔ ایس مونگیا تھے۔ یہ سیشن جج غیر معمولی دیانتدار اور قانون میں ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔

مسٹر مونگیا جب دہلی میں پہلے روز آئے تھے تو ان کے مکان کا انتظام نہ ہوا تھا۔ یہ لالہ دیس راج پاہوہ سیشن جج کے دوست تھے۔ ان کے مکان پر ٹھہرے۔ لالہ دیس راج پاہوہ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے بھتیجے ہیں۔ اور میرے دونوں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ بلکہ لالہ دیس راج کی والدہ میری والدہ کو اپنی والدہ کی طرح سمجھتی تھیں۔ میں اس زمانہ میں لالہ دیس راج کے ہاں دوسرے تیسرے روز جایا کرتا تھا۔ مسٹر مونگیا سے بھی ملاقات ہوئی۔ مسٹر مونگیا نے چار باچ روز لالہ دیس راج کے مکان پر قیام کیا۔ اس کے بعد ان کے لئے کوٹھی کا انتظام ہو گیا۔ اور وہ راجپور روڈ کی ایک کوٹھی میں چلے گئے۔ مسٹر مونگیا کے لالہ دیس راج کے ہاں سے چلے جانے کے بعد آپ سے بٹنے کا مجھے بہت کم اتفاق ہوتا۔ کبھی لالہ دیس راج کے ساتھ راجپور روڈ کی طرف میرے لئے جانے کا اتفاق ہوا۔ تو چند منٹ کے لئے مسٹر مونگیا سے بھی مل لئے۔ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہ تھا۔ اور نہ لینے کا اتفاق ہوتا۔

مولانا مظہر الدین کے مقدمہ کی جب کئی پیشیاں مسٹر مونگیا کی عدالت میں ہو چکیں۔ سرکاری گواہوں کی شہادتوں کے بعد فرد جرم۔ لمبوں کا بیان اور صفائی کی شہادت بھی ختم ہو گئی۔ اور بحث ہونے والی تھی۔ تو مجھے خیال آیا کہ اگر کچھ کرنا ہے۔ تو جلدی کرنا چاہئے۔ بعد میں کوشش لا جاہل ہو گئی۔ میں لالہ دیس راج کے ہاں بیٹھا لالہ دیس راج اور ان کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ تو مسٹر مونگیا کا ذکر چل پڑا۔ لالہ دیس راج نے بتایا کہ مسٹر مونگیا غیر معمولی دیانتدار اور جرأت مند سیشن جج ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے بھی ان کی بہت تعریف سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی وہ یہاں آئیں۔ تو ان سے باتیں کی جائیں۔ لالہ دیس راج کو کیا انکار تھا۔ انھوں نے اگلے روز مجھے اور مسٹر مونگیا کو ڈنبر آنے کے لئے دعوت دی۔ میں نے ملاقات کی تیاری اور اپنے خیال کے متعلق لالہ دیس راج سے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ بھی بہت دیانتدار ہیں۔ اس کے علاوہ مسٹر مونگیا ان کے انصر تھے۔ میں اپنا خیال ظاہر کرنا۔ تو شاید تمام کھیل ہی بگڑ جاتا اور وہ مجھے منشی عبدالقدیر

یہ متعلق ذکر کرنے سے روک دیتے۔ یا ہم دونوں کو بیک وقت کھانے پر ہی نہ بٹاتے۔ اور میری سیکم رہ جاتی۔ نذر زہ وقت پر میں اور مسٹر مونگیا لالہ دیس راج کے مکان پر پہنچ گئے۔ پہلے ڈرائنگ روم میں مختلف موضوع باتیں ہوئیں پھر ہم ڈائننگ روم میں گئے۔ اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کی میز پر میں۔ لالہ دیس راج۔ لالہ دیس راج کی بیوی اور مسٹر مونگیا تھے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ منشی عبدالقدیر سے متعلق بات کس طرح شروع کروں۔ کہ مسٹر مونگیا نے میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:-

”سردار صاحب۔ سنا ہے۔ آپ پر ریاستوں اور گورنمنٹ نے کئی مقدمے قائم کئے۔ اور عدالتوں نے ان مقدمات کے متعلق متعلقہ پولیس افسروں اور وایان ریاست کے خلاف سٹر کچر بھی پاس کئے۔“

مسٹر مونگیا کا یہ کہنا تھا کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے جواب میں کہا:-  
 ”مونگیا صاحب۔ آپ تو مقدمات کے متعلق پولیس کو جانتے ہیں۔ کہ یہ کیونکر جھوٹے مقدمات بناتی ہے۔ آپ کی عدالت میں تو اب تک ہزار ہا جھوٹے مقدمات پیش ہوئے ہوں گے۔ پولیس والوں کی عداوت ذاتی ہوتی ہے اور اس عداوت کی کسر فرضی مقدمات سے نکالتے ہیں۔ میرے خلاف ایک درجن سے زیادہ مقدمات انگریزی علاقہ کی پولیس اور وایان ریاست نے چلائے۔ مگر ان سب میں ان کو ندامت اٹھانی پڑی۔ اور مجھے تک ہی کیا محدود ہے۔ دن رات جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں۔ اور یہ گناہ جیل خانوں میں قید کر دیئے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں دہلی میں ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ ایک صاحب منشی عبدالقدیر کا نگرسی ہیں غیر معمولی طور پر شریعت نیک اور دیانتدار۔ زندگی بھر کبھی ایک پیسہ کسی فنڈ سے نہ لیا۔ اور نہ کسی عہدہ اشہرت کا لالچ ان کو راہ پولیس ان کی اب تک پندرہ سولہ بار تلاشی لے چکی ہے۔ مگر منشی جی تابریں نہ آئے۔ اب پچھلے دنوں یہاں کے ایک اخبار نویس مولانا منظر الدین کا قتل ہو گیا۔ قتل کرنے والے اور لوگ تھے مگر منشی جی کو بھی دھریا گیا۔ کیونکہ ان کو جیل بھیجے کی دوسری کوئی صورت نہ تھی۔ اور اب منشی جی کا مقدمہ غالباً کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا ہے۔ اس طرح جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں۔“

میں نے اتنا کہنا تھا کہ مسٹر مونگیا نے فرمایا:-  
 ”قتل کا یہ مقدمہ تو میری عدالت میں ہے۔ اس پر آجکل بحث ہو رہی ہے۔“  
 مسٹر مونگیا کے یہ الفاظ سن کر میں نے فوراً کہا:-

”اوہ! مجھے علم نہ تھا۔ کہ مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے جس صورت میں مقدمہ آپ کی عدالت

میں ہے۔ آپ سے تو اس کا ذکر بھی نہ کرنا چاہئے تھا۔“  
 چنانچہ میں نے فوراً دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی اور کسی نے محسوس نہ کیا۔ کہ میری مسٹر مونگیا سے اس ملاقات کی غرض کیا تھی۔

اس واقعہ کے پانچ سات روز بعد سٹر مونگیا نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ایک ٹرم کو پھانسی کی سزا دی۔ ایک عفریہ۔ اور منشی عبدالقدیر کو باعزت بری کر دیا گیا۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اگر منشی عبدالقدیر کے متعلق سٹر مونگیا کو اصل حالات نہ بتانا۔ تو وہ گواہوں کی شہادتوں کو دیکھ کر منشی جی کے متعلق کیا فیصلہ کرتے۔ مگر میں اپنے اس فعل پر شرمندہ نہیں ہوں۔ اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ایک بے گناہ اور بے قصور آدمی کو کرکریوں کے جھوٹے مقدمہ سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

اس واقعہ کا یہ تاریک پہلو ہے۔ اور میرا سٹر مونگیا سے یہ کہنا کہ مجھے اس مقدمہ کے ان کی عدالت میں ہونے کا علم نہیں۔ بلاشبہ جھوٹ تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کسی بے گناہ کو بچانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز یا مناسب ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر اگر ہمارا گناہ بھی کی رائے لی جاتی تو وہ بلاشبہ فرما جواب دیتے۔ کہ نا جائز اور غیر مناسب ہے۔ کیونکہ وہ کسی صورت میں بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مگر مجھ جیسے لوگ جو دن بھر میں نہ معلوم کتنی بار داد اور نادانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر کسی نیک کام یا کسی معصوم دے گناہ کی زندگی کو بچانے کے لئے ہلا کسی غرض کے جھوٹ بولیں تو میرا خیال ہے۔ کہ یہ گناہ یا کمزوری قابل معافی قرار دی جانی چاہیے۔

## ریاستی وزراء کا اقبال زوال

”ریاست“ کو جاری ہوئے دو برس ہوئے تھے۔ کہ سردیاکشن کول وزیر اعظم ٹیالہ اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ آپ ٹیالہ میں ایک سازش کا شکار ہوئے جس میں کرنل امریک سنگھ سٹر رفین احمد خاں اور ٹیالہ کے چند اہلکار شریک تھے۔ سردیاکشن کول ریاستوں کے وزراء میں بہت لائق اور تجربہ کار تھے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ آپ اپنے زمانہ میں شاید تمام ریاستوں میں لائق ترین وزیر تھے۔ جو دالے ریاست اور رعایا دونوں کی منہج پہناتے ہوں۔

جب سردیاکشن ٹیالہ سے چلے گئے۔ تو ٹیالہ میں یہ عام خیال تھا کہ سردیاکشن پھر واپس ٹیالہ آجائے گی کیونکہ آپ کا دائرہ اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت کافی اثر تھا۔ اور دائرہ ہمارا جو ٹیالہ پر سردیاکشن کے پھر واپس بلائے جانے کے لئے زور دیں گے اس خیال سے متاثر ہو کر کرنل امریک سنگھ اور سٹر رفین احمد خاں نے سوچا کہ کوئی صورت ایسی اختیار کرنی چاہیے کہ ہمارا جو ٹیالہ اور سردیاکشن کے درمیان کشیدگی بہت زیادہ بڑھ جائے۔ تاکہ ان دونوں کے تعلقات آئندہ کبھی اچھے نہ ہو سکیں۔ اور سردیاکشن کا واپس ٹیالہ آنا ممکن نہ رہے۔ چنانچہ اس سکیم کو عملی صورت دینے کے لئے اس پارٹی نے لاہور سے دو اخبار نویسوں کو بلایا۔ ان کو پانچ پانچ سو روپیہ بطور پیشگی دیا گیا۔ آئندہ کے لئے بہت شاندار وعدے کئے۔ اور ہدایت کی۔ کہ سردیاکشن کول کی ذات کے خلاف اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعہ پراپا گنڈا کیا جائے۔ تاکہ سردیاکشن پبلک میں رُسا ہوں۔ اس سکیم کا مقصد یہ تھا کہ اگر سردیاکشن خاموش ہے۔ تو پبلک میں رُسا ہوں گے اور چونکہ یہ پراپا گنڈا ٹیالہ کے روپیہ سے ہو رہا ہے۔ اگر سردیاکشن نے ہمارا جو ٹیالہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو یہ مقدمہ ہمارا جو اور سردیاکشن کے درمیان خلیج کو اور

زیادہ وسیع کرنے کا باعث ہوگا۔ اور سردیاکشن کا پھر پٹیا ل میں بطور وزیر عظم آنا ممکن ہی نہ ہوگا۔ سردیاکشن کے خلاف لاہور میں جب مضامین اور پوسٹر بازی شروع ہوئی۔ تو سردیاکشن نے لاہور سے ایڈیٹر "ریاست" کے پاس دہلی پیغام بھیجا کہ میں لاہور آ کر ان سے مل لوں۔ سردیاکشن سے ایڈیٹر "ریاست" کی اس سے پہلے واقفیت ہو چکی تھی۔ اور سردیاکشن نے اپنے بھائی راجہ ہری کشن کول دج اس زمانہ میں جالندھر کے کشتہ زخمی (کہ بھی بتا دیا تھا کہ سردیاکشن کول کے والد راجہ سورج کول اور ایڈیٹر "ریاست" کے والد دونوں گہرے دوست تھے۔ اور دونوں میانوالی وغیرہ کمی اضلاع میں اکٹھے ملازم رہے۔) یہ واقعہ ایڈیٹر "ریاست" کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ راجہ سورج کول میانوالی میں ایکسٹرا سسٹنٹ کشتہ زخمی اور ایڈیٹر "ریاست" کے والد وہاں ڈاکٹر تھے)

میں جب لاہور گیا۔ اور راجہ سردیاکشن کول اور ان کے بھوپھی زاد بھائی پنڈت جیون لال مٹھ سے ملا۔ تو تمام حالات معلوم ہوئے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ "ریاست" میں ہمارا جہ پٹیا ل کے جاری کئے گئے پراپاگنڈا کے خلاف لکھا جائے۔ میں نے جب تمام حالات سنے۔ تو میں نے ان لوگوں سے کہا۔ کہ اخبار میں کمکتا تو کوئی شکل نہیں اور شاید ہمارا جہ پٹیا ل کو بہت بُری طرح سے بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہمارا جہ کی کمزوریاں ہی اس قابل ہیں۔ مگر میرے آپ کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ اس لئے میں کوئی غلط رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کا اس گنہ سے پراپاگنڈا کے خلاف ایک لفظ لکھنا یا لکھوانا آپ کے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ بغیر کچھ لکھے یا لکھوانے کسی دوسرے طریقہ سے اس پراپاگنڈے کو بند کیا جائے۔ اور کوشش کی جائے کہ تعلقات ہمارا جہ پٹیا ل سے اچھے ہو جائیں۔ تاکہ کنٹرول امریکہ سٹڈیو کو کیمن کام ہو۔ چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگلے ہفتہ جمپ رائٹ پرنس کا اجلاس ہونے والا ہے۔ راجہ سردیاکشن اجلاس کے موقع پر دہلی آکر ہمارا جہ پٹیا ل سے ملنے اور تعلقات اچھے کرنے کی کوشش کریں۔

میں دہلی واپس آ گیا۔ اور چار پانچ روز کے بعد راجہ سردیاکشن بھی دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں ان کا قیام لالہ سری رام مصنف، خٹنا جادید، کی کرٹھی میں ہوا۔ راجہ صاحب نے دہلی پہنچتے ہی اپنے پہنچنے کی مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی۔ اور میں حالات سے باخبر رہنے اور مشورہ دینے کے لئے دن میں پانچ چھ بار ٹیلی فون پر بات کر لیا کرتا۔

راجہ سردیاکشن کو دہلی میں پہنچے دو تین روز ہوئے تھے۔ دہلی میں والیان ریاست اور ان کے وزراء و سٹاف کے باعث (جو جمپ رائٹ پرنس کے موقع پر آئے تھے) کافی رونق ہو گئی۔ اس زمانہ میں مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا آرمبر اسمبلی میرے مکان پر مقیم تھے۔ میں نے کھانے پر باتوں باتوں میں ان سے ذکر کیا کہ یہ والیان ریاست اپنے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں بھی بُری حرکتیں کرتے ہیں۔ اور ہمارا جہ پٹیا ل کے روپیہ سے راجہ سردیاکشن کول کے خلاف لاہور میں ایسے گندے پوسٹر شائع کیے جا رہے ہیں۔ جن کو کوئی شریف آدمی پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مسٹر رنگا آرمبر نے اسے تعجب کے ساتھ سنا۔ اور کہا کہ آپ اسمبلی میں اس پوسٹر بازی کے متعلق سوالات دریافت کرنے کا نوٹس دیں گے۔ اور گورنمنٹ سے پوچھیں گے۔

کہ کیا یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ ہمارا چٹیا لہ کے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں لاہور کے اندر انگریزی رعایا کے خلاف گندے پوسٹر چھپے اور شائع ہوئے۔ مسٹر رنگا آئر نے کھانا کھانے کے بعد ان سوالات کا مضمون تیار کیا۔ اور جب سوالات ٹائپ کر کر تیار کر لئے گئے۔ تو میں نے کہا مسٹر شبرک ولیمز فارن مسٹر ریاست چٹیا لہ بھی آجکل دہلی میں ہیں۔ سوالات دریافت کرنے سے پہلے کیوں نہ ان سوالات کے متعلق ان کو بتا دیا جائے تاکہ اگر یہ پراپاگنڈا بند کر سکیں۔ تو سوالات دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اور سانپ بھی مر جائے اور لالٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مسٹر رنگا آئر نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ مسٹر شبرک ولیمز گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلسٹی افسر وہ چھپے تھے اور مسٹر رنگا آئر کے دوست تھے آپ نے اسی وقت ان کو ٹیلی فون کر کے اگلے روز صبح ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ آپ ملنے کے لئے گئے۔ تمام واقعات اور سوالات کے متعلق بتایا۔ تو مسٹر شبرک ولیمز بہت حیران ہوئے۔ کیونکہ پوسٹر بازی ان کی لاعلمی میں کی جا رہی تھی۔ ان کو یہ حالات سن کر بے حد انوس ہوا۔ اور آپ نے مسٹر رنگا آئر سے درخواست کی۔ کہ سوالات اسمبلی میں دریافت نہ کئے جائیں۔ وہ ہمارا چٹیا لہ سے بات کر کے اس گندے اور پلچر پراپاگنڈا کو فوراً بند کر دیں گے۔ رنگا آئر نے واپس آکر مجھے بتایا۔ کہ ان کی مسٹر شبرک ولیمز سے لیا بات چیت ہوئی۔

یہ بات تو صبح ہوئی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم ریاست دتیا ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملنے کے لئے دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے اور باتیں ہوئیں تو میں نے ان کو بتایا کہ بس طرح کر نل امریکہ سنگھ وغیرہ راجہ سردیا کٹن کول کے خلاف گندہ پراپاگنڈا کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب ہمارا چٹیا لہ کے بہت گہرے دوست تھے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں نے شرارتاً کہا۔ کہ میں اس معاملہ کو ”ریاست“ میں لے رہا ہوں۔ اور میں ہمارا چٹیا لہ کو بتاؤں گا۔ کہ وہ کس طرح انگریزی علاقہ میں لوگوں کے خلاف گندگی پھیلا سکتے ہیں۔ قاضی صاحب بہت دوست نواز، نرم دل، نیک بزرگ تھے۔ جب انھوں نے مجھ سے یہ سنا۔ کہ میں ہمارا چٹیا لہ کے خلاف ریاست میں سلسلہ مضامین شروع کر رہا ہوں۔ تو آپ پریشان سے ہوئے۔ اور آپ نے کہا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ سردار صاحب۔ آپ ایسا نہ کیجئے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارا چٹیا لہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کو تو شاید اس پوسٹر بازی کا علم بھی نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ خود غرض لوگ ان کو اطلاع دیئے بغیر کر رہے ہوں۔ میں ابھی ہمارا چٹیا لہ کے پاس جا کر دریافت کرتا ہوں۔ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جو ہمارا چٹیا لہ کے شان کے شایاں نہیں۔“

قاضی صاحب کے ایسا کہنے پر میں نے جواب دیا۔ ”قاضی صاحب آپ کو مشن کر لیجئے۔ اگر یہ شرمناک پوسٹر بازی بند نہ ہوئی۔ تو میں پھر اس معاملہ کو ہاتھ میں ضرور لوں گا۔ سردیا کٹن کول کی میں اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں۔“

قاضی صاحب اس گفتگو کے بعد سیدھے کننگز وے تشریف لے گئے۔ جہاں ریلوے سٹیشن پر ہمارا چٹیا لہ کی سیلون کھڑی تھی۔ ہمارا چٹیا لہ کو اطلاع ہوئی۔ تو ہمارا چٹیا لہ نے قاضی صاحب کو فوراً بلا لیا۔ خیر خیریت دریافت

کرنے کے بعد قاضی صاحب نے ہمارا جہ سے کہا۔

”سرکار۔ حضور کی عزت موتیوں کی طرح صاف اور قیمتی ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہ حضور کے حکم سے سر دیا کٹن کول کے خلاف گندہ پراپا گنڈا کیا جا رہا ہے۔ اور ان پوسٹروں کے جواب میں اب حضور کے خلاف لکھا جانے والا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ حضور کی شان ایسی باتوں سے بہت بلند ہونی چاہیے۔“

قاضی صاحب نے جب یہ الفاظ کہے تو ہمارا جہ کا رنگ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا۔ اور آپ نے چوہدری سے کہا: ”بلاؤ امریکہ کو“ (ہمارا جہ جب غصہ میں آتے تو اپنے ملازمین کو آدھے نام سے پکارتے مثلاً امریک سنگھ کو امریکے۔ رفیق محمد کو رفیقے اور زرخن سنگھ کو زرخنے وغیرہ) چوہدری ساتھ والے سیلون سے کرنل امریک سنگھ کو بلا لایا۔ اور کرنل صاحب جب آئے۔ تو ہمارا جہ ان پر برس پڑے۔ اور گالیاں دے کر کہا کہ ”تم لوگ مجھے بے عزت کرنا چاہتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ اگر دیا کٹن نے میرے خلاف گندے پوسٹر نکلوائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اس پراپا گنڈا کو فوراً بند کر دو۔ اگر بند نہ ہوا تو تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا“ یہ سب ڈانٹ ڈپٹ قاضی صاحب کی موجودگی میں ہوئی۔ قاضی صاحب نے واپس آکر مجھے بتایا کہ ان کی موجودگی میں کیا کچھ ہوا۔

اس کے بعد اطلاع ملی کہ مسٹر مشہرک دبیرزات کو ہمارا جہ کے ساتھ ڈنر کھانے کے لئے آئے۔ تو آپ نے کہا کہ پوسٹروں وغیرہ کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں سوالات دریافت کئے جانے والے ہیں۔ ہمارا جہ ڈنر پر ہی کرنل امریک سنگھ کو بلا کر پھر ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ اس پراپا گنڈے کو فوراً بند کر دیا جائے۔

میں راجہ مر دیا کٹن کول کو ٹیلی فون پر تمام حالات کی اطلاع دیتا رہتا تھا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ لاہور کے پوسٹر شائع کرنے اور اخبارات میں لکھنے والے دونوں حضرات روپیہ کی مزید قسطیں وصول کرنے کے لئے دہلی کے رائل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اور صبح دس بجے کرنل امریک سنگھ کی زیارت کے لئے گنڈے دے سٹیشن تشریف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ اس روز شام کو جب گئے۔ تو کرنل امریک سنگھ نے ان سے کہا۔ ”فوراً واپس لاہور چلے جاتے ہمیں پراپا گنڈا کی ضرورت نہیں اور نہ ہم سے کبھی لجنے کے لئے تشریف لائیے۔“ یہ دونوں حضرات بڑی امتیہدوں سے آئے تھے۔ اور شاید لاہور روپیہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جبران ہوئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ دیوان سنگھ نے ایسا کیا ہوگا۔

سر دیا کٹن کول ان تمام حالات سے بیدار ہوئے۔ اور آپ نے لاہور جانے سے پہلے آخری روز ٹیلی فون پر فرمایا: ”سر دار صاحب میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اور آپ کی قابلیت اور اخلاص کا پہلے سے ہزار گنا زیادہ مداح ہوں۔ اگر خدا نے کبھی موقع دیا۔ تو میں آپ کے اس احسان کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے ٹیلی فون پر ہی جواب دیا۔

”راجہ صاحب۔ میں آپ کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے اور میرے والد کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ باوجود ان تعلقات کے میں نے

پنجاب کے اخبارات میں جب کہ میں ان کو ایڈٹ کرتا تھا۔ پٹیل کو بے نقاب کرتے ہوئے آپ کے خلاف بھی بارہا لکھا۔ اب آپ پٹیل سے رشتہ تو ہو چکے ہیں۔ اور پرائیویٹ لائف میں ہیں۔ اگر میں نے اس سلسلہ میں آپ کی کوئی خدمت کی۔ تو میں نے اپنے گزشتہ گناہوں کو دھویا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ خدا کرے کہ میں آئندہ بھی پرائیویٹ حیثیت سے آپ کی کبھی کوئی خدمت کر سکوں؟

سردیاشن کول نے اپنے دہلی کے اس قیام میں ہمارا جہ پٹیل سے بھی مل کر غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی راہ میں ہمارا نا دھولپور محل ہوئے۔ جن کے اس زمانہ میں ہمارا جہ پٹیل کے ساتھ گھرے دوستانہ اور رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ کیونکہ ہمارا نا دھولپور بھی سردیاشن کو پٹیل سے علیحدہ کرانے میں شریک تھے۔ اس کے بعد کئی برس تک ہمارا جہ پٹیل سردیاشن سے نہیں ملے۔ دایان ریاست فطرتاً ہیبت خود غرض ہوتے ہیں۔ کئی برس کے بعد جب پہلک ایچی ٹیشن سے متاثر ہو کر واسرائے نے ہمارا جہ پٹیل کے خلاف فٹنر پٹرک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ تو ہمارا جہ پٹیل نے سردیاشن سے امداد کے لئے درخواست کی۔ سردیاشن ریاستی قسم کے نمک حلال تھے۔ آپ نے پچھلے تمام حالات اور ہمارا جہ کی زیادتیوں کو بھول کر اس کمیشن میں ہمارا مدد دی اور اس امداد کے باعث ہی ہمارا جہ کو کوئی سزا نہ ملی۔

اس واقعہ کے بعد سردیاشن کول کئی برس زندہ رہے۔ آپ سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو بہت محبت سے پیش آتے۔ اور میں بھی ان کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا۔ مرعوم میں بھی ریاستی اہلکاروں جیسی کمزوریاں ہوں گی اور تھیں۔ مگر آپ بہت خوبصورت انسان اور بہت مضبوط کیریکٹر کے بزرگ تھے جس کے دشمن ہیں۔ اسے کچلے بغیر آپ کو صبر نہ آتا اور جس کے دوست اس کے لئے آنکھیں بچھا دیتے۔ بہت فیاض۔ بہت بہادر۔ بہت بڑے سیاستدان اور بہت ہی مخلص۔ مرعوم ہمارا جہ نا بھدرا تم الحروف اور دوسرے دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ”ہمارا جہ پٹیل کی خوش نصیبی ہے کہ ان کے پاس سردیاشن جیسا منیہ ہے۔ اور میری بد نصیبی ہے کہ میرے پاس سردیاشن کے بدلہ کو کوئی آدمی نہیں“ چنانچہ ہمارا جہ نا بھدرا نے گدڑی سے دستبرداری کے بعد بھی راجہ سردیاشن سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے چاہے اور مجھے منصوری و ڈیرہ ددن سے آپ کے پاس لاہور بھیجا۔ مگر راجہ سردیاشن نے ہمارا جہ نا بھدرا کی اس خاموشی کو لبیک کہنا مناسب نہ سمجھا۔

## بھروسہ کا متحی شخص نہیں

کئی برس ہوئے بھگت سنگھ کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور پنجاب کے کالجوں کا ہر طالب علم اپنے آپ کو انارکسٹ سمجھتا تھا۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر ہمارا گاندھی اُس زمانہ میں جرأت کے ساتھ اس تحریک کی علامتہ خدمت نہ کرتے۔ تو یہ تحریک زیادہ زور پکڑتی۔ اس میں لوگ زیادہ شامل ہوتے۔ زیادہ وارداتیں ہوتیں۔ زیادہ مقدمات چلتے۔ زیادہ لوگ سرکاری گواہ بنتے۔ اور زیادہ لوگوں کو پھانسیاں ملتیں۔ کیونکہ پنجاب کے لوگ فطرتاً کسی سازش کے اہل نہیں۔ یہ لوگ جتنی جلدی کسی سازش میں شامل ہوتے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب

میں یہ شل مشہور ہے کہ اگر دہاں کسی سازش میں بارہ ملزم ہوں۔ تو تیرہ سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ بارہ کے بارہ ملزم تو سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہوتے ہی ہیں۔ ان کے قریب کے کسی پڑوسی کو سرکاری گواہوں کے بننے کی اطلاع ملے تو وہ بھی پولیس سے کہتا ہے کہ اسے سرکاری گواہ بنالیا جائے) پنجاب کے لوگوں کی اس نظرت کا نتیجہ ہے کہ یہاں کبھی بھی کوئی سازش کا میاب نہیں ہوئی۔ اور پولیس کو سب کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ حالانکہ بنگال میں کسی ایک سازش کا بھی کبھی انکشاف نہیں ہوا۔ اور وہاں اگر کوئی انارکسٹ پکڑا گیا۔ تو اس نے سازش کے انکشاف کے خوف سے سائینڈ آف پوٹاش کا زہر کھا کر فوراً ہی اپنی زندگی ختم کر لی۔

لارڈ اردن کی ٹرین کے نیچے جب بمب رکھا گیا۔ تو اس سے چند ماہ پہلے پنجاب کے کچھ نوجوان دہشت انگیزی یا انارکزم پھیلانے کی نیت سے دہلی آئے۔ اتنا بڑا اہم کام۔ اور کالجوں سے نکلے ہوئے نا تجربہ کار نوجوان۔ کوئی رہبری کرنے والا نہیں۔ جیب میں پیسے نہیں۔ اور فاقہ کشی مگر وصلے بلند اور قربانی کے جذبات۔ یہ لوگ جب دہلی آئے۔ تو دہلی کے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ اور کہا کہ کچھ لوگ ایک اہم کام کے لئے پنجاب سے آئے ہیں۔ اور بہت محب الوطن ہیں، فاقہ کشی میں مبتلا دہلی سے قریب بہادر گدھ یا بہادر گدھ کے قریب مقیم ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے لئے کچھ روپیہ چاہئے میں نے اس شخص کو ایک سو روپیہ دے دیا۔ اور ناکید کی کہ آئندہ مجھ سے ان لوگوں کی کسی مصروفیت کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ یہ شخص میرے اس جواب پر حیران تھا اور اس نے پوچھا کہ میں اتنی غیر دلچسپی کا اظہار کیوں کر رہا ہوں۔ حالانکہ دوسرے لوگ ایسے واقعات کو کرید کرید کر پوچھتے اور دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں جانتا ہوں کہ ایسی سازشوں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بارہ ملزم ہوں تو تیرہ سرکاری گواہ بن جاتے ہیں۔ میں نے روپیہ دیا ہے۔ تو ان کے کسی فعل کے لئے نہیں۔ بلکہ ان کی حب الوطنی اور ان کی تنگدستی سے مناثر ہو کر۔ یہ صاحب روپیہ لے کر چلے گئے۔ اس کے بعد یہ آٹھویں۔ دسویں یا پندرہویں دن تشریف لے آئے۔ اور ایک یا دو سو روپیہ لے جاتے۔ اور باوجود اس بات کے کہ میں کوئی بات سننا نہ چاہتا۔ مگر ان کو صبر نہ آتا۔ یہ کچھ نہ کچھ حالات سنہلی جلتے۔

یہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ یہ نوجوان ملنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کے لئے بہت عزت و احترام ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں ان کی عزت و محبت کا شکر گزار ہوں مگر ملنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں محتاط ہوں۔ نہ معلوم ان لوگوں میں سے کون کون اور کب سرکاری گواہ بنے اور کیا کیا بیان دے۔ میں کسی صورت میں بھی ان سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ میرے دل میں ان کے حب الوطنی کے جذبات کی قدر ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ جب کبھی ان کو مالی مشکلات ہوں۔ یہ کسی آدمی کو بھیج دیا کریں۔ مجھ سے جو کچھ ممکن ہو سکے گا۔ میں ان کی نذر کردوں گا۔ اس سے زیادہ کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنا میرے بس کا کام نہیں۔ اس کے بعد یہ صاحب اکثر آتے رہے۔ اور روپیہ لے جاتے رہے۔ ایک روز تشریف لائے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ کار کی ضرورت ہے۔ میں اپنی کار دوں۔ میں نے پوچھا کیا ضرورت ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں



اپنی کار نہیں دے سکتا۔ اور نہ ان کی مصروفیات کے متعلق کوئی بات سننا چاہتا ہوں اور نہ قائل ہوں کہ اگر کار کی ہی ضرورت ہو۔ اور ان میں سے کوئی صاحب کار چلا سکتے ہوں۔ تو شام کو سیناؤں کے سامنے درجنوں کاریں ملاوٹ کھڑی ہوتی ہیں۔ کسی ایک کار کو لے سکتے ہیں۔ انارکرم کے مقابلہ پر چوری کو سناڑا جرم ہے۔ انارکرم کے لئے تو پچاس فی کی سزا ہے۔ چوری کے لئے زیادہ سے زیادہ دو سال قید ہوگی۔ اور پھر چوری بھی چوری کی نیت سے نہیں۔ میرے اس مذاق کے بعد ان صاحب نے کار کے لئے بھر بار کہا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور اپنے وہی الفاظ دہرائے۔ کہ میں تم لوگوں کی مصروفیات کے متعلق نہ تو کوئی بات سننا چاہتا ہوں نہ کوئی نصیحت لینا چاہتا ہوں کیونکہ میں جاننا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کیا۔ تو نہ معلوم تم میں سے کون کون سرکاری گروہ بنے گا۔ کیا کیا بیان دو گے۔ اور کس کس کو پچھانشی برائگی اڈے گے۔

ان واقعات کے بعد ایک روز صبح کا وقت تھا۔ غالباً دھیر کا مہینہ۔ بہت سخت سردی تھی اور چاروں طرف کھڑی کھڑی۔ لہجہ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا۔ میں صبح اٹھ کر سنیل خانہ میں گیا۔ واپس آیا۔ تو سٹر سٹری کرشن آف ایسوسی ایٹڈ پریس کا ٹیلی فون آیا کہ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اسے قلعہ کے پاس لارڈ اردن کی ٹرین کو کیم کے ذریعہ اڑانے کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ کھڑ زیادہ تھی خوش قسمتی سے نشانہ درست نہ لگا۔ اور واسٹرا سٹریچ گئے۔ سٹر سٹری کرشن نے تو دوستانہ طور پر اطلاع دی۔ اور حسبِ ایسی کوئی بہت اہم خبر تھی۔ تو آپ ٹیلی فون پر مجھے بتا دیا کرتے۔ مگر میرے لئے یہ خبر خلافتِ توحید نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ کہ یہ پنجاب کے ان لاجروں کی مصروفیت کا ہی نتیجہ ہے۔

اس واقعہ کوئی ماہ گزر گئے۔ ان انارکرم سٹرائیکروں میں سے کچھ تو گزندہ ہو چکے تھے۔ اور کچھ ابھی گزندہ نہ ہوئے تھے۔ مجھے اس زمانہ میں سینا کا بہت شوق تھا۔ صفات کے مستقل پاس تھے۔ اُن زمانہ میں سیناؤں کے ایڈیٹران اخبارات کو مستقل پاس دیا کرتے تھے۔ کہ جب بھی جاہر پبلہ جاوے، آجکل یہ لوگ صرف ایک شے کے لئے پاس جاری کرتے ہیں۔ جو دوبارہ استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پھر دہانا ہو تو پھر نیا پاس چاہل کیا جاتا ہے۔ میں اب ایک عرصہ سے پاسوں سے سیناؤں کی بجائے کچھ عجیب سا سمجھتا ہوں۔ کٹ خرید کر ہی سیناؤں کی جھنڈا ہوں۔ اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے دفتر کا کوئی شخص بھی پاس نہ لے کر سینا نہ دیکھے۔ کیونکہ جس صورت میں کہ ہم فلم دانوں سے اشتہارات کی اجرت لیتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان سے پاس طلب کیا جائے۔ میں کوئی فلم نہ چھوڑتا تھا۔ بلکہ بعض فلموں کو تو دو بار دیکھتا۔ میں عوام کے پاس بیک ٹک سینا میں اور آخری اور کنارہ کی ایک کرسی پر بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ باہر سے کوئی شخص آکر میرے پاس گھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے اس شخص کو دیکھا۔ تو یہ سردار کرم سنگھ انچیکر سی۔ اتنی ڈیڑھ بجے میں سردار بہادر اور ڈیڑھ چھٹہ ٹکٹ ہو گئے تھے۔ اور اب ریشا تر ہو چکے ہیں (تھے۔ یہ چونکہ باہر روٹھی ہیں۔ لہذا کچھ قلعہ سینا میں اندر پہنچتے۔ تو ان کو بیٹھتے ہوئے لوگ نظر نہ آتے تھے۔ اور یہ وہاں بیٹھتے لوگوں کو اپنی آنکھوں پر زور دے کر خود کے ساتھ زور اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب سردار کرم سنگھ کو دیکھا کہ یہ اندر پہنچے ہیں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ تو میری ہنسی نکلی گئی۔ اور میں نے طنزاً کہا کہ سردار جی کس شکار کی تلاش میں ہو؟ سردار کرم سنگھ میرے واسطے تھے۔ اور واقعتاً ان کی یہ صورت تھی کہ یہ میری تلاشوں اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں انہوں نے بار بار میرے مکان پر تشریف

لا چکے تھے۔ اور اس کے بعد جب جلتے۔ ست سری اکال ہو جانا۔ شکار کے الفاظ سن کر یہ میری ساتھ والی کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔ اور میرے طنز کا انھوں نے طنز میں ہی جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ شکار ہم کریں۔ اور روپیہ تم دو۔“

میں نے کہا۔ سردار جی میں آپ کے ان الفاظ کو سمجھ نہ سکا۔ کہ روپیہ کس کو دو۔ اس پر سردار کرم سنگھ نے کہا۔ ہمارے پاس ایک شخص کا بیان موجود ہے۔ کہ وہ ان انارکسٹوں کے لئے آپ سے روپیہ لانا ہمارے جنوں نے دائرہ سرائے کی ٹرین کو اڑانے کی کوشش کی، میں نے بات کو منہ میں ٹالے ہوئے کہا۔ کہ اگر پولیس کے گواہ ایسے ہی معتبر ہیں۔ تو گورنمنٹ کی تباہی میں کوئی شک نہیں۔ ہم سینا بھی دیکھنے جا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں ظاہر اہلہ پر تو ان کے گواہوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اور عذر دہی منہی کے ساتھ ان پر اس بات کا انکار کر رہا تھا۔ کہ میں قطعی بے خبر اور لاعلم ہوں۔ مگر باتوں باتوں میں سردار صاحب کو یہ کہہ کر دیکر پوچھتا تھا کہ مزید حالات کیا ہیں۔ تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ پولیس کے پاس میرے متعلق اور مراد کیا ہے۔ سردار کرم سنگھ سے معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں کی جب گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ تو وہ حضرت بھی گرفتار ہوئے۔ جو مجھ سے روپیہ لے جایا کرتے تھے۔ گرفتار کیے جانے کے بعد میٹرپولس سپرنٹنڈنٹ پولیس (دیہ انٹرپولیٹیو پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ دہاں سے دائرہ سرائے کی ٹرین کو اڑانے والے سازش کے مقدمہ کی تحقیقات پر خاص طور سے لگائے گئے اور تحقیقات کے سلسلہ میں سپیشل ڈیوٹی پر کئی ماہ دہلی میں رہے) کے سامنے پیش کیے گئے تو مسٹر پیل نے پولیس آفیسر دیکھائے ہوئے ان سے کہا۔ کہ کمزموں کے کٹھن میں آنا چاہتے ہو۔ یا بطور سرکاری گواہ کے۔ دونوں میں سے کس کو انتخاب کرتے ہو۔ مسٹر پیل کے یہ الفاظ سن کر یہ حضرت گھبرا گئے اور دوپڑے اور انکھوں نے کہا کہ ان کو کمزوم نہ بنایا جائے۔ یہ تباہ ہو جائیں گے۔ اور سرکاری گواہ بھی نہ بنایا جائے۔ سرکاری گواہ بننے کی صورت میں یہ آئندہ پہلک میں بھی کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ یہ تمام حالات سن و عن راز میں بتا دیتے ہیں۔ اور گرفتاریوں میں بھی امداد دیں گے۔ ان کو کمزموں یا گواہوں میں نہ رکھا جائے۔ چنانچہ اس بات چیت کے بعد انھوں نے قیصری فلسفہ ساز کے کاغذ پر اپنا بیان دیا ہے۔ اور اس بیان میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ وہ ایڈیٹر ریاست سے کمزموں کے لئے روپیہ لانا رہا۔ جس سے ان کے کھانے پینے کے اخراجات چلتے تھے میں نے سردار کرم سنگھ سے جب یہ حالات سنے تو مجھے معاذ ہو گیا۔ کہ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے مزید کر دینے کے لئے تمام واقعات کا پھر مذاق اڑاتے اور فرضی ہنسی ہنسنے پر چھا۔ کہ اگر آپ کے پاس یہ بیان موجود ہے۔ کہ ایڈیٹر ریاست نے ان انارکسٹوں کو روپیہ دیا۔ تو آپ نے ایڈیٹر ریاست کو گرفتار کیوں نہ کیا۔ اس کے جواب میں سردار کرم سنگھ نے کہا۔ کہ یہ شہادت کافی نہ تھی۔ صرف ایک آدمی کی شہادت مقدمہ کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ اس شخص نے بتایا ہے۔ کہ ایڈیٹر ریاست ”سوائے ذاتی اخراجات کے اور کوئی امداد دینے یا جھٹہ لینے کے لئے تیار نہ تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بیان گرفتاری یا مقدمہ چلانے کے لئے کافی نہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد کا ذکر ہے۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ اور میں ابھی کام کر رہا تھا۔ ایک بنگالی نے نیچے کھادروازہ آکر کھٹکھٹایا۔ کھادروازہ نے دروازہ کھولا۔ تو اس نے کہا کہ وہ دیوان سنگھ سے ملنا چاہتا ہے۔

ملازم میرے پاس اوپر آیا۔ اور اس نے بتایا کہ ایک شخص نیچے سرحد راسی یا بنگالی معلوم ہوتا ہے۔  
 بلنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ پوچھو نام کیا ہے۔ وہ اس وقت کیوں بلنا چاہتا ہے۔ اور کام کیا ہے۔ ملازم  
 نے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نام بتانا نہیں چاہتا۔ مگر ایک بہت ضروری کام ہے۔ وہ بلنے پر بتائے گا۔  
 کہ کیا کام ہے۔ اور کیا نام ہے۔ اگر کوئی شخص اپنا نام بھی نہ بتائے۔ تو میں بلنے سے انکار کر دیا کرتا ہوں۔ اور  
 اکثر ایسا ہوا کہ نہیں ملا۔ کیونکہ جو شخص اپنا نام بھی نہ بتائے۔ اس کو حق چاہل نہیں کردہ دوسروں کا وقت  
 ضائع کرے۔ مگر چونکہ رات کے بارہ بجے تھے میں یہ سمجھا کہ شاید کسی ریاست سے کوئی شخص پوشیدہ طور پر  
 آیا ہو۔ اور دہاں کے مظالم بتانا چاہتا ہو۔ میں نے اس کو بلایا۔ اور پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ یہ ملک تہہ کاہنے  
 والا ایک انارکسٹ ہے۔ پنجاب کے ہیرا کاریوں (سکھوں میں ہیرا کالی تحریک شروع ہوئی تھی جس کا کام  
 پولیس کے افسروں اور سرکاری گواہوں کو قتل کرنا تھا) سے بلنے کے لئے امر متوجہ رہا ہے۔ اس کے پاس اخراج  
 ختم ہو گئے ہیں۔ اور اس کو ایک سو روپیہ کی ضرورت ہے۔ میں ایسے لوگوں کے متعلق بہت محتاط رہا ہوں۔  
 اور ہر شخص کے متعلق یہ سوچ لیتا ہوں کہ اگر یہ سرکاری گواہ بنا۔ تو مجھے کس حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے۔  
 میں نے اس پر سوال کیا کہ تم کو دیوان سنگھ کے متعلق علم کیونکہ ہوا کہ وہ اس مکان میں رہتا ہے۔ اور وہ نہیں  
 روپیہ دے گا۔ اس نے جواب دیا کہ کلکتہ میں وہ سردار رنجن سنگھ طالب درجہ مرحوم ہمارا جتنا بھوکے پرانیو بیٹ  
 سیکریٹری تھے۔ جن پر ستر سہا ش چندر بوس سے قتل رکھنے کا الزام تھا اور جو پانچ سال تک مختلف جیلوں میں  
 رکھے جانے کے بعد رہا ہوئے؟ سے ملتا کرتا تھا۔ اور ایڈیٹر ریاست کے متعلق دہاں اکثر ذکر آیا کرتا تھا۔ میں نے  
 پھر سوال کیا کہ کیا دہلی میں کسی شخص کو جانتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں لاٹشنگ لال ٹراپیکل انفرنس  
 والوں کو۔ ستر آصف علی کو اور مولانا عارف ہسوی کو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں جانتا نہیں کہ تم کون  
 ہو۔ آیا انارکسٹ ہر یاسی۔ آئی۔ ڈی کے ملازم ہو۔ اگر تم انارکسٹ ہو۔ تو مجھے تمہارے انارکزم سے کوئی  
 تعلق نہیں۔ میں بطور انسان کے ایک دوسرے ضرورت مند انسان کی امداد کر سکتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے  
 اور میں ہمیشہ کرتا ہوں۔ مگر اس خیال سے کہ یہ امداد غلط طریقہ پر ضائع نہ ہو۔ آپ ان تینوں اصحاب میں سے  
 کسی ایک کے پاس چلے جائیے۔ اور مجھے ٹیلی فون کر دیجئے کہ وہ آپ کو جانتے ہیں۔ میں آپ کو روپیہ دے دوں گا۔  
 مگر بغیر واقفیت کے نہیں دے سکتا۔ یہ بنگالی حضرت چلے گئے۔ اس کے بعد نہ یہ واپس آئے۔ اور نہ کوئی  
 ٹیلی فون آیا۔ میرا یقین ہے کہ یہ شخص سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگوں میں سے تھا۔ یا سی۔ آئی۔ ڈی والوں کا بیجا  
 جوا تھا۔

ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو امداد دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ یہ  
 ہر انسان کا فرض ہے۔ اور میں اُسے خوش نصیب سمجھتا ہوں جس کا محنت سے پیدا کیا ہوا روپیہ دوسرے  
 لوگوں کے کام آئے۔ اس کے علاوہ میری رائے میں ہماری ہمدردی اور امداد کا ہر وہ شخص مستحق ہے۔ جو  
 عجب الوطن ہے۔ اور ملک کی خدمت کرتا ہے۔ مگر ہر چمکنے والی شے کو سونا سمجھنا۔ احتیاط نہ کرنا۔ ہر شخص پر بھروسہ  
 کرتے ہوئے اس کے ساتھ شامل ہو جانا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں غدی پھانسی کی رستی ڈال لی جائے۔  
 چنانچہ میں اگر روپیہ لے جانے والے یا بنگالی پر زیادہ اعتماد کرتا۔ اور بے تعلق نہ رہتا۔ تو یہ غیر ممکن نہ تھا کہ مجھے

بھی لمزموں کے ساتھ شامل کر لیا جاتا۔

میں جب فیروز پور جیل میں نظر بند تھا، اور سنٹرل ایسلی میں میری گرفتاری اور نظر بندی کے متعلق سوالات دریافت کئے گئے۔ تو ہوم ممبر نے ایڈیٹر "ریاست" کی گرفتاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ایڈیٹر "ریاست" چونکہ فطرتاً اور عادتاً انقلاب پسند ہے۔ اس لئے اس کو نظر بند کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہوم ممبر کا ایسلی میں یہ جواب غالباً پولیس کی اس قسم کی رپورٹوں کی بنیادوں پر ہی تھا۔ کیونکہ پولیس کے لئے مبالغہ آمیزی اور ایک پسیمہ کو ایک روپیہ میں بدل دینا زبانی باتھ کا کزب ہے۔ مگر میری رائے ہے۔ اور شروع سے یہ رائے ہے کہ انارکزم ہندوستان کی آزادی کے لئے مفید نہیں۔ اگر انارکزم کی سپرٹ ٹانگ میں پیدا ہوتی تو گورنمنٹ اس کو آسانی کے ساتھ چل سکتی تھی۔ بے اختیار تو ان کے لئے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ عدم تشدد۔ جسے ہاتھ گاٹھائی نے اختیار کیا۔

## طوائف کی ناقابل تبدیل فطرت

ریاست اودے پور میں ایک جاگیر ناتھ دوارہ ہے جس کے جاگیردار مہنت دامودر داس تھے۔ یہ مہنت عمر میں پینتیس برس کے ہوں گے۔ شادی شدہ ایک جوان لڑکی اور چار پانچ برس کا ایک لڑکا جسے جاگیر کے دلی عہدہ ہونے کا حق چھل تھا۔ ان کی اولادیں تھیں۔ ناتھ دوارہ کی اس جاگیر باگدی کی سالانہ آمدنی پندرہ سو لاکھ روپیہ کی ہے۔ اس کے علاوہ کروڑوں روپے کے زیورات اور جواہرات موجود ہیں۔ جو معتقدین نے اس گدی کو نذر کئے۔ اور ہر سال ہزار ہا کی تعداد میں زائرین اس گدی اور گدی کے وارث مہنت صاحب کی زیارت کے لئے ناتھ دوارہ پہنچتے ہیں۔

کئی برس ہوئے ناتھ دوارہ میں سالانہ مذہبی آئندہ (تقریب) تھا۔ ہزار ہا کی تعداد میں زائرین جمع ہوئے۔ کاٹھیاواڑ اور بمبئی تک سے لوگ آئے۔ مہنت دامودر داس جی نے اس آئندہ پر ٹھاکر جی کے سامنے رقص کرنے کے لئے حسب دستور مختلف مقامات سے کچھ طوائفیں بھی بلائیں۔ ان طوائفوں میں دہلی کی ایک مشہور طوائف ہنسا بھی تھی۔ ہنسا کی عمر اُس وقت چالیس پینتالیس برس کی ہوئی۔ جیسی مہنت دامودر داس جی سے آٹھ دس سال بڑی تھی۔ طوائفیں اپنے شباب کو قائم رکھنے کے اعتبار سے بہت محتاط ہوتی ہیں۔ مگر مہنتوں کے باعث سیاہ ہو چکی دیوار پر سفیدی کے جھنڈے بھی کوٹ چاہو کرو۔ سیاہی کا بالکل چھپنا ممکن نہیں۔ یہ سیاہی غور ظاہر ہوگی۔ چاہے مٹیالے یا ہلکے شرخی نما رنگ میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہنسا کے کافی "ٹیک اپ" کرنے کی صورت میں بھی اس کے چہرہ کی جھریاں اس کے بڑھاپے کی بگڑی ہوئی صورت سے باز نہ آتی تھیں۔

مہنت دامودر داس بہت ہی غلصہ اور سادہ دہیدہ شخص تھے۔ بلکہ ان کی سادگی بے وقوفی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے جب ہنسابانی کو دیکھا۔ تو ان کے دل پر ہنسابانی کا کچھ اثر سا ہوا۔ اس اثر کو ہنسابانی نے محسوس کیا۔ تو اس نے اپنے طوائفانہ ہتھیاروں کو استعمال کرنے ہوئے دامودر داس جی کو مزید بیوقوف بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنسابانی مستقل طور پر ناتھ دوارہ میں ہی رکھ لی گئیں۔

ہنسائی جب ناخود دوارہ میں مقیم ہوئی تو اس پر لوگوں میں چرچا ہوا۔ مہنت برہٹلی کے الزامات لگے شروع ہوئے۔ اور ہمارا نا اودے پور نے بھی اعتراض کیا۔ تو مہنت صاحب کے عشق میں اس مخالفت کے باعث اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ عشق و محبت کے معاملہ میں انسانی فطرت ہے کہ جوں جوں مخالفت اور رسوائی ہو۔ انسان اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم جاتا ہے۔ اور عزت و دنا کی قربانی پر نازاں ہوتا ہے۔ آخر جب اس مخالفت نے بہت ہی زور پکڑا تو مہنت صاحب ہنسائی کے ایسا سے دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے پرتھوی راج روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ ہنسائے شادی کر لی۔ اور ہنسائے کچھلے تمام دوست۔ آشنا۔ ملنے والے۔ میرانی۔ سارنگے اور اسی کے رشتہ دار۔ داور۔ داس پر مکھیوں کی طرح گر پڑے۔ ناخود دوارہ کے روپیہ کو کوٹھی کی وسیع سازش ہوئی مہنت صاحب دہلی پہنچنے سے پہلے آٹھ دس لاکھ روپیہ کے قریب ہنسائے اور ہنسائے والے۔ دین کو دسے چکے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد کوشش یہ تھی کہ ناخود دوارہ کے ٹھاکر صاحب کے کپڑے بھی اُتار کر ٹھاکر صاحب کی مورتی کو بالکل ننگا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سازش میں مقامی سناٹن دھرم کے ایک لیڈر بھی شامل تھے جن کا کام یہ تھا کہ یہ مہنت دامودر داس اور ہنسائے روپیہ کے کران دونوں کے تعلقات کو منہ می اعتبار سے جائز و باعث سعادت قرار دیں۔

دامودر داس جی کے دہلی پہنچنے پر ان کے متعلق یہاں موافق و مخالف دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ان دونوں گروہوں کا مقصد یہ تھا کہ مہنت سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ ایک گروہ اس بات کا مدعی کہ مہنت صاحب نے اچھا کیا کہ ایک طوائف سے شادی کی۔ اور آپ ایک طوائف کو راہ راست پر لانے والے رفیقار ہیں۔ دوسرا گروہ اس بات کا مدعی کہ مہنت صاحب بد چلن ہیں۔ انھوں نے ناخود دوارہ کی گدی کو پلید کیا۔ اور ان کو گدی سے علیحدہ کر کے ان کی تمام جائیداد اور آمدنی بحق پبلک یا بحق ریاست اودے پر ضبط کر لی جائے۔ ان دونوں فریقوں کے ساتھ بعض اخبارات بھی شامل تھے۔ دامودر داس کے حمایتی اور مخالف حضرات میں کئی اصحاب ایڈیٹر ریاست کے بھی دوست تھے۔

جب یہ مخالفت زردوں پر تھی۔ اور مہنت دامودر داس بہت پریشان تھے۔ تو ایک دوست جو جہری تھے۔ میرے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے کہا کہ مہنت دامودر داس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے پوچھا۔ کہ کیا کام ہے، تو انھوں نے بتایا کہ کچھ مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ صاحب ایک دوست کا پیغام بھی لائے۔ جو دہلی میں بہت با اثر اور ہیک بہت معزز خاندان کے رکن تھے۔ میں نے ان سے شام کو آئے کا وعدہ کیا۔ میں ظلم کو چھوٹے کے قریب پرتھوی راج روڈ پر مہنت صاحب کی کوٹھی گیا۔ مہنت صاحب منتظر تھے۔ بہت بڑی کوٹھی۔ سامنے اور پچھلی طرف۔ بہت وسیع صحن۔ درجنوں کمرے۔ مہنت صاحب۔ مہنت صاحب کی پہلی بیوی پہلی بیوی سے جو ان لڑکی۔ چھوٹا بچہ۔ ہنسائی۔ ہنسائی ماں بہنیں رشتہ دار۔ میرانی۔ سارنگے۔ استاد جی۔ اور ملازم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاٹھیاواڑ کے کوئی بڑے والے ریاست اپنے تمام خاندان اور سٹاف کے ساتھ مقیم ہیں۔ میں جب پہنچا۔ تو مہنت صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اس کے بعد ہنسائی بھی ہاں آگئیں۔ اور باتیں شروع ہوئیں۔ مہنت صاحب نے لوگوں کی مخالفت کا گلہ کرتے ہوئے کہا۔

”سردار صاحب۔ دیکھئے کیا میں نے بڑا کام کیا ہے۔ جو ایک طوائف کی زندگی سدا ہادی۔

میں نے لوگ لاج کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی۔ جس کی کسی بڑے سے بڑے ریفارمر سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا یہ مخالفت جائز ہے۔ مجھے ہنسنا بائی جی سے پریم تھا۔ میں نے شادی کر لی۔ اب میری ہالگیر کو مضحکہ کرانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ میں نے آپ کی اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف سنی ہے۔ اس لئے آپ کو تکلیف دی کہ آپ سے مشورہ کروں۔“

میں اس کے متعلق کیا جواب دیتا۔ میں نے یہی کہا کہ اگر آپ لوگوں کے درمیان فی الحقیقت محبت۔ اور یہ عارضی جذبات کا بیج نہیں۔ تو آپ نے شادی کر کے اچھا کیا۔ اور چاہے آپ کو گدے سے الگ ہونا آپ کو اس پر قائم رہنا چاہئے۔ اور اگر آپ نے عارضی جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کیا۔ تو اسے اصلاح نہیں کہا جاسکتا۔ آپ اپنی گدی کو بھی رسوا کرنے کا باعث ہوئے۔ ہنر صاحب نے پھر زور دے کر کہا کہ اگر شادی کا بہت خالص طور پر محبت ہے۔ ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ اور میں واپس آنے والا تھا۔ تو ہنسنا بائی باتیں کرنے کے لئے مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ ہنر صاحب کی پہلی بیوی سے بالکل ملحق تھا۔ مگر اس کمرہ کی آواز اس کمرہ میں نہ جاسکتی تھی۔ ہنسنا نے جب باتیں شروع کیں۔ تو جیسا کہ ان الفاظ انداز۔ جو اس کی فطرت تھی جیم کے ہر جھنڈہ حرکت دینا۔ بات بات میں مسکراتا۔ تکلف۔ نمائش شن اور سیاہیست وغیرہ۔ اس کی باتوں کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کے فلاں دوست کا دوست ہوں۔ اور اس کے فلاں بیٹے والے سے میرے تعلقات ہیں۔ اور یہ منظم ہے اور ہمہ ردی کی سستی ہے وغیرہ۔ جب ہنسنا یہ باتیں کر رہی تھی۔ تو میں نے اس کے ذہن کی کیفیت معلوم کرنے اور تمام حالات کی درست و صحیح پوزیشن سمجھنے کے لئے اس سے سوال کیا۔

”تم نے اب تک اس آواز سے کتنا روپیہ حاصل کیا۔ اور کیا یہ گدھا تمہارے بیج سے نکل تو نہ جائے گا؟“

میرے اس سوال کا جواب ہنسنا نے دیا اس نے میرے جسم کے رد نکلے کھڑے کر دیئے اور وہ الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اس نے کہا۔

”کیا آپ مجھے اتنی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ میں اس حرام زادہ کو اپنے چگل سے نکلنے دوں گی۔ اس کا خیال تک بھی نہ کیجئے۔“

ہنر صاحب اور اس کو اپنے آپ کو ریفارمر سمجھ رہے ہیں۔ لاکھوں روپیہ اور وہ عزت جو کہ وہ دونوں اپنے صوف کر کے پر بھی نہ مل سکے اس طوائف کی نذر کر دی۔ گدی سے اترنے والے ہیں۔ اور جگہ جگہ سے آپ کے خلاف بد چلن اور عیاشی ہونے کے فتوے دیئے گئے۔ مگر آپ نے پروا نہ کی۔ ”اگر آپ ”عشق و محبت“ کی لاج رکھ سکیں۔ مگر ادھر ہنسنا طوائف۔ جس کے لئے آپ نے یہ سب کچھ کیا۔ آپ کو بیوقوف سمجھ کر گندی گالیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔

ہنسنا سے باتیں کر کے میں واپس اپنے دفتر چلا آیا۔ دفتر پہنچ کر میں نے ہنر صاحب کو ایک خط لکھا کہ آپ کے عشق اور بیوقوفی میں کوئی فرق نہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ اگر اپنی عزت کی پروا

کرتے تو کم از کم اپنی پہلی بیوی اور جوان لڑکی کی عزت کی پروا ضرور کیجئے جو میراثیوں اور سارے نیکے مسکینوں  
فنا میں ہیں۔ اور اس عیشت بازی کو چھوڑ کر واپس ناقدہ دوارہ چلے جائیے۔ مہنت صاحب نے نہ تو میرے  
خط کا کوئی جواب دیا۔ نہ غالباً کوئی پروا کی۔ اور شاید یہ خط آپ نے ہنسنا کو ہی دے دیا ہو۔ یہ معاملہ  
کامیاب ہو بیٹ تھا۔ اس میں کسی اخبار کو دخل دینے کا حق قابل نہ تھا۔ میں نے اس کے متعلق "زیاست"  
کا لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف ایک نوٹ شائع ہوا کہ ناقدہ دوارہ کے انتظام کے لئے ذمہ دار اور دیانتدار  
صاحب کی کمیٹی بنائی جانی چاہئے تاکہ یہ مذہبی وقف تباہ نہ ہو۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ریاست اودے پور کے حکم سے مہنت صاحب کو ناقدہ دوارہ سے روپیہ ملنا  
بھی بند ہو گیا۔ مہنت صاحب کے لئے تنگ دستی کے دن آگئے۔ جو روپیہ تھا ختم ہو چکا۔ جو اہرات اور  
رات نصف اور جو تھائی قیمت پر جو ہریوں کی دوکانوں میں پہنچ گئے۔ قرض خواہوں نے بار بار آنا شروع  
کر مہنت صاحب بیمار ہو گئے۔ اچھی طرح سے علاج بھی نہ ہوا۔ بیماری کی حالت میں ہی اودے پور گئے۔  
آپ کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کے انتقال کے بعد ہنسنا بائی بیبی مہنتی صاحبہ نے اودے پور  
وہاں دہلی تشریف لائیں۔ اور دہلی سے واپس اپنے خاندانی اڈہ پر یعنی اپنے وطن الموٹہ چلی گئیں۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طوائفیں لوگوں کو کیسے مکر آتو بناتی ہیں۔ نادانانہ لوگ اپنی بے وقوفی  
بیکر عیشت و بخت قرار دیتے ہیں۔ اور طوائفوں کے لئے چاہے لاکھوں روپیہ کی قربانی کی جائے۔ ان کی  
جوں میں قربانی کرنے والے احمق اور بے وقوف ہی رہتے ہیں۔

## خواب و خیال

میرے والد کا جب انتقال ہوا۔ تو میری عمر صرف چالیس وز کی تھی۔ اور مجھ سے بڑے ایک بھائی اور دو  
میں تھیں۔ ہندوؤں یا سکھوں میں عورت کے لئے بیوہ ہونا بہت بڑی مصیبت ہے۔ اور جس صورت میں  
پھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ جائیں یہ مصیبت ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میری والدہ  
س غم کے باعث دن رات روتی رہتیں۔ ایک روز میری والدہ نے خواب میں میرے والد کو دیکھا۔ والد  
کہا کہ نہ دیا نہ کرو۔ میں حافظ آباد کے قریب موضع جویاں کے ٹکڑے میں فلاں شخص کے گھر فلاں تاریخ کو پیدا  
ہو گا۔ وہاں صرف دو ماہ رہیں گا۔ پھر میری منگنی (نجات) ہو جائے گی۔ جو سامان چلم دجاں میرے والد کو اکثر  
دے لایا گیا ہے۔ اس سامان میں ایک بڑا کبس ہے۔ اس کبس کے اندر ایک چھوٹی صندوقچی ہے۔ اس  
دوچی کے خانہ میں سو روپیہ کا ایک نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید پڑی ہوئی ہے۔ یہ رسید لالہ جونی رام  
کو دے کر پندرہ روپیہ منگا لیجئے۔

میری والدہ نے اس خواب کا ذکر میری دادی سے کیا۔ دادی بھی خواب سن کر رونے لگی گئیں۔ انھوں  
دادا سے کہا۔ دادا بہت عبادت گزار سکھ تھے۔ اور خوابوں پر یقین نہ دگتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ خواب  
سارے ہر روز آتے ہیں۔ ان کا خیال ہو کر ناچا ہے۔ میری والدہ نے سامان میں سے کڑھی کے کبس کو کھولا۔

اس میں سے صندوقی نکالی۔ والدہ کو اس صندوقی کا کوئی علم نہ تھا۔ کیونکہ سامان کو جہلم سے لانے کا انتظام میر سیکو چا سردار بھگوان سنگھ سے کیا تھا۔ اس صندوقی کو کھولا تو اس کے خانہ میں ایک سو کا نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید موجود تھی۔ میری والدہ نے میرے بھائی کے ہاتھ یہ رسید لالہ جونی رام کپور کو بھیجی۔ تو لالہ جونی رام کپور نے میرے بھائی کو اس رسید کے پندرہ روپیہ دے دیئے۔ یہ رسید ”سراج الاخبار“ دو جاسن نامہ میں جہلم سے نکلتا تھا اس کے دفتر کی تھی۔ لالہ جونی رام اس اخبار کے خریدار تھے اور میرے والد نے لالہ جونی رام کے حساب میں ”سراج الاخبار“ والوں کو پندرہ روپیہ دیئے تھے۔ میری والدہ کو نہ تو اخبار کا علم تھا نہ رسید کا اور نہ اس صندوقی کا مگر خراب کے مطابق تمام واقعات درست نکلے۔ میری والدہ نے میری دادی کی صحت و ادا سے کہا دیا۔ کہ جریاں کے ٹھٹھہ جاکر معلوم کرنا چاہیے کہ فلاں شخص کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا یا نہیں میرے دادا نے جانے یا آدمی بھیجنے سے انکار کر دیا۔

کئی ماہ گزر گئے تو میرے دادا ایک مقدمہ کی پیشی کے لئے گوجرانوالہ گئے۔ اس زمانہ میں علی تھی نہ اگلے تھے اور کھوٹوں پر جایا کرتے۔ دادا بھی کھوٹے پر گوجرانوالہ گئے اور تین چار روز حافظ آباد سے غیر حاضر رہے۔ ان کی غیر حاضری میں میری والدہ نے میری دادی اور میرے چچا کو ساتھ لیا۔ اور یہ تینوں جریاں کے ٹھٹھہ دو حافظ آباد کے قریب ہی آئے۔ وہاں اس شخص کے گھر پہنچے جس کا نام خواب میں بتایا گیا تھا۔ تو وہاں کی عورتوں نے بتایا کہ ہاں فلاں نام کے کوڑے کا پیدا ہوا۔ جو در ماہ زندہ رہ کر مر گیا۔ میری والدہ وغیرہ یہ سن کر وہاں آگئے اور خواب کا ہر حصہ درست ثابت ہوا۔

بچے اچھی طرح ستے یاد ہے۔ میں، امجد (دیا ست پٹیل) میں تھا۔ والدہ بھی وہاں تھیں۔ والدہ نے ایک روز جمع کہا کہ ہمیشہ خوش رہو۔ رات کو میں نے گورو دیوی و میری ماموں زاد بہن کو کبھی حالت میں دیکھا ہے اس کے ہاں کھٹکے ہیں۔ اور رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تو گورو دیوی نے کہا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس خواب کے بعد تیسرے روز کجرات (جہاں کہ یہ لڑکی بیوی ہوئی تھی) سے خط پہنچا کہ گورو دیوی کا شوہر انتقال کر گیا ہے۔ چنانچہ اس خط کے پہنچنے ہی والدہ و امجد پرسی کے لئے حافظ آباد روانہ ہو گئیں۔

میرنا بچہ میں قید تھا۔ ہمارا جی گدی سے دستبرداری کے بعد انگریزی ایڈمنسٹریشن نے بچے وہاں گرفتار کر لیا تھا۔ میں وہاں خالہ اشہان نامہ رہا۔ والدہ چونکہ میری گرفتاری کے باعث بہت شگین تھیں۔ میری بڑی بہن میری والدہ کو اپنے پاس لا جو۔ لے آئیں تاکہ غم غلط ہو سکے۔ میں نا بھر سے کوئی خط بھی نہ لکھ سکتا تھا نہ مجھے خط مل سکتا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت میری والدہ جی آنکھ لگ گئی۔ تو وہ دھنسا جا گئیں۔ اور انہوں نے میری بہن سے پوچھا کہ کیا دیران سے لکھ لکھ کر آئی ہیں۔ میں نے کہا۔ نہیں ابھی تو نہیں آیا۔ والدہ نے کہا کہ ”ابھی دیکھا کہ دیران سنگھ اس مکان سے باہر لگی ہیں آوازیں دے رہا ہے۔“ میری بہن نے بتائی تو یہی۔ اور کہا کہ چونکہ آپ کا خیال بہر وقت دیران سنگھ کی طرف ہے۔ اس لیے خواب دیکھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں بھلیک اسی روز اور اسی وقت جب کہ والدہ نے خواب دیکھا تھا تب سے رہا گیا۔ اور میں رہا ہونے کے بعد نا بھر سے سیدھا ڈیرہ دون ہمارا جہ سے پہنچنے چلا گیا۔ ایک روز وہاں رہا۔ اور تیسرے روز لاہور پہنچ گیا۔ میرے والدہ کے ایک چھوٹے بھائی سردار گورکھ سنگھ کی بیوی یعنی میری چچی تھیں۔ ان کا نام مہری تھا۔



یہ بچاری جوانی کے عالم میں ہی دیوہ ہو گئیں۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا نکلا۔ جو بچپن میں ہی انتقال کر گیا۔ ان کے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لیے یہ بچاری اپنی زندگی کے دن گزارنے کے لیے مستقل طور پر اپنے میکے چلی گئیں۔ اور اپنے بھائی کے پاس چھوٹ رہتی تھیں۔ چند سال کا ذکر ہے۔ ایک روز میں دوپہر کو کام کر رہا تھا کہ مجھے دفعتاً اس چچی کا خیال آیا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو اس سے پانچ سات سال پہلے تک مجھے اس بچاری کا کبھی خیال نہ آتا تھا کیونکہ کئی برس سے نہ ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا نہ کوئی خط ملا۔ اور نہ کبھی کوئی اطلاع آئی۔ دوپہر کو کام کرتے ہوئے غلط توقع اس بچاری کا خیال آیا۔ اور اس خیال میں ہی تھا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ یہ بچاری کبھی ہوں گی۔ کہ اس کے مشہور سال دالوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس سے کہی یہ بھی پوچھا ہو۔ کہ یہ زندہ ہے۔ یا مر گئیں۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ اس چچی کو دوسرے روپیہ بھیج دوں کیونکہ غور کیا جائے تو میرے لیے یہ ایسی ہی قابل عزت ہیں۔ جیسے میری والدہ۔ میں نے چچا اسی سے چچی آرڈر فارم منگایا۔ اور سنی آرڈر فارم لکھنے لگا۔ تو خیال آیا کہ شاید وہ آجکل چھوٹ نہ ہوں کسی اور جگہ ہوں اور درست پتہ بھی معلوم نہیں کیونکہ صرف اتنا یاد تھا کہ ہونے کے بھائی کا نام لالہ ہری چند کپور تھا۔ اور یہ کئی برس ہوتے چھوٹ میں بڑی کی دوکان کرتے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے خطا لکھ کر پتہ دریافت کر لینا چاہئے۔ پھر سنی آرڈر بھیجا جائے۔ چنانچہ میں نے لالہ ہری چند کپور بزاز چھوٹ کے پتہ پر خط لکھا۔ کہ چچی صاحبہ کہاں ہیں۔ ان کا پتہ کیا ہے۔ میں ان کو کچھ روپیہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس خط کے لکھنے کے چھ سات اور بعد میرے پاس جواب پہنچا جس میں لکھا تھا کہ چچی ٹھیک اُس روز اور اُس وقت انتقال کر گئیں جس روز کہ میں سنی آرڈر لکھنا چاہتا تھا۔ اور میرے چھوٹ خط لکھا میں نہیں کہہ سکتا کہ اتنے برس کے بعد عین اُس روز اور اُس وقت اس چچی کا خیال کیوں آیا۔ اور روحانیت کے ماہر اس کی وجہ کیا بیان کریں گے۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید مرتے ہوئے اس بچاری کو اپنے مشہور سال کے لوگوں کا بھی خیال آیا ہو۔ اور ان لوگوں میں سے اس نے مجھے بھی یاد کیا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس یاد کا میرے ذہن پر بھی اثر ہوا۔

یہ چند واقعات خراب اور خیال کے متعلق ہیں۔ جن کا ذاتی تجربہ ہوا۔ ان کے علاوہ میں نے جب کبھی خواب میں سانپ دیکھا تو چند روز کے بعد ہی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اگر میں نے خواب میں سانپ کو ہلاک کر دیا تو دشمن کو شکست دی اور سانپ بھاگ گیا۔ یا خواب میں سانپ نے مجھے کاٹ لیا۔ تو دشمن نے مجھے نقصان پہنچایا۔ مجھے جب بھی کوئی تکلیف ہونے والی ہو۔ میرے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو۔ دشمن مجھے نقصان پہنچانے کے لیے سوچ رہا ہو۔ یا میرے کسی عزیز دوست کو تکلیف ہو۔ تو میں اپنے قلب پر ایک ناقابل بیان سا اثر محسوس کرتا ہوں جسے ڈیپریشن یا گھبراہٹ ہی کہنا چاہیے۔ چنانچہ میں کہہ دیتا ہوں کہ کوئی نئی نصیبت پیش آنے والی ہے۔ اور میرا اندازہ ہمیشہ ہی درست ثابت ہوتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ قبل از وقت محسوس کرنے یا خدشہ کے بعدیں درست ثابت ہونے کی اصل وجہ کیا ہے اور اس میں روح کد دخل ہے۔ یا نہیں۔ بہر حال میں اس کا ضرور مقابل ہوں۔ کہ کوئی ایسا ذریعہ درموجود ہے۔ جس کے باعث ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے۔ اور پیش آنے والے واقعات کا جس کے باعث پہلے سے احساس ہو جاتا ہے۔

## والیان ریاست کا انتقام اور ریاستی لڑتیں

مرحوم ہمارا جگموجرن سنگھ آف نابھہ موجودہ ہمارا جہ پرتاب سنگھ کے والد جو مغزول و جلالہا وطن ہوئے اور جنھوں نے کوڑائی کنال و مدراس میں چند سال ہوئے انتقال کیا میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی کمزوریاں تھیں۔ آپ بہت بڑے وطن پرست، برطانیہ کے سخت دشمن، علم دوست، اور کٹ مرے مگر پیچھے نہ ہٹنے والی شخصیت تھے۔ اور کمزوریوں کے ہمارے اُن میں بھی وہ تمام نقائص تھے جو والیان ریاست میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی طبیعت میں انتقام کے جذبات بھی انتہائی صورت میں تھے۔ اور آپ دشمن کو کبھی معاف نہ کرتے۔

جب آپ ابھی دلی عہد ہی تھے تو آپ کے پرائیویٹ سکرٹری نابھہ کے ایک رئیس سردار جنرل شیو دیو سنگھ مقرر ہوئے (جو پانچ چھ سال نابھہ کے وزیر اعظم رہے اور پٹیلہ ریمن کے ایک منسٹر بھی تھے) جو ہمارا جہ کے دلی عہدی کے زمانہ میں ہمارا جہ کے ساتھ انگلستان بھی گئے۔ چنانچہ ہمارا جہ نابھہ اور ان جنرل سردار شیو دیو سنگھ کے تعلقات کی کشیدگی کی ابتدا انگلستان میں ہی ہوئی۔ جب کہ ہمارا جہ آپ پر ناراض ہو گئے۔ اور آپ کو واپس ہندوستان بھیج دیا گیا۔

ہمارا جہ ہیرا سنگھ کا انتقال ہوا اور ہمارا جہ گورچن سنگھ گدی پر بیٹھے تو سردار شیو دیو سنگھ ملازمت سے علیحدہ کیے گئے۔ مگر ہمارا جہ کے انتقام کے جذبات بدستور مشتعل تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سردار شیو دیو سنگھ کے سوتیلے بھائی سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔ سردار جنگ سنگھ کو یہ شبہ ہوا یا اس نے ہمارا جہ کے کہنے سے سردار شیو دیو سنگھ پر یہ غلط الزام لگایا کہ اس لڑکی کے انتقال کی وجہ زہر دیا جانا ہے۔ اور جایا دے کے جھگڑوں کے باعث سردار شیو دیو سنگھ نے ہی اس لڑکی کو زہر دلویا۔ سردار جنگ سنگھ کا سردار شیو دیو سنگھ پر لگایا گیا یہ الزام ہمارا جہ کے ہاتھوں میں انتقام لینے کے لیے نیا ہتھیار آگیا۔ سردار شیو دیو سنگھ کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ہوئی کے ایک ریٹائرڈ سیشن جج پنڈت پیتمبر جوشی کو اس مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر کیا گیا۔ عدالت میں شہادتیں گزریں۔ اور سردار شیو دیو سنگھ سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کو زہر دینے اور ہلاک کرنے کے جرم میں عمر قید کو دیے گئے۔

سردار شیو دیو سنگھ جب جیل بھیج دیے گئے۔ تو انھوں نے اس سے پہلے اور جیل جانے کے بعد بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ کو رٹنٹ وند کے پاس ہمارا جہ کے خلاف شکایتیں کھینک بھیجیں۔ ہمارا جہ نے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے خبریں حاصل کرنے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے کلرکوں سے انتظام کر رکھا تھا۔ اور ان کلرکوں کو اس کام کے لیے کافی روپیہ دیا جاتا تھا۔ ہمارا جہ کو ان کلرکوں کے ذریعہ علم ہوا کہ سردار شیو دیو سنگھ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پاس ہمارا جہ کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجتے ہیں۔ چنانچہ یہ اطلاع سنی کہ ہمارا جہ کے انتقام کی سہولت میں اور اضافہ ہوا۔ اور ہمارا جہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سردار شیو دیو سنگھ کو مزید آنتیں دی جائیں۔

سردار شیو دیو سنگھ کو ذہنی آفت دینے کے لیے ہمارا جہ نے اپنے دو نفروں (ریاستوں میں ہمارا جہ کے اُن ملازمین کو کہتے ہیں۔ جو ہمارا جہ کے ذاتی کام شایہ گھانا، کھانا، کپڑے بدلوانا، غسل کرانا، وغیرہ سرانجام دیتے ہیں)

بیرسنگہ اور ایک دوسرے شخص کو مقرر کیا۔ کسی نہ کسی طریقہ سے سردار شیو دیوسنگ کی بیوی کو جو بھدوڑ ریاست  
پھیلا رکھا رہنے والی تھیں۔ اور ہمارا چٹیا لہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں۔ نا بھہ لایا جائے تاکہ وہ اپنے  
شہر کے خلاف ہمارے اس کے شہر کے خلاف بطور ٹول استعمال کیا جائے۔

سردار شیو دیوسنگ کی بیوی بہت نیک خاتون تھیں۔ اور اس خاتون کے والد سردار نانک سنگہ مرحوم جس عظیم  
بھدوڑ بھی غیر معمولی طور پر نیک شخصیت تھے۔ یہ بچاری اپنے شہر کے جیل جانے کے بعد اپنے بیکے یعنی بھدوڑ  
آگئی تھیں۔ اور وہاں ہی مستقل طور پر مقیم تھیں۔ بیرسنگہ نفر اور اس کا ساتھی دونوں بھدوڑ پہنچے۔ اور انھوں نے  
اس خاتون کو بہت لالچ دیئے کہ یہ نا بھہ چلے۔ مگر اس خاتون نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بیرسنگہ اور  
اس کا ساتھی برنالہ (جو بھدوڑ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے) اور بھدوڑ کا ریلوے سٹیشن (تھانہ بھی ہے) کے  
تھانہ دار عبدالعزیز کے پاس پہنچے۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ سب انسپکٹر سردار فی شیو دیوسنگہ کے خلاف  
کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کرے۔ تو اس کو دس ہزار روپیہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اس جھوٹے مقدمہ کا مقصد یہ  
تھا کہ مقدمہ کے خوف سے سرہارنی شیو دیوسنگہ نا بھہ چلی جائے گی۔ ایک سب انسپکٹر پولیس کے لئے دس ہزار  
روپیہ کا لالچ کم نہ تھا۔ اور پولیس کے لوگ جھوٹے مقدمے بنانے کے اعتبار سے کافی سنگدل ہوتے ہیں۔  
مگر چونکہ سردار فی شیو دیوسنگہ ہمارا چٹیا لہ کی قریبی رشتہ دار تھیں۔ اور عبدالعزیز ریاست پھیلا کے ملازم تھے۔  
اس لیے عبدالعزیز کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ رشوت لے کر سردار فی شیو دیوسنگہ پر جھوٹا مقدمہ قائم کرے۔

اس واقعہ کو دو تین ماہ گذر گئے اور بیرسنگہ دھنرہ دوسری کوششوں میں مصروف ہے مگر ان کو کامیابی  
نہ تھی۔ اس کے بعد یہ لوگ لاہور لگ آئینڈ کیلوس کمپنی دیر انگریزی کمپنی جو اہرات زیورات اور قیمتی گھڑیوں  
وغیرہ کا بزنس کرتی تھی اور اس کا زیادہ کاروبار ریاستوں میں تھا ان کے ہاں گئے۔ اور کہا کہ بھدوڑ کے رئیس عظیم  
سردار نانک سنگہ مرحوم کی چھوٹی لڑکی کی شادی ہے۔ اور اس شادی کے لیے زیورات وغیرہ سامان چاہئے۔  
لگ آئینڈ کیلوس کے منیجر نے جیسا کہ وہ عام طور پر کرتے تھے۔ اپنے ایک کلرک کو چالیس پچاس ہزار روپیہ کا  
سامان دے کر بیرسنگہ اور اس کے ساتھی کے ساتھ بھدوڑ بھیج دیا۔

یہ لوگ اس بابو کو بھدوڑ لے گئے۔ وہاں انھوں نے پہلے سے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ وہاں  
بابو کو ٹھہرایا۔ بہت خاطر تواضع کی۔ دونوں کے بعد انھوں نے سردار نانک سنگہ کا مکان لگی میں سے دکھایا۔  
اور کہا کہ یہ مکان سردار فی نانک سنگہ کا ہے۔ سردار فی صاحبہ کے ہاں اس وقت یہت سے همان آئے  
ہوئے ہیں اور ان کو فرصت نہیں۔ سردار فی صاحبہ نے آپ کے کرایہ وغیرہ کے لئے ایک صورت روپیہ دیا ہے۔  
آپ واپس چلے جائیے۔ جب پھر آپ کو تار دیا جائے تو آپ تشریف لائیے۔ اور زیادہ سامان لائیے۔  
کیونکہ سامان کافی خرید جائے گا۔ بابو صاحب کو ایک سو روپیہ کرایہ بطور بریل گیا۔ وہ واپس چلے گئے۔ دس دن  
کے بعد لگ آئینڈ کیلوس کے پاس تار پہنچا کہ بابو کو پھر بھیجئے۔ لگ آئینڈ کیلوس نے اپنے بابو کے ہاتھ ایک لاکھ  
روپیہ سے زیادہ قیمت کا مال پھر روانہ کیا۔ بابو بھی برنالہ کے ریلوے سٹیشن پہنچے۔ تو ریلوے سٹیشن پر بیرسنگہ اور اس کا  
ساتھی ڈاونٹ لیکر موجود تھے کہیں کا روانہ تھا۔ چند گھنٹے یہ ریلوے سٹیشن پر ٹھہرے۔ جب شام ہو گئی۔ تو یہ اونٹوں پر  
روانہ ہوئے اونٹ جب برنالہ اور بھدوڑ کے درمیان جنگل میں پہنچے تو اونٹ بٹھا دیئے گئے۔ بیرسنگہ اور اس کے

ساتھی نے بابو جی کو رستوں کے ساتھ ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ اور زیورات والا بکس لے کر یہ دونوں اور ٹٹول پرنا بھر روانہ ہو گئے۔ بابو جی کو جب رہاں درخت کے ساتھ بندھے ہوئے دتین گھنٹے ہو گئے۔ اور قریب سے کچھ لوگ گزرے تو بالوں نے زور سے آوازیں دیں۔ اور ان لوگوں نے آکر بابو جی کی رسیاں کھولیں۔

بابو جی پیدل واپس برنالہ پہنچے۔ ریلوے سٹیشن سے انھوں نے اپنے مالکان یعنی گلگ ایئرڈ کیلوے کو تار دیا کہ ڈاکر پڑا ہے۔ اور سامان لوٹ لیا گیا ہے۔ گلگ ایئرڈ کیلوے نے ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب (اس زمانہ میں کرنل پنچن اسے جی۔ جی تھے) کو تار دیا اور ایجنٹ گورنر جنرل نے ریاست پٹیالہ کو تار بھیجا۔ چنانچہ دوسرے تیسرے روز پنجاب اور پٹیالہ دونوں جگہ کی پولیس تجربہ کار افسروں کے ساتھ تحقیقات کے لئے برنالہ پہنچ گئی۔ بالوں کے نشان نہ دیکھ کر پولیس بھدڑ سرداری تاںک سنگھ کے مکان پر پہنچی۔ ان خواتین نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیونکہ نہ تو ان بچاریوں کے ہاں کوئی شادی تھی اور نہ زیور خریدنے کا سوال تھا اور ان کو علم تک نہیں کہ ڈاکو کون تھے۔ اور ڈاکو کیوں پڑا۔

جب پولیس کو چارپانچ روز تحقیقات کرتے گزر گئے۔ اور کوئی پتہ نہ چل سکا۔ تو سب انسپکٹر عبدالعزیز کو خیال آیا۔ کہ یہ کارروائی غالباً مجھ کے اُن دو اشخاص کی ہے۔ جو اُسے دس ہزار روپیہ رشوت دے کر سرداری نیند ویر سنگھ کے خلاف بھڑا مقدمہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کی ملاقات وغیرہ کے تمام کے تمام حالات اور رشوت پیش کرنے کا واقعہ ایک خط کے ذریعہ سردار یاشن کول وزیر اعظم پٹیالہ کو لکھ بھیجا۔ سردار یاشن نے جب یہ خط دیکھا۔ تو آپ نے عبدالعزیز کو تار دیا کہ فوراً پٹیالہ پہنچو۔ آپ نے عبدالعزیز سے تمام حالات سنے۔ تو عبدالعزیز کو تڑپتی دے کر انسپکٹر پولیس بنا دیا گیا۔ اور صرف اس مقدمہ کی تحقیقات کے لئے سپیشل ڈیوٹی پر مقرر کیا۔

عبدالعزیز انسپکٹر ہونے کے بعد تحقیقات کے لئے نا بھہ پہنچا۔ اس کے ان دنوں ملازموں کا نام تک معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ان کو پہچان سکتا تھا۔ یہ منصوری رجاں کہ ہمارا جہ نا بھہ منیم تھے (گیا تا کہ ہمارا جس کے ملازموں میں سے یہ ملازموں کو پہچان سکے۔ مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد یہ کئی روز تک نا بھہ میں چکر لگاتا رہا۔ مگر اسے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ جب ہمارا جہ نا بھہ کو ڈاکہ کا علم ہوا۔ اور یہ پتہ چلا کہ پنجاب و پٹیالہ کی پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ تو آپ نے ملازموں کی رہائش کا انتظام نا بھہ کے شاہی محلات ”پکا باغ“ کے اندر کر دیا تھا۔ جہاں کوئی شخص نہ آ سکتا تھا۔ نہ جاسکتا تھا۔

عبدالعزیز جب نا بھہ میں کئی روز پھرتا رہا۔ اور اُس نے مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں کے فوٹو دیکھے تو وہ میر سنگھ کا فوٹو ایک جگہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس فوٹو کے متعلق پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ ہمارا جہ کے نفر بیر سنگھ کا ہے۔ یعنی اس فوٹو کے ذریعہ یہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے ایک شخص میر سنگھ نفر ہے۔ اب میر سنگھ کی تلاش جاری ہوئی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ میر سنگھ نہ شاہی ملاقات میں رکھا ہوا تھا۔

نا بھہ پولیس عبدالعزیز کی مصروفیات کی نگہانی کر رہی تھی۔ مگر اس کے پاس عبدالعزیز کو نا بھہ سے نکلنے

کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کیونکہ عبدالعزیز مقدمہ کی تحقیقات کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاس ملزموں کی گرفتاری کے لیے ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب اور پیٹالہ فارن منسٹر دہلی کے دستخطی وارنٹ گرفتاری موجود تھے۔ آخر نا بھ پولیس نے عبدالعزیز کو پھنسانے کے لیے ایک سازش کی۔ نا بھ کے ایک سب انسپکٹر پولیس دولت سنگھ دیہ صاحب غالباً بعد میں ریاست نالگرٹھ میں انسپکٹر پاسپورٹ منٹ پولیس تھے ) عبدالعزیز کے پاس گئے۔ اور کہا کہ اگر عبدالعزیز پیٹالہ سے دولت سنگھ کو کافی روپیہ دلوادیں۔ اور یہ وعدہ کریں کہ پیٹالہ میں اچھی ملازمت بھی دینگے۔ تو دولت سنگھ میر سنگھ کو گرفتار کر دے گا۔ عبدالعزیز اس سازش کا شکار ہوئے۔ آپ نے دولت سنگھ کو دو ہزار روپیہ بطور ایڈوانس دے دیا۔ تین ہزار روپیہ میر سنگھ کی گرفتاری کے بعد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور یہ وعدہ بھی ہوا کہ گرفتاری کے بعد دولت سنگھ کو پیٹالہ میں انسپکٹر پولیس بنا دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد تیسرے چوتھے روز دولت سنگھ عبدالعزیز کے پاس آئے۔ اور کہا کہ ابھی چلئے۔ میر سنگھ ایک مکان کے اندر اس وقت موجود ہے اسے گرفتار کرو۔ عبدالعزیز دولت سنگھ کے ساتھ ایک نیم طوائف (جو پرائیویٹ طور پر پیشہ کرتی تھی۔ کیونکہ نا بھ میں کسی طوائف کو پیشہ کرنے کی قانوناً اجازت نہ تھی) کے مکان پر گئے۔ اور دولت سنگھ نے گلی میں سے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس مکان کے اندر میر سنگھ موجود ہے گرفتار کرو۔ اور یہ کہتے ہوئے کہ دولت سنگھ کی مخبری کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ دولت سنگھ مکان دکھا کر چلا گیا۔ عبدالعزیز کی جیب میں اس وقت ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب اور فارن منسٹر پیٹالہ کے دستخطی وارنٹ اور ایک ہتھکڑی تھی۔

اس نیم طوائف کا نام خیران تھا اور یہ نا بھ پولیس کے ماتحتوں میں ٹول تھی۔ عبدالعزیز جب میر سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے خیران کے مکان کے اندر پہنچے۔ تو نا بھ پولیس کی سکیم کے مطابق عبدالعزیز کے اندر پہنچتے ہی خیران نے عبدالعزیز کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اور جوتے مارنی مارنی ان کو گھر سے باہر لگی میں لے آئی۔ گلی میں شور مچا کر پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ لوگوں نے خیران سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ خیران نے کہا کہ یہ کوئی بد معاش ہے۔ جو زنا با بچہ کی نیت سے مکان کے اندر گھس آیا۔ ایسے مواقع پر پبلک سائیکالوجی کے اعتبار سے ہر شخص کی ہمدردی کا عورت کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ خیران کی گفتش کاری کے ساتھ ساتھ عام لوگوں نے بھی عبدالعزیز کو جوتے مارنے شروع کیے۔ کوئی کہتا ”بد معاش تو اس گلی میں آیا کیوں؟“ کوئی کہتا ”کیا تمہارے گھر میں بہن بیٹی نہیں؟“ ”تم کو جیل خانہ میں بھونا چاہیئے؟“ ”کتنی جرات ہے دن کے وقت عورت کے گھر میں چلے جانا“ وغیرہ

نا بھ پولیس نے تمام انتظام کر رکھا تھا۔ جب پکارے عبدالعزیز کو چٹا جا رہا تھا۔ تو قریب ہی سے پولیس آگئی۔ اس نے عبدالعزیز کو گرفتار کیا۔ عدالت میں زیر جرم زنا با بچہ چلان ہوا۔ شہادتیں گزریں۔ اور مجسٹریٹ نے عبدالعزیز صاحب کو عین سال قید سخت کی مزا دی۔ اور عبدالعزیز صاحب اس وقت جیل سے رہا ہوئے۔ جب کہ ہمارا چنا بھ کی گڈی سے دستبرداری کے بعد انگریزوں نے نا بھ ایڈمنسٹریٹیشن پر قبضہ کیا۔

اس واقعہ کے بعد بیرسنگہ بڑودہ میں گرفتار ہوا۔ اس گرفتاری کے حالات بہت دلچسپ ہیں اور کسی دوسری جگہ درج ہیں

## ریاستوں کے جرائم

ہمارا جہ نا بھگہ کانفر بیرسنگہ بھدوڑ کے قریب لگا اینڈ کیلوے کے سامان پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد نا بھگہ کے سرکاری محلات میں رکھا گیا۔ اور جب ہمارا جہ اور کرنل منچن ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کے درمیان ہمارا جہ کی گڈی سے دستبرداری کے متعلق خط و کتابت ہو رہی تھی اور ہمارا جہ کو یہ یقین ہو گیا کہ آپ گڈی سے علیحدہ کر دیئے جائیں گے۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ بیرسنگہ کے مسئلہ کا حل کیا ہو۔ کیونکہ بیرسنگہ گرفتار ہوتا ہے۔ تو لک اینڈ کیلوے کے ڈاکہ کے متعلق اقراری بیان دیدے گا۔ اور اس مقدمہ میں بھی ہمارا جہ کا تعلق ثابت ہو گا۔ اور اگر یہ گرفتار نہ ہو۔ تو اسے کہاں بھیجا جائے۔ جہاں کہ یہ اپنی زندگی پر شدید طور پر مبرک کر سکے۔ چنانچہ سوچنے کے بعد ہمارا جہ نے اس کو پانچ سو روپیہ اخراجات کئے دیے۔ اور کہہ کر ایک کسی دوسری ریاست میں چلا جائے۔ جہاں کہ یہ گرفتار نہ ہو سکے۔ اس کو موٹر میں بٹھا کر گوبند گڑھ ریلوے سٹیشن (جو ریاست نا بھگہ کی حدود میں تھا) پر چھوڑا گیا۔ جہاں سے اپنے ماموں کے ساتھ بڑودہ پہنچ گئے۔ بڑودہ پہنچے ہوئے اس کو چند روز بھی ہوئے تھے کہ اس کے پاس روپیہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ انسان اگر پردیس میں پریشیدہ طور پر رہنا چاہے تو اسے ایک روپیہ کی جگہ چار روپیہ صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس نے اپنے ماموں کو ہمارا جہ کے پاس پھر واپس نا بھگہ بھیجا۔ تاکہ یہ ہمارا جہ سے اخراجات کے لئے مزید روپیہ لا سکے۔ اس وقت تک نہ تو برطانوی پولیس میں سے کسی شخص کو علم تھا کہ بیرسنگہ کہاں ہے۔ نہ ٹیالہ کی پولیس۔ کہ بیرسنگہ کا ماموں جب بڑودہ سے واپس نا بھگہ پہنچا۔ اور ہمارا جہ سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے ملا۔ تو ان لوگوں کو اس شخص کی حرکات پر مشتبہ ہوا۔ جہ ہمارا جہ ٹیالہ کے مخزن بھگہ کے محلات میں تھے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے ہمارا جہ ٹیالہ کو اطلاع دی۔ کہ بیرسنگہ کا ماموں نا بھگہ میں ہے۔ اور ہمارا جہ سے بلا ہے۔ ٹیالہ والوں نے اس کی اطلاع برطانوی پولیس کے لوگوں کو دی جو ٹیالہ میں تھے۔ چنانچہ برطانوی پولیس کی سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ نا بھگہ میں بیرسنگہ کے ماموں کی نگہانی پر لگا دیئے گئے۔ بیرسنگہ کا ماموں روپیہ کئے چار پانچ روز نا بھگہ میں رہا۔ اس کے بعد یہ روپیہ لے کر بڑودہ کو روانہ ہوا۔ تو سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ مگر اس کو ان کا کچھ علم نہ تھا۔

بیرسنگہ بڑودہ میں اپنے ماموں کے انتظار میں تھا اور جب اس کے ماموں کو بڑودہ سے گئے ہوئے کئی روز ہو گئے تو اس نے بے صبری کے عالم میں فرنٹیئر سیل کے وقت ریلوے سٹیشن پر بھی آنا شروع کر دیا۔ تاکہ یہ دیکھ سکے کہ اس کا ماموں آیا ہے۔ یا نہیں۔ جس روز اس کا ماموں بڑودہ کی فرنٹیئر سیل سے آؤا۔ تو بیرسنگہ اس وقت بھی اپنے ماموں کے انتظار میں بڑودہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس کا ماموں گاڑی سے اترا اور بیرسنگہ سے بلا تو سی۔ آئی۔ ڈی کے ان

لوگوں نے جناحہ سے ساتھ آئے تھے۔ بیر سنگھ کو ریلوے کے پلیٹ فارم پر ہی گرفتار کر لیا۔ اور اسے پٹیار لایا گیا۔ تاکہ اس پر ڈاکہ کا مقدمہ چلایا جائے۔ پٹیار لے کر بیر سنگھ نے من و عن تمام حالات بتا دیئے۔ اور بارہا جناحہ کے خلاف وہ بیان دے دیا۔ جس کی برطانوی اور پٹیار لے کر بیر سنگھ کو ضرورت تھی۔ بیر سنگھ پر مقدمہ۔ اور اس مقدمہ میں بیر سنگھ کو دس سال قید سخت کی سزا سنائی۔

بیر سنگھ کا قصہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جانا۔ ڈاکہ کے اس واقعہ سے ایک عرصہ پہلے بیر سنگھ مہیسی گیا تھا۔ ہاں اس نے کسی دوسرے شخص کے ساتھ دھوکا کھایا۔ تو اس شخص نے بیر سنگھ کے خلاف پولیس میں زیر دفعہ ۴۲ رپورٹ درج کرائی۔ اور پولیس نے مقدمہ قائم کیا۔ مگر مہیسی پولیس بیر سنگھ کو گرفتار نہ کر سکی۔ جب بیر سنگھ کے پٹیار میں قید ہونے کی اطلاع مہیسی پولیس کو ملی۔ تو اس نے بھی اپنے ۴۲ کے مقدمہ میں پھر فی زندگی پیدار کی۔ اور چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت سے بیر سنگھ کو مہیسی بھیجے جانے کے وارنٹ حاصل کئے۔ مہیسی پولیس یہ وارنٹ لے کر پٹیار پہنچی۔ پٹیار کے فارن منسٹر نے حسب قاعدہ حکم دیا کہ مہیسی کے مقدمہ کا ردوائی کے لئے بیر سنگھ کو مہیسی پولیس کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہ کاغذات پٹیار پولیس کے پاس گئے۔ اور پٹیار پولیس نے بیر سنگھ کو پٹیار جیل سے قائل کر کے مہیسی پولیس کے سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ مگر پٹیار پولیس کی ممانعت سمجھئے۔ یا بیر سنگھ کی خوش نصیبی کہ جب بیر سنگھ کو مہیسی پولیس کے حوالہ کیا گیا۔ تو پٹیار پولیس کاغذات رانگی میں یہ لکھنا بھول گئی۔ کہ ٹرمز دس برس کے لئے پٹیار میں قید کاٹ رہا ہے۔ مہیسی کے مقدمہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کو قید کے ایام کاٹنے کے لئے وہاں پٹیار بھیجا جائے۔

مہیسی کی پولیس بیر سنگھ کو لے کر مہیسی پہنچی۔ بیر سنگھ کو لے جانے والے کنسٹیبلوں نے اس کو مہیسی جیل کے حوالہ دیا۔ دو تین روز کے بعد اس کی پٹنٹی چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔ چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ نے مشل دیکھی اور پرچھا۔ کیا جرم ہے تو ٹرمز اور سرکاری وکیل نے بتایا کہ ۴۲ یعنی دھوکہ ۴۲۰ کا جسٹرم غزیرات ہند کے مطابق قابل ضمانت ہے چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ٹرمز پانچ سو روپیہ کی ضمانت پر راکر دیا جائے۔ یہ حکم بیر سنگھ کی قسمت میں نئے باب کے اضافہ کا باعث ہوا۔ اس نے مہیسی کے اپنے ایک راتے دوست سے پانچ سو روپیہ کی ضمانت کے لئے کہا۔ اس دوست نے پانچ سو روپیہ کی ضمانت دے دی۔ اور بیر سنگھ جیل سے راکر دیا گیا۔ اس کے بعد اب تک بیر سنگھ کا نہ تو برطانوی پولیس کو کوئی سراغ لگ سکا۔ نہ پٹیار کی پولیس کو۔ اور بیر سنگھ مفور ہے۔

کئی برس کی بات ہے۔ مرحوم ہمارا جناحہ زندہ تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست "بھی ان کے پاس منصورہ میں مقیم تھا۔ میں بازار میں میرے لئے گیا۔ تو ایک شخص مجھ سے ملا۔ اس نے ہمارا جہ کے نام ایک لٹاؤ دیا۔ دیکھا کہ وہ اگلے روز شام کو اسی مقام پر جواب کا انتظار کرے گا۔ ہمارا جہ سے جواب لا دیا جائے۔ میں نے بیر سنگھ کو کبھی پہچانے تھا نہ مجھے شبہ ہوا۔ کہ یہ بیر سنگھ ہے۔ اور نہ میں نے اس سے دریافت کرنے ضرورت سمجھی۔ کہ یہ کون ہے۔ کیونکہ میں دوسروں کے معاملات میں مہرت کم دخل دیا کرتا ہوں۔ میں نے یہ خط ہمارا جہ کو دیا۔ تو انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ خط بیر سنگھ کا ہے۔ اور منصورہ میں ہے۔ جہ اور لٹاؤ چاہتا ہے نہ ہمارا جہ نے بیر سنگھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور زبانی کہہ دیا کہ وہ منصورہ میں سے چلا جائے۔ اور

کبھی یہاں نہ آئے۔ ہمارا جہ اس سے ملتا نہیں چاہئے۔ اگلے روز میں نے بیر سنگھ کو یہی جواب دے دیا۔  
مجھے علم نہیں کہ اس کے بعد بیر سنگھ کہاں گیا۔ وہ کہاں ہے۔ اور اس کا کیا حشر ہوا۔

بیر سنگھ کے سلسلہ میں گنگ اینڈ کیلوے کے جاہرات کا قحطہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ جب ہمارا جہ گدی سے دستبرد دار ہوئے۔ تو نا بھ سے روانہ ہونے سے پہلے یہ سلسلہ بھی ہمارا جہ کے سامنے تھا۔ کہ بیر سنگھ کو تو بڑا ورہ بھیج دیا گیا۔ جیولری کے اس کبس کا کیا ہوا جو بیر سنگھ نے گنگ اینڈ کیلوے کے بابو سے بھدوڑ اور برنالہ کے درمیان بذریعہ ڈاک حاصل کیا۔ اتنے عرصہ تک یہ کبس میرا محل نا بھ کے اندر ہمارا جہ کے بیڈروم میں پڑا رہا۔ گدی سے دستبرداری اور ہمارا جہ کے نا بھ سے ڈیرہ دونوں روانہ ہونے سے چار روز پہلے ہمارا جہ نے یہ کبس ایک دوسرے نفر بھان سنگھ کو دیا۔ اور کہا۔ کہ اس کبس کو یہی حالت میں کی دریا۔ کنوئیں یا کسی ایسی جگہ پھینک دو۔ جہاں سے یہ واپس چھل نہ ہو سکے۔ صدمہ دے گا باعث ہمارا جہ کے دماغ کا توازن اس وقت قائم نہ رہا تھا۔ بھان سنگھ نے ہمارا جہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ کبس ہمارا جہ سے لے لیا۔ اور یہ اُسے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ بھان سنگھ چھوٹی حیثیت کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے کوارٹر کے اندر ہی اس کبس کے کمانے کو توڑا۔ تاکہ دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے جو ہمارا جہ ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ کبس کو کھولنے کے بعد اس نے دیکھا کہ قیمتی جیولری ہے۔ اس نے سمجھا کہ ہمارا جہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو ہمارا فی کی جیولری کا کبس ضائع کرنے کے لئے اس نے دے دیا۔ اور ہمارا جہ کا حکم جس کی تعمیل سے انکار کرنے کی دزدان میں بھی جرات نہ تھی۔ یہ بچاؤ انھوں نے دیکر حکم کی تعمیل نہ کرتا۔ اور قیمتی جیولری کا کبس۔ اس کا دل نہ چاہا۔ کہ اس کو ضائع کرے۔ لہذا اس کسٹیشن کے بعد اس نے سولے کی چوڑیوں اور سونے کے دوسرے سامان کو الگ کیا۔ اور گھڑیوں اور ہیروں و موتیوں کے جڑاؤ سامان کو الگ۔ اس نے سونے کے تمام سامان کو ہمارا مادہ چور چور کیا۔ اور ہیرا محل سے دور فاصلہ پر ایک کنوئیں میں پھینکا۔ قیمتی گھڑیوں اور جڑاؤ سامان کو اس نے پھر اس کبس میں بند کیا۔ اور اس کبس کو کسی پوشیدہ مقام پر زمین کے اندر دفن کر دیا۔ اور ہیرے ایک انگر ٹھی جس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔

نا بھ میں ایک صاحب سٹر شامی واس کپور جیولر تھے۔ بہت ملنسار با اخلاق اور شریفانہ کی دکان پر آٹھ دس کرسیاں پڑی رہتیں۔ اور ریاست کے افسر اکثر ان کے ہاں آتے یہ لالہ شام جی اس ہمارا جہ کے طلبہ کرتے تھے۔ بھی جیولری کی خرید کے وقت اکثر ہیرا محل جاتے۔ اور تمام اہلکاران کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ ہمارا جہ کی دستبرداری کو غالباً ایک ہفتہ پہلے ہمارا جہ بھان سنگھ نے اپنے ہاتھ کی انگلی میں قیمتی انگلی پٹہ پہنے ہوئے لالہ شام جی واس کی دکان پر گیا۔ اور چھ دیرواں بیٹھا۔ لالہ شام جی واس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پانچ چھ ہزار روپیہ کی قیمتی ہیرے کی انگلی تھی ہے۔ مگر یہ بھان سنگھ سے کچھ کہنے کے ہمارا جہ کی دستبرداری کے بعد نا بھ کے ایڈمنسٹریٹر سٹر ڈگھوی تھے (یہ سٹر ڈگھوی بدیس ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا میں سرٹیری تھے) جب سٹر ڈگھوی سرگودھا میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ تو یہ وہاں کے ایک ایڈمنسٹریٹر ایلیس تھو رام پر بہت مہربان تھے۔ سٹر ڈگھوی جب نا بھ میں ایڈمنسٹریٹر تھے تو اس نے تھو رام کو بھی اپنے ساتھ نا بھ کے آئے۔ اور وہاں آپسے اس کو ایک مٹر جنرل پولیس مقرر کر دیا۔



یہی نتھورام بعد میں انگریزی علاقہ کے اندر سب انسپکٹر پولیس مقرر ہوئے۔ پھر مسٹر ادگلوئی کی کو مشن سے پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے مسٹر ادگلوئی جب دہلی میں آئے تو ان کو یہاں دہلی میں سی جی جیٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔ دہلی میں لالہ نتھورام رائے بہادر وادی۔ ای وغیرہ ہوئے۔ اور یہاں انھوں نے دار فناء اور قرضہ جنگ میں چلک سے مختلف طریقے استعمال کرتے ہوئے لاکھوں روپیہ گورنمنٹ کی امداد کے لئے حاصل کیا۔ لالہ نتھورام جب نا بھ میں انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے تو آپ وہاں اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لئے سرگودھا کے علاقہ سے ساٹھ ستر مسلمان کنٹیل بھرتی کر کے لے گئے۔ اس علاقہ کے لوگ فوج اور پولیس کے لئے مزدور تھے ہیں۔ اپنی جان اور اپنے منہ کی پروا کم کرتے ہیں۔ لالہ نتھورام کے نا بھ میں برسرِ اقتدار دیکھ کر آپ مسٹر ادگلوئی کے دست راست تھے (ہوئے) پر شہر کے لوگوں نے خوشامد کے طور پر آپ کے پاس جانا شروع کیا۔ ایک روز لالہ شام جی داس کپور جو بری بھی گئے۔ تو آپ نے لالہ نتھورام سے معزول ہمارا جہ کی شکایت کرنے ہوئے کہا کہ ہمارا جہ نے ریاست کو تباہ کر دیا۔ نگر لوگ دزدان پر حکومت کرتے تھے۔ چیلک تو بھوکے مرد ہی ہے۔ مگر نفر مال مال ہیں۔ چنانچہ آپ نے مثال دیتے ہوئے باتوں باتوں میں کہا کہ بھان سنگھ نفران کے ہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلی میں پانچ چھ ہزار روپیہ کی قیمتی انگوٹھی ہے۔ نہ معلوم ہمارا جہ نے اس کو یہ انعام دیں دیں یا اس نے ہمارا جہ کی چوری کی۔ بہر حال تین روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے نفر کے پاس پانچ چھ ہزار روپیہ کی میرے کی انگوٹھی کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ نا بھ میں ہمارا جہ کے وقت کیونکر چوروں کے کپڑے اور لالٹھوں کے گز تھے۔

لالہ نتھورام نے جب یہ واقعہ سنا تو انھوں نے ایک کنٹیل کو بھیجا کہ وہ بھان سنگھ نفر کے مکان پر جا کر آئے بلالائے۔ یہ کنٹیل بھان سنگھ کو لانے کے لئے گیا۔ تو بھان سنگھ اپنے پہلے اقتدار کو ابھی بھول نہ سکا تھا۔ نفروں سے دزدانک خوف کھاتے تھے۔ کہ کہیں یہ ہمارا جہ سے شکایت نہ کر دیا۔ بھان سنگھ نے کنٹیل سے کہا کہ جاؤ۔ جا کر دو نتھورام سے میں نہیں آتا۔ انسپکٹر جنرل پولیس کی حیثیت کیا ہے کہ وہ مجھے کنٹیل بھیج کر طلب کرے؟ کنٹیل نے اسی طرح آکر لالہ نتھورام سے کہا لالہ نتھورام نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سرگودھا کے جوانوں میں سے دو جوانوں کو بھیجا کہ بھان سنگھ کو لے آؤ۔ اگر وہ آئے سے انکار کرے۔ تو اسے وہاں ہی جوتے لگانا شروع کر دو۔ یہ لوگ گئے تو بھان سنگھ کو تھپڑ مار کر اور گردن سے پکڑ کر ساتھ لے آئے۔ جب بھان سنگھ لالہ نتھورام کے پاس پہنچا۔ لالہ نتھورام نے بغیر کچھ کہے۔ دریافت کیا کہ یہ آپ ہیں۔ حکم دیا کہ اس کو اٹھا دو۔ سرگودھا کے جوانوں نے بھان سنگھ کو اٹھا دیا۔ لالہ نتھورام کے حکم سے اس کے چوڑوں پر کفنش کاری شروع ہوئی اور سرگودھا کے جوانوں نے گن کر ایک سو چوتھے لگائے۔ بھان سنگھ چلا رہا تھا۔ مگر کفنش کاری جاری تھی۔ جب ایک سو کی گنتی ختم ہوئی۔ تو بھان سنگھ کو کھڑا کیا گیا۔ اور لالہ نتھورام نے کہا کہ اب بتاؤ تم نے آنے سے انکار کیوں کیا۔ اس کے بعد لالہ نتھورام نے پوچھا کہ وہ انگوٹھی کہاں ہے۔ جو تم نے ہمارا جہ کے ہاں سے چوری کی۔ اس گفتگو سے پہلے نہ لالہ نتھورام کو علم کہ یہ انگوٹھی لک اینڈ کمپلو کے مال میں سے ہے۔ نہ لالہ شام جی داس کپور کو کچھ پتہ کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی۔ بھان سنگھ کفنش کاری کے باعث خوف زدہ تھا۔ اس نے انگوٹھی بھی اپنے گھر سے منگادی۔ اور تمام کا تمام

واقعہ بتا دیا کہ ہمارا جہ نے اس کو کبیں دیا۔ وہ کبیں اس نے اپنے کو ارٹریس کھولا۔ اور سامان فلاں کنریں میں پھینکا ہے۔ بھان سنگھ کے بیان کے بعد کنریں کے اندر آدمی اتارے گئے۔ اور وہاں سے سامان نکھوایا گیا۔ تو لاکھ ہزار کا یہ خیال ہوا کہ شاید یہ سامان کنگ اینڈ کیلو سے کا ہو۔ چنانچہ کنگ اینڈ کیلو سے کو تار دیا گیا۔ سامان کی شناخت کے لئے وہاں سے باجوئی تشریف لائے انھوں نے سامان کو پہچانا تو سامان وہی تھا۔ جو بیر سنگھ نے ڈاکہ ڈال کر باجوئی سے لیا تھا۔ بھان سنگھ حالات میں بھیج دیا گیا۔ ایک طویل عرصہ تک بھان سنگھ حالات میں رہا۔ ہمارا جو چمک گدی سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اس لئے اس کبیں کے متعلق مزید کارروائی نہ کی گئی۔ جیولری کی قیمت جو غالباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ تھی۔ نا بھگہ کے سرکاری خزانہ سے بحکم ایڈمنسٹریٹر کنگ اینڈ کیلو سے کو ادا کر دی گئی۔

## ہندوستانی ہوٹل

اخبار ”ریاست“ کے جاری کرنے سے پہلے جب دہلی سے خواجہ حسن نظامی اور میں نے مشترکہ طور پر ایک روزانہ اخبار ”رعیت“ جاری کیا۔ تو اخبار جاری ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر میں کسی روز تک ٹفرن برج کے قریب ایک ہوٹل میں مقیم رہا۔ اس ہوٹل کے مالک ایک پنجابی کھتری تھے۔ اور ہوٹل میں بیس پچیس کمرے ہوں گے۔

میری زندگی کا یہ معمول رہا ہے کہ میں رات کو نو دس بجے کے قریب سو جاتا ہوں۔ علی الصباح چار بجے جاگ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر کام شروع کر دیتا ہوں۔ اور دس گیارہ بجے تک سکون اور تنہائی میں اپنا کام ختم کر لیتا ہوں اسی عادت کے مطابق اس ہوٹل میں بھی یہی پروگرام رہا۔ ایک روز تھکا ہوا ہوٹل میں آپس آیا۔ اور نو بجے رات کو کھانا کھا کر سو گیا۔ گیارہ بجے میں نے ساتھ والے کمرہ میں کچھ شور سنا۔ تو میری آنکھ کھل گئی۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ اور اس دروازہ میں بھی متعدد شیشے لگے ہوئے تھے یعنی اگر کوئی شخص آہستہ سے بات کرے تو وہ بھی سنائی دیتی تھی۔ میں نے جب غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ اس کمرہ میں ایک مرد اور ایک عورت ہے اور مرد نے شراب پی ہوئی ہے۔ یہ لوگ دہلی کی ”کرخن دار“ کلاس رجس کو پنجاب میں ہا جا کا جابا سیناؤں میں جا رہے والی کلاس کہتے ہیں (میں سے ہیں اور عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ شراب کے نشہ میں ہی شور مچا رہا ہے۔ اور بعض اوقات گندی گالیاں بھی دے جاتی ہیں۔ میں دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے کوشش کی کہ پھر سو جاؤں۔ مگر سونہ سکا۔ کیونکہ ان لوگوں کا شور جلدی تھا۔ آخر تنگ آ کر میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا اور ہوٹل کے دفتر کے کمرہ میں گیا۔ وہاں ایک گانڈس رہا تھا۔ اس کو جگایا۔ اس سے میجر کو بلانے کے لئے کہا۔ جو کہ ہوٹل کے ان کمروں میں سے ہی آخر کے کمروں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ میجر تشریف لائے۔ تو ان سے سب کی کیفیت بیان کی۔ اور کہا کہ ابھی کو تو الی ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع کرتا ہوں کہ تم ہوٹل میں عورتیں سپلائی کرتے ہو۔ میجر نے کہا کہ مسافر خود لے آیا ہوگا۔ چنانچہ میجر اس کمرہ میں گیا۔ اور مسافر کو آدازیں

دیں۔ مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ ہماری باتوں کو سن کر "کرخن دار" صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور صبح ہونے سے پہلے ہوٹل سے چلے گئے۔

میں معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ کوشش کیا کرتا ہوں۔ اور جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو جائے۔ ایک قسم کی جستجو ہی رہتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں غالباً آٹھ دس دن ہوٹل میں رہا۔ ہوٹل کے ملازموں کی معرفت میں نے ہوٹل کے تمام حالات معلوم کر لئے۔ تو پتہ چلا کہ ہوٹل کے انک کو ہوٹل کے کرایے سے زیادہ آمدنی دلائی کی ہے ہوٹل میں قیام کرنے والے لوگ خصوصاً پنجاب سے آئے ہائے حضرات) ہوٹل کے ملازموں کی معرفت عورتیں منگاتے ہیں۔ یہ ملازم ان بے وقوف مسافروں کو مزید اتار بنانے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ عورت غلام رائے بہادر کی بیٹی ہے۔ اور غلام خان بہادر کی نواسی ہیں اور اس کے شوہر گورنمنٹ ہند کے غلام بڑے دفتر میں ملازم ہیں وغیرہ۔ مگر اصل یہ عورتیں بہت ادنیٰ درجہ کی پہاڑی رہنے والی ہندو یا دہلی کی آتشک اور سوزاگ زدہ مسلمان عورتیں ہوتی ہیں جو ہوٹل میں قیام کرنے والے عیاش لوگوں کو زندگی بھر کے لئے خطرناک سریفکیٹ بھی دے دیتی ہیں۔

میں اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہاں سامان فروخت کرنے والے لوگ بھی آیا کرتے۔ کیونکہ مسافروں کے پاس یہ زیادہ قیمت پر اپنا سامان فروخت کر سکتے تھے۔ ایک روز میں دوپہر کے وقت کھانا کھا کر قلیلہ کر رہا تھا۔ نوکرہ کے دروازہ پر ایک شخص آیا۔ اس کے پاس چھبکلی کی قسم کے متعدد زندہ جاوڑ تھے اس نے کہا کہ "سانڈے کا تیل ہے۔ اگر چاہو۔ تو زندہ سانڈے میں سے ابھی تیل نکال کر دوں گا" میں نے اس سے پہلے کبھی سانڈے کو نہ دیکھا تھا اور نہ سانڈے کے تیل کی خصوصیات سے واقف تھا میں نے پوچھا کہ یہ سانڈے کا تیل کس کام آتا ہے اس نے میرے اس سوال کا جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

"سانڈے کا تیل نامردی کمزوری اور شستی کو دور کرتا ہے۔ یہ جانور جھگڑ میں مبتلا ہے ہم لوگ پکڑ کر لاتے ہیں۔ اور اس کا تیل نکالتے ہیں۔ یہ تیل دہلی سے دُور دُور جاتا ہے۔ آپ کی درجن میں سکھ تھا) قوم کے سردار سندرسنگھ بھیٹھ۔ سردار جو گیند سنگھ اور رائے بہادر بٹا سنگھ بھی متعدد بار ہم سے یہ تیل لے گئے۔ اور انھوں نے بار بار منگایا۔ آپ بھی لیجئے۔ بہت کام کی چیز ہے۔ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے"

اسی بہادر بٹا سنگھ سے تو میں واقف نہ تھا۔ مگر سردار سندرسنگھ بھیٹھ اور سردار سردار گیند سنگھ جو دوسرے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے) سے بل چکا تھا۔ اور ان دونوں بزرگوں کی نیکی۔ بلند کیرکٹر شرافت اور اخلاق کی بلندی سے واقف تھا۔ ان کا نام سانڈے کے تیل کی خصوصیات کے ساتھ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں جب غصہ کی حالت میں ہوں۔ تو گالیاں اور جسمانی سزا دینے کے لئے بھی بے قابو سا ہو جاتا ہوں۔ (یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ اور اسے بد اخلاقی بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا مجھے بعد میں ہمیشہ ہی اندس ہوتا ہے) میں نے اس شخص کو ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کیں۔ اور کہا کہ مکینہ کئے تو چند پیسوں کے لالچ میں نیک اور فرشتہ خصلت لوگوں کو رُسوا کرنا ہے۔ اور ان بچاؤں کا جرم صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ملک میں مشہور شخصیت ہیں۔ اور تمھارے جیسے کتے بھی ان کے نام سے واقف ہیں۔ میری گالیاں

سوکھیں کر اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا اور یہ بھیگی تلی کی طرح ہوٹل سے چلا گیا۔

اسی ہوٹل کے واقعے سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ بیس دہائی میں آیا۔ میرے ساتھ مانہہ (ریاست پٹیا) کے ٹھیکہ دار سردار بختا ورسنگھ بھی تھے (یہ صاحب غالباً آجکل راج پورہ (ریاست پٹیا) میں رہتے ہیں) لوگ ریڈیو سے سٹیشن کے قریب سرائے احمد پائی میں بیٹھے۔ دن بھر سیر کرتے اور سامان خریدنے میں مصروف رہتے۔ رات کو دس بجے کے قریب واپس سرائے میں پہنچے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ جب سوئے والے تھے تو سردار بختا ورسنگھ نے کہا کہ ان کو رات کے وقت دودھ پینے کی عادت ہے، دودھ پینے کے لئے بازار جا رہے ہیں۔

ابھی واپس آئے ہیں جب بختا ورسنگھ دودھ پینے کے لئے چلے گئے۔ تو مجھے اکیلا دیکھ کر سرائے کے ایک ملازم کی جرات ہوئی وہ آیا۔ اور اس نے کہا کہ "کوئی خدمت ہو۔ تو بتائیے" میں نے جواب دیا کہ ایک ٹاٹا پانی کا بھر کر گری پر رکھ دیجئے وہ پانی لے آیا۔ تو اس نے پھر کہا "کوئی اور خدمت ہو۔ تو بتائیے" جب

اس نے دوبارہ یہی کہا۔ تو مجھے خیال آیا کہ یہ جو اتنی خاطر خواہ جمع کر رہا ہے۔ اور بار بار پوچھتا ہے۔ یہ خلعت سے غافل نہیں۔ اور اس کی ہمدردی کی تہ میں کوئی اور بات ہے۔ میں نے پوچھا کیا خدمت؟ میں سمجھا نہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر کئی عورت کی ضرورت ہو تو لادوں۔ بڑے بڑے خان بہادروں اور راجہ بہادروں کی لڑکیاں لاسکتا ہوں۔ اس کی اس پیشکش کی سن کر مجھے شرارت سوچی میں نے جواب دیا۔

کہ میں تو اس کام سے نفرت کرتا ہوں! اور تھکا چلوں۔ اب سو جاؤں گا۔ میرے ساتھ جو سردار جی ہیں پٹیا کے رہنے والے بہت بڑے عیاش ہیں۔ یہ اس غصہ کے لئے ہی دہلی آئے ہیں۔ بازار سے ابھی واپس آ رہے

ہیں۔ ان سے پوچھ لو۔ اور ان کے لئے انتظام کر دو۔ میں یہ کہہ کر اور کوڑے لے کر وہ صری طرف ٹھٹھہ کر کے سو گیا۔ سردار بختا ورسنگھ مذہبی خیال کی شخصیت تھے۔ اس زمانہ میں سنگھ سبھا کی تحریکوں میں حصہ لیتے۔ اور دن میں

کئی کئی گھنٹہ جب جی صاحب جاپ صاحب اور وہ راس کا پٹا کرتے اور گوردوارہ ہر روز باقاعدہ جاتے۔ جب یہ واپس آئے۔ تو ہوٹل کے ملازم نے ان سے صاف الفاظ میں وہی کچھ کہا جو مجھے کہا تھا یہ سن کر سردار

بختا ورسنگھ کو بہت غصہ آیا۔ اور انھوں نے اس کو بہت گالیاں دیں۔ میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ تو سردار بختا ورسنگھ نے اپنے خیال میں (مجھے جگا کر اس سرائے کی دلائی پر توجہ دلائی۔ اور بتایا۔ کہ ملازم نے ان سے کیا

کہا میں نے اپنی منہی کو ضبط کرتے ہوئے کہا: "سردار صاحب دیہی کے ہوٹلوں والے اپنے ہی بد معاش ہیں۔ اور یہاں آئے والے بھی ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ ان پکاروں کو کیا حکم آپ دن رات پٹا کرتے ہیں۔ اور

گوردوارہ میں جاتے ہیں؟" اس کے بعد ہم سوئے۔ اور اگلے روز واپس مانہہ چلے گئے۔ ایک ریاست کی بیگم صاحبہ کا خط میرے پاس پہنچا۔ کہ وہ اپنی ریاست سے نمبر جابری ہیں میں لمبئی میں

ان سے ملوں۔ وہ اپنے حالات بیان کرنا چاہتی ہیں۔ یہ گالیاں قطعی راز میں رہے اور کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ اس خط کے لئے پریس مینی گیا۔ وہاں کرافٹ مارکیٹ کے قریب ایک بڑے ہندوستانی ہوٹل میں مقیم ہوا۔

ہوٹل میں پہنچنے کے بعد میں نے اس ذریعہ سے اس خاتون تک اطلاع پہنچائی، جو ذریعہ اس نے بتایا تھا۔ بیگم صاحبہ نے جواب میں کہا کہ وہ خود اس ہوٹل میں پہنچ جائیں گی۔ چنانچہ اگلے روز یہ خاتون اپنی مولز اس

موٹریں (اس زمانہ میں روز راتس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ میں ملتی تھی۔ اب تو یقیناً اس کی قیمت

ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے کم نہ ہوگی) ایکلی تشریف لائیں۔ کیونکہ وہ میری اور اپنی ملاقات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں۔ میں جس کمرہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا اور دوسرے کمروں کا برآمدہ ایک ہی تھا۔ جس طرح ہوٹلوں کے متعارف دیکھوں کا ایک ہی برآمدہ ہوتا ہے۔ جب یہ خاتون میرے کمرہ میں تشریف لے آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ دوسرے کمروں کے مسافر جب برآمدہ میں سے گزرتے ہیں۔ تو اس خاتون کو جس کا لباس بہت قیمتی تھا۔ اور جبے ہر حسین تھیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ اور بعض کچھتوں نے تو اسی طرح سے برآمدہ میں چکر لگانے شروع کر دیے جس طرح ”ہنسی ناند کش لوگ ریلوے پلیٹ فارم میں پر زمانہ ڈبوں کے سامنے ٹھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور گاڑی میں بیٹھی خواتین کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی۔ تو میں نے کمرہ کے سامنے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور پچھلے دروازے کھول دیئے۔ تاکہ یہ خاتون آفادہ لوگوں کی بری نظروں سے محفوظ رہیں۔ ہم ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب باتیں کرتے رہے۔ تو اس کے بعد یکم صاحبہ اپنی گاڑی میں واپس تشریف لے گئیں۔ جہاں کہ ان کے شوہر مقیم تھے۔ جب یہ خاتون چلی گئیں۔ تو نصف گھنٹہ کے بعد ہوٹل کا مہیرا چار روپیہ کا ایک بل لے آیا۔ میں حیران کہ یہ چار روپیہ کامل کیسا ہے۔ اس پر صرف چار روپیہ لکھا تھا۔ کسی شے کا نام نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ یہ بل کس چیز کا ہے۔ تو میرا نے بے تکلفی سے کہا کہ ”جو صاحبہ بانی جی کو بلائیں۔ چاہے وہ بانی جی کو خود لائیں۔ یا ہماری معرفت بلائیں۔ ہم چار روپیہ چارج کرتا ہے۔“ میں سمجھ گیا کہ یہ چار روپیہ دلالی کی فیس ہے۔ بل کو اور مہیرا کو لے کر میں ہوٹل کے منیجر کے کمرہ میں گیا۔ اور منیجر سے پوچھا کہ یہ چار روپیہ کامل کیسا ہے۔ منیجر نے مہیرا والے الفاظ دہرائے مجھے بہت افسوس آیا۔ دل چاہتا تھا کہ اس منیجر کا منہ پھیر دوں۔ مگر میں نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا ”تم نے بانی جی کو خود دیکھا۔“ منیجر نے کہا ”ہاں میں نے خود دیکھا۔“ میں نے کہا ”وہ موٹریں آتی تھیں۔“ منیجر نے جواب دیا ”ہاں سیاہ رنگ کی بہت خوبصورت اور بڑی موٹر تھی۔“ میں نے پھر سوال کیا ”اگر یہ بانی جی بد معاشی کے لئے آئیں۔ تو اس نے مجھ سے کتنے روپیہ لئے ہوں گے؟“ اس نے سر کھاتے اور کھسیانا صورت بنائے ہوئے کہا ”مجھے کیا علم۔ پچاس ساٹھ روپیہ تو لئے ہوں گے۔“ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ کیونکہ اور ذلیل شخص جو عورت ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی قیمتی ساڑھی پہنے پچاس ہزار روپیہ کی موٹر میں آئی۔ تمھارے خیال میں وہ بد معاشی کی غرض سے آئی ہوگی۔ اور تمھارے ہوٹل میں کسی شریف عورت کا آنا ممکن ہی نہیں۔ میں نے جب منیجر کو برا بھلا کہا تو وہ جہنت شرمندہ اور نادام ہوا۔ اور اس نے اپنی غلطی کی معافی چاہی۔

یہ چند واقعات ہندوستانی ہوٹلوں اور مسافروں کے متعلق ہیں۔ اور میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ ہندوستانی ہوٹلوں میں سوئیں سے پچاڑے ہوٹل بد چلنی اور بد معاشی کے اوتے ہیں۔ ان میں کھانا ہنایت رومی اور بد مزہ پکتا ہے۔ کیونکہ دلالی کی آمدنی کے مقابلہ پر یہ لوگ اچھا کھانا پکانے پر توجہ نہیں دیتے۔ ان کے محل فاسے گندے اور طامام لاپرواہ اور گستاخ۔ مگر ان کے مقابلہ پر انگریزی ہوٹلوں میں سے شاید ایک ہوٹل بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو عورتیں سپلائی کرنے کا کمینہ کام کرتا ہو۔ ان ہوٹلوں میں بھی بد چلنی ہوتی ہے۔ مگر وہاں جو شخص چاہے کسی عورت کو بطور دوست کے اپنے کمرے میں لاسکتا ہے۔ نہ ساتھ کے کمرے

اور کو کوئی دل چسپی نہ مالک ہو بل کو کوئی اعتراض نہ کسی کو آنے کا خیال نہ جانے کی فکر۔ فرش غسل خانے اور کمرے صاف۔ ملازم چپست اور فرمانبردار۔ اور کھانا لذیذ اور زود ہضم۔ چنانچہ میں اب کئی برس سے سوائے مجبوری کے کبھی کسی ہندوستانی ہو بل میں نہیں ٹھہرتا۔ اور اگر کسی ہندوستانی ہو بل میں کبھی ٹھہرنا ہوں۔ تو اس صورت میں جب کہ کسی انگریزی ہو بل میں جگہ نہ ملے۔

## مرحوم ہمارا جہ ناجبھ کی گرفتاری

مرحوم ہمارا جہ گورچرن سنگھ سالہ ۱۹۲۳ء میں اختیارات سے محروم کر دیئے گئے اور دستبرداری میں ہو کر شریط تھیں۔ ان کے مطابق ہمارا جہ دریائے جمناسے مغرب کی طرف یعنی پنجاب میں نہ جاسکتے تھے آپ کو ہزار تین ہمارا جہ کا خطاب اور توپوں کی سلامی کا حق دیا گیا تھا۔ اور آپ کے لئے پچیس ہزار روپیہ ماہوار یعنی تین لاکھ روپیہ سالانہ پنشن یا لالوئس مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ سالہ ۱۹۲۷ء میں الہ آباد کے مقام پر گرفتار کیے گئے۔ آپ کی گرفتاری کے حالات یہ ہیں۔

گورنمنٹ ہند کے پرنسپل ڈپٹی کمشنر نے ہمارا جہ کو الہ آباد میں گرفتار کرنے اور کوڈائی کنال (دراس) میں نظر بند کرنے کی وجہ کی بھی ظاہر کی جو بگڑا اصل اس کا سبب گورنمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ کاغذات میں اس گرفتاری اور آپ کے خطاب جمعین میں جانے اور لالوئس کم کرنے کی وجہ بتائی گئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ ہمارا جہ نے امرتسر کے ایک گورنمنٹ ہفتہ وار اخبار میں اپنے نام سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں ہمارا جہ پٹیل پر الزام لگایا تھا کہ ہمارا جہ پٹیل نے داسرائے کو خوش کرنے کے لئے کسی جنگل سے ایک شیر منگایا۔ یہ شیر پٹیل کے قریب چھوڑ دیا گیا۔ تاکہ داسرائے اس کا شکار کریں اور خوش ہوں۔ اور بشیر پٹیل کے قریب کی چٹک کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس مضمون کو ہمارا جہ پٹیل کے خلاف اخباری ہڑپا گنڈا قرار دیا گیا۔ اور ظاہر طور پر اس مضمون کی بنیاد دل پر ہی گرفتاری کوڈائی کنال میں نظر بندی کی ہمارا جہ تعمیر کی گئی۔

گورنمنٹ نے جب ہمارا جہ گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو یہ کام یوپی کے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس سسٹرپیل دیہ نہی سسٹرپیل ہیں۔ جولاہا اردن کی ٹرین کو بم کے ذریعہ اڑا دینے والی سازش کے مقدمہ کے انچارج تھے۔ اور دہلی میں اس مقدمہ کی پیردی کرتے رہے کے سپرد کیا گیا۔ گورنمنٹ نے پہلے فیصلہ کیا کہ ہمارا جہ کو ڈیرہ دون میں گرفتار کیا جائے۔ پھر یہ خیال بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہاں ہمارا جہ کی بیوی اور بچے تھے۔ تاکہ ایجنٹ ٹین نہ ہو۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ آپ کو اس وقت گرفتار کیا جائے جب آپ ڈیرہ دون سے باہر ہوں۔ چنانچہ ہمارا جہ دہلی آئے۔ آپ کے اس سفر کا مقصد داسرائے سے ملنا تھا۔ آپ یہاں سوس ہو بل میں مقیم ہوئے۔ تو آپ کی گرفتاری کا مکمل انتظام کر دیا گیا۔ ہو بل کے ارد گرد کئی درجن سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ منڈلاتے رہے۔ اور ویلوے سٹیشن پر کمانڈر انچیف کی سپیشل آپ کو لے جانے کے لئے تیار رکھی گئی تھی کہ گورنمنٹ کو علم ہوا کہ آپ قانونی

مشورہ کے لئے الہ آباد جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی دہلی میں گرفتاری کا ارادہ بھی بدل دیا گیا۔ اور یہ انتظار کیا جائے لگا کہ آپ الہ آباد جائیں۔ اور وہاں گرفتاری ہو۔ تاکہ دہلی میں بھی ایجنٹین پیدا نہ ہو۔ جہاں اسمبلی اور کونسل آف منسٹرز کا مرکز تھا۔ ہمارا جہ دہلی سے الہ آباد کے لئے روانہ ہوتا تھا۔ تو اس گاڑی کے بعد جو گاڑی الہ آباد کو جاتی تھی۔ اس میں مسٹر پیل، مسٹر اداکانڈی، انسپکٹر جنرل پولیس سی۔ آئی۔ ڈی۔ یو پی اور سردار بہادر کشن سنگھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ متعدد اور افسر بھی تھے۔ یہ لوگ ہمارا جہ کے پیچھے پیچھے الہ آباد پہنچے اور کمانڈر انچیف کی سپیشل کمرے کے لئے الہ آباد کے قریب ایک ریلوے سٹیشن فتح پور سہوہ بھیرے کا انتظام کیا گیا تاکہ الہ آباد میں اس گرفتاری کا شبہ یا علم نہ ہو۔

ہمارا جہ ناچھ دور الہ آباد کے ایک ہوٹل میں مقیم رہے۔ سردار بہادر کشن سنگھ ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں بٹھیرے اور انتظار کیا جانے لگا کہ ہمارا جہ کب الہ آباد سے روانہ ہوں اور ریلوے سٹیشن پر یا راستہ میں آپ کی گرفتاری کی جائے۔ ہمارا جہ کے الہ آباد میں قیام کے دور روز بعد دہلی جانے والی گاڑی میں جگہ ریزرو ہو چکی تھی۔ اور رات کو دس بجے ہمارا جہ کے سیکرٹری (مسٹر بھارگر) اور ملازم سامان کے کر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ اور سردار بہادر کشن سنگھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ریلوے سٹیشن سے ان افسروں کو اطلاع دیتے رہے۔ چنانچہ دس بجے سردار بہادر نے سامان پہنچنے کی اطلاع ان افسروں کو کلب میں دی۔ جہاں کہ یہ موجود تھے۔ یہ افسر یعنی مسٹر اداکانڈی، انسپکٹر جنرل پولیس، مسٹر پیل سپرنٹنڈنٹ پولیس، مسٹر بیرس سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسٹر اجرس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ ساتھ کے قریب انسپکٹر سب انسپکٹر ہیڈ کنسٹیبل اور کنسٹیبل ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہمارا جہ موٹر میں ساڑھے دس بجے ریلوے سٹیشن پہنچے۔ اور آپ ریلوے پلیٹ فارم پر جب پیل کے پاس اکھڑے تھے۔ تو یہ افسر آپ کے پاس آئے۔ اور مسٹر اداکانڈی نے ہمارا جہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”آپ کو تین بجے گورنمنٹ ہند گرفتار کرنا ہوں“ ان افسروں کا خیال تھا کہ شاید ہمارا جہ اس خبر کو سن کر تشدد استعمال کریں۔ یا خود کشی کی کوشش کی جائے۔ اس لئے یہ لوگ بہت محتاط تھے۔ ہمارا جہ نے پوچھا کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ تو اس کے جواب میں مسٹر اداکانڈی نے کہا: ”یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو علم ہے۔ ہمیں صرف آپ کی گرفتاری کا حکم ہے۔“ اس حکم کو سننے کے بعد یہ افسر ہمارا جہ کو ساتھ لے کر واپس کلب میں آئے۔ اس وقت ہمارا جہ کے ملازموں سے سب نے ہمارا جہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ صرف ایک نوجوان کنسٹیبل کے آپ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔ ہمارا جہ کو کلب کے ایک کمرہ میں پہرہ کے اندر بٹھا دیا گیا۔ اور دوسرے کمرہ میں مشورہ ہوا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ مسٹر اداکانڈی نے کہا کہ ہمارا جہ اور پولیس ایک لارے میں فتح پور سہوہ بھیرے کے ہوٹل میں بند کر دیا جائے۔ اور پھر صبح کو ڈائی کنال دھراس کے لئے روانہ ہوگی۔ اس پر سردار بہادر کشن سنگھ نے کہا کہ یہ بہت بڑا غلط قدم ہوگا۔ ہمارا جہ کی پوزیشن ایک رولنگ پرنس کی تھی اور آپ اس کے ریگولیشن کے مطابق نظر بند کئے جا رہے ہیں۔ کوئی بات بھی ہمارا جہ کی شان کے خلاف ہوئی۔ تو گورنمنٹ اس پر اعتراض کرے گی۔ اور ایجنٹین پیدا ہوگی۔

چنانچہ مشورہ کے بعد مسٹر راجس اور سردار بہادر کشن سنگھ سٹیشن ماسٹر الہ آباد کے پاس پہنچے اُس سے ایک فنڈ کلاس کپارٹمنٹ کا انتظام کیا گیا۔ یہ کپارٹمنٹ فتح پور ہسودہ جانے والی مال گاڑی کے ساتھ لگانے کا انتظام کیا گیا۔ ہمارا رجسٹر انسرڈ کے ریلوے سٹیشن آئے اور ہمارا رجسٹر اس میں بٹھا کر یہ کپارٹمنٹ مال گاڑی کے ساتھ لگا دیا گیا۔ الہ آباد سے فتح پور ہسودہ ستر میل کے قریب ہے۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو چلتی گاڑی میں ہمارا رجسٹر کی تلاشی لی گئی۔ ہمارا رجسٹر اپنا مقصد خود ہی دے دیا۔ گاڑی فتح پور ہسودہ پہنچی وہاں کمانڈر انچیف کی اسپیشل انتظام میں کھڑی تھی۔ ہمارا رجسٹر اس میں بیٹھے۔ اور ہمارا رجسٹر کے ساتھ پولیس کے چھوٹے انسرڈ اور کنسٹیبلوں کے علاوہ مسٹر چیل اور سردار بہادر کشن سنگھ تو کوڈائی کنال تک گئے۔ باقی بڑے انسر یعنی مسٹر ادکارہ وغیرہ فتح پور ہسودہ سے واپس الہ آباد چلے گئے۔ فتح پور ہسودہ کے سٹیشن پر اس وقت پولیسکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک نوجوان انگریز انسر بھی دہلی سے پہنچ گیا تھا۔ جس نے ہمارا رجسٹر کو رٹمنٹ کا حکم دستی دیا۔ یہ سپیشل فتح پور ہسودہ سے کانپور۔ کانپور سے جھانسی جھانسی سے ممناڈ۔ ممناڈ سے ڈھونڈ اور ڈھونڈ سے مدراس گئی۔ کیونکہ اُس زمانہ میں گریڈنگنگ ایکسپریس والی لائن نہ تھی۔ یہ حالات ایڈیٹر "ریاست" کو مختلف ذرائع سے معلوم ہوئے۔ ہمارا رجسٹر نا بھنے کوڈائی کنال میں ایک واقعہ بیان کیا۔ جس کی سردار بہادر کشن سنگھ نے بھی تصدیق کی۔ ہمارا رجسٹر جب مدراس جا رہے تھے۔ تو راستہ میں سردار بہادر کشن سنگھ نے حکام کے اشارے پر ہمارا رجسٹر کی کڑہی کیفیت معلوم کرنے کے لئے یاد ایسے ہی باتوں باتوں میں یہ چھٹا آپ کی اس گرفتاری اور نظر بندی کے بعد ہمارا فی نا بھنے کپا پوزیشن اختیار کریں گی۔ وہ ڈیرہ دون میں رہیں گی۔ نا بھنے جا ہیں گی۔ یا آپ کے پاس کوڈائی کنال آئیں گی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے" ہمارا رجسٹر نے سردار بہادر کشن سنگھ کو جواب دہ یہ تھا:-

"سردار صاحب۔ میں اس سوال کا جواب تب دے سکتا تھا۔ اگر میری بیوی دیہات کے رہنے والے کسی جاٹ کی لڑکی اور غیر تعلیم یافتہ ہوتی۔ یا میری ماں زندہ ہوتی۔ تو میں بتاتا کہ میری ماں میری گرفتاری کے بعد کیا کرے گی۔ ہمارا فی ولایت کی تعلیم یافتہ ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ کیا کرے گی۔ اس کا جو دل چاہے گا کرے گی۔"

ہمارا رجسٹر نا بھنے لے آیا تو سردار بہادر کشن سنگھ کے اس سوال سے متاثر ہو کر یا دیسے احتیاط کے طور پر ہی مجھے اور سردار سردول سنگھ کو پیش کو اکسپریس تار دیئے۔ جن میں لکھا۔ کہ آپ میری بیوی اور بچوں کی ذمہ داری میں حفاظت کیجئے۔ یہ تار سردار بہادر کشن سنگھ کو بھیجئے کے لئے دیئے گئے۔ انھوں نے مسٹر چیل کو دکھا کر یہ تار ریلوے سٹیشن مینا کے تار گھر کو دیئے۔ ایڈیٹر "ریاست" کے نام کا تار چند گھنٹوں میں دہلی پہنچ گیا۔ اس تار کے مضمون کو نہ تو سردار بہادر کشن سنگھ سمجھ سکے۔ نہ مسٹر چیل۔ اس تار کا اصل مطلب یہ تھا کہ ہمارا فی نا بھنے اور بچے پولیسکل ڈیپارٹمنٹ اور ہمارا رجسٹر کے کوئی تعلق پیدا کر کے ان کے ہاتھوں میں ٹول ثابت نہ ہوں۔ محتاط رہو۔ میں تار کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ اور اسی شاہ کھڈیمہ دن روانہ ہو گیا۔ میں جب ڈیرہ دون میں ہمارا رجسٹر کی کو بھی اندر در ڈھونڈا۔ تو وہاں نقشہ بدلا ہوا پایا۔



سر جس فٹزر پٹرک ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔ میرے جانے سے پہلے وہ دلی عہد نامہ موجودہ ہمارا جہ اور خریطہ پیش کر چکے ہیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تم آج سے نا بھ کے حکمران اور ہمارا جہ ہو۔ ہمارا جہ کے لازم مستعدی اور تیزی سے سامان باندھنے میں مصروف ہیں۔ لکڑی کے کئی کبس تو سامان رکھ کر بند بھی کئے جا چکے ہیں۔ اور سر جس فٹزر پٹرک کے ساتھ نا بھہ جانے۔ دہاں شاہی داخلہ ہونے اور مستقل طور پر قیام کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد سردار سردول سنگھ بھی دہاں پہنچ گئے۔ ہم نے سوچا۔ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر ہمارا بی بی سے جب باتیں ہوئیں تو ہم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ شوہر کے گرفتار ہونے کے بعد آپ کا نا بھہ جانا۔ اور پٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں میں کھیلنا نہ صرف غیر مناسب ہے۔ بلکہ آپ کی ذلت و رسوائی کا باعث بھی ہوگا۔ کیونکہ سکھوں میں ایچی ٹیشن ہوگی۔ اور جہاں لوگ ہمارا جہ کے حق میں ہوں گے۔ دہاں آپ کو اپنے شوہر کا غدار سمجھے ہوئے گا لیاں دی جائیں گی۔ ہمارے اس کہنے پر ہمارا بی بی کے خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ سامان کا نا بھنا بند کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد ہمارا بی بی پٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے زور دینے کے کئی برس تک نا بھہ نہ گئیں۔ اور نہ آپ نے بچوں کو نا بھہ بھیجا۔ ہاں یہ بھی سچ ہے۔ کہ آپ کو دوائی کمال اپنے شوہر کے پاس نہیں گئیں۔ بلکہ میاں بیوی کے تعلقات زیادہ لبیدہ ہونے چلے گئے۔

## مرہٹوں کا بڑھا پیسے میں جوش

مرحوم پروفیسر ابھینکار (فرگوسن لاکاچ پونا) انڈین سٹیشن پیپلز کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ اور آپ کا سٹیٹیشن لاکے اعتبار سے ہندوستان میں ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے میرے جب اُن سے دوستانہ تعلقات ہوئے تو آپ کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی۔ آپ اپنے عزیزوں کی طرح مجھ سے محبت کرتے۔ جب کبھی پنجاب یا دہلی آتے۔ تو دفتر ”ریاست“ میں ضرور نشر بیت لاتے۔ اور مختلف موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتیں اس عمر میں بھی آپ کے اندر جوانوں جیسا جوش و زندگی تھی۔ اور آپ صحیح معانی میں مرہٹہ تھے۔

مرحوم ہمارا بی بیالہ کے خلاف جب انڈین سٹیشن پیپلز کانفرنس نے ایچی ٹیشن جاری کی۔ اور بیالہ کے واقعات کے متعلق تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا۔ تو اس تحقیقاتی کمیشن کے ایک ممبر آپ بھی تھے۔ یہ تحقیقاتی کمیشن لوگوں کی شہادتیں لینے کے لئے لاہور پہنچا۔ چرائی انارکلی کی ایک بلڈنگ میں اس کمیشن کا اجلاس شروع ہوا۔ ریاست بیالہ کے سینکڑوں لوگ شہادتیں اور بیانات دینے کے لئے آئے۔ جن میں عورتیں بھی تھیں۔ اور ان لوگوں میں زیادہ تر مسکھ تھے۔ جن کی کمر میں اڑھائی اڑھائی فٹ کی لمبی کرپا میں لٹک رہی تھیں۔ جب شہادتیں ہو رہی تھیں تو کوئی شخص یہ بیان دیتا تھا کہ ہمارا بی بیالہ اس کی بیٹی کا اغوا کر کے لے گیا۔

کوئی یہ شہادت دیتا کہ اس کی بہن کو ہمارا جہ نے جبراً اپنے محلات میں رکھ چھوڑا ہے۔ کوئی کہتا کہ اس کی بیوی کے ساتھ ہمارا جہ نے زنا بالجبر کیا وغیرہ۔ جب یہ شہادتیں ہو رہی تھیں۔ تو ان شہادتوں کو سن کر پروفیسر ابھینکار کا چہرہ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا۔ آپ بار بار اٹھتے نہ کر سکے۔ اور آپ نے شہادت دینے والے

لوگوں کو مخا طلب کرتے ہوئے کہا:-

”ہمارا جہ پٹیار نے تو خیر وہ کچھ کیا جس کی کسی شریعت انسان سے توقع نہیں۔ مگر تم لوگوں جیسا کہینہ بہ غیرت اور بے جا بھی بین نے دنیا میں کوئی نہیں دیکھا۔ تم لوگوں کو کمر میں کرپائیں لٹکائے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ کہ تمہاری بہنیں۔ بیٹیاں اور بیویاں تمہارا جہ پٹیار نکال لے گیا۔ اور تم کرپائیں لٹکائے بے غیرتوں کی طرح زندہ بھر رہے ہو۔ تم سر کیوں نہیں جانتے۔ تمہارے جیسے جیالوگ اس دنیا میں کیوں موجود ہیں۔ اور تمہیں کرپائیں لٹکائے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔“

پروفیسر ابھینکار کے ان الفاظ سے کمرہ کے اندر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کرپائیں لٹکائے ہوئے سکھوں چہرے ندامت کے باعث پانی پانی ہو گئے۔ اور ہر شخص اس بہادر دمریہ کے الفاظ سے متاثر تھا۔ پروفیسر ابھینکار نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ کے مقدمہ پرنسپس پروفیکشن ایکٹ کی پیر ویک کے لئے چند بار ہوشنگ آباد بھی گئے۔ آپ ہمارا دفتر اور سی۔ پی میں بہت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتے تھے ہوشنگ آباد کے دکلائے آپ کو ایک ٹی پارٹی بھی دی۔ جس میں مقامی دکلا۔ مجسٹریٹ اور جج شامل ہوئے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے بہت کوشش کی کہ آپ فیس قبول کریں۔ مگر آپ نے ریلوے کرایہ تک نہ لیا۔

ہوشنگ آباد کا ایک دانتہ بھی بہت دلچسپ اور آپ کی غیرت و محبت اور سچائی کا مظہر ہے ہم ڈاک ہنگامہ میں مقیم تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ اور آپ کے ساتھ مسٹر بی۔ بی۔ توکلی۔ سردار بہادر بھنگوان سنگھ اور ہوشنگ آباد کے دوسرے مقامی دکلا مقدمہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ تو اخبار فر دخت کرنے والا لڑکا آٹ انڈیا ”کوئے گیا۔ پروفیسر ابھینکار نے ”ٹائمز آف انڈیا“ دیکھنا شروع کیا۔ تو ایک خبر پڑی۔ کہ مہانتہ گاندھی نے تمام کانگرس کمیٹیوں کو ایک سرکولر لیٹر بھیجا ہے۔ جس میں یہ تاکید کی گئی ہے۔ کہ کوئی کانگرس کمیٹی نیلا لگنی دیہ امریکین یا انگلش ذمہ خاتون کچھ عرصہ جہانگاندھی کے آشرم سید اگرام میں رہی۔ وہاں اس کو ناجائز مغلن دہلی کے ایک شخص سے جو وہاں مقیم تھا ہو گیا۔ اور جب جہانگاندھی نے اس خاتون سے باز پرس کی تو اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ کہ پستہ یا امداد نہ دے۔ پروفیسر ابھینکار نے جب اس خبر کو پڑا تو غصہ کے باعث آپ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ آپ کرسی پر بیٹھ نہ سکے۔ اور کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ہاتھوں پر اخبار تھا۔ آپ نے کھڑے ہو کر غصہ کی حالت میں کہا:-

”کس قدر ظلم ہے کہ ایک نوجوان لڑکی نے جذبات سے مجبور ہو کر ایک غلطی کر دی۔ تو اس کو نہ صرف آشرم سے نکال دیا گیا۔ بلکہ اب سرکولر بھیجا گیا ہے کہ اس کو کوئی شخص امداد یا پروفیکشن نہ دے۔ کیونکہ اس بچاری نے اپنے عشق و محبت کے جرم کا اقرار کر لیا۔ مگر اس فاحشہ لیڈرائی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جس نے اپنی جوانی میں ایک بھی پولیسیکل لیڈر نہ چھوڑا تھا۔ زندگی بھر بد چلن رہی۔ بد چلنی پھیلاتی رہی۔ اور سب لوگوں میں پردھان بنی پھرتی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بد چلنی کا کبھی اقرار نہیں کیا۔“

ہم لوگ پروفیسر ابھینکار کے الفاظ سن کر حیران بھی تھے۔ اور آپ کی سچائی و جرأت کی داد بھی دے رہے تھے۔

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرہٹے جو ایک مارشل یعنی فوجی خصوصیات کی قوم ہے لڑھاپے میں بھی کس قدر غیور۔ جو شیلے اور حق پسند ہیں۔ اور ایک سو سال کی غلامی کے بعد بھی ان کے اندر وہ حمیت موجود ہے۔ جو اڑھائی تین سو سال پہلے سیواجی مرہٹہ میں تھی۔

## وضع داریاں

مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دنیا میں جہاں اور درجنوں خدایاں تھیں۔ وہاں وضع داری کے اعتبار سے بھی وہ بہت ہی قابل احترام شخصیت تھے۔ جب کسی شہر میں جاتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے پرانے پٹنے والے دستوں کے ہاں نہ پہنچتے۔ اور اگر کسی وجہ سے نہ جاسکے تو خط لکھ کر معافی نہ چاہتے۔

قاضی صاحب مرحوم دہلی میں ہمیشہ سیپلی ہوٹل میں قیام کرتے۔ اور شاید اس ہوٹل کی نارت نہیں یہ واقعہ اپنی قلم کارا دعا واقعہ ہے کہ قاضی صاحب تین برس کے طویل عرصہ میں جب کبھی دہلی آتے تھے اس ہوٹل میں ہی مقیم ہوتے اور کسی بھی دوسرے ہوٹل میں نہ ٹھہرتے۔ اس ہوٹل کی مالکہ ایک انگریز خاتون تھیں۔ اس خاتون کے دلی میں بھی قاضی صاحب کے لئے بہت عزت تھی۔ اگر کمرے خالی نہ ہوں تو یہ خاتون داسرے کے کو تو کمرہ دینے سے انکار کر سکتی تھیں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ قاضی صاحب کو ان کے پہنچنے پر یہ کہہ سکیں کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر کبھی ہوٹل کا کوئی کمرہ خالی نہ ہوا۔ اور قاضی صاحب تشریف لے آئے۔ تو اس بیماری نے اپنا ذاتی کمرہ قاضی صاحب کے لئے خالی کر دیا۔ اور خود کسی سٹور روم وغیرہ میں ایک دو دن قیام کر لیا۔ مگر قاضی صاحب کو جواب نہ دیا۔ قاضی صاحب سے راقم الحروف نے کئی بار کہا کہ نئی دہلی میں امپیریل ہوٹل بہت اچھا ہوٹل ہے۔ اس کی دفعتا بہت اچھی ہے۔ اور موسائی کے اعتبار سے بھی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا مرکز ہے۔ وہاں ٹھہرا کیجئے۔ تو قاضی صاحب نے ہمیشہ ہی یہ جواب دیا کہ ”اتنے برس سے سیپلی ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ وضع داری اس میں ہی ہے کہ زندگی میں جب کبھی دہلی آؤں اس ہوٹل میں ہی ٹھہروں۔“

دہلی میں ایک حجام تھا۔ جس کا میں ذمہ بھول گیا ہوں۔ اس کو ”رائل باربر“ کہا جاتا تھا اس حجام نے درجنوں بادشاہوں۔ درجنوں داسروں۔ کمانڈر انچیفوں اور گورنروں اور البان ریاست کی حجامت بنائی۔ چنانچہ لاڈلوزن اور لارڈ کھز کے بعد کے تمام داسروں اور کمانڈر انچیفوں کے اس کے پاس سٹریٹیکٹ تھے انڈیاستان کے کنگ جیپ اندر اور امان اندر کے علاوہ بہت سے ممالک کے ان بادشاہوں کی بھی اس نے حجامت بنائی۔ جو ہندوستان میں آئے۔ اور یہاں داسرے ہو س میں بطور بہان مقیم ہوئے۔ اور جب چارج پنجم کا دور بار ہوا۔ تو یہ شخص بھی مہر کا ہی طور پر انگلستان میں مدعو کیا گیا۔ اور وہاں اس نے کنگ جارج پنجم کنگ ایڈورڈ (جو گدی سے دستبردار ہوئے) کی بھی حجامت بنائی۔ قاضی صاحب مرحوم جب

کبھی دہلی آتے۔ یہ حجام ان کی حجامت کے لئے ہر روز صبح پانچ بجے سیل ہوٹل میں پہنچ جاتا۔ قاضی صاحب اس کو حجامت کی اجرت پانچ روپیہ روزانہ دیتے۔ اور یہ شخص بھی منتظر رہتا۔ کہ قاضی صاحب کب تشریف لائیں۔ اور یہ سیل ہوٹل جسا ناشر وغرے۔ چنانچہ یہ حجام اگر کبھی راقم الحروف کو راستہ میں مل جاتا۔ تو خیریت پوچھنے کے بعد یہی سوال کرتا۔ کہ قاضی صاحب کب تشریف لارہے ہیں۔ ایک روز میں بھی قاضی صاحب سے ملنے کے لئے صبح پانچ بجے سیل ہوٹل گیا۔ قاضی صاحب سے ملنے کا بہترین وقت یہی تھا۔ کیونکہ سکون سے باتیں کر سکتے تھے۔ درنہ سورج نکلنے کے بعد تو ان سے ملنے داروں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ تو یہ حجام قاضی صاحب کی حجامت بنا رہا تھا۔ حجامت سے فارغ ہوا۔ تو قاضی صاحب نے اسے اپنے ملازم سے پانچ روپیہ دلوا دیئے۔ جب حجام پانچ روپیہ لے کر چلا گیا۔ اور قاضی صاحب ہاتھ منہ دھونے کے لئے غسل خانہ میں تھے تو قاضی صاحب کے ایک ملازم نے قاضی صاحب کی فضول خرچی کا شکوہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کہ دوسرے نانی تو دریا چار آنہ میں حجامت بناتے ہیں۔ یہ شخص قاضی صاحب سے ہر روز پانچ روپیہ لے جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس ملازم کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ تو میں مسکرا دیا۔ میرے مسکرانے پر قاضی صاحب نے پوچھا۔ کہ کیا بات ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ آپ کی فضول خرچی کا ذکر ہے۔ کہ دوسرے حجام تو دریا چار آنہ شیرو کا لیتے ہیں۔ آپ پانچ روپیہ دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا۔ ”سردار صاحب یہ شخص میں پچیس برس سے حجامت بنا رہا ہے۔ اب تک تو میں اس دھندلاری کو نبھاتے جا رہا ہوں۔ خدا کرے زندگی تک نبھائے چلا جاؤں۔ ہر شخص اپنی قسمت کا لیتا ہے۔ کون کسی کو دیتا ہے۔ اور کون کسی سے لیتا ہے۔ نہ معلوم خدا ان لوگوں کے لئے ہی مجھے دیتا ہو۔“

بھیا شیخ احسان الحق میرٹھ کی بھینا فیملی میں سے ہیں۔ یہ وہی فیملی ہے۔ جو یو۔ پی کے بہت بڑے رؤسا میں سے ہے۔ اور جس نے غدر شہداء کے بعد برٹش گورنمنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دے کر جامع مسجد دہلی واپس لی۔ بھینا احسان کی دھندلاری کے قصے بہت دلچسپ ہیں۔ اور اس دھندلاری کے باعث آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ دوستوں پر صرف کیا۔ بھینا ایک روز دفتر ریاست میں بیٹھے تھے۔ تو راقم الحروف نے دیکھا۔ کہ آپ کی ایک آنکھ میں سیاہی مائل رنگ کا ایک چھلکا پڑا ہے۔ یہ چھلکا تنگ ہے۔ اور آنکھ کی سورت ہے۔ ایڈیٹر ریاست نے فرمایا کہ بھیا اگر چھلکا پہننے کا ہی شوق ہے۔ تو اس چھلکے کو نکال دیجئے۔ اور اس سے بڑا چھلکا بازار سے خرید کر پہن لیجئے۔ تاکہ آنکھ کی تکلیف نہ ہو۔ بھینا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموش رہے۔ لیکن ان کی آنکھیں دُبڑا آئیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ آپ نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ جب زیادہ پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ”پچیس برس ہوئے برا سیر کی شکایت ہو گئی تھی۔ بیوی نے برا سیر کا یہ چھلکا کہیں سے منگوا کر اپنے ہاتھ سے پہنا دیا۔ اس کے دو چار برس بعد میری بیمار ہو گئیں۔ دماغ پر دیوانگی کا اثر ہے۔ پہچان بھی نہیں سکتیں۔ اور نہ کوئی بات کر سکتی ہیں اب اس چھلکے کو اتارنے کو جی نہیں چاہتا۔ محبت کے جذبات کے ساتھ بیوی نے پہنا دیا تھا۔ اسے جدا کرنا گوارا نہیں۔“ بھینا احسان نے یہ کہا۔ اور ان کی آنکھیں اور زیادہ دُبڑا آئیں۔

آج سے پچیس تیس یا چالیس برس پہلے تو عام لوگوں میں بھی وضع داری تھی۔ اور یہ اپنی بات کا پاس کرتے تھے۔ اب تو ہزار ہا لوگوں میں سے شاید ایک آدمی ایسا نکل آئے۔ جو اپنی وضع پر قائم ہو۔ اور جس کو اپنی زبان یا اپنے شعار کا خیال ہو۔ پندرہ برس کا عرصہ ہوا۔ دہلی کی ایک نامور طوائف کا تعلق یہاں سے ایک ہندو رئیس سے تھا۔ یہ رئیس زیور۔ کپڑا اور دوسرے تمام اخراجات کے علاوہ اس طوائف کو پانچ سو روپیہ ماہوار (جو آج کے دو ہزار روپیہ کے برابر سمجھنا چاہئے) دیتا تھا۔ اور یہ طوائف امیرانہ زندگی گزارتی تھی۔ اس طوائف نے اپنی عمر کے درمیانی حصہ میں ایک پردیس سے شادی کر لی اور اپنی زندگی کو قطعی بدل دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس طوائف نے اپنے نکاح کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ اس نے اپنا تمام زیور۔ کپڑا۔ اور دوسرا سامان حج کر کے ایک گاڑی میں رکھوایا۔ اور اس رئیس کے ہاں واپس پہنچ دیا۔ اور ساتھ کہلا بھیجا۔ کہ ”یہ تمام سامان آپ نے دیا تھا۔ اب میں نے اپنی زندگی بدل لی ہے۔ نہ اس سامان پر میرا کوئی حق ہے اور نہ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔“ یہ رئیس بہت فیاض اور فزا خد تھا۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ اس سامان کو یہ طوائف رکھ لے۔ تاکہ اس کی آئندہ زندگی میں اس کے یا اس کے شوہر و بچوں کے کام آئے۔ مگر اس طوائف نے انکار کر دیا۔ اور پھر کہلا بھیجا۔ کہ ”جس صورت میں میرا اب آپ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ یہ وضع داری کے خلاف ہے۔ میں آپ کے دیئے ہوئے سامان کو رکھوں یا استعمال کروں۔“

موری دروازہ کے ڈفرن برج کے بالکل قریب ایک صاحب لالہ رام چند رہتے تھے۔ یہ ڈی بزرگ تھے۔ جنھوں نے سنہ ۱۹۰۷ء کے دہلی دربار کے موقع پر دہلی میں سب سے پہلے موٹر منگائی تھی۔ اور اس موٹر کو دیکھنے کے لئے والیان ریاست تک آئے تھے۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں لالہ رام چند کے مرحوم سر اسرار حسن خاں (سابق ہوم منسٹر ریاست بھوپال) وزیر اعظم ریاست خیرپور سے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ اُس زمانہ سے مرحوم سر اسرار حسن خاں جب کبھی دہلی آتے تو لالہ رام چند راجی کے ہاں قیام کرتے۔ لالہ رام چند اور سر اسرار حسن خاں کا انتقال ہوئے بہت برس ہو گئے۔ سر اسرار حسن خاں جب تک زندہ رہے۔ لالہ رام چند کے ہاں اسی مکان میں قیام فرمایا کرتے۔ سر اسرار حسن خاں کے عروج کو دیکھ کر درجنوں اصحاب نے اپنی بڑی بڑی کوٹیاں پیش کیں۔ اور کوشش کی۔ کہ آپ ان کے ہاں قیام کریں۔ مگر آپ نے ہمیشہ ہی انکار کیا۔ اور ایک بار راقم الحروف سے کہا۔ ”دوستوں کی جھونپڑی میں بھی وہ ٹھٹھ ہے۔ جو بڑے بڑے محلات میں بھی میسر نہیں۔ اگر میں اس مکان میں قیام کرنا چھوڑ دوں۔ تو یہ میری وضع داری اور دوستی کے شعار کے خلاف ہے۔“

ان چند واقعات سے اندازہ کیجئے۔ کہ آج سے چوتھائی صدی پہلے کے لوگ بھی کتنے وضع دار اور بامروت تھے۔ اور اب ہماری حالت کیا ہے۔

## ریاستوں کی رعایا کا احساس کمتری

انگریزی ملاقہ کے رہنے والے لوگ جو کبھی ریاستوں میں نہیں گئے وہ ریاستوں کی رعایا کے احساس کمتری (جس کو دالیان ریاست و فاشادری قرار دیتے تھے) کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور ریاستوں کے لوگ دالیے ریاست کو دل سے چاہے کتنی نفرت کرتے اور مظالم سے نالاں تھے۔ مگر اس طواریف کی طرح جو کسی گندے میلے بدبودار اور سرسیدھ کو خوش کرنے کے لئے اپنے چہرہ پر فرضی مسکراہٹ لاتی ہوئی سیدھ صاحب سے اظہار محبت کرتی ہے۔ ریاستوں کی پبلک بھی اپنے حکمران کی دفاشادری کا مصنوعی طور پر دم بھرتی۔ اور احساس کمتری کا یہ اثر صرف دالیان ریاست کی اپنی رعایا پر ہی نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتے جو ریاستوں کی عارضی طور پر گمازمت اختیار کرتے۔

ایڈیٹر ”ریاست“ جب نابھہ میں ملازم ہوا۔ تو ملازمت سے پہلے وہ اپنے آپ کو بطور ایک اخبار نویس کے بہت ہی انڈیپنڈنٹ سمجھتا تھا۔ اور وہ ایسا کے تنگ کی پردانہ کرنے کا دم بھرتا تھا۔ مگر ریاست ”نا بھہ کی گمازمت اختیار کرنے کے بعد یہ آہستہ آہستہ خود داری سے محروم ہو گیا۔ خود داری کی جگہ احساس کمتری نے لے لی۔ ہمارا جہ نابھہ کو ممبر اسن الخطا اور ان دنوں سمجھا جانے لگا۔ اگر ہمارا جہ کبھی لینے کے لئے طلب کرتے۔ تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت بڑی عزت یا خطاب بخش دیا گیا اور اگر دوسرے لوگوں کو طلب کرنے کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ کو یاد نہ فرمایا جاتا۔ تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے بہت بڑی توہین کر دی ہے۔ اور یہ احساس کمتری جتنے کا ہی محدود نہ تھا۔ اس میں دہاں کا ہر مسٹر۔ ہر انسپکٹر۔ ہر اہلکار۔ ہر ملازم اور ہر باشندہ متنبلا تھا اور صرف احساس کمتری ہی نہیں بلکہ حالت یہ تھی۔ کہ اگر کسی سے ہمارا جہ خوش تو ان کی تمام رعایا اس سے خوش۔ اور اگر ہمارا جہ ناراض تو ان کی تمام رعایا اس کی دشمن چنانچہ یہ واقعہ ہے۔ کہ اگر میں کبھی ہمارا جہ سے لینے کے لئے میرا محل گیا۔ ہمارا جہ بہت خوش ہیں۔ اور بہت تپاک سے بیٹے۔ اور میں واپسی کے وقت اپنے گھر پہنچ آیا (میرا مکان ہیرا محل سے دو فرلانگ کے قریب ہوگا) تو راستہ میں لوگوں نے میرے پیدل آنے سے اعلا نہ کیا کہ ہمارا جہ ناراض ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ لوگ دیکھ کر سنہ پھیر لینے اور کوئی سلام نہ کرتا۔ اور اگر میں ہیرا محل کسی اپنے کام یا پرائیویٹ سیکرٹری سے لینے کے لئے جاتا۔ ہمارا جہ کو میرے دہاں لینے کا علم نہ بھی نہ ہوتا۔ واپسی کے وقت کوئی سرکاری موٹر اتفاق سے شہر کی طرف آ رہی ہوتی۔ اور میں اس موٹر میں اپنے مکان تک بیٹھ جاتا۔ تو لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ ہمارا جہ یہ صدمہ خوش ہیں جو موٹر میں واپس گھر بھیجا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ راستہ میں جو ملتا۔ جھک جھک کر اور مٹا مٹا کر (گویا کہ یہ بھی میرے لینے کا شکرا نہ ادا کر رہے ہیں) سلام کرتا۔ اس زمانہ میں ریاست نابھہ میں سوائے سرکاری موٹروں کے کسی شخص کے پاس موٹر نہ تھی۔ حالانکہ دہاں درجنوں جاگیردار موٹریں رکھ سکتے تھے۔ موٹروں کی عدم موجودگی کا باعث لوگوں کا یہ احساس کمتری تھا کہ اگر موٹر خرید لی گئی۔ تو سواری کے اعتبار سے یہ ہمارا جہ کی برابری اور مقابلہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو احساس کمتری کی حالت یہ تھی۔ کہ لوگ اس زمانہ میں گھوڑا

گاڑی رکھنا بھی کبیر خور اور سرکار کی برابری کرنا سمجھتے تھے۔

اُس زمانہ میں نا بھ میں دو پانچ تعلیم یافتہ اصحاب کا آپس میں ملنا بھی ایک متم کی سازش قرار دیا جاتا تھا۔ اور پبلک میں یہ احساس تھا کہ ہمارا جہ کی مشرک طبیعت لوگوں کا آپس میں ملنا گوارا نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر ایک تعلیم یافتہ شخص کسی دوسرے تعلیم یافتہ سے ملتا تو چروں کی طرح چھپ چھپ کر جس زمانہ میں ایڈیٹر ریاست "نا بھ" میں تھا۔ اُس زمانہ میں مسٹر ایس رنگا آیر جو پہلے اخبار لیڈر "الہ آباد" میں تھے اور بعد میں "رائز دیگی" جہلی کو ایڈیٹ کرتے رہے، ایک ہنگامی مسٹر جی پرشاد سوری جو ڈال اسٹنٹ سکریٹری تھے۔ اور مسٹر ہری رام سرکاری وکیل (جو بعد میں نا بھ میں جج ہائیکورٹ تھے) ایڈیٹر ریاست کے دوستوں میں سے تھے ہم چاروں شام کے وقت نا بھ سے دتین میل دور سیر کے لیے نکل جاتے۔ یہ وقت گپ بازی میں اچھا گزر جاتا۔ اور ہم ہمیشہ اُس مشرک پر جاتے۔ جہاں ہمارا جہ جانا پسند نہ کرتے تاکہ ہمارا جہ ہم چاروں کو ایک جگہ اکٹھے نہ دیکھ لیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ہم سیر کے لئے گئے۔ اور واپسی کے وقت حسب معمول کچھ اندھیرا سا ہو گیا۔ تو ہم نے دیکھا کہ ایک موٹر بہت تیز روشنی کے ساتھ اُسی مشرک پر آرہی ہے۔ ہمیں فرما احساس ہوا کہ یہ کار ہمارا جہ کی ہے۔ اور ہمارا جہ ہم چاروں کو اکٹھے سیر کرتے دیکھ کر ناخوش ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ مشرک سے ایک طرف دور چلے جائیں۔ تاکہ ہمارا جہ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ موٹر تیزی کے ساتھ آرہی تھی۔ ہم نے بھی مناسب ہی سمجھا کہ بھاگ کر مشرک سے دور فاصلہ پر چلے جائیں۔ تاریکی کافی تھی۔ ہم دوڑ رہے تھے۔ تاریکی میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوڑتے ہوئے مسٹر رنگا آیر ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ اور ان کے گھٹنوں کو بہت سخت چوٹ آئی۔ اتنے میں موٹر نکل گئی۔ مسٹر رنگا آیر تو تکلیف کے باعث سی سی کر رہے تھے اور ہم تینوں کے لئے اپنی ہنسی خدا کا ناشکل تھا۔ گو اس ہنسی میں ہمدردی کے جذبات بھی تھے۔ جب مسٹر رنگا آیر اپنے کپڑے جھاڑ کر کچھ لنگراتے ہوئے ہمارے ساتھ واپس آ رہے تھے۔ تو میں نے ان سے مذاقاً کہا "اُسے سخت میں تو اردو اخبارات کو ایڈیٹ کرتا رہا۔ اور اردو اخبارات کے لئے میدان تنگ ہے۔ اس لئے یہاں دھکے کھارہا ہوں۔ انگریزی کے اخبارات تو تنگ میں بہت کافی ہیں۔ تم نے یہاں آئے کی جھک کیوں ماری۔"

ہمارا جہ کی موٹر کے سلسلہ میں لوگوں کے لیے یہ بہت وقت تھی کہ اگر کوئی شخص موٹر کو دور سے دیکھ کر ہاتھ باندھے ہوئے ادب سے کھڑا نہ ہو۔ اور ہمارا جہ اُس موٹر کے اندر موجود ہوں۔ تو یہ ہمارا جہ کی بے ادبی اور توہین سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر ہمارا جہ کی موٹر کو آتے دیکھ کر وہ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور قریب آ کر معلوم ہوا کہ موٹر میں ہمارا جہ موجود نہیں ہیں۔ صرف ڈرائیور خالی کار کر لیے جا رہے ہیں۔ تو ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے کا ڈرائیور نے مذاق اڑایا۔ چنانچہ ایک بار رات کا وقت تھا۔ میں سیر سے واپس آ رہا تھا۔ ترسانے سے موٹر آگئی۔ میں بھی احساس کمتری کے باعث دوسروں کی طرح ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ جب موٹر قریب آئی۔ تو موٹر کھڑی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی تو ہمارا جہ کی ہے۔ مگر اُس میں انکی سینٹ پر ہمارا جہ کے پرائیویٹ بیک میٹری سردار پھارگر و دیال سنگھ بیٹھے ہیں۔ سردار

گور دیال سنگھ بہت اچھی طبیعت کی شخصیت تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کے خلص دوست تھے۔ آپ نے کار کے کھڑا ہونے پر بتایا کہ کار میں صرف وہ ہیں۔ ہمارا جہ نہیں ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ میرا ہاتھ اندھے کھڑا ہونا غلط فہمی کا باعث ہے۔ سردار گور دیال سنگھ کے اس ارشاد پر میں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:-

"ریاست نا بھ میں ہمارا جہ صاحب کو ٹھاکروں کی پوزیشن حاصل ہے اور ہمارا جہ کی موٹر کو ٹھاکر دوارہ کی۔ ٹھاکر دوارہ میں گھٹا کرنے ہوں۔ پھر بھی لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ٹھاکر دوارہ کو سجدہ کریں۔"

میرے یہ الفاظ سنکر سردار گور دیال سنگھ تہمتہ مار کر ہنس پڑے۔ اور پھر وہ سری باتیں شروع ہو گئیں احساس کمتری صرف نا بھ کے لوگوں میں ہی موجود نہ تھا۔ بلکہ اس دبا سے ہندوستان کی کوئی ریاست بھی خالی نہ تھی۔ اور احساس کمتری کی لعنت سے ریاستوں کو پاک کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دایا ریاست کا اقتدار و اثر ختم کر کے ریاستوں میں پبلک کی ذمہ دار حکومتیں قائم کی جائیں۔

## شہرت باعث راحت نہیں

جس طرح شادی نہ ہونے کی صورت میں انسان کے دل میں انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی شادی ہو اور جب شادی ہو جائے تو شادی ہونے کا اُسے بار بار اندوس ہوتا ہے۔ اس طرح ہی شہرت حاصل کرنے کی بھی کیفیت ہے۔ انسان جب تک شہرت حاصل نہ کرے۔ قدرتی طور پر اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں میں اُس کی شہرت ہو۔ اور لوگ اُس کو جانیں مگر لوگ جب اُسے جانتے ہوں اور اُس کی شہرت ہو جائے تو اسے وہ وہ کافوس ہوتا ہے کہ لوگ اُسے کیوں جانتے ہیں۔ اور وہ گناہی کی زندگی بسر کیوں نہیں کر رہا۔ کیونکہ پبلک میں شہرت ہونے کی صورت میں اُس کی زندگی کا ہر کام۔ ہر فعل اور ہر قول چاہے وہ گناہی پر ایمپیٹ اور نجی حیثیت رکھتا ہو۔ پبلک کی نظروں میں قابل تنقید قرار دیا جاتا ہے۔ اور شہرت نہ ہونے کی صورت میں چاہے انسان کئی بُرے سے برا فعل کرے۔ وہ قابل تعزیر نہیں سمجھا جاتا اخبارات کے دفاتر میں پبلک کی طرف سے جو خطوط آتے ہیں۔ وہ درائی کے اعتبار سے بہت کافی مواد کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا دھچکہ تو بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ جس میں مضامین یا نظمیں بھی والے اصحاب اپنے نام کے ساتھ خود ہی "عالی جناب" "مایہ ناز ادیب" "شاعر بے مثال" "خطیب ہن" "شاعر انقلاب" "جناب حضرت" اور "آفتاب سخن" وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ تاکہ یہ القابات اس طرح سے ہی شائع ہو جائیں۔ اور پبلک میں ان کو شہرت نصیب ہو۔ کیونکہ ان بچاروں کو علم نہیں کہ شہرت یا ہونے کی صورت میں انسان کے لیے کتنی بڑی مصیبت ہے۔ اور گناہی میں کتنی راحت اور آرام ہے۔ یہ درست ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو بھی پبلک میں آنے سے پہلے شہرت کی خواہش تھی۔ مگر یہاں ہے کہ اگر یہ خواہش تھی۔ تو یقیناً یہ بہت ہی محدود تھی اور راقم السطر نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے



تو یہ ہمیشہ ہی کوشش کی کہ یہ عام لوگوں کی نظروں سے دور رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ”ریاست“ کو پڑھنے اور اس کا اعتراف کرنے والوں کا حلقہ تو بہت کافی وسیع ہے۔ مگر ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملنے والوں کا حلقہ بہت ہی محدود ہے۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ اگر کبھی بازار میں جائے تو گنتی کے صرف چند لوگ ہونگے جن کو اس سے ملنے یا کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ اگست ۱۹۴۲ء میں ایڈیٹر ”ریاست“ جب کانگریس حضرات کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی جیل گیا۔ تو وہاں دہلی کے ساتھ کے قریب پولیٹیکل قیدیوں میں سے ”ریاست“ سے تو تمام ہی واقف تھے۔ مگر ایڈیٹر ”ریاست“ کو ذاتی طور پر جاننے والے شاید چار یا پانچ سے زیادہ اصحاب نہ تھے۔ اور یہی کیفیت ممکن جیل میں تھی۔ وہاں سچو سر کے قریب پولیٹیکل نظر بند تھے۔ مگر ایڈیٹر ”ریاست“ سے ذاتی طور پر واقف۔ شاید ایک اور جن سے زیادہ اصحاب نہ ہونگے۔ اور انہوں سے ہوا تھا۔ جب ان میں سے اکثر نے اصحاب اخلاص و محبت کا اظہار کرنے کے لیے ملنے آتے۔ کیونکہ تعلقات کو محدود رکھنے کی راہ کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ اور ذہنی اعتبار سے میرے لیے دہلی شہرت کا کافی باعث کوفت تھی۔ جو اس سے پہلے مجھے بطور ایک اخبار نویس کے حاصل ہو چکی تھی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ سنٹرل اسمبلی کے میرے ایک دوست کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ آپ اسمبلی کے سیشن کے لیے دہلی آئے اور یہاں کام کی زیادتی کے باعث ان کا جی تفریح اور گانا سننے کے لیے چاہا تو آپ شہرت کے باعث دہلی کی کسی طوائف کے ہاں جا نہ سکتے۔ اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ وہ کسی طوائف کو اپنے ہاں بلا سکیں (اب گورنمنٹ کی ہرمانی سے اچھی سے اچھی طوائف کا گانا ریڈیو پر گھر میں ہی سنا جاسکتا ہے) تو چارے لوگوں کی نظروں سے بچ کر میرے گھر آتے۔ اور وہاں اپنا گانا سننے کا ”ظہر“ پڑا کر آتے۔ ان کی اس جنگی تفریح کا ایک بار ذکر آیا۔ تو آپ نے ایڈیٹر ”ریاست“ سے کہا کہ ”نیرٹھ جا کر گانا سننا تو ننگی تفریح ہے۔ مگر اس صورت میں کہ یہ تفریح دہلی میں ہو۔ زیادہ ہنگامی ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہاں اکثر لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ لوگوں میں یہ چرچا ہوگی کہ میں ممبر اسمبلی ہونے ہوئے طوائفوں کے ہاں جاتا ہوں۔ حالانکہ میں زندہ کی میں کبھی بھی کسی طوائف کے ہاں بدچلنی کی نیت سے نہیں گیا۔ اور میری تفریح صرف موسیقی تک ہے۔“

مرد ہے۔ یعنی ان صاحب کے لیے ممبر اسمبلی ہونے کی شہرت و بال جان تھی۔ حالانکہ یہ شہرت ان لوگوں کے لیے باعث کوشش و رغبت ہے جو اسے حاصل نہیں کر سکے۔

ایک رانی صاحبہ نے شہرت کے سلسلہ میں راقم الحروف سے بہت دلچسپ بات کہی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں میں بے معنی باتیں کرنے کی بہت عادت ہے۔ اور جب ملیں۔ تو یہ سوال علم طور پر پوچھتی ہیں۔ ”تمہارے شوہر کیا کام کرتے ہیں۔“ ”تمہارے بچے کہاں ہیں؟“ ”خدا کے فضل سے تمہارے کتنے بچے ہیں؟“ تمہارے شوہر کیا تنخواہ پاتے ہیں؟“ وغیرہ۔ ان ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے اگر آپ یہ کہیں کہ آپ فلاں ریاست کی رانی ہیں۔ تو مزید سوالات کی وہ بوچھاڑ جو کئی ہفتوں تک ختم نہ ہو۔ چنانچہ آپ پچھلے چند برس سے اپنے شوہر کے متعلق تو صرف یہی جواب دے دیا کرتی ہیں کہ ”میرے بچے فوج میں ملازم ہیں۔ اور لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ کچھ ہتہ نہیں کرکب واپس آئیں۔“

اس خاتون نے کہیں مانا ہو۔ تو سیکنڈ کلاس میں سفر کرتی ہیں تاکہ لوگ ان کو رانی نہ سمجھیں۔ کیونکہ رانی ہونے کی شہرت بھی ان کے لیے کافی مصیبت کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔

ایڈیٹر "نیا سست" بھی جب سفر میں ہو۔ تو وہ کبھی یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے۔ اور اگر کوئی سوال کرے تو جواب بے اعتنائی کے ساتھ صرف یہ ہوتا ہے "میں گوجرانوالہ کے ضلع کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہوں" تاکہ ہم سفر فریڈ سوالات و دریافت کریں کیونکہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میرا اخبار "نیا سست" سے تعلق ہے۔ تو سوالات شروع ہو جائے ہیں "کیا پٹرانی تحقیقت مرگیا۔ یا زندہ ہے؟" "سبب بھاش بابو کب تک ظاہر ہو جائیں گے؟" "فلاں ہمارا جہ کی کتنی بیویاں ہیں؟" نظام دکن کے پاس کتنا روپیہ ہوگا؟" "مسٹر جناح انگریزوں سے ملے ہوئے تھے یا نہیں؟" وغیرہ۔ یہ لوگ اپنی مسالوات کو وسیع کرنے کے لئے صرف سوالات کرتا جانتے ہیں۔ یہ نہیں سوچ کر کہ تو اخبارات کے ایڈیٹروں کے ساتھ ہٹلر کی خط و کتابت ہے۔ نہ سبب بھاش چند برسوں میں کبھی ان سے بڑا وائریس بامست کرتے ہیں۔ نہ یہ نظام کے خزانہ کے خزانچی ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کی بیویوں کے شمار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام بے معنی سوالات صرف اس جرم میں کیے جاتے ہیں کہ اخبارات کی لوگوں میں شہرت ہے اور لوگ ایڈیٹروں کے نام سے واقف ہیں۔

اگر شہرت کے نتائج پر غور کیا جائے۔ تو شاید ہندوستان میں سب سے زیادہ مصیبت میں شخصیت چھٹا گا ندھی کی تھی۔ جن بچاروں کے پاس چرمیں گھٹنوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا۔ جو ان کا اپنا ذاتی گھنا جا سکے۔ اور جو اگر سفر اختیار کرتے۔ تو چلے یہ بچار ہوتے۔ اور ان کی زندگی ہی خطرہ میں کیوں نہ ہوتی یہ جو نہیں سکتا تھا کہ رات کے وقت بھی لوگ ان کے درشن کے لیے دیوے شیشیوں پر جمع نہ ہوتے۔ اور ان کا نیشہ جیٹنی جھوکران کے لیے وبال جان ثابت نہ ہوتے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شہرت انسان کے لیے باعث راحت اور سرمایہ اطمینان و مسرت ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ شہرت میں صرف اُس وقت تک ہی کشش ہے۔ جب تک کہ یہ حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب شہرت حاصل ہو جائے۔ تو انسان کو انوس ہوتا ہے۔ کہ لوگ اُس کو جانتے کیڑے ہیں۔ اور وہ گنگامی کی زندگی کیوں پس نہیں کر رہا۔ مگر یہ انوس لا حاصل ہوتا ہے۔ شہرت کا دارنا مٹانے سے کہاں ہے۔ اور اُس وقت تک تو اس کے منہ کا سوال ہی نہیں۔ جب تک کہ انسان پبلک لائف میں ہو۔ اور اُس کے دیئے گئے بیانات یا لکھے گئے مضامین پبلک میں آ رہے ہوں۔

## تجارتی ہتھکنڈے

روزانہ "رعیت" رجین نے اور خواجہ حسن نظامی نے دہلی سے جاری کیا تھا، نقصان کے باعث بند کر دیا گیا۔ تو میں دیوبند کے ایک بٹے لالہ اوگر سین کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ جہاں لالہ جی نے اوگر سین

ابنہ کمپنی کے نام سے آرٹھنٹ کا کاروبار جاری کیا۔ میں ان کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔ لارڈ اگر سین بخارتی ذہنیت کے بزرگ تھے۔ آپ نے ممبئی میں جب مسٹر کیلا بہت کثرت کے ساتھ فروخت ہوتے دیکھا تو آپ نے کیلا فروخت کرنے والوں سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ کہ یہ کیلا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کہاں اس کی مارکیٹ ہے۔ اور کہاں کہاں جاتا ہے۔ تاکہ اس کاروبار کو جاری کر سکیں۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ نے مجھے ممبئی سے کچھ فاصلہ پر بسین بھیجا۔ یہ بسین مغربی ہندوستان میں کیلے کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس علاقہ میں ہی مسٹر کیلا رجسٹرڈ ہے۔ یہی کیلا کہا جاتا ہے پیدا ہوتا ہے۔ اور تمام ہندوستان میں فروخت کے لئے جاتا ہے۔

میں بسین ریلوے سٹیشن پہنچا۔ وہاں سے ٹانگہ میں سوار ہو کر شہر گیا۔ جہاں کیلے کی مارکیٹ ہے۔ اس مارکیٹ میں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کیلے کی بھری ہوئی درجنوں گاڑیاں ہر روز غلی اور وسطی ہندوستان کو جاتی ہیں اور تمام کی تمام مارکیٹ پنجاب کے تین چار اصحاب کے ہاتھوں میں ہے۔ جو ایک ہی خاندان میں سے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص یہ کاروبار نہیں کرتا۔ اور ان اصحاب نے اس تجارت سے لاکھوں روپیہ پیدا کیئے ہیں۔

میں یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد مسیدھا ان پنجابیوں کی دوکان پر گیا۔ ان لوگوں نے مجھے پنجابی دیکھا تو بہت تپاک سے لے۔ چند منٹ دوکان پر بات چیت کرنے کے بعد اپنے گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا۔ پرچھا کہ بسین کس طرح آئے۔ میں نے جواب دیا کہ سنا تھا۔ یہاں کیلا کثرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب سے ممبئی آیا تھا۔ سیر کے لئے یہاں آگیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں پھر ان کے ساتھ ان کی دوکان پر واپس آگیا۔ اور باتیں شروع ہوئیں تو انھوں نے بتایا کہ یہ تمام ایک ہی خاندان سے ہیں۔ بیس برس سے بسین میں کاروبار کرتے ہیں۔ تمام مارکیٹ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب تک لاکھوں روپیہ پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے یہ بتانے کے بعد میں ان سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ کاروبار تمام کا تمام آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور کوئی گجراتی پارسی یا مہٹہ یہ کام نہیں کرتا۔ میرے اس سوال پر ان چاروں بھائیوں میں سے ایک نے بہت خسرے ساتھ اپنی ہوشیاری اور قابلیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:-

”ہم کسی بیوپاری کو یہاں قدم جمائے نہیں دیتے۔ اگر کوئی شخص یہاں کیلے کا کاروبار کرتا ہے۔ تو ہم مارکیٹ میں سے فوراً اگر ان پر خپر کیلا خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور لڑائی رنخ پر دوساد میں فروخت کرتے ہیں ہم دو چار ماہ میں دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ کا نقصان اٹھاتے ہیں اور وہ نیا بیوپاری بھی ہمارے ساتھ اتنا ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا بیوپاری اپنا دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ سرمایہ نقصان میں دے کر یہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ہم مارکیٹ میں قیمت بھر کم کر دیتے ہیں۔ اور جو نقصان ہوا اتنا وہ دو چار ماہ میں بھر چورا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے بیس برس سے ہم نے کسی کو موقع نہیں دیا۔ کہ وہ یہاں جم کر کاروبار کر سکے۔“

میں نے اس ملاقات میں ان سے باتوں باتوں میں تمام راز دریافت کر لئے کہ یہ کس منہ پر مال خریدتے ہیں۔ کس منہ پر دس سواڑ بھیجتے ہیں۔ ان کا مال کس کس جگہ جاتا ہے۔ اور ان کو ماہر کرتی آمدنی ہے۔ میں تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد بمبئی واپس پہنچا سیٹھ اور گرسین کو تمام حالات بتائے۔ سیٹھ صاحب یہ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان میں یہ ہمت نہ تھی یا وہ تجارتی اعتبار سے اس نقصان کو برداشت کرنا نہ چاہتے تھے۔ جو کیلے کے ان پنجابی سوداگروں کے تجارتی انتھکنڈوں کے مقابلہ میں ان کو برداشت کرنا پڑتا۔ چنانچہ سیٹھ اگر سین نے کیلے کا کاروبار کرنے کا ارادہ منسوختی کر دیا۔

اگر تجارتی دنیا پر غور کیا جائے۔ تو تجارت نام ہی منھنڈوں کا ہے۔ تجارتی رقیبوں کو گزانا۔ خود آگے بڑھنا۔ اور ایک روپیہ کے چار روپیہ بنانا۔ وغیرہ۔ یہ سب تنھنڈے۔ جھوٹ۔ فریب اور بے ایمانی۔ تجارتی اعتبار سے جائز اور ناقابلیت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس بدعت میں ہر تاجر مستلما ہے۔ جو انتہائی انصاف ناک ہے۔

## ہامتا گاندھی سے ملنے کی آرزو

اخبار ”ریاست“ کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ کہ ہامتا گاندھی نے مرحوم مولانا محمد علی کے مکان کو چہ چیلان دریا گنج پر اکیس روز کا فاقہ شروع کیا۔ اس فاقہ کے شروع ہونے سے چند روز پہلے اور فاقہ شروع ہونے کے بعد چند روز تک مرحوم مولانا۔ ہامتا جی کو سیر کے لیے شام کے وقت موٹر پر لے جاتے۔ مرحوم مولانا محمد علی ایڈیٹر ”ریاست“ پر بہت گرم فرماتے۔ اور نہ صرف آپ کے دل میں ”ریاست“ کی پالیسی کی قدر تھی۔ ذاتی اعتبار سے بھی وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے۔ جیسا کہ بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک روز جس دہلی دروازہ کی طرف سے (جہاں کہ میرا رہائشی مکان تھا) شہر کی طرف تبدیل آ رہا تھا۔ اور مولانا موٹر میں ہامتا جی کے ساتھ میرے لیے شہر کی طرف سے دہلی دروازہ کی طرف جا رہے تھے۔ مولانا نے جب مجھے دیکھا۔ تو آپ نے ڈرائیور کو اپنی موٹر کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ جب موٹر کھڑی ہوئی تو میں نے سمجھا۔ کہ شاید اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے گاڑی کھڑی کی گئی ہوگی۔ میں نے تو جہ نہیں دی۔ کیونکہ موٹر اپنی بائیں طرف کو جا رہی تھی۔ اور میں موٹر کے داہنی طرف پٹری پر تھا۔ گاڑی کھڑے ہوتے ہی مولانا نے مجھے آواز دی۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ مولانا نے مجھ سے بات کرنے کے لیے ہی گاڑی کھڑی کی ہے۔ میں تیز قدمی کے ساتھ موٹر کے قریب پہنچا۔ اور مولانا اور ہامتا جی کو سلام کیا۔ تو مولانا نے تعارف کراتے ہوئے ہامتا جی سے کہا۔ ”یہی دیوان سنگھ صاحب ایڈیٹر ”ریاست“ ہیں۔ جن کے تعلق میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔“ اس تعارف کے بعد ہامتا جی نے اپنے خاص گاندھیانہ انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”مولانا صاحب نے آپ کی اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف کی ہے۔ میں آپ سے بل کر بہت خوش ہوا۔ آپ اچھے ہیں؟“ میں نے اس کے جواب میں کہا۔ ”آپ کی ہر بات ہے۔“ اس واقعہ کے بعد آج تک مجھے ہامتا گاندھی سے ملنے یا ہیکلام میں نہ کبھی موقع نہیں ملا۔ اس لئے اور کنگرس کے دنوں

دو تین روز ہاتھ ماساج کر دیکھئے گا اتفاق ضرور ہوا  
اخبارات کے ایڈیٹر خبریں حاصل کرنے یا اپنے تعلقات کو بڑھانے کے لئے دوسرے عام لوگوں کے  
خاطر پر بہت مستعد ہوتے ہیں۔ اور بغیر ضرورت کے بھی ہر جگہ گھس جاتے ہیں۔ مگر راقم الحروف طبعا اور فطرتاً  
س کی قطعی طور پر ضد ہے۔ چنانچہ شاید یہ حیرانی کے ساتھ سنا جائے گا کہ میں مرکزی گورنمنٹ کے موجودہ  
نٹروں سے بھی صوائے دو تین کے کسی سے کبھی نہیں ملا۔

ہر سال دہلی میں میٹروں کے دو چار پروسیشن نکلتے ہیں۔ اور بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ میں کبھی کسی  
لے یا جلوس کو دیکھنے کے لئے نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ دہلی کا گروس کیٹی کا دفتر کہاں ہے۔ اور اگر میں  
بتا دوں کہ میں آخری بار دہلی میں سکھوں کے کسی گوردوارہ میں کب گیا۔ تو شاید اکالی میسرے سکھ نہ ہونے کا  
اجی صادر کر دیں۔ یہ سب کچھ اس لئے نہیں کہ میں طبقاتی تشکیب یا مفرد ہوں۔ تشکیب اور عذر کو تو میں کینیڈین  
ھتا ہوں۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ میں بغیر کام کے کسی شخص سے اپنا اور اسکا وقت ضائع کرنا مناسب  
ن سمجھتا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شامل آن لوگوں کو ہرنا چاہیے۔ جو زندہ باد کے نعرے لگانے والے ہوں۔  
رے لگو اگر خوش ہوں۔ اور گوردواروں یا عبادت گاہوں میں جاتے اور عبادت کرنے کے متعلق میرا نظریہ عام  
س سے بالکل مختلف ہے۔

بادو درشن کرنے اور درشن کرانے والوں سے طبعا اس قدر اختلاف کے کئی برس سے یہ آرزو تھی کہ  
ہاتھ ماساج کے قریب دو تین ہفتہ قیام کر دوں۔ ان کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کر دوں۔ اور اگر ممکن  
تو اپنے کبیر کیٹر کے لئے ان سے کچھ حاصل کر دوں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ حق و صداقت کے اعتبار سے موجودہ  
ٹوکیا پچھلے کئی سو برس میں بھی ہاتھ ماساج کا مذہبی جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔

راجو تانہ کے قومی درکر مسٹر رام نرائین جی چودھری کئی برس تک ہاتھ ماساج کا مذہبی کے پاس رہے۔ وہ سیدگرام  
م میں اکثر آتے جاتے اور کئی کئی ماہ قیام کرتے۔ چودھری صاحب ایڈیٹر "ریاست" کے گھرے دوستوں  
سے ہیں۔ آپ جب کبھی دہلی تشریف لاتے تو ایڈیٹر "ریاست" سے ملتے۔ تو جتنی دیر ایڈیٹر "ریاست" سے  
ہاتھ ماساج کا مذہبی کے کبیر کیٹر خصوصیات اور حالات کا ہی ذکر ہوتا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے مسٹر تانہ کے  
میں چودھری صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ جب چودھری صاحب سیدگرام آشرم میں موجود ہوں۔  
ایڈیٹر "ریاست" وہاں آئے۔ اور دو ہفتہ قیام کرے۔ چودھری صاحب نے اس خواہش کو شن کر  
ریدگی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ آپ ہاتھ ماساج کا مذہبی سے بل کر ناتج مقرر کریں گے۔ چودھری صاحب نے  
اگرام آشرم میں پہنچ کر ہاتھ ماساج کا مذہبی سے ذکر کیا۔ تو ہاتھ ماساج اور چودھری صاحب کے درمیان  
ایڈیٹر "ریاست" کے متعلق یہ بات چیت ہوئی۔

ہاتھ ماساج کا مذہبی :- یہ ایڈیٹر "ریاست" کیسا آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کئی راجوں اور نوابوں نے  
پرستارے چلائے مگر اس نے کبھی پرہیز نہیں کیا۔  
چودھری صاحب :- یہ بہت اچھا آدمی ہے۔ بڑا بے خوف۔ نڈر اور بہادر ہے۔ جو جی چاہتا ہے کرتا ہے۔  
پہو نہیں کرتا۔ اور سیٹی منیٹل سا آدمی ہے۔ اگر وہ یہاں آیا۔ اور اس کو یہ آشرم پسند آگیا۔ تو شاید یہ

یہیں سے اپنے دفتر کو خط لکھ دے کہ اخبار بند کر دو۔ ادب یہاں ہی بیٹھ کے لئے رہ جائے۔ دہلی واپس ہی نہ جائے۔

ہاتا گاندھی: ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہئے۔ آپ لکھتے بھیجئے کہ جگہ کی قلت ہے۔ نئی جگہ لیار ہو رہی ہے۔ دو ہفتہ میں لیار ہو جائے گی۔ اُس وقت آجائیں۔ تاکہ اُن کو رہائش کی تکلیف نہ ہو۔

رام نرائن جی چودھری نے مجھے خط لکھا کہ دو ہفتہ تک نئے کمرے لیار ہو جائیں گے۔ اُس وقت آجائے۔ ہاتا جی سے پوچھ لیا ہے۔ اب فوراً آنے کی صورت میں رہائش کی تکلیف ہوگی۔ میں نے چودھری صاحب کو اس خط کا جواب لکھا کہ آپ ہاتا جی سے عرض کیجئے کہ میں سید اگرام آشرم میں ایک بیکشور رگورگیا طالب علم کی حیثیت سے آؤں گا۔ میرے آرام کا کیا سوال ہے۔ میں نوکسی جھونپڑی کے برابرہ کو ہی شاہی محل سے کم نہ سمجھوں گا۔ یا میں رام نرائن جی کے کمرے میں ہی ایک کونہ میں بسترہ بچھا لوں گا۔ مجھے آرام و راحت کی کوئی پروا نہیں۔ میرے اس خط کے جواب میں چودھری صاحب کا پتھر خط آیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا۔ کہ میں ہفتہ تک سید اگرام آشرم میں پہنچ جاؤں۔ اور میں جب تنگ دہاں قیام کروں گا۔ چودھری صاحب بھی وہاں موجود رہیں گے۔

میں سید اگرام جانے کے لئے لیار ہو رہا تھا۔ اور دفتر کے انتظام کے لیے دفتر والوں کو ہدایتیں دے رہا تھا کہ میری روانگی سے تین روز پہلے نوٹوں کے مقدمہ میں میری گرفتاری ہوگئی۔ اور میں ضمانت نامہ منظور ہونے کے باعث جیل بھیج دیا گیا۔ اس مقدمہ میں دو سال سے زیادہ عرصہ تک مصروف رہا۔ اور سید اگرام آشرم نہ جاسکا۔ میری اس گرفتاری کے موقع پر بھی ہاتا گاندھی اور رام نرائن جی کے درمیان جو بات چیت ہوئی۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چودھری جی نے مجھے بتایا کہ ہاتا گاندھی نے میری گرفتاری کے ایک دو روز بعد "ٹائمز آف انڈیا" میں میری گرفتاری کی خبر پڑھی۔ اور اس خبر کو پڑھتے ہی آپ نے رام نرائن جی کو اُن کے کمرے سے طلب فرمایا۔ ہاتا جی اُس وقت جم پرالٹ کر رہے تھے۔ جب رام نرائن جی آئے تو ہاتا جی نے رام نرائن جی کو "ٹائمز آف انڈیا" کا پوچھ دیتے ہوئے کہا۔

"رام نرائن جی آپ نے یہ خبر پڑھی۔ آپ کے دوست دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" جلی نوٹوں کے مقدمہ میں گرفتار ہو گئے۔" رام نرائن جی نے اخبار کے اس خبر کو پڑھا۔ تو بڑھنے کے بعد مکتاتے ہوئے کہا۔

"یہ خلاف توقع نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ دیوان سنگھ سے دُنیا کے ہر کام کی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ کام چاہے کتنا ہی اچھا یا بُرا ہو۔ کیونکہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے۔"

رام نرائن جی کے ان الفاظ کو سن کر ہاتا جی نے کہا کہ

"ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہئے۔ مگر اب تو وہ اس مقدمہ کے باعث شاید نہ آسکیں۔"

ایڈیٹر "ریاست" اس وقت کے دسمبر میں نوٹوں کے مقدمہ میں رہا ہوا۔ اور جب کاروبار پر دو چار ماہ توجہ دی۔ اور دفتر کے حالات درست ہوئے۔ تو پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سید اگرام آشرم چلنا چاہیے۔ چنانچہ رام نرائن جی دہلی تشریف لائے تو پھر اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا۔ رام نرائن جی

اُس وقت ڈائری فارم کی ٹریننگ کے لیے سیدو اگرام آشرم سے بنگلور جانے والے تھے اور میں چاہتا تھا کہ سیدو اگرام آشرم میں چونکہ میں اجنبی ہوں گا۔ اس لیے میرا رام نراین جی کی موجودگی میں ہی جانا مناسب ہو گا۔ رام نراین جی نے ہمارا جی سے سیدو اگرام آشرم میں پہنچ کر پھر بات چیت کی کہ دیوان سنگھ کب وہاں آئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ رام نراین جی اگست ۱۹۷۲ کے شروع میں بنگلور سے واپس سیدو اگرام آشرم پہنچ جائیں گے۔ اور ہمارا گاندھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس سے فارغ ہو کر اگست کے دوسرے ہفتہ واپس سیدو اگرام آجائیں گے۔ میں اُس وقت سیدو اگرام پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں نے پھر تیاری شروع کی۔ تو اطلاع آئی کہ ہمارا جی ۸ اگست ۱۹۷۲ کو دوسرے تمام کانگریسی لیڈروں اور کارکنوں کے ساتھ بمبئی میں گرفتار کر لیے گئے۔ ہمارا جی کی اس گرفتاری سے مجھے بہت باہمی ہوئی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ وہ تین ہفتہ سیدو اگرام آشرم میں قلم لیں۔ آپ کی اس گرفتاری سے دس روز بعد یعنی ۱۸ اگست کو میں بھی گرفتار کر کے دہلی اور پنجاب کے کانگریسی حضرات کے ساتھ جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے ستمبر ۱۹۷۳ء کو رہا کیا گیا۔ تو سوال ذریعہ معاش اور آئندہ زندگی کے گزارنے کا تھا۔ چنانچہ ”ریاست“ جو میری نظر بندی کے زمانہ میں بند ہو چکا تھا۔ کو پھر جاری کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ ادھر ہمارا گاندھی نئی گورنمنٹ کے قیام اور ملک کے فسادات میں مصروف تھے۔ اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان کو کب فرصت ہو۔ اور مجھے میری دیرینہ خواہش کے پورا کرنے کا موقع ملے۔ مگر میرا یقین تھا کہ ہمارا گاندھی جیسی موجودہ دور کی مقدس ترین شخصیت کے پاس قیام اور وہاں سے کچھ حاصل کرنے کا اتفاق تب ہی ہو گا۔ جب ساروں کے اعتبار سے منت میں کسی بڑے ہاں پرش سے فائدہ حاصل کرنا لکھا ہو گا۔

## غلط فہمی سے بچنے کی ضرورت

رائے بہادر ڈاکٹر مسٹر اداس بھڑوا ایک ماہر چشم یا آئی سرجن کے جو شہرت تمام ہندوستان میں رکھتے ہیں۔ وہ تو ان کی طبی خدمات کے باعث ہے جو انھوں نے خدا کی مخلوق کی اپنی زندگی میں ادا کیں۔ مگر ذاتی کیرئیر کے اعتبار سے وہ اس سے بھی زیادہ عزت کے مستحق ہیں۔ اور اگر یہ بالحد نہ سمجھا جائے۔ اور میری ذاتی معلومات پر یقین کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر ہمارا نہیں ایک انتہائی بلند انسان تو ضرور سمجھے جانے چاہئیں۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی تمام زندگی میں سوائے اپنی جہی کے دنیا کی ہر عورت کو اپنی ماں۔ بہن یا بیٹی سمجھا۔ اور شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی منہ کے قریب تک نہ آنے دیا۔ اور اپنی تمام عمر گناہوں کے اعتبار سے نہ صرف خدا سے ڈرتے رہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ خدا سے قدم قدم پر بدلتے بھی رہے۔

میں سوچتا ہوں ان کے ماتحت کام کرتا تھا۔ اور دوکانیں، پتلیوں کے اور بیغلوں کے لئے ہندوستان کے علاوہ غیر محالک میں بھی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اور آنکھوں کے اور پیشی سیکھنے کے لیے بہت سے ڈاکٹروں کی ہندوستان کے دورے کرتے تھے۔ اور ان کی کئی روز قیام کرتے۔ اُس زمانہ میں جو ڈاکٹر وہاں

کام سیکھنے کے لئے آئے۔ اُن میں ایک بیڈی ڈاکٹر ہیرا دیوی بھی تھیں۔ میرا خیال ہے یہ خاتون بعد میں ریاست کپور تھلہ میں محاذ میں ہوئیں اور وہیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آجکل کہاں ہیں۔ بیڈی ڈاکٹر ہیرا دیوی عمر میر جوان۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح صاف ستھری اور خوش پوش تھیں۔ اور وہ موگا کے ہسپتال میں کئی روز تک ڈاکٹر صاحب سے آنکھوں کے آپریشن کا کام سیکھتی رہیں۔ یہ خاتون بینک اور اچھے گھرانہ کی تھیں۔ ان کا فیصام ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہی زنا نہ میں ہوا۔ جہاں کہ ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیوی رہا کرتیں اور مردانہ میں دوسرے مرد ڈاکٹر رہتے۔ جو کام سیکھنے کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر متھرا داس کی پہلی بیوی یعنی ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادہ کرنل تیرتھ رام آئی۔ ایم۔ ایس کی حقیقت والدہ بہت بینک خاتون تھیں۔ غیر معمولی شریف اور پرانے زمانہ کی اُن عورتوں میں سے۔ جو کسی مرد کی کسی غیر عورت کے ساتھ مسکراہٹ کو بھی برداشت نہ کر سکیں۔ اور کسی غیر عورت اور غیر مرد کا آپس میں بات کرنا (وہ بات چاہے سیاسیات۔ لٹریچر یا روحانیت کے متعلق ہی کیوں نہ ہو) بھی بد چلنی سمجھیں۔ ڈاکٹر ہیرا داس کا مسلسل کئی روز تک ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آپریشن کرنا۔ اور آپریشن سیکھنا۔ کئی کئی گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیماروں کو دیکھنا۔ اور ڈاکٹر صاحب کا اس خاتون کی سہولت کا خیال رکھنا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو بہت ناگوار گذرا۔ اور ڈاکٹر ہیرا دیوی کو وہاں قیام کرتے دیکھنا زیادہ عرصہ گزرنا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے دل میں شکوک پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور ان شکوک کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو یہ دہم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب اس خاتون سے شادی کرنے والے ہیں۔ اور شادی کی غرض سے ہی یہ خاتون اس گھر میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی منہ سے کچھ کہہ نہ سکتیں۔ کیونکہ اگر کچھ کہتیں تو اس الزام کے ثبوت میں اُن کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔ اور الزام کی بنیاد ہی غلط فہمی اور دہم پر قائم تھی اس غلط فہمی اور دہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے کھانا پھوڑ دیا۔ ہر وقت آؤ اس رہتیں۔ اور جب وہ سونے کے آنے کا خیال کر لیں تو اکثر رو پڑتیں۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میری والدہ کو جب اس غلط فہمی کا علم ہوا۔ اور میری والدہ نے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو سمجھایا کہ وہ دہم میں مبتلا نہیں ہو گھانا کھالیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے میری والدہ دھن کو ڈاکٹر صاحب اور اُن کی بیوی دونوں ہی اپنی ہمتیقی ماں کی طرح عزت کرتے تھے) سے کہا:-

”اُسی جی۔ میں کھانا کیا کھاؤں۔ مجھ سے تو میری تمام زندگی کے لئے روٹی چھینی جا رہی ہے۔ میں تو تباہ ہو جاؤں گی۔ اس سے تو میرا مر جانا ہی اچھا ہے مجھے۔ بچوں کا کیا ہو گا۔ اگر میرے شوہر نے دوسری شادی کر لی میں تو برباد ہو جاؤں گی“

میری والدہ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کے حالات اور فطرت سے ڈاکٹر صاحب کے بچپن سے ہی واقف تھیں۔ مگر یہ غلط فہمی رخنہ نہ ہو سکی۔ کیونکہ ایک عورت سب کچھ برداشت اور قربان کر سکتی ہے۔ مگر اُس کا اُس کے شوہر کی محبت سے محروم ہونا ممکن نہیں۔ چاہے محبت سے محروم ہونا غلط فہمی اور دہم کی بنیادوں پر ہی



کیوں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی اس غم میں ہی بیماریں مبتلا ہو گئیں۔ اور یہ بخار نمونیا کی صورت میں تبدیل ہوا۔

اس زمانہ نہ منسلکین ایجاد ہوئی تھی۔ نہ ایم بی ۱۹۳۲ء تھی۔ شوق کے بیماروں کی دوا صرف براہی اور معمولی ادویات تھیں۔ یہ نیک اور فرشتہ شخصیت خاتون مولیاں دو چار درجہ ستارہ کر انتقال کر گئیں۔ اور موت کی درہمیل دھڑکتی غلط فہمی تھی۔ چنانچہ برائیتیں تھیں کہ اگر اس خاتون کے اوصاف کا خیال کرتے ہوئے (اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ احساس ہے بنیاد ہے) غلط فہمی پیدا نہ ہوتے۔ جی جاتی تو یہ خاتون نوعمری میں اپنی زندگی سے محروم نہ ہوتیں۔ یہ حالات تو اس خاتون کے ہیں۔ جس کو میں آج تک بھول نہیں سکا۔ مگر ان کے صاحبزادہ تیرتھ رام یا بھوہ کے وہ آتش تو میرے لیے آئینہ زندگی میں شاید کبھی بھی قابلِ فراموش نہ ہونگے۔ جب کہ تیرتھ رام وہی آئے میرے دل میں مقیم تھے۔ ہم گم گمیں کے زمانہ میں چھت پر لیٹے ہوئے رات کو باتیں کر رہے تھے اور اوپر کے حالات، سببوں سے تیرتھ رام کی کوٹھالی سے تیرتھ رام اپنی ماں رجب تیرتھ رام کی ماں کا انتقال ہوا۔ تیرتھ رام کی عمر پانچ سال کی تھی۔ گویا کر کے رازدار ہونے لگ گئے۔ اور روتے روتے ان کی چٹکی بند ہو گئی۔

غلط فہمی سے بچنے کے سبب لڑیں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ میں ریاست میں لازم تھا۔ ہمارا ہا منصوری پہاڑ پر مقیم تھے۔ اور میں بھی وہاں تھا۔ مرحوم سردار بہادر گوردیال سنگھ بڑا یادگار سپریمیری سے ہر روز باتیں ہوا کرتے تھے۔ ایک دن منصوری کے پرنسپل پہاڑ کا ڈاکٹر آگیا۔ تو سرور صاحب نے کہا: ”اب منصوری کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور منصوری کی اکیلیت اجا پڑا ہے۔ مگر ان کی تو اس پہاڑ سے قیام سے تنگ آچکا ہوں۔ چار چار سال بھر میں نہ ماہ یہاں رہتے ہیں۔ یہ زمانہ ہم لوگوں کو تیری ان کے الگ رہنا پڑتا ہے۔ اور صرف تین ماہ جبکہ کہ سردی زیادہ ہوئی۔ چار ماہ تک نا بھجھ جاتے ہیں۔ اور سردی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔“

میں نے سرور صاحب سے کہا کہ ”منصوری میں ریاست نا بھجھ کی درجنوں کرٹیاں ہیں جو اکثر غلطی سے ہیں۔ آپ ان کو بھین میں سے ایک کو بھٹی لے کر اپنی بیوی اور خاتون کو یہاں رکھ دیا جائے۔ یا ان کو تیری بیوی سے آپ کوئی کو بھٹی بھیر کر کے لے کر اپنے سردار کو لیں۔ تو کوئی دوسری کو بھٹی گرا یہ بے گناہ ہیں۔ آپ کو نا بھیر بیوی بچوں کے کہیں تکلیف آتے ہیں۔“ میرے اس سوال پر سردار گوردیال سنگھ نے بوجھاب دیا۔ اور مجھے ”اب انگ یاد ہے۔ آپ نے کہا۔“

”سردار صاحب ہم لوگوں کو صرف نیک لڑنے کی ہی ضرورت نہیں۔ نیک ہونے سے ہوئے بھی غلط فہمی سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ اگر میں اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں منصوری سے لے کر دوں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ہمارا جیسی بیوی یا بیوی کی ضرورت کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی نہ دیکھیں گے۔ مگر اس غلط فہمی کا کیا علاج ہے۔ میرے بیوی بچوں کے یہاں آئے یہ ان کے لیے ناگوار ہیں۔ یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ ہمارا جیسی بیوی سے بھی کوئی تکلیف ہے۔ اور اس سے ہی بیوی بیوی ضرورت کی ہیں۔ نہ انہیں سے بچنے کے لیے اپنی بیوی بچوں کو کبھی صلہ کی ضرورت ہے۔“

اور پچھلے بیس برس سے اس طرح ہی تکلیف اٹھا رہا ہوں۔“  
 سردار گوردیال سنگھ جب تک زندہ رہے، پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لئے ہمیشہ اکیلے ہی  
 منصوبہ بندی کرتے۔ اور آپ کبھی اپنی بیوی کو دہاں نہ لے گئے۔ جہاں کہ ہمارا جہم ہوتا۔  
 اوپر کے ردائیات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان کو صرف نیک ہونے کی ضرورت ہی نہیں  
 بلکہ غلط فہمی سے اپنی ذات کو بچانے کے لئے بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہانا گاندھی جیسے  
 مقدس شخص بھی حبيب رات کو سوتے تھے تو پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لئے کبھی اکیلے نہیں سوتے تھے ان کی  
 چار پانی کے پاس متعدد دوسرے اصحاب کی چار پائیاں ہوتی تھیں تاکہ کسی شخص کو غلط بیانی اور غلط فہمی  
 کا موقع نہ دیا جائے۔

## جھوٹ بولنے کی فطرت

مجھے اپنی زندگی میں جھوٹ بولنے والے بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ مگر مرحوم ہمارا جہ  
 بھرت پور کا مقابلہ غالباً کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا تھا۔  
 مرحوم ہمارا جہ بھرت پور کو گدڑی سے علیحدہ کئے جانے کا مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش تھا۔ اصل  
 واقعہ تو یہ تھا کہ آپ پولیشیل ایجنٹوں کی پرواہ نہ کرتے تھے اور پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے تمام افسر آپ کے دوا  
 سے نالاں تھے۔ مگر آپ گدڑی سے علیحدہ اس جرم میں کئے جانے والے تھے کہ آپ کے ایک اے۔ ڈی۔ سی  
 نے بھرت پور کی ایک نرس کی عصمت دری کی۔ ایک پہاڑی طوائف جو ہمارا جہ کے پاس تھی کا قتل ہوا۔ اور  
 قتل میں ہمارا جہ کا ہاتھ تھا۔ اور ہمارا جہ کے زمانہ میں ریاست بھرت پور ساٹھ ستر لاکھ روپے کی مشروطی ہو گئی  
 نرس اور پہاڑی طوائف کا مسئلہ تو ابھی شروع ہی نہ ہوا تھا کہ پولیشیل ڈیپارٹمنٹ نے سب سے پہلے  
 ریاست بھرت پور کی مالی تباہی کے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف اس مسئلہ پر ہی خاموشی  
 کے ساتھ ہمارا جہ کو بے اختیار کیا جائے اور ہمارا جہ برائے نام گدڑی پر رہیں۔ چنانچہ پولیشیل سیکریٹری گورنٹ  
 ہند اور ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے ہاں سے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں مطالبہ کیا گیا  
 کہ چونکہ ریاست کی مالی حالت تباہی تک پہنچ چکی ہے۔ اس ریاست کی ایڈمنسٹریشن پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے  
 ہاتھوں میں دیدی جائے۔

اس زمانہ میں بھرت پور میں وزیر اعظم راجو بہادر جہ دہری لال چند تھے۔ (جو بعد میں پنجاب میں منسٹ  
 رہے) جو دہری لال چند ہمارا جہ کے دیانت دار اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ اور آپ کا اس  
 زمانہ کے پولیشیل سیکریٹری گورنمنٹ ہند سر جان تھا مین پر بھی بہت اثر تھا۔ جو دہری لال چند جانتے تھے  
 کہ جس صورت میں بھی ممکن ہو ہمارا جہ بے اختیار نہ ہوں۔ اور ان کے اور پولیشیل ڈیپارٹمنٹ کے تعلقات  
 خوشگوار ہو جائیں۔ چنانچہ جو دہری صاحب نے ہمارا جہ سے مشورہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ سر جان تھا مین کو  
 بھرت پور آنے کی دعوت دی جائے۔ اور یہاں بات چیت کر کے سر جان کو مطمئن کیا جائے۔

سرجان تھا مین کر چودہری صاحب نے بھر تہہ آنے اور وہاں شکار کھیلنے کی دعوت دی۔ سرجان چودہری لال چند کے گھر سے دوستوں میں سے تھے۔ اگر ہمارا جہ لکھتے تو شاید سرجان انکار کر دیتے۔ مگر آپ کے دل میں چودہری صاحب کے لئے بہت عزت اور قدر تھی۔ آپ نے اس دعوت کو منظور کر لیا۔ اور آپ نارنج مقرزہ پر بھرت پور پہنچ گئے۔

سرجان تھا مین جب بھرت پور پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر ہمارا جہ اور چودہری لال چند نے آپ کا استقبال کیا۔ اور تینوں اصحاب ایک کار میں ریاست بھرت پور کے مقام ڈیگ کو روانہ ہوئے۔

ڈیگ بھرت پور سے غالباً سولہ یا بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اور یہ بہت اچھی شکار گاہ ہے۔ اس کار کو ہمارا جہ بھر تہہ خود چلا رہے تھے۔ ان کے بائیں طرف انکی سیٹ پر سرجان تھا مین تھے اور بکھلی سیٹ پر چودہری لال چند۔ کار چل رہی تھی تو ہمارا جہ نے سرجان تھا مین کے ساتھ بائیں شروع کیں۔ باتوں باتوں میں ہمارا جہ نے سرجان سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”بعض لوگ مجھ پر فضول خرچی کا اور مفروضہ ہرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ مگر لوگوں کو علم نہیں کہ میرے پاس ایک پوشیدہ خزانہ ہے۔ اور اس خزانے میں ساٹھ لاکھ روپیہ نقد چاندی کا موجود ہے۔ میں یہ پوشیدہ خزانہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بار چودہری لال چند کو دکھایا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس خزانہ سے بہت دور ایک مقام پر چودہری لال چند کی آنکھیں باندھ دی گئیں تاکہ ان کو کچھ نظر نہ آ سکے۔ میرے مستند آدمیوں نے چودہری صاحب کو اُٹھالیا۔ اور یہ اس خزانہ کے اندر لے گئے۔ خزانہ کے اندر لے جا کر چودہری صاحب کی آنکھیں کھول دی گئیں۔ اور چودہری صاحب سے کہا گیا کہ آپ چاندی کے روپیہ کی ان پٹیلیوں کو گن لیجئے چودہری لال چند نے ان تمام پٹیلیوں کو گنا۔ تو یہ ساٹھ لاکھ روپیہ تھا۔ ہم نے چودہری صاحب کی آنکھیں پھر باندھ دیں۔ اور میرے آدمی چودہری صاحب کو اُٹھا کر خزانہ سے باہر اس مقام پر لے گئے جہاں سے کہ چودہری صاحب کو لایا گیا تھا۔“

ہمارا جہ یہ کہانی بیان کر رہے تھے۔ سرجان تھا مین ہوں ہوں کہہ کر سننے پہلے جا رہے تھے اور چودہری لال چند حیران تھے کہ ہمارا جہ کو کیا ہو گیا۔ جو آپ پولیسیل سیکریٹری گورنمنٹ ہند کے سامنے اس قدر لچر اور بہرہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جس کا نہ سر ہے نہ پاؤں اور اس جھوٹ کا نتیجہ کیا ہو گا۔

موٹر ڈیگ کے مقام پر پہنچی۔ وہاں ہمارا جہ اور ہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کھٹیاں ہیں۔ یہ کار ڈیگ پہنچتے ہی ہمان خانے میں گئی۔ جہاں کہ سرجان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ کار ٹھہری۔ سرجان اس میں سے اترے اور ہمارا جہ نے چودہری صاحب کو حکم دیا کہ آپ یہاں ہی ٹھہریئے۔ اور سرجان کے آرام کا انتظام کیجئے۔ تاکہ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر ہمارا جہ اپنی کھٹی چھنے گئے۔ سرجان تھا مین بہت ہی ہوشیار اور لائق سولین میں سے تھے۔ آپ نے جنگل کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے چودہری لال چند سے سوال کیا۔

”ویل چودہری صاحب! ہمارا جہ نے یہ جو ساٹھ لاکھ روپیہ کا قصہ سنا ہے اس میں کہاں

جنگ سچائی ہے“

جو دہری لال چند جواب کیا دیتے۔ وہ کوئی ادنیٰ سا جھوٹ بولنا بھی اپنے لئے باعث شرم سمجھتے تھے۔ اس اہم بے بنیاد اور پھر جھوٹ کو کیونکر قبول کر لیتے۔ آپ نے شکر اتنے ہوئے جواب دیا۔

”میں آپ کا شکریہ گزار ہوں کہ آپ نے یہ سوال کار میں ہی ہمارا جگہ کے سامنے نہ کر دیا ورنہ میری پوزیشن بہت ہی ناؤک ہو جاتی۔  
اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کہانی میں کوئی پختہ کاری نہیں۔“

ہمارا جہ بھرت پور اپنے انتقال سے پہلے ایک عرصے تک دہلی میں رہے۔ پہلے آپ کا قیام اس مٹرک پر تھا جو سبزی منڈی سے گھاٹت گھسب کو جاتی تھی۔ پھر آپ راجپور روڈ پر اس کوٹھی میں چلے گئے جو پہلے رنگ کی دوسنزلہ ہے۔ اور بعد میں سردار بہادر سوبھا سنگھ کی کوٹھی میں نئی دہلی چلے آئے جہاں کہ آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دہلی کے اس قیام میں ایڈیٹر ”ریاست“ کو آپ سے پہلے کا اکثر انٹرویو ہوتا۔ ان ملاقاتوں میں شاید ایک ملاقات بھی ایسی نہ ہوگی جس میں آپ کی دروغ بیانیوں کا ذہن پر ناقابل برداشت اثر نہ ہوا ہو۔

جو لوگ دیا دہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ بولنا ان کی فطرت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہ جھوٹ کر جھوٹ سمجھ کر نہیں بولتے۔ بلکہ دروغ بیانی کو ان کا ایک معمول بن جاتا ہے۔  
ایسے لوگ نفرت کے اتنے مستحق نہیں جتنے کہ یہ قابلِ رحم قرار دیئے جانے چاہئیں۔ کیونکہ سالہا سال تک مسلسل جھوٹ بولنے کے بعد ان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ جھوٹا نہ بولیں۔ اور اپنی اس عادت کو ترک کر سکیں۔

## جیل کی ”بد معاشیاں“

جیل میں اگر کوئی شے ناجائز طریقہ سے منگائی جائے یا چھپی جائے تو اسے پنجاب کے جیلوں کی قوانین میں ”بد معاشی“ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر جیل کے سپرنٹنڈنٹ میں کوئین نہ ہو۔ اور بخار میں مبتلا کوئی شخص کسی وارڈ کو دیکھ کر چار آنہ زینت یا انعام دے کر بازار سے کوئین منگائے۔ تو یہ بھی جیل کی ”بد معاشی“ ہے جس کی سزا جیل کے قوانین کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سگریٹ منگانا۔ حکام کی اطلاع کے بغیر خط بھیجنا یا منگوانا۔ کھانے پینے کی کوئی شے منگانا۔ روپیہ پیسہ رکھنا۔ کاغذ، قلم، دوا کا ہونا۔ یا مٹن لگانے کے لئے ایک سہائی کی مدد کو بھی یہ تمام جیل کی ”بد معاشیاں“ ہیں۔ اور جیل کا قانون ان میں سے کسی ”بد معاشی“ کی سزا دیتا ہے۔

جیل میں کوئی بارگیا۔ اور وہاں سینکڑوں سیاسی و غیر سیاسی قیدیوں کے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے کر ان کے لئے اور تمام میں سے شاید ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس کو جیل کی بد معاشیوں سے بالکل پاک قرار دیا جاسکے۔ ہر شخص کی قہر کی ضرورت اس لئے کہ کسی طریقہ سے ”بد معاشی“

میں محبلاً رہتا ہے۔ اور جہاں تک جیل کے اندر کیر کیٹر کی پاکیزگی کا سوال ہے۔ شاید تمام ہندوستان میں ایک ہاتھا گا ندھی ہی ایسی شخصیت تھے جن کا دامن اس اعتبار سے قطعی بے داغ رہا۔ چنانچہ ہاتھا گا ندھی کا ذیل کا واقعہ دلچسپی کے ساتھ سنا جائے گا۔ جو آپ کے اس قسم کے درجنوں واقعات میں سے ایک ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ہاتھا گا ندھی یارودا (پونا) جیل میں قید تھے۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق دل بھی اپنے کیر کیٹر کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے اور جیل کے احکام کی سوتی صوری تعمیل کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں جیلوں کے اندر اخبارات پڑھنے کی ممانعت تھی۔ اور کسی زبان کا کوئی اخبار جیل کے اندر نہ جاسکتا تھا۔ تاکہ قیدی جیل سے باہر کے حالات سے قطعی ناواقف رہیں۔ اور سیاسی ایجنٹین سے متاثر نہ ہوں۔ یارودا جیل کا سپرنٹنڈنٹ انگریز آئی۔ ایم۔ ایس۔ تھا۔ جو اپنے ڈاکٹری پیشہ کے باعث نیک دل تھا۔ ایک روز "ٹائمز آف انڈیا" میں ہاتھا گا ندھی کے متعلق ایک بہت اہم خبر شائع ہوئی۔ یہ سپرنٹنڈنٹ جیل چاہتا تھا کہ ہاتھا گا ندھی اس خبر کو پڑھ لیں۔ مگر جیل کے قوانین اور گورنمنٹ کے احکام اجازت نہ دیتے تھے۔ کہ سپرنٹنڈنٹ ہاتھا گا ندھی کو یہ اخبار دے یا اس مضمون کا ذکر بھی کرے۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ ہاتھا گا ندھی کی کوٹھڑی میں ہاتھا جی سے ملنے کے لئے گیا۔ زبان جی کی صحت وغیرہ کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے جیب میں سے دوسرے سامان کے ساتھ یہ اسرار بھی نکال کر ہاتھا جی کی چار پائی پر ایک طرف رکھ دیا۔ اور پھر دوسرا سامان ترجیب میں واپس ڈال دیا۔ مگر اخبار اٹھایا تاکہ ہاتھا جی اس کے جانے کے بعد یہ اخبار پڑھ لیں۔ سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد ہاتھا جی نے دیکھا کہ ان کی چار پائی پر ایک طرف اخبار پڑا ہے۔ اس اخبار کو دیکھتے ہی آپ کوٹھڑی کے کونے میں ایک طرف چلے گئے تاکہ نہ تو اخبار کو چھونے کا اتفاق ہو۔ اور نہ اخبار کا کوئی لفظ آنکھوں کو نظر آئے۔ اور آپ رات بھر کوٹھڑی کے اس کونہ میں ہی بیٹھے رہے۔ اگلے روز صبح سپرنٹنڈنٹ حسب قاعدہ پھر ہاتھا جی کی کوٹھڑی میں آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ جس پرزین میں اخبار رکھا تھا۔ بالکل اسی پرزین میں پڑا ہے۔ اس کو چھوا تک نہیں گیا۔ اور ہاتھا جی کوٹھڑی کے ایک کونہ میں بیٹھے ہیں سپرنٹنڈنٹ نے آتے ہی جب یہ کیفیت دیکھی۔ تو اظہارِ مذمت کے طور پر کہا "بھے افسوس ہے کہ کل میں قطعی سے اخبار یہاں بھول گیا۔" ہاتھا جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں۔ مگر بھے وزارت بھر کونہ میں بیٹھے رہنے کی سزا دی۔"

یہ کیفیت تو کیر کیٹر اور صداقت کے فرشتہ ہاتھا گا ندھی کی ہے۔ اب ایڈیٹر "ریاست" اور اس قماش کے دوسرے سیاسی ستیہ اگر یہوں کے واقعات سنیں۔

اگست ۱۹۴۰ء میں جب ہم گوٹ دہلی جیل میں بھیجے گئے تو یہاں غالباً وہ ہفتہ رہے۔ دہلی میں سپرنٹنڈنٹ جیل "نٹرا ایمر" (ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) تھے۔ یہ نہ صرف مذہباً عیسائی بلکہ نیک دل کے اعتبار سے بھی۔ دینی صدی حضرت مسیح کے مسئلہ تھے۔ یہاں اخبارات کے پڑھنے کی اجازت تھی۔ اور گھر سے سامان بھی لے جایا جاسکتا تھا۔ یہاں ساتھ کے قریب سیاسی قیدیوں میں چار آدمی تو اسے کلاس میں تھے۔

باقی تمام کے تمام بی کلاس ہیں۔ اسے کلاس میں ایڈیٹر ریاست "لارڈ وین بندھو گپتا" ممبر سنٹرل اسمبلی (سٹرچن لال جرنلسٹ اور جو تھے غالباً شری برج کشن جی چاندی والے تھے۔ مگر جہاں تک رہتے رہتے کا سوال ہے۔ کسی میں کوئی فرق نہ تھا۔ میرا کھانا دونوں وقت گھر سے آتا تھا جو انگریزی و دیہی دونوں طریقوں کا ہوتا۔ کیونکہ میں گھر میں بھی اس زمانہ میں زیادہ تر انگریزی طریقہ سے پکا ہوا کھانا کھاتا تھا۔ اور کبھی کبھی دیہی طریقہ کا۔ یہاں ہم لوگ آپس میں چمڈے طور سے مسادات کا ثبوت دیتے۔ اور وقت کا زیادہ حصہ کہیں ہانپنے۔ کھانا کھانے۔ اخبارات پڑھنے۔ ٹائٹل کیلئے۔ اور کوئٹہ انڈیا۔ "انگریزوں کو نکال دو" اور "جیل خانہ توڑ دو" وغیرہ کے نعرے لگانے میں صرف ہوتا۔ دو ہفتہ کے بعد ہم ملتان اور لارڈ سنٹرل جیل میں بھیجے گئے۔ راستہ میں بھی کوئی سٹیشن آیا نہ تھا۔ جہاں "انگریزوں کو نکال دو" اور "بغدادت کر دو" کے نعرے ہم نے نہ لگائے ہوں۔ ملتان پہنچے تک میں نے قید کو غنیمت سمجھا۔ نہ کام۔ نہ دفتر کی کدورت۔ نہ کوئی ڈگری نہ قرقی۔ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا۔ کتابیں اور اخبارات پڑھنا۔ آپس ہانپنا اور نعرے لگانا۔ ملتان جیل کے دروازہ کے اندر داخل ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ پنجاب کے چھ سو کے قریب سیاسی قیدی اس جیل میں جمع ہو چکے ہیں ان میں اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔ اور ریس و امر کا طبقہ بھی۔ اور پنجاب گورنمنٹ نے حکم دیا ہے کہ نہ کوئی اسے کلاس ہوگی۔ نہ بی کلاس۔ معمولی قیدیوں کا سا کھانا ملے گا۔ اخبارات کے پڑھنے کا تو کیا جیل کے اندر کسی اخبار کے داخل ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں۔ چار پائیاں نہ ہوں گی۔ ان کی جگہ مٹی کے جوتے دروں پر سونا پڑے گا۔ اور ہمیں دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر رکھا جائے گا۔ تاکہ چا پانیوں کے کامیاب حملوں کی خبریں سن کر ہمارے دلوں میں گدگدائی پیدا نہ ہو۔ یہ اطلاع سنی تو ہمیں قدرتی طور پر تشویش پیدا ہوئی کہ دن کیسے گزریں گے۔ یہ تشویش غصہ میں تبدیل ہوئی۔ اور مختلف بہانے بنا کر ہم نے جیل کے حکام کے ساتھ تعلقات کشیدہ کر لئے۔ چنانچہ ہمارے جیل کے اندر جاتے ہی ہم امنگ گاندھی ٹوپی سے جڑی جیل داڑھے لگتے تھے۔ کہ وہ جیل کے اندر کسی گاندھی ٹوپی کے جانے کی اجازت نہ دیں گے۔ ہم لوگ کہتے تھے کہ یہ ہماری سیاسی توہین ہے۔ چنانچہ غصہ و جوش میں ہم نے بطور پروٹیسٹ تمام کپڑے اتار دیئے۔ اور جیل کے قیدیوں کے عام کپڑے پہن لئے۔ مجھے کرنی کرتہ فٹ نہ آیا۔ تو میں بغیر کرتے ہی جیل میں داخل ہوا۔ اور جب تک درزی نے میرے سائز کا کرتہ نہ بنایا۔ میں ایک ہفتہ کے قریب نانگے سادھوؤں کی طرح ہی رہا۔ یہ سب کچھ تو ہم نے گاندھی ٹوپی کے نام پر کیا مگر دراصل اس کی وجہ آرام نہ لینے کی تشویش اور تشویش سے پیدا شدہ غصہ تھا کہ ہم دہلی جیل کے بہشت سے ملتان جیل کے دہشت میں بھیج دیئے گئے۔

ملتان جیل میں کھانے پینے کی تکلیف تو برداشت کی جاسکتی تھی۔ مگر دنیا کے حالات سے بے خبر رہنے کی کوفت ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اسمبلی کے ایک ممبر نے کوشش کر کے اپنے ایک ہم وطن دارڈو کو اڈے لگایا۔ اور یہ انتظام کیا گیا کہ "ٹرمینوں" کے دو پرچے دو علی الصبح چار بجے ان کے پاس پہنچا دیا کرے۔ اور ان دو پرچوں کی قیمت دو روپیہ اس دارڈو کو دی جائے گی۔ اس تجارت میں اسے ایک روپیہ جوہ آئے کی ہر روز یافت ہوگی۔ اور اگر یہ سوقوف ہو گیا۔ تو اس کی ملازمت کا کسی دوسری جگہ انتظام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس طریقہ سے "ٹرمینوں" کے دو پرچے آتے رہے۔ اور ملتان جیل میں یہ پہلی "بد معاشی" تھی جس کا ہم لوگوں نے انتظام کیا۔ چھ سو سیاسی قیدیوں میں دو پرچے ناکافی تھے اور بعض افتات پرچہ کی دوسرے تیسرے روپے

باری آتی تھی۔ چنانچہ اس ذہنی گرفت کے ساتھ ساتھ ہمارے غصہ میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ بہت کوشش کرتے کہ ہم ”پڑامن“ رہیں۔ مگر ہم لوگ اظہارِ ناراضی کا کوئی نہ کوئی بیانیہ نکال ہی لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیدیوں نے جیل کے حکام کے ساتھ نان کو اپریشن شروع کر دیا۔ جوں جوں ہم امیروں کو تنگ کرتے وہ ہمارے لیے زیادہ سختیاں پیدا کرتے چلے جاتے۔

ادھر سختیاں شروع ہوئیں۔ اور اُدھر میں نے ”ہوائی ڈاک“ (بغیر حکام کی اطلاع کے جیل سے جو خط و کتابت کی جائے۔ قیدیوں کی اصطلاح میں اسے ہوائی ڈاک کہا جاتا ہے) کا انتظام کر لیا۔ ہر روز خط پوسٹ کرنے کے لیے جیل سے باہر بھیج دیتا۔ اور خطوط کا جواب اسی ذریعے سے میرے پاس پہنچ جاتا۔ اور یہ ”ہوائی ڈاک“ اس قدر وزنی ہو گئی کہ اکثر بیس بیس پچیس پچیس خطوط ہر روز بھیجے جاتے۔ مجھے پوسٹ آفس سمجھ بیٹا گیا۔ اور جس شخص کو جیل سے باہر خط بھیجنا ہوتا وہ مجھے اپنا خط دے جاتا۔

مولانا امداد صابری نے ایک روز کہا کہ ملتان جیل میں اگر زندگی بے لطف ہو گئی۔ کوشش ہونی چاہئے۔ کہ ہم واپس دہلی یا کسی دوسرے جیل میں چلے جائیں۔ میں نے کہا یہ کیا مشکل ہے۔ ایک ہفتہ میں چلے جائیں گے۔ میں انتظام کر دیتا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل سردار رام سنگھ قیدیوں کو دیکھنے کے لیے ہر روز صبح آیا کرتے۔ اگلے روز صبح آئے۔ تو انہوں نے حسب دستور میرے قریب آکر پوچھا: ”سردار صاحب مزاج اچھے ہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟“ میں نے جواب دیا: ”تکلیف کا کیا سوال ہے یہاں ہم رات کے ساتھ تو بیٹھ آئے۔ جو آرام و راحت کی تلاش میں ہوں۔ اور نہ ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ مگر سردار صاحب سنا ہے۔ کہ آپ اکثر اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ اور آپ کی پوزیشن ایک مجسٹریٹ کی بھی ہے۔“ سردار رام سنگھ نے

جواب دیا: ”ہاں۔ میں مجسٹریٹ بھی ہوں۔“ اس پر میں نے کہا: ”میرا یقین ہے کہ بطور مجسٹریٹ آپ جھوٹ نہ بولیں گے۔ بعض سیاسی قیدیوں کہ ہم سے دوسرے جا کر کوٹھڑیوں میں پٹا گیا۔ ہم یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے یا جھوٹ ہے اور اگر سچ ہے۔ تو کس قانون کے ماتحت آپ کے آدمیوں نے یہ کمینہ فعل کیا۔ آپ کہ اس واقعہ کی جواب دہی کے لیے تیار ہونا چاہیے؟“ میں نے سختی کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔ اور اس سے دو چار روز پہلے ہم قیدیوں کو بیٹھنے وغیرہ کے واقعات دہلی کے اخبار ”نیخ“ (جس کے ایڈیٹر مولانا امداد صابری تھے) کو بھیج چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سردار رام سنگھ نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو رپورٹ کی کہ وہ ان سنگھ اور اس کے ساتھ آٹھ دس دوسرے اہلکار بہت

گستاخ اور ایچی ٹیسٹریس (ان کو اس جیل سے فوراً بدل دیا جائے۔ ورنہ یہ تمام قیدیوں کو ورغلا دیں گے۔ سردار رام سنگھ کی اس رپورٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دس کے قریب سیاسی قیدی جن میں لدھیانہ کے مفتی نعیم بھی تھے۔ ملتان جیل سے انہار جیل میں تبدیل کر دیئے گئے۔ اور جو گارد ہمیں انہار جیل میں پہنچانے کے لیے ملتان سے گئی۔ اس کے پاس ہر س لگا ہوا ایک لفافہ بھی تھا۔ اس لفافہ میں ہر قیدی کا

اعمال نامہ تھا۔ اور میرے اعمال نامہ میں لکھا تھا کہ یہ خطرناک قسم کا ایچی ٹیسٹریس ہے۔ اس سے بہت احتیاط کی جائے۔

انہار جیل میں سپرنٹنڈنٹ لالہ ہری چند تھے جو مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک بار

لالہ شام لال سپور ایڈیٹر گورنمنٹ پریس کے ساتھ لاہور میں مجھ سے مل چکے ہیں۔ مگر مجھے یاد نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لالہ ہری چند بہت شریفینہ طبیعت انسان تھے۔ جو کسی کو گھٹیت دیکھتا تھا۔ اپنے اپنے علاقہ و ہمارے مقام کے بھیجے گئے اخبارات کا بھی کچھ اتر تھا۔ لالہ ہری چند نے اپنے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو زبانی ہدایت دی کہ دیوان سنگھ بہت خطرناک قسم کا آدمی ہے۔ یہ اپنے مقدمات پر کئی سرکاری ملازموں کے لئے مصیبت کا باعث ثابت ہوا۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کے مخالف ہونے کی صورت میں ملازمت کا ہی خطرہ ہے۔ یہ بھی خلاف توقع نہیں کہ یہ کرنی ایسی مصیبت کھڑی کرے جس سے نہ صرف ملازمت سے موافق ہو بلکہ انسان قید بھی ہو جائے۔ اس لئے یہ جیسا کہ ہے کرتے جاؤ۔ اس کو ناراض نہ ہونے دیا جائے۔ اس ہدایت کے متعلق تو مجھے تب معلوم ہوا۔ جس روز چھ ماہ کے بعد ہم لوگ انبالہ جیل سے فیروز پور جیل میں تبدیل کر دیئے گئے۔ اور انبار سے روانہ ہوئے۔ مگر اس ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک ہم انبالہ جیل میں رہے۔ یہاں پر راستہ میں کوئی ٹکڑی نہیں ہوا۔ درجنوں خطوط باہر جاتے اور ان جواب آتے۔ جو شے میں چاہتا ہوں اس سے ملتا تھا۔ اخبارات، جیل کے تمام کام کا نظم کرتے۔ اس جیل میں میرا ایک دوست وہیہ ماہوار کے قریب خرچ تھا۔ اور آرام کیسا اور جیل سے باہر پانچ سو روپیہ ماہوار میں بھی ایسی راحت دیتا تھا کہ جو ملازم جیل سے باہر پانچ سو روپیہ ماہوار میں مل سکتا۔ ویسی سرورس جیل میں پانچ سو روپیہ ماہوار میں حاصل ہوتی۔ چنانچہ اس جیل میں جیل کی کوئی ایسی بد معاشی نہ تھی۔ جہاں سے نہ لی۔ ہر دو خطوط آتے۔ خطوط جاتے۔ غیر سیاسی قیدیوں کی ضرورتیں پوری کرتا۔ جو سامان چاہتا ہوا اسے منگاتا ہوا۔ تک کہ جیل سے سنٹرل اسپتال کے بعض ممبروں اور مسز ایڈمنسٹریٹو کونسل کے سربراہ تک کو بھی پیغام بھیجتا اور ان کے جوابات منگالیتا۔ اور جیل کاشفروں کی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر سے بھی اپنے متعلق تمام اطلاعات حاصل کر لیتا۔

انبالہ جیل میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ گورنمنٹ نے دہلی کے تمام سیاسی قیدیوں کو فیروز پور جیل میں ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور میں بھی وہاں بھیج دیا گیا۔ فیروز پور جیل میں پہنچنے کے بعد بد معاشیوں کو جیل کے باہر سے منگائے کا نیا انتظام کرنا پڑا۔ نور نے دار و دروں کو اوٹے لگایا گیا۔ دوسرے سامان کے بغیر تو گزارہ ہو سکے۔ خط و کتابت کے بغیر نہ گزارا جائے۔ انبالہ جیل میں خطوط لے جانے والے دار و در کو آٹھ فی خط دیا کرتا تھا۔ اسی ریٹ پر فیروز پور میں انتظام کر لیا گیا۔ چند روز ہوائی ڈاک جاری رہی۔ تو میرے متعلق وہاں کے سپرنٹنڈنٹ جیل کو کسی دار و در کی انجبری کے باعث علم ہو گیا۔ کہ میں اپنے پاس جیل کے قوانین کے خلاف روپیہ رکھتا ہوں۔ اور میرے خطوط جاتے اور آتے ہیں۔ مگر سپرنٹنڈنٹ کو یہ علم نہ ہوا کہ خط و مکالمہ کون لاتا ہے۔ چنانچہ صرف شک میں ہی جیل کے ہسپتال کا ایک کمپونڈروں سے تبدیل کر دیا گیا۔ حالانکہ اس پکارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ یہ ایک روز مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور خبرتے ہمیں باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اس کمپونڈر کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی شک ہوا۔ اور ان کو ڈیوٹی دوسرے دار و دروں میں لگا دی گئی۔ جب میری خط و مکالمہ کی بد معاشی جاری ہوئے بہت دہلی گزرا گئے۔ تو ایک روز اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر ڈوگرہ یہ صاحب آجکل غالباً انبالہ جیل میں ہیں



میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر مٹو کے دل میں میرے لئے بہت عزت ہے۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ مجھے کوئی تکلیف ہو۔ اور وہ سخت قدم اٹھائیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ بند ہونا چاہئے کیونکہ گورنمنٹ کے اعلیٰ افسر مٹو صاحب کو تنگ کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ چونکہ آپ پرائیویٹ طور پر بطور دوست پوچھ رہے ہیں میں جھوٹ بولنا یا مکاری کرنا نہیں چاہتا۔ میں خطوط بھیجتا اور منگاتا ہوں۔ میرا ان کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا کیونکہ خط و کتابت کے بغیر میں اپنے دفتر اور دوستوں کے حالات سے بے خبر رہتا ہوں۔ میری اس سچائی پر انہوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ کیا روپیہ بھی رکھتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ روپیہ کے بغیر کوئی کام کرتا ہے۔ ان باتوں کے بعد کچھ مذاق اور کچھ سنجیدگی کے لئے انہوں نے کہا کہ آپ دیسے ہی گپ ہاتھتے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی روپیہ ہوتا۔ تو آپ کے بکس یا سامان میں ہوتا۔ میں نے کہا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ فی الحقیقت میرے پاس روپیہ ہے۔ اور بغیر روپیہ کے میں کبھی بھی کسی جیل میں نہیں رہا۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کو بطور حق خدمت دینا ہوتا ہے، میرے اس جواب پر ڈوگرہ صاحب نے کہا۔ کیا دھرم سے کہتے ہو کہ روپیہ ہے۔ میں نے کہا۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ اور اگر آپ کی تسلی دھرم سے ہی ہوتی ہے۔ تو میں دھرم سے کہتا ہوں۔ کہ میرے پاس روپیہ ہے۔ اور اس بکس میں ہی پڑا ہے۔ جس کی آپ نے تلاش لی۔ مسٹر ڈوگرہ حیران کہ روپیہ کہاں ہے جو تلاش پر بھڑکا نہ نکلا۔ آپ نے پھر دوبارہ میرے بکس کی تلاش لی۔ ایک ایک کپڑا۔ اور کپڑے کی ایک ایک جیب۔ کشتا ہوں گا ایک ایک ورق۔ جو تھے اور تمام سامان کو چھان مارا۔ یہاں تک کہ سالٹ کی شیشیوں تک کو خالی کر دیا۔ مگر کچھ نہ نکلا اور مسٹر ڈوگرہ مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر چلے گئے۔ ”یالتم تو جھوٹ بولتے ہو اور مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی روپیہ نہیں۔“ میں نے پھر کہا۔ دھرم کی قسم پر اعتبار کیجئے۔ میرے پاس روپیہ موجود ہے۔ اور اس بکس میں ہی ہے۔

اس وقت میرے پاس دس دس روپیہ کے دس نوٹ تھے۔ اور یہ نوٹ کرپشن سالٹ کی شیشیوں کے ڈھکنے میں لگے کئے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ اور کرپشن سالٹ کی یہ شیشیاں اس بکس میں ہی پڑی تھیں جن کو خالی کر کے اور سالٹ باہر نکال کر مسٹر ڈوگرہ نے دوبارہ دیکھا تھا۔ چنانچہ فیروز پور جیل میں میری جیل کی ”بد معاشیاں“ آخری روز تک جاری رہیں۔ کیونکہ یہ بد معاشیاں ”گو کا فوٹا منج تھیں۔ مگر جہاں تک اخلاق کا سوال ہے۔ میں ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتا۔ اور آئندہ بھی ان کو کروں گا۔ گورنمنٹ کے یہ توقع حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے مطابق ہمیں خطرناک سمجھتے ہوئے جیل میں بند کرے۔ مگر ہمارے بے گناہ ہوتے ہوئے اسے ہماری خط و کتابت اور ہمارے کھانے پینے کی اشیاء پر پابندی لگانے کا حق حاصل نہیں۔ اور ان پابندیوں کو صرف ہمارا گناہ جیسی بلند شخصیتیں ہی قبول کر سکتی تھیں۔ جو جیل کے ڈسپلن کو توڑنا بھی مستحکم اگرہ کے خلاف سمجھیں۔“

## جرائم پر فطرت کا اثر

دوسرے لوگ تو جیلوں میں جا کر اپنا وقت گزار کر چلے آتے ہیں۔ مگر میں جب کبھی جیل گیا، انسانی فطرت کے متعلق میں نے ہمیشہ ہی اپنی معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ کیونکہ وہاں پڑھنے اور سوچنے کے لئے اتنا وقت ملتا ہے کہ جیل سے باہر اس کا عشر عشر بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ میں جب شروع شروع میں جیل گیا اور کسی قیدی سے اس کے جرم کے متعلق پوچھتا تو ہر شخص اپنے جرم کو بتاتے ہوئے ہچکچاتا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا بھی جرائم پیشہ ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے جرم پر جوری، دھوکہ یا اس قسم کے دوسرے اخلاقی جرائم کا اقرار کرے۔ چنانچہ جس قیدی سے میں پوچھتا کہ وہ کیا جرم کر کے آیا ہے۔ تو جواب دینے والا قیدی یا تو ملنے کی کوشش کرتا یا اپنے جرم کو غلط بتاتا۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ جب کبھی کسی سے پوچھتا تو یہ سوال نہ کرنا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا۔ اس سے کہتا تھا کہ اسے خلاف پولیس نے کس جرم میں پھرنا مقدمہ بنایا ہے؟ میرے اس سوال کا قیدی کی ذہنیت پر مدد دی کا سا اثر ہوتا۔ اور وہ فوراً جواب دیتا زنا بالجبر۔ چوری۔ ڈاکہ یا دھوکے کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں سمجھ جاتا کہ یہ حضرت کس جرم میں تشریف لائے ہیں۔ اور ان کا کیریکٹر کیا ہے۔

میں دہلی جیل میں تھا۔ ایک روز شام کو چار بجے کے قریب ایک انگریز قیدی تشریف لائے۔ اور میرے ساتھ سپیشل کلاس کے کمر میں رکھے گئے۔ ان کے پہنچنے پر میں نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔ پولیس نے آپ پر کس جرم میں جھوٹا مقدمہ بنایا؟ اس انگریز نے فوراً جواب دیا۔ ۴۲۰ (یعنی دھوکہ) چونکہ یہ ابھی آئے تھے میں نے باورچی سے چائے تیار کرنے کے لئے کہا۔ چائے پیتے ہوئے باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے فرمایا کہ آپ کا نام مسٹر ڈالٹن ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے آپ بیرسٹر ہیں۔ کسی مخالف بیرسٹر نے سازش کر کے آپ کے خلاف جھوٹا مقدمہ قائم کر دیا۔ اور مقدمہ لین دین کا تھا جس کو دھوکہ بنایا گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر کیس کہاں کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ پہلے اجیر میں پریکٹس کرتے تھے۔ اب لاہور میں پریکٹس کرتے ہیں۔

رات کو بھی مسٹر ڈالٹن سے باتیں ہوتی رہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری اس شخص کو حفظ یاد ہیں۔ اور ہائیکورٹوں کے فیصلے اور نظائر سے بھی یہ خوب واقف ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص بیرسٹر ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مقدمے کے متعلق بھی اس سے مشورہ لیا۔ اور چونکہ میں نے اس سے مشورہ لیا اس لئے میں نے "بیرسٹر صاحب" کی خاطر و تراضی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ بیرسٹر صاحب نے کہا کہ رات کو انھوں نے ڈنر میرے ساتھ کھایا۔ اور صبح بھی انڈسٹریسٹ اور بریک فاسٹ کی چائے میرے ساتھ پی۔ اگلے روز دوپہر کے تین بجے تھے کہ مجھ سے ملنے کے لئے ایک قیدی پیارا سنگھ آئے۔ پیارا سنگھ پہلے پریسٹ ڈالٹن تھے اور میرے لئے ان کے دل میں بہت مخلصانہ جذبات تھے، انھوں نے میرے پاس مسٹر ڈالٹن کو بیٹھے دیکھا۔ تو آتے ہی بے تکلف ہو کر کہا "بیلو مسٹر ڈالٹن" مسٹر ڈالٹن نے جب پیارا سنگھ جی کو دیکھا تو وہ کچھ حیران سا ہو گیا۔ اور کھینا حالت میں

پیارا سنگھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ”بیلو پیارا سنگھ! پیارا سنگھ جی ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ تو آپ نے مسٹر وائٹن سے سوال کیا۔ لاہور جیل سے کب آئے؟ کس کس جیل میں رہے۔ کیا کوئی اور اسامی ملی؟ وغیرہ۔ ان باتوں سے میں سمجھ گیا کہ مسٹر وائٹن جیل کے ”اولڈ بوڈ“ ہیں۔ پیشہ در مجرم ہیں۔ اور زیادہ مقدمت کا ڈیفنس پیش کرنے کرتے۔ ان عزیمات ہند اور مضابطہ فوجداری سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد پیارا سنگھ جی نے مجھے بتا دیا کہ یہ دھوکے میں سولہ بار کے سزایافتہ ہیں۔ پیشہ در ۴۲ ہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ جیلوں میں گزرا اور بہت بڑے پتہ باز ہیں۔

مسٹر وائٹن کے جھوٹ بولنے کا بھروسہ بہت بڑا اثر ہوا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا ہو گئی۔ مگر یہ شخص بہت ہی ہوشیار تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کے پہلے درجنی جھوٹ بولنے کا تجربہ بڑا اثر ہوا ہے تو اس نے اپنے جھوٹ بولنے کا اقرار کر لیا۔ غلامت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ آئندہ جھوٹ نہ بولے گا۔ چنانچہ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ پچھلی زندگی میں اس نے کیا کیا جرائم کئے۔ اس کے اقرار کے باعث اس نفرت میں کچھ کمی ہوئی، جو اس کے لئے میرے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔ اور چونکہ ہم ایک ہی کمرے میں رہتے اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ بات چیت نہ کرتے۔ یا ایک دوسرے کے ہمدرد نہ ہوتے۔

اس کو جیل میں آئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ یہ اپنے مقدمہ کی پیشی کے لئے ڈسٹرکٹ کورٹ میں بیجا گیا۔ عدالت سے یہ واپس آیا تو بہت مغموم صورت میں سے پوچھا۔ کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ عدالت میں تو پیشی پڑ گئی مگر اس کی بیروی کا خط ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ قاتل کر رہی ہے۔ کھانے کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ اور بچے بھی فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ میں نے اس کی مصیبت میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ تو اس نے مزید مغموم صورت بناتے ہوئے کہا کہ میں اس کو پچیس روپے دوں تا کہ یہ اپنی بیروی کو لاہور بھیج دے۔ جب اس نے اس مغموم صورت میں پچیس روپے طلب کئے تو میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے اپنے دفتر میں ایک رقعہ لکھ دیا کہ پچیس روپے دیدیئے جائیں۔ اس نے یہ رقعہ ایک آدمی کے ہاتھ بھیج کر پچیس روپے میرے دفتر سے منگالے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد اس نے کہا کہ اس کا لڑکا لاہور میں سخت بیمار ہے۔ پھر چند روز کے بعد اور بتا دیا۔ چنانچہ درواہ کے عرصے میں میرے رقعے لے جا کر اس نے میرے دفتر سے ڈیڑھ سو روپے کے قریب منگالے۔ درواہ گزرنے کے بعد یہ جب پیشی پر عدالت میں گیا تو وہاں سے سارجنٹ پولیس (جو اسے پیشی کے لئے موٹر سائیکل پر لے جایا کرتا تھا اور واپس لاتا تھا) کو ساتھ لے کر دفتر ”ٹاؤنسٹ“ میں پہنچا۔ اور اس نے میجر سے کہا کہ دیوان سنگھ نے پچاس روپے منگائے ہیں۔ دفتر داروں نے کہا کہ ان کو روپیہ دینے میں عذر نہیں مگر رقعہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے بغیر رقعہ کے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز مجھے اطلاع ملی کہ وائٹن نے اس طرح بغیر میری اجازت کے روپے طلب کئے تو میں نے اسے بہت شرمندہ کیا۔ مگر اس شرمندگی کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ دھوکا دینا تو اس کی فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد گو اس نے میری رحمتی کا اجازت نامہ اٹھاتے ہوئے اپنے مصائب بیان کر کے مجھے دھوکا دینا چاہا۔ مگر میں نے جیل میں اس کا اعتبار نہیں کیا۔ اور نہ کچھ دیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد وائٹن نے بھی اپنی رہائش دہلی میں اختیار کر لی۔ کشمیری دروازہ کی طرف

ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور اس نے اپنی ایک زوجہ لڑکی اور لڑکے کو لاہور سے اپنے پاس منگالیا۔  
میں اس کی نظرت سے واقف ہو چکا تھا اور اس کے دھوکہ میں نہ آتا مگر اس نے میرے جیل سے  
آنے کے بعد میرے ہاں آنا شروع کیا۔ کبھی اپنی لڑکی اور لڑکے کو لیکر آ جاتا۔ کبھی اکیلے۔ جب بھی آتا دو چار  
دس روپے طلب کرنا۔ اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ کل سے کھانا نہیں کھایا۔ لڑکے کو بخار ہے۔ دوائی کے لئے پیسہ نہیں  
تاکہ میرے ہاں لے جانے کے لئے دام نہیں ہیں۔ وغیرہ۔ میں اس سے انتہائی نفرت کرتا۔ مگر اس کی حالت  
کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ دینے کے لئے مجبور ہو جاتا۔ اور وہ بھی اس طرح جیسے کوئی شخص کسی فقیر سے پیچھا چڑھتا ہے  
کے لئے دیتا ہے۔

ایک روز شام کو ۶ بجے کے قریب اپنی لڑکی اور لڑکے کو ساتھ لیکر میرے قریب واقع مکان پر پہنچ گیا  
اور اپنی لڑکی سے کہہ لیا کہ وہ سینا جانا چاہتی ہے۔ اس کو سینا کے ٹکٹ کے لئے کچھ دیا جائے۔ لڑکی کی زبان  
سے یہ سن کر مجھے بہت غصہ اور افسوس ہوا۔ میں نے دانش کو ڈانٹا کہ جو ان لڑکی کو لیکر اس کا دوسرے لوگوں کے  
گھر دل میں جانا مناسب نہیں۔ اور اگر اس کے پاس کھانے کو نہیں تو وہ سینا دیکھنے کا خیال بھی کیوں کرتا ہے۔  
میں نے کچھ دینے سے انکار کیا تو وہ چلا گیا۔ اس کے کئی روز بعد یہ ایک بار پھر آیا۔ اور کہا کہ چند گھنٹے کے لئے اسے  
صوفہ بیٹھ دیا جائے۔ یہ دراصل شوکرنا چاہتا ہے۔ ایک بلڈنگ تو ہے مگر وہاں فرنیچر نہیں میں اس کو سخت کوکھا جا رہا  
دیتا۔ جس صورت میں کہ یہ صوفہ بیٹھ صرف چند گھنٹے کے لئے طلب کو دیا تھا میں نے اس کو دیدیا جو آج تک واپس  
نہیں آیا۔ اور نہ اس کے بعد اس کو جرات ہوئی کہ وہ میرے سامنے آئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دانش آج کل کہاں ہے  
عرصہ ہوا سنا تھا کہ یہ فوج میں عارضی طور پر ملازم ہو گیا ہے۔

میری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ طویل عرصہ سے جرائم کرتے ہیں جرائم ان کی فطرت کا ایک حصہ  
بن جاتے ہیں۔ اور وہ اگر جرائم کو چھوڑنا بھی چاہیں تو قوت ارادی کی کمزوری کے باعث وہ جرائم کو چھوڑ نہیں  
سکتے۔ اور چاہے سزا کے طور پر وہ کافی عمر جیل میں رہیں جیل سے باہر آنے کے بعد وہ ان جرائم کے پھر مرتکب ہوتے  
ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی۔ اور جیل سے رہا ہو چکے متعدد اشخاص پر اعتبار کیا مگر ان میں سے شاید ایک شخص بھو  
آسیانہ بھلا جو قابل اعتماد ثابت ہوتا۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ فطرت کو بدلنے کے لئے بہت طویل عرصے کی  
ضرورت ہے۔ اور وہ بھی اگر یہ طویل عرصہ گزشتہ جرائم پر ندامت اور ضمیر میں پاکیزگی پیدا کرنے کی کوشش  
میں گزارا جائے۔

## بداچھا بدنام برا

میں سنہ ۱۹۴۲ء کے شروع میں جلی نوٹوں کے مقدمہ میں گرفتار ہوا۔ اس سے پہلے مجھ پر گواہی دیکھنے، چوری  
کرنے یا کرتے، اور امانت میں خیانت کرنے وغیرہ کے کئی جھوٹے مقدمات چل چکے تھے۔ جو اہلیان ریاست  
کے پیڈ ایجنٹوں نے چلائے۔ اور میں ان تمام مقدمات میں عدالتوں سے باعزت بری ہوا۔ ان مقدمات کے  
متعلق تو شروع سے ہی تمام لوگوں کو یہ علم تھا کہ مقدمات بے بنیاد ہیں۔ اور ہر شخص میرا ہمدرد تھا۔ مگر نوٹوں

والے اس مقدمے کے متعلق ایک طبقہ اس مقدمے کو چھوٹا اور بناؤنی نہ سمجھتا تھا بلکہ بعض حلقے تو اس کوشش میں تھے کہ میں نوٹوں کے ”سٹاک“ میں ان کو بھی شریک کروں تاکہ وہ ان کے ذریعے لاکھوں روپیہ پیدا کر سکیں۔ اس سلسلہ میں چند ریچپ واقعات عرض کرتا ہوں۔

مقدمہ جب شروع ہوا۔ اور میں پہلی پیشی پر جیل سے عدالت میں لایا گیا تو دہلی کے متعدد اخبار نویس بطور ہمدردی عدالت میں موجود تھے۔ ان اخبار نویسوں میں ایک دوست جن کا ایک مقامی روزانہ انگریزی اخبار سے تعلق تھا مجھے دوسرے نوکوں سے چند قدم کے فاصلے پر لے گئے۔ اور آپ نے میرے کان سے اپنا منہ لگا کر سنجیدگی کے ساتھ کہا: ”آپ میرے دوست ہیں۔ ساہا سال سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اگر واقعی نوٹ موجود ہوں اور ابھی نہ چلے ہوں تو مجھے دیکھئے۔ میں ان تمام کو احتیاط کے ساتھ چلاؤں گا۔ اور جو روپیہ ان نوٹوں سے حاصل ہوگا۔ وہ نصف نصف کر لیا جائے گا۔“ ان کی اس بات کو سن کر میں مسکرایا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ اور ان کے ساتھ دوسرے دوستوں کے پاس واپس آکر ایک لطیفہ بیان کیا۔ جو یہ ہے۔ ایک میراثی کو یہ معلوم ہوا کہ گوردوارہ میں صبح ہر روز کڑاہ پرشاد (طلوہ) مفت تقسیم ہوتا ہے۔ میراثی ایک روز حلوہ تقسیم ہونے کے وقت گوردوارہ میں جا بیٹھا۔ اور وہ بائیں طرف کی قطار میں بیٹھا تھا جب حلوہ تقسیم ہونے کا وقت آیا تو حلوہ تقسیم کرنے والے گرنتمی نے داہنی طرف کی قطار سے حلوہ تقسیم کرنا شروع کیا۔ میراثی نے جب دیکھا کہ حلوہ تقسیم کرنے والے نے داہنی طرف کی قطار سے حلوہ تقسیم کرنا شروع کیا ہے تو وہ صبر نہ کر سکا۔ اور اس خیال سے کہ بائیں طرف پہنچتے پہنچتے تمام حلوہ ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے لئے باقی نہ بچے گا۔ اس نے حلوہ تقسیم کرنے والے گرنتمی سے کہا: ”سردار جی! حلوہ پہلے اس قطار کی طرف سے تقسیم کرنا شروع کیجئے۔“ گرنتمی کے لئے یہ آواز غلاب تو فحقی کیونکہ کسی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی شخص نے حلوہ کے لالچ کا اظہار کیا ہو۔ گرنتمی نے پوچھا: ”تم کون ہو؟“ میراثی نے فوراً جواب دیا: ”میں تمہارا خادم میراثی ہوں۔“ گرنتمی نے جب یہ سنا کہ میراثی گوردوارے کے اندر گھس آیا ہے تو اس نے ایک دوسرے سکھ سے کہا: ”ارو اس میراثی کو۔ یہ کیوں یہاں گھس آیا؟“ میراثی کو جب مار پڑنے لگی تو اس نے کہا: ”سردار جی میں نے تو حلوہ کے لئے کہا تھا کہ ادھر بائیں طرف کی قطار سے شروع کرو۔ اگر پٹنے کا ہی سوال ہے تو پھر داہنی طرف سے ہی شروع کیجئے۔ جہاں سے حلوہ تقسیم ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ لطیفہ بیان کرنے کے بعد میں نے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ یہ ہمارے دوست صرف حلوہ کھانے والوں میں سے ہیں۔ پٹنے والوں میں سے نہیں۔ فرماتے ہیں۔ بنے بنائے نوٹ دید و چلا دیں گے۔ اور میں عرض کرتا ہوں کہ پہلے جیل میں میرے ساتھ آئیے۔ پھر آپ کا حصہ دید و چلا۔ دوستوں نے تو اس لطیفے کو سمجھ کر کڑھنا کرکڑھنا کر نوٹوں کے وہ خواہش مند دوست کچھ کہیا نے سے ہو گئے۔ اور گھبیانی حالت میں ہی ان کو بھی قہقہوں میں شریک ہونا پڑا۔

نوٹوں کے مقدمے کے فیصلے اور بری ہونے کے آٹھ ماہ بعد جب مئی اگست ۱۹۱۱ء میں کانگریسی اصحاب کے ساتھ نظر بند کیا گیا۔ اور ملتان جیل میں پہنچا تو لاہور کے ایک کانگریسی لیڈر جو آجکل پنجاب اسمبلی میں ایم۔ ایل اے ہیں۔ مجھے دوسرے دوستوں سے علیحدہ لے گئے۔ اور مختلف موضوعات پر باتیں کرنے کے بعد آپ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: ”سنائیے کتنے نوٹ ابھی باقی ہیں۔ جو پولیس کے ہاتھوں سے

بیچ گئے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے دیکھئے۔ میں تمام کو بازاریں چلوادوں گا۔ میرے پاس نوٹ چلوانے کے ذریعہ موجود ہیں۔ میں ان کو کیا جواب دیتا۔ میں نے بہت کہا کہ آپ کا خیال غلط ہے۔ میرے پاس کوئی نوٹ موجود نہیں۔ مگر یہ نہ مانے۔ وہاں دوسرے تیسرے روز مطالعہ کیا کرنے کر میں وہی اپنے قابل اعتماد آدمیوں کی ہدایت کر دوں کہ وہ ان دوست کے قابل اعتماد آدمی کو بقایا تمام نوٹ دیدیں۔ چنانچہ یہ اب بھی جب کبھی ملتے ہیں تو یہی مشکوہ کرتے ہیں کہ میں نے ان پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا۔ اور نوٹ نہ دیئے۔

عرصہ ہوا دفتر "ریاست" محلہ گرھیا میں تھا تو ضلع مردان (سرحد) سے ایک شہساز بزرگ تشریف لائے۔ ان کے بیٹے کے بعد میں نے کہا۔ فرمائیے، کس طرح تشریف لائے، کیا کام ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کو لیکر دوسرے کمرے میں گیا۔ اور وہاں بیٹھے کے بعد میں نے پوچھ فرمائیے۔ تو آپ نے دس روپے کا ایک جعلی نوٹ نکال کر مجھے دکھایا۔ اور کہا کہ اس کے ساتھ کے ہزار دو ہزار یا دس ہزار جتنے نوٹ ہیں چاہوں ان سے نصف قیمت پر لے سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میں یہ سودا انہیں کر میرا کام اخبار ایڈیٹ کرنا ہے۔ جعلی نوٹ فروخت کرنا نہیں۔ میرے اس جواب پر آپ نے فرمایا۔ "مجھے تو معلوم ہوا تھا کہ آپ جعلی نوٹوں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ میں اسی لئے مردان سے آیا۔ مگر آپ انکار کر رہے ہیں کچھ کم دیش کر کے معاملہ کر لیجئے۔" میں نے پھر ان سے تنجیدگی کے ساتھ کہا کہ آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ میں نوٹ کا بیوپاری نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے اس لئے میں آپ کے اعتماد کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ورنہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو پولیس کو اطلاع کر دیتا اور آپ گرفتار ہو جاتے۔ مہربانی فرما کہ یہاں سے چلے جلیئے اور پھر کبھی بھی دوبارہ یہاں تشریف نہ لائیے۔ میرے یہ کہنے کے بعد وہ حضرت تشریف لے گئے۔

کافی عرصہ کا ذکر ہے۔ میں صبح آٹھ بجے کے قریب مضمون لکھ رہا تھا۔ تو بیچے سے چڑا سی نے آکر کہا کہ ایک لالہ جی لاہور سے آئے ہیں اور ان کا بسترہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ میں نے سمجھا کہ کوئی صاحب بطور ہمان تشریف لائے ہیں۔ میں نے بلایا اور پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: "میں دکان کرنا ہوا پچاس ساٹھ روپے ماہوار کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ بیڈن روڈ پر ایک کمپور صاحب ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ جعلی نوٹوں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ میرا سجدہ کاروبار تنگی بخشن نہیں۔ میں آپ کی امداد چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے ارزاں نرخ پر جعلی نوٹ دیں تو میں بھی اس میں سے منافع حاصل کر دوں۔" میں حیران کہ بہ کون شخص ہے۔ عمر پینسٹھ ستر برس کے قریب۔ صحت خراب۔ طبعاً بالکل سادہ لوح اور بے ریا۔ جب زیادہ باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ کوئی کمپور صاحب ہیں انھوں نے اس پکارے کو سادہ لوح سمجھ کر بیوقوف بنایا۔ اور کہا کہ وہ دکان داری میں زیادہ منافع نہیں کیا پچاس ساٹھ روپے میں جھکارتے ہو۔ دیوان سنگھ کے پاس پہلی جاؤ۔ وہاں سے نصف قیمت پر جعلی نوٹ لاؤ اور پوری قیمت پر چلاؤ۔ چند روز میں لاکھوں روپیہ پیدا کر لو گئے۔ میں نے اس پکارے کو سمجھایا کہ کمپور صاحب نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ کوئی شخص آپ کو بیوقوف سمجھ کر ٹھگ لے گا۔ اور نقصان اٹھاؤ گے۔ چنانچہ یہ پکارہ پندرہ میں دو پیہ کرایہ پوچھ کر کے اور سفر کی تکلیف اٹھا کر واپس لاہور گیا۔

اب تو نہیں مگر کچھ عرصہ پہلے حالت یہ تھی کہ میں جب کبھی بازار جاتا۔ سامان خریدنے کے لئے دوکاندار

کو سو روپے کا نوٹ دیتا۔ اور دوکان دار مجھے جانتا تو نوٹ اپنے ہاتھوں میں بیکر کبھی میری طرف دیکھتا۔ کبھی نوٹ کی طرف۔ کبھی اس کے دائر مارک (جو نوٹ کے کاغذ کے اندر سفید لکھتا ہوتا ہے) کو غور سے پڑھتا۔ اور پھر مجھ کو دیکھ کر مشکوک نگاہوں کے ساتھ نوٹ کو اپنے کیش بکس میں رکھتا۔ یعنی اس کو شک ہوتا کہ یہ نوٹ جعلی ہے یا اصلی۔ چنانچہ میں نے اس زمانہ میں اپنی جیب میں سو روپے کا نوٹ رکھتا ہی بند کر دیا تھا۔ اس کی جگہ دس دس روپے کے نوٹ رکھتا۔ کیونکہ جن جعلی نوٹوں کے متعلق مفت دمہ چلا وہ سو سو روپے کے تھے۔

جیل میں میرے ساتھ دہلی کے ایک فحش اور سچے گانڈھی بھگت برج کرشن جی تھے۔ جن کا خاندان چاندی والا کہلاتا ہے۔ کیونکہ ان کے بزرگ پہلے غالباً چاندی کا کاروبار کرتے تھے۔ دہلی میں برج کرشن جی بھی چاندی والے مشہور ہیں۔ فیروز پور جیل میں ایک بڈلہ سچ درست نے کہا: ”برج کرشن جی چاندی والے کے مقابلہ پر دیوان سنگھ کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ برج کرشن جی تو چاندی والے ہیں۔ مگر دیوان سنگھ نوٹوں والا ہے۔ نوٹوں کے مقابلہ پر چاندی کی کیا حیثیت ہے؟“

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے: ”مجھے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے جو بے نقاب ہو گئے۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا گنہگاروں کی ہے۔ جن لوگوں کے گناہوں کا کسی کو علم نہ ہو وہ تو نیک ہیں۔ مگر جن لوگوں کے گناہوں کا لوگوں کو علم ہو گیا یعنی بے نقاب ہو گئے چاہے وہ سچے تھے یا جھوٹے وہ گنہگار کہلائے۔

اس انگریز کے قول کے مطابق ہر شخص اتنا برا نہیں جتنا کہ بدنام شخص۔ کیونکہ اگر کوئی برا ہے مگر لوگ اس کی برائیوں کو نہیں جانتے تو وہ عوام میں نیک تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بدنام ہے چاہے وہ گنہگار ہے یا نہیں۔ وہ لوگوں کی نظروں میں گنہگار قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کہاوتوں میں کہا جاتا ہے۔ بد اچھا بدنام برا۔

## خیالات میں انقلاب کا باعث

میری غریب اٹھارہ بیس برس کی تھی تو میں بہت ہی متعصب قسم کا سکھ تھا۔ اور اس کا سبب وہ سکھ ماحول تھا جو بطور دوستوں کے حلقے کے مجھے فیروز پور کے قیام میں نصیب ہوا میرے یہ درست مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دشمن تھے۔ دن رات اپنی علیحدہ قوم علیحدہ مذہب اور علیحدہ پیٹھ کے خطا میں بہتے۔ یہ سنگھ بھائی نخر نیک کے سرگرم درکردوں میں سے تھے۔ اور ان کی ذہنیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے گورکھی زبان کی تبلیغ و اشاعت کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں سوائے گورکھی کے اردو، انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کچھ نہ لکھیں گے اور نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ یہ اصحاب اگر در اس، کلکتہ یا بمبئی خط لکھتے تو خط کا ایڈریس گورکھی زبان میں لکھتا جاتا جو ان صوبوں کے ڈیپٹی کمشنر کی سیر کرنے کے بعد واپس آجاتا۔ ان دوستوں کی اس سپرٹ کا مجھ پر بھی اثر ہوا۔ اور

مجھے یاد ہے کہ جس طرح ایک نو مسلم دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ پر ہندوؤں کا زیادہ دشمن ہوتا ہے یا دشمن ہونا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کو مسلمان زیادہ خالص لہو و سلام کا پرستار سمجھیں۔ میں بھی ہندوؤں کا عموماً اور آریہ سماجیوں کا خصوصاً بہت دشمن تھا۔ میں ہندو تہواروں اور رسم و رواج کا مذاق اڑاتا اور جب کبھی بحث ہوتی تو دیدوں اور ستیارتھ پر کاش پر بھی اعتراض کرتا۔ حالانکہ نہ کسی میں نے ستیارتھ پر کاش پڑھا تھا۔ نہ گرنٹھ صاحب سے کافی واقفیت تھی۔ اور دیدوں کو تو کسی دُور سے دیکھنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ میری مذہبی معلومات کی یہی پوزیشن اسلام اور عیسائیت کے متعلق تھی۔ یعنی غیر ان مذاہب کی واقفیت کے ان پر بھی اعتراض کرتا۔

انسان کے ذہن میں تنبیہ کیونکر پیدا ہوتی ہے اس سلسلہ میں دو واقعات بیان کرتا ہوں:-  
میں منصوری پہاڑ پر تھا۔ اور چند روز کے قیام کے بعد واپس آنے والا تھا۔ جس روز شام کو وہاں سے روانہ ہونا تھا۔ منصوری پہاڑ کا کچھ سامان یعنی چھڑیاں وغیرہ خریدنے کے لئے بازار میں گیا۔ بازار میں دیکھا کہ سینا کے پاس عیسائی طلباء و طالبات کا مجمع ہے اور یہ لوگ اپنے پادریوں کی معیت میں سینا کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہاں آج عیسائیوں کا کوئی جلسہ ہے۔ کیونکہ سینا شام کے وقت ہوا کرتے تھے۔ ایک پادری نے جواب دیا کہ حضرت مسیح کی زندگی کے متعلق فلم "کنگ آف کنگز" دکھائی جائے گی۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں بھی اس فلم کو دیکھ سکتا ہوں میں نے ٹکٹ کی قیمت دینے کے لئے کہا۔ مگر پادری نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس شویں ٹکٹ فروخت نہ کیئے گئے تھے۔

میں یہ فلم "کنگ آف کنگز" دیکھتا رہا۔ میں ذہنی اعتبار سے کسی فلم کی تمام سٹوری کو یاد رکھنے کا اہل نہیں۔ اور تمام زندگی میں کبھی ایسا نہ ہوا۔ کہ کسی فلم کی پوری کہانی کو ذہن میں رکھا ہو۔ کیونکہ فلم دیکھتے یا کسی سے باتیں کرتے چند منٹ کے بعد ہی ذہن دوسرے خیالات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ میں میرے لئے ایک پوری فلم کا دیکھنا یا نصف دیکھ کر انٹرڈل میں چلے آنا ایک عیسایہ۔ اسی طرح دوستوں کی پوری بات پر متوجہ نہ ہونے کے باعث مجھے اکثر شرمندہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ میں فلم "کنگ آف کنگز" کی تمام سٹوری پر تو غور نہ کر سکا۔ اور نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔ مگر حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ کا مجھے پرہیز اثر ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور یہ مسلم ہی اس اعتقاد اور احترام کی بنیاد ثابت ہوئی جو آج میرے دل میں عیسائی مذہب کے بانی یعنی حضرت مسیح کے متعلق ہے۔ چنانچہ اگر میں اپنے دل کی ترجمانی کر سکتا ہوں تو مجھے اس کا اقرار کرنے میں چھپک محسوس نہیں کرتی چاہے کہ گریس عیسائی نہیں اور میں نے ہپتسمہ نہیں لیا مگر جہاں تک حضرت مسیح کی قربانیوں اور مذہبیت کا سوال ہے۔ میں حضرت مسیح کا عیسائیت سے کم معتقد نہیں ہوں۔

اسلام سے مجھے واقفیت نہ تھی۔ اور نہ میں نے رسول اللہ کی زندگی یا قرآن کے مطالعہ کا کبھی خیال کیا۔ کیونکہ مذہبی لوگوں کے اعمال کو دیکھ کر مذاہب سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ اگر کسی جگہ مذہب کے متعلق کوئی بات ہو تو میرے لئے وہاں چند منٹ گزارنا بھی طبیعت پر بار



رہا تھا۔ میں دہلی جیل میں تھا۔ دہلی میرا قیام کانپور کے احاری مولوی عبدالقیوم (جو آجکل مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر یاد کر رہے ہیں) کے ساتھ تھا۔ مولوی عبدالقیوم ایک مخلص شخصیت ہیں۔ مولوی لوگوں کی اصلی زندگی چاہے کچھ ہو۔ یہ مذہب کو کسی وقت بھی نہیں بھولتے اور کوئی بات ہو اس کے متعلق مذہبی سند پیش کرنے میں مشاق ہوتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ دن رات رہتا۔ اور یہ ہر بات میں مذہبی سند پیش کر دیتے۔ اس پر میں نے کبھی توجہ نہ کی چنانچہ سوچ تو یہ ہے کہ ان کی یہ مذہبی سندیں پیش کرنا مجھے ناگوار سا محسوس ہوتا۔ ایک روز ہمانا گا ندھی کی زندگی اور حق پرستی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کیونکہ میں ہمانا گا ندھی کی حق پرستی کا ساہا سال سے معتقد یا معترف ہوں۔ اور میرا ایمان ہے کہ موجودہ دور کے مشاہیر میں سے کوئی لیڈر بھی ہمانا گا ندھی حق و صداقت کے اعتبار سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہمانا گا ندھی کی سچائیوں اور صفات بیانوں کے ذکر کے بعد مولوی عبدالقیوم نے ایک حدیث پڑھی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”دنیا میں سب سے بڑا جہاد و شاہ کے منہ پر حق و صداقت کی آواز بلند کرنا ہے اور اگر یہ شخص کسی ستر کی پردہ میں کو تو اس شخص کا یہ فعل تمام بادلوں میں سب سے بڑا جہاد قرار دیا جائے گا“ مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر میں سوچنے لگا کہ جو رسول حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کو جہادوں میں سے افضل ترین جہاد قرار دیتا ہے، اس رسول کے بلند، حق پرست اور قابل احترام ہونے سے انکار کرنا کس قدر شرم ناک اور باطل پرستی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کے اس حدیث کے بیان کرنے کے بعد اسلام کے متعلق میرے ذہن میں انقلاب پیدا ہوا۔ اس کے بعد جب بھی موقع ملا میں نے رسول اللہ کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اور مختلف موضوع پر قرآن کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دل میں گو بعض مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ان کے لئے نفرت ہے۔ اور ان کے اعمال نامے کو عالم اسلام کے لئے رسوائی و ذلت کا باعث سمجھتا ہوں۔ مگر رسول اللہ ﷺ قرآن اور اسلام کے لئے اپنے دل میں اتنی ہی عزت و احترام اور محبت کے جذبات رکھتا ہوں جتنے کہ ایک مسلمان کے دل میں ممکن ہیں۔

ان دو واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے ذہن کی تبدیلی کے لئے بعض اوقات ایک آدھ واقفہ کافی ہوتا ہے۔ اور یہ واقعہ نہ صرف اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ بلکہ بر نفرت کو محبت اور خوارت کو عشق میں تبدیل کرنے کا باعث بھی ممکن ہے۔

## گھریلو ملازموں کی بددیانتیاں

کئی برس ہوئے گا کہ ارہنے والا میرا باورچی کو بدو وطن چلا گیا۔ تو اس کی جگہ میں نے دہلی کا ایک باورچی بھیرو رکھ لیا۔ جو پہلے دہلی الیکٹرک سپلائی کمپنی کے منیجر کے پاس تھا۔ مگر الیکٹرک سپلائی کمپنی کے منیجر کے چھ ماہ رخصت پر ولایت جانے کے باعث یہ بیکار تھا۔ میں گھریلو ملازموں اور چٹرائیسیوں کی بددیانتیوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اور میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کو کالی منادہ لے تاکہ یہ بددیانت نہ ہوں۔ کچھ روز جب میرے ملازمت کے لئے آیا تو میں نے پوچھا کہ الیکٹرک سپلائی کمپنی کا صاحب کیا تنخواہ دیتا تھا۔ اس نے بتایا

پندرہ روپیہ ماہوار بغیر خوراک۔ میں نے کچھڑوں سے کہا کہ وہ چوری نہ کرے اسے پندرہ روپے ماہوار کے ساتھ کھانا بھی دیا جائے گا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ ”بہت اچھا“ کہا اور کام شروع کر دیا۔

میں ملازموں کی دیانت داری اور بددیانتی کو دیکھنے کے لئے ان پر کسی دوسرے ملازم کو نگران مقرر کر دیتا ہوں۔ میرے پاس گھر میں اس زمانہ میں ایک دوسرا پہاڑی ملازم رہا تھا جسے میں نے کچھڑوں کی نگرانی پر لگا دیا کچھڑوں کو کام کرتے ہوئے تین روز جوئے تھے۔ یہ رات کو دس بجے کام سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا۔ اس نے چادر اوڑھے رکھی تھی۔ رامانے مجھے بتایا کہ کچھڑا اپنے گھوڑا ہنگامی کے باعث جسم پر کڑی پھینتا بھی دھتوار۔ مگر یہ چادر اوڑھے جا رہا ہے۔ غالباً کوئی شے چوری کر کے لئے جاتا ہو گا۔ میں نے رامان کو بھیجا کہ اس کو بلالائے۔ رامان اس کے پیچھے گیا اور اُسے واپس بلالایا تو میں نے کچھڑوں سے پوچھا کہ تم چادر اوڑھے جا رہے ہو بہار طبیعت تو اچھی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ طبیعت ٹھیک ہے مگر ذرا جسم ٹوٹ رہا ہے اور خفیف سرد حرارت محسوس ہو رہی ہے اس لئے چادر اوڑھے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کو چادر اتارنے کے لئے کہا۔ اس نے چادر اتار دی دیکھا کہ اس کے پاس ایک برتن ہے۔ اور اس برتن میں ایک پاؤ کے قریب لگی ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیوں لے جا رہے؟ کیا جواب دیتا شرمندہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اُس کی تنخواہ کم ہے تو اس میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ کرتا ہوں۔ مگر وہ آئندہ چوری نہ کر۔ اس نے پھر شکریہ کے ساتھ کہا کہ ”حضور میں آئندہ چوری نہ کروں گا“

کچھڑا اب بیس روپے ماہوار اور کھانا لیتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ تنخواہ ایک اچھے باورچی کے لئے کافی تھی۔ مگر اس نے چند روز کے بعد پھر چوری کی۔ میں نے اس کی تنخواہ میں پانچ روپیہ کا اور اضافہ کیا۔ اور اس سے حلف لیا کہ اب چوری نہ کرے گا۔ مگر اس کی چوری کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ یہ کبھی نہ کبھی ”باورچی از کاشورت دسمی دیتا۔“

کچھڑوں کو کام کرتے ہوئے چار پانچ ماہ چمے تھے کہ یہ ایک روز میرے پاس آیا اور کہا کہ ملازمت چھوڑنا چاہتا ہے کیونکہ اس کا ایکٹر کس پلائی کمپنی والا صاحب دلایت سے واپس آ گیا ہے۔ اور یہ اپنے صاحب کے پاس دیا چلا جانا چاہتا ہے۔ میں نے کچھڑوں سے پوچھا کہ وہ وہاں اب کیا تنخواہ لے گا۔ اس نے بتایا کہ وہی پہلی تنخواہ پندرہ روپے بغیر کھانا۔ میں نے کہا کہ یہاں پچیس روپے اور کھانا لیتا ہے پھر کیوں چھوڑتا ہے۔ اس نے انکساری سے جواب دیا کہ یہ اپنے صاحب کے پاس کئی برس سے ملازم ہے۔ اپنے صاحب کا بہت فضاہت ہے۔ صاحب چھ ماہ کی رخصت پر دلایت گیا تھا اس لئے دوسری جگہ پر ملازمت کی۔ اور وہ اپنے صاحب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا یہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔ مگر چوری کرنے والوں میں بھی کس قدر ناشعارم ہے۔ میں نے رامان سے کہا کہ وہ اپنی طرف سے کچھڑوں سے بات کرے اور پوچھے کہ اُسے کیا تکلیف ہے جو چھوڑ رہا ہے اور وہ کھانا چھوڑ کر بغیر کھانے کے پندرہ روپے پھر جا رہا ہے۔ رامانے پوچھا تو اس نے کہا ”میں پچیس“ ماہوار اور کھانے کو کیا کروں۔ بجلی کمپنی کے صاحب کے ہاں میں صرف لکڑی اور کوئلے سے ہی بارہ چودہ آ روزانہ پیدا کر لیتا تھا۔ دوسرے سامان کی خرید سے الگ وصول کرتا تھا یہاں سامان خریدنے والا دوسرا آدمی ہے۔ اور ایک پیسے کی بالائی آمدنی نہیں۔ اس لئے میں تو اپنے صاحب کے پاس ہی جاؤں گا۔

ل کر میں ڈیڑھ دور دوپہ روزانہ اوپر سے جالیتا تھا۔

میرے پاس ایک موٹر ڈرائیور تھا۔ چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ لیتا تھا۔ میں موٹر ہمیشہ خود چلایا کرتا۔ اور ایسٹور کو کبھی ساتھ نہ لے جاتا۔ ڈرائیور کا کام گاڑی کو اچھی حالت میں رکھنا۔ اور ہماؤں کو لے جانا ہوتا تھا۔ ل ڈرائیور کو جب ملازم رکھا تو چند روز کے بعد اس نے گاڑی کا پچھلا دھرا (جو دونوں پہیوں کے درمیان (مابین) نکال کر دکھایا اور کہا کہ یہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے (یعنی دیوان سنگھ نے) ایسی احتیاط سے نہیں چلائی۔ اس زمانہ میں اس گاڑی کا دھرا تیس پینتیس روپے میں آتا تھا۔ میں نے اسے کی قیمت اس کو دی۔ اور اس نے ایک دھرا لاکر دکھایا۔ اور اگلے روز کہا کہ اس نے ٹوٹے ہوئے ٹکڑیاں بدل دیا ہے۔ اس واقعہ کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد پھر اس نے کہا کہ دھرا ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ پھر اس نے دھرا لاکر دکھا دیا۔ اور کہا کہ بدل دیا۔ جب آٹھ نوواہ کے عرصہ میں تین چار دھرے ٹوٹ گئے اور میں نے تحقیقات ذہنہ جلا کہ یہ کجخت ایک پُرانا ٹوٹا ہوا دھرا تھے دکھا دیا کرتا۔ نیا دھرا دکھانے کے بہانے ایک دکان سے لے۔ اور پھر واپس کر دیتا۔ چنانچہ اس طرح دوسرے تیسرے ماہ یہ تیس پینتیس روپے ہڑالیتا۔ جب مجھے اس کی حرکت کا علم ہوا تو میں نے اس کو نکال دیا۔ اس کے بعد یہ نئی دہلی کے ٹھیکے دار خان بہادر راج برعلی کے پاس ملازمت کے لئے گیا۔ راجہ صاحب نے پوچھا کہ ملازمت کہاں کہاں کی۔ تو دوسرے دن کے علاوہ اس نے میرا نام بھی بتایا۔ راجہ صاحب میرے دوست تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر سے اس ڈرائیور کے چال چلن کے متعلق پوچھا۔ تو میں نے بتایا کہ چال چلن سب ٹھیک ہے۔ صرف یہی میں دوسرے تیسرے ماہ دھرا بدلتا پڑے گا۔ چنانچہ راجہ صاحب نے بھی میری اس سفارش پر سے ملازم نہ رکھا۔ اور انکار کر دیا۔

میں جیل سے واپس آیا تو اپنے کپڑے خود دھویا کرتا۔ دھوبی سے کپڑے دھلوانے سے نفرت سی ہو گئی۔ لکہ دھوبی ہر قسم کے گندے کپڑے لاکر دھوتے ہیں۔ کپڑے دھونے کے لئے میں کپڑے دھونے کا ٹامپین صابن ایک درجن ڈنڈے منگایا کرتا۔ اور جب یہ ڈنڈے ختم ہو جاتے تو نئے ڈنڈے منگایا کرتا۔ ایک روز نے ایک درجن ڈنڈے منگائے تو اگلے روز ان میں سے ایک ڈنڈا غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد اگلے ز ایک اور غائب۔ مجھے کسی شے کے چوری جانے کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا چوری کی واردات کا کیونکہ محسوس کرتا ہوں کہ چوری کرنے والا مجھے ہیروقت اور اپنے آپ کو چالاک سمجھ کر چوری کرتا ہے۔ اور نقصان کے بل پر بے وقوف بننا زیادہ تکلیف کا باعث ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چور کو پکڑنا چاہئے۔ یہ صابن دوسرے گھر سے رکھا تھا۔ میں نے اس صابن کو دو دو گھنٹے کے بعد جاکر دیکھنا شروع کیا۔ دن بھر دیکھتا رہا۔ مگر کوئی ڈنڈا ب نہ ہوا۔ دفتر میں پارٹ ٹائم پر کام کرنے والے دوسرے کلرکوں اور ٹائپسٹوں کے علاوہ ایک ٹائپسٹ سات بجے شام دس بجے تک آیا کرتا تھا اور یہ سب سے آخر میں جایا کرتا۔ جب دوسرے ٹائپسٹ ۹ بجے کے قریب چلے گئے تو نے صابن کے ڈنڈے گن لئے وہ پورے تھے۔ یہ ٹائپسٹ دس بجے فارغ ہو کر جانے والا تھا تو مجھے گڈ بائی کے لئے آیا۔ میں نے کہا۔ ایک منٹ تشریف رکھئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔

یہ میسرے کمرہ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میں صابن والے کمرے میں ڈنڈے گننے کے لئے گیا تو دیکھا کہ ایک ڈنڈا

اور کم ہے اور ابھی غائب ہوا ہے میں اپنے کمرے میں آیا۔ اور اس ٹائپسٹ کو اوپر سے نیچے تک دیکھ  
 تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے گرم کوٹ کے بائیں طرف کا حصہ کچھ آبھرا ہوا ہے۔ میں نے فوراً اس  
 سوال کیا: ”کیا صابن تو نے چوری کیا؟“ میرا یہ سوال سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ مگر اس نے جواب دیا  
 ”آپ ایک شخص پر غلط اور بے بنیاد الزام لگاتے ہیں“ اس کے اس جواب پر میں نے اس کے کوٹ کے  
 بٹن کھولے۔ تو اندر صابن کا لمبا ڈنڈا موجود تھا۔ میں نے پوچھا: ”یہ ڈنڈا کہاں سے آیا؟“ اس نے فوراً  
 جواب دیا۔ بازو سے خیر ا تھا۔ میں صبر نہ کر سکا۔ میں نے وہی ڈنڈا اس کے منہ پر مارا۔ صابن نرم ہوتا ہے  
 صابن منہ پر پڑتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے اس کو تھپڑوں سے پیٹنا شروع کیا۔  
 اور کہا۔ تب چھوڑوں گا اگر سچ بتاؤ گے کہ اب تک کیا کچھ چوری کیا۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ یہ صابن  
 کے کئی ڈنڈے۔ چمکیں۔ قلم۔ نیس وغیرہ چوری کر چکا ہے۔ اس کے جرم کا اقرار کرنے پر میں نے اس کا  
 حساب صاف کیا۔ جو کچھ اس کی تنخواہ کا نکلتا تھا دیا۔ اور اسے نکال دیا۔ یہ باور چوری یا تغلب کے مقدمہ  
 میں ہی تین سال قید کاٹ چکا تھا۔ جیل میں ہی اس کی مجھ سے واقفیت ہوئی۔ اور اس واقفیت کے  
 باعث ہی اسے دفتر میں جگہ دی تھی۔

میں نے یہ چند واقعات بتائے ہیں اور میرا کچھ لا تجربہ ہے کہ گھریلو ملازموں میں سے انگریزی کھانا  
 پکانے والے باورچیوں میں ایک بھی میں نے آج تک ایسا نہیں دیکھا جو دیانتدار ہو۔ کیونکہ یہ انگریزوں  
 کی ملازمت کرتے ہوئے نادانقت مالکان کو بہت ہی قوت بناتے ہیں۔ اور لڑتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ  
 لوگ کسی ہندوستانی کے ہاں ملازمت کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ہندوستانی آقاؤں کی بیویاں  
 ان ملازموں کی نگرانی کرتی ہیں اور اس نگرانی کے باعث ملازموں کو بددیانتی کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اور یہ  
 لوگ انگریزوں کے ہاں ملازمت کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں ان کی نگرانی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ دل  
 کھول کر بددیانتی کرتے ہیں۔ ہندوستانی کھانا پکانے والے ملازموں یا چپراسیوں میں سے کچھ لوگ دیانت دار  
 ملتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہندوستانی آقا ان کی شروع ہی سے نگرانی کرتے ہیں۔ اور ان کو موقع کم ملنے کے  
 باعث ان میں بددیانتی کا چسکا کم ہوتا ہے۔

گھریلو ملازموں کی بددیانتی کے متعلق دو رائے ہیں۔ ایک حلقہ تو وہ ہے (جن میں سے میں بھی ایک ہوں)  
 جو بددیانتی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور جو چوری کو دفتر یا گھر میں برکت نہ ہونے کا باعث سمجھتا ہے۔ یعنی  
 جہاں چوری ہوگی وہاں برکت نہ ہوگی۔ دوسرے حلقہ کا خیال ہے کہ جس صورت میں کہ مالکان بڑی چوریاں  
 اور بددیانتیاں کرتے ہیں۔ یعنی غلط اور قابل اعتراض طریقوں سے لاکھوں روپیہ پیدا کرتے ہیں چھوٹے  
 ملازموں کی چھوٹی چوریوں اور بددیانتیوں کو نظر انداز کر دیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ایڈیٹر ”ریاست“ کے  
 دوست جیٹا شیخ احسان الحق تو اپنے گھر کے بجٹ میں گھریلو ملازموں کی تنخواہ کے علاوہ ان کی چوریوں اور  
 بددیانتیوں کے لئے بھی دس فیصدی ریزرو رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا یقین ہے کہ ہندوستان میں اپنی ملازم  
 چوری اور بددیانتی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال گھریلو ملازم  
 چوری کو چوری نہ سمجھتے ہوئے چوری کرتے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کی اس وقت تک توقع نہیں کی جاسکتی

جب تک کہ ان کا معیار یورپ اور امریکہ کے ملازموں کی طرح بہت کافی بلند نہ ہو۔

## سی۔ آئی۔ ڈی کی کارگزاری

میں انسٹیٹل گورنمنٹ کے زمانہ کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا کہ سی۔ آئی۔ ڈی میری نگرانی کرتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں اب کئی کئی ہفتے تک گھر سے باہر نہیں جاتا۔ کام میں مصروف رہتا ہوں۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ میرا بیچا کیا جاتا ہے یا نہیں۔ مگر چند سال پہلے تک قوسی۔ آئی۔ ڈی کے ایک یا دو نمائندے دفتر ”ریاست“ والی گلی کے باہر بیٹھے رہتے اور ایڈیٹر ”ریاست“ کہیں جاتا تو یہ ساتھ جھولتے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ان کارندوں یا نمائندوں کی کارگزاری اور ان کی رپورٹیں بہت دلچسپ ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے ان کو درجنوں بار بیوقوف بنایا۔ ان واقعات میں سے چند عرض کرتا ہوں۔

چند برس ہوئے ایڈیٹر ”ریاست“ لاہور گیا۔ وہاں گجرانوالہ سے لالہ بشن داس چوڑہ دکیل (جوائے صاحب) اور ریاست بیگانہ نہیں دیونید کشر تھے) ملنے کے لئے آئے۔ چوڑہ صاحب نے کہا کہ ان کی بھانجی کے لئے رشتہ کی ضرورت ہے۔ ”ٹرمیون“ میں ایک اشتہار شادی کے متعلق چھپا ہے جس میں مشہر کے نام دپتہ کی جگہ صرف نمبر معرفت ”ٹرمیون“ درج ہے۔ یہ پتہ لے دیا جائے کہ مشہر کا نام دپتہ کیا ہے۔ تاکہ اس رشتے کے متعلق خط و کتابت کی جائے۔ میں لالہ بشن داس کو لے کر دفتر ”ٹرمیون“ میں گیا۔ وہاں منیجر سے ملا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں اور وہ اپنی توجہ واقعہ تو صرف اتنا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے لاہور کے کارندے نے جو رپورٹ اپنے مقامی افسروں کو کی۔ اور یہ رپورٹ دہلی کے بڑے دفتر میں آئی۔ وہ یہ تھی۔ ”دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست“ لاہور آیا۔ یہ امپیریل ہوٹل میں مقیم ہوا۔ یہاں اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایڈیٹر ”ٹرمیون“ کو رشوت دے کر اسے ہاراجہ نا بھکے کے حق میں مضامین لکھنے پر آمادہ کرے۔ یہ دفتر ”ٹرمیون“ میں گیا۔ وہاں نصف گھنٹے سے زیادہ عرصے تک ٹھہرا۔ اور اس نے ایڈیٹر ”ٹرمیون“ کو کافی روپیہ بطور رشوت دیا۔ روپے کی اصل رقم معلوم نہیں ہو سکی۔“

سی۔ آئی۔ ڈی کے اس کارندے کو ایسی رپورٹ مرتب کرنے کا خیال اس لئے ہوا کہ اس کو میرا بیچا کرنے کے لئے جب ایک افسر نے ہدایت کی تو کہا کہ دیوان سنگھ ہاراجہ نا بھکے کا دوست ہے اور ایچی ٹیٹر ہے۔ اس کے متعلق پتہ لویہ کہاں کہاں جاتا ہے۔ اور کس کس سے ملتا ہے۔ اس ہدایت کے مطابق ہی اس کا رندے نے اپنے ذہن سے یہ رپورٹ تیار کر لی۔

اس قسم کی جھوٹی رپورٹوں کا مجھ پر تو کوئی اثر نہ تھا۔ مگر بعض اوقات میرے دوستوں کو پریشانی ہوتی تھی۔ جن سے میرے جانے کے بعد میرے متعلق مختلف سوالات کے پوچھا جاتا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندوں رجن کی تنخواہ میں پچیس روپے ماہوار رجن کی قابلیت چٹل لیں کی سی اور رجن کا جملہ کنٹینبل یا سپر کنٹینبل ہوتا ہے) کو بے وقوف بنایا جائے۔ اور ان کو پتہ نہ چلے کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کس سے ملتا ہوں۔

میں لاہر گیا۔ میو معمول تھا کہ سٹیشن سے ٹیکسی لیتا۔ اور جتنے دن رہتا ہوتا ٹیکسی والے سے پٹرول کا اہل خرچ اور گاڑی کا دروازہ کرایہ مقرر کر لیتا۔ ان ٹیکسی والوں میں سے ایک دو کے ساتھ بار بار ان کی گاڑی لینے کے باعث تعلقات بھی جوڑ چکے تھے۔ دوسرے بچارے میرا راز کسی کو بتاتے نہ تھے۔ میں نے ریلوے سٹیشن پر پہنچتے ہی ٹیکسی لی۔ اور انارکلی کے اسپرٹل ہوٹل میں پہنچا۔ میں اس زمانہ میں اسی ہوٹل میں ٹھہرتا تھا۔ اس ہوٹل کے مالک لالہ درگا داس نہ کھانے کی قیمت دیتے نہ ہوٹل کا کرایہ۔ اور بعض اوقات تو وہاں کھانے پر میرے آٹھ دس دس درست بھی جمع ہو جاتے چنانچہ اس ہوٹل میں بعد میں نہ ٹھہرنے کی ایک وجہ بھی تھی کہ لالہ درگا داس کا کرایہ وغیرہ نہ لینا مجھ پر بارسا کرتا تھا۔ ہوٹل میں پہنچنے پر میں نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور باہر جانے کے لئے نیچے اترا تو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے صاحب مع اپنی سائیکل کے موجود تھے۔ اگر ٹانگہ ہو تو یہ فرزند ان برطانیہ اپنی سائیکل پر ٹانگے کے ساتھ ساتھ نگرانی کر سکتے تھے۔ اور اگر موٹر ہو تو پھر سائیکل پر نگرانی کیونکر کی جاسکتی تھی۔ موٹر کی صورت میں ان کی معلومات دوسروں سے دریافت کرنے تک ہی محدود رہتی تھیں۔ میں نے جب اس شخص کو ہوٹل سے باہر سامنے کی دکان پر بیٹھے دیکھا تو میں نے لالہ درگا داس سے کہا کہ اگر یہ کجخت میرے متعلق پرچھے کہ میں کہاں گیا ہوں تو کہہ دینا کہ راتے بہادر لالہ کج بہاری تھا پر کے ہاں گیا ہوں دراتے بہادر کج بہاری تھا پر اس زمانہ میں پنجاب گورنمنٹ کے سب سے بڑے گرگے تھے۔ اور پبلک آڈاؤر پبلک تحریکوں کو کچلنے کے اعتبار سے ان کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں لالہ درگا داس سے کہہ کر موٹر میں جہاں کہیں جانا تھا چلا گیا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے صاحب سائیکل پر راتے بہادر کج بہاری تھا پر کی کوٹھی پہنچے۔ اس شخص میں کوٹھی کے اندر جانے یا دریافت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس نے سائیکل کو کوٹھی کی چھوٹی دیوار کے سہلے کھرا کیا۔ اور مٹرک پر کوٹھی کے دروازے کے پاس اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ دیوان سنگھ باہر نکلے تو یہ پھر اس کا بیچھا کرے۔ اس کو وہاں بیٹھے بیٹھے چار پانچ گھنٹے ہو گئے پہلے اس نے خیال کیا کہ بیٹھنے کے لئے گیا ہو گا ابھی واپس آجائے گا۔ زیادہ دیر ہوئی تو اس نے سمجھا کہ شاید دیر پھر کا کھانا یعنی پنچ کھا کر آئے گا۔ جب پنچ کا وقت گذرے بھی کافی عرصہ ہو گیا تو اس نے کوٹھی سے باہر نکلنے والے ایک ملازم سے پوچھا کہ دیوان سنگھ دیوان سنگھ جہاں ہے لے گیا ہے کب واپس آئے گا۔ ملازم نے بتایا کہ راتے بہادر تو اکیلے بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس کوئی لینے والا نہیں آیا یہ جواب سن کر یہ حضرت واپس ہوٹل میں پہنچے۔ اور لالہ درگا داس پر برس پڑے کہ اُسے غلط پتہ بتایا گیا۔ لالہ درگا داس نے کہہ دیا کہ جو کچھ اسے پتہ تھا اس نے کہہ دیا۔ وہ مسافروں کی حرکات و سکنات کا ذمہ دار نہیں۔ چنانچہ اس بچارے کا یہ تمام وہن ضائع گیا۔ نہ معلوم اس نے اپنی کارگزاری کی کیا رپورٹ کی۔ اس نے ٹیکسی والے سے بھی پوچھا تو ٹیکسی والے نے میری ہدایت کے مطابق راتے بہادر کج بہاری تھا پر کے علاوہ اور دو چار خان بہادر وں اور راتے بہادر وں کے نام لے دیئے۔ کہ وہاں بھی گئے تھے۔

میں اور لالہ امیر چند کھنہ دہلی سے حافظ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کے پاس سیکنڈ کلاس کے کھٹ تھے۔ دہلی سٹیشن سے روانہ ہوئے تو سی۔ آئی۔ ڈی کے دہلی سٹیشن کے کارندے نے میرے کھٹ کا نمبر لیا۔ اور نمبر لیکر اس نے لاہر ریلوے سٹیشن کی سی۔ آئی۔ ڈی کو تیار دیا کہ نمبر ۱۱ سی۔ آئی۔ ڈی کی فہرست میں

ان تمام لوگوں کے نمبر ہوتے جن کی نگرانی کی جاتی۔ یہ فہرست سی۔ آئی۔ ڈی کے تمام دفاتروں میں موجود ہوتی۔ اور جب یہ لوگ تار کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ اطلاع دیتے تو نام نہ لکھتے صرف نمبر لکھتے۔ میرا اس زمانہ کی فہرست میں نمبر ۱ تھا، فرنیٹر میل میں آ رہا ہے اور اس کے ٹکٹ کا فلاں نمبر ہے اس کی نگرانی کرو۔ ہم جب لاہور پہنچے تو وہاں میرے خیر مقدم کے لئے دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے موجود تھے۔ جنہوں نے ٹکٹ کلکٹر کی معرفت میرا ٹکٹ دیکھا۔ اور وزیر آباد دیا کہ نمبر ۱ آ رہا ہے۔ اس کی نگرانی کرو۔ گاڑی کے لاہور سے روانہ ہونے کے بعد مجھے شرارت سر جھی۔ میں نے لالہ امیر چند سے کہا کہ اپنا ٹکٹ مجھے دیکھئے۔ اور میرا آپ لے لیجئے۔ اور وزیر آباد جہاں ہم نے گاڑی بدلنی تھی پہنچ کر آپ فوراً ہی تھرو کلاس کے ڈبے میں چلے جائیے اور وزیر آباد سے اگلے سٹیشن پر پھر سیکنڈ کلاس میں آجائیے۔ لالہ امیر چند نے ایسا ہی کیا۔ وہ گاڑی کے وزیر آباد پہنچتے ہی حافظ آباد جانے والی گاڑی کے تھرو کلاس کے ڈبے میں چلے گئے۔ اور میں اس گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جا بیٹھا۔ میرے وہاں سامان رکھنے اور بیٹھنے کے بعد سی۔ آئی۔ ڈی کا کارندہ ٹکٹ کلکٹر کو لے آیا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ یہ نمبر کارندہ کو دیا تو ٹکٹ کا یہ نمبر وہ نہ تھا۔ جو اس کی برادری نے دہلی اور لاہور میں دیکھا تھا۔ چنانچہ یہ بھگا ہوا اپنے ریلوے کے فائل میں گیا۔ وہاں اس نے یو۔ پی۔ این سارجنٹ کو رپورٹ کیا۔ یو۔ پی۔ این سارجنٹ آیا۔ ٹکٹ کلکٹر کی معرفت میرے ٹکٹ کا نمبر پھر دیکھا۔ اس نمبر کو تار کے ساتھ ملایا۔ یہ بہت پریشان کہ نمبر ۱ کہاں چلا گیا۔ لاہور تک جیج و سلامت آیا تھا۔ راستہ میں آ کر گیا یا کیا ہوا۔ یہ لوگ بھاگے ہوئے سیالکوٹ کی گاڑی کی طرف گئے کہ شاید اس گاڑی میں سوار نہ ہو گیا ہو۔ وہاں کے سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے ٹکٹ چیک کئے گئے۔ میرے لاہور والے ٹکٹ کا نمبر وہاں بھی نہ ملا۔ یہ پھر واپس آ گئے۔ ایک نئے ٹکٹ کلکٹر کو لاکر پھر نمبر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ نام کیا ہے کیا کام کرتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ میں نے جواب دیا دہلی سے آیا ہوں۔ نام سند سنگھ ہے اور وہاں ٹھیکیداری کرتا ہوں۔ میرا یہ جواب سن کر سی۔ آئی۔ ڈی کے یہ کارندے سر نہ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ میں کوئی اور آدمی ہوں۔ اور نمبر ۱ جس کا نام دیوان سنگھ تھا کہیں راستہ میں ہی آ کر گیا ہے۔ میں ان لوگوں کی اس پریشانی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وزیر آباد جنکشن ہونے کے باعث گاڑی ایک گھنٹہ بعد وہاں سے چلتی تھی۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا کہ اتنے میں سامنے کے دوسرے پلیٹ فارم سے مجھے وزیر آباد کے ذکیل لالہ چرنجیت لال نے دیکھ لیا۔ جو اپنے کسی دوسرے کام سے سٹیشن پر آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ میرے پاس آئے۔ اور حسب عادت مجھ سے لپٹ گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے لالہ چرنجیت لال سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ لالہ چرنجیت لال نے بتایا کہ یہ دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست ہے۔ یہ سن کر ان کارندوں کی جان میں جھلن آئی۔ کہ نمبر ۱ کون نہیں ہوا۔ اور وہ صحیح و سلامت وزیر آباد تک پہنچ گیا ہے۔

میں ایک بار اندر گیا۔ وہاں ایک دوست کے خلاف مقدمہ تھا میں جب وہاں جانے کے لئے تیار ہوا تو خیال آیا کہ جہاں جاتا ہوں سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ میرے واپس آنے کے بعد ان لوگوں سے میرے آنے اور میری حرکات سکنت کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں اور جہاں ٹھہرتا ہوں ان پکاروں کو پریشان ہونا پڑتا ہے۔

میں یہاں ان لوگوں سے بچ کر جاؤں تاکہ اندور کے میرے میزبان کریشان نہ ہونا پڑے۔ اس زمانہ میں میرے پاس استہارات لانے کے لئے ایک اینگلو انڈین کنویرسٹر مارٹن تھا جس نے مارٹن سے کہا کہ وہ میرا سامان سٹیشن پر لے جائے۔ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں میرا بستر و بچھوادے ہیں میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ مارٹن کو میں نے ہدایت دے کر بھیج دیا۔ اگر میں کامیاب ہوں تو میں بغیر کوٹ کے صرف قمیض پہنے سٹیشن پر گیا۔ ریلوے اسٹیشن دہلی پر سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس یہ لوگ منڈلاتے رہتے تھے جس میں سٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہی بک مثال پر گیا۔ اور رسائل دیکھنے شروع کئے تاکہ یہ لوگ محسوس کریں کہ میں دہلی سے باہر کہیں نہیں جا رہا صرف سٹیشن پر تفریحاً رسائل دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے لاپرواہی کے ساتھ رسائل دیکھنے کی صورت میں لاپرواہی محسوس کر کے کہ نہ تو میرے ساتھ کوئی ملازم ہے نہ سامان اور میں صرف ایک قمیض کے ساتھ ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا۔ کہ میں صرف سٹیشن تک آیا ہوں یہ لوگ میرے متعلق بے فکر اور لاپرواہ ہو گئے۔ بک مثال پر کتابیں دیکھنے کے بعد میں فرنیچر میل پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک دو چکر لگائے جیسے میں نظامہ بازی کر رہا ہوں۔ ان کو میری اس حرکت سے اور یقین ہو گیا کہ میں تفریحاً سٹیشن پر آیا ہوں۔ چنانچہ مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کا کھانے چلے گئے۔ اور جب گاڑی نے حرکت کی تو میں فوراً گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی کے جانے کے بعد یہ پریشان کر میں کہاں گیا۔

اور وہ رپورٹ کیا کریں۔ میں اندور دور دراز رہا۔ واپسی کے متعلق بھی میں مارٹن کو ہدایت دے گیا تھا کہ وہ ٹیٹ فام ٹکٹ لیکر اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ میں جب دہلی پہنچا تو مارٹن موجود تھا۔ میں نے اپنا ٹکٹ جو اندور سے دہلی کا تھا اس کو دیا۔ یہ میرا سامان بیکر باہر آ گیا۔ اور اس کا پیٹ فام ٹکٹ بیکر میں چند منٹ کے بعد ٹیٹ فام سے باہر آیا۔ جب میں نے ٹکٹ لینے والے باؤکر پیٹ فام ٹکٹ دیا تو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے پریشان کر میں گاڑی سے اُترا ہوں اور پیٹ فام ٹکٹ دے رہا ہوں۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ کار اسٹیشن پر موجود تھی۔ مارٹن میرے پہنچنے سے پہلے سامان اس میں رکھ چکا تھا۔ میں سوار ہو کر اپنے مکان پر پہنچ گیا۔

میرے اس طرح جانے اور واپس آنے کے باعث سی آئی ڈی والے پریشان کر میں کہاں گیا تھا کیوں گیا اور کہاں سے بلا۔ ان کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر چار روز کے بعد سردار کرنا سنگھ انسپکٹر پولیس تشریف لائے۔ یہ لوگ دو سردوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مگر اپنی چالاک کے باعث خود بے وقوف بنتے ہیں۔ انھوں نے تشریف لانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ مگر میں فوراً سمجھ گیا یہ معلوم کرنے کے لئے آئے ہیں کہ میں کہاں گیا تھا کیوں کہ ان کی مسل کے پیٹ کا بھرا ضروری ہے۔ چند منٹ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے دوستانہ انداز میں پوچھا کہ تین چار روز ہوئے کہاں گئے تھے۔ میں نے جواب دیا۔ میں جانتا ہوں آپ یہ دریافت کرنے کے لئے ہی آئے ہیں۔ میں نظام کیا تھا۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا وہاں کے متعلق چند لوگوں کو سخت شکایت تھی حالات دیکھنے خود گیا تھا۔ پوچھا کہاں ٹھہرے تھے میں نے جواب دیا ریلوے اسٹیشن رتلام پر۔ میری اس "معتبر" اطلاع کے بعد سردار صاحب تشریف لے گئے۔ اور آپ نے غالباً ہی کچھ کچھ لکھا کر "شامل" کر دیا ہوگا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سی آئی ڈی کے کارکن اپنے افسروں کو دہرائیں کرتے ہوئے کہیں



”کارگزاروں“ کا ثبوت دیتے ہیں۔ کا غذات کیا کچھ لکھ کر ”شامل“ کئے جاتے ہیں اور یہ محکمہ کیونکر جنت المہتاب ہے۔

## بھوتوں کا وجود

ایک مرتبہ ”ریاست“ کے ”ناقابل فراموش“ کالم کے زیر عنوان ایک صاحب نے بھوتوں کے متعلق اپنا ایک تجربہ بیان کیا۔ اس واقعہ کے شائع ہونے کے بعد کئی خطوط دفتر ”ریاست“ میں پہنچے۔ جن میں تعجب کا اظہار کیا گیا کہ ایسا واقعہ ”ریاست“ میں کیوں شائع کیا گیا جس کو عقل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور بھوتوں کا اقرار ضعیف الاعتقادی ہے وغیرہ۔

بھوتوں یا جنات کا وجود بنیائیں ہے یا نہیں۔ گمان کا ذکر اکثر مذہبی کتابوں میں ہے میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہر شخص اپنے تجربے کا خود ذمہ دار ہے۔ مگر میں ایک چشم دید واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میں دہلی جیل میں تھا۔ ہاں گودام کے انچارج سردار جاگیر سنگھ سٹور کیپر تھے۔ میں وقت کاٹنے کے لئے دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے سردار جاگیر سنگھ کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ ایک روز جیل کا ایک ملازم جو ریلوے سٹیشن پر سامان لے جانے اور لانے کا کام کرتا تھا۔ اور بیل گاڑی چلاتا تھا۔ داں آیا تو سردار جاگیر سنگھ نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ یہ شخص بھوتوں کے علم سے واقف ہے۔ رات کو دو تین تین بجے تک قبرستانوں میں گھنٹوں اور جنگلوں میں پھرتا ہے۔ اور جوتے چاہے بھوتوں کے ذریعے منگا سکتا ہے۔ سردار جاگیر سنگھ کا یہ بیان سن کر میں حیران رہ گیا۔ اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں اس معاملہ میں مزید تحقیقات کروں۔ چنانچہ میں اس شخص سے مخفی طلب ہوا۔ بھوتوں کے متعلق معلومات حاصل کر نیک شوق ہے۔ میری اس درخواست کو ثبوت درنورثہ کر گزار ہوں گا۔ مجھے بھوتوں کے متعلق معلومات حاصل کر نیک شوق ہے۔ میری اس درخواست کو اس نے انکار اراۃ طریقے سے انکار کرتے ہوئے ٹال دیا۔ مگر میں اس کا پیچھا چھوڑا۔ اور اُسے پھر کہا کہ کچھ دکھاؤ۔ سردار جاگیر سنگھ کہ اشارہ کیا کہ وہ بھی اس سے کہیں۔ میرے بار بار زور دینے پر یہ شخص تیار ہو گیا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ اس کے جسم پر صرف ایک کرتہ اور ایک پاجامہ تھا۔ اس نے ایک چادر طلب کی جو گودام میں سے ہی اس کو دے دی گئی۔ وہ چادر کو لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور منہ سے کچھ پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کہا کیا چاہتے ہو۔ میں نے جواب دیا گرم اور تازہ مٹھائی منگا دو۔ جیل کے اندر مٹھائی کا لانا بنانا یا رکھنا قانوناً ممنوع ہے۔ میں نے اسی لئے اس سے مٹھائی منگانے کے لئے کہا۔ چنانچہ چند منٹ کے بعد اس نے چادر کو اٹھایا تو ہتھوں کے ایک بڑے ڈوٹے میں مختلف قسم کی تازہ اور گرم مٹھائی موجود تھی۔ میں نے یہ مٹھائی نہیں کھائی کیونکہ اس شخص کے قبرستان اور مرگھٹ میں راتوں کو پھرنے اور بھوتوں کے ذریعے مٹھائی لانے جلنے کے باعث میرے دل میں نفرت سی پیدا ہو چکی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے کئی قیدیوں نے یہ مٹھائی لے لی اور ہمارے سامنے کھائی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے اس شخص سے مختلف سوالات کئے۔ اور پوچھا کہ تم کچیں تیس پچیس ماہوار کے

ملازم ہو۔ بھوتوں کے ذریعے سرکاری خزانہ یا بنیوں کی تجویروں سے روپیہ کہیں نہیں منگایا کرتے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر وہ چاہے تو روپیہ وغیرہ ہر جگہ سے منگاسکتا ہے۔ مگر یہ روپیہ لازمی طور پر اپنی جگہ واپس رکھنا ہوگا۔ کیونکہ اگر خیانت کی جائے تو پھر بھوت بے قابو ہو جائے۔ میں کھانے پینے کی ہشیا حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں بھوتوں یا جنات کا نہ پہلے کبھی قائل تھا۔ اور نہ اب ہوں۔ مگر ادھر کا واقعہ میرا چشم دید ہے۔ جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

## عورتوں کا نازک احساس

دہلی ریڈیو سٹیشن پر ایک اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر روپ لال ملک تھے۔ یہ آج کل لندن میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اور پچھلے چند برس میں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ پیدا کرنے کے علاوہ بطور بزنس مین مزے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسٹر روپ لال جب ریڈیو کے محکمہ میں ملازم تھے تو ان کا ذہن مغربیوں کی مصیبت سے فوراً متاثر ہو جاتا تھا کسی شخص کے ساتھ محکمہ میں زیادتی ہوتی تو یہ اپنا فرض سمجھ کر اس کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ جہاں اس محکمہ کے ملازم اور سازندے وغیرہ ان کا عزت و احترام کرتے۔ اور ان کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات رکھتے۔ آپ اپنے امیروں کی نظروں میں کھٹکتے اور آپ کو ایک طرح کا لیبر لیڈر سمجھا جاتا۔

انگریزی کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ وہ لوگ ہمدردی کے سخن میں جبے نقاب ہو گئے۔ اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ہر شخص گنہگار ہے۔ اور گنہ گار ہوتے ہی ہر شخص بے گناہ ہے۔ کیونکہ وہ بے نقاب نہیں ہوتا اور وہ شخص پہلک کی نگاہوں میں اس وقت گنہ گار قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ بے نقاب ہو جائے۔

چنانچہ سرکاری دفتروں میں دن رات رشوت ہے۔ بددیانتی ہے۔ سفارش بازی ہے۔ اور تلاش کرنے پر شاید ہی کوئی کلرک، باپو یا امیروں کے روبرو مل سکے۔ مگر یہ سب ہی دیانتدار اور شریف ہیں۔ کیونکہ بے نقاب نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی بے نقاب ہو جائے تو وہ بددیانت بھی۔ ملزم بھی اور قابل تعزیر مجرم بھی۔ روپ لال ملک نے غلطی سے یا لحاظ و مروت سے ایک شخص کو تقریروں کے سلسلہ میں پانچ چھ روپے زیادہ دے دئے

یا بغیر تقریر کے دے دیئے۔ روپ لال کا یہ جرم امیروں کی نظروں میں توجہ کا مرکز بن گیا۔ اعلیٰ امیروں کو رپورٹ ہوئی۔ اور روپ لال کو تہ ہی علم ہوا جبکہ ان کی مروتی کا حکم آپہنچا۔ جب یہ حکم ان کو سنا دیا گیا تو یہ اپنے گھر گئے۔ ان کی زوجہ ان کی بیوی کھانا تیار کیے شوہر کے انتظار میں تھیں۔ انھوں نے اپنی بیوی کو مروتی

کی خبر سنائی تو بیوی پر مسکنہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ بل نہ سکیں۔ عرصہ کی بیکاری کے بعد شوہر کو سرکاری ملازمت ملی تھی۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ میاں بیوی آرام سے گزر رہے تھے۔ اس صدمہ سے اس خاتون کو بخار ہو گیا۔ ایک ہفتہ بخار نہیں اُترا۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ ایک پیچھے پڑے پرتپ دن کا اثر ہو چکا ہے۔ روپ لال جی نے بہت علاج کیا۔ مگر جب بیوی کو بیماری کے ساتھ

شوہر کے بیکار ہو جانے کا غم ہو تو اسکا ستیا حق کو بچنا کیونکر ممکن تھا۔ صرف یہ ضد ہی اس خاتون کی زندگی کو ختم کر دینے کا باعث ہوا۔

”ریاست“ کے پرنسٹون پبلشرسٹر فلپرا احمد کی والدہ کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس خاتون کو اپنے بھائی کی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنی اس بھتیجی کے متعلق ایک جرعی خبر سنی تو یہ خاتون اس خبر کو سُننے ہی فوراً اپنے دامنی توازن سے محروم ہو گئیں۔ دو تین روز بعد پاگلوں کی سی باتیں شروع کر دیں۔ حالتِ ذہن بدلتی گئی۔ اور کئی برس کے علاج کے بعد بھی یہ اچھی نہیں ہو سکیں۔ اور دماغ بالکل جواب دے چکا تھا یعنی صرف ایک ناخوشگوار خبر سُننے ہی اس خاتون کے دماغ پر پاگل پن کا اثر ہوا۔ اور اس بچاری کے اچھا ہونے کی توقع نہ رہی۔

ایڈیٹر ”ریاست“ کے ماموں زاد بھائی سردار ہر نام سنگھ کیپور لاہور ڈسٹرکٹ کورٹ کے خزانہ کے ہیڈ خزانچی تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے ایک روز مذاقاً کہا کہ وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ بات بالکل مذاق میں کہی گئی۔ یہ خاتون بہت نیک اور کئی بچوں کی ماں ہیں۔ مگر اس مذاق کا ہی اس بچاری کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اگر ان کے محلہ میں کسی کے ہاں شادی ہوتی تو سردار ہر نام سنگھ کے گھر میں غم و اہم کی گھنٹائیں چھا جاتیں۔ یہ خاتون سمجھتی تھیں کہ شاید ان کے شوہر دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ ان کے گھر میں کسی عورت یا ظلم ایکٹریس کی کوئی تصویر نہ جاسکتی تھی۔ فوراً پھاڑ دی جاتی۔ رشتہ میں سے کوئی عورت آئے تو اسے بھی مشتبہ نظر سے دیکھا جاتا۔ کہ شاید میان کے شوہر کی شادی کے لئے کوئی بات چیت کرنے آئی ہو۔ کوئی شخص کسی کی شادی کے متعلق بات نہیں کر سکتا تھا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ کیفیت یہ کہ جب اخبار ”ریاست“ ان کے ہاں جاتا اور اس میں کسی خاتون کی تصویر ہوتی تو بیوی شوہر سے کہتی: ”دیر ان سنگھ کہاں کا شریف آدمی ہے جو عورتوں کی تصویریں چھاپ چھاپ کر اپنے بھائی کو بھیجتا ہے۔ اس کو شرم نہیں آتی کہ بھائی کے بچے ہونے ہوئے بھائی کی شادی کو کوشش کرتا ہے۔“ پھر غصہ کے ساتھ اپنے شوہر سے پوچھتیں: ”اس اخبار میں سے کوئی عورت سے شادی کیا ہے۔“ یہ سب کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں بتاتے؟“ چنانچہ اگر ”ریاست“ میں کسی عورت کی تصویر ہوتی تو یہ پرچہ ہی پھاڑ دیا جاتا۔ اور کبھی کبھی دماغی حالت اس قدر خراب اور خطرناک ہو جاتی کہ بچاری کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس خاتون کی یہ کیفیت صرف ایک واقعہ کے باعث ہوئی جو مذاق تھا۔ اور جس میں ستیا کا ایک شائبہ بھی نہ تھا۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں مرد و زن رات مصائب اور مشکلات کے باعث بھی اپنے ہوش و حواس سے محروم نہیں ہوتا۔ اور وہ جدوجہد میں بٹے بڑے حد سے برداشت کرتا ہے۔ عورت کے لئے بعض اوقات صرف ایک چھوٹی سی بات بھی ناقابل برداشت اور بعض صورتوں میں ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

## ہمارا تجارتی چلن

ہندوستان کی جہاں سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے حالت انتہائی قابل رحم ہے۔ وہاں تجارتی اعتبار سے بھی ہندوستانی باہر یورپ یا امریکہ کے قارجوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل نہیں۔ اور ہماری یہ تجارتی کمزوریاں نہ صرف ہماری رسوائی و ذلت کا باعث ہیں۔ بلکہ ہمارے لئے مالی اعتبار سے بھی نقصان پہنچانے کا باعث ہو رہی ہیں کیونکہ ہمارے اندر تجارتی ساکھ یا بزنس کے متعلق مارکیٹ میں کریڈٹ کا نہ ہونا ہمارے لئے بد اعتمادی پیدا کرنے کا باعث ہے۔ حالانکہ ان کمزوریوں کا اظہار بعض اوقات کسی وجہ یا نیت کے باعث نہیں ہوتا۔

بہت برس ہوئے۔ اخبار کی اشاعت کے پراپاگنڈا کے سلسلہ میں دفتر "ریاست" کو تھیکر سٹینک کمپنی کی ڈائریکٹری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو کھلتے سے بنیں روپیہ میں تھیکر ڈائریکٹری منگوائی گئی۔ اس ڈائریکٹری کو جب دیکھا گیا۔ تو اس میں اُن دایاں ریاست اور ریاستی انسٹروں کے نام بھی تھے۔ جو مرچکے تھے۔ چنانچہ جب یہ دیکھا گیا۔ تو اس ڈائریکٹری کو استعمال کرنا نا محصل سمجھا گیا۔ اور "ریاست" میں اعلان کیا گیا۔ کہ تھیکر ڈائریکٹری جو ابھی دو ہفتہ ہوئے بتیں روپیہ میں خریدی گئی ہے سولہ روپیہ میں دے دی جائے گی۔ جو صاحب خریدنا چاہیں۔ سولہ روپیہ بیچ کر منگا سکتے ہیں۔

اس پرچہ کے شائع ہونے کے بعد دوسرے روز صدر بازار دہلی کے ایک سوداگر کا ملازم دفتر "ریاست" میں آیا۔ اور سولہ روپیہ دے کر یہ ڈائریکٹری لے گیا۔ ڈائریکٹری کے فروخت ہونے کے ایک ہفتہ بعد بنگلور سے دفتر "ریاست" میں سولہ روپیہ کا ایک منی آرڈر پہنچا۔ جو اس غرض کے لئے تھا کہ ڈائریکٹری ان کو بیچ دی جائے۔ یہ منی آرڈر وصول کر لیا گیا۔ حالانکہ تجارتی اور اخلاقی اعتبار سے ہمارا فرض تھا کہ اس منی آرڈر کو وصول نہ کرتے۔ منی آرڈر کے وصول ہونے اور چٹی رساں کے چلے جانے کے بعد جب ایڈیٹر "ریاست" کو اس منی آرڈر کے متعلق یہ علم ہوا کہ یہ ڈائریکٹری کے متعلق ہے۔ تو اس نے اُس زمانہ کے منیجر ماسٹر عبد الکیم سے کہا کہ سولہ روپیہ ہدیہ منی آرڈر بنگلور واپس بھیج دیئے جائیں۔ ماسٹر جی نے کہا کہ "بہت اچھا بیچ دوں گا۔" دوسرے روپیہ کے ساتھ یہ سولہ روپیہ بھی دفتر میں خرچ ہو گئے۔ اور ماسٹر جی نے روپیہ فوراً واپس بھیجے کہ اہمیت نہ دی۔ اور سوچا کہ ایک دو دن میں بیچ دیں گے۔ اس واقعہ کے آٹھ دس روز بعد بنگلور سے خط آیا۔ کہ ڈائریکٹری ابھی تک نہیں پہنچی۔ حالانکہ منی آرڈر کی رسید پہنچ چکی ہے۔ اس خط کے پہنچنے پر ایڈیٹر "ریاست" نے ماسٹر عبد الکیم کو تاکید کی کہ سولہ روپیہ بنگلور بھیج دیئے جائیں۔ ماسٹر عبد الکیم نے پھر کہا کہ "بہت اچھا" ماسٹر عبد الکیم کے "بہت اچھا" کہنے کے بعد ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ بنگلور سے پھر خط آیا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے ماسٹر عبد الکیم کو پھر تاکید کی۔ اور نتیجہ یہی "بہت اچھا" آخر بنگلور سے رجسٹری خط آیا۔ جس میں خطوط کے جواب نہ دینے اور ڈائریکٹری کے نہ پہنچنے کی شکایت کی گئی تھی۔ اس رجسٹرڈ خط کے آنے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" ماسٹر عبد الکیم پر ناراض ہوا۔ اور منی آرڈر بھیجا گیا۔ اور روپیہ نیچے والے کو ذمہ داری اور فریاد کی کے ساتھ لکھا گیا کہ ڈائریکٹری فروخت ہو چکی ہے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سولہ روپیہ کو مصمم کرنے کی نیت نہ تھی اور

نہ بے ایمانی کرنے کا کرتی سوال تھا۔ اگر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کیا گیا۔ یا بد اعتمادی پیدا ہوئی۔ تو تجارتی چلن کی کمزوری کے باعث۔ کیونکہ ہمیں اول تو چاہئے تھا کہ سنی آرڈر وصول ہی نہ کرتے۔ اور اگر غلطی سے کیا گیا تھا۔ تو اسی روز روپیہ بذریعہ سنی آرڈر واپس کر دیا جاتا۔ مگر ہم نے بالکل اُس طرح ہی بزنس کے کیرئیر کی کمزوری کا اظہار کیا جس طرح کسی بننے کی تجوری میں ہزاروں ہزار روپیہ موجود ہوں۔ مگر پانچ روپیہ لینے والا کوئی شخص آئے۔ تو لالہ جی فوراً کہہ دیتے ہیں "کل اکڑ لے جانا" حالانکہ لالہ جی جانتے ہیں کہ رات بھر پانچ روپیہ رکھ کر وہ اس پانچ روپیہ کے سود سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور اس کے مقابلہ پر وہ اپنے اس فعل سے اُس شہرت کو زیادہ شہرت دینے کا باعث ہو رہے ہیں۔ جو بیک میں اُن کی نادہندگی کے متعلق ہے۔

یورپ اور امریکہ کے تاجروں میں تجارتی کریڈٹ یا اعتماد کو بہت اہمیت دی جاتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ چنانچہ ایڈیٹر ریاست کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ ریاست کی پچھلی عمر میں کسی ایک انگریزی یا امریکن فرم نے بھی اس کا روپیہ نہ مارا۔ بلکہ ہائے دفتر کی نالائقی کے باعث اگر کسی بل میں رقم کم لکھی گئی تو ان امریکن دیورپین تجارتی فرشتوں نے اس رقم کو پورا رکھ لیا۔ اس کے مقابلہ پر تجارتی دنیا میں جو ہماری حالت ہے۔ اُسے قابلِ رحم ہی نہیں بلکہ باعثِ شرم بھی قرار دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ ہماری یہ حالت ہمارے لئے نہ صرف باعثِ رسوائی بلکہ باعثِ نقصان بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اندر تجارتی کیرئیر پیدا کریں تو یہ کیرئیر ہمیں مارکیٹ میں بہت بلند لے جانے کا باعث ہو سکتا ہے۔

## بچپن کا زمانہ اور والدین کا فرض

"ریاست" کا دفتر جب اجیری دروازہ سے باہر تھا تو اس دفتر کے سامنے ایک سکھ سردار ماتا سنگھ رہتے تھے۔ جو کڑھی اور لوہے وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان سردار ماتا سنگھ کے بہنئی دہلی میں سردار بہادر ہتاب سنگھ سپرنٹنڈنٹ انڈسٹریز تھے۔ جو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر پر کالی اثر رکھتے تھے۔

سردار ماتا سنگھ کا ایک لڑکا ریل سنگھ (مجھے نام ٹھیک یاد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہی نام تھا) اس زمانہ میں غالباً سات آٹھ برس کا ہو گا۔ یہ لڑکا ہر روز دفتر ریاست "دالی بلڈنگ" کے اس حصہ میں آیا کرتا جہاں کہ ایڈیٹر ریاست "کے رہائشی کمرے تھے پڑوسیوں کے دوسرے بچوں کی طرح اس بچے کے ساتھ بھی ہائے فرمیں محبت کا سلوک کیا جاتا۔

بچوں کی نظرت ہے کہ ان کو دنیا میں صرف دو باتیں مٹا کر سکتی ہیں۔ اور یہ صرف ان دو سے ہی خوش ہو سکتے ہیں۔ ایک کھانے کے لئے ان کو کچھ دیا جائے۔ دوسرے اُن سے اخلاص و محبت کے ساتھ پیش آیا آئے۔ اگر کسی بچہ کو یہ دونوں اشیاء اپنے خاندان کے کسی دشمن سے بھی نصیب ہوں تو یہ بچہ اپنے گھر والوں کو قبول کر دشمن خاندان کے لوگوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اور ایڈیٹر ریاست "کا یہ ایمان ہے کہ مالی۔ ذہنی اور روحانی خوش حالی کے لئے ضرورت مند غریب لوگوں اور بچوں کی دُعائیں محبت ہی بڑا اثر دیتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں نے جب تک ضرورت مند دوستوں۔ غریب لوگوں

اور محصور بچوں کی امداد کی ربحے روپے پیسے کے اعتبار سے کبھی کمی نہ ہوئی۔ اور میں نے جب ان لوگوں کی خدمت گذاری سے ہاتھ کھینچا۔ میری مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اور فاقہ کنشی شروع ہو گیا۔ چنانچہ مجھے جب کبھی زیادہ ذہنی کوفت ہو تو میں پانچ سات یا دس روپے کے اچھے اچھے پھل اور مٹھائیاں منگا کر محلہ کے غریب بچوں میں تقسیم کر دیا کرتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنی کوفت اور تشویش سے فوری نجات مل جاتی ہے۔ اور حالات درست ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت تو تشویش یا ذہنی کوفت کو دور کرنے کے متعلق ہے۔ عام طور پر بھی محلہ اور پڑوسیوں کے بچے مجھ سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان بچوں کے والدین سے نہ میں نے کبھی تعلقات پیدا کیے اور نہ میں نے ان لوگوں کے نام اور حالات سے واقف ہونے کی کبھی کوشش کی۔ میری اس فطرت سے متاثر ہو کر یہ لڑکا روویل سنگھ بھی پڑوس کے بچوں کے ساتھ ہمارے گھر میں اکٹرا یا کرتا۔

ایک روز نا بچہ سے ایک شخص جس کا نام عنایت تھا اور جو دہاں کبھی میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ ملنے کے پہنچ آیا۔ اور میرے ہاں قیام ہوا۔ اس شخص کو آتے ہوئے چار پانچ روز ہوتے تھے کہ ایک روز میرے ذاتی کمرہ سے میرا فونٹین میں گم ہو گیا اس کے میں فرصت کے وقت میں کبھی کبھی عنایت کو بھی باتیں کرنے کے لئے بلاتا کرتا تھا۔ قلم کے گم ہونے پر مجھے شبہ ہوا کہ یہ قلم چونکہ قیمتی تھا اسے عنایت نے چوری کر لیا ہے۔ شبہ ہونے میں نے اس کو بلایا۔ اس سے قلم کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے اس کے انکار پر یقین آیا۔ میں نے اس کو سخت سخت کہا۔ اور نا بچہ کے ٹکڑے کے لئے اس کو پانچ روپے دے کر کہا کہ وہ فوراً چلا جائے۔ یہاں نہ رہے۔ عنایت پہلے جب کبھی آتا تو میں اس کے رخصت ہوتے وقت چالیس پچاس روپے دیتا۔ مگر میں عصمت میں تھا۔ اس کو صرف ریلوے کا کرایہ دے کر بھیج دیا۔ عنایت جاتے ہوئے بہت مستحکم ایک چوری کا الزام دوسرے وہ توفیق پوری نہ ہوئی۔ جس کے لئے آیا تھا۔

عنایت کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ایک روز میرے پرائیویٹ کمرہ کی میز پر دو روپہ پڑے تھے۔ میز غسل خانہ میں گیا تو واپس آکر دیکھا کہ وہ دو روپے دہاں سے غائب ہیں یہ چوری چند منٹ کے اندر ہوئی۔ صبح کا وقت تھا۔ دفتر ابھی کھلا نہ تھا۔ میں نے گھر کے ملازم راما کو آواز دی۔ اور پوچھا کہ ابھی کو شخص یہاں آیا۔ راما نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی اس نے سامنے والوں کا لڑکا روویل سنگھ زینے سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ روویل سنگھ کو بلالائے۔ وہ سامنے والے مکان میں گیا اور روویل سنگھ کو بلالایا۔ میں نے اس بچے کو دھکایا اور ملا تھوں میں رول لیکر کہا بچہ بتاؤ کیا تم نے یہاں سے دو روپے لئے۔ اور اگر تم نے بچہ نہ بتایا تو اس رول سے ماراؤ کہ تمھیں سڑخ کھوں گا اور پھر پولیس والوں کے پاس تمھانے میں بھیج دوں گا۔ لڑکا خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ ہاں اس نے دو روپے اٹھائے ہیں۔ اس کے اس اقرار کے بعد میں نے نرمی کا لہجہ اختیار کیا۔ اور اس سے کہا کہ اچھا میں تمھیں کچھ نہ کہوں گا اور نہ تم بٹو گے۔ یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم نے اد کیا کچھ لیا اور اگر تم نہ بتاؤ گے تو تمھیں ابھی پولیس کے ہتھانے میں بھیجتا ہوں میرے اس کہنے پر اس نے بتایا کہ اس نے کئی بار میز پر سے سامان اٹھایا۔ چنانچہ میرے دھکائے پر اس نے فونٹین میں اور ڈاک کے ٹکٹ

لیرو کئی اشیا اپنے گھر سے لادیں۔ جو اس نے وہاں اپنے والدین سے پرشیدہ طور پر چھپا رکھی تھیں۔ اس فتنہ کے بعد میں نے اس لڑکے کا اپنے ہاں آماندہ کر دیا۔ مگر بعد میں اس کے حالات کا علم ہونا رہا کہ اس پر بابتک چوری اور مختلف قسم کے دوسرے جرائم کے بین کے قریب مقدمات چل چکے ہیں جن میں سے میں تو سردار بہادر ہتھاب سنگھ کے اثرات کے باعث یہ چھوڑ دیا جاتا رہا۔ اور بعض میں اس کو سزا ہوئی۔ یہی اس بچہ میں چوری کی جو کمزوری سات آٹھ برس کی عمر میں پیدا ہوئی تھی نگراں نہ ہونے کے باعث ترقی کرتے نہ یہ کمزوری اس کی تمام عمر کو تباہ کرنے کا باعث ہوئی اور اس کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی زندگی میں کبھی بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکے۔ اور اس کی آئندہ تمام زندگی ہی جرائم کرنے اور ان جرائم کی را بھگتے بسر ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس بچے کے کیریکٹر کا اگر شروع سے ہی خیال رکھا جاتا اور اس کی مجرمانہ ذہنیت سختی کے ساتھ نگراں کی جاتی تو یہ بچہ سوسائٹی کے لئے نقصان کا باعث ہونے کی جگہ اپنی ذات اور سوسائٹی کے لئے مفید ہوتا۔

میرا لڑکا مہندر سنگھ جب چار پانچ برس کا تھا تو ایک روز کھانے کے کمرے میں اکیلا کھیلنے ہوئے شرارتیں رہا تھا۔ شرارتیں کرتے ہوئے یہ اس شیلف پر چڑھ گیا جس شیلف میں شیشے اور چینی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اب یہ اس شیلف پر چڑھا تو وہ شیلف الٹ کر گر پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اور انوں کے ٹوٹنے کی آواز اور پرکی سننے تک پہنچی۔ جہاں کہ میری والدہ لڑکا کو کھانے کے کمرے پر یہ سہا ہوا اور اسے تو میری والدہ نے اس سے پرچھا کہ بچے سے یہ آواز کیسی آئی۔ والدہ کے اس سوال پر اس نے جواب دیا۔ "برتن سردار (یعنی دیران سنگھ) نے توڑ دیئے ہیں۔" میری والدہ حیران کہ برتن کیوں توڑے۔ انھوں نے پھر پرچھا کہ کہا کہ "نو کروں کو مار رہے تھے۔" اترتے اترتے غصہ میں برتن توڑ دیئے۔" میری والدہ نے اس کو یقین کر لیا۔ اور وہ خاموش ہو گئیں۔ میں اس وقت گھر پر موجود تھا۔ دو گھنٹہ کے بعد باہر سے واپس آیا۔ اور پر گیا تو والدہ نے مجھ سے کہا۔ "تم نو کروں کو مارتے ہو اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ تمہیں کئی بار کہہ چکی ہوں غریب لوگوں کو مارنا اور ان کی بددعائیں لینا اچھا نہیں۔ اب نو کروں کو مارنے کے ساتھ برتن توڑ دیئے۔ تم اپنے منہ کو ضبط کیوں نہیں کرتے۔" میں حیران کہ معاملہ کیا ہے۔ جب پرچھا اور اصل حالات معلوم کئے تو تپتہ چلا کہ پتے اپنے جرم کو چھپانے کے لئے جھوٹ بولا ہے۔

میری عمر جب آٹھ دس برس کی تھی۔ میری والدہ مجھے بازار سے سودا لانے کے لئے روپیہ دیا کرتیں۔ ان روپیے کے پیسے ختم ہو جاتے تو وہ اور روپیہ دیتیں۔ چنانچہ ایک روپیہ میں سے ایک دو آنہ کا سودا آتا۔ رہائی کی ریزگاری دروازہ کے اوپر طاق میں رکھ دی جاتی۔ اس ریزگاری میں سے ایک دو آنہ اس زمانہ میں دو آنہ کی چھوٹی سی ہوا کرتی (لیکڑی سے بنائی) کی ریزگاری سے فروہ رکھ دیتا۔ اس ریزگاری کے ختم ہونے اگر والدہ کو حساب یاد رہتا اور وہ پرچھتیں کہ دو آنے کم کیوں ہیں تو میں سٹول پر چڑھ کر فرضی طور سے طاق سے پیسے تلاش کرتا۔ اور پھر اپنی دیانتداری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا کہ دو آنہ دو آنہ ہی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بچہ نظر نہ چوری کرنے، جھوٹ بولنے اور دوسروں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی ایک بچہ بھی بیانا ہوگا جو بچپن میں چوری کرنا نہ چاہتا ہو۔ جھوٹ بولنا ہو۔ وہ دوسروں کی نقل نہ کرے۔ یا اپنے گھر

دالوں یا دوسروں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہ کرے۔ بچوں کا یہ زمانہ والدین کے لئے بہت ہی اہمیت کا زمانہ ہے۔ ان کے کیرئیر کی اگر عقل مندی و طریقہ کے ساتھ نگرانی کی جائے تو یہ بچے اپنی آئندہ زندگی میں اپنی ذات اپنے خاندان اور سوسائٹی کے لئے مفید اور بلند ثابت ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کے بچپن کے اس زمانہ سے لاپرواہی کا سلوک کیا جائے تو یہ بڑے ہو کر باطل تباہ ہو جاتے ہیں۔

## فرہیم ایک لعنت ہے

میں اگست ۱۹۴۲ء میں جب کانگریسی حضرات کے ساتھ نظر بند کیا گیا تو میرا وزن تین سو دس سیر تھا۔ میں دیکھنے میں گلو کے علاقہ کا ایک ریچھ معلوم ہوتا تھا۔ اور دوسروں کو تو کیا اپنے جسم سے مجھے خود بھی نفرت تھی مگر کیا کرتا۔ صبح پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک جو شخص کرسی پر بیٹھا کام کرتا رہے۔ اگر گھر یا دفتر سے باہر بھی نکلے تو موٹر میں۔ اور کئی کئی ماہ تک ایک فرلانگ چلنے کا بھی اتفاق نہ ہوا۔ اس کے جسم میں تناسب قائم رہنے کا سوال ہی کیا تھا۔ جیل میں جانے کے بعد میں نے سوچا کہ نہ معلوم اس نظر بندی سے رہائی کب نصیب ہو دن بھر سوائے کتاب پڑھنے کے دوسرا کوئی کام نہیں کہیں مزدور شروعات کی جائے۔ چنانچہ میں نے جیل میں ورزش شروع کر دی۔ سب سے پہلے صبح جیل کے اندر دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چکر لگاتا۔ اور ایک گھنٹہ کے قریب چلتا۔ تاکہ تین میل کی مسافت طے ہو جائے۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تک ڈنڈ پیٹتا۔ اور پیٹ کو کم کرنے کی ورزش کرتا۔ اسی طرح شام کو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پیرول دس دن کے لئے جون ۱۹۴۳ء میں رہا کیا گیا تو میرا وزن دو سو دس سیر تھا۔ یعنی ایک برس میں میرے وزن میں ایک سو یا اسی پونڈ کمی ہو گئی۔ گویا کہ دوسرے لوگوں نے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں قوم کے لئے ذہنی اور فنی بہایا اور میں نے قوم کو ایک سو چوبیس ہزار کر دی۔ میں گھر میں بھی ہمیشہ قیض اور پا جامہ کے ساتھ رہتا ہوں۔ کوٹ کبھی نہیں پہنتا۔ اور سردیوں میں جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے گرم واسکٹ پہنتا ہوں جیل سے روانہ ہوتے وقت جب کوٹ پہنتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلو ٹرے کے منہ پر ڈھیلٹا تو برا ہو۔ یا کسی سادھو نے ایسا چلا پہن رکھا ہو جو وہ دن کو پہننے اور رات کو سوئے کے کام میں بھی لے آتا ہو۔ میں کوٹ پہن کر جب جیل سے باہر نکلا تو کچھ شرم سی محسوس کرتا تھا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے والے میرا یہ کوٹ چوری کے ذریعہ اڑایا ہوا سمجھتے ہیں جو میرے جسم پر فٹ نہیں۔

رہا ہونے کے بعد میں لاہور میں اپنے ماموں زاد بھائی سردار بہرام سنگھ کے مکان پر پہنچا۔ تو سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ درزی کو بگاڑنے تمام گرم دسر کوٹ فنٹ کرائے۔ درزی نے ہر کوٹ میں سے ۵ اینچ کپڑا دہنی طرف سے اور ۵ اینچ کپڑا بائیں طرف سے نکالا۔ یعنی ہر کوٹ کا گھیر دس دس اینچ کم کر دیا گیا۔ میں دو دن لاہور رہا۔ جس دوست سے ملتا وہ مجھے کمزور سمجھ کر اظہار ہمدردی کرتا۔ ”جیل میں انسان کمزور ہو جاتا ہے“ ”جیل کی زندگی روزگار کے برابر ہے“ ”تم تو پہلے سے آدھے مہ گئے“ ”جیل میں غم کرتے ہو گے“ ”گورنمنٹ بڑی ظالم ہے۔ بے گناہ کو پکڑ لیا۔ اور محنت تباہ کر دی وغیرہ“ میں ان کج گفتگوں کو کیا جواب دیتا۔



جس چربی کم ہونے کے باعث پہلے سے زیادہ طاقت محسوس کرتا تھا۔ کام زیادہ کر سکتا تھا۔ طبیعت میں  
بشاشت زیادہ محسوس ہوتی۔ یا صحیح معانی میں انسان بن گیا تھا مگر یہ اظہار نامہ کرنے والے مجھے مکرور  
سمجھتے تھے۔ اگر یا اگر ان کے خیال میں چربی ہی قوت اور طاقت کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ چربی ضرورت سے زیادہ ہونے  
جسم کے لئے ایک لعنت ہے۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں جیل سے رہا ہو کر دہلی پہنچا۔ امدادی شہر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کاروبار غیر حاضری میں ختم  
ہو چکا تھا۔ اخبار بند تھا اور بعض ملازم ”تمک حلالی“ کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان کو بھی فروخت کر کے ہضم  
کر چکے تھے۔ اگر میں دہلی میں نظر بند نہ ہوتا۔ اور یہاں تھا تو میں ہر روز حاضری کی پابندی نہ ہوتی۔ تو کسی دوسرے  
شہر میں کسی دوست کے پاس یا اپنے وطن حافظ آباد چلا جاتا۔ مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ آخر ایک مکان گراہ پر  
لیا۔ اور اخبار جاری کرنے کی تیاری شروع ہوئی۔ گورنمنٹ نے پہلے تو اخبار جاری کرنے کی اجازت دے  
دی۔ مگر اخبار جب پریس میں چھپنے کے لئے گیا تو گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں۔  
اس کے بعد اسمبلی میں سوالات ہوئے۔ اور سرلوہ۔ این۔ سین آف ایسوسی ایٹڈ پریس مشینری۔ ڈی شربا  
آف رینائیٹڈ پریس۔ اور سٹریٹوٹن جرنل ایڈیٹر ”ڈان“ گورنمنٹ کے سیکریٹریوں اور میسروں سے پہلے تو  
نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کی اجازت مل گئی۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اخبار نکل آیا۔ اخبار جاری ہونے کے بعد جو  
دوست صاحب ملنے کے لئے ہر روز زیادہ دوسرے میسرے روز گئے ان میں کتنا جی اے حسن صاحب حسرت  
بھی تھے جو ”فوجی اخبار“ کے ایڈیٹر تھے۔ حسرت صاحب نے ایک روز بتایا کہ کرنل مجید ملک (جو پہلے مسلم  
آؤٹ لک کے ایڈیٹر تھے) اور فٹری کے جنرل میڈیکل کوارٹر میں ڈپٹی پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں۔ ملنا چاہتے  
ہیں۔ وہ خود آتے۔ مگر چونکہ فٹری کے ملازمین کے لئے شہر کے اس حصہ میں جہاں کہ ”ریاست“ ہے جانے  
کی ممانعت ہے۔ اس لئے ہم فٹری کے آئی ریلیشن حسرت صاحب کے ہاں کھاتے پر میں بھی آؤں اور ملک جیسا  
بھی آئیں۔ میں نے جواب دیا کہ ملک صاحب سے ملنے بہت برس ہو گئے میرا جی خود ملنے کے لئے چاہتا ہے۔  
چنانچہ فیصلہ ہوا کہ میسرے روز میں اندر کرنل صاحب حسرت صاحب کے ہاں کھاتے پر آئیں۔

دہلی میں ”ریاست“ کو جاری ہونے اور دن رات محنت کرتے ہوئے اب ایک سال کے قریب غرضم ہو چکا  
تھا۔ دفتر کے ہی ایک کمرہ میں رہائش تھی۔ کبھی کبھی ہفتہ تک باہر نہ جانا گریہ میں وہی قیفس دیا جانے کے ساتھ  
اور مردوں میں کشمیری گرم کپڑے کی واسکٹ پیئر کر ڈھبنا ڈھکے لئے حسرت صاحب کی کوٹلی پر جانا تھا تو میں گے وقت  
حسرت صاحب کا آوی آؤں جس نے کہا کہ بھل نہ جانا آج شام کو کھانا کھائیے۔ مجید ملک کے علاوہ دیگر جن جن (جو  
”جنگل پاکستان“ شاعر تھے) اور ”ڈاکٹر کاشمیری“ آئیں تھے۔ میں نے کہا۔ بہت اچھا۔  
اس روز باؤش ہو رہی تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور صبح اوسے بھی پڑ چکے تھے۔ شام کو میں ڈاکٹر پر جانے کے  
لئے کپڑے پہنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے وزن اور جسم میں دن رات بیٹھنے کے باعث پھر اضافہ ہو گیا  
ہے۔ میرے کونوں میں سے اگر واسکٹ نہ بھی پہنوں تو کوئی گھوٹ فٹ نہیں آتا۔ نہ گرم نہ سرد۔ اگر واسکٹ  
پہنوں تو سامنے کے ٹٹوں اور شکم کے درمیان دو ایرج کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اگر واسکٹ نہ پہنوں تو  
ٹٹوں پھر بھی بہت شکل کے ساتھ بند ہوتے ہیں۔ اور اس حالت میں اگر کھڑا ہوں تو ٹٹوں نہ ٹٹیں گے۔

اور اگر ہندوؤں کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو ہندوؤں کے ٹوٹے اور جسم کے کٹے جانے کا سوال ہے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ دسمبر کی سردی۔ اگلے بارش۔ دانت سے دانت تک رہے ہیں۔ کوئی کوٹ نہ ملے۔ آٹا اور ادھر وہ دھندلا ہوا کہ ضرور آؤں گا۔ قہر و دیش راجان در دیش بغیر واسکٹ کے گرم کوٹ پہن لیا۔ موٹر تو میں جب جیل میں تھا فروخت ہو چکی تھی۔ تاکہ میں سوار ہوا۔ حسرت صاحب کی کوٹھی نئی دہلی میں دفتر تھا۔ اسے نین سہل کے فاصلہ پر تھی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رات کو آٹھ بجے جب نانگ میں سامنے سے اور بے زورہ ٹھنڈی ہوا کے پھیپھڑے بچے گئے تو میری کیا حالت ہوتی ہوگی۔

حسرت صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو کرنل جمیل ملک۔ سیمیر فیض اور ان کی یو۔ این۔ بی۔ اور ڈاکٹر تاشیر اور ان کی یو۔ این۔ بی۔ ہری دت کے لئے موجود تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں جب صوفے پر بیٹھا تو میرے کمرے کے کنبوں میں گھپٹا پیدا ہوا۔ اور نہ صرف کنبوں کے ٹوٹنے کا خیال بلکہ کمرے کے سامنے کا حصہ ایسا معلوم ہونا جیسے بڑے سائز کے تنکے پر چھوٹے سائز کا خلافت چڑھا دیا گیا ہو۔ میرے لئے اب سوائے اس کے اور کوئی صوفہ نہ تھا کہ کنبوں کو کھول دیتا۔ چنانچہ میں نے کمرے کے کنبے کھول دیئے۔ ان تینوں صاحب اور دونوں لیڈیز نے تو کوئی کئی گرم کپڑے پہن رکھے تھے یعنی سر مشرک مہیض، گرم واسکٹ، گرم کوٹ اور گرم اور کوٹ مگر یہاں بچے کی فیض اور کنبے کنبوں کا کوٹ۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان یو۔ این۔ بی۔ لیڈیز نے میرے لباس کو دیکھ کر کیا خیال کیا ہو اور شاید ان بچاریوں نے سمجھا ہو کہ ہندوستان میں سکھوں کے ڈنر کا فرمی لباس ہی ہے یا میں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوں۔ کہ پچاس ساٹھ درجے کی سردی میں بھی گرمی محسوس کرتا ہوں۔ مجھ سے میری اس جنٹلمینیت کے متعلق نہ تو کسی لیڈی نے سوال کیا نہ کسی جنٹلمین نے۔ بیٹوں کی کھلی حالت میں ہی ڈرائنگ روم بازی میں شامل رہا۔ اور رات کو بارہ بجے ہارٹش اور اولوں کی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے واپس آیا۔

میں جب واپس آ رہا تھا تو زورہ کہہ کر دل میں خیال کرتا کہ در دیشوں کی کالی کھلی اور گاندھی بھگنوں کی کنٹمبری گرم چادر میں کتنا آرام ہے کہ جن میں سے کونے کا سوال ہے نہ پھیلنے کا۔ اور جو سردی سے محفوظ رکھنے کے باعث بار سے ہر حالت میں مفید ہیں۔

جو لوگ چربی کی زیادتی یا مرثا پے کی صحت سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ چربی کا جسم کے تناسب اور ضرورت سے زیادہ ہونا نہ صرف جسم میں کالی اور کستی پیدا کرنے کا باعث ہے اور اس سے عمر بھی کم ہو جاتی ہے۔ بلکہ موٹاپا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں مذاق و سخاوت کا باعث بھی ہے۔ اور موٹاپا کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بالکل ننگا قدام آدم آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے جسم کو دیکھے تاکہ اس کے دل میں اپنے فربہ جسم کے لئے نفرت پیدا ہو۔ اور وہ اپنی قربت اورادی کو استعمال کرتے ہوئے ورزش کرے۔ کم کھائے اور ضرورت ہو تو فاسٹے بھی کرے۔

# طوائفوں کی قابلِ حسم زندگی

میں اس سے پہلے ایک مضمون میں اپنے صحیح جذبات کا اظہار کر چکا ہوں کہ مجھے طوائفوں سے بے حد نفرت ہے۔ اور میرے لیے گندگی کے کسی ذخیرے کے قریب سے گزرتا آٹھانا گوار نہیں جتنا طوائفوں کے بازار میں سے اور میرا یقین ہے کہ سوائے بیوقوفوں کے حلقہ کے طوائفوں کے شعلہ ہر شخص کی ہری پوزیشن ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الذراغ شخص کا ایسی عورت سے محبت کرنا کیونکر ممکن ہے جس کی فصاحت و درجن نہیں سینکڑوں کے لئے وقف ہو۔ اور جو اگر شکر ادا بھی ہو۔ تو صرف روپیہ کے لیے۔ مگر باوجود ان جذبات کے انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں طوائفوں سے باتیں کیں ان کا گانا سنا۔ اور ان کے پراثر بیٹ حالات معلوم کیے۔

کئی برس ہوئے ہیں رسات کے موسم میں بھی گیا۔ مرحوم لالہ دینا ناتھ (ایڈیٹر ہندوستان ڈوٹیشن لاہور) وہاں بنا سہتی گھی کا کاروبار کرتے تھے۔ لالہ صاحب کے دل میں میرے سیلف میڈ ہونے کے باعث بہت عزت تھی۔ اور وہ میرے ہم وطن بھی تھے۔ میں جتنے روز بمبئی میں رہا لالہ جی ہر روز ملتے رہے۔ اور مختلف محرم پر باتیں ہوا کرتیں۔

لالہ دینا ناتھ میں تجارتی اعتبار سے چاہے کتنی کمزوریاں تھیں۔ اور کاروبار کے اعتبار سے ان کے دوستوں کو چاہے ہزار شکایتیں ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ مرحوم لالہ دینا ناتھ چال چلن کے اعتبار سے بہت ہی بلند تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی اپنے حلقے کے اندر نہ جانے دیا۔ اور آپ نے زندگی بھر غیر عورت کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ لالہ دینا ناتھ سے بمبئی میں ایک روز باتیں ہو رہی تھیں۔ تو زیر بحث موضوع طوائفوں کی زندگی تھا۔ لالہ دینا ناتھ کا خیال تھا کہ ان کی زندگی بہت آرام و راحت کی ہے۔ میں کہتا تھا کہ نہیں ان کی زندگی جہنم سے کم تکلیف دہ نہیں۔ باتوں باتوں میں فیصلہ ہوا کہ طوائفوں کی زندگی اور ان کے جذبات کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد ہم دونوں مع مرحوم مولانا عرفان سیکر میری خلافت کمیٹی "طوائفوں کے دورہ" پر روانہ ہوئے۔

ہم سب سے پہلے ایک ایسی طوائف کے ہاں گئے جس کو سینا کے چار آنہ کلاس کی طرح طوائفوں کی چار آنہ والی کلاس میں سے کہا جاسکتا ہے۔ اس طوائف کا گھر بارہ مربع فٹ کا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ کے نصف حصہ میں ایک پلٹنگ تھا جس پر سلی سی چادر پھیلتی تھی۔ اور ایک میز سا مگبیہ رکھا تھا۔ یہ بچاوی شنکار کی تلاش میں بارہ گزرنے والوں کو دعوت حسن و عشق دینے کے لیے خود دروازہ میں بیٹھی تھی۔ اور اس کا لباس سٹریٹ رنگ کی ساڑھی اور سرخ رنگ کی بنڈی تھا۔ ایسا کہ ہمارا شرع کے علاوہ میں غریب عورتیں پہنتی ہیں۔ اس کمرہ میں دو تین تصویریں بھی دیواروں پر لٹک رہی تھیں۔ جو دیوی دیتا دیوں کی تھیں۔ ہم لوگ اس طوائف کے دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ تو اس بچاری نے شکر ادا کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم لوگ اس کمرہ کے اندر گئے۔ اس نے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ایک چار پائی کے علاوہ بیٹھنے کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ تھی۔ اور اس پلید اور بیلے بستہ سے کراہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اور کوئی صورت نہ تھی۔ ہم تینوں اس چار پائی پر بیٹھ گئے۔

یہ بچادی اس خیال میں تھی کہ ہم تینوں بچاب کے فوجی تعلقے ہیں۔ اور نفسانی خواہشات سے مجبور ہو کر  
 سیمین لباس میں طوائفوں کے بازار میں دھکے کھا رہے ہیں۔ چنانچہ گفتگو شروع ہونے سے پہلے تک اس  
 بچاری کے چہرہ پر فرضی مسکراہٹ قائم رہی۔ اور یہ خوش فہمی کہ کیسا سعید و مبارک دین ہے۔ ایک نہیں تین  
 حکمارا تھے آئے۔ جو اگر دو دور دہیر بھی فیس ادا کرینگے تو چھ لپہہ بل جائیں گے چنانچہ ڈپریشن کی ترجمانی کا  
 فرض لالہ دینا نا تھ نے ادا کیا۔ اور ذیل کی گفتگو ہوئی۔

لالہ دینا نا تھ :- آپ کب سے اس بازار میں ہیں۔

طوائف :- مجھے گھر سے آئے ہوئے جا رہا ہوں برس ہو گئے۔

لالہ دینا نا تھ :- آپ کوہ کا کیا کرایہ دیتی ہیں۔

طوائف :- اس کھولی کا کرایہ ایک روپیہ روز ہے۔

لالہ دینا نا تھ :- کتنی ماہوار آمدنی ہو جاتی ہے۔

طوائف :- آپ کو آمدنی سے کیا۔ تم کام کی بات کرو جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔

لالہ دینا نا تھ :- ہمارا ارادہ شادی کرنے کا ہے۔ مگر تم کو اس مکان سے اچھا مکان۔ اچھا کھانا۔ اچھا کپڑا

اور آرام کی زندگی ملے۔ تو کیا تم شادی کر لوگی۔

طوائف :- آئے شادی کرنے والے۔ تمہارے جیسے سینکڑوں موالی رہہ معاش پھرتے ہیں۔ جو بچاری

عورتوں کو بھگالے جاتے ہیں۔ دور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی بازار میں درجنوں عورتیں موالیوں کی جان کر رہی

ہیں۔ ان کے گھر برباد ہو گئے۔

اس طوائف نے یہ کہا۔ اور کہنے کے ساتھ ہی اس نے بڑوس کی ایک بوڑھی عورت کو بلا لیا۔ جو اس کی

رشتہ دار یا بڑوس تھی۔ اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا: ”دیکھو یہ موالی مجھے شادی کرنے

کو کہتا ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ ہی یہ ہے کہ شریف عورتوں کو بھگالے جائیں۔ اور گھروں کو برباد کر دیں۔ اس

بوڑھی عورت نے بھی ہم لوگوں کو ترچھی اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں سے

پلے جاؤ۔ لالہ دینا نا تھ نہ صرف خود معقولیت پسند تھے۔ دوسرے شخص کو قائل کرنے کے اعتبار سے بھی آپ

بہت قابل تھے۔ آپ نے بوڑھی عورت پر ہل ہل پریشانی ظاہر کر دی اور کہا کہ ہم لوگ تو طوائفوں کی اصلاح

چاہتے ہیں۔ اور اس خیال سے ہی بات چیت کر رہے ہیں۔ چنانچہ اہل واقعہ ظاہر ہونے کے بعد نضا بالکل

بدلی گئی۔ ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان بچاریوں کی زندگی دودھ سے کم نہیں۔ جو

آٹھنی ہو سب کچھ خرچ ہو جاتی ہے۔ ایک پیسہ باقی نہیں بچتا۔ جب تک شباب قائم رہے۔ تب تک رگزارہ

پلتا ہے۔ اس کے بعد ان بچاریوں کو گداگری کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ ان سے شادی کرنے پر

آمادہ ہوتے ہیں۔ وہ جہلن جہ معاش اور فرض ناشناس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور شادی کرنے

کے بعد یا تو ان کو فروخت کر دیتے ہیں۔ یا چھوڑ دیتے ہیں۔ شرف کا طبقہ طوائفوں سے شادی کرنے پر آمادہ

نہیں ہوتا۔ ان حالات میں طوائفوں کی شادی سے بے حلف نفرت ہے۔ اور اگر اچھے فرض شناس اور شریف

شر ہر لیں۔ تو دنیا میں شاید ایک طوائف بھی اس پیشہ میں نہ رہے۔ سب ہی شادی کر لیں۔ اس طوائف

سے انٹرویو کے بعد ہم لوگوں نے رات کو گیارہ بجے تک رکیو کھڑا بیفوں کی دوکانداری کا وقت مغرب  
 کی نماز کے بعد اور رات کو گیارہ بجے ریڈیو کے آخری آداب عرض تک ہوتا ہے) کئی دوسری طوائفوں  
 کے ہاں جا کر بھی بات چیت کی۔ اور ان تمام طوائفوں کی بات چیت کا نتیجہ یہی ہے۔ جو ادب پر بتایا جا چکا ہے۔  
 دہلی میں پردہ پریم بائی (اور لالی دو مشہور طوائفیں تھیں۔ لالی بہت اچھی گانے دایلوں میں سے  
 تھیں۔ اور مرحوم ہمارا جہر کھارسی کے پاس ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار پر کم از کم تھیں۔ پردہ دہلی کے ایک  
 بہت بڑے رئیس کے پاس ملازم تھیں۔ اور دہلی کے اس رئیس کے ایڈیٹر ریاست کے ساتھ بہت ہی  
 گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان دنوں صاحب کے ہاں جب کہی پرائیویٹ دعوت ہوتی۔ تو آپ کے دوستوں  
 نے علاوہ پردہ لالی اور دوسری متحدہ طوائفیں بھی اس دعوت میں شریک ہوا کرتیں۔ ایک روز ایڈیٹر ریاست  
 بھی دعوت میں شریک تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر ریاست نے لالی سے کہا کہ جس صورت میں تمھارے  
 پاس کافی روپیہ اور جائداد موجود ہے۔ تم حرام کی زندگی کو ترک کیوں نہیں کر دیتیں۔ میرے اس سوال پر لالی نے  
 جواب دیا میں اسے زندگی میں بھول نہیں سکا۔ اس نے کہا۔

”اگر ہم حرام کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ تو دنیا میں حلال کی زندگی کون بسر کرتا ہے۔ آپ یہ خیال  
 نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی میٹلا۔ کچیلہ گندہ۔ سیباہ۔ بد صورت۔ بھدہ۔ تو نہ لگی ہوئی۔  
 منہ سے بدلو اور کہنے و کنجوس خصلت کا سیٹھ آئے ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس شخص کی طرف آنکھ  
 اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ مگر وہ پیسے لیے ہم اس کو خوش کرنے کے لئے سنگڑ کر کے اس کے سامنے  
 بیٹھتی ہیں۔ عسکراتی ہیں۔ محبت سے باتیں کرتی ہیں۔ اپنے دل کو مار کا اخلاص کا اظہار کرتی ہیں۔  
 اس کے منہ کی بدبو کی پروا تک نہیں کرتیں۔ اور یہ جو کچھ بھی چاہے ہم کرتی ہیں۔ تو آپ ہی ایمانداری  
 کے ساتھ بتائیے کہ کیا ہماری یہ کٹائی حرام کی ہے یا حلال کی۔ لوگ ہمارے روپیہ کو حرام کا روپیہ کیوں کہتے  
 ہیں۔ حالانکہ ہم دین کے ہر شخص کے محتاج بل پر روپیہ زیادہ محنت سے اپنی جان مار کر پیدا  
 کرتی ہیں۔“

لالی کی اس دلیل کا میرے پاس کیا جواب تھا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ طوائفوں کے دل کا محبت  
 کے ایک مرکز پر قائم نہ رہتا ہی ان کے لیے ایک ایسی سزا ہے جس کا ہزار دوزخ بھی سقا بل نہیں کر سکتے۔  
 بہت برس ہوئے ملک میں جب کھدر اور چرخہ کا زور تھا۔ اور باوجود چرخہ اور کھدر سے انتہائی نفرت  
 ہونے کے بھی ایڈیٹر ریاست نے کھدر اور چرخہ کے کوٹ سلوائے تھے۔ ایک بار ایک طوائف نے  
 باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس طوائف نے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایڈیٹر ریاست نے جب کھدر  
 کا لباس دیکھا۔ تو بہ حیران رہ گیا۔ اور اس کو یقین ہو گیا کہ ہاتھ کاغذ سی کی کھدر بخشی کی سپرٹ ہر اپنے اور  
 جیسے شخص پر اثر انداز ہے۔ راقم الحروف سے رہا نہ گیا۔ اور اس نے اس طوائف سے۔ دال کیا کہ آپ نے  
 کھدر کیوں پہنا۔ عورت تو صرف خوبصورتی کے لئے پیدا ہوئی ہے اور کھدر کپڑوں میں سب سے زیادہ بدلتا  
 اور بد صورت کپڑا ہے۔ میرے اس سوال کا اس طوائف نے جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

”ہم طوائفوں کا نہ کوئی ضمیمہ ہے نہ ایمان۔ ہم دوسروں کی خوشی کے لیے پیدا ہوئیں۔ اور دوسروں کی خوشی پر

ہماری زندگی کا انحصار ہے جس نے محسوس کیا کہ لوگ کھدور پہننے ہیں اور کھدور کو پسند کرتے ہیں۔ اس خیال سے جس نے بھی کھدور کا لباس اختیار کیا۔ اور روشنی کپڑے ترک کر دیئے۔ کہ شاید لوگوں کی نگاہوں میں میرا کھدور کا لباس زیادہ کشش کا باعث ہو۔ لوگ مجھے زیادہ پسند کریں۔ اور میری آمدنی میں اضافہ ہو۔ ورنہ جب ہم طوائفوں کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں۔ روپیہ کے لئے ہندو دھرتے ہوئے مسلمانوں سے اور مسلمان دھرتے ہوئے ہندوؤں سے تعلقات پیدا کر لیتی ہیں۔ ہمارے دل میں گناہ ہی یا کھدور کے لئے کیا محبت ہو سکتی ہے۔

دہلی میں ایک طوائف جمیدین بہت اچھی گانے والیوں میں سے شمار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ گانہ گوشتہ یا موجودہ تین یا چار بہترین گانے والیوں میں سے وہ ایک ہے۔ چند برس ہوئے دہلی کے زمانہ مسلمانوں نے مرحوم مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد مولانا کی یاد گاہ قائم کرنی چاہی۔ اور فیصلہ ہوا۔ سینا میں طوائفوں کے رقص اور گانے کی محفل منعقد کی جائے اور اس شو سے جو آمدنی ہو وہ مولانا کے یادگار فنڈ میں دی جائے۔ جمیدین سے اس شو میں گانے کے لئے درخواست کی گئی۔ تو بھاری مولانا محمد علی کا نام منکر بغیر کسی معاوضہ کے گانے کے لئے طیار ہو گئی۔ حالانکہ اس کو گانا چھوڑے عرصہ ہو چکا تھا۔ اور موسیقی کے فن کے شوقین اس کے گانے کو ترستے تھے۔ جمیدین عمر میں کچھ بڑی تھی اور اس شو میں جو دوسری طوائفیں تھیں اور گانے کے لئے آئیں۔ نوجوان تھیں۔ میں اس شو میں موجود تھا۔ اور یہ ہے کہ جمیدین کا گانا سننے کے لئے ہی گیا تھا۔ پہلے بھر گئے اور پھر گئے والی چھو کر لیں گانا ہی ہوا۔ لوگوں نے جی کھل کر تالیاں بجایں اور داد دی۔ اس کے بعد جمیدین کا تعارف ہوا تو لوگوں نے جمیدین کا نام سن کر تالیاں بجا نہیں۔ کیونکہ موسیقی کے اخت سے دہلی میں اس کی بہت شہرت تھی۔ مگر بھاری جب گانے لگیں تو لوگوں کا شور ہوا۔ تالیاں بجا لگیں بیٹھے جاؤ۔ جاؤ۔ فلاں بالی کو بھیجوا۔ رفلان جانا کہ بھیجھو کے نعرے بلند ہوئے یہ شور سن کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست (جو موسیقی کے بہت شوقین اور میزیک کا نفرین کو کا میا ہے) بلانے والوں میں سے تھے، شکایت کی۔ تو اس دوست نے آدھ سر دھرتے ہوئے کہا۔

”خدا اچھت کی زندگی اس کے شباب کے ساتھ فتم ہو جاتی ہے۔ مجب۔ ان کے شباب کا زمانہ جا چکا ہے۔ یہ بڑھاپے میں قدم رکھ رہی ہے۔ اور اکثر عجیب رسمیں کرتی ہے۔ مگر لوگ چاہتے ہیں کہ یہ سولہ سترہ برس کی کم سن لڑکی بن کر گائے۔ اس بھاری سے اب یہ کیونکر ممکن ہے۔“

اس شور میں جمیدین کی خود داری نے بھی گوارا نہ کیا کہ وہ گائیں۔ دوبرہ کے پیچھے چلی گئیں۔ اس کے بعد پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کی طوائف نے رقص کیا اور گایا جن کو نہ موسیقی کا علم تھا نہ سترال اور جن کے فنی گیتوں پر لوگوں نے فرائضی کے ساتھ داد دی۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے لوگ تو بچاس۔ ساٹھ۔ اسی یا سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ اور لوگ ان کو قبول نہیں کتے۔ مگر کامیاب سے کامیاب طوائف کی زندگی بھی اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ اس کے شباب اور بڑھاپے کے اتصال کا زمانہ نہیں آ جاتا۔ اس کے بعد تو وہ اگر چاہے بھی کہ لوگ اس

جیس اور یاد رکھیں۔ پہلک نہ دیکھنے کے لیے لیا تو ہے۔ نہ یاد رکھنے کے لیے۔ یعنی شباب کے گزرنے کے  
 اس کی پہلک مرث ہو جاتی ہے۔

جو لوگ خواہیوں کی زندگی کو آرام و راحت کی زندگی یا جو عورتیں خواہیوں کے رہنے بہنے کے طریقہ اور  
 ان کے حالات کو باعث کشش محسوس کرتی ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ خواہیوں کی زندگی انتہائی غلیظہ  
 و منحہ انتہائی تکلیف دہ اور انتہائی قابلِ رحم ہے۔ اور اگر ان کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص شادی  
 نہ کرنے کے بعد ان سے اچھا سلوک کرے گا۔ تو یہ خواہیوں اپنے چہرے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتی  
 ہیں۔

## پولیس کے گرگوں کی کارگزاریاں

چند برس ہوئے دہلی میں ایک شخص عبد الستار تھا جو ظاہر طور پر موٹروں کی مرث کا کام کرتا تھا۔ مگر  
 اس کا پیشہ دراصل کوکین فروشی بیٹھوں۔ ساہوکاروں اور سینوں کو دھوکا کر دہیہ وصول کرنا اور کرایہ کے  
 لوگوں سے قتل کرانا۔ یا خود قتل کرنا تھا۔ مگر میری معلومات کے مطابق جہاں تک قتل کے الزام کا سوال ہے  
 یہ قتل کرنے کے ہمارے قتل کرانے والوں کو آکر بنا کر ان سے دہیہ اڑا لیتا تھا۔ چنانچہ اس عبد الستار کو  
 دہلی گورنمنٹ نے غنڈہ ایکٹ کے ماتحت صوبہ دہلی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا۔

دہلی سے نکلنے کے بعد اس شخص نے پہلے نورا دلپنڈی میں تیار کیا۔ اور پھر لاہور میں۔ اور یہ ہمیشہ ہی اس  
 وحش میں رہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ دہلی واپس چلا جائے تاکہ وہاں اپنے غنڈہ بین کا سکہ پھر رائج کر سکے۔  
 چنانچہ لاہور میں اس نے وہاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس سٹر سید احمد کو تجویز یاد نہیں رہا۔ ان کا نام یاقوت سید احمد  
 تھا یا سید احمد۔ یہ صاحب غالباً اب پولیس کی فائز مست سے ریٹائر ہو چکے ہیں) کے ہاں آنا جانا شروع  
 کیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اس کے خدمات کا موقع دیا جائے۔ یہ پولیس کی خدمات انجام دے۔ اور ان  
 خدمات کے معاوضہ میں دہلی گورنمنٹ سے سفارش کر کے اسے دہلی رہنے کی پھر اجازت دلوائی جائے پولیس  
 افسروں کے دوستوں۔ خوشامدیوں اور خواریلوں کا زیادہ حلقہ بد معاش اور جرائم پیشہ لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ  
 ان کے ذریعے ان کو مقدمات کی تفتیش میں ہوا ملتی ہے۔ عبد الستار بھی ان سٹر سید احمد کے رازداروں۔  
 حواریوں اور دوہاریلوں میں شامل ہو گئے۔ اور دن رات آنا جانا شروع ہوا۔

لاہور کے جناح مسلم کالج فار ویمن (زمانہ اسلامیہ کالج) میں ایک پروفیسر سٹر عبد العزیز تھے  
 یہ صاحب عمر کے اعتبار سے خزان مگر خیالات کے اعتبار سے بوڑھے۔ یعنی دن رات قرآن متنازل  
 روزہ حدیث اور دوزخ و بہشت کا خیال۔ خاکسار جماعت کے ممبر اور علامہ مشرقی کے عزیز مریدوں میں  
 سے عبد الستار کو جب یہ علم ہوا کہ پروفیسر صاحب مذہبی خیال کے خاکسار ہیں۔ تو اس نے آپ کے  
 ہاں بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو خاکسار ظاہر کیا۔ نماز با جماعت مشروع ہوئی۔ مذہبی مسائل  
 اور مفسر و بہشت کے نتائج پر بحث ہو کرتی۔ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور عبد الستار کا

کافی وقت پر و فیسہ عبدالعزیز کے مکان درجہ سعدی پارک نرنگ میں تھا، پر گزرتے لگا، اور پر و فیسہ کو یقین ہو گیا کہ عبدالستار پکا خاکسار اور اسلامی اخوت کے رنگ میں رنگا ہوا جانا۔ عبدالستار نے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سعید احمد سے ایک روز کہا کہ اسے ایک بہت بڑی سازش کا علم ہوا ہے۔ اور یہ سازش خاکساروں کی طرف سے سرسکندر حیات کو قتل کرنے کی ہے اور یہ اس سازش کو بکھڑا سکتا ہے۔ یہ اطلاعات سن کر سعید احمد صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور آپ نے وعدہ کیا کہ اگر عبدالستار اس سازش کو بکھڑا دے تو پنجاب گورنمنٹ دیملی گورنمنٹ سے سفارش کر کے عبدالستار کے دیملی میں داخلہ کی ممانعت کا حکم منسوخ کر دے گی۔ چنانچہ ادھر تو عبدالستاد سعید احمد صاحب کو سازش کے متعلق غلط اطلاعات دیتے رہے اور ادھر پر و فیسہ عبدالستار سے تعلقات مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔

عبدالستار نے ایک روز سعید احمد صاحب سے کہا کہ ایک خاکسار پر و فیسہ عبدالعزیز مسلح ہو کر آ شام کو سات بجے سرسکندر کو ہلاک کرنے کے لئے سرسکندر کی کوشی جانے والے ہیں۔ اور ان کو راستہ میں گرفتار کر لیا جائے۔ مسٹر سعید احمد نے پوری تیاری کر لی۔ اور شام کے لئے متحدہ انسپکٹر سب انسپکٹر اور کانسٹیبل ریوالوں سے ایس جے کر لئے گئے۔ اور فیصلہ ہوا کہ پر و فیسہ کو سعدی پارک اور سرسکندر کی کوشی کے درمیان ہر گز گرفتار کر لیا جائے۔

اسی روز عبدالستار نے پر و فیسہ عبدالعزیز سے کہا کہ شام کو سینا چلیں۔ پر و فیسہ عبدالعزیز اس رخصتا سند ہو گئے۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ شام کو چھ بجے کے قریب عبدالستار پر و فیسہ صاحب کے مکان پر آئیں گے اور پھر ان کے ساتھ سینا چلیں گے۔ چنانچہ شام کو چھ بجے عبدالستار پر و فیسہ صاحب کے مکان پر پہنچے۔ اور کچھ پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے ایک ضروری کام ہے۔ یہ اس ضروری کام سے فارغ ہو کر سیدہ حسینا پہنچ جائے گا۔ اور اس دیوالیہ درجہ عبدالستار کی جیب میں تھا۔ اور جب عبدالستار نے راز داری میں اپنے جیب سے نکال کر پر و فیسہ صاحب کے جیب میں ڈال دیا کہ اپنے ساتھ لے جائیے۔ کیونکہ جہاں وہ ضروری کام کے لئے جا رہا ہے وہاں اس لئے جانا نہیں چاہتا۔ عبدالستار بطور خاکسار اور جانا باز کے پر و فیسہ عبدالعزیز کے اعتماد میں آچکا تھا۔ پر و فیسہ صاحب نے بھروسہ کیا اور آپ ریوالور حسیب میں رکھ کر سینا کروانہ ہو گئے۔ جس سینا میں جاسے کا فیصلہ ہوا تھا یہ سینا پر و فیسہ کے سعدی پارک واسطے مکان اور سرسکندر حیات کی کوشی کے درمیان ہے۔ پر و فیسہ صاحب اپنے مکان سے لشکر فرار لٹک لئے ہوں گے کہ مسٹر سعید احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مع سب انسپکٹر سب انسپکٹر دیملی اور کانسٹیبلوں کے پر و فیسہ عبدالعزیز کو پہنچنے سے بکھڑا لیا۔ تاکہ پر و فیسہ صاحب نہ کر سکیں مگر فتاری کے بعد تلاشی ہوئی تو پر و فیسہ صاحب کے جیب سے ریوالور برآمد ہوا۔ گواہ

نے جامہ تلاشی کی فہرست پر دستخط کئے۔ اور اگلے روز صبح کے اخبارات میں چار چار کالم کی علی شریف اور عنوانات کے ساتھ پہلو صفحہ پر خبریں شائع ہوئیں۔ "سرسکندر حیات کو قتل کرنے کی سازش میں عبدالستار کی گرفتاری"۔ اسی پر و فیسہ عبدالعزیز کے جیب سے ہر گز ایک گولی کا ریا اور برآمد ہوئیں گا کا کیا چاہا؟



پروفیسر صاحب کی گرفتاری کے بعد ان پر مقدمہ چلا۔ اور مجسٹریٹ نے آپ کو سرسکندر حیات کو قتل کرنے کی غیت اور کرشش کے جرم میں کئی برس کی سخت سزا دی۔ اور پروفیسر صاحب سنٹرل جیل لاہور میں تشریف لے آئے۔ آپ کے وہاں آنے سے پہلے ایڈیٹر ریاست سنٹرل جیل میں موجود تھا اور آپ بھی اس کمرہ میں ہی مقیم ہوئے جہاں کہ ایڈیٹر ریاست تھا۔

ایڈیٹر ریاست نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے۔ قرآن کی تلاوت میں بھی نافذ نہ ہوتی۔ اور خاموشی زندگی بسر کرتے جیل میں چاہے سینکڑوں تکلیفیں ہوں مگر جیل کی زندگی کا یہ روشن پہلو ہے کہ وہاں کوئی شخص اپنی فطرت کو چھپا نہیں سکتا۔ اور ایک دوسرے کے اصل حالات اور خصائل سے انسان واقف ہو جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے لئے میرے دل میں نہ صرف عزت بلکہ کچھ محبت کے جذبات بھی پیدا ہو گئے۔ میں جب وہاں سے رہا ہوا تو پروفیسر صاحب کے مقدمہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر کی جا چکی تھی۔ اور پروفیسر صاحب جیل میں ہی موجود تھے۔

میں جیل سے رہا ہونے کے بعد جب دہلی پہنچا تو پروفیسر صاحب کی بے گناہی اور سزا باری میرے دل میں ایسے ہی کھٹک رہی تھی جیسے جسم کے کسی حصہ میں پھالتس ہو۔ ہر وقت یہی خیال کہ پروفیسر صاحب کے لئے کیونکر مفید ثابت ہو کر اپنا فرض ادا کروں۔ مقدمہ کی اپیل ہائی کورٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ اگر اخبار میں لکھتا ہوں تو توہین عدالت کا نیا مقدمہ۔ اور اگر نہیں لکھتا تو پروفیسر صاحب ساہا

سل کے لئے جیل میں اور میں فرض ناشناسی کا جرم۔ میں دو تین روز سوچتا رہا۔ آخر فیصلہ کیا کہ توہین عدالت کا مقدمہ چلے اس کی پروا نہیں۔ فرض سے پیچھے قدم ہٹانا بزدلی ہوگی اخبار میں ضرور لکھنا چاہیے۔ چنانچہ ”ریاست“ میں ایک نوٹ لکھا گیا جس میں اس تمام سازش اور عداوت کی بدنامی اور اس کے

دہلی کے پچھلے واقعات کو بے نقاب کر دیا گیا۔ مضمون کے شائع ہونے کے بعد اس کا گنگ میں نے سر وٹکس سنگ چھٹ جٹس ہائی کورٹ کو بھیجا۔ اور ساتھ خط لکھا کہ آپ کے عہد میں اس طرح سے بے گناہ اور مصوم لوگ عندوں اور پولیس کا شکار ہو رہے ہیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ چونکہ مقدمہ عدالت میں ہے

میرا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو لکھنا خلاف قانون اور توہین عدالت ہے مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا تو اس

لکھنے کا اثر یہ ہوا کہ جب پروفیسر صاحب کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو مقدمہ سننے والے نے مجھ نے عدالت میں کہا۔ ”میرے شاہدوں کو پروفیسر عبدالعزیز سرسکندر کو قتل کرنے کے لئے نہ جا رہے تھے اور ان کے خلاف عبدالستار کی سازش ہے۔ مگر پروفیسر کے جیب سے ریوا لور نکلا۔ پروفیسر کو علم تھا کہ یہ ریوا لور ہے۔ کسی دوسرے شخص نے ان کے علم کے بغیر ان کی جیب میں نہیں رکھا۔ اسی صورت میں پروفیسر کیٹ اسلحہ سے بری کیونکر ہو سکتا ہے؟“ چنانچہ پروفیسر صاحب کی طویل برسر کی قید میں تخفیف کی گئی۔ اور جو سزا ان کو ملی وہ ریوا لور روکنے کے جرم میں تھی۔ اور آپ سرسکندر کو قتل کرنے کی سازش کے الزام سے بری کیے گئے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے برگے بیگانہ ہوں کو پھنسانے کے لئے کیونکر پولیس کے دست

ریاست ثابت ہوتے ہیں۔

یوہنی کی عدالتوں کے اشتہارات "ریاست" میں کثرت کے ساتھ شائع ہوتے رہے تو ایک رالموڑہ کے ایک منصف (جو عیسائی تھے) کا خط دفتر "ریاست" میں پہنچا کہ آپ آئندہ "ریاست" نام نہ بھیجئے۔ کیونکہ ان کو ٹیکرٹس کے حکم بلا کہ آئندہ کوئی اشتہار چھپنے کے لئے "ریاست" میں نہ بھیجا جائے۔ اور وہ آئندہ اشتہار نہ بھیجنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد اسی ہفتہ۔ یوہنی کی عدالتوں کے اشتہارات "ریاست" میں آئے قطعی بند ہو گئے۔ یعنی ایک ہزار روپیہ ماہ روپیہ میں فوراً کمی ہو گئی۔

تو ریاست کے عدالتی استتہارات بند ہونے کے بعد میں رہ آباد گیا۔ تاکہ معلوم ہو گیا جائے کہ اس حکم امتناعی کی وجہ کیا ہے۔ میں رہ آباد پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ وہاں معلوم کیا کہ انفرمیشن بیورو کے کون صاحب انچارج ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مسٹر جوشی ہیں۔ جو پہلے اخبار لیڈر کے سب ایڈیٹر تھے۔ میں جب نا بھہ میں تھا تو یہ۔ پی کے ایک ریٹائرڈ سیشن جج رائے بہادر تمبہروٹ نا بھہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ مجھے رائے بہادر جوشی سے ہی نا بھہ میں معلوم ہوا تھا کہ ان کے صاحبزائے رہ آباد کے اخبار "لیڈر" کے سب ایڈیٹر ہیں۔ مجھے ذرا خیال ہوا کہ شاید یہ انفرمیشن بیورو کے مسٹر جوشی رائے بہادر تمبہروٹ جی کے صاحبزادے ہوں۔ چنانچہ میں نے معلوم کیا تو میرا خیال درست نکلا۔ میں مسٹر جوشی کے گھر پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ برائمنوں کی سادہ زندگی۔ سفید دھوئی پہنے سفید چاندو کے فرش پر بیٹھے تھے۔ میں نے اپنا وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ اندر بلا لیا۔ بہت تپاک اور اخلاص کے ساتھ ملے۔ باتیں ہوئیں تو انھوں نے دفتر جا کر کاغذات دیکھنے کا وعدہ کیا۔ میں تمام کو بھر گیا تو ان سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے بعض اہم دو اخبارات نے مسٹر چیتامتی سے شکایت کی کہ "تو ریاست" اس صورت کا اختیار نہیں مگر یہ۔ پی کے تمام سرکاری استتہارات لے جاتا ہے۔ اس کے استتہارات بند ہونے چاہئیں۔ مسٹر چیتامتی نے گورنر کو لکھا۔ اور گورنر کے سیکریٹری کا خط ہائی کورٹ میں پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تو ریاست" کے تمام عدالتی استتہارات بند کر دیئے گئے۔

مرحوم پنڈت صاحب لال نہرو ممبر سنسکرت سہیلی ذمہ داری پنڈت سرتی لال نہرو کے بیٹے اور پنڈت

اہر لال نہرو کے چچا زاد بھائی) ایڈیٹر ریاست کے بہت گہرے دوست تھے۔ اور آپ جب کبھی جلی کے سبکدیس دہلی میں مقیم ہوتے تو اکثر دفتر ”ریاست“ میں نشریہ لاتے۔ اور ایڈیٹر ریاست“ ی ان کی جائے قیام پر جایا کرتا۔ وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ اسمبلی کے نوجوان ممبروں کا ایک گروپ تھا۔ میں پنڈت شبام لال نہرو۔ مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا آئر۔ مسٹر جی۔ سی۔ گو سوامی۔ دیوان چمن لال۔ مسٹر بگی اور مسٹر بی۔ داس وغیرہ تھے۔ یہ تمام کے تمام محب الوطن آتش بیان اور گورنمنٹ کے لئے باعث عیبیت حضرات تھے۔ ایڈیٹر ریاست کے ان سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور آنا جانا تھا میں شرجوشی سے فاسخ ہو کر پنڈت شبام لال نہرو سے ملنے گیا تو وہ میرے بغیر اطلاع آنے پر حیران سے گئے۔ اور کہا کہ اطلاع کیوں نہ دی سیشن پر لینے کے لئے پہنچتے ہیں نے کہا کہ میں اشتہارات کے متعلق علوم کرنے آیا تھا۔ کل سے یہاں ہوں ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اور رات کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ ڈٹ جی بہت ناراض ہوئے۔ اور ان کی بیوی نے بھی بار بار کہا کہ ہوٹل سے سلمان منگایا جاتا ہے۔ اور میں ان کے ہاں قیام کروں۔ میں نے شام کو واپس جانے کا عذر کیا۔ چنانچہ میں پنڈت جی کے ہاں کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ رکھنا بھی دیا ہی کھایا۔ پنڈت جی کی صاحبزادی اس زمانہ میں وکالت میں پڑھتی تھیں۔ جن کی شادی بندیں ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ہوئی۔ اور ان کا صاحبزادہ فوج میں لفٹنٹ ہونے والا تھا یا ہو چکا۔ ان کے فوج میں جانے کا ذکر ہوتا رہا۔ پنڈت شبام لال جی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ تو آپ نے کہا کہ وچچا پنڈت موتی لال نہرو کے ہاں چلیں۔ پنڈت جی اپنی کار میں مجھے ساتھ لے گئے۔ وہ کار بھی چلا رہے تھے۔ اور باقیں بھی کرتے جاتے تھے۔ آپ نے بتایا کہ پنڈت موتی لال نہرو پرسوں ہی بھوپال سے آئے۔ میں نے پوچھا کہ بھوپال کیوں گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ کسی قانونی مشورہ کے لئے میں نے پوچھا بیافیس لی۔ تو آپ نے بتایا کہ بیس ہزار روپیہ۔ میں نے مزید کہہ دیا چاہا تو آپ نے کہا: ”قانونی مشورہ درمقام کیا ہے۔ یہ تو یہاں ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ بھوپال میں کانگرس کے لوگ ایچی منشن کریں اور چچا سے گہری دوستی جو“

باتیں کرتے ہوئے ہم پنڈت موتی لال جی کے مکان آئند بھون پہنچے۔ پنڈت جی برآمدہ میں بیٹھے تھے۔ اور ان کے پاس مولانا ابوالکلام بھی تھے۔ پنڈت شبام لال جی نے میرا تعارف کرایا تو ڈٹ موتی لال جی نے کہا۔

”میں سردار صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں“ پنڈت موتی لال جی اس وقت خربوزے کھا رہے تھے۔ میں اس سے پہلے خربوزے چاقو سے کٹی پھانکیں کر کے کھایا کرتا تھا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ پنڈت جی خربوزے کو تروزی کی طرح درمیان سے دھکڑے کر کے چم کے ساتھ کھا رہے ہیں پنڈت جی ہمیں بھی خربوزہ کھانے کے لئے کہا۔ ہم زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ بیٹھے اور واپس چلے آئے۔ جرنلسٹوں کو یہ مذاکرات بہت پسند آئے کہ جس طرح پولیس والے کسی نوجوان کے ہاں اپنی تصویر اتارنے کے لئے میں تو ہاں ملنے ہوئے خوشوں میں سے بھی اشتہاری ملزموں کے چہروں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ فہار بزیں چلتے پھرتے، باتیں کرتے ہوئے، ہمیشہ ہی نئی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور ان کے لئے

کسی دلچسپ خبر کو ضبط کرتے ہوئے اخبار میں شائع نہ کرنا بہت ہی امتحان طلب مسئلہ ہو کر رہا ہے۔ میں نے واپسی کے وقت پنڈت شیاام لال جی سے بھوپال کے متعلق مزید دریافت کرنا چاہا۔ مگر ان کو زیادہ کچھ معلوم نہ تھا اور نہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ میں اپنے اخبار کے لئے مواد حاصل کر رہا ہوں۔

واپس آنے کے بعد میں فقوڑی دیر پنڈت شام لال جی کے مکان پر بیٹھا اور پھر پنڈت جی مجھے میرے ہوٹل چھوڑ گئے۔ میں شام کو الہ آباد کی سیر کے لئے گیا۔ زمر مرحوم سید اکبر الہ آباد کی یا ڈنا زہ ہو گئی۔ مرحوم سید اکبر کا انتقال ہوئے کئی برس ہر چکے تھے۔ جی چاہا کہ اس مکان کو پھر دیکھوں۔ جس میں مرحوم رہا کرتے تھے۔ اور جہاں میں نے مرحوم کے ساتھ کئی روز تک دن میں کئی کئی گھنٹے باتیں کی تھیں۔ میں سید اکبر کے مکان پر پہنچا۔ مکان بند تھا۔ صحن کی گھاس بھی اچھی حالت میں نہ تھی۔ کیونکہ مرحوم کے صاحبزادے سید عشرت حسین الہ آباد سے باہر ملازم تھے۔ اور اس مکان میں صرف ایک ملازم تھا۔ جس کا کام سوائے کھانے اور سونے کے دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں اس مکان کو حسرت کی نگاہوں کے ساتھ دیکھ کر واپس ہوٹل آیا۔ آہ وہ مکان آج سسنان پڑا ہے جہاں اردو زبان کے اس شاعر عظیم کی زبان سے الہام نازل ہو کر رہا تھا۔

میں رات کو الہ آباد سے سوار ہو کر واپس دہلی آیا۔ اور اسی ہفتہ ایک نوٹ ذاب بھوپال کے متعلق لکھا۔ جس میں ذاب بھوپال پر الزام لگایا گیا کہ وہ پبلک آڈار کو دہانے کے لئے ملک کے لیڈروں کو دعوتیں دیتے ہیں۔ اور قانونی مشورہ کے نام پر بیس بیس ہزار روپیہ مقرر کیا جاتا ہے۔ جسے رشوت قرار دیا جاسکتا ہے۔

ذاب بھوپال ”ریاست“ کے مضامین سے بہت تنگ آچکے تھے۔ اور ذاب صاحب کی مطلق العنانی اور بھوپال ایڈیٹر شپ کو بے نقاب کرنے میں ”ریاست“ نے اس سے پہلے کافی حصہ لیا تھا۔ اس ضمن میں کہ دیکھ کر ذاب صاحب نے اپنے سیکریٹری سر شعیب قریشی (جو آجکل کسی ملک میں پاکستان کے سفیر ہیں) کو پنڈت موتی لال نہرو کے پاس بھیجا۔ اور کہا کہ آپ پر بھی رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو فطرتاً بہت ضدی اور غیر ضروری طور پر خوددار تھے۔ شعیب قریشی کی انجمن سے متاثر ہوئے اور آپ نے ڈاکٹر کاٹھوڑ جو آجکل مدھیہ پردیش کے صوبہ میں وزیر اعلیٰ ہیں) کی معرفت ایڈیٹر ریاست، کو معافی مانگنے پر توجہ دے دی۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں مقدمہ دائر کرنے کا نوٹس دیا۔ اس نوٹس کے پہنچنے ہی ایڈیٹر ”ریاست“ نے الزام کے صرف روپیہ اور رشوت کے حصہ کی تردید کر دی یعنی پنڈت موتی لال نہرو پر لگایا گیا الزام تو واپس لے لیا۔ مگر ذاب بھوپال پر لیڈروں کے ذریعہ پبلک آڈار کو دہانے کا الزام واپس نہ لیا۔

اس تردید کے بعد ذاب بھوپال کی طرف سے پنڈت موتی لال نہرو پر زور دیا گیا کہ وہ ایڈیٹر ریاست سے ذاب بھوپال کے متعلق بھی تردید کرائیں۔ اور ادھر سردار سنگھ کو لیٹر (جو اس زمانہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے) اور لالہ گدھاری لال امرتسری (جو پنڈت موتی لال نہرو کے دوستوں میں سے تھے) نے پنڈت جی سے کہا کہ وہ ذاب بھوپال کے مسئلہ کو چھوڑ دیں۔ ذاب بھوپال سے دیوان سنگھ خود۔

نپٹ لیگا۔ پنڈت جی کی ذات کے متعلق تردید ہو چکی ہے۔ اسے کافی سبھا جائے۔ چنانچہ کئی ماہ کی اس کش مکش کے بعد پنڈت جی نے نواب بھوپال پر لگائے گئے الزام سے اپنی غیر دلچسپی کا اظہار کر دیا۔ اور اس مضمون کی بنا پر ہی نواب بھوپال نے ایڈیٹر "ریاست ہوشنگ آباد" میں پرنس پر وٹیکشن ایکٹ کے تحت فوجداری مقدمہ چلایا جو چھ سال تک چلتا رہا۔ کئی بار ہائیکورٹ میں گیا اور طوالت کے اعتبار سے یہ مقدمہ ہندوستان کے تمام گذشتہ فوجداری مقدمات سے زیادہ طویل تھا۔ اس مقدمہ کے واقعات میں آئندہ صفحات میں عرض کر دوں گا۔

پنڈت موئی لال نہرو نے نوٹس دیا۔ مقدمہ کی دھکی دی مگر بطور ایک اخبار نویس کے میری زبان یا میرے قلم سے آج سے پہلے یہ اشارہ بھی کبھی ظاہر نہ ہوا کہ میں ہزار روپیہ کی اطلاع دینے والے ان کے حقیقی بھتیجے پنڈت شیا م لال نہرو تھے۔ میں مرحوم پنڈت شیا م لال پر الزام نہیں لگاتا۔ انھوں نے یہ واقعہ معمولی طور پر باتیں کرتے ہوئے نیک نیتی کے ساتھ بیان کیا اور ان کو خیال بھی نہ تھا کہ میں ان کی اس اطلاع کو استعمال کر دوں گا۔ اور آج بھی اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں تو صرف اس لئے کہ اس دلچسپ واقعہ کو بیان کرنے سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور آج اس کی حیثیت محض ایک دلچسپ واقعہ سے زیادہ نہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک اخبار نویس کے لئے جہاں سی اہم اطلاع کو مضمر کرنا اور اخبار میں شائع نہ کرنا بہت مشکل ہے وہاں اطلاع دینے والوں کے ام کا اظہار کرنا بھی خلاف اخلاق، خلاف ایمان اور اعتماد کشی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے پاس اخبار نویسوں کو مصائب بھی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔

## مقدمہ ہوشنگ آباد

۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے مجھے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کے ایک ذریعہ سے اطلاع ملی کہ اب بھوپال مقدمہ نواب بھوپال بنام اخبار "طاقت" دہلی میں ایڈیٹر "طاقت" سے معافی منگوانے اور یہ بکھولنے کے بعد آئندہ وہ اخبار کسی دایہ ریاست کے خلاف کبھی بھی کچھ نہ لکھے گا۔ بطور فاتح بہت مغرور ہو چکے ہیں۔ اور اسی طرح سے ایڈیٹر ریاست کے خلاف بھی پرنس وٹیکشن ایکٹ کے تحت مقدمہ چلانے کی گورنمنٹ ہند سے منظوری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور سیکم یہ ہے کہ پے درپے متعدد اخبارات کے خلاف مقدمات چلا کر اس آواز کو بالکل بند کر دیا جائے۔ جو ریاستوں کے مظالم کے متعلق اخبارات کے ذریعہ اٹھائی جا رہی ہے۔ اور اس طرح نواب بھوپال ایمان ریاست سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ لے کر اپنے چائلڈ ہونے کے لئے میدان لیتا کریں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر چارلس ڈاشن پولیٹیکل سیکریٹری نے اس وجہ سے کہ نواب بھوپال نے اخبار "طاقت" کو الزام مقدمہ بغیر گورنمنٹ ہند کی منظوری کے عدالت سے واپس لے لیا۔ حالانکہ گورنمنٹ ہند کی منظوری کے ساتھ چلایا گیا تھا۔ ایڈیٹر ریاست کے خلاف مقدمہ چلانے کی منظوری دینے

سے انکار کر دیا تھا۔ مگر جب نواب بھوپال کی طرف سے پھر زور دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ نواب بھوپال اس مقدمہ میں ہاریں یا جیتیں وہ ذمہ دار ہونگے۔ اور گورنمنٹ چاہے تو کوئی امداد نہ دے۔ میر جالیں نے غصہ میں آکر اور مجبور ہو کر منظوری دے دی ہے۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملنے پر ریاست میں ایک نوٹ شائع ہوا۔ جس میں یہ لکھا کہ اطلاع دی گئی کہ نواب بھوپال ریاست کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والے ہیں۔

نواب بھوپال نے یہ مقدمہ ریاست بھوپال کے قریب ہوشنگ آباد میں دائر کیا۔ جہاں سے کہ ریاست بھوپال کی حد ایک میل پر ملتی ہے (یعنی دونوں علاقوں کے درمیان دریا کے نزدیک ہے) اس سے پہلے نواب بھوپال نے اخبار ”طاقت“ کے خلاف مقدمہ دہلی میں دائر کیا تھا مگر ایڈیٹر ریاست کے خلاف دہلی سے چھ سو میل کے فاصلہ پر ہوشنگ آباد دائر کیا گیا۔ اتنی دور مقدمہ دائر کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایڈیٹر ریاست مقدمہ کی پیروی نہ کر سکے گا۔ اس کے راستہ میں قدم قدم پر مشکلات پیدا ہوں گی اور یہ تو بہ کہتے ہوئے آئندہ نہ صرف نواب بھوپال بلکہ کسی دایئے ریاست کے خلاف بھی کبھی کچھ نہ لکھے گا۔ معافی مانگ لیا گیا اس کے اخبار کو بند کرنے کے لیے مجبور کر دیا جائے گا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں لاہور کس کام کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک دو دن رہا۔ جب وہاں سے واپس آنے کے لئے سوار ہوا۔ تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنجاب کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر سنبھال سٹے۔ ڈاکٹر صاحب میرے بہت مخلص دوستوں میں سے تھے۔ اور ریاست کو قدر اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس گاڑی میں ہی دہلی کے لیے سوار ہوئے۔ ہم لوگ جب دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ تو اسٹیشن پر اترتے ہی بھوپال کے انسپکٹر جنرل پولیس خواجہ محمد اکرم۔ ریلوے پولیس کے ایک سب انسپکٹر (جن کو خواجہ اکرم اپنے ساتھ بھوپال ریلوے پولیس سے لائے تھے) اور بھوپال پولیس کے متورڈ انسپکٹروں۔ سب انسپکٹروں اور کنسٹیبلوں نے پلیٹ فارم پر اترتے ہی مجھے آگھیرا۔ اور کہا کہ میرے وارنٹ گرفتاری دلتا شی ہیں۔ اتنے میں دوسرے ڈبے سے ڈاکٹر سنبھال میرے پاس آگئے۔ ان کو لینے کے لئے دہلی کے کانگریسی لیڈر لالہ شنکر لال بھی اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سنبھال کو تعجب ہوا کہ ریلوے اسٹیشن پر ہی گرفتاری کی جا رہی ہے۔ لالہ شنکر لال کے ایڈیٹر ریاست کے ساتھ تعلقات نہ تھے (بعد میں کافی دوستانہ اور اخلاص کے تعلقات قائم ہوئے) ڈاکٹر سنبھال نے لالہ شنکر لال کو ایڈیٹر ریاست کے ساتھ کو توالی بھیجا کہ وہ وہاں ضمانت دے دیں۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں میرا خیال ہے کہ غالباً ڈاکٹر سنبھال بھی ہمارے ساتھ ہی کو توالی گئے۔ پولیس کی جمعیت بھی ہمارے ساتھ تھی کہ توالی میں لالہ شنکر لال نے میری دہزار روپیہ کی ضمانت دی۔ کہ میں آئندہ جیشی پر ہوشنگ آباد کی عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا (مجھے کئی روز بعد معلوم ہوا کہ لالہ شنکر لال میری ضمانت دینا نہ چاہتے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر انصاری لالہ شنکر لال کی انشورنس کمپنی وغیرہ کے ڈائریکٹر

تھے۔ اور ڈاکٹر انصاری نواب بھوپال کے دوست اور ریاست بھوپال کے وظیفہ خوار تھے۔ یہ معلوم کر کے مجھے بے حد تکلیف ہوئی۔ کیونکہ میں کسی شخص کی باوثاقیت ہونا۔ یا ایسے شخص کا احسان برداشت کرنا، جرنل چاہتا ہوں، میرے ذہن کے لیے ایک اذیت ہوا کرتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے علم اُس وقت ہوا جب کہ میں ہوشنگ آباد کی عدالت میں حاضر ہو چکا تھا۔ اور لارڈ سنکر لال کی ضمانت کی میعاد گزر چکی تھی۔ درنہ میں فوراً لارڈ سنکر لال کی جگہ کسی دوسرے دوست کی ضمانت دلوا دیتا) کو تواری میں ضمانت دینے کے بعد پولیس کے ساتھ ہی دفتر ریاست میں آیا۔ اور دفتر ریاست کی ملاشی شروع ہوئی۔ ملاشی کئی گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ پولیس بھوپال کے نامہ نگاروں کے خطوط حاصل کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ اُن کے نام معلوم ہوں۔ اور اُن پر منظم کیے جاسکیں۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔

چند تصویر بتائیں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا پولیس خریداروں اور ایجنٹوں کے رجسٹر اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی۔

ملاشی جہی رہی تھی۔ کہ دوستوں اور اخبار نویسوں نے آنا شروع کیا۔ ملاشی سے فارغ ہوا تو میں نے سوامی رامانند جی کو (جو سوامی شروع ہندو جی کے کسی زمانہ میں دست راست تھے۔ اور اُس زمانہ میں دہلی کے سیاسی لیڈر تھے) بلا بھیجا۔ وہ میرے بہت نخلص دوست تھے۔ میں نے اُن سے کہا۔ کہ وہ آج ہی رات کی گاڑی ہوشنگ آباد جائیں۔ وہاں کے مجسٹریٹ کے متعلق معلوم کریں کہ وہ کن ہے۔ کیا اُس کا تعلق نواب بھوپال سے ہے۔ یا نہیں۔ اور دوسرے حالات معلوم کرنے کے علاوہ وہاں نئی ضمانت کا بھی انتظام کریں۔ کیونکہ لارڈ سنکر لال کی ضمانت تو صرف عدالت میں حاضر ہونے تک کے لئے تھی۔ سوامی رامانند جی رات کی گاڑی سے ہوشنگ آباد تشریف لے گئے۔ وہاں یہ کانگریسی اور ہندوؤں کے لیڈروں سے ملے۔ حالات معلوم کیے۔ مسٹر شہنشاہ مصرا (میر عمر گزی آہلی) سے ضمانت دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ مجسٹریٹ مسٹر نگم ہیں۔ جن کا بھوپال سے کوئی تعلق نہیں۔ سوامی جی تمام انتظام کرنے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد میں نے مسٹر بی بی توکلی ایڈوکیٹ سے مشورہ کیا۔ اجیر سے سردار بہادر بنگوان سنگھ بیربر بھی تشریف لے آئے۔ اور مقدمہ کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہم لوگ معہ سوامی رامانند جی کے ہوشنگ آباد روانہ ہوئے۔ ہوشنگ آباد میں ہم لوگ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے۔ معلوم ہوا کہ نواب بھوپال نے مقدمہ کے لئے خان بہادر عبدالرحمن (جو بعد میں لاہور ہائی کورٹ کی ججی سے ریٹائر ہوئے) کو وکیل مقرر کیا ہے۔ خان بہادر کے علاوہ نصف درجن کے قریب دوسرے وکیل بھی کیے گئے ہیں۔ اور بھوپال سے دو درجن سے زیادہ پولیس افسر اور ملازم آئے ہیں۔ اور ان سب کے لئے جیسے نصب کیے گئے ہیں۔ اور کھانے کی دیگر سہولتیں بھی ہیں جیسے کہ کوئی عرس ہو۔

دس بجے کے قریب ہم عدالت میں پہنچے۔ مجسٹریٹ مسٹر نگم تھے۔ جو خیالات کے اعتبار سے رادھا سوامی تھے۔ مجھے عدالتوں کے متعلق یہ خیال رہتا ہے کہ مجسٹریٹ غیر جانبدار ہو۔ رادھا سوامیوں کے گورنر مرحوم صاحب جی ہمارے "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کے بہت مداح تھے۔ دہلی کے ڈاکٹر نجیم سین (جو رادھا سوامی ہیں) کی معرفت صاحب جی ہمارے کو پیغام بھیج دیا گیا تھا کہ وہ مسٹر نگم سے

غیر جاندار رہنے کی تاکید کر دیں۔ چنانچہ ہمارے ہوشنگ آباد پہنچنے سے پہلے ہی صاحب جی ہمارے  
کا پیغام پہنچ چکا تھا۔ کہ آٹھنوں نے مسٹر گم کو تاکید کر دی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہم مطمئن تھے۔  
کہ اگر مسٹر گم ہمارے ہمدرد نہ ہونگے تو نواب بھوپال کے باعث ہمارے خلاف بھی نہیں ہو سکتے۔ مقہ  
پیش ہونے پر جب میرے وکیلوں نے مسل کے کاغذات دیکھے تو معلوم ہوا کہ مقدمہ ضلع ہوشنگ آباد  
کی عدالت میں دائر نہیں کیا گیا بلکہ ریلوے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ  
مسٹر گم کو ضلع ہوشنگ آباد اور ریلوے مجسٹریٹ دونوں کے اختیارات حاصل ہیں۔ یعنی دونوں علاقوں  
کا ایک ہی مجسٹریٹ ہے) اس لیے یہ مقدمہ مسٹر گم کی عدالت میں آیا۔ اور مسٹر گم کے فیصلہ کی اپیل سیشن  
کورٹ ہوشنگ آباد اور ہائیکورٹ ناگپور میں نہ جائے گی۔ بلکہ پرنسپل ایجنٹ بھوپال کے پاس بطور سیشن  
اور ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا کے پاس بطور جج ہائیکورٹ جائے گی اور مسٹر گم کے بعد اگر اپیل ہو  
تو اس اپیل کے لیے ہمیں نواب بھوپال کے علاقہ میں بھوپال جانا ہوگا۔ ہم نے مقدمہ کی جب یہ نوعیت دیکھ  
تو ہم حیران رہ گئے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اس روز عدالت میں شہادت کے لئے تاریخ مقرر ہوئی۔ اور ہم واپس دہلی چلے آئے۔

دہلی پہنچنے کے بعد میں نے اسمبلی کے اہل الرائے ممبر دوستوں سے مشورہ کیا۔ اور اسمبلی میں سوالنامہ  
دریافت کرنے کا نوٹس دلایا۔ جن میں گورنمنٹ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ واقعہ ہے۔ یا نہیں کہ جب پرنس پر  
ایجنٹ اسمبلی میں پاس ہو رہا تھا۔ تو گورنمنٹ نے ہاؤس کو یقین دلایا تھا کہ اس ایکٹ کے مطابق جن مقہ  
کی گورنمنٹ ہند منظوری دے گی۔ ان مقدمات کی اپیل ہائیکورٹ میں جائے گی۔ تاکہ ملزم کے ساتھ کسی  
جسم کی بے انصافی نہ ہو۔ مگر اس ہوشنگ آباد والے مقدمہ کی اپیل پرنسپل ایجنٹ کے پاس جائے گی  
ان سوالنامہ کے اسمبلی میں نوٹس دلوانے کے بعد میں سر چارلس اسٹینٹن سیکریٹری گورنمنٹ ہند سے ملاہ بہت  
فطرت انگیز بحث میں جب ملزم مقدمہ کی تمام پوزیشن بتا رہا تھا تو وہ نواب بھوپال کی خلاف آئین چالاک پر بہت نفرت اور  
غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ اور کچھ جھنجھلا سے رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ ”میں ان ہی حرکتوں  
باعث مقدمہ کی منظوری نہ دیتا تھا۔ اچھا میں اب انتظام کر دوں گا۔ کہ آپ کے ساتھ ضلع  
آئین ظلم نہ ہو۔“

میں سر چارلس سے ملنے کے بعد واپس آیا۔ چند روز کے بعد ہم جب انگلی بیٹی پر ہوشنگ آباد گئے۔ تو مجسٹریٹ  
نے بتایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم کے مطابق مقدمہ کی کارروائی روک دی گئی ہے۔ اور آج کو  
کارروائی نہ ہوگی۔ مستغیث اور ملزم دونوں تا اطلاع ثانی اپنے گھر وں کو واپس چلے جائیں۔ اس حکم  
کا نہ مجھے علم تھا اور نہ بھوپال کے نمائندہ خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس کو۔ یہ حکم سن کر ہم لوگ حیران  
رہ گئے۔ اور خواجہ اکرم کا رنگ تیز ہو گیا۔ اور وہ سر کھجلائے سنگے در خواجہ اکرم کی اعصاب کے اعتد  
سے کچھ عادت سی ہے۔ کہ وہ جب تشریف میں ہوں۔ تو اپنے سر کو کھجلائے لگ جاتے ہیں۔ یہ حکم سن کر  
ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ اطلاعات حاصل کرنے کے لیے ناگپور میں  
انتظام کر دیا تھا۔ اس دوست نے اطلاع دی کہ پرنسپل سیکریٹری گورنمنٹ ہند نے سی۔ پی کی گورنمنٹ



نہ صرف مقدمہ کی کارروائی روکنے کے لیے تیار ہوا ہے۔ بلکہ ایک خط کے ذریعہ یہ بھی لکھا ہے کہ گورنمنٹ ہند کی نواب بھوپال کے ساتھ اس مقدمہ کے سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ گورنمنٹ ہند کی مستفیضت سے ہمدردی ہے۔ نہ کمزم سے اور گورنمنٹ ہند قطعی غیر جانبدار ہے۔ اور جب بھی عدالت میں کوئی کارروائی ہو تو عدالت کی کارروائی کی پوری نقل گورنمنٹ ہند کو بھیجی جائے۔ اس اطلاع کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب اس مقدمہ بازی کا لطف آئے گا اور میں دیکھوں گا کہ نواب بھوپال اپنی نوابی کا کیونکر ناجائز استعمال کر سکتے ہیں۔

گورنمنٹ ہند کا مقدمہ کی کارروائی کو روکنے کا یہ حکم نواب بھوپال کے پریسیج اور اثر پر بہت بڑی ٹھوکر تھی۔ ان لوگوں نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ کبھی نواب بھوپال دایس رائے سے مل رہے ہیں۔ اور کبھی ان کے وزیر پٹیکل ایجنٹ۔ ایجنٹ گورنر جنرل اور پولیٹیکل سیکریٹری گورنمنٹ ہند سے۔ ادھر اسمبلی کے تمام ممبر ہائے سائنس کی روز تک جڑ جڑی رہی۔ آخر سر آبرے میککاف فارن سیکریٹری گورنمنٹ ہند رج اسمبلی میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے تھے (انے سسٹرنی داس ممبر اسمبلی سے خواہش ظاہر کر کے) میں ان سے ملوں۔ چنانچہ اگلے روز میں سر آبرے میککاف سے ملنے کے لئے ان کے دفتر میں گیا۔ جو پولیٹیکل سیکریٹری کے دفتر کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے وزیر میککاف کا ڈیپارٹمنٹ سے ملنے کا نام لیا اور ملا اور باتیں شروع ہوئیں تو آپ سے مقدمہ کے متعلق ذیل کی گفتگو ہوئی۔

سر آبرے میککاف: ویل سرور دیر ان سسٹیک کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی اور نواب بھوپال کی مصالحت ہو جائے۔ اگر آپ چاہیں تو میں کوشش کر کے مصالحت کراتا ہوں۔ تاکہ نواب صاحب مقدمہ واپس لے لیں۔

میں: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مردم منزل میککاف جو بہت زیادہ انگریز تھے۔ اور جن کے نام پر یہاں پہلی میں میککاف ہاؤس بطور یادگار قائم ہے۔ کے آپ بے لے ہوئے۔

سر آبرے میککاف: (اس کا ساتھ دیتے ہوئے) ہاں میں مردم منزل میککاف کا حقیقی بیٹا ہوں۔ میں، آپ اس بہادر میککاف کے بیٹے ہوتے ہوئے۔ مجھے نواب بھوپال سے مصالحت کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ بہادر انسان مصالحت کے مقابلہ پر جنگ کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ میرے حقیقی دادا نے اپنے مائیں کے ساتھ چار اچر و نجییت سنگھ کی طرف سے ہجرات کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ جنگ کی۔ آپ سوچیں میککاف کے ہوتے ہوئے جو کہ چار اچر و نجییت کے بیٹے تھے۔ ان کے سو بھرا دادا کا بیٹا ہوتے ہوئے مصالحت کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اور میرے بیٹے اسی میں لطف دیکھا۔ کہ میں نواب بھوپال کو تمام قدم پر شکست دوں۔

سر آبرے میککاف: میرے یہ الفاظ سن کر کچھ حیران سے ہو گئے۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوئیں۔ مجھے سر آبرے نے یقین دلایا کہ اس مقدمہ میں گورنمنٹ ہند بالکل غیر جانبدار رہے گی۔

ہماری اور نواب بھوپال کی کئی روز کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ آخر یہ نکلا کہ مقدمہ عدلیہ کے ججسٹریٹ کی عدالت سے واپس لے لیا گیا۔ اور پھر ڈسٹرکٹ کورٹ ججسٹریٹ آباد کی عدالت میں دائر ہو۔

جس کی اپیل سیشن جج ہرفنگ آباد اور ہائیکورٹ ناگپور میں کی جائے گی۔ چنانچہ کئی ہفتوں کے بعد دوسری عدالت میں منتقل ہو گیا۔ اور نواب بھوپال کو کافی مدامت اٹھانی پڑی۔

## ہوشنگ آباد کے مقدمہ کا تماشہ

مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ریاست کی کارروائی گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے بند اور پھر جاری ہونے میں کئی ہفتہ صرف ہوئے۔ اتنے میں پہلے مجسٹریٹ مسٹر گم رجوراد ہاسوامی نے تبدیل ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ایک معمر مجسٹریٹ مسٹر رائے زادہ تشریف لائے۔ یہ پرانے ڈانچے کے برہنہیت اخلاق سے پیش آنے والے مگر استغاثہ کے وکیل خان بہادر عبدالرحمن نے دبا لیا تو وہاں نہ اختیار کر لی۔ اور اگر مگر کم کے وکیل مسٹر توکلی نے سختی سے جواب دیا تو وہاں ہجک گئے۔ اگر کسی سوال یا مستفیض کے وکیل نے اعتراض کیا تو کہہ دیا سوال کی اجازت نہیں، اور اگر ملزم کے وکیل نے کہہ دیا کہ سوال کی اجازت ہونی چاہیے تو کہہ دیا کہ ”اچھا سوال کرنے کی اجازت ہے۔“ اس مجسٹریٹ کا یہ ہرے مدد دلچسپ تھا کہ عدالت کے شروع ہونے کے وقت دس بجے اگر استغاثہ کے لوگ پہنچ گئے۔ اور مگر اور اس کے وکیل ابھی نہ پہنچے۔ تو آپ نے استغاثہ کے وکیل کے ساتھ محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں آپ کہہ دیتے ”اخبارات کے ایڈیٹر بہت بد معاش ہوتے ہیں۔ بڑے بڑوں کی گڑبازاں اُڑھاتے ہیں۔ ان سے دایان ریاست بھی محفوظ نہیں۔“ وغیرہ اور اگر نواب بھوپال کی پارٹی کے لوگ اُڑھاتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ”ریاست“ اپنے دکلا مسٹر برج بہاری توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ کے ساتھ عدالت میں پہنچ گیا۔ تو آپ مسٹر توکلی سے باتیں شروع کر دیتے۔ ”یہ دایان ریاست بہت بد معاش ان کے ہاتھوں رعبیت کی جان محفوظ ہے نہ عزت، عورتیں تک نکال کر لے جاتے ہیں۔ اخبارات کا کام ہے کہ ان بر معاشوں کے خلاف آواز پیدا کریں وغیرہ۔“

چنانچہ یہ رائے زادہ صاحب دونوں پارٹیوں کو اپنی اپنی جگہ خوش کرنے کی کوشش کرنے اور دونوں پارٹیاں پکھری سے باہر ان کا مذاق اڑاتیں۔ مسٹر رائے زادہ کی عدالت کا تماشہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ میں رائے زادہ صاحب کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور آپ ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آپ کئی ہفتہ تک ہوشنگ آباد میں ہی رہے۔ اور اس کئی ہفتہ کے عرصہ میں ایڈیٹر ریاست کیسٹر توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ جب کبھی ان کی کوٹھی کے پاس سے گزرتے۔ ہم لوگ ان سے باتیں کرتے۔ لے ان کی کوٹھی پر چلے جاتے۔

ایک روز ایڈیٹر ریاست نے تفریحاً و مذاقاً آپ سے پوچھا کہ رائے زادہ صاحب یہ تو بتائیے کہ اگر آپ ریٹائر نہ ہوتے۔ اور آپ اس مقدمہ کا فیصلہ کرتے۔ تو آپ کا فیصلہ کیا ہوتا؟

اس پر رائے زادہ صاحب نے یہ تکلف فرمایا کہ آپ لوگ، پبلک کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ دایان ریاست بہت بد معاش ہیں۔ میں آپ کو یہ قصور سمجھتا ہوں۔ مگر میں آپ کو بچاؤ نہیں دے سکتا۔

۱۔ اس سے زیادہ سزا نہ دیتا۔“ یہ جواب سن کر ہم سب لوگ ہنس پڑے کیونکہ ابھی تک استغاثہ کے وہ نہ ہوئے: ڈیفنس نہ لیا گیا۔ فرد جرم نہیں لگا سکا۔ رائے زادہ صاحب نے مجھے مجرم قرار دے دیا۔ آپ بلعد لودر سادہ لوح تھے۔ ریشا ترہو کے بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے تھے لکھنؤ سے یہ مجھے اکثر خط لکھتے رہا کرتے۔ اور جب مسٹر بیٹ مسٹر احمد حسین نے مجھے اس مقدمہ میں سزا دی تو آپ کا خط آیا جس میں لکھا تھا: ”بہت انصافی ہوئی۔ اگر میں مجسٹریٹ ہوتا۔ تو آپ کو بری کرتا۔“

مسٹر رائے زادہ کے ریشا ترہو کے بعد ان کی جگہ ایک مجسٹریٹ مسٹر احمد حسین تشریف لائے۔ جو کے رہنے والے تھے۔ اور دیانتداری کے اعتبار سے سی۔ پی کے تمام صوبہ میں مشہور تھے۔ مجھے معلوم کہ یہ دیانتداری کی شہرت کے باعث ہی ہوشنگ آباد میں بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ اس مقدمہ میں انصاف ہی۔ اور ان پر نواب بھوپال کے رویہ کا کوئی اثر نہ ہو۔

مسٹر احمد حسین بہت چالاک مجسٹریٹ تھے۔ یہ عدالت میں کوئی بات ایسی نہ کرتے جس سے ہمیں ان کے تعلق کوئی شبہ ہو۔ چنانچہ ہمیں اطلاعیں ملا کرتیں۔ کہ نواب بھوپال کی شخصیت کا ان پر اثر ہے۔ اور اب بھوپال کے تعلق والے لوگ ان سے ملتے ہیں۔ مگر عدالت میں ان کے رویہ کے باعث ہم ایسی لاعانت کو غلط سمجھتے۔ اور پروا نہ کرتے۔

مسٹر احمد حسین کو مقدمہ کی سماعت کرتے ایک عرصہ گزر گیا۔ تو ایک روز دہلی میں خان بہادر قسطنطین دایڈیٹر ریاست کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اور جن کا گورنمنٹ آف انڈیا کے ہر بڑے سے ٹرسٹ احمد پر اثر تھا۔ نے پوچھا کہ ہوشنگ آباد میں مقدمہ کس مجسٹریٹ کے پاس ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ایک صاحب مسٹر احمد حسین ہیں۔ جو لوہی کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا احمد حسین علی گڑھ کے فلاں ڈپٹی کلکٹر کے بھائی تو نہیں۔ میں نے کہا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان کے بھائی کا نام کیا ہے۔ مگر یہ مجھے علم ہے۔ کہ ان کے ایک بھائی یو پی میں غالباً ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اس واقعہ سے ایک ہفتہ بعد خان بہادر قسطنطین حسین بٹلے کے لئے تشریف لائے۔ تو آپ نے پایا۔

”احمد حسین صاحب کے فلاں قریبی عزیز میرے گہرے دوست ہیں۔ میں ان سے غلطی گڑھ میں ملا تھا۔ اسے بات چیت ہوئی۔ تو میں نے کہا کہ وہ احمد حسین صاحب سے کہیں۔ کہ وہ سردار دیوان سنگھ کا ال رکھیں۔ سردار دیوان سنگھ میرے دوست ہیں۔ مگر اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ اس سے پہلے ند حسین صاحب سے نواب بھوپال کی سفارش کر چکے ہیں۔ ایسی حالت میں سردار دیوان سنگھ کے کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے مسٹر احمد حسین کے متعلق شبہ ہوا۔ کہ ان پر نواب بھوپال کا اثر استغاثی جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہم لوگ مسٹر احمد حسین کے متعلق بالکل بے فکر اور مطمئن تھے۔ خان بہادر ق حسین کی اس اطلاع نے مقدمہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اس اطلاع سے پہلے ہم احمد حسین سے انصاف اور فیروانہ داری کی توقع رکھتے تھے۔ اب ہم نے ان کو اپنے دل میں

دشمن سمجھنا شروع کیا۔ ایڈیٹر تریاست، جب کسی مجسٹریٹ سے انھوں کی ترقی نہ رکھے، تو پھر اس کو  
 جہولانی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہتا چاہئے کہ اگر وہ مجسٹریٹ کوئی رعایت بھی کرے، تو اس  
 رعایت کو میں مگر مجھ کے آنسو سمجھا کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مسٹر احمد حسین کو اب دشمن سمجھنا چاہئے  
 چاہے وہ الت میں یہ کئی ایسی بات نہیں ہونے دیتے۔ جن سے ان کی جانبداری محسوس ہو چنانچہ ہم نے  
 مجسٹریٹ کے احساس کی پروا نہ کرتے ہوئے مقدمہ کی سسل کی بنیادوں کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ تاکہ یہ  
 مجسٹریٹ اگر مقرر بھی ہو سکے۔ تو اپیل میں بریت حاصل ہو۔

مقدمہ چل رہا تھا تو میں نے کوشش شروع کر دی کہ اس مجسٹریٹ کو یہاں سے تبدیل کرایا جائے۔  
 پھر کے مشہور میر سٹرمردم مسٹر جیوال سے ایڈیٹر تریاست کے کچھ تعلقات تھے۔ ان کا لڑکا وہ زمین ہا  
 رہا تھا، تو وہ ایڈیٹر تریاست کے ہاں مقیم ہوا چنانچہ یہ تعلقات اور زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ مسٹر  
 جیوال کے امور اس کے سگائی سی پی کے منظر راستے بہادر مسٹر جیوال کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔  
 اور مسٹر جیوال نے اپنے بیٹے سے اس کے بہادر جیوال کو خط لکھا کہ دیوان سنگھ ان کا دوست ہے۔ اگر  
 یہی رشتہ کی ضرورت ہو تو وہ رینگ نہ کیجئے۔

میں نے غور کیا کہ میں سی پی کے درم میں مسٹر راؤ کو نہ دے اور جو میں دے اور اس کے ہاتھ نامہ کو نقل کے  
 میر دے اور میں سی پی آپ کا انتقالی ہوا ہے انوں۔ اور تمام حالات کے علاوہ  
 تو اس سبب یہ بھی ہوا کہ مسٹر احمد حسین سے کی گئی سفارش کا ذکر کر کے احمد حسین کے تبادلہ کا مطالبہ کر دیں۔  
 چنانچہ میں نے شنگ آباد سے ناگپور کیا۔ وہاں کے انگریزی اخبار ہندو اسکے ایڈیٹر ہر سہ دست تھے۔ ان کے  
 ہاں قیام کیا۔ جی کا وقت تھا ان کے پاس سے اسی وقت راستے بہادر جیوال کو ملی فن کیا کہ میں ناگپور میں  
 ہوں۔ اور ایڈیٹر ہندو اسکے مکان پر مقیم ہیں۔ راستے بہادر جیوال کو جب یہ علم ہوا۔ تو انھوں نے کہا کہ وہ  
 اکیس بجے گاؤں پہنچے۔ میں نے ان کی ہاں نام نہ نہ کر دیں۔ چنانچہ میں سنسٹ میں ان کا مکرکاری بہادر کو  
 سنے کہ میں گیا۔ میں اسے میں غسل سے فارغ ہو چکا تھا۔ کار میں راستے بہادر جیوال کے ہاں پہنچا۔ راستہ  
 میں۔ مجھے خیال آیا۔ ذرا اب بہادر جیوال جیسی بڑی شخصیت نے مقدمہ چلایا۔ میں اس صوبہ میں ایک مذہبی شخصیت  
 تھی۔ ہوں۔ لیکن یہاں کے منسٹر کا چہرہ نہ لینے سکھینے آیا۔ منسٹر کی کار ہے۔ اور منسٹر کے ہاں کھانا ہوگا۔ یہ سب  
 اشارہ ملی گاؤں سے۔ وہ ذرا اب بہادر جیوال سے جب مقدمہ شروع کیا۔ تو وہ بہت شکوکہ و شبہ میں رہا۔ دیوان سنگھ  
 معاملہ ان کے لئے گا۔ اور اسے کچل دیا جائے گا۔ میں راستے بہادر جیوال کے ہاں پہنچا وہ منسٹر کے لئے ان کے  
 ساتھ کھانا کیا۔ اور کھانا کھانے ہوئے بتایا کہ وہ ثقافت کیا ہیں۔ اور میں احمد حسین سے کسی انصاف کی  
 توقع نہیں کر سکتا۔ میری اطلاع کے مطابق احمد حسین کے پاس ذرا اب بہادر جیوال کی سفارش پہنچ چکی ہے  
 کھانا کھانے کے بعد میں در راستے بہادر جیوال کے منسٹر میں آئے۔ ہمارے پیچھے سے پہلے مسٹر راؤ کو نہ دے ہم میرا چہ  
 دفتر پہنچ چکے تھے۔ راستے بہادر اپنے ساتھ مجھے مسٹر راؤ کو نہ دے کرہ میں لے گئے۔ مسٹر راؤ سے میرا تعارف  
 کرایا۔ تعارف کرانے کے بعد راستے بہادر تو اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ میں نے مسٹر راؤ سے باتیں  
 شروع کیں۔ مسٹر راؤ مقدمہ کے تمام حالات سے واقف تھے۔ جب میں نے ان کو علی گڑھ کی گفتگو کے

حالات سنائے۔ تو انھوں نے کہا۔

میں نے مسٹر احمد حسین کو صرف اس لئے ہوشنگ آباد بھیجا ہے۔ کہ وہ تمام صوبہ میں واپس آئے اور غیر جانبدار مشہور ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ احمد حسین پر کسی سفارش کا اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا طرازِ منت کا کچھ لا تمام ریکارڈ ہے۔ وہاں ہے۔ میری رائے ہے کہ مقدمہ کسی دوسرے جسٹریٹ کے پاس نہ جانا چاہیے۔ اور اگر آپ پھر بھی مطمئن نہ ہوں۔ اور آپ کو یقین ہو۔ کہ احمد حسین انصاف نہ کرے گا۔ تو آپ مجھے بتائیے میں احمد حسین کو کسی دوسرے ضلع میں تہدین کر دوں گا۔

مسٹر رانگھنڈا رارا کے اس یقین والے پر مجھے خیال آیا۔ کہ یہ درست ہے کہ احمد حسین صاحب سے فریب بھوپال نے سفارش کوائی۔ مگر جیسا کہ مسٹر رانگھنڈا رارا دے سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سفارش کا مسٹر احمد حسین پر کوئی اثر نہ ہو۔ میں نے مسٹر رانگھنڈا سے کہا۔

”بہت اچھا۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔ مگر وہ گروں۔ اگر ضرورت ہو تو میں پھر آپ کو مطلع کروں گا۔“

میں یہ کہہ کر اور رانگھنڈا دھری باتیں کر کے راستے پر ہوا اور جیروال کے کمرہ میں آیا۔ اُن کو بتایا کہ کیا کچھ بات چیت ہوئی۔ راستے پر ہوا وہ بھی اس بات سے متفق تھے۔ کہ ابھی مقدمہ دوسری عدالت میں لے جانے کی کوشش نہ کی جاسکے۔ چنانچہ ہم نے جسٹریٹ کو تبدیل کر کے نیا خیال چھوڑ دیا۔ گو میں نے مسٹر احمد حسین کے حلقہ میں نہ تھا۔ یہ مقدمہ چھ سال تک چلتا رہا۔ جس کے واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔

## ”والیان ریاست کا پریش“

ایک صاحبِ کزنل امیر احمد بھوپال میں نواب صاحب کے منٹری سیکریٹری تھے۔ میلان میٹ۔ بڑی سے بڑی جگہ پہنچ جانے والے۔ بہت بااثر اور ہر شخص کو شیخہ میں قائم رہنے کے اعتبار سے بڑے دیکھ بھلے۔ آپ بچپن میں گسٹ ہوسٹل میں پھرایا ہوا تھے۔ شاہ فرید میں امرا کے طبقہ کی خدمت کرنے۔ آخر تو آتی کر کے ریاست بھوپال میں منٹری سیکریٹری کے عہدہ پر پہنچے۔ آپ کے اثر کا اندازہ اس بات سے لگئے کہ آپ کو جب انگلستان جاتے تو وہاں شاہی محلات میں مدعو کیے جاتے۔ اور نئی دہلی میں آتے تو اکثر وائسرائے کے ہاں قیام تھا۔ آپ کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر پر بھی کافی رسوم چل تھا۔

نواب بھوپال مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ میں صلح چاہتے تھے۔ مگر اس صلح کے راستے میں آپ کا پریش“ حامل تھا۔ کیونکہ نواب صاحب والیان ریاست کے چپ نسل ہوتے



ایڈیٹر "ریاست" آپ کی مہربانی ہے۔

کرنل امیر احمد۔ نہیں میں مبالغہ نہیں کرنا۔ میری ایماذاری کے ساتھ یہی رائے ہے۔  
ایڈیٹر "ریاست" آپ کے خیالات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کرنل امیر احمد۔ آپ ریاستوں کے مظالم کو بھی خوب بے نقاب کرتے ہیں۔  
ایڈیٹر "ریاست" والدین ریاست کی حالت ایسی ہی ہے۔ یہ لوگ اس بات کے سق ہیں کہ ان کا خدارا  
بے نقاب کریں۔

کرنل امیر احمد۔ ذاب بھرپال والا آپ کا مقدمہ بھی پبلک میں بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا جاتا  
ہے۔ آپ خوب مقابلہ کر رہے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" مقدمہ نواب بھرپال نے کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ ڈیفینڈ کر دوں۔

کرنل امیر احمد۔ ہاں۔ مگر نواب صاحب ذاتی طور پر بڑے شریف ہیں۔ صرف ان کے خوشامدیوں نے  
ان کو خراب کیا۔ جنھوں نے مقدمہ چلانے کی رائے دی۔

ایڈیٹر "ریاست"۔ خوشامدیوں کے ہاتھوں میں ٹول بنا بھی تو ایک عجیب ہے۔ جس کا انسان کو خیا زہ  
بھگتنا پڑتا ہے۔ اور خوشامدیوں کے ہاتھوں میں بے وقوف بننا صرف نواب بھرپال ہی تک محدود نہیں۔  
ہر والیے ریاست اس میں مبتلا ہے۔

یہ باتیں چند منٹ ہوتی تھیں۔ تو کرنل امیر احمد کھل گئے۔ آپ نے فرمایا:-

"بات دراصل یہ ہے۔ کہ میں سٹر خان ٹھیکہ دار نہیں ہوں۔ میں کرنل امیر احمد لٹری بیگریٹری  
بھرپال ہوں۔ ایک طویل عرصہ سے میری خواہش تھی کہ میں آپ سے ملتا۔ اور چونکہ میں  
نواب صاحب بھرپال سے پوشیدہ طور پر آپ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس لئے تعارف  
میں نام غلط بتانا پڑا۔"

میں نے کہا۔ اس کا خیال نہ کیجئے۔ مجھے ریاستوں کے امیروں سے ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ آپ  
نواب صاحب سے پوشیدہ طور پر ملنے کے لئے آئے ہیں یا نواب صاحب کی ہدایت کے مطابق۔ میرے لیے  
اس میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد کرنل صاحب زیادہ کھلے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ جو پارٹی مقدمہ چلانے اور مقدمہ کو جاری  
رکھنے کے حق میں ہے۔ اس پارٹی کے لوگ کرنل امیر احمد کے مخالفین ہیں سے ہیں اور آپ کی خواہش ہے  
کہ مقدمہ کا خاتمہ ہو۔

مقدمہ کو ختم کرنے کے متعلق دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کہ کیا صورت اختیار ہو۔ کرنل صاحب اس بات پر  
بعض تکتے کہ ایڈیٹر "ریاست" اگر معافی نہ مانگے۔ تو کم از کم امیروں کا اظہار کر دے۔ مقدمہ واپس لے لیا جائے  
اور جو روپیہ ایڈیٹر "ریاست" کا مقدمہ میں اب تک خرچ ہوا۔ وہی اس سے زیادہ روپیہ ایڈیٹر "ریاست" کو دے دیا  
جائے۔ لیوا ایڈیٹر "ریاست" کا مطالبہ یہ تھا۔ کہ مقدمہ نواب صاحب بھرپال نے شروع کیا۔ وہ واپس لے لیں۔  
ایڈیٹر "ریاست" نہ معافی کے لئے تیار ہے۔ نہ اظہار انہیں کے لئے۔ اس بحث کے بعد کرنل امیر احمد نے کہا:-

سردار صاحب۔ ذرا یہ تو سوچئے کہ اگر آپ اظہار افسوس ہی نہ کریں۔ تو نواب صاحب اپنی رعایا کو کیسی منہ بند دکھائیں گئے۔ کیا بھوپال کی رعایا یہ خیال نہ کرے گی کہ نواب صاحب نے مقدمہ جاری کیا۔ اور جب وہ مقدمہ میں مقابلہ نہ کر سکے تو مقدمہ جھک مار کر واپس لے لیا گیا۔ آپ اس پر غور تو کیجئے۔ نواب صاحب کا پرستیج کیا باقی رہ جائے گا۔  
میں نے جواب دیا۔

”کرنل صاحب۔ آپ تو صرف ایک ریاست بھوپال کی رعایا کے متعلق فرماتے ہیں۔ ذرا یہ تو سوچئے کہ اگر میں اظہار افسوس کر دوں تو میں چھ سو ریاستوں کی رعایا کو کیا منہ دکھاؤں گا کیا ان چھ سو ریاستوں کی رعایا یہ خیال نہ کرے گی کہ ایڈیٹر ریاست نے پہلے تو نواب صاحب کے خلاف لکھا۔ اور الزام لگائے۔ مگر جب مقدمہ میں ایڈیٹر ریاست تو نواب صاحب کا مقابلہ نہ کر سکا تو اس نے جھک مار کر معافی مانگ لی۔ آپ اس پر غور تو کیجئے کہ اخبار ریاست کا پرستیج کہاں باقی رہ جائے گا۔“

میرے اس جواب کے بعد کرنل امیر احمد کو یقین ہو گیا کہ میں معافی نہ مانگوں گا۔ چنانچہ سلسلہ گفتگو ختم ہو گئی کہ نواب صاحب اپنے پرستیج پر دھتکہ لگانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست جو غلام کے پرستیج پر دھتکہ لگوانے کے لئے تیار نہ تھا۔ مقدمہ چھ سال تک چلا۔ نواب صاحب کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور ایڈیٹر ریاست نے اس مقدمہ میں اتنی ہزار روپیہ کے قریب صرف کیا۔ چنانچہ اب جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ نواب بھوپال والے مقدمہ کا کیا نتیجہ ہوا تھا۔ تو میں جواب دیتا ہوں۔ چھ سال قید اتنی ہزار روپیہ جرمانہ یعنی چھ سال کا قیمتی وقت مقدمہ کی پیروی میں صرف ہوا قید۔ کم نہیں۔ اگر یہی چھ سال کا زمانہ اخبار پر محنت کی جاتی۔ اور مقدمہ کے مصارف کا اسی ہزار روپیہ اخبار کو زیادہ بہتر بنانے میں صرف ہوتا۔ تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ریاست میں کتنی مزید غریبوں کا اضافہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر انسان کو اپنے پرستیج کے لئے قربانی کرنی ہی پڑتی ہے۔

## ایڈیٹر ریاست پر چھوٹا شریف کیٹ صاحب کا الزام

ہوشنگ آباد کے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ریاست کا ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔ مقدمہ کی پیشی سقرر ہو چکی تھی اور نواب بھوپال کے گواہ پیش ہوئے تھے۔ نواب صاحب کے نمایندگان ایٹنہ خان بہادر عبدالرحمن درجہ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ سر عبدالرحمن میں اور فلسفین والے کمیشن میں گورنمنٹ ہند کے نمایندگان تھے اور اپنے ایک درجن کے قریب ماتحتی اور درجن کے قریب گواہوں کو بیکر میٹی پر ہوشنگ آباد پہنچے۔ کیونکہ فیصلہ تھا کہ مقدمہ اس تاریخ تک ہر روز ہو گا جب تک کہ نواب صاحب کے گواہ ختم نہ ہو جائیں۔ چنانچہ گواہوں کے لئے نیچے نصب ہو چکے تھے۔ پلاؤ تو رہا اور کباب پک رہے تھے۔ اور ان لوگوں کے دہ ہفتہ تک رہاں نیام کا انتظام تھا۔



اس پیشی سے پہلے ایڈیٹر "نیاست" کئی ایک پیشیوں پر نہ جاسکا تھا۔ اور اس نے میڈیکل سٹیفیکٹ بیج دیا تھا۔ اور ذاب بھوپال کے نمائندوں کو یہ خیال تھا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ (ادڈاکٹر سے غلط سٹیفیکٹ بیکر بیج دیتا ہوں۔ اس پیشی سے ایک روز پہلے میں نے پھر میڈیکل سٹیفیکٹ لیا یہ سٹیفیکٹ ڈاکٹر شیورام چوہدرہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نے دیا۔ اور اس پر میجر اسپنل سول سرجن نئی دہلی رجسٹرڈ پنجاب ایسٹریکچرل سول اسپتال (تھے) نے دستخط کو منسٹر سائن) کئے۔ اور میں نے شام کو گریڈ ٹرنک ایکسپریس میں اپنے آدمی کے ہاتھ پر سٹیفیکٹ ہوشنگ آباد بھیج دیا۔

انپکٹر جنرل پولیس بھوپال اور خان بہادر عبدالرحمن نے یہاں دہلی میں اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے کہ وہ میرے متعلق بذریعہ تاران کو ہوشنگ آباد اطلاع دیتے رہیں۔ یہ لوگ میرے اُس آدمی کو نہ جانتے تھے جو میڈیکل سٹیفیکٹ کے ہوشنگ آباد گیا۔ یہ دہلی اور نئی دہلی کے سٹیشنوں پر ہر گاڑی میں مجھے تلاش کرتے۔ اور تلاش کرنے کے بعد دے دیتے کہ فلاں گاڑی میں بھی روانہ نہیں ہوا چونکہ یہ میرے آدمی کو نہ جانتے تھے اس لئے اس کے متعلق یہ اطلاع نہ دے سکے۔ جب گریڈ ٹرنک ایکسپریس رجسٹرڈ ہوشنگ آباد کے لئے آخری ٹرین بھٹا، بھی دہلی سے چلی گئی اور انھوں نے میرے روانہ نہ ہونے کے متعلق تار دیا تو اس کے بعد یعنی چھ سات بجے شام کو انھوں نے ایک اور ایکسپریس تار دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ دیوان سنگھ گریڈ ٹرنک ایکسپریس کے جانے کے بعد اپنے مکان اجیری دروازہ سے چاؤڑی بازار کو جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ اپنی موٹر خود چلا رہا تھا "یہ تاران لوگوں کو رات کو بھی یا علی الصبح ہوشنگ آباد پہنچ گیا۔ اور انھوں نے تیاری کر لی کہ اب دیوان سنگھ کی ضمانت منسوخ کر اگر چھوڑیں گے۔ عدالت میں مجسٹریٹ گیارہ بجے تشریف لائے۔ مجسٹریٹ کے پہنچنے پر میرا بھیجا ہوا آدمی عدالت کے اندر داخل ہوا۔ اور اس نے میرا میڈیکل سٹیفیکٹ مجسٹریٹ کو دیا۔ مجسٹریٹ نے سٹیفیکٹ دیکھ کر خان بہادر عبدالرحمن کو دکھایا۔ اب مجسٹریٹ بھی پریشان اور خان بہادر عبدالرحمن بھی۔ مجسٹریٹ اس لئے کہ اس نے کام کے اعتبار سے روہنتے بالکل خالی رکھے تھے۔ اور یہ عرصہ صرف اس مقدمہ کے لئے ہی وقف کیا تھا۔ تاکہ مقدمہ ڈے ٹوے (دہر روز) ہو کر استغاثہ کے تمام گراہ ختم کر دیئے جائیں۔ اور کئی برس کا لٹکا ہوا مقدمہ جلدی ختم ہو۔ اور خان بہادر عبدالرحمن اس لئے کہ گواہوں کو دُور دُور سے منگایا۔ تمام اہتمام کیا۔ دو ہفتہ کے لئے دہلی کے مقدمات کی تاریخیں بدلوائیں۔ اور ہوشنگ آباد رہنے کے لئے خیمے نصب ہوئے۔ خان بہادر عبدالرحمن نے کہا کہ دیوان سنگھ جھوٹے میڈیکل سٹیفیکٹ بیج کر میں پریشان کرتا ہے۔ اور دہلی کے نارہناتے ہیں کہ وہ میڈیکل سٹیفیکٹ والے روز شام کو سیر کے لئے اپنی موٹر میں پھر رہا تھا۔ اور موٹر خود چلا رہا تھا۔ چنانچہ یہ تار بھی آپ نے عدالت میں پیش کر دیئے۔ اس پر مجسٹریٹ نے کہا کہ جس صورت میں سول سرجن نئی دہلی کا سٹیفیکٹ موجود ہے اس سٹیفیکٹ پر کیوں اعتبار نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ تو فیصلہ یہ ہوا کہ خان بہادر عبدالرحمن حلفہ بیان دیں کہ دیوان سنگھ بیمار نہیں ہے اور اس نے جھوٹا سٹیفیکٹ بھیجا ہے۔ عدالت سول سرجن دہلی رجسٹرڈ کا چیف میڈیکل انسپکٹر اور میجر اسپنل کا اسٹریٹھاس کا مجھے نام یاد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کرنل رسن تھے جو بعد میں سی۔ پی کے

اسپیکٹر جنرل سول ہاسپٹلز مقرر ہوئے (کو بذریعہ تار دیران سنگھ کا معائنہ کرنے کے لئے ہدایت کرے۔ چنانچہ سول سرجن کی فیس ایک سو روپیہ بھد پال دانوں سے جمع کرائی گئی۔ اور عدالت نے چیف میڈیکل انسپکٹر دہلی کو تار دیا کہ وہ بغیر اطلاع کئے دفعۃً دیران سنگھ ایڈیٹر زیاستہ کا معائنہ کرے اور بذریعہ تار اس عدالت کو نتیجہ سے اطلاع دی جائے۔ یہ واقعہ گیارہ اور بارہ بجے دوپہر کے درمیان کا ہے۔ دوپہر کے تین یا چار بجے تھے۔ میں دفتر کے اوپر کی سنرل رچھاں میرا پرائیویٹ دفتر تھا) میں تھا۔ نیچے سے چتر اسی آیا جس نے وزٹنگ کارڈ دیا۔ یہ کارڈ چیف میڈیکل آفیسر کا تھا۔ میں کارڈ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ ورنہ یہ حضرت تشریف لانے کی تکلیف نہ اٹھاتے۔ میں نے چتر اسی سے کہا کہ صاحب کو ساتھ لے آؤ۔ صاحب تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں مریضوں کا معائنہ کرنے والا ڈاکٹر دال کا بیگ تھا۔ آتے ہی انھوں نے دیکھا کہ میں چار پانی پر لیٹا ہوا ہوں۔ ان کے اوپر سے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

سول سرجن :- گڈ آفٹرنون۔

میں :- گڈ آفٹرنون !

سول سرجن :- کیا تکلیف ہے۔

میں :- درد گردہ ہے۔

سول سرجن :- کس کا علاج کر رہے ہو۔

میں :- ڈاکٹر چوڑہ کا۔

سول سرجن :- کیا علاج کیا۔

میں :- پہلے مار دیا کا انجکشن دیا تھا۔ پھر (نسخہ دکھا کر) یہ نسخہ پی رہا ہوں۔

سول سرجن :- دوائی کہاں ہے؟

میں نے دوائی والی شیشی جو وہاں چڑی تھی دے دی۔ اس کے بعد اس نے میری پشت کے نیچے جی گردہ والی جگہ کے ارد گرد ٹوٹنا اور معائنہ کرنا شروع کیا۔ جب اس نے گردہ والی جگہ کو انگلیوں سے دبایا تو میں نے ”وسی“ کیا۔ یعنی میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔

معائنہ کرنے کے بعد پھر یہ گفتگو ہوئی۔

سول سرجن :- تم لوگ اپنی صحت کی پروا نہیں کرتے جسم کا وزن زیادہ ہے اس کو کم کرنا چاہئے جربی جسم کی بڑھی ہوئی ہے۔

میں :- آپ کے خیال میں مجھے جربی کم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔

سول سرجن :- جربی اور گھمی دالی اشیاء اور مٹھاس بالکل چھوڑ دو۔ اور ورزش کیا کرو۔

میں :- بہت اچھا۔ آپ کے خیال میں درد گردہ کا یہ نسخہ ٹھیک ہے۔

سول سرجن :- ہاں ٹھیک ہے مگر اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے میں نے نسخہ صاحب کو دیا اور

اس نے اپنے ہاتھوں سے اس میں ایک دوائی کا اور اضافہ کر دیا۔

میں :- اور کوئی ہدایت ۔

سول سرجن :- خوراک کا بہت خیال رکھو۔ سادہ اور زود ہضم کھانا کھایا کرو۔  
میں :- کئی برس سے انگریزی کھانا کھاتا ہوں اور وہ صرف  
اس خیال سے کہ ایسی کھانا جلدی ہضم نہیں ہوتا۔ اور چربی بڑھاتا ہے۔  
سول سرجن :- آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ ورزش بھی کیا کیجئے۔

میں :- بہت اچھا۔ ایسا ہی کروں گا میں آپ کے مشورہ کا بہت شکر گزار ہوں۔ کیا میں اب بدچلتے  
لگتا ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی ؟

سول سرجن :- مجھے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد نے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کا معائنہ کروں۔  
میں :- تو آپ کی میری بیماری کے متعلق اب کیا رائے ہے۔

سول سرجن :- آپ فی الحقیقت بیمار ہیں۔

میں :- اور میں ہوشنگ آباد جانے اور سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

سول سرجن :- بالکل نہیں۔

میں :- مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ ڈاکٹر ہیں۔  
ایک نیک پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور خدا کی مخلوق کو آپ سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا  
شخص ہوتا تو میں اس پر آج ہی مکان میں ناجائز مداخلت کا فوجداری دعویٰ دائر کر دیتا۔ کہ آپ میری  
اجازت کے بغیر تشریف کیوں لائے۔

سول سرجن :- میں خود نہیں آیا۔ میں ایک مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق آیا ہوں۔ اور یہ خلاف قانون  
نہیں۔

میں :- آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر آپ یہاں دہلی کے کسی مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق تشریف  
لائے تو آپ کا آنا بلاشبہ خلاف قانون نہ تھا۔ مگر میں اور آپ ہوشنگ آباد کے مجسٹریٹ کی جو رسد کش  
میں نہیں۔ ہوشنگ آباد کا مجسٹریٹ میرے معائنہ کرنے کا جس صودت میں کہ میں دہلی میں ہوں کم نہیں ہو  
سکتا۔ آپ کا آنا لازمی طور پر خلاف قانون اور جرم ہے۔

سول سرجن نے جب میرے یہ الفاظ سنے تو اس کے ہوش ٹھکالے آگئے۔ اور اس نے محسوس کیا کہ  
میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قانونی اعتبار سے اس کے اندر جان ہے۔ اور ہوشنگ آباد کے مجسٹریٹ کے لئے  
مناسب یہ تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کو لکھتا کہ وہ سول سرجن سے میرا معائنہ کرائے۔ اور سول سرجن  
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی ہدایت کے مطابق میرا معائنہ کرتا۔

اس گفتگو کے بعد سول سرجن نے شریفانہ انداز سے اظہار افسوس کیا اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے  
جانے کے بعد میں نے مسٹر بی۔ بی۔ تو کلی ایڈوکیٹ کو ٹیلیفون کیا۔ وہ تشریف لائے تمام حالات سنئے تو  
وہ سول سرجن کی کوٹھی پر گئے۔ اور کہا کہ دیوان سنگھ سول سرجن کے معائنہ کے لئے آنے کو اپنی توہین  
محسوس کر رہا ہے۔ اور بہت غصہ میں ہے مگر وہ نہیں چاہتا کہ سول سرجن کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔

اور اگر وہ فی الحقیقت بیمار ہے جیسا کہ سول سرجن نے دیکھا تو بیماری کا سرٹیفکیٹ دیدیا جائے سیل جرن  
نے سٹر تو کلی سے بھی اٹھار افسوس کیا اور کہا کہ اس سے غلطی ہوئی۔ چنانچہ اس نے سرٹیفکیٹ دیا کہ  
دیوان سنگھ فی الحقیقت درگدہ میں بیمار ہے اور ہوشنگ آباد جانے کے قابل نہیں۔

سول سرجن نے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کو بھی بذریعہ تاجواب دیدیا کہ دیوان سنگھ فی الحقیقت بیمار  
ہے۔ چنانچہ نواب بھوپال کے نمائندے اپنے خیمے پیٹ کر اور کھانا پکانے والی دیگیں صاف کر کے واپس  
بھوپال تشریف لے گئے۔ اور مقدمہ دو ہفتہ کے لئے پھر ملتوی ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ایڈیٹر ریاست نے دہلی کی عدالت سٹی مجسٹریٹ میں خان بہادر عبد الرحمن  
پر اس الزام میں فوجداری مقدمہ دائر کر دیا کہ آپ نے ایڈیٹر ریاست "پر ہوشنگ آباد کی عدالت میں  
یہ الزام لگایا اور حلفیہ بیان دیا کہ دیوان سنگھ بیمار نہیں۔ یہ بہانہ کروا ہے۔ اور دیوان سنگھ کا سول سرجن  
دہلی سے معائنہ کر کر اس کی توہین کی گئی۔ وغیرہ۔ یعنی ادھر تو ہوشنگ آباد کے مقدمہ نواب بھوپال بنام  
دیوان سنگھ میں دیوان سنگھ ملزم اور دہلی کے مقدمہ دیوان سنگھ بنام خان بہادر عبد الرحمن میں نواب بھوپال کو کل خان بہادر  
عبد الرحمن ملزم۔ کیل لوگ دوسروں کے مقدمہ بازی میں مبتلا ہونے کی صورت میں تو روپیہ بھی خوب پیدا  
کرتے ہیں۔ اور مرغوں کی طرح نا فونی لڑائی بھی مزے سے لڑتے ہیں مگر جب یہ غرور مقدمہ میں ملزم ہوں تو ان کی  
حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ اب کبھی تو نکلی صاحب کے پاس عبد الرحمن صاحب کے پیغامات آ رہے  
ہیں کہ مقدمہ واپس کراؤ۔ کبھی دیوان سنگھ کے دوستوں سے کہلوایا جا رہا ہے اور کبھی اور کوششیں ہو رہی ہیں۔  
ادھر ہم ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ اس طرح سے کئی روز گزر گئے تو دہلی کے ایک سنیر کیل ٹرینیٹا اور خان بہادر عبد الرحمن  
کے گہرے دوستوں میں سے تھے) کا خط تو کلی صاحب کے پاس پہنچا جس میں لکھا تھا کہ عبد الرحمن صاحب  
اس مقدمہ کے باعث بچہ پریشان ہیں۔ مقدمہ واپس لے لیا جائے یہ ان پر احسان ہو گا۔ اور وہ ذاتی  
طور پر بھی درخواست کرتے ہیں اس کے علاوہ دہلی کے ایک دوست مجسٹریٹ نے ایڈیٹر ریاست سے  
ذاتی تخافات کی بنا پر درخواست کی کہ میں مقدمہ واپس لے لوں اور خان بہادر کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ  
ان حالات میں عدالت سے درخواست کی گئی کہ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں اور خان بہادر کو معاف  
کرتا ہوں۔

## خواب اور اس کی تعبیر

خواب عام طور پر پیٹ بھر کر کھانے کے باعث زیادہ آتے ہیں۔ مگر پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا جائے۔  
نصف رات گزرنے کے بعد خواب آئے، اور وہ خواب دن کو یاد رہے۔ تو یقیناً اس خواب کی  
تعبیر کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ خواب کے متعلق میں چند ذاتی واقعات اور تجربات  
بیان کرتا ہوں :-

میں نے جب کبھی خواب میں سانپ کو دیکھا یا بشیر لیکر رات کو سرتے وقت سانپوں کی باغیں نہ ہوتی

ہوں۔ اور ان باتوں نے ذہن پر اثر نہ چھوڑا ہو۔ جو خواب میں بھی خیال کی صورت میں قائم رہے (نولازمی طور پر مجھے دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس خواب میں اگر میں نے سانپ کو کھل دیا۔ تو اس کا نتیجہ دشمن پستخ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اگر سانپ نے مجھے دس لیا۔ تو دشمن نے مجھے نقصان پہنچایا۔ میں لاہور کے روزانہ اخبار ”پنٹھ“ کو ایڈیٹ کر رہا تھا۔ رات کو میں نے خواب میں سانپ کو دیکھا۔ اس نے میرے کندھے پر دس۔ اور دس کر بھاگ گیا۔ جب یہ بھاگ کر اپنے پل میں گھس رہا تھا۔ تو میں نے اس کی دم پکڑ لی۔ اور پھر اس کے سر کو پکڑ کر اسے کھل دیا اس خواب کے بعد تیسرے روز مرحوم ہمارا چٹیا لہنے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ میرے مکان میں کوکین لکھوائی۔ مجھے گرفتار کر لیا۔ مقدمہ چلا۔ اور مقدمہ میں نہ صرت میں با عزت بری ہوا۔ اور مجھے پستخ نصیب ہوئی۔ بلکہ مجسٹریٹ نے چٹیا لہ کے خلاف سخت ریمارک بھی کئے۔ اور یہ معاملہ گورنمنٹ ہند تک پہنچ کر ہمارا چٹیا لہ کے لئے بہت ہی مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہوا۔

بھوپال کے مقدمہ ہوشنگ آباد سے ایک ہفتہ پہلے میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک چٹان پر کھڑا ہوں۔ اور دفعتاً یہ چٹان ٹپنی شروع ہوئی۔ میری والدہ بھی قریب ہیں۔ والدہ نے گھبرائے ہوئے کہا۔ کہ یہ زلزلہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنے میں چند جھٹکے آنے کے بعد چٹان کا ہلنا موقوف ہو گیا۔ تو میں نے والدہ سے کہا۔ ہاں زلزلہ تھا۔ مگر اب کوئی بات نہیں۔ زلزلہ بند ہو گیا ہے۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد مقدمہ ہوشنگ آباد میں میری گرفتاری ہوئی۔ اور گو یہ مقدمہ چھ سال تک جاری رہا اور کافی روپیہ اور وقت ضائع ہوا۔ مگر میں نے اس مقدمہ کی پروا نہ کی۔ اور نہ مجھے کوئی تکلیف محسوس ہوئی۔ میں میرے پورے تھیلے (ضلع سکھر سندھ) میں تھا۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں جا رہا ہوں۔ تو ایک دیوانہ کتا میرے پیچھے سے میرے قریب آ گیا ہے وہ مجھے کاٹنا ہی چاہتا ہے۔ کہ میں نے شور پیدا کر دیا۔ میرا شور سن کر قریب کا ایک شخص لاکھی لے کر پہنچا اور اُس نے دیوانہ کتے کو ہلاک کر دیا۔ اس خواب کے بعد اسی شام کا واقعہ ہے میں ریلوے کی پٹری پر سیر کے لئے جا رہا تھا۔ تو دیکھا کہ ایک سانپ ہے۔ میرے پاس کوئی لکڑی نہ تھی۔ مگر قریب ہی دیوار سے پھانگ تھا۔ جہاں چڑھ کر کھڑا تھا۔ میں نے اس کو آواز دی کہ سانپ ہے۔ وہ لاکھی لے کر بھاگا ہوا آیا۔ اور اس نے سانپ کو ہلاک کر دیا۔

مسٹر ڈی۔ ایم۔ زسنگار اودیرا غلام ریاست اندور نے مجھے بتایا کہ باؤلہ کے قتل کا واقعہ ابھی نہیں ہوا تھا۔ قتل کے واقعہ سے چند روز پہلے ہمارا جہ نے خواب میں دیکھا کہ دشمن کی فوج فاختانہ انداز میں اندور کے قلعہ کی طرف بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس خواب کے چند روز بعد باؤلہ کا قتل ہوا اور ہمارا جہ گدی سے اتار دیئے گئے۔

چند برس کا واقعہ ہے۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ دشمنان بھومی (مردے جلانے کی جگہ) میں ہزار ہا لاشیں پڑی ہیں۔ اور مردے جلانے جا رہے ہیں میں جب جا گا۔ تو اس دشتناک خواب کا ذہن پر بہت بُرا اثر تھا۔ میں نے دفتر میں ایک دو اصحاب سے کہا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

چنانچہ اس خواب کے دو تین روز بعد ہی دہلی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور لوگ قتل کیے گئے۔

## علاج کے لئے تشخیص کی ضرورت

کئی برس ہوئے مرحوم نظام دکن کے سابق ذاتی طبیب مرحوم حکیم عبدالوہاب صاحب انصا (حکیم نابینا صاحب جو مرحوم ڈاکٹر انصاری کے حقیقی بڑے بھائی تھے) موجودہ نظام دکن کے منٹ سے تنگ آکر حیدرآباد سے دہلی چلے آئے۔ اور یہاں آپ نے اپنا مطب جاری کر دیا۔ آپ کا یہ مطب اسپلیٹڈ روڈ پر دفتر "ریاست" کے بالکل قریب تھا۔ جہاں ہر روز سینکڑوں مریض آتے۔ حکیم صاحب نے مرحوم لالہ لاجپت رائے اور مرحوم ڈاکٹر انبال کا علاج کیا۔ جس کے باعث آپ کی شہرت شمالی ہندوستان میں بھی بہت کافی ہو گئی۔ کیونکہ ان دونوں لیڈروں کے علاج کا ذکر اخبار میں ہوتا رہا۔

ایڈیٹر "ریاست" کے ایک مشتبہ دار کا خط لائیل پور سے آیا کہ ان کی بیوی ہسٹیریا میں مبتلا ہیں۔ حکیم نابینا صاحب کا علاج کرانا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جواب دیا کہ تشریف لائیے۔ چنانچہ عزیز مع اپنی بیوی کے تشریف لے آئے۔ اور میں ان کو حکیم صاحب کے پاس لے گیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ حالات پوچھے۔ اور دیر تک تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا: "سردار دیوان سنگھ ہمارے عزیز دوست ہیں۔ کوئی فکر نہ کیجئے۔ علاج پورے غور سے کیا جائے گا جس میں گری ہے۔ اور دماغ میں خشکی! بہت جلدی بالکل اچھی ہو جائیں گی" ایڈیٹر "ریاست" ایک عرصہ تک میڈیکل پریکٹس کرتا رہا۔ اور دہانتا تھا کہ ہسٹیریا کو نہ دماغ کی خشکی سے نفلق ہے۔ نہ جگر کی گری سے۔ یہ نتیجہ ہے رحم میں ایڈیٹیشن کا۔ اس ایڈیٹیشن کا سبب چاہے کچھ ہی ہو مگر نہ تو میں کچھ کہہ سکتا تھا۔ اور نہ کوئی میری مننے والا تھا کیونکہ ریاست حیدرآباد کے شاہی حکیم معالج اور چار سو میل دور لائل پور سے آئے ہیں معتقد مریض۔ حکیم صاحب نے تسلی و تشفی دینے کے بعد نسخہ لکھا جو ایک سخت جلاب تھا۔ کیونکہ جس طرح عداوتوں میں جاذو دواں کی الف بے کورٹ فیس سے شروع ہوتی ہے۔ جیکبوں کے ہاں ہر بیماری کا علاج سخت مٹم کے جلاب خصوصاً جال گڑھے سے شروع کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ دوائی لے کر چلے آئے حکیم صاحب کے تمام خاندان کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" کے گھر سے درستانہ مراسم تھے حکیم صاحب نے نہ تو کوئی فیس لی۔ اور نہ دوائی کی قیمت۔ گھر واپس آنے پر مریض نے دوائی کھائی۔ کئی دست آئے۔ اور مریضہ کو جہاں پہلے دن میں کئی بار ہسٹیریا کے غش آئے۔ دستور کے آنے کے بعد یہ غش بالکل بند ہو گئے۔

جب غش بند ہو گئے۔ تو مریضہ اور مریضہ کا شوہر بہت مطمئن و خوش کہ دوائی کیا تھی۔ جادو تھا جو ایک دودھ خوراک میں ہی کئی برس کی بیماری دور ہو گئی۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" مطمئن نہ تھا کیونکہ وہ دانتا تھا کہ ہسٹیریا کا نہ دماغ کی خشکی سے کوئی نفلق ہے۔ نہ جگر کی گری سے۔ اور اگر نفلق ہو بھی۔ تو یہ کئی برس کی پڑائی نہ گری اور خشکی "دوائی کی ایک دودھ خوراک سے کیونکہ دور ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ

بہت ہی خوش۔ اور حکیم صاحب کے دست شفا کے پہلے سے زیادہ معتقد۔ چنانچہ مریضہ کے شوہر ارگئے۔ اُنہوں نے وہاں کے ایک بہت بڑا ہتھال خریدا۔ یہ ہتھال گھنٹہ والے حلوائی کے ہاں سے ہتھالی بیکر کر چکیا گیا۔ اور ان لوگوں نے اس ہتھالی کے ساتھ ایک سو ایک روپیہ نقد رکھا۔ اور ہم اگلی صبح پھر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب دیے تو ہر مریض کے ساتھ محبت و توجہ کے ساتھ بٹ آتے۔ مگر ایڈیٹر ”ریاست“ کے کرم فرمائے۔ آپ نے مریضہ کی منجھ کر دیکھا۔ اور یہ تک حالات پر چھنے بعد ارشاد فرمایا۔ پہلے سے دماغ کی خشکی اور دل کی گرمی میں بہت کمی ہے۔ اور مرض میں بہت کافی افادہ۔ انشاء اللہ تین چار روز میں قطعی آرام ہو جائے گا۔ دیوان سنگھ ہمارے عزیز ہیں۔ میں پوری توجہ سے تاج کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلدی اور مشکل نایہ ہو گا۔ ہم لوگ دوائی لے کر پھر واپس آئے اب حکیم صاحب نے حلاب نہیں دیا کوئی اور دوائی دی۔ جس کا علم ایڈیٹر ”ریاست“ کو نہیں۔ مگر خیال یہ ہے۔ یہ دوائی دماغ کی خشکی اور دل کی گرمی کے متعلق ہی ہو گی۔

اس دوائی کو کھائے دو روز ہوئے تھے۔ کہ مریضہ کو پھر غش کے دورے شروع ہو گئے۔ اور بالکل پہلے طرح دن میں کمی کمی بار مریضہ اور اس کا شوہر پہلے تو خوش تھے۔ مگر اب ان کے چہرہ پر کچھ تشویش اور حیرانی ماحر ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم لوگ پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حکیم صاحب نے پھر منجھ کر دیکھا۔ اور پہلے کی طرح انشاء اللہ کہتے ہوئے پھر تلی دی اور کہا کہ جلر کی گرمی اور دماغ کی خشکی کا ابھی اثر باقی ہے۔ رننہ رننہ دور دور ہو جائے گی۔ حکیم صاحب نے آج پھر پہلے روز والا حلاب دیا اور ہم واپس آ گئے۔

یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا حکیم صاحب حلاب دیتے تو مریضہ کے غش دورے ہوتے۔ اور حکیم صاحب دوسری دوائی دیتے تو یہ غش پھر جاری ہو جاتے۔ ان غشوں کے آنے اور نہ ہونے سے یہ لوگ بچارے کبھی پریشان اور کبھی خوش۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کی پوزیشن نازک۔ کہ اگر وہ ان کو کسی دوسرے ڈاکٹر کا علاج بدلنے کے لئے کہے۔ تو شاید یہ لوگ برا مانیں۔ اور خیال کریں کہ میں ان مہمانوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ اور ان کو جانے

کے لئے کہہ رہا ہوں۔ چند روز کے بعد مجھ سے رہ نہ گیا۔ اور میں نے مریضہ کے شوہر سے کہا کہ یہ طریقہ علاج غلط ہے ہسٹیریا کوئی بیماری نہیں۔ یہ صرف رحم کی مختلف بیماریوں کا نتیجہ یا علامت ہے۔ جس طرح بخار خود کوئی بیماری نہیں۔ مختلف بیماریوں کا ایک نتیجہ ہے۔ مثلاً پلگ ہو تب بخار۔ تب دق ہو تب بخار۔ سلیریا ہو تب بخار۔ اس طرح کسی وجہ سے بھی رحم میں اری مٹین (فارش) ہو۔ ہسٹیریا ہو جاتا ہے۔ میرے اس سمجھانے پر یہ فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے تشخیص کرائی جائے اور کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ بیماری کیسی ہے۔ اور اس کے بعد علاج ہو۔ یہ علاج چاہے کسی اچھے ڈاکٹر کا ہو یا حکیم صاحب کا۔ اس زمانہ میں سول ہسپتال دہلی کے انجارج ڈاکٹر دیوی داس کپور تھے۔ جن کے ایڈیٹر ”ریاست“ کے ساتھ ذاتی درستانہ تعلقات تھے۔ ان ڈاکٹر صاحب سے ایک تعارفی خط لیڈی ہارڈنگ زنانہ میڈیکل

کلج کی پرنسپل (میرا خیال ہے کہ ان کا نام غالباً س کیمل تھا) کے نام لیا۔ ہم لوگ مریضہ کو لے کر لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کلج گئے۔ وہاں پرنسپل صاحبہ سے ملے۔ اُنھوں نے دوسری ڈاکٹر ٹینڈل کے ساتھ بل کر مریضہ کو دیکھا۔ تو رحم پر ایک زخم تھا۔ اس زخم سے تھوڑا سا مواد لیا گیا۔ اور اس مواد کو خوردبین

سے دیکھا گیا تو اس میں ایک پوشیدہ بیماری کے جراثیم تھے۔ چنانچہ بیماری کے پچھلے حالات سنے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ کئی برس ہوئے مریضہ کے شہر ایک پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہوئے۔ اس بیماری کے جراثیم ان کی بیوی میں منتقل ہوئے۔ ان جراثیم کے باعث ہی مریضہ کے رحم پر زخم ہوا۔ اور اس زخم میں جب اری میٹن ہوتی ہے۔ تو مریضہ بے ہوش ہو جاتی ہے جسے ہسپتال کہا جاتا ہے یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور حجاب کا اثر یہ ہوتا کہ انٹریاں جب صاف ہو جاتیں تو ان انٹریوں کا بوجھ یا اثر رحم پر نہ پڑتا۔ رحم راحت محسوس کرتا۔ اور مریضہ بے ہوش نہ ہوتی۔

اس کے بعد ایڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر کپور کے مشورہ سے مریضہ کے رحم کو ڈوش سے دھویا جانا۔ اور اس کے ساتھ ان کے شوہر کا علاج بھی شروع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریضہ چند روز میں بالکل اچھی ہو گئی۔ اور اب یہ خاتون کئی بچوں کی ماں ہے۔

نئی سائیتس نے علاج کے لئے تھرماسیٹر، سیٹھ سکوپ۔ مائیکر سکوپ۔ ایکس رے۔ بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ۔ پیشاب دیکھنے کا آلہ اور اس قسم کے درجنوں دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے جو بیماریوں کی تشخیص میں معاون و مددگار ہیں۔ ان ذرائع کی امداد سے محرم ہونا اور علاج سے پہلے اچھی طرح تشخیص نہ کرانا نہ صرف حماقت بلکہ بد نصیبی بھی ہے۔ اور درست طریقہ یہ ہے کہ ہر مرض کی پہلے اچھی طرح تشخیص کرائی جائے۔ اور تشخیص کے بعد علاج چاہے کسی ڈاکٹر سے کرایا جائے۔ یا کسی حکیم اور دیدے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

## والیان ریاست کی سازشیں

مرحوم ہمارا چڑیا لہ بہت فیاض تھے۔ اور فیاضی کے اعتبار سے ان جیسا بلند کوئی نواب یا ہمارا جہ نہ گذرنا۔ والیان ریاست میں پیدا ہوا اور نہ ان کے دو دو میں کوئی دوسرا آپ کی مینا ضیاں نہ صرف عوام بلکہ والیان ریاست اور ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں تک وسیع تھیں۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے کوئی والیان ریاست آپ سے امداد وصول کرتے رہے اور والیان ریاست کے سینکڑوں عزیز اقارب ایسے تھے جو مرحوم سے زندگی بھر وظائیت پاتے رہے۔

مرحوم ہمارا چڑیا لہ کی امداد یا ماہوار وظائیت حاصل کرنے والوں میں سے مرحوم نواب الیر کوٹلہ کے ایک عزیز بی عزیز بھی تھے۔ جو نواب صاحب الیر کوٹلہ کے دل سے دشمن تھے۔ مگر ظاہر طور پر نواب صاحب کی وفا شکاری کا دم بھرتے تھے ہمارا جہ اگر ان حضرت کی امداد کرتے تو صرف اس خیال سے کہ یہ ایک ریاست کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ صاحب جن کو خاندانی اعتبار سے نواب صاحب ہی کہا جاتا تھا۔ چڑیا لہ میں اکثر آتے اور کوئی کئی ماہ تک وہاں قیام کرتے۔

جب ہمارا چڑیا لہ اور ایڈیٹر ریاست کے درمیان کشمکش زوروں پر تھی۔ اور ہمارا جہ ریاست کے مضامین کو بند کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر چکے۔ تو ان نواب صاحب نے ہمارا جہ سے عرض کیا



”سرمکار دیوان سنگھ کو چکنا کیا شکل ہے۔ میں انتظام کرتا ہوں کہ اُسے پٹیل لایا جائے۔ اور پٹیل جیل میں عذاب دے دے کہ ہلاک کیا جائے۔“ چنانچہ ان نواب صاحب نے ہمارا جیسے دس ہزار روپیہ اخراجات کے لیے حاصل کیا۔ اور آپ اپنے اس شن کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے۔

اُس زمانہ میں ایڈیٹر ریاست، ”دیرا گنج کی کوٹھی نمبرہ“ میں رہتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کوٹھی کے بالکل قریب ہی وہ کوٹھی کرایہ پر لے لی۔ جس میں کسی زمانہ میں ایک با اثر مسلمان کانگریسی بیرسٹر رہتے تھے (میں مرحوم بیرسٹر صاحب کا نام بھول گیا ہوں۔ بیرا خیال ہے کہ ان کا نام مسٹر عہد الزوف تھا) اس کوٹھی میں مقیم ہونے کے بعد یہ حضرت میرے پاس ملنے کے لیے تشریف لائے۔ آپ نے اپنا تعارف کرایا۔ کہ آپ نواب صاحب بالیر کوٹھ کے قریبی عزیز ہیں۔ نواب بالیر کوٹھ بہت ظلم میں اور آپ بالیر کوٹھ سے ہجرت کر کے دہلی میں آ گئے ہیں۔ کیونکہ بالیر کوٹھ میں آپ کی عزت و جان محفوظ نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے نواب صاحب بالیر کوٹھ کی بیواشیوں کے ثبوت میں ایک خط بھی دیا۔ یہ خط بالیر کوٹھ کے ایک بڑے ہزار وڈو کٹر کی لپٹی کا لکھا ہوا نواب صاحب کے نام تھا۔ جو ناہرے کے ایک زمانہ کا گھڑ سے لکھا گیا۔ اور اس میں نواب صاحب کی محبت کا ذکر تھا۔ اور یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ نواب صاحب اس لڑکی کو اپنی زندگی کا باقاعدہ ساتھی بنالیں۔ ورنہ وہ مجبور ہوگی کہ نواب صاحب سے نفرت منقطع کر کے کسی دوسرے کے ساتھ چلی جائے۔

میں نے زندگی بھر یہ کوشش کی کہ ریاست میں کبھی کوئی ایسا مضمون شائع نہ ہو جس میں اشارہ بھی کبھی کسی خاقدن کے کیرکٹر پر حملہ کیا گیا ہو۔ یہ خط تو پنجاب کے ایک بہت معزز خاندان کی لڑکی کا تھا۔ اس کا ”ریاست“ میں شائع ہونا کیونکہ ممکن تھا۔ میں نے اسے شائع نہ کیا۔ اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے اس لڑکی اور لڑکی کے والدین کی عزت کے متعلق کئی بار خیال آیا۔ تین چار روز کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے لڑکی کے دادا کو ایک رجسٹری خط لکھا جس میں یہ الفاظ تھے کہ آپ کی لپٹی کا نا جائز تفتیش نواب صاحب سے ہے۔ اور جو حالات میرے پاس پہنچے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی اپنے مستقبل سے لاپرواہ ہو کر آپ کی عزت کو بھی مٹی میں ملاسنے والی ہے۔ میری رائے ہے کہ اس لڑکی کی کہیں شادی کر دو۔ اور اسے مدفع نہ دے کہ یہ نواب صاحب سے خط و کتابت کر سکے۔ یا بل سکے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ میں اس لڑکی کے کیرکٹر کے متعلق ہر اعتبار میں کچھ لکھنا کہیں نہ سمجھتا ہوں۔“ میں نے رجسٹری خط اس لیے بھیجا کہ یہ خط ان ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ چند روز بعد ہی نواب صاحب کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

یہ نواب صاحب پہلی ملاقات کے دو روز بعد پھر تشریف لائے۔ بہت محبت و اخلاص کا اظہار کیا۔ ایک گھنٹہ تک باتیں کرنے کے بعد ارشاد کیا کہ میں رات کو کھانا اُن کے ہاں کھاؤں چنانچہ رات کو میں کھانا کھانے کے لئے اُن کی کوٹھی حاضر ہوا۔ شاید نہ ٹھاٹھ۔ ایک ترخانہ دانی نواب دوسرے ہمارا چٹیل کار وہید۔ میز پر قسم قسم کی شرا ہیں۔ نواب صاحب کے گھر کی تین چار فوجان اور خوبصورت خادماں رجن کی حیثیت لوندیوں کی تھی (بے پردہ مکہ میں ادھر ادھر پھر رہی ہیں۔ اور میز پر کھانا لانے میں مصروف ہیں۔ نواب صاحب کبھی کبھی ان لڑکیوں میں سے کسی کسی سے محض مذاق بھی کر لیتے ہیں۔ اور لڑکیاں مسکرا کر

چلی جاتی ہیں۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے ارشاد کیا کہ کیا پیو گے میں نے دو تین بار انگار کربا۔ اور جب بار بار زور دیا گیا۔ تو میں نے کہا کہ اچھا صرف نصف پیگ برانڈی۔ نواب صاحب یہ سن کر حیران ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں غلط ہو جاؤں گا۔ اور وہ اپنی سیکم کو عملی صورت دے سکیں گے۔ شراب کے متعلق بعض اصحاب کو میرے متعلق بہت غلط فہمی ہے۔ میرے بعض وہاں ایسے آتے ہیں جو بڑوں کی باتیں ختم کر سکتے ہیں۔ اور ان دوستوں کی اس پوزیشن کے باعث بعض اصحاب مجھے بھی اسی شینڈل کا "پیاگ" سمجھتے ہیں۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے اور میرے حالات کے لیے تمام گہرے دوست واقف ہیں کہ مجھے شراب سے قطعی نفرت ہے۔ میں چھ چھ ماہ یا ایک ایک سال تک شراب نہ پیتا تھا۔ سردیوں میں جب زیادہ کام کے باعث تھکاوٹ محسوس کر دوں تو رات کو کھانا کھانے سے پہلے ایک اونس کے قریب برانڈی صوطے میں ملا کر پی لیا کرتا ہوں۔ یا کبھی زکام ہوا تو ایک اونس برانڈی گرم پانی میں ملا کر پی لی۔ جس سے نصف گھنٹہ میں ہی اچھا ہو جاتا ہوں چنانچہ برانڈی کی ایک بوتل بعض اوقات میرے لیے تو ایک ایک سال تک کام دیتی ہے۔ مگر کوئی پینے والی دوست تشریف لے آئے۔ تو اسے دو گھنٹہ میں ہی ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ شراب کے متعلق میری فی الحقیقت اور ایمان داری کے ساتھ پوزیشن یہی ہے۔ میں نہ تو شراب پینے کے حق میں ہوں۔ اور نہ اس سے ایسا بد کرتا ہوں۔ جیسے مذہبی لوگ بد کہتے ہیں۔

نواب صاحب کی سیکم یہ تھی کہ وہ کسی روز مجھے شراب میں غلط کر کے اپنی موٹر میں ڈال لیں گے۔ اور مجھے غور حالت میں ہی ہمارا چہرہ سمیٹا لے کے حضور میں پیش کیا جائے گا۔ پھر ہمارا جہ جو چاڑیں اسے دشمن کے ہاتھ ساؤک کریں۔ اس سیکم کے لئے وہ دس ہزار روپیہ پیشگی لائے اور بعد میں ہفتے روپیہ کی ضرورت ہو مٹا سکتے تھے۔

نواب صاحب کی اس پہلی دعوت کے بعد ہی میں نے پشمال ایک دوست کو خط لکھا۔ جہ ہمارا جہ کے حلقہ میں رہتا تھا۔ اور ایک سپرٹ سے متاثر ہو کر مجھے اطلاع میں دیا کرتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ نواب صاحب کیسے آدمی ہیں؟ انھوں نے معاملہ کر کے بعد مجھے اطلاع دی کہ ان حضرت کی سیکم ایڈیٹر ریاست "کوہلی سے پشمال لائے کی ہے۔ اور ہائیڈریٹ سیکرٹری کے دفتر سے دس ہزار روپیہ ایڈوانس لے گئے ہیں۔ اس اطلاع کے سننے کے بعد میں بہت محتاط ہو گیا۔ اور یہ جب سمجھ لیتے ہیں تو ان سے شکرا اُسکرا کر باتیں کرتا۔ تاکہ یہ تاریکی میں رہیں۔ اور یہ سمجھیں کہ مجھے کوئی علم نہیں۔ مگر مجھے ان سے دلی نفرت ہو گئی۔

پہلی دعوت پر صرف کھانا تھا۔ اور نواب صاحب کی خواہش تھی کہ میں بے تکلف ہو جاؤں اور ان کی خاموشی سے بار بار گندہ مذاق کرنے سے تو خیال ہوتا تھا کہ شاید وہ مجھے بھی اس سلسلہ میں بے تکلف اور اپنے ساتھ شریک کر لینا چاہتے ہیں۔ کھانا بہت پُر تکلف اور ذہنی وضع کا تھا۔ یعنی دیسی و انگریزی دونوں قسم کی ڈشیں۔ کھانے کے بعد مالیر کوٹہ۔ پشمال۔ اور دوسری ریاستوں کا ذکر رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں واپس آ گیا۔ اور میرے شراب میں محو رہنے کے باعث نواب صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کھوئے کھوئے سے ہیں۔ اور بالکل ہی محسوس کر رہے ہیں۔

اس دعوت کے نہتہ چھ ہفتہ دعوت دی گئی۔ اس سے پہلے میرے پاس ان نواب صاحب کی سکیم کی اطلاع پٹیلہ سے پہنچ چکی تھی۔ اور میں بہت محتاط تھا۔ سڑکا ہرن کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں اس دوسری دعوت کے متعلق آپ نے بہت زور دیا۔ میں حصر دینے کے بہانہ سے انکار کرتا رہا۔ آخر اپنے جب کئی بار آکر تنگ کیا۔ تو میں نے اس شرط پر دعوت میں حاضر ہونے کا اقرار کیا کہ اگر لالہ امیر چند کھنہ وغیرہ درمیں اور دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ دوسرے جو دوست آئے ان کے متعلق مجھے یاد نہیں رہا کہ کون تھے۔ یہ دعوت پہلے سے ہی زیادہ پر تکلف تھی۔ اور نواب صاحب نے گانے کے لیے نایر کوٹلہ کی ایک خواہش اور سازندوں کو بھی منکار رکھا تھا۔ اس طوابع کا نام غالباً نواب یا نواب بیگم تھا۔ جو دہلی کے چارٹی یا نواب میں پرکٹش کرتی تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ بغیر کسی فیس یا معاوضے کے منگائی گئی۔ کیونکہ دایان ریاست اور ان کے رشتہ دار اپنی رعایا سے مصنت کام لینا نواب یا ایک تسم کا احسان سمجھتے ہیں۔ اس دعوت پر بھی وہی تھوڑی سی توہیو اور کچھ توہیو کا اصرار۔ اور میرا وہی انکار۔ کھانے کے بعد نواب کا گانا ہوا۔ اور ہم لوگ واپس آئے۔ نواب صاحب کو باہمی ہوئی۔ ایک توہیو نے شراب پی۔ دوسرے میرے ساتھ لالہ امیر چند کھنہ وغیرہ تھے۔

اس دعوت کے بعد نواب صاحب کی یاد دہلی میں ہے۔ اور مجھ سے اکثر ملا کرتے۔ اور دعوت پر آنے کے لیے کہتے۔ مگر میں ہمیشہ ہی انکار کرتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہ گیا۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا۔ نواب صاحب آپ کی سکیم کا باب نہیں ہو سکتی۔ نہ میں شرابی ہوں۔ کہ میں بے وقوف بن کر بے ہوش ہو جاؤں اس کے علاوہ بہت محتاط ہوں۔ آپ مجھے پٹیلہ نہیں لے جا سکتے۔ اور اگر آپ باز نہ آئے تو یہ غیر ممکن نہ ہوگا۔ کہ آپ کی نوابیت دہری رہ جائے۔ اور آپ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کے جرم میں دہلی کے کسی محنت ساند کی حوالات میں بند ہوں۔ نواب صاحب میرے یہ خلاف توقع الفاظ سن کر حیران اور ناراض سے ہو گئے۔ اور میری ”غلط فہمی“ کا شکوہ کرنے لگے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد نواب صاحب تشریف نہیں لائے میرے اس کہنے کے دو تین روز بعد ہی دہلی سے واپس پٹیلہ چلے گئے۔

اس واقعہ کے بعد نواب صاحب سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک جرمنسٹ کے متعلق سنٹرل آسٹریا میں سوالات دریافت کرانے کے لیے سردار سنت سنگھ ممبر اسمبلی سے ملنے لائل پور جا رہا تھا۔ تو اتفاق سے آپ ریلوے اسٹیشن لاہور پر مل گئے۔ مجھے دیکھ کر دیسے تو تیاگ کے ساتھ بخلیگر ہوئے۔ مگر ان کا چہرہ ظاہر کر رہا تھا کہ بہت نادام ہیں۔

میرا یقین ہے کہ اگر مجھے شراب کی لت ہوتی تو میں یقیناً اس سادوش میں ان نواب صاحب کے پھندے میں گرفتار ہو کر اس وقت پٹیلہ جیل میں ہوتا۔ اور نہ معلوم مرحوم ہمارا چہ پٹیلہ انتقام کے جذبات باعث میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

# گناہوں کی سزا

پچاس ساٹھ برس کا عرصہ ہوا۔ دہلی میں اردو زبان کے جو بہترین اخبارات تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان میں "کرزن گزٹ" کو بہت بلند پوزیشن حاصل تھی اس اخبار کے ایڈیٹر مرزا حیرت تھے۔ جو دنیا آگے نکل گئی۔ اور کرزن گزٹ دنیا کے ساتھ نہ چل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "کرزن گزٹ" بند ہو گیا۔ جس طرح چورچوری چھوڑ دے پیرا پھیری کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک جرنلسٹ کے لئے بھی یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اخبارات سے نقل منقطع کر کے بلڈگ کی زندگی بسر کرے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جرنلسٹ نے زندگی میں کئی کئی بار اخبار جاری کیے۔ اور ناکام ہو کر ان کو بند کر دیا۔ مگر اخبار جاری کرنے اور پھر بند کر دینے کا یہ سلسلہ جاری ہی رہا اور سال و سال کے بدینا اخبار پھر جاری کر دیا گیا۔ مرزا حیرت بوڑھے ہو چکے تھے۔ آپ کا ذریعہ معاش و ریسہ میں رہسپتال کی طرف سے دیرسہ میں جاتے ہوئے باتیں طرف کو دس بارہ دوکانیں چھوڑ کر آپ کی دکان بقی کتابوں کی دکان تھی۔ مگر آپ کا اخبار جاری کرنے یا جاری رکھنے کا "کھڑک" پورا نہ ہوا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں جبکہ "ریاست" کا دفتر سڑک پر بیڑ پر تھا مرزا حیرت "دورہ عمر" کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالتے تھے۔ یہ اخبار چھوٹے سائز کے چار صفحہ کا تھا۔ اور اس کی قیمت غالباً ایک پیسہ تھی۔ مرزا حیرت کے اس اخبار "دورہ عمر" میں خواجہ حسن نظامی کے خلاف بھی مضامین شائع ہوتے۔ خواجہ حسن نظامی کی مکاریوں کو نہایت بُری طرح سے بے نقاب کیا جاتا۔ اور خواجہ صاحب نے نہایت کوشش کی کہ مضامین کا یہ سلسلہ بند ہو جائے مگر یہ بند نہ ہوا۔ چنانچہ خواجہ صاحب اس اخبار سے بہت ہی تنگ آ گئے۔

دفتر "ریاست" مرزا حیرت کی دکان سے بالکل قریب تھا۔ یعنی ان دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی تھی۔ جو ایک طرف تو سڑک پر بیڑ پر نکلتی تھی دوسری طرف دیرسہ میں لیس ہاؤس میں ایڈیٹر "ریاست" اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ اور خواجہ حسن نظامی ہفتہ میں دو تین بار دفتر "ریاست" میں تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز خواجہ صاحب آئے تو ان کے ساتھ دونوں جو خوب صورت لڑکے بھی تھے۔ یہ لڑکے اس زمانہ میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لوگوں میں ان لڑکوں کے متعلق بہت چرچا تھا۔ اور لوگ اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی کے چال چلن پر بھی الزام لگاتے۔ مگر یہ الزامات قطعی بے بنیاد اور غلط تھے۔ اور اقم الحروف کو ذاتی واقفیت ہے۔ کہ خواجہ حسن نظامی خلاف وضع فطری۔ شراب۔ زنا یا اس قسم کی چال چلن کے متعلق تمام کمزوریوں سے بلند تھے۔ خواجہ حسن نظامی ان دونوں بوجان لڑکوں کے ساتھ دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ یہ سب آپس میں کچھ دیر مشدہ کر رہے۔ پھر وہ دونوں کے بعد یہ دونوں لڑکے مرزا حیرت کی دکان پر گئے۔ اور انھوں نے باننا میں کھڑے ہو کر مرزا حیرت پر جوتا پھینکا۔ مرزا حیرت دکان کے اندر بیٹھے تھے۔ یہ دونوں لڑکے جوتا پھینک کر واپس دفتر "ریاست" میں بھاگ آئے۔ واپس آنے کے بعد یہ اپنی کارگزاری پر بہت خوش تھے۔ اور خواجہ حسن نظامی نے بھی ان کو ان کی اس بہادری پر داد دی۔ ایڈیٹر "ریاست" کو اس واقعہ کا ان کے واپس آنے پر علم ہوا۔ یہ حالات سن کر ایڈیٹر "ریاست" کو بہت افسوس ہوا۔ مگر اخلاقی جرأت نہ ہونے

کے باعث اس نے نہ تو افسوس کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی اس غنڈہ پن پر ملامت کی بلکہ حالات سن کر نیم دلی کے ساتھ یہ بھی شکر ادا کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سنگِ اخلاقِ واقعہ کو اگر یہ پسند نہیں کرتا، تو دوستانہ تعلقات کے باعث اس پر ملامت بھی کرنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ مرزا حیرت پر جب جوتا پڑا۔ تو مرزا حیرت حیران تھے اور مرزا صاحب کے دکان سے باہر نکلنے یا شور پیدا کرنے سے پہلے یہ دہاں سے بھاگ آئے۔

ویسے تو خواجہ حسن نظامی کے بلند ہونے کے سلسلہ میں ایڈیٹر ریاست، کو کوئی دوسرے واقعات کا بھی تجربہ تھا۔ مگر اس واقعہ کا تو دل پر بہت ہی بُرا اثر ہوا۔ بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ اس واقعہ کے بعد گو ایڈیٹر ریاست، اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان گہرے تعلقات رہے مگر ان تعلقات میں عزت و احترام کے جذبات نہ تھے۔ کیونکہ کیریکٹر کے اچھے یا بُرے ہونے کا اثر انسان کے گھر والوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پورے لوگوں کے عزیز و اقارب بھی اُن کو عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اور اچھے لوگوں کے کیریکٹر کے دشمن بھی مآخ ہوتے ہیں۔

یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ اس واقعہ کے انیس برس بعد یعنی ۱۹۵۴ء میں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ اجیری دروازہ کے باہر ایک کالج میں ہونے والا تھا۔ یہ جلسہ محب الوطن مسلمانوں کے خلاف تھا۔ اور محب الوطن مسلمانوں کی خواہش تھی کہ یہ جلسہ کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ کالج کے دروازے سے باہر سڑک پر احرامی وغیرہ محب الوطن المتغیر لوگوں کو جلسہ میں جانے سے روک رہے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ اس جلسہ کی اصل غرض کیا ہے۔ اتنے میں پرگرام کے مطابق خواجہ حسن نظامی بھی موٹر میں تشریف لائے۔ کیونکہ آپ جلسہ میں تقریر کرنے والے تھے۔ خواجہ حسن نظامی تقریریں کرنے کے لئے دہلی میں مشہور تھے۔ یہاں کے لوگ ان سے ہر جلسہ میں تقریریں کرا لیا کرتے۔ یہ جلسہ چاہے آریہ سماجیوں کا ہوتا۔ اکائیوں کا ساتھ دھرمیوں کا۔ انگریزوں کے خوشامدیوں کا یا انگریزوں کے مخالفین کا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی جلسہ کے لئے کوئی تقریر کرنے والا نہ ملتا تو یہ حضرت تقریر کے لئے ضرور آجاتے۔ اور ان سے جس قسم کی چاہتے تقریر کرا لیتے۔ ان بچاؤں نے کبھی انکار نہ کیا جب آپ کالج کے دروازے پر پہنچے تو لوگوں میں جلسہ کے خلاف بہت جوش تھا۔ ہلکے خواجہ حسن نظامی کی ابنِ وقتینوں۔ پروبرٹش پالیسی اور سنگ حریت حرکتوں سے پہلے ہی تنگ تھی۔ لوگوں نے خواجہ حسن نظامی کو کاریں دیکھا تو اس میں سے اُترنے نہ دیا۔ ان کو کاریں ہی جو تیاں لگائیں۔ ان کے منہ پر حقو کا۔ اور زمین سے مٹی اٹھا کر ان کے منہ اور سر پر ڈال دی۔ خواجہ حسن نظامی چونکہ انگریزوں کے خوشامدی تھے۔ ان کو حکام پر بہت ناز تھا۔ یہ کارلے کر کالج کے دروازے سے بھاگ گئے۔ اور اجیری دروازہ کے پاس ایک جگہ پہنچے۔ جہاں ٹیلی فون تھا۔ ٹیلی فون پر انھوں نے حکام اور پولیس کو اطلاع دی کہ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ پولیس مرتضیٰ پور پہنچی۔ خواجہ حسن نظامی پولیس کا انتظار فرما رہے تھے۔ اتنے میں حملہ کرنے والے لوگ جلسہ میں گڑ بڑ پیدا کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پولیس اب گڑا کرے تو بکس کر۔ اب خواجہ حسن نظامی بھی اس طرح ہی ٹھنڈے ہو کر صبر کرتے ہوئے اپنے گھر کو تشریف لے گئے۔ جس طرح مرزا حیرت نے انیس برس پہلے خواجہ حسن نظامی کے جوتیل والے حملہ پر صبر کیا تھا۔

ایڈیٹر ریاست " نہیں کہہ سکتا کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ پر غور کرنے کی نہ فرصت ہے نہ قابلیت۔ اور وہ نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ سزا اور جزا دینے والا کون ہے۔ مگر یہ اپنے پچھلے تجربوں کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ ظلم کی سزا یقیناً ملتی ہے۔ یہ چاہے فوراً ملے۔ یا کچھ عرصہ کے بعد یا شاید اگلے جنم یعنی مرنے کے بعد بھی اور یہ ہو نہیں سکتا کہ گت ہوں کی سزا سے انسان بچ سکے۔

## والیان ریاست کا روپیہ وریسٹک خدمت

میری مالی حالت ہمیشہ ہی کمزور رہی۔ اور پچھلی تمام زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں۔ جب کہ میں مقروض نہ تھا۔ چنانچہ میری مالی کمزوریوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ مرحوم لال رام رچپال سنگھ شیدا ایڈیٹر ہندوستان لاہور میرے ہاں مقیم تھے۔ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے تھے جیسی بزرگ اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں سے۔ اور محبت و شفقت کے ان جذبات کے باعث ہی وہ کئی کئی ماہ تک میرے پاس رہا کرتے۔ میں نواب بھوپال والے مقدمہ کی پیشی کے لئے ہوشنگ آباد جانے والا تھا۔ اور سامان باندھا جا رہا تھا۔ مسٹر پوٹن جو زف ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز، بھی سٹلے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ شیدا صاحب نے بزرگانہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "تم گاڑی میں احتیاط سے رہا کرو۔ خصوصاً جب ٹرین بھوپال کے علاقہ سے گزرے۔ تو اپنا ریوالتور جیب میں رکھنا۔ ان والیان ریاست کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی حملہ کر دے۔" شیدا صاحب کے یہ الفاظ سن کر مسٹر پوٹن جو زف نے مسکراتے ہوئے کہا: "شیدا صاحب والیان رکھتے۔ دیوان سنگھ کو نہ تو نواب بھوپال مار سکتا ہے۔ نہ اس کے آدمی۔ اس کو تو اگر کوئی مار سکتا ہے۔ تو دیوانی عدالتوں کے پیادے ہی مار سکتے ہیں۔ جو دیوانی مقدمات کے سمن اور قریاں لپا کرتے ہیں۔" مسٹر جو زف کا مطلب یہ تھا کہ دیوان سنگھ پر والیان ریاست کے مقدمات اور جملے کوئی اثر نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے پریشان کن ہیں۔ تو دیوانی عدالتوں کے لینے دینے کے مقدمات۔

میری مالی پریشانیوں کی وجہ کیا ہے۔ عام لوگ تو شاید نہ جانتے ہوں۔ مگر مجھ سے واقف حلقہ جانتا ہے۔ کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں روپیہ سے محبت نہیں کرتا۔ میری فطرت روپیہ جمع کرنے کے خلاف ہے۔ میں اپنی ہر شے کو دوستوں اور ضروری مقصدوں کی خدمت پر صرف کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی دوست یا ضرورت مند روپیہ طلب کرے۔ اور روپیہ میرے پاس ہو۔ تو میں انکار نہیں کر سکتا اور میں عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ تو حسی کو سامنے رکھتا ہوں۔ اور نہ مستقبل کو۔ اور روپیہ پیسے کے معاملہ میں اگر میں غور کر سکتا ہوں تو صرف حال کے زمانہ پر۔ چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں اپنے کاروبار کے لئے اتنی محنت کی کہ شاید کسی جرنلسٹ نے مذہبی ہوگی۔ اتنا روپیہ پیدا کیا۔ کہ کسی اخبار نویس نے نہ کیا ہوگا۔ اور اتنا روپیہ صرف کیا۔ کہ بہت کم اخبار کے ایڈیٹروں کو اس کا اتفاق ہو جاوے گا۔ اور آمدنی اور خرچ کا توازن سے اندازہ لگائیے۔ کہ ریاست میں چالیس چالیس صفحہ کے مستقل اشتہارات ہے۔ جن سے ہر ہفتہ ہزار روپیہ کاروبار پر نیکو وصول ہوتا۔ اور تجارت کے ذریعہ حاصل کی گئی اس مستقل آمدنی کے علاوہ اگر مجھے کبھی روپیہ کی دفعتاً ضرورت ہوتی تو میرے

دوستوں نے کبھی بھی نجل سے کام نہ لیا۔ اور ان دوستوں میں وایان ریاست۔ ریاستوں کے وزراء۔ کانگریس لیڈر۔ صحافت کے وزراء۔ وائسرائے کی انتظامیہ۔ کنسل کے میجر اور انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس جیسی پبلک کی نمائندہ آرگنائزیشنیں بھی شامل تھیں۔ اور گرامی قوتیں بیٹھ رہیں۔ مگر میرا کام کبھی بھی نہ ٹکا۔ اور قدرت نے یا میرے مستاندوں نے رجوتن کے مطابق مشکل کا ستارہ میرے لیے ہمیشہ مانی اور دوسری بریٹانیال پیدا کرنا ہے۔ اور برہمپت، ہمیشہ ہی میری مشکلات آسان کر لے (میری ہمیشہ یاد دہانی۔ اور خرچ کے اعتبار سے یہ کہنا کہ فلاں ضرورت مند کو یہ دیا۔ اور فلاں دوست کو یہ دیا کہینہ چن ہوگا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض دوستوں اور ضرورت مندوں کے لیے جیس جیس میں اور بچیں بچیں ہزار روپیہ بھی صرف ہوا۔ اور میرے اندازہ کے مطابق ”ریاست“ کی آمدنی میں سے اب تک پچاس ہزار روپیہ سے زیادہ توڑا کٹروں اور کمیٹیوں کی جیب میں گیا۔ جو دوستوں اور ضرورت مندوں کا علاج کرتے رہے۔ انشاور پیہ صرف کرنے کا میرے ذہن پر کیا اثر ہوا۔ اس کے متعلق اگر میری زبان پر یقین کیا جائے تو یہ پیمانہ دہائی کے ساتھ بیچ گنتا ہوں کہ روپیہ صرف کرتے ہوئے مجھے وہ ایلینان و مسترت نصیب ہوئی رہی ہر شایہ فدا کی مبادت میں اور لیبار انٹرک اور کالکٹنگ کرنے میں یاد شاہوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اتنی آمدنی اور اتنے مصارف کے ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی ذات پر کیا کچھ خرچہ کیا۔ اس کا اندازہ تو اس سے ہی کر لیجئے کہ میں گراہیہ کے مکان میں رہتا ہوں۔ زندگی میں اپنے لیے ایک کوٹھڑی بنانا بھی نصیب نہ ہوا۔ کسی کئی ہفتہ نہیں کئی کئی ماہ تک بازار کے توروں اور ہوٹلوں سے روٹی منگا کر کھا لیتا ہوں۔ اور کیش بکس میں شام کو دو تین یا چار روپیہ سے زیادہ کبھی بھی نصیب نہ ہوا۔

مسٹر امرت لال سیٹھ ایڈیٹر روزانہ گجراتی اخبار ”جنم بھومی“ انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ اور آپ نے ریاستوں کی رعایا میں بیداری پیدا کرنے کے اہم بار سے نمٹنے کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ آپ کے دل میں ”ریاست“ اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے لیے ہمیشہ ہی عزت و محبت کے جذبات رہے۔ آپ محسوس کرتے کہ ”ریاست“ نے شمالی ہند کی ریاستوں کی پبلک میں بیداری پیدا کرنے کے اعتبار سے ملکہ کی خدمت انجام دی ہے۔ اور آپ کی کوشش ہوتی کہ ایڈیٹر ”ریاست“ ہر کمزوری سے بلند رہ کر پبلک کی خدمت انجام دے۔ چنانچہ راقم الحروف ایک بار بمبئی میں تھا۔ وہاں ایک پرائیویٹ صحبت میں انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے چند لیڈر موجود تھے۔ چائے پر باتیں ہو رہی تھیں۔ تو باتوں باتوں میں مسٹر امرت لال نے کہا۔

”ریاستوں کے ورکرز کے لیے مناسب ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کسی والیے ریاست سے چاہے وہ کتنا بھی دھست کیوں نہ ہو کسی مٹ کی کوئی ادا نہ لیں“۔

مسٹر امرت لال نے تو یہ بات ویسے ہی نصیحتا کہی۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ لیڈر اور پبلک ورکرز ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں۔ وہ وایان ریاست سے روپیہ لے لے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ امرت لال جی کا دوسرا سخن شاید میری طرف ہو۔ میں نے کہا۔

”امرت لال جی۔ اگر آپ کا دوسرا سخن میری طرف ہے۔ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ

آپ نے تو پہلک خدمت پہلک کے روپیہ کے ساتھ کی یعنی پہلک کی جیب سے چندے لے کر اور ہم نے پہلک خدمت کی بعض دایان ریاست کی جیب سے روپیہ لے کر۔ آپ ہمیں جو دیانت تپ کہیں اگر ہم اس روپیہ سے اپنی کوئی ذاتی جائیداد بناتے ہوں۔ یا روپیہ اپنی ذات پر صرف کرتے ہوں۔ دایان ریاست کی عورتیاں اور دایان ریاست کا سراسر ہی کیا حرج ہے۔ اگر ہمارا جہ ناجہ جیسے معزول محب الوطن اور دوست دایان ریاست سے روپیہ لیا اور یہ روپیہ ہمارا جہ پیٹا جیسے ظالم دایان ریاست کے مظالم کو بے نقاب کرنے پر صرف کر دیا۔ آپ یہی بتائیے کہ پہلک سے روپیہ لے کر پہلک پر خرچ کرنے والا شخص ملک کی زیادہ خدمت کرتا ہے یا دایان ریاست سے روپیہ لے کر پہلک پر خرچ کرنے والا شخص زیادہ خدمت انجام دیتا ہے۔ میرے اس جواب کو سن کر تمام دوست تہققہ ار کر کہیں پڑے۔ سٹر امرت لال بھی ایک حد تک لاجواب ہو گئے۔ اور آپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں یہ بات عام درگزر کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اگر ہمارے ہاتھ بالکل پاکیزہ ہوں تو ہمارے کام کا پہلک پر زیادہ اثر ہو گا۔ اور ہم پہلک میں زیادہ بیداری پیدا کر سکیں گے۔“ سٹر امرت لال میرے حالات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اگر میں کسی دوست دایان ریاست سے روپیہ لیتا ہوں۔ تو یہ روپیہ یا تو اخبار کے کام آتا ہے۔ یا اس روپیہ سے میں دوستوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کرتا ہوں۔ یا اپنی ذاتی جائیداد بناتا۔ ان وجوہ کے باعث ہی وہ ہمیشہ میری کمزوریوں کو نظر انداز کرتے رہے۔ اور ان کے اخلاص و محبت میں کبھی کمی نہ ہوئی۔

میں سنہ ۱۹۰۹ء میں نظر بندی سے رہا ہو کر آیا۔ تیسری غیر حاضری میں دفتر کے بعض ملازم سب کچھ غور و جود کر چکے تھے۔ اور یہ کہنے قسم کے خدا را اخبار ریاست کے پچھلے نمائندہ تاج دہی میں فروخت کرنے کے کھائے گئے۔ رہائی کے بعد سوانی پیدا ہوا کہ روپیہ کہاں سے آئے۔ اور اخبار کیونکر جاری ہو۔ چند دوستوں کو خط لکھے ذریعہ حالات لکھتے تو ایک دوست نے جو اعلیٰ سرکاری ملازم تھے۔ تین ہزار روپیہ بیع دیا جس میں سے اٹھائی ہزار روپیہ تو اخبار کی ضمانت کے طور پر سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا۔ کیونکہ پہلی ضمانت ضبط ہو چکی تھی۔ اور نئی ضمانت اٹھائی ہزار روپیہ کی طلب کی گئی تھی۔ پانچ سو روپیہ لاہور کے ایک تاجر جرم نے بیع دیا۔ جو ریاست کے مدراج تھے۔ کچھ روپیہ دہلی کے ایک دوست سے قرض لیا۔ اور ایک دوست دایان ریاست کا پیغام آیا کہ وہ معتریب ہی دس ہزار روپیہ بیع رہے ہیں۔ چنانچہ کچھ روپیہ موجود تھا۔ اور دس ہزار روپیہ کی توقع تھی۔ میں نے اخبار جاری کر دیا۔ جو روپیہ موجود تھا۔ وہ پہلے چار پانچ پرچوں میں ہی صرف ہو گیا۔ میں نے حافظ آباد کی زمین فروخت کرنے کا اخطام کیا تھا۔ مگر وہاں سے ابھی روپیہ نہ آیا تھا۔ اور مالی پریشانی تھی کہ ایک روز شام کو سنٹرل انڈیا کی ریاستوں کی پہلک کے ایک لیڈر شریف لائے اور آپ نے کہا۔ ”ہم تین روز سے آپ کے مکان کی تلاش میں ہیں۔ مکان نہ ملتا تھا۔ سٹر امرت لال سیٹھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کاروبار میں ہوٹل میں مقیم ہیں۔ آٹھویں نے کئی دوستوں سے آپ کے مکان کا پتہ پوچھا۔ مگر کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ اب بڑی مشکل سے پتہ چلا۔ میں نے مذاق کہا۔ جبناں



اچھی حالت میں نہ ہو تو وہ اکڑ کر سڑک کے درمیان نہیں چلتا۔ بلکہ ایک طرف کنارہ پر گردن نیچی کیے ہوئے چلتا ہے۔ میرا کاروبار ابھی چلا نہیں۔ اس لیے میں نے اپنے مکان کا کسی دوست کو پتہ نہیں دیا۔ جب کاروبار چل جائے گا۔ تو پھر سب دوستوں کو اطلاع دے دوں گا۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں رات کو دس بجے امرت لال جی سے کاروبار میں ہوٹل میں ملوں گا۔ یہ صاحب امرت لال جی کے پاس ہوٹل میں پہنچے۔ تو پھر وہاں پیغام لائے کہ امرت لال جی کا کسی دوست کے ہاں رات کو ڈنر ہے۔ ممکن ہے۔ رات کو وہاں دیر ہو جائے۔ وہ صبح آٹھ بجے فرنٹیر ہیل میں وہاں پہنچی جا رہے ہیں۔ اور بلنا ضرور چاہتے ہیں۔ اس لیے میں صبح آٹھ بجے سٹیشن پر ان سے ملوں۔

میں صبح آٹھ بجے ریلوے سٹیشن پہنچا۔ امرت لال جی وہاں موجود تھے۔ بہت تپاک کے ساتھ ملے۔ کیونکہ کئی برس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے کہا۔  
”میں یہاں چار پانچ روز سے تھا۔ آپ کو تین چار روز متاثر تھا۔ سن کر اہلکار۔ یہ تو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اخبار جاری ہو گیا ہے۔ مگر مکان کا پتہ نہ تھا۔ سنائیے اخبار کا کیا حال ہے۔ کیا اخبار کے جاری کرنے کے لیے روپیہ کا انتظام ہو گیا؟“

میں امرت لال جی سے اپنی مالی پریشانی کیا بیان کرتا۔ میں نے یہی جواب دیا کہ ”ہاں روپیہ کا انتظام ہو گیا ہے۔“ میرے اس جواب کے بعد امرت لال جی نے دوستانہ نصیحت کے انداز میں پھر کہا۔  
”دیوان سنگھ جی۔ اتنا عرصہ مند رہنے کے بعد ریاست کا نیا جنم ہوا ہے۔ اس اخبار کو ہر طبقہ میں عزت اور محبت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے طبقہ میں اس کی قدر ہے۔ اب آپ ایک کام کیجئے کہ آئندہ کسی واسطے ریاست سے چاہے وہ آپ کا کتنا بھی عزیز دوست کیوں نہ ہو کسی قسم کی کوئی امداد قبول نہ کیجئے۔ اور آپ کو روپیہ کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہیے۔ میرے پاس کافی روپیہ موجود ہے۔ دو چار دس میں ہزار روپیہ میں آپ کو دے سکتا ہوں مجھ سے کہیے۔ مگر کسی واسطے ریاست سے نہ لیجئے۔ اور اب اپنے ہاتھوں کو بالکل پاکیزہ رکھیے۔“

میں ان کی اس نصیحت کا کیا جواب دیتا۔ میں نے ٹالنے کے لیے یہی کہا۔ ”بہت اچھا۔“ میرے بہت اچھا کہنے کے بعد انھوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پھر کہا۔

”آپ جیسے درڈ آف آؤڈ کیجئے۔ کہ آپ آئندہ کبھی کسی واسطے ریاست سے کوئی امداد قبول نہ کریں گے۔“

میں اس کا کیا جواب دیتا۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر ان کا بار بار درڈ آف آؤڈ کا مطالبہ جاری ہوا۔ آخر میں مجھ کو درڈ آف آؤڈ دینا پڑا۔ کہ میں کسی واسطے ریاست سے روپیہ قبول نہ کروں گا۔

اس کے بعد امرت لال جی ہمیں روانہ ہو گئے۔ میں گردن نیچی کیے سر چتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ ٹانگہ کیا۔ اور خیالات میں غرق کہ ایک پیسہ اس نہیں۔ اخبار کی آمدنی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ چار پانچ ہزار روپیہ باہر روکا خرچ ہو گا۔ اور میرے درڈ آؤڈ آؤڈ کا بنگا۔ اب اخبار جاری روکے گا۔ تو کیونکہ انھیں خیالات



## سیاسی پراپاگنڈے

گجرات (صوبہ بمبئی) میں ایک چھوٹی سی جاگیر آمود ہے جس کی آمدنی چند ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ اس جاگیر کے مالک ٹھاکر زرننگہ جی تھے جن کے بزرگ دوسو برس کے قریب عرصہ ہوا مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر اس خاندان نے نہ تو اپنے نام تبدیل کیے۔ اور نہ اپنا خاندانی لقب یا خطاب ”ٹھاکر“ چھوڑا۔ اس جاگیر کے مالک ٹھاکر زرننگہ جی سے خواجہ حسن نظامی کو احمد آباد گجرات میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب آئے لوگوں سے فائدہ اٹھاتا خوب جانتے تھے۔ آپ نے ٹھاکر صاحب سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے۔

خواجہ حسن نظامی نے ٹھاکر زرننگہ جی کو لیڈری کی روشنی دکھائی۔ اور ان سے تحریک کی کہ یہ مسلمانوں کے کسی بڑے جلسہ میں شامل ہوں۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تشریف لائیں۔ اور آپ نے انجمن کے کارکنان سے خط و کتابت کے ذریعہ یہ بھی انتظام کر لیا۔ کہ انجمن کے جلسہ میں ایک روز کی کارروائی کے صدر یہ ٹھاکر صاحب بھی ہوں۔ اس فیصلہ کے بعد خواجہ حسن نظامی کا ٹھاکر صاحب کے حق میں دبلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اپنے حق میں پراپاگنڈا شروع ہوا۔ ”صوبہ بمبئی کی ایک بڑی ریاست کا حکمران مسلمان ہو گیا۔“ ہمارا ناز سنگہ جی کا نام آئندہ نواب نصر اللہ خاں بہادر ہو گا۔“ اسلام کا آفتاب عروج پر ہے۔“ تبلیغی سرگرمیوں کے نتائج“ وغیرہ عزائم کے ساتھ پوسٹر اور اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ اور ذریعہ تار ہندوستان کے اخبارات کو جوہا اور پنجاب ریوی پی کے اخبارات کو خصوصاً یہ اطلاعیں بھی گئیں کہ نوسلم نواب نصر اللہ خاں بہادر انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ کی صدارت کے لیے فلاں تاریخ کو صبح آٹھ بجے والی اسپر بس میں دہلی سے لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔ اخبارات کے علاوہ لاہور اور دہلی دلاہور کے درمیان تمام شہروں میں پوسٹر بھی چسپاں کیے گئے۔ کہ نوسلم نواب صاحب کے استقبال کے لیے لوگ ریلوے سٹیشن پر آئیں۔

اتفاق ایسا ہوا کہ میں بھی لاہور جانے والا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے ساتھ فیصلہ ہوا کہ اکٹھے نہی چلیں گے۔ چنانچہ جب میں صبح آٹھ بجے کے قریب دہلی ریلوے سٹیشن پہنچا تو یہ نوسلم ٹھاکر صاحب اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ ہم لوگ سیکنڈ کلاس کے ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ غازی آباد کے سٹیشن پر تو ”نوسلم نواب صاحب“ کی زیارت کرنے والے نصف درجن سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ مگر گاڑی جب میرٹھ پہنچی۔ تو پیٹ فارم بھرا ہوا تھا۔ گاڑی کے پہنچنے ہی اللہ اکبر کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ہر شخص نوسلم ہمارا نکو دیکھنے اور ہاتھ ملانے کے لیے بے تاب رہے۔ میں تھا میرٹھ کے کسی آدمی مرا ہمارا نواب صاحب کے لیے پُر تکلف کھانا لائے تھے۔ کیونکہ میرٹھ کے کباب تمام ہندوستان میں مشہور ہیں اور کھانے کا دقت قریب تھا کھانا دینے والوں کو گاڑی تک پہنچنے کے لیے راستہ نہ ملتا تھا۔ ان لوگوں نے بہت مشکل کے ساتھ گاڑی میں کھانا رکھا۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ایک سوا شخص پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ کھانا لانے والے شاید یہ سمجھتے ہو گئے کہ ”نوسلم“ ہمارا نواب صاحب کے ساتھ ان کی ایک آدھ ملٹن بھی ہوگی۔

اس ہجوم کے باعث گاڑی کئی منٹ لیٹ ہو گئی مگر لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ اور ان سی آنکھیں "نومسلم ہمارا نا" کو دیکھ کر سیر نہ ہوتی تھیں۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ تو اس چار سو بیس کی عظیم الشان کامیابی پر نومسلم ہمارا نا کی آنکھیں احسان کے باعث ٹھکی ہوئی تھیں۔ اور تیر کے نشاۃ پر گئے کے باعث خواجہ حسن نظامی کی گردن اکڑ رہی تھی۔ اور ان کے چہرے ظاہر کرتے تھے کہ ایک تو احسان محسوس کر رہا ہے۔ اور دوسرا فخر ہجوم کی یہ کیفیت صرف میرٹھ کے سٹیشن تک محدود نہ تھی۔ بلکہ جس جس سٹیشن پر گاڑی ٹھہری پلیٹ فارم مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور انٹر اکبر اسلام زندہ باد، "نومسلم ہمارا نا زندہ باد" خواجہ حسن نظامی زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر تو جگہ کم ہونے کے باعث لوگ ریلوے لائن کے ساتھ بھی کھڑے تھے تاکہ اگر نومسلم ہمارا نا نظر نہ آئیں تو کم از کم اس گاڑی کو تو دیکھ لیں جس گاڑی میں ہمارا نا سوار ہیں۔ یعنی ٹھاکر صاحب کے درشن نہ ہوں۔ ٹھاکر دودارہ کو تو شکرا کر ملی جائے۔

گاڑی رات کو آٹھ بجے کے قریب لاہور ریلوے سٹیشن پہنچی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ مگر استقبال کرنے والوں کے دل روشن تھے۔ شہر کے معزز مسلمان کثرت کے ساتھ استقبال کے لیے ریلوے سٹیشن آئے ہوئے تھے۔ اور عوام کا تو شمار ہی نہ کیا جاسکتا تھا۔ شہر جھنڈیوں سے سیجا گیا تھا۔ ہم لوگ گاڑی سے اترے تو بہت مشکل کے ساتھ ہجوم میں سے نکلے۔ ہر مسلمان پلیٹ فارم پر "نومسلم ہمارا نا" سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ ہمارا نا کے بعد لوگ خواجہ حسن نظامی سے ہاتھ ملاتے۔ اور اس کے بعد مجھے غور کے ساتھ دیکھتے ہوئے عجب سے بھی ہاتھ ملاتے۔ راستہ میں بھی کھڑکیوں میں ہمارا نا اور خواجہ حسن نظامی کے بعد مجھ سے ہاتھ ملایا جاتا رہا۔ اور ہر شخص مجھے غور سے دیکھتا۔ ان کا خیال تھا کہ کیا تو میں "نومسلم ہمارا نا" کا سیکریٹری یا ان کی ریاست کا کوئی بڑا افسر ہوں۔ یا میں بھی مشرف یہ اسلام ہونے کا کوئی اُسیدار ہوں جس کا کریڈٹ عقرب خواجه حسن نظامی کو ملنے والا ہے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن سے اتر کر ہم لوگ میاں عبدالعزیز پر پریڈنٹ لاہور میونسپلٹی کی کوٹھی پہنچے۔ جو دہلی دروازہ کے باہر گول مٹرک پر ہے۔ کیونکہ وہاں ہی ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ یہ لوگ تو سوڑوں سے اتر کر اس کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ میں اجازت لے کر اسپیرل ہوٹل میں چلا گیا۔ جہاں کہ ہمیشہ شہر پر کرتا تھا۔

ہم لوگ تین چار روز لاہور میں رہے۔ میں دن کو "نومسلم ہمارا نا" اور خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لیے اکثر جایا کرتا۔ ان تین چار دنوں میں رنگ برنگی جھنڈیوں کا نظارہ "نومسلم ہمارا نا" کو دیکھنے والوں کی بیقراری۔ انٹر اکبر۔ نومسلم ہمارا نا اور خواجہ حسن نظامی زندہ باد کے لہجے حمایت اسلام کی رونق اور نومسلم ہمارا نا کا استقبال اور تقریریں ایسی تھیں۔ جن کو اب تک نہیں بھول سکتا۔ مگر مسلمان پبلک کی سہ وقوفی تو شاید تمام زندگی کے لیے ہی ناقابل فراموش ہے۔ کیونکہ ٹھاکر نرسنگھ جی کے بزرگ دوسو برس ہوئے مسلمان ہوئے۔ مگر ان کی اولاد کو دوسو برس کے طویل عرصہ کے بعد آج نازہ نومسلم ظاہر کرتے ہوئے پبلک سے خراج تحسین حاصل کیا گیا۔

## وکیلوں کی طفل تسلیاں

میں نے اس وقت تک دفتر ریاست میں فرموں کے اشتہارات حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں کنویرسز کئے۔ ان کنویرسز میں زیادہ سے زیادہ میں فی صدی دیانتدار ہونگے اسی فی صدی یقیناً بد دیانت تھے۔ لیونکہ کنوینٹنگ کے کام میں ایک شخص اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ جتنا کہ وہ ہوشیار ہو۔ اور اگر ہوشیار ہے اور اس کی ہوشیاری کے ساتھ چالاک بھی شامل ہے۔ تو وہ اپنے مالک کو بھی اپنی چالاک کا شکار بنا سکتا ہے۔ چنانچہ کنویرسز کے متعلق یہ عام پرزیش ہے کہ وہ اگر ہوشیار اور چالاک ہے۔ تو بد دیانت بھی ہے۔ اور اگر شریف اور سیدھے ہے۔ تو وہ کنوینٹنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور کنوینٹنگ کی لائن میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے۔ جو شریف بھی ہوں۔ اور اچھے کنویرسر بھی۔

چند برس ہوئے ایک صاحب دفتر ریاست میں تشریف لائے۔ جنہوں نے اپنا نام سٹر جی۔ ڈی۔ کنور بتایا۔ اور کہا کہ یہ لاہور کے اخبار ”گورڈ گھنٹال“ وغیرہ میں اشتہارات کے کنوینٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ ان کا اصلی نام گنیش داس تھا۔ اور لاہور کے ایک اچھے شریف کھتری گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ان سے باتیں ہوئیں۔ تو آدمی ہوشیار معلوم ہوئے۔ ان کو امتحاناً ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ایک ماہ کے لئے بطور کنویرسر رکھ لیا گیا۔ اس ایک ماہ میں یہ کئی کئی روز غائب رہا کرتے۔ اور اگر دفتر میں آتے بھی تو اکثر لیٹ۔ ان کو کئی بار تنبیہ کی گئی کہ وقت پر آئیے اور ناخن نہ کیجئے۔ مگر یہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے پھر غائب ہو جاتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لاہور سے کوئی عورت نکال کر لاتے ہیں۔ اور شراب وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی پرائیویٹ لائٹ میں کبوں دخل دیتا۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ ان کے متعلق کیا اظہار ہیں۔ جب یہ ایک ماہ کام کر چکے تو میں نے ان کی تنخواہ کا حساب کر کے ان کو چیک بے دیا۔ رسید ملی۔ اور یہ لکھا لیا کہ انھوں نے کسی پارٹی سے کوئی روپیہ رسوائے اُس روپیہ کے جو انھوں نے دفتر ریاست میں جمع کر دیا تھا وصول نہیں کیا۔ یہ میں نے احتیاطاً ان سے لکھوایا۔ اور جب کسی کنویرسر کو جواب دیتا ہوں۔ تو حساب کرنے کے بعد عموماً لکھوایا کرتا ہوں۔

جب یہ دفتر ریاست سے علیحدہ ہو گئے۔ تو اگلے روز میں نے دفتر کے منیجر سے کہا کہ وہ ان تمام پارٹیوں کے پاس جائیں۔ جن سے یہ کنور صاحب اشتہارات لائے تھے۔ اور دیکھیں کہ کوئی ایسی پارٹی تو نہیں جس سے یہ روپیہ لے چکے ہوں۔ اور وہ روپیہ انھوں نے دفتر میں جمع نہ کر لیا ہو۔ دفتر کے منیجر ان پارٹیوں کے پاس گئے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ان پارٹیوں میں سے کئی سے روپیہ وصول کر چکے تھے۔ جو انھوں نے دفتر میں جمع نہیں کیا۔ اس اطلاع کے بعد منیجر کو پھر بھیجا کہ وہ اچھی طرح سے تنقیہ کریں۔ اور کنور صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسیدیں بھی دیکھ آئیں۔ جب یہ بھی اچھی طرح سے متنی کر لی گئی۔ تو میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انچارج کڑائی کو خط لکھا۔ جس میں تفصیل کے ساتھ تمام حالات بتائے۔ اور اطلاع دی کہ ملزم اس وقت لیڈی ہارڈنگ سرائے کے ایک کمرہ میں رہتا ہے۔ میرا یہ خط جب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہنچا تو انھوں نے ایک سب انسپکٹر پولیس کو تحقیقات پر مقرر کیا۔ خاتم کونسات بجے کا وقت ہوگا۔ یہ سب انسپکٹر تحقیقات کے لئے

دفتر ریاست میں آئے اور انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ملازم کی شناخت کے لیے کسی آدمی کو ساتھ بھیجا جائے اس وقت دفتر کے تمام لوگ چائے پیے میں خود انکے ساتھ نئی دہلی ریلوے سٹیشن کے قریب لیڈی بار ڈیم سرائے میں گیا۔ سب انسپکٹر سرائے کے باہری ٹھہرے تاکہ ملازم دردی کو دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔ میں سرائے کے نیچر سے کنور صاحب کے کمرہ کا نمبر پوچھ کر وہاں پہنچا۔ جہاں یہ حضرت ٹھہرے تھے۔ میں نے جب کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو مجھے دیکھ کر یہ حیران تو ہوئے۔ مگر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کو خیال ہوا۔ کہ میں نے ان کو مروت کر کے شاید اپنی غلطی محسوس کی ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں۔ کہ یہ پھر دفتر میں کام کریں۔ مجھے دیکھ کر کمرہ سے باہر نکل آئے۔ میں ان سے باتیں کرتا ہوا ان کو ساتھ ہی نیچے لے آیا۔ اور جب ہم سرائے سے باہر دروازہ پر پہنچے۔ تو سب انسپکٹر انتظار میں تھے میں نے تعارف کرایا کہ یہ کنور صاحب ہیں۔ سب انسپکٹر ہمیں ساتھ لے کر پھر کنور صاحب کے کمرہ میں آئے۔ گواہ بلائے گئے کمرہ کی تلاشی لی گئی۔ تو کچھ گراموفون ریکارڈ بھی ملے جن کے متعلق انھوں نے اقرار کیا۔ کہ یہ گراموفون کمپنی سے ریلوے کے لئے لائے تھے۔ مگر راستہ میں ہی ہضم کر گئے۔ تلاشی کے بعد سب انسپکٹر ان کو تھانہ میں لے گیا۔ اور یہ حالات میں بند کر دیئے گئے۔

اگلے روز انھوں نے اپنے دوستوں کو پیغام بھیجا۔ جن کی دہلی میں ان سے تازہ تازہ واقفیت ہوئی تھی۔ اور جن کا ان کے کمرہ میں آنا جانا تھا۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ تو دو ہزار روپیہ کی ضمانت ہو گئی۔ ایسے مقدمات قابل ضمانت ہیں۔ ضمانت کے بعد انھوں نے ایک وکیل کیا۔ وکیل صاحب نے جب مقدمہ کے حالات مجھے تو کہا۔ کہ مقدمہ بالکل بے جان ہے۔ پہلی پیشی پوری ہو جاؤ گے۔ وکیل صاحب کا اطمینان دلانا تھا۔ کہ یہ بہت خوش اور مطمئن۔ بلکہ اس خیال میں کہ ایڈیٹر ”ریاست“ سے ہر جانا بھی وصول کرینگے۔ چنانچہ ایک گورنر صاحب لالہ امیر چند کھنہ سے جامع مسجد کے پاس میر کرتے ہوئے ملے۔ تو انھوں نے کھنہ صاحب سے کہا ”مقدمہ میں کوئی جان نہیں۔ پہلی پیشی پوری ہو جاؤں گا۔ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ اس مقدمہ کو دایر کس طرح کیا گیا۔ پولیس کو حق حاصل نہ تھا۔ کہ وہ گرفتاری بھی کرتی۔ آپ دیکھیں گے کہ میں ہر جانا وصول کرتا ہوں“ لالہ امیر چند نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو میں مسکرا دیا۔ کیا جواب دیتا۔ یہی کہا۔ کہ وکیلوں کی طفل تسلیوں کے بھروسہ پر تو لوگ پھانسیوں پر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر وکیل مقدمہ بے جان نہ کہیں۔ تو موکل ان کو اپنا وکیل ہی کیوں مقرر کریں۔ ان کو وکیل ہی تب مقرر کیا جاتا ہے۔ جب یہ بری ہوئے کہ ملازم کو یقین دلادیتے ہیں۔

اس مقدمہ میں پانچ چھ پیشیاں ہوئیں۔ وکیل صاحب نے اپنے پیشہ کے مطابق گواہوں پر جمع اور بحث کی۔ مگر جسٹس نے دس ماہ قید سخت کی منادی۔ منرا کا حکم سننے سے پہلے کنور صاحب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ مقدمہ میں جان نہیں یہ مقدمہ چلانے والے سے ہر جانا وصول کر سکیں گے۔ انھوں نے یہ نہ سوچا۔ کہ وکیل سنگین اور ملازم یا مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو ہی طفل تسلیاں دیتے ہیں۔ اگر یہ طفل تسلیاں نہ دیں۔ تو ان کو مقدمہ کرن دے۔ منرا کا حکم سننے کے بعد ان کے جوش ٹھکانے آئے اس سے پہلے یہ مقدمہ کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے انھوں نے اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع نہ دی تھی۔ منرا سننے کے بعد انھوں نے گھر والوں کو لاہور اطلاع دی۔ تو ان کی بہرہ ماں دہلی

آئیں اور یہ اپنے ساتھ لاہور سے میرے رشتہ داروں کی سفارش لائیں اور مظلومیت بیان کرتے ہوئے  
 وزارتِ اردو دینی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا لڑکا نالائق ہے۔ ایک عورت کو لاہور سے نکال کر لایا ہے۔ یہ عورت  
 اس لڑکے کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ مگر پھر بھی اس کے سینہ میں ماں کا دل ہے۔ یہ نہیں دیکھ سکتی۔ کہ  
 اس کا بچہ تکلیف اٹھائے۔ اس غریب کی حالت کو دیکھ کر میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ وکیل سے پوچھ لو  
 اگر میرا عدالت میں معاف کر دینے کا بیان مفید ہو سکے۔ تو میں جا کر بیان دے دوں گا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا  
 ہوں۔ تیسرے روز سیشن جج کی عدالت میں کچی پیشی تھی سیشن جج نے مقدمہ کے حالات سنے اور فیصلہ پڑھا  
 تو کچی پیشی میں ہی مقدمہ خارج کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنور صاحب کو دس ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

دہلی کے ایڈووکیٹ مسٹر بی۔ بی۔ توکلی (جو میرے مقدمہ کی ہمیشہ ہی پیروی کرتے رہے) بہت دلچسپ اور لطافت  
 پسند طبیعت کے بزرگ ہیں۔ وہ وکیلوں کے متعلق بھی اکثر لطافت سنایا کرتے ہیں۔ ایک صاحب کو کار مع اپنے ہمراہی  
 کے ان کے پاس تشریف لائے جو مقدمہ دینا چاہتے تھے۔ مقدمہ بہت کمزور تھا اور لالہ جی کے مقدمہ کے  
 جیتنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تو کلی صاحب نے حسبِ عادت صاف صاف کہہ دیا۔ کہ مقدمہ کمزور ہے۔  
 آپ کے مقدمہ میں جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ سن کر لالہ جی کے کان کھڑے ہوئے۔ اور آپ نے فوراً کہا۔ کہ  
 اچھا بالوجہ ہم کل آئیں گے۔ مشورہ کر لیں۔ لالہ جی یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تشریف لے گئے۔ جب لالہ جی  
 زمین سے اتر رہے تھے تو اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے۔ یہ وکیل تو لائق ہے۔ مگر اس نے مقدمہ کا پیمنٹ  
 (پر ائینٹ) نہیں کرا۔ چلو کسی دوسرے وکیل کے پاس چلیں۔ اس کے بعد یہ ایک دوسرے وکیل کے  
 پاس گئے۔ تو وکیل نے طفل تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ پہلی پیشی پر ڈگری ہو جائے  
 گی۔ یہ سن کر لالہ جی نے وکیل صاحب کو مقدمہ کی فیس دے دی۔ اور خوشی و فخر کے ساتھ اپنے ہمراہی سے  
 کہا۔ دیکھا۔ ان وکیل صاحب نے مقدمہ کا پیمنٹ (پر ائینٹ) پیکر کرایا۔ تو کلی صاحب کی سمجھ میں پیمنٹ نہ آیا  
 تھا۔ لالہ جی کے مقدمہ کا بھی دہی حشر ہوا۔ جو کمزور مقدمات کا ہوا کرتا ہے۔ مگر وکیلوں کی طفل تسلیوں کا  
 کیا علاج یہ اگر طفل تسلیاں نہ دیں۔ تو ان کو مقدمہ کون دے۔ چنانچہ وکیلوں کا تو پیمنٹ ہی یہ ہے۔ کہ وہ بے جان  
 مقدمہ کو بھی جاندار ظاہر کریں۔ حاکمِ تِوان موقوفوں کی ہے جو مقدمہ کو کمزور سمجھتے ہوئے بھی ان طفل تسلیوں  
 پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور مقدمہ کی کامیابی کے خواب دیکھتے ہیں۔

## نئے اخبارات کی ناکامی

کئی دن انبیا نہیں گذرتا۔ کہ جس روز کوئی نہ کوئی نیا اخبار جاری نہ ہو۔ اور یہ اخبار ایک ہفتہ  
 دو ہفتہ یا چار پانچ ہفتہ جاری رہ کر ہند نہ کر دیا جاتا ہو۔ چنانچہ صرف ایک سال میں نئے اخبارات کے  
 چڑھنے کیلئے بیسٹن صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں تک  
 پہنچتی ہے۔ مگر ان ڈیپوٹیشن داخل شدہ اخبارات میں سے ٹھکے پر لیا ہوا پانچ کی اطلاع کے مطابق پانچ فی  
 صدی اخبارات ہی زندہ نہیں رہتے۔ بعض تو ڈیپوٹیشن کے بعد جاری ہی نہیں ہوتے۔ یعنی ان اخبارات کے

مالکان صرف ڈیکلریشن داخل کر کے ہی اپنا ٹھکر پورا کر لیتے ہیں اور بعض اخبارات چند بار شائع ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اتنے زیادہ اخبارات کے جاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اخبار کے ایڈیٹر بننے کا شوق ہے۔ جو شخص چند غلط سطریں لکھ لے۔ یا کسی دوسرے اخبار سے کوئی انسانہ نقل کر سکتا ہو۔ وہ اپنے آپ کو جرنلسٹ سمجھتا ہے۔ اور اس کا خیال ہے کہ اگر ہاشٹہ کرشن "بر تاپ" یا مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کے باعث نام شہرت پر پہنچ سکتے ہیں۔ تو وہ کیوں نہیں پہنچ سکتا۔ اور ان لوگوں کے ناکام ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ نہ تو فن صحافت سے واقف ہوتے ہیں۔ کہ اپنے اخبار کو مقبیل بنا سکیں۔ اور نہ اخبار کے اختلاص امور سے کہ اخبار اپنا خرچ خود نکالنے کے قابل ہو سکے۔ چنانچہ نئے اخبارات جاری کرنے والے اخبار کے ان دونوں پہلوؤں سے ناواقف ہونے کے باعث نقصان اٹھا کر مٹیہ جاتے ہیں۔

اخبارات میں غلط طریقہ سے روپیہ کیونکر ضائع کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ایک واقعہ سنئے۔ اخبار "زیاست" کو جاری ہونے چند برس ہوئے تھے۔ اور اشتہارات کے چال کرنے کے لیے کوشش جاری تھی۔ کہ دفتر زیاست سے ایک صاحب لالہ سادتری پر شاو کو بطور کنوینسیر لازم رکھ کر لاہور بھیجا گیا۔ ان کو وہاں کے امپیریل ہوٹل کے پردہ اسٹر لالہ درگا واس کے نام خط دیا کہ لالہ جی کی رہائش وغیرہ کا انتظام اپنے ہوٹل میں کر دیجئے۔ اور دوسرے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ بطور نمونہ مفت تقسیم کرنے کے لیے دوسو روپے اور اشتہارات کے متعلق لٹر پھر دے دیا گیا۔ لالہ جی وہے تو اچھے تعلیم یافتہ اور ہوشیار و مہذب آدمی ہوتے تھے۔ مگر اخبارات سے کام سے ناواقف تھے۔ ہور غلطی ہوئی کہ ان کو صرف کالم انچ صفحہ وغیرہ سمجھا دیا گیا۔ یہ نہ بتایا گیا۔ کہ وہاں کس کس شہر کے پاس چائیں۔ اور کوشش کریں۔ لالہ سادتری پر شاو لاہور گئے۔ وہاں پندرہ دن تک رہے۔ پندرہ روز کے بعد واپس آئے۔ تو وہ ایک انچہ اشتہار بھی نہ لائے۔ ان کے خالی داپس آئے پر بہت انوس ہوا۔ کہ پندرہ روزیہ وہاں رہے۔ روپیہ بھی خرچ ہوا۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں۔ کچھ انوس۔ کچھ غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا گیا۔ کیا آپ ہوٹل میں سوئے رہتے تھے کہ ایک اشتہار بھی نہ لاسکے لالہ جی نے فرمایا۔ میں دہرم سے بچ کر رہا ہوں۔ کہیں دن بھر پھر تارہتا تھا۔ کسی روز ایک منٹ کے لیے آرام نہ ہوا گیا۔ وہاں سب سے بارونق بازار انارکلی ہے۔ میں نے آپ کے دینے ہوئے دوسو روپے اور اشتہارات کے متعلق لٹر پھر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام دوکانداروں کو دیتے۔ اور ان کے پاس بار بار گئے مگر سب نے یہی کہا۔ کہ اچھا غور کرینگے۔ اس جواب کو سن کر میں سمجھ گیا کہ یہ ہرچے اور لٹر پھر غلط لوگوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ میں نے پھر پوچھا۔ وہاں کس کس کو نمونہ اور لٹر پھر دیا گیا تو لالہ جی نے فرمایا۔ سردار صاحب دوسرے لوگ تو کیا میں نے تو وہاں حلو ایلنگ تک کو بھی نہیں بھیجا۔ اُن سے بھی بلا۔ اور کوشش کی کہ اس جواب سے علم ہوا کہ لالہ جی جیسے اُن لوگوں سے ملنے کے جو اس وقت دوسرے اخبارات میں اشتہار دے رہے ہیں۔ اپنے لوگوں کے ہاں دھنگے کھاتے رہے۔ جنہوں نے کبھی اشتہار نہیں دیا تھا۔ اور نہ وہ اشتہار دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک حلوانی یا صولٹی بساطی جس کی روزانہ آمدنی پانچ سو سات روپیہ ہے۔ یا ایک کشمیری جس کو ہفت روزہ کے اشتہار دینا کس جافد کا نام ہے۔ کس طرح اشتہار دے سکتا تھا۔ جو لوگ نئے اخبارات جاری کر رہے ہیں۔ اور دو چار روپے نکال کر بند کر دیتے ہیں۔ ان کی ناکامی کے پامیانہ



(۱) یہ بغیر سرمایہ کچھ پرچہ جاری کرتے ہیں۔ حالانکہ آج سے بیس برس پہلے تو ایک ہفتہ دار اخبار کے لیے پانچ ہزار روپیہ اور ایک روزانہ اُردو اخبار کے لیے پچاس ہزار روپیہ کافی تھا۔ مگر آج ایک ہفتہ دار کو کامیاب بنانے کے لیے کم از کم پچاس ہزار روپیہ اور ایک روزانہ اُردو اخبار کو سیلف سپورٹنگ کی حالت تک پہنچانے کے لیے کم از کم اڑھائی لاکھ روپیہ (اگر پرہیز لگانا ہو۔ تو اُس کی قیمت اس کے علاوہ ہوگی) چاہیئے۔

(۲) اخبار جاری کرنے والوں میں نہ فور قلم ہے۔ نہ حسن تحریر۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہلا پرچہ دیکھنے کے بعد لوگ ناک چڑھاتے ہیں۔ اور دوسرا پرچہ خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

(۳) اخبار جاری کرنے والوں کو تو اخبار کے انتظامیہ امور سے واقفیت ہے اور نہ تجربہ۔ یہ لوگ اُس طرح ہی اپنا سرمایہ غلط طریقہ پر ضائع کرتے ہیں جس طرح ایڈیٹر زیاست نے لالہ ساد تری پر شاد کو بیگز ٹینک دیئے لاہور بھیج کر حادثت کی بھٹی۔ جو اخبار جاری ہوتا ہے۔ جاری کرنے والا پہلے ہفتہ میں ہی کافی روپیہ صرف کر کے اپنا منانہ۔ ہسبی اور کلکتہ بھیج دیتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے۔ کہ دلاپتی اور ہندوستان کی اچھی فرموں کے مستقل اشتہارات صرف ہسبی اور کلکتہ آدمی بھیجے سے مل جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔

کہ اچھی ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں کسی اخبار کو اشتہار دینے کا اُس وقت تک خیال بھی نہیں کرتیں۔ جب تک کہ اس اخبار کو جاری ہونے چند سال کا عرصہ نہ ہو جائے اور یہ دیکھ نہ لیں۔ کہ اخبار کی پچھلی اور آئندہ کی جنم پتھری میں کیا کچھ لکھا ہے چنانچہ جو لوگ ہسبی جاتے ہیں۔ وہ دلاپتی اور ٹائیزنگ ایجنسیوں سے ملتے ہیں۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے یہی جواب دیتی ہیں کہ ”بہت اچھا غور کر بیٹھے“ یہ بے وقوف ”غور کرنے“ کہہ ہی کامیابی اور اشتہارات کا پروگرام سمجھ لیتے ہیں۔ اور داپس آکر اپنے مالکان کو کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے اُس روپیہ کو حلال کرتے ہیں۔ جو یہ ہسبی یا کلکتہ میں صرف کر آئے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی اشتہار نہیں ملتا۔ ادھر لوگ اخبار خریدتے نہیں۔ اور پورا ٹرل صاحب گھر کا دو چار ہزار روپیہ ”سیال“ کو کے اخبار بند کر دیتے ہیں۔

جو لوگ اخبار جاری کرنا چاہیں۔ وہ جاری کرنے سے پہلے تمام حالات پر غور کر لیا کریں یا کم از کم لالہ ساد تری پر شاد والے واقعہ کی طرح غلط طور پر روپیہ تو صرف نہ کریں جو ایڈیٹر زیاست کے لیے اب تک ناقابلِ فراموش ہے چنانچہ اب بھی جب کہیں لالہ جی تشریف لاتے ہیں۔ تو آپ کی لاہور کی ”محنت“ یاد آ جاتی ہے۔

## بدحواسیال

دماغی اعتبار سے میں بچپن سے ہی بدحواس سا ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگ بھی ایسے ہوں۔ مگر جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں دیکھا کہ جیسی طرح ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہے اور بدحواس ہو۔ اس بدحواسی کے سلسلہ میں چند واقعات عرض کرتا ہوں۔

دفتر ریاست“ ہملٹن روڈ پر تھا۔ اور میرا ذاتی دفتر ادھر کی منزل میں تھا۔ میں نے دفتر میں ٹاکیہ کر رکھی تھی کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کیے مجھ سے ملنے کے لیے نہ آئے۔ یعنی ملنے والے پہلے چٹ پر اپنا نام تپہ اور کام لکھیں۔ یہ چٹ پٹرا اسی میرے پاس لائے۔ اور میں پھر کھوں تو ان صاحب کو لینے کے لئے لایا جائے۔ تاکہ میرا وقت ضائع نہ ہو۔ میرے چچا زاد بھائی سردار رنجوہر سنگھ کھٹہ کی بیوی اپنے بھائی کے پاس حافظ آباد سے نئی دہلی آئیں۔ تو ایک روز وہ میرے دفتر میں بھی تشریف لائیں۔ کیونکہ میں ان کا دلیر تھا۔ اور سردار رنجوہر سنگھ سے قریبی رشتہ کے علاوہ ان سے میرے ذاتی تعلقات بھی اخلاص و محبت کے تھے۔ جب یہ دفتر میں آئیں تو انھوں نے چٹرا اسی سے پوچھا کہ ذیوان سنگھ کہاں ہے۔ چٹرا اسی نے بے تکلفی کے یہ الفاظ ایک خاتون سے سن کر محسوس کیا کہ یہ خاتون کوئی رشتہ دار ہے۔ اسے جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ ان کا نام وغیرہ پوچھتا۔ اور مجھے اطلاع دیتا۔ یہ ان کو اپنے ساتھ ادھر کے کمرہ میں لے آیا۔ یہ خاتون جب ادھر میرے کمرہ میں تشریف لائیں۔ تو یہ مشکرا رہی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے تکلف ہیں۔ ساہا سال سے جانتی ہیں۔ اور مجھے اپنا عزیز نہ سمجھتی ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ان کا استقبال کیا۔ اور ان سے صوفیہ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ جس کی عمر دس برس کی ہوگی۔ ان کے بیٹھے کے بعد میں حیران کہ یہ کون ہیں۔ انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ خیریت دریافت کی جس کا میں نے جواب دیا۔ ایک دو منٹ گزرے ہو گئے۔ کہ میں نے حیرانی کی صورت میں کہا۔ ”معاف کیجئے۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ کہ آپ کون ہیں“ میرے یہ الفاظ سن کر وہ ادھر سے کرائیں اور مسکراتے ہوئے کچھ طفرے کے جذبات کے ساتھ غجابی زبان میں کہا۔ ”بھٹے مٹھ اے۔ کدی گھر دیاں نوں دی ٹھیل جاویدا اے“ لعنت ہے تم پر کہ بھی اپنے گھر کے لوگوں کو بھی انسان بھول جاتا ہے) اس جواب سے میں شرمندہ تو بے حد ہو ا مگر باوجود ذہن پر زور دینے کے بھی یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ یہ کون خاتون ہیں۔ چند لمحہ سوچنے کے بعد میں نے شرمندگی کی حالت میں پھر کہا ”میں فی الحقیقت نہیں سمجھ سکا“ اس پر اس خاتون نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ہند دیا سکھ عورتیں ادب کے خیال سے اپنے شوہر کا نام نہیں لیتیں) کہ اپنے باپ کا نام لو۔ جب انھوں نے اپنے بیٹے سے یہ کہا۔ تو بیٹے نے کہا ”رنجوہر سنگھ“ رنجوہر سنگھ کا نام سن کر میں جس قدر نادام ہوا بیان نہیں کر سکتا۔ خیر اس وقت تو حافظ آباد اور دہلی کے عزیزوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اس خاتون کے چہرہ سے میں محسوس کرتا تھا کہ میرا ان کو نہ پہچانا بہت ناگوار گذر رہا ہے۔ اور یہ میری بدحواسی کو قابل معافی نہیں سمجھتیں چنانچہ اس کے بعد میں جب کبھی حافظ آباد گیا۔ اور سردار رنجوہر سنگھ جی سے ملا۔ تو اس خاتون نے میرا مذاق اڑانے ہوئے ہمیشہ ہی یہ کہا۔ کہ ”تم بہت اکڑ گئے ہو۔ اور مغرور ہو جو اپنے گھر کے لوگوں کو نہیں پہچان سکتے“ میں ہمیشہ ہی اس کے جواب میں ندامت کے ساتھ اپنی بدحواسی کا ڈیفنس پیش کرتا۔ مگر اس خاتون نے میرے اس ڈیفنس کو کبھی قابل سماعت نہ سمجھا۔ اور میں ہمیشہ ہی قابل الزام قرار دیا گیا۔

میں اب تو سینما بہت کم دیکھتا ہوں۔ اور شاید پچھلے دو برس میں ایک بھی فلم نہیں دیکھی مگر آج سے دس پندرہ برس پہلے میں کوئی فلم نہ چھوڑتا تھا۔ بلکہ ایک ایک فلم کو کسی کسی بار دیکھتا تھا مگر یہ حقیقت ہے

کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی ایک فلم کو بھی کبھی غور کے ساتھ نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ فلم کی سٹوری کیا ہے۔ میں نوے فی صدی صورتوں میں انٹرول کے وقت چلا آتا تھا اور تمام کی تمام فلم مجبور ہو کر صرف اس صورت میں دیکھتا جب کسی ساتھ والے دوست کے ساتھ بیٹھ رہنا ضروری ہوتا اور میری فلم کی تفریح صرف موسیقی رقص اور گانا سننے تک محدود ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ میرے بس میں نہیں کہ میں کسی سٹوری فلمی شخص کی بات یا کسی مسئلہ پر مسلسل پندرہ بیس منٹ توجہ دے سکوں۔ میرا دلغ ہر وقت کام کرتا ہے۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں اور سوچتے ہوئے خیالات بدلتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کروں یا نہ کروں۔ تو میں کچھ اور سوچنے لگ جاتا ہوں۔ اور بات کرنے والے سے بات کرنے کے بعد پھر پوچھتا ہوں کہ فلاں واقعہ کے بعد کیا ہوا۔ چنانچہ اس بدحواسی کا سبب میرے دماغ کا فیضان رہنا ہی ہے جسے انگریزی میں "ایمبینٹ اینڈ ڈ" کہا جاتا ہے۔

میرا کھانے پینے پر اتنا ذاتی خرچ نہیں۔ جتنا غسل اور ادویات پر ہوتا ہے۔ غسل کے لیے میں سکراب امونیا ضرور استعمال کرتا ہوں۔ یہ امونیا جسم کو صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ خطرناک ذہر ہے۔ اگر اسے پی لیا جائے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں نل خانہ میں غسل کر رہا تھا اور غسل کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ میں نے دانت صاف کیے تو دانتوں کو صاف کرنے کے بعد بجائے گارگل والی شیشی کے امونیا کی شیشی اٹھالی اور گارگل کے لئے امونیا منہ میں ڈال لیا۔ اس امونیا کا منہ میں ڈالنا تھا کہ میرا دم گھٹ گیا۔ یہ غنیمت ہوا کہ میں نے امونیا کے منہ میں ڈالتے ہی اسے محسوس کر لیا۔ اور فوراً منہ سے اسے نکال کر پانی کے غرارے کر لیے۔ ورنہ اگر اس کے چند قطرے بھی حلق کے اندر چلے جاتے تو میں نصف یا ایک منٹ کے اندر مر جاتا۔ اس بدحواسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری زبان پر اور منہ میں آبلے پڑ گئے۔ اور دو ہفتہ تک ڈاکٹر کے علاج کرنے سے اچھا ہوا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے بہت سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ مگر کم کو آواز دیتا ہوں کہ وہ آئے اور اس کو کھانا لانے کے لیے کہوں۔ مگر کم آتا ہے۔ تو میں اتنے میں کچھ سوچنے لگ جاتا ہوں۔ مگر کم آکر پوچھتا ہے کہ کیوں آواز دی تھی۔ کیا کام ہے۔ میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ داپس چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب اپنے خیال سے فارغ ہوتا ہوں۔ تو پھر چلا آتا ہوں اور مگر کم کو ڈانٹتا ہوں کہ وہ اب تنگ کیوں نہیں آیا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ وہ آیا تھا۔ مگر میں نے کوئی کام نہ بتایا۔ مگر کم کے اس جواب کو سن کر ذرا مت محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر کہتا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا جلدی لاؤ۔

میری بدحواسیوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے ملے تو میں چند روز کے بعد اس کا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ اور اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ دماغ کی اس کیفیت میں جب کوئی اصحاب ہر روز ملنے کے لیے آئیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص کا نام یاد رکھوں۔ اور ملتے ہی پہچان جاؤں۔ کہ یہ فلاں صاحب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص تپاک سے ملے۔ تو میں اسے نہ پہچانتے ہوئے بے حد ندامت سی محسوس کرتا ہوں۔ اور شرمندگی کے عالم میں پوچھتا ہوں کہ آپ کا نیا ذرا تو حاصل ہوا تھا۔ مگر معاف کیجئے۔ مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا۔ میرے اس جواب سے ملنے والا مطمئن نہیں ہوتا۔ اور وہ میرے

اس نہ پہچانے کو غور اور تکبر خیال کرتا ہے۔ حالانکہ میں غور اور تکبر کو طبعاً اور فطرتاً مکینہ پن سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اس ندامت سے بچنے کے لیے میں ملنے والوں کو دُعا سلام کے بعد پوچھنا شروع کر دیتا ہوں کہ ”آپ کے مزاج اچھے ہیں۔“ ”آپ کے بال بچے تو خیریت سے ہیں۔“ لطف یہ ہے کہ یہی سوال بعض اوقات اُن اصحاب سے بھی پوچھ لیے جاتے ہیں جن کے بال بچے تو کیا بچا روں کی شادی بھی نہ ہوئی تھی۔ ہر زیادہ سوچنے اور دماغ سے کام لینے والا بدحواسیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر میں اپنے لیے ترسے ایک مرض ہی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں اور دوسرے وہ بدحواس لوگ یقیناً معافی کے مستحق ہیں۔ جو دماغ کی غیر حاضری کے باعث ملنے والوں کی خواہش کے مطابق پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

## بزدلی یا بے بسی

جب پنجاب کے فسادات کا اثر دہلی تک پہنچا اور شہر میں قتل و غزیرہ کے واقعات شروع ہو چکے تھے۔ تو ایک روز صبح کے وقت پولیس کے وکٹیفیکل کرچ قطبی بیگم (جہاں کہ پہلے دفتر ”ریاست“ تھا۔) میں آئے۔ اور مسلمانوں سے کہا۔ فسادات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور چونکہ اس کوچ میں زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے (اس گلی میں آٹھ دس گھر مسلمانوں کے اور باقی تمام کے تمام ہندوؤں کے تھے) اور مسلمانوں کی جان کو خطرہ ہے۔ اس لیے تمام مسلمان ان کنٹیبلوں کے ساتھ مسلم محلوں میں چلے جائیں۔ چنانچہ محلہ کے تمام مسلمان اپنے بال بچوں کو لے کر ان کنٹیبلوں کے ساتھ مسلمانوں کے محلوں میں چلے گئے۔ اپنے گھروں کو چھوڑنے والے ان مسلمانوں کو مختار سی کے لیے زیادہ سے زیادہ پارغ منٹ کا وقت ملا ہو گا۔ کیونکہ کنٹیبل گلی میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ پارغ منٹ کے عرصہ میں یہ لوگ اپنے گھروں کا کیا سامان اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ جب یہ لوگ گئے۔ تو اس خیال میں تھے کہ یہ صرف دو چار روز کے لیے جا رہے ہیں۔ جب فرقہ پرستی کا جوش بیک میں کم ہو گا۔ تو وہاں آجائیں گے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی بار یہ لوگ اسی طرح عارضی طور پر جا چکے تھے۔ ان جانے والوں میں سے ایک تو دفتر ”ریاست“ والی بلڈنگ کے مالک اور صاحب اپنا گھر ایڈیٹر ”ریاست“ کے سپرد کر گئے۔ اور یہ اپنے کسی کمرہ کو تالہ تک نہ لگا سکے۔ ان کے ساتھ والے مکان میں ان کی خالہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ گھر بھی نگرانی کے لیے ایڈیٹر ”ریاست“ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ان کے مکان کے ساتھ ایک اور بوڑھے مسلمان رہتے تھے۔ جانتے جانتے وہ بھی کہہ گئے۔ ”سردار صاحب میں غریب آدمی ہوں۔ بہربانی فرما کر میرے گھر کا بھی خیال رکھنا۔ کہیں لوٹ نہ لیا جاؤں۔“ گویا اس گلی کے تین مکانات کا تو ”مین آفیسری کسٹوڈین“ مقرر کر دیا گیا۔ دیسے میری یہ دلی خواہش تھی کہ جب تک میں اس گلی میں موجود ہوں کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

مسلمانوں کے محلہ سے چلے جانے کے بعد دوسرے یا تیسرے روز میں دفتر ”ریاست“ میں بیٹھا مضمون لکھ رہا تھا۔ کہ گلی کا ایک بچہ میرے پاس آیا۔ اور اس نے کہا کہ گلی میں جو مسجد ہے۔ لوگوں نے اس کا تالہ توڑ لیا ہے۔ اور وہ اس کا سامان لے جا رہے ہیں۔ اس بچہ نے جب یہ کہا۔ تو میں نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت

نہ دی۔ کیونکہ شہر میں دوکانوں کے لوٹ پیٹے جانے کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ دوکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ اور کہیں کہیں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں نے اس واقعہ کو یہ سمجھ کر اہمیت نہ دی۔ کہ چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس میں کیا دکھا ہو گا۔ وضو کرنے کے چند پورائے لوٹے اور بیٹھے کے لیے ٹوٹی ہوئی چند چٹائیاں ہوں گی۔ لوٹنے والے کچھتوں کو لوٹ لینے دو۔

اس چھکی اطلاع کو ابھی دس منٹ ہوئے تھے کہ ایک دوسرا بچہ آیا۔ اُس نے کہا کہ لوگ مسجد کو گرا رہے ہیں۔ میں یہ اطلاع سن کر پہلے تو کچھ دم بزد سا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ مگر چند سیکنڈ کے بعد میری کیفیت یہ ہوئی۔ کہ غصہ کے باعث میں سوچ بھی نہ سکا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کھلی میں گیا۔ جہاں کہ مسجد تھی۔ وہاں دیکھا کہ پانچ چھ اشخاص جو کھارٹائیپ کے تھے۔ مسجد کے مناروں کو گرا رہے ہیں۔ مسجد کے اندر کا کچھ سامان تو یہ لوگ لے جا چکے ہیں۔ اور کچھ سامان لے جانے کے لیے مسجد سے باہر رکھا ہے۔ یہ سامان ایک آدھ چار پانی پانی گرم کرنے کا حمام۔ چٹائیاں اور لکڑی کی ایک آدھ چکی جس پر میٹھ کر وضو کرتے ہیں وغیرہ تھا۔ میں جب وہاں پہنچا۔ تو غصہ کے باعث میں ایک حد تک اپنے دماغی توازن سے محروم ہو چکا تھا۔ میں نے جاتے ہی مسجد گرانے والوں کو گالیاں دیں۔ اور زور سے کہا کہ کج بخت کے بچو۔ اگر مسلمانوں کو مسجد کے گرانے کا علم ہو گیا تو وہ تہا سے گھر دں کو آگ لگا دیں گے۔ تم مسجد پر اگر رحم نہیں کر سکتے۔ اور انسانیت سے قطعی محروم ہو چکے ہو تو کم از کم اپنی ذات پر رحم کرو۔ اپنی جائیداد کی تباہی کے خیال سے ہی اس مکینہ بن سے باز آؤ۔ میری آواز اور ڈانٹ ڈپٹ سن کر یہ کھار بھاگ گئے۔ خلیں جو دوسرے کھار اور غریب لوگ تھے۔ انھوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ تاکہ مسجد کے گرانے کا الزام اُن پر عائد نہ ہو۔ میں نے دفتر کے ایک آدمی کی امداد سے جو میرے ساتھ ہی وہاں گیا تھا۔ صبح کے سامان کو کھلی میں سے اٹھا کر مسجد کے اندر رکھا۔ اور مسجد کے دروازہ کو بند کر دیا۔ میں دروازہ بند کر رہا تھا۔ تو قریب کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک پنجابی شہزادہ بھی نے جو ابھی چند روز ہوئے پنجاب سے آئے تھے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں مسجد نہیں گرانے دیتے۔ آپ کے گوردوارے مسلمانوں نے پنجاب میں گرا دیئے“ میں نے اس کا جواب دیا۔ کہ ”یہ تو کوئی دلیل نہیں کہ کلکتہ میں کوئی چوری کرے تو اس کے ہمنام کو جیسی میں پکڑ لیا جائے۔ جن لوگوں نے پنجاب میں گوردوارے گرائے وہ پلاشبہ سخت سے سخت سزا کے مستحق ہیں۔ مگر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اس کا بدلہ دہلی کی مسجدیں گرا کر لیا جائے۔“ میری اس دلیل کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ پنجاب سے تباہ ہو کر آئے ہیں۔ اور اپنے دماغی توازن سے محروم ہیں۔ انھوں نے مسجد کے گرانے پر زور دیا۔ میں اس کو شرمناک فعل سمجھتا تھا۔ معاملہ تو تو میں میں تک پہنچا۔ اگر میری جگہ دہلی کا کوئی شخص ہوتا تو یہ پنجابی شہزادہ بھی شاید اُس کی دلیل کا جواب انھوں سے دیتے مگر میں پنجابی اور سکھ تھا۔ ان کو کھڑکی میں سے نیچے اترنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور میں اس توہین میں کہ بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ اس وقت تک اس محلہ میں نہ تو کوئی گھر لٹا تھا۔ اور نہ کوئی قتل ہوا تھا۔

اس مسجد کے متعلق میرے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ محلہ کی کھار بھلا اس اور دوسرے ادنیٰ قسم کے لوگوں کو جو لوٹ مار پر آمادہ تھے (میرا تجربہ ہے کہ لوٹ مار کرنے والوں میں نوے فی صدی لوگ

ادنے قسم کے مزدور پیشہ تھے، اور دس فی صدی دہلی کی بابو کلاس) ان کو حملہ نہ ہوا کہ وہ گلی میں میرے موجود ہوتے ہوئے مسلمانوں کے مکانوں کو لوٹتے۔ ویسے وہ دانت پیسنے رہتے کہ ان کو لوٹنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اور یہ لوگ جب بھی مجھے دیکھتے بڑی ترچھی نظروں سے گویا کہ میں ہندو جاتی کا خدا ریا کوئی بڑا مجرم ہوں۔

مسلمان جب اس محلہ میں آباد تھے۔ تو ہر جمعرات کو گداگری کے لیے علی الصبح ایک فقیر آیا کرتا۔ اس کا گلا بہت شربلا تھا۔ میری عادت صبح چار بجے سے کام شروع کر دینے کی ہے۔ میرے کان بھی ہر جمعرات کو علی الصبح اس فقیر کے گانے کی آواز سے محفوظ ہوا کرتے۔ اس پچارے کو علم نہ تھا کہ اس محلہ کے تمام مسلمان چند روز پہلے محلہ خالی کر چکے ہیں۔ اور اس کی گدا بازی کے لئے کوئی موجود نہیں۔ یہ فقیر ہمیشہ کی طرح اس جمعرات کو بھی علی الصبح گداگری کے لیے محلہ میں آیا۔ مگر ابھی گلی کے اندر پہنچا نہ تھا کہ گلی کے سرے پر کسی نے اس کو پھڑے سے ہلاک کر دیا۔ جب دن نکلا۔ میرا آدمی چائے کے لیے دودھ لینے بازار گیا۔ تو اس نے دیکھا کہ اس فقیر کی لاش گلی کے سرے پر پڑی ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا جس صورت میں کہ خیرات دینے والے لوگوں کی زندگی کی ہی کوئی قیمت نہ رہی۔ خیرات لینے والے فقیروں کی زندگی کی کیا قیمت تھی۔ دوپہر کو پولیس آئی۔ اور لاش لے گئی۔ نہ دوپہر۔ نہ تقفیش۔ نہ جہ نہ سزا۔ قتل لکھیہ واقعہ اس محلہ میں پہلا واقعہ تھا۔

محلہ کے مسلمان جب محلہ سے جا رہے تھے۔ تو ان مسلمانوں کو لے جانے والے کنیٹبلوں نے اس کو چر قطبی بیگم سے بالکل لمحوظہ گلی روئیاں میں رہنے والے ایک مسلمان سے بھی چلنے کے بلے کہا۔ یہ مسلمان آنکھوں سے اندھا۔ بڑھا اور قریب قریب مفروح تھا۔ بیکتی برس سے ایک کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ اور پڑوسی اس کو کھانے کے لیے دے دیتے۔ کنیٹبلوں نے اس کو بھی مسلمانوں کے محلہ میں چلنے کے لیے کہا۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ یہ کئی برس سے یہاں رہتا ہے۔ عمر کا کافی حصہ یہاں گزر گیا۔ معذو رہے۔ اس کا کوئی دشمن نہیں۔ اس کو کیا خطرہ ہے۔ اور یہ نہیں جانا چاہتا۔ چنانچہ یہ کنیٹبلوں کے ساتھ نہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز صبح اس کی لاش گلی میں پڑی تھی۔ آہ! انسان جب انسانیت سے محروم ہو جاتا۔ تو پھر یہ وحشیانہ پن میں جیواؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

مسلمانوں کے محلہ چھوڑنے کے بعد اس گلی قطبی بیگم سے باہر اس قسم کے قتل کے کئی واقعات ہوئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شاید کوئی دن بھی ایسا نہ تھا۔ جب کہ صبح ایک آدمہ لاش نہ ملتی۔ مگر گلی لوٹ سے محفوظ تھی۔ اور لوٹنے والا طبقہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا گیا۔ تو ایڈیٹر "ریاست" ان کو گرفتار کرادے گا۔ یہ گلی کسی روز لوٹ سے محفوظ رہی۔ اور میرے پاس اطلاعیں آتی رہیں کہ محلہ کا سیویم سکی اور ادنے طبقہ مجھے اپنے راستہ میں ایک روکا دٹ سمجھتا ہے۔

ایک روز دوپہر کو مجھے اطلاع ملی کہ لوٹنے والا ایک گروہ قریب کی ایک دوسری گلی سے زینہ لگا کر اس گلی کے ایک مکان میں لوٹنے کے لیے داخل ہوا ہے۔ اور اس وقت لوٹ رہا ہے۔ میں فوراً اس مکان پر گیا۔ تو دیکھا کہ لوٹنے والے پچھلی گلی کے ایک مکان سے داخل ہو کر اس مکان کو لوٹ رہے ہیں۔ یہ مکان ایک مالدار

مسلمان مقبول صاحب کا تھا۔ میں نے ادنیٰ آواز کے ساتھ لوٹنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی تو یہ لوگ بھاگ گئے۔ جب یہ بھاگ رہے تھے۔ تو میں جلدی سے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ گیا تاکہ دیکھوں۔ کہ یہ کون لوگ ہیں اور لوٹ کا سامان کہاں لے جا رہے ہیں۔ جب میں نے ان کو سامان لے جاتے اور رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ تو میں نے گلی کے ایک شخص کو تھانہ میں یہ کہہ کر بھیجا کہ سب انسپکٹر کو بلا لاؤ اور کہو کہ ابھی ابھی ایک مکان لوٹ لیا گیا ہے۔ اور لوٹ کا سامان ایک دوسرے مکان میں موجود ہے۔ میرے آدمی بھیجنے کے نصف گھنٹہ بعد تھانہ دار صاحب معہ ہندو قوں والے تین کنسٹیبلوں کے تشریف لائے۔ مجھ سے حالات پوچھے۔ میں نے تمام حالات بتائے۔ اپنے مکان کی چھت پر ان کو لے جا کر بتایا۔ کہ لوٹنے والے فلاں مکان کے اندر دیہ مکان میرے مکان سے بالکل پیچھے ایک ہنست کا مکان تھا۔ جس میں کرایہ کے دس بارہ گھر آباد تھے۔ اور آباد لوگوں میں زیادہ تر ادنیٰ رتہ کے لوگ ہیں (سامان لے کر گئے۔ تھانہ دار صاحب مجھ سے تمام حالات پوچھ کر جس مکان میں گئے۔ اس کے بعد ادھر جاؤ ادھر جا۔ اس سے باتیں کر۔ اس سے باتیں کر نصف گھنٹہ کے قریب تعینش کرنے کے بعد یہ تھانہ دار صاحب واپس تھانہ میں گئے۔ جو آدمی میں نے اطلاع دینے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ تھا۔ تھانہ میں پہنچ کر تھانہ دار صاحب نے اس آدمی سے کہا ”حاضر اے ہندو ہوتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہ تم ہندوؤں کے خلاف رپورٹ کر رہے ہو۔ پنجاب میں ہندوؤں کے ساتھ کیا ہوا۔ اگر یہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو لوٹ لیا۔ تو کیا جرم ہے“ وہ آدمی تھانہ دار کی ”امرت بانی“ سن کر واپس آگیا۔ اور اُس نے مجھے بتایا۔ کہ تھانہ دار نے اس سے کیا کہا۔ اس واقعے پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ لوٹنے والوں اور سرکاری ملازموں کی پوزیشن مختلف ہے۔ تھانہ دار کے یہ الفاظ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فسادات کے بند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مجھے ٹھیک علم نہیں کہ خیال ہے کہ تعینش کے وقت اس تھانہ دار نے کمزوروں کی حوصلہ افزائی کی کیونکہ جہں گھروں میں لوٹ کا مال گیا۔ اس کے بعد ان گھروں کے لوگ لوٹ اے کے لیے اور زیادہ طیار ہو گئے۔ اور میرے پاس اطلاع آئی۔ کہ ان لوگوں نے اور حملے کے سیوم سنگیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایڈیٹر ”ریاست“ کو قتل کیا جائے۔ اور دفتر ”ریاست“ کو آگ لگا دی جائے۔ اور اس کے بعد حملے کے مسلمانوں کے گھر صاف کیے جائیں۔ اس زمانہ میں اخبارات تو بند ہو چکے تھے دفتر میں کتابوں کا آنا ممکن ہی نہ تھا۔ کوئی پریس نہ چل رہا تھا۔ اور دفتر کے چڑاسی بھی غائب ہو گئے تھے۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ ان دنوں میرے مکان پر مسٹر گربال پلے ایڈیٹر ”پرسنی انڈیا“ مسٹر خوشتر گرامی ایڈیٹر ”ہندوستان“ مسٹر درجنگ بہادر سنگھ ایڈیٹر ”شیر پنجاب“ اور سیالکوٹ کے حکیم عبدالعزیز دجن کا ہند نام ہم نے رام لال رکھ چھوڑا تھا کہ یہ مسلمان ہونے کے جرم میں اُسے نہ جائیں (مقیم تھے۔ ہم چاروں خود ہی کھانا طیار کرتے۔ برتن صاف کرتے۔ دن بھر افرامیں سنتے۔ واقعات رواں پر تعقید کی جاتی۔ اور رات کو بادی بادی پہرہ دیتے۔ تاکہ حملے کے مسلمانوں کے یا کم از کم دو تین مکانات محفوظ رہیں جن کا میں ”آزیری کسٹوڈین“ تھا۔ کیونکہ انور صاحب کے ساتھ والے یعنی انور صاحب کی خانہ کے مکان میں ان کی خاڑ کا کچی ہزار دیہہ اور زیور پڑا تھا۔ اور لوٹنے والی حملہ کی برادری اس کو شیش میں بستی تھی۔ کہ سب نے پہلے اس مکان کو صاف کیا جاسے۔

جب میرے پاس مجھے ہلاک کرنے اور دفتر ریاست، کو آگ لگانے کی سیکورٹی کی اطلاعیں پہنچ رہی تھیں۔ تو یہ اطلاع غادر ڈھاکہ کے سیکریٹری سردار ملک سنگھ جی کو بھی مل گئی۔ جو قریب کے محلہ میں رہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے تو یہ بھی سنا۔ کہ دیوان سنگھ پر حملہ ہوا ہے۔ یہ بچاے پنڈت منو دیو شاستری کے ساتھ پریشانی کی حالت میں میرا پاس پہنچے۔ تو انھوں نے بتایا کہ کیا کچھ انھوں نے سنا۔ اور بعض لوگوں کی کیا نیت ہے۔ میں نے ان کو تمام حالات سنائے۔ یہ دونوں درست چلے گئے۔ تو چند گھنٹہ کے بعد آٹھ دس معزز اصحاب کی ایک پنچایت تشریف لائی تاکہ ”غلط فہمی“ دمنے کی جائے۔ سردار ملک سنگھ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس پنچایت میں سے ایک بزرگ نے کہا۔

”میں آپ کا اخبار کسی برس سے پڑھتا ہوں۔ آپ جہت بڑے محب الوطن اور ویش سید ہیں۔ آپ نے زندگی میں پہلک کے لئے جہت تکالیف برداشت کیں۔ اور بڑے بڑے نوابوں اور راجوں کا مقابلہ کیا۔ یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ مسلمانوں نے پنجاب کے ہندوؤں پر بہت مظالم کیئے۔ آپ ہندوؤں کو لوٹنے سے روکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ آپ اپنی نیکدلی کے باعث ایسا کرتے ہیں مگر لوگ آپ کے مکان کو آگ لگا دیئے اور آپ کو ہلاک کرنے کے متعلق سیکمیں بنا ہے ہیں۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سادھو اور ہاتھ تباہ نہ کیئے یعنی آنکھیں بند کر لیئے جینا میں جو ہر زمانہ ہے۔ ہونے دیکھے کسی کو کچھ نہ کیئے۔“

ان بزرگوں کی نافرمانی دوسرے حضرات نے بھی کی۔ اور انھوں نے بطور شخص اور خیر خواہ کے مجھ سے مطالبہ کیا۔ کہ میں لوٹنے والوں کو نہ روکوں۔ میں نے ان کی اس نصیحت کے بعد ان سے کہا کہ لوٹنا کانگریس اور ہاتھ گانڈھی کی سپرٹ اور شرافت کے خلاف ہے۔ جس کا جواب انھوں نے یہی دیا۔ کہ لوگ اب نہ ہاتھ گانڈھی کو جانتے ہیں۔ نہ کانگریس کو اور نہ شرافت کو۔ اب تو ہر شخص آزاد ہے۔ یہ لوگ اس کے بعد چلے گئے اور میں سوچنا رہا۔ کہ جس صورت میں پہلک لوٹ کو اب سمجھتی ہے۔ قتل اور خوریزی دہرم کا ایک حصہ بن چکی۔ پولیس اپنے فرائض کو چھوڑ چکی۔ میں کیا راہ اختیار کروں۔ اور میں کسی کے لینے کیا مفید ہو سکتا ہوں۔ میں دن بھر اس ذہنی گفت و میر مبتلا رہا۔ اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

اس واقعہ کے اگلے روز گلی کے مسلمانوں کے گھروں کے دروازے ٹوٹ رہے تھے۔ دس دس۔ میں ہیں اہ تیس تیس لوگوں کا گروہ سامان نکال کر لینے جا رہا تھا۔ لوہے کی آہنی الماریاں اور سیف ہتھیاروں کی زد میں تھے اور پولیس کے سپاہی بند و قیں کندھوں پر بکے کبھی کبھی گلی میں چکر لگاتے تھے۔ گویا کہ یہ گھروں سے جا چکا مسلمانوں کے مکانات کی حفاظت نہیں بلکہ لوٹنے والوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اپنا حصہ ساتھ ساتھ وصول کرتے چلے جائے ہیں اور راقم الحزن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ ایک سب انسپکٹر پولیس ایک گھ سے بہت قیمتی پتنگ خود نکلوا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس لوٹ نے دو تین روز کے اندر تمام گلی کے مسلمانوں کے گھر دسوائے ان تین مکانوں کے جن کا ایڈیٹر ریاست ”آزادی کی سٹیڈین“ تھا۔ اور جن کارات کو پہرہ دیا جاتا۔ اور دن کو لوٹنے سے باز رکھنے کے لئے لوٹنے والوں سے بک بک کی جاتی مصافحہ کر دیئے۔ چنانچہ یہ ناقابل فراموش واقعات جب کبھی یاد آ جاتے ہیں۔ تو سوچنا ہوتا ہے کہ میری موجودگی میں محلہ کے لوگوں کا



لوٹ لیا جانا میری نزدیکی یا بے بسی۔ ہاتھ کاغذ می کو تمام حالات بتا کر پوچھا جاتا تو وہ یقیناً اسے  
نزدیکی قرار دیتے۔ مگر میں اپنے ذہن کو دھوکہ دینے کے لیے اسے اپنی بے بسی ہی سمجھتا ہوں۔

## دفعہ ۹۔ الغزیرات ہند کا شکار

جنگ کا زمانہ تھا۔ اور میں دہلی جیل میں قتلہ ایک روز جمع ایک قیدی نے مجھے آکر بتایا۔ کہ پچھلے شام  
کر جرمی کا ایک جاسوس گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے۔ اور جیل کے امینوں کا حکم ہے کہ کوئی شخص اس  
یورپین سے بات نہ کرے۔ یہ خبر میرے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھی۔ میں فوراً اس کے پاس گیا۔ یہ جیل  
کے ہسپتال کے قریب بیٹھا تھا۔ اور ایک نمبردار رجیل میں ایک معین عرصہ گزارنے اور نیک چلن رہنے کے بعد  
قیدی کو نمبردار بنا دیا جاتا ہے۔ جس کی ذیہنی غذا کوئی کام نہ کرنا اور دوسرے قیدیوں سے کام لینا ہوتی ہے اس کے  
قریب اس ذیہنی پورے تھا کہ کوئی قیدی اس سے بات چیت نہ کرے۔ جیل کے قیدی اور نمبردار میرا لحاظ  
کرتے تھے۔ کیونکہ وہ مجھے اپنا ہمراہ اور پہلک کی خدمت کرنے والا سمجھتے تھے۔ میں جب جرمی کے اس "جاسوس"  
کے پاس گیا۔ تو اس نمبردار نے مجھے بات کرنے سے نہ روکا۔ میں نے اس "جاسوس" سے پوچھا۔ تم کس جرم  
میں گرفتار ہوئے ہو۔ میرے اس سوال کا اس نے جواب دیا۔ "خدا کے لیے مجھے چائے کی ایک پیالی وہ  
میں بے حد تکلیف میں ہوں۔ میں پھر تباؤں گا۔ کہ میں کس جرم میں گرفتار ہوا ہوں۔"

اس کے چائے کی پیالی طلب کرنے سے محالہ ہوتا تھا کہ یہ چائے کی طلب بالکل اس طرح ہی محسوس  
کر رہا ہے۔ جس طرح انڈین کا عادی انڈین بنیر انڈین کے لیے چھین جو مجھے معام ہوا کہ رات کو اسے ایک کوٹھڑی  
میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور صبح جب کوٹھڑی میں سے نکالا گیا۔ تو یہ کچھ نڈھال سا تھا۔ ایک تو مناسب کھانا نہ  
لنے کے باعث دوسرے جیل کے باعث ذہنی پریشانی اور تیسرے چائے کی طلب۔ اس کی نڈھالی کے باعث میں  
نمبردار اس کو کوئی دروائی دوانے کے لئے ہسپتال لایا تھا۔ میں فوراً اپنے کمر میں آیا۔ چائے طیارہ کرائی اور اس قیدی  
کے ہاتھ جرمیر لکھانا طیارہ کیا کرتا تھا۔ اس کو بھجوا دی۔

آٹھ لاکھ کے قریب پہر منڈنٹ جیل تشریف لائے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص یورپین ہے۔  
تو حکم دیا کہ اسے سینٹل کلاس رجہاں میں۔ ایک اور یورپین اور دہلی کے ایک صاحب مہتمم نے) میں مل جاؤ  
چنانچہ کچھ دیر کے بعد یہ "جاسوس" ہا سے پاس ہی تشریف لے آئے۔ میرا کھانا دونوں وقت گھر سے آیا کرتا۔  
اور یہ کھانا انگریزی اور ہندوستانی دونوں قسم کا اور تین چار پیوں کے لیے کافی ہوتا۔ اس "جاسوس" نے جس کا ہم مشرق میں  
تھا ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔

جیل میں اگر کسی قیدی سے یہ پوچھا جائے کہ اس نے کیا جرم کیا تھا جس کے باعث جیل میں آیا۔ تو یہ قیدی شرم  
محسوس کرنے ہوئے کبھی اپنا اصلی جرم نہیں بتاتا۔ اور جھوٹ بولنے ہوئے کسی دوسرے جرم کا نام لے دیتا ہے۔ مثلاً  
اگر وہ خلاف وضع فطری چوری یا جیب کاٹنے کے جرم میں آیا۔ تو یہی جواب دے گا کہ اس کی رشتہ داروں  
بے عداوت تھی۔ آپس میں لڑائی جھگڑا تھا۔ عداوت کا شکار ہوا وغیرہ۔ اس لیے میں قیدیوں سے ایک خاص

طریقہ سے اُن کا جرم پوچھا کرتا۔ اُن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھتا کہ "پولیس نے تم کو کس میں پھنسیا یہ میرے اس سوال کا اُن کے ذہن پر ایسا اثر ہونا کہ وہ اپنے جرم کو چھپانے لگے اور فوراً جواب دینے کو زنا بالجبر جرمی یا جیب کترنے کے جرم میں۔ میں نے مسٹر ٹامس سے بھی یہی سوال کیا کہ پولیس نے کس جرم میں پھنسیا۔ یہ بکارانی الحقیقت پھنسیا گیا تھا۔ اور قطعی بے گناہ تھا۔ اس نے جواب دیا "دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی کے جرم میں" میں سمجھ گیا کہ پولیس کے پاس جب کسی جرم کے متعلق کوئی ثبوت نہ ہو۔ تو یہ ۱۰۹ دفعہ آوارہ گردی کی اہمیت اور استعمال کرتے ہیں۔ اس بکار سے پر یہی دفعہ استعمال گئی ہے۔

اب اس ٹامس کے اصل حالات سنئے۔ یہ شخص یورپ کے کسی ملک کا رہنے والا تھا۔ پیشہ کے لحاظ۔ موٹر کار کی مشینری کا ماہر اور بہت اچھا موٹر ڈرائیور۔ ایک عرصہ تک فرانس۔ اٹلی۔ انگلستان۔ مصر۔ اور عرب وغیرہ میں رہا۔ اور یہ فرانسیسی۔ انگریزی۔ روسی۔ اور عربی وغیرہ کئی زبانوں کو بے تکلف بل۔ اور جب لہذا میں تھا۔ تو یہ کرنل لارنس آف عربیہ جس نے عربوں کے متعلق مسئلہ اور کی جنگ میں انگریز کی بہت خدمات انجام دیں۔ اور جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا کے پاس بھی بطور موٹر ڈرائیور ملازم یہ کرنل لارنس کے چشم دید حالات ایڈیٹر ریاست "کو سنایا کرتا۔ جو بے حد دلچسپ ہیں۔ اور ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنل لارنس نہ صرف غیر معمولی انسان تھے۔ بلکہ بہت بلند بھی تھے۔ کرنل لارنس پاس کئی برس رہنے کے بعد یہ بھی آگیا۔ اور وہاں ایک معمولی ہوٹل میں رہائش اختیار کی۔ جس کو ایک بلو بیڈی بطور لورڈنگ ہاؤس کے جلائی تھی۔ وہاں اس نے اخبارات میں ایک اشتہار دیکھا کہ گورنر نے کو ایسے ترجمان کی ضرورت ہے۔ جو روسی زبان سے واقف ہو۔ اور جو روسیوں کے ساتھ بات چیت کرے۔ اشتہار دیکھ کر اس نے لٹری انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر کے پاس پونا درخواست بھیجی وہاں انٹر ویو کے لیے گیا۔ انٹر ویو کے بعد اس کو آٹھ سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا گیا۔ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی گئی۔ اور اس کو ایک خط سرٹیفکٹ کے ڈائریکٹر لٹری انٹیلیجنس پشاور لڑجہاں سرحد پر بھیج دیا۔ اسی پرٹے لگے تھے) کے نام دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ یہ فوراً پشاور جا کر ملازمت پر حاضر ہو جائے۔

یہ خط پہنچنے کے بعد فرنٹیر پوسٹ سے دہلی پہنچا۔ جیب میں روپیہ تھا۔ ایک برس پہلے بھی یہ دہلی آیا۔ یہاں بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ وہاں کی یورپین نرس سے میل جول ہو گیا تھا۔ اب دہلی نوہ نرس یاد آگئی۔ اُس ہسپتال میں پہنچا۔ نرس سے ملا۔ اور اُسے ہوٹل میں (جہاں مقیم تھا) کھانا آنے کی دعوت دی۔ نرس آئی۔ وہی تھی جسے جام پینے گئے۔ اور کھانے کے بعد یہ دونوں ٹیکسی پر پہنچی دہلی سیر کرنے گئے۔ دو تین دن یہ دہلی میں رہا۔ تیسرے روز رات کے آٹھ بجے فرنٹیر پوسٹ سوار ہونے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی کچھ لمبی تھی۔ چھیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں ڈرائیور بھی ڈرائیو والے مولوی ٹائپ کے ایک مسلمان بھی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ د گڑا رہنے اور یہ بتانے کے لیے کہ یہ یورپین ہوتے ہوئے بھی عربی جانتا ہے۔ اس نے مولوی صاحب عربی زبان میں پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہیں۔ یورپین کے سنہ سے عربی زبان کے ا

کر مولوی صاحب بے خوفش ہوئے اور عربی میں بات چیت شروع ہوئی۔ جب یہ باتیں کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک کنٹینر بھی ادھر آدھر چکر لگا رہا تھا اس نے جب دیکھا کہ ایک عربی زبان میں مولوی صاحب سے باتیں کر رہا ہے۔ تو اس نے سمجھا کہ یقیناً یہ شخص جرمنی کا جاسوس تھا۔ جو مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ فوراً ریلوے سٹیشن تھا نہ میں پہنچا۔ وہاں ایک گروہ سار جنٹ ڈیوٹی پر تھا۔ اس گروہ سے سار جنٹ سے سی۔ آئی۔ ڈی کے کنٹینر لے گیا کہ پلیٹ فارم پر جرمنی کا ایک جاسوس ایک مولوی صاحب سے عربی زبان میں بات چیت رہا ہے۔ گروہ سار جنٹ کی بھی باجیس کھل گئیں۔ اور اس نے سمجھا کہ بہت بڑا افکار مارتھ آیا۔ یہ تحقیقات لیے ”موقع واردات“ پر پہنچا۔ تو اس نے اپنے کانوں سے یورپین کو عربی زبان میں باتیں کرتے سنا۔ فوراً رتھانہ میں جا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی مسٹر میلر دیہ حضرت اس جیل پاکستان میں کہیں سپرنٹنڈنٹ میں ہیں اگر ٹیلی فون کیا۔ اور کہا کہ جرمنی کا ایک جاسوس پلیٹ فارم پر عربی زبان میں ایک مولوی سے باتیں رہا ہے۔ مسٹر میلر نے ٹیلی فون پر ہی کہا کہ فوراً گرفتار کر دو۔ تلاشی لے کر سول لایقن کے تھانہ کی عمارت میں بند کر دو۔ رتھ پیل کر دو۔ چنانچہ مسٹر ٹامس جو گاڑی کے انتظار میں تھے۔ پلیٹ فارم پر گرفتار کر لیے گئے۔ تھانہ سول لائسنز میں لے گئے۔ تلاشی لی گئی۔ اور عمارت میں بند کر دیئے گئے۔

اگلے روز دس بجے وہی گروہ سار جنٹ مسٹر سائیکل پر تھانہ پہنچا۔ مسٹر سائیکل پر ہی پچھلی سیٹ پر ٹامس کو غلاما سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں پہنچ کر مسٹر میلر کے سامنے پیش کیا۔ مسٹر میلر تلاشی کے سامان میں سے وہ لٹاؤ مول کر دیکھ چکے تھے۔ جو ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس بیورو پر نائے سر بمبر ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس ہٹاؤ کے م بھیجا تھا۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ یہ جاسوس نہ صرف جرمنی کا جاسوس ہے۔ بلکہ جعل ساز بھی ہے۔ جو کام کے نام کے خطوط جعلی طیارہ کے ہندوستان میں پھرتا اور اپنا کام نکالتا ہے۔ مسٹر ٹامس اور مسٹر میلر کے میان دفتر سی۔ آئی۔ ڈی میں انٹروکشن کے سلسلہ میں یہ بات چیت ہوئی۔

میلر:- تم وہی کیوں آیا۔

ٹامس:- پشاور ملازمت پر جا رہا تھا۔ راستہ میں اُترا۔

میلر:- تم دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو۔ سی۔ آئی۔ ڈی کو نہیں۔ تم یہاں وہی میں کس کس سے ملے۔ ٹامس:- ہوٹل میں مقیم ہوا۔ فلاں ہسپتال کی فلاں نرس سے ملا کسی پرسیبر کو گیا۔ دو دن اور دو رات با۔ اور کسی سے نہیں ملا۔

میلر:- یہ خط تم نے جعلی طیارہ کیا ہے۔ اچھے جلسا نہ ہو۔

ٹامس:- میں جلسا نہیں۔ تم کو ذمہ داری کے ساتھ بات کرنی چاہیے۔ کسی شریف پر الزام لگانا شرافت نہیں میلر:- تم شریف نہیں ہو۔

اس کے بعد ٹامس نے اینٹ کا جواب پتھر کی صورت میں دیا۔ اور غصہ میں مبرا کو سوا این رسورسنگ دیا۔ جس پر میلر نے حکم دیا کہ دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی کے جرم میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے جیل میں بھیج دو۔ ناچہ ٹامس مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ کی پوزیشن سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے بالکل ایسی تھی۔

جیسے گاؤں کے کسی نہ کسی دار کی پٹی کشتہ کے سامنے۔ مجسٹریٹ نے ضمانت طلب کی۔ وہاں ضمانت دینے والا کون تھا۔ اور اگر کوئی ضمانت دینے والا ہوتا بھی۔ تو تقریرات بند کی دوسری دفعات موجود تھیں۔ کسی دوسری ناقابل ضمانت دفعہ کے ماتحت جیل بھیج دیا جاتا۔ چنانچہ ٹامس صاحب مجسٹریٹ کے سامنے حاضری دینے کے بعد جیل میں بھیج دیئے گئے۔

اس کے بعد مسٹر میل نے خط لکھنے والے ڈائریکٹر لٹری ڈپٹی جنس پرنا کے نام کا نفی و نفل خط لکھا۔ اور ”رجلی“ خط ساتھ بھیجا کہ اگر ٹامس کے متعلق مزید معلومات ہوں۔ تو لکھیے۔ تاکہ اس جاسوس کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اور دہلی میں نرس۔ ٹیکسی ڈرائیور اور ہوٹل والوں کی سی۔ آئی۔ ڈی میں پیشیاں شرمنا ہوئیں۔ جو حیران کہ وہ جاسوس سے کیوں ملتے۔ اتفاق ہوا کہ ڈائریکٹر صاحب پرنا سے مدراس کی طرف دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ ودماہ کے قریب دورہ پر رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو انھوں نے جواب دیکر ٹامس کو وہ امر سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ اس نے لٹری ڈپٹی جنس کو بطور ترجمان ملازمت کے لئے درخواست دی اور اس کو ملازمت دے دی گئی۔ وہ خط ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جعلی نہیں۔ اور ملازم رکھنے سے پہلے بی بی سی۔ آئی۔ ڈی سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا تھا۔ تو سی آئی ڈی بی بی نے لکھا تھا کہ ٹامس شریف دی ہے۔ اور عرصہ سے بی بی میں رہتا ہے۔

اس جواب کے آنے سے پہلے ٹامس کو پولیس ہر دس پندرہ روز کے بعد مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرتی اور ایوانڈ کے یعنی۔ نہ مجسٹریٹ پوچھتا کہ ریوانڈ دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی میں کیوں لیا جا رہا ہے۔ اور نہ کوئی دوسرا اعتراض تین ماہ تک ریوانڈ ملتے رہے۔ اور ٹامس صاحب جیل میں ہمارے ساتھ رہتے رہے۔ اس بچارے کو اس سے پہلے جیل میں جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اور ہم جیل کے پرانے رسیا تھے۔ اس غریب کو رات بھر بندھے آئے بہت پریشان رہا کرے۔ ہم گہری نیند میں خراٹے لیا کرتے۔ تین ماہ کے قریب یہ جیل میں رہا۔ تو ایک روز گورا سارجنٹ اس کو جیل سے لینے کے لئے آیا۔ جیل سے اسے عدالت میں لے جایا گیا۔ وہاں پہلے انتظام ہو چکا تھا۔ پولیس کے ایک گروگے نے مسٹر ٹامس کی دوسرہ وہیہ کی ضمانت نیک چلی داخل کی۔ اور ٹامس صاحب راہ ہوئے۔ حسب ہدایت گورا سارجنٹ ٹامس کو رہائی کے بعد سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں لایا۔ یہ گھبرا رہا تھا کہ کوئی نیا جال لیا نہ کر لیا ہو۔ مگر اسے تسلی دی گئی۔ یہ مسٹر میل کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے جو تکلیف ملا وجہ اٹھائی اس کی مسٹر میل نے معافی مانگی۔ اور کچھ روپیہ دے مجھے ٹیکس یاد نہیں غالباً دوسرہ وہیہ تھا) بطور دستاویز امداد“ (یہ روپیہ نہ محکمہ مسٹر میل نے اپنی جیب سے دیا یا کسی خفیہ فنڈ سے) نذر کیا۔ اس کو ایک ڈرہوٹل میں رکھا گیا۔ تاکہ یہ آرام کرے۔ اس ہوٹل کا بل بھی مسٹر میل کے مقرر کیے ہوئے ایک سب انسپکٹر نے ادا کیا۔ اور ٹامس صاحب اپنا اصلی سفارشی خط (جو چند روز جلی دستاویز رہا) لے کر اپنی ملازمت پر پشادہ گردانہ ہوئے۔ گویا کہ یہ یورپین عربی بولنے کے جرم میں زیر دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی (تین ماہ تک جیل میں ہزار ہا پیریل بھی ٹانگ جال کا سرکاری ہمان رہا۔

## فسادات کا کیریٹر پر اثر

فسادات کے دنوں کے کچھ حالات ایڈیٹر "ریاست" نے لکھے ہیں۔ جو اس کے چشم دید تھے۔ ذیل میں کچھ مزید حالات لکھے جاتے ہیں۔ جو دلچسپ ہیں اور جن کا ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی علم ہے۔

انور صاحب ایڈیٹر رسالہ "انارم" جن کے مکان میں میں رہتا تھا خیالات کے اعتبار سے کانگریسیں اور کانگریسی بھی بہت سخت متم کے۔ یہ کانگریس کی تقریروں میں حصہ بھی لیتے رہے تھے۔ اور کانگریس کے ورکرز ان سے واقف تھے۔ ان کو یہ یقین تھا کہ فسادات چاہے کتنا بھی زور پکڑ جائیں۔ ان کے کانگریسی ہونے کے باعث ان کو کوئی کچھ نہ کہے گا۔ چنانچہ یہ فسادات کے دنوں میں ہر جگہ چلے جاتے۔ ایک روز یہ ہانڈی چوک سے نئی سڑک پر آ رہے تھے۔ تو راستہ میں ہندوؤں کا ایک گروہ جو اُس زمانہ میں مسلمانوں پر حملے کرنے کے لئے جمع ہو رہا تھا۔ ان پر ہلک پڑا۔ اور اس نے ان کو پھینا شروع کر دیا۔ انور صاحب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ اور ابھی ان پر کسی ہلک ہتھیار سے حملہ نہ ہوا تھا کہ اس گروہ میں سے ایک کانگریسی نے ان کو پہچان لیا اور اپنے ہمراہیوں کو پکار کر کہا کہ یہ تو کانگریسی اور مسلم لیگ کا مخالف ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ چنانچہ حکم کرنے والوں نے جب یہ سنا۔ تو انھوں نے انور صاحب کو چھوڑ دیا۔ اور دو تین کانگریسی ان کو سہارا دے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ انور صاحب جب گھر پہنچے تو یہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ کمرے پہنچے ہوئے۔ اور ان کو اپنے پر مشدد مقامات کو کپڑے سے چھپانے کا بھی احساس نہ تھا۔ ان کے اپنے بھائی بران کے گھر میں کمرہ مہیا کیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کے حواس درست ہوئے۔

ان کی حالت کو دیکھ کر ایک صاحب نے کہا کہ یہ کانگریسی ہونے کے باعث بے خوف ہو کر شہر میں پھرتے تھے۔ میں نے کہا یہ تو بیشک ہے مگر کانگریسی ہونے کے باعث ہی پہنچ بھی گئے۔ اگر کانگریسی نہ ہوتے۔ اور ان کو مجھے میں کانگریسی پہچان نہ لیتے۔ تو یہ اُسی وقت ختم کر دیے جاتے۔

چہرے والوں درجہاں دفتر "ریاست" تمام میں مسلمانوں کے مکانات لوٹے جارہے تھے۔ اور دس دس۔ پندرہ۔ پندرہ۔ میں میں آدمیوں کے گروہ سامان لوٹنے کے لئے آ رہے تھے۔ تو ایڈیٹر "ریاست" نے دیکھا۔ کہ دو سیکہ جو جنٹلمین متم کے تھے۔ یعنی آنکھوں پر عینک جسم پر سوٹ۔ جیب میں فوٹو بین چین اور پاؤں میں بوٹے۔ محل کے ایک بہت بڑے ٹب کر اٹھائے لئے جارہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ایک لڑکا ہے جس نے ساگون کی ایک خوبصورت تپائی کو اٹھایا ہوا ہے۔ ان لوگوں کو یہ سامان لے جاتے ہوئے ایڈیٹر "ریاست" نے دیکھ لیا تو یہ کچھ جھینپ گئے۔ اور اپنی نزاعت کو چھپانے کے لئے ڈھیشوں کی طرح ایک نے کہا: "یہ ٹب شزار قیصل کے لئے جارہے ہیں۔ کیمپ میں دال ڈالنے کے کام آجائے گا۔" میں ان کو کیا جواب دیتا۔ یہی کہا: "بہت اچھا خیال ہے۔ آپ بہت بڑی قوی سید اک رہے ہیں۔ ساگون کی یہ تپائی روٹیاں رکھنے کے کام آجائے گی۔" میرے اس طنز کو شکر یہ مزید نام نہورے۔ انھوں نے گردنیں جھکیں مگر ڈھیشوں کی طرح چلے گئے۔

فسادات ابھی ختم نہ ہوئے تھے۔ مگر ان کی شدت میں کمی آچکی تھی۔ کہ ایک روز چند ہندو کانگریسیوں کے ساتھ انور صاحب اپنے نئے مکان سے جہاں وہ فسادات کے باعث چلے گئے تھے) ایڈیٹر ”ریاست“ سے ملنے کے لئے دفتر ”ریاست“ میں آئے۔ یہ بل کر واپس جا رہے تھے۔ تو ان کو جاتے ہوئے راستہ میں ایک کانگریسی نے دیکھا جو سپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اگلے روز ان سپیشل مجسٹریٹ نے دو فسادات میں امن قائم کرنے کے لئے سپیشل مجسٹریٹ بنائے گئے تھے۔ ان کانگریسیوں سے جو انور صاحب کو ملائے گئے دفتر ”ریاست“ میں لائے اور واپس لے گئے تھے۔ کہا۔

”تم کہاں کے ہندو ہو۔ جو ایک مسلمان کو نہ صرف ختم نہ کیا۔ بلکہ اس کی حفاظت میں لے گئے۔ اس پلان کانگریسیوں نے کہا کہ: ”وہ تو کانگریسی تھا۔“ اس کے جواب میں اس سپیشل مجسٹریٹ نے فرمایا: ”چاہے کانگریسی تھا۔ مگر تھا۔ تو مسلمان“ فسادات ختم ہوئے تو ان سپیشل مجسٹریٹ صاحب کو معلوم ہو گیا کہ اس واقعہ کا ایڈیٹر ”ریاست“ کو علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے۔ اور اپنی گرفت پر اظہارِ اندام کیا اور معافی چاہی۔ ایڈیٹر ”ریاست“ ان سے کہا کہتا۔ اپنے دل میں ہی کہا۔ کہ جب دنیائے ہی قتل اور لوٹ مار کرنا پاپ اور گناہ نہ سمجھا۔ اسے ثواب سمجھ لیا گیا تو اس بچارے کانگریسی سپیشل مجسٹریٹ کا کیا تصور ہے۔

دفتر ”ریاست“ کے قریب ایک مسلمان بڑھی رہتا تھا۔ جو ایڈیٹر ”ریاست“ کے وہاں جلنے سے پہلے اپنے غنڈہ پن کا ثبوت دیتے ہوئے خوجی دالے ہندوؤں سے اشیائے کرکھا جاتا مگر ان کو پیسے نہ دیتا۔ محلہ کے تمام لوگ اس کے غنڈہ پن سے عاجز تھے۔ جسے چاہتا گالیاں دیتا اور جسے چاہتا دھکاتا۔ محلہ کے بنیا کلاس کے ہندو اس سے دیکر رہتے۔ ایک دفعہ دفتر ”ریاست“ کے سامنے دالے مکان میں ایک نئے راہ دار جو سکول ماسٹر تھے آئے تو اس غنڈہ نے ان کو بلاوجہ دھکایا۔ اور کہا کہ کس سے پوچھ کر رہائش اختیار کی ہے۔ گویا کہ یہ غنڈہ اس گلی کا ”میر محلہ“ ہے۔ مجھے اس واقعہ کا علم ہوا۔ تو میں نے تکلیف محسوس کی۔ اس غنڈہ کا باپ شریف آدمی تھا۔ جو اپنے بیٹے سے عاجز تھا۔ اس کو بل کر میں نے کہا۔ کہ اپنے بیٹے سے کہہ دیجئے۔ کہ وہ آئندہ اس محلہ میں غنڈہ پن کا ثبوت نہ دے۔ ورنہ میں افسروں کو توہید میں کہوں گا۔ پہلے خود اس کی مرست کر دی گا۔ میری اس تنبیہ کے بعد اس نے کبھی کسی کو تنگ نہ کیا اور اس سے پہلے جہاں یہ گلی میں آکر مل کر اور چھاتی تان کر چلتا۔ اس کے بعد گردن نیچی کیے چلتا۔ فسادات جب شروع ہوئے تو یہ بھی محلہ سے چلا گیا۔ اور اس کو بھی لوٹ لیا گیا۔ اس کے گھر میں سوائے بڑھی کے اور زاروں۔ اور لکڑی کے چند بڑے چھوٹے ٹکڑوں کے کچھ نہ تھا۔ فسادات ختم ہوئے۔ اور لوگوں نے اپنے ٹٹ چکے سامان کے نقصان کی خبریں دیں۔ تو اس نے اپنے سامان کی قیمت کا اندازہ پانچ ہزار روپیہ لکھوایا اسکا خیال تھا کہ جو لکھوایا جائے گا۔ بل جائے گا۔ مگر اس کو کیا علم کہ ”قوی لوٹ“ میں سود تو کیا اصل بھی نہیں ملا کرتا۔ اس لوٹ اور قتل نے اس غنڈہ کی کمر کے بل بھی نکال دئے اور اب نہ تو اس کا غنڈہ پن باقی ہے۔ اور نہ یہ اس محلہ میں جاسکتا ہے۔ جہاں کہ یہ گردن تان کر چلا کرتا تھا۔

فسادات کے دنوں میں نہ تو کوئی ہندو مسلمانوں کے محلہ میں جاسکتا تھا۔ نہ مسلمان ہندوؤں کے محلہ میں۔

لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور کرنی نہیں دیکھتا تھا کہ اچھا کون ہے۔ اور برا کون۔ ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں پیغام کا آنا جانا بھی ممکن نہ تھا۔ فسادات کے دنوں میں مجھے اپنی اتنی فکر نہ تھی۔ جتنی دوستوں کی وہ جا ہے ہندو تھے۔ مسلمان یا سکھ میں طعنے صاحب سے دوزیاست اسکے سا اہا سال سے پرنسٹر دہلیشر تھے۔ ملنے اور ان کی غیریت دریاہنت کرنے کے لئے بے چین رہتا۔ چنانچہ ملاقات کا طریقہ یہ تھا۔ کہ میں ہندو محلوں سے جڑتا ہوا۔ تھانہ فیض بازار میں پہنچتا۔ وہاں سے پولیس کے کسی مسلمان کنسٹیبل یا کسی مسلمان کانگریسی کو طعنے صاحب کے گھر بھیج کر ان کو بلوانا اور ہم تھانے میں بیٹھ کر باتیں کر لینے کیونکہ تمام شہر میں صرف پولیس کے تھانے ہی محفوظ مقام تھے۔ جہاں کہ بندو قوں کا پہرہ ہوتا۔ اور کسی حملہ کا خدشہ نہ تھا۔

کوچہ قطبی بیگم کے مسلمانوں کے ایک گھر میں ستر پچتر ہزار روپیہ کا سامان تھا۔ فسادات کا جوش کچھ کم ہوا تو لاکھ مکان کی لڑکی دو مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے کر اپنا گھر دیکھنے آئی۔ یہ اپنے گھر پہنچی تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ گھر کا سامان۔ فرنیچر۔ بجلی کے پنکھوں۔ برتنوں اور دوسری اشیاء کا کیا سوال ہے۔ لوٹنے والے دیواروں پر سے بجلی کے تار بھی نکال کرے گئے تھے۔ اور گھر میں شہزادہ قیوں کے تین چار خاندان آباد تھے۔ یہ لڑکی جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو گھر کی دیواروں کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی دیوانہ دیکھتا ہے۔ اس کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ خواب دیکھ رہی ہے یا کہ مکان کی حالت فی الحقیقت ایسی ہو چکی ہے۔ مکان کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا: اچھا۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔ تم لوگ خوشی سے اس مکان میں رہو۔ مگر مکان کو آگ نہ لگانا۔ اس نے آگ نہ لگانے کی اس سے التجا کی کیونکہ اس نے سنا تھا کہ اگر کسی مکان سے شہزادہ قیوں کو نکالا جائے۔ تو شہزادہ قی مکان کو آگ لگا دیتے ہیں۔

میں شام کے وقت بیٹھا تھا کہ ہمدرد و داخانہ کے مالک حکیم عبدالمجید صاحب کے چھوٹے بھائی سعید صاحب ایک سکھ سب انسپکٹر اور دو مسلح کانسیبلوں کے ساتھ دفتر دوزیاست "میں آگئے۔ میں حیران ہو گیا معاملہ ہے افسوس نے ایک خط دیا۔ جو حکیم صاحب کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فوراً اگر مجھ کو ضروری کام ہے۔ میں نے چلنے کے لئے کھٹ پہن دیا۔ اور روانہ ہوا تو زمین میں اترتے ہوئے سب انسپکٹر نے خیر خواہی کے انداز میں کہا: "یہ مسلمان ہیں۔ ان کا اعتبار نہ کرو۔ خطرہ ہے۔ آپ کو جاننا چاہئے۔ یہ سن کر میں مسکرایا۔ یہ سب انسپکٹر بھارا حکیم صاحب کو جانتا تھا نہ مجھے۔ اس کا علم صرف یہاں تک ہی محدود تھا کہ حکیم صاحب مسلمان ہیں۔ اور میں سکھ ہوں۔ میں نے کہا بردانہ کہئے۔ میں حکیم صاحب کو جانتا ہوں۔ نگلی سے باہر آیا۔ تو حکیم صاحب کی موٹر کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو کر ہم لوگ دریا گنج حکیم صاحب کی کوٹھی گئے۔ جہاں سینکڑوں آدمی کام کرتے تھے۔ وہاں اب ایک ستانا چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ فسادات کے باعث کسی کاریگر کا آن ممکن نہ تھا۔ کوٹھی میں صرف حکیم صاحب کے پانچ چھ ملازم تھے۔ ارد گرد بلکہ دور تک تمام ہندوؤں کی کوٹھیاں اور مکانات۔ صرف ایک حکیم صاحب مسلمان تھے جن کا یہ کارخانہ تھا۔ کوٹھی کے اندر گیا۔ حکیم صاحب کو بھی کے پچھلی طرف دریا کے کنارہ والے کمرہ میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب سے ملا خیریت دریاہنت کی۔ تو حکیم صاحب نے بتایا کہ کئی راستوں سے کوٹھی پر حملہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے

اور پچھلی رات دوسرے قریب ہندوؤں کا مجمع رات کو گیارہ بارہ بجے حملہ کرنے کے لئے آ بھی رہا تھا۔ مگر اتفاق سے پہرہ دینے والی فوجی گارڈ آگئی۔ اس گارڈ کو دیکھ کر یہ لوگ بھاگ گئے۔ رات کو بندہ قتل کے بغیر بچے جاتے ہیں۔ اور بعض سرکاری انسر بھی اس کوشش میں ہیں کہ کوٹھی پر حملہ ہو۔ اور کوٹھی لوٹ لی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ہر لمحہ حملہ کا خطرہ ہے۔ تمام حالات بتاتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا۔ ”میں اپنے غیر مسلم دوستوں میں سے آپ پر بہت بھروسہ کرتا ہوں۔ مجھے رائے دیکھ کر کیا کروں۔ اور آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ آپ کو کوٹھی تو ملازموں اور پولیس کی حفاظت میں دیکھئے اور فوراً یہاں سے اپنے شہر والے مکان میں جو مسلم خاندان ہے منتقل ہو جائیے۔ آپ کا یہاں چند گھنٹہ رہنا بھی غیر مناسب اور خطرہ کا باعث ہے اور دفاعی حکام سے بیکر کوٹھی کی حفاظت کرنی چاہیے۔ میں آپ کی کوٹھی کی حفاظت کرنے کے لیے طیارہوں اور دین رات پہرہ دوں گا۔ مگر میری غیر حاضری میں انور صاحب کمانڈ کی خالہ کا اور میرے پڑوس کے ایک غریب مسلمان کا مکان لوٹ لیا جائے گا۔ جو اب تک بچا ہوا ہے۔ اگر وہاں کا انتظام ہو جائے تو میں فسادات کے دنوں تک کے لئے آپ کی کوٹھی میں آجاتا ہوں۔ اس مشورہ کے بعد میں اور حکیم صاحب مسٹر رندھاوا ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی گئے تو وہاں ملازموں نے بتایا کہ رندھاوا صاحب تو کوئی روزے کوٹھی پر نہیں آئے۔ اگر آتے ہیں۔ تو کبھی کبھی رات کے وقت۔ فسادات دور کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔ اور ٹاؤن ہال میں ملیں گے۔ ہم لوگ ٹاؤن ہال پہنچے۔ وہاں سے پتہ چلا۔ کہ مسٹر رندھاوا انتظام کے سلسلہ میں لال قلعہ میں گئے ہیں۔ ان کا کچھ دیر انتظار کیا۔ وہ نہ آئے۔ پھر ہم لالہ ساد توڑی پر مشاڈ عیڑیٹ سے ملے۔ اور تمام حالات بیان کئے۔ تو انھوں نے ایک دوسرے مجسٹریٹ مسٹر گپتا سے کہا کہ حکیم صاحب کی کوٹھی کا فوراً انتظام کیا جائے۔ سلیج پولیس تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہاں جائے۔ اور کوٹھی کو ہر صورت میں خطرہ سے محفوظ رکھا جائے۔ اس وقت کچھ اندھیز ہو چکا تھا۔ ہم لوگ ٹاؤن ہال سے بلی ماراں میں ہوتے ہوئے چمخے والوں پہنچے۔ بلی ماراں بالکل سنسان۔ تمام بازار میں ایک آدمی نظر نہ آیا۔ چرنے والوں سنسان۔ کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ چرنے والوں اور بلی ماراں کے درمیان بازار میں ایک شخص کی ایک لاش پڑی تھی جس کو کسی نے تھوڑو دیر پہلے ہٹا کر لیا تھا۔ یہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا اتصال ہے۔ یعنی اس جگہ سے چرنے والوں کی طرف تو ہندوؤں کی آبادی ہے۔ اور بلی ماراں کی طرف مسلمانوں کی۔ جس میں حکیم صاحب لاش ہندو کی تھی یا مسلمان کی حکیم صاحب نے مجھے چمخے والوں میں اتار دیا۔ اور خود اپنی کوٹھی تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پولیس نے کوٹھی کی حفاظت کا انتظام کر دیا تھا۔ اور ایک روز مولانا ابوالکلام بھی حکیم صاحب کی خیریت دریافت کرنے وہاں گئے تھے۔

فسادات کے دنوں میں مجھے ایک خط ملا۔ جو ایک مسلمان کا تھا۔ دیکھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ ان کی لڑکی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی تھیں۔ اور وہ ”ریاست“ میں مضامین بھی لکھا کرتی تھیں۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ بلی سے جا رہے ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کو مکان کی ضرورت ہے۔ یہ فوراً اگر مکان پر قبضہ کر لیں۔ یہ خط تو اس وقت لکھا گیا۔ جب فسادات کے شروع ہونے کا خطرہ تھا اور کہیں کہیں حملے ہو رہے تھے۔ مگر خط ڈاک خانہ کا کام معطل



ہونے کے باعث چند روز بعد ملا۔ یہ خط کچھ دن میری جیب میں بھی پڑا رہا۔ میں ایک روز ایک دوست کے ساتھ ٹاؤن ہال دھوانِ شہر کے انتظام کے لئے ایک مرکز تھا، میں گیا۔ تو خیال آیا کہ وہ مکان دیکھنا چاہئے۔ میں نے میری شائق احمد سے یہ خیال ظاہر کیا۔ تو انھوں نے وہاں ایک جیب گاڑی کا انتظام کر دیا۔ منشی عبدالقدیر اور ڈاکٹر خالد وہاں موجود تھے۔ وہ بھی ساتھ ہوئے ڈاکٹر خالد کے پاس بندون مٹی۔ ہم لوگ گلیوں کے چارے کاٹتے ہوئے۔ اس مکان میں جا رہے تھے۔ ترستہ میں دیکھا کہ ایک لڑکے کے مکان میں سے دو تین عورتیں اور دو تین مرد بچے ہیں۔ ڈاکٹر خالد کے ہاتھوں میں بندون مٹی۔ انہوں نے پوچھا۔ ”تم کون لوگ ہو جو یہاں پھر رہے ہو؟“ ڈاکٹر خالد نے تو اس خیال سے کہا۔ کہ یہ لوگ بھی شاید مکانوں میں رہتے ہیں۔ کچا سامان لے جا رہے ہیں۔ اس ”قوی قافلہ“ میں سے بولٹھی عورت نے جواب دیا۔ کوئی بات نہیں ہم ہندو ہیں۔“ گویا کہ ہندوؤں کو لٹنے کا لائسنس ملا ہوا تھا۔ اس خاتون نے مجھے اور منشی عبدالقدیر کو ان کی داڑھی کے باعث) سکھ سمجھا اور ڈاکٹر خالد کو ہندو۔ اس نے ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے اس نے بے تکلف کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہم ہندو ہیں۔“ اس عورت کا یہ جواب سنکر میں اپنی ہندی ضبط نہ کر سکا۔ اور کہا ”کوئی بات نہیں۔ ہم بھی سب ہندو بھائی ہیں۔“ اس کے بعد ہم لوگ اس مکان میں پہنچے جس کے متعلق خط آیا تھا۔ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک نوجوان مرد در صاحب۔ بچے انھوں نے ہم لوگوں کو معہ بندون کے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے کہا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے مکان دکھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ ہم لوگ مکان کو صرف دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ دیکھ لیتے دیکھتے۔ بجائے ہمیں مکان دکھانے کے انھوں نے تحکمانہ اہم اختیار کیا۔ اور مکان دکھانے سے انکار کیا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”سردار جی میں بھی سکھ ہوں اور بھائی ہوں۔ ولی کا بنیا نہیں ہم صرف مکان کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں کتنی گنجائش ہے۔ اگر آپ نے تو تراف کی تو آپ کا سرنالی میں دسے دوں گا۔“ اس پر سردار جی سیدھے ہو گئے۔ اور آپ نے مکان دیکھنے کی اجازت دے دی۔ پھر ہم نے مکان دیکھا۔ اول تو اس میں گنجائش ہی کم تھی۔ دفتر کے لئے جگہ کافی نہ تھی۔ دوسرے میں اس قدر بے رحم نہ تھا۔ کہ کسی کو وہاں سے نکل کر قبضہ کرنا۔ مکان کو دیکھنے کے بعد جب اس کو پتہ چلا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ اور مقصد صرف مکان کو دیکھنے کا تھا۔ تو پھر اس نے خوشامد زدیہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم واپس آ گئے۔ اب ڈاکٹر خالد جب کبھی ملتے ہیں تو مذاقاً ان کے کہتا ہوں ”سنائیے ہندو ڈاکٹر صاحب کیا حال ہے؟“

## اندھوں میں قوت احساس

میں جب فیروز پور میں تھا۔ اس زمانہ میں وہاں ایک کامیاب ترین وکیل سردار چند سنگھ تھے جن کی پریکٹس کا مقابلہ شاید ہی کوئی وکیل وہاں کر سکتا تھا۔ یہ سردار چند سنگھ قوتِ بینائی سے بالکل محروم اور پیدائشی اندھے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کی چشمیاں تھیں۔ نہ سفیدی نہ کچھ اور۔ یعنی یہ آنکھوں سے بالکل ہی محروم تھے۔ جن کے اوپر نیشن یا علاج کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آپ پکری میں جاتے یا کسی اور جگہ ایک

آدمی ان کو ہار دینے کے لیے ضرور ساتھ ہونا۔ اور ان کی پریکٹس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زیادہ تر قتل کے مقدمات کے سلسلہ میں سیشن کرٹ میں پیش ہوتے۔ ان سردار چنداسنگھ کی قوت احساس اس قدر تیز تھی۔ کہ یہ گھوڑے پر صرف ہاتھ پھیر کر بتا دیتے کہ گھوڑے کا رنگ سفید ہے۔ سرخ یا سیاہ۔ ایک بار ان کے ہاتھوں میں مختلف رنگ کے آؤن کے کچے دے دیئے گئے۔ آپ تھوڑی دیر ان بچھوں کو ٹھٹھٹے رہے۔ اور ٹھٹھٹے کے بعد آپ نے ہر بچے کے متعلق بتا دیا۔ کہ ان کا کون کن سا رنگ ہے۔ ان سردار چنداسنگھ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ آپ پبلک کی ایک میٹنگ میں شامل ہوئے۔ اس میٹنگ میں سٹریٹس اور تھ سمیٹ ڈپٹی کمشنر تقریر کر رہے تھے۔ اور تقریر بھی پر اسے زمانہ کے میزان انڈین سنل سر دس کے جذبات میں انتہائی مطلق العنان تھی سردار چنداسنگھ صبر نہ کر سکے۔ آپ نے کھڑے ہو کر سٹریٹس اور تھ سمیٹ کو ٹوک دیا۔ باسور تھ سمیٹ بہت ہی اگھڑ اور اچھٹ منہ کے اندر تھے۔ معاملہ تو تو میں میں تک پہنچ گیا۔ سٹریٹس اور تھ سمیٹ نے سردار چنداسنگھ کے خلاف اور سردار چنداسنگھ نے سٹریٹس اور تھ سمیٹ کے خلاف گورنمنٹ کے پاس شکایتیں کیں۔ اور نوٹس بازی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سردار چنداسنگھ کا پریکٹس کا لائسنس ضبط کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد سردار چنداسنگھ سٹریٹس اور تھ سمیٹ کے پیچھے لگے رہے۔ مارشل لا میں باسور تھ سمیٹ نے پبلک پر بہت مظالم کیے۔ شکایتیں جو تھیں۔ میانواں میں آپ نے دیاں کے ایک نواب کو گالیاں دیں۔ نواب نے اپنے ملازموں سے باسور تھ سمیٹ کو بہت پٹوایا یہ تمام حالات اور سردار چنداسنگھ کی مخالفت ایک جگہ جمع ہو گئے۔ تو سٹریٹس اور تھ سمیٹ ملازمت سے معزف کر دیئے گئے۔ اس موقع کی اطلاع سن کر سردار چنداسنگھ نے سٹریٹس اور تھ سمیٹ کو ایک خط لکھا۔ جس میں اوپر تو القاب کی جگہ لکھا گیا۔ ”نجد مت سٹریٹس اور تھ سمیٹ ڈسمیٹ ڈپٹی کمشنر“ اور نیچے لکھا ”آپ کا خادم چنداسنگھ ڈسمیٹ ایڈوکیٹ۔“

گیانی شیر سنگھ سکھوں میں بہت اہم شخصیت تھے۔ ایک بہترین مقرر۔ اچھے مصنف اور جرنلسٹ۔ اور حالات کے اعتبار سے بہت اچھے فلسفی۔ مگر آنکھوں کی مینائی سے قطعی محروم۔ ایڈیٹر ”ریاست“ جس زمانہ میں لاہور کے ہفتہ دار ”خالصہ اخبار“ ایڈیٹ کیا کرتا آپ سنے کے لیے تشریف لایا کرتے۔ اور آپ سے گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ آپ آنکھوں سے قطعی محروم تھے۔ مگر آپ کی قوت احساس اس قدر تیز تھی کہ آپ کو کسی کمرہ میں چلے جانے تو رضا کو محسوس کرتے ہوئے کمرہ میں کھڑے ہو کر بتا دیتے۔ کہ یہ کمرہ اتنے فٹ لمبا ہے اور اتنے فٹ چوڑا ہے۔ ان گیانی شیر سنگھ سے سنے ہوئے کسی برس جو بچکے تھے۔ کہ ایڈیٹر ”ریاست“ ایک روز امرتسر گیا۔ وہاں ہاں دروازہ سے باہر ریلوے سٹیشن کو جا رہا تھا۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ ریلوے کے پل کے قریب گھاس کے فرش پر گیانی صاحب اپنے پرسل سٹنٹ کو اپنے اخبار اور گورکھی زبان میں تھا اور امرتسر سے شائع ہوتا تھا، کے لئے مصدق لکھا رہے ہیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ ٹانگ سے اتر کر آپ کے پاس گیا۔ اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شیک ہینڈ کیلے گیانی صاحب نے پوچھا کہ کون ہے میں نے نہ صرف خود کو ہی جواب نہ دیا بلکہ ان کے پرسل سٹنٹ کو بھی اشارہ سے کہہ دیا کہ وہ کچھ نہ بتائے۔ گیانی جی نصف منٹ کے قریب میرے ہاتھ کو ٹھٹھٹے رہے۔ تو آپ نے کہا کہ ”ہاتھ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہلی کے دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست“ کا ہاتھ ہے۔“ میں بے اختیار ہنس پڑا اور حیران تھا۔ کہ دس گیارہ برس

کے بعد بھی گیانی صاحب نے کبھی نہ صرف ہاتھ ٹٹول کر مجھے پیمانہ لیا۔

## مسٹر ہارنیمین کی فیاضی

مسٹر بی۔ جی۔ ہارنیمین مرحوم اُن چند نیک دل انگریزوں میں سے تھے۔ جو انصاف پسند ہونے کے باعث ہندوستان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔

مرحوم ہمارا جہ ناجہ گدی سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی گورنمنٹ کے معسوب تھے۔ اور یہ خطرہ تھا کہ گورنمنٹ آپ کے خلاف شاید زیادہ سخت قدم اٹھائے۔ ہمارا جہ جن لوگوں سے (مع مسٹر جناح مرحوم) رائے لینے تمام لوگ ہی ہمارا جہ کو پوشیل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تعاون کرنے کی رائے دیتے۔ مگر ہمارا جہ اس تعاون کے معنی غلامی سمجھتے۔ کیونکہ وہ فطرتاً تعاون پسند نہ تھے۔ ہمارا جہ جب انصاف ہے قطعی مایوس ہو چکے تو آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ گورنمنٹ اگر آپ پر مزید ظلم کرے تو اس ظلم کو بے نقاب کرنے کے لیے پریس اور چیلک کے لیڈروں کی امداد لی جائے۔ چنانچہ لیڈروں میں سے توینڈت موٹی لال ہنر۔ لالہ لاجپت رائے۔ دیوان جین لال۔ سر سنکھ نار۔ سر سی۔ پی۔ راماسوامی آئر۔ مسٹر بی۔ پرکاشم۔ مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا آئر۔ اور سر جین لال ستیلو اور وغیرہ درجنوں سیاست دان حضرات سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے گئے۔ اور پریس کی امداد کے لیے لکھنؤ کا روزانہ انگریزی اخبار ”انڈین ڈیلی ٹیلی گراف“ خرید لیا گیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنیمین جو اُن دنوں بیکار تھے اور بمبئی کرائسٹل سے الگ ہو چکے تھے (کو روپیہ دے کر انگریزی کا ایک نیا شاندار روزانہ اخبار جاری کیا جائے۔ چنانچہ ہمارا جہ نے ایڈیٹر ”ریاست“ کو بمبئی بھیجا کہ اس سلسلہ میں مسٹر ہارنیمین سے بات چیت کی جائے

ایڈیٹر ”ریاست“ منصوری سے بمبئی گیا، مسٹر ہارنیمین سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تو فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنیمین میرے ساتھ منصوری چلیں۔ مسٹر ہارنیمین زندگی بھر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ کیونکہ وہ فطرتاً فیاض تھے۔ روپیہ بیدردی کے ساتھ صرف کرتے تھے۔ میں نے وقتی اخراجات کے لیے چند سو روپیہ ان کو عہدہ دیا۔ میں بمبئی سے جب چلا۔ تو ہمارا جہ کے بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور سفید رنگ کا افریقہ کا ایک طوطا میں نے خریدا۔ میں اور مسٹر ہارنیمین فرسٹ کلاس میں سوار ہوئے کیونکہ مسٹر ہارنیمین افلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کیا کرتے۔ دوسرے سامان کے ساتھ سفید رنگ کا یہ افریقین طوطا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ راستہ میں مسٹر ہارنیمین نے مجھ سے متعدد بار کہا کہ میں طوطے کو پتھر سے نکال کر آزاد کر دوں۔ پر بندوں کو پتھر میں رکھنا بہت برا ظلم ہے۔ میں نے طوطے کو پتھر سے تو نہ نکالا۔ اور اس کو منصوری ساتھ لے گیا۔ مگر مسٹر ہارنیمین کے متعلق اس واقعہ کے باعث میرے دل میں بہت ہی عزت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اور مرحوم کی نیک دلی کا یہ پہلا اثر تھا۔ جو اب تک میرے ذہن پر موجود ہے۔ اور اس واقعہ کا ہی اثر ہے کہ میں نے اس طوطے کے بعد کبھی کسی جانور کو پتھر میں نہیں ڈالا۔ اور شاید درجنوں بار دوسرے لوگوں سے پرندوں کو آزاد کرنے کے لیے کہا۔

مسٹر ہارنیمین گوشت نہ کھاتے تھے۔ اور گوشت کھانا بے رحمی سمجھتے تھے۔ آپ کو کتوں وغیرہ جانوروں سے بے حد محبت تھی۔ اور آپ کے پاس مسیحاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ جس سے ایک زرد رنگ کے بیچے بھی جنم لیا۔ نہ ہوتے۔ چنانچہ جب منصور می آئے۔ تو یہ کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ کتا ایک روز منصور می میں گم ہو گیا۔ مسٹر ہارنیمین کی کتے کی جدائی میں جو حالت ہوئی۔ بیان نہیں کی جاسکتی۔ آپ نے کھانا چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت آنسو رشتہ۔ مہاراجہ اور چارائی بھی مسٹر ہارنیمین کی اس حالت کو دیکھ کر متاثر تھے۔ ہم نے کئی آدمی کتے کی تلاش میں لگا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین روز کے بعد کتا مل گیا۔ اور مسٹر ہارنیمین نے کھانا کھایا۔ مسٹر ہارنیمین کے جانوروں سے اس قدر محبت کرنے کا ہم تمام لوگوں پر اثر تھا۔ اور ہر شخص آپ کی رحمت کو تحسین کرتا تھا۔

مسٹر ہارنیمین اپنا تختہ اور گلازوں سے محبت کرنے کے اعتبار سے بھی بہت نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ اور ان کو آپ دوست سمجھتے۔ اور ان لوگوں کو بھی آپ سے بے حد محبت تھی۔ آپ کے تمام ماتحت اور ملازم آپ کو گورنر کہہ کر مخاطب کرتے۔ منصور می میں آپ آئے تو آپ کے ساتھ ایک ملازم ممتاز بھی تھے۔ یہ ممتاز بالکل غلام ڈانسر نہیں جو کئی فلسوں میں کام کر چکے ہیں۔ اور اسٹر ممتاز علی کے نام سے مشہور ہیں۔ مسٹر ہارنیمین یہ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ کہ ان کا کوئی ماتحت یا ملازم آرام سے نہ رہے۔ چنانچہ ملازم کی رعایت کا انتظام بھی مسٹر ہارنیمین کے ساتھ ہی سکین ہوٹل میں کیا گیا۔ اور جب تک مسٹر ہارنیمین نہ ہوئے۔ اس رہے۔ ممتاز بھی اس سکین ہوٹل میں ہی رہے۔ جس کا پندرہ روپیہ روزانہ کے حساب سے کرایہ دیا جاتا۔

مسٹر ہارنیمین منصور می میں دو ماہ کے قریب رہے۔ ان کی مہاراجہ سے ہر روز ملاقات ہوتی بلکہ قریب قریب ہر روز راقم الحروف اور مسٹر ہارنیمین بیچ اور ڈنر پر مہاراجہ کے ہاں جمع ہونے ان ملاقاتوں کے بعد مہاراجہ سے مسٹر ہارنیمین کی سکیم کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ "انڈین نیشنل میرلز" جاری کرنے کے لیے دیا۔ اور مسٹر ہارنیمین کا اندازہ یہ تھا کہ اگر پریس نہ لگایا جائے۔ تو یہ رقم ایک روزانہ انگریزی اخبار کو سیلٹ سپرٹنگ بنانے کے لیے کافی ہوگی۔ مگر مسٹر ہارنیمین اور روپیہ دونوں متضاد تھے۔ مسٹر ہارنیمین پرنسٹرل کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور آپ کا اس روپیہ پر بلا شرکت غیرے اقتدار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ روپیہ تین ماہ کے اندر ہی ختم ہو گیا۔ ورنہ جس اخبار کو مسٹر ہارنیمین جیسا ایڈیٹر نصیب ہو۔ اگر اخبار کا انتظام بھی اچھے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا۔ تو یہ اخبار آج بقیہ پندرہ بیس ہزار روپیہ ماہوار آسانی کے ساتھ منافع دے سکتا تھا کیونکہ اگر کوئی اخبار لکھا۔ ٹے میں چلے تو گھر کی بیٹیاں فروخت کر دیتا ہے۔ اور اگر منافع ہو۔ تو اس میں سے کئی ہزار روپیہ ماہوار منافع بالکل معمولی بات ہے۔

مسٹر ہارنیمین روپیہ کو کس طرح صرف کرتے تھے۔ اس کے متعلق کئی واقعات میں سے صرف ایک راقم ہی سمجھتا۔ راقم الحروف اور مسٹر ہارنیمین دونوں منصور می میں تھے۔ وہاں اطلاع آئی کہ مرحوم مہاراجہ چارلٹ ایڈیٹر ریاست کے خلاف ایک جھوٹے اور بے بنیاد مقدمہ میں گورنمنٹ سے ایکسٹرا ڈیوٹی کے وارنٹ نکالوا رہے تھے۔ اس لیے مسٹر ہارنیمین سے اس اطلاع کا ذکر کیا۔ تو آپ نے ایک

مضمون لکھا۔ جو بہت طویل اور زردوار تھا۔ یہ مضمون چھپنے کے لئے بمبئی جانا تھا۔ آپ نے کہا کہ یہ مضمون  
 بذریعہ تار بمبئی بھیجا جائے۔ میں نے کہا۔ دروز میں دہاں بذریعہ ڈاک پہنچ جائے گا۔ مگر آپ نہیں مانے۔  
 اور یہ مضمون بذریعہ تار بمبئی بھیجا گیا۔ جس پر پریس ٹیلی گرام دیا کہ آؤ کے چھ الفاظ کے فتح سے پچھتر روپے  
 صرف ہوئے۔ یعنی جہاں دروز کے وقت کی بچت کے لئے ایک مضمون پر پچھتر روپے صرف کر دیئے جائیں۔  
 دہاں کفایت شعاری کا کیا سوال ہے۔

”انڈین نیشنل میریڈ“ بند ہو چکا تھا۔ تو ایڈیٹر ”ریاست“ کو بمبئی جانے کا اتفاق ہوا وہاں دوسرے  
 دوستوں کے علاوہ مسٹر ہارنمین سے ملنے کے لئے بھی اُن کے مکان پر گیا۔ باتیں کرتے ہوئے دیر ہو گئی۔ تو مسٹر  
 ہارنمین نے کہا کہ میرا بیٹا بھی اُن کے ساتھ کھائے۔ اور بیٹے کے بعد وہ بھی میرے ساتھ فورسٹ کی طرف چلیں گے  
 میں نے اُن کے ساتھ بیٹا بھیجا۔ اور ساتھ چلنے کا وقت آیا۔ تو وہ پس و پیش کر رہے تھے۔ مگر ہم کبھی آنا ہے  
 اور کبھی جانا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی وقت ہے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بدلنے کے لئے کپڑے  
 مقرر نہیں۔ دھوئی نہ صرف اس دھلائی کی اجرت طلب کرتا ہے۔ بلکہ کچھلی دھلائی کی بھی۔ بغیر اجرت کے  
 وہ کپڑے دینے سے انکار کر رہا ہے۔ اور مسٹر ہارنمین کپڑے نہ ہونے کے باعث باہر نہیں جاسکتے۔ یہ دیکھ کر مجھے  
 بے حد تکلیف ہوئی۔ ہندوستان کا ناخوش ترین اور بین الاقوامی شہرت کا جز ٹسٹ۔ جس کی بڑے سے بڑا ایڈیٹر بھی  
 عزت کرے اس کے پاس دھلائی کی اجرت دینے کے لئے بھی دام نہ ہوں۔ میں نے ایک سو روپیہ کا رشتا متنازعہ  
 دیا۔ کہ وہ کپڑے دھوئی سے منگائے۔ اور باقی رقم اخراجات کے لئے گھر میں رکھ لے۔ اس کے بعد مسٹر ہارنمین  
 سے میں نے مشورہ کیا کہ ان کا مستقبل کیا ہو۔ بمبئی میں وہ بیکار ہیں کسی کے ماتحت کام کر نہیں سکتے۔ دنیا میں  
 نفوذ خرچ کی ہر تنگ کبیر کپڑ پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں۔ اور ضروری اخراجات سے  
 بھی تنگ ہیں۔ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنمین دہلی چلیں۔ دہاں میں اور مسٹر ہارنمین دونوں بل کر انگریزی  
 کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری کریں۔ مسٹر ہارنمین اخراجات کے لئے پانچ سو روپیہ ہوا راتخوہ لیں۔ اور اخبار  
 کے تمام اخراجات کے بعد اگر کوئی بچت ہو تو وہ نصف نصف۔ اور اس بزنس پر ایڈیٹر ”ریاست“ دس ہزار روپیہ  
 صرف کرے۔ دھوئی کے ہاں سے کپڑے آگئے۔ اور ہم فورسٹ کی طرف گئے۔ اگلے روز میں نے ضروری اخراجات کے لئے  
 مسٹر ہارنمین کو پانچ سو روپیہ دیا تاکہ وہ بمبئی چھوڑ سکیں اور واپس دہلی آگیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں دہلی میں ہفتہ وار  
 انگریزی اخبار کے لئے تیاری کر دوں۔ اور مسٹر ہارنمین پندرہ روز تک دہلی پہنچ جائیں گے۔ میں دہلی واپس آگیا۔ تو  
 ایک ہفتہ کے بعد مسٹر ہارنمین کا رات آیا کہ اُن کو پانچ سو روپیہ اور بھیجا جائے۔ اس تار کو دیکھ کر میں نے محسوس  
 کیا کہ جو رقم اٹھایا جا رہا ہے وہ کامیاب نہ ہوگا۔ اور دفتر ”ریاست“ اتنے اخراجات کا متحمل نہ ہو سکے گا۔  
 مگر قدم کو پیچھے لے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وعدہ کے علاوہ مسٹر ہارنمین کے فلاس کا خیال بھی تکلیف دہ  
 تھا۔ میں نے پانچ سو روپیہ اور بذریعہ تار بھیج دیا۔ اور مسٹر ہارنمین دہلی تشریف لے آئے۔

جب مسٹر ہارنمین سے دہلی آنے کا فیصلہ ہوا تو یہ بات صاف کر دی گئی تھی کہ وہ فی الحال صرف اکیلے دہلی  
 آئیں۔ میرے مکان پر ہی قیام کریں۔ میرے بلزم اُن کی خدمت کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور اُن کا کوئی خرچ نہ  
 ہوگا۔ پانچ سو روپیہ ہوا رات اُن کے جیب خرچ کے لئے کافی ہیں۔ جب وہ آئے تو میں دہلی میں موجود نہ تھا۔

مقدمہ کی پیشی کے لئے ہونٹنگ آباد گیا ہوا تھا۔ واپسی پر سہ پہر چلا کر مسٹر ہارنیمین دہلی پہنچ چکے ہیں۔ اور رسول لایوڑ کی طرف ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ میں ہوٹل میں پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہاں آپ نے کئی کمرے لیے ہوئے ہیں اور آپ کے ساتھ ممتاز کے علاوہ دو اور ملازم بھی ہیں۔ میں اس تمام ”خانہ دان“ کو دیکھ کر پریشان کہ اس بجٹ کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ہوٹل میں چائیں پیہ روزانہ کہاں سے دیا جائے گا۔ میں اگلے روز صبح مکان کی تلاش میں نکلا۔ اور اپنے دو ملازموں کو بھی مکان تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ کیونکہ میرے گھر میں چار مستقل مہمانوں کے لئے گنجائش نہ تھی۔ صرف مسٹر ہارنیمین کے لئے تو ایک دو کمروں کا انتظام کر دیتا۔ نئی دہلی میں رائے بہادر سردار زائر مسنگہ بہت مہربان دوست تھے۔ ان سے ملا تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنی ایک کوٹھی کا ایک حصہ دے دیجئے۔ چنانچہ مسٹر ہارنیمین کو اس کوٹھی میں جو جتنے منتر روڈ پر تھی منتقل کیا گیا۔ اور کام شروع ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کا نام اس زمانہ کی گورنمنٹ کے لئے ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی۔ ارٹھائی ہزار روپیہ کی ”ویکی ہیرلڈ“ چھاپنے کے لئے ایک شین خریدی گئی۔ کافی مقدار میں ہائپ بیا گیا۔ اور کام شروع ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کے قلم میں بہت ذرا تھا۔ پہلی اشاعت سے ہی ارٹھائی ہزار کی تعداد میں پرچہ بیسی گیا۔ مسٹر ہارنیمین کا نام بیسی کے اخبار پڑھنے والے طبقہ میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی ان کے نام پر ہی اخبار فروخت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اخبار بہت مقبول ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کے ایک جرنلسٹ دوست بیسی میں رسول ایجنٹ مقرر ہوئے۔ جو برکری کا تمام روپیہ خود کھا جاتے۔ ایک پیسہ دہلی نہ بھیجتے۔ روپیہ کے متعلق لکھا جاتا۔ تو جواب ہی نہ دیتے۔ ادھر مسٹر ہارنیمین کا ذاتی خرچ ایک ہزار روپیہ ماہوار سے کم نہ تھا۔ اخبار کے ابتدائی اخراجات کی مصیبت الگ تھی۔ یہ اخبار چند ہفتہ میں ہی دس ہزار روپیہ نکل گیا۔ اس سے زیادہ روپیہ صرف کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ اور اگر کرتا۔ تو یہ اخبار ”ریاست“ کہلے پھٹتا۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ جب تک بیسی کی فروخت کا روپیہ نہ پہنچے اخبار بند کر دیا جائے۔ بیسی سے روپیہ پہنچا کیونکہ ہر ممکن تھا۔ کیونکہ وہ روپیہ تو مسٹر ہارنیمین کے معتمد دوست ہر ہفتہ مہضم کرتے جا رہے تھے۔ ان تمام مشکلات میں ”ویکی ہیرلڈ“ بند کر دیا گیا۔ اور ضمانت کا جو روپیہ مسٹر ہارنیمین کے نام پر گورنمنٹ کے خزانہ میں جمع تھا۔ وہ مسٹر ہارنیمین نے لے لیا۔ جو شاید دو تین ہفتہ میں ہی ختم ہو گیا ہوگا۔ اور مسٹر ہارنیمین واپس بیسی چلے گئے۔ کیونکہ نہ ایڈیٹر ریاست ”آن کے لیے“ مفید ہو سکتا تھا۔ نہ وہ ایڈیٹر ریاست ”کے لیے“ اس زمانہ میں ایک ہفتہ اخبار کے لئے دس ہزار روپیہ بہت کافی سمجھا جاتا تھا۔ کاش مسٹر ہارنیمین میری رائے پر عمل کرتے ہوئے کفایت شعاری سے کام لیتے۔ تو یہ ”ویکی ہیرلڈ“ آج دہلی کے بہت بڑے روزانہ انگریزی اخبارات میں سے ہوتا۔ اور مسٹر ہارنیمین اس میں سے دس ہزار روپیہ ماہوار آسانی سے پیدا کر سکتے تھے۔

مسٹر ہارنیمین بہت صفات کے انسان تھے۔ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر برداشت نہ کر سکتے۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ فیاض اس قدر کہ اگر کوئی گدہ اگر ہاتھ پھیلائے۔ تو ایک روپیہ سے کم نہ دیتے۔ سفر میں قلیوں کو پانچ روپیہ سے کم دینا قلیوں کی حق تلفی سمجھتے۔ ہندوستان کے انتہائی مخلص اور مہربان زندگی بھر شادی نہ کی۔ گوشت کھانے کے اصولاً خلاف۔ شراب سے ان کو انتہائی نفرت تھی۔ دوستوں سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور بہت خوبیوں کے انسان تھے۔ مگر غیر ضروری فیاضی یا فضول خرچی کے باعث

زندگی بھربالی مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ملازمت میں اکثر ہفتہ وار تنخواہ لیا کرتے۔ کیونکہ ماہوار تنخواہ کی صورت میں اپنی تنخواہ دو روز میں ہی صرف کر دیتے۔  
اس فدا نے ہندوستان میں اگر یہ کمزوری نہ ہوتی۔ تو یہ اپنی زندگی آرام و راحت سے بسر کرتا۔ اور اسے اظلاس کی تکالیف برداشت نہ کرنی پڑتیں۔

## عشق اور شباب کی مجسوریاں

انگریزی کے ایک مصنف نے لکھا ہے۔ ”مجھے اُن گنگھاروں کے ساتھ ہمدردی ہے جو بے نقاب ہو گئے۔“ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا میں سب ہی گناہ کرتے ہیں۔ مگر گنگھار وہی قرار دے جاتے ہیں جن کے گناہوں کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اور وہ لوگ گناہ کرتے ہوئے بھی معصوم و بے گناہ رہتے ہیں۔ جو بے نقاب نہیں ہوئے۔  
گناہ اور گنگھاروں کی اس پرزیش میں ہندی کے فاضل اجل شاعر پیاری اپنے ایک دوہے میں فرماتے ہیں۔  
شباب اور سیلاب کی تباہ کاریوں کو دنیا میں کوئی روکنے والا پیدا نہ ہوا۔ ”چنانچہ دنیا میں شاید ہی کوئی نشان ایسا ہوگا کہ بشرطیکہ صحت کا اعتبار سے مردہ اور دماغی اعتبار سے بے حس نہ ہو جس نے شباب کے زمانہ میں ٹھوکریں نہ کھائی ہوں۔ اور جانا گا ندھی بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اپنے شباب کے زمانہ کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

شباب کے زمانہ کی غلطیوں یا مجسوریوں کے متعلق میرے مشاہدات بہت وسیع ہیں۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ جب کبھی کسی شخص کے شباب و محبت کے واقعات۔ محبت کی غلطیاں۔ مجسوریاں۔ نرسوائی۔ نتائج اور محبت کی سزا دیکھتا ہوں۔ تو میرے دل میں اس کے لیے بے حد ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

کئی برس کی بات ہے میں مہلین روڈ والے دفتر ”ریاست“ میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کہ ریلوے اسٹیشن سے ایک ٹیلی فون آیا۔ جس میں بتایا گیا۔ کہ پنجاب کی ریاست کے ایک سابق منسٹر ریلوے اسٹیشن پر گرفتار ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر ”ریاست“ فوراً ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ یہ منسٹر میرے دیرینہ لٹے والے تھے۔ میں کار میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ وہاں ڈیٹنگ روم میں گیا۔ تو دیکھا کہ دہلی کے ایک مسلمان ٹھیکہ دار اسپیکٹر پولیس منسٹر غلام سرور۔ وکٹیشیل۔ ایک بکنگ کارک اور وہ سابق منسٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ غلام سرور صاحب کو میں جانتا تھا۔ وہ ذرا بے سر ریاضت جیات اور سرسکندہ جیات کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور ذرا بے ریاضت جیات کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں جب پہنچا تو غلام سرور صاحب نے جو حالات بتائے وہ یہ تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب دیبا گنج میں رہتے ہیں۔ ان کا دفتر اور رہائش الگ الگ جگہ ہے۔ اور ٹھیکہ دار صاحب کی بیوی کا ٹھکانا ڈاکٹر کی ہیں۔ منسٹر صاحب کو دہلی میں آئے ہوئے اور ٹھیکہ دار صاحب کے گھر کا طواف کرتے ہوئے تین روز ہو گئے ہیں۔ اور تین روز تک ملازم کے ذریعہ خط و کتابت کرنے کے بعد منسٹر صاحب ٹھیکہ دار کی بیوی کو اسٹیشن کے ریشا ترنگ روم میں بلوائے ہیں کامیاب ہوئے۔ ٹھیکہ دار صاحب کے ملازم نے پہلے روز ہی ٹھیکے دار صاحب کو بتا دیا تھا کہ ایک صاحب اُن کے گھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ اور اسی ملازم کے ذریعہ

خط و کتابت جاری ہے۔ اور بیوی ملاقات کے لئے جگہ اور وقت مقرر کریں گی۔ چنانچہ بیوی بہانہ کر کے ڈولی میں جب اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئیں تو ٹھیکہ دار صاحب ان کے پیچھے کار میں (مع غلام سرور صاحب) ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ اور جب یہ خاتون منسٹر صاحب والے ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئیں۔ تو ٹھیکہ دار صاحب اور غلام سرور صاحب ریٹائرنگ روم کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ اور منسٹر صاحب کو اغور کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ منسٹر صاحب نے محبت کے جو خطوط اس خاتون کو لکھے تھے ٹھیکہ دار صاحب نے ٹمازم سے چل کر پڑے تھے۔ جو اس وقت ان کے پاس تھے اور کنگ کلرک اس الزام میں گرفتار تھے۔ انہوں نے خلافت قانون ایک دوسرے شخص کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ پر منسٹر صاحب کو ریٹائرنگ روہ میں پھرنے کا ٹکٹ دیا۔ اور یہ ٹکٹ ہر روز بدل لیا جاتا۔ کیونکہ کوئی شخص ۲۴ گھنٹہ سے زیادہ ریٹائرنگ روہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

اس تمام ڈرامہ میں دردناک حالت اس زوجہ خاتون کی تھی۔ جو محبت سے مجبور ہو کر اپنے شوہر سے جھوٹے ہوتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پہنچی۔ اپنے محبوب سے ملنے کے لئے کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو شوہر پولیس کو لے کر دروازہ پر پہنچ گئے۔ اب وہ دروازہ پر پولیس کنسٹیبل پہرہ دے رہا ہے۔ تاکہ یہ خاتون اندر ہی رہے۔ باہر نہ نکلا سکے۔ اور قریب کے کمرہ میں اس کے اور اس کے محبوب کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے "تحتیقاتی کمیشن" بھیجا ہوا ہے۔

میں نے جب تمام حالات سنے۔ تو اس خاتون کی نظربندی کی کیفیت سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی کیونکہ اس کا ایک ایک سیکنڈ اس طرح ہی ایک ایک سال کی طرح طویل اور ناقابل برداشت تھا۔ جس طرح جیل میں کسی پھانسی کا حکم سن چکے مجرم کے لئے رات بسر کرنی مشکل ہو جاتی ہے اور اس کا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر طویل اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ غلام سرور صاحب نے جب تمام حالات بیان کئے۔ اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ تو میں نے کہا۔ منسٹر صاحب کی حالت قابل شرم ہے ٹھیکہ دار صاحب کے ساتھ ہر شریف انسان کو ہمدردی ہونی چاہئے۔ کنگ کلرک اس جرم میں موقوف کیا جاسکتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ دردناک حالت اس خاتون کی ہے۔ جو شباب کی غلطیوں کے باعث موت سے زیادہ تکلیف دہ لمحے گزار رہی ہے۔ میری رائے میں یہ معاملہ یہاں ہی ختم کر دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ گو منسٹر صاحب تو تیار ہو جائیں گے مگر ٹھیکہ دار صاحب کی رسوائی اور ان کی بیوی کی عزت و آبرو میں مٹی پلید ہوگی۔

میری اس رائے پر ٹھیکہ دار صاحب اور غلام سرور صاحب دونوں نے اتفاق کیا۔ منسٹر صاحب نے معافی نامہ لکھوا لیا گیا۔ اور معافی نامہ میں انہوں نے لکھا کہ وہ آئندہ اس خاتون کو اپنی بہن سمجھیں گے۔ منسٹر صاحب مقدمہ کے خوف کے باعث بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی خواہش پر میں ان کو اپنی کار میں ہی اپنے ساتھ لے آیا۔ میں جب اسٹیشن سے روانہ ہونے لگا تو میں نے ٹھیکہ دار صاحب سے علیحدگی نہ کرنا کہا۔ دنیا میں ہر شخص سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور آپ کی بیوی سے جو غلطی ہوئی اگر آپ اپنی آئندہ زندگی خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔ تو میری رائے ہے کہ یا تو اپنی بیوی کو طلاق دے دیجئے۔ اور یا ایمان داری اور



کے ساتھ اُسے معاف کر دینے کا اُس پر یقیناً اثر ہوگا۔ اور وہ آئندہ زندگی میں پھر ایسی غلطی نہ کرے گی۔ اور دونوں صورتوں میں میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی بیوی کو اس جرم میں کوئی سزا نہ دیجئے۔ اُس نے اپنی غلطی کی رٹیاڑینگ روم میں ایک گھنٹہ بند رہ کر اتنی سزا جھکت لی ہے جو کئی بار چھائی بیٹے کی سزا اور تکلیف سے بھی زیادہ سخت ہے۔

جبکہ دار صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا۔ اور میرے زور دینے پر حلف لیا۔ کہ وہ اپنی بیوی پر اس جرم کے سلسلہ میں کوئی ظلم نہ کریں گے۔ چنانچہ وہ اپنی کار میں اپنی بیوی کو لے گئے۔ میں منسٹر صاحب کو لے کر اپنے دفتر میں آگیا۔ انکمپٹر صاحب کو تو والی چلے گئے اور بکننگ کلرک واپس اپنی ڈیوٹی پر لے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ ٹھیکہ دار صاحب نے واپس گھر جا کر اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیونکہ اُس کے بعد نہ ٹھیکہ دار صاحب کبھی ملے۔ اور نہ میں نے دریافت کرنا مناسب سمجھا۔ ہاں اگر وہ اپنے حلیفہ وعدہ پر قائم تھے۔ تو یقیناً انھوں نے اپنی بیوی کی غلطی کے سلسلہ میں اُسے مزید سزا نہ دی ہوگی۔

میں نابھہ میں تھا۔ اور میرے پاس ایک بہت اچھی نسل کی سیاہ رنگ کی خوبصورت کار پیل پیل گئیا تھی جو میں نے شملہ کے ایک انگریز سے خریدی تھی یہ گئیا جب جو ان ہوئی اور اس کے تہار کے دن تھے۔ تو محلہ کے گھٹوں نے اس کا پچھیا کیا۔ میں اس کو بہت محفوظ رکھتا اور دن رات دروازہ بند رہتا۔ تاکہ کوئی گھٹنا نہ آجائے اور میں نہ چاہتا تھا کہ اتنی اچھی نسل کی گئیا سے کوئی کم ذات ”گٹا“ تعلق پیدا کرے اور اس کے بچے بھی ایٹھوانڈین قسم کے ہوں۔ دروازوں کے بند ہونے کی صورت میں بھی ایک گٹا قریب کے مکان کی چھت پر سے اندر آگیا۔ اس کو مکان کے اندر دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اُس کو کہنے کو پکڑ لیا۔ اور اس کے گلے میں رسی کا بھندا ڈال کر صحن میں لٹکا دیا۔ تاکہ یہ عیش بازی کو محسوس جائے۔ اور پھر دوبارہ مکان میں آئے کی جرات نہ کرے۔ رسی کے ساتھ جب میں نے اسے لٹکایا۔ تو یہ دیوار کے ساتھ تڑپنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے رحم آگیا۔ میں نے اُس کی رسی کھول دی۔ اور مکان سے باہر نکال دیا۔ اس کو صحن میں لٹکنے سے یقیناً بہت اذیت پہنچی۔ اور میرا یقین تھا کہ اب یہ عیش بازی کو محسوس جائے گا۔ مگر اُس روز تو اُس نے میرے مکان کا رخ نہ کیا۔ اگلے روز میں نے دیکھا کہ وہ پھر پڑوس کی چھت پر سے اندر آگیا ہے۔ اُس کے مکان میں داخل ہونے پر میں نے اس کو بہت پیٹا اور مکان سے نکال دیا۔ مگر اس کے اگلے روز پھر دیکھتا ہوں کہ چھت سے کود کر اندر آگیا ہے۔ اور اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت رحم آیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ انسان ہی نہیں جانور بھی عشق کے ماتحت مجبور ہے جس میں چنانچہ میں نے پھر اسے کچھ نہ کہا۔ کیا کہ انٹر کاسٹ میرچ کی اجازت دے دی گئی۔

یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ ہر شخص شباب کے زمانہ میں غلطیاں کرتا ہے اور باوجود تنبیہ کئے جانے اور بار بار ٹھوکریں کھانے کے بھی باز نہیں آتا۔ مگر یہی شخص جب عمر میں زیادہ ہو جائے تو نوجوانوں کو عشق و محبت سے دور رہنے کی نصیحتیں شروع کر دیتا ہے۔ اور نہیں سوچتا کہ تو اُس نے جانی ہیں کسی کی کوئی نصیحت سنی۔ اور نہ یہ سنیں گے جن کے سامنے وہ نصائح کے دریا بہا رہا ہے۔ کیونکہ شباب اور عشق کے باوجود وہ خود مجبور تھا۔ لہذا جن کو نصیحتیں کر رہا ہے۔ وہ بھی مجبور ہیں۔

میری رائے میں جو لوگ اپنی اولاد یا اپنے عزیزوں کو صرف نصاب کے ذریعہ محبت و محبت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سعی قطعی لا حاصل ثابت ہوتی ہے۔ شباب اور محبت نصیحت کی محتاج نہیں۔ ہاں اگر یہ ممکن ہو کہ جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس کے متعلق محبت کرنے والے کو غیر ذرا شعاری کا یقین دلایا جاسکے۔ تو محبت کرنے والے کے دل میں نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔

## عورت اور شباب جیل میں

انگریز سنٹرل جیل کے بڑے دروازہ سے اندر داخل ہوں۔ تو اندر جاتے ہی داہنی طرف کو سب سے پہلے سپرنٹنڈنٹ جیل کا دفتر ہے۔ اس دفتر کے بالکل پچھلی طرف اسے کلاس کے پولیسیل قیدیوں کے لئے کوٹھی بنا ڈال کر ہے۔ اور اس کمرہ کے ساتھ زنانہ جیل کی دیوار ملتی ہے۔ یعنی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر اور زنانہ جیل کے درمیان اسے کلاس کے قیدیوں کے لئے جگہ ہے۔

ہر سال ۱۹۰۰ میں جیل گیا۔ تو ناگہم کے اسی کلاس والے کو کھٹی ناکمرے میں رکھا گیا۔ اس کمرہ میں مجھ سے پہلے سی۔ پی کے قریب قریب تمام موجودہ وزرارہ چکے تھے۔ جن کے حالات جیل کے قیدی اور افسر مجھے سنایا کرتے۔

اس زنانہ جیل میں جس کا دروازہ مردانہ جیل کے اندر کی طرف ہے، ایک سو کے قریب قیدی عورتوں کی تھیں۔ ان قیدی عورتوں کی عمر عام طور پر پندرہ اور پچیس برس کے درمیان تھی کیونکہ ان میں سے نوے فی صدی عورتیں اپنے شوہروں کو زہر دینے کے جرم میں قید تھیں۔ جس کا باعث یہ تھا۔ کہ ان کے شوہران پر ظلم کرتے۔ یہ ان مظالم سے عاجز آجاتیں۔ اور ظلم سے چھٹکارہ چاہنے کے لئے ان کے پاس صرف تین ہی راستے تھے۔ یا تو کسی غیر کے ساتھ گھر سے نکل جائیں یا اپنے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کر دیں اور یا خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کر لیں۔ جو خودکشی کر لیتیں ان کے جیل میں آنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ لیکن جو اپنے شوہروں کو زہر دیتیں۔ ان کو جیل میں قید کی سزا بھگتنی پڑتی۔ چنانچہ یہ بچاری پندرہ پندرہ سو سو برس کی عمر میں (کیونکہ سی۔ پی میں لڑکیوں کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی جاتی ہے) جیل کے اندر داخل ہوتیں۔ اور شباب کا زمانہ جیل کی نذر کر کے پچیس پچیس برس کی عمر میں رہا کی جاتیں۔

عورت آخر عورت ہے۔ اور شباب آخر شباب۔ یہ دونوں جاب ہے جیل میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میرے کمرہ اور زنانہ جیل کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ اور اس دیوار کے نیچے بارش کا پانی جاسے کے لئے ایک بڑا سوراخ تھا۔ جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ جیل کی یہ عورتیں اور لڑکیاں دن بھر خوش فعلیاں کر تھیں۔ کبھی روتیں۔ کبھی فہشتے مار کر ہنستیں۔ کبھی چنچتیں۔ کبھی رڑتیں۔ کبھی جھگڑتیں۔ ان کی ان خوش فلیوں کی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ جیل میں مجھے سوائے آرام کرنے کے کوئی کام نہ تھا۔ جو شخص زندگی بھر مصروف رہا ہو۔ اس کے لئے جیل میں وقت نہ کاٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ میں دن رات کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا۔ اور جب کتابوں سے اگتا جاتا تو سجا کرتا۔ ایک روز اپنے خیالات میں غرق تھا۔ تو میں نے

قدرت کے اس احسان کو محسوس کیا کہ میرے ادبی ذوق۔ موسیقی شناس ذہن۔ حسن پرستی۔ اور آرٹ پسند طبیعت کا خیال کرتے ہوئے جیل میں بھی مجھے ایسی جگہ دی گئی۔ جہاں عورت کی آواز (جو خود موسیقی ہے) میرے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جیل کی ان خواتین کی شرارتوں کی آواز سے کئی کئی گھنٹہ لطف اندوز ہوا کرتا۔ اور میرا وقت گنت جاتا۔

لڑکیاں فطرتاً شریعہ ہوتی ہیں۔ اور ان کی اس فطری شرارت پر جیل کیونکر غالب آتا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ یہ دیوار کے نیچے کے سوراخ میں سے جھانک تاک کی کوشش کرتی ہیں۔ اور شرارتاں کبھی کبھی دیوار کے اوپر سے کنکر پھینک دیتی ہیں۔ میں ان کی اس شرارت پر ہنس دیتا تھا۔ ان بچاریوں کو قابل رحم اور قابل ہمدردی سمجھتا۔ چنانچہ جیل سے رہائی حاصل کرنے کے بعد میں نے قیدی عورتوں کے متعلق متعدد مضامین لکھے اور ان کے مشکاک گورنمنٹ کو بھیجے۔ ان مضامین میں یہ لکھا گیا تھا کہ عورتوں کو پھانسی دینے اور پانچ برس سے زیادہ عرصہ تک قید رکھنے کا سلسلہ موقوف کیا جانا چاہئے۔

بہر حال یہ ہے۔

میں ایک روز کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور میرے پہرے پر یو۔ پی کا ایک نوجوان سپاہی بیٹھا تھا اتنے میں زمانہ جیل کی طرف سے کسی لڑکی نے شرارتاں ایک کنکر پھینکا۔ جب یہ کنکر میرے قریب آکر پڑا تو اس نوجوان پر بے سپاہی نے جو میرے پاس بیٹھا تھا۔ اس شرارت کا جواب فوراً ہی شرارت کی صورت میں یہ دیا۔ کہ اس نے سنگترے کا ایک چھلکہ (جو وہاں پٹا تھا) لے کر زمانہ جیل کی طرف پھینک دیا۔ یہ چھلکہ جب زمانہ جیل میں پہنچا تو وہاں اسے جیل کی وارڈن نے دیکھ لیا۔ وارڈن نے داروغہ غنی لیڈی داروغہ کے پاس رپورٹ کی۔ اور معاملہ سپرنٹنڈنٹ جیل تک پہنچ گیا۔ چنانچہ تحقیقات شروع ہوئی تو بتایا گیا کہ یہ چھلکا اے کلاس کے کمرے کی طرف سے پھینکا گیا ہے۔ اے کلاس میں صرف میں ہی اکیلا قیدی تھا۔ جس پر کہ یہ الزام لگایا جاسکتا تھا۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ ایک پارسی بزرگ کرنل موڈی تھے۔ جو نہایت شریف اور میرا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے۔ اور میری سہولت اور آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ اگلے روز جب آپ میرے پاس آئے تو خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد آپ نے کہا۔

”سردار صاحب میرے پاس زمانہ جیل سے ایک شکایت پہنچی ہے۔ کہ وہاں آپ کے کمرے کی طرف سے سنگترے کا ایک چھلکا پھینکا گیا۔ یہ شکایت بہت ہی افسوس ناک ہے۔“

میں نے کرنل موڈی سے جب یہ الفاظ سنے تو میں شرم کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ حالانکہ اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ میں نے کرنل موڈی سے کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس قدر غیر ذمہ دار رہے وقت نہیں ہوں۔ کہ چھلکا پھینکتا۔ ہاں مجھے علم ہے کہ میں نے پھینکا۔ اور جس شخص نے پھینکا میں نے بھی کسی بُری نیت سے نہیں پھینکا صرف شرارتاً پھینکا۔ اگر آپ مجھ سے اخلاقاً وعدہ کریں آپ اس جرم میں چھلکا پھینکنے والے کو کوئی سزا نہ دیں گے اور دل سے معاف کر دیں گے۔ تو میں سا کا نام بھی بتانے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ کرنل موڈی نے وعدہ کیا کہ وہ چھلکا پھینکنے والے کے

خلافت کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ جھلکا پھینکنے والا لڑکا بھی کرنل موڈی کے پاس ہی کھڑا تھا جس نے کہا اس لڑکے نے یہ شرارت کی تھی مگر شرارت کے جواب میں دفعتنا بطور ڈیفنس کیونکہ پہلے زنانہ جیل کی طرف سے کسی لڑکی نے شرارت انگیز پھینکا تھا۔ اصل واقعہ بتانے پر کرنل موڈی اور دوسرے تمام لوگ ہنس پڑے۔ اور معاملہ ختم ہو گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عورت اور مصحاب دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ تو وہ ایک ایسا سیلاب ہے جس کو جیل کی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔ اور ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے قول کے مطابق اس سیلاب کی کمرشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو یہ تباہی کے سامان پیدا کرے۔

## لیڈری اور اخبارات

دفتر ریاست "اجیرنی دروازہ سے باہر جی۔ بی روڈ پر تھا۔ ایک روز مسٹر آپن سابق ایڈیٹر "مسلم آؤٹ لک" لاہور ایک دوسرے انگریز کے ساتھ دفتر ریاست میں آئے مسٹر آپن نے دوسرے انگریز سے تعارف کرایا کہ یہ میجر وینرزن ہیں اور دہلی سے انگریزی کا ایک روزانہ اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر آپن کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ نسل کے اعتبار سے انگریز تھے اور مذہب کے اعتبار سے مسلمان مسٹر آپن بہترین لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور روپے پیسے کے معاملہ میں بھی دھبیج معافی میں جڑ لٹ گئے یعنی تنخواہ آنے سے پہلے قرض لے کر خرچ کر ڈالتے تھے میں نے محسوس کیا کہ مسٹر آپن اس ناواقف شخص کو اپنا تختہ مشق بنانا چاہتے ہیں۔ اس بچائے کے پاس دس ہزار روپیہ ہوگا۔ ایک آدھ مہینہ میں اس کو نکال کر دیں گے۔ میں نے اس نئے شخص سے ہمدردی کے لہجہ میں پوچھا۔ "آپ انگریزی کے روزانہ اخبار کے لئے کتنا روپیہ صرف کر دیں گے؟" میرے اس پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس نے پندرہ بیس ہزار روپیہ کہا تو میں اس سے کہوں گا۔ کہ یہ روپیہ ضائع کرے۔ مگر اس نے جواب دیا چند لاکھ روپیہ۔ یہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا کہ یہ کون حضرت ہیں جو کی لاکھ روپیہ اخبار جاری کرنے پر صرف کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مزید باتیں ہوئیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ میجر وینرزن فورج کے وٹیاوڈ اعمر اور ضلع منٹگمری کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ہزار ہا ایکڑ زمین دی ہوئی ہے ان کے بنار خور و ضلع منٹگمری میں سیلوں تک سنگترے اور مالے کے باغ ہیں۔ سینکڑوں اچھی نسل کے گھوڑے ان کے پاس ہیں جو گھوڑ دوڑ کریں کام آتے ہیں بعض گھوڑوں کی قیمت دس دس بیس بیس ہزار روپیہ بلکہ پچاس پچاس ہزار روپیہ تک ہے۔ اور ان کے لئے چند لاکھ روپیہ خرچ کر دینا بہت معمولی بات ہے۔ میجر وینرزن اور مسٹر آپن کے بعد سے لے کر کامقصد یہ تھا۔ کہ میں ان کے لئے مکان حاصل کرنے اور اخبار کے شائق دوسری ضروریات کے سلسلہ میں ان کی ادوا و دوا اور شوروں۔ میجر وینرزن نے تو میڈن ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اور مسٹر آپن نے ڈولینڈ ہوٹل میں۔ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے چائے پی اور چائے پینے کے بعد میجر وینرزن نے خواہش ظاہر کی۔

میں رات کو کھانا ان کے ساتھ میٹن ہوٹل میں کھاؤں تاکہ ہم اخبار کے متعلق تفصیل کے ساتھ باتیں کر سکیں۔

میں رات کو کھانے کے وقت میٹن ہوٹل گیا۔ میجر وینزن اپنے کمر میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اور دسکی پی رہے تھے۔ میں پہنچا اور بیٹھا تو آپ نے کہا: ”آپ دسکی نہیں گئے۔“ میں نے جواب دیا کہ گرجھے دسکی لینے کی عادت نہیں۔ اور چھ چھ اوٹک مجھے شراب کو کبھی چھوئے گا بھی اتفاق نہیں ہوتا۔ مگر میں کبھی بھی تھوڑی سی پنی لینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ دسکی میرے گھر پر دوستوں کے لئے تو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ مگر میں خود دسکی نہیں بتا کبھی کبھی تھوڑی سی رائیڈ پی لیتا ہوں۔ میرے اس جواب کے بعد آپ نے میرے لئے براڈی کا ایک ٹیک منگایا۔ اور اس پیگ میں سوڈا ڈالتے ہوئے کہا: ”جو لوگ شراب نہیں پیتے۔ مہری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے دل میں اخلاص۔ سچائی اور پاکیزگی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دل کی صفائی کے لئے شراب سے بڑھ کر کوئی شے دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوئی۔“ میں نے جواب دیا کہ شراب تھوڑی مقدار میں جتنی مفید ہے زیادہ مقدار میں اتنی ہی نقصان کا باعث ہے۔ اور چونکہ لوگ اپنی طبیعت پر کنٹرول نہیں کر سکتے زیادہ پی جاتے ہیں۔ اسی لئے اس دیوتاؤں کے پینے والی شے (سنکرت میں دیوتا کو شراب اور شراب کو سراپاں یعنی دیوتاؤں کے پینے والی شے) کی مذہب نے ممانعت کر دی۔ اور اسے حرام قرار دیا۔ میجر وینزن نے مجھے بتایا کہ حضرت رح کے ایک خلیفہ نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا تھا کہ جب کبھی تمہارا معدہ خراب ہو۔ تھوڑی سی شراب پی لیا کرو۔ چنانچہ عیسائیوں میں شراب پینے کی مذہب ممانعت نہیں ہے۔ اور اس کا پینا جائز ہے۔ کھانے پر مختلف تین ہوتی رہیں۔ اور اخبار کے متعلق بھی میں نے ان کو بتایا کہ کیا کچھ کرنا چاہئے۔

میجر وینزن بہت ہی خلص اور فیاض شخصیت تھے۔ روپیہ کو مٹی کے برابر سمجھتے۔ ان کو نہ تو جرمز سے کوئی ایچی تھی نہ سیاسیات سے۔ ایک پیسہ کی جگہ ایک روپیہ صرف کرتے۔ اخبار کے جاری ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے دفتر میں بھاری بھاری تنخواہوں پر کئی انگریز اور ہندوستانی ملازم بھرتی کر لئے۔ ان کے اخبار جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو نائٹ بننے کی خواہش تھی۔ سرٹر اسپن نے ان کو پتی پڑھا دی تھی۔ کہ اگر انہوں نے ایک سال بھی انگریزی کا روزانہ اخبار جاری رکھا۔ تو یہ نائٹ (یعنی سر) ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے مجھے باتوں باتوں میں بتایا کہ ان کے اخبار جاری کرنے کا مقصد کیا ہے۔ اس پر میں نے ان کو صاف کہہ دیا۔ کہ اخبار جاری کرنے کے کئی برس بعد تو وہ نائٹ ہو سکتے ہیں۔ ایک سال میں نائٹ ہونا مشکل ہے۔ اور جس طریقہ کے ساتھ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس طرح تو سال میں چار پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو جائے گا۔

میجر وینزن اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ روپیہ بے تحاشا صرف کرتے رہتے۔ پانچ پانچ ہزار روپیہ کی ڈننگ شین کے لئے بیس بیس ہزار روپیہ دیدیا۔ دو دو سو روپیہ ماہوار کے ملازم کی تنخواہ پانچ پانچ سو روپیہ مقرر کر دی گئی۔ اور جو کام چار آدمی کر سکتے تھے۔ اس کے لئے دس آدمی رکھ لئے گئے۔ مجھ سے جب کبھی رائے جیتے میں ان کو تجارتی کفایت شعاری کی رائے دیتا۔ مگر اس کا ان کی طبیعت پر فی اثر نہ ہوتا۔ ایک تودہ طبعاً فیاض اور فضول خرچ دوسرے نائٹ کا خطاب حاصل کرنے اور لیڈر

بننے کی خواہش چنانچہ ایک سال میں خطاب اور لیڈری کی توقع پوری نہ ہوئی روپیہ ایسٹ میٹ کے مقابلہ پر آٹھ گنا زیادہ صرف ہو گیا۔ فوجی ختم کے آدمی نئے ایک روز محسوس کیا کہ خطاب حاصل کرنے کے لئے یہ غلط قدم ہے۔ اور اس احساس کے بعد آپ نے کئی لاکھ روپیہ صرف کرنے کے بعد اخبار بند کر دیا اور آپ واپس اپنی زمینداری پر منگمری چلے گئے۔

بھیر وینرفن کے کوئی اولاد نہیں نہ تھی۔ کروڑوں روپیہ کی جائیداد چھوڑ کر انتقال کیا۔ اس جائیداد کی وارث غالباً آپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بہت عرصہ ہو گیا میں نے اخبارات میں پڑھا کہ بھیر وینرفن کی بیوہ اپنی زمینداری کے کام کے سلسلے میں جب منگمری سے کراچی جاری تھیں تو راستہ میں کسی بے رحم نے روپیہ کے لالچ میں اس خاتون کو قتل کر دیا۔ یہ پڑھ کر مجھ بہت افسوس ہوا۔

بعض لوگ اخبارات صرف لیڈر بننے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے بھیر وینرفن کا اخبار جاری کرنا عبرت کا باعث ہونا چاہیے کیونکہ اخبار ایک ایسی تجارت ہے جس میں بہت کافی روپیہ صرف کرنے کے بعد کسی سناٹے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اور لیڈری حاصل کرنے کے لئے اخبار جاری کرنا تو ایک حماقت ہے۔

لیڈری کی خواہش رکھنے والے اصحاب کے لئے بہتر ہے کہ وہ کبھی بھی اپنا اخبار جاری نہ کریں۔ ان کا ایک اخبار جاری کرنا درجنوں دوسرے اخبارات کو دشمن بنانے کا باعث ہوگا۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ جو روپیہ وہ اپنے ذاتی اخبار کے نکالنے پر صرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ روپیہ دوسرے اخبارات کے ایڈیٹروں کی دعوتوں اور قاطعوں تو ضیع پر صرف کریں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر اخبار ان کا دوست اور ان کی لیڈری میں معاون ثابت ہوگا۔

## رشتوں اور سفارش

ہندوستان کی مملازمتیں۔ ہندوستانیوں کے مقدمات۔ ہندوستان کی ٹھیکہ داریاں یا دوسرے کاروبار وغیرہ ان سب کا دار و مدار زیادہ تر رشتوں اور سفارشوں پر ہے۔ یعنی کوئی مقدمہ جو تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ یا تو سفارش ہے۔ یا رشتہ۔ ملامت حاصل کرنی ہو تو اس کے لئے سفارش کرائی جاتی ہے۔ یا رشتہ دی جاتی ہے۔ اور کوئی کاروبار کرنا ہو تو اس کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے کس کس کو رشتہ دی جائے گی۔ اور کس کس کو سفارش کے ذریعہ اپنے قابو میں کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ دونوں بد دیاختیاں ہماری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہیں۔ اگلے سے لے کر اعلیٰ تک سب رشتوں اور سفارش میں مبتلا ہیں۔ اور نہ تو سفارش کراتے اور رشتہ دینے والا اس میں کوئی عیب سمجھتا ہے نہ سفارش ماننے والا۔ حالانکہ غور کیا جائے۔ تو سفارش کرایا یا سفارش ماننا اتنا ہی عیب ہے جتنا کہ رشتہ دینا یا لینا میرا اندازہ ہے کہ ہر ٹپسے آدمی کے پاس اہل غرض سفارش کراتے کے لئے ہر روز درجنوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ اور یہ ٹپسے آدمی ہر شخص کو ہی لٹل تلیاں دے کر

ان کرتاریکی میں رکھنے ہوئے ان کے لئے نقصان اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ سفارش کرانے والا مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنا کام نکالنے کے لئے انتظام کر لیا۔ اب اسے کوئی فکر نہ کرنی چاہیے۔ مگر سفارش کرنے والا بھی کافی سمجھتا ہے کہ اس نے اہل عرض کو مطلع نہ کیا دے کر اسے بے وقوف بنایا۔ میں سفارشوں کے سلسلہ میں چند واقعات عرض کرتا ہوں جن سے معلوم ہو گا کہ بڑے لوگ جن کے پاس ہر روز درجنوں اہل عرض سفارش کے لئے آتے ہیں۔ اور جن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ہر شخص کی سفارش کر سکیں کیونکہ اہل عرض کو بے وقوف بناتے ہوئے ان کے لئے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

میرا ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ اور ضمانت نہ ہونے کے باعث میں جیل میں تھا۔ میری غیر حاضری میں ”ریاست“ کے پرنسٹروپلنٹر مسٹر ظفر احمد مقدمہ کے باعث بہت پریشان تھے۔ تو اتفاق سے ان کے ایک قریبی رشتہ دار جو پنجاب گورنمنٹ کے ایک بہت بڑے عہدہ پر ہیں۔ دہلی تشریف لائے اور ظفر صاحب سے ملے۔ تو باتوں باتوں میں ظفر صاحب کو انھوں نے بتایا کہ دہلی کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر زیندر سنگھ (جن کی عدالت میں یہ مقدمہ تھا) ان کے بہت گہرے ذاتی دوست ہیں۔ اس بات چیت میں ہی انھوں نے ظفر صاحب کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کہا کہ فکر نہ کیجئے۔ وہ سردار بہادر زیندر سنگھ سے سفارش کرینگے۔ اور سفارش کیے بغیر دہلی سے نہ جائیں گے۔ اس بات چیت کے بعد اگلے روز یہ بزرگ ظفر صاحب سے ملے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ وہ سردار بہادر زیندر سنگھ سے ملے تھے۔ انھوں نے سفارش کر دی ہے۔ اور سردار بہادر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دیوان سنگھ کو بری کر دیں گے۔ کیونکہ دیوان سنگھ بے قصور ہے۔ ظفر صاحب کو ان ایسے سفارش بازوں کا تجربہ نہ تھا۔ میں جب ضمانت پر جیل سے باہر آیا۔ تو مجھے حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ اس قسم کی سفارشوں کے جسم پر اپنے آپ کو کبھی نہیں چھوڑا میں نے اپنے ذرا نیچے سے ایک دوست کی معرفت پتہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ سفارش کرنے والے بزرگ ایک لیڈر عرصہ سے سردار بہادر زیندر سنگھ سے ملے ہی نہیں۔ سفارش کرنے کا تو سوال ہی کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ظفر صاحب کو بتایا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اور اگر ہم اس سفارش کے رحم پر رہتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اس کے بعد ظفر صاحب اپنے ان بزرگ سے ملے۔ اور ان پر ظاہر کیا کہ ہمیں اصل حالات اور آپ کا بھوٹ بولنا معلوم ہو چکا ہے۔ تو یہ حضرت شرمندہ ہوئے۔ اور اب جب بھی ظفر صاحب سے ملے ہیں تو شرم محسوس کرتے ہوئے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔

میرا مقدمہ چل رہا تھا۔ ہائیکورٹ میں پہلے تو یہ حکم دیا کہ اس مقدمہ کی مسٹریس کی عدالت میں سماعت ہو۔ مگر مسٹریس نے ہائیکورٹ کو رپورٹ کی کہ چونکہ آپ کے دیوان سنگھ کے ساتھ ذاتی تعلقات ہیں۔ اس لئے آپ مقدمہ کی سماعت کرنا نہیں چاہتے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چیف جج نے اس پورٹ پر مقدمہ گورکھاؤں بھیج دیا۔ مقدمہ کے گورکھاؤں جانے کا سپیکر کو علم نہ تھا۔ ایک روز میں کسی کام کے لئے ریلوے اسٹیشن پر گیا۔ وہاں سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے سامنے کھڑا ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا کہ دہلی کے ایک بہت بڑے ٹھیکہ دار جو خطاب یافتہ سردار بہادر بھی ہیں۔ مجھے ملے۔ آپ نے کچھ تھوڑی سی دسکی بھیجی ہوئی تھی۔ دسکی پینے کے بعد انسان فراخ دلی بنے ساتھ اظہار محبت کرتا ہے۔ آپ جب ملے تو آپ

ایڈیٹر "ریاست" سیٹ گئے۔ اور اظہارِ مہمِ مددی اور اظہارِ محبت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "مسٹر ایمر میرے گھر سے دوست ہیں۔ وہ کل مجھ سے ملے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دورانِ جنگ میرا گہرا ذاتی دوست ہے۔ آپ خیال رکھئے۔ اور مسٹر ایمر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مقدمہ میں ضرور بری کر دیں گے ان سردارِ جی کو علم نہ تھا کہ مقدمہ کئی روز جوئے گڑ گھاؤں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور مسٹر ایمر نے مقدمہ کی سماعت سے انکار کر دیا ہے۔ آپ نے حسبِ عادت ایڈیٹر "ریاست" پر احسان جتانے کے لیے بلاؤہ جھوٹ بولا۔ ایڈیٹر "ریاست" اُس سے اگلے روز مسٹر ایمر سے ملا۔ اور ان سردارِ بہادر کی ننگی بازئی کے متعلق پوچھا تو مسٹر ایمر نے بتایا کہ آپ کئی ماہ سے ان سردارِ بہادر سے ملے تک نہیں۔ اور سردارِ بہادر کا ارشاد سونی صدی جھوٹ ہے۔

ایک دوست جیل میں ہسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ یہ دہلی تشریف لائے اور لیے تو انھوں نے بتایا۔ کہ آپ ایک ممبر اسمبلی سے ملے دہلی اس لیے آئے تھے کہ وہ ممبر اسمبلی مسٹر بیہم سین چھوڑ کر جیل خانہ جات پنجاب سے سفارش کر دیں۔ میں نے باتوں باتوں میں اس دوست پر ظاہر کر دیا۔ کہ آپ ایسی سفارشات پر پھر دسمہ نہ کیجئے۔ یہ ممبرانِ اسمبلی لوگوں کو غلط توقعات دلانے اور ناپاکیوں میں گھیر کر جھوٹ بولنے میں شائقِ جھوٹے ہیں کیونکہ ہر ممبر اسمبلی کے پاس روزانہ چالیس پچاس سفارش کرانے والے جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ اتنے لوگوں کی سفارش کریں۔ چنانچہ ایک روز یہ ممبر اسمبلی میرے ہم سفر تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو انھوں نے بتایا اور اتر کر کیا کہ سفارش کرانے والے چالیس پچاس اصحاب ہر روز آتے ہیں۔ ان کو اگر صاف جواب دیا جائے تو یہ دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مجبوراً سب کی خانہ چڑی کرتے ہوئے سب سے مل کر لی جاتی ہے۔ اور کسی کی بھی سفارشی نہیں کی جاتی۔ یا زیادہ سے زیادہ سفارشی خط لکھ دیا جاتا ہے۔ جس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سفارشی خط لکھنا ایک رسم سی ہے۔ جس کو ہر ممبر اسمبلی ادا کرتا ہے کیونکہ اگر یہ رسم بھی ادا نہ کی جائے تو دوسرے دشمن ہو کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ریاست کے ایک ملکٹ کلکٹر مقدمہ میں گرفتار تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص چند منٹ کے لیے بھی ملے۔ تو وہ دوست ہوتا ہے۔ اور اس "دوست" سے ہر قسم کا کام لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مقدمہ کے سلسلہ میں یہ درجنوں ممبرانِ اسمبلی اور بڑے بڑے لوگوں سے مل چکے تھے جن سے تو بڑی بہت راقبیت تھی۔ تاکہ مجسٹریٹ کے پاس ان کی سفارش کی جائے۔ ان ممبرانِ اسمبلی اور بڑے لوگوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے ان کو سفارش کرنے کا یقین نہ دلایا ہو اور یقین دلانے کے بعد سفارش کی ہو۔ یہ صاحبِ باب جب بھی ملتے ہیں اپنے "دوستوں" کا شکوہ کرتے ہیں۔ مگر محسوس نہیں کرتے۔ کہ دوستی اور واقفیت میں فرق ہے۔ اور واقفیت سے دوستی کی ترقی کرنا ممکن ہی نہیں۔

رشتوں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ رشتوں کا پریمی (جس کو ہائے ایک دوست چاندی کی چوٹی کہا کرتے ہیں) ہر خستہ سے سخت دل کو نرم کر سکتا ہے۔ مگر سفارشیوں پر پھر دسمہ کرنے والے یقیناً غلط توقعات لاد رہے غلط امیدوں پر تباہ ہو رہے ہیں۔ اور ان کا سفارشی کی کوشش کرنا یقیناً ایسا گناہ ہے۔ جو گناہ بھی ہے۔ اور جس کا کوئی اچھا نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔



## اہل فن اور ان کی قدر ناشناسی

اخبار ریاست کے جاری ہونے سے پہلے میں ایک بار ریاست حیدر آباد گیا۔ اور حیدر آباد پہنچے پہلے ایک ہفتہ کے قریب حضور صاحب دناڈیڑ جہاں کو گوردینر سنگھ کا وصال ہوا میں قیام کیا۔ حضور صاحب کے گوردوارہ میں شبد کیرتن کرنے کے لیے ایک صاحب بھائی تھمن سنگھ راگی مقرر تھے جن کا خاندان کئی پشت سے یہی کام کرتا تھا۔ یہ بھائی تھمن سنگھ موسیقی کے فن میں ماہر تھے۔ اور انھوں نے خود ہی ایک ساز تیار کیا تھا جس پر ساڈھ ستر کے قریب تار تھے۔ اور جو ستر بٹا ہونے کے اعتبار سے سارنگی یا ستار سے زیادہ دلکش تھا۔ بھائی تھمن سنگھ کے پاس بڑے بڑے لوگوں کے سینکڑوں سٹریکیٹ تھے۔ اور ان سٹریکیٹوں میں مرحوم سٹریکیٹ آئی سی ایس (جنھوں نے سکھ ازم کے متعلق مشہور تصنیف ”سکھ دیسجن“ لکھی) اور سردار بہادر بھائی کا بہن سنگھ وغیرہ کے سٹریکیٹ بہت اہم تھے میں جتنے دن حضور صاحب نے ملی البصیح بھائی تھمن سنگھ کی موسیقی سے غلط ہوا۔

بھائی تھمن سنگھ نے بتایا کہ میرے وہاں جانے سے عرصہ پہلے سردار بہادر بھائی کا بہن سنگھ مرحوم ہمارا جناح کے تابق جو بعد میں ریاست پٹیالہ میں فارن منسٹر تھے) حضور صاحب گئے۔ اور آپ بھائی تھمن سنگھ کی موسیقی سے بہت خوش ہوئے تو آپ نے پٹیالہ کے فارن منسٹر ہونے کے بعد مرحوم ہمارا چ پٹیالہ سے بھائی تھمن سنگھ کی بہت تعریف کی جس پر ہمارا چ پٹیالہ نے بھائی تھمن سنگھ کو پٹیالہ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اس دعوت پر بھائی تھمن سنگھ پٹیالہ گئے۔ وہاں سرکاری جہان خانہ میں قیام کیا۔ اور کئی ہفتہ کے انتظار کے بعد آپ کو موتی باغ محل (جہاں مرحوم ہمارا چ پٹیالہ رہا کرتے تھے) میں طلب کیا گیا۔ بھائی تھمن سنگھ جب موتی باغ پہنچے تو آپ کا ہمارا چ پٹیالہ سے تعارف کرانے کے لیے مزار بہادر بھائی کا بہن سنگھ وہاں موجود تھے۔ چنانچہ بھائی تھمن سنگھ بھی ویٹنگ روم میں بھائی کا بہن سنگھ کے پاس جا بیٹھے۔ ویٹنگ روم میں بھائی کا بہن سنگھ اور بھائی تھمن سنگھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو ساتھ والے کمرے کے گدھے (پنجاب کی ریاستوں ناہیم۔ پٹیالہ۔ جہیند اور اضلاع فیروز پورہ لدھیانہ میں عورتیں برسات کے زمانہ میں دیہاتی رقص کرتی اور گاتی ہیں۔ جسے وہاں گدھا کہا جاتا ہے) کی آواز آ رہی تھی۔ بھائی تھمن سنگھ نے ایک لمبے ڈی سی سے دریافت کیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ تو لمبے ڈی سی نے بتایا کہ سری حضور ہمارا چ صاحب گدھا ہیں مشغول ہیں۔ اور دیہات کی عورتیں بٹائی لگتی ہیں۔ جو رقص کر رہی ہیں۔ اور گارہی ہیں۔ بھائی تھمن سنگھ بہت بڑے آرٹسٹ اور موسیقی کی باریکیوں سے واقف تھے۔ آپ نے ہمارا چ کا گدھے میں مصروف ہونا اپنی طبیعت پر ایک بار سانسوں کیا۔ اور آپ نے بھائی کا بہن سنگھ سے کہا۔

”بھائی صاحب۔ موسیقی کا علم بہت ارفع علم ہے۔ جس کی کوئی موسیقار تو جن برداشت نہیں کر سکتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جو ہمارا چ گدھا سن سکتا ہے۔ اس کو راگ کی باریکیاں سننا موسیقی کی توہین ہے۔ اس لیے مجھے معاف کیجئے۔ میں ہمارا چ پر اپنی راگ دیا کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں وہاں چلا جاؤں“

سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ نے بھائی تھن سنگھ کو بہت سمجھایا کہ دلیان ریاست ہر قسم کے اشتغال میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اور ہمارا جہ کرگنا شنائے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر بھائی تھن سنگھ نہ مانتے۔ واپس وہاں خانہ میں آگئے۔ اور آپ نے اگلے روز واپس حضور صاحب جانے کی تیاری کر لی چنانچہ شام کو بھائی کا ہن سنگھ وہاں خانہ میں پہنچے۔ اور جب بھائی تھن سنگھ کسی صورت سے بھی ہمارا جہ کرگنا شنائے پر رضامند نہ ہوئے۔ تو آپ نے ہمارا جہ کی طرف سے بھائی تھن سنگھ کو چند ہزار روپیہ بطور رخصتانہ دے دیا۔ اور بھائی تھن سنگھ واپس حضور صاحب چلے گئے۔

یہ تو درست ہے۔ کہ اہل فن مالی اعتبار سے ہمیشہ پریشان رہے۔ کیونکہ فن کی قدر کرنے والے اس دنیا میں کیاب ہیں۔ مگر اہل فن کے لئے فاقہ کشی کرنے کے معنی ابلہ پر اپنے فن کی توہین برداشت کرنا زیادہ تکلیف دہ ہے۔ جس کا نتیجہ ہے۔ کہ اچھے شعرا۔ اچھے جرنلسٹ۔ اچھے مصور۔ اچھے بہت تراش اور اچھے موسیقار و آرٹسٹ اپنی خودداری کے باعث کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ اور فاقہ کشی ہی میں اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔

## ٹیلی فون پر شرارتیں یا مذاق

آٹومیٹک ٹیلی فون جہاں رازداری کے اعتبار سے سائنس کی ایک نعمت ہے۔ وہاں شرارتیں یا مذاق کرنے کے لحاظ سے اسے ایک ٹھیکیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں اپنے چند واقعات عرض کرتا ہوں۔

”ریاست“ کا دفتر اجیری دروازہ کے باہر تھا۔ اور اس زمانہ میں میرٹھ کا مقدمہ سازش چل رہا تھا۔ اس مقدمہ میں لالہ کدرا ناتھ سہگل۔ اور سردار سوہن سنگھ جو شہر وغیرہ کئی دوست ماخوذ تھے جن سے ملنے کے لئے میں ہینہ میں ایک آدمہ ہار میرٹھ جایا کرتا۔ اور اس مقدمہ کے انچارج وکیل ٹپنہ کے ایڈوکیٹ مسٹر دیو کی پرشاد سنہا ممبر مرکزی اسمبلی تھے۔ مسٹر دیو کی پرشاد سنہا ناب زادہ بیانت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے ہم زلف تھے۔ یعنی بیگم بیانت علی (جو اس زمانہ میں ایک عیسائی خاتون مس پنت تھیں اور بعد میں جن کی شادی بیانت علی خاں صاحب سے ہوئی) مسٹر سنہا کی بھتیجی ہیں۔ مسٹر سنہا ایڈیٹر ”ریاست“ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ آپ۔ آپ کی فیملی یا س پانت (بیگم بیانت علی) وغیرہ جب کبھی میرٹھ سے دہلی تشریف لاتے تو یہ ایڈیٹر ”ریاست“ کے مکان پر ہی قیام کرتے۔ یہ سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا۔

ایک بار تین روز کی مسلسل چھٹیاں تھیں۔ اور سپیشل راج میرٹھ کی عدالت (جہاں مقدمہ سازش کی سماعت ہو رہی تھی) بھی بند تھی۔ مسٹر سنہا صبح اپنی فیملی کے دہلی آگئے اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے ہاں مقیم ہوئے۔ آپ کو دہلی آئے دو روز ہوئے تھے اور ابھی چھٹیوں کا ایک روز باقی تھا۔ کہ مسٹر سنہا شام کے وقت میرٹھ واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے آپ سے کہا کہ ابھی کچھ ہی ایک روز اور نہ پتہ

میرٹھ جا کر کیا کر دے۔ کئی شام کو چلے جائیے مگر مسٹر سنہا نے مانے۔ اور آپ نے کہا کہ آپ ضرور جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کھانے پر بھی ان سے کہا گیا کہ آپ نہ جلیے۔ مگر آپ مسلسل انکار کرتے رہے۔ اس پر ایڈیٹر ”ریاست“ نے آپ سے کہا کہ چاہے کچھ ہو آپ کو نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور مسٹر سنہا نے کہا کہ چاہے کچھ ہو۔ آپ ضرور جا بیٹھیں گے۔ کھانا ختم ہوا۔ تو آپ نے اپنی کار میں سامان رکھوایا۔ اور آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر میرٹھ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب آپ چلنے لگے۔ تو آپ سے پھر کہا گیا کہ نہ جلیے۔ رات کے نو بج چکے ہیں۔ دو گھنٹہ کا سفر ہے۔ رات کو گیارہ بجے میرٹھ پہنچنے کے تکلیف ہوگی۔ کل چلے جائیے مگر مسٹر سنہا نے مانے اور روانہ ہو گئے۔

ان کے دفتر ”ریاست“ سے روانہ ہونے کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ کو شرارت سوجھی۔ اس نے جنرل کی پریس کی چوکی کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں ایک ہیڈ کنسٹیبل بیہوش تھا۔ اسے کہا۔ ”میں کو توالی سے لال رہا ہوں۔ ابھی ایک موٹر کار سیاہ رنگ کی جس کا فلاں نمبر ہے ۱۰۱۰ نمبر مسٹر سنہا کی کار کا فلاں پل کی طرف آ رہی ہے۔ اس کو فوراً روکو۔ میرٹھ کی طرف جانے منت دو کیونکہ اس کار میں کوکین کا شہ ہے۔“ ہیڈ کنسٹیبل ”بہت اچھا حضور“ کہہ کر اور ٹیلیفون بند کر کے پل کے راستہ میں کھڑا ہو گیا۔ چار پانچ منٹ کے بعد اسی نمبر اور سیاہ رنگ کی کار پہنچی۔ تو اسے ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ کو توالی سے حکم پہنچا ہے۔ آپ کی کار میں کوکین ہے آپ آگے نہیں جا سکتے۔

مسٹر سنہا حیران کہہ کر ان کی موٹر میں کوکین کہاں سے آ گئی۔ یہ معاملہ کیسا ہے۔ آپ نے ہیڈ کنسٹیبل سے کہا کہ آپ میرٹھ پہلی اور مقدمہ سازش میرٹھ کے انچارج وکیل ہیں۔ اور مقدمہ کی پیروی کے لئے میرٹھ جا رہے ہیں۔ مگر ہیڈ کنسٹیبل نے ایک نہ سنی۔ اور جواب دیا کہ آپ چاہے دایسر لے بھی ہوں نہیں جا سکتے۔ کیونکہ کو توالی سے آپ کو روکنے کے لئے حکم ملا ہے۔ مسٹر سنہا کی منٹ ٹنگ اس ہیڈ کنسٹیبل کو سمجھاتے رہے کہ دو موٹر کو بانے دے مگر وہاں کون سنتا تھا۔ آخر مسٹر سنہا نے دفتر ”ریاست“ میں ٹیلیفون کیا کہ یہ ناگہانی مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اور میں کو توالی میں ٹیلیفون کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پریس سے کہوں۔ کہ ان کی کار کو نہ روکا جائے۔ مسٹر سنہا کی اس کیفیت کو سن کر ایڈیٹر ”ریاست“ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ اور بتایا کہ خود اس نے ہی یہ شرارت کی ہے چنانچہ ان سے کہا گیا کہ ٹیلیفون کو بند کر دیجئے۔ ہیڈ کنسٹیبل کو ابھی حکم دیا جاتا ہے۔ مسٹر سنہا نے ٹیلیفون بند کر دیا تو ایڈیٹر ”ریاست“ نے پھر اس جہاں کھل کے ٹیلیفون کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجنے پر ہیڈ کنسٹیبل نے ٹیلیفون اٹھایا تو اسے کہا گیا۔ میں کو توالی سے بل رہا ہوں۔ ڈپٹی صاحب نے حکم دیا ہے کہ کار جو روکی ہوئی ہے۔ اس کو جانے دو۔ غلطی سے اس کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔“ ہیڈ کنسٹیبل نے ”بہت اچھا حضور“ کہا۔ اور سنہا صاحب میرٹھ تشریف لے گئے۔

لدھیانہ کے سردار گوبل سنگھ خالصہ (جو میرٹھ پہلی تھے) ایڈیٹر ”ریاست“ کے مکان پر مقیم تھے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ رات کو کھانے کے بعد بائیں شہرے ہوئیں۔ تو اس کے بعد بطائیف کا دور شروع ہوا۔ لطیفہ بازی میں رات کے تین بج گئے۔ اس وقت ہمیں شرارت سوجھی۔ ”ہندوستان ٹائمز“ کا آخری فرمہ اس وقت تیار ہوتا تھا اور

چار پانچ بجے کے قریب پرچہ شائع ہو جاتا تھا۔ سردار گپال سنگھ نے ایک بننے کی گھبرائی ہوئی آوازیں  
 ہندوستان ٹائمز کے نائٹ ایڈیٹر سے ٹیلی فون پر ذیل کی گفتگو کی۔

سردار گپال سنگھ: ”بابو جی، بابو جی۔ غازی آباد کے سٹیشن پر بسب سے کتنے آدمی مرے ہیں۔ اور کتنے  
 زخمی ہوئے ہیں۔“

نائٹ ایڈیٹر نے کیا غازی آباد میں بسب پھٹا ہے۔“

سردار گپال سنگھ: ”بابو جی آپ اکھبار نکالتے ہیں۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہیں۔ میں نے چار مرے ہوئے دیکھے ہیں  
 پتہ نہیں حکمی کتنے ہوئے۔ پولیس پر بسب پھینکا گیا۔“

یہ کہتے ہی سردار گپال سنگھ نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ رات کے تین بجے تھے۔ اور چار بجے اخبار شائع  
 ہونا تھا۔ ہندوستان ٹائمز والوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا کہ اس خبر کی تصدیق کرتے۔ اور اتنی اہم  
 خبر سے اپنے ناظرین کو محروم بھی نہ کر سکتے تھے۔ پہلے صفحہ کی دوسری صفحہ کی خبریں نکال کر چار کالموں کی  
 سرخبری کے ساتھ خبر شائع کی گئی۔ ”غازی آباد میں بسب پھٹا۔“ چار مرے گئے۔ ”صح ہندوستان ٹائمز“  
 آیا۔ ”تویہ سنسنی خیز“ خبر تھی۔ اس خبر کے شائع ہونے کے چار روز بعد ہندوستان ٹائمز نے غلط خبر کی  
 اشاعت پر یو پی گورنمنٹ سے معافی مانگی۔ اور اس معافی کو اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیا۔ اس خبر  
 کے شائع ہونے کے بعد ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر پوتھن جو زت جب ملے۔ تو ہندوستان ٹائمز  
 کی تازہ ترین خبروں کی داد دی گئی۔ اور جب اس شہزاد کا اُن کو حکم ہوا۔ تو آپ نے سردار گپال سنگھ  
 کو داد دی۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سیکریٹری مرحوم چودھری عبدالغنی نے خلافت کمیٹی اور پبلک لائین سے  
 بد دل ہو کر دہلی میں بزنس شروع کر دیا تھا۔ وہ امپورٹ اور اکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ شام کو آپ  
 ہر روز دفتر ”ریاست“ میں تشریف لایا کرتے۔ بہت خوبیوں کے خلص دوست تھے۔ گھنٹوں باتیں ہوا کرتیں۔  
 ایک روز آپ نے اپنی آواز بدل کر ایڈیٹر ”ریاست“ کو ٹیلی فون کیا کہ ہمارا جوبیکا نیر کے پراویٹ سیکریٹری  
 دہلی آئے ہوئے ہیں۔ رائل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اور ایک ضروری معاملہ کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے ہمارا ج  
 نے ان کو بھیجا ہے۔ تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں رائل ہوٹل کے کمرہ نمبر میں ان سے مل جاؤں۔  
 میں چودھری صاحب کی آواز پہچان سکا۔ حالانکہ ہر روز ملتا کرتے۔ اس ٹیلی فون کے بعد میں فوراً کاریں رائل ہوٹل  
 پہنچا۔ رائل ہوٹل کے مالک لالہ ٹھاکر داس پرانے سٹے والے اور شملہ کی ایک ریاست کے رہنے والے تھے۔  
 میں ہوٹل پہنچا۔ تو بہت تپاک سے ملے انھوں نے پوچھا کہ میں کس غرض کے لئے ہوٹل آیا ہوں۔ میں تمام  
 معاملہ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ ان کو بھی میرے ہمارا جوبیکا نیر کے سیکریٹری سے ملنے کا علم نہ ہو۔ میں نے  
 کہا کہ ایک دوست کے متعلق اطلاع تھی۔ کہ وہ یہاں آٹھ نمبر کے کمرہ میں ہیں۔ اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ لالہ  
 ٹھاکر داس نے بتایا کہ آٹھ نمبر کا کمرہ تو کئی روز سے خالی ہے۔ میں واپس آ گیا۔ شام کو چودھری صاحب  
 آئے تو آپ نے پوچھا کہ رائل ہوٹل میں کسی گزری کیا جواب دیتا۔ یہی کہا کہ میں آپ کی آواز پہچان گیا

تھا۔ اس لئے رائیل ہوٹل گیا ہی نہیں۔

ایک دن دو پہر کا وقت تھا۔ ہمیں شرارت سوچی۔ سردار نانک سنگھ آئرن مرچنٹ رجسٹری کی پبلک لائٹ میں بہت دھنسی لیا کرتے تھے۔ اور یہاں کے سکھوں میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کو ایک دوست نے ٹیلی فون پر آواز تبدیل کر کے انگریزی میں اس طرح بات کی جس طرح کوئی کم انگریزی جانتے والا جاپانی ٹوٹی بھوٹی انگریزی اور جاپانی لہجہ میں بات کرتا ہے۔ سردار نانک سنگھ سے کہا گیا۔  
”میں جاپان کا ٹیڈ منسٹر ہوں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات کی سیر کر رہا ہوں۔ میرا مذہب بدھ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں گوردانک بہت بڑے ریخار مر ہو چکے ہیں۔ اور سکھوں کا ٹیل دہلی میں بھی ہے۔ اس ٹیل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

سردار نانک سنگھ ٹیلی فون پر ”جاپانی ٹیڈ منسٹر“ کی یہ خواہش سن کر بے حد خوش ہوئے۔ شام کو چھ بجے گوردوارہ دیکھنے کا وقت مقرر ہوا۔ سردار نانک سنگھ نے ٹیلی فون پر دہلی کے تمام بڑے بڑے سکھ ٹھیکہ داروں اور سرداروں کو یہ مسرت افزا اطلاع دی۔ تمام ٹھیکہ دار خوش ہوئے گویا کہ تمام کا تمام جاپان سکھ مذہب قبول کرنے والا ہے۔ شام کو چھ بجے ایڈیٹر ”ریاست“ اپنے اس دوست کے ساتھ جس نے آواز بدل کر سردار نانک سنگھ کو ٹیلی فون کیا تھا۔ موٹر پر چاندنی چوک سے ہوتا ہوا گوردوارہ سین گنج کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ کئی بڑے بڑے ٹھیکہ دار اور سردار ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے گوردوارہ کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ ان سرداروں کو ”جاپانی ٹیڈ منسٹر“ کے انتظار میں کھڑے دیکھ کر تکلیف تو ہوئی مگر ہم اپنی شرارت کی کامیابی پر مسرور تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بزرگ کتنے بچے تک ”جاپانی منسٹر“ کا انتظار کرتے رہے۔

کئی برس ہوئے ایڈیٹر ”ریاست“ نے ایک مقامی روزانہ انگریزی اخبار کے ایڈیٹر شپ خالق کیا جس طرح آجکل تیسری عالمگیر جنگ اور روس کے ایٹم بمب کا چرچا ہے۔ اُس زمانہ میں جرمنی اور ہٹلر کی دہشت تمام دنیا پر طاری تھی۔ اور جرمنی کے نئے جنگ جاری کرنے کی افواہیں گرم تھیں۔ ایڈیٹر ”ریاست“ اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک مقامی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کا ٹیلی فون آیا کہ کوئی کام نہ تھا اس لئے گپ بازی کر جاتا ہے کیونکہ آپ بھی کام سے فارغ ہوتے تو ٹیلی فون پر باتیں شروع کر دیتے۔ آپ نے پوچھا کہ میرے پاس اور کون بیٹھا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ جرمنی کے انفارمیشن بیورو سے ایک صاحب ہندوستان آئے ہیں۔ ان کی غرض اس ملک میں جرمنی کے حق میں پراگندہ اکرانے کی ہے۔ سنا ہے۔ لاہور کے اخبارات میں ساڈہ ستر ہزار روپیہ نقد تم کرائے ہیں۔ اب یہ دہلی کے اخبارات کے ایڈیٹروں کو مل رہے ہیں۔ ان سے بات کر رہا ہوں۔ ان کا بیان تو یہ ہے کہ جرمنی کی صنعت و حرفت کے حق میں مضامین لکھے جائیں۔ دراصل ان کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کا سیاسی پراگندہ کیا جائے تاکہ آئندہ جنگ میں عوام جرمنی کے حق میں ہوں۔ میری یہ اطلاع سن کر ایڈیٹر صاحب کی ہچکچاہٹ کھل گئی۔ یہ اخبار کے خود مالک نہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ میں ان کی ملاقات کا دفتر ”ریاست“ میں انتظام کر دوں۔ اور ان کے اخبار کے مالک کو علم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ

فی الحال ٹیلی فون بند کر دیجئے۔ میں ان سے مشورہ کرنے کے بعد ابھی آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان کو ٹیلی فون پر کہا۔ کہ وہ صاحب اب تروہاں جا رہے ہیں۔ جہاں وہ مقیم ہیں۔ ان کی خواہش ہے۔ کہ آپ کل دوپہر ان سے سیل ہوٹل میں ملیں۔ اور پتے ان کے ساتھ کھائیں۔ تاکہ اس وقت باتیں بھی ہو سکیں۔ ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ وہ اگلے روز دوپہر کو ایک بجے سیل ہوٹل میں پہنچے۔ اور انتظار شروع ہوا۔ ڈیڑھ بج گیا۔ دو بج گئے۔ اڑھائی بج گئے۔ اور تین بج گئے۔ مگر جرنل کے "انفرسٹیشن آفیس" کا کوئی جتہ نہیں۔ آپ نے بار بار ہوٹل کے کلرک سے دریافت کیا۔ مگر وہاں سے لاٹلی کا اظہار ہوا۔ آخر تین بجے ٹھیک ٹیلی فون کیا۔ اور کہا۔ وہ صاحب اب تک نہیں پہنچے۔ میں کیا جواب دیتا۔ میں نے بتایا کہ مذاق کیا تھا۔ آپ بہت ناراض ہوئے۔ اور آپ کی ناراضی کا سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا۔

## شہرت کا غلط شوق و لذت کا باعث

مردم ہمارا جانا بھہ کو لٹریچر اور سیاست کا بہت شوق تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سیاسی دلچسپیاں ہی ان کی معرزی کا باعث ہوئیں۔ آپ جب کبھی کوئی مضمون انگریزوں یا انگریز پرستوں کے خلاف لکھا دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے اور انگریزوں کی تعریفیں میں کوئی کلمہ برداشت نہ کر سکتے۔ اور ہمارا ج کے تمام دوست ان کی اس نفس کو بچانے لگتے۔

لاہور سے گورنمنٹی کا ایک ہفتہ دار اخبار "ہفتہ سیک" شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر ماسٹر چندا سنگھ تھے۔ ماسٹر چندا سنگھ کو سکھوں کی پروگروڈنٹ پارٹی چیف خالصہ دیوان اور ہمارا چٹیا لکھ کے مخالفین میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور اس نے ہمارا جانا بھہ اس اخبار کو وقتاً فوقتاً مالی امداد دیا کرتے تھے۔ ماسٹر چندا سنگھ میں بہت بڑی کمزوری یہ تھی۔ کہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی ان کے اخبار میں مضمون لکھتا تو یہ اسے اپنے نام کے ساتھ شائع کرتے۔

ہمارا جانا بھہ کے ایک دوست سردار سوہن سنگھ راہی گوجر خاں، غلطی راہی پٹی ایس رہتے تھے۔ یہ بھی اچھے لکھنے والوں میں سے تھے۔ اور کبھی کبھی اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ سردار سوہن سنگھ راہی نے ایک مضمون لکھا جس میں انگریزوں کی حکومت پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اور ہمارا چٹیا لکھ بھی بے نقاب کیا گیا تھا۔ سردار سوہن سنگھ نے اس مضمون کی ایک کاپی گوجر خاں سے براہ راست ہمارا ج کو نا بھہ پہنچ دی۔ اور ایک کاپی شایع کرنے کے لئے اخبار "ہفتہ سیک" کو بھیجی۔ چونکہ یہ دونوں کاپیاں بیک وقت گوجر خاں سے پوسٹ ہوئیں۔ ہمارا جانا بھہ کے پاس کاپی "ہفتہ سیک" میں مضمون شائع ہونے سے پہلے چھ روز پہلے پہنچ گئی۔ مگر ماسٹر چندا سنگھ کو علم نہ تھا کہ سردار سوہن سنگھ مضمون کی ایک کاپی ہمارا جانا بھہ کو بھی براہ راست پہنچ چکے ہیں۔

سردار سوہن سنگھ کا یہ مضمون "ہفتہ سیک" میں بطور ریپورٹ شائع ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے خود یہ مضمون لکھا۔ مضمون بہت اچھا تھا۔ مضمون کے شائع ہونے کے پانچ چھ روز بعد

ماسٹر چندا سنگھ اس مضمون والے دہن پرچے ساتھ لے کر نا بھگے تاکہ ہمارا جہ سے کچھ روپیہ بطور امداد حاصل کریں۔ دہاں کیسٹ باؤس میں بطور سرکاری مہمان مقیم ہو گئے۔ اور ہمارا جہ سے انٹرویو ہوا۔ تو باتیں کرتے ہوئے ہمارا جہ لے گیا۔

”بھائی صاحب۔ وہ جو مضمون اس ہفتہ پختہ میوک میں بطور لیڈر شائع ہوا ہے۔ بہت ہی زوردار اور اچھا ہے۔“

ہمارا جہ لے ایچی انتہائی کہا تھا اور وہ اپنی بات ختم نہ کر سکے تھے۔ کہ بات کاٹتے ہوئے ماسٹر چندا سنگھ لے گیا۔

”سرکار کیا عرض کر دیں۔ یہ مضمون ایک دن اور ایک رات میں لکھا گیا۔ کئی کتابوں کو دیکھنا پڑا۔ اس مضمون کے باعث میرے سر میں کئی گھنٹہ تک درد رہا۔ مجھے خود غرض ہے۔ کہ مضمون ایسا اچھا لکھا گیا۔“

ماسٹر چندا سنگھ کا یہ جواب سن کر ہمارا جہ کے دل میں ماسٹر صاحب کے لیے بے حد نفرت پیدا ہوئی کیونکہ ہمارا جہ کہ یہ مضمون سردار سوہن سنگھ راہی ایک ہفتہ پہلے بھی چکے تھے۔ اور ان کو علم تھا کہ مضمون کے لکھنے والے سردار سوہن سنگھ ہیں۔ نہ کہ ماسٹر چندا سنگھ۔ مگر ہمارا جہ اخلاقاً بہت بلند تھے۔ انھوں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ ان کے پاس مضمون کی کاپی مضمون کے چھپنے سے پہلے سردار سوہن سنگھ کو جہاں سے بھیج چکے تھے۔ ماسٹر چندا سنگھ کی یہ غلط بیانی اور کبر کیٹر کی کمزوری ہمارا جہ کے دل میں انتہائی نفرت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اور اس نفرت کا نتیجہ تھا۔ کہ ہمارا جہ نے اس کے بعد اپنا دست امداد کھینچ لیا۔

”ریاست“ کے جاری ہونے کے بعد آج تک اس میں درجنوں مترجم کام کرنے پر مقرر ہوئے جن کے ذمہ فرض صرف یہ تھا۔ کہ وہ ایڈیٹوریل۔ رازدردن پردہ۔ نظائر۔ کارٹون۔ اقتباسات اور مقالات راجن کو راقم الحروف لکھنا یا مرتب کرنا) کے علاوہ باقی کے مضامین انگریزی یا دوسری زبانوں کے رسائل سے ترجمہ کرتے۔ یا جب کبھی ایڈیٹر ”ریاست“ دہلی سے غیر حاضر ہوتا تو ایڈیٹوریل کے کاموں کی یا تو یہ لوگ خود خانہ چری کر لیتے۔ یا کسی دوسرے مقامی روزانہ یا ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر سے لکھوا لیتے۔ مگر یہ واقعہ بے حد دلچسپ ہے۔ کہ ان مترجموں میں سے نصف کے قریب ضرور ایسے تھے جنھوں نے ہمیشہ ہی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے دوسرے لوگوں کے پاس ڈنکیں ماریں۔ اور ”ریاست“ کے ایڈیٹوریل نوٹوں کو اپنے ساتھ منسوب کیا اور بلاوجہ داد و تحسین کی۔ اور ان کی غلط بیانی سے متاثر ہو کر اگر کسی دوسرے اخبار نے ان کو اپنے ہاں بطور ایڈیٹر رکھ لیا۔ تو یہ چند روز میں ہی بے نقاب ہو گئے۔ اور جو لوگ ان کی غلط بیانی کے باعث ان کے مداح تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں ہی ان کے لیے نفرت و حقارت پیدا ہوئی۔

کئی برس کی بات ہے۔ راقم الحروف نے ایک کتاب دیکھی جس پر مصنف کا نام ”حسن عزیز جاوید ایڈیٹر ریاست“ لکھا تھا۔ اس کتاب کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ یہ حضرت کئی برس پہلے صرف چند ہفتہ دفتر ”ریاست“ میں ترجمہ کا کام کرتے رہے۔ اور اپنے آپ کو ایڈیٹر ”ریاست“ لکھ رہے ہیں۔ میں ایسی چھوٹی

چھوٹی باتوں کا نوٹس نہیں لیا کرتا۔ مگر مجھے اس شرمناک جسات پر غصہ آیا۔ میں نے کتاب پر پتہ دیکھ کر ان کو نوٹس دیا۔ تو آپ نے اپنے کیریئر کی کمزوری کا اقرار کرتے ہوئے بہت کجاست کے ساتھ معافی طلب کی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایڈیٹر سب ایڈیٹر مترجم میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ اور اگر کسی اخبار میں چند روز کام کریں۔ تو اس اخبار کا نام غلط طور پر استعمال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اگر دوسرے کے لکھے ہوئے مضامین کو اپنے نام سے منسوب کرنا ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ تو اس غلط فہمی کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی اگر عوام میں کسی لکھنے والے کے متعلق یہ افواہ پھیل جائے کہ یہ خود نہیں لکھتا بلکہ کسی دوسرے سے لکھواتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ایک واقعہ سنئے۔ مسٹر ساغر نظامی کا ابتدائی دور تھا۔ اور یہ حضرت سیاب کے شاگرد ہونے کے باعث بن رات سیاب صاحب کے ساتھ رہتے۔ منگرم صاحب کا کلام بھی اخبارات میں شائع ہوتا۔ مگر لوگوں میں یہ افواہ تھی کہ ساغر صاحب ڈمی شاعر ہیں۔ یہ خود شعر نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ سیاب صاحب اور ساغر صاحب دہلی تشریف لائے۔ اور خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لیے بھیما احسان الحق صاحب کے مکان بھلی والوں دائرہ بازار میں گئے۔ تو وہاں باتوں باتوں میں بھیما احسان نے صاف کہہ دیا۔ کہ ساغر ڈمی شاعر ہیں۔ اور ان کی نظیں سیاب صاحب لکھتے ہیں۔ بھیما احسان کے اس الزام کی سیاب صاحب نے تردید کی۔ مگر بھیما نے اسے آخر ساغر صاحب کو مصرعہ طرح دیا گیا کہ وہ اس پر اشعار لکھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ساغر صاحب نے چند منٹ میں نظم کہہ دی۔ اور تمام حاضرین کو ساغر صاحب کی قابلیت کا اقرار کرنا پڑا اور ساغر صاحب کے متعلق اس غلط افواہ کی بنیادیں تو وہی وقت بالکل ٹکڑ ٹکڑ ہو گئیں۔ جب سیاب صاحب کی زندگی میں سیاب صاحب اور ساغر صاحب کے تعلقات کشیدہ ہوئے اور کشیدہ تعلقات کے زمانہ میں بھی ساغر صاحب اخبارات میں نظیں لکھتے رہے۔

دوسروں سے نظیں غزلیں اور مضامین لکھوا کر اپنے نام سے اخبارات یا رسائل میں شائع کرانا یا ان کو شاعروں اور ادبی جلسوں میں پڑھنا انتہائی ذلت کا باعث ہے۔ کیونکہ مٹی کا سونپا سونے کا ٹی ہونا ممکن نہیں۔ شہرت کی خواہش رکھنے والوں کے لئے بہتر ہے کہ وہ خود اشعار کہنے اور مضامین لکھنے کی کوشش کریں تاکہ وہ فی الحقیقت بطور شاعر یا مضمون نویس درست و صحیح عزت حاصل کر سکیں۔

## سوامی شرودھانند اور خواجہ حسن نظامی

میں میٹرک پریٹھ والے دفتر ”ریاست“ میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ سوامی رامانند رجو سوامی شرودھانند کی خدمت کی تحریکوں کے (نچارج تھے) کاٹلی فون آیا کہ سوامی شرودھانند کو ابھی ایک سلمان نے قتل کر دیا ہے۔ سوامی شرودھانند بہت ہی بلند انسان تھے اور ایڈیٹر ”ریاست“ پر بہت ہر باقی فرمایا کرتے تھے۔ یہ اظہار ایڈیٹر ”ریاست“ کے لئے خلاف توقع اور بے حد امنوں کا باعث تھی۔ میں فوراً سوامی جی کے نیا بازار والے مکان پر پہنچا۔ اس وقت واقعہ کہہ رہے ایک گھنٹہ سے کم عرصہ ہوا تھا۔ سوامی جی مقتول حالت میں خون سے لبت



پت لکڑی کے تخت پوش پر پڑے تھے۔ قاتل عبدالرشید حراست میں تھا۔ ہزار ہا لوگ جمع تھے اور شیخ  
ذہیر الحق انپکٹر پولیس ابتدائی تحقیقات میں مصروف تھے میں نے جب عبدالرشید کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا۔  
کیونکہ ایک یا دو سال پہلے یہ دفتر ”ریاست“ میں کتابت کا کام کر چکا تھا۔ عبدالرشید نے جب مجھے دیکھا تو  
میں نے سلام کیا۔ یہ ہجوم کے باعث بہت ہی پریشان تھا اور اس کا رنگ زرد تھا میں نے حالات کو دیکھا  
تو میں سمجھ گیا کہ یہ قاتل عبدالرشید کی مذہبی دیوانگی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کی دیوانگی کی علامات ایک عرصہ پہلے ذیل  
کی صورت میں دفتر ”ریاست“ میں ظاہر ہو چکی تھیں اور وہ واقعات یہ تھے۔

افغانستان میں کنگ امان اللہ کے حکم سے چند احمدی سنگسار کر دئے گئے جو وہاں اپنے احمدی خیالات کی  
تبلیغ کرتے تھے۔ سنگساری کے ان واقعات کو سن کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں حیران تھا کہ کیا موجودہ زمانہ میں  
بھی انسان انسانوں کو مذہب کے نام پر پتھر مار مار کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس واقعہ کو بیان کرتے  
ہوئے افغان گورنمنٹ کے خلاف ایک سخت ایڈیٹوریل نوٹ لکھا اور یہ نوٹ اس کا تب عبدالرشید (سوامی  
شرودھانن) کے قاتل (کو کتابت کے لئے دیا۔ عبدالرشید نے ابھی چند سطروں کی کتابت کی تھی کہ وہ میرے پاس  
آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرہ پر غصہ کے جذبات تھے اور اس نے کہا ”آپ کو شرعی معاملات میں دخل  
دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق سنگساری جائز ہے اور احمدیوں کو ضرور سنگسار کیا جانا چاہئے  
تھا کیونکہ یہ اپنے مرزا قادیان کے نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔ میں یہ کافرانہ نوٹ نہیں لکھ سکتا“ میں نے جب اس کو  
انتہائی غصہ کی حالت میں دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا دماغی توازن قائم نہیں۔ میں نے اس سے نوٹ  
واپس لیکر دوسرے کا تب کو دے دیا اور اس کا حساب کر کے اس کو اپنے دفتر سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد  
عبدالرشید کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ ہجرت کی تحریک میں یہ افغانستان چلا گیا تھا اور  
وہاں سے جب ہماچل واپس ہندوستان آئے تو یہ بھی واپس آ گیا اور آئے ہوئے وہاں سے پوشیدہ طور پر ایک ریوالور  
اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس ریوالور سے ہی اس نے سوامی شرودھانن کو قتل کیا۔

سوامی شرودھانن جی کے مکان پر جب عبدالرشید حراست میں تھا تو جمع میں لوگ اس قتل کی ذمہ داری خواجہ  
حسن نظامی پر ڈال رہے تھے اور کہا جا رہا تھا کہ قاتل خواجہ حسن نظامی کا ایجنٹ اور بیچا ہوا ہے۔ چونکہ میں عبدالرشید  
کے حالات سے واقف تھا یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے جرأت کے ساتھ  
کہا کہ ”جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ میں قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ شخص مذہبی بائبل میں مبتلا ہے اور یہ  
اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی قتل میں حصہ لے سکیں“ جس صورت  
میں کہ لوگ علانیہ طور پر خواجہ حسن نظامی پر قتل کا الزام لگا رہے تھے میرے یہ الفاظ ان کے لئے خلاف توقع  
اور انتہائی ناخوش گذارے مگر سوامی راما منند اور شیخ ذہیر الحق انپکٹر پولیس کی موجودگی اور میرے سکیم یا غیر  
مسلح ہونے کے باعث یہ کچھ کہہ نہ سکے اور خاموش ہو گئے۔ چنانچہ چند روز کے بعد شیخ ذہیر الحق نے میری گفتگو  
کا ذکر میری عدم موجودگی میں خواجہ حسن نظامی سے کیا تو ان کے اور ان کے دوستوں کے دل پر میری حق و صداقت  
کی آواز اور جرأت کا بہت اثر ہوا اور شیخ ذہیر الحق بعد میں جب کبھی ملتے وہ اس واقعہ کا ذکر کیا کرتے حالانکہ  
ایسا مذہبی کی بات یہ ہے کہ جس نے اس وقت جو کچھ کہا وہ کسی شخص کو خوش یا ناراض کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔

میں محسوس کرتا تھا کہ خواجه حسن نظامی پر غلط اتہام لگایا جا رہا ہے اور قتل کی ذمہ داری صرف عبدالرشید کی گردن پر ہے جسے میں مذہبی دیوانگی میں مستلذا دیکھ چکا تھا۔

میں اس کے بعد واپس اپنے مکان پر آ گیا اور اگلے روز سوداچی جی کا جن ازہ اٹھا جس میں لاکھوں ہندو شامل ہوئے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد خواجه نظامی پر کسی نے گولی چلائی اور گولی خواجه صاحب کو ترنہ لگی اس گولی سے ان کے خسر خواجه محمد صادق ہلاک ہو گئے جو خواجه صاحب کے انتظار میں ان کے موٹر گریج کے پاس کھڑے تھے۔ چونکہ رات کا وقت تھا اور رات بہت تاریک تھی خواجه صاحب یا ان کا کوئی ہمراہی قاتل کو نہ پہچان سکا کیونکہ گولی کچھ فاصلہ سے آئی تھی اور گولی چلانے کے بعد قاتل مرزا غالب کے مقبرہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد مجھے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع ملی میں نظام الدین گیا۔ میرے جانے سے پہلے بھتیجا احسان الحق اور واحدی صاحب وغیرہ دوست پہنچ چکے تھے اور اگلی صبح کو ”الامان“ کے مولوی منظر الدین وغیرہ مسلم لیگی بھی پہنچ گئے جنہوں نے خواجه حسن نظامی کو یہ ٹیپٹھان شریف کی کہ آپ پولیس کو ایسا بیان دیں جس سے یہ ثابت ہو کہ قاتل کوئی ہندو تھا۔ میں یہ تماشا دیکھتا رہا اور جب یہ ہیرا پھیری جاری تھی تو میں رہ نہ سکا۔ میں خواجه صاحب کو الگ لے گیا۔ اور کہا کہ خواجه صاحب انسان کے لئے امتحان کا وقت روز روز نہیں آیا کرتا۔ اور صرف بڑے لوگ ہی امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ پر یہ امتحان کا وقت ہے۔ مناسب ہے کہ آپ جھوٹ نہ بولے۔ اگر آپ ایمان داری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ قاتل کوئی ہندو تھا تو آپ ضرور ہندو کا نام لیجئے اور اگر آپ کو قاتل کے ہندو ہونے کا یقین نہیں تو اس مجھ کو (مولانا منظر الدین ایڈیٹر ”الامان“) کو تمام لوگ ان کے ایمان کے باعث مجھ کو کہا کرتے تھے) کے کہنے پر عمل نہ کیجئے۔ چنانچہ خواجه صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جھوٹ نہ بولیں گے اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ پر قائم رہے۔ قتل کے جرم میں ان کے ایک رشتہ دار کا عدالت میں چالان ہوا جو ان کا خاندانی دشمن تھا مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث یہ ملزم سیشن کورٹ سے بری ہو گیا۔

سوامی شردھانند اور خواجه حسن نظامی کے درمیان سخت عداوت تھی مگر میرے دونوں کے ساتھ تعلقات مخلصانہ تھے۔ کیونکہ یہ تعلقات کسی غرض کی بنیاد پر نہ تھے اور دونوں کے دلوں میں میرے لئے عزت و محبت کے جذبات تھے مگر میں نے سوامی شردھانند جی کے انتقال یا خواجه حسن نظامی کے خسر کے قتل کے موقع پر اگر آواز پیدا کی تو دوستانہ تعلقات سے قطعی لاپرواہ ہو کر صرف حق و صداقت کے خیال سے، اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے میری رائے کی قدر کی۔ چنانچہ میرا یقین ہے کہ اگر انسان تعلقات کی پروا نہ کرتے ہوئے حق و صداقت کی آواز پیدا کرے تو اس کو غناغین بھی برا محسوس نہیں کرتے۔

## پراسرار مسٹر سوامی

بہت برس ہوئے گزرے روڈنی دہلی پر ایک صاحب مسٹر سوامی رہا کرتے تھے جن کے پاس کئی کوٹھیاں تھیں اور یہ بزرگ دایبان ریاست کو اپنے ہاں ہمان رکھنے کے بہت خواہشمند تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کئی دایبان ریاست ان کے ہاں ہمان رہا کرتے۔

ان مسٹر سوامی نے مرحوم خان بہادر قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم ریاست دتیاسے لگی بار و خوست کی کہ آپ اور ہمارا جہ دتیان ان کے ہاں بطور ہمان رہیں۔ قاضی صاحب بہت محتاط تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر ہمارا جہ دتیاسٹر سوامی کی کوٹھی پر بطور ہمان رہیں تو کیا اس میں کوئی خرج تو نہیں۔ اور یہ مسٹر سوامی کیسے آدمی ہیں؟ میں مسٹر سوامی سے قطعی ناواقف تھا۔ صرف اتنا سنا تھا کہ یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ نقد اور کئی کوٹھیدوں کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کو بطور ایڈوائزر ملازم رکھتے ہیں اور یہ ایک راز ہے کہ ان کے پاس یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ کہاں سے آیا۔ میں نے جب قاضی صاحب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے دہلی کے چیف کمنشنر سر جان تھامپسن کو کہی کچھ لکھا کہ مسٹر سوامی کون ہیں اور اگر ہمارا جہ دتیان ان کے ہاں ہمان رہیں تو کیا گورنمنٹ کو اعتراض تو نہیں۔ سر جان تھامپسن نے یہ خط مقامی سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرنٹنڈنٹ کو تحقیقات کے لئے بھیجا۔ ایک ہفتہ کے بعد قاضی صاحب کو سر جان کا خط ملا جس میں آپ نے لکھا "مسٹر سوامی کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے۔ تحقیقات میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جس کا خیال کرتے ہوئے ان کے ہاں ہمارا جہ دتیاسے قیام کو قابل اعتراض کہا جاسکے" اس جواب کے بعد قاضی صاحب نے مسٹر سوامی کی دعوت کو قبول کر لیا اور چند روز کے بعد جمپیر آف پرنس کے موقع پر ہمارا جہ دتیاسٹر سوامی کے ہاں بطور ہمان مقیم ہوئے۔

قاضی سر عزیز الدین بہت ہی بلند اور دھندلاری کے پابند انسان تھے۔ جب کبھی دہلی تشریف لاتے تو ایڈیٹر ریاست "سے ملنے کے لئے دفتر ریاست" میں ضرور آیا کرتے اور میں قریب قریب ہر روز ان سے ملنے اور پبلیک ڈیپارٹمنٹ کے متعلق حالات معام کرنے علی الصبح پانچ بجے دیکھنے کی سی وقت ان کی تنہائی کا ہوا کرتا ورنہ دن بھر ان کے پاس آنے والوں کا جگمگا رہتا سبیل جہاں کہ وہ قیام فرما ہوتے، جایا کرتا اور شام کو کبھی کبھی ان کو اپنی کار میں سیر کے لئے لے جاتا۔ صبح کو قاضی صاحب سے ملنے کے لئے گیا۔ تو قاضی صاحب نے مسٹر سوامی کے تمام حالات بتائے اور فرمایا کہ ہمارا جہ دتیان ان کی کوٹھی پر قیام فرما ہیں۔ چنانچہ شام کو میں قاضی صاحب سے پھر ملنے کے لئے گیا تو آپ مجھے بھی مسٹر سوامی کی کوٹھی لے گئے۔ میں جب ان کی کوٹھی پر گیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا جہ دتیان کے علاوہ ہمارا جہ پنا وغیرہ اور متعدد دایبان ریاست بھی وہاں بطور ہمان قیام پذیر ہیں۔ درجنوں موٹریں کھڑی ہیں۔ ریاستوں کے دربار سیکریٹری آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے حد دلچسپ ہے کہ ان مسٹر سوامی نے اس زمانہ میں پانچ پانچ چھ چھ ہزار روپیہ ماہوار پر ریٹائرڈ انگریز کرنل، جنرل اور انڈین سول سروس کے ممبر بطور ایڈوائزر رکھے ہوئے تھے اور ان اصحاب میں داسرے کی انتظامیہ کونسل کے ریٹائرڈ ممبر سری۔ پی۔ راما سوامی اسیر بھی تھے۔ چنانچہ پنجاب کی ریاستوں کے ایجنٹ گورنر جنرل سر جیمز فٹنر پٹرک نے بھی ایڈیٹر ریاست "کو بتایا تھا کہ جب وہ ریٹائر ہوئے والے تھے تو مسٹر سوامی نے ان کو پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھنا چاہا

مگر سرچیس نے انکار کر دیا تھا۔ مسٹر سودامی سے اس زمانہ میں کبھی کبھی ملنے کا اتفاق ہوا کرتا مگر معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے پاس یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ کہاں سے آیا اور ان کے بڑے بڑے ریٹائرڈ افسروں اور لیڈروں کو ملازم رکھنے میں راد کیا ہے۔

یہ عقیدہ نہ صرف ایڈیٹر ریاست سے کھل نہ سکا بلکہ کرنل روڈر جہاں کہ مسٹر سودامی رہا کرتے تھے ہرے رات بٹنے والے دوسرے اصحاب بھی اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ یہ لطیفہ بہت دلچسپ ہے کہ مئی یا جون ۱۹۵۳ء کے مہینہ میں ایک روز شام کو مسٹر سودامی کا ٹیلیفون آیا کہ آپ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب چاہیے تشریف لائیے۔ آپ ایک گھنٹہ بعد تشریف لے آئے۔ اس وقت ایڈیٹر ریاست کے پاس چند دوست بیٹھے تھے۔ آپ نے تنہائی میں مختصر سی دیر باتیں کیں اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ اس وقت دوسرے لوگ بیٹھے ہیں آپ اگلے روز دوپہر کو آئیں گے۔ اگلے روز آپ اور آپ کے صاحبزادہ تشریف لائے۔ تین چار گھنٹہ باتیں ہوئیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ چاہتے کہ چند روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات جاری کئے جائیں اور آپ اس مقصد کے لئے دس ہندوہ یا بیس لاکھ روپیہ صرف کرنے کے لئے تیار ہیں اور اخبارات جاری کرنے کی غرض صرف پبلک خدمت ہے۔ تین چار گھنٹہ باتیں کرنے اور رائے لینے کے بعد آپ چلے گئے مگر اس کے بعد معام نہیں ہو سکا کہ آپ کہاں ہیں اور آپ کی اس ہندوہ یا بیس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے روزانہ اخبارات جاری کرنے کی سبکیم کاکیا ہوا۔

## ذہن میں نہ بھلا

بیس جن دنوں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا، نو بھڑ (ریاست پٹیالہ) کے قریب موضع جنگ پورہ میں ایک دست کی دعوت پر آنکھوں کے آپریشن کرنے کے لئے دہاں گیا اور چند روز مقیم رہا۔ اس مقام پر ایک دوست پرامری سکول کے ماسٹر ناہر سنگہ رہا کرتے تھے۔ یہ ماسٹر ناہر سنگہ بہت مضبوط بہادر و مستعد اور دھندلار طبیعت کی شخصیت تھے۔ اور دوسروں کے لئے خود تخلیق اٹھانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ میرے جنگ پورہ سے چلے آنے کے بعد بھی ماسٹر ناہر سنگہ سال میں ایک آدھ مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے ہمیشہ آتے رہے۔ اور ان کی یہ دھندلاری اب بھی قائم ہے۔

۱۹۵۴ء میں جب منادات شروع ہوئے تو اتفاق سے یہ دہلی میں موجود تھے اور جب چند روز یہاں مقیم رہے تو ایک دن انھوں نے کہا کہ یہ اپنے گاؤں ضلع انبالا میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ منادات چور ہے ہیں۔ دہلی میں ہی رہو جب منادات ختم ہو جائیں گے تو چلے جانا۔ مگر ماسٹر جی نے جواب دیا کہ نہیں جانا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے علاقہ کے اکابرین کا ان کے پاس بچپن میں پہنچا ہے وہ دہلی کے مسلمانوں کو ختم کر رہے ہیں اور ان کو بھی وہاں طلب کیا ہے تاکہ یہ بھی مسلمانوں کو قتل کرنے میں حصہ لیں۔ میں نے جب یہ سننا نہیں سہیا تو انھیں اور ماسٹر جی سے بہت کہا کہ وہ قتل کی اس دہلی میں حصہ نہ لیں۔ یہ سبکھ لازم اور انسانییت

کے خلاف ہے مگر ماسٹر جی مانے اور دہلی سے اپنے گاؤں چلے گئے۔

ماسٹرنا ہر سنگہ جب اپنے گاؤں پہنچے تو وہاں کے علاقہ میں مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا۔ اکالیوں کی تلواروں کو خون لگا ہوا تھا۔ اور جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آتا۔ اس کو ختم کر دیا جاتا۔ ماسٹرنا ہر سنگہ اپنے گاؤں پہنچنے کے بعد اگلے روز صبح ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لئے گاؤں سے باہر دھبیا کے دیہات میں دستور ہے (کھیتوں میں گئے تو وہاں پانی کی چھوٹی سی نہر درج اس گاؤں کے قریب تھی اور جس میں مین چارنٹ کے قریب پانی بہہ رہا تھا) میں ایک سر نظر آیا۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا۔ ماسٹر جی حیران کہ اس وقت اس نہر میں کون شخص گردن بکالے کھڑا ہے۔ ماسٹر جی نے کنارہ پر کھڑے ہو کر اس شخص کو پوچھا کہ کون ہے۔ ماسٹر جی کے اس سوال پر جواب ملا کہ ”ماسٹر جی میں ہوں“ یہ آواز ماسٹر جی کے ایک مسلمان شاگرد کے کی تھی جسے ماسٹر جی کچھ عرصہ پہلے سکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ ماسٹر جی نے اس لڑکے کو نہر سے باہر آنے کے لئے کہا۔ لڑکا نہر سے باہر آگیا تو یہ کانپ رہا تھا اور اس نے بتایا کہ چونکہ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ نہر میں چھپا کھڑا تھا۔ اور اس نے اپنا سر پانی سے اوپر سانس لینے کے لئے نکالا ہوا تھا اور انجانگی کہ اس کو ہلاک نہ کیا جائے۔ یہ

کیفیت دیکھ کر ماسٹرنا ہر سنگہ کے ذہن میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ بچہ کو یہ اپنے گھر لے آئے اور کپڑے پہنائے۔ گاؤں کے لوگوں میں اس واقعہ سے ماسٹرنا ہر سنگہ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے کہ انھوں نے ایک مسلمان لڑکے کو پناہ دی ہے۔ ماسٹرنا ہر سنگہ بہت بہادر اور شجاع ہیں آپ کسی بارڈر کوؤں کا مقابلہ کر چکے تھے اور خود بھی ڈاکر کے الزام میں گرفتار ہو کر پٹیا لہ جیل میں رہ چکے تھے۔ آپ نے اپنی کرپان (تلوار) کر میان سے نکال لیا۔ اور گاؤں کے لوگوں کو لٹکار کر کہا کہ جو شخص اس بچہ پر ہاتھ اٹھائے گا اس تلوار سے اس کو ختم کر دیا جائے گا اور اگر یہ بچہ قتل ہوا تو گاؤں کا ایک شخص بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ ماسٹرنا ہر سنگہ کا یہ سیلینج سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ ماسٹر جی نے اس بچہ کو اپنے ساتھ لیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ گاؤں سے کافی فاصلہ پر اس کیمپ میں لے گئے جہاں کہ مسلمانوں کو حفاظت کے لئے رکھا جا رہا تھا۔

ماسٹرنا ہر سنگہ جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچے تو وہاں آپ نے دیکھا کہ مسلمان بہت مغموم ہیں ان کے عزیز و اقارب قتل کر دیئے گئے ان کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ کوئی سامان اور عورتیں اور بچے ایک قیامت میں مبتلا ہیں اس منظر کو دیکھ کر ماسٹرنا ہر سنگہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو آپ دیہات سے مسلمانوں کو نکال کر ان کو بچائیں گے چاہے ان کو اس راہ میں خود بھی ہلاک ہونا پڑے چنانچہ آپ نے اسی وقت سے ہی دیہات کا دورہ شروع کیا اور جہی مسلمان ملتا اس کو نکال کر کیمپ میں پہنچا آتے۔ آپ نے اس طرح دو ہزار کے قریب مسلمانوں کو اکالیوں کے ہاتھوں سے بچا کر کیمپوں میں پہنچایا۔ ماسٹرنا ہر سنگہ کا بیان ہے کہ کیمپوں کے یہ مسلمان جب پاکستان کو روانہ ہوتے تو ماسٹرنا ہر سنگہ سے گئے مگر انہما رشک گزار کی کرتے ہوئے زار زار روتے اور ایک ضعیف اور بوڑھی مسلمان عورت کے آنسو نہ تھے جب اس نے جدا ہونے وقت ماسٹر جی کی پیشانی کو چوم لیا اور کہا ”بیٹا اگر تم نہ ہوتے تو آج ہم اس دنیا میں زندہ نہ رہ سکتے“ اس ضعیف خاتون کو کیا معلوم کہ پاکستان کیا ہے اور کہاں ہے اس نے ماسٹر جی سے بہت کہا کہ یہ بھی اس قافلہ کے ساتھ چلیں اور یہ خاتون ان کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھتی تھی مگر نہ تو ماسٹرنا ہر سنگہ پاکستان جا سکتے تھے اور نہ یہ خاتون ہندوستان میں رہ سکتی تھیں یہ خاتون اور

ماسٹر صاحب دروزی ہی آئندہ بتاتے ہوئے ملجھہ ہوئے۔

ماسٹر ہارسنگکے آجکل راجپورہ دریا ست پٹیلہ میں بہتے ہیں اور اپنی وضعاری کو نبھانے کے لئے کبھی کبھی پانی ایکارتے ہیں جب بھی آتے ہیں تو میں ان کی زبان سے ان حالات کو پھر سن لیا کرتا ہوں کیونکہ آپ کا شملاندن کو قتل کرنے کے ارادہ سے اپنے گادوں جانا اور شاگر کو قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر ان کے ذہن میں انقلاب پیدا ہوتا ایسا واقعہ ہے جس کو بار بار سنئے اور اس پر بار بار غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔

گاہے گاہے باز خال ایں دفتر پارینہ را تازہ خواہی داشتن گردا غمائے سینہ را

## ماسٹر باسور تھ سمٹھ آف شارل لاکا و خیانہ پن

بہت برس ہوئے میں جب موگا (ضلع فیروز پور) کے ہسپتال میں کام کرتا تھا تو فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر ماسٹر باسور تھ سمٹھ تھے۔ ان ماسٹر باسور تھ سمٹھ کا والد لندن کی ایک بہت نامور یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور ان پر ویسٹمن کی کوششوں سے ہی یہ ماسٹر باسور تھ سمٹھ انڈین سول سروس میں داخل کر لیے گئے ورنہ ذہنی لحاظ سے یہ انتہائی یوفو آجڈ، ظالم اور نیم پاگل شخص تھے۔

ایک سکہ انجینئرسردار میرا سنگھ بہت کمزیر قسم کے سکہ تھے اور ماسٹر باسور تھ سمٹھ ان پر بہت ہی ہریان تھے۔ فیروز پور آنے سے پہلے ماسٹر باسور تھ سمٹھ جہاں بھی ڈپٹی کمشنر ہے انھوں نے سردار میرا سنگھ کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور یہ جب فیروز پور آئے تو انھوں نے ان کو بھی ڈسٹرکٹ بورڈ فیروز پور کا انجینئر مقرر کر دیا۔ ماسٹر باسور تھ سمٹھ کو فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر تھے مگر عملی طور پر فیروز پور کی حکومت سردار میرا سنگھ کے ہاتھوں میں تھی کیونکہ ماسٹر باسور تھ سمٹھ ہر معاملہ میں سردار میرا سنگھ کی رائے لیتے اور کوئی کام ان کے مشورہ کے بغیر نہ کرتے۔ سردار میرا سنگھ چونکہ کمزیر قسم کے سکہ تھے اور چیف خالصہ دیوان کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکھوں کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ آپ نے ماسٹر باسور تھ سمٹھ کو یہ یقین دلایا تھا کہ سکہ بطور ایک قوم کے بہت ہی نیک، بہادر اور برطانیہ کے وفادار ہیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ بڑے سے بڑے سکہ کو بھی نیک اور اچھا سمجھتے اور آپ نے سردار میرا سنگھ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے ضلع فیروز پور کے دیہات میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے روپیہ سے سکھوں کے سینکڑوں پرائمری سکول جاری کر دئے تھے اور آپ کی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ سکھوں کو فائدہ پہنچے۔

ماسٹر باسور تھ سمٹھ کہ جب سردار میرا سنگھ نے بار بار یہ یقین دلایا کہ سکہ مجموعی طور پر بہت نیک اور برطانیہ کے وفادار ہیں تو ایک روز ماسٹر باسور تھ سمٹھ نے سردار میرا سنگھ سے پوچھا کہ تمام کی تمام قوم یا تمام کا تمام ملک تو نیک ہر نہیں نکلتا۔ کیا کوئی ایک سکہ بھی بد معاش نہیں۔ سردار میرا سنگھ بہت ہوشیار آدمی تھے آپ نے جواب دیا کہ ہاں سکھوں میں بھی کوئی بد معاش ہے۔ اس جواب پر ماسٹر باسور تھ سمٹھ نے پوچھا کہ جو سکہ بد معاش ہو اس کی پہچان کیا ہے تو میرا سنگھ نے بتایا کہ بد معاش سکہ کی پہچان یہ ہے کہ اس کی داڑھی کچھ کٹی ہوئی ہے۔ یعنی اس کی داڑھی کے بال ترشوتا ہے (چونکہ سکھوں میں مذہباً بالوں کے کٹوانے

کی سخت مانعت ہے۔ سردار بہرائنگ نے مذہب کی پابندیوں سے آزاد سکھوں کو بد معاش کہا تا کہ اگر مسٹر باسور تھ سمیٹھ کا قہر نازل ہو تو صرف ان سکھوں پر جو کچھ سکھ نہیں اور سکھ انہم کے مصوروں کی پابندی نہیں کرتے، مسٹر باسور تھ سمیٹھ کے ذہن میں یہ بات نقش ہو گئی کہ سکھوں میں صرف وہ شخص بد معاش ہوتا ہے جس نے داڑھی ترشوا دی ہو۔ چنانچہ آپ جب دیہات میں جاتے اور سردار وغیرہ اور دوسرے لگ صاحب بہادر کی پیشوائی کے لئے پہنچتے تو جس شخص نے داڑھی ترشوائی ہوتی۔ مسٹر باسور تھ سمیٹھ اُس کو بد معاش سمجھ کر دوسرے لوگوں سے الگ کر لیتے اور کہتے کہ چونکہ وہ بد معاش ہے اس کی نمبر داری یا ذمہ داری ضبط کر لی جائے گی مسٹر باسور تھ سمیٹھ کئی برس تک فیروز پور میں رہے اور ”بد معاشوں“ کی گرفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دیہات کے لوگوں نے ذلت کے خوف سے داڑھیاں ترشوانا چھوڑ دیا اور جو لوگ داڑھیاں ترشواتے وہ ڈپٹی کمشنر کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرتے۔

یہ مسٹر باسور تھ سمیٹھ مارشل لا کے زمانہ میں شیخوپورہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہاں انھوں نے لوگوں پر بہت ظلم کیے اور جب مارشل لا کے متعلق کمیشن مقرر ہوا تو شہادتیں اس قسم کی دی گئیں جن سے مسٹر باسور تھ سمیٹھ کا وحشیانہ پن ثابت ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ انڈین سول سروس کی ملازمت سے موقوف کر دیئے گئے۔

مسٹر باسور تھ سمیٹھ جب فیروز پور میں تھے تو آپ نے اپنے وحشیانہ پن سے مجبور ہو کر ایک جلسہ میں ہاں کے ایک فاضل اور نابینا وکیل سردار چندا سنگھ کی بے عزتی کی جس کے باعث دونوں کے درمیان سخت عداوت ہو گئی۔ دونوں نے نفیشتہ گورنر اور ہائیکورٹ کے پاس شکایتیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار چندا سنگھ کا وکالت کا لائسنس ضبط کر لیا گیا۔ لائسنس کی اس ضابطی کے چند سال بعد جب مسٹر باسور تھ سمیٹھ بھی انڈین سول سروس کی ملازمت سے موقوف ہوئے تو آپ نے ایک خط مسٹر باسور تھ سمیٹھ کو دہلی سبیل ہوٹل کے پتہ پر درجہاں کر آپ موقوفی کے بعد مقیم تھے) لکھا جس میں ”اوپر خطاب کرتے ہوئے“ ”بخدمت مسٹر باسور تھ سمیٹھ ڈپٹی کمشنر پنجاب اور چیف پیسینے والے کی جگہ لکھا۔“ ”آپ کا صادق چندا سنگھ ڈسمسٹر وکیل“ چنانچہ یہ خط کافی عرصہ تک فیروز پور اور دوسرے مقامات کے واقعکار حلفوں میں دلچسپی کا باعث رہا۔

مسٹر باسور تھ سمیٹھ ایک زمانہ میں میاوالی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور کالاباغ دورہ پر گئے تو وہاں آپ نے وہاں کے ایک بڑے جاگیردار کو سزا دیکر دیا۔ یہ جاگیردار اس گالی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے کاٹھکاروں کو حکم دیا کہ صاحب بہادر کی سرست کی جائے۔ چنانچہ کاٹھکاروں نے مسٹر باسور تھ سمیٹھ کو بہت مارا مگر آپ نے بدنامی کے خوف سے اس واقعہ کو ہمیشہ چھپائے رکھا اور پھر کالاباغ جانے کی کبھی جرأت نہ کی مسٹر باسور تھ سمیٹھ کے ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی سفارتش کے ذریعہ بعض جرم اور ظالم لوگ کیونکہ انڈین سول سروس میں بھرتی کر لئے جاتے تھے اور انھوں نے کیونکہ ہندوستانیوں کو انسان نہ سمجھا۔

## پولیس کے پہلے پرائیڈٹر ریاست کا دہلہ

اگست ۱۹۷۷ء میں ہاتھ کا گندھی کی گرفتاری کے فوراً بعد جب تمام ملک میں سرکاری عمارتوں اور سالن کو نقصان پہنچانے کی تحریک شروع ہوئی اور ہر صوبہ میں ہزار ہا کانگریسی گرفتار ہوئے تو ایک روز صبح پانچ بجے کے قریب چودھری بھیم سنگھ انسپٹر پولیس سی۔ آئی۔ ڈی (جو بعد میں غالباً امرتسر میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) ایدٹٹر ریاست کے مکان قزول باغ میں تشریف لائے۔ ایدٹٹر ریاست صبح چار بجے سے کام شروع کرنے کا عادی ہے۔ اس وقت یہ ایدٹریل لکھ رہا تھا۔ چودھری صاحب نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور دروازہ کھولا لایا تو معلوم ہوا کہ آپ معہ کنٹیبلوں کے کھڑے ہیں۔ آپ اندر تشریف لائے اور ان سے صبح ہی صبح آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ میری گرفتاری کے وارنٹ ہیں اور میں سیفیٹ ایکٹ کے ماتحت گرفتار کیا جا رہا ہوں۔ میں چودھری صاحب سے پہلے واقف نہ تھا۔ ان کے رویہ سے معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی شریف اور ہمدرد فطرت انسان ہیں۔ آپ نے کہا کہ کوئی جلدی نہیں۔ میں چائے وغیرہ پیوں اور پھر ان کے ساتھ کو توالی چلوں۔ چائے پینے کے بعد میں نے اپنے کاغذات کو درست کیا اور اپنے ملازم کو یہ ہدایت دے کر کہ میرا بسترو اور پہننے کے کپڑے کو توالی بھیج دیئے جائیں، میں ان کے ساتھ موٹر میں کو توالی روانہ ہوا۔ کو توالی پہنچنے کے بعد مجھے حالات کے ایک کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ مجھے وہاں پہنچے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کمرہ میں لالہ ہنونت سہائے (جن پر لارڈ ہارڈنگ پر مجب پھینکنے کی سازش میں مقدمہ چلا تھا اور جو دہلی میں بہت نیک دل۔ محب الوطن اور قابل احترام شخصیت تسلیم کئے جاتے ہیں) بھی تشریف لے آئے اور کنٹیبل نے ان کو بھی حالات کے اندر داخل کر کے حسب دستور باہر سے تالا لگا دیا۔ لالہ ہنونت سہائے بہت ہی قابل محبت بزرگ ہیں۔ ان سے باتیں شروع ہوئیں تو اتنے میں دس بارہ اور مقامی کانگریسی لیڈر اور دیگر بھی حالات کے اندر داخل کر دیئے گئے۔ میں نے لالہ ہنونت سہائے کو ایک لطیفہ سنایا کہ ایک مولوی صاحب کا انتقال ہوا مولوی صاحب کی بیوی روپیٹ رہی تھی اور لوگوں نے صبر کی تلقین کی تو بیوی نے کہا کہ شوہر کامرنا بہت ہی صدمہ کا باعث ہے مگر اس حملہ میں ایک دوسرے شخص کا بھی آج ہی انتقال ہوا ہے، اس لئے خدا کا شکریہ کہ شوہر اس دنیا سے اکیلے نہیں گئے۔ ایک ساتھی بھی ان کے ہمراہ گیا ہے۔ مولوی صاحب کا راستہ میں دل لگا رہے گا۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ ایدٹٹر ریاست اکیلا جیل نہیں جا رہا۔ لالہ ہنونت سہائے بھی اس کے ہمراہ ہیں۔ دل لگا رہے گا۔ اس لطیفہ پر تمام دوست ہنس پڑے۔ دو گھنٹہ تک حالات میں رکھنے کے بعد میں دہلی کے ڈسٹرکٹ جیل لے جایا گیا۔ وہاں کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ تھی اور اخبارات پڑھنے کے لئے بل جاتے تھے۔ چند روز دہلی جیل میں رکھنے کے بعد ہم لوگ جو قعدا میں ساٹھ کے قریب تھے لیٹان سنٹرل جیل میں لے جائے گئے جہاں کہ پنجاب کے کئی سولیڈر اور قومی کارکن پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

سنٹرل جیل لیٹان میں کھانے پینے کی تو کوئی تکلیف نہ تھی۔ سب سے زیادہ ذہنی گرفت یہ تھی کہ وہاں پنجاب گورنمنٹ کے حکم سے کوئی اخبار جیل کے اندر داخل نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہم میں سے کوئی شخص کسی



سے خط و کتابت کر سکتا تھا تاکہ ہم دُنیا اور ہندوستان کے حالات سے قطعی بے خبر اور تاریکی میں رہیں۔ ایک اخبار نویس کو کھانا نہ ملنے کی زیادہ تکلیف محسوس نہیں کرتا مگر اُس کو اخبار کا نہ ملنا اُس کے لئے ناقابل برداشت کوفت اور اذیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اخبار کے منتقل تو اسمبلی کے ایک ممبر دست نے جیل کے ایک ملازم کو اپنے اڈے لگالیا۔ اس ملازم کو ”ٹریبون“ کے دو پرچوں کا معاوضہ روزانہ دو روپے دیدیا جاتا (حالانکہ ایک پرچہ کی قیمت ایک آنہ تھی)۔ ان دو پرچوں کو تمام لوگ باری باری پڑھ لیتے اور شام تک ہر شخص کو معلوم ہو جاتا کہ دُنیا اور ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے اخبار نہ ملنے کی شکل تو اس طریقہ سے حل ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ دفتر ”ریاست“ کے حالات کیونکر معلوم ہوں اور دہلی کے ساتھ خط و کتابت کیونکر جاری رہ سکے کیونکہ سرکاری طور پر جیل والوں کی معرفت کسی شخص کا خط بھیجنا یا وصول کرنا دونوں ناممکن تھے۔

کچھ روز تو میں سوچتا رہا کہ اس مسئلہ کا حل کیونکر ہو کیونکہ دفتر ”ریاست“ سے بے خبر رہنا ذہن کے لئے بہت بڑی کوفت تھی۔ آخر جیل کے ایک افسر کو آمادہ کر لیا۔ اور یہ صاحب دستاں طور پر بخیر کسی معاوضہ کے یہ خطرہ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے کہ جیل سے تو یہ خطوط لے جا کر ڈاک خانہ میں پہنچا دیا جائے۔ جواب ایک شخص کی معرفت ملتان شہر میں پہنچے جہاں سے کہ ان کی معرفت یہ جواب ایڈیٹر ”ریاست“ کے پاس پہنچ جایا کرے، اور چونکہ دفتر ”ریاست“ کی ڈاک کئی برس سے سنسر ہوتی تھی۔ میں نے خط و کتابت دہلی ملازحدی صاحب ایڈیٹر ”نظام المشرق“ کے نام شروع کر دی کیونکہ واحدی صاحب کی ڈاک سنسر نہ ہوتی تھی۔ وہ سیاسی ایجنسی ٹریبون بھی نہ تھے اور ممبرنیل کمیٹی کے ممبر ہونے کے باعث حکومت ان کو خطرناک بھی قرار نہ دیتے تھے۔ یعنی میں باہر کے لفاظ پر تو واحدی صاحب کا ایڈریس لکھنا چھوڑا اس کے اندر لفظ ”نام لکھ کر رکھ دیتا جن کو خطوط پہنچانے مطلوب ہوتے اور واحدی صاحب یہ خطوط دستوں کو پہنچا دیتے۔ یہ سلسلہ کچھ روز چلتا رہا۔ میرے خطوط ملتان کے ڈاک خانہ سے جیل کے اُس افسر کی معرفت پہنچ جاتے اور ان کا جواب ملنے کے زیادہ ہی سیکڑیں پہنچ جاتا کہ کچھ روز کے بعد دہلی پولیس کو معلوم ہوا کہ ملتان جیل سے نظر بندوں کی خط و کتابت دہلی کے لوگوں کے ساتھ شعل چاری ہے اور گورنمنٹ کی تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئی ہیں تو دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر میلر بہت ہوشیار تھے، انے دہلی کے ڈاک خانہ کو حکم دیا کہ تمام خطوط کا بندل جو ملتان کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ میں پہنچے (ڈاک خانہ کے قواعد کے مطابق اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پانچ یا پانچ سے زیادہ خطوط جائیں تو ان کا رسوا سے بندل بنانے کو اُس پر اُس شہر کا نام لکھ دیا جاتا ہے جس شہر میں کہ یہ بندل جا رہا ہو تاکہ راستہ میں ڈاک کے ساتھ ساتھ کرنے والے ریلوے میل سروس کے ملازمین کو تکلیف نہ ہو اور ڈاک جلدی سارٹ ہو سکے) وہ بندل بند بندل بغیر کھولے سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں پہنچایا جائے۔ چنانچہ یہ بندل ملتان سے دہلی کے ڈاک خانہ میں پہنچا، سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں کھولا گیا اور تمام لفاظوں کو دیکھا گیا تو اس میں سیرا ایک لفظ بھی تھا جس پر پندرہ واحدی صاحب کا لکھا ہوا انتہائی شہر بہ جیران کر میں کس تکلیف سے تمام دستوں کے نام خطوط واحدی صاحب کی معرفت پہنچنا ہوں تاکہ میرے خطوط کو ڈاک سنسر کرنے والے دیکھ نہ سکیں۔ جب سی۔ آئی۔ ڈی نے میرا یہ خط دیکھا

تو یہاں سے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رجسٹر ان کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ رادھا سوامی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اب یہ ریٹائر ہو چکے ہیں، تحقیقات کے لئے لمٹان پہنچے اور انھوں نے دوسرے لوگوں کے علاوہ جیل کے افسر سے بھی سوالات کئے جن کی معرفت میں خطوط بھیجتا تھا کیونکہ ایک خط میں ان کے متعلق لکھا گیا تھا کہ اگر کسی شخص کو لمٹان بھیجا جائے تو یہ شخص لمٹان جیل کے رہائشی کواٹروں میں اس افسر سے ملکر مجھ سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس چارپانچ روز لمٹان میں رہے جیل کا جو افسر میرے خطوط پر سٹ کرتا تھا اس نے بتایا کہ تحقیقات میں اس کو بھی پیشا جا رہا ہے کیونکہ میرے ایک خط میں ان کا ذکر تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جو رپورٹ کی وہ یہ تھی کہ گرو شہ توبی ہے کہ جیل کا یہ افسر خطوط پر سٹ کرتا رہا مگر کوئی ثبوت نہیں اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو مع آٹھ دس دوسرے دوستوں کے ملحق جیل سے انبالہ جیل میں تبدیل کیا گیا اور جیل کے یہ افسر اس جرم میں ہی گرفتار اس پر تبدیل ہوئے۔

انبالہ جیل میں پہنچنے کے بعد نئے سرے سے پھر وقت پیدا ہوئی کہ خط و کتابت کا سلسلہ کیونکر جاری ہو اور دفتر تباہست کے حالات کیونکہ معلوم ہوئے تھے۔ دو تین روز سوچنے کے بعد میں نے انبالہ جیل کے ایک ملازم کو راز میں لے لیا اور اس کو خط پر سٹ کرنے کا معاوضہ فی خط آٹھ آنے دینے شروع کئے کیونکہ گو جیل میں روپیہ رکھنے کی سخت ممانعت تھی اور یہ قابل سزا جرم تھا مگر میں پچاس ساٹھ یا سو روپیہ ہر شہ طور پر اپنے پاس ضرور رکھتا تھا، اور ان کا جواب انبالہ شہر کے ایک شخص کے ہتھ پر منگالیا کہ جس کے لئے بھی فی خط آٹھ آنے جیل کے اس ملازم کو دیدیئے جاتے۔

انبالہ پہنچنے کے بعد سب سے اہم سوال یہ تھا کہ چونکہ لمٹان کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ جانے والی تمام کی تمام ڈاک سنسر کرتی تھی اور اب سی۔ آئی۔ ڈی والے انبالہ کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ میں پہنچنے والی تمام کی تمام ڈاک سنسر کرتے ہوں گے، خطوط دہلی میں کس طریقہ سے پہنچیں آخر سوچنے کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا کہ میں اپنے خطوط ایک بڑے لفافہ میں اپنے ایک دوست کے نام پشاور بھیجوں اور پشاور کا دوست انڈر کے لفافوں کو وہاں سے دہلی کو پوسٹ کر دے کیونکہ دہلی کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ نوٹروٹ ان بنڈلوں کو سنسر کرتی تھی جو بنڈل ان مقامات سے مثلاً انبالہ یا لمٹان سے پوسٹ ہوتے جن مقامات کے جیلوں میں دہلی کے نظربند مقید تھے۔ چنانچہ پہلے سلسلہ بے حد کامیاب رہا۔ دہلی کی سی۔ آئی۔ ڈی کو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ انبالہ جیل سے خطوط کے دہلی پہنچنے کا کیا ذریعہ ہے اور میں جب انبالہ جیل سے فریڈ پور جیل میں بھیجا گیا تو وہاں سے بھی اس ترکیب کے ذریعہ خطوط دہلی پہنچائے جاتے رہے اور سی۔ آئی۔ ڈی کو آخری وقت تک کچھ پتہ نہ چل سکا جو نتیجہ دہلی کی سی۔ آئی۔ ڈی کے ہتھ پر ایڈیٹر "تباہست" کا دہلہ تھا۔

یہ یہ قانون شکنی کرتا رہا مگر میرا غمیر وطن تھا کہ جس صورت میں کہ انگریزوں کی حکومت نے لوگوں کی آزادی کو تباہست پر بھی ناجائز پابندیاں عاید کیں اور اس نے ہمارا کہ ہم قلمی آزادی میں وہیں ہمارا قانون شکنی کرتا تھا اور جس کے یہ قانون شکنی کرنی چاہیے تھی۔

# کیونسٹوں کی قوتِ ارادی

میں جب فیروزپور جیل میں تھا تو ہم وہاں ساتھ کے قریب دہلی کے نظربند تھے۔ جو ۱۹۴۲ء کی کانگریس تحریک کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور ان ساتھ میں کانگریسی بھی تھے، کیونسٹ بھی، انارکسٹ بھی اور مجھ جیسے کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھنے والے بھی، مگر یہ واقعہ ہے اور میں ان تمام کا زیرِ بار احسان ہوں کہ گویہ سب اپنی پارٹی بازیوں کے باعث ایک دوسرے کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تھے مگر مجھ سے قلم ہی محبت اور ہر پارٹی کا سلوک کرتے۔

ایک دن صوبہ دہلی کی کیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری مسٹر عبدالقیدم فاروقی نے میرے کمرہ یعنی جیل کی کوٹھڑی میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ میں ان کے ہاں شام کو چائے پرائوں میں نے اس دعوت کو مستحکم کر کے ساتھ قبول کیا اور شام کو ان کے نیچے میں حاضر ہوا۔ وہاں سردار بھگت سنگھ اور دوسرے چار پانچ کیونسٹ تشریف فرمائے اور میرا انتظار ہو رہا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد پُر تکلف چائے کا دُور شروع ہوا۔ جیل میں پُر تکلف چائے کی ذیل میں صوف چائے، حلہ، پتوئیاں اور پکوڑے ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شے بغیر سپرنٹنڈنٹ کی منظوری کے بازار سے جیل میں منگائی نہیں جاسکتی (چائے پر دوسری گپ بازی کے علاوہ وہی باتیں ہوتی رہیں جو کیونسٹوں کے دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ مثلاً شالمن نے شباب کے زمانہ میں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، ایم۔ این۔ رائے نے کیونسٹ پارٹی کے ساتھ وفا کی، روس کے انقلاب کا دُنیا پر کیا اثر ہوا اور ہندوستان کی کیونسٹ پارٹی کا مستقبل کیسا ہے وغیرہ۔ میری داغی کیفیت بچپن سے یہ ہے کہ میں ہر وقت ہی سوچتا رہتا ہوں اور یہ غیر ممکن ہے کہ میں کسی شخص کی بات مسلسل پانچ منٹ بھی غور کے ساتھ سُن سکوں اور یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کسی جلسہ میں کوئی تقریر نہ سننے نہیں جاتا۔ اس چلنے پارٹی میں بھی ہاں ہاں تو کرتا رہا مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نے کچھ بھی نہ سنا کہ ان لوگوں نے مجھے کیوں نرم کا دوس دیتے ہوئے کیا کچھ کہا ہے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کمرہ یعنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز شام کو تین بجے کے قریب فاروقی صاحب پھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا سیر کر چلو گے جیل میں میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں ہر روز تقریباً تین گھنٹہ سیر اور ورزش میں صرف کرتا اور جیل میں سیر یہ ہوا کرتی کہ جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا۔ چنانچہ میں صبح اٹھتے ہی ضروری حاجت سے فارغ ہونے کے بعد ورزش کرتا اور پھر سیر میں مصروف ہو جاتا۔ ایک گھنٹہ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا۔ ایک گھنٹہ میں تین میل کے قریب پیدل سیر ہو جاتی۔ اس کے بعد واپس اپنی کوٹھڑی میں آتا اور پھر ورزش شروع کر دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں جیل میں گیا تو میرا وزن تین سو دس سیر تھا اور جب جیل سے رہا ہوا وزن دس سو دس سیر تھا (یعنی میں نے ایک سو پندرہ چربی جیل میں قوم کی نذر کی) میں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ حاضر ہوں۔ چنانچہ میں اور فاروقی صاحب دونوں سیر کرنے اور میں ہر روز کی طرح ایک گھنٹہ فاروقی صاحب کے ساتھ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا رہا۔ اس ایک گھنٹہ میں بھی فاروقی صاحب مجھے وہی درس دیتے رہے، شالمن کی حکومت میں کیا خوبیاں ہیں، مارکس نے دُنیا سے کیا کہا، لینن نے انقلاب کی راہ میں کیا کیا

اور کیونٹس جنگ میں انگریزوں کے ساتھ کیوں شامل ہوئے وغیرہ میں منتشر رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا مگر میں اپنی دماغی حالت کے مطابق کچھ اور ہی سوچتا رہا اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ فاروقی صاحب نے کیا کہا۔ سیر کے بعد ہم واپس اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔

اگلے روز فاروقی صاحب صبح تشریف لائے اور فرمایا کہ میں دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھائوں۔ میں نے شکر یہ کے ساتھ اس دعوت کو بھرپور قبول کیا اور دوپہر کو میں کھانے پر گیا۔ وہاں ”مجتہد کلف“ کھانا یعنی سبزی، دال، چارہ اور پراسٹھے تھے اور کیمپ کے پانچ چھ کیونٹس تشریف فرما تھے۔ کھانے پر وہی باتیں۔ ہمارے کسی تعلیم کیا ہے، روس اور برطانیہ اگر جنگ میں کامیاب ہوئے تو دنیا میں کیا ہوگا، ہٹلر ظالم ہے اور سربراہ پرستی کو دیکھیں۔ اس کے کیونکر ختم کیا جاسکتا ہے۔ میں منتشر رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا مگر میں اب بھی اپنے خیالات میں غرق تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا کالج کا فوجی عیسائی پادریوں کے چگل میں پھنس گیا ہو اور اس کے کانوں میں چاروں طرف سے ”حضرت مسیح نجات دہندہ ہیں“ ”مذہب اکابر آسمان سے نازل ہوا“ اور ”حضرت مریم معصوم تھیں“ وغیرہ صدائیں آ رہی ہوں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے گھر میں واپس آ گیا۔

شام کو تین بجے فاروقی صاحب پھر تشریف لائے اور سیر کو چلنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں فوراً تیار ہو گیا کیونکہ انسان اکیلا سیر سے اکتا جاتا ہے اور اگر سیر کرنے والے دو یا زیادہ ہوں تو سیر دلچسپ رہتی ہے اور زمانہ زیادہ عرصہ تک چل سکتا ہے۔ ہم دونوں جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور فاروقی صاحب مجھے درس دینے میں مصروف تھے۔ یہ درس بھی وہی تھا جو چائے، کھانے اور سیر میں پہلے دیا جاتا رہا۔ جب ہم ایک گھنٹہ چلتے رہے اور گھڑی میں دیکھا کہ چلتے چلتے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے اور ہم نے تین میل کے قریب چل لیا ہے۔ ہم نے سیر بند کر دی اور واپس اپنی اپنی کوٹھری میں جا گئے۔ لے تیار ہوئے تو سٹر فاروقی نے مجھ سے سوال کیا کہ میرا کیونٹس کے متعلق اب کیا خیال ہے۔ میں دوستوں کے پاس کبھی جھوٹ نہیں بولتا میں نے شکراتے ہوئے کہا کہ فاروقی صاحب مجھے کچھ پتہ نہیں کہ آپ نے اب تک کیونٹس کے متعلق کیا کہا ہے۔ میں آپ کے ارشاد کو منتشر رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا مگر میرا دل تو کچھ اور ہی سوچنے میں مصروف تھا۔ میرا یہ جواہر سن کر فاروقی صاحب حیران ہو گئے اور ان کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ انھوں نے پھر تجتب کے ساتھ پوچھا کہ کیا فی الحقیقت میں نے ان کے درس پر غور نہیں کیا تو میں نے ان کو یقین دلانے کے لئے ہتم کھا کر کہا کہ جس بد ذات نے آپ کی کوئی بھی مشکل بات سنی ہے سٹر فاروقی کو میرا یہ جواب سن کر یقین تو آگیا کہ میں نے ان کے درس کو نہیں سنا مگر یہ کچھ باؤس ہے جو گئے اور ہم واپس اپنی اپنی کوٹھریوں میں چلے گئے۔

میری زندگی کا تجربہ ہے کہ قوت ارادی کے لحاظ سے کیونٹسوں اور میرہ کمپنیوں کے ایجنڈوں کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خدا ان کے ہاتھوں سے سادہ دل لوگوں کو بچائے کیونکہ کیونٹس جب کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو یہ اس کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک کہ یہ اپنے گھروالوں سے فائدہ خفی لے کر کھانا، کپڑا اور پندرہ روپیہ ہمارا جیب خراب کر کیونٹس نہ کروں جس شامل نہ ہو جائے چاہے یہ کسی بر لایا

ڈالیا کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنی آسامی کا ڈاکٹری معائنہ کر کے یہی پہلی قسط وصول کر لیں۔ میرے اس جواب پر بھی فاروقی صاحب نے اپنی ہمت کو نہ چھوڑا اور چونکہ ”ریاست“ کی پالیسی ہمیشہ ہی کیونز کم کی معترف رہی اُن کا خیال تھا کہ ایڈیٹر ریاست“ پچاس فی صدی تو ہمارا مسائل کا چیلہ ہے۔ بقایا پچاس فی صدی کو منشی سے یہ بہرہ ہو جائے گا تو ”ریاست“ جیسا چلا چلا یا شاید از اخبار بغیر ایک پیہ صرف کئے کیونشوں کا آرگن ہوگا۔ چنانچہ جب تک میں فیروز پور جیل میں رہا فاروقی صاحب نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ موقع ملنے پر مجھے کیونز کم اور دس کے دس دیتے ہی رہے اور مجھے اکثر ان کے ہاں دعوت کھانے کی عزت بھی نصیب ہوئی۔

• فیروز پور جیل سے رہائی کے بعد جب میں اور فاروقی صاحب دہلی واپس پہنچ گئے اور ”ریاست“ پھر شروع ہوا تو فاروقی صاحب نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ ہفتہ میں ایک آدمہ ہار ضرور تشریف لاتے اور کبھی کبھی دعوت بھی دیتے۔ چنانچہ ان کے ذاتی مکان میں جو کشمیری دروازہ کی تفصیل کے اندر تھا وہاں بھی کھانے پر گیا جہاں میرے قاف میں چاروں کی ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی سے کرایا گیا اور اس بچی نے قاف کے بعد مجھے کیونشوں کا لالہ سلام کیا۔

فاروقی صاحب ایک سال تک مسلسل میرا پیچھا کرتے رہے اور مایوس ہونے کے بعد بھی اُن کو امید تھی کہ میں ان کا چیلہ بن جاؤں گا۔ چنانچہ بھوپال کے ایک مستغادر خوبصورت نوجوان مسٹر کامل یا کمال کو بھی انھوں نے میرے اُس بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکا ایم۔ اے تک تعلیم یافتہ تھا اور بھوپال کے کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بھی مجھے کیونز کم کا درس دیا کرتا اور میں اس پر رحم کھاتے ہوئے کہا کرتا کہ اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔ دنیا میں کوئی کام کر کے خوب روپیہ پیدا کرو۔ اس روپیہ سے غریب اور مستحق لوگوں کی بھی امداد کرو اور وقت ضائع نہ کرو مگر کیونشوں کو دیکھ کر کسی نصیحت کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ یہ اپنی دھن اور قوت ارادی کے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ لڑکا بھی کافی عرصہ تک میرا پیچھا کرتا رہا اور ہمیں معلوم کہ اب یہ فوجان کیونشوں پارٹی کا کہاں کام کرتا ہے۔

مسٹر فاروقی اب مجھ سے قلمی مایوس ہو چکے ہیں اور اگر میرے تعلق ان کے اخلاص میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور جب کبھی ان کو دعوت دوں تو تشریف لاتے اور کبھی کوئی ضروری کام ہو تو شبلی فون پر بات کر لیتے ہیں مگر یہ اب محسوس کرتے ہیں کہ گو ”ریاست“ ہمیشہ کی طرح کیونز کم کا مداح ہے مگر ایڈیٹر ریاست“ ان کا چیلہ نہیں ہو سکتا اور میں گوان کا چیلہ نہ بن سکا مگر کیونشوں کی قوت ارادی ان کی شب و روز کی محنت اور ان کے اشارے کا بہت مداح ہوں اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص پبلک خدمت کے میدان میں آنا چاہے تو وہ کیونشوں کی ان صفات کی پروردی ضرور کرے۔

# ہندوستان کی پولیس اور ظلم

سنگھ کے انقلاب نے پنجاب کے مالدار ترین لوگوں کو تنگ دستی اور صاحب جائیداد لوگوں کو غریب الوطنی کے لئے مجبور کر دیا۔ میرے اموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کپور جو آج کل امرتسر کے خزانہ کے اچھارچ ہیں، حافظ آباد کے اچھے خوشحال لوگوں میں سے تھے اور ان کے وہاں نصف درجن سے زیادہ مکانات تھے اور گرایہ کی آمدنی کافی تھی۔ اس انقلاب کے سلسلہ میں جب یہ مشرقی پنجاب آئے تو دفتر ریاست کی اوپر کی منزل کے ایک کمرہ میں سب اپنے بال بچوں کے مقیم ہوئے۔ یہاں چند ماہ مقیم ہونے کے بعد ان کے مستقل طور پر آباد ہونے کا سوال تھا اور یہ چاہتے تھے کہ دہلی یا دہلی کے قریب کسی قصبہ میں آباد ہوں کچھ عرصہ کی دوڑ دھوپ کے بعد دہلی کے قریب سونی پت کے مجسٹریٹ سٹرکشن لال کپور سے ملے تو سٹرکشن لال نے کہا کہ کوئی مکان بتائیے جو آپ کے نام الاٹ کر دیا جائے۔ سردار ہرنام سنگھ نے سونی پت میں ایک مکان دیکھا جو کسی مسلمان کا تھا اور یہ خالی تھا۔ چنانچہ یہ مکان سردار ہرنام سنگھ کے نام الاٹ کر دیا گیا۔ مکان کے الاٹ ہونے کے بعد جب سردار ہرنام سنگھ منتقل ہونے کے لئے سونی پت پہنچے تو وہاں ملتان کے کوئی شہزادہ تھی اس مکان میں داخل ہو چکے تھے۔ سردار ہرنام سنگھ نے ان سے کہا کہ یہ مکان ان کو الاٹ ہو چکا ہے اور یہ کسی دوسرے مکان میں چلے جائیں۔ یہ ملتان شریف اور مقبولیت پسند تھے انہوں نے وعدہ کیا کہ یہ ایک ہفتہ میں کوئی دوسرا مکان تلاش کر کے اس میں چلے جائیں گے اور یہ مکان خالی کر دیں گے۔ سردار ہرنام سنگھ واپس دہلی آ گئے۔

ایک ہفتہ کے بعد سردار ہرنام سنگھ نے اپنے ملازم کو سونی پت بھیجا کہ یہ وہاں جا کر دیکھ آئے کہ مکان خالی ہو چکا ہے یا نہیں تاکہ اگر خالی ہو چکا ہو تو یہ اپنے بال بچوں کے ساتھ دہلی سے سونی پت منتقل ہو جائیں۔ یہ ملازم شام کی ٹرین میں دہلی سے روانہ ہوا تاکہ یہ سونی پت پہنچ کر صبح ہی صبح مکان کی کیفیت دیکھ کر اگلے روز دوبہر تک واپس دہلی آجائے۔ جب یہ سونی پت کے ریلوے سٹیشن پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اس نے سوچا کہ یہ اب اس وقت سونی پت کے شہر میں کہاں جائے گا رات یہ ریلوے سٹیشن پر ہی سو رہے اور صبح ہی مکان دیکھ کر پھر واپس ریلوے سٹیشن پر آکر دہلی چلا جائے گا کیونکہ ریلوے سٹیشن اور شہر کے درمیان سیل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہے۔ گرمیل کا زمانہ تھا یہ ملازم ریلوے پلیٹ فارم کے ایک پنج پر سو گیا۔ اس کو سوتے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ پولیس کا ایک کنسٹیبل آیا۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ ملازم نے جواب دیا کہ یہ سردار ہرنام سنگھ کپور کا ملازم ہے۔ دہلی سے مکان دیکھنے کے لئے آیا ہے کہ خالی ہو گیا ہے یا نہیں۔ اور چونکہ سٹیشن سے شہر ایک میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے یہ رات یہیں گزار رہا ہے تاکہ صبح شہر میں مکان دیکھنے جائے اور پھر واپس دہلی چلا جائے۔

ہندوستان کی پولیس کا کیریئر یہ ہے کہ اس پولیس کے ملازم دنیا میں ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے باپ، بھائی اور بیٹے کو بھی مشتبہ قرار دیتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ان سے ہو سکے یہ لوگوں کو ایذا پہنچائیں اور جیل بھجوائیں۔ چنانچہ دہلی کے سابق ایڈیشنل مسٹرکٹ مجسٹریٹ میٹرا ایس کہا کرتے ہیں کہ اگر پولیس

کا کوئی ملازم اپنے حقیقی بھائی کو گرفتار کرے اور اس کی ماں اس سے سفارش کرے کہ تم اپنے بھائی کا چالان نہ کرو تو پولیس کا یہ ملازم ماں کے کہنے پر بھائی کا چالان تو نہ کرے گا مگر بہت ذہنی تکلیف کے ساتھ مجبور ہو کر کیونکہ کسی شخص کا چالان کرنا، وہ چاہے کتنا بھی بے گناہ اور اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو پولیس کے ملازم کے لئے مسرت اور اطمینان کا باعث ہوتا ہے کنسٹیبل نے کہا کہ تم تو چور ہو اور واردات کرنے کے لئے یہاں بیٹھ ہو۔ تھانہ میں چلو کنسٹیبل اس کو تھانہ میں لے گیا اور جاتے ہی وہاں اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں کرکسی لوگ پہلے ہی بند تھے۔ یہ ملازم رات بھر حوالات میں بند رہا۔ صبح ہوئی اور سب انسپکٹر صاحب قتل اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نو بجے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوئے۔ ان کے تشریف لانے سے پہلے تھانہ کے صحن میں میز اور کرسیاں بھائی جاچکی تھیں۔ آپ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ رات کی کارگذاری معلوم کرنے کے لئے تھانہ کا محضر حاضر ہوا اور ایک ایک ملازم پیش کیا گیا۔ جب سردار ہرنام سنگھ کا ملازم پیش کیا گیا تو تھانہ دار صاحب اور اس ملازم کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔ تم کون ہو۔ حضور میں پنجاب کا شرمار تھی ہوں۔

حوامزادے یہ بتاؤ تم رہتے کہاں ہو؟

حضور میں دہلی میں رہتا ہوں۔

تم سوئی پت کیوں آئے؟

میں سردار ہرنام سنگھ کپور کا ملازم ہوں ان کو سوئی پت میں ایک مکان الاٹ ہوا ہے یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ مکان خالی ہوا ہے یا نہیں۔

ہرنام سنگھ کون ہے؟

حضور وہ حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے کپور کھتری ہیں۔

یہ ہرنام سنگھ کہاں رہتا ہے؟

حضور یہ اخبار "ریاست" کے دفتر میں رہتے ہیں۔

یہ اخبار "ریاست" کے دفتر میں کیوں رہتا ہے؟

حضور یہ اس اخبار سے ایڈیٹر دیوان سنگھ کے بھائی ہیں۔

یہ دیوان سنگھ ایڈیٹر اخبار "ریاست" کا بھائی ہے؟

جی ہاں۔ دیوان سنگھ کے امون زاد بھائی ہیں۔

یہ جواب سنتے ہی سب انسپکٹر صاحب نے اس کنسٹیبل کو طلب فرمایا جو اس "ملازم" کو ریلوے

سٹیشن سے گرفتار کر کے لایا تھا۔ کنسٹیبل سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم کی ایک

پینچ پر سوا ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ یہ مکان دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ یہ جواب سن کر سب انسپکٹر نے اس

کنسٹیبل کو سخت مسرت کہنا شروع کیا "تم لوگ دیکھتے نہیں کہ جس کو گرفتار کر رہے یہ کون ہے؟"

"تم انسان کو پہچاننے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔" "تم لوگ کسی روز خود بھی مرد گے اور مجھے بھی مرد آد گے۔"

"تم دیوان سنگھ کو نہیں جانتے۔ یہ بہت مفردہ باز ہے۔ اس نے نواب بھوپال اور جہاڑ چٹیل کے

دانت کھٹے کھٹے، "تیرہ ہائیکورٹ تک مقدمہ لڑا کرتے ہیں" تیرہ صرف اپنے مخالفین کو موقوف بلکہ قید بھی کراتا ہے، "تیرہ بہت انتہا میں لے دالا شخص ہے" تم نے اس شخص کو گرفتار کر کے بہت غلطی کی، "فیو سب ان پکڑ لیا صاحب جب گرفتار کرنے والے کنشیل کو بہت سخت سخت کہہ چکے تو آپ نے اپنے ٹھکر کے ملازم کو بگڑا بیچا۔ ملازم جب آیا تو اس کو حکم دیا گیا کہ دی کی لٹی اور پراٹھے لاؤ۔ چنانچہ سردار ہر نام سنگھ کے ملازم کے ناشتہ کے لئے پراٹھے اور سی لانی لگی اور سردار نے حکم دیا کہ ملازم سے کہا گیا کہ بیٹا غلطی سے تم گرفتار کیئے گئے تھے۔ تم نے اپنی گرفتاری کے متعلق سردار دیوان سنگھ سے کچھ نہ کہنا اور یہ ناشتہ کھا لو اور مکان دیکھنے چلے جاؤ۔ مجھے بہت اندس ہے کہ اس بے وقوف کنشیل نے تم کو گرفتار کیا۔" چنانچہ ملازم ناشتہ کرنے کے بعد مکان دیکھنے گیا اور مکان دیکھ کر وہاں دہلی آیا اور اس نے بتایا کہ یہ کیونکر رات بھر حالات میں رہا اندس صبح پراٹھے اور سی کا اس کو ناشتہ کرایا گیا۔

یہ ہے ہندوستان کی پولیس جو صرف اُن لوگوں پر ظلم کرتی ہے جو ظلم برداشت کریں اور اُن لوگوں پر ظلم نہیں کرتی جو ظلم برداشت نہ کرتے ہوں۔

## ریاستوں کے خوش خور

ہندوستان کی ریاستوں میں وہ ایسا ریاست کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ جن کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی اور جن کا کام کبھی کبھی دایئے ریاست کو خوش کرنا تھا اور ان میں پہلوان، موسیقار، شاعر اور دوسرے اہل فن ہوا کرتے۔

ریاست ناہر میں ایک صاحب کپتان شیو دیو سنگھ تھے جو ہمارا جہ کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ جہدہ کے خانہ سے آنریری کپتان، تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار اور کام صرف یہ کہ جب کبھی ہمارا جہ طلب کریں حاضر ہو جائیں۔

کپتان شیو دیو سنگھ بہت شریف، لمبا، سادہ طبیعت اور خوش خوری کے اعتبار سے آپ "آفتاب خوش خوری" یا "رستم خوش خوری" (موسیقاروں کے خطاب آفتاب، موسیقی اور پہلوانوں کے خطاب رستم ہند کی طرح) کے خطاب کے مستحق تھے اور اس فن کے اعتبار سے شاید نام ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص آپ کا مستحق نہ کر سکتا تھا۔

ناہر میں قبیلہ بابا اچھے پال سنگھ کے نام سے ایک تاریخی گوردوارہ ہے جہاں کہ ہر پورنماشی کو ہمارا جہ کی طرف سے اڑھائی سو روپیہ کا کڑا ہر شاد (علوہ) چڑھا یا جاتا۔ اس زمانے میں کھانے کی ہر شے مثلاً گھی، کھانڈ اور گندم بہت ارزاں تھی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اڑھائی سو روپیہ کا کڑا ہر شاد مقدار میں کتنے من ہوتا ہوگا۔ پورنماشی کے روز دو پہر کو اس گوردوارہ میں چند سو کے قریب سرکاری ملازم، انفرادی دوسرے لوگ آیا کرتے، اور چونکہ کڑا ہر شاد کئی من ہوتا دیاں شامل ہونے والے ہر ایک کو اتنا کڑا ہر شاد دیا جاتا جو جسکی دونوں ہاتھوں میں آسکتا تاکہ یہ سب میں تقسیم ہو جائے



ایک آدمی کے حصہ کا کڑاہ پر شاد کھانے کے بعد اس کو کھانا کھانے کی ضرورت ہی نہ رہتی چنانچہ ہر پریشانی کو کپتان شیدو یو سنگھ بھی آتے تو آپ کے قریب بیٹھے آٹھ دس سرکاری افسر بالکل تھوڑا سا کڑاہ پر شاد اپنے لئے رکھ کر باقی تمام کا تمام کپتان صاحب کو دے دیتے اور کپتان صاحب تمام کے حصہ کا دیاں بیٹھے بیٹھے کھا جاتے جس کی مقدار کی ضرورت میں بھی چھ سات سیر سے کم نہ ہوتی۔

ہمارا جرنے ایک بار کپتان صاحب کو طلب فرمایا۔ آملوں کا موسم تھا اور بنارس و گھنٹہ آملوں کے ٹوکے آئے تھے۔ ہمارا جرنے فرمایا کہ کپتان صاحب اگر آملوں کا ایک پورا ٹوکرا بغیر تھ گٹے کھا جاؤ تو آپ کو دوسو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے اس شرط کو منظور کیا اور آپ بغیر تھ گٹے تمام کے تمام آم کھا گئے اور دوسو روپیہ وصول کیا۔

سرکاری شکاری ایک روز جھگل سے ہرن مار کر لائے۔ ہمارا جرنے کپتان صاحب کو طلب کیا اور کہا کہ اگر ایک دن میں تمام کا تمام ہرن کھا جاؤ تو پانچ سو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے یہ شرط منظور کر لی۔ ہرن کو صاف کیا گیا۔ سرکاری باورچی خانہ میں پکایا گیا اور کپتان صاحب بارہ گھنٹہ میں ہرن کے اس تمام گوشت کو کھا گئے۔

ہمارا جرنے ایک بار کپتان صاحب کو طلب کیا اور فرمایا کہ اگر آپ پانچ سیر دودھ میں دو سیر جلیبیاں ڈال کر کھا جائیں تو دوسو روپیہ انعام ملے گا چنانچہ پانچ سیر دودھ میں دو سیر جلیبیاں ڈالی گئیں اور کپتان صاحب نے کھانا شروع کیا۔ جب آپ دودھ اور جلیبیدوں کا کچھ بہت کافی کھا چکے اور بہت تھوڑا سا باقی رہ گیا تو آپ کے معدے نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آپ کا جی متلانے لگا مگر آپ نے پھر بھی پروا نہ کی اور تسلی پر غالب آئے جسے اس کچھ ختم کر گئے اور انعام حاصل کیا۔ ایک مزد سرکاری شکاری جھگل سے بہت سے تینتر مار کر لائے۔ ہمارا جرنے کپتان شیدو یو سنگھ کو طلب فرمایا۔ اور کہا کہ اگر بغیر پکائے ایک تینتر کھا جاؤ تو دوسو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے یہ شرط بھی منظور کر لی اور آپ بغیر پکائے تینتر کھا گئے اور انعام حاصل کیا۔

ایڈیٹر ”ریاست“ نے ایک بار چھ سات سرکاری افسروں کی اپنے ہاں دعوت کی۔ جب تمام لوگ آ گئے اور کھانا تیار ہو چکا تو فیصلہ ہوا کہ پہلے کپتان شیدو یو سنگھ کو کھانا کھلایا جائے اور بعد میں دوسرے لوگ کھانا کھائیں۔ چنانچہ کپتان صاحب نے کھانا شروع کیا اور آپ چھ سات آدمیوں کے لئے کچے ہوئے پراٹھے، پلاؤ، مختلف قسم کے سالن اور پڈنگ وغیرہ سب ختم کر گئے اور اس کے بعد باورچی کو نئے سرے سے آٹا گوند کر روٹیاں پکائی پڑیں اور دقت تنگ ہونے کے باعث مہانوں کو صرف اندھے تل کر کھانا کھلایا گیا۔

ریاستوں کے ختم ہونے کا اثر پہلوانوں، موسیقاروں، شعراء اور دوسرے اہل فن لوگوں کے لئے کپتان شیدو یو سنگھ جیسے خوش خودوں پر بھی پڑا جس کا بہت حد تک انہیں ہے۔

# کھانے کی لذت

میری عمر دس برس کی تھی کہ اُس زمانہ میرے وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ایک دوکاندار سرین سنگھ ہوا کرتا۔ یہ ذات کا غالباً کھار تھا اور اس کی دوکان میں کچا اور پکا ہوا گوشت فروخت ہوتا اور تمام تقسیمیں جھٹھے کی غالباً صرف یہی ایک دوکان تھی۔ کچا گوشت اس زمانہ میں چھ پیسے یا دو آنہ سیر ملتا اور پکا ہوا گوشت دو پیسہ کا اتنا بل جانا جتنا آج چار آنہ کا ملتا ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" کو زندگی میں درجنوں دایان ریاست کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ اور ہندوستان کے اچھے سے اچھے انگریزی اور دیسی ہوٹلوں میں کھانا کھایا مگر یہ واقعہ ہے کہ جلزٹ اس سرین سنگھ جھکلی کی دوکان کے پکے ہوئے دو پیسے کے گوشت میں تھی۔ وہ لذت نہ تو کبھی دایان ریاست کے دسترخوان پر نصیب ہوئی اور نہ ہندوستان کے بہترین ہوٹلوں میں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وجہ کیا تھی، یعنی سرین سنگھ فی الحقیقت گوشت اچھا پکا ہوا تھا یا اُس زمانے میں میرے ذائقہ اور لذت کی جس محدود تھی۔ یہی معمولی کھانا بھی بہت لذیذ محسوس ہو کرتا۔

میں جب نابھہ میں ملازم تھا تو ہاں افسروں کے ہاں خوشامد کرتے یا ان سے تعلقات بڑھانے کے لیے اکثر لوگ آیا کرتے۔ اور میرے ہاں جو لوگ آتے اُن میں ایک نیک دل شخصیت پنڈت دیوانیک بھی تھے جو ہندی بہت اچھی جانتے اور میں نے ہندی ان سے ہی سیکھی یعنی یہ میرے ہندی کے استاد بھی تھے۔ ایک روز پنڈت جی بیٹھے تھے۔ اور میرا باورچی کھانا پکا رہا تھا۔ تو پنڈت جی نے باورچی سے کہا کہ وہ سبزی خود پکائیں گے۔ چنانچہ پنڈت جی نے آلو کی سبزی پکائی اور میں نے کھانا کھایا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس سے پہلے ایسی لذیذ سبزی کھانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے پنڈت جی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ نہ تو بیمار استعمال کرتے ہیں۔ نہ لہن اور مولیٰ نمک اور مرچ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد پنڈت جی سے کبھی کبھی سبزی پکانے کی درخواست کی جاتی تو آپ پکا دیا کرتے۔ پنڈت جی کا بیان تھا کہ اُن کی شادی کے بعد ان کی بیوی ستائیس برس زندہ رہیں اور ستائیس برس میں آپ نے کبھی ایک دن بھی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا۔ ہمیشہ اپنا کھانا خود پکایا کرتے اور بیوی کو بچو کھلایا کرتے۔ میرے نابھہ سے چلے آنے کے بعد وہ میرے پاس دہلی آ گئے۔ اور یہاں کئی برس میرے پاس رہے۔ یہاں بھی کبھی کبھی سبزی پکایا کرتے اور یہ واقعہ ہے کہ جلزٹ اس سبزی میں ہوتی کبھی کسی دوسرے شخص کی پکائی ہوئی سبزی سے حاصل نہ ہوتی اور میں نے ان سے اس کا راز پوچھا تو آپ نے بتایا کہ لذیذ کھانا پکانے کے لیے ضروری ہے کہ اچھا خاصہ صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوتی سبزی ہو۔ اچھی لکڑی کا کونہ جو جس پر کھانا پکایا جائے۔ صاف ستھری اور اچھی کوئی لکڑی کی گندم جو جس کا آٹا پیا جائے۔ اور پکانے والا نیت کے لحاظ سے لاپچی اور کمینہ نہ ہو۔ ان تمام میں سے اگر ایک شے بھی خراب ہوگی تو کھانا لذت سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ میرا بھی تجربہ ہے۔ کہ اگر کھانا پکانے والا باورچی کینہ نامپ کا لاپچی ہوا اور وہ کھانا دیکھی میں سے فراخالی کے ساتھ نہ نکالے اور کھانا دیتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لرزش سی پیدا ہو تو اس کا پکا ہوا کھانا لذت سے قطعی محروم ہوتا ہے۔

میں سٹرکولی ایڈوکیٹ دہلی اور سٹریشن واس چوڑہ (جو راجپوتانہ میں کسی جگہ کشتہ تھے) ہم تینوں ریاست

غیر ہندو اسکو چلانے کے ایک مٹھکی بیرونی کے لئے سکھ (سندھ) گئے وہاں سے واپس آکر ہے تھے تو میں نے ردھری کے ریلوے اسٹیشن سے ابوہر (ضلع فیروز پور) لالہ لال جی مل بل تار (جو کسی زمانہ بیکانیر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے) کو تار دیا کہ ہم براستہ سمانہ دہلی جا رہے ہیں۔ شام کو ریلوے اسٹیشن ابوہر پر تین آدمیوں کا کھانا بیچا جائے۔ لالہ لال جی مل کھانے کو خود اسٹیشن پر آئے۔ ہم تینوں نے سیکنڈ کلاس کی گاڑی میں بیٹھے کھانا کھایا۔ تینوں کا بیان ہے کہ ایسا لذیذ کھانا بہت کم کھانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اور اب بھی کبھی کبھی اس کھانے کے متعلق میرا اور توکی صاحب کا ذکر آجاتا ہے۔ حالانکہ اس کھانے میں معمولی گوشت بہزی دال اور پرلٹے تھے۔

مرحوم ہمارا جہاں ایک بار گردوارہ کی زیارت کے لئے ناندیڑ دیاست حیدر آباد گئے وہاں سے واپس آتے ہوئے انھوں نے ریلوے اسٹیشن دینا سے مجھے قادیانہ کی اگلی صبح کو کھانا ریلوے اسٹیشن دہلی پر لایا جائے۔ میں نے ایک بادرچی کا انتظام کیا۔ جو دہلی کے شاہی بادرچیوں کے خاندان میں سے تھا۔ ادھ میں کا پیشہ ہی دھوتوں میں کھانا پکانا تھا۔ اس سے اجرت کا فیصلہ ہونے کے بعد سامان منگایا گیا۔ رات کو بجے کھانا پکانا شروع ہوا۔ اور صبح چھ بجے تک کھانا پکانا۔ میں قسم کا کھانا تھا اور اس کے لئے کئی نئے کیریر خریدے گئے تھے۔ اس کھانے پر اٹھائی سو روپیہ کے قریب صرف ہوا۔ میں کھانے کو صبح سات بجے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں ہمارا جہ سے ملنے کے لئے مرحوم مولانا محمد علی بھی موجود تھے۔ کھانا ہمارا جہ کے مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ ہمارا جہ ویرہ دون جا رہے تھے آپ نے گیارہ بجے کے قریب سہارنپور پہنچ کر کھانا کھایا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہمارا جہ تے سہارنپور سے مشکریہ کا تار بیجا جواب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس تاریخ کھانے کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہمارا جہ یا ہارانی جب کبھی دہلی سے گزرتے کھانا لانے کے لئے ناردیئے اور بعد میں جب تلے نکھانے کی تعریف کرتے۔ چنانچہ ایک بار میں ہارانی اور بچوں کے لئے جب وہ ولایت سے واپس آ رہے تھے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر کھانے کو لایا تو کھانا میری فٹریٹرک ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب نے بھی کھایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ سر جیمس نے بھی کھانے کی بہت تعریف کی تھی۔ دہلی کے یہ بادرچی اب ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں کیونکہ جب کھانا پکانے والے ہی نہ رہے تو پکانے والے اور یہ بن کیونکہ زندہ رہ سکتا ہے۔

میں محلہ گرٹھیہ میں رہتا تھا۔ تو وہاں میرے ہاں میں مسلمانوں کا ایک شریف گھرانہ تھا۔ دہلی کے مسلمانوں کے ہاں آڑو کی ایک خاص قسم کی دال پکا کر پی جی پھریری دال کہتے ہیں۔ یہ دال بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اس گھر میں جب یہ دال پکتی تو گھر کی لاکھ اپنے ملازم کے ہاتھ مجھے یہ دال ضرور بھیجتیں۔ میں نے ایک روز اس خاتون کو کہلا بیجا کہ میں کسی عورت کا انتظام کرنا ہوں جو پردہ نہ کرتی ہو۔ آپ اس عورت کو دال پکانا سکھا دیجئے تاکہ وہ مجھے سکھا دے۔ میری اس درخواست پر اس خاتون نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔ اس نے کہا۔

”میں دال پکانا اس عورت کو سکھا تو دوں گی مگر یہ تو اپنا اپنا ہاتھ ہے۔ تمام عورتیں ہی کھانا پکاتی ہیں۔ مگر کوئی لذیذ پکاتی ہے کوئی بد مزہ۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ عورت یا آپ بھی دال ایسی ہی پکا سکیں۔“

اس جواب پر میں نے دال پکنا سیکھنے والی عورت کو بھیجنے کا خیال بدل دیا۔  
 ہندی زبان کے مشہور شاعر بہاری نے ایک دہا لکھا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ بغیر عورت کے  
 داخل ہونے نہ تو ہارچی خانہ پوتر (پاک) ہوتا ہے۔ اور نہ عورت کا ہاتھ لگے بغیر کھانا لذیذ نہیں ہو سکتا ہے۔ چاہے  
 کوئی مرد ہارچی کتنی بھی کوشش کرے۔ چنانچہ بہاری نے ایک جگہ تو عورت کو یا دوجی خانہ کی حور بھی  
 لکھا ہے اور کہا ہے کہ اس حور کے بغیر ہارچی خانہ کو برکت اور رونق نصیب نہیں ہو سکتی۔  
 میں خود بھی کھانا پکھا لیتا ہوں۔ اور جو درست یہ کھانا کھاتے ہیں۔ ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے  
 کھانا پکھا اچھے ہارچیوں اور کھانا پکانے والی عورتوں سے سیکھا ہے۔ اور جو دست شام کو دفریاست  
 میں تشریف لاکر ذرہ نوازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ کھانے کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت احمق  
 پھونڈی جب پھونڈے سے آتے ہیں۔ تو آتے ہی ارشاد ہوتا ہے کہ شام کو دال ضرور پکائی جائے۔ اور  
 دہلی کے ادیب اور شاعرہ گرسٹر گن بیر پرشاد اتر جب کبھی شام کو تشریف لانے والے ہوں تو آپ اکثر صبح یا  
 دوپہر کو اطلاع دے دیتے ہیں تاکہ شام کو دال یا سبزی طیار کی جائے حالانکہ اتر صاحب  
 کا بیٹہ ہیں۔ اور خوش خوری کے اعتبار سے کایتھوں کو مسلمان ہی سمجھنا چاہیے۔  
 کھانے کے متعلق میرا تجربہ یہی ہے کہ جس طرح اخبار کی لیاری کے لیے کاغذ کتابت چھپائی ایڈیٹنگ  
 چھاپہ خانہ کی سیما ہی اور مشین میں وغیرہ اگر تمام ہی اچھے ہوں۔ تو اخبار اچھا۔ دلچسپ اور صاف ستھرا  
 شائع ہو سکتا ہے۔ اور اگر ان میں سے ایک میں بھی نقص ہو تو تمام کے تمام اخبار کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔  
 اس طرح ہی کھانے کے لیے بھی اچھا لگتی۔ اچھی سبزی۔ اچھا نمک مرچ۔ اچھا کوئلہ اور نیت کا اچھا  
 پکانے والا اور کھانا کھلانے والا بھی طبعاً فیاض ہو تو کھانا لذیذ ہوگا۔ اور اگر ان میں سے ایک میں بھی  
 نقص ہو تو کھانا بد مزہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر عورت کھانا نہ بھی پکائے تو قبل وہاں کوئی بہاری کے عورت  
 صرف کھانے کو ہاتھ ہی لگا دے تو کھانے میں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔

## کوتوں کی وفا شعاری

کوتوں کے پالنے کا مجھے بچپن ہی سے شوق ہے اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ میری  
 عمر جب دس برس کی تھی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے وطن حافظ آباد سے پانچ چھ کوس دور وطن کے مقام پر  
 ایک گھرانے بہت خوبصورت بچے دیئے ہیں تو میں اپنے چند ہم عمر بچوں کے ساتھ اس گاؤں میں گئے گا  
 بچہ لینے چلا گیا۔ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر گیا اور جب شام تک واپس نہ آیا۔ تو میرے اور ان ہم عمر بچوں  
 کے گھروں میں ایک کھرام سا پیدا ہو گیا تھا اور سب نے یہ یقین کر لیا کہ کیا تو ہم لوگ خواہ کر لیے گئے ہیں۔ یا گھر  
 سے بھاگ نکلے ہیں۔ اور کسی دوسرے شہر کر چلے گئے ہیں۔ مگر جب ہم رگ واپس آئے تو تمام لوگ میرے کوتوں کے  
 شوق پر حیران تھے اور مذاق اڑا رہے تھے۔

بچپن کے اس واقعہ کے بعد میں نے اپنی زندگی کے ہر زمانہ میں کتے رکھے۔ اور میرا یہ یقین ہے کہ

شکتی کی وفا شعاری کا مقابلہ کرتی، دوسرا جازر نوکیا کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا۔ اور گناہ اپنے مالک کا جتنا وفا شعار ہے۔ اتنا کوئی مرید اپنے پیہر کا۔ کوئی چیلہ اپنے گورو کا اور کوئی گمازہ اپنے آقا کا وفا شعار نہیں۔ میں جب نابھ میں تھا۔ تو شملہ کے ایک انگریز سے میں نے سیاہ رنگ کا کاسکریٹ بچہ خریدا۔ اس زمانہ میں اتنی گرائی نہ تھی یہ بچہ میں نے پندرہ روپیہ میں خریدا۔ کیونکہ شملہ میں گتوں کے بچے عام طور پر مل جاتے تھے۔ یہ بچہ میں نابھ لے آیا۔ اور یہ میرے پاس رہا۔ میں جب ہمارا جہ کی معزولی کے بعد کرتار ہو کر نابھ کی ایک سرکاری بلڈنگ میں نظر بند کر دیا گیا تو میں آتے ہوئے یہ لکھتا اپنے پردوس کی ایک خاتون کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لئے دے دیا۔ دو تین روز کے بعد میں نے اسے پہرہ والی گارڈ کا سپاہی بھیج کر اپنے پاس منگایا۔ اور میں جب تک نظر بند رہا یہ لکھتا میرے پاس رہی۔ اور اس نے میری نظر بندی کے زمانہ میں بھی میرا ساتھ دیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے سردار سردول سنگھ کو بٹرنے نئی دہلی کی ایک میم سے سلکی سڈنی منل کے تین ٹہیت ہی خوبصورت بچے خریدے۔ یہ میم جنرل انگلک کمانڈر انچیف افواج ہند کی دوست تھی۔ اور میرے اس میم کی کتیا اور جنرل انگلک کے گتے دونوں کی مشترکہ اولاد تھی۔ ان تین بچوں میں سے ایک بچہ سردار سردول سنگھ نے مجھے دے دیا۔ گتوں کی سڈنی منل بھی ٹہیت محبت کی منل ہے۔ یہ کتا جس کا نام راجہ تھا۔ میرے پاس شملہ تک رہا یہ چن منٹ کے لئے بھی میری جذباتی پسند نہ کرتا تھا۔ اگر میں پلنگ پرسوجاؤں تو یہ میرے جوتوں پر سر رکھ کر سو جاتا کہ میں اس کی بے خبری کے عالم میں کہیں چلانا جائیں اور جب جتے ہیں کر جاؤں۔ تو یہ بھی ساتھ جاتے ہیں منل خانہ میں جاتا تو جب تک منل خانہ سے باہر واپس نہ آتا یہ دروازہ پر بیٹھا رہتا اور یہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے جدا ہونا پسند نہ کرتا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں اس زمانہ میں ماسٹر تاناو سنگھ کے چلائے گئے ایک مقدمہ میں جب پیشی پر امر ستر جاتا تو یہ باوجود گمازہ کی کوشش کے کچھ نہ کہتا۔ اور دن رات میری چارپائی کے قریب بیٹھا رہتا۔ ایک بار میں دور دراز امر ستر رہا۔ تو اس نے دور دراز اور تین رات کچھ نہ کھایا۔ اور جب واپس پہنچا تو اس نے کھانا کھایا۔ یہ کتا میرے پاس کئی برس رہا ٹہیت چھوٹے قد کا خوبصورت تھا۔ اور اس کے بال سنلک یعنی ریشم کی طرح سلاطین اور سفید تھے۔ اس بچہ کو کوئی شخص لگی میں سے آٹھارے گیا۔ اس کے چوری ہونے کے بعد اسے تمام ٹھریں تلاش کر دیا گیا۔ مگر آج تک نہیں مل سکا اور اس کا اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے۔ تو اس کے گم ہونے کا بے حد افسوس ہوتا ہے۔

چند برس ہوئے میں نے ایک مادہ بچہ ایلٹین منل کا خریدا۔ یہ منل دوسری تمام قہقہے گتوں سے زیادہ وفا شعار اور خوشنما رہتی ہے اور یہ اپنے مالک کی ٹہیت ہی وفادار ہے اس کے لئے اپنی جان بھی دے دیتی ہے۔ مگر وہ سردول کی ٹہیت دشمن ہے۔ چنانچہ اس قہقہ کی شاخیں موجود ہیں کہ اس منل کے گتے کے مالک نے اگر اپنی بیوی کی طرف بھی اشارہ کیا تو اس نے بیوی پر حملہ کر دیا حالانکہ بیوی اس گھر میں کئی برس سے رہتی تھی۔ میرے پاس جو کتیا تھی۔ اس کا نام سیگم تھا۔ اس بیگم کی موجودگی میں چاہے دودھانے کھائے رہیں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص میرے کردوں میں آ سکے۔ اس بیگم کے واقعات ٹہیت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کے مطابق کسی کے گھر میں بغیر آوازا یا اطلاع دیئے جانا ایک

عام کمزوری ہے۔ اس کمزوری کا جواب یہ بیگم تھی۔ مینی انگر کوئی شخص میرے مکان میں بغیر اطلاع دیئے داخل ہو گیا۔ تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بیگم کے محلہ سے بچ سکے۔ چنانچہ جو لوگ جانتے تھے وہ پہلے اطلاع کرتے اور میں بیگم کو زنجیر سے باندھتا۔ تو پھر وہ محفوظ صورت میں آسکتے۔

یہ بیگم بھنگن کی بہت سخت دشمن تھی۔ بھنگن جب ہر روز صفائی کے لئے آتی اور کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ٹوکرا بھر کر لے جاتی تو یہ بیگم محسوس کرتی کہ یہ ہر روز چاہے گھر کو لٹٹے کے لئے آتی ہے۔ اس پر ہلک پک پڑتی۔ چنانچہ بھنگن جب آتی تو نگلی میں سے ہی آواز دیتی کہ گتیا کو باندھو۔ اس دارنگ پر بیگم کو زنجیر سے باندھ دیا جاتا اور بھنگن صفائی کرتی۔ مگر جب تک کہ بھنگن صفائی کرتی رہتی بیگم زنجیر کو توڑ کر بھی اس پر حملہ کی ناکام کوشش میں مصروف رہتی۔ چنانچہ ایک روز یہ بھنگن بیمار ہو گئی اور اس کی جگہ گھر کی صفائی کرنے کے لئے اس کی کوئی دوسری رشتہ دار بھنگن آئی۔ اس بھنگن کو بیگم کا علم نہ تھا۔ یہ جب صفائی کرنے کے لئے زمین پر چڑھی تو بیگم اس پر ہلک پڑی۔ اور اس کی ٹانگ کو پکڑ لیا۔ دواچہ کے قریب شہر اڑھم آیا۔ اور اس بھنگن کا ہسپتال میں علاج کرانا پڑا۔

جب کوئی نیا ملازم رکھا جاتا تو کوشش کی جاتی کہ اس کے ہاتھوں سے دو چار روز بیگم کو کھانا کھلایا جائے تاکہ بیگم میں اس ملازم کے لئے انس پیدا ہو۔ اور دو چار روز ملازم کے ہاتھوں سے کھانا کھلانے کے بعد یہ جوتا کہ بیگم ملازم کو نہ کاٹتی اور جب یہ کھانا کھلاتا تو دم ہلا کر انہماک محبت کرتی مگر یہ ملازم کی وفا شعار کبھی نہ ہوتی چنانچہ ایک ملازم کئی ماہ سے کام کر رہا تھا۔ ایک روز میں اس سے ناراض ہوا۔ اور اس کو تھپڑ مارا۔ بیگم پاس بیٹھی تھی۔ میرے تھپڑ مارنے کو دیکھتے ہی ملازم پر ہلک پڑی۔ اور بہت شکل کے ساتھ ملازم کو بھایا گیا۔

ایک روز دھوبی کپڑے لینے کے لئے آیا کپڑے گئے اور دیکھتے گئے۔ ہم کئی آدمی تھے۔ اور بیگم بھی پاس ہی خاموش بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ اور جب دھوبی کپڑوں کی گٹھڑی لے جانے لگا تو یہ اس پر ہلک پڑی۔ کیونکہ اس نسل کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ کسی کو کوئی شے گھر سے لے جانے دے۔

سردار بہادر بھگوان سنگھ میر سٹراجمیر نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بھی ایک البیشین (سب سے پہلے یہ نسل جرمنی میں ایک بھیڑیے اور گتیا کے ملاپ سے پیدا کی گئی تھی۔ اور جرمنی سے یہ نسل ہندوستان لائی گئی) کاگتا تھا۔ گھر کے لوگ جب سینا جاتے۔ تو وہ بچوں کو اس گتے کی حفاظت میں جھوٹا جلاتے۔ چنانچہ ایک روز شام کو سردار بھگوان سنگھ واپس گھر آئے۔ گھر کے تمام لوگ سینا گئے ہوئے تھے۔ سردار صاحب کا دوسراں کا ہوتا چار پائی پر سر رہا تھا۔ اور یہ گتا اس کے ساتھ چار پائی پر بیٹھا۔ بچہ کے جسم پر ایک پاؤں رکھے تھا۔ تاکہ کوئی شخص بچہ کو آٹھانے نہ جائے۔

البیشین نسل کے گتے اب پولیس کی تنقید میں بہت اہم ضیات انجام دیتے ہیں۔ اور فوج میں بھی ان کے لئے ایک نیا حکمہ قائم کر دیا گیا ہے کیونکہ اس نسل کے کتوں میں سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اگر کوئی نسل ہو تو یہ سونگھ کر جہاں جاتاں گیا ہو اس کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کا یہ چشم دید واقعہ ہے۔ کہ اگر ہندوہ میں منٹ پہلے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ اور داخل ہونے کے بعد چلی گئی۔ تو میری گتیا بیگم اس جلی

کا سرخ آئس راستہ کو سونگھ سونگھ کر نکالیتی جس راستہ سے کہتی گئی۔  
 بیگم جب تک میوے پاس رہی یہ ممکن نہ تھا کہ رات کو دس گیارہ بجے کے بعد اور صبح تک اگر کوئی شخص گلی  
 میں سے گزرے اور اس نے گھر کے اندر ہی بیٹھے بھونک کر اس کا خیر مقدم نہ کیا ہو۔ یعنی بجے سوتے ہوئے  
 جلم ہو جاتا تھا کہ گلی میں سے کوئی شخص گزر رہا ہے۔ دو برس ہوئے میری ماموں زاد بہن آئیں۔ تو انہوں نے  
 خواہش ظاہر کی کہ بیگم کا ایک بچہ ان کو دیا جائے۔ کیونکہ ان کے بیٹے جو دہلی چھاؤنی کی ایک ملٹن میں کرنل ہیں  
 کی کوٹھی میں چوری ہو گئی ہے۔ ان کے آنے سے پہلے بیگم کے تمام بچے دوستوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ میں  
 انکار نہ کر سکا۔ اور میں نے کہا کہ آپ بیگم کو ہی لے جائیے۔ اگر چہ روں کا زیادہ خوف ہو۔ کیونکہ ان کی کوٹھی جگل  
 میں تھی۔ چنانچہ ان کا بیٹا کرنل کھنڈ بیگم کو اپنی کوٹھی لے گیا۔ اب بیگم وہاں ہی رہتی ہے۔ اور ان کا بیان  
 ہے کہ اس کے وہاں پہنچنے کے بعد پہلے ہفتہ ہی پوسٹاسٹر کا خط آیا کہ اپنی ڈاک ڈاکا نہ سے منگالیا کہ کیونکہ  
 گتیا خطوط دینے کے لیے پوسٹمن کو کوٹھی کے اندر جانے نہیں دیتی۔ دودھ دینے والے نے اگر دودھ دینے  
 سے انکار کر دیا۔ کیونکہ بیگم اس پر پیک پری تھی۔ اور ان کی کوٹھی لگا کیا سوال ہے اب بیگم پڑوس کی ساتھ  
 والی تین کوٹھیوں کی بگرنی کرتی ہے۔ اور رات کو کوئی چور تو کیا کوئی سادھو بھی ان کوٹھیوں کے قریب  
 نہیں جاسکتا۔

کتنے اور بتی کی فطرت میں بہت بڑا فرق ہے۔ کتنا اپنے مالک کا وفا شعار ہوتا ہے اور بتی اپنے گھر سے  
 آئس رکھتی ہے۔ یعنی کتنے کا مالک گھر میں ہو یا سفر میں یا وہ مکان بدل لے کتنا اپنے مالک کو نہیں  
 چھوڑتا یہ اس سے محبت کرتا ہے مگر بتی کو اپنے مالک سے قطعی محبت نہیں ہوتی اس کو صرف مکان  
 سے آئس ہوتا ہے یعنی ایک مکان میں رہائش رکھنے کے لئے دس خاندان بدل جائیں بتی وہاں ہی رہے  
 گی مگر کتنا اپنے مالک کے ساتھ نقل مکانی کرتا رہے گا۔ بتی کے متعلق بھی ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔  
 کئی برس ہوئے میں مہلٹن روڈ والے مکان میں رہتا تھا اور وہاں ایک بتی بہت تنگ کرتی تھی۔ میں نے ایک روز  
 فیصلہ کیا کہ اس بتی کو پکڑ کر دور چھوڑنا چاہیئے۔ چنانچہ جب بتی ایک کمرہ میں تھی۔ تو اس کمرہ کے دروازے  
 ہنڈ کر کے بتی کو پکڑ لیا گیا اور اس کو ایک خالی بوری میں بند کر کے موٹر میں رکھ کر میں اس کو اپنے مکان  
 سے چھ میل دور شہر سے باہر جگل میں لے گیا۔ وہاں بوری کھول کر اس کو چھوڑ دیا اور کار میں واپس آ گیا۔  
 میں مطمئن تھا کہ نہ تو بتی کو ہلاک کرنا پڑا۔ اور اس سے چھٹکارا بھی ہو گیا۔ مگر چار روز کے بعد دیکھا کہ یہی بتی پھر  
 واپس گھر میں آ گئی تھی۔ حالانکہ جب میں اس کو لے گیا تو یہ بوری میں بند تھی۔ اس نے راستہ نہ دیکھا تھا۔ مگر  
 اس میں سونگھنے کی قوت اتنی تیز تھی کہ یہ راستہ کو سونگھ سونگھ کر واپس اپنے گھر آ گئی اور شاید یہ اب  
 بھی اس مکان میں ہی رہتی ہو۔ کیونکہ بتی جب تک زندہ رہے اسی مکان میں رہتی ہے۔ اور کتنا جب تک زندہ  
 رہے اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا۔ کتنوں کا پالنا بہت مشکل ہے کیونکہ جب ان کا بچپن کا زمانہ ہو تو یہ جگہ جگہ پاحسانہ  
 کر دیتے ہیں۔ ان کو سدھانے میں بہت کانی وقت صرف ہوتا ہے۔ اور ان کی محنت کا خیال کرتے ہوئے ان کو  
 چست و چالاک رکھنے کے لیے دو دوائی دینی اور ان کو ورزش کرائی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک بیماری  
 ڈسٹمبر ہو جاتی ہے۔ جس سے یہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری ڈسٹمبر کی اب ویکسین تیار ہو گئی ہے

## پھانسی کے منتظر

عام پبلک میں تو بہت ہی کم لوگوں کو پھانسی کے منتظر قیدیوں سے بات چیت کرنے یا پھانسی لگنے یا دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو گا مگر ایڈیٹر ریاست، کو پھانسی کے درجنوں منتظر لوگوں سے بات چیت کرنے اور کئی ایک کو پھانسی لگتے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔

سب سے پہلے تو ایڈیٹر ریاست نے پھانسی لگتے انسان کو فیروز پور کے جیل میں دیکھا جبکہ اس کی عمر صرف سولہ برس کی تھی اور یہ فیروز پور جیل کے ہسپتال میں ملازم تھا۔ پھانسی لگتے وقت جیل کے ملازموں کے علاوہ ایک مجسٹریٹ (جو یہ تصدیق کرتا ہے کہ اس شخص کو فی الحقیقت پھانسی دی گئی) اور ایک اسٹنٹ سرجن یا سول سرجن (جو یہ تصدیق کرتا ہے کہ پھانسی پلنے والے کی جان نکل گئی ہے اور یہ فی الحقیقت مر چکا ہے) کا ہونا ضروری ہے۔

پھانسی کے متعلق پوزیشن یہ ہے کہ جس روز ملازم کو سیشن جج پھانسی کی سزا کا حکم سنائے اس روز سے ہی اس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے اور اس کے عدالت سے واپس جیل پہنچتے ہی اس کی بہت احتیاط کے ساتھ تلاشی لی جاتی ہے تاکہ یہ باہر سے اپنے ساتھ کوئی زہر نہ لے جائے۔ اور پھانسی لگنے سے پہلے یہ خودکشی دگرے جیل میں پہنچنے کے بعد اس کو دوسرے قیدیوں سے بالکل الگ ایک کوٹھری میں رکھا جاتا ہے جو ایسے مجرموں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہ کوٹھریاں پتھر اور سیمنٹ کی پختہ ہوتی ہیں جن میں ذرتوں قب لگائی جاسکتی ہے اور وہ دباؤ کوئی شے چھپائی جاسکتی ہے۔ ان کے ہر قیدی کی لازمی طور پر دن میں دو بار یعنی صبح و شام تلاشی لی جاتی ہے۔ کوئی شخص ان کے قریب نہیں جاسکتا تاکہ یہ کسی سے زہر حاصل نہ کر سکیں۔ رات کو تین تین گھنٹہ کے بعد ان کو جگا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ یہ شخص زندہ ہے اور کوٹھری کے دروازہ پر دن رات سخت پہرہ رہتا ہے اور پہرہ دینے والا بٹلے ہوئے نگرانی کرتا رہتا ہے۔ پھانسی کی اس کوٹھری میں ایک مجرم کو کئی کئی ماہ رہنا پڑتا ہے کیونکہ سیشن جج کے فیصلہ کے بعد اس کی اپیل ہائی کورٹ میں ہوتی ہے اور ہائی کورٹ کے بعد یہ اپنی قسمت کے آخری فیصلہ کے لئے سپریم کورٹ وغیرہ کسی اعلیٰ عدالت کا دروازہ بھی اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جب اس کی اپیل کا آخری فیصلہ ہو جائے تو سزا دینے والی سیشن جج کی عدالت اس کو پھانسی دینے کی تاریخ اور وقت مقرر کرتی ہے اور اسے پھانسی دینے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جب پھانسی دینے کی تاریخ مقرر ہو جائے تو جیل سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو صبح سورج نکلنے سے پہلے کسی مجسٹریٹ کو سمجھنے کا انتظام کیجئے (پھانسی ہمیشہ سورج نکلنے دی جاتی ہے۔ صرت مرحوم سردار بھگت سنگھ کو شام کے سات بجے پھانسی دی گئی تھی تاکہ رات میں ان کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے) اور سول سرجن کو لکھا جاتا ہے کہ تاریخ اور وقت مقررہ پر خود



تشریف لائیے یا اسسٹنٹ سرجن کو بھیجئے۔ پھانسی پانے والے کے رشتہ داروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ کو پھانسی دی جائے گی۔ آخری ملاقات کے لئے اس تاریخ سے ایک روز پہلے جیل میں بیچ جلیے اور پھانسی دینے والے بھنگیوں کا یہ خاندان ساہا سال سے پھانسی دینے کا کام کرتا ہے۔ اس کو ریلوے کے کرایہ کے علاوہ فی پھانسی کچھ روپیہ بطور ملاؤنس ملتا ہے اور جہاں بھی پھانسی ملنی ہو یہ بھنگی ایک دو روز پہلے بیچ کر پھانسی دینے کا سامان یعنی رستہ وغیرہ کو دیکھ لیتا ہے اگر اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ سے پہلے بیچ جاوے۔

پھانسی لینے کا عذاب تو چند منٹ کا ہوتا ہے مگر پھانسی کے انتظار کا عذاب ناقابل بیان اور ناقابل برداشت ہے جس کو پھانسی ملنے کے عذاب سے ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ پھانسی پانے والے کو ایک ایک منٹ ایک ایک سال کی طرح طویل محسوس ہوتا ہے۔ پھانسی ملنے سے ایک روز پہلے مجرم کے رشتہ دار اور عزیز بیچ جاتے ہیں۔ عام طور پر سہ پہر کے وقت ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ نقطہ اردہ بہشت ہی دردناک جزا ہے کیونکہ پھانسی پانے والے کو تو یقین ہو جاتا ہے کہ اگلے روز یہ اس دنیا میں نہ ہوگا اور رشتہ دار یہ جانتے ہیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اس ملاقات کے بعد یہ صرف اس کی لاش کو ہی کھیل کر سکیں گے۔ اسے زندہ حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ ملاقات کا یہ وقت جو نصف یا ایک گھنٹہ کے قریب ہوتا ہے اسے رونے، چیخنے، چلانے، نصیحت کرنے اور گھروالوں کو آئندہ کے لئے چند باتیں دینے میں صرف ہو جاتا ہے۔ ملاقات کے بعد جب یہ لوگ علیحدہ ہوتے ہیں تو گھر والے اپنے عزیز کو مڑ مڑ کر حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

جس روز پھانسی ملنی ہو اس روز صبح جیل کی تمام بارکوں اور کوٹھریوں کے دروازے اور تالے بند رہتے ہیں تاکہ قیدی پھانسی میں رکاوٹ کا باعث نہ ہوں۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے کہ پھانسی والے کی کوٹھری میں باپ کا ایک ٹین پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ یہ آخری غسل کرے غسل کے بعد اس کو سیاہ رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنا دیا جاتا ہے اور جیل کے سپاہیوں کی ایک گارڈ اس کو پھانسی گھر تک لے جاتی ہے جہاں کہ جیل کے انصرمول سرجن یا اسسٹنٹ سرجن اور میٹریٹ موجود ہوتے ہیں۔ پھانسی پانے والوں میں شاید پانچ فی صدی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس وقت بغیر کسی سہارے کے خود بخود عرصہ کے ساتھ کوٹھری سے پھانسی گھر تک چل سکتے ہیں ورنہ ان کی حالت نیم مردہ کی سی ہوتی ہے جو چند قدم بھی بغیر سہارے کے چل نہیں سکتے۔ قیدی جب پھانسی گھر میں پہنچے تو اس کو سیاہ رنگ کی بسی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے جس میں اس کا تمام چہرہ بھی گردن تک چھپ جائے اور یہ باہر کی کسی شے کو دیکھ نہ سکے۔ یہ ٹوپ پہنانے کے بعد اس کی گردن میں پھانسی کا رستہ باندھ دیا جاتا ہے جو اوپر لٹکا ہوتا ہے۔ اس رستہ کے نیچے چند گز زمین گہری کھدی ہوتی ہے اور اس پر لوہے کے تختے لگے ہوتے ہیں جہاں کہ مجرم کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جب اس کے گلے میں رستہ باندھ کر اسے تختوں پر کھڑا کر دیا جائے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کہتا ہے۔

”فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں تم کو پھانسی دی جاتی ہے۔“

یہ سنتے ہی پھانسی دینے والا بھنگی جو رستہ گلے میں باندھتا ہے لوہے کے تختوں کو نیچے گرا دیتا ہے اور

پھانسی پانے والے کی گردن رستہ کے ساتھ لٹک جاتی ہے۔ جب گردن لٹکتی ہے تو پھانسی پانے والے کا جسم نہایت ہے اور بھنگی نیچے جا کر مجرم کی ٹانگوں کو کھینچتا ہے تاکہ گردن میں رستہ اچھی طرح سے کسا جائے اور ماسن آدور جانے سکے۔ مجرم نصف گھنٹہ کے قریب لٹکتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گلے کا رستہ کھول کر ہس کی لاش کو چار پائی پرٹ دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر (جو وہاں منتظر کھڑا رہتا ہے) اس کی نبض وغیرہ کو دیکھ کر تصدیق کرتا ہے کہ مجرم مر گیا ہے اور اس میں زندگی باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد لاش والی چار پائی کو چار قیدی اٹھا کر جیل سے باہر لاتے ہیں۔ اگر تو پھانسی پانے والے کے رشتہ دار موجود ہوں تو لاش ان کے حوالہ کر دی جاتی ہے اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو یہ قیدی ہی ایک دار ڈر کے ساتھ لاش کو مر گھٹ یا قبرستان میں لے جاتے ہیں۔

پھانسی کے امیدوار قیدیوں سے دوسرے عام قیدیوں کو لینے یا بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی مگر میں جس جیل میں رہا وہاں کے افسر میرا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے۔ اس لحاظ کی وجہ چاہے تو یہ تھی کہ وہ میرے اخلاص، میری پہلک خدمت اور میری دایاں ریاست کے ساتھ مقدمہ بازی سے متاثر تھے یا یہ خوف زدہ تھے کہ رہا ہونے کے بعد میں ان کو بے نقاب کروں گا اور ان کے لئے مصائب پیدا ہوں گی۔ بہر حال جیلوں میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کبھی کسی خواہش کا اظہار کیا ہو اور جیل کے افسروں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے پھینک دیا۔ میں نے وہی جیل کے افسروں سے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے پھانسی کی کوٹھڑیوں میں مجرموں سے ملنے اور بات چیت کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکوں تو ان افسروں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دے دیا تھا کہ میں جب بھی چاہوں ان قیدیوں سے بات چیت کر سکوں۔ چنانچہ میں جب تک دہلی جیل میں رہا پھانسی کے منتظر قیدیوں سے اکثر مل کر باتیں کیا کرتا۔

سبزی منڈی دہلی کے ایک غنڈے کو چھڑے کے ساتھ ایک دوسرے شخص کے ہلاک کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ غنڈہ تمام سبزی منڈی کے غنڈوں میں ایک اہم شخصیت تھا۔ اس کی بیوی اور ایک چھوٹی سی تین برس کی بچی اس سے آخری ملاقات کے لئے پھانسی سے ایک روز پہلے جیل میں آئیں۔ جب ملاقات شروع ہوئی تو میں بھی وہاں پہنچ گیا اور غدر کے ساتھ ان کی باتوں کو سننا رہا۔ بیوی تو روتی اور چیختی ہوئی ایسی کہتی رہی کہ آئندہ کیا کروں گی بچی کی پرورش کیسے ہوگی۔ اور زندگی کیسے گزرے گی۔ غنڈہ دجاس سے پہلے جیل میں بھی اپنے غنڈہ وین کی دھاک بٹھاتے ہوئے ڈینگیں مارا کرتا تھا اور اپنے آپ کو پھانسی سے بھی بے نیاز سمجھتا تھا۔ جواب میں حوصلہ دیتا رہا مگر اس کی زبان صاف نہ چلتی تھی اور اس میں اندیشہ سی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ پر پھانسی کا بہت بڑا اثر ہے اور یہ موت سے خوف زدہ ہے۔ میں نے جب اس کی زبان کی یہ کیفیت دیکھی اور محسوس کیا کہ یہ اچھی طرح سے بات بھی نہیں کر سکتا تو میں نے مزید کریدنے کے لئے اس سے کہا ”تم حوصلہ کرو، گھبراؤ نہیں، مردوں کی طرح موت کا صفت برد کرو“ اس کے جواب میں بھی اس کی زبان اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی اور اس نے جواب دیا ”سردار جی۔ سردار جی۔ میں۔ میں۔ میں حوصلہ میں۔ حوصلہ میں ہوں۔ میں۔ میں۔ گھبراتا۔ گھبراتا نہیں“ یعنی یہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ حوصلہ میں ہوں اور گھبرا نہیں رہا مگر موت کے خوف کے باعث اس کے منہ سے صاف الفاظ

بھی نہ نکلتے تھے۔ اگلے روز جب یہ غنڈہ پھانسی گھر لے جایا جا رہا تھا تو اس سے قدم نہ اٹھنا تھا اور جیل کے وارڈز اس کو سہارا دے کر لے جا رہے تھے۔

پشاور کا ایک غنڈہ دہلی میں مقیم تھا۔ اس نے جنت و عنت کی راہ میں اپنی داشتہ طوائف کے ایک دوسرے آشتی کو قتل کر دیا تھا۔ پھانسی سے ایک روز پہلے اس کا کوئی دوست عزیز ارشد دار اس کی ملاقات کے لئے نہ پہنچا اور جیل والوں نے جب پوچھا کہ تم کوئی وصیت کرنا چاہتے ہو تو لکھا دو تو اس نے جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ جب اس کو دفن کیا جائے تو اس کے بالوں کو دو جگہ دن تک خوبصورت پٹوں کی صورت میں تھے۔ سنوار کر دفن کیا جائے اور اس کی لاش پشاور لے جا کر دفن کی جائے۔ اس کا کوئی وارث ہی موجود نہ تھا۔ اس کی لاش کو پشاور کو نلے جاتا۔ جیل کے قریب کے قبرستان میں اس کی لاش دفن کر دی گئی اور بالوں کے متعلق اس کی آخری وصیت اور خواہش کو سنکر میں حیران تھا کہ انسان قبر کے متعلق بھی کس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ سٹی اور کیڑوں کے اثرات سے اس کی لاش ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کے بالوں کی تعریف کرنے والے قبر میں بھی موجود ہوں گے۔

میں نوجوان نے مولوی منظر الدین ایڈیٹر "الامان" کو قتل کیا تھا میں اس سے اکثر ملنا کرتا تھا یہ راہ گاہ بہت خوبصورت تھا اور اس کی عمر بائیس تیس برس کی ہو گی۔ یہ راہ گاہ کانگریسوں کی محنت میں رہتا تھا اور مولوی منظر الدین بہت ہی کٹر مہتمم کے مسلم لیگ تھے۔ اپنے اخبار میں ہر روز کانگریس اور کانگریسوں کے خلاف لکھتے اور اس نوجوان کا مقصد مولوی منظر الدین کو قتل کرنا نہ تھا بلکہ ان کی ناک کاٹنا تھا اور یہ اس ارادہ سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ دفتر "الامان" میں گیا تھا مگر حملہ کے وقت چونکہ مولوی منظر الدین اپنی کرسی سے مقابلہ کے لئے اٹھے اور انھوں نے حملہ آور کو گرفتار کرنا چاہا تو حملہ آور نے اس کشمکش میں ہی مولوی صاحب کے سینہ میں چاقو مارا جس کے باعث وہ ہلاک ہو گئے۔

میں اس نوجوان سے جب بھی ملتا تو یہ نوجوان مجھ سے سوال کرتا کہ پہلک کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں اس نوجوان کی دلدادہی کے لئے جب یہ کہتا کہ لوگ اس کے قتل کی بہت تعریف کرتے ہیں اور اس کو بہادر سمجھتے ہیں تو اس کا چہرہ پھانسی کی کوٹھری میں بھی خوشی کے ساتھ مسخر ہو جاتا۔ یعنی شہرت کا خیال اس کے لئے پھانسی کی کوٹھری میں بھی سترت اور اطمینان کا باعث تھا۔

اس نوجوان کے پھانسی ملنے سے ایک روز پہلے جب اس کے گھر کے لوگ اس سے ملنے کے لئے آئے تو میں دکان موجود تھا اور میں اس منظر کو زندگی میں کبھی نہیں سکتا اس کی ماں کی عمر چالیس برس کے قریب ہو گی۔ جب یہ آخری ملاقات کے لئے جیل میں آئی تو نیم ہنگام سی تھی۔ یہ بڑے پٹے ہوئے تھے مگر اس میں بڑے کو سنبھالنے کا احساس ہی نہ تھا۔ اور یہ بڑے کو چہرے پر اٹھائے جیل کی باد کوں کو ہانکوں کی طرح دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ جب یہ اپنے اکلوتے، نوجوان اور خوبصورت بچے سے آخری ملاقات کر رہی تھی تو اس کے حواس اس کے قابو میں نہ تھے اور شدت غم کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور یہ قطعی خاموش دور گم غم اپنے بیٹے کو دیکھتی ہی۔ اس کا باپ بیٹے سے باتیں کرتا رہا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ماں کے مقابلہ پر باپ کم غمزدہ ہے۔ باپ باپ حوصلہ میں ہے۔ جب تک ملاقات جاری رہی ماں گم غم بیٹھی اپنے بچہ کو دیکھتی رہی۔ بچہ روتا رہا، باپ بچہ

کو حوصلہ دیتا رہا اور جھوٹی بچیاں اپنے بھائی کو روتا دیکھ کر رو رہی تھیں۔ جب اس نوجوان کی ماں ملاقات کے بعد جیل سے باہر جا رہی تھی تو اس وقت بھی یہ یا نگلوں کی طرح جیل کی بارکوں کو دیکھتی جاتی تھی اس نوجوان نے ملاقات کے وقت اپنی جن آخری خواہشات کا اظہار کیا ان میں ایک یہ بھی خواہش تھی کہ اس کی نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھی جائے۔ اور چونکہ اس کے جنازہ کے ساتھ کانگریسی مسلمان اور دوسرے لوگ کثرت کے ساتھ ہوں گے، اس کے جنازہ کو بانس بانڈھ دے جائیں تاکہ زیادہ لوگ اس کے جنازہ کو کندھا دے سکیں۔ چنانچہ جنازہ کی نماز تو جامع مسجد میں پڑھی گئی مگر شاید ایک کانگریسی مسلمان بھی اس غریب کے جنازہ کے ساتھ شامل نہ ہوا اور جنازہ کے بانس بانڈھنے کے بعد کھول دینے پڑے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان فطرتاً ہی چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اسے اچھی شہرت نصیب ہو۔

ایک نوجوان ہندوستانی عیسائی جس کا نام غالباً ڈیفنس تھا کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ شخص نئی دہلی کے ایک گرجا میں بطور چپراسی ملازم تھا۔ اگر جا کے قریب سرکاری کوارٹروں میں سے سکھوں کا ایک خوبصورت بچہ گر جاکی باہر کی چھوٹی سی دیوار کو پھانڈ کر پھول توڑنے کے لئے گر جاکی باغیچے میں داخل ہوا تو اس ڈیفنس نے بچہ کو کپڑا لیا اور اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اس نے بچہ کے ساتھ خلاف وضع فطری کی اور جب بچہ نے شور پیدا کیا تو اس نے گرفتار ہونے کے خوف سے بچہ کو ہلاک کر دیا۔ کچھ عرصہ بچہ کے والدین بچہ کو تلاش کرتے رہے بچہ نہ ملا۔ آخر جب کسی نے بتایا کہ بچہ پھول توڑنے کے لئے گر جاکی حدود میں دیوار پھانڈ کر گیا تھا تو گر جاہیں تلاش شروع ہوئی اور بچہ کی لاش چپراسی کے گھر سے ملی اور ڈیفنس گرفتار ہوا۔ اس گرفتاری کے صدرہ کا اثر ڈیفنس کے دماغ پر ہوا اور جب میں اس سے تین گزاتھا تو محسوس ہوتا تھا کہ یہ کچھ تری صدی پہلے ہے۔ اس پاگل پن کے باعث ڈیفنس دنیا کے تفکرات سے قطعی بے نیاز تھا۔ پھانسی کی کوٹھری میں بھی خوش رہتا۔ میں جب اس سے بات کرتا تو یہ سکتا اور میں مقدمہ کا ذکر کرتا تو یہ جواب دیتا کہ رات کو حضرت مسیحؑ نہ نہیں لائے تھے اور وہ کہتے تھے کہ مقدمہ میں بری ہو جائے گا۔ ڈیفنس جب پھانسی کی کوٹھری سے پھانسی گھر کو جا رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے پہرے پر کوئی تشریف یا کیک کے اثرات نہ تھے۔ یہ مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا اور تمام لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہ بیچارہ پاگل ہے مگر میں سوچتا تھا کہ پاگل پن بھی خدا کی ایک نعمت ہے جس کے باعث انسان دنیا کے تفکرات بلکہ موت کے خوف سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

پھانسی کی کوٹھری میں بند پھانسی کے منظر قیدیوں سے ملاقات کر کے سائیکالوجی کا ایک طالب علم بہت کافی مواد حاصل کر سکتا ہے۔ جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا اور یقیناً یہ ملاقاتیں ناقابل فراموش ہوتی ہیں۔

# گناہوں کی سزا اس جسم میں

اگر کبھی مغدہ پنجاب کے جیلوں کی تاریخ مکی گئی تو اس تاریخ میں ایک داروہ جیل جن کا نام غالباً رائے صاحب لالہ رام دتہ مل تھا بہت اہم ہوزیشن حاصل کریں گے ان لالہ رام دتہ مل نے قیدیوں کو ”ڈسپلن“ میں رکھنے کے اعتبار سے جیلوں میں جو منظم کیے اس کی تاریخ دنیا کے کسی ملک میں نہیں مل سکتی۔ اس زمانہ میں عادی مجرموں کے لیے جیل میں رہنے کے پھرے ہوا گتے جن میں یہ رات کو نیکر کر دیئے جاتے۔ یہ پھرے سادہ سے چھوٹے لمبے چار فٹ چوڑے اور پانچ فٹ اونچے تھے یہ پھرے بارک کے اندر ایک لائن میں ہوا کرتے اور جب تمام قیدی ان میں داخل کر دیئے جاتے تو ان تمام کو ایک ہی زنجیر میں باندھ کر کالا لٹکا دیا جاتا جس کا مقصد یہ تھا کہ جب تک کالا کھولنے کے بعد تمام زنجیر کو نہ نکالا جائے کسی ایک پھرے کا کھلنا ممکن نہ ہو۔ اس پھرے کے اندر ایک پینے کے لئے پانی کا برتن اور دوسری طرف پافانہ اور چٹاب کے لئے ایک برتن ہوتا کہ رات کو اگر قیدیوں کو پافانہ یا چٹاب کی حاجت یا پانی کی ضرورت ہو۔ تو ان کو پھرے سے نکالنے کی ضرورت نہ پڑے۔ راقم الحروف نے یہ پھرے فیروز پور جیل میں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ جب اس کی عمر سولہ برس کی تھی اور یہ اس جیل میں ملازم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان پھرے کو انسانوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ بنانے کے ذمہ دار بھی یہی لالہ رام دتہ مل تھے۔ اور آج جیلوں کی چار دیواری کے اندر جو پراسسٹم یعنی پہرہ دینے والے کا ہر وقت دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے رہنا موجود ہے۔ یہ بھی ان رام دتہ مل کی ایجاد ہے اور ہمارے ایک دوست کے بیان کے مطابق اس زمانہ میں جب کئی قیدی زیادہ ہی شرارت کرتا تو لالہ رام دتہ مل کے حکم سے اس قیدی کو جلتے ہوئے تھوڑا ب جیلوں میں تھوڑا موجد نہیں۔ اب روٹی تو اسے پر پکائی جاتی ہے۔ مگر اس زمانہ میں روٹیاں پکانے کے لئے بڑے بڑے تنور ہوا کرتے تھے (میں ڈال دیا جاتا اور سرکاری کاغذات میں لکھا جاتا کہ قیدی اس تنور میں اتھان سے گر گیا ہے۔

یہ لالہ رام دتہ مل جب جیل کے محکمہ میں ملازم تھے تو گورنمنٹ نے جیلوں کا تعلیم یافتہ لوگوں کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے عہدہ کے لئے ڈائریکٹ بھرتی کیا جاتے۔ اس سے پہلے ہر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یعنی داروہ کو ایک سپرنٹنڈنٹ سے ترقی کر کے بیس پچیس برس کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر پہنچنا ہوتا تھا۔ گورنمنٹ نے جب ڈائریکٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھرتی کرنے کا اعلان کیا اور اس سکیم پر عمل کیا گیا تو پہلے پچیس برس جو جوان بھرتی کیے گئے ان میں لالہ رام دتہ مل کے ایک صاحبزادہ مسٹر جن لال بھی تھے جنھوں نے ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ مسٹر جن لال کے قد کا انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ سانت فٹ کے قریب قد۔ معمولی انسان سے دگنا بلکہ سہ گنا زیادہ وزن۔ بہت موٹے موٹے ہونٹ اور کان۔ اور جسم کے دوسرے عضو بھی معمولی انسانوں سے دو گنے موٹے اور ہمیشہ ناک ٹیکل جس سے خوف محسوس ہو۔ مسٹر جن لال جب بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مقرر ہوئے تو ان کی تقرری سب سے پہلے اولڈ سنٹرل جیل ملٹن میں ہوئی۔ یہاں کہ اس زمانہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر ایک بہت ہی نیک دل اور خدا ترس سچو جیوا لٹر شاہ تھے جو بڑا پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور مذہبی اعتبار سے قادیان کے احمدی اور احمدیوں کے موجودہ پیشہ کے قریبی رشتہ دار۔ آپ کو ولایت کے تسلیم یافتہ تھے

اور ان کے گھر میں بھی پرہیز چوری تھیں۔ مگر نیکی۔ پارسائی۔ منہ زور و روزہ کے اعتبار سے آپ ایک بکے سلطان تھے۔

مسٹر چن لال کو ملازم ہوتے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ کانگریس کی تحریک شروع ہوئی اور سینکڑوں کی تعداد میں کانگریسی قیدی ہو کر ملتان جیل میں آ گئے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی اپنے جوہن پر تھی۔ کانگریسی قیدیوں کو جو رضائیاں اوڑھنے کے لئے دی گئیں ان میں ایک تو ردی کم تھی (جس کی وجہ غالباً رضائیاں تیار کرنے والے ٹھیکہ داروں کی کفایت شعاری اور رضائیاں تیار کرنے والے جیل کے بعض افسروں کی بے ایمانی اور بددیانتی تھی) اور دوسرے ان کی لمبائی اور چوڑائی کم تھی جیل کے نیکل بل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بیجر شاہ جب ان کانگریسی قیدیوں کو دیکھنے کے لئے ان کے وارڈ میں گئے تو ایک کانگریسی قیدی نے سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی کہ جو رضائی اس کو دی گئی ہے اس میں ردی کم ہے اور لمبائی میں بھی یہ چھوٹی ہے۔ یہ رضائی رات کو سردی سے اسے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اس شکایت کو سن کر سپرنٹنڈنٹ نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر چن لال کی طرف دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ردی اور لمبائی کم کیوں ہے۔ جب بیجر شاہ نے مسٹر چن لال کو اس طرح دیکھا تو مسٹر چن لال جو خانہ زانی اعتبار سے انگریزوں کے پروردہ تھے نے فوراً جواب دیا: ”جناب یہ کانگریسی بد معاش ہے اور چھوٹی شکایت کرتا ہے“ بیجر شاہ نے جب یہ جواب سنا تو انھوں نے اس جواب کو تکلیف کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ جانتے تھے کہ کانگریسی کسی اپنی ذاتی غرض یا جرم کے باعث جیل میں نہیں آئے مگر چونکہ مسٹر چن لال انگریزوں کے خانہ زانی گز گئے تھے بیجر شاہ نے صرف یہ حکم دیا کہ یہ رضائی بدل دی جائے۔ اس کے علاوہ آپ مسٹر چن لال سے کچھ کہہ نہ سکے۔

مسٹر چن لال کو اولاً سنٹرل جیل ملتان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ وہاں سکھ قیدیوں کی دوبارہ ٹیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مسٹر چن لال، بچپن سے ہی اپنے باپ سے جیلوں کے ڈسپلنری اکیشن کی داستانیں سنتے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے آئے تھے۔ آپ نے سکھ قیدیوں کی ان دونوں پارٹیوں کے دوسرے کردہ لیڈروں کے لئے حکم دیا کہ ان کو لاٹھیوں سے زدہ کر کے ان کو الگ الگ کھڑکیوں میں بند کر دیا جائے۔ اور ان کو رات کو اوڑھنے کے لئے کپڑا نہ دیا جائے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق پہلے تو دونوں پارٹیوں کے دونوں لیڈروں کو لاٹھیوں سے ”ٹھٹھک“ کی گئی اور پھر ان کو دو کھڑکیوں میں الگ الگ بند کر دیا گیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور پھر ملتان کی خشک سردی اپنے جوہن پر تھی۔ رات بھر کسی نے ان دونوں قیدیوں کی حالت کو نہ دیکھا صبح جب کوٹھڑیوں کے دروازے کھولے گئے تو پتہ چلا کہ دونوں قیدیوں کی کئی کئی جگہ سے لاٹھیوں کے باعث ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک قیدی رات کی سردی کے باعث نمونہ کا شکار ہو کر مر چکا ہے۔

اس سوت کی اطلاع صبح ہی بیجر شاہ کو انکی کوٹھی پر پہنچائی گئی۔ وہ فوراً موقع پر پہنچے۔ مسٹر چن لال نے چاہا۔ کہ اس معاملہ کو بھی اس طرح ہی ہمیشہ آپ ”اکر دیا جائے“ جس طرح ان کے باپ قیدیوں کو جیتے تنور میں ڈال سکتے تھے۔ مگر بیجر شاہ نیکہ دل اور انصاف پسند شخصیت تھے۔ آپ نے مرنے والے قیدی کی لاش کو تو پوسٹ مارٹم

کے لئے سول سرجن کے پاس سول ہسپتال بھیجا اور انسپکٹر جنرل جیل خانجات کو واقعہ کے متعلق تفصیلی تار دیا۔ چنانچہ سول سرجن نے توپرسٹ مارٹم میں یہ قرار دیا کہ مقتول کی کمی جگہ سے ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں جو ضربات کا نتیجہ ہیں اور انسپکٹر جنرل اگلے روز تحقیقات کے لئے لاہور سے ملتان پہنچ گئے۔ معاملہ پولیس کے سپرد کیا گیا اور پولیس نے لاٹھیاں مارنے والے جیل کے ملازمین کے علاوہ مسٹر چین لال کو بھی زیر دفعہ ۳۲۵ تعزیرات ہند کسی کو لاٹھیوں سے ضرب شدید پہنچانا اگر فٹ آر کر پیلہ اور مقدمہ عدالت میں گیا۔

اس مقدمہ میں مسٹر چین لال کو مجسٹریٹ نے دو سال قید سخت کی سزا دی مسٹر چین لال نے سیشن کورٹ میں اپیل کی تو سیشن جج نے یہ سزا چھ ماہ رہنے دی۔ سیشن جج کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر چین لال نے اپنی کورٹ میں اپیل کی تو یہ مقدمہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگلے کے سامنے پیش ہوا۔ سر ڈگلس نے جب مسئلہ میں تمام واقعات کو پڑھا تو آپ نے محسوس کیا کہ مقتول کے ساتھ جیل میں ظلم ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مقدمہ کا فیصلہ بہت سخت الفاظ میں لکھتے ہوئے ملازم کو پانچ سال قید سخت کی سزا دی (جو اس دفعہ کے مطابق زیادہ سے زیادہ دی جاسکتی تھی) دی اور لکھا اگر ہائی کورٹ کے اختیار میں ہوتا تو آپ دفعہ ۳۲۵ (ضرب شدید کسی گنہ آگے) کو دفعہ ۳۰۴ (قتل) کی صورت میں بدل کر ملازم کو موت کی سزا دیتے مگر چونکہ ہائی کورٹ قانوناً دفعہ کو تبدیل نہیں کر سکتی اس لئے دفعہ ۳۰۴ کے مطابق زیادہ سے زیادہ یعنی پانچ سال کی سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ مسٹر چین لال پانچ سال کی سزا کا سرٹیفکیٹ لے کر لاہور سینٹرل جیل میں تشریف لے آئے۔

ایڈیٹر "ریاست" جب لاہور سینٹرل جیل میں گیا تو مسٹر چین لال وہاں موجود تھے اور اتفاق کی بات ہے کہ جس پینٹل وارڈ میں یہ رہتے تھے اسی پینٹل وارڈ میں ایڈیٹر "ریاست" کو جگہ دی گئی اور مسٹر چین لال سے دن رات باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ اس زمانہ میں سینٹرل جیل لاہور کے سپرنٹنڈنٹ دی ڈاکٹر بھیر شاہ تھے جو ملتان میں مسٹر چین لال کے افسر تھے یعنی ملتان میں تو بھیر شاہ سپرنٹنڈنٹ تھے اور مسٹر چین لال اپنی سپرنٹنڈنٹ اور اب لاہور میں بھیر شاہ سپرنٹنڈنٹ ہیں اور مسٹر چین لال قیدی۔

ایک روز سردیوں کا زمانہ تھا اور سردی اپنے جوہر پر تھی۔ بھیر شاہ ہلے وارڈ میں قیدیوں کو دیکھنے لے آئے مسٹر چین لال نے بھیر شاہ سے درخواست کی کہ "جناب سردی بہت سخت ہے میرا قد بڑا ہے اور جرمائی دی گئی ہے اس میں روئی کہے اور لمبائی چوڑائی بھی کافی نہیں۔ رات کو مجھے سردی بہت محسوس ہوتی ہے اور نیند نہیں آتی۔ ہربائی فرما کر میرے لئے زیادہ روئی کسی بھی رضائی کا حکم دیا جائے" بھیر شاہ نے مسٹر چین لال سے جب یہ الفاظ سنے تو آپ کو ملتان کے کانگریسی قیدی کی رضائی کا واقعہ یاد آیا۔ آپ نے فوراً جواب دیا "مسٹر چین لال تمہیں یاد ہے کہ ملتان اولڈ سینٹرل جیل میں ایک کانگریسی قیدی نے شکایت کی تھی کہ اس کی رضائی میں روئی کہے اور لمبائی بھی کم ہونے کے باعث اس کو سردی محسوس ہوتی ہے تو تم نے کہا تھا کہ یہ قیدی بد معاش ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔ میں اب تمہاری درخواست پر کہتا ہوں کہ تم بد معاش ہو اور جھوٹ بولتے ہو" یہ کہہ کر بھیر شاہ آگے چل دیے اور مسٹر

چمن لال کی منگاہیں شرم کے باعث زمین کی طرف جھک گئیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ سرچمن لال اب کہاں ہیں۔ چند برس ہوئے ایک روز دفتر ریاست میں آئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کو کسی جگہ ملازم کرا دیا جائے۔ مگر میں ان کی اس خواہش کو پورا نہ کر سکا۔ سننا تھا کہ آج کل مشرقی پنجاب میں کسی جگہ انشورنس کے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کے گناہ معاف ہوں اور ان کی آئندہ زندگی آرام سے گزرے۔

## بیتیم ہونا بھی ایک نعمت ہے

مرحوم خان بہادر قاضی سرعزیز الدین احمد وزیر دتیا کے حقیقی بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد کی پہلی بیوی کے بطن سے جب بچہ پیدا ہوا تو یہ بیوی بچہ پیدا ہونے کے چند روز بعد انتقال کر گئیں۔ بچہ چند روز کا تھا اور یہ سوال درپیش تھا کہ خاندان میں کون عورت اس بچہ کی پرورش کرے کیونکہ عام طور پر بچہ کے اپنی ماں سے خردم ہونے کی صورت میں یا تو بچہ کی پرورش نانی کرتی ہے یا دادی۔ قاضی سرعزیز الدین احمد اور ان کے بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد دونوں بی بی کی پرورش سول سروس میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور انگریزوں کے حلقہ میں ان دونوں بھائیوں کے اخلاص کا بہت گہرا اثر تھا اور اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر بہت کم ہندستانی ایسے ہوں گے جن کا حلقہ احباب انگریزوں میں قاضی سرعزیز الدین احمد سے زیادہ وسیع ہو۔ چنانچہ آپ ہر سال ایک ہزار سے زیادہ کس کس کا رڈ تو انگریز دوستوں کو انگلستان وغیرہ غیر ممالک میں بھیجتے۔ قاضی خلیل الدین احمد کی بیوی کے انتقال کی خبر جب کلکتہ کے انگریزوں کے حلقہ میں پہنچی تو یہ لوگ انہار امس کے لئے قاضی صاحب کے ہاں پہنچے۔ ان انگریزوں میں ایک صاحب انڈین سول سروس کے ممبر بھی تھے جو بی بی کے پشاسٹر جنرل کے عہدہ پر تھے۔ ان پشاسٹر جنرل کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ ان کی بیوی نے جب قاضی خلیل الدین احمد کے چند روز کے بچہ کو دیکھا تو آپ نے قاضی سرعزیز الدین احمد سے درخواست کی کہ یہ بچہ اس خاتون کو پرورش کے لئے دے دیا جائے۔ چنانچہ قاضی صاحب اور ان کے بھائی اس پر آمادہ ہو گئے اور چند روز کا یہ بچہ جس کا نام وراثت الدین احمد رکھا جا چکا تھا۔ اس خاتون کو پرورش کے لئے دے دیا گیا۔

ایڈیٹر "ریاست" کے قاضی سرعزیز الدین احمد اور ان کے بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد دونوں کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور ایڈیٹر "ریاست" ان کے گھریلو معاملات سے بھی واقف تھا اور گودارث الدین سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا مگر راقم الحروف کو اس بچہ کی پرورش کے تمام واقعات کا علم تھا۔ چنانچہ اخبار "ریاست" کو جاری ہوئے چند برس ہوئے تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو کلکتہ جانے اور وہاں دو دن قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان دونوں میں دوستوں سے ملنے کے علاوہ یہ خواہش بھی تھی کہ وراثت الدین کو بھی دیکھوں جن کی عمر اس وقت سوسترہ برس کی تھی اور چونکہ پشاسٹر جنرل ریٹائر ہوئے کے بعد کلکتہ میں ہی انتقال کر گئے تھے ان کی بیوی وراثت الدین کے ساتھ کلکتہ کی ایک کوٹھی



میں مستقل طور پر مقیم تھیں اور انھوں نے واپس اپنے وطن انگلستان جانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔  
 صبح نو بجے کا وقت ہو گا، میں اس سڑک کو چلاں کہ اس خاتون کی کوٹھی تھی، دریافت کرتے اس کوٹھی  
 میں پہنچا۔ نہ تو میں نے اس سے پہلے کبھی وارث کو دیکھا تھا نہ وارث نے مجھے مگر ہم ایک دوسرے کو جانتے  
 تھے کیونکہ تاحی خلیل الدین احمد نے باہا اپنے بیٹے کا مجھ سے اور میرا اپنے بیٹے سے ذکر کیا تھا۔ میں جب  
 اس خاتون کی کوٹھی پہنچا تو دیکھا کہ ایک معمر بوڑھی یورپین خاتون کوٹھی کے برآمدہ میں صوفہ پر بیٹھی سر میسر  
 دفیو کچھ بن رہی ہیں اور ان کے زانوں پر سر رکھے ایک سولہ سترہ برس کا بچہ اس طرح لیٹا ہے جیسا وہ  
 اپنی ماں سے محبت کی باتیں کر رہا ہو۔ میں جب برآمدہ کے قریب پہنچا تو میں نے اس خاتون سے انگریزی میں پوچھا  
 کہ کیا یہ مکان مسز کا ہے (میں اب اس خاتون کے شوہر کا نام بھول چکا ہوں۔ اس وقت مجھے یاد تھا)  
 اس خاتون نے جواب دیا۔ ہاں۔ میں نے کہا کہ میں وارث سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دہلی سے آیا ہوں اور میرا نام  
 دیوان سنگھ ہے۔ میرے اس جواب کو سن کر وارث مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نہایت اخلاص  
 اور ہنس مکھ سے مجھے ڈرانگ روم میں لے گئے۔ چائے پینے کے لئے کہا مگر میں چائے مسٹر نکھار ایڈیٹر انڈین  
 ڈیلی ٹیلی گراف (جہاں کہیں مقیم تھا) کے ہاں پی کر گیا تھا۔ نصف گھنٹہ کے قریب باتیں کرتی رہیں۔ میرے دل  
 پر اس خاتون کے اخلاص کا بہت بڑا اثر تھا اور میں اب تک محبت کے ان اثرات کو بھول نہیں سکا جو  
 وارث اور ان کی گاڈ مڈر کو دیکھ کر میرے ذہن پر ہوئے۔ باتیں تو مختلف ہوتی رہیں مگر مجھے اب تک یاد ہے،  
 میں نے اس خاتون سے کہا تھا کہ دنیا کے قریب قریب تمام پیغمبر اور بڑے خوش نصیب لوگ یتیم تھے اور  
 وارث بھی یقیناً خوش نصیب ہے جس کو آپ جیسی محبت کرنے والی مخلص ماں نصیب ہوئی۔ میرے ان الفاظ کو  
 سن کر اس خاتون کی آنکھیں ڈبڑا اٹئی تھیں اور یہ کچھ کہہ نہ سکی تھیں۔

اس واقعہ کے عرصہ بعد یہ خاتون بیمار ہو گئیں۔ کافی تعصیب تھیں۔ اس خاتون کے بھائی اور شوہر کے  
 کچھ عزیز انگلستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی تھے اور ان سب کو علم تھا کہ اس خاتون نے ایک وصیت  
 کی ہے اور یہ وصیت لکھنؤ کے ایک بنگلہ پر محفوظ رکھی ہے جو اس کے مرنے کے بعد کھلی اس بیماری میں خاتون کا  
 انتقال ہو گیا۔ انتقال کی خبر سن کر اس خاتون اور اس کے مرحوم شوہر کے تمام عزیز سرور اور خوش تھے کہ  
 مرحومہ کا روپیہ اور جائیداد ان کو ملے گی اور اگر دنیا میں کوئی معنوم اور مالوس تھا تو صرف وارث جو محسوس کرتا تھا  
 کہ آج وہ ایک شفیق اور ضعیف خاتون کے سایہ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا جو اس سے بے غرض محبت کرتی تھیں  
 اور جس نے اس کی چند روز کی عمر سے لیکر جان ہونے تک پرورش کی تھی۔

اس خاتون کے انتقال کے چند روز بعد خاتون کے وہ عزیز و اقارب بھی لکھنؤ پہنچ گئے جو ہندوستان  
 میں تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے یہ وصیت کھولی گئی تو اس میں لکھا تھا کہ تمام جائیداد و معادن کے  
 ایک مکان اور بنگلہ کے روپیہ کے جو غالباً ایک لاکھ روپیہ قریب تھا وارث کر دیا جائے اور دوسر کوئی  
 شخص اس میں سے ایک پیسہ حاصل نہ کرے۔ چنانچہ تمام جائیداد اور روپیہ اس وصیت کے مطابق  
 وارث کو دے دیا گیا۔

لکھنؤ کی اس ملاقات کے بعد شہزادہ الدین احمد سے ایک بار دہلی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ جب

آپ اپنی بیوی (جو غالباً راجہ صاحب جہانگیر آباد کی بیٹی ہیں) کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور بمبئی بڑودہ ریلوے کی چھوٹی ٹالین پر بروڑی میں اسٹنٹ ٹرانسپورٹنگ تھے اس کے بعد تبادلاً آبادی کے سلسلہ میں آپ پاکستان چلے گئے اور غالباً آج کل کراچی میں لیجے کے بڑے انسر ہیں۔

میں جب کبھی کسی بچے کے یتیم ہونے کی خبر سنا ہوں یا کسی یتیم کو دیکھتا ہوں تو مجھے فوراً خیال آتا ہے کہ شاید یہ بچہ اپنی زندگی میں آئندہ بڑی پوزیشن حاصل کرے کیونکہ اکثر یتیم اور بڑے لوگ یتیم تھے اور قدرت ہمیشہ ہی یتیموں کی امداد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ یتیم بچوں پر کنٹرول کرنے والا کوئی نہیں ہوتا یہ بچے اگر مدست راستہ پر چلیں تو تیز رفتاری کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے ہیں کیونکہ ان کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ستاروں کے اعتبار سے بھی کسی بچے کے یتیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیدا ہو کر ہی اپنا راستہ صاف کرتا ہے تاکہ اس کے راستہ میں کوئی ٹکڑ نہ ہو۔ اور جو لوگ دنیا میں بلند پایا کامیاب ہوئے ان میں زیادہ تعداد یتیموں کی ہے کیونکہ انھوں نے جس رفتار سے چاہا۔ دنیا کی دوڑ میں حصہ لیا اور قدرت نے ان کی امداد کی، اور گو یتیم ہونا ایک بچہ کے لئے دردناک حادثہ ہے مگر قدرت یقیناً اس بچہ کی امداد کرتی ہے جسے قدرت کی طرف سے ایک نعمت قرار دیا جانا چاہیے۔

## صحافتی مراسم

دہلی کے ایک صاحبِ سفر عنایت نے کلکتہ سے اخبار ”چنچ“ جاری کر رکھا تھا۔ مسٹر عنایت ہسٹنچسپ آدمی تھے۔ مجھے علم نہیں کہ خاندانی اعتبار سے وہ میراثی تھے یا نہیں مگر طبعا میراثیوں سے زیادہ لطیف گو۔ حاضر جواب اور بھینٹ باز تھے۔ اس زمانہ میں ہر سال کرسمس کے دن کلکتہ جایا کرتا یہ صبح سے رات تک میرے پاس رہتے۔ اچھے سے اچھے موسیقاروں کا بغیر ایک پیسہ صرف کئے مفت گانا سنواتے۔ جوٹل میں جاں میں مقیم ہونا اپنے دوستوں کو ملنے کے لئے لاتے اور مجھے دوستوں کے ہال دعوت پر بلواتے اور جتنے روز میں کلکتہ میں رہتا یہ دن میرے بہت ہی دلچسپی کے ساتھ گزرتے۔

مسٹر عنایت اگر اخبار ”چنچ“ نکالتے اور اخبار مزاح کے اعتبار سے آدو کے جوتی کے اخبارات میں سے تھا مگر ان کا پروگرام یہ تھا کہ صبح سے شام تک طوائفوں، فلم ایکٹریوں اور شعرا کے ہاں چکر لگاتے۔ شام کو طوائفوں کے ہاں ہی شراب پیتے اور کھانا کھاتے اور کلکتہ کی ایک بھی طوائف یا فلم ایکٹری ایسی نہ تھی جس سے ان کے دوستانہ مراسم نہ ہوں۔ کیونکہ کسی طوائف کے خلاف لکھتے اور کسی کے حق میں اور فلموں کے پروڈیوسر کے خلاف لکھتے تو فلم ایکٹریوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے کے باعث عنایت صاحب کے بینک تھے۔ جہاں سے جب چاہا وہ پیسہ لے لیا۔

میں کلکتہ پہنچا اور عنایت صاحب کو میری دہلی پہنچنے کا علم ہوا تو آپ فوراً تشریف لے آئے چند گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد مجھ سے کوئی بات کیے بغیر کلکتہ کی مشہور فلم ایکٹریں جہاں آرا گئیں جس کی

اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں شہرت تھی اور جو فلموں کے علاوہ تھیٹر میں بھی چنی کے پارٹ ادا کرنے والوں میں سے تھی اُس کے اُس تشریف لے گئے۔ اور سب کچن کرتا یا کہ اخبار "ریاست" کا ایڈیٹر دیوان سنگھ کلکتہ آیا ہوا ہے اور ہوٹل میں مقیم ہے۔ "ریاست" ہندوستان بھر میں بہترین اخبار ہے۔ دیوان سنگھ کی دعوت کی جانی چاہیے۔ "ریاست" میں اگر چند سطور بھی اس کے آرٹ کی تعریف میں شائع ہو جائیں تو فلم اور آرٹ کی دنیا میں یہ طور ایک سنگیٹ بن جائیں گی۔ سب کچن "ریاست" پڑھا کرتی تھی۔ یہ سیری کلکتہ میں موجودگی کی خبر سن کر بہت خوش ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز دوپہر کو پانچ پر راقم الحروف کی دعوت کی جائے۔ مسٹر عنایت یہ فیصلہ کرنے کے بعد میرے ہوٹل میں آئے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کسی فلم ایکٹر میں یا ہڈی ادا کرنے کے ہاں دعوت پر جانا پسند نہیں کرتا۔ انھوں نے سب کچن کی تعریف کے بل باندھنے شروع کیے کہ ایسا گاتی ہے اور ایسی اچھی ایکٹر میں ہے وغیرہ تاکہ میں خود اپنے کا اشتیاق ظاہر کروں۔ مگر میں مستحار رہا اور میں نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر آپ نے فرمایا کہ سب کچن کی خواہش ہے کہ میں ان کے ہاں دعوت پر جاؤں۔ میں نے جب یہ سننا تو میں نے عنایت صاحب سے کہا کہ آپ ہاں دیجئے۔ میں کسی فلم ایکٹر میں کے ہاں دعوت پر جانا نہیں چاہتا۔ میرے انکار کے بعد دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ مگر عنایت صاحب محسوس کر رہے تھے کہ میرا یہ انکار اُن کے پرپیچ میں دھڑکاؤ تھا اور فلم ایکٹر میں پر تھا۔ کمی کرنے کا باعث ہو گا۔ شام کو ہم دوسرے دوستوں سردار زنجن سنگھ طالب ایڈیٹر "دیش درپن" وغیرہ کے ساتھ سیر کے لئے چلے گئے۔ اگلے روز عنایت صاحب صبح آٹھ بجے تشریف لے آئے۔ انھوں نے میرے ساتھ ہی بریک فاسٹ کھایا۔ باتیں ہوتی رہیں اور گیارہ بجے کے قریب چلے گئے۔

بارہ بجے کے قریب عنایت صاحب سب کچن کے ساتھ تشریف لے آئے۔ اور سب کچن نے کہا کہ میں ان کے ہاں کھانے پر چلوں۔ میں حیران تھا کہ کل میں نے انکار کر دیا تھا مگر یہ آج تشریف لے آئیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیونکہ سب کچن نے آتے ہی شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کی دعوت قبول کی ہے۔ ان کے اس کہنے پر میں عنایت صاحب کی طرف دیکھتا تھا کہ انھوں نے اُپا کیوں کہا۔ مگر عنایت صاحب مسکراتے رہے میں جانتا تھا کہ یہ حضرت دوستوں کے تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی دعوت کی تہ میں آپ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر پر اثر ہے۔ مگر میں مجبور تھا کہ ایک خاتون لینے کے لئے آئیں تو انکار نہ کروں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ان کی کار میں چلا گیا۔ میں سب کچن کے مکان پر دعوت کا بڑا اہتمام تھا۔ چھ سات دوسرے اصحاب میرا انتظار کر رہے تھے۔ سب کچن نے سب سے پہلے اپنے گراموفون ریکارڈ سنائے۔ جو ابھی بیک میں نہ آئے تھے اور جو ابھی حال میں گراموفون کمپنی نے تیار کئے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا بہت پُر تکلف تھا۔ ساڑھے موجود تھے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب کچن نے گانا سنایا۔ اور دو بجے کے قریب میں سب کچن کی کار پر عنایت صاحب کے ساتھ واپس آیا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو عنایت صاحب کو بُرا بھلا کہا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ عنایت صاحب پیدائشی طور پر ڈھیٹھے تھے۔ میرے سخت مسست الفاظ سننے پر وہ اور

مسکراتے رہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد عنایت صاحب دہلی تشریف لائے اور دفتر ریاست میں پہنچے تو میں نے پوچھا کہ قیام کہاں ہے تو آپ نے فرمایا کہ آپ محلہ کوڈے والاں میں بمبئی کی مشہور فلم ایکٹریس نسیم کی والدہ شمشاد بیگم دشمناد دہلی کی بہترین گانے والی طوائفوں میں سے تھیں۔ ان کی بیٹی نسیم ہندستان کی ایک بہترین فلم ایکٹریس تھیں۔ شمشاد بیگم کا نقل دہلی کے ایک بہت بڑے انجنیر کے ساتھ تھا۔ اور لاکھوں روپیہ کی مالک تھیں اے ہاں ٹھہرے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ میرے ہاں قیام فرماتے تو آپ نے جواب دیا کہ وہاں اعلیٰ اہم کی شراب اور بہترین مہم کا کھانا مفت ملتا ہے۔ ان طوائفوں کی جیب سے بے گچہ نکل آئے وصول کر لینا چاہئے یہ جواب معقول تھا۔ عنایت صاحب دوپہنے کے قریب دہلی میں رہے۔ قریب قریب ہر روز تشریف لاتے اور دو دو تین تین گھنٹے طعنے بازی کرتی۔ عنایت صاحب کو دہلی میں آئے تین چار روز ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں پسند کروں تو چھپیارہ شمشاد بیگم کا گھر بلوانا تھا۔ میری دعوت کرنا چاہتی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ دعوت اوکھلا کے پُر نضا مقام پر ہو اور وہ وہاں ہی گانا سنائے۔ میں عنایت صاحب کی فطرت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ یہ ریاست کے اثرات کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں پھیپھیا کے گانے کرے حد پسند کرتا ہوں۔ اور میں ریڈیو پر ان کا گانا اکثر سنا کرتا ہوں۔ اس لئے اوکھلے میں اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں مگر عنایت نے پھر زور دیا کہ چھپیارہ کی خواہش ہے کہ وہ گانا سنائے۔ مگر میں نے پھر انکار کیا اور کہا کہ ال دیجے۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں اوکھلے جا کر گانا سنوں۔ عنایت صاحب میرے انکار سے کچھ یابوس سے تھے مگر میں نے ہر دانہ کی۔

اس واقعہ کے چار روز بعد راجہ اکبر علی خاں ٹھیکہ دار راجہ اکبر علی خاں بہت ہی مخلص۔ بلند اور دوست نواز شخصیت تھے۔ ان کی کوٹھی پر ہر وقت دوستوں کا جمع رہتا۔ کھانے پر ہمیشہ دس پندرہ دوست ہوتے اور ان کا مہمان خانہ جو کوٹھی کے ایک طرف تھا ہمیشہ بھرا ہوتا اور دہلی کی شاید ہی کوئی بڑی شخصیت ہوگی جس کو آپ کی دستی کا فخر حاصل نہ تھا۔ کاٹیل فون آیا کہ آج شام کو میں کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ کبھی کبھی یہ مجھے کھانے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ میں نے بہت اچھا کھا اور شام کو میں اپنی کار میں میرے بعد ان کے ہاں گیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو کھانا دس پندرہ کرسیاں بچھی تھیں۔ ان کرسیوں پر راجہ صاحب۔ شمشاد بیگم یعنی چھپیارہ۔ ان کی بیٹی فلم ایکٹریس نسیم دو چند روز کے لئے اپنی والدہ سے ملنے بمبئی سے آئی تھیں۔ محمد سلیمان صاحب چیت انجنیر اور راجہ صاحب کے دو تین مصاحب بیٹھے تھے میں جب پہنچا تو تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ ملیک سلیک ہوئی۔ اور جب مجھے بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے تو راجہ صاحب نے بے تکلفی کے ساتھ پنجابی زبان میں فرمایا: "تو ایہہ دس۔ اینہاں وچاریاں نے تیرا کی دکاڑیا اے" (تم یہ بتاؤ ان بچاریوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے) میں نے جواب دیا کہ راجہ صاحب میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ راجہ صاحب نے پھر کہا: "اینہاں وچاریاں تیرا کی دکاڑیا اے جو اینہاں دے کچھے پیا ایں" (ان بچاریوں نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے جو ان کے پیچھے تم پڑے ہو) میں نے پھر کہا کہ راجہ صاحب

میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے اس جواب پر ششاد بیگم نے کہا:-

”سروار صاحب! کیا آپ نے کبھی بھی گانا سننے کے لئے کہا اور میں نے انکار کیا۔ ہمارے لئے تو یہ عزت کا باعث ہے کہ آپ ہمارا گانا سنیں۔ عنایت صاحب نے بتایا ہے کہ آپ ہم پر سخت ناراض ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں مجھ سے جب عنایت صاحب نے کہا کہ آپ ناراض ہیں تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ راجہ صاحب کی معرفت آپ سے ناراضی کا سبب پوچھوں۔ خدا کی قسم ہمارے دل میں تو آپ کے لئے انتہائی عزت ہے۔ آپ جہلی مکہ کیجئے میں گانے کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ عنایت صاحب نے بتایا کہ چونکہ میں نے آپ کو کبھی گانا نہیں سنایا اس لئے آپ مجھ سے بے حد عداوت ہیں اور دشمن ہو رہے ہیں۔“

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اور میں نے بتایا کہ عنایت صاحب تو مجھ سے یہ کہتے تھے کہ آپ کی خواہش گانا سننے کی ہے اور میں ادکھلے جا کر گانا سننے کی دعوت قبل کر لوں۔ مگر میں نے اسے نامناسب سمجھ کر انکار کر دیا اور کہا کہ میں ریڈیو پر آپ کا گانا سن سکتا ہوں۔

میرے اس جواب کو سن کر عنایت صاحب کے متعلق چھپانے کہا۔ یہ کنجٹ شرارتوں سے باز نہیں آتا بغیر اطلاع دیئے اور کہے بطور ہمان چلا آتا ہے۔ دن بھر شراب پیتا ہے اور ہمارے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے میں تو تنگ آچکی ہوں۔ یہ بھی مناسب نہیں کہ جہان کو گھر سے چلے جانے کے لئے کہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی کئی شرارتیں کر چکا ہے۔ مجھے تو آخر کتنا ہی پڑے گا کہ کسی دوسری جگہ تشریف لے جائیے۔ میں خود سوچتی تھی کہ اب تک آپ سے کبھی بات چیت کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ آپ راجہ صاحب اور سلیمان صاحب کے دوست ہیں پھر ہمارے دشمن کیوں ہوں۔

اس بات چیت کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے اور کھانے کی میز پر بھی عنایت صاحب کے پچھلے کارناموں کا ہی ذکر رہا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر راجہ صاحب سے باتیں ہوتی رہیں اور میں فون بجے گھر واپس پہنچا۔

اگلے روز عنایت صاحب تشریف لائے اور میں نے ان کی غلط بیانی پر ملامت کی تو مسکرانے لگے اور میں نے جب پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو آپ نے بے تکلف جواب دیا۔ دوستوں کے حلقہ کو وسیع کرنا چاہتا ہوں۔ تم دوست ہو اور میں چاہتا تھا کہ تمہارے چھپا اور فیم سے بھی مراسم ہوں۔

اگلے روز عنایت صاحب واپس کلکتہ چلے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ چھپانے ان کو تشریف لے جانے کے لئے کہا یا کہ یہ خود ہی چلے گئے۔

## ہندوستان کا مام دین

میں شہداء میں ایک روز اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک گہرے یعنی سادھوؤں والے کپڑے پہنے ایک سوامی جی تشریف لائے جن کے پاس اردو کے مشہور شاعر حضرت احمق پھونڈوی کا تعارفی خط تھا اور اس خط میں لکھا تھا کہ سوامی پارس ناتھ جی اس غرض کے لئے دہلی آ رہے ہیں کہ یہ جمہوریہ ہندوستان کی صدارت کے آئندہ وار ہیں۔ اور اس عہدہ کے حاصل کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد کی جائے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد میں نے سوامی جی سے باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی مخلص اور قابل محبت انسان ہیں مگر ان کے دماغ کی ایک چٹل نہیں، کئی چڑیاں ڈھیلی ہیں، چنانچہ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہندی زبان کے اچھے شاعر ہیں۔ آگرہ کے ہندی زبان کے ایک ماہوار رسالہ کو ایڈیٹ کرتے رہے ہیں۔ پچیس برس سے ہندی کی ایک مشہور شاعرہ جو الہ آباد کی رہنے والی ہیں، کے عاشق ہیں۔ ان کو اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا پچیس برس جوئے صرف ایک بار اتفاق ہوا تھا۔ پچھلے پچیس برس میں یہ خاتون بڑھی ہو چکی ہیں مگر سوامی جی کے خیال میں یہ شباب کے دور میں ہی ہیں۔ میں نے سوامی جی کی رہائش کا اپنے مکان کے ایک کمرہ میں انتظام کر دیا اور یہ دو سال کے عرصہ تک میرے ہاں بطور مہمان مقیم رہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

”ریاست“ کا دفتر اور اس کے ایڈیٹر کا رہائشی مکان ہمیشہ ایک ہی بلڈنگ میں رہے کیونکہ اس صورت میں کام کرنے کی بہت سہولت رہتی ہے۔ صبح سے شام تک کام کرتے رہو۔ کہیں جائے آنے کی ضرورت نہیں اور اخراجات میں بھی کفایت رہتی ہے، اور چونکہ ایڈیٹر ”ریاست“ تنہا رہتا ہے، شام کے وقت دو چار، پانچ سات دوست تشریف لے آتے ہیں دن بھر کے کام کے بعد ایک دو گھنٹے تفریح کے گزر جاتا ہے چنانچہ سوامی جی سے ملنے کا وقت بھی شام کو دوستوں کی موجودگی میں ہی ہوتا اور وہ دن بھر اپنے کمرہ میں یا تو کچھ لکھتے رہتے یا آرام فرماتے۔

سوامی جی کی زندگی کے پچھلے واقعات بھی بے حد دلچسپ ہیں اور ان واقعات کے متعلق ایک مفید کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ان واقعات میں سے صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ چونکہ آپ ہندی کے شاعر ہیں، پچیس برس ہوئے ایک دوست کے ساتھ الہ آباد گئے تو ہندی کے ایک بہتر شاعر کے ساتھ وہاں کی مشہور شاعرہ جو وہاں کے ایک زمانہ کالج میں پرنسپل بھی ہیں کے مکان پر چلے گئے۔ وہاں چند منٹ بیٹھے اور یہ شاعرہ دوسرے شاعر کے ساتھ باتیں کرتی رہیں اور سوامی جی سے مخاطب بھی نہ ہوئیں مگر سوامی جی اس ملاقات میں ہی وہاں سے عشق خرید لائے اور واپس اپنے وطن پھونڈو ضلع اٹارہ، یو۔ پی۔ پہنچ کر اس شاعرہ سے یک طرفہ خط و کتابت شروع کر دی۔ یعنی سوامی جی ہفتہ میں ایک دو عشیقہ خط ضرور لکھتے اور وہاں سے کبھی کبھی جواب نہ آتا۔ سوامی جی اس دن دسے ٹریفک ”سے تنگ آ گئے تو آپ الہ آباد چلے گئے۔ وہاں دیناے گنگا کے کنارے آپ نے ایک کوٹھری میں قیام کیا اور جب کوئی شخص وہاں سے اس سڑک کی طرف جاتا جہاں کہ آپ کی ”محبوبہ“ کی کوٹھی تھی دیکھتے تو ہندوستان میں ہندی کی بہترین شاعرہ ہونے کے علاوہ

الہ آباد میں بہت با اثر ہیں۔ ان کے ہندو فیملی سے بھی کافی مراسم ہیں۔ چنڈت جو اہر لال ہندو کی صا جزادی اندرا گاندھی ان سے پڑھتی رہی ہیں۔ تمام یوپی میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اور ایک کوٹھی میں امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتی ہیں (تو آپ اس کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو خط بھیج دیتے جس میں کہ ہے احتیاتی کی شکایت کی جاتی اور آپ خط لے جانے والے ہر شخص کو خط لے جانے کا معاوضہ آٹھ آنہ دیتے۔ آپ نے ایک روز ایک لڑکے کو خط دیا کہ یہ خط ان کی محبوبہ کو پہنچا دیا جائے۔ یہ لڑکا چالاک ٹائیپ کا تھا۔ اس نے خط پڑھا اور دیکھا کہ سوامی جی عیشت بازی میں مبتلا ہیں تو اس نے خط پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس نے خط پہنچا دیا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ سوامی جی خط اور آٹھ آنہ دیتے مگر خط پھٹا دیتا اور واپس آکر کہہ دیتا کہ خط پہنچا دیا ہے۔ ایک روز لڑکے نے اپنی بہن دجہندی پڑھی ہوئی تھی سے سوامی جی کے نام اس خاتون کی طرف سے خط لکھوایا جس میں تمام خطوط پہنچنے کا اقرار کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ گھر داروں کی سختی اور نگرانی کے باعث جواب نہ دینے کے لئے مجبور تھیں۔ آپ لکھنا جاری ہیں۔ آپ کے پاس اخراجات کے لئے روپیہ نہیں، ساتھ روپیہ بھیج دیجئے۔ سوامی جی نے جب اس جواب کو دیکھا تو شدت مسرت کے باعث آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ آپ کے پاس اس وقت پچپن روپیہ تھے۔ آپ نے اپنے پاس ایک پیسہ رکھ بغیر یہ پچپن روپیہ اس لڑکے کے حوالہ کئے۔ سوامی جی کا بیان ہے کہ یہ لڑکا اگلے روز نئے سٹے ہوئے کپڑے اور نئی رسٹ داغی پہن کر آیا تو آپ نے سمجھا کہ ان کے ساتھ یہ دھوکہ ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے آئندہ اس لڑکے کا اعتبار کرنا تو چھوڑ دیا مگر خطوط کا سلسلہ جاری رہا جو دوسرے راہ چلتے لوگوں کے ذریعہ بھیج دیئے جاتے۔

خطوط کو بھیجے کا یہ سلسلہ جب چھ ماہ کے قریب جاری رہا اور یہ خاتون اس خطوط سے تنگ آگئیں تو اس خاتون نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو خط لکھا کہ ایک پامل شخص ان کو خطوط بھیج کر تنگ کرتا ہے، اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ سوامی جی نے بتایا کہ اس زمانہ میں الہ آباد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک انگریز مسٹر مورس تھے۔ انھوں نے ایک کنشیل بھیج کر سوامی جی کو بلایا۔ سوامی جی جب آئے تو مسٹر مورس نے پوچھا کہ آپ اس خاتون کو عشقیہ خطوط کیوں لکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں سوامی جی نے فرمایا کہ یہ خاتون ان کی پچھلے عہد کی بیوی ہے اور اس عہد کی روحانی محبوبہ، اس نے خط لکھتے ہیں۔ مسٹر مورس نے جب یہ جواب سنا تو آپ سمجھ گئے کہ سوامی جی اپنے دماغ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ آپ نے سوامی جی کو حکم دیا کہ پہلی گاڑی سے الہ آباد سے چلے جاؤ ورنہ حالات میں دسے دیئے جاؤ گئے۔ اس حکم کو سن کر سوامی جی کو بادل ناخواستہ واپس پھینچو نہ آنا پڑا۔ پھینچو نہ واپس آئے پر سوامی جی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ان کی محبوبہ تو ان کو چاہتی تھیں مگر اس خاتون کے رشتہ دار راستہ میں خلل ہوتے تھے اور انھوں نے ہی پولیس کے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ الہ آباد سے نکلوا دیا۔

اوپر کا واقعہ تو پچیس برس پہلے کا ہے، اب سوامی جی کی دہلی کی مصروفیات سنئے۔ سوامی جی سے جب باتیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ آپ گائبا استعمال کرتے ہیں تو ان میں بہت بڑی "رُوحانیت" پیدا ہو جاتی ہے اور اُس وقت کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور سیاست دان بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سوامی جی کو دہلی تشریف لائے چند دن ہوئے تھے تو آپ کے لئے انگریزی کے بہت شاندار وزٹنگ کارڈ چھپوائے گئے جن پر لکھا تھا: "سوامی پارس ناتھ ایگریکلچر، دفینہ اور روجا حایت کے اکسپرٹ" کیونکہ سوامی جی کا ارشاد تھا کہ آپ کو زمین کے اندر تمام کی تمام دولت کا علم ہے اور آپ کو رٹا من سونا نکلا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار کو دس گنا زیادہ پیدا کر سکتے ہیں اور روحانی اعتبار سے چاہیں تو ہندوستان کی تمام بھڑیں، بچھو اور سانپ جمع کر کے غیر مالک کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے بھیج دیں۔ جب وزٹنگ کارڈ تیار ہو گئے تو ایڈیٹر "ریاست" نے عرض کیا کہ اصل مقصد تو ہندوستان کی صدارت حاصل کرنے کا ہے جس کے لئے آپ پھپھوند سے تشریف لائے اور اس کے لئے انتہائی کوشش کی جائے گی مگر یہ غنہ طریقہ کے ساتھ حاصل ہونا چاہیے۔ چنانچہ سوامی جی اس پر آمادہ ہو گئے اور فیصلہ ہوا کہ پہلے تو کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کی ممبری حاصل کی جائے اور کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کی ممبری کے بعد جمہوریہ ہندوستان کی صدارت حاصل ہو۔ چنانچہ ایک درخواست تیار کر کے ٹائپ کی گئی جو وزیر اعظم پنڈت نہرو کے نام تھی۔ اس درخواست میں لکھا گیا کہ سوامی جی ہندوستان کے دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گدا گردوں کے پیشوا ہیں۔ ان سادھوؤں کا ایک نمائندہ کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی میں ہونا چاہیے تاکہ ان کے حقوق محفوظ رہیں اور سوامی جی بطور ان کے پیشوا اور لیڈر کے ان کے بہترین نمائندہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کو کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کا ممبر نامزد کیا جائے۔ اس درخواست کے ساتھ آپ کو پنڈت نہرو کے پاس بھیجا گیا۔ اُس زمانہ میں پنڈت نہرو ہر شخص سے بل لیا کرتے تھے۔ آپ جب پنڈت نہرو کی کوٹھی پہنچے اور آپ نے اپنا وزٹنگ کارڈ بھیجا تو پنڈت جی نے آپ کو اندر طلب فرمایا۔ آپ نے جاتے ہی پنڈت جی کو وہ درخواست دی۔ پنڈت جی اس درخواست کو پڑھ کر حیران سے ہو گئے کہ یہ کون حضرت ہیں جو کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کے ممبر ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کے اور پنڈت جی کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی:-

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

میں پھپھوند ضلع اٹادہ، یوپی کا رہنے والا ہوں۔

آپ کے آئے کا مقصد کیا ہے؟

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گدا گردوں کا پیشوا اور نمائندہ ہوں۔ میرا اصل مقصد تو ہندوستان کا صدر بننا ہے مگر میں فی الحال کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔

آپ پھپھوند میں کیا کرتے ہیں؟

میں زراعت، دفینہ اور روجا حایت میں ماہر ہوں۔ زمین کا تمام دفن شدہ سونا اور جواہرات نکال کر ملک کو مالالال کر دوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو دشمن ملک کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کی تمام بھڑوں، بچھوؤں، سانپوں، اور چھتروں کو بھیج دوں گا۔

آپ دہلی کس سے تشریف فرما ہیں؟

مجھے یہاں آستے ہوئے ایک ہفتہ کے قریب ہو گیا ہے۔



آپ یہاں دہلی میں کہاں مقیم ہیں؟

میں اخبار ریاست کے دفتر میں اس اخبار کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا جہان ہوں۔  
سوامی جی کا بیان ہے کہ جب پنڈت جی نے اخبار ریاست اور اُس کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا نام سنا  
تو آپ نے مسکراتے ہوئے کہا ”خوب! میں اب سمجھا کہ آپ بہت بلند شخصیت ہیں۔ میری بھی رائے ہے  
کہ کانٹنی ٹیونٹ اسمبلی کی مہر کی لئے آپ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص مستحق نہیں۔ یقیناً آپ اس کے حقدار  
ہیں اور آپ کو ضرور اسمبلی کا ممبر بنایا جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے پنڈت جی نے سوامی جی کی درخواست کو سنا  
بڑی فائیکس کے اوپر رکھ دیا اور کہا کہ آپ جاسکتے ہیں، آپ کو ضرور ممبر بنایا جائے گا چنانچہ سوامی جی  
جب دفتر ریاست میں واپس آئے تو بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مرحلہ تو طے  
ہو گیا، اب بھگوان نے چاہا تو صدارت بھی مل جائے گی۔

پنڈت ہندو سے ملنے کے بعد اگلے روز سوامی جی دوستوں کے مشورہ کے مطابق بابو راجندر پرشاد راج  
اس زمانہ میں فوڈ منسٹر تھے) کے پاس پہنچے کیونکہ سوامی جی بھی جنم کے لحاظ سے کا سیتھ ہیں اور بابو راجندر پرشاد  
بھی کا سیتھ۔ ایک کا سیتھ کو اپنے کا سیتھ بنانی کی امداد ضرور کرنی چاہیے۔ سوامی جی جب بابو راجندر پرشاد  
کی کڑھی گئے تو آپ نے اپنا وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ بابو جی نے سوامی جی کو بلالیا اور دونوں کے درمیان  
یہ باتیں ہوئیں:-

فرمائیے کس طرح تشریف لائے؟

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گراگروں کا نمائندہ اور پیشوا ہوں اور میں کانٹنی ٹیونٹ  
اسمبلی کا ممبر ہونا چاہتا ہوں تاکہ ان کے حقوق کی حفاظت کروں۔ آپ کا سیتھ ہیں اور میں کو اب سادھو  
ہوں مگر جنم کے لحاظ سے میں بھی کا سیتھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ میری امداد کریں اور مجھے کانٹنی ٹیونٹ  
اسمبلی کا ممبر بنوادیں۔ میں پنڈت ہندو سے بھی مل آیا ہوں۔ اور انھوں نے وعدہ فرمایا ہے۔ بابو راجندر پرشاد  
نے جب یہ سنا تو وہ بھی چکرائے کہ یہ سوا کیا ہے؟ انھوں نے ٹالنا چاہا تو سوامی جی کو اپنی برادری  
کی بے مہر کی کا خیال آگیا اور آپ نے خطا ہو کر کہا آپ اگر پچر منسٹر بنے پھرتے ہیں مگر آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ  
اگر پچر کیا ہے۔ بھلا آپ بتائیے کہ جی کیا ہوتی ہے؟ سوامی جی کہے اس سوال پر بابو راجندر پرشاد مسکرائے  
اور فرمایا کہ فی الحقیقت آپ کو علم نہیں کہ جی کیا ہوتی ہے۔ سوامی جی نے جواب دیا سر یہی راحت ہے  
مستحق آپ کی معلومات ہیں۔ اب اگر کہو تو میں بتاؤں کہ جی کیا ہوتی ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے کہا فرمائیے  
جی کیا ہوتی ہے؟ تو سوامی جی نے فرمایا جی جو کہ گھروالی بیٹی ہوئی ہے۔ اس گھتے گھو کے بعد  
سوامی جی واپس دفتر ریاست میں تشریف لے آئے مگر آپ بابو راجندر پرشاد اور اپنی کا سیتھ برادری دونوں پرست  
خفا تھے کہ انھوں نے سوامی جی کی قدر نہ کی۔

تیسرے روز آپ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے مگر آپ کے سیکرٹری سٹر اجل خاں نے کہہ دیا  
کہ مولانا مصروف ہیں۔ سوامی جی واپس آگئے اور بہت ناراض تھے اور ان کو سخت شکایت تھی کہ مولانا نے  
ملنے سے انکار کر دیا اور ان کی شخصیت اور عظمت کی قدر نہ کی گئی۔

اگلے روز آپ ہاتھا گاندھی سے ملنے کے لئے ہری جنوں کی بیٹی میں گئے جو ریڈنگ روڈ نئی دہلی پر ہے۔ ہاتھا جی لوگوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے اور ہر ایک کو دو دو منٹ دیئے جاتے تھے۔ اس وقت ان کے پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض سربراہ کرشن چاندی والے ادا کر رہے تھے۔ سوامی جی تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے تو سربراہ کرشن جی نے سوامی جی کو ہاتھا جی کے پاس اندر جانے کے لئے کہا۔ سوامی جی اندر گئے تو آپ نے وہی درخواست جو آپ پنڈت نہرو کو دے چکے تھے، ہاتھا جی کو بھی دی۔ ہاتھا گاندھی اس درخواست کو پڑھ کر خاموش رہے آپ نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ آپ کسی بے معنی بات پر ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کرتے تھے اور سیاسی معاملات کے تفکرات کے باعث بہت بھیدہ تھے۔ ہاتھا جی نے کچھ جواب نہ دیا اور دو منٹ پورے ہو گئے۔ اتنے میں سربراہ کرشن جی نے کہا سوامی جی دو منٹ ہو چکے ہیں، تشریف لے چلے کیونکہ دوسرے اصحاب منتظر ہیں۔ سوامی جی کمرہ سے باہر نکل آئے اور واپس دفتر ”ریاست“ میں پہنچے مگر بہت غناک تھے۔ میں نے پوچھا سوامی جی کیا بات ہے، آج رنجیدہ کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاتھا گاندھی سے مل کر آیا ہوں، میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہوا، میرے سوال پر آپ نے جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا:-

”میں ہاتھا گاندھی کے سامنے پیش کیا گیا اور اپنی درخواست بھی دی۔ انھوں نے درخواست پڑھی مگر کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھا گاندھی پاگل ہیں اور ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہا، ورنہ کچھ جواب دیتے؟“

سوامی جی کا یہ جواب سن کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ انسان ہیا ہر وہ سرا بھی اس کو دیکھا ہی نظر آتا ہے۔ سوامی جی پاگل ہیں تو اب ان کو ہاتھا جی بھی پاگل نظر آتے ہیں مگر ان سے میں نے کہا سوامی جی کوئی خیال نہ کیجئے، ہاتھا جی مصروف رہیں گے، اس لئے فی الحال کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر غور کرنے کے بعد جواب بذریعہ ڈاک بھیج دینے میرے اس کہنے پر سوامی جی کا غم و غصہ کم ہوا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ ایک درجن کے قریب دوست بیٹھے تھے جن میں زیادہ نقاد و شعرا اور اخبار نویس حضرات کی تھی۔ سوامی جی بھی گانچھاپینے کے بعد تشریف فرما تھے اور ان کا ”روحانی“ فیض جاری تھا۔ سوامی جی نے فرمایا کہ دنیا کے تمام سینا بند کر دیئے جائیں۔ یہ فضائل خرچ ہیں اور صرف ایک سید نہیں اور آسمان کے درمیان قائم کیا جائے جسے ہر ملک دیکھ سکے۔ یہ طریقہ تمام ممالک کی اقتصادیات میں بکثرت کا باعث ہو گا۔ سننے والے تمام صحاب نے اس نکتہ کی تعریف کی اور ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی نہ صرف ”ایک نکتہ“، ذہنیہ اور روحانیت میں اہل ہیں بلکہ اقتصادیات میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ سن کر سوامی جی مسکرا دیئے، گو یا کہ وہ اپنے ابراہم اقتصادیات ہونے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہورہی تھیں کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لے آئے۔ جوش صاحب نے بھی جب انٹر نیٹل سینٹا کی اس سکیم کو سنا تو آپ نے بہت تعریف کی۔ اس کے بعد میں نے جوش صاحب سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو میں سوامی جی سے درخواست کر سکتا ہوں کہ سوامی جی آپ کو اپنا شاگرد بنا لیں جوش صاحب نے کہا کہ ان کے لئے اس سے زیادہ عزت کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جوش صاحب نے اپنی جیب سے

دو روپیہ نکال کر سوامی جی کی نذر کئے اور جوش صاحب کو شاگرد بنانے کی رسم ادا کی گئی۔ اب سوامی جی دہلی میں کسی سے ٹھیس یاد دلی سے باہر، تو باتوں باتوں میں جوش صاحب کے شاگرد ہونے کا ذکر ضرور کرتے ہیں کیونکہ جب جوش صاحب نے بطور شاگرد دو روپیہ نذر کیے تو پھر وہ لوگوں سے اپنے اُستاد ہونے کا ذکر کیوں نہ کریں اس کے علاوہ یہ مان لیا گیا کہ جوش صاحب اس وقت اُردو اور فارسی کے بے مثل اور انقلاب پسند شاعر ہیں مگر ”رہ حایت“ کے مراحل تو انھوں نے طے نہیں کیے۔

ایک روز سوامی جی کا دوبارہ دفتر ”ریاست“ میں لگا ہوا تھا اور چند اخبار نویس اور شاعر حضرات تشریف فرما تھے کہ اہل انڈیا ریڈیو کے سٹر مقطر و فنی نشر بہت لے آئے۔ میں نے مقطر صاحب سے کہا کہ مقطر صاحب اگر آپ ریڈیو پر سوامی جی کی تقریر کو آئیں تو یہ نہ صرف اہل انڈیا ریڈیو بلکہ گزٹ آف انڈیا پر بھی احسان ہوگا اور یہ تقریر دفتر ”ریاست“ سے نشر کی جائے۔ اگلے روز سوامی جی کی تقریر نشر کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ چالیس کے قریب دست جمع ہوئے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ کے پاس درزش کر کے ایک شبین ہے جس میں کئی کئی ایک موزیکلے اور یہ بجلی سے گھومتی ہے۔ سوامی جی نے اس شبین کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ شبین سوامی جی سے پوشیدہ طور پر گرو دھام میں سے نکلا کہ اوپر سنگائی گئی۔ سوامی جی کو اس شبین کے سامنے یہ کہہ کر ٹھٹھا دیا گیا کہ یہ براڈ کاسٹنگ شبین ہے۔ سوامی جی بخیدہ ضرورت میں شبین کے سامنے بیٹھ گئے اور شبین کی سورت چلا دی گئی۔ سوامی جی کو براڈ کاسٹنگ کے لئے ہدایت دینے کا کام لاہور امیر چند کھنہ اور مقطر صاحب کے سپرد تھا۔ اس شبین کو ایک میسج لگا دیا گیا اور سوامی جی سے کہا گیا کہ وہ میسج کے قریب ہو کر تقریر کریں اور اپنی تقریر میں ”الہ آباد والی اپنی محبوبہ کو بھی جو پیغام دیا جا رہا ہے دے دیں۔ چنانچہ پندرہ منٹ کے قریب سوامی جی نے تقریر کی اور جب سوامی جی نے اپنی محبوبہ کے نام پیغام دیا تو سوامی جی کچھ کانپ سے رہے تھے اور ان کی آنکھیں ٹٹلنا دہی تھیں۔ تقریر ختم ہونے سے پہلے یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جو دوسرے دست سوامی جی سے دفتر ”ریاست“ سے باہر ہیں تو اس تقریر کی تعریف کریں۔ چنانچہ اس تقریر کے بعد سوامی جی دفتر ”ریاست“ سے باز رہیں گئے تو وہاں ایک صاحب لے کہا کہ سوامی جی آج تو آپ کی ریڈیو والی تقریر بہت دلچسپ اور عالمانہ تھی۔

اس کے بعد آپ محلہ سویرا لان میں گئے تو وہاں ایک صاحب لے کہا کہ سوامی جی آپ کی تقریر جید دلچسپ تھی۔ پھر آپ اُردو بازار میں گئے تو وہاں بارہ لوگوں نے کہا کہ سوامی جی آج تو آپ نے تقریر میں کمال کر دیا۔ اس کے علاوہ اگلے روز پانچ چھ خطوط لکھے گئے جن کے ادھر مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ، جھانسی، مراد آباد اور الہ آباد وغیرہ کے نام تھے اور یہ تمام سوامی جی کے نام لکھے گئے تھے۔ ان میں مختلف لوگوں کی طرف سے لکھا گیا کہ یہاں آپ کی ریڈیو والی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔ چنانچہ ان خطوط میں ایک خط ہندی میں ایک خاتون کی طرف سے بھی تھا جس میں تقریر کی تعریف کے ساتھ اظہارِ عیش بھی کیا گیا تھا۔ اس خاتون کا یہ خط سوامی جی کے پاس آسکے اب تک موجود ہے اور آپ اس خط کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ یہ تمام خطوط ریلوے ٹرین میں پوسٹ کیے گئے تاکہ سوامی جی کو ڈاک خانہ کی مہر سے بچنے چل سکے کہ یہ دہلی سے ہی پوسٹ کئے گئے ہیں۔

ایک دن ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ سوامی جی کی ان کی ”محبوبہ“ سے ٹیلیفون پر ملاقات کرائی جائے۔ چنانچہ

سوامی جی سے ان شریعتی جی کے نام خط لکھوایا گیا کہ آپ آئندہ اتوار کو شام کے چھ بجے ٹریک ٹیلیفون پر  
 سوامی جی سے بات کریں، سوامی جی بہت مضطرب ہیں۔ یہ خط سوامی جی سے لے کر ادا اس پرنٹنگ گھر  
 چڑھ کر آگیا کہ یہ فوراً پرنٹ کر دیا جائے مگر اس کے کان میں کہہ دیا گیا کہ خط پوسٹ نہ کیا جائے، اسے  
 پھاڑ دیا جائے۔ ادھر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ ان کی بیوی ٹیلیفون پر سوامی جی سے اتوار کی  
 شام کو چھ بجے بات کریں اور یہ بتائیں کہ الہ آباد سے ان کی محبوبہ بات کر رہی ہیں۔ چنانچہ اتوار کی شام کو چھ بجے  
 سے پہلے ہی سوامی جی ٹیلیفون کے انتظار میں اوپر تشریف لے آئے۔ چھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے  
 ٹیلیفون اٹھایا۔ جب ٹیلی فون اٹھایا تو میرے اس دوست نے اپنی بیوی سے بات کرانے سے پہلے کہا۔  
 الہ آباد سے ٹیلی فون آیا ہے، سوامی پارس ناٹھ جی ہیں، میں نے فوراً گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے سوامی جی  
 کو آواز دی۔ سوامی جی جلدی آئے، الہ آباد سے ٹیلی فون آیا ہے۔ جب سوامی جی نے ٹیلیفون کا رسید رکاز پر  
 لٹکایا تو میرے اس دوست نے اپنی مردانہ آوازیں پوچھ کر سوامی پارس ناٹھ جی ہیں۔ سوامی جی نے کہا کہ ہاں ہیں  
 سوامی پارس ناٹھ تول رہا ہوں، اس پر میرے دوست نے کہا کہ الہ آباد سے بات کرو۔ سوامی جی اس وقت  
 رسید رکاز میں قحط سے لرز رہے تھے۔ ان کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میرے دوست کی بیوی اور سوامی جی  
 کے درمیان ٹیلی فون پر یہ باتیں ہوئیں۔

سوامی جی ہیں ؟

ہی ہاں، میں سوامی پارس ناٹھ تول رہا ہوں۔

سوامی جی آپ کے خطوط پہنچے رہتے ہیں مگر یہ کجخت مبرے گھر کے لوگ میری نگرانی کرتے ہیں، اس لئے  
 میں جواب نہیں دے سکتی۔ اب بھی بہت مشکل کے ساتھ یہ ٹیلی فون ایک دوسری جگہ سے کر رہی ہوں۔

آپ دہلی میں کیوں نہیں آتیں؟ میں آجکل دہلی میں رہتا ہوں۔  
 آپ ہندوستان کے پریزیڈنٹ ہو چکے ہیں تو میں فوراً آپ کے پاس آ جاؤں گا۔

جس پریزیڈنٹ نے بعد میں ہوجاؤں گا، آپ ضرور آجائیں۔

اؤنہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، کیا جلدی ہے، میں آ جاؤں گی۔

اتنی بات ہوئی تھی کہ میرے دوست جو اپنی بیوی سے ٹیلی فون پر بات کر رہے تھے، نے فوراً کہا۔  
 "تین منٹ پہلے میں، بات ختم کرو۔"

سوامی جی ٹیلی فون سننے کے بعد بار بار کہتے رہے "اؤنہ آپ تو ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں، کیا بیٹھی زبان  
 تھی، ہر بات ہوا چنانچہ سوامی جی اب بھی اس ٹیلیفون کو اکثر یاد کیا کرتے ہیں اور ایک خاص انداز میں  
 کہا کرتے ہیں "اؤنہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"

حبیب سہا جی کا پورا ڈاکسٹنگ اند ٹیلی فون جو کچھ تو اردو بازار کی قومی دہ گاہ یعنی مولانا مہسح اشرف کی  
 کتابوں کی دوکان و مولانا مہسح اشرف مرحوم شفیق مولا کا کفایت اللہ کے داماد ہیں۔ آپ جیسا شخص اور جہاں نواز  
 بھی شاید دہلی میں کوئی دوسرا نہ ہو گا صحیح سے شام تک آپ کی دوکان پر علم دوست، اخبار نویس، شعرا اور  
 ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی وغیرہ حضرات آتے رہتے ہیں۔ اشعار پڑھے جاتے ہیں اور علم و سیاست پر بحث ہوتی

ہے اور مولوی صاحب کراچہ دوروپہ کی کتاب ایک روپیہ میں پڑوسوں کو دینی پڑے، آپ ان سب کی جانے سے تو اصرار کرتے ہیں، پر کسی نے سوامی جی سے کہہ دیا کہ براڈ کا سنگ اور ٹیلی فون ریشہ دیوان سنگ کی شرارت ہے ورنہ براڈ کا سنگ ہوا نہ الہ آباد سے ٹیلی فون آیا۔ سوامی جی نے جب یہ سنا تو ان کو شک ہوا کہ شاید یہ تمام جلسازی ہی ہو۔ سوامی جی تشریف لائے تو بہت خدا اور مغموں تھے۔ میں نے پوچھا۔ سوامی جی کیا بات ہے، آج جی تو اچھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ دیکھو چ بتاؤ، یہ ٹیلی فون اور براڈ کا سنگ جلسازی تھی یا کہ دراصل ٹیلی فون اور براڈ کا سنگ ہوا کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلسازی تھی۔ میں نے جب سوامی جی سے سنا تو میں نے بہت غصہ کی، حالانکہ میں کہا "سوامی جی آپ دوسروں کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ نے میری خدمات کی قدر نہ کی، ہم لوگ آپ کے لئے کوشش کرتے کرتے مر گئے اور پچیس سال کے پچھڑوں کو ٹیلی فون پر ملوا دیا مگر ان خدمات کا معاوضہ آج یہ مل رہا ہے کہ مجھے آپ بے ایمان اور جھوٹا سمجھتے ہیں۔" سوامی جی کو جب میں نے ڈانٹا تو سوامی جی نے کہا کہ وہ تو بھین کرتے ہیں کہ براڈ کا سنگ بھی ہوا۔ اور ٹیلی فون بھی کیونکہ براڈ کا سنگ کے متعلق دہلی سے باہر کے شہروں سے بھی خطوط آئے اور ٹیلی فون میں "اُونہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں" کون کہہ سکتا تھا؟ مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب جلسازی تھی۔ جب سوامی جی میرے غصہ کے باعث ٹھنڈے ہوئے تو میں پھر نرم ہو گیا اور میں نے اپنے غصہ کے متعلق سوامی جی سے مدافعی طلب کی اور سوامی جی سے حلف لیا کہ ان کو میرے اخلاص اور میری خدمات و سچائی کے متعلق کوئی شک نہیں۔

سوامی جی ہر سال ہونے والی سے بریلی چلے گئے کیونکہ وہاں کے رادھے شام پرس والوں نے ان کو ہندی کی ایک تصنیف کے سلسلہ میں دیا گیا۔ بریلی میں سوامی جی نے وہاں کے لوگوں سے براڈ کا سنگ اور الہ آباد کے ٹریک ٹیلی فون کا ذکر کیا تو ان لوگوں نے بھی سوامی جی سے کہا کہ یہ سب جھوٹا ہے۔ نہ براڈ کا سنگ ہوا اور نہ ٹیلی فون۔ آپ لوگوں کے کہنے سے پھر متاثر ہو گئے۔ اور آپ نے مجھے ایک خط لکھا کہ میں جھوٹا اور بے ایمان ہوں۔ نہ براڈ کا سنگ ہوا نہ ٹیلی فون اور میں نے سوامی جی کو بے وقت بنایا۔ سوامی جی کا جب یہ خط مجھے ملا تو مجھے ایک شرارت منو جھی۔ میں نے سوامی جی کو جبرڈ نوٹس دیا کہ آپ نے مجھے جھوٹا اور بے ایمان لکھ کر میری توہین کی ہے۔ آپ پانچ ہزار روپیہ بطور ہرجانہ داکر ورنہ آپ پر فوجداری اور دیوانی و عوی و دیر کر دیا جائے گا۔ میرا یہ نوٹس جب سوامی جی کے پاس پہنچا تو آپ بہت گھبرائے اور آپ نے خط لکھا کہ آپ تو فقیر ہیں آپ کے پاس ہرجانہ دینے کے لئے پانچ ہزار روپیہ کہاں ہے مگر آپ وعدہ قدی کے ساتھ معافی چاہتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ ایڈیٹر "ریاست" سچا اور ایمان دار آدمی ہے۔ اس جواب کے بعد سوامی جی کے ساتھ پھر خط و کتابت شروع ہو گئی اور سوامی جی نے "ریاست" کے جذبات مشرق کے کالم کے لئے پھر ہندی کے دو سہ ہندی کی کتابوں سے منتخب اور ترجمہ کر کے بھیجنے شروع کر دیئے اور ہاری مسلح ہو گئی مگر سوامی جی کو براڈ کا سنگ اور ٹریک ٹیلی فون کے متعلق کچھ شک سارا۔ سوامی جی بریلی کے کام سے فارغ ہو کر دہلی آ گئے تو پہلے کی طرح آپنا دفتر "ریاست" میں رہائش اختیار نہ کی بلکہ آپ نے جتنا سے پار ایک گاؤں میں قیام کر لیا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آپ مجھ پر ناراض ہیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے ایک دوست کی ڈیوٹی لگائی کہ سوامی جی

گروفر "ریاست" میں لایا جائے۔ یہ دوست سوامی جی کر لے آئے تو ان کے آتمی میں نے سب سے پہلے ان کے پاؤں چھونے اور اس کے بعد شکوے اور شکایت کے دفتر کھول دیئے کہ آپ مجھ سیدک کو بھول گئے، آپ نے میری خدمات فراموش کر دیں، آپ کا خون سفید ہو گیا ہے، آپ کی صحت دیکھنے کو میں ترس گیا اور مجھ جیسے مخلص دوستوں کو تو بھولنا نہ چاہیئے تھا، وغیرہ، سوامی جی میری ان التجاذب سے بہت متاثر ہوئے تو میں ان سے پست کیا اور کہا کہ تب تک نہ پھر لوں گا جب تک کہ آپ کا دل میرے متعلق صاف نہ ہو جائے، چنانچہ سوامی جی نے نہ صرف اس کا آفر کیا بلکہ تم کھائی کو ان کا دل بال صاف ہے اور وہ ایڈیٹر "ریاست" کو سچا ایمان دار، مخلص اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔ اس ڈرامہ کے بعد سوامی جی نے وعدہ کیا کہ آپ کبھی کبھی دفتر "ریاست" میں درشن دیتے رہا کریں گے، اور اب آپ نے ہفتہ عشرہ کے بعد چہرہ آنا شروع کر دیا ہے جس کے لئے ایڈیٹر "ریاست" آپ کا شکر گزار اور احسان مند ہے کیونکہ ایسے صاف دلی، معصوم، مخلص اور محبت کے "روحانی"، بزرگ کہاں؟

اس شخصوں سے پاکستان کے رہنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر پاکستان کے مجذبات (پنجاب) کے مام دین کو پیدا کیا تو ہندوستان میں بھی ایک ہندو مام دین یعنی سوامی پارسی ناتھ موجود ہیں جو پاکستان کے مام دین کا علم شاعری اور "روحانیت" وغیرہ سب اعتبار سے مقابلہ کر سکتے ہیں، آہ! انہوں نے پاکستان کا مام دین اغفال کر گیا۔ خدا ہندوستان کے مام دین کو رہتی دنیا تک یا کم از کم اس زمانہ تک حبیب تک کہ ایڈیٹر "ریاست" زندہ ہے سلامت رکھے۔ آمین۔

## عدالتوں میں ضمیر کا سودا

"ریاست" کے جاری ہونے سے پہلے کوئی اخبار کسی والی ریاست یا کسی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھتا تھا اور اگر کبھی کسی خواب یا ہمارا جہ کے متعلق لکھا بھی جاتا تو ان کی تعریف میں اور پبلک مطالبات کے خلاف۔ اور نوابوں اور ہمارا جہل کو برا من الخطاب بھی لکھا جوں سے پاک سمجھا جاتا۔ شمالی ہند میں "ریاست" غالباً پہلا اخبار تھا جس نے ریاستوں کے مظالم کے خلاف آواز پیدا کرنے کو اپنا شعار قرار دیا۔ کیونکہ ریاست نا بھ کی ملازمت کے باعث ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی علم تھا کہ ریاستوں میں کیونکر تنگ و مضائقہ مظالم ہوتے ہیں۔

"ریاست" نے ایک نئی وضع بنی پالیسی اور نیا شعار اختیار کیا تھا۔ اس کے جاری ہوتے ہی اس کے سینکڑوں معترف پیدا ہو گئے۔ جو ایسے اخبار کی زندگی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اور یہ لوگ ضرورت کے وقت اس کی امداد بھی کرتے اور "ریاست" روز بروز ترقی کی طرف قدم بڑھاتا چلا گیا۔ "ریاست" کی اس کامیابی کو دیکھ کر ہمدردوں اور معترفین کے ساتھ اس کے حامد اور دشمن اخبارات بھی پیدا ہو گئے۔ ان حامد اور دشمنوں میں سے کسی نے تو "ریاست" کے دایمان ریاست پر لگائے گئے الزامات کی تردید کو اپنا شعار قرار دیا تاکہ وہ ان نوابوں اور ہمارا جہ کی خوشی کے لئے ان سے روپیہ لے سکے۔ بعض کیاستوں کی صرف تعریف کی جاتی۔

اور اکثر اخبارات نے ”ریاست“ کے ٹائٹل کی نقل کرتے ہوئے اپنی شکل و صورت بھی ”ریاست“ جیسی بنائی تاکہ وہ اپنے آپ کو ریاست کے معنی میں سمجھا کر سکیں۔ یہ اخبارات اپنی انتہائی کوشش کے باوجود زندہ نہ رہ سکے۔ اور کوئی دو ماہ۔ کوئی چار ماہ اور کوئی چھ ماہ زندہ رہ کر بند ہو جاتا۔ اور یہ تماشہ سالہا سال تک جاری رہا۔

”ریاست“ کو جاری ہوئے۔ تین چار برس ہوئے تھے کہ دہلی سے ایک اخبار جاری ہوا جس کا نام غالباً ”الحلیل“ تھا۔ اس کا دفتر جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں تھا۔ اس اخبار نے ”ریاست“ کی پالیسی کی تقلید کرتے ہوئے نہ صرف دلیان ریاست بلکہ ریاستوں کے حکام کے خلاف بھی لکھنا شروع کیا۔ مگر بہت عیسائی زبان اور پست چوبار کے ساتھ۔ اس اخبار نے بھوپال کے ایک انجینئر کے خلاف ایک مضمون لکھا۔ جس میں اس انجینئر پر رشوت وغیرہ کے الزامات کے علاوہ اس پر لوگوں کے ساتھ خلاف وضع فطری کے غلیظ الزامات بھی لگائے۔ کیونکہ اس انجینئر کے دو تین نوجوان لڑکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اور یہ لڑکے کچھ خوبصورت بھی تھے۔ ان الزامات والے پرچے مختلف پتوں پر بھوپال بھیجے گئے اور وہاں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ ان بوجوں کو جب ان نوجوانوں نے جن کے متعلق یہ مضمون تھا پڑھا تو ان میں انتہائی جوش اور غصہ پیدا ہوا۔ یہ بغیر انجینئر یا اپنے گھر والوں کو اطلاع دینے دہلی آئے۔ یہاں اس اخبار کے دفتر میں پہنچے اور انھوں نے ایڈیٹر صاحب پر چاقو سے حملہ کیا۔ حملہ کے وقت ہاتھ پائی ہوئی اور شور پیدا ہوا تو یہ ایڈیٹر صاحب کو معمولی سا زخمی کرنے کے بعد گرفتاری کے خوف سے بھاگ گئے اور بھاگتے ہوئے ان میں سے ایک اردو بازار میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس لڑکے کی گرفتاری کے بعد مقدمہ پولیس کے ہاتھوں میں گیا۔ دوسرا لڑکا بھی گرفتار ہو گیا۔ شہر میں بہت سنسنی مچ گئی کہ ریاست بھوپال کے لوگوں نے دہلی کے ایک اخبار کے ایڈیٹر پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اخبارات میں پہچان خیز مضامین کا طویل سلسلہ شروع ہوا جن میں نواب بھوپال پر بھی الزامات لگائے گئے اور عدالت میں پیر پڑھائی اور پبلک معاملات میں دیکھی جانے والی کاجوم۔ یہ مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ کے سامنے چلا گیا۔ عدالت رام چندر سنگھ کی سربراہی میں عدالت میں تھا جن کو واقعہ تین کے اختیارات بھی تھے۔ عدالت نے آپس میں ہنگامہ قید سخت کی سزا دے سکتے تھے۔

مقدمہ عدالت میں گیا تو انجینئر صاحب کے دوست اور لڑکوں کے دو مقدمہ کی پیروی کے لئے دہلی پہنچے اور ایڈیٹر ریاست کو اطلاع دہلی کہ ان لوگوں نے ایڈیٹر صاحب کو دو ہزار روپیہ دے دیا ہے اور یہ دو سو روپیہ منفع کے گواہوں کو بھی اپنے قبضہ میں کر رہے ہیں۔ مگر کچھ یقین نہ آیا۔ کیونکہ اگر ہاتھ پائی کے وقت سنو نہ ہوتا تو ایڈیٹر صاحب اس وقت قریب ایک سو کم ہسپتال میں ہوتے۔ ایڈیٹر ریاست نے ان ایڈیٹر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے لا حول ولاقہ کہتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انھوں نے تو وہ دیکھ لیا اور نہ بھوپال والوں سے کوئی بات کی ہے۔

عدالت میں ابتدائی کارروائی کے بعد گزم کے خلاف شہادتیں شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے ایڈیٹر صاحب کی شہادت ہوئی۔ جنھوں نے قاتلانہ حملے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے جرح میں ارشاد فرمایا کہ آپ گزموں کو پہچان نہیں سکتے۔ اور جو گزم عدالت میں موجود ہیں انھوں نے جلد نہیں کیا بلکہ وہ اندر لوگ تھے۔ جنھوں نے

حلقہ کیا تھا۔ اس قسم کی شہادت ہی دوسرے موقع کے گواہوں کی تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ قاتلانہ حملہ تو ضرور ہوا مگر حملہ کرنے والے دوسرے لوگ تھے اور یہ لڑکے نہ تھے۔ اس شہادت کے ذریعہ مقدمہ کا کچھ سر نکال دیا گیا۔ اور بھوپال کے لوگ خوش کہ مژم صاف بری ہو جائیں گے۔ شہر میں انواہیں جن میں ایڈیٹر صاحب کے خلاف ملامت کے کلمات استعمال کئے جاتے۔ اور ایڈیٹر ریاست، کو افسوس کہ اس طرح قاتلانہ حملہ کے بعد مژم کا بڑی ہونا انصاف کے خلاف اور دوسرے ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ چنانچہ بہت غور کرنے کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ اصل حالات دریافت کرنے کے لئے مجسٹریٹ لالہ سنت رام کے مکان پر گیا جو سبزی منڈی میں تھا۔ لالہ سنت رام کے دل میں ”ریاست“ اور اس کے ایڈیٹر کے لئے بہت عزت کے جذبات تھے۔ آپ بہت اچھی طرح سے پیش آئے۔ اور جب مقدمہ کے متعلق بات چیت ہوئی تو لالہ سنت رام نے کہا۔

”سردار صاحب میں یہ جانتا ہوں کہ مقدمہ سچا ہے اور ان لڑکوں نے قاتلانہ حملہ کیا ہے جس شخص پر حملہ کیا گیا اگر وہی اپنے بیان میں یہ کہتا ہے کہ حملہ کرنے والے دوسرے لوگ تھے۔ یہ لڑکے نہ تھے تو بتائیے دنیا کی کون سی عدالت ہے جو مژم کو سزا دے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان بیانات کی موجودگی میں مژم پر فرد جرم بھی نہ لگنی چاہئے۔ ان کو سزا دلانے کا سوال ہی کیا ہے۔ میں قطعی بے بس ہوں۔ مشکل کے بیانات کو تو قانون کے ذریعہ ہی ناپا اور قولا جاسکتا ہے۔“

یہ جواب سنکر میں واپس آگیا اور چند روز کے بعد مژم بغیر فرد جرم لگائے انسانی شہادت ہونے کے باعث ڈسچارج یعنی رہا کر دیئے گئے۔ مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد ایڈیٹر صاحب اپنے وطن یو۔ پی۔ چلے گئے۔ تاکہ بھوپال کے روپیہ سے کوئی تجارت کریں اور بھوپال کے لوگ فاتح کی حیثیت سے واپس بھوپال پہنچ گئے۔ یہ لوگ جب واپس بھوپال گئے تو کچھ عرصہ کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ کے ایک دوست نے ان انجینیئر صاحب سے اس وقت رہنے کے متعلق بات چیت کی تو انجینیئر صاحب نے کہا:-

”دنیا میں ہر شخص کے ضمیر کی قیمت مقرر ہے اور وہ اس قیمت میں خرید لیا جاسکتا ہے۔ اب ایڈیٹر صاحب کے ضمیر کی قیمت دو ہزار روپیہ تھی یہ روپیہ ادا کر کے ہم نے ان کو خرید لیا اور لڑکے بری ہو گئے۔ غذا کا شکریہ کہ ایڈیٹر صاحب صرف زخمی ہوئے تھے۔ اگر قتل ہو جاتے تو ہزار کی جگہ شاید ہمیں دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ صرف کرنے پڑتے۔“



## مسٹر ہارنیم کی تنگدستی

ہندوستان کی مصافحت کی تاریخ میں "بیٹی کرائیکل" اور "انڈین پیپلز" کے ایڈیٹر مرحوم مسٹر بی. ہارنیم کا نام بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسٹر ہارنیم نہ صرف خود ایک نامزد ترین، بے خوف، انصاف پسند اور غریبوں کے بھروسہ جرنلسٹ تھے بلکہ آپ کی شاگردی میں مرحوم مسٹر عبداللہ ہیلوی، مرحوم مسٹر سید حسین اور مسٹر پوتھن جوزف جیسے درجنوں اچھے اخبار نویسوں نے تربیت حاصل کی اور انگریز ہوتے ہوئے بھی آپ زندگی بھر ہندوستان کی آزادی کا علم بلند کرتے رہے۔ چنانچہ یہ تاریخی واقعہ تو بہت ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جب ہندوستان کی انگریزی گورنمنٹ نے آپ کے ہندوستان میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر دی تو آپ بغیر پاسپورٹ پانڈیچری (فرانس) کے راستے ہندوستان چلے آئے اور ایچی ٹیشن کے خوف سے گورنمنٹ ہند کو جرأت نہ ہوئی کہ یہ مسٹر ہارنیم کو گرفتار کر لیں۔ ایڈیٹر "ریاست" کے مسٹر ہارنیم کا تعلق بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مسٹر ہارنیم جب بمبئی دہلی آتے تو ایڈیٹر "ریاست" کے وہاں ہوتے اور ایڈیٹر "ریاست" جب بمبئی بمبئی جاتا تو مسٹر ہارنیم سے ہر روز ملاقات ہوتی اور مسٹر ہارنیم دہلی آتے یا ایڈیٹر "ریاست" بمبئی جاتے مسٹر ہارنیم ہمیشہ ایڈیٹر "ریاست" سے دو چار یا پانچ سو روپیہ لیتے کیونکہ آپ غیر معمولی فیاض تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ آپ ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھ سکتے اور باوجود کافی تنخواہ پانے کے ہمیشہ ہی بے قرض رہے۔

ایڈیٹر "ریاست" ہر سال بمبئی جایا کرتا اور عام طور پر دس جون کو بمبئی پہنچتا کیونکہ دس جون کے قریب دہلی بارش شروع ہو جاتی ہے اور جب دہلی سے یہاں بارش ہونے کا تاثر پہنچتا تو دہلی میں بارش عام طور پر بیس جون کے قریب شروع ہو جاتی ہے، اگر مونسون کی ہوا سست (نقارہ ہو) تو میں دہلی کے لئے بمبئی سے روانہ ہو جانا۔ میرا یہ معمول کئی برس رہا۔ اس زمانہ میں مقدمات کے باعث میری مالی حالت اچھی نہ تھی۔ ہزار روپیہ ہزار کا خرچ تھا اور چھتیس ہزار روپیہ کے قریب قرضہ ہو چکا تھا اور قرضہ داروں میں سے دو تین نے دیرانی مقدمات بھی دائر کر دیئے تھے جن کی عدالت سے اقتضا مقرر ہو چکی تھیں۔ بمبئی کے لئے دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے ان مقدمہ کرنے والوں میں سے ایک کا سامن میں نے اپنے جیب میں رکھ لیا اور فیصلہ کیا کہ چونکہ میری اپنی مالی حالت اچھی نہیں میں مسٹر ہارنیم کو اس سفر میں ایک پیسہ نہ دوں گا چاہے مسٹر ہارنیم کتنی بھی التجائیں کریں روانہ ہوتے وقت میرے پاس پانچ سو روپیہ موجود تھا اور خیال تھا کہ اگر ضرورت ہوگی تو "ریاست" کے بمبئی میں نمائندہ مسٹر ہرنیم لال سے لے لوں گا جن کے پاس دفتر کا روپیہ جمع تھا میں بمبئی پہنچا اور اورینٹ ہوٹل میں مقیم ہوا۔ دوسرے روز میکس میں بمبئی کے ایک نواحی علاقہ میں مسٹر ہارنیم سے ملنے کے لئے ان کے گھر گیا۔ مسٹر ہارنیم رات کو سونے کے سوٹ میں تشریف فرما تھے اور مضمون لکھ رہے تھے۔ بہت تھاک سے بے چند منٹ باتیں ہوئیں تو میں نے پوچھا کہ اس وقت باوجود بچ رہے ہیں اور آپ سلیپنگ سوٹ میں ہی تشریف فرما ہیں کیا دفتر نہ جائیں گے تو آپ نے ہاتھ کٹھکتے ہوئے کہا کہ ہاں دفتر جاؤں گا۔ اس کے

بعد پھر باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے پوچھا کہ "تیاست" کی مالی حالت آجکل کیسی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ "بہت بُری" اور میں نے اپنی مالی مشکلات کے ثبوت میں اپنی جیب سے وہ سمن نکالا جو میں ساتھ لے گیا تھا اور کہا کہ یہ دیکھو مجھ پر دیوانی مقدمات بھی چل رہے ہیں۔ اس دقت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ سمن کو دیکھ کر مسٹر ہارنمین شکر ادا دیئے۔ میں نے کہا کہ سمن کو دیکھ کر تو آپ کو میرے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیئے مگر آپ شکر ادا رہے ہیں۔ مسٹر ہارنمین نے میرے اس سوال کا بھجوا دیا وہ یہ تھا۔

"میں بھی ہمیشہ مقروض رہتا ہوں اور قرضخواہوں کے تقاضے کے باعث بہت تنگ آ جاتا ہوں کیونکہ ان کے ساتھ جھوٹے وعدے کرنے پڑتے ہیں اور جواب دینا اور ٹالنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جب کوئی قرضخواہ مقدمہ کرنے اور میرے پاس سمن آ جائے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ یہ کجمنت اب تقاضہ کرنے کے لئے تو نہ آئے گا اور مجھے تنگ تو نہ کرے گا۔ تم بھی خوش نصیب ہو کہ تمہارے پاس سمن پہنچ گیا اور اب اس قرضخواہ کے زبانی تقاضہ سے تمہیں نجات حاصل ہوگی۔"

قرضخواہوں کے تقاضہ سے نجات حاصل کرنے کا یہ نسخہ دلچسپ تھا۔ اس کے بعد مسٹر ہارنمین نے اپنی مالی پریشانیاں بیان کرنی شروع کیں مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک پیسہ نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو میں نے اجازت چاہی اور کہا ٹیکسی موجود ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ آپ کو آپ کے دفتر چھوڑ دوں گا۔ اس پر مسٹر ہارنمین نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ضرور چلتے مگر آپ کی پتلون دھوبی کے پاس ہے اور دھوبی نے پتلون دینے سے انکار کر دیا ہے جب تک کہ اس کے پچھلے پیسے بھی دھوبی کے روپیہ کے قریب تھے، نہ دے دیئے جائیں اور گھر میں ایک پیسہ موجود نہیں جس کے باعث وہ میرے لئے چائے بھی تیار نہ کر سکے۔ میں یہ سُن کر سکتہ کی حالت میں تھا۔ ہندوستان کا بہترین اور آل انڈیا شہرت کا جرنلسٹ مسٹر ہارنمین اور چائے کے لئے بھی پیسے نہیں۔ میں رہ نہ سکا۔ ان کے ملازم ممتاز دروازے پر کل فلم ایکٹر ممتاز کے نام سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں (کو ایک سو روپیہ کا نوٹ دیا۔ دھوبی سے پتلون آئی۔ چائے تیار ہوئی اور میں نے اور مسٹر ہارنمین دونوں نے چائے پی اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر آئے اور میں نے مسٹر ہارنمین کو ان کے دفتر چھوڑا۔

مسٹر ہارنمین ایک زمانہ میں ممبئی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ حکومت ان کے قلم سے کاغذی ہوتی اور چنگ ان کے ساتھ ہوتی۔ ممبئی کے بڑے بڑے لیڈر ان کے دروازہ پر سجدہ کرتے تھے اور ہندوستان کا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا۔ اخبارات پڑھتا ہوا اور مسٹر ہارنمین کے نام سے واقف اور ان کی قابلیت کا مآثر نہ ہو مگر مسٹر ہارنمین زندگی بھر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور اکثر آپ نے ناخوشی کے کیونکہ آپ نظر ثانی کرتے تھے۔ آپ کی عمر کے آخری زمانہ میں آپ کے چند دوستوں نے آپ کی مالی امداد کے لئے "ہارنمین فنڈ" جاری کیا جس میں بھی صرف چند ہزار روپیہ جمع ہو سکا کیونکہ روپیہ

اخبارات میں اپیل کرنے سے جمع نہیں ہوا کرتا۔ اس کے جمع کرنے کے لئے تو ذاتی اثرات استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ سٹراونین کی زندگی کا آخری زمانہ بھی تلکدستی میں بسر ہوا۔ گوا آئندہ زمانہ میں ہندوستان کی آئندہ نسل اس شخص کے نام کے کتبے آویزاں کرے گی اور آئندہ زمانہ میں اپنی یادگاریں قائم کی جائیں گی۔

## جہیز کا شمار

کئی برس ہوئے نئی دہلی میں کلکتہ کے ایک ہندو بنگالی کلک تھے۔ تنخواہ ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کے قریب۔ ان کی بیوی مرچلی تھیں۔ کوئی لڑکا نہ تھا اور صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام شیلما تھا۔ اُس زمانہ میں جہیزے ارزاں تھے اور ان بالوجہ کے صرف ایک بچی تھی۔ اس لئے آپ اس بچی پر کافی روپیہ صرف کرتے۔ اور آپ نے اس لڑکی کی تعلیم کا انتظام دہلی کے کوئن میری سکول میں کیا تھا۔ جہاں مصارف کی زیادتی کے باعث صرف اُمراء کی لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ شیلما جب چودہ برس کی تھی تو اس کے والد انتقال کر گئے اور گھر میں جو سرکاری کارٹر تھا، کوئی نہ رہ گیا۔ اذازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک نو عمر اور نا تجربہ بہ کار لڑکی صرف اکیلی رہ جائے تو اس کے دل اور ذہن کی کیا کیفیت ہوگی۔ میرے پاس ایک خاتون کا پیغام پہنچا کہ یہ لڑکی اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کے رشتہ دار کلکتہ میں ہیں اور جب تک کہ اس کے چچا اس کو لینے کے لئے نہ آجائیں اس لڑکی کے رہنے کا انتظام کسی خاتون کے ہاں کر دیا جائے۔ لڑکی جو ان تھی اور ذمہ داری کا بھی سوال تھا میں نے مناسب سمجھا کہ اس لڑکی کو کوچہ چیلان کی ایک خاتون کے ہاں بھجوا دیا جائے۔ یہ خاتون بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان میں ایک ارکٹن میری سکول ہی کی تعلیم یافتہ تھیں۔ یہ ”ریاست“ اور اس کے ایڈیٹر کی مداح تھیں۔ اور اس خاتون کا کبھی کبھی خط آیا کرتا تھا۔ میں نے ظفر احمد صاحب دجہ ”ریاست“ کے پرنٹرو بلشرٹھ اور نرنجی کم کرتے تھے) کو بھیج کر لڑکی کو کوچہ چیلان کی اس خاتون کے ہاں بھجوایا۔ اور اس خاتون نے اس لڑکی کے لئے اپنے مکان کی اوپر کی منزل میں ایک کمرہ دیا۔ اور چونکہ یہ لڑکی ہندو تھی اس کے کھانے کا انتظام اس خاتون نے دریا گنج کے ایک ہندو ہوٹل میں کر دیا۔ جہاں سے ہوٹل کا ملازم دونوں وقت کھانا دے جاتا۔ اور میں نے کلکتہ اس کے چچا کو تار بھجوا کر شیلما اکیلی ہے وہ اسے آکر لے جائے۔

دو تین میں زوال کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ملتا۔ شیلما کے چچا نے جب سنا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے اور شیلما دہلی میں اکیلی ہے تو اس نے بھی کچھ زیادہ پروا نہ کی اور لڑکی کو کلکتہ لاکر رکھنا ایک بوجھ سمجھا اور جب اسے بار بار لکھا گیا تو یہ کئی روز بعد دہلی پہنچا اور شیلما دو ہفتہ کے قریب کوچہ چیلان کی اس خاتون کے ہاں رہیں۔ اس دو ہفتہ کے قیام میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ صرف ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ میرے پاس اطلاع پہنچی کہ شیلما کو بخار ہے میں نے ظفر صاحب کو بھیجا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو دکھا کر دوائی کا انتظام کر دیں۔ ظفر صاحب کوچہ چیلان گئے۔ شیلما کو اس وقت بخار نہ تھا۔ ظفر صاحب نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کو

بلا کر دکھا دیتے ہیں۔ تو شیلانے کہا کہ ڈاکٹر کو فیس دینے کی کیا ضرورت ہے وہ خود ڈاکٹر کے ہاں جا کر اور نمٹیں دکھا کر دوائی لے آئیں گی۔ ظفر صاحب نے ان کے لئے ڈولی منگائی اس زمانہ بنگالی میں ڈولیمیں کا رواج بہت تھا اور عورتیں ڈولیمیں ہی بنایا کرتی تھیں۔ شیلہ جب ڈولی میں سوار ہونے لگی تو کمزوری کے باعث یہ کچھ لڑکھڑاسی گئی۔ ظفر صاحب نے جب دیکھا کہ یہ کمزور ہیں تو چاہا کہ سہارا دے کر ڈولی میں بٹھا دیں۔ مگر جب ظفر صاحب سہارا دینے والے تھے تو شیلانے بے اختیار ہی کے عالم میں کہا۔ ”بھائی صاحب مجھے ہاتھ نہ لگانا میں خود بیٹھ جاؤں گی۔“

شیلہ ڈولی میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئیں ظفر صاحب ساتھ تھے۔ ڈاکٹر کو نمٹیں دکھائی گئی اور شیلہ دوائی لے کر واپس کر چکیاں پہنچ گئیں۔ ظفر صاحب جب دفتر میں واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ جب وہ شیلہ کو سہارا دینے والے تھے تو شیلانے کہا ”بھائی صاحب مجھے ہاتھ نہ لگانا میں خود بیٹھ جاؤں گی۔“ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے اور مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب آج سے چالیس چاس برس پہلے ہر ہندو عورت کسی غیر مرد کو چھونا بھی پاپ یا گناہ سمجھتی تھی۔

شیلہ کو کچھ چیلان کی اس خاتون کے گھر قیام کئے دو ہفتے ہو گئے تھے کہ اس کے چچا شیلہ کو لینے پہلی پہنچے۔ وہ پہلے اپنے بھائی کے کو ادر میں گئے۔ وہاں پڑوسیوں نے بتایا کہ شیلہ کو کچھ چیلان کے فلاں سلمان خاندان کے گھر رہتی ہے۔ شیلہ کے چچا نے جب یہ سنا تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اس نے یہ سمجھ لیا کہ شیلہ سلمان ہو گئی ہے۔ وہ کو کچھ چیلان میں اس خاتون کے یہاں پہنچا۔ بعد دروازہ پر شور پیدا کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ ایک معصوم ہندو لڑکی کو اغوا کر کے لائے ہو۔ شیلہ اوپر کے کمرے میں تھی جب اس نے یہ شور سنا تو نیچے آئی اور چچا کو دیکھا کہ وہ غصہ کی حالت میں دشنام طرازی کر رہا ہے۔ شیلہ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس نے اپنے چچا کو تمام اصل حالات بتائے اور کہا کہ دریا گنج کے ایک ہندو ہوش سے کھانا آتا ہے۔ صرف ازراہ ہمدی اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ شیلہ کے چچا کو جب اصل حالات معلوم ہوئے تو بے حد شرمندہ ہوا اس نے معافی چاہی اور وہ شیلہ کو لے کر رات کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہو گیا۔

شیلہ جب کلکتہ پہنچی تو خاندان میں اس کی شادی کا سوال پیدا ہوا۔ اور لڑکے کی تلاش شروع ہوئی۔ بنگالی ہندوؤں میں بغیر ہمیر کے کسی لڑکی کی شادی کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ لڑکے والے دس دس پندرہ پندرہ اور تیس تیس ہزار روپیہ طلب کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کے پارچے لڑکے ہوں تو اس کا خاندان امیر ہو جاتا ہے۔ شیلہ کا باپ معمولی کلرک تھا۔ جو اپنی بیٹی پر فراخ دلی کے ساتھ روپیہ صرف کرنا رہا۔ شیلہ کے چچا کے پاس بھی روپیہ نہ تھا اور اگر ہوتا تو شاید وہ پھر بھی شیلہ کے ہمیر میں ہزار ماروپیہ نہ دیتا۔ ہمیر کے لئے روپیہ نہ ہونے کے باعث شیلہ کے چچا نے اس کی سنگائی ایک معمر بنگالی کے ساتھ کر دی جو انبالہ جھاڑی میں گڈس کلرک تھا۔ شیلہ کی شادی ہونے کے چھ ماہ بعد شیلہ کا شوہر جگر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ یہ رخصت لے کر علاج کے لئے کلکتہ گیا وہاں ہسپتال میں داخل ہوا اور ہسپتال میں ایک ماہ زیر علاج رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔

شیلہ کے بیوہ ہوتے ہی گھر کے لوگوں نے اس کو مجبور کیا کہ یہ رواج کے مطابق اپنے بال کٹوا دے تاکہ بد صورت نظر آئے۔ شیلہ کو بہن میری سکول کی اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ پڑھی ہوئی تعلیم یافتہ خوبصورت اور نو عمر لڑکی تھی۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے بال نہ کاٹے جائیں ورنہ بنگالی عورتوں کے بال بے حد حسین ہوتے ہیں اور بنگالی عورتیں اپنے بالوں کو لمبے چمکیلے اور خوبصورت بنانے پر کافی محنت کرتی ہیں (مگر گھروالوں نے خاندان کے دنار کے خیال سے شیلہ کے بال کاٹ دیئے۔ شیلہ کو ایک کمرے میں بند رہنے پر مجبور کیا گیا۔ تاکہ اس کی منحوس صورت شادی شدہ عورتیں نہ دیکھیں اور ان کا شہاک قائم رہے۔ کیونکہ بنگالیوں کے خیال کے مطابق سہاگن عورتوں کو صبح ہی صبح بیوہ عورتوں کی صورت نہ دیکھنی چاہئے۔ شیلہ کی جب یہ کیفیت ہوئی تو اس نے سبھی انگریزی میں ایک خط لکھا کہ کیونکہ وہ اردو نہ جانتی تھی اور میں بنگالی زبان سے واقف نہ تھا) جس میں اس کے شادی ہونے اور بیوہ ہونے کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ درج تھے اور لکھا تھا کہ ظفر صاحب کو کلکتہ بھیج دو تاکہ وہ دہلی چلی آئے۔ کیونکہ اس کی مروجہ زندگی ناقابل برداشت حد تک اذیت میں ہے۔ جب یہ خط پہنچا تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میں نے ظفر صاحب کو کلکتہ بھیجا کہ وہ شیلہ کو دہلی لے آئیں اور یہاں اس کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ظفر صاحب کلکتہ گئے تو وہاں ان کے پہنچنے سے ایک روز پہلے شیلہ زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر چکی تھی۔ ظفر صاحب نے بتایا کہ اُس بے گناہ اور معصوم لڑکی کی شادی مقتر اور بیمار شخص کے ساتھ کر کے سوسائٹی نے اس پر بہت برا ظلم کیا۔ کیونکہ چیز کے لئے روپیہ نہ تھا۔ اور چیز کے بغیر کوئی اچھا لڑکا شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے اس ظلم کے مقابلہ پر موت کو ترجیح دی۔ یہ دن رات ایک کمرہ میں پڑی رہتی۔ جب اس کی موت ہوئی تو اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور صبح گھر والوں نے دیکھا کہ اس کی لاش چارپائی پر پڑی ہوئی ہے۔ ظفر صاحب یہ حالات سن کر وہاں آ گئے۔ مجھے حالات سن کر بے حد تکلیف ہوئی مگر سوائے اخبار میں غم و غصہ اور اظہار افسوس کے کبھی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ اسی ہفتہ شیلہ کی موت پر ”ریاست“ میں ایک دردناک نوٹ لکھا گیا۔ جس میں چیز کی لعنت پر آنسو بہائے گئے۔

## ۱۹۴۷ء کا بہت مال

۱۹۴۷ء میں میرے پاس ایک چھڑا سی رن سنگھ بہت ہی محنتی، شریف اور دیانتدار تھا اور یہ ایک عرصہ سے کام کر رہا تھا کیونکہ اگر کوئی ملازم محنتی اور دیانتدار نہ ہو تو اس کا میرے پاس چند روز کام کرنا بھی ممکن نہیں اور جو شخص چند ماہ بھی دفتر ”ریاست“ میں کام کرے تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ محنتی اور دیانتدار ہے۔ رن سنگھ کے متعلق مجھے کوئی شکایت نہ تھی اور نہ اُس کو میرے متعلق کسی قسم کی کوئی شکایت تھی کیونکہ میں ملازموں کے ساتھ ہمیشہ ہی ایسا سلوک کرتا ہوں جیسے یہ اپنی فیملی کے ممبر ہوں۔ یہ رن سنگھ ضلع انبالہ کی تحصیل کھرڈا کا رہنے والا تھا۔

فسادات ہو رہے تھے تو ایک روز میں نے محسوس کیا کہ رن سنگھ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے یعنی یہ کام اس طرح نہیں کر رہا جیسا کہ یہ ہمیشہ کرتا تھا۔ میں نے ہمدردی کے لہو میں اس سے پوچھا کہ تنہا راجی تو اچھا ہے۔ رن سنگھ نے جواب دیا ہاں میں بالکل اچھا ہوں۔ میں نے پھر پوچھا کہ آج تم دل لگا کر کام کیوں نہیں کر رہے تو اس کے جواب میں اس نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا جو اس کو اپنے گھر سے پہنچا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ”اب تم کو ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں، فوراً اپنے گھر واپس چلے آؤ۔ مسلمانوں سے ٹوٹا ہوا مال ہم نے بہت کافی حاصل کر لیا ہے اور بہت کافی تعداد میں خوبصورت سے خوبصورت مسلمان عورتیں بھی موجود ہیں۔ جتنا مال تم چاہو لے لینا اور اگر عورت کی ضرورت ہوگی تو عورت بھی لے لینا۔ تم فوراً اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔“ اس خط کو دیکھ کر میں حیران کہ دنیا کو کیا ہو گیا۔ میں نے رن سنگھ کو سمجھایا کہ دوسروں کا مال حاصل کر لگنا اور پاپ ہے مگر یہ نہ مانا اور ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے کوئی عورت تو حاصل نہ کی کیونکہ یہ شادی شدہ تھا مگر سکھوں کے ”بیت المال“ میں سے اس نے اپنا حصہ لے لیا اور اس نے اپنے گاؤں میں رہنا شروع کیا۔ یہ کسی زمانہ میں فوج کے ایک ہسپتال میں بطور دارو قلی کام کرتا تھا اور ٹیکہ آؤ ڈیڑ اور آؤ ڈو فارم کو استعمال ہوتے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے گاؤں میں بھی پانچ سات ادویات اپنے گھر میں رکھ لیں اور مجھے خط لکھا کہ اس نے ڈاکٹری شروع کر دی ہے اور آئندہ جب اس کو خط لکھا جائے تو ڈاکٹر رن سنگھ کے پتہ پر بھیجا جائے۔

قرول باغ دہلی میں کچھ سکھ رہتے تھے جو موٹر ڈرائیوری وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ فسادات کے دنوں میں انھوں نے ٹوٹ میں حصہ لیا اور کنٹ پلیس کی ایک ریڈیو کی دوکان میں سے یہ دس بارہ ریڈیو اٹھا لئے۔ یہ لوگ خلیع انبالہ کے رہنے والے تھے اور ان کو علم نہ تھا کہ ریڈیو بغیر بجلی کے کام نہیں دے سکتا۔ یہ جب ریڈیو اپنے گھر لے آئے تو ان کے گھر میں بجلی نہ تھی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ ریڈیو پر نسا شروع کریں اور انھوں نے ریڈیو چلانے والے پوزوں کو بہت گھمایا مگر ریڈیو نہ بولے تو یہ پڑوس کے ایک دوست کو لائے جس کے گھر میں ریڈیو تھا اور پوچھا کہ یہ ریڈیو کس طرح چلایا جائے۔ ان کے اس دوست نے بتایا کہ یہ بغیر بجلی کے نہیں چل سکتا تو یہ مایوس ہو گئے اور انھوں نے سو رہ پیر کا مال پچیس روپیہ میں فروخت کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ریڈیو سیٹوں کو اپنے گاؤں لے جائیں گے مگر وہاں بھی بجلی نہ تھی۔ اس لئے ان کے پاس اس ”بیت المال“ کو فروخت کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایڈیٹر ریاست ”سنگھ ۱۹۴۲ء میں جن دنوں فیروز پور جیل میں نظر بند تھا وہاں پہلے ساتھ دہلی کے ایک دیکھل بھی نظر بند تھے جو کانگریس کے حلقوں میں کافی معتبر سمجھے اور قومی تحریکوں میں حصہ لینے کے

اعتبار سے پیش پیش تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دنوں میں مجھے اطلاع ملی کہ یہ حضرت بھی ٹوٹ میں جھڑکے رہے ہیں اور ایک شخص نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ بے کی الماریوں کی ایک دکان میں سے بے کے کبس لوٹ رہے ہیں، فسادات کے دن تھے۔ ڈاکخانہ بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ اخبارات شائع نہ ہو رہے تھے اور ”ریاست“ بھی بند تھا۔ اگر اخبار جاری ہوتا تو میں ان وکیل صاحب کے اس ”کانگریس ازم“ کو بے نقاب کر دیتا۔ میں نے اس کا ذکر چند کانگریسی حضرات سے کیا تو انھوں نے اس وکیل سے دریافت کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز یہ وکیل صاحب دفتر ریاست میں پہنچے اور انھوں نے اس خیال سے معافی چاہی کہ اخبار جاری ہونے پر ان کی مٹی پلید نہ ہو اور کہا کہ یہ ٹوٹ کا مال واپس کر دیں گے۔ اس واقعہ کے بعد کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کسی قومی تحریک میں حصہ لیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ کانگریسی حضرات کو ان کے اعمال نامہ کا علم ہو چکا تھا، یہ خود ہی شرم محسوس کرتے ہوئے قومی چھپسی سے الگ ہو گئے۔

فسادات کے زمانہ میں ایک دوست تشریف لائے۔ یہ مرکزی گورنمنٹ کے دفتر میں ملازم تھے۔ ان کے پاس پارکر کا نیا قلم تھا اور میرے قلم کا تلب کر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس لئے میں معمولی قلم و دوات کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ آج کل قلم بہت ارزاں ہیں، میں پارکر کا ایک نیا قلم کیوں نہیں خرید لیتا۔ میں نے جواب دیا کہ پارکر کا قلم ساٹھ ستر روپیہ سے کم قیمت میں نہیں مل سکتا اور اخبار بھی فسادات کے باعث بند ہے، اتنی قیمت ادا کرنے کی ہمت نہیں، میرے اس جواب پر آپ نے اپنا نیا قلم دکھایا اور فرمایا کہ انھوں نے یہ قلم بیس روپیہ میں خریدا ہے اور جتنی تعدادیں ضرورت ہو یہ قلم بیس بیس روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ میں حیران کہ بازار میں یہ قلم ساٹھ ستر روپیہ میں نہیں مل سکتا اسے بیس روپیہ میں کون دے گا۔ میں نے جب زیادہ تفصیل کے ساتھ پوچھا تو معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے فسادات کے سلسلہ میں مال ٹوٹا ہے وہ یہ قلم بیس بیس روپیہ میں فروخت کر رہے ہیں۔ اس دوست نے چاہا کہ میں ان کا قلم مفت ہی لے لوں مگر میرے ضمیر نے اجازت نہ دی اور میں نے جواب دیا کہ اگر ساٹھ سا ہو کار کا یا دالی ریاست کی دوکان کا ٹوٹا ہوا مال ہوتا تو میں شاید لے لیتا، غریبوں کی دوکان کا ٹوٹا ہوا مال خریدنے یا مفت لینے کی ہمت نہیں کیونکہ مجھے خوف ہے کہ یہ قلم شاید مجھے دس قلموں کی قیمت ادا کرنے کے بعد میرے ایمان اور ضمیر کو بھی لے ڈوبے۔ اس دوست نے بار بار کہا کہ میں یہ قلم ان سے لے لوں مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ”بیت المال“ کے اس قلم سے لکھ رہی نہ سکوں گا۔

# مرحوم شیخ ضیاء الحق کی علم دوستی

غالباً سترہ لوگ بات ہے ہندوستان کے تین مجاہد وطن (۱) صوفی انبیا پرشاد (۲) سردار اجیت سنگھ (مشہور انقلاب پسند مرحوم سردار بھگت سنگھ کے حقیقی چچا) اور (۳) شیخ ضیاء الحق (مولانا عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے حقیقی بھائی) غیر مالک کی امداد کے ذریعہ ہندوستان کو انگریزی حکومت کی غلامی سے نجات دینے کے لئے ہندوستان سے باہر گئے۔ ان میں سے صوفی انبیا پرشاد کا تو ایران میں انتقال ہو گیا۔ سردار اجیت سنگھ ایران سے روپوش ہو کر یورپ چلے گئے اور شیخ ضیاء الحق برطانوی سفیر متعینہ ایران کے ایسا سے پھران میں گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کے بعد ہندوستان لائے گئے۔ یہاں سات برس تک قید رہے اور اس کے بعد رہا ہوئے۔

شیخ ضیاء الحق مرحوم مولانا محمد علی کے گھرے دوستوں میں سے تھے اور آپ نے مرحوم مولانا محمد علی کو خواجه حسن نظامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ مشہور خط دیا تھا جس کی بنیاد پر مرحوم مولانا نے خواجه حسن نظامی پر انگریزوں کی جاسوسی کا الزام لگایا اور جو خط خواجه حسن نظامی کی موت کا باعث ہوا۔

ریاست کے جادی ہونے کے دو برس بعد شیخ ضیاء الحق نے مجھے کئی خطوط لکھے کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ مجھے خواجه نظامی کی پارٹی کے اصحاب نے بتایا تھا کہ وہ خطرناک قسم کے آدمی ہیں۔ یہ خطوط دو سال کے مسلسل عرصہ میں لکھے گئے مگر شیخ ضیاء الحق میرے جواب نہ دینے سے بھی مایوس نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک گھرے دوست لالہ کدرا ناتھ سہگل (جو بعد میں پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے) اس زمانہ میں انارکٹوں کے ساتھ تعلق رکھنے میں مشہور تھے اور میرے بھی گھرے دوست ہیں) کو میرے پاس بھیجا اور دریافت کیا کہ میں شیخ صاحب کے خطوط کا کیوں جواب نہیں دیتا اور کیوں نہیں ملتا۔ میں نے جواب دیا کہ شیخ ضیاء الحق خطرناک قسم کے آدمی ہیں جو پراپیٹریٹ تئریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں ایسے شخص سے دور رہنا چاہتا ہوں، مگر لالہ کدرا ناتھ نے کہا کہ مجھے غلط بتایا گیا ہے۔ شیخ ضیاء الحق غیر مسمولی اچھے، بہادر، انتہائی محب الوطن اور حریت پرست دوست ہیں اور میں ضرور ان سے ملوں۔ لالہ کدرا ناتھ کے زور دینے پر میں نے کہا کہ بہت بہتر، شیخ صاحب تشریف لاسکتے ہیں۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد شیخ ضیاء الحق ملنے کے لئے تشریف لائے۔ اس پہلی ملاقات میں بہت باتیں ہوئیں مگر میں محتاط تھا کہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکل جائے جس کا یہ ناجائز فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ریاستوں کے حالات دریافت کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا کیونکہ یہ ریاستوں کے متعلق بہت اکپیرٹ تھے۔ ریاستوں کے مظالم کو بے نقاب کرنے کے لئے درجنوں پمفلٹ لکھ چکے تھے۔ گرفتار بھی ہوئے اور مسلمان دایمان ریاست ان سے بہت خوف زدہ تھے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک لمبی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد پھر تشریف لائے۔ اس کے بعد کبھی کبھی تشریف لائے اور میں نے محسوس کیا کہ بہت



ہی خلص اور محبت کے اشان ہیں۔ جتنا ان کے قریب جاؤں ان کے لئے اتنی ہی عزت و محبت کے جذبات میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دہرے کی لمکات کے بعد ان کے ساتھ میرے تعلقات اس قدر گہرے ہو گئے کہ یہ ہر اتوار کی صبح کو اپنی بیوی سے بہت اچھا اور لذیذ کھانا کچھ کر دس بجے کے قریب اپنے وطن ہاؤس دہلی میرے ہاں پہنچتے۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے شام کے چار بجے تک باتیں کرتے اور اس کے بعد واپس ہاؤس چلے جاتے اور آپ کا یہ معمول کئی برس تک جاری رہا۔

شیخ ضیاء الحق کی عمر اُس وقت غالباً پچھتر برس کی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ انرجی والا انسان نہیں دیکھا۔ صوفیائے کرام پر دس منٹ سے زیادہ نہ بیٹھ سکتے اور پٹلنے لگتے کسی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے غصہ میں آتے تو کھڑے کر اُس شخص کو گایاں دینے لگ جاتے۔ آپ اعلیٰ درجہ کی شراب خوردی مقدار میں پیے جس کے باعث آپ کی صحت بہت اچھی اور چہرہ کارنگ سرخ تھا۔ آپ بہت بڑے و صندار دوستوں کے لئے مزا بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھتے۔ بہت بڑے ہماں نواز اور خلص اور ریرے نہ صرف بہت بڑے مآج بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ مجھ سے اپنے عزیزوں کی طرح محبت کرتے تھے جس کے باعث مولانا عبدالحق بھی مجھ پر کرم فرماتے ہیں۔

میں ایک روز بیمار تھا۔ بخار کی حالت میں پٹنگ پریشاہر تھا اور میرے پاس لالہ کانٹی رام کپور۔ (رائے بہادر ڈاکٹر ہمارا ج کرشن کپور کے حقیقی بھائی اور میجر کپور گن انڈین پولیسیل سر دس کے حقیقی چچا) بیٹھے ہوئے تھے کہ شیخ ضیاء الحق ہاؤس سے تشریف لے آئے۔ شیخ صاحب جب بیٹھے تو میں نے لالہ کانٹی رام کپور سے ان کا تعارف کراتے ہوئے مذاق سے کہا ”آپ شیخ ضیاء الحق ہیں جو میری پیدائش سے بھی کئی برس پہلے سے ریاستوں کے متعلق دلچسپی لے رہے ہیں اور دایان ریاست کے خلافت ورجن پمفلٹ بلکہ چکے ہیں۔“ لالہ کانٹی رام نے جب یہ سنا تو آپ نے شیخ ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے مذاق سے کہا ”باباجی اس اپنے بر خوردار (یعنی دیوان سنگھ) کو بزرگانہ دعائیں دیکھئے تاکہ یہ اپنے فن (یعنی دایان ریاست کے خلافت لکھنے) میں زیادہ کامیاب ہو۔“ لالہ کانٹی رام کپور کے یہ الفاظ سن کر شیخ ضیاء الحق نے فوراً جواب دیا ”میں اس بر خوردار کو کیا دعائیں دوں۔ دایان ریاست کو بے نقاب کرنے کے اعتبار سے تو یہ میرا بھی باپ پیدا ہو گیا۔“ شیخ ضیاء الحق کے یہ الفاظ سن کر ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور لالہ کانٹی رام نے شیخ صاحب کے اس دلچسپ جواب کی خوب داد دی۔

شیخ ضیاء الحق خود بھی بہت فیاض اور ہماں نواز تھے اور ان لوگوں کی بہت داد دیا کرتے جو فیاضی کے ساتھ رپریم صرف کرتے یا ہماں نواز ہوتے۔ میں شیخ ضیاء الحق کے لئے اپنے گھر میں اعلیٰ درجہ کی برانڈی ہینری تھری مار ضرور رکھتا تھا کہ یہ آپ کو بہت مرغوب تھی اور جب آتے تو دین پگ ضرور پیتے اور ایک پگ مجبور کر کے مجھے بھی پلاتے کیونکہ میں شراب پینے کا عادی نہیں۔ کئی کئی ماہ کے بعد کسی دوست کے مجبور کرنے پر زیادہ سے زیادہ دو ایک پگ پنی لیا کرتا ہوں۔ ایک روز میں صدر بازار گیا

لڑواں کو اکر لی گی ایک دوکان پر بہت خوبصورت مٹھاس کٹھن صراحی پڑی تھی جو شراب رکھنے کے لئے تھی۔ اس صراحی کو دیکھ کر مجھے شیخ صاحب یاد آ گئے۔ میں نے وہ صراحی اٹھا کر دوپہر میں خیرینی اور گھر پہنچنے کے بعد برانڈی کی ایک بوتل اس میں ڈال دی کیونکہ اس میں اتنی مقدار کے لئے باقی تھی۔ تین روز کے بعد شیخ صاحب تشریف لائے اور آپ نے برانڈی طلب کی تو میں نے بتائی میں سے صراحی نکال کر شیخ صاحب کے سامنے رکھتی شیخ صاحب بہت خوش ہوئے اور آپ نے اس میں سے دو تین پیگ پئے اور باقی کر کے رہے۔ ان کے پینے کے بعد میں نے یہ صراحی کبھی نہیں رکھا۔ اسی تو چار بجے کے قریب جب ریڑھے سٹیشن کو جانے لگے تو آپ نے اس کبھی میں سے صراحی نکالی اور اسے اپنی بٹل میں دبا کر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے کہا ”شیخ صاحب یہ صراحی کہاں لے جا رہے ہو۔ میں تو اسے بہت شوق کے ساتھ اٹھا کر دوپہر خرچ کر کے لایا ہوں۔“ شیخ صاحب نے میرے اس کہنے کا جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا ”میں یہ جانتا ہوں کہ یہ صراحی تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ وہ میری اشیاء کی طرح تم سے یہ صراحی بھی کوئی نہ کوئی لے جائیگا اور جب کوئی دوسرا لے جائیگا تو میں بھی کہیں نہ لے جاؤں۔“

یہ کہتے ہوئے شیخ صاحب چلے گئے اور جب اگلے روز آ کر آئے تو آپ نے کہا کہ آپ صرف اس شوق سے صراحی لے گئے تھے کہ اسے کوئی نہ کوئی دوسرا اڑا لے جائے گا۔ یہ صراحی بہت خوبصورت ہے۔ باقی میں محض غلطی ہے اور اگر میں یہ غلطی اقرار کر دوں کہ میں کسی دوسرے کو نہ دوں گا تو آپ لگے ہفتہ یہ صراحی واپس لے جائیں گے۔

شیخ صاحب اپنی بہت بڑے علم دوست تھے۔ ہزار کتابوں کے علاوہ آپ کے پاس آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کے اخبارات اور رسائل بھی موجود تھے جو اس وقت قلعی نایاب ہیں بلکہ ایک قاتیل تو شہرہ آفاق جنگ آزادی سے پہلے کے ایک قزوخی اخبار کی بھی تھی۔ جب کبھی کسی واقعہ کا ذکر ہوتا تو آپ اپنی دلیل کی تائید میں اس زمانہ کے اخبار کا فائل پیش کر دیتے اور کتابوں کے متعلق تو پوزیشن یہ تھی کہ شاید ہی آرمڈ بائی کی کوئی اہم کتاب ایسی ہوگی جو آپ کے پاس نہ تھی اور آپ کے فائلوں میں پچھلے پچاس برس کے خطوط بھی موجود تھے جو بڑے گزشتہ تھے۔ آپ کو کہتے۔ آپ کی کتابوں اور اخبارات کی فائلوں کا جب کبھی ذکر آتا تو میں شیخ صاحب سے مذاقاً کہا کرتا شیخ صاحب ایک صیت کر چاہیے کہ آپ کے سر کے بعد آپ کا یہ تمام شاگ مجھے دیا جائے شیخ صاحب میری اس خواہش پر مسکرا دیتے۔ مگر میں جانتا تھا کہ جو شخص پچاس ساٹھ برس سے اخبارات اور رسائل کے فائل جمع کر رہا ہو اس کے لئے یہ غلی خزانہ جدا کرنا ممکن نہیں شیخ صبیح الحق کا جب انتقال ہوا تو میں جیل میں تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں ”ریاست“ پھر جاری کیا تو ایک روز دوپہر کے وقت دیکھا کہ مرحوم شیخ صبیح الحق کے صاحبزادہ کتابوں سے بھری جوئی چاریل گاڑیوں کے ساتھ دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے ہیں۔ میں حیران کہ یہ کیا بات ہے۔ شیخ صاحب کے صاحبزادہ سے

بدھاتو آپ نے بتایا کہ آپ کے ابا یعنی شیخ ضیاء الحق نے انتقال سے ایک روز پہلے کہا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد تمام فائیل اور کتابیں ویران سنگھ کو بیچ دی جائیں اور آپ دو کتابیں اور فائیل لائے ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کیونکہ میں گئی روز سے سوچ رہا تھا کہ کسی دن ہارڈ جاکر شیخ صاحب کے مقبرہ پر حاضری دوں۔ ان فیل گاڑیوں سے کتابیں اور اخبارات و رسائل کے فائیل آترہائے گئے اور ایک کمرہ میں رکھوائے تو اس میں فٹ لے لے اور بارہ فٹ چڑھے کمرہ میں ایک گڑاؤنچی جگہ میں یہ علی خزانہ رکھا گیا۔ یہ فائیل اور کتابیں دروازہ تک اس کمرہ میں رہیں۔ جو دوست آتا دس بیس یا پچاس کتابیں اٹھائے جاتا کیونکہ بعض کتابیں ایسی تھیں جو اس وقت کہیں نہیں مل سکتیں۔ میری حالت یہ کہ نہ تو مجھے ان کتابوں اور فائلوں کے بڑھنے کی فرصت، نہ اپنی گرفتار رکھنے کا سلیقہ اور نہ لائبریری کا شوق کیونکہ اگر شرق ہوتا تو میرے پاس اپنی ہی اس وقت کوئی ہزار کتابیں جو تھیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی خیال کہ دوست ان تمام کو آہستہ آہستہ ختم کر دیں گے۔ میں نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ تمام شکاں کسی لائبریری کو دیا جائے گا کہ پہلک اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ نذیر بک کتب خانہ (جو شمس العلماء مولانا ڈاکٹر نذیر احمد کی یادگار ہیں قائم کیا گیا ہے) کے مفتاح مولوی محمد عبدالرؤف کو بتوایا اور اخبارات کے تھوڑے سے فائیل خود رکھ کر اس تمام شکاں کی کتابوں اور فائلوں پر ہر گھنٹائی گئی جس پر لکھا تھا: "یہ کتاب مرحوم شیخ ضیاء الحق نے لائبریری کو خیرگی" اور تمام شکاں اس لائبریری کو بیچ دیا گیا تاکہ یہ لوگوں کے کام آسکے۔

شیخ ضیاء الحق آن مخلص، بہادر اور سب الوطن لوگوں میں سے تھے جن پر مادہ وطن خیر کر سکتی ہے مگر چونکہ ہمارے وطن میں فدا یان وطن کے حالات قلمبند کرنے کا نہ شوق ہے نہ ذریعہ، اس لئے آج سے پچاس برس کے بعد شاید ہی کوئی شخص آپ کے نام سے واقف ہو۔

## ہندوستانی وضع دار مال

ہم دو بھائی تھے اور ہماری دو بہنیں تھیں۔ میری بڑی بہن کا جب انتقال ہوا تو میری عمر غالباً پانچ برس کی ہوگی اور مجھے اس بہن کی نہ تو شکل یاد ہے اور نہ کوئی اور بات۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ گھر کے لوگوں کا گوروارہ میں انتظار کر رہا تھا کیونکہ مگھٹ گوروارہ کے قریب تھا اور لاش کو جلانے کے بعد گھر کے لوگوں نے نہ بڑی رسوم ادا کرنے کے لئے گوروارہ میں آنا تھا۔ میری اس بہن کی عمر ان کے انتقال کے وقت غالباً ٹھالیس کی ہوگی۔ ان کی شادی رائے صاحب لال لال چند مہو ترہ سب ڈویژنل انجینئر کے ساتھ ہوئی تھی اور شادی کے بعد یہ بہت مختصر عرصہ زندہ رہیں اور ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔

دیے تو چونکہ میری اس بہن کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور ان کے انتقال کے بعد میرے بہنوئی لال لال چند نے دوسری شادی کر لی تھی، ہمارا اس خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہنا چاہیے تھا مگر

یہ واقعہ ہے کہ لالہ لال چند جب تک زندہ رہے ان کا ہمارے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ میری والدہ جب کبھی لاہور جاتیں (لالہ لال چند لاہور کے رہنے والے تھے) یہ لالہ لال چند اور ان کی دوسری بیوی سے ملے بغیر واپس نہ آتیں۔ یہ لالہ لال چند کی بیوی سے اپنی بیٹی بیسائیک کر تیں۔ جب بھی بیٹے کا اتفاق ہوتا ان کو رسم کے طور پر اپنی بیٹی بجھتے ہوئے دو چار روپیہ ضرور دیتیں۔ لالہ چند جی کے ساتھ ہمیشہ خط و کتابت جاری رہی اور چند برس ہوئے یہ اپنے انتقال سے پہلے جب علاج کے لئے دہلی آئے تو انھوں نے مجھے اپنا عزیز بھتیجے ہوئے حکیم محمد احمداں صاحب کو دکھانے وغیرہ کی خدمت کا موقع دیا اور اب بھی جب کبھی مرحوم لالہ چند جی کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں ایک خوشگوار سی یاد کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کو طبع نہ کرنا ممکن نہیں۔

کئی برس ہوئے میری والدہ ہر دو ماہ گتیس تو میرے وطن حافظ آباد سے دوسرے جو لوگ ان کے ساتھ گئے ان میں لالہ دیس راج پاجوہہ سیشن جج (جو پچھلے دنوں ڈپٹی کسٹوڈین جنرل تھے) کی والدہ بھی تھیں اور چند روز میری والدہ اور دیس راج جی کی والدہ ہر دو ماہ رہیں تو وہاں دیس راج جی کی والدہ نے گنگا کے کنارہ میری والدہ کی بیٹی بیٹے کی رسم ادا کر دی۔ اس رسم کے ادا کرنے کے بعد میری والدہ اور دیس راج جی کی والدہ کے درمیان وضعداری کی کیفیت یہ تھی کہ میری والدہ فی الحقیقت دیس راج جی کی والدہ کو اپنی بیٹی یعنی میری حقیقی بہن سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں اور دیس راج جی کی والدہ مجھے اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ عزیز سمجھتیں۔ میرے اور دیس راج جی کے تعلقات اس قدر گہرے رہے اور اب بھی ہیں کہ اس سلسلہ کا ایک واقعہ ثبت و پاسب ہے۔ میرے نوٹوں کے مقدمہ میں رائے بہادر ڈاکٹر شہزاد اس میرے صفائی کے گواہ تھے اور جب یہ شہادت کے لئے عدالت میں آئے تو ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کی اور دیوان سنگھ کی رشتہ داری کیا ہے (لالہ دیس راج جو کہ رائے بہادر ڈاکٹر شہزاد اس کے بھتیجہ ہیں اور پولیس کے افسروں کی یہ اطلاع تھی کہ لالہ دیس راج و دیوان سنگھ کے بھتیجہ ہیں۔ اس لئے پولیس اور سرکاری وکیل دونوں کو یہ یقین تھا کہ ڈاکٹر شہزاد اس بھی دیوان سنگھ کے قریبی رشتہ دار ہوں گے) اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر شہزاد اس نے کہا کہ ان کی دیوان سنگھ کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں اس جواب کو سن کر پولیس کا نایندہ اور سرکاری وکیل دونوں بہت غصہ میں متوجہ ہوئے گویا کہ ڈاکٹر شہزاد اس جیسی بڑی پوزیشن کی اور نیک شخصیت عدالت میں جھوٹا بدل کر حلف دروہی کر رہی ہے مگر جب مزید جرح کی گئی تو ڈاکٹر صاحب نے صاف کہا کہ دیوان سنگھ کھٹہ کھتری ہے اور آپ پاجوہہ اور وہ ہیں، کوئی رشتہ داری نہیں اور نہ کھتریوں اور اروٹوں میں کوئی رشتہ داری ہو سکتی ہے۔ یہ جواب جرح کرنے والوں کو جواب کرنے کا باعث ہوا۔ یعنی اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لالہ دیس راج و دیوان سنگھ کا بھانجہ ہیں مگر ان کو یہ پتہ نہیں کہ یہ رشتہ داری صرف ہر دو ماہ کی رشتہ داری ہے جسے ہندوستان کی وضعداری کہنا چاہیے۔

میری پہلی بیوی کے ساتھ میرے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے اور ان ناخوشگوار تعلقات کے باعث ہی میں نے دوسری شادی کی ان ناخوشگوار تعلقات کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ میری پہلی

سسرال والے میرے دشمن ہوتے مگر ہندوستانی گھرانوں کی یہ دمننداری ہے کہ باوجود ناخوشگوار تعلقات رہنے اور میری اس پیروی کے انتقال کے کئی برس بعد بھی میرے ان سسرال والوں کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہیں یہ لوگ جب بھی دلی آئیں تو بغیر ملے نہیں جاتے۔ کبھی نہ کبھی کوئی خٹے کرناں دجھاں کہ یہ فیملی تبادلہ آبادی کے بعد اب مقیم ہے) سے بھیجتے رہتے ہیں اور میری اس پیروی کے بھائی روشن لال صاحب بھی دلی آئیں تو وہ میرے ہاں ہی مقیم ہوتے ہیں حالانکہ میری اس پیروی سے کوئی اولاد نہ تھی اور ان تعلقات کے درمیان کوئی کڑی نہ ہونے کے باعث یہ تعلقات ختم ہو جانے چاہئیں تھے۔

ہندوستانی معاشرت میں ہزاروں کمزورباں سہی مگر جہاں تک ہندوستانی تمدن میں دمننداری کی موجودگی کا سوال ہے، یہ یقیناً ہماری شہسائیتی کے لئے ایک ایسی رحمت ہے جس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی اور اس کو زندہ و جاری رہنا چاہئے۔

## ریاست پٹیالہ کے سیشن ججوں کا بیج

پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب کی اُردو زبان میں آج تک جتنی سوانح حیات لکھی گئیں ان سب میں قاضی محمد سلیمان کی تصنیف ”رحمت للعالمین“ غالباً متاثر ترین حیثیت رکھتی ہے۔ قاضی محمد سلیمان اُن دنوں بھٹنڈہ (ریاست پٹیالہ) میں سیشن جج تھے جن دنوں میں مانہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل کمیشن کرائے تھا اور مرحوم قاضی صاحب سے نہ صرف اکثر لٹے کا اتفاق ہوتا بلکہ وہ مجھے شفقت کی نظر سے بھی دیکھتے کیونکہ ان کے عزیزوں میں سے کسی ایک کے ساتھ میرے ذاتی مراسم تھے۔ مرحوم قاضی صاحب نہ صرف ایک فاضل ترین شخصیت تھے بلکہ انتہائی دیانتدار اور بلند کیرکٹر بھی تھے۔ جس زمانہ میں ریاست پٹیالہ میں ہر جگہ دوسیشن جج ہو کرتے اور یہ دونوں ایک بورڈ پینج کی حیثیت سے ہر مقدمہ کا جلی کر فیصلہ کرتے۔ اور قاضی صاحب کے ساتھ دوسرے سیشن جج کر نل سُندر سنگھ تھے جو صرف گورنمنٹی زبان میں دستخط کرنا جانتے اور جو اُردو زبان سے بھی ناواقف تھے مگر دیانتداری وغیرہ کے اعتبار سے یہ بھی بہت بلند تھے۔ یعنی اس سیشن بورڈ یا سیشن پینج کے دونوں ممبر ریاستوں کے اہلکاروں کی روایتی بددیانتی کے خلاف دیانتدار تھے مگر ایک تو فاضل ترین شخصیت اور دوسرے تعلیم سے قطعی نا آشنا۔ چنانچہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیشن کورٹ کے مقدمات قتل وغیرہ کے قانونی نکات کو کر نل سُندر سنگھ کیا سمجھتے ہوں گے اور اس پینج میں اگر یہ اکیلے ہی ہوتے تو کمزوروں کی بہت کافصلہ کیا ہوتا۔

ایک روز قاضی صاحب اور کر نل سُندر سنگھ قتل کے ایک مقدمہ کی سماعت فرما رہے تھے اور سرکاری وکیل قانونی نکات پیش کر رہا تھا۔ کر نل سُندر سنگھ ان نکات کو سمجھ نہ سکے تھے۔ اس لئے اُن کے لئے ان نکات میں دلچسپی لینا بھی ممکن نہ تھا۔ سرکاری وکیل دو گھنٹہ تک بحث کرتا

رہا تو کرنل سندر سنگھ بحث سے تنگ آ گئے۔ آپ نے بہت کوشش کی مگر سرکاری وکیل اپنی دلائل ختم کرے اور ان کا اس بحث سے چھٹکارا ہو مگر سرکاری وکیل نے بحث ختم نہ کی۔ آخر کرنل سندر سنگھ سے رہا نہ گیا۔ آپ اپنی کڑی سے آٹھ گھنٹے ہوئے اور آپ نے قاضی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "قاضی صاحب آپ اس بحث کو سن لیجئے۔ میں ذرا اپنی کوٹھی پر جا کر اپنے گھوڑوں کو دیکھ آؤں۔" کرنل صاحب کو گھوڑوں کا بہت شوق تھا اور آپ کے اہل بل میں متعدد اچھے گھوڑے ہوا کرتے، چنانچہ کرنل صاحب اپنی کوٹھی پر تشریف لے گئے اور اس وقت واپس آئے جب قاضی صاحب سرکاری وکیل کی تمام دلائل سن چکے تھے۔

## مذاق کا گفتارہ

ایڈیٹر ریاست کے گھر سے دوستوں میں ایک صاحب مسٹر محمد یوسف جالی ہیں جو ملک کی تقسیم کے زمانہ میں دہلی سے لاہور چلے گئے۔ یہ یوسف صاحب بہت مخلص، بہت خوبصورت، دہلی کی تہذیب و تمدن کے نمونہ اور علم و ادب کے پرستار تھے۔ کئی برس ہوئے یہ ریاست جو ناگرٹھ کے جہان خانہ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے اور وہاں ان کے تعلقات دوسری بڑی اور مشہور شخصیتوں کے علاوہ مشہور مسلم ایکٹریس اور موسیقار وحیدن بانی آگرہ والی (فلم ایکٹریس فی کی والدہ) سے بھی ہو گئے کیونکہ یہ اس جہان خانہ میں نواب جو ناگرٹھ کی جہان کے طور پر مقیم ہوئیں جو نواب کی سالگرہ کے موقع پر اپنی موسیقی کے کمالات دکھانے کے لئے اپنی بڑی بہن کے ساتھ جو ناگرٹھ گئی تھیں۔ یوسف صاحب کھانا پیسے کہ وحیدن بانی پر یوسف صاحب کی خوبصورتی کا اثر ہوا اور وہ چاہتی تھیں کہ جو ناگرٹھ میں کچھ روزہ اور قیام کر دیں مگر ان کی بہن نے یہ دوستانہ تعلقات ناپسند کیئے اور وہ یہی چلی گئیں۔

یوسف صاحب کے جو ناگرٹھ کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ کا کئی برس تک یہ معمول رہا کہ وہ شام کو پانچ بجے میرے ہاں آتے، دوسرے دوستوں کے ساتھ چائے پیٹے۔ چائے پینے کے بعد ہم دونوں چھ بجے کے قریب کار میں میرے کئے چلے جاتے۔ میرے آٹھ بجے واپس پہنچتے۔ دوسرے دوستوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ تین بجے ریڈیو پر خبریں سننے۔ خبریں سننے کے بعد میں تو سو جانا اور میرا موٹر ڈرائیور یوسف صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آتا۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور اس زمانہ میں ہی ایک دوسرے دوست مسٹر ایس۔ وی کرپارام دجربہٹی میں فلمی گانہ سنی کے نام سے مشہور ہیں، جو بہت نیک منش انسان ہیں اور اس زمانہ میں دہلی کے فلمی انگریزی رسالہ "مودیز" کو ایڈیٹ کرتے تھے ابھی قریب قریب ہر روز شام کو تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ مسٹر کرپارام فلمی لائین میں بہت اکسپرٹ اور قابل قدر ذہنی بہت دوست ہیں۔

ایک روز شام کو میں مسٹر کرپارام اور یوسف صاحب چائے پی رہے تھے اور ریڈیو چل رہا تھا تو ریڈیو پر مس وحیدن بانی کا ریکارڈ بجا گیا۔ جب وحیدن کا ریکارڈ شروع ہوا تو میں نے یوسف صاحب

سے مذاقاً کہا "یہ رتھاری وحیدن گارہی ہیں" وحیدن فلمی لفظ میں بہت ہر دو عزیز نہیں اور سٹر کر پارام فلمی رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے جب میرے شہسے یہ صرف صاحب کو خطی طے کر کے کہتے ہوئے "رتھاری وحیدن" کے الفاظ سنے تو انھوں نے پوچھا کہ یوسف صاحب کی وحیدن کیوں؟ کچھ فوراً ایک شرارت شوچی میں نے کر پارام جی کہ جواب دیا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یوسف صاحب کی اس وحیدن سے شادی ہو چکی ہے" یہ جواب میں نے بغیر شکراے سنجیدہ ضرورت بنا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کر پارام جی کو اس شادی کا یقین آگیا اور یہ خبر ان کے لئے نئی بلکہ بہت حد تک "سفسی خیر" بھی تھی اور آپ نے اگلے دن ہی اس "شادی" کے متعلق اپنے فلمی حلقوں میں اکثر دوستوں سے ذکر کیا کہ وحیدن باقی نے وہی کے یوسف صاحب سے شادی کر لی ہے۔

سٹر کر پارام جب شام کو دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ سے پہلے چہ منٹ کے لئے دو ناؤ لٹی سینما میں بھی حضور جاتے تاکہ وہاں اپنے فلمی دوستوں سے دینی آپ کی فلموں کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق معاملات حاصل کر لیں۔ سٹر یوسف صاحب کی اس فرضی شادی کی اطلاع کے ایک ہفتہ بعد سٹر کر پارام ناؤ لٹی سینما کے صحن میں کھڑے تھے۔ یوسف صاحب بھی سٹر کے ہر دفتر "ریاست" کو آ رہے تھے۔ کر پارام جی نے جب یوسف صاحب کو سٹر کے پرہاتے دیکھا تو آواز دے کر ان کو اپنے پاس بلایا اور جب یوسف صاحب ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے سینما کے بالک سیٹ جگت نزائیں جی سے غریہ انداز میں تعارف کرتے ہوئے کہا کہ "آپ یوسف صاحب ہیں جنھوں نے حال میں مشہور فلم ایکٹر میں سر وحیدن سے شادی کی ہے"۔ سیٹ جگت نزائیں نے جب یہ سنا تو ان کے دل میں بھی یوسف صاحب کے لئے قدر کے جذبات پیدا ہوئے اور آپ یوسف صاحب اور کر پارام جی وہ فون کو سینا میں لے گئے۔ وہاں صبح سے اچھا اور جگہ کی سیٹوں پر ان کو بٹھایا اور آئیں کریم سے ان کی تواضع کی کیونکہ سٹر صاحب فلمی دنیا میں بہت بلند پوزیشن رکھتے تھے اور قدرتی طور پر انھوں نے محسوس کیا ہو گا کہ وحیدن کے شوہر کی فاطمہ و زکرات ہونی چاہیے۔ اس فاطمہ تواضع کے بعد یوسف صاحب اور کر پارام جی دفتر "ریاست" میں پہنچے تو انھوں نے بتایا کہ سیٹ جگت نزائیں نے یوسف صاحب کی بہت تواضع کی۔ اس واقعہ کے بعد کر پارام جی نے کئی دوستوں سے یوسف صاحب کا بطور وحیدن کے شوہر کے تعارف کرایا اور کئی سیناؤں میں یوسف صاحب نے معفت میں مسلم دیکھے کیونکہ جو سیناؤں کا اس خیال میں تھا کہ اگر کبھی کسی مسلم کے حامل کرنے کے سلسلہ میں وحیدن کی سفارش کی ضرورت ہوتی تو یوسف صاحب کام آئیں گے۔

ایک روز یوسف صاحب کی دوست (جو یہی سے ناہور چار تھا) سے ملنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر گئے تو وہاں سیکنڈ کلاس کے کنگ آفس کے پاس کر پارام جی کھڑے تھے۔ فلیک سلیک کے بعد کر پارام جی نے پوچھا کہ "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں" یوسف صاحب نے جواب دیا کہ "گھنٹ وحیدن بیٹی سے کہہ دی ہیں۔" ان کو لینے آیا ہوں۔" وحیدن کا نام سننے ہی کر پارام جی نے کہا کہ اگر آپ فرماتے تو وہ بھی وحیدن کے استقبال کے لئے بیٹے کا دم پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔ یوسف صاحب نے جواب دیا کہ "آپ کا شکریہ مگر وہ اب پرہہ کرتی ہیں۔ شاید آپ کا جانا وہ پسند نہ کریں" یہ جواب سن کر کر پارام جی خاموش ہو گئے اور یوسف صاحب

پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ فرنیچر محل میں جس دوست نے بیٹی سے لاہور جانا تھا، یوسف صاحبان سے ملے اور وہاں آ رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ کپارام جی ابھی تک وہاں ہی سیکنڈ کلاس بمکنگ آفس کے پاس کھڑے ہیں۔ کپارام جی نے پوچھا کہ کیا وجہ نہیں آئیں تو یوسف صاحب نے جواب دیا کہ شاید وہ نئی دہلی کے سٹیشن پر اتر گئی ہوں گی کیونکہ مکان وہاں سے بھی قریب ہے۔ یوسف صاحب اگلے روز دفتر ”ریاست“ میں پہنچے تو انھوں نے کپارام جی کے سٹیشن پر ملنے کا واقعہ بیان کیا۔ ہم کپارام جی کی سٹیشن کی اس ملاقات کا لطف لے رہے تھے تو کپارام جی کا دل بڑی سینا سے ٹپٹی ٹپٹی ہوا کہ یوسف صاحب ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کن وجہ سے دہلی پہنچی تھیں یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں نئی دہلی کے سٹیشن پر اتر گئی تھیں اور اس وقت چائے پر یہاں تشریف فرما ہیں۔ اس جواب کے بعد کپارام جی نے پوچھا کہ کیا وہ دفتر ”ریاست“ میں آجائیں تو میں نے کہا کہ ذرا ٹھہریے۔ میں یوسف صاحب اور وجیدن سے پوچھ لوں۔ اس کے بعد میں نے ٹیلیفون کے ماؤنڈ پر ہاتھ رکھ کر کپارام جی میری بات سن نہ سکیں، میں نے یوسف صاحب سے کہا کہ کپارام جی آنا چاہتے ہیں۔ کیا جواب دوں۔ یوسف صاحب اور میں اپنی بہنی ضبط نہ کر سکے۔ آخر میں نے اپنی آواز میں سنجیدگی پیدا کی اور ٹیلیفون پر میرے اور کپارام جی کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

میں۔ وجیدن کہتی ہیں کہ وہ اب شادی شدہ ہیں اور کسی غمزدگی کے سانسے ہونا نہیں چاہتیں۔ کپارام جی۔ اگر وہ پردہ کی اتنی ہی پابند ہیں تو تمہارے سامنے کیوں آئیں؟ میں۔ ان کے میاں نے مجھ سے پردہ نہیں کرایا اور ملازموں میں میاں جس شخص سے پردہ کرنا نہ چاہے جو وہ اس سے پردہ نہیں کرتی۔

کپارام جی۔ اگر وہ پردہ کی اتنی ہی پابند ہیں تو پھر فلم میں کس طرح کام کریں گی۔ میں۔ اس کے متعلق میں وجیدن بانی سے پوچھ کر جواب دیتا ہوں۔ (میں نے تھوڑے وقفے کے بعد جواب دیا)

میں۔ وجیدن بانی کہتی ہیں کہ وہ تو بزنس کی بات ہے فلم کے وقت تو بغیر پردہ آنا ہی پڑتا ہے۔ کپارام جی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف اور وجیدن میرا دفتر ”ریاست“ میں آنا اور ملنا پسند نہیں کرتے۔

میں۔ میں کیا عرض کروں۔ انھوں نے ایسا ہی کہا ہے۔ ویسے میں تو چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لے آئیں اور یوسف صاحب آپ سے بھی وجیدن کا پردہ نہ کرائیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ کہنے کے بعد کچھ غصہ اور کچھ ایسی ہی حالت میں کپارام جی نے ٹیلیفون بند کر دیا اور اگلے روز شام کو آپ نے پھر ٹیلیفون پر پوچھا تو میں نے کہا کہ آج وجیدن نہیں ہیں۔ یوسف صاحب اکیلے ہیں آپ تشریف لے آئیے۔ چنانچہ کپارام جی تشریف لائے تو مجھ سے ناخوش نہ تھے۔ یوسف صاحب سے کہنے کہنے سے تھے۔ میں نے یہ کہہ کر دونوں کو بے تکلف کر دیا کہ ہر شہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کا جس شخص سے چاہے پردہ کرانے اور جس سے چاہے پردہ نہ کرانے اور کپارام جی کو شکایت نہ کرنی چاہیے۔



اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد تک کہ پارام جی یوسف صاحب سے وحیدن بائی کے متعلق ہر روز خبر دیتے دریافت کر لیتے اور پھر چھ لینے تک کب تک قیام ہے۔ یوسف صاحب معمولی سارسی جواب دے دیتے اور دو ہفتہ کے بعد یوسف صاحب نے کہ پارام جی سے کہا کہ وحیدن واپس بمبئی چلی گئی ہیں۔

ایک ماہ ہو چکا تھا کہ پارام جی کسی فلم ڈسٹری بیوٹر کے کام سے بمبئی جانے والے تھے۔ انھوں نے یوسف صاحب سے کہا کہ وہ بمبئی جا رہے ہیں۔ اگر وحیدن کو کوئی پیغام دینا ہو یا کوئی سامان بھیجنا ہو تو بھیج دیں۔ یوسف صاحب نے کہ پارام جی کو مالتے ہوئے کہا: ”چھوڑ دیجی۔ ان خطوں کا کیا ہے۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں نے شادی کر کے غلطی کی اور میں تو سوچتا ہوں کہ اسے طلاق دے دوں۔ یہ سن کر میں نے کہا۔ دیکھئے یوسف صاحب ایسا خیال نہ کیجئے۔ اس بچاری کا کیا جرم ہے جو اس کو طلاق دیں۔ آپ کو تعلقات قائم رکھنے چاہئیں اور اگر کوئی غلط فہمی ہو تو دُور کر لی جائے۔ کہ پارام جی یوسف صاحب کے اس جواب سے کچھ ماہر سے ہرے کیونکر آپ چاہتے تھے کہ کوئی پیغام یا تعارفی خط مل جاتا تو آپ وحیدن بائی کے ہاں بے تکلف جاسکتے۔

کہ پارام جی بمبئی گئے۔ ان کے دل میں فلمی خیال سے وحیدن بائی سے بے تکلف ہونے کی خواہش چلی گئی۔ یہ رہی مٹھی۔ یہ رہ نہ سکے اور وحیدن بائی کے ہاں جا پہنچے۔ آپ نے وہاں پہنچنے کے بعد ملازم کو اپنا وزٹنگ کارڈ دیا جس پر انگریزی میں: ”ایس۔ دی کہ پارام ایڈیٹر ”مردیز“ دہلی“ لکھا تھا۔ ملازم یہ کارڈ اندر لے گیا اور وحیدن کو دیا۔ وحیدن نے یہ سمجھ کر کہ ایک فلمی رسالہ کا ایڈیٹر ملنے کے لئے آیا ہے۔ مسلم ایکٹریسوں اور ایکٹروں کے پاس فلمی ایڈیٹر کثرت کے ساتھ جاتے ہیں، کہ پارام جی کو بلایا کہ پارام جی نے جاتے ہی کہا: ”سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی اور میں بمبئی آیا تھا، اس لئے میں نے چاہا کہ آپ کا نیا زماں مل کر جاؤں یہ وحیدن نے کچھ نہیں سمجھا کہ سردار صاحب نے تعریف کی کیونکہ فلم ایکٹریسوں کے معترفین اور عشاق میں ہزار ہا سردار صاحب، خاں صاحب اور لالہ صاحب ارے مارے بھرتے ہیں۔ وحیدن نے جواب دیا: ”آپ کی ہر بات ہے جو تشریف لائے۔ میں کس قابل ہوں“ کہ پارام جی بیٹھ گئے۔ وحیدن نے چائے منگائی کیونکہ فلمی ایڈیٹر دل کو بے وقوف بنانے اور اپنی تعریف میں قصیدہ خوانی کرانے کے لئے فلم ایکٹریسوں ان کی بہت خاطر تواضع کرتی ہیں۔ تھوڑی دیر آپ فلموں کے متعلق بات چیت کرتے رہے اور واپس تشریف لے آئے۔

بمبئی کے اس دورہ کے بعد کہ پارام جی دہلی پہنچے تو اگلے روز شام کو دفتر ”تربا ست“ میں تشریف لائے۔ یوسف صاحب ابھی تک نہ پہنچے تھے۔ کہ پارام جی نے بیٹھے ہی بتایا کہ آپ بمبئی میں وحیدن سے ملے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میرا رنگ فن ہو گیا اور میں نے عہدس کیا کہ ہمارا مذاق بے نقاب ہو گیا ہوگا۔ میں نے بیقراری کے عالم میں پرچہ کہ وحیدن سے کیا باتیں ہوئیں تو کہ پارام جی نے بتایا کہ وحیدن کے مکان پر پہنچتے ہی آپ نے وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ ملازم کارڈ لے کر اندر گیا تو فوراً اُن کو بلایا گیا۔ انھوں نے پہنچتے ہی بیٹھنے سے پہلے کہا کہ سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی، اس لئے بیٹے چلا آیا۔ وحیدن بہت تپاک سے پیش آئیں۔ چائے پلائی اور فلموں کے متعلق باتیں ہوئی رہیں۔

میں نے کریدنے ہوئے پوچھا اور کیا باتیں ہوئیں اور وہاں کیا حالات ہیں تو آپ نے بتایا کہ اور تو کوئی نہیں بات نہیں ہوئی مگر ایک واقعہ دیکھ کر ان کو بہت افسوس ہوا کہ وحیدن کے ہاں دو تین مہینوں کے عرصے کے عازم تھے جیسے طوائفوں کے ہاں ہوتے ہیں۔ یوسف کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو گھر پر نہ رہنے دیں۔ میں نے کہا کہ انتہائی ہمدردی کے بوجھ میں کہا۔ ”بہت افسوسناک واقعہ ہے۔ وحیدن کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گھر پر نہ رکھے کیونکہ وہ اب شادی شدہ ہے۔ یوسف کو علم ہو گیا تو نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ کرپارام جی آپ اس کا ذکر یوسف سے نہ کیجئے۔ میں لوگوں کے گھریلو معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے۔“

کرپارام جی نے اس کا جواب دیا۔ ”مجھے یوسف صاحب سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں کہ وحیدن نے شادی کر لی مگر اس نے اپنے ہاں ابھی تک مہینوں کے عرصے میں ہم یہ باتیں کر رہے تھے تو یوسف آگئے۔ ہم لوگ چائے پیچھے نہ رہے تو کرپارام جی نے صرف اتنا کہا کہ وہ میری اپنے بزنس کے سلسلہ میں گئے تھے۔ کرپارام جی کے جانے کے بعد میں نے یوسف صاحب کو کرپارام جی کے وحیدن سے انٹرویو اور مشنڈل کا قسطہ بیان کیا۔ جتنے جتنے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اگلے روز بھینا احسان الحق تشریف لائے تو میں نے ان کو میری کا تمام قسطہ سنایا۔ اس سے پہلے ان کو یوسف کی مندرجہ شادی کا قسطہ معلوم ہو چکا تھا۔ بھینا بھی دیر تک جتنے رہے۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کرپارام جی تشریف لے آئے۔ بھینا احسان میں یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ کوئی راز نہیں رکھ سکتے اور غیر ضروری طور پر صاف بیانی کر دیتے ہیں۔ آپ نے کرپارام جی کو ہمارے سامنے ہی کہہ دیا کہ یہ دونوں میری دیوانہ سگہ اور یوسف آپ سے مذاق کر رہے ہیں۔ نہ تو یوسف کی وحیدن سے شادی ہوئی اور نہ وہ دہلی آئی۔ بھینا نے جب یہ کہا تو وہ منہ بھی رہے تھے۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے فوراً کہا ”بھینا صاحب آپ لاکھ کرپارام جی کو کہیں بے وقوف بناتے ہیں۔“ میرے اس کہنے پر کرپارام جی فوراً بول اُٹھے ”بھینا صاحب آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جب بھی کیا تو میں نے وحیدن سے خود کہا کہ سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ میں اس لئے چلا آیا اور وحیدن نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ ہر باتی ہے۔ کرپارام جی نے ابھی بات ختم ہی کی تھی تو میں نے فوراً کہا۔ ”بھینا صاحب آپ ہر شخص سے کیوں مذاق کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے چائے کی پیالی میں چائے ڈالی اور کہا چھوڑ دینے مذاق کو، ایسے مذاق کا نتیجہ اچھا نہیں ہو کرتا، چائے پیچھے۔ اس روز ہم نے کرپارام جی سے بہت شکل سے چھٹکارا کرایا اور نہ اس دن ہی بھینا نے میں بے نقاب کر دیا تھا۔

چھ ماہ کے عرصہ تک کرپارام جی کو یہی یقین رہا کہ یوسف صاحب کی وحیدن سے شادی ہو چکی ہے۔ چھ ماہ کے بعد کرپارام جی کو میری میں لوگوں نے بتایا کہ وحیدن کی شادی کی اطلاع غلط ہے۔ اس اطلاع کی تصدیق کے لئے آپ غالباً وحیدن سے بھی ملے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرپارام جی اس مذاق کے باعث یوسف اور مجھ سے بہت خفا ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف میرے ہاں آنا بلکہ مجھ سے ملنا بھی ٹھک کر دیا اور اگر میں میرے خدشات باتیں کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا کرتے۔ میں نے بہت جلد چاہا کہ کرپارام جی مجھ جیسے خاندان سے ناراض نہ ہوں اور مذاق کو مذاق سمجھیں۔ میں نے مجھے عذر دیا کہ ان کی دہلی صحافت نہ پڑھا۔

اس کے بعد کہ پارام جی بمبئی چلے گئے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ یہ فوج میں بطور کپتان کے بھرتی ہو گئے۔ اور مجھ پر نوٹوں والا مقدمہ قائم ہو گیا۔ میں جب اس مقدمہ میں بری ہوا، لاہور ہائیکورٹ کے جج مسٹر مزدے پرلیس کے خلاف کھلی عدالت میں سخت رویا کرکپس کیے اور اس مقدمہ کو بے بنیاد قرار دیا تو میرے لاہور سے دہلی پہنچنے پر کہ پارام جی کا ایک خط میرے پاس پہنچا جو کہ غذا میں کہیں محفوظ ہے۔ اس خط کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے:-

”تم بہت ذلیل قسم کے انسان ہو جو دوستوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تمام عمر تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا اور نہ کبھی کوئی خط لکھوں گا مگر اب جب کہ تم مقدمہ میں باعزت بری ہوئے ہو، ہمارا کساد دیتا ہوں۔“

کہ پارام جی کا جب یہ خط میرے پاس پہنچا تو میں نے بازار سے ایک سرکاری یعنی عدالتی کاغذ منگایا اور اس پر ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ چسپاں کر کے ذیل کا حلف نامہ لکھ کر کہ پارام جی کو بمبئی بھیجا:-

”سنگہ دیدان سنگہ ولد سردار زندھان سنگہ قوم کھتری کتہ ساکن حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ حال ایڈیٹر اخبار ”زیاست“ دہلی، یہ حلفیہ اقرار کرتا ہے کہ لا کہ پارام جی سابق ایڈیٹر رسالہ ”مودیز“ اگر مجھے دل سے معاف کر دیں تو میں آئندہ کبھی بھی ان سے پہلے کی طرح مذاق نہ کروں گا اور یہ تحریر بطور سند لکھ دیتا ہوں کہ بروقت ضرورت کام آئے۔

نیا زمند  
دیدان سنگہ“

میرے اس حلفیہ بیان کو بھی شاید لا کہ پارام جی نے مذاق مزید یا مذاق جدید سمجھا کہ میری اس التجا پر بھی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد یہ کبھی بار دہلی آئے مگر انھوں نے اس اپنے دیرینہ نیاز مند سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ چنانچہ میں اس ”نا قابل فراموش“ کے ذریعہ آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ روپیہ اور پوسٹ صاحب کے قصور کو معاف کر دیں اگر وہ چاہیں تو یہ سب صاحب کے قصور کو معاف نہ کریں کیونکہ وہ اب ایک پاکستانی ہیں) میں ان کو فی الحقیقت نیاز مند اور نکلے دوست ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ان سے کبھی ایسا مذاق نہ کروں گا۔

## مہاراجہ بھرتپور کا انجام

مرحوم مہاراجہ بھرتپور کسی برس ہوئے جن کا انتقال دہلی میں ہوا) نہ صرف ذاتی طور پر عیاش تھے بلکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بے حد کشیدہ تھے اور گورنمنٹ جب آپ کے اختیارات سلب کرنے سے متعلق سوچ رہی تھی تو جاٹ کمیونٹی کے لیڈر رائے بہاد پرج دھری لال چند آت روہنگ نے محسوس کیا کہ اس جاٹ ریاست بھرتپور کو نقصان نہ پہنچنا چاہیے اور مہاراجہ بھرتپور نے بھی جو دھری صاحب

سے درخواست کی کہ وہ ریاست بھرتپور میں بطور وزیر اعظم چلے آئیں۔  
 رائے بہادر جو دھری لال چند ذاتی طور پر بے حد شریف، لائق اور خلص شخصیت تھے اور آپ کا  
 انگریز حکام پر بھی بے حد اثر تھا اور اس زمانہ کے پولیسل سیکرٹری گورنمنٹ ہندو سر جان تھاہین تو  
 آپ سے گہرے ذاتی دوستوں میں سے تھے کیونکہ سر جان اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں وہ ہنگ میں  
 سیشن جج رہ چکے تھے اور جب آپ پنجاب گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری تھے تو جو دھری صاحب اس  
 زمانہ میں پنجاب کونسل کے ممبر یا وزیر تھے۔ ہمارا جو بھرتپور نے جب جو دھری لال چند سے بھرتپور کا  
 قسبان وزارت سنبھالنے کے لئے درخواست کی تو آپ نے سر جان تھاہین سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ  
 وہ ہمارا جو نقصان نہ پہنچائیں گے اور ہمارا جو بھرتپور نے سر جان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ریاست بھرتپور  
 کی ایڈمنسٹریشن میں دخل نہ دیں گے تاکہ اس ریاست کی بدانتظامی دور ہو اور گورنمنٹ کو کوئی شکایت  
 نہ رہے۔

ہمارا جو بھرتپور کے خلاف گورنمنٹ کی شکایت یہ تھی کہ ہمارا جو کی فضول خرچیوں کے باعث آپ کی  
 ریاست دیوالیہ ہو چکی ہے۔ ہمارا جو تمام آمدنی اپنی عیاشی پر صرف کر دیتے ہیں، رشوت کا زور ہے،  
 ریاست کا انتظام اچھا نہیں اور ریاست بہت کافی مقروض ہے۔ جو دھری لال چند نے بطور وزیر  
 اعظم بھرتپور جانے کے بعد بہت کوشش کی کہ وہاں کی ایڈمنسٹریشن اچھی ہو جائے مگر ہمارا جو طوائیفوں  
 اور خوشامدیوں کے زرخیز ہیں گھر سے ہوتے تھے اور یہ لوگ ایڈمنسٹریشن پر بھی اثر انداز تھے۔ جو دھری صاحب  
 اگر کسی معاملہ میں اصلاح کرنا بھی چاہتے تو ہمارا جو اپنا حکم جاری کر کے جو دھری صاحب کو بے بس بنا دیتے۔  
 یہی ایک طرف تو جو دھری صاحب کے احکام میں مداخلت کی جاتی اور دوسری طرف جو دھری صاحب  
 کو یہ خوف کہ اگر ایڈمنسٹریشن کی حالت بہتر نہ ہوئی اور گورنمنٹ نے مداخلت کی یا ہمارا جو کو نقصان پہنچا  
 تو ان کی بھی رسوائی ہوگی۔ جو دھری صاحب نے اس کشمکش میں چند ماہ گزارے تو آپ نے ہمارا جو کی  
 طرف سے سر جان تھاہین پولیسل سیکرٹری گورنمنٹ ہند جو دائیہ اس کے بعد ریاستوں کے متعلق ہندوستان  
 میں سب سے بڑی اتھارٹی تھے، کو ایک دعوتی خط بھیجا جس میں لکھا کہ آپ شکار کے لئے بھرتپور  
 تشریف لائیں۔ اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا جو اور سر جان کے درمیان تعلقات زیادہ خوشگوار  
 اور دوستانہ بن جائیں اور سر جان دوستانہ سپرٹ میں ہمارا جو کو طوائیفوں اور خوشامدیوں کے زرخیز  
 سے بچنے کا مشورہ دیں۔ چنانچہ شکار کے لئے بھرتپور سے ہندو میں میل کے فاصلہ پر ایک مقام ڈیگ تجویز ہوا  
 جہاں کہ بہت بڑی شکار گاہ ہے اور ہمارا جو کی ایک کوٹھی اور گیسٹ ہوس بھی ہے۔

سر جان تھاہین بھرتپور پہنچے ہمارا جو اور جو دھری لال چند نے آپ کا استقبال کیا اور آپ ہمارا جو  
 کی موٹریں ڈیگ روانہ ہوئے۔ اس کار کو ہمارا جو خود چلا رہے تھے۔ ہمارا جو کے ساتھ اگلی سیٹ پر  
 سر جان تھاہین تھے اور پچھلی سیٹ پر جو دھری لال چند بیٹھے تھے۔ بھرتپور سے ڈیگ جاتے ہوئے ہمارا جو  
 اور سر جان باتیں کرتے جارہے تھے تو باتوں باتوں میں ہمارا جو نے اپنی الی ہندوین کا سکہ بٹھاتے اور اپنی  
 حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے سر جان سے کہا۔

”بعض لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ میں ریاست بھرتپور کا روپیہ بے دردی کے ساتھ عیاشی پر صرف کر رہا ہوں اور ریاست بھرتپور مقروض ہے، حالانکہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے، ریاست بھرتپور کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ اس وقت ریاست بھرتپور کے ایک پوشیدہ خزانہ میں جو زمین کے اندر ہے ساٹھ لاکھ روپیہ نقد موجود ہے۔ چودھری لال چند کے بھرتپور وزیر اعظم مقرر ہونے کے چند روز بعد میں چودھری صاحب کی آنکھوں پر روال باندھ کر ان کو اس پوشیدہ خزانہ میں لے گیا تھا۔ اس خزانہ میں پہنچنے کے بعد میں نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور کہا کہ اس روپیہ کو گن لیجئے۔ یہ ساٹھ لاکھ روپیہ ہے۔ چودھری صاحب نے خود روپیہ کی یہ تھیلیاں گن لیں اور دیکھ لیا کہ یہ ساٹھ لاکھ روپیہ ہے۔ اس کے بعد میں نے ان کی آنکھیں پھر روال سے باندھ دیں اور ان کو اس پوشیدہ خزانہ سے باہر لے آیا۔“

سر جان تھامپسن انڈین سول سروس کے لائٹ ترین ممبروں میں سے اور بہت ہوشیار شخصیت تھے۔ آپ یہ سب کچھ سننے اور ہوں ہوں کہتے رہے مگر حیران تھے کہ جس صورت میں کہ چودھری لال چند خود ساٹھ لاکھ روپیہ دیکھ چکے ہیں تو گورنمنٹ ہند کے پاس پولیٹیکل ایجنٹ نے ریاست بھرتپور کے مقروض ہونے کی رپورٹ کیوں کی۔ چودھری لال چند بھی پھکی سیٹ پر بیٹھے یہ سب کچھ سن رہے تھے اور پریشان تھے کہ ہمارا ج کیوں یہ جھوٹ بول رہے ہیں اور سوچ رہے تھے کہ اس جھوٹ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہمارا ج کی موٹر ڈیگ پہنچی تو وہاں کے گیٹ ہاؤس میں سر جان تھامپسن کے قیام کا انتظام تھا۔ موٹر اس گیٹ ہاؤس کے دروازہ پر کھڑی ہوئی۔ سر جان، ہمارا ج اور چودھری لال چند اس میں سے اترے تو ہمارا ج سر جان اور چودھری صاحب کو اس گیٹ ہاؤس میں چھوڑ کر خود اپنی کونٹی میں چلے گئے۔ سر جان گیٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں پہنچے ہی تھے تو صوفہ پر بیٹھنے سے پہلے آپ نے چودھری لال چند سے سوال کیا کہ کیا یہ درست ہے کہ آپ کی آنکھیں روال سے باندھی گئیں، آپ کو ایک پوشیدہ خزانہ میں لے جایا گیا اور آپ نے ساٹھ لاکھ روپیہ کی تھیلیاں خود دیکھیں؟ چودھری لال چند یہ سن کر پریشان کہ وہ ہمارا ج کے اس جھوٹ اور بے بنیاد گپ کا کیا جواب دیں۔ چودھری صاحب نے مٹکراتے ہوئے کہا ”میں آپ کا مشکوک گزار ہوں کہ آپ نے یہ سوال موٹر میں ہی ہمارا ج کے سامنے نہ پوچھا“ جن کا مطلب یہ تھا کہ اس گپ کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد تک چودھری لال چند نے بہت کوشش کی کہ ریاست بھرتپور کی ایڈمنسٹریشن کی اصلاح ہو اور ہمارا ج کو گدگی سے نہ اتارا جائے مگر ہمارا ج نے اپنی عیاشی، فساد و فحاشی خوشامدیوں کے ہاتھوں میں کھیلنا اور ایڈمنسٹریشن میں مداخلت کرنا جاری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری صاحب نے مجبوراً بھرتپور کی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ہمارا ج اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے تعلقات نیا وہ کشیدہ ہوئے اور ایڈمنسٹریشن کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور آخر گورنمنٹ ہند نے ہمارا ج کو حکم دیا کہ وہ بھرتپور سے چلے جائیں اور اپنی ریاست کے علاقہ سے ایک سو میل دور رہیں۔ چنانچہ ہمارا ج اپنی رہائش بھرتپور سے ایک سو میل دور دہلی میں رکھنے پر مجبور

ہوئے۔ آپ یہاں بھی ملو ایفوں کے جھرمٹ میں رنگ رلیاں سنایا کرتے اور یہاں ہی نئی دہلی کی ایک کوشی میں غریب لڑکی کے عالم میں آپ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ وہ نظارہ عبرت انگیز تھا کہ جب ہمارا جہ کا انتقال ہوا، ہمارا جہ کی لاش ابھی بھر تپور کو روانہ نہ ہوئی تھی کہ حکم گورنمنٹ ہند ملو ایفوں کے سامان کی تلاش لی گئی اور تلاش لینے کے بعد ان کو ان کے وطن میرٹھ اور سینی ٹال وغیرہ جانے دیا گیا۔ اگر ہمارا جہ بھر تپور رائے بہادر جدوہری لال چند کے نیک مشورہ پر عمل کرتے اور غیر سخی لوگوں کے ہاتھوں میں نہ کیستے تو آپ کا یہ افسوسناک انجام نہ ہوتا۔

## ”سہن جی کہنے کا اثر“

۱۹۴۷ء کے فسادات جاری تھے۔ مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے صوبجات میں چلے آ رہے تھے اور ان کی بہت بڑی تعداد دہلی پہنچ چکی تھی کیونکہ دہلی کے تجارتی مرکز ہونے کے باعث مغربی پنجاب کے تاجروں کے لئے دہلی میں کافی کشش تھی جہاں کہ یہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تلاش کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں ”ریاست“ کا دفتر محلہ چرنے والاں میں تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ پشاور کی ایک خاتون تشریف لائیں۔ اس خاتون کی عمر چالیس برس کے قریب تھی اس کا شباب ختم ہو چکا تھا اور بڑھاپے کی آمد تھی مگر اس کے ہونٹوں پر سرخچہ، ریشمی لباس، بالوں کو خوبصورت بنانے کی کوشش، ہونٹوں پر شکر اسٹ پیدا کرنے کا جہر ظاہر کرنا تھا کہ یہ اپنے آپ کو نوجوان لڑکیوں کی صف میں شمار کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کو دیکھنے والوں کے دلوں میں تامل پیدا ہو۔ اس خاتون کے ساتھ ایک سکھ تھا جس کا لباس اور چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوفر کلاس میں سے ہے۔ یہ خاتون بغیر اطلاع اور بغیر کسی سے دریافت کیے میرے کمرے میں تشریف لے آئیں۔

اگر کوئی شخص میرے کمرے میں بغیر اطلاع چلا آئے تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے اصرار میں ملنا پسند نہیں کرتا اور اکثر ایسا ہنچا کہ میں اس کا نام پرچھے اور بات کئے بغیر ہی اسے واپس چلے جانے کے لئے کہہ دیتا ہوں، مگر یہ عورت تھیں، میں نے ان سے واپس چلے جانے کے لئے تو نہ کہا، کچھ بے اعتنائی کا سا اظہار کرتے اور اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا ”بیٹھے، فرمائیے کیا حکم ہے؟“ جس کا مطلب یہ تھا کہ کام کی بات کیجئے اور تشریف لے جائیے، اس خاتون نے بتایا کہ یہ پشاور کی رہنے والی ہیں۔ وہاں ان کی لاکھوں روپیہ کی جائیداد تھی، بارگشتہ کو ٹھیاں تھیں اور امیر گھرانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور فسادات کے باعث یہ بغیر ایک پیسہ ساتھ لئے تین کپڑوں کے ساتھ دھڑا رہتی اس زمانہ میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ یہ تین کپڑوں یعنی قیض، پاجامہ اور صاف کے ساتھ اپنے گھروں سے خالی ہاتھ چلے آئے ہیں چاہے ان کے جیب میں ہزار روپیہ کے نوٹ ہوتے (چلی آئی ہیں۔ ان کے پاس رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں اور یہ چاہتی ہیں کہ ان کو اس یعنی دفتر ”ریاست“ کی بلڈنگ میں ایک کمرہ رہائش کے لئے دیا جائے۔

چونکہ فسادات کے متعلق ہر شخص کو دلچسپی تھی، میں نے کمرہ کے متعلق تو لکھ دیا کہ اس بلڈنگ میں کوئی کمرہ خالی نہیں مگر فسادات اور شرناقیوں کے متعلق میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں اور میرے اور اس خاتون کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ لوگ پشاور میں کیا کام کرتے تھے؟  
ہمارے باغ تھے، کڑھیاں تھیں، جائیداد تھی، زمین تھی، پھلوں کا کاروبار کرتے تھے اور لاکھوں روپیہ کے مالک تھے۔

آپ وہاں سے کتنا روپیہ ساتھ لائے ہیں؟  
ہم صرف ان تین کپڑوں کے ساتھ جان چکا کر آئے ہیں۔

راستہ میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟  
نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی، اسپیشل ٹرین میں آئے ہیں، فوج کا پہرہ تھا۔

آپ کے گھر کے کتنے ممبر ہیں؟  
میرا باپ اور بھائی تھا، وہ قتل ہو گئے، میں، میری ماں اور میری چھوٹی بہن یہاں پہنچ گئے ہیں۔  
یہ آپ کے ساتھ جو سکھ ہے، یہ کون ہے؟

یہ میرا بھائی ہے۔

کیا حقیقی بھائی ہے۔

ہاں، میرا حقیقی بھائی ہے۔

یہ وہاں کیا کام کرتا تھا؟

یہ پشاور میں ٹانگہ چلاتا تھا۔

آپ تو لاکھوں روپیہ کے مالک تھے مگر آپ کا بھائی ٹانگہ چلاتا تھا؟

ہاں پہلے اس نے پھلوں کی دوکان جاری کی تھی۔ نالایت ہے۔ دوکان بند کر دی تو ٹانگہ چلاتا تھا۔

آپ یہاں دہلی میں کیا کاروبار کریں گے؟

جو کام مل جائے گا کریں گے، آخر زندگی کے دن تو پورے کر لے ہی ہیں۔

یہ کہنے کے بعد اس نے مسکراہٹ کے ساتھ انگڑائی لی اور کہا کہ ”سردار جی۔ ہمیں ایک کمرہ تو

ضرور دے دیجئے۔“

اس مسکراہٹ اور انگڑائی کا مطلب یہ تھا کہ میں سحر ہو جاؤں اور ان کو اپنے ہاں مہمان

رکھ لوں۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ عورت آدمارہ کا اس کی ہے، ساتھ والا شخص اس کا دلال ہے اور شاید یہ مغربی

پنجاب یا پشاور وغیرہ میں بھی پیشہ کرتی ہوگی کیونکہ اس عورت میں حیوانہ تھی اور ہندی زبان کی

کہاوت کے مطابق اس کا انگ انگ پھرکتا تھا، یعنی اس کے جسم کے ہر حصے عشق کی دعوت

دیتے تھے۔

باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا کہ ”آپ نے بہت ہربانی کی، درشن دے۔ اب میں کام کر رہا ہوں میرے پاس کوئی کمرہ ہرنا تو شاید دے دیتا مگر یہاں کوئی کمرہ خالی نہیں، میں خود تکلیف میں ہوں۔“ میرے اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ تشریف لے جائیے۔

میرے اس کہنے پر بھی یہ خاتون مایوس نہیں ہوئی اور اس نے اظہار توجہ دینے میں نہایت محنت کی تاکہ کام کو شش کرتے ہوئے پھر انگڑائی لی اور کہا کہ ”ہم تو کمرہ لئے بغیر یہاں سے نہ جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو،“ میں حیران کہ اس خاتون سے کیا کہوں۔ اول تو میرے پاس کوئی کمرہ خالی نہیں اور اگر ہو بھی تو میں اس کلاس کے لوگوں کو کمرہ یا جگہ نہیں دے سکتا۔ میں نے اس عورت کی سائیڈ کالہجی کو بدلتے کے لئے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”بہن جی۔ میرے پاس نہ تو کوئی کمرہ ہے اور نہ دے سکتا ہوں۔ مجھے اب ضروری کام کرنا ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیے ست سڑی اکال!“ یہ کہہ کر میں دوسرے کمرہ میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب تو آپ ضرور ہی تشریف لے جائیے۔

میرے ”بہن جی“ کہنے کا مطلب بھی یہ تھا کہ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کیجئے۔ کوئی اور گھر تلاش کیجئے جہاں آپ رہ سکیں۔

اس کے بعد یہ خاتون کبھی میرے ہاں نہیں آئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے بازار سیٹا رام میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا جہاں یہ پیشہ کرتی رہی اور اس کے ساتھ جو سکھ آیا تھا وہ اس کا دال تھا جو آسامیاں لایا کرتا۔

میری رائے میں جو عورتیں اظہار محبت کرنے والے مردوں کی حوصلہ شکنی کرتا چاہیں ان کو بات چیت کرنے وقت ”بھائی صاحب“ کہنا چاہیے اور مردوں کو ایسی عورتوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے ”بہن جی“ کہنا کافی ہے اور یہ نسخہ تانوانے کی صدی کا میاں ہوتا ہے۔

## عورتوں پر صدمہ کا اثر

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا ہی تھا کہ یہاں سب سے پہلے اس محکمہ کے ڈائریکٹر مسٹر ذوالفقار بخاری (جو آج کل پاکستان ریڈیو کے کنٹرولر ہیں) مقرر ہوئے۔ دہلی سٹیشن کے بعد دوسرے مقامات پر بھی نئے سٹیشن جاری ہونے والے تھے تران سٹیشنوں کے شاف کے لئے بھرتی شروع ہوئی۔ اسٹیشنوں کی پوسٹ کے لئے اخبارات میں اشتہار دیگیا اور ہزار ہا امیدواروں کی جو درخواستیں آئیں ان میں ایک درخواست پشاور سے مسٹر آر۔ ایل۔ ملک کی بھی تھی جو تعلیم کے لحاظ سے گریجوٹ تھے اور اس سے پہلے مختلف جگہوں پر کام کر چکے تھے۔ مسٹر آر۔ ایل۔ ملک کی درخواست جب دہلی پہنچی تو درخواستیں پڑھنے والے مسلمان افسر نے دہلی میں کہا جاسکتا کہ یہ افسر مسٹر بخاری تھے یا کوئی دوسرے صاحب ایہ خیال کرتے ہوئے کہ درخواست کنندہ کوئی مسلمان گریجوٹ ہے۔



ان کی درخواست کو منظور کر لیا اور پشاور سٹر ملک کو حکم بھیجا کہ آپ بطور اسٹنٹ ریڈر سٹیشن دہلی حاضر ہو جائیں آپ کو ڈیوٹی سوردیہ اور انڈیا کے چنانچہ اس حکم کے پہنچنے ہی سٹر آر۔ ایل ملک دہلی پہنچ گئے اور ان کو بطور اسٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں عام طور پر آل انڈیا ریڈیو میں پنجابی یا سرحدی نوجوان گریجویٹ ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ کیونکہ نیا کام ہونے کے باعث ایک تین رات محنت کرنے کا مل تھا اور دوسرے صوبہ جات کے لوگ پنجابیوں اور سرحدیوں جیسی محنت نہ کر سکتے تھے اس کے علاوہ پنجابی انسر چاہتے تھے کہ ان کے عزیز۔ رشتہ دار اور دوست ملازم ہو جائیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں جب جھنجھ اور پھر تیلے پنجابی تسلیم یافتہ نوجوانوں کو اچھے لباس میں کیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے اس زمانہ کے سیکریٹری سٹر این بی رائے آئی۔ سی۔ ایس نے دیکھا تو کہا تھا کہ ”میں ریڈیو اسٹیشن پر ان تعلیم یافتہ پنجابی نوجوانوں کو دیکھ کر ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ نوجوان آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء ہیں جو انڈین سول سروس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔“

یعنی ریڈیو اسٹیشن کے یہ نئے اسٹنٹ اس محکمہ کے لئے باعثِ فخر تھے اور ان اسٹنٹوں میں سٹر آر۔ ایل ملک بھی تھے جو اپنا مستقبل اس محکمہ میں بہت شاندار محسوس کرتے تھے۔

سٹر آر۔ ایل ملک کو آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے ہوئے کئی باہ ہو گئے اور کسی کو یہ علم نہ ہو سکا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ان کے تمام ہمراہی ان کو مسلمان ہی سمجھتے۔ ایک روز یہ سٹر ڈاٹو افکار بخاری کے ساتھ بیٹھے کام میں مصروف تھے کہ سٹر بخاری اور ان کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔

میں پشاور کا رہنے والا ہوں۔

آپ پشاور کے کون سے ملک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا آپ کی رشتہ داری ملک فیروز خاں لون کے خاندان سے بھی ہے۔

جی نہیں۔ میں تو برہمن ہوں۔ پشاور کے برہمن ملک خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور میرا نام روپ لال ملک ہے۔

یہ بات چیت تھی جو سب سے پہلے سٹر آر۔ ایل ملک کو ریڈیو سٹیشن دہلی کے اعلیٰ مسلمان افسروں کی نگاہ میں سے خارج کرنے کا باعث ہوئی۔ کیونکہ یہ اعلیٰ افسر سٹر روپ لال ملک کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کو مسلمان سمجھ کر ملازمت دی گئی۔ مسلمان سمجھتے ہوئے ہی ان پر ہربانی اور کرم رہا۔ مگر یہ کج فہم ہندو بن گئے۔

سرکاری ملازمت حاصل کرنا بوجہ مشکل ہے۔ مگر جب کوئی ملازم ہو جائے تو اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ سٹر روپ لال فطرتاً غریبوں کے خیر خواہ تھے اور اگر راہ چلتے ہوئے بھی یہ کسی غریب پر ظلم ہوتا دیکھتے تو یہ اپنے وقت کی ہر دانہ کرتے ہوئے منظم کی حمایت پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے اس کیرئیر کی مجبوری سمجھئے یا بد قسمتی کہ ریڈیو سٹیشن پر جب کسی

سازندے یا آرٹسٹ کے ساتھ زیادتی ہوتی تو یہ اس منظلوم کا ساتھ دیتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ سازندوں اور آرٹسٹوں میں تو یہ حد ہر دلعزیز تھے مگر محکمہ کے بڑے افسران کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے۔ ان کو ریڈیو سٹیشن دہلی پر گمازمت کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو گیا تو ایک روز دفتر "ریاست" میں نشرین لائے۔ ان کا آنا مسٹر ذوالفقار بخاری کے ایسا سے تھا۔ کیونکہ "ریاست" اس محکمہ کی بد احتیاطیوں کے خلاف سخت مضامین شائع کر رہا تھا اور مسٹر بخاری چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو "ریاست" کے مضامین کا یہ سلسلہ ختم ہو کیونکہ کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مسٹر ایس۔ این رائے آجی سی ایس ایڈیٹر "ریاست" کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے دل میں "ریاست" کے لئے عزت اور قدر کے جذبات تھے دیہ تعلقات مرحوم مسٹر کے ہی واسطے میننگ ڈائریکٹر ایسوسی ایڈیٹر ہیں کے ذریعہ قائم ہوئے۔ کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" اور مسٹر ایس این رائے دونوں مسٹر سی۔ رائے کی کوجلی پر اکثر جاتے اور وہاں دونوں کو بہتر ڈیز میں شامل ہونے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسٹر رائے جب ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھے اور ایڈیٹر "ریاست" کا ذوالباب بعد پال کے ساتھ معذمہ چل رہا تھا تو مسٹر رائے نے وجہوں اور مجھے معذمہ کے متعلق قیمتی اطلاعات دیں اور جب ریڈیو ڈیپارٹمنٹ کے متعلق "ریاست" میں کوئی مستعمل شائع ہوتا تو آپ اس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ احکام سے فوراً جواب طلب کرتے۔ مسٹر نوپ لال ملک اس سے پہلے کبھی دفتر "ریاست" میں نہ آتے تھے۔ آپ جب پہنچے تو ان کے اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی۔

میں ریڈیو سٹیشن سے آیا ہوں۔ میرا نام آر۔ ایل ملک ہے۔ بہت دیر سے آپ کا نیاز حاصل کرنے کی خواہش تھی۔

آپ نے بہت کرم فرمایا۔ تشریف رکھیے۔

میرے آنے کی ایک خاص غرض یہ بھی ہے کہ میں آپ سے ریڈیو پر تقریر کرنے کی درخواست کروں۔

میں تو ایک معمولی جرنلسٹ ہوں۔ کبھی سبکدوش کے متعلق بھی اہل الرائے نہیں۔ اس لئے میں اپنے آپ کو اس کام کے لئے فٹ نہیں سمجھتا۔

مگر آپ دیکھتے ہوں گے کہ اکثر اخبارات کے ایڈیٹر ریڈیو پر تقریریں کرتے ہیں۔ اور خواجہ حسن نظامی بھی اکثر تقریریں فرماتے ہیں۔

وہ لوگ اس کے لئے فٹ ہوں گے۔ میں فٹ نہیں ہوں اور نہ آپ کی اس پکیشن کا مجھ پر کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس تقریر کے بعد "ریاست" میں ریڈیو سٹیشن کے متعلق شائع ہونے والے مضامین کا سلسلہ ختم ہو جائے گا تو آپ کی غلطی ہے۔

نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ ہماری سب کی خواہش یہ ہے کہ آپ کسی نہ کسی موضوع پر ریڈیو پر تقریر کریں۔

میں فی الحقیقت اس خدمت کے لئے فٹ نہیں ہوں۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر

ہندوستان کے تمام اہل الرائے مروجائیں توفٹ ہونے کے لحاظ سے شاید پھر بھی میری باری نہ آئے۔

میرا یہ جواب سن کر مسٹر ملک خاموش ہو گئے اور انہوں نے مسٹر بخاری کو تمام گفتگو بتائی جس کا مطلب یہ تھا کہ دیوان سنگھ تقریروں کے ذریعہ خرد انہیں جاسکتا۔  
مسٹر روپ لال ملک کچھ دنوں کے بعد پھر مجھ سے ملے مگر تقریر کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی اور اس کے بعد یہ اکثر مجھ سے ملتے۔ دوسرے کچھ روز ٹیلیفون پر بھی بات چیت کر لیتے۔ اور اگر کوئی اچھے محاکے والا یا اچھی لکائی والی گانا شروع کرتی تو مجھے اس گانے کے سننے کے لئے ٹیلیفون پر دعوت دی جاتی۔ کیونکہ میں اس زمانہ میں بپے گانے کے سمجھنے کی مشق کر رہا تھا۔ اور کئی واکوں اور رانگیوں سے واقف ہو چکا تھا۔

ملک روپ لال کئی ماہ تک دہلی ریڈیو سٹیشن کے دیہاتی پروگرام کے انچارج رہے۔ اور یہ ان کا معمول تھا کہ جب یہ دیہاتی پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کرتے اور اس اعلان کو ان کی بیوی اپنے گھر بٹنٹیں دمسٹر فیلڈن کنٹرول رائل انڈیا ریڈیو نے اپنے سٹاف کے اکثر اصحاب کو اپنے گھروں پر رکھنے کے لئے ایک ایک ٹیڈیو مفت دیدیا تھا تاکہ یہ اپنے گھروں میں بھی پروگرام سن سکیں۔ اور پروگرام کی رفتار سے واقف رہیں، تو یہ چولے میں اگل جلا دیتیں۔ ملک صاحب کے گھر چنے تک چوہا گرم ہو جاتا اور ان کے پیٹھے ہی ان کو گرم کھانا ملتا۔

ملک روپ لال کو کام کرتے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز ان کے پروگرام میں ان کے ایک دوست کا بھی نام تھا جس کو تقریر کے معادفہ میں دینے کے لئے بیس روپیہ منظور ہو چکا تھا۔ مگر ان کے یہ دوست عین وقت پر نہ پہنچے۔ یہ تقریر ملک صاحب نے خود ہی پڑھ دی اور جب یہ تقریر پڑھ چکے تو یہ دوست ریڈیو سٹیشن پر تشریف لے آئے۔ ملک صاحب کی غلطی سمجھے یا ان کی دوست نوازی کہ آپ نے اس دوست کے دال پہنچنے پر ان کو بیس روپیہ دیدیئے۔ حالانکہ یہ نہ دیتے چاہیے تھے کیونکہ تقریر کرنے والے نے تقریر نہیں کی تھی اور ان کا حق ذیال ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ تو معمولی تھا مگر مسٹر ملک اپنی مزدور پرست پالیسی یا فطرت کے باعث اپنے افسروں میں ہر دلعزیز نہ تھے۔ آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ نے بیس روپیہ کی سرکاری رقم بغیر تقریر کے اپنے ایک دوست کو دی اور یہ سرکاری روپیہ کا غلط یا ناجائز استعمال تھا اور مسٹر ملک پر سرکاری روپیہ کی امانت میں خیانت کا فوجداری مقدمہ چلایا جائے۔

مسٹر ملک کو جب اس مقدمہ کی اطلاع ملی تو آپ کے ہوش اڑ گئے کیونکہ آپ اپنا مستقبل اس محکمہ میں تہمت شناسانہ محسوس کرتے تھے۔ مگر اب نہ صرف آپ ملازمت سے علیحدہ ہوں گے بلکہ شاید عدالت آپ کو قید کی سزا بھی دے۔ آپ نے جب حکم شناسانہ تہمت پریشان تھے مصلحتی کا حکم سننے کے بعد اپنے گھر پہنچے۔ چند روز پہلے ان کی بیوی کے بچہ ہوا تھا۔ بیوی کچھ کمزور تھیں شوہر وقت سے پہلے ہی گھر پہنچے تو بیوی نے محبت کے جذبات کے ساتھ پرچھا۔ آج جلدی چلے آئے؟ اس کے جواب میں مسٹر ملک نے بتایا کہ ملازمت تو ختم ہو چکی

اور شاید مقدم میں سزا بھی ہو۔ یہ سن کر پیڑی بے ہوش ہی ہو گئیں۔ ملک صاحب نے حوصلہ دیا کہ گھبراؤ نہیں خدا مالک ہے۔ دونوں طورہ کرتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہئے اور مستقبل کیا ہوگا۔ پیڑی کو شدت غم کے باعث رات کو بخار ہو گیا۔ اگلے دن بھی حرارت تھی۔ سمجھا گیا کہ بلیریا ہے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر کو دکھایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ ایک پھیپڑہ پر تپ دن کا اثر ہے۔ اس زمانہ میں تپ دن کا علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ اور سٹیٹو نامی سین بھی ایجاد نہ ہوئی تھی۔ ملک روپ لال نے علاج کے لئے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور یہ تپ دن ہی یا دوسرے الفاظ میں شوہر کی ملازمت سے علیحدگی ہی اس نیک دل خاتون کی زندگی کو ختم کرنے کا باعث ہوئی۔

مسٹر روپ لال ملک کو معطل ہونے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ یہ میرے پاس آئے۔ تمام کیفیت بیان کی۔ میں کسی سے سفارش نہیں کیا کرتا اور سفارس کرنے کو معیوب سمجھتا ہوں۔ مگر جب ظلم ہو تو میں اپنی خود داری کو جواب دے کر بھی میدان میں کود پڑتا ہوں۔ جب تمام حالات سنئے تو افسوس ہوا میں اس زمانہ میں بکریہ بیوہ کے خلاف سخت مضامین لکھ رہا تھا۔ ان دنوں محکمہ پیڑی کے ڈپٹی کنٹرولر مسٹر احمد شاہ بخاری تھے (جو آج کل ریٹائرڈ میڈیشنر ہیں) پاکستان کے نمائندے ہیں اور جن کے بلند قابل محبت اور قابل احترام ہونے کا آپ کے خالصین بھی آوارہ کرتے ہیں) میں اپنی خود داری کی پروا نہ کرتے ہوئے گہرج میں سے اپنی کار نکال کر بخاری صاحب کے گھر پہنچا اور درخواست کی کہ وہ مسٹر ملک کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ مسٹر بخاری بہت ہی دوست نواز اور بلند شخصیت ہیں میرے مضامین کا کوئی اثر لے بغیر انھوں نے اس کیس کی تمام پوزیشن بیان کی اور بتایا کہ معاملہ گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس جا چکا ہے مگر وہ یہ کوشش کریں گے کہ مسٹر روپ لال ملک پر خود داری مقدمہ قائم نہ ہو اور ان کو صرف ملازمت سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر بخاری نے ایسا ہی کیا اور مسٹر روپ لال ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

مسٹر روپ لال ملک کی بیوی کی لا علاج بیماری اور حالات نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے دوستوں کے لئے بھی تکلیف کا باعث تھے۔ میں نے ان کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر دفتر "ریاست" میں مقرر کر دیا کہ ان کی مالی پریشانی میں کچھ تو کمی ہو۔ میں جب نوٹوں کے مقدمہ میں گرفتار ہوا تو اس وقت یہ دفتر "ریاست" میں ملازم تھے میری گرفتاری کے بعد یہ ملازمت چھوڑنے کے لئے مجبور ہوئے اور کلکتہ چلے گئے۔ یہ آدمی بہت ادو العزم ہیں۔ جنگ کا زمانہ تھا آپ جرات اور دلیری کے ساتھ ہر ماسی سرحد پر ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام کرتے رہے اور آپ نے بہت روپیہ پیدا کیا۔ اسہا جب کبھی دہلی آتے ہیں تو یہ دفتر "ریاست" میں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ ان کی موجودہ کامیاب زندگی کے ساتھ جب ان کی بیوی کو صدمہ پہنچنے اور اس صدمہ کے نتیجہ کا خیال آتا ہے تو جیم کمانپ اٹھتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں درجنوں ایسی عورتوں کو دیکھا جو اپنے نازک اساس رکھنے کے باعث کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکیں اور یہ یا تو تپ دن کا شکار ہوئیں یا خودکشی پر آمادہ ہو گئیں۔ ان میں

سے ایک مسزنگ بھی تھیں جو اپنے شباب کے زمانہ میں اپنے شوہر کی تکلیف برداشت نہ کر سکیں اور تپ دق کا شکار ہوئیں۔

## نظام دکن کا ظلم اور ہاتما گاندھی

ریاست حیدرآباد کے سابق ہزارگیر الٹڈ ہائیس نظام دکن یا اس کے بعد کے راج پرکاش عثمان علی خاں کو روپیہ جمع کرنے کا شوق پاگل پن کی حد تک تھا اور آپ کے والد مرحوم میر محبوب علی خاں جتنے نیاں، فراخ دل اور ہر دلعزیز تھے، یہ عثمان علی خاں اتنے ہی بخیل، کنجوس اور متعصب تھے، یعنی میر محبوب علی خاں کے پاس تو جو کوئی بھی گیا وہ مالامال ہو کر واپس آیا اور میر عثمان علی خاں کے ساتھ جس کی ملاقات ہوئی وہ اپنی جیب خالی کر کر واپس آیا اور میر محبوب علی خاں تو اپنی رعایا کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر فی الحقیقت محبوب تھے۔ میر عثمان علی خاں ہر غیر مسلم کے دشمن جو ہندو کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے اور ہندوؤں کو نفرت و حقارت کے ساتھ ہنڈواڑے ہکتے۔

میر عثمان علی خاں کے روپیہ کے جمع کرنے کے پاگل پن کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں تھے حیدرآباد کے رؤسا کی زندگی عذاب میں تھی اور اگر کوئی رئیس ہندو تھا تو وہ اپنی جاگیر اور عزت دونوں کو بڑھتے خطرہ میں سمجھتا۔ چنانچہ ریاست حیدرآباد کی ایک جاگیر گدوال کو ضبط نہ کرنے کی ذمہ داری توڑیاست پر ہے۔ اس ریاست کی مالک ایک بیروہ رانی تھیں جن کے ہاں کوئی اولاد نہ رہی تھی۔ بیروہ رانی چاہتی تھیں کہ اپنے نواسے کو دلی عہد قرار دیں مگر نظام اس جاگیر کو ضبط کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس زمانہ میں رانی گدوال کے ایک عزیز مسٹر ریڈی مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے جنہوں نے تمام حالات ایڈیٹر ریاست کو بتائے۔ ”ریاست“ میں اس ظلم کے خلاف کئی مضامین لکھے گئے تو گورنمنٹ ہند کے پرنسپل ڈیپارٹمنٹ نے مداخلت کرتے ہوئے نظام کو اس جاگیر کو ضبط نہ کرنے کا حکم دیا۔

نظام کے مظالم کے سب سے بڑے شکار دہاں کے سابق وزیر اعظم ہمارا جہ سرکش پرشاد تھے کیونکہ گو ہمارا جہ کی نگاہوں میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا اور ان کی پروا اسلام یا ہندی کے باعث ہندو ان کو نیم مسلمان قرار دیتے تھے مگر چونکہ ہمارا جہ خاندانی لحاظ سے راجہ چند دلال کے خاندان میں سے ہندو تھے، نظام اس کوشش میں رہے کہ یہ جاگیر (ہمارا جہ سرکش پرشاد کی خاندانی جاگیر چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اور ان کی پیش کاری کی ذاتی تنخواہ پانچ ہزار روپیہ ماہوار تھی) ضبط کر لی جائے۔ ہمارا جہ طبعاً سادہ خلق و نیاں تھے۔ اپنی فیاضیوں کے باعث زندگی بھر قرض بے پادار آپ کے ذہن کے لئے یہ خیال بھی اذیت کا باعث تھا کہ اگر یہ جاگیر ضبط ہو گئی تو راجہ چند دلال کے خاندان کا وقار ختم ہو جائے گا اور جن لوگوں کا آپ سہارا تھے وہ لوگ مالی مشکلات میں مبتلا ہوں گے۔

ہاتما گاندھی کی شہرت روز بروز عروج حاصل کرتی جا رہی تھی اور برٹش گورنمنٹ ہاتما گاندھی کی تحریک کو کچلنے کی ناکام کوشش کے بعد ہاتما جی سے بات چیت کرنے کے لئے مجبور تھی۔ ہمارا جہ سرکش پرشاد

نے جب ملک کی اس فضا کو دیکھا تو آپ سیر کے بہانہ دہلی آئے۔ آپ کے اور خواجہ حسن نظامی کے تعلقات بہت گہرے تھے اور خواجہ حسن نظامی نظام دکن سے بھی مراسم رکھتے تھے اور ریاست حیدرآباد سے دوسروں پر یہ مہوار خوار پاتے تھے مگر ہمارا جس نے خواجہ حسن نظامی کو راز میں لے کر ہاتھ کاغذی سے ملاقات کا انتظام کیا اور یہ ملاقات رازداری میں رات کے وقت بیہوش شیخ احسان الحق کے ذاتی مکان پھلی دالان (جہاں آج کل آزاد ہند ہوٹل ہے) میں ہوئی مگر کسی شخص کو اس ملاقات کا علم نہ ہوا اور اس ملاقات کی اطلاع نظام تک نہ پہنچ جائے۔ اس ملاقات میں ہاتھ کاغذی، ہمارا جس سرکشن پر شاہ، خواجہ حسن نظامی اور بیہوش شیخ احسان الحق شامل تھے یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک رہی اور اس ملاقات کا سبب باب یہ تھا کہ ہمارا جس نے تو جاگیر داروں پر کئے جارہے مظالم بیان کئے اور ہاتھ کاغذی کی امداد چاہی اور ہاتھ کاغذی نے جواب دیا کہ ”سچائی اور جرات کے ساتھ کھلے طور پر بیان میں آؤ چاہے اس راہ میں مٹ جاؤ، اور اگر یہ جرات نہیں رکھتے تو ظلم برداشت کرتے چلے جاؤ“ ہمارا جس فاذا فی رئیس تھے۔ ان کے اندر نظام کی کھلے طور پر مخالفت کی جرات کہاں۔ یہ جواب سن کر آپ بہت مایوس ہوئے۔

ہاتھ کاغذی کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی سازش میں شریک ہوتے چاہے یہ سازش انگریزوں کو ہندوستان سے ہٹانے کے اعتمار سے کامیاب ہی کیوں نہ ہوتی کیونکہ آپ فطرتاً سازشوں کے خلاف تھے اور جو کچھ کرتے کھلے طور پر کرتے۔ چنانچہ ہاتھ کاغذی کی سیاسی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی یہ پالیسی تھی کیونکہ اگر منش کسی سازش کے نام پر آپ کو کھل نہ سکی اور آپ نے اگر ہمارا جس سرکشن پر شاہ کا ساتھ نہ دیا تو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر، اور اب اگر نظام اپنی زندگی میں ہی اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے تو یہ قدرت کی طرف سے ان مظالم کی منسوبی جو آپ نے اپنی زندگی میں اپنی رعایا پر کی۔

## مجرمانہ دہشت اور اس کے نتائج

۱۹۴۷ء میں جو کھاتے پیتے اچھے آسودہ گھرانہ کے لاکھوں شہرناز تھی تباہ آبادی کے سلسلہ میں مغربی پنجاب سے ہندوستان آئے ان میں انگلری کے ایک بہت ہی شریف، نیکدل اور معزز ٹھیکہ دار لالہ بابک چند بھی تھے اور ہندوستان پہنچنے کے بعد ان کے سامنے نہ صرف اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا سوال تھا بلکہ اس سے زیادہ اہم سوال ان کے سامنے ان کی اولاد کا مسئلہ تھا کیونکہ اپنے وطن میں نوان کو اپنے بچوں کے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ زمینیں نہیں، جائیداد بھی، روپیہ تھا اور یہ اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے تھے اور وہاں لوگ ان کو جانتے تھے اور یہ لوگوں کو جانتے تھے۔ یہاں شادی کے سلسلے میں بھی یہ وہاں امتیاز کے ساتھ قدم اٹھاسکتے تھے مگر اب ان کے رشتہ داروں میں کوئی دہلی میں ہے تو کوئی امرتسر میں اور کوئی کلکتہ میں رہتا ہے تو کوئی پٹنہ میں۔ بھائی، بہن، خالہ، چچا، ماموں، بھوپا اور رشتہ دار وغیرہ سب الگ الگ ہو گئے۔ لالہ بابک چند کے دو تین لڑکے تھے اور دو تین لڑکیاں جو سکول

میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے دہلی پہنچنے کے بعد اپنے گھر کے لوگوں کے سرچھپانے کے لئے قول نامہ میں دس ہزار روپیہ صرف کر کے ایک مکان خرید لیا اور جو کچھ آپ کے پاس تھا اس سے آپ نے اپنی زندگی کے دن گزارنے شروع کیے اور بچوں نے تعلیم شروع کر دی۔

ان کو دہلی میں آئے پہلے برس کے قریب ہوئے تھے تو یہ ایک روز دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے بہت ہی کم ہوئے اور پریشان۔ آپ ”ریاست“ کے مآج تھے اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے لئے ان کے دل میں عزت کے جذبات تھے۔ آپ نے ایڈیٹر ”ریاست“ کو راز میں لے کر بتایا کہ آپ منگلوری کے رہنے والے ہیں اور منگلوری اور لاہور میں ٹھیکہ داری کرتے تھے۔ دہلی میں پہنچنے کے بعد اپنے مستقبل کے متعلق متفکر تھے۔ بڑی لڑکی جو جو ان تھی اس کی شادی کے متعلق پریشان تھے۔ آپ نے اختیار ”ٹریبون“ کے شادی کے اشتہارات کے کالموں میں ایک اشتہار دیکھا جو بنارس کے کسی صاحب کے نام سے شائع کیا گیا اور اشتہار میں لکھا تھا کہ ایک فوجیان بھائی جو گر بچہ میٹ اور برسر کار ہے، شادی کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اس اشتہار دیکھنے والے کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔ لڑکے کا نوٹ منگایا گیا اور شادی کی تاریخ مقرر کر کے شادی کر دی گئی مگر شادی کے بعد جب لڑکی اپنے سسرال بنارس گئی تو وہاں بڑے میمن نے بتایا کہ اس کا دو لہا چار سو بیس کلاس کا جرائم پیشہ شخص ہے۔ بڑے نام ہو میو میٹیک ڈاکٹر ہے اور پہلے دھوکہ دے کر روپیہ کے لئے کئی شادیاں کر چکے ہیں۔ ہندو مذہب میں جب لڑکی کی شادی ہو جائے تو یہ شادی نہ صرف اس کی موجودہ تمام زندگی بکاؤ میمن کے تعلقات کی بھی ایک گارنٹی ہوتی ہے اور ہندو عورت کو چاہے کتنی بھی مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے، طلاق حاصل کرنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا اور شوہر چاہے پریشانی اور پریشانہ ذہنیت کا ہو، عورت کو اس کا دفا شعار ہونا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ لالہ نانک چند کی صاحبزادی جب پہلی بار اپنی سسرال گئی تو اس کے شوہر جو لائل پور کا رہنے والا آلودہ البیہ قوم میں سے تھا اور جس کا پہلا نام امریک سنگھ تھا اور جس نے اپنے ایک قتل کے جرم کو چھپانے کے لئے اپنا نام تبدیل کر کے امر سرور رکھ لیا تھا انے لڑکی سے سات ہزار روپیہ کے ایک چیک پر وہ تنگہ کرا لئے۔ جو روپیہ لالہ نانک چند نے اپنی لڑکی کے نام بینک میں جمع کرا دیا تھا۔ اس وقت تک لالہ نانک چند کو اپنے والد کے متعلق سوائے ”ٹریبون“ کے اشتہار یا اس کے متعلق خط و کتابت کے اور کچھ علم نہ تھا۔ لڑکی جب سسرال سے واپس آئی تو اس بچاری نے اپنی والدہ کو تمام حالات بتائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ لالہ نانک چند نے یہ تمام حالات ایڈیٹر ”ریاست“ کو بتائے اور اس سے زیادہ انہوں نے اور کچھ نہ بتایا اور نہ ہی ان کو اس والدہ کی دوسری کو البیہ گیشن کا کوئی علم تھا۔ آپ صرف اس علم میں ہی تھے کہ آپ کی صاحبزادی کی شادی ایک نالائق اور بیکار شخص کے ساتھ ہوئی اور آپ نے چاہا کہ آپ کو اس معاملہ کے متعلق میں کوئی درست رائے دوں۔

میں نے لالہ نانک چند سے کہا کہ جب ان کا داماد دہلی آئے تو وہ اسے میروے پاس لائیں تاکہ میں اس پر جرح کر سکے اس کے تمام حالات معلوم کر سکوں اور کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں۔ چند روز بعد ان کا داماد لڑکی کو لینے کے لئے دہلی آیا تو لالہ جی نے اس سے کہا کہ دیوان سنگھ اس سے ملنا چاہتا ہے مگر ان کے

داماد نے نالتے ہوئے ایڈیٹر ریاست سے جلتے سے انکار کر دیا اور لالہ نانک چند کو دھکی دی کہ اگر وہ لڑکی کو اس کے ساتھ نہ بھیجیں گے اور مزید روپیہ نہ دیں گے تو یہ لالہ نانک چند اور ان کے مقام خاندان کو قتل کر دے گا۔ لالہ نانک چند نے یہ حالات بتائے تو وہ بہت ہی سہمے ہوئے۔ خوفزدہ اور پریشان تھے میں نے ان کو بہت حوصلہ دیا کہ پروا مت کریں۔ میں ابھی نئی دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بھائیہ (جوائیڈٹر) ریاست کے دوست اور ہم وطن تھے، کی معرفت ان کی حفاظت کا انتظام کرتا ہوں۔ لالہ نانک چند بہت ہی خوفزدہ اور پریشان تھے۔ آپ نے چاہا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ایڈیٹر ریاست کے ہاں آجاتے ہیں۔ ان کو ایک کمرہ دے دیا جائے تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ ایڈیٹر ریاست نے کہا کہ جب چاہیے چلے آئیے، دفتر ریاست کے ایک دو کمرے خالی کر دئے جائیں گے مگر بہتر یہ ہے کہ حوصلہ اور بہادری کے ساتھ اپنے مکان میں رہیے تاکہ ان کا داماد ان کے دل کی اس کمزوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لالہ نانک چند سے یہ بات چیت ہوئی تھی کہ آپ اس کے بعد دفتر ریاست میں نہ آئے اور اگلے روز دہلی میں کسی شخص کو بھی اپنا پتہ بتائے بغیر اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی سے باہر چلے گئے تاکہ ان کا داماد ان پر تاملانہ حملہ نہ کر سکے کیونکہ یہ بے حد خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔

لالہ نانک چند کا کوئی ماہ کے بعد پنجاب کے ایک مقام سے خط ملا کہ آپ فلاں جگہ ہیں، فلاں شخص کی معرفت میں ان کو خط لکھ سکتا ہوں اور ان کا پتہ کسی دوسرے شخص کو نہ بتایا جائے۔ میں نے ان کو جواب لکھا کہ اطمینان رکھیے۔ ان کے موجودہ پتہ کا کوئی دوسرے کو علم نہ ہوگا۔ اس خط کو بڑے کئی ماہ ہو گئے تو ایک سکھ سردار راجندر سنگھ نماز مت کے لئے دفتر ریاست میں تشریف لائے۔ ان سے بات چیت ہوئی تو یہ فیصلہ ہوا کہ یہ دفتر ریاست میں بطور کنوینیر کام کریں گے مگر ابھی دو ایک ہفتہ تک کام شروع نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں انبالہ جانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ مقدمہ کیا ہے تو آپ نے بتایا کہ مقدمہ قتل کا ہے۔ ایک شخص بنارس میں تھا۔ اس نے روپیہ کے لالچ میں دھوکہ دے کر ان کے انبالہ کے عزیزوں میں ایک لڑکی سے شادی کی اور جب مزید روپیہ نہ ملا تو اس نے اپنے خسر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے قردل باغ میں منگھری کے ایک شخص کی لڑکی سے شادی کی اور پھر اس کے بعد ایک اور شادی کرنے کے لئے دہلی آیا تھا کہ یہاں گرفتار ہو گیا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب ان حالات میں بنارس اور منگھری کے ایک شخص کی لڑکی سے شادی کرنے کا واقعہ بتایا تو مجھے فوراً لالہ نانک چند کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ منگھری کے اس شخص کا نام کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ سنا ہے کہ ان کا نام نانک چند ہے اور انہوں نے اب اس نانک چند کو قردل باغ میں بہت تلاش کیا ہے مگر ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب یہ کہا تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے مقدمہ کی تفصیل پر چھی تو انہوں نے جو حالات بتائے وہ یہ تھے۔

ایک شخص امریک سنگھ جو آلہودالیہ قوم میں سے ہے (آلہودالیہ قوم پنجاب کی خوبصورت ترین اقوام میں سے ہے۔ ہمارا جہمپور قلعہ بھی اسی قوم میں سے ہے اور راولپنڈی کی آلہودالیہ قوم کا تو خوبصورتی



کے اعتبار سے ہندوستان کی کوئی قوم بھی مستابلہ نہیں کر سکتی (تبادلہ آبادی سے پہلے لائل پور کا رہنے والا تھا۔ بی۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی۔ بی۔ ہے۔ تبادلہ آبادی کے بعد یہ شخص دہلی میں آکر محکمہ سول سپلائی میں ملازم ہو گیا اور یہاں سے فرج میں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پر عارضی طور پر انسپٹر ہو کر مدد اس چھاؤنی میں تعینات ہوا۔ جبکہ فرج میں ملازم تھا تو اس نے انبالہ کی ایک لڑکی سے شادی کی یہ لڑکی سردار راجندر سنگھ کے رشتہ داروں میں سے تھی) لڑکی کے والدین کو تنگ کر کے روپیہ حاصل کرتا رہا اور جب انھوں نے روپیہ دینے سے انکار کیا تو قتل کی دھمکیاں دیا کرتا اور آخر اس نے اپنے خسر کو قتل بھی کر دیا اور قتل کرنے کے بعد یہ موقع پر ہی گرفتار ہوا۔ گرفتاری کے بعد امریکہ سنگھ نے انبالہ جیل میں قانون کے مطابق جیل کے رجسٹروں میں اپنے انگوٹھے اور انگلیوں کے امپریشن دیتے کیونکہ جو قیدی جیل میں داخل ہو، شناخت کے لئے اُس کی انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں جیل میں جانے کے چند روز بعد اُس نے اپنے دل کی کمزوری کا بہانہ کیا اور درخواست کی کہ اسے کسی ہارٹ آپریٹ کو دکھایا جائے۔ چنانچہ جیل کے انسپروں نے اس کو امرتسر کے سول ہسپتال میں بھیجے گا فیصلہ کیا اور جب پولیس کے سپاہی اس کو امرتسر لے جا رہے تھے تو انبالہ شہر میں یہ پولیس والوں سے سہولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ ان کے ساتھ کھانا کھانے اور پولیس والوں کو کھانا کھلانے کے بہانہ اپنے ایک دوست کے مکان پر لے گیا جہاں یہ اپنے پہرے کے سپاہیوں کو چمک دے کہ دوسرے دروازہ سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد پہرہ والے سپاہیوں پر غفلت شعاری کے جرم میں مقدمہ چلا اور ان کو تین تین برس قید کی سزا ہوئی اور انبالہ پولیس کو کچھ علم نہ ہو سکا کہ امریکہ سنگھ کہاں ہے کیونکہ اُس نے اب بنارس جا کر امر سرورپ کے نام سے رہائش اختیار کر لی اور وہاں جو میڈیٹیک ڈاکٹر بن گیا کیونکہ ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ڈاکٹری کی اسے۔ بی۔ بی۔ بھی جانتا ہو۔

بنارس پہنچنے کے بعد اُس نے ”ٹریبون“ میں شادی کا پھر اشتہار دیا اور اس اشتہار کے ذریعہ اس نے قردل باغ کے لالہ نامک چند کو دھوکہ دیا اور ان کی لڑکی سے شادی کی جو بی۔ اے تک تعلیم یافتہ ہیں اور جب لالہ نامک چند بغیر کسی کو اطلاع دے دہلی سے پنجاب کے ایک دوسرے مقام پر چلے گئے تو اس نے پھر ”ٹریبون“ میں شادی کا اشتہار دیا اور دہلی دیا گنج کی ایک لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا اور یہ لڑکی گوبی۔ اے تک تعلیم یافتہ تھی مگر خوبصورت نہ تھی، اس لئے شادی کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ لڑکی کے والدین دھاکو آٹھ ہزار روپیہ نقد اور زیورات وغیرہ دیں گے۔ چنانچہ امریکہ سنگھ جب یہ نئی شادی کرنے کے لئے بنارس سے دہلی پہنچا تو اتفاق ایسا ہوا کہ ان سردار راجندر سنگھ نے اس کو ریلوے سٹیشن دہلی کے پلیٹ فارم پر دیکھ لیا۔ اس وقت اس نے اپنے بال کٹوائے ہوئے تھے اور کلیں شیو تھا کیونکہ یہ لالہ نامک چند کی لڑکی سے شادی کرنے سے پہلے اپنا طبع تبدیل کرنے کے خیال سے سکھ انیم کو جواب دے چکا تھا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب اس کو پہچان لیا تو انھوں نے فدا پولیس کو اطلاع دی کہ یہ امریکہ سنگھ قتل کے مقدمہ میں مفروضہ ہے۔ اس اطلاع پر پولیس نے امریکہ سنگھ کو گرفتار کر کے کوثرانی بھیج دیا۔ جہاں اسے حوالات میں بند کیا گیا اور تحقیقات شروع ہوئی، اس تحقیقات

کے سلسلہ میں امریکہ سنگھ کا بیان تو یہ تھا کہ یہ امریکہ سنگھ نہیں، اس کا نام امر سرورپ ہے۔ چنانچہ اس کے بیان پر پولیس کے افسروں کو بھی یہ خیال ہوا کہ یہ گرفتاری غلط شخص کی جوتی ہے مگر سردار راجندر سنگھ نے یہ یقین دلایا اور تحریری بیان دیا کہ یہ شخص فی الحقیقت امریکہ سنگھ ہے جس نے ان کی رشتہ دار لڑکی سے شادی کی تھی اور جو اپنے خسر کو قتل کرنے کے بعد مفرور ہو گیا تھا۔ چنانچہ تحقیقات کے سلسلہ میں یہ واقعہ بے حد چسپ ہے کہ جب سردار راجندر سنگھ اس کی شناخت کے لئے کورتالی میں گئے تو یہ خاموش رہا مگر سردار راجندر سنگھ اس کی آواز کو سن نہ سکیں اور مزید تصدیق نہ کر دیں۔ اس پر انسپکٹر پولیس نے امریکہ سنگھ کے منہ پر زور کے ساتھ پتھر مارا جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ چلائے اور آواز نکالے اور سردار راجندر سنگھ اس کی آواز کو بھی پہچان سکیں۔ چنانچہ اس پتھر سے اس کا منہ سرخ ہو گیا اور یہ چلا یا تو سردار راجندر سنگھ نے اس کی آواز کو بھی پہچان لیا۔ اس ابتدائی تحقیقات کے بعد امریکہ سنگھ مزید تحقیقات کے لئے انبالہ جیل میں بھیجا گیا تاکہ اس پر قتل کے جرم میں مقدمہ چلایا جاسکے۔ انبالہ جیل میں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک قیدی رجسٹر میں رجسٹر میں کام کرتا تھا کے ساتھ سازش کر کے اس رجسٹر کے ادنیٰ ضائع کرائے جن پر اس کے انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات اس وقت لگائے گئے تھے جبکہ یہ قتل کے بعد فوراً موقع پر گرفتار کر کے انبالہ جیل میں بھیجا گیا تھا۔ اور اب انبالہ پہنچنے کے بعد اس کا ڈیفنس یہ تھا کہ یہ امریکہ سنگھ نہیں، اس کا نام امر سرورپ ہے اور یہ غلطی سے گرفتار کیا گیا ہے، پولیس نے اس کی شناخت کے سلسلہ میں جب مختلف ثبوت جمع کیے تو یہ چلا کہ جیل کے رجسٹر میں سے وہ ادنیٰ ضائع ہیں جن پر اس کے انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات تھے جن سے کہ اس کا امریکہ سنگھ ہونا بلا شک و شبہ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ یہ نشانات اس کی گرفتاری کے فوراً بعد حاصل کیے گئے تھے۔ جب یہ ادنیٰ رجسٹر میں موجود نہ تھے تو نہ صرف پولیس کے لئے ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی بلکہ جیل کے وہ سرکاری ملازم بھی لیٹ میں آگئے جو ان رجسٹروں کو محفوظ رکھنے کے فوجدار تھے۔ چنانچہ اس غفلت شعاری کے قصور میں جیل کے ایک انسٹرکٹ منرادی گئی۔

امریکہ سنگھ پر قتل کا مقدمہ چلا۔ ابتدائی کارروائیوں کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر بھنوت کی عدالت میں ہوئی اور ملازم سیٹھن سپرد ہوا۔ سیٹھن جج نے اس شخص کو پھانسی کی سزا دی اور ہائیکورٹ میں اس نے اپیل کی تو یہ مقدمہ دو جج مسٹر فالٹا اور مسٹر دولت کی عدالت میں پیش ہوا۔ کئی روز اس مقدمہ میں بحث ہوتی رہی اور طویل بحث سننے کے بعد ہائی کورٹ کے ان ججوں نے امریکہ سنگھ کو قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا دی۔

سردار راجندر سنگھ نے جب مجھے یہ حالات سنائے تو اس وقت تک ہائی کورٹ نے فیصلہ نہ سنایا تھا اور وکیلوں کی بحث جاری تھی۔ چنانچہ راجندر سنگھ جی نے حالات سناتے ہوئے امریکہ سنگھ کا ایک فوٹو بھی مجھے دکھایا جو اس کے سکھ ہونے کے زمانہ کا تھا۔ اس فوٹو کو دیکھ کر مجھے فوراً یاد آ گیا کہ یہ شخص سنگھ نامی ایک شخص تھا جو میں جب کہ ہفت روزہ "مجلہ گڑھی" میں تھا، مجھ سے ایک دوسرے شخص کے ساتھ بیٹنے کے لئے آیا تھا مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ اس کی یہ ملاقات ملازمت حاصل کرنے کے سلسلہ

میں تھی یا کسی دوسری غرض سے۔ بہر حال مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ یہ شخص اس زمانہ میں میرے پاس آیا تھا۔

ہائی کورٹ کے جج نے امریکہ سنگھ کو قتل کے مقدمہ میں عمر قید کی سزا دی مگر اس شخص نے جس بے رحمی کے ساتھ معزز گھرانہ کی کئی شریف خواتین کو تباہ کیا۔ اس تباہی کو دیکھا جائے تو اس کو ایک بار نہیں، اگر ممکن ہوتا تو کئی بار بھانسی کی سزا ملنی چاہیے تھی اور اب اس جراثیم پیشہ شخص کو شاید اپنے آئندہ جنم میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے کیونکہ ایڈیٹر ”ریاست“ کا عقیدہ ہے کہ گناہوں کی سزا نہ صرف اس جنم میں بلکہ آئندہ جنم میں بھی ملتی ہے۔ اور یہ واقعہ اُن والدین کے لئے آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیے جو بغیر اچھی طرح سے چھان بین کئے اپنے بچوں کی شادیاں صرف خط و کتابت کے ذریعہ طے کر دیتے ہیں۔

## جیل کا ”پاگل پن“

ایڈیٹر ”ریاست“ جب سے دہلی میں ہے اور اُس نے جب سے اخبار ”ریاست“ جاری کیا اور اس عرصہ میں دہلی میں اس کو جن ایک درجن کے قریب بلند ترین۔ دیانت دار ترین اور صنعت دار ترین لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ان میں دو شخصیتیں بہت اہم ہیں۔ ایک ڈا. اچاری ایڈیٹر ”نظام المشائخ“ اور دوسرے بھتیاشی احسان الحق رئیس اعظم میرٹھ (یہ دونوں شخصیتیں تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں دہلی سے کراچی چلی گئیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے چلے جانے کے بعد میں دہلی کے دوستوں میں بہت ہی کمی محسوس کرتا ہوں اور جب بھی ان کا خط آتا ہے یا ان کے متعلق کوئی اطلاع پہنچتی ہے تو جذباتی اور محبت کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے اسنو اُس سے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

ڈا. اچاری صاحب کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی مرتضیٰ صاحب ہیں۔ جن کو خیالات کے اعتبار سے ڈا. اچاری صاحب کی بالکل ضد کہنا چاہئے۔ مگر چونکہ یہ ڈا. اچاری صاحب کے بھائی تھے۔ اس لئے جس طرح ڈا. اچاری صاحب نے سوداگر شینہ گرد صاحب کی اولاد دہرنے کے باعث عزت و احترام کے خیال سے ڈا. اچاری صاحب کے کسی درگاہ کا مجاز و نسل کے لحاظ سے سید ہونے کے باعث شاہ صاحب کہلاتا ہے ڈا. اچاری صاحب کے دوست بھی ان مرتضیٰ صاحب کا ہمیشہ خیال کرتے۔ کیونکہ آخر وہ ڈا. اچاری صاحب کے بھائی ہیں۔ یہ مرتضیٰ صاحب پہلی جنگ سے پہلے اٹلی سے شینے کے بنے ہوئے گلے کے دار۔ سوتی یا چوڑیاں وغیرہ منگاتے اور کاروبار کرتے۔ یہ اٹلی سے مل منگایا کرتے تھے کہ دفعتاً اعلان جنگ ہو گیا اور اٹلی انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گیا۔ اس اعلان جنگ سے پہلے کا لکھا اٹلی کا ایک خط مرتضیٰ صاحب کو اعلان جنگ کے بعد ملا کہ وہ ان فرخوں پر مال منگا سکتے ہیں۔ مرتضیٰ صاحب کو یہ خیال نہ رہا کہ اعلان جنگ کے بعد دشمن ملک کے کسی فرد سے خط و کتابت کرنا قانوناً جرم ہے۔ آپ نے اس خط کا جواب اٹلی کی اس فرم کو دیا کہ آپ فلاں فلاں مال بھیج دیجئے ہم رد یہ مال پہنچنے پر ادا کر دیں گے۔ یہ خط جب دہلی سے پوسٹ ہوا تو ڈاکخانہ والوں نے

اے سی۔ آئی۔ ڈی کے پاس بھجوا دیا۔ سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے اُسے چیف سنسر بمبئی کے پاس بھیجا اور وہاں جب اُسے پڑھا گیا تو چیف سنسر نے دہلی گورنمنٹ کو ہدایت کی کہ خط لکھنے والے کے خلاف دشمن ملک کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے سنگین جرم میں فوجداری مقدمہ چلایا جائے جس کی مناسبات برس قید سخت تھی۔ دہلی گورنمنٹ نے اس ہدایت کے ساتھ خط لکھنے والے پر مقدمہ چلایا جائے یہ خط ڈسٹرکٹ جج ٹریٹ کو بھیجا۔ پولیس نے مقدمہ رجسٹر کیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ عدالت نے مرتضیٰ صاحب کے وارنٹ پلا ضمانت جاری کیے اور مرتضیٰ صاحب گرفتار کیے جا کر دہلی جیل میں لائے گئے۔

مرتضیٰ صاحب جب دہلی جیل میں آئے تو میں اس سے پہلے دہلی جیل میں تھا۔ اور چونکہ واحدی صاحب میرنپل کشنر اور معزز خاندان میں سے تھے اور یہ واحدی صاحب کے حقیقی بھائی تھے آپ کو جی کلاس دی گئی اور یہ اس کمرہ میں ہی لائے گئے جہاں میں اور دو اور پرچن پہلے موجود تھے۔ یعنی اب اس کمرہ میں ہم چار ہو گئے۔ یہ دونوں پرچن تو پر دیسی تھے۔ ایک لاہور کے اینگلو انڈین اور دوسرے بمبئی کے رہنے والے سٹرناس جو ارمینیا کے رہنے والے تھے اور جاسوسی کے الزام میں گرفتار تھے۔ میرا کھانا گھر سے آیا کرتا تھا۔ میں نے گھر میں ہدایت کر دی تھی کہ تین آدمیوں کے لئے کھانا آبا کرے رہیں اس زمانہ میں انگریزی کھانا کھایا کرتا تھا، ہم تینوں اکٹھے کھانا کھایا کرتے۔ مرتضیٰ صاحب کا کھانا بھی ٹفن کیریر میں گھر سے آجایا کرتا اور ہاراکپ بازی میں وقت صرف ہوتا۔

مرتضیٰ صاحب دہلی کے رہنے والے نازک مزاج شخصیت تھے۔ دل کے کمزور۔ کبھی جیل کا دروازہ تک نہ دیکھا اور نہ زندگی میں کبھی بیوی بچوں سے جدا ہوئے۔ میں تو گپ بازی اور کتابیں پڑھنے میں اپنا وقت صرف کرتا اور صبح تو یہ ہے کہ میں نے جیل اور اپنے گھر میں کبھی بھی فرق محسوس نہیں کیا یعنی جیسا گھر میں خوش رہتا ہوں ویسا ہی جیل میں۔ بلکہ جیل میں مجھے یہ بھی فائدہ رہا کہ وہاں قرض خواہ تنگ نہ کر سکتے تھے۔ مگر مرتضیٰ صاحب اُداس پڑے رہتے۔ یا دل کی گھبراہٹ کی شکایت کرتے اور رات کو بیوی بچوں کی یاد میں روتے۔ مرتضیٰ صاحب جب کبھی بات کرتے تو یہی مقدمہ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کتنی سزا ہوگی۔ کیا کوئی صورت مقدمہ میں بری ہوئے گی ہے۔ یعنی یہ مجھے جو تنگی اور دکیل سمجھتے ہوئے مجھ سے ہر وقت مقدمہ کے متعلق پوچھتے کیونکہ بچاؤوں کو اپنے مستقبل کے متعلق بے حد تشویش تھی۔ ان کو جیل میں آئے چند ہفتہ ہوئے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ بچاؤ جیل میں رہنے کے لئے فٹ نہیں ہیں اور اگر یہ زیادہ عرصہ رہے تو اپنی صحت بھی تباہ کر لیں گے۔ میں نے سوچنے کے بعد ایک دلچسپ سکیم تیار کی اور ان سے کہا کہ اگر میری رائے پر آپ عمل کریں تو جیل سے رہا ہو سکتے ہیں۔ میں نے ان کو سکیم بتائی اور یہ اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

رات کو دوبارے کے قریب میں نے مرتضیٰ صاحب سے کہا۔ کہ وہ ”اوٹ پٹانگ“ باتیں شروع کر دیں اور چلا جائیں۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ تو میں نے پہرہ والے کو آواز دی کہ مرتضیٰ صاحب سخت بیمار ہیں فوراً ڈاکٹر کو بلا یا جائے۔ پہرہ والا جیل کے دروازہ پر گیا وہاں سے سپاہی ڈاکٹر کے کمرے میں گیا۔ ڈاکٹر صاحب صوبہ تھے۔ ان کو جھکا گیا اور وہ تشریف لائے تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ

مرقضى صاحب کے دماغ پر اثر ہے۔ یہ پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی چھت کی طرف دیکھتے ہیں کبھی دروازہ کی طرف اور انھوں نے مجھے گالیاں بھی دی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی سیٹھ سکوپ کے ساتھ دل دیکھا اور کہا کہ نبض اور دل تو ٹھیک حالت میں ہیں دماغ پر شاید اثر ہو۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ وہ ابھی دوائی بھیجتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دیکھ کر چلے گئے اور انھوں نے تین خوراک دوائی کی اس ہدایت کے ساتھ بھی کہ تین تین گھنٹے کے بعد ایک ایک خوراک پلائی جائے۔

دوائی جب آئی تو اس میں سے ایک خوراک میں نے پھینک دی اور صبح ہوتے ہی باقی کی دو خوراکیں بھی پھینک دی گئیں۔ صبح آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب پھر تشریف لائے تو میں نے بتایا کہ دوائی پینے کے بعد مریض کو کچھ شکون سا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مرقضى صاحب کو دیکھا تو مرقضى صاحب میری ہدایت کے مطابق پھر چھت کی طرف عور کے ساتھ دیکھتے رہے جیسا کہ پاگل دیکھا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے دیکھنے کے بعد بتایا کہ ان کے دماغ پر اثر ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ہم تو کئی بار جیل آئے اور جیل اور گھر میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے مگر یہ پچارے جیل کے قابل نہ تھے۔ خدا نے مصیبت کے دن دکھائے اس لئے جیل کی فضا کا ان کے دماغ پر اثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور چلے گئے۔ جانے کے بعد ان کا کمپونڈر اس ہدایت کے ساتھ دوائی کی تین خوراکیں اور دے گیا کہ یہ دوائی چار چار گھنٹے کے بعد پلائی جائے۔ میں مرقضى صاحب کے زس کے فرائض انجم دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ دوائی وقت پر پلا دوں گا۔ کمپونڈر صاحب چلے گئے تو میں نے غیثی میں سے ایک خوراک پھینک دی اور اس طرح ہی چار چار گھنٹے کے بعد ایک ایک خوراک زمین پر پھینکنا رہا۔ تاکہ نہ معلوم ڈاکٹر صاحب کب اچانک آجائیں اور وقت پر دوائی نہ دینے کا مجھ پر الزام لگایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب شام کو دیکھنے کے لئے پھر تشریف لائے مرقضى صاحب نے میری ہدایت کے مطابق اسی طرح ہی چھت کی طرف اور ادھر ادھر خور سے دیکھنے کا ایکٹ کیا۔ میں نے کہا کہ بیمار کو پہلے سے کچھ شکون ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمدردی کا اظہار کیا اور دوائی بھیجے کا وعدہ کر کے آپ تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دوائی آگئی۔ اور اس میں سے ایک خوراک ضائع کر دی گئی۔

رات کو اڑھائی بجے مرقضى صاحب نے میری ہدایت کے مطابق پھر شور پیدا کیا۔ میں نے پہرہ دا لے کر آواز دی وہ جیل کے دروازہ پر گیا اور ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے پر میں نے کہا کہ رات کو ایک بجے تک تو کافی شکون رہا مگر اس کے بعد پھر دورہ پڑا ہے اور کمرہ کے برآمدہ میں انھوں نے بھاگنا شروع کیا ہے اور مجھے گالیاں دی ہیں۔ ڈاکٹر نے پھر دیکھا اور کہا کہ صرف دماغ پر اثر ہے ویسے دل اور نبض درست حالت میں ہیں۔ میں نے شکایت کی کہ مجھے نہ بچھلی رات سونا نصیب ہوا نہ اس رات۔ ڈاکٹر نے بھی شکوہ کیا کہ ان کے آرام میں بھی خلل آتا ہوا ہے۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے اور میں نے کہا کہ ان کو دوائی میں برومائیڈ دی جائے تاکہ سکون ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ برومائیڈ ہی دے رہے ہیں اور اس برومائیڈ کے اثر سے ہی ان کو شکون ہوتا ہے اور یہ سو جاتے ہیں۔ میں نے تنوین کے بچوں کو کہا کہ مجھے تو یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ پچارے

کہیں اپنے دماغی توازن سے ہمیشہ کے لئے ہی محروم نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کل سول سرجن کو دکھائیں گے۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب کرنل شاہ دوجا غالباً آج کل پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز ہیں) تشریف لائے۔ ان کے آنے سے پہلے میں نے مرتضیٰ صاحب سے کہا کہ وہ اپنی قیض کا گریبان پھاڑ دیں تاکہ زیادہ پاگل قرار دیئے جاسکیں۔ مرتضیٰ صاحب فطرتاً ہی حد بخوش تھے۔ فرمانے لگے کہ یہ قیض نئی ہے۔ یہ سن کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور کہا کہ پروا منت کرو جیل سے رہائی کے لئے یہ قربانی کر دینی چاہیئے۔ مرتضیٰ صاحب نے دل پر جبر کر کے قیض کا گریبان چاک کر دیا اور میں نے ہدایت کر دی کہ جب سول سرجن آئے تو زیادہ پاگلوں کی سی باتیں کریں۔ سول سرجن صاحب جب تشریف لائے تو ان کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل اور جیل کے ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ مرتضیٰ صاحب مسلسل چھت کی طرف دیکھتے رہے اور منہ سے اس بہن کی گالیاں بکتے رہے۔ میں نے پچھلے تین دن کے تمام حالات سول سرجن کو بتائے اور خطرہ کا اظہار کیا۔ سول سرجن نے غور کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ دل اور رضخ تو درست ہے ہاں دماغ پر ضرور اثر ہے۔ میں نے سول سرجن اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ مریض کی اس حالت میں بہتر ہے کہ مریض کے گھر کے لوگوں یعنی واحدی صاحب وغیرہ کو اطلاع کر دی جائے تاکہ وہ بھی بیلد کو دیکھ جائیں۔ سول سرجن نے کہا کوئی ہرج تہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ وہ ابھی واحدی صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع کر دیں گے تاکہ وہ گریہ کر دیکھ جائیں۔ سول سرجن صاحب تشریف لے گئے اور انھوں نے رپورٹ کی کہ مرتضیٰ صاحب کے دماغ پر اثر ہے اور یہ خطرہ ہے کہ شاید پیاری زیادہ اثر کرے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے واحدی صاحب کو اطلاع دی کہ ان کا بھائی پاگل ہو گیا ہے اور وہ جیل میں آکر ان کو دیکھ جائیں۔ دو بجے کے قریب واحدی صاحب بہت ہی مغوم اور افسردہ حالت میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ہمارے کمرہ میں تشریف لائے۔ چونکہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی واحدی صاحب کے ساتھ تھے مرتضیٰ صاحب میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چھت کی طرف ہی غور سے دیکھتے رہے اور انھوں نے بھائی کی طرف بھی نہ دیکھا۔ واحدی صاحب کے ساتھ دہلی کے تحصیلدار مسٹر محمد حنین بھی تھے۔ جو واحدی صاحب کے گھر سے دوستوں میں سے تھے۔ واحدی صاحب نے جب اپنے بھائی کو گریبان چاک حالت میں چھت کی طرف لٹکا ہوا دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واحدی صاحب کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے واحدی صاحب پر بہت رحم آیا اور میں رہ نہ سکا۔ میں واحدی صاحب کو کمرہ سے باہر لے گیا اور ان سے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں یہ سب ایک ڈرامہ ہے تاکہ ان کو رہائی مل جائے۔ سول سرجن نے بھی رپورٹ کر دی ہے آپ سٹی مجسٹریٹ (سردار بہادر زیند رسنگھ) پر بھی اثرات استمال کیجئے جن کی عدالت میں مقدمہ ہے تاکہ رہائی ہو۔ واحدی صاحب نے جب میرے منہ سے یہ سنا تو وہ سن ہو کر دنگا ہو گئے اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہی پیدا ہو گئی۔ میں واحدی صاحب کے ساتھ کمرے میں آ گیا اور سب کے سامنے کہا کہ یہ خطرہ ہے کہ دماغ پر جو اثر ہے یہ مستقل صورت اختیار نہ کر جائے۔ کوئی محنت نہ کرنی چاہئے کہ مرتضیٰ صاحب کو

جیل سے نکالا جائے۔ اس بات چیت کے بعد تمام لوگ چلے گئے۔  
 اس واقعہ کے چار روز بعد مرتضیٰ صاحب کی بیٹی تھی۔ یہ گریبان چاک حالت میں ہی پاگلوں کی  
 طرح دیکھتے ہوئے عدالت میں لائے گئے۔ مجسٹریٹ کو پہلے ہی ان کی دماغی حالت کا علم ہو چکا تھا۔ مقدمہ  
 پیش ہوا تو مجسٹریٹ نے عدالت برخاست قید کی سزا دی۔ مرتضیٰ صاحب جیل میں بیچ بھیت چلایا کرتے  
 تھے عدالت میں بھی یہ بیچ چلاتے رہے تاکہ خدائے شام کے چار بجے تک خوش رہے اور اس عرصہ کے درمیان  
 میں کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ شام کو چار بجے جب عدالت برخاست ہوئی تو مرتضیٰ صاحب چند گھنٹہ  
 کی قید کاٹ کر گھر پہنچ گئے۔

## ریاست اور جسٹس سر ڈگلس نینگ

مجھ پر نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اور یہ مقدمہ دہلی کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر سردار زیندہ سنگھ  
 درجہ آجکل غالباً پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں اکی عدالت میں تھا۔ اس مقدمہ کی پیروی سرکار کی  
 طرف سے رائے بہادر گرگ پال داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی۔ دہلی رساین ڈپٹی انسپکٹر جنرل  
 پولیس ریاست جے پور کر رہے تھے اور میری طرف سے دہلی کے ایڈوکیٹ مسٹر برج بہاری توکلی اور اجیر کے  
 بیرسٹر سردار بہادر بھگوان سنگھ تھے۔ بین ضمانت پر تھا اور اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک روز مجھے ٹیلیفون آیا  
 ٹیلی فون کرنے والے نے کہا کہ وہ خواجہ مجید بھل رہے ہیں۔ اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ  
 آپ تشریف لے آئیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ دفتر ریاست میں ملنا نہیں چاہتے۔ میں نے جواب دیا کہ  
 اگر آپ یہاں نہیں آسکتے تو میں بھی کسی دوسری جگہ نہیں جاسکتا۔ کیونکہ ضرورت آپ کو مجھ سے ملنے کی ہے۔ مجھے آپ سے  
 ملنے کی نہیں۔ میں نے یہ کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون بند کیے ایک منٹ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بھی میں نے رسید رکھٹھایا۔ تو دہلی کے ٹیکسٹ ڈار  
 راجہ اکبر علی خاں راجہ اکبر علی خاں ان خالص لوگوں میں سے تھے۔ جن کو مادر وطن ہر روز پیدا نہیں کرتی۔  
 بے حد فیاض۔ بہت بڑے ہاں نواز۔ جن کے ہاں ہر وقت دس پندرہ بیس ہاں موجود۔ بے تکلف قسم کے  
 پنجابی۔ دوسروں کے کام آنے والے اور لاکھوں روپیہ سالانہ آمدنی رکھتے ہوئے بھی عجز و انکساری کا مجسمہ  
 تھے۔ انھوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے پنجابی زبان میں کہا۔

”ابھی جو ٹیلی فون تمھیں کیا گیا یہ خواجہ مجید کی طرف سے تھا۔ یہ خواجہ مجید لاہور کے خواجہ وزیر احمد  
 بیرسٹر کے حقیقی ماموں اور پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس نینگ کے گھر سے درست ہیں میں نے  
 ان کو بتایا تھا کہ تم پر کیونکر نوٹوں کا جھڑا مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ تمام حالات دریافت کرنا چاہتے تھے مگر یہ جسٹس  
 سر ڈگلس نینگ کو بتا سکیں مگر تم عجیب شخص ہو کہ جتنے سے ہی انکار کر دیا۔“

راجہ اکبر علی خاں کا یہ ارشاد سن کر میں بے حد نادام ہوا اور میں نے کہا کہ خواجہ صاحب نے صرف  
 خواجہ مجید کہا مجھے کیا علم تھا کہ خواجہ مجید کون ہیں۔ میں نے سمجھا کہ کوئی اور شخص ملنا چاہتا ہوگا۔ میرے لئے

یہ ممکن نہیں کہ میں ہر شخص سے دفتر سے باہر جا کر ملاقات کروں۔ اس لئے میں نے لٹنے سے انکار کر دیا۔ آپ جہاں فرمائیے میں حاضر ہو جاؤں۔

راجہ اکبر علی خاں نے خواجہ مجید سے بات کی اور فیصلہ ہوا کہ میں اگلے روز دس بجے مرحوم حکیم اجل خاں صاحب کے مکان پر شریف منزل بی ماراں پہنچ جاؤں کیونکہ مرحوم حکیم صاحب کے صاحبزادہ حکیم جمیل احمد خاں ان کے دوست ہیں۔

میں اگلے روز صبح دس بجے حکیم جمیل احمد خاں صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ خواجہ مجید میرا انتظار کر رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد اہم شروعات ہوئیں۔ میں نے مقدمہ کے تمام حالات بتائے تو خواجہ صاحب نے کہا آپ چند روز کے بعد جسٹس سر ڈگلس نینگ کے ساتھ سیر کے لئے کشمیر جا رہے ہیں اور آپ وہاں چیف جسٹس سے اس مقدمہ کے متعلق تمام حالات بیان کریں گے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ میں اس میں یقین نہیں رکھتا کہ آپ جب کشمیر جائیں گے تو سر ڈگلس سے ذکر کریں گے۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی گاؤں میں جا رہا ہو اور اس سے کہہ دیا جائے کہ جاتے جاتے ایک دوسرے گاؤں میں پیغام پہنچا دینا یعنی اگر وہ اس دوسرے گاؤں نہ جاتے تو پیغام کا پہنچنا غیر ممکن۔ اگر آپ کہہ سکتے ہیں تو یہ کیجئے کہ میں جسٹس سر ڈگلس نینگ سے خود بل لوں اور اپنے تمام حالات بتاؤں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ بہت اچھا وہ کریش کریں گے۔

جسٹس سر ڈگلس نینگ اُس زمانہ میں ایڈیٹر ”ریاست“ کے ہیڈ کوارٹر میں سے تھے کیونکہ ایک بار آپ نے مقدمات کو جلدی ختم کرنے کے خیال سے ایک دن میں قتل کے پانچ چھ مقدمات کی اپیلوں کے فیصلے کئے تو ایڈیٹر ”ریاست“ نے آپ کی اس جلد بازی پر تنقید کرتے ہوئے ”ریاست“ میں ایک نوٹ لکھا تھا کہ یہ فیصلے ہائی کورٹ نے کئے ہیں یا کہ عدالت خفیہ نے کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک روز میں قتل کے پانچ چھ مقدمات کی سماعت اچھی طرح ہو سکے۔ اس نوٹ کا ترجمہ دہلی گورنمنٹ نے جسٹس سر ڈگلس کو بھیجا تو سر ڈگلس کا ارادہ ہوا کہ وہ تو بین عدالت کے جرم میں ایڈیٹر ”ریاست“ پر مقدمہ کریں۔ مگر چونکہ ان کے اپنے صوبہ میں ان کی اپنی ذات پر تنقید تھی اور ان کو لوگوں نے بتا دیا کہ وہ ان سنگھ مقدمہ لڑے گا۔ یہ معافی نہ چاہے گا۔ معاملہ دھڑکنے لگا اور تو بین عدالت کا یہ مقدمہ شاید کسی دوسرے صوبہ کے ہائی کورٹ میں تبدیل ہو جائے تو آپ نے ایڈیٹر ”ریاست“ پر تو بین عدالت کے جرم میں مقدمہ کرنے کا خیال بدل دیا تھا مگر دہلی و پنجاب کی عدالتوں کے اشتہارات حاصل کرنے والی فہرست (جس کی منظوری ہائی کورٹ دیتا تھا) میں سے ”ریاست“ کا نام نکال دیا جس کے نتیجے کے طور پر ”ریاست“ کو غالباً ایک ہزار روپیہ ماہوار کے اشتہارات کی آمدنی کا نقصان ہوا۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے خواجہ مجید کو یہ بھی بتا دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ تھوڑا عرصہ ہوا ایڈیٹر ”ریاست“ نے گورنمنٹ ہند کے لائبریریر محمد ظفر احمد خاں کو یہ تمام حالات بتا دیے ہیں اور سر ڈگلس کے رویہ کی شکایت بھی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ایڈیٹر ”ریاست“ نے محسوس کیا کہ دہلی گورنمنٹ اس کے خلاف ہے اور اس مخالفت کا یہاں کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر سردار زیندہ سنگھ پر بھی اثر معلوم ہوتا ہے اور ادھر سر ڈگلس نینگ کی مخالفت کے باعث پنجاب ہائی کورٹ سے بھی انصاف کی کوئی



توقع نہیں تھا ایڈیٹر "ریاست" شملہ جا کر گورنمنٹ ہند کے لائبریری سر محمد ظفر اللہ خاں جن کے ماتحت ہندوستان کے تمام لائبریری تھے اور جوائنٹر "ریاست" کے دیرینہ کمرے تھے، کو تمام حالات بتا کر چاہا کہ ایڈیٹر "ریاست" کا مقدمہ کسی دوسرے صوبہ میں بھیجا جائے اور جو دھری صاحب سوچ رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

میں خواجہ حمید کو تمام باتیں بتا کر واپس اپنے دفتر آ گیا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ خواجہ صاحب کچھ نہ کر سکیں گے کیونکہ سر ڈگلس میرے خلاف فیصلہ میں سے ہیں اور ان پر خواجہ حمید کے کہنے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ چنانچہ میں پھر بھی اس کوشش میں رہا کہ میرا یہ مقدمہ کسی دوسرے صوبہ کے ہائی کورٹ کے ماتحت چلا جائے۔

میں اس زمانہ کا روبرو وغیرہ کے سلسلہ میں ہینہ میں ایک آدھ بار لاہور جایا کرتا تھا۔ اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد لاہور گیا اور خواجہ حمید احمد صاحب میر سٹر (خواجہ حمید کے حقیقی بھانجے) کو میرے لاہور آنے کا علم ہوا تو انہوں نے سٹر غلام نبی بٹ (فلم ایکٹر) کی معرفت مجھے پیغام بھیجا کہ میں ان سے مل لوں۔ یہ پیغام مجھے امپریل ہوٹل میں ملا اور میں اگلے روز خواجہ صاحب سے ملنے کے لئے ان کے دفتر میں لائبریری کورٹ خواجہ صاحب اس زمانہ میں ہائی کورٹ کے رسیدہ تھے اور ان کا دفتر بھی ہائی کورٹ میں تھا آ گیا۔ خواجہ صاحب سے ملا تو آپ نے فرمایا کہ خواجہ حمید کی مقدمہ کے متعلق سر ڈگلس نینگ سے تفصیل کے ساتھ باتیں ہوئی تھیں۔ سر ڈگلس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور میں صبح ساڑھے آٹھ بجے خواجہ صاحب کی کوٹھی پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں اگلے روز صبح آٹھ بجے ٹیکسی پر خواجہ صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا۔ خواجہ صاحب کے ارشاد کے مطابق میں نے ٹیکسی کو واپس کر دیا تاکہ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی علم نہ ہو کہ میں کہاں گیا۔ خواجہ صاحب مجھے اپنی کار میں لیکر جسٹس سر ڈگلس کی کوٹھی پہنچے۔ کوٹھی پر پہنچنے کے بعد خواجہ صاحب تو کوٹھی کے ڈائیننگ روم میں چلے گئے۔ جہاں سر ڈگلس ہریک فاسٹ کھا رہے تھے۔ میں برآمدہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے برآمدہ میں بیٹھے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ خواجہ صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ صاحب دفتر کے کمرہ میں آگئے ہیں اور میں ان کے ساتھ چلوں۔ میں ان کے ساتھ گیا۔ دفتر کے کمرے میں داخل ہوا تو خواجہ صاحب نے چاہا کہ ایڈیٹسٹ کے مطابق وہ خود کمرہ سے باہر چلے جائیں تاکہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں آزادی کے ساتھ تنہائی میں کہہ سکوں مگر جسٹس سر ڈگلس نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ بھی بیٹھ جائیے چنانچہ میں اور خواجہ صاحب دونوں بیٹھ گئے اور چیف جسٹس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں کہا: "ویل سر دار صاحب۔ وٹ آئی کیمن ڈوفاریو" یعنی میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ دیہ انگریزوں کا ایڈیٹسٹ ہے کہ وہ بات شروع کرتے وقت اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) میں نے جواب دیا میں آپ سے سوائے انصاف کے کچھ نہیں چاہتا اگر آپ کر سکتے ہیں تو انصاف کیجئے۔ میں نے مقدمہ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بتائے۔ دہلی گورنمنٹ۔ رائے صاحب گوپال داس اور سردار بہادر زیند رسنگھ سٹی مجسٹریٹ کی پوزیشن بیان کی اور وہ فہرست ان کے سامنے رکھی جو میرے مقدمات کے متعلق چھی ہوئی تھی اور جس میں تفصیل کے

ساتھ بتایا گیا ہے کہ کون کون سا مقدمہ کب شروع ہوا کس وجہ کے مطابق چلایا گیا۔ کس والے ریسٹ نے چلایا بدستغیث کون تھا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا وغیرہ جسٹس سرڈگلز نے جب یہ فہرست پڑھی تو وہ پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھنے لگے اور پوچھا کہ ”آپ پر چودہ مقدمات چلائے گئے“ میں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے پھر فہرست کو پڑھنا شروع کیا۔ فہرست پڑھنے کے بعد پھر مجھے دیکھا اور کہا کہ ”آپ تمام مقدمات میں بری ہوئے“ میں نے کہا۔ ”ہاں سوائے ایک پرنس پر ڈیلیکشن ایکٹ کے مقدمہ کے جس میں مجھے ہوشنگ آباد میں تین ماہ قید ہوئی“ یہ سن کر آپ نے کہا کہ ”وہ مقدمہ تو پرنسٹن تھا یعنی ایک معصوم بچے کے جرم میں“ میں نے کہا ہاں۔ یہ سب پڑھنے اور سننے کے بعد آپ نے کہا۔

”میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس پر مختلف نوعیت کے چودہ انگلیں مقدمات چلائے گئے ہوں اور وہ تمام میں باعزت بری ہوا ہو۔ مذکر فل۔“

یہ کہہ کر آپ پھر میری طرف دیکھنے لگ گئے اور ہوں۔ ہوں۔ مذکر فل۔ مذکر فل کہتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے گھڑی کی طرف دیکھا (انگریز نے جب تلے والے سے یہ کہنا ہو کہ اب آپ چلے جائے تو وہ گھڑی کی طرف دیکھا کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اب چائے) تو میں نے اجازت چاہی۔ آپ نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مذکر فل۔ سرور صاحب میں آپ سے بل کر بہت خوش ہوا“ میں رخصت ہو کر خراجہ صاحب کی کار میں آ بیٹھا۔ میرے کار میں آنے کے تین چار منٹ بعد خراجہ صاحب بھی آئے تو آپ نے فرمایا کہ میرے آنے کے بعد چیف جسٹس نے کہا کہ:-

”میں اس شخص سے بل کر بہت خوش ہوا۔ اس سے کہہ دینا کہ جب کبھی بھی وہ لاہور آئے تو

مجھ سے مل کرے۔ میں نے ایسا بارہا وہ شخص زندگی میں نہیں دیکھا جس پر نوابوں اور جہازوں نے چودہ مقدمات چلائے اور ان سب کا اس نے معاف بلکہ کیا۔ اس کے ساتھ ضرور انصاف ہوگا“

خراجہ صاحب مجھے اپنی کار میں اپنی کوٹھی لائے وہاں سے میں نے ٹیکسی منگائی اور ہوٹل واپس آیا۔ اس کے بعد میرا مقدمہ ٹریبونل پر نیدرلینڈز کے جج جسٹس کی عدالت سے تبدیل کیا جا کر دیوان سکھانڈیٹنٹیل ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ گورکھ پور کی عدالت میں بھیجا گیا۔ دیوان سکھانڈیٹنٹیل اپنے ایک دوست سے تو مقدمہ کے دنوں میں کہا کہ اس مقدمہ میں بھی دیوان سکھ کر بری ہونا چاہیے مگر آپ نے سات برس قید سخت کی سزا دی۔ ہائی کورٹ میں اس کی اپیل کی گئی تو مقدمہ کی ساعت جسٹس سرڈگلز کی عدالت میں ہوئی اور جسٹس سرڈگلز نے عدالت میں نہ صرف وہی کی پولیس بلکہ تخت عدالت کے خلاف بھی سخت الفاظ استعمال کیے اور ایڈیٹر ریاست کو باعزت بری کیا۔ اس مقدمہ کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ میں یہاں بری ہوا تو سزا دینے والے دیوان سکھانڈیٹنٹیل ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ (ججیرے) دست اور شہر رخصت و ڈرامہ نویس دیوان شرر کے حقیقی بھائی ہیں، نے مجھے مبارکباد کا پیغام بھیجا اور اب پچھلے سال وہ ایک شادی کی تقریب کے سلسلہ میں دہلی میں تھے تو آپ نے انہار محبت کرتے ہوئے ان کے ساتھ ملایا اور انکلیج کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے جس پر میں نے کہا کہ دیوان صاحب میرے تمام مقدمات کا فیصلہ کر نیوالے تمام ججسٹریٹ ہی فیصلہ کے بعد سزا دے رہے ہیں اور آپ کو ہی میں اپنا دوست ہی سمجھتا ہوں کیونکہ آپ سزا دے دیوان شرر کے بھائی ہیں، آپ نے کچھ کیا مجھے علم ہے کہ آپ حالات کو سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی خواہش کے خلاف فیصلہ دینے والے بہت کم ججسٹریٹ ہو کر آتے تھے۔

آج جبکہ یہ دستور رکھ رہا ہوں کہ تو ہندوستان میں جسٹس سرڈگلز ننگ موجود ہیں نہ جسٹس سرڈگلز۔ عرصہ ہوا

جسٹس یگ ولایت چلے گئے اور جسٹس ہنز کا انتقال ہو گیا مگر جب کبھی ان دونوں کے انصاف کا خیال آتا ہے تو عزت و احترام کے جذبات کے ساتھ نگاہیں ٹھٹھک جاتی ہیں اور خواجہ مجید اور خواجہ نذیر احمد کو تو بیس ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے حقیقی بھائی۔ اور ابھی دو برس ہوئے خواجہ نذیر احمد وہی آئے اور ملے تو ان کو دیکھ کر خوشی اور محبت کے طغیانیوں میں آسو بھر آئے اور سوچا کہ ہندوستان کی تقسیم کے باعث میں کتنے اچھے بلند اور مخلص دوستوں سے محروم ہو گیا۔

## نوبل پرائز کے امیدوار مولانا ناصر بلباوی

ایڈیٹر ”ریاست“ زندگی کے ہر زمانہ میں ایک دو پاگلوں سے دوستانہ تعلقات رکھتا رہا۔ کیونکہ پاگلوں (بشرطیکہ ان کے دماغ میں دس پندرہ یا بیس فی صدی سے زیادہ پاگل پن نہ ہو اور یہ اس بیماری میں بالکل ہی مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ زیادہ پاگل ہونے کی صورت میں ان سے بات چیت کرنے میں کوئی کٹھن نہیں) کے ساتھ بات چیت کرنے میں بے حد لطف محسوس ہوتا ہے اور دن بھر کی کوفت چند منٹ میں ہی دور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر ”ریاست“ کا مولانا سمیع اللہ مولانا صاحب مرحوم مفتی کفایت اللہ کے داماد ہیں اور آپ دیسے تو اردو بازار میں کتابوں کی ایک مختصر سی دکان کرتے ہیں مگر آپ کی دکان علم و دوست اصحاب اور شعر کا ایک جنگل شیش ہے۔ اور شام کو آپ کے ہاں درجنوں شعرا۔ ادیب۔ ممبران پارلیمنٹ اور اہل ذوق جمع ہوا کرتے ہیں اور سرسبز جنت اور دوسرے چند دوستوں کے ساتھ یہ معاہدہ ہے کہ ان میں سے جس کسی کے پاس کوئی پاگل آئے تو وہ اس کو دوسرے دوستوں کے پاس بھی بھیجے اور اگر کسی کے پاس پہننے کے لئے جگہ نہ ہو تو اس کی رہائش کا انتظام دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں کر دیا جاتا ہے تاکہ شام کو تمام دوست اس کی صحبت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اور اس سلسلہ میں ہی سوامی پارس ناتھ اور مسٹر نیم چند نیتاجی وغیرہ اصحاب کئی کئی برس تک دفتر ”ریاست“ میں مقیم ہوئے۔

۱۹۵۳ء کے گرمیوں کے زمانہ میں ایک روز مولانا عبدالرزاق سلج آبادی تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ مولانا ناصر بلباوی بھی تھے۔ مولانا سلج آبادی نے تشریف لانے کے بعد تعارف کرایا۔ ”آپ مولانا ناصر بلباوی ہیں جو عربی زبان کے فاضل اجل شاعر ہیں۔ ایک کتاب ”حیات الہند“ لکھ رہے ہیں۔ جس میں ہندوستان کے تمام پھول اور سبزیوں کا عربی اشعار میں ذکر ہے۔“ اور ”آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ”ریاست“ ہیں۔“ اس تعارف کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ مولانا ناصر کے دماغ کی کچھ چولیس ڈھیلی ہیں اور آپ اپنی کتاب کو اہام کا درجہ دیتے ہیں۔ اور آپ کو یہ بہت بڑی شکایت ہے کہ ٹولنے ان کی اور ان کی کتاب کی قدر نہ کی۔ قدر ناشنائی کی اس شکایت کو سن کر ایڈیٹر ”ریاست“ نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ آپ کی کتاب نوبل پرائز کے مقابلہ کے لئے یورپ بھیجی جاسکتی ہے مولانا کو نوبل پرائز کا علم نہ تھا۔ ان کو بھیایا گیا کہ جو کتاب دنیا میں سب سے اچھی

ہر اُس کو نوبل پرائز کے فائدے سے دس لاکھ روپیہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔ مولانا یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اُس روز صرف یہی بات چیت ہوئی اور مولانا نے وعدہ فرمایا کہ آپ ہفتہ میں دو تین بار ضرور تشریف لایا کریں گے تاکہ نوبل پرائز حاصل کرنے کی کوشش جاری رہے۔ مولانا صراحتاً اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں بطور امام ملازم تھے۔ کھانا تو محلہ کے لوگوں کے ہاں کھاتے اور محلہ کے لوگ دوسرے اخراجات کے لئے آپ کو چندہ کے ذریعہ آٹھ دس روپیہ ماہوار جمع کر دیتے۔ اس مسجد میں آپ کو قیام فرماتے چند ماہ ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ آپ نے مسجد کی امامت چھوڑ دی ہے کیونکہ محلہ کے لوگ آپ کی قدر نہیں کرتے۔ ان سے کہا گیا کہ مسجد کی مالی صاف کرنا بھی ان کا فرض ہے۔ اور مولانا نے یہ ادائے کام کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا نے استغناء دے دیا ہے۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا اور آپ سے درخواست کی گئی کہ اگر آپ چاہیں تو دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں مستقل طور پر قیام کر سکتے ہیں مگر ایڈیٹر ریاست پر شکوک ہے۔ شاید آپ کو خیال ہو کہ مولوی کلاس آپ کا کسی غیر مسلم کے ہاں قیام کرنا پسند کرے۔ آپ نے مناسب نہ سمجھا اور آپ اپنا بسترہ اُس مسجد سے اٹھا کر ایک دوسری مسجد میں چلے گئے جہاں کا امام ان سے واقف تھا۔

چھ ماہ کے قریب نوبل پرائز کا سلسلہ جاری رہا کبھی کسی دوست نے یہ کہا کہ اس سال نوبل پرائز لگتی ہو چکا ہے اور کبھی یہ کہ عربی زبان کی کتاب کو نوبل پرائز نہیں مل سکتا۔ مولانا چھ ماہ تک نوبل پرائز کے دس لاکھ روپیہ کے منتظر رہے اور آپ دوسرے مولویوں سے کہتے رہے کہ غفریب آپ کو دس لاکھ روپیہ یورپ سے ملنے والا ہے۔ چھ ماہ کے بعد آپ جب کچھ مالوس سے ہوئے تو سکیم لیبار کی گئی کہ گورنمنٹ ہنسے اس کتاب کا انعام کم از کم ایک لاکھ روپیہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ٹیلیڈیاں شروع ہوئیں۔ دوستوں نے اس کی تائید کی اور مولانا نے ایک خط ہندوستان کے صدر مسٹر چندر پرشاد کے نام لکھا جس میں آپ کا ادعا تھا کہ ہندوستان کا نام روشن کرنے کے لئے آپ نے ایک کتاب ”حیات الہند“ لکھی ہے اور اس کتاب میں اُن تمام سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں کے نام ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان کی شہرت دُنیا کے تمام ممالک تک پہنچ جائے گی۔ مولانا نے جب یہ خط لکھا اور ایڈیٹر ”ریاست“ اور دوسرے دوستوں نے دیکھا تو اس خط کی بہت تعریف کی گئی اور یہ خط پوسٹ کرنے کے لئے رکھ لیا گیا اور مولانا سے کہا گیا کہ یہ خط رجسٹری کر دیا جائے گا آپ اس کی رسید مل لے جائیے۔ مولانا کے جانے کے بعد اس خط کو تو بھاڑ دیا گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا نفاذ لکھا گیا جس پر پتہ مسٹر چندر پرشاد معرفت اخبار ”ریاست“ دہلی تھا اور اس کے اندر ردی کا عقد کا ایک پرزہ رکھ دیا گیا۔ اور اس نفاذ پر دس آدھ کے ٹکٹ لگا کر اسے رجسٹری کر دیا گیا۔ ڈاک خانے کے قواعد کے مطابق رجسٹری کی رسید پر ڈاک خانہ مکمل پتہ نہیں لکھنا صرف نام لکھ دیا جاتا ہے اور یہ رسید بھیجنے والے کو دے دی جاتی ہے۔ ڈاکخانہ والوں نے بھی قاعدہ کے مطابق رسید پر مسٹر چندر پرشاد لکھنا اور رسید دے دی۔ اگلے روز یہ رجسٹری دفتر ”ریاست“ کو ڈکوری ہو گئی جو بھاڑ دی گئی اور شام کو جب مولانا تشریف لائے تو رسید اُن کو

دے دی گئی جس پر سٹرا جندر پر شاد لکھا تھا۔ مولانا اس رسید سے پورے طور پر مطمئن تھے اور اب اس رجسٹری کے جواب کا انتظار ہونے لگا۔ مولانا نے یہ رسید بعض انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دکھائی کہ اس پر کس کا نام درج ہے اور جب انھوں نے بتایا کہ رسید پر سٹرا جندر پر شاد کا نام لکھا ہے تو آپ بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ اس رجسٹری کے جواب کا انتظار کرتے جب کئی روز ہو گئے اور مولانا کچھ مایوسی سی محسوس کر رہے تھے تو بازار سے ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کا سادہ لیٹر فارم اور لفافہ منگوا گیا اور اس لیٹر فارم پر ٹائپ کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مولانا کا خط ہلا ہے اور بہت خوشی ہوئی کہ آپ کتاب ”حیات الہند“ لکھ رہے ہیں جو ہندوستان کا سرنظام دُنیا میں بلند کرے گی۔ اس کتاب کی یقیناً بہت قدر کی جائے گی اور کافی رقم میں انعام دیا جائے گا۔ اس خط کے نیچے بھیجے والے کا نام راجندر پر شاد لکھا گیا اور لفافہ پر پتہ حضرت ناصر علیاوی معرفت اخبار ”ریاست“ دہلی ٹائپ کیا گیا۔ یہ خط دو آٹھ کے ٹکٹ لگا کر لیٹر کس میں ڈال دیا گیا جو اگلے روز دفتر ”ریاست“ میں پہنچا۔ اور تیسرے روز جب مولانا تشریف لائے تو یہ خط بغیر کھولے مولانا کو یہ کہہ کر دیا گیا کہ آپ کے نام کا ایک خط معرفت ”ریاست“ آیا ہے۔ مولانا نے جب یہ خط دیکھا تو خوشی و مسرت کے انتہائی جذبات میں تھے آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ خط پڑھا جائے۔ اُس وقت چند دوسرے دوست بھی بلائے گئے تھے۔ سب کے سامنے خط کھولا گیا اور پڑھا گیا تو چاروں طرف سے مولانا کو مبارکبادیں دی گئیں۔ اور مولانا بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ اب گورنمنٹ ہند کے انعام کا انتظار ہونے لگا۔ اور مولانا نے اس خط کے جواب میں شکریہ کا ایک خط سٹرا جندر پر شاد کے نام لکھا جو مولانا سے پرسٹ کرنے کے لئے بیا گیا اور مولانا کے جانے کے بعد بھاڑ دیا گیا۔ مولانا سٹرا جندر پر شاد کے بھیجے ہوئے کئی لاکھ روپیہ کے چیک کا ایک ماہ تک انتظار کرتے رہے اور سٹرا جندر پر شاد کو ریوانڈر بھیجے کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور یہ ریوانڈر پہلے کی طرح ہی بھاڑ دیئے جاتے۔ مولانا سٹرا جندر پر شاد والے فرضی خط کو دیکھ کر چھ ماہ تک خوش رہے اور جب چھ ماہ تک کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آپ کچھ مایوس سے ہوئے اور مایوسی کے عالم میں ہی گورنمنٹ ہوس گئے اور وہاں کسی کلرک کو وہ خط دکھایا تو اس کبخت کلرک نے آپ سے کہا کہ یہ مذاق کیا گیا ہے سٹرا جندر پر شاد ایسے کا غافل پر سرکاری خط نہیں لکھا کرتے۔ مولانا اس مایوسی کے عالم میں دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے تو آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ وہ کلرک ہندو ہونے کے باعث حاسد تھا جو نہ جانتا تھا کہ کوئی مسلمان گورنمنٹ سے چند لاکھ روپیہ منگوا کرے۔ روپیہ ضرور آئے گا۔ چنانچہ پھر انتظار شروع ہوا اور اس انتظار کا سلسلہ مزید چھ ماہ تک جاری رہا جس کے بعد مولانا قطعی مایوس ہو گئے اور آپ کو یہ صدمہ تھا کہ آپ کی لا جواب تصنیف کی گورنمنٹ ہند اور ہندوستان کے صدر نے بھی قدر نہ کی۔

مولانا جب سٹرا جندر پر شاد سے بھی مایوس ہوئے تو فیصلہ ہوا کہ چند دوستوں سے مولانا کی کتاب کے لئے بطور قدرہائی مالی امداد لی جائے۔ ایک دوست سٹرا پریم کوہلی قریب قریب ہر روز

دفتر ”ریاست“ میں آنے والوں میں سے ہیں۔ تمام دوستوں اور مولانا کے سامنے ان سے کہا گیا کہ وہ مولانا کو ایک ہزار روپیہ بطور دستاورد دیں۔ یکیم کے مطابق پہلے تو مسٹر پریم نے بیوں کی سی بہانہ سازی کی اور جب دوستوں نے بار بار زور دیا تو آپ آمادہ ہو گئے اور آپ نے وعدہ کیا کہ آپ ایک ہزار روپیہ دینگے چنانچہ اس ایک ہزار روپیہ کے لئے تقاضہ شروع ہوا تو آپ نے پڑوس کے ایک صاحب سے جو گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ایک پڑائی چیک بک کا ایک چیک لیا جو گجرات کے ایک بنک کا تھا اول یہ بنک تبادلہ آبادی سے دس برس پہلے بند ہو چکا تھا پریم صاحب نے اس چیک پر ایک ہزار روپیہ لکھ کر دستخط کر دیئے اور ساتھ اس چیک پر ”پے ای اکونٹ ادنی“ (یعنی یہ روپیہ بنک کے ذریعہ صرف اس شخص کو ملے جس کا بنک میں حساب ہو) لکھ کر مولانا کو دے دیا۔ مولانا بے حد خوش ہوئے کہ ان کو ایک ہزار روپیہ ملا ہے۔ آپ مسٹر پریم کا شکریہ ادا کرتے اور اپنی احسان شناسی کا ثبوت دینے کے لئے دہلی کے مسلم اخبارات کے دفاتر میں گئے اور ان سے کہا کہ وہ مسٹر پریم کی تعریف میں مضمون لکھیں کیونکہ انھوں نے ہندو مت سے ہونے والی عربی زبان کی ایک کتاب کی قدر کرتے ہوئے ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ چنانچہ ”الحقیقت“ اور دوسرے روزانہ مسلم اخبارات میں مسٹر پریم کی تعریف میں ایک مراسلہ شائع ہوا جو مولانا صرہ لیا دی کی طرف سے تھا۔ اور یہ اخبارات نے کہ آپ شام کو دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے تاکہ وہ مسٹر پریم کو ان کی تعریف کا یہ مضمون دکھا سکیں۔ اور تمام دوستوں کے سامنے یہ اخبارات مسٹر پریم کو دکھائے گئے۔ اس کے بعد ایک دوست سے مولانا کو کہلوا گیا کہ اس چیک کا روپیہ مولانا کو تنہا مل سکتا ہے اگر ان کا حساب بنک میں ہو اور کسی بنک میں حساب کھولنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مولانا پہلے کم از کم دو سو روپیہ بنک میں جمع کرا دیں۔ مگر مولانا غریب کے پاس دو سو روپیہ کہاں۔ وہ تو محلہ کے مشکانوں کی روٹیوں پر زندگی گزارتے تھے اور دوسرے اخراجات کے لئے ایڈیٹر ”ریاست“ سے ساتویں آٹھویں روز دو تین روپیہ لے جاتے تھے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے کہ بنک سے روپیہ کیونکر نکلوایا جائے۔ دو تین ماہ اور گزر گئے کیونکہ مولانا کو نہ تو یہ معلوم تھا کہ بنک میں حساب کھولنے کی کیا صورت ہے۔ نہ روپیہ موجود تھا اور اس کا تو علم ہی نہ تھا کہ جس بنک کا یہ چیک ہے وہ بنک آج سے پندرہ برس پہلے پاکستان میں تھا اور اب بند ہو چکا ہے۔

بنک سے چیک کیش کرائے کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا کبھی تو مسٹر پریم کے خلاف شکایت کہ انھوں نے چیک پر ”پے ای اکونٹ ادنی“ لکھ دیا اور کبھی اس مجبوری کا اظہار کہ ان کے پاس دو سو روپیہ موجود نہیں تاکہ یہ بنک میں حساب کھول سکیں بہر حال کئی ماہ اس جدوجہد میں گزر گئے اور جب مولانا کو ایک شخص نے یہ بتایا کہ یہ چیک پاکستان کا ہے اور ہندوستان میں کیش نہیں ہو سکتا (آپ کو اس کا علم اب تک نہیں کہ اس بنک کو بند ہوئے بھی پندرہ برس ہو چکے ہیں) تو آپ بہت مایوس ہوئے اور آپ اب تک مسٹر پریم سے غفا ہیں کہ انھوں نے چیک پاکستان کے بنک کا دیا جو ہندوستان میں کیش نہیں ہو سکتا۔

جب مولانا اس چیک سے بھی بے حد باؤس ہو گئے تو سوال پیدا ہوا کہ اب مولانا کی "مصرفیت" کی کیا صورت اختیار کی جائے۔ ایران کی اسمبلی کے سیکریٹری مسٹر مزافہشتہ میں ایک آدمہ بار وفتر ریاست میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ آپ سے مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ چونکہ شاہ ایران کے حقیقی چھوٹے بھائی ہندوستان آ رہے ہیں۔ مولانا ان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھیں اور مسٹر مزافہشتہ شاہ ایران کے بھائی سے پچاس ہزار روپیہ بطور انعام دلوائیں۔ اس سکیم پر علحدہ آمد کرنے کی طیاریاں شروع ہوئیں اور مولانا نے ایران کے شاہزادہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جو مسٹر مزاکو سے دیا گیا۔ اور چند روز بعد جب شاہزادہ ایران دہلی تشریف لائے تو مسٹر مزافہشتہ نے بتایا کہ شاہزادہ صاحب مولانا کو پچاس ہزار روپیہ بطور انعام دینا چاہتے ہیں چنانچہ اب اس روپیہ کو لینے کی طیاریاں شروع ہوئیں اور مولانا سے فیصلہ ہوا کہ اس پچاس ہزار روپیہ میں سے ساڑھے بارہ فی صدی یعنی سوا چھ ہزار روپیہ تو مسٹر مزاکو بطور اپنا کیش لیں گے۔ اور سوا چھ ہزار روپیہ دیوان سنگھ اپنی کوشش کا معاوضہ لے گا اور مولانا سے پر رگڑا ملے ہونا شروع ہوا کہ آپ کب شاہزادہ سے ملیں اور پچاس ہزار روپیہ ایرانی اشرافیوں کی صورت میں وصول کریں۔ چنانچہ مولانا نے شاہزادہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے درزی کو سینے کے لئے کپڑے دیے اور ملاقات کی طیاریاں ہوئیں اور ایک روز دس بجے کا وقت مولانا کی ملاقات کا مقرر کر دیا گیا۔ مولانا نے ایڈیٹر ریاست سے کچھ روپیہ لے کر درزی کو سینے کے لئے کپڑے زدے دیے مگر آپ کے پاس سلائی کے لئے پیسے نہ تھے کجنت درزی نے ایک نو کپڑے سینے میں دیر کی اور مولانا رات بھر درزی کے پاس بیٹھ کر کپڑے سلواتے رہے اور دوسرے جب کپڑے سل چکے تو درزی نے بغیر اجرت لیے کپڑے دینے سے انکار کر دیا اور اتفاقاً درزی نے بہت بک بک کے بعد کپڑے اُس وقت دیئے جب کہ شاہزادہ سے ملنے کا فرضی وقت گزر چکا تھا۔ یعنی دس بجے تو ملاقات کا وقت مقرر تھا اور مولانا نے کپڑے پہن کر اور اپنے کندھے پر مولوں کا سرخ رومال رکھ کر ساڑھے دس بجے وفتر ریاست میں پہنچے تاکہ بس کے کرایہ کے لئے پیسے لے کر ایران کی اسمبلی میں پہنچ سکیں۔ اگر مولانا وقت پر پہنچ جاتے تو ہمیں کوئی اور بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ مولانا خود ہی نصف گھنٹہ لیٹ پہنچے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے فرضی طور پر مسٹر مزاکو ٹیلی فون کیا اور فرضی باتیں کرنے کے بعد مولانا کو بتایا کہ مسٹر مزافہشتہ خفا میں اور وہ کہتے ہیں کہ شاہزادہ صاحب نے مولانا کو ملاقات کا فخر بخشنے کے لئے دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا مگر مولانا دس بجے نہیں پہنچے اور شاہزادہ صاحب کہہ رہے تھے کہ کوئی ہندوستانی بھی وقت کا پابند نہیں۔ اور مولانا کا انتظار کرنے کے بعد شاہزادہ صاحب ابھی پنڈت بڑا ہرلال نہرو سے ملنے چلے گئے ہیں۔ اور آج رات کو چار بجے ہوائی جہاز کے ذریعہ واپس ایران جا رہے ہیں۔ چنانچہ مسٹر مزاکو فرضی جواب سن کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی مگر مولانا کو خود افسوس تھا کہ جو قصور ہے اُس کجنت درزی کا ہے جس نے وقت پر کپڑے لیٹا دیئے۔

شام کو مسٹر مزافہشتہ تشریف لائے۔ مولانا بھی انتہائی مایوسی کی حالت میں موجود تھے۔ ہم تینوں نے

بات چیت کی۔ مسٹر مرزا تو غصہ میں تھے کہ مولانا وقت پر ایران کی امپرسی میں تشریف نہ لائے اور مولانا انتہائی مایوس کہ درزی کی غلطی سے پچاس ہزار روپیہ کا نقصان ہوا اور میں ددوں سے خفا کہ میرا ساڑھے بارہ فی صدی حصہ یعنی سو اچھ ہزار روپیہ کا نقصان ہوا۔ نصف گھنٹہ کے قریب بات چیت کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ مولانا ہوائی جہازوں کے اڈہ پر رات کو بارہ بجے تشریف لے جائیں وہاں شہزادہ صاحب سے ملاقات ہو اور مولانا پچاس ہزار روپیہ کی سونے کی ایرانی اثرنیاں حاصل کریں۔ اور چونکہ مولانا ہوائی اڈہ وغیرہ سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے پاس ٹیکسی کے لئے چپے ہیں۔ دیوان سنگھ ان کے ساتھ ہوائی اڈہ پر جائے۔ اس فیصلہ کے بعد میں جب دوسرے کمرہ میں گیا تو مسٹر مرزا نے مولانا سے رازیں کہا کہ مولانا صاحب سوچ لیجئے پچاس ہزار روپیہ کا معاملہ ہے۔ دیران سنگھ ایک سکھ اور کافر ہے اور ہندوستان میں ہندو گورنمنٹ ہے ایسا نہ ہو کہ جب آپ واپس آسکے ہوں تو دیوان سنگھ روپیہ کے لاپٹ میں آپ کو قتل کر دے۔ سنگھ ادھ میں سکھوں نے ہزار ہا مسلمانوں کو قتل کیا۔ میں یہ صرف احتیاطاً کہہ رہا ہوں کیونکہ کسی کافر کا اعتبار کرنا اسلام میں منع ہے۔ مولانا نے مسٹر مرزا سے جب یہ سنا تو آپ سناٹے میں آگئے ایک طرف پچاس ہزار روپیہ ملنے کا سوال اور دوسری طرف زندگی کا خطرہ۔ آپ نے مسٹر مرزا سے فرمایا کہ آپ نے اچھا کیا جو وقت پر متنبہ کر دیا۔ میں تو کسی قیمت پر بھی رات کے وقت ایک سکھ کے ساتھ دہلی سے دس میل دور ہوائی اڈہ پر جانے کے لئے طیار نہیں۔ چنانچہ اس بات چیت کے باعث مولانا پچاس ہزار روپیہ سے مایوس ہو گئے جو ان کو شہزادہ سے ملنے والا تھا۔

ایران کے شہزادہ کے واپس ایران چلے جانے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ اب مولانا کی مایوسی کو دور کرنے اور آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی نئی سکیم طیار کی جائے۔ دہلی کی ایک عظیم دوست شخصیت مسٹر گن میر پرشاد ماقہر بھی کبھی کبھی شام کی محفل میں شامل ہونے کے لئے دفتر "ریاست" میں آیا کرتے ہیں اور آپ بھی ان دلچسپیوں میں حصہ لیا کرتے تھے آپ سے درخواست کی گئی کہ سیٹھ برلا آپ کے دوست ہیں اور ان کے پاس کروڑوں روپیہ موجود ہے وہ سیٹھ برلا سے مولانا کو کیوں نہ دس ہندہ ہزار روپیہ لے دیں کیونکہ ان کا عربی زبان کی ایک کتاب کی قدر کرنا ان کے ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہونے کا ثبوت ہوگا۔ مسٹر گن میر پرشاد ماقہر نے جواب دیا کہ وہ ضرور کوشش کریں گے اور سیٹھ برلا کو خط لکھیں گے۔ چنانچہ اب مولانا کی ماقہر صاحب کے ہاں آمد و رفت شروع ہوئی اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ آج سیٹھ برلا دہلی آئے مگر مصروفیت کے باعث ماقہر صاحب ان سے مل نہ سکے۔ سیٹھ صاحب کلکتہ میں موجود نہیں سیٹھ صاحب یورپ گئے ہوئے ہیں اور سیٹھ صاحب عنقریب پھر دہلی آئیں گے وغیرہ۔ سیٹھ برلا کے روپیہ کی توقع پر بھی کئی ماہ گزر گئے تو آخر موری صاحب نے فرمایا کہ ماقہر صاحب بہت کاہل اور فرض ناشناس ہیں اور کسی دوسرے کے کام آنے والے نہیں۔ ورنہ کوشش کرتے تو یہ دس ہزار روپیہ بلنا کوئی مشکل نہ تھا۔ آخر موری صاحب سے یہ کہا گیا کہ ماقہر صاحب تو بہت اچھے ہیں اور انھوں نے بہت کوشش کی مگر سیٹھ برلا



ہندوہاں بھائی خیالات کے ہی وہ کسی مسلمان کو روپیہ دینا نہیں چاہتے اگر کوئی ہندو ہونا اور کتاب سنکرت میں لکھی جاتی تو یہ دس ہزار روپیہ نہیں پچاس ہزار روپیہ دے دیتے۔ مولانا اس جواب سے بھی بے حد مایوس ہوئے اور اب کوئی نئی سکیم سوچی جانے لگی۔

مولانا صر جب زیادہ ہی مایوسی ہوئے تو مولانا عبدالرزاق مایع آبادی نے مولانا سے کہا کہ جب کسی سکیم کے مطابق اکھٹا لاکھوں روپیہ آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال آئیہ کیا جائے کہ مولانا ناصر مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک درخواست دیں۔ تاکہ گورنمنٹ ہند آپ کی پانچ سو روپیہ پنشن مقرر کر دے کیونکہ جس صورت میں کہ گورنمنٹ کے خزانہ سے سینکڑوں ہندو اور مسلمان مصنف اور شاعر سو سو اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پنشن پارہے ہیں کیا وجہ ہے کہ مولانا صر جیسے لائق تریں مصنف کو پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن نہ دی جائے کیونکہ شعر اور ادبائے تو صرف نظمیں اور مضامین لکھتے اور مولانا نے سبزیوں اور پھلوں کے متعلق عربی زبان میں کتاب لکھ کر ہندوستان کا سرتام دنیا میں بلند کیا۔ چنانچہ درخواست لکھی گئی اور اب انتظام شروع ہوا کہ مولانا کی پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو اور آپ نے مولانا عبدالرزاق مایع آبادی کے گھر کے چکر لگانے

شروع کیے اور اس سلسلہ میں مایع آبادی صاحب نے مسٹر اجل خاں صاحب پرائیویٹ سیکرٹری مولانا ابوالکلام سے بھی تعارف کروایا اور ان کو بھی راز میں لے لیا گیا۔ مولانا صر جب پنشن کے فیصلہ کا چھ ماہ تک انتظار کرتے رہے اور مایوس ہوئے تو آپ کے کان میں کہا گیا کہ مولانا ابوالکلام نے تو پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی تھی اور ایجوکیشن منسٹری سے حکم بھی جاری ہو گیا تھا مگر مولانا عبدالرزاق اور مسٹر اجل خاں نے حسد کے باعث فائل کی فائل کو ہی گم کر دیا ہے اس لیے پنشن کا حکم سرکار ہی خزانہ میں نہ پہنچا۔ اس اطلاع پر مولانا ناصر نہ صرف بے حد مایوس ہوئے بلکہ آپ مولانا عبدالرزاق مایع آبادی اور مسٹر اجل خاں کے بھی خلاف ہو گئے اور آپ نے مولانا مایع آبادی کے ہاں جانا ترک کر دیا اور جب بھی بات ہوتی تو ارشاد ہوتا کہ "مولوی مولوی کا دشمن" کے مصداق مولانا مایع آبادی نے مسٹر اجل خاں سے سازش کر کے پنشن بند کرادی حالانکہ مولانا ابوالکلام نے تو علم دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیتے ہوئے پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن جاری کر دی تھی۔

پنشن کے بند ہونے پر مولانا بے حد مایوس ہوئے تو ایڈیٹر "ریاست" نے ان سے کہا کہ قرآن میں خدا نے کہا ہے کہ مسلمان کو مایوس نہ ہونا چاہیے قرآن کے اس حکم کے مطابق آپ کا مایوس ہونا گناہ ہے۔ اور جب مولانا زیادہ ہی مایوس ہوئے تو مسٹر مرزا نے ایک روز خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کو مبارکباد دی کہ ایران کے بادشاہ نے مولانا کو ایران سے پچاس ہزار روپیہ بھیجا ہے اور اب آپ کو پچاس ہزار روپیہ کا ایران کی ایسی سی سے چیک دیا جائے گا۔ اس خبر کو سن کر مولانا کو جو مسرت نصیب ہوئی وہ بیان سے باہر ہے اور اب اس چیک کا انتظار ہونے لگا اور مولانا نے مسٹر مرزا کے گھر کے چکر لگانے شروع کیے اور ٹیلی فون پر تقاضہ شروع ہوا کہ چیک جلدی بھیجا جائے۔ مگر مسٹر مرزا نے مال مثل کا رویہ اختیار کیا۔ اور جب مال مثل کرتے ہوئے ہی دو تین ماہ گزر گئے اور آپ نے ایڈیٹر

”ریاست“ پر چیک سنگٹانے کے لئے زیادہ زور دیا تو ان کے کان میں کہا گیا کہ مسٹر مرزا اس پچاس ہزار روپیہ میں سے اپنا کمیشن چاہتے ہیں اس لئے چیک جاری نہیں ہونے دیتے اور چونکہ ایڈیٹر ”ریاست“ بھی آپ کے لئے اتنے طویل عرصہ کے کوشش کر رہا ہے اس کو بھی کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔ چنانچہ ایک روز مسٹر مرزا صاحب اپنی بیوی کے تشریف لائے اور مولانا بھی موجود تھے تو ایک گھنٹہ کی بحث اور ”گوانیڈائیٹک“ کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے فیصلہ ہوا کہ اس پچاس ہزار روپیہ میں سے ساڑھے سیٹھ ہزار روپیہ تو مولانا لیں۔ سوا چھ ہزار روپیہ مسٹر مرزا اور سوا چھ ہزار روپیہ ایڈیٹر ”ریاست“ اور اس فیصلہ کے متعلق مولانا نے ایک خط بھی مسٹر مرزا کو لکھ دیا کہ مولانا تمام کا تمام چیک غریبی ختم نہ کر جائیو۔ اس فیصلہ کے بعد چیک کا پھر انتظار شروع ہوا اور مسٹر مرزا کبھی تو کہتے کہ امیسٹر صاحب شکر گئے ہیں کبھی دورہ پر ہیں اور کبھی طبیعت اچھی نہیں اس لئے چیک پر دستخط نہیں ہوتے جب یہ سلسلہ بھی کئی ماہ تک چلتا رہا تو مولانا بے حد خفا تھے اور آپ نے دریافت کیا کہ چیک کے نہ دینے کی اب وجہ کیا ہے جب کہ تمام فیصلہ ہو چکا ہے۔ مولانا کی اس غلطی اور بایوسی کو دیکھ کر آپ کے کان میں پھر کہا گیا کہ مسٹر مرزا سوا چھ ہزار روپیہ پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ نصف یعنی پچیس ہزار روپیہ طلب کرتے ہیں یہ سن کر مولانا غصہ کے باعث مریخ ہو گئے اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ کتاب لکھنے کی محنت تو آپ نے کی اور کوشش دیوان سنگٹانے اور یہ مسٹر مرزا ہیں کہ پچاس ہزار روپیہ میں سے نصف اڑا لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا مسٹر مرزا پر بے حد ناراض اور آپ نے کہا کہ آپ مسٹر مرزا سے ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کر دیں گے کیونکہ مسٹر مرزا اپنی زبان پر قائم نہیں رہے۔ مولانا کے فہم کو دیکھ کر ان سے کہا گیا کہ تعلقات ہرگز منقطع نہ کیجئے اور نہ اپنی ناراضی کا مرزا صاحب پر اظہار ہونے دیجئے ورنہ ہم پچاس ہزار روپیہ سے غروم ہو جائیں گے۔ یہ وزیر لگ اپنے سیکریٹریوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتے ہیں۔ سیکریٹری ان کو جوڑھائیں یا اس پر عمل کرتے ہیں۔ میرے یہ کہنے پر مولانا کچھ غصہ نہ ہوئے مگر آپ ابھی تک پچیس ہزار روپیہ دینے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اور جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ پچاس ہزار روپیہ کے چیک کا مطالبہ جاری ہے اور احتیاط کی گئی ہے کہ جب تک کہ یہ کتاب شائع نہ ہو یہ تفرغ جاری رہے کیونکہ کتاب کے شائع ہونے کے بعد تو تمام درست اس تفرغ سے غروم ہو جائیں گے اور کوئی برس کی یہ تفرغ مولانا کے لئے بھی مفید نکلی۔ کیونکہ آپ کئی برس تک ان وعدوں کے باعث انتہائی خوشی و مسرت محسوس کرتے رہے اور کئی بار تو روپیہ کے انتظار میں آپ رات کو سو بھی نہ سکتے

## شراب کی زیادتی موت کا باعث

لیکٹر کے نوجوان شاعر مرحوم مسٹر اسرار الحق جاتہ ٹی لوگوں میں سے تھے جن کو مادر وطن ہر روز پیدا نہیں کرنی اور جو طویل عرصہ کے سہمی پیدا ہوتے ہیں مرحوم کے ایڈیٹر ”ریاست“ کے

ساتھ محبت ہی اخلاص و محبت کے تعلقات تھے اور آپ جب بھی دہلی آتے اور جتنے روز یہاں قیام کرتے دن میں کئی کئی گھنٹہ دفتر ریاست میں گزارتے۔

دفتر ریاست "ٹھکانہ گریہا میں تھا۔ جہاں کہ چھت پر سونے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی کیونکہ ادھر کسی منزل میں دوسرے لوگ رہتے تھے۔ ایک روز گرمی کا زمانہ تھا اور شام کا وقت تھا کہ آپ اور مرحوم سٹراختر شیرانی دونوں تشریف لائے اور چنٹ بیٹھے تھے کہ آپ نے شراب شنگھانے کے لیے کہا۔ مجھے دسکی یا دیسی شراب سے ایک طرح کی نفرت سی ہے اور میں کبھی کبھی جب طبیعت اچھی ہو یا زیادہ تشنگان ہوں تو نصف یا زیادہ سے زیادہ ایک پیگ یا ڈیڑھ پیگ پییا کرتا ہوں۔ اور کئی کئی ماہ تک نہیں پیتا چاہے گھر میں بوتل بھری رکھی ہو مگر دوستوں کے لئے ہر زمانہ میں دسکی موجود رہی کیونکہ اگر کوئی دوست شام کو میلے کے لیے یا کھانے پر آئے تو کفایت شعاری یا نہ سب کچھ بھانہ کرتے ہوئے ان کو دسکی پیش نہ کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ ان دونوں حضرات کے کہنے پر میں نے دسکی کی ایک بوتل اور سوڈے کی چند بوتلیں ان کے لیے ڈرائنگ روم میں رکھوا دیں۔ اور کہا کہ آپ شغل فرمائیے اور خود میں دفتر کے کمرہ میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں اس زمانہ میں رات کو مرحوم مسٹر شرما ایڈیٹر "انصاف" کے مکان پر چلا جایا کرتا تھا تاکہ چھت پر ہوا میں سو سکوں۔ یہ دونوں رات کو نو بجے تک دسکی پیتے رہے تو میں نے سلازم سے کہا کہ یہ جیسا تک یہاں بیٹھے پیتے رہیں ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے اور جب یہ جائیں تو پھر وہ دروازے بند کر دے۔ اور ان سے کہا کہ میں سونے کے لئے مسٹر شرما کے مکان پر جا رہا ہوں۔ آپ پینے کے بعد جب چاہیں چلے جائے۔ میں یہ کہہ کر مسٹر شرما کے مکان پر چلا گیا۔

میں مسٹر شرما کے مکان سے صبح چار بجے واپس دفتر آ جایا کرتا تھا کہ کام شروع کر سکوں۔ اگلی صبح چار بجے جب واپس آیا تو یہ دسکی پر رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ یہ بھی ابھی تشریف لائے ہیں تو میں نے پوچھا کہ آپ کس وقت تشریف لائے۔ مجاز دعا جب نے کہا کہ رات کو گیا کون تھا۔ یعنی یہ رات بھر دسکی پیتے رہے۔ اور اس کے بعد دوبارہ کون بجے کے بعد یہ واپس وہاں گئے جہاں کہ مقیم تھے۔

زیادہ شراب پیئے کام مرحوم سٹراختر کے دماغ پر بھی اثر تھا۔ اور عورتوں کے متعلق تو ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اگر کسی بس میں جا رہے ہوں جتنی دیر بس میں بیٹھے کسی نہ کسی عورت کی طرف ہلکی ہانڈے دیکھتے رہتے۔ اور یہ محسوس کرتے کہ یہ عورت ان پر عاشق ہے۔ ایک روز آپ اردو بازار میں سے گزر رہے تھے۔ بازار کی سڑک کی حرمت جو رہی تھی اور مردوروں میں راجپوتانہ کی ایک نو عمر اور نوجوان لڑکی بھی کام کر رہی تھی۔ آپ نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو وہیں کھڑے ہو گئے اور شاید ایک گھنٹہ تک وہیں کھڑے رہے اور شام کو آئے تو آپ نے اس لڑکی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ لڑکی بھی ان کو پسند کرتی تھی حالانکہ لڑکی کو خیال بھی نہ تھا کہ یہ کون ہیں۔ مگر یہ اس کے عشق میں مبتلا تھے اور اس سے بعد کئی روز تک اس بازار کے چکر لگاتے رہے کہ یہ کہیں نظر آجائے۔



ایک روز دوپہر کو دفتر ریاست میں آئے اور جب واپس جا رہے تھے تو راستہ میں پڑوس کی ایک جوان لڑکی تل سے پانی لینے آرہی تھی۔ آپ نے راستہ روک لیا اور اس کو گلگلی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ لڑکی بھاری معصوم اور غیر شادی شدہ عقیدہ واپس اپنے گھر چلی گئی تو آپ تشریف لے گئے۔ جب آپ چلے گئے تو یہ لڑکی میرے پاس آئی اور اس نے نہایت غصہ کی حالت میں شکایت کی۔ میں کیا جواب دیتا۔ یہی کہا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہے اس کا کوئی خیال نہ کیا جائے اس کے بعد اگلے روز تشریف لائے تو میں نے صفات الفاظ میں کہہ دیا کہ آپ تشریف نہ لایا کیجئے۔ آپ کا آنا رسوائی کا باعث ہے۔ چنانچہ آپ چلے گئے۔ اور چونکہ مجھے بہت سخت غصہ تھا تھوڑی دیر کے بعد آپ نے بات چیت کرنے کے لئے کسی دوسری جگہ سے ٹیلی فون کیا تو میں نے غصہ کی حالت میں ہی ٹیلی فون بند کر دیا اور بات نہ کی۔ میرے اس رویہ کو آپ نے بھی محسوس کیا اور اس کے دو روز بعد بغیر ملے لکھنؤ چلے گئے اور چند ہفتہ کے بعد اطلاع آئی کہ آپ رانچی کے پاگل خانہ میں بیچ دیئے گئے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بے حد صدمہ اور افسوس ہوا میں نے رانچی کے میٹل ہسپتال کے پتہ پر آپ کو خط لکھ کر آپ کی خیریت دریافت کی مگر کوئی جواب نہ آیا میرا خیال ہے کہ میرا خط ان کو نہیں ملا ورنہ وہ بہت ہی معصوم اور فیاض تھے کسی درست کے متعلق اپنے دل میں کدورت نہ رکھ سکتے تھے۔ اگر خط ملتا تو ضرور جواب دیتے۔

مجاز ہندوستان کے چوٹی کے اُن چند شعرا میں سے ایک تھے جن پر آئندہ نسلیں بھی فخر کریں گی۔ ایک روز دفتر ریاست میں تشریف لائے تو میں دایان ریاست کے مظالم کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ آپ نے جب اس مضمون کو پڑھا تو آپ نے قلم دوات لے کر ہندوستان کے حکمرانوں کے متعلق ذیل کے اشعار لکھے۔

آج جب مرد کے ماتھے پر نظر آتا ہے      یک بہ یک خون مری انگلیوں میں اتر آتا ہے

جب نظر آتا ہے عورت کی جبین پر چمک      غمزد تسلیم کا ہر نقش آ بھر آتا ہے

مرحوم مجاز کا جب انتقال ہوا تو آپ عمر کے لحاظ سے ابھی جوان تھے اور آپ کی موت کا باعث بھی حضرت اختر شیرانی اور حضرت منشد کی طرح شراب کے استعمال کی کثرت تھی۔ اور میرا یہ یقین ہے کہ اگر شاعر انقلاب حضرت جوش بھی اپنے شراب کے اندازہ اور پینے کے وقت کے پابند نہ ہوتے تو آج ہندوستان و پاکستان امد و زبان کے اس لہم سے بھی محروم ہو گیا ہوتا۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ حضرت جوش جب شراب پیتے ہیں تو اپنے سامنے گھڑی رکھ لیتے ہیں تاکہ وقت کے پابند رہیں اور زیادہ نہ پیئیں۔ اور جب حضرت مجاز سے ایک دوست نے کہا کہ آپ بھی گھڑی کو سامنے رکھ کر پیا کیجئے تو آپ نے فوراً جواب دیا کہ آپ گھڑی نہیں شراب کے بھرے ہوئے گھڑے کو سامنے رکھ کر پینا چاہتے ہیں۔ آہ! مجاز شراب کثرت کے ساتھ پیتے تھے اور شراب ان کو کھا گئی جس کا ان کے ہر دوست کو صدمہ ہے۔

## روپیہ کی موجودگی میں افلاس

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد پچاس لاکھ کے قریب شرنار تھی پاکستان کے علاقہ سے ہندوستان آئے۔ اور یہ جب یہاں پہنچے تو یہ اپنی جائیداد یعنی زمین اور مکانات وغیرہ کو تو اپنے ساتھ نہ لاسکے کیونکہ اس کا لانا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا مگر یہ روپیہ۔ زیورات یا دوسرا جو سامان بھی اپنے ساتھ لا سکتے تھے اپنے ہمراہ لے آئے اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" کے ایک قریبی عزیز اپنے وطن حافظ آباد سے آم کے آچار کا ایک ٹین بھی اپنے ساتھ لے آئے جو یہاں ایک عرصہ تک کھاتے رہے مگر یہ واقعہ ہے کہ جس شرنار تھی سے پوچھا جاتا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کچھ لایا تو جواب یہی ملتا کہ یہ صرف اپنے تین کپڑوں (رقیض۔ پاجامہ اور صاف) کے ساتھ اپنی جان بچا کر آیا ہے۔

تبادلہ آبادی کے زمانہ میں دفتر "ریاست" چاڈری بازار کے قریب محلہ چرنے والاں میں تھا۔ اس محلہ کے مسلمان جب مکانات خالی کر کے پاکستان یا دہلی کے مسلم زون میں چلے گئے تو کیونکہ اس محلہ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، تو مسلمانوں کے ان خالی مکانات میں شرنار تھی داخل ہو گئے۔ اور دفتر "ریاست" کے بالکل قریب کے ایک مکان پر بھی شرنار تھیں کے تین چار خاندان کے لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ ایڈیٹر "ریاست" کو پاکستان کے حالات سُننے سے ہمت دلچسپی تھی۔ اور جو شرنار تھی بھی ملتا اُس سے حالات پوچھتا۔ پڑوس کے اس مکان کے ایک شرنار تھی ریلنے کے لئے آئے اور اس سے باتیں ہوئیں تو اس شرنار تھی نے بتایا کہ وہ صرف تین کپڑوں کے ساتھ پاکستان سے آیا ہے اور اس کے پاس سونے کے لئے بسترہ تک بھی نہیں اور اس کی ایک سال کی بچی ہے جو رات کو سردی میں بغیر لحاف کے ہی اپنی ماں کے ساتھ سو جاتی ہے۔ اس کے یہ حالات سن کر ایڈیٹر "ریاست" نے محسوس کیا۔ اُس وقت دفتر "ریاست" میں پچیس روپیہ موجود تھے جو اس شرنار تھی کو یہ کہہ کر دے دیئے گئے کہ آپ لحاف بنائیے تاکہ رات کو سردی میں تکلیف نہ اٹھائے اور اس شرنار تھی نے یہ روپے شکر یہ اور احسان کے جذبات کے ساتھ لے لئے۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد اس مکان کے ہی ایک دوسرے شرنار تھی ریلنے کے لئے آئے جو لاہور انارکلی میں گھڑیوں کے سوداگر تھے۔ ان سے نصف گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں اور باتوں باتوں میں ان سے اُس شرنار تھی جس کو بچی کے لحاف کے لیے پچیس روپیہ دیئے گئے تھے، کے متعلق بھی پوچھا کہ اُس کا کیا حال ہے تو گھڑیوں کے اس شرنار تھی سوداگر نے بتایا کہ اُس کا اچھا حال ہے اور اس نے اور ایک دوسرے شرنار تھی نے پچیس پچیس ہزار روپیہ کے سرمایہ سے چاندنی چوک میں کپڑے کی ایک دکان شروع کر دی ہے اور اس کا کام چل رہا ہے۔ یہ سنانے کے بعد پوچھا گیا کہ اس نے پچیس ہزار روپیہ کہاں سے لیا تو اس نے بتایا کہ جب یہ لاہور سے آیا تو اس کے پاس پچاس ہزار روپیہ کے قریب نقد تھا جو یہ پاکستان

سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس میں سے پچیس ہزار روپیہ تو اس نے اپنے کاروبار میں لگا دیا ہے اور پچیس ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے۔ یعنی تین کپڑوں کے ساتھ پاکستان سے آنے اور پہننے کے لیے لحاظ نہ رکھنے والے خزانہ دہی کے پاس پچاس ہزار روپیہ نقد موجود تھا۔ اور زیورات یا دوسرے سامان کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا کیا تھا۔

کئی برس ہوئے ایڈیٹر ریاست کے ایک مرحوم دوست کے صاحبزادہ کاہور سے تشریف لائے۔ آپ بیمار تھے اور آپ نے فرمایا کہ آپ علاج کے لیے دہلی آئے ہیں۔ اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم ہیں اور آپ کے پاس علاج کے لیے ایک پیسہ نہیں۔ ان کے یہ حالات سن کر تکلیف ہوئی اور ان کی خدمت میں علاج کے لیے ایک سو روپیہ نذر کر دیا گیا کیونکہ ان کے والد مرحوم کے ساتھ ایڈیٹر ریاست کے گھر سے دوستانہ مراسم تھے۔ پندرہ روز کے بعد آپ پھر تشریف لائے۔ اور پھر اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ان کی خدمت میں پھر ایک سو روپیہ نذر کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد یہ زیادہ بیمار ہو گئے اور ایڈیٹر ریاست ان کو دیکھنے کے لیے دہلی گیا جہاں کہ یہ مقیم تھے اور حالات پوچھے تو آپ نے بتایا کہ علاج کے لیے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں اور ان کی بیماری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے چنانچہ ان کی خدمت میں ایک سو روپیہ اور نذر کر دیا گیا اور دو تین ہفتہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سے ان کے دہلی آنے پر اظہارِ افسوس کیا گیا اور باتوں باتوں میں پوچھا گیا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور مرحوم کی بیوہ کے اخراجات کا کیا انتظام کیا گیا تو مرحوم کے بھائی نے جو جواب دیا وہ یہ تھا :-

”مرحوم کی بیوہ کے پاس پچیس ہزار روپیہ کے قریب نقد موجود ہے۔ جہاں تک گزارہ کا سوال ہے۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہوگی مگر غنیمت بچوں کا باپ کے سایہ سے محروم ہونا ایک دردناک مصیبت ہے۔ اور اس مصیبت کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔“

یعنی پچیس ہزار روپیہ نقد ہوتے ہوئے بھی مرحوم کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ اور یہ دوستوں کا فرض تھا کہ وہ علاج کے لیے روپیہ دیتے۔

ایڈیٹر ریاست کے دہلی کے ایک سلمان جرنلسٹ دوست بیمار ہو گئے اور جب ان کی صحت بہت ہی برکتی تو آپ نے ایڈیٹر ریاست کو طلب فرمایا اور اپنی بیماری اور افلاس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے پاس علاج کے لیے بھی ایک پیسہ نہیں۔ ان کا یہ اور شاہد تکلیف کا باعث تھا اور ان کے اپنے حالات بتانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ ان کی امداد کی جائے۔ ایڈیٹر ریاست خود مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ اس نے حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر شمع کو ٹیلی فون پر تمام حالات بتائے۔ حافظ صاحب نے دستوں کی لڑائی کے اعتبار سے بہت ہی بلند اور فیاض ہیں۔ اور یہ ان کا کیرئیر ہے کہ یہ جب بھی کسی کی امداد کریں تو اس کا یہ کسی سے انکار نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹوں یا گھر والوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا امداد کرنے کے بعد اس کا اظہار کرنا یہ

اخلاقی کی بجائے قرار دیتے ہیں۔ اور بقول ایک دوست کے یہ سٹر رام رکھا خوشتر گرامی کی حند ہیں۔  
 یعنی سٹر خوشتر تو اگر کسی کی دعوت کریں تو یہ اس دعوت کا بار بار دوسرے لوگوں سے ذکر کرتے  
 ہیں اور چاہتے ہیں کہ دعوت کھانے والے ان کے شامی کباہوں کی تشریف کریں۔ مگر حافظ صاحب  
 اگر داہنے ہاتھ سے کسی کی امداد کریں۔ تو یہ بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ حافظ صاحب سے میں نے  
 اس اپنے بیمار جرنلٹ دوست کے تمام حالات بتائے۔ حافظ صاحب حالات سننے رہے اور انہوں  
 نے نہ ہاں کی اور نہ انکار کیا۔ حافظ صاحب اگلے روز شام کو ان دوست کے گھر گئے۔ بیماری کے  
 حالات پر پچھتے رہے اور خاموشی کے ساتھ ایک لفافہ دیا جس میں سو سو روپیہ کے پانچ نوٹ تھے۔  
 حافظ صاحب اس کے بعد ایڈیٹر ریاست سے ملے مگر انہوں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور  
 اُس بیمار دوست نے ہی بتایا کہ حافظ صاحب آئے تھے اور علاج کے لئے پانچ سو روپیہ  
 دے گئے ہیں۔

ایک ماہ بعد اس بیمار دوست کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو ان کے صاحبزادہ نے ٹیلی فون پر  
 کہا کہ حالت زیادہ خراب ہے اور علاج کے لئے ایک پیسہ موجود نہیں۔ ایڈیٹر ریاست نے جواب دیا  
 کہ وہ حافظ یوسف صاحب سے مزید امداد کے لئے کہے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ حافظ صاحب  
 سے نہ کہا جائے کیونکہ چند روز ہوئے انہوں نے خود ہی حافظ صاحب سے کہا تھا اور حافظ صاحب  
 نے دو سو روپیہ اور بھیج دیا تھا کسی دوسرے دوست سے کہا جائے۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ اور  
 تو فی الحال کوئی دوست ایسا نظر نہیں آتا جس سے کہا جائے کہ یہ کوشش کرے گا کہ کوئی دھما  
 دوست امداد کرے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد رات کو اس بیمار جرنلٹ دوست کا انتقال ہو گیا۔ اور جب صبح کو  
 کئی دوست جنازہ میں شامل ہونے کے لئے مرحوم کے گھر پہنچے تو مرحوم کے صاحبزادہ نے بتایا کہ  
 کفن و دفن کے لئے بھی ایک پیسہ موجود نہیں چنانچہ مرحوم کے دہاں موجود دوستوں میں سے حافظ  
 محمد یوسف۔ انور صاحب ایڈیٹر "بانو" اور دوسرے اصحاب نے تین چار سو روپیہ جمع کر کے  
 میت کے کفن و دفن کا انتظام کیا۔

مرحوم کے انتقال کے چار روز بعد انور صاحب دفتر ریاست میں تشریف لائے اور مرحوم کے  
 متعلق باتیں شروع ہوئیں تو انور صاحب نے بتایا کہ انتقال کے بعد اگلی صبح جب ان کی بیوی ماتم  
 پڑی کے لئے مرحوم کے مکان پر گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ مرحوم کے صاحبزادہ کی بیوی کے بازو  
 سونے کی چڑیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور کسی شے کو شکانے کے لئے جب اس خاتون  
 نے اپنا ہتھکڑا تو اس میں سو سو روپیہ کے نوٹوں کی گڑھی موجود تھی۔ اور یہ بھی بتایا کہ دو برس ہوئے  
 مرحوم نے اپنے صاحبزادہ کو پندرہ ہزار روپیہ نقد دیئے تھے جو صاحبزادہ کے پاس موجود ہیں اور



چونکہ انور صاحب اندر مرحوم کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے صاحبزادہ نے دو ماہ پہلے بتایا تھا کہ وہ پندرہ ہزار روپیہ تو آپ نے اپنے بچوں (یعنی مرحوم کے پوتوں) کے لیے الگ رکھا ہوا ہے تاکہ یہ روپیہ آئندہ ان کی تعلیم و فیروہ کے کام آئے۔ انور صاحب کا یہ بیان سن کر ایڈیٹر ”ریاست“ کو جس قدر انوس ہوا اور غصہ آیا وہ بیان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ چودہ ہزار روپیہ نقد اور ہزار روپیہ کے زیورات ہوتے ہوئے بھی جو شخص اپنے باپ کے کفن و دفن کا انتظام دوستوں کی خیرات کے دو پیسے کرنا ہے اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

اس مرحوم دوست کے انتقال کے ایک ماہ بعد ان کے صاحبزادہ کے ایڈیٹر ”ریاست“ گریٹلی فون آنے شروع ہوئے کہ یہ فائدہ کشی میں مبتلا ہے اور کاروبار چلانے کے لیے بھی اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ یہ مشورہ (یعنی امداد) کے لیے آنا چاہتا ہے۔ پہلے تو اسے ٹالا گیا مگر جب ٹیلی فون کا سلسلہ کافی تیز ہو گیا تو اس سے کہا گیا کہ تشریف لائیے۔ دوپہر کا وقت تھا آپ تشریف لائے۔ ان کو علم نہ تھا کہ انور صاحب اس سے پہلے تمام حالات بتا چکے ہیں۔ آپ نے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ اپنا کتابوں اور رسالہ کا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ سُننے کے بعد ایڈیٹر ”ریاست“ نے جو دلچسپ جواب دیا وہ یہ تھا۔

”میں کیا عرض کروں میری مالی حالت بھی اچھی نہیں۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر رائے نے چند روز جوئے دس ہزار روپیہ اور راجپوتانہ کے لیڈر مسٹر دیاس نے پندرہ ہزار روپیہ بھیجا تھا۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ کی تو ڈی۔ ایل۔ ایف والوں سے زمین خرید لی گئی۔ پانچ ہزار روپیہ ادھر ادھر صرف ہو گیا۔ زمین کی قیمت میں سے پانچ ہزار روپیہ ابھی ڈی۔ ایل۔ ایف والوں کو اور دینا ہے۔ وہ تقاضہ کر رہے ہیں۔ اس زمین پر کوٹھی بنانے پر پچیس ہزار روپیہ کے قریب صرف ہو گا۔ بہار کے ایک وزیر نے دس ہزار روپیہ کا وعدہ کیا تھا مگر یہ روپیہ اب تک نہیں آیا۔ یہ وزیر اپنے وعدہ کے پابند ہیں پہلے ہی اپنے وعدہ کے مطابق روپیہ بھیج چکے ہیں اور کبھی غلط وعدہ نہیں کرتے۔ یہ روپیہ تو ضرور بھیج دیں گے۔ دیکھئے کب بھیجے ہیں۔ میرے یہ حالات ہیں کوٹھی کے لیے پچیس ہزار روپیہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں ورنہ میں ضرور آپ کی خدمت کرتا۔ میں قطعی مجبور ہوں۔“

میرے اس بیان کو سن کر ان صاحبزادہ کے چہرہ سے حسد اور حیرانی کے جذبات کا اظہار ہوا تھا۔ یہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اور ابھی میں نے یہ کہا ہی تھا کہ میں نے اپنے بیان کی تائید میں دفتر کے دوسرے کمرہ سے دفتر ”ریاست“ کے منیجر پنڈت سہم ناتھ کو آواز دی۔ وہ ایسے معاملات میں خوب پارٹ ادا کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ پنڈت جی کل ڈی۔ ایل ایف والوں کا پھر ٹیلی فون آیا تھا کہ زمین کی قیمت کا بقایا پانچ ہزار روپیہ ادا کیا جائے۔ آپ آج ان کے پاس جائے اور کہیے کہ ہم دس ہزار روپیہ تو ادا کر چکے ہیں بقایا پانچ ہزار روپیہ ادا کر دیجئے۔ ہم کہیں بھاگے تو نہیں جاوے۔ پنڈت

سوم ہاتھ ایسے مذاق میں اکثر حصہ لیا کرتے ہیں۔ آپ نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ وہ آج جائیں گے اور ڈی۔ ایل۔ ایف والوں سے کہیں گے کہ ہم چند روز تک پانچ ہزار روپیہ ادا کر دیں گے ہمیں بار بار تنگ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد صاحبزادہ صاحب تشریف لے گئے اور وہ مایوسی اور حیرانی کے جذبات کے باعث کچھ بکھرنے لگے۔

اس واقعہ کے تین روز بعد رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس صاحب تشریف لائے۔ وہ بھی لطافت اور مذاق سے بہت محظوظ ہو کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو شروع سے یعنی حافظ یوسف صاحب کے پانچ سو روپیہ سے لے کر مرحوم دست کے صاحبزادہ کے تشریف لانے اور بات چیت کرنے تک کے تمام واقعات سنائے کے بعد کہا کہ جس صورت میں کہ لوگ ہزار روپیہ اپنے پاس رکھنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مفلس و خلاش ظاہر کرتے ہیں تو میں مفلس اور خلاش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو امیر اور دولت مند کیوں ظاہر نہ کروں۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور آپ نے فرمایا کہ ان مرحوم دست کی بیماری کے زمانہ میں جب ان کو بھی ٹیلی فون پر کہا گیا کہ مرحوم کے پاس علاج کے لیے ایک پیسہ نہیں تو انھوں نے بھی بطور امداد کچھ روپیہ بھیجا تھا کیونکہ مرحوم کے ساتھ ان کے بھی تعلقات تھے۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں لوگ کیونکر روپیہ رکھتے ہوئے بھی افلاس کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اگر میں نے مفلس ہونے اور گپ بازی کرتے ہوئے چند صوبہ جات کے وزیروں اور نمائندوں کے روپیہ بھیجنے کا مرحوم کے صاحبزادہ سے غلط اقرار کر لیا تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ بعض لوگ تو اپنے آپ کو برادری میں امیر اور صاحب حیثیت کہلانے کے لیے کم آمدنی ہوتے ہوئے بھی انکم ٹیکس دینے والوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور میں نے تو صرف ایک بر خور دار پر ہی اپنی امیرانہ شان کا سکھایا۔

## مرحوم سر بابا حکیم سنگھ کے اثرات

میرے مرحوم والد کے مرحوم بابا سر حکیم سنگھ بیدی دکنور ہندو سنگھ بیدی ڈپٹی کمشنر پنجاب کے حقیقی دادا کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اور میری والدہ اور چچا وغیرہ بتایا کرتے تھے کہ مرحوم بابا صاحب جب کبھی جہلم یا میانوالی وغیرہ جہاں کہ میرے والد بطور ڈاکٹر ملازم تھے (دورہ پر آتے تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لاتے۔ اور جب تک میرے والد حیات تھے۔ یہ مراسم جاری رہے۔ یہ واقعات میری پیدائش سے پہلے کے ہیں۔

”ریاست“ جاری ہو چکا تھا کہ ایک روز پنڈت رام چندر بھادراج سالک رومی برادر کشمیری گریڈ دہلی نے ذکر کیا کہ مرحوم سر بابا حکیم سنگھ بیدی کے سب سے بڑے صاحبزادہ بابا سر گرو بخش سنگھ بیدی سردیوں کے زمانہ میں دہلیں ماہ کے لئے گورکھ گاندی آیا کرتے ہیں کیونکہ گورکھ گاندی کی آپ دھڑا کو

آپ پسند فرماتے ہیں اور گوڑ گاؤں شہر سے باہر پنڈت جی کی کوٹھی میں آپ رہائش اختیار کرتے ہیں۔ اور آجکل بھی وہاں تشریف فرما ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ میں بابا صاحب کا نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بابا صاحب سے ذکر کریں اور اگر بابا صاحب پسند فرمائیں تو میں حاضر ہوں گا۔ اور بابا صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا جائے کہ میں مرحوم ڈاکٹر ندھان سنگھ کا بیٹا ہوں۔ دوسرے یا تیسرے روز پنڈت جی نے فرمایا کہ بابا صاحب سے ذکر آیا تھا اور بابا صاحب کو مجھ سے بل کر بہت خوشی ہوئی اور وہ چاہتے ہیں کہ میں گوڑ گاؤں آکر ان سے ضرور ملوں۔ اس پیغام کے بعد میں اپنی کار میں پنڈت جی کے ساتھ ہی گوڑ گاؤں گیا۔ بابا صاحب تشریف فرما تھے۔ دو حضرات ملازم دیکھا نہ نضا اور شکار سی کتے اور گھوڑے وغیرہ بندھے تھے کیونکہ بابا صاحب جب گوڑ گاؤں آتے تو یہاں شکار سے بھی مشغول فرماتے۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بہت ہی تپاک کے ساتھ ملے اور آپ نے اپنے خاندان اور میرے مرحوم والد کے تعلقات کے متعلق دیر تک ذکر کیا اور بتایا کہ ان کے والد بابا سرکھیم سنگھ اور ایڈیٹر ریاست کے والد کے بیان بہت ہی اخلاص و محبت کے تعلقات تھے۔ میں بابا سرکھیم سنگھ کی خدمت میں ایک گھنٹہ کے قریب بیٹھا باتیں کرتا رہا اور واپس آنے کے بعد ان کی بزرگانہ شفقت اور محبت کو محسوس کر کے بار بار یہ خیال آیا کہ آج سے پچاس یا سو برس پہلے کے لوگ اخلاص بے دریائی اور محبت کے اعتبار سے کتنے بلند تھے۔ اور آج تلاش کرنے پر بھی اس قابل قدر سفار کا کوئی انسان نہیں مل سکتا۔ کاش کہ میں بھی اُس زمانہ میں پیدا ہوتا۔ میں موگا (ضلع فیروز پور) میں تھا تو ہسپتال کے لیے کچھ سامان خریدنے ملتان گیا کیونکہ وہاں کی فرم علی بھائی ولی جی تمام ہندوستان کے ہسپتالوں کو سامان سپلائی کرتی تھی اور ان کا سامان یورپ کی بڑی سے بڑی فرموں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں ملتان سے جب واپس آ رہا تھا تو گاڑی کے جس خانہ میں سوار تھا اس خانہ میں ہی منٹگری سے ایک سکھ سوار ہوئے جو شکل و شبہات سے ایک رقیں معلوم ہوتے تھے۔ میں فطرتاً کچھ خاموش سا ہوں۔ اور ٹرین میں تو کبھی بھی کسی ایسے شخص سے بات نہیں کرتا جو واقف نہ ہو اور اپنا وقت کتاب یا کوئی رسالہ پڑھ کر گزار لیتا ہوں یہ صاحب جب اس خانہ میں آکر بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ منٹگری سے دوٹیشن جانے کے بعد ان بزرگ اور میرے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔

میں ملتان سے آ رہا ہوں۔

کہاں جاؤ گے۔

میں موگا جاؤں گا۔

کہاں کے رہنے والے ہو۔

میں حافظ آباد کا رہنے والا ہوں۔

حافظ آباد کے رہنے والے ہاں ایک گھر ہے دوست ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے جن کا بہت بڑا گھر

انتقال ہو چکا ہے۔

میں ان کا لڑکا ہوں۔

کیا تم کرتاؤ سنگھ۔

نہیں میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں اور میرا نام دیوان سنگھ ہے۔

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ یہ سردار صاحب بیتاب ہو کر مجھ سے لپٹ گئے۔

ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ بہت محبت اور اخلاص کا اظہار کیا اور جب باتیں ہوئیں تو

معلوم ہوا کہ آپ مرحوم بابا سرکھیم سنگھ کے دوسرے صاحبزادہ بابا ہراسنگھ ہیں۔ بابا ہراسنگھ تو اس

گاڑی میں لاہور جا رہے تھے میں رائے دنڈ جنکشن پر اتر کر دیر نہ پروردہ الی گاڑی سے موکا چلا آیا۔ اس واقعہ

کو ہوتے بہت برس ہو گئے مگر جب بھی یہ ایک یاد گشت کی ملاقات یاد آتی ہے تران بابا صاحب کے

اخلاص و محبت کا خیال آتے ہی آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

میں لاہور کے "خالصہ اخبار" کو ایڈیٹ کرتا تھا۔ تو اس زمانہ میں سر بابا بکھیم سنگھ کے ایک برتے

بابا جرنٹ سنگھ ملا کرتے تھے۔ اور یہ کئی برس تک ملتے رہے ان کے اخلاص اور محبت کا بھی اب تک

دل پر نقش ہے اور لاہور چھوڑنے کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ بابا صاحب آجکل کہاں ہیں۔

یہ تو بابا سرکھیم سنگھ کے خاندان سے ایڈیٹر تریاست کے خاندانی تعلقات تھے جن کو کئی زیادہ محبت

نہیں دی جاسکتی اور ان کا ذکر صرف اس خاندان کے اخلاص و محبت کے سلسلہ میں آگیا۔ جس میں بھی پھیل سکا

اب میں بابا سرکھیم سنگھ کے کچھ واقعات بتاتا ہوں۔ جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور یہ واقعات

مجھے ایک نایب تحصیلدار نے بتائے جو وزیر آباد کے رہنے والے تھے اور جن کا تعلق اس واقعہ سے

سے تھا۔ کیونکہ اس زمانہ راولپنڈی میں یہ نایب تحصیلدار تھے۔ واقعہ یہ ہے۔

پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ۱۹۱۹ء سے پہلے گورنر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کہا جاتا تھا اور گورنر صرف

بنگلہ۔ ممبئی اور مدراس کے بڑے صوبہ جات میں تھے دورہ راولپنڈی گئے۔ اور بابا سرکھیم سنگھ

ہیدی لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لئے اپنے گاؤں کلر سے راولپنڈی آئے۔ لفٹنٹ گورنر سے

ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں بابا صاحب نے لفٹنٹ گورنر سے کہا کہ آپ راولپنڈی تو آئے

ہی ہیں آپ ہمارے ہاں بھی تشریف لے چلے اور وہاں چائے پیجے۔ بابا صاحب نے لفٹنٹ گورنر

کو یہ دعوت معمولی بات چیت کرتے وقت صرف اخلافا دی اور اس سے پہلے نہ تو بابا صاحب

کو اس دعوت کے دینے کا خیال تھا اور نہ لفٹنٹ گورنر کا کوئی پروگرام ہی بابا صاحب کے

گاؤں کلر جانے کا تھا۔ گورنر نے بابا صاحب کی اس خواہش کے جواب میں دعوت قبول کر لی

اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی سے کہا کہ آپ اگلے روز شام کو کلر جائیں گے۔ لفٹنٹ گورنر کا یہ حکم سن کر

ڈپٹی کمشنر نے تحصیلدار کے نام حکم جاری کیا کہ انتظام کیا جائے۔ تحصیلدار میرٹھ کے رہنے والے تھے۔

آپ پریشان کہ یہ ناگہاں مصیبت نازل ہو گئی۔ کیونکہ ایک روز کا تو درمیان میں وقفہ تھا اور یہ ممکن

ہی نہ تھا کہ سڑک وغیرہ کو درست کیا جاسکتا۔ کلر راولپنڈی سے غالباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

اس تحصیلدار نے محسوس کیا کہ سڑک تو ناہموار اور کچی ہے اور اگر راستہ کا اچھا انتظام نہ ہو سکا تو یہ قطعی ممکن ہے کہ تحصیلدار لفٹنٹ گورنر نا راض ہوں اور ان کو وہ نا اہل سمجھتے ہوئے موقوف بھی کر دیں۔ تحصیلدار نے ڈپٹی کمشنر کو جواب میں لکھا کہ وہ یہیلو ہے اور لفٹنٹ گورنر کے اس دورہ کے انتظام کے لئے نایب تحصیلدار (جنہوں نے یہ تمام واقعات ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا) کو حکم دے دیا گیا ہے۔

نایب تحصیلدار یہ حکم سن کر پریشان کہ اب ایک روز میں کیا انتظام ہو سکتا ہے یہ نایب تحصیلدار بابا مرہیم سنگھ کے اثرات اور رسوخ سے واقف تھا۔ یہ ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بے بسی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا کہ بارہ میل کے قریب کچی سڑک ہے جہاں کو مٹی اڑ رہی ہے اس سڑک کے درست ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اگر انتظام کے لئے بابا مرہیم سنگھ صاحب کے ایک صاحبزادہ کو ان کے ساتھ کر دیا جائے تو سڑک درست ہو سکتی ہے اور لاٹ صاحب کو سڑک پر جانے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ڈپٹی کمشنر نے بابا صاحب سے کہا اور بابا صاحب نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ بابا کرتار سنگھ کو نایب تحصیلدار کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ یہ نایب تحصیلدار بابا صاحب کے صاحبزادہ کے ساتھ شام کے وقت راولپنڈی سے دو گھوڑوں کی گھٹی میں (کیونکہ اس زمانہ میں موٹر میں نہ تھیں) روانہ ہوا۔

راستہ میں جو گاؤں آیا وہاں پہنچ کر انھوں نے گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ کل دوپہر کو لفٹنٹ گورنر صاحب بھر جا رہے ہیں اور بابا مرہیم سنگھ نے حکم دیا ہے کہ رات رات میں سڑک تیار کر دی جائے۔ دیہات کے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے نایب تحصیلدار رات کو کلر پہنچ گئے۔ ادھر دیہات کے لوگوں نے جب بابا صاحب کا حکم سنا تو انھوں نے معہ عورتوں اور بچوں کے اپنے اپنے علاقہ کی سڑک کو ہموار کرنا شروع کیا اور ہموار کرنے لگے۔ اب اس سڑک پر دھان کا پھوس جس کو پنجاب میں پرالی کہتے ہیں بچھا دیا گیا۔ نایب تحصیلدار نے رات کو کلر آرام کیا اور یہ اسی گھٹی میں سوار ہو کر صبح راولپنڈی واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ تمام سڑک ہموار ہے اور اس پر پرالی بچھا دی گئی ہے تاکہ مٹی نہ اڑے۔ نایب تحصیلدار یہ دیکھنے کے بعد راولپنڈی پہنچا اور اس نے سڑک کی تیاری کے متعلق ڈپٹی کمشنر سے رپورٹ کی۔ ڈپٹی کمشنر حیران کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ رات رات میں بارہ میل سڑک تیار ہو جائے جب کہ کوئی فوج بھی اتنی جلدی سڑک تیار نہیں کر سکتی۔ سہ پہر کو لفٹنٹ گورنر ڈپٹی کمشنر اور بابا مرہیم سنگھ گھٹی میں راولپنڈی سے کلر روانہ ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام سڑک تیار ہے اور گورنر بھی حیران کہ رات رات میں یہ سڑک کیسے تیار کر لی گئی۔ یہ تینوں اصحاب دو گھنٹہ میں کلر پہنچ گئے۔ وہاں لفٹنٹ گورنر نے چائے پی اور چائے پر باتیں ہوئیں تو لفٹنٹ گورنر نے بابا صاحب سے سوال کیا کہ اگر برطانیہ اور روس یا افغانستان کے درمیان جنگ ہو اور روس یا افغانستان پشاور کے راستہ ہندوستان پر حملہ کرے تو بابا صاحب اس جنگ میں انگریزوں کو کیا امداد دیتے۔ اس کے جواب میں بابا صاحب نے فرمایا کہ فوج کے لئے دس ہزار ہندو اور سکھ جوان اور ایک لاکھ معینہ نقد فوراً

اور چند ہفتہ کے بعد اس سے بہت زیادہ امداد دی جاسکے گی۔ لفٹنٹ گورنر یہ سن کر خاموش ہو گیا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ بابا سرکھیم سنگھ کے اثرات کا نہ صرف اُس زمانہ میں پنجاب کا کوئی ہندو یا سکھ لیڈر مقابلہ نہ کر سکتا تھا بلکہ اُس کے بعد بھی آج تک کسی سکھ یا ہندو لیڈر کو اتنا اقتدار نصیب نہیں ہوا۔ چنانکہ بابا سرکھیم سنگھ کو نصیب تھا اور آپ کے اثرات نہ صرف پنجاب اور صوبہ سرحد بلکہ سندھ اور افغانستان کے ہندوؤں اور سکھوں تک بھی وسیع تھے کیونکہ اُس زمانہ میں تمام ہندو اور سکھ بابا صاحب کے گورداناں کی اولاد ہونے کے باعث ان کو اپنا گوردو اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور عبادت کرنے کے اعتبار سے بھی بابا سرکھیم سنگھ فی الحقیقت ایک مقدس ترین شخصیت تھے اور ان کی اس عبادت گزاری کا اثر ان کے چہرہ پر بھی محسوس ہوتا تھا۔

لفٹنٹ گورنر اس دورہ کے بعد لاہور پہنچے تو آپ نے ایک حکم جاری کیا جس کے مطابق گورنمنٹ نے بابا سرکھیم سنگھ کو کسی ہزار ایکڑ زمین منگمری کے علاقہ میں دی اور اس کے ساتھ ہی حکم دیا کہ آئندہ بابا صاحب جب بھی کہیں جائیں تو اپنے دورہ کی اطلاع گورنمنٹ کو دیں۔ یعنی برٹنل گورنمنٹ نے آپ کے اثرات سے خوف زدہ ہو کر آپ کی ایک طرح سے نظر بندی یا نگرانی شروع کر دی اور بابا صاحب کے اثرات ہی ان کی آزادی میں خلل ہونے۔

مرحوم بابا سرکھیم سنگھ اور آپ کے خاندان کا اُس زمانہ میں ہندوؤں اور سکھوں پر کتنا بڑا اثر تھا اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس خاندان کا کوئی فرد جب کسی گاؤں۔ قصبہ یا شہر میں جاتا تو وہاں کے تمام لوگ آپ کو نذر پیش کرتے اور وہاں ایک میلہ سا لگا رہتا جہاں کہ ان کا قیام ہوتا اور ایڈیٹر "ریاست" کو کپڑے کے تھانوں کی وہ نقادیں اب تک یاد ہیں جو اس نے مانچسٹر اور لنکا شائر سے آئے ہوئے کپڑے پر لگی ہوئی پچپن کے زمانہ میں دیکھیں اور ان نقادیں کے درمیان میں تو بابا سرکھیم سنگھ تھے اور چاروں کونوں پر ان کے چاروں صاحبزادے۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس تصویر میں ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ کی عمر پندرہ سولہ برس کی معلوم ہوتی تھی یعنی شہرت اور اثرات کے لحاظ سے بابا صاحب کا نام غیر ممالک کے صنعتی کارخانے بھی استعمال کرتے تھے تاکہ ان کا مال ہندوستان میں مقبول ہو۔

## ضامن ہونا بھی ایک جرم ہے

مرحوم خواجہ حسن نظامی نے دو پیر قرض مانگنے والوں اور ضمانت دینے کی درخواست کرنے والوں سے تنگ آکر ایک جگہ لکھا تھا کہ ان کے والد جب انتقال کرنے والے تھے تو آپ نے اپنے بیٹے (یعنی خواجہ حسن نظامی) کو نصیحت کی تھی کہ تم نے نہ ترکی کو کبھی روپیہ قرض دینا اور نہ کسی کی ضمانت دینا۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص آپ سے روپیہ قرض دینے کی درخواست کرتا یا ضمانت دینے کے لیے کہتا تو آپ اپنے مرحوم والد کی نصیحت کا حوالہ دے کر

انکار کر دیتے۔ اس زمانہ میں تو خواجہ صاحب کے دوست آپ کے اس قدم کا متحضر اڑایا کرتے اور یہ محسوس کرتے کہ قرض اور ضمانت دینے سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ نسخہ دیکھ چپ ہے کہ آپ اپنے والد مرحوم کی نصیحت پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق قرض فی الحقیقت دوستانہ اور محبت کے تعلقات کو منقطع کرنے کے لیے ایک قبیحی ہے اور ضمانت کا دینا دوسرے کی مصائب و مشکلات کو اپنے ذمہ لینا ہے چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں غالباً کسی شخص کو بھی قرض تو کبھی نہیں دیا اور جب کسی نے قرض مانگا تو روپیہ یہ کہہ کر دے دیا گیا کہ واپس دینے کی ضرورت نہیں یہ آپ کی نذر ہے۔ اور ضمانت کے متعلق تین واقعات میری زندگی میں ایسے ہیں جن کو میں کبھی بھی بھول نہیں سکا اور یہ میرے لیے ہمیشہ ہی ناقابل فراموش ثابت ہوئے۔

۱۹۱۰ء میں تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں جب مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے تمام ہندو، اور سکھ ہندوستان چلے آئے تو ان میں مرحوم سردار امر سنگھ ایڈیٹر ”شیر پنجاب“ اور آپ کا خاندان بھی دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد یہ لوگ پریشان کیونکہ نہ رہنے کے لئے کوئی مکان اور نہ کوئی ذریعہ معاش سردار امر سنگھ کے صاحبزادہ سردار جنگ بہادر سنگھ میرے پاس آئے اور اپنی مشکلات بیان کیں تو میں نے کہا کہ جب تک آپ کے اخبار کے دفتر کا انتظام نہیں ہوتا آپ اپنا دفتر ریاست کے دفتر کے ایک کمرہ میں رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے اخبار ”شیر پنجاب“ کا ڈیکلریشن اپنے نام سے عدالت میں داخل کر دیا تاکہ فوراً منظور ہو جائے۔ اور غالباً دو برس کے قریب دفتر ریاست کے ایک کمرہ میں ہی ان کے اخبار کا دفتر رہا اور یہ بطور دوستانہ ہمدردی کے بغیر کسی کرایہ کے تھا اور رہائش کے لیے آپ نے غازی آباد میں ایک مکان کرایہ پہلے لیا۔ غازی آباد میں مکان لینے کے بعد آپ کشمیری دروازہ کی ایک فرنیچر کمپنی سیٹھ برادر س کے ہاں گئے اور آپ نے فرنیچر کرایہ پر دینے کے لئے کہا۔ اس فرم نے کہا کہ فرنیچر کرایہ پر دینے میں اس فرم کو کوئی انکار نہیں مگر کوئی ضامن ہونا چاہیے۔ سردار جنگ بہادر سنگھ نے فرنیچر کی ضمانت دینے کے لئے مجھ سے کہا۔ ایک معمولی بات سمجھ کر میں نے ضمانت کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اور مجھے خیال بھی نہ رہا کہ میں نے فرنیچر کی ضمانت دی ہوئی ہے اس واقعہ کے غالباً چار برس بعد سیٹھ برادر س کا آدمی میرے پاس پہنچا اور اس نے کہا کہ اب تک نہ تو فرنیچر آپ کیا گیا اور نہ ایک چیمبر کرایہ ادا کیا گیا ہے۔ گیارہ سو روپیہ سردار جنگ بہادر سنگھ کے ذمہ ہے اور چونکہ میں ضامن ہوں یا تو روپیہ ادا کروں نہ عدالت میں مقدمہ دائر کروا جائے گا۔ کیونکہ یہ فرم سردار جنگ بہادر سنگھ سے تقاضہ کرتے کرتے تنگ آچکی ہے اور اب سوائے مقدمہ کرنے کے دوسرا کوئی راستہ نہیں چنانچہ سردار جنگ بہادر سنگھ پر میرے بار بار کہنے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ سیٹھ برادر س نے گیارہ سو روپیہ کا دیوانی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور میرے نام بھی سمن آگئے کیونکہ میں ضامن تھا تاکہ اگر یہ روپیہ سردار جنگ بہادر سنگھ سے وصول نہ ہو تو یہ فرم مجھ سے روپیہ وصول کرے۔ اس مقدمہ کے عدالت میں جانے کے بعد جب میں شہادت کے لیے عدالت میں گیا اور مقدمہ کے پیش ہونے سے پہلے وہاں کے ریٹورنٹ میں چائے پی رہا تھا تو سردار جنگ بہادر سنگھ کے ایک نمائندہ تشریف لائے اور آپ نے

فرمایا کہ

”اگر سردار جنگ بہادر سنگہ یہ روپیہ ادا نہ کر سکے تو یہ روپیہ آپ کو دینا ہو گا اس لیے بہتر ہے کہ آپ اس دستاویز اور اپنے دستخطوں سے انکار کر دیں جو ضمانت کے متعلق ہیں تاکہ آپ سے بھی دُگری کا روپیہ وصول نہ ہو سکے۔“

میں نے جب یہ ضمانت غصہ کے باعث میں کچھ بے قابو سا ہو گیا۔ اور میں نے سخت ترس اچھ میں کہا۔

”تم لوگ نہ صرف خود بے ایمان اور بددیانت ہو جو واجب روپیہ ادا نہیں کرتے اور عدالت میں جھوٹے حلفیہ بیان دے کر اپنے آپ کو رسوا اور ذلیل کر رہے ہو بلکہ تم دوسروں کو بھی بے ایمان

اور بددیانت بننے کی ترغیب دیتے ہو۔ تم لوگوں کو شرم محسوس ہونی چاہیے۔ اگر یہ روپیہ میں نے خود دینا

ہوتا تو میں پھر بھی اس روپیہ سے انکار کرنا کمینہ نہ بن سکتا اور میں نے اپنی زندگی میں کسی بھی عدالت میں

کبھی روپیہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ میں تمہارے لیے جھوٹ کیونکر بول سکتا ہوں۔ اور جس صورت میں

کہ میں فی الحقیقت ضامن ہوں میں ضمانت کی دستاویز اور اپنے دستخطوں سے انکار نہیں کر سکتا

چاہے میرے خلاف دُگری ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اور مجھے یہ روپیہ ادا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

میرے یہ الفاظ سن کر سردار جنگ بہادر سنگہ کے یہ نمائندہ حیران اور اباوس ہو کر اداس چلے گئے۔

مختصری دیر کے بعد۔ مینٹی ہوئی۔ میں نے دستاویز کے درست ہونے اور اپنے دستخطوں کا اقرار کر لیا۔ جرح

میں سردار جنگ بہادر سنگہ کے وکیل نے اپنی وکالت کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے ایک سوال کیا کہ ”کیا تم

سردار جنگ بہادر سنگہ کے خلاف ہو؟“ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں مخالفت کے باعث شہادت

دے رہا ہوں۔ میں نے اس سوال کا جواب دیا کہ ”میں جنگ بہادر سنگہ کے خلاف نہیں ہوں مگر

اس شخص کے چار سو میں ہونے کے باعث میرے دل میں اس کے لیے نفرت و حقارت کے جذبات

ضرور موجود ہیں۔“ میرا یہ جواب عدالت میں بہت دلچسپی کا باعث ہوا۔ چنانچہ میرے بیان کے بعد اس

رہنمائی کے حق میں تو دُگری ہو گئی اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ میرے اس بیان کے چند روز بعد جج

نے ایک ٹی پارٹی میں قریب بیٹھے ایک وکیل دوست کے پاس میرے بیان کے لطیفہ کا ذکر کیا اور کہا

کہ آپ نے اپنی پچھلی عدالتی زندگی میں جرح کے دوران سوال کا ایسا دلچسپ جواب بھی نہیں سنا کہ مدعا علیہ

کے خلاف عداوت یا مخالفت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت و حقارت کے جذبات ہیں۔ سردار جنگ بہادر سنگہ

نے اس دُگری کی اپیل اعلیٰ عدالت میں کی اور اس اپیل کا وہی حشر ہوا جو ماتحت عدالت میں ہوا تھا اور

اس کے بعد مجھے مجھ علم نہیں کہ سردار جنگ بہادر سنگہ نے یہ روپیہ ادا کیا یا نہیں اور کیا تو کب کیرنگ میرے

پاس وصول ہونے کے لیے دُگری ابھی تک نہیں پہنچی۔

تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں ایک صاحب میا کوٹ نے علی تشریف لے آئے۔ جن کی شادی حافظ آباد میں

ہوئی تھی۔ اور ان کے خسر میرے واقف یا دوست تھے۔ یہ صاحب دہلی پہنچنے کے بعد کبھی کبھی ”ترہیت“

میں بھی تشریف لایا کرتے اور کاروبار کے لحاظ سے یہ لاجپت رائے مارکیٹ میں بزاز کی دکان

کرتے تھے۔ میں ایک روز کسی کام کے لیے ڈسٹرکٹ کووٹ گیا تھا اور وہاں یہ حضرت ملے اور آپس



فرمایا کہ ان پر ایک پروٹ کے سلسلہ میں کسی نے ڈیرہ ہزار روپیہ کا مقدمہ دائر کر دیا ہے اور عدالت میں ڈیرہ ہزار روپیہ کی ضمانت دینے کی ضرورت ہے اور میں یہ ضمانت دے دوں۔ میں نے ضمانت کا دینا معمولی بات سمجھا اور ان کے ساتھ دیوانی عدالت میں چلا گیا اور میں نے ضمانت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تو فریق مخالف نے میرے ضمانت دینے پر اس لیے اعتراض کیا کہ میری کوئی غیر منقولہ جائیداد دہلی میں نہیں ہے۔ صاحب اخبار ریاست سے واقف تھے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ ”کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی کوئی غیر منقولہ جائیداد دہلی میں نہیں ہے؟“ میں نے جواب دیا کہ ”تنہا صرف دہلی میں میری کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں بلکہ کسی دوسری جگہ بھی نہیں ہے۔“ صاحب نے یہ سوال صرف مزہ لینے کے لیے ہی کیا تھا کیونکہ کہ میں کبھی ان سے ملنا نہ تھا مگر وہ مجھے جانتے تھے۔ جج صاحب نے فریق مخالف کےکیل سے کہا کہ ”آپ کے خیال میں سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ”ریاست“ سے ضمانت کا پندرہ سو روپیہ وصول نہ ہو سکے گا۔“ فریق مخالف کےکیل صاحب کوئی جواب نہ دے سکے اور جج نے ضمانت کو منظور کرتے ہوئے ضمانت نامہ پر دستخط کر دیئے۔

اس واقعہ کو گزرنے دو برس کے قریب ہو گئے اور مجھے خیال بھی نہ رہا تھا کہ میں نے ضمانت دی ہوئی ہے ایک روز صبح کا وقت تھا اور میں ایڈیٹوریل لکھ رہا تھا کہ دیوانی عدالت کے ایک پیادہ تشریف لائے اور ان کے پاس دو ہزار روپیہ کی ڈگری کا سمن تھا جس میں لکھا تھا کہ ڈگری کاروبار عدالت میں فلاں تاریخ سے پہلے داخل کر دو۔ میں نے جب یہ سمن دیکھا تو میں حیران کہ میرے خلاف تو کوئی دیوانی مقدمہ نہ تھا یہ ڈگری کہاں سے آگئی۔ میں نے سمن کو غور سے پڑھا اور مقدمہ کا عنوان دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ڈگری اُس ضمانت کے متعلق ہے جو میں نے پندرہ سو روپیہ کی دی اور بانی کا خرچہ ملا کر کل رقم دو ہزار روپیہ کے قریب ہے۔

اس روز دوپہر کے وقت میں نے اس شخص کی دکان پر لا جپت رائے مارکیٹ آدمی بھیجا جس کی ضمانت دی ہوئی تھی۔ وہاں سے پتہ چلا کہ یہ حضرت عرصہ ہوا دکان چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے آدمی کو پورائے قلعے میں بھیجا جہاں کہ اس شخص کی رہائش تھی۔ میرا آدمی اس شخص کی بیوی سے ملا تو اس خاتون نے جواب دیا کہ ان کے شوہر حجہ ماہ ہوئے دہلی سے کسی جگہ باہر چلے گئے ہیں اور لا پتہ ہیں۔ اور ان کے پاس ضروری اخراجات کے لیے بھی ایک پیسہ نہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ اس جواب کو سن کر میرا آدمی واپس آگیا اور اس نے بتایا کہ اس خاتون کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنے شوہر کا علم تو ہے مگر یہ اپنے شوہر کی ہدایت کے مطابق ہر فرخ خواہ سے ہی کہتی ہے کہ اس کا شوہر اپتہ ہے تاکہ اس کا بھیجا دیا جائے۔ میں نے اگلے روز پھر اپنے آدمی کو لا جپت رائے مارکیٹ بھیجا وہ پڑوس کی دکانوں سے پتہ لگائے کہ یہ حضرت کہاں ہیں چنانچہ بہت کوشش کے بعد پتہ چلا کہ شخص لعل انبالہ کے ایک مقام جٹانگرم میں ہے اور وہاں ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر میں نے اس شخص کو اس بتائے ہوئے پتہ پر ایک خط لکھا کہ آپ کے فائدہ کی بات ہے کہ آپ فوراً اور پہلی گاڑی میں دہلی پہنچے ورنہ آپ کا بھرت نقصان ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس

شخص کا کوئی جواب نہ آیا تو پھر جتنا لگے آدمی بھیج کر اسے یہاں بلواؤں گا۔ مگر اس خط کو پڑھتے ہی رچرک خط میں اس کے فائدہ اور نقصان کا ذکر تھا، یہ شخص اگلے روز دہلی چلا آیا اور دفتر ریاست میں پہنچا۔ اور اس کے اور میرے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ آجکل کہاں رہتے ہیں۔

میں جتنا لگ رہتا ہوں اور وہاں کسی روز گار کی تلاش میں ہوں۔

ابھی حال میں عدالت کا ایک بیلٹ میرے خلاف ڈگری لایا تھا۔ یہ ڈگری دو ہزار روپیہ کی نفی اور ڈگری ضمانت کے روپیہ کے متعلق تھی۔

میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ نہیں۔

گویا کہ آپ اس ڈگری کے متعلق اخلاقی اعتبار سے اپنا کوئی فرض نہیں سمجھتے۔

میرے پاس جب کہ ایک پیسہ موجود نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

گویا کہ مجھے یہ روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔

اور دوسری کیا صورت ہے۔

گویا کہ آپ کا اس ڈگری کو ادا کرنا کوئی فرض ہی نہیں۔

میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

اب اس مقدمہ کی آپ نے اپیل کی ہے۔

ہاں اپیل کی ہے اور یہ اپیل سیشن جج کی کورٹ میں ہے اور اس کے لیے غلط تاریخ

مقرر ہے۔

تو آپ اس ڈگری کو ادا نہ کریں گے اور اس ڈگری کا روپیہ مجھے لازمی طور پر ادا کرنا پڑے گا۔

ایسی ہی صورت ہے۔ میں تو مجبور ہوں۔

چھت اچھا۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ میں نے یہ کہا اور یہ حضرت چلے گئے۔

میں نے وکیلوں سے مشورہ کیا کہ کیا کوئی صورت ہے کہ اس مقدمہ میں دی گئی میری ضمانت

منسوخ ہو تو وکیلوں نے کہا کہ یہ غیر ممکن ہے۔ مقدمہ کے شروع میں جب تک کہ ماتحت عدالت سے

فیصلہ نہ ہوا تھا میں اپنی ضمانت منسوخ کرا سکتا تھا اب تو یہ غیر ممکن ہے اس ڈگری کا روپیہ تو دینا

ہی ہو گا۔

اتفاق دیکھئے کہ یہ اپیل جب سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوئی تو ماتحت عدالت کے فیصلہ

میں کچھ قانونی نقائص تھے اور عدالت کی کارروائی میں کچھ بے ضابطگیاں تھیں سیشن جج نے اس

فیصلہ میں مقدمہ کی ان خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مقدمہ نئے سرے سے شروع ہو اور جو

قانونی خامیاں رہ گئی ہیں وہ دور کی جائیں۔ چنانچہ یہ مقدمہ پھر نئے سرے سے چلانے کے لئے

ماتحت عدالت میں آگیا اور مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے فوراً وکیل کی معرفت اپنی ضمانت

کے منسوخ کرنے کی درخواست دے دی۔ اور عدالت نے مدعا علیہ کو حکم دیا کہ وہ نئی ضمانت

داخل کرے۔ اس حکم کے مطابق میری دی گئی ضمانت تو منسوخ ہوگئی اور مجھے معلوم نہیں کہ دوسری ضمانت کس نے دی اور اس ضامن کا کیا حشر ہوا۔

تبادلہ آبادی کے بعد جب مغربی پنجاب سے ہندو ہندوستان آئے تو ان میں ایک صاحب لالہ سرداری لال بھی تھے جو لائل پور میں ایک پریس یعنی چھاپہ خانہ کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ صاحب دہلی آئے تو چونکہ یہ لائل پور میں ایک پریس کے مالک تھے انھوں نے کوشش کر کے اپنے نام الامان پریس الاٹ کر لیا کیونکہ اس پریس کی مالکہ (مولانا مظہر الدین ایڈیٹر اخبار "الامان" کی بیوہ) پاکستان چلی گئی تھیں۔ اس الامان پریس کے لالہ سرداری لال کے نام الاٹ کرنے کا جب فیصلہ ہوا تو لالہ سرداری لال میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اس پریس کے متعلق سات ہزار روپیہ کی ضمانت دے دوں کیونکہ کسٹوڈین تب اس پریس کا قبضہ دے سکتا ہے اگر کوئی معتبر ضامن ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ میری کوئی غیر منقولہ جائیداد دہلی میں نہیں اس لیے میری ضمانت منظور نہ ہوگی مگر آپ نے فرمایا کہ ضمانت کے منظور ہونے کا یہ انتظام خود کر لیں گے۔ اسے اخلاقی جرأت کی کمی سمجھنے یا مردت کے جذبات کا غلط استعمال۔ میں ضمانت دینے پر آمادہ ہو گیا اور میں نے اس پریس کے متعلق سات ہزار روپیہ کی ضمانت دے دی اور کاغذات پر دستخط کر دیے۔ اس ضمانت کے دوسرے بعد میں نے لالہ سرداری لال سے درخواست کی کہ اب کسی دوسرے سے ضمانت دلوادیکجئے اور اس ضمانت سے میرا چھٹکارا کرایئے مگر لالہ سرداری لال نے کوئی پروانہ کی اور پہلے تو ضمانت دوانے کے لیے لالہ سرداری لال میرے مکان کے چکر کاٹتے تھے اور اب کئی برس سے میرے آدمی لالہ سرداری لال کے مکان کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ چنانچہ آخر تک آکر میں نے کسٹوڈین کو درخواست دی کہ میری ضمانت منسوخ کر دیجئے ورنہ میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ میری اس درخواست پر کسٹوڈین نے ایک انسپکٹر کو تحقیقات کے لیے مقرر کیا اور اس کسٹوڈین نے تحقیقات کے بعد رپورٹ کی کہ پریس میں اٹھارہ سو روپیہ کی پلیٹیں وغیرہ موجود نہیں۔ چنانچہ کسٹوڈین کا میرے پاس حکم پہنچا کہ یہ اٹھارہ سو روپیہ ادا کرو تو ضمانت منسوخ کی جاسکتی ہے۔ میں نے پھر درخواست کی کہ آپ یہ اٹھارہ سو روپیہ پریس کے الایٹ سے وصول کرنے کی کوشش کیجئے اور اگر یہ روپیہ الایٹ سے وصول نہ ہو تو پھر مجھے اس روپیہ کی ادائیگی کا ذمہ دار سمجھا جائے مگر میری اس درخواست کا بھی وہی حشر ہوا جو مجھ جیسے دوسرے ہزار ہا ضمانتوں اور امکان جائیداد کا جو رہا ہے یعنی کسٹوڈین کا کوئی جواب ہی نہیں آتا اور میں مسلسل سات ہزار روپیہ کا ضامن ہوں۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ مسٹر سرداری لال مجھ پر رحم فرمائیں گے یا نہیں اور رحم فرمائیں گے نہ کہ اب میری اس ضمانت کا کیا حشر ہوگا۔ کیونکہ جب انسان اخلاقی وعدوں کی کوئی قدر و قیمت سمجھے تو پھر وہ "برہم گمانی" ہو جاتا ہے جس پر عزت یا رسوائی کا کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا۔

ضمانت کے اس تجربہ کے بعد میری رائے یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی ضامن نہ بننا چاہیے اور اگر وہ کسی کی مدد کرنا ہی چاہے تو ضمانت یا قرض دینے کے مقابلہ پر بہتر یہ ہے کہ روپیہ کے داپس لینے کا خیال چھوڑ کر مدد کر دی جائے تاکہ نہ تو ضمانت کے منسوخ کرانے کی کوفت ہو اور نہ قرض واپس لینے کا خیال

## گھر کا جوگی جوگرہ

پنجابی زبان میں ایک کہاوت ہے ”گھر کا جوگی جوگرہ باہر کا جوگی رسدہ“ اس کہاوت کے معنی ہیں کہ اگر کسی ولی اللہ کی تمام دنیا میں بھی شہرت ہو اور تمام دنیا اس کے سامنے سر جھکا کر رہے ہیں اور گھر کا وطن کے لوگ پھر بھی اس کو ولی اللہ تسلیم نہیں کرتے اور یہ اس کی مخالفت ہی کرتے رہتے ہیں اور دور کا رہنے والا کوئی سادہ چاہے دھوکہ باز یا گرا کر ہی ہو لوگ اس کو درویش کا بل سمجھتے ہیں یعنی کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی نظروں میں بلند اور قابل احترام قرار نہیں دی جاسکتی۔

میں فیروز پور جیل میں تھا تو رہاں دہلی کے رہنے والے یا دہلی میں نظر بند کیے گئے ساتھ کے قریب سیاسی قیدی تھے جو ستیہ اگرہ کی تحریک کے سلسلہ میں وہاں رکھے گئے اور ان لوگوں میں ایک صاحب رہنمائی کے رہنے والے پروفیسر گرگیشور (میرا خیال ہے کہ یہی یا اس سے ملتا جلتا نام تھا) بھی تھے جو پندرہ برس سے ہما تھا گا ندھی کے سابر مٹی آشرم میں طلباء کو پڑھایا کرتے اور جن کو دس بارہ برس تک ہما تھا جی کے ساتھ دن رات رہنے کا اتفاق ہوا مجھے جب یہ پتہ چلا کہ پروفیسر صاحب اتنا طویل عرصہ تک ہما تھا جی کے ساتھ رہے ہیں تو موقع مل گیا اور میں نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی کہ وہ جیل کی میری کوٹھری میں آجائیں تاکہ ہم دونوں وقت اچھی طرح سے گزار سکیں۔ پروفیسر صاحب مجھے اور ”ریاست“ کو جانتے تھے انھوں نے میری اس درخواست کو قبول فرمایا اور یہ اپنا بسترہ اور سامان میری کوٹھری میں لے آئے۔ اور ہم دونوں نے اکٹھا رہنا شروع کیا اور مجھے موقع مل گیا کہ میں ہما تھا جی کے متعلق اپنی معارف وسیع کر سکوں۔

’ہما تھا گا ندھی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھنگی صفائی پسند ہے تو وہ بھنگی ہوتے ہوئے بھی برہمن کہلائے جانے کا مستحق ہے اور اگر کوئی برہمن صفائی پسند نہیں تو وہ برہمن ہوتے ہوئے بھی بھنگی ہے۔‘ ہما تھا گا ندھی کی اس آئیڈیالوجی کا ان کے تمام بھگتوں پر اثر ہے اور میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا کہ وہ ہما تھا گا ندھی کے اصولوں کا عملی طور پر منقلد ہو اور وہ صفائی پسند نہ ہو۔ چنانچہ یہ پروفیسر صاحب بھی بے حد صفائی پسند تھے۔ میں تو صبح آنکھ کھلتے ہی ضروری حاجت سے فارغ ہو کر درجن کے لیے جیل کے اندر جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتا اور ایک گھنٹہ تک چلتا رہتا تاکہ تین میل کی مسافت طے ہو جائے۔ اور اس عرصہ میں پروفیسر صاحب تمام کمرہ میں بھاڑ دیتے۔ تمام کپڑوں اور سامان کو بھاڑنے اور میرا اور اپنا بسترہ درست کر کے بچھا دیتے اور میں جب واپس آتا تو کمرہ سامان اور برتن وغیرہ مشینہ کی طرح صاف ملتے۔ پروفیسر صاحب کچھ تو عمر میں مجھ سے بڑے تھے اس کے علاوہ بے حد نیکدل اور بلند۔ میں کچھ شرم سی محسوس کرتا کہ یہ میرے

کپڑوں اور سامان وغیرہ کی بھی صفائی کر دیتے ہیں۔ میں آتے ہی ہر روز ان سے کہتا کہ ”پروفیسر صاحب آپ نے کیوں تکلیف کی میں اگر صفائی کرتا“ اور یہ میرے اس کہنے پر مسکرا دیتے جس کا مطلب یہ تھا کہ میں تو ہر روز یہ کہتا ہی چلا جاؤں کہ آپ نے کیوں تکلیف کی اور پروفیسر صاحب اپنی فطرت کے مطابق صفائی کر ہی دیا کریں گے۔ پیدل چلنے کے بعد میں کوٹھڑی میں پہنچ کر درزن کو کہتا تھا ”اندھورا یکسر سائز“ کہنا چاہیے۔ اور یہ درزن ایک گھنٹہ کے قریب جاری رہتی تاکہ میرا وزن کم ہو جائے (یہ واقعہ دیکھنا ہے کہ میں جب جیل میں گیا تو میرا وزن تین سو دس سیر تھا اور جب جیل سے رہا ہوا تو میرا وزن دو سو دس سیر تھا یعنی میں نے ایک برس اور تین ماہ جیل میں رہ کر قوم اور ملک کو انٹی پرنڈ یا ایک سو چرنی نذر کی اور میں ان لوگوں کے مقابلہ پر زیادہ فخر کر سکتا ہوں جنہوں نے قوم اور ملک کے لیے اپنا خون دیا) درزن کہنے کے بعد ہاتھ لگا کر مذہبی کے متعلق باتیں شروع ہو جاتیں جب بھی وقت ملتا ہاتھ لگا کر مذہبی کے پچھلے حالات سنتا اور رات کو بھی کھانا کھانے کے بعد ہاتھ لگا کر مذہبی کے حالات ہی کرید کرید کر پوچھتا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میں ہاتھ لگا جی کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کروں کئی روز تک باتیں ہوتی رہیں اور میں نے ہاتھ لگا جی کے متعلق بہت کافی معلومات حاصل کر لیں تو میں نے ایک روز پروفیسر صاحب سے سوال کیا کہ

”کیا ہاتھ لگا جی کی بیوی کستور ابائی جی ہاتھ لگا جی کو نالایتی سمجھتی تھیں یا وہ بھی ہاتھ لگا جی کی بلندی کی قائل تھیں؟“

میرا یہ سوال سن کر پروفیسر صاحب کچھ حیران سے ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ”اس کا کیا مطلب؟“ جس کے معنی یہ تھے کہ میں ایک پھر سوال کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے سوال کو بخوبی سمجھنے کے ساتھ پھر دہرایا اور کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر پیغمبر اور اوتار یا ولی اللہ کے گھروالے اس کی بلندی کے قائل نہیں ہوتے۔ اور اسے نالایتی ہی سمجھتے ہیں۔ کستور ابائی جی کا ہاتھ لگا جی کے متعلق کیا خیال تھا وہ ان کو دوسرے لوگوں کی طرح ہی ایک ہاتھ لگا جی سمجھتی تھیں یا ان کو نالایتی شہرہ تصور کرتی تھیں کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی لیڈر کی غیر تعلیم یافتہ بیوی اپنے شوہر پر غور نہیں اور اسے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس لیڈر کے ساتھ شادی ہونے کی جگہ یہ کسی گھر کے سے بیابانی جاتیں تو اچھا تھا تاکہ کلرک شوہر کو اس سے باتیں کرے بازار سے سودا سلف لائے۔ بچوں کو اٹھائے پھرنے اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے وقت آتا اور اب یہ لیڈر شوہر اول تو گھر میں قدم ہی نہیں رکھتا اور گھر آئے بھی تو یہ پبلک کے کاموں یا اخبارات پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔ میرا سوال تفصیل کے ساتھ سننے کے بعد پروفیسر صاحب سوچنے لگ گئے اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد آپ نے فرمایا۔

”ہاں۔ یہ تو سچ ہے کہ آشرم میں جب کوئی نیا شخص آتا تو کستور ابائی جی کی پیشانی پر ہل پڑ جاتے۔ اور جب راشن کی کمی ہوتی تو اپنے شوہر کو کہنے لگ جاتیں کہ آشرم میں متے لوگوں کو کیوں ہل رکھا ہے۔ جس کے جواب میں ہاتھ لگا جی مسکرا دیا کرتے“

پروفیسر صاحب کا یہ جواب سن کر میں نے کہا کہ میرا سوال اطمینان بخش صورت میں حل ہو گیا ہے اور دوسرے بیغیروں۔ اولیاء اللہ اور بڑے بیڈروں کی بیویوں کی طرح کستور بانی بھی اپنے شوہر سے زیادہ مطمئن نہیں تھیں اور ان کو بھی اپنے نظریہ کے مطابق یقیناً کبھی یہ خیال آتا ہوگا کہ اس ہمانا شوہر کی جگہ رگروہ کسی کلرک سے بیاہی جاتیں تو خوش رہتیں کیونکہ کلرک شوہر کو صرف اپنی بیوی کی فکر ہوتی اس کو ہمانا ہی کی طرح تمام دنیا کی فکر تو نہ ہوتی۔

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس پامود بہت ہی بلند لوگوں میں سے ہیں اور آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں انسانوں کی آنکھوں کے آپریشن کیے اور جن کے باعث موگا (منسلق فیروزپور) کے قصبہ کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی کیونکہ آپ ساہا سال تک دہلی کے انچارج تھے اور آپ سے آپریشن سیکھنے کے لیے یورپ اور امریکہ سے بھی آنکھوں کا آپریشن کرنے والے ڈاکٹر آیا کرتے۔ اور اس بات کو چھوڑ کر کہ آپ دہلی کے بہترین آنی سپیشلسٹ ہیں ذاتی طور سے بھی آپ کو ایک فرشتہ کہا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے رویہ سے کئی سکول۔ کالج اور ہسپتال قائم کیے اور آپ ساہا سال تک پانچ ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ان انسٹی ٹیوشنز کو بطور امداد دیتے رہے۔ میں ایک زمانہ میں جب بیکار تھا تو چند ماہ اپنے وطن حافظ آباد رہا۔ ڈاکٹر صاحب بھی حافظ آباد کے رہنے والے ہیں ایک روز ڈاکٹر صاحب موگا سے حافظ آباد گئے اور آپ آنکھوں کے مریضوں کو دیکھنے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہوئے تو دوسرے چالیس پچاس لوگوں کے ساتھ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو آگے آگے تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے اور میں اور دوسرے لوگ ان کے پیچھے تھے۔ اور جب آپ بازار میں سے گزر رہے تھے تو ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے دو بڑے اشخاص نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اس مجمع کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ان دو میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ یہ کون شخص چلا جا رہا ہے جس کے ساتھ اتنے لوگ ہیں تو دوسرے نے جواب دیا کہ ”یہ نانک چند پامودہ کالا کا متھرا داس پامودہ جا رہا ہے جو موگا میں ڈاکٹر ہے۔ اور اس کے ساتھ جانے والے بیماروں کے رشتہ دار ہوں گے جو اپنے عزیزوں کی آنکھیں دکھانا چاہتے ہیں“

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے والد مرحوم لالہ نانک چند ڈاکٹر تھے اور اپنے زمانہ کے اچھے مشہور ڈاکٹروں میں سے تھے اور ڈاکٹر متھرا داس خود رائے بہادر بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ آنی سپیشلسٹ اور ایک بلند ترین شخصیت ہیں مگر اپنے ہوطنوں کی نظروں میں ان کے والد ڈاکٹر نانک چند پامودہ تو صرف نانک چند ہی رہے اور رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس صرف متھرا داس میں بنی نظر کا جوگی جو گڑبہا ہر کا جوگی سیدھہ کے مصداق ڈاکٹر متھرا داس کو چاہے دنیا ایک بلند ترین ہمانا ہی سمجھتی ہے مگر یہ اپنے عزیز و اقارب اور ہوطنوں کے خیال میں تو متھرا داس ہی ہیں اور ہمیشہ متھرا داس ہی رہیں گے۔ کیونکہ آج تک کوئی بھی بیغیر ادمار۔ علی اللہ باڈرا شخص اپنے عزیزوں اور ہوطنوں کی نظروں میں بلند قرار نہ دیا جاسکا۔ اور نہ دیا جائے گا اور رسول اللہ حضرت مسیح اور گوردانک کے ساتھ بھی ان کے ہم وطنوں نے اچھا سلوک نہ کیا کیونکہ انسان کا ہر دم وطن اور رشتہ دار نظر آتا

حاسد ہوتے ہوئے اپنے دل میں بغض اور عداوت کے جذبات رکھتا ہے اور اس کا ایک ہم وطن اور رشتہ دار کو دیکھ کر خوش ہونا ممکن نہیں۔

## سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ آف ناہیہ

میں اپنی زندگی میں جن چند بلند ترین لوگوں سے ملا۔ ان میں ناہیہ کے سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ ایک اہم شخصیت تھے۔ بھائی صاحب ریاست ناہیہ کے رہنے والے تھے۔ عمر غالباً پچھتر برس کے قریب۔ سفید دڑھی۔ چہرہ پر سُرخ اور سپیدی جیسے نور برستا ہو۔ بہت عالم۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ بہت بڑے سیاست دان اور آپ نہایت پاکیزہ ہندی میں بات چیت کرتے۔

بھائی صاحب کا ہن سنگھ مرحوم ہمارا جہاں بھلا موجودہ ہمارا جہاں کے والد کے ٹیوٹر تھے جب کہ ہمارا جہاں ابھی دلی عہدہ تھے اور ہمارا جہاں کے گدی پر بیٹھنے کے بعد آپ ریاست ناہیہ میں فارن منسٹر مقرر ہوئے۔ آپ وہاں فارن منسٹر تھے کہ ریاست ناہیہ اور پٹیالہ کے درمیان تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے۔ اور ان کشیدہ تعلقات کے زمانہ میں آپ ایک روز اتوار کے دن اپنے صاحبزادہ سے ملنے کے لیے پٹیالہ چلے گئے جہاں کہ صاحبزادہ کالج میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ گو آپ کو ہمارا جہاں کے ٹیوٹر ہونے کا انحراف مگر ہمارا جہاں آخر ہمارا جہاں تھے۔ آپ کے پٹیالہ جانے کے بعد کسی مخبر نے ہمارا جہاں کو اطلاع دی کہ ناہیہ اور پٹیالہ کے تعلقات کشیدہ ہونے کی صورت میں بھی بھائی کا ہن سنگھ پٹیالہ گئے ہیں۔ آپ واپس آئے اور اگلے روز ہمارا جہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہمارا جہاں اور بھائی صاحب کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

ہمارا جہاں: آپ کل کہاں تھے۔

بھائی صاحب: میں اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے پٹیالہ گیا تھا۔

ہمارا جہاں: آپ کس کی اجازت سے گئے۔

بھائی صاحب: میں قیدی تو نہیں ہوں کہ پوچھ کر جاتا۔ کل اتوار کے باعث دفاتر بند تھے اس لیے چلا گیا۔

ہمارا جہاں: آپ کے خیال میں آپ کا قیدی ہونا مشکل ہے۔

بھائی صاحب بہت نازک الحس تھے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہے۔ اور آپ نے محسوس کیا کہ ہمارا جہاں کے تیور بدلے ہوئے ہیں، آپ گھر واپس آئے تو ملتانم کو سفر کا سامان باندھنے کے لئے حکم دیا اور رات کی گاڑی سے بغیر کسی کو اطلاع دیئے سری نگر چلے گئے۔

بھائی کا ہن سنگھ کے ناہیہ سے جانے کے بعد ہمارا جہاں نے اخبارات میں ایک بیان دیا کہ سردار بہادر بھائی کا ہن سنگھ فارن منسٹر ناہیہ سے بھاگ گئے ہیں۔ جس کے جواب میں

بھائی کا ہن سنگھ نے اخبارات میں ایک بیان دیا کہ آپ گرمیوں کے زمانہ میں ہمیشہ پہاڑ پر جایا کرتے ہیں اس لیے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے آپ سری نگر آئے ہیں مابھ سے بھاگ کر نہیں آئے اور آپ نا بھ کے خاندان کے بدستور و فاشعار اور خیر خواہ ہیں۔ یعنی بات تو معنی تھی۔ آپ اپنے صاحبزادہ سے ملنے کے لیے پٹیار گئے۔ مگر نا بھ اور پٹیار کے تعلقات کی کشیدگی اور غلط فہمی کا شکار ہوئے اور معاملہ اخبارات کے ذریعہ پہلک تک پہنچ گیا۔ کیونکہ ہمارا جہ نا بھ بھی سکھوں میں ایک لیڈر تسلیم کیے جاتے تھے۔ اور بھائی صاحب تو ایک لائق اور مصنف ہونے کے باعث سکھوں میں بہت ہی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے اور شاید پڑھا لکھا ایک سکھ بھی ایسا نہ ہوگا جو آپ کے نام سے واقف نہ تھا۔ بھائی کا ہن سنگھ کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں پر بھی کافی اثر تھا اور انگریز ان کی قابلیت کے مداح تھے۔ اس کے بعد نا بھ اور پٹیار کے تعلقات جب زیادہ کشیدہ ہو گئے تو ہمارا جہ پٹیار کے زور دینے پر آپ ریاست پٹیار میں فارن منسٹر مقرر ہوئے اور میری رائے میں یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کیونکہ ان کے لیے مناسب تھا کہ آپ اگر نا بھ سے چلے گئے تھے تو ہمارا جہ نا بھ کے مخالف ہمارا جہ پٹیار کے ہاں نہ جاتے اور انگریزی علاقہ میں ہی رہتے تاکہ آپ پر نا بھ کے غیر و فاشعار ہونے کا الزام نہ لگایا جاسکتا۔ چند برس بعد جب نا بھ اور پٹیار کے درمیان سردار بہادر بھائی اور جن سنگھ باگڑیاں راجونا بھ۔ پٹیار اور جیند کی ریاستوں کے مذہبی مشیر تھے ان کی کوششوں سے صلح ہوئی تو اس صلح میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ بھائی کا ہن سنگھ کو واپس نا بھ بھیج دیا جائے گا اور ہمارا جہ نا بھ ان کے ساتھ کوئی بڑا سلوک نہ کریں گے چنانچہ صلح کی ان شرائط کے مطابق بھائی کا ہن سنگھ نا بھ واپس آ گئے اور آپ نے اپنی رہائش اپنے گاؤں پٹھو میں اختیار کر لی اور کبھی کبھی ہمارا جہ نا بھ سے اجازت لے کر نا بھ چلے آتے یا گرمیوں کے موسم میں انگریزی علاقہ کے کسی پہاڑی مقام پر چلے جاتے کیونکہ آپ نے زندگی بھر گرمیوں کا زمانہ ہمیشہ ہی پہاڑی مقامات پر گزارا اور ہر سال پہاڑ کی رہائش بدل لیتے یعنی اگر اس سال کوئی ٹیڈ گئے ہیں تو اگلے سال آپ منصورہ جاتے اور اس سال اگلے سال کوہ مری یا کسی دوسرے پہاڑ پر۔ اس اعتبار سے بھی آپ کا معیار بہت بلند تھا۔ اور جب ہمارا جہ نا بھ سیاسی مشکلات میں مبتلا ہوئے اور گرگرنٹ ہمارا جہ کے خلاف تھی تو آپ کو ہمارا جہ نے نا بھ بلوایا تاکہ آپ ہمارا جہ کو مشورہ دے سکیں۔

اس زمانہ میں جب بھائی کا ہن سنگھ نا بھ میں مقیم ہوئے تو میں ان کے پاس دوسرے تیسرے روز جایا کرتا کیونکہ آپ سے ملنا اور بات چیت کرنا نہ صرف پُر لطف ہوتا بلکہ یہ معاملات کے وسیع اور قابلیت میں اضافہ کرنے کا باعث بھی تھا۔ اس سال آپ گرمیوں میں پہاڑ پر نہ جاسکے کیونکہ ہمارا جہ کو آپ کے مشورہ کی ضرورت ہوتی۔ میں ایک روز آپ سے ملنے کے لیے گیا تو آپ نے گرمی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی ایک ذاتی کو بھٹی سولن پہاڑ کے مقام پر ہے۔ یہ کہ بھٹی ریاست پٹیار کے علاقہ میں ہے اور چونکہ نا بھ اور پٹیار کے درمیان تعلقات پھر کشیدہ ہو چکے ہیں۔



اس لیے آپ اپنی اس کو مٹھی میں بھی نہیں جاسکتے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ ”بھائی صاحب آپ نے ایک ریاست کے علاقہ میں کو مٹھی بنانے کی کیوں غلطی کی؟“ اس کے جواب میں آپ نے جو کچھ کہا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا۔

”دیوان سنگھ جی۔ زندگی میں ایک غلطی کی ہو تو اس غلطی پر رو دیا بھی جائے۔ جب زندگی ہی غلطیوں سے بھری پڑی ہے تو کس کس غلطی پر رو دیا جائے۔ اور سب سے بڑی غلطی تو یہ ہوتی کہ ایک ریاست کے علاقہ میں پیدا ہوتے جس کا خلیازہ بھگت رہے ہیں اگر انگریزی علاقہ میں پیدا ہوتے تو ان مشکلات اور کشمکش کا شکار ہونا نہ پڑتا۔“

یعنی ہندوستان کے آباد ہونے سے پہلے کسی ریاست کے علاقہ میں پیدا ہونا بھی قدرت کی طرف سے ایک سزا سمجھا جاتا تھا۔

بھائی کاہن سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی کتابیں لکھیں اور ان کتابوں میں گورست پر بھاگ اور گورست سدھا کر دو کتابیں تو سکھوں میں ایک اتھارنی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب میں آپ نے چند اشعار میں سکھ قوم کو ایک دُعا دی ہے۔ اس دُعا میں آپ فرماتے ہیں۔

تیری کر پچی کر پان ننت چلتی رہے

دکھانا تقسیم کرنے والی تیری کر پچی یعنی چچا اور ظالم کو ختم کرنے والی کرپان یعنی تلوار دونوں ہمیشہ ہی چلتی رہیں ان کو کبھی بھی قرار اور سکون نصیب نہ ہو۔ یعنی تمہارے لسنگر ہمیشہ جاری رہیں اور تم دُنیا میں سے ظلم کو ہمیشہ ہی ختم کرتی رہو۔

بھائی کاہن سنگھ رہن سہن کے اعتبار سے بھی جہت بلند تھے۔ برت کی طرح سفید کپڑے زیب تن فرماتے غسل کے لئے فیتی سے فیتی سامان استعمال کرتے۔ سکون کی زندگی کو ترجیح دیتے اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی بھر کبھی بھی بازار کی کچی ہوئی کوئی شے مثلاً مٹھائی یا ایک دغیرہ نہ کھائی کیونکہ آپ کی صفائی پسند طبیعت کسی گندی۔ خواب یا مٹکھی بیٹھی ہوئی شے کا کھانا گوارا نہ کرتی تھی۔

بھائی کاہن سنگھ ایک لایق ترین سیاست دان تھے اور آپ سے جب بھی ہمارا جہنا جہ نے مشورہ لیا تو آپ نے یہی رائے دی کہ ہمارا جہ پرنسپل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں سے تعلقات کشید نہ کریں مگر ہمارا جہ پر اس نصیحت کا کبھی کوئی اثر نہ ہوتا اور رائے دینے والے اس شخص کو بڑا دل سمجھا جاتا تھا اگر نروں سے تعاون کرنے کی رائے دیتا۔ میں آپ سے اس مسئلہ پر ایک بار بات چیت کر رہا تھا تو آپ نے فرمایا۔

”دیوان سنگھ جی۔ اگر نروں تو دیوان سنگھ کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ کاہن سنگھ کا کیدنگر۔ اگر ان پر ظلم کریں تو اس ظلم کے خلاف آواز پیدا کرنے کے لئے اسمبلیاں اور پارلیمنٹ موجود ہے جہاں کہ اس ظلم کو بے نقاب کیا جاسکتا ہے مگر اگر نروں گر چاہیں تو ہمارا جہ ناجیہ

تو کیا نظام دکن کو بھی پس کر رکھ دیں۔ نہ کوئی سُننے والا ہے نہ سُنانے والا۔ کیونکہ ان کی رعایا خود ان سے نالاں ہے۔

سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ بہت ہی خوبیوں اور محبت کے انسان تھے۔ اگر آپ ریاست نا بھ میں پیدا نہ ہوتے تو یقیناً آپ ملک کے پہلی قطار کے لیڈروں میں جگہ حاصل کرتے مگر آپ کا ایک ریاست کے علاقہ میں پیدا ہونا آپ کی شہرت اور عزت کو صرف سکھوں کے حلقہ تک ہی محدود رکھنے کا باعث ہوا۔ اور ریاستیں جہاں ریاستوں کی پبلک کے لئے جہتم تھیں وہاں یہ سینکڑوں بڑے اور بلند لوگوں کو بھی گناہی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث ہوئیں۔

## روپیہ اور فیاضی

روپیہ اور فیاضی دونوں بہت کم صورتوں میں ایک جگہ جمع رہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ اکثر صورتوں میں ایک دوسرے کی ضد بھی ہوتے ہیں۔ یعنی عام طور پر فیاض وہ لوگ ہوتے ہیں جو مفلس ہوں اور سرمایہ دار فیاض نہیں ہو کرتے کیونکہ جو شخص فیاض ہو گا وہ روپیہ صرف کرنا ہے گا اُس کے پاس روپیہ جمع ہونا مشکل ہے اور روپیہ وہ ہی جمع کر سکتا ہے جس کا دل فیاض نہ ہو اور روپیہ کو اپنی چھاتی سے لگا کر رکھے۔ روپیہ اور دل کی فیاضی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہوں۔

پنجاب کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار خطاب یا فٹہ رائے بہادر۔ اور لیڈر کلاس کے ایک بزرگ تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں پنجاب سے دہلی آ گئے۔ ان کے نہ صرف پنجاب بلکہ یوپی میں بھی درجنوں کارخانے اور شگر سلیس تھیں تبادلہ آبادی کے باعث جب ان کو اپنی لاکھوں روپیہ کی جائیداد پنجاب میں چھوڑنی پڑی تو آپ اس صدمہ سے بیمار ہو گئے اور غالباً دہریس تک بیمار رہے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار یہاں شروع کر دیا اور کاروبار کے سلسلہ میں یہ بھی کبھی اخبارات کو کچھ تھوڑا بہت اشتہار بھی بطور امداد دے دیا کرتے کیونکہ اخبارات کے رسپانڈ ہیں اور ادبی لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور یہ ”ریاست“ کے بھی بہت بڑے ملاحوں اور مقررین میں سے اور اس کے خریدار ہیں۔

دفتر ”ریاست“ کے منیجر پنڈت سوم ناتھ ایک بار اشتہار کے سلسلہ میں ان سے ملنے گئے تو آپ نے پنڈت جی کے پاس ”ریاست“ کی تعریف شروع کر دی اور آپ ایک گھنٹہ کے قریب تعریف کرتے رہے اور آپ نے فرمایا کہ آپ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ریل۔ زور قلم اور حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کے اعتبار سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے اردو اخبارات میں سے کوئی اخبار بھی ”ریاست“ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس تعریف کو سن کر پنڈت سوم ناتھ نے آپ سے کہا کہ آپ ”ریاست“ کے اس قدر مداح ہیں۔ اور خدا کے فضل سے آپ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں اور ادھر ”ریاست“ مالی پریشانیوں

میں مبتلا ہے ان حالات میں آپ اگر ”ریاست“ کو اُردو کا بہترین اور مفید ترین اخبار سمجھتے ہیں تو پھر  
 نیاضی کا غموت دیتے ہوئے اس کی امداد کیوں نہیں کرتے۔ یہ آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ پنڈت  
 سوم ناتھ کے یہ الفاظ سن کر آپ نے جواب دیا۔ کہ آپ ”ریاست“ کی امداد کرنا چاہتے ہیں۔ اور ضرور  
 امداد کریں گے۔ اس بات چیت کے تین یا چار روز بعد ان بزرگ کا ایک خط ملا جس کے ساتھ تین سو روپیہ  
 کا چیک تھا۔ اور اس خط میں لکھا تھا کہ چونکہ ”ریاست“ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے اس لئے یہ  
 تین سو روپیہ اس کی امداد کے لئے ارسال ہے۔ پنڈت سوم ناتھ نے ان کے ساتھ جوابات چیت کی تھی  
 اُس کا علم مجھے پہلے ہو چکا تھا۔ اور پنڈت جی توقع کر رہے تھے کہ اب شاید سال دو سال کے لئے  
 تو ہمیں مالی تنگدستی سے نجات مل جائے گی۔ میں نے جب یہ خط پڑھا اور چیک دیکھا تو میں نے  
 محسوس کیا کہ گو یہ بزرگ ”ریاست“ کے بہت مداح ہیں مگر ان کا دل سرمایہ داری کی کمزوریوں سے  
 پاک نہیں اور یہ غیر ضروری کفایت شعاری میں مبتلا ہے۔ میں نے یہ چیک ان کو واپس بھیج دیا اور  
 ساتھ لکھا کہ آپ کی اس محبت اور قدردانی کا شکریہ ادا ہوں۔ مگر اب ہمیں روپیہ کی ضرورت نہیں  
 اس لئے یہ چیک واپس بھیج رہا ہوں

اس واقعہ کے چند روز بعد لالہ شیونرائین بھٹناگر ایڈیٹر ”وطن“ تشریف لائے۔ لالہ شیونرائین  
 ان کے دوستوں میں سے ہیں اور یہ دونوں اکٹھے تاش بھی کھیلا کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ان بزرگ  
 کا ذکر آگیا۔ لالہ شیونرائین کو علم تھا کہ یہ ”ریاست“ کے بہت مداح اور معترف اور خیر خواہ بھی ہیں۔  
 میں نے بتایا کہ انھوں نے تین سو روپیہ کا چیک بھیجا تھا جو میں نے واپس بھیج دیا۔ یہ ذکر معمولی  
 طور پر بات چیت میں ہوا۔ مگر لالہ شیونرائین نے محسوس کیا کہ یہ ”ریاست“ کی اتنی تو تعریف کرتے  
 ہیں اور کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں مگر دل کی حالت یہ ہے کہ آپ نے تین سو روپیہ کا  
 چیک بھیجا۔

اس واقعہ کے غالباً چھ ماہ بعد لالہ شیونرائین اور یہ بزرگ تاش کھیل رہے تھے کہ اخبارات کا  
 ذکر آگیا اور انھوں نے ”ریاست“ کی پھر تعریف شروع کر دی۔ جس پر لالہ شیونرائین کو موقع مل  
 گیا اور آپ نے طنزاً کہا کہ ”ہاں جناب آپ نے بھی بطور قدردانی ”ریاست“ کو تین سو روپیہ  
 کا چیک بھیجا تھا جو دیوان سنگھ نے آپ کو واپس کر دیا۔“ لالہ شیونرائین کے یہ الفاظ سن کر آپ نے  
 فرمایا۔ نہیں۔ نہیں میں عنقریب ”ریاست“ کی زیادہ امداد کروں گا۔ میں ”ریاست“ کی  
 بہت قدر کرتا ہوں۔“

لالہ شیونرائین اور ان بزرگ کی اس بات چیت کے چند روز بعد میں ”ریاست“ کے ادھر سے  
 کمرہ میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی نے آکر بتایا کہ ان بزرگ کے پرائیویٹ سیکریٹری میلنے  
 کے لئے تشریف لائے ہیں۔ میں نے ان کو لانے کے لئے کہا۔ یہ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا  
 کہ ان کے آگے پانچ سو روپیہ بھیجا ہے۔ میں نے کہا کہ میں پہلے بھی اُن کے تین سو روپیہ کا  
 چیک واپس بھیج چکا ہوں۔ آپ اُن کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیجئے کہ میرے

دل میں اُن کے ایک لائق اور فاضل ترین شخصیت ہونے کے باعث انتہائی عزت و احترام کے جذبات ہیں۔ اور اُن کی اس قدر افزائی کا شکریہ گزار ہوں۔ مگر میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا۔ میرے اس کہنے کے بعد ان سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ ”آپ اور کیا چاہتے ہیں۔“ میرا خیال ہے۔ ان کو ہدایت تھی کہ اگر دیوان سنگھ پانچ سو روپیہ نہ لے تو کچھ تھوڑا بہت اور دے دیا جائے۔ میں نے اس کا جواب دیا وہ یہ تھا۔

”دیکھئے۔ رائے بہادر صاحب بہت لائق۔ بے حد شریف۔ نیک اور اچھی شخصیت ہیں۔ اور میرے دل میں ان کے لیے بے حد عزت و احترام کے جذبات ہیں۔ اور اگر آپ کو یہ خیال ہے کہ میں روپیہ نہ ملنے کے باعث اُن کی مخالفت کروں گا یا اُن کا دشمن ہو جاؤں گا۔ تو میں خدا کی قسم کھا کر یقین دلانا ہوں کہ میرے دل میں اُن کے متعلق کدورت کا ایک شائبہ بھی نہیں۔ میں اگر اخبار کے لیے بطور امداد روپیہ لیا کرتا ہوں تو صرف اُن دوستوں سے جو فیاض ہوں۔ اور جو لوگ فیاض نہ ہوں۔ میں اُن سے روپیہ نہیں لیا کرتا۔ اگر آپ کے آقاؤں ہذا روپیہ بھی دیں تو میں پتہ کہتا ہوں کہ میں نہیں لوں گا۔ اور آپ میرے یہی الفاظ اپنے آقا سے کہہ دیجئے اور یقین دلادیں گے کہ میں اُن کا خیر خواہ اور درست ہوں۔ اور پچھلے ساہا سال کے ذاتی تعلقات میں کبھی بھی کمی نہ ہوگی۔“

میرے یہ الفاظ سن کر یہ سیکریٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اور ایمان داری کے ساتھ خدا کی قسم کھا کر پتہ کہتا ہوں کہ میرے دل میں اُن کے لیے نہ کسی قسم کا بغض ہے نہ کینہ اور کسی شخص کے مداح اور مالدار ہوتے ہوئے صرف روپیہ نہ دینے کی صورت میں اُس کا خیال ہونا کینہ نہ سمجھتا ہوں۔ گویا محسوس کرتا ہوں کہ دوسرے سرمایہ داروں کی طرح اُن کا دل بھی روپیہ کی زیادتی کے ساتھ ساتھ کفایت شعار میں مبتلا ہو گیا اور گورنمنٹ نے ڈیپوٹیشننگ لگا کر اچھا کیا کہ جو لوگ روپیہ کو جمع کرنے کے خط میں مبتلا ہوں اُن کی دولت ان کے مرنے کے بعد سرکاری اور قومی خزانہ کے لیے حاصل کی جائے گی۔ اور شاید سرمایہ داروں کو نئے ریلوے اور دوسرے ٹیکسوں کے ذریعہ اپنی زندگی میں ہی یہ روپیہ گورنمنٹ کو دینا پڑے۔

## خاندانی وقار

میرے والد ڈاکٹر تھے اور وہ اپنے زمانہ کے کامیاب ترین ڈاکٹروں میں شمار کیے جاتے تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو میری عمر چالیس روز کی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے والد نے اپنی زندگی میں کتنا روپیہ پیدا کیا مگر عزیز و اقارب کا بیان ہے کہ میرے والد کے انتقال کے بعد سوئے کے جزیو دے تو لے گئے تو اُن کا دزن پندرہ سیر تھا اور نقد روپیہ کے علاوہ میرے والد نے اپنی حیات میں ایک سو ایک رزمین اور چند مکانات خریدے جن پر ایک چھانے قبضہ کر لیا اور چونکہ میرے بڑے بھائی کی عمر بھی دس برس کے قریب تھی اور اُس زمانہ میں خواتین عدالتوں میں جانا اپنے خاندانی وقار

کے خلاف سمجھتی تھیں ہم اپنے چچا سے اپنی جاہلادادیں نہ لے سکے۔

نقد روپیہ اور زیورات دس بارہ برس میں ختم ہو گئے کیونکہ اس عرصہ تک یہ نقد روپیہ اور بعد میں زیورات فروخت کر کے اخراجات چلائے جاتے۔ اس کے علاوہ میری درہنوں اور بڑی بھائی کی دو شا دیوں پر بھی کافی روپیہ صرف ہوا کیونکہ خاندانی وقار کے لئے یہ ضروری تھا چنانچہ میری عمر جب دس بارہ برس کی تھی تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں زندگی گزارنے کے لئے ایک پیسہ موجود نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں جماعت کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور گزارہ کے لئے زیورات کے بعد دوسرا سامان فروخت ہونا شروع ہوا۔

میرے والد کے پاس میڈیکل کس یعنی ڈاکٹری کے متعلق کتابوں کا ذخیرہ بھی کافی تھا جو دوسرے سامان کے ساتھ میرے والد کے انتقال کے بعد چپلم سے حافظ آباد منتقل ہو گیا۔ اور ڈاکٹری کی ان کتابوں میں بعض کتابیں ایک ایک ہزار صفحہ کی ضخیم تھیں جب گھر میں اخراجات کے لئے کچھ نہ رہا تو ہم نے ان کتابوں کو ردی میں فروخت کرنا شروع کیا اور ایک ایک کتاب جس کی قیمت غالباً چالیس چالیس پچاس پچاس روپیہ ہوگی ردی کے نرخ پر آٹھ آٹھ اور دس دس آنہ میں حلوایوں اور دوسرے لوگوں کے پاس فروخت ہونا شروع ہوئیں۔ اتفاق دیکھئے کہ میرے ایک چچا زاد بھائی سردار صاحب ڈاکٹر امریک سنگھ رخصت پر اپنے وطن حافظ آباد آئے ہوئے تھے اور انھوں نے شام کے وقت آدمی بھیج کر ایک حلوای (جس کا نام لدھارام بانکا تھا) سے کھانے کے لئے پکوڑے منگائے اور اس حلوای نے ہماری ردی میں فروخت کی ہوئی ایک ضخیم میڈیکل بک کے ایک ورق میں یہ پکوڑے دیئے۔ ڈاکٹر امریک سنگھ کے پاس جب یہ پکوڑے پہنچے اور آپ نے ان پکوڑوں والا کاغذ دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ یہ ورق ایک قیمتی اور ضخیم میڈیکل بک کا ہے۔ آپ فوراً لدھارام بانکے کی دکان پر پہنچے اور پوچھا کہ یہ ورق کس کتاب کا ہے۔ لدھارام نے یہ کتاب آپ کو دکھائی جس میں سے یہ ورق لیا گیا تھا۔ پھر پوچھا کہ یہ کتاب کہاں سے لی تو لدھارام نے بتایا کہ یہ کتاب ردی میں دیوان سنگھ دے گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر امریک سنگھ ہمارے ہاں پہنچے اور پوچھا کہ کیا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں۔ اور گو بہت سی کتابیں موجود تھیں مگر خاندانی وقار کو قائم رکھنے کے لئے میری والدہ نے کہا کہ کوئی اور کتاب موجود نہیں۔ اور اس کے بعد ہم نے آہستہ آہستہ تمام کتابیں ردی میں فروخت کیں اور کچھ عرصہ تک ان کتابوں کے ذریعہ ہم کھانے پینے کا سامان خریدتے رہے۔

جب کتابیں ختم ہو گئیں تو سوال پیدا ہوا کہ اب زندگی گزارنے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے بعد برتنوں کے فروخت کرنے کا سلسلہ جاری ہوا کیونکہ برتن بہت کافی تعداد میں موجود تھے اور برتنوں کے فروخت کرنے کی یہ صورت تھی کہ میری والدہ اندر کے کمرہ میں پتیل لٹا کر کوئی بڑا برتن مثلاً گارگر وغیرہ لیتیں۔ اس گارگر کو کسی بڑی اینٹ کے ساتھ توڑا جاتا اور جب یہ گارگر ٹوٹ جاتی اور اس کا صلیہ بگاڑ دیا جاتا تو اس گارگر میں یہ کہہ کر فروخت کیا جاتا کہ یہ برتن ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی ہمیں ضرورت نہیں اس لئے فروخت کیا جا رہا ہے چنانچہ ایک عرصہ تک برتنوں کو توڑ کر گزارا چلتا رہا۔ اور یہ تمام

برتن ایک ایک کر کے حافظ آباد کے ایک برتن فروش لالہ منگل داس مہوڑہ درجہ ہائے دور کے رشتہ دار بھی تھے کسی دکان پر پہنچ گئے کیونکہ اگر یہ برتن اپنی اصلی حالت میں فروخت کیے جاتے تو ان کے باعث لوگوں کو ہائے افلاس کا پتہ چلتا جسے خاندانی وقار کے خلاف قرار دیا جاسکتا تھا۔

پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب میں نے سکول جانا چھوڑ دیا تو حالات کی مجبوری کے باعث میں نے برازی کی ایک دکان پر پانچ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی اور وہاں میرا کام مالک دکان کے حکم کے مطابق گاہک کو اندر سے کپڑے کے تھان لاکر دکھانا تھا۔ یہاں مجھے ملازمت کرتے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ عزیز واقارب اور گلی کے لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔ ہماری گلی کے سرے پر ایک چھوٹا سا ٹھاکر دواہہ تھا اور اس ٹھاکر دواہہ کے مالک ایک براہمن چندر بھان تھے جن کے والد پنڈت پاندھیاوٹارام بہت اچھے جوتی تھے اور پنڈت بوٹارام سال میں ایک دو بار میرے والد کے پاس جہاں کہ وہ ملازم ہوتے جایا کرتے اور میرے والد ان پنڈت جی کو دو تین سو روپیہ کا سلوک کرتے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اور میرے والد کے انتقال کے بعد پنڈت بوٹارام کا انتقال ہو گیا تو ان کے لڑکے پنڈت چندر بھان اس ٹھاکر دواہہ کے انچا راج یا مالک تھے جو دن بھر اس ٹھاکر دواہہ میں رہتے اور گلی محلہ کی شادی وغیرہ کی رسوم ادا کرتے۔ ان پنڈت چندر بھان نے جب یہ سنا اور ایک روز مجھے جاتے دیکھا تو انھوں نے بٹھاپنے پاس بلا کر پرچھا کہ میں نے تعلیم کا سلسلہ کیوں منقطع کر دیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ افلاس اور تنگدستی کے باعث ایسا کیا گیا۔ پنڈت چندر بھان احسان شناس تھے اور ان کو معلوم تھا کہ ان کے والد میرے والد کے پاس (جہاں کہ والد ملازمت میں ہوتے) جایا کرتے تھے اور ہمیشہ دو تین سو روپیہ کا سلوک کیا جاتا۔ پنڈت چندر بھان نے کہا کہ اگر میں اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کروں تو وہ میری تعلیم کے تمام مصارف برداشت کریں گے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔ میں جب گھر پہنچا اور والدہ سے اس پیشکش کا ذکر کیا تو والدہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ”لوگ کہیں گے کہ ہمیں کی امداد سے تعلیم حاصل کی“ یعنی یہ خاندانی وقار کے خلاف ہو گا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ زمانہ میں ہندوستان کے لوگ خاندانی وقار کی کوئی قیمت سمجھیں گے یا نہیں مگر کچھ بھی ہو ہندوستانی معاشرت میں اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی اور اس کے متعلق میری رائے ہے کہ اگر آئندہ بھی ہندوستان میں یہ احساس قائم رہے تو یہ دنیا کی نگاہوں میں ہندوستان کے لیے عزت و احترام کے جذبات پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ اور اس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔

## ”نیتاجی“ نیم چند

میں ایک روز شام کو کام کرنے کے بعد تھک کر بیٹھا انگریزی کا ایک امریکن رسالہ پڑھ رہا تھا تو چپراسی نے آکر بتایا کہ نیتاجی نیم چند ملنے کے لیے آئے ہیں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ میں نے ان کو لانے کے لیے چپراسی سے کہا۔ آپ تشریف لائے تو آپ نے مولانا بیسٹ امیر مرحوم مولانا مفتی کفایت اللہ کے داماد کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ نیتاجی نیم چند تشریف لاتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کیا ہے اور ان کے پاس نہ رہنے کے لیے جگہ ہے نہ کوئی ذریعہ معاش۔ اور ان کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام دفتر ”ریاست“ میں کر دیا جائے۔ ان ”نیتاجی“ نیم چند سے باتیں کر رہیں تو آپ نے فرمایا کہ آپ چند برس پہلے دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ وہاں سے علیحدہ کر دیئے گئے اور مہاتما گاندھی کا تو لوگ بلا وجہ نام لیتے ہیں کہ مہاتما جی نے ہندوستان کو آزاد کرایا ورنہ دراصل انھوں نے ہی ملک کو آزاد کرایا ہے۔ جب انھوں نے یہ باتیں کیں تو میں سمجھ گیا کہ خدا نے دوسرے سوامی پارس ناتھ بھیج دیئے ہیں اور کچھ مزید عرصہ تفریح کے ساتھ گزر سکے گا۔ میں نے ان کی رہائش کا انتظام دفتر کے ایک کمرہ میں کر دیا اور کھانے پینے کے لیے ان سے کہہ دیا کہ جیسا غریبانہ میرے ہاں کھانے کا انتظام ہے آپ بھی میرے ساتھ کھالیا کیجئے اور جب دو چار روپیہ کی جیب خرچ کے لیے ضرورت ہو تو میں انتظام کر دیا کروں گا۔ چنانچہ ”نیتاجی“ کا قیام دفتر ”ریاست“ میں ہو گیا۔ دن بھر تو میں کام میں مصروف رہتا اور شام کو جب درست آجاتے تو نیتاجی کے ساتھ محفل گرم ہو جاتی۔

”نیتاجی“ نیم چند کے حالات یہ ہیں۔ آپ دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں بطور کلرک ملازم تھے۔ وہاں کسی وجہ سے آپ کے دماغ کو صدمہ پہنچا۔ آپ کا دماغی توازن قائم نہ رہا تو محکمہ ڈاک نے آپ کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ صرف لیڈری کے لیے وقف ہو گئے۔ کبھی تو بچوں کی ایک فوج جمع کر رہے ہیں۔ اور اُس میں اپنا جھنڈا درج ایک گز کپڑے کر آپ نے تیار کر لیا تھا بلند کیا جا رہا ہے کبھی مشاعروں میں جاتے ہیں اور وہاں اپنی نظمیں پڑھنے کے لیے زور دیتے ہیں۔ مشاعرہ والے جب نظم نہیں پڑھواتے تو اُن پر خفا ہوتے ہیں اور آخر آپ کی ”روحانیت“ کی جب شہرت دہلی میں عام ہو گئی تو مشاعروں کے کارکن یا تو آپ کی نظم مشاعرہ شروع ہونے سے ہمت پہنچے پڑھوا دیتے اور تالیروں کے ذریعہ ہمت داد دی جاتی اور یا جب مشاعرہ ختم ہو جاتا اور لوگ چلے جاتے تو اُس وقت آپ کو لاؤڈ سپیکر کے سامنے لایا جاتا اور ”نیتاجی“ اس پر ہی مطمئن رہتے۔

”نیتاجی“ نے جب ”روحانیت“ کے مرحلے کافی طے کر لیے تو آپ کی بیوی اپنے دو بچوں کو اپنے ساتھ لے کر اپنے بیکہ والوں کے ہاں جھانسی چلی گئی کیونکہ دہلی میں نہ تو اُس بچاری کے لیے کھانے پینے کا کوئی انتظام تھا اور ”نیتاجی“ روحانیت کی منزلیں طے کرنے میں مصروف تھے۔ آپ کو جب بھی اپنی بیوی کا خیال آتا تو تکلیف محسوس کرتے اور اپنے مسلسل والوں کو کوٹنے کہ

دہ کیوں ان کی بیوی اور بچوں کو جھانسی لے گئے ہیں۔ چنانچہ جب بیوی اور بچوں کی جدائی کا زیادہ ہی خیال آیا تو ایک روز آپ چاندنی چوک کی کوتوالی میں پہنچے اور رپورٹ درج کرائی کہ آپ کی بیوی مع بچوں کے اغوا کر لی گئی ہے اور جھانسی کا فلاں شخص رپورٹ میں انھوں نے اپنے خسر کا نام لکھوایا) اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اور اپنا پتہ انھوں نے اخبار ”ریاست“ کا دیا کیونکہ یہ یہاں مقیم تھے۔ اس رپورٹ کی نقل جب پولیس کے بڑے افسروں کے پاس پہنچی تو اخبار ”ریاست“ کا نام دیکھ کر انھوں نے تحقیقات کے لیے ایک سب انسپکٹر مقرر کیا اور یہ سب انسپکٹر اگلے روز دفتر ”ریاست“ میں پہنچا۔ میں اس وقت باہر کے کمرہ میں کام کر رہا تھا۔ اور ”نیتاجی“ اندر کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ سب انسپکٹر جب آیا تو میں نے پوچھا کہ کس مقصد کے لیے تشریف لائے؟ اس سب انسپکٹر نے بتایا کہ دفتر ”ریاست“ میں ایک صاحب سسر نیتاجی نیم چند رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیوی کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی ہے اور اعلیٰ افسروں نے ان کو تحقیقات پر مقرر کیا ہے۔ میں نے جب یہ سنا تو نہ صرف میں حیران بلکہ مجھے افسوس بھی ہوا اگر یہ سب انسپکٹر تحقیقات کے لیے ”نیتاجی“ کی سسرال جھانسی چلا گیا تو ان بچادوں کی کتنی بدنامی ہوگی۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ یہ رپورٹ غلط ہے اغوا کا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور رپورٹ لکھوائے والے کے دماغ میں خلل ہے۔ میں نے جب سب انسپکٹر کو تمام اصل حالات سنا دیئے تو اندر سے ”نیتاجی“ کو بلوایا گیا۔ ”نیتاجی“ تشریف لائے تو میں نے سب انسپکٹر سے آپ کا تعارف کرایا۔ یہ نیتاجی نیم چند ہیں جنھوں نے ہندوستان آزاد کرایا اور لوگ ملک کے آزاد کرانے کا کریڈٹ خواہ مخواہ ہاتھ کاغذ ہی کو دیتے ہیں۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا اور سب انسپکٹر کے آنے کا مقصد بھی نہ بتایا تھا۔ کہ نیتاجی کانگریس پر برس پڑے اور کہا کہ آپ نے تو ملک کو آزاد کرایا اور یہ کانگریسی ہندوستان کے آزاد کرنے کا تمام کریڈٹ ہاتھ کاغذ ہی کو دیتے ہیں اور ان کے ساتھ قدرنا شناسی کا یہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ باتیں ہوئیں تو سب انسپکٹر سمجھ گیا کہ نیتاجی نے پولیس میں رپورٹ کیوں کی۔ مگر آپ نے نیتاجی سے کہا کہ شام کو کو تو الی ضرور پہنچ جائیے تاکہ آپ کی اغوا شدہ بیوی کو واپس لا کر آپ کے حوالہ کیا جائے۔ سب انسپکٹر یہ کہہ کر چلا گیا اور اس نے اپنے حکام کو بتایا کہ رپورٹ کرنے والا پاگل ہے اور اس نے غلط رپورٹ کی ہے۔ شام کو ”نیتاجی“ بھی کو تو الی پہنچ گئے اور سب انسپکٹر خان کا سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے پیش کرتے ہوئے تعارف کرایا کہ ”یہ نیتاجی ہیں جنھوں نے دراصل ہندوستان کو آزاد کرایا ہے“ سب انسپکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ آپ نے کانگریس اور کانگریس گورنمنٹ پر قدرنا شناسی اور احسان فراموشی کے الزامات لگانے شروع کر دیئے اور کہا کہ ملک کو آزاد تو انھوں نے کرایا اور لوگ نام ہاتھ کاغذ ہی کا لیتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جب دیکھا کہ ”نیتاجی“ روحانی بزرگ ہیں تو آپ نے سب انسپکٹر سے تو یہ کہا کہ فائل داخل دفتر کر دی جائے اور نیتاجی سے کہا کہ آپ اطمینان رکھیے آپ کی بیوی واپس آجائے گی۔ جھانسی کے مجسٹریٹ کو لکھا گیا ہے کہ اغوا کرنے والے کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا جائے۔ نیتاجی جب واپس آئے تو



بہت خوش تھے اور آپ دوسرے دوسرے روز کو توالی پہنچ کر حالات کے لازم دیکھ آتے کہ ان کے خسر ابھی گرفتار ہو کر آئے ہیں یا نہیں۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا اور ایک ماہ کے بعد "نیٹاجی" یہ کہہ کر اور صبر کر کے بیٹھ گئے کہ پولیس نے رشوت کھالی ہوگی جو ان کے خسر کی اب تک گرفتاری نہیں ہوئی۔ اور ادھر بار لوگوں نے بھی آپ سے کہا کہ جس صورت میں کہ کانگرس اور کانگرس گورنمنٹ آپ کی دشمن ہے۔ گورنمنٹ کی پولیس آپ کی دشمن کیوں نہ ہو۔ پولیس سے مایوس ہونے کے بعد آپ نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں جانا شروع کر دیا۔ وہاں عدالتوں میں جا کر ججسٹریٹوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ان کی بیوی اور خسر گرفتار ہو کر ابھی آئے ہیں یا نہیں وہاں سے کیا جواب ملتا۔ بچائے کی روز دہاں جاتے رہے۔ اور آخر مایوس ہو کر آپ نے عدالتوں میں جانا بھی چھوڑ دیا۔

کچھ روز کے بعد دہلی اسمبلی کے انتخابات شروع ہوئے تیار لوگوں نے آپ کو رائے دی کہ اسمبلی کے لیے کھڑے ہوں تاکہ آئندہ صوبہ دہلی کے وزیر ہو کر پبلک کی زیادہ خدمت کر سکیں۔ آپ اس کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپ کے پاس ضمانت داخل کرنے کے لیے ایک پیہ نہ تھا۔ آپ نے درخواست میں لکھا کہ آپ مفلس ہیں اور ضمانت کا روپیہ داخل نہیں کر سکتے اور مفلسی میں ہی آپ کو کھڑا ہونے کی اجازت دی جائے جیسے کہ مفلسی میں لوگ عدالتوں میں مقدمہ دائر کرتے ہیں۔ اس وقت انکشن کا کام مرحوم سردار ہر چند رسنگ ٹھکانوں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ججسٹریٹ کے چچر تھا۔ جنہوں نے یہ درخواست نام منظور کر دی تو آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ گورنمنٹ آپ کے خلاف ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ آپ اسمبلی میں جا کر اس کی مخالفت کریں۔ درخواست کے نام منظور ہونے کے بعد بھی آپ انکشن میں کھڑے ہو گئے اور محلہ کے بچوں کو جمع کر کے اپنے حق میں "نیٹاجی نیم چنڈ نہ باد" اور "نیٹاجی نیم چند کر دوٹ" کے نعرے لگواتے اور جھوٹے چھوٹے پروپیشن نکلاتے رہے اور یہ واقعہ تو سب حد تک چھپ ہے کہ جس روز دہلی ڈالے جا رہے تھے تو جلی میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور آپ نے دوٹ دینے والوں سے کہنا شروع کیا۔ کہ آپ کو دوٹ دیا جائے۔ محلہ کے لوگ آپ سے واقف تھے جو دوٹر آتا مسکر کر چلا جاتا۔

نیٹاجی نیم چند اپنے پاگل پن کے باعث ڈاک خانہ کی ملازمت سے علیحدہ کیے گئے تھے اور آپ سمجھتے تھے کہ آپ کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ آپ نے مفلسی میں گورنمنٹ پر پچاس ہزار روپیہ کا دعویٰ کر دیا۔ عدالت نے قانون کے مطابق مفلسی کی تصدیق کے لیے درخواست تفصیل دار کو بھیجی اور تفصیل دار نے لکھ دیا کہ آپ فی الحقیقت مفلس ہیں اور کورٹ فیس ادا نہیں کر سکتے۔ تفصیل دار کے ہاں سے کاغذات واپس جانے کے بعد مقدمہ شروع ہوا اور پیشیاں ہوئیں کیونکہ عدالت بغیر سماعت کے قافوہ کوئی مقدمہ خارج نہ کر سکتی تھی جب آپ عدالت میں جاتے تو عدالت دلچسپی کا مرکز بن جاتی۔ آپ کا کرنی وکیل نہ تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے ایک سرکاری وکیل پیش ہوا کرتا۔ ایک روز آپ کوئی گھنٹہ تک عدالت کے باہر بیٹھے رہے اور جب آپ کو آواز دی گئی تو سرکاری وکیل کسی دوسرے مقدمہ میں مصروف تھا جو دو تین گھنٹہ لیٹ پہنچا۔ نیٹاجی نے عدالت سے درخواست کی کہ چونکہ سرکاری وکیل غیر حاضر تھا اس لیے آپ کو ہر جانہ دلایا جائے۔ نیٹاجی

کی اس درخواست پر سرکاری دکیل نے فوراً اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر ”نیتاجی“ کو نذر کیا۔ اس کے بعد آپ جب واپس دفتر ”ریاست“ میں پہنچے تو فخر کے ساتھ آپ نے کہا کہ آج آپ نے گورنمنٹ سے ہر جان و وصول کیا ہے۔ چند پیشیوں اور قانونی کارروائی کے بعد یہ مقدمہ خارج ہو گیا تو آپ عدالت پر بہت ناراض تھے اور آپ نے کہا کہ کوئی بات نہیں اگر عدالت نے گورنمنٹ کے خلاف ڈگری نہیں دی تو نہ ہی آپ خود ڈگری کے گورنمنٹ سے روپیہ وصول کریں گے۔ چنانچہ آپ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ایک پوسٹر شائع کیا جس میں پبلک کو اطلاع دی گئی کہ گورنمنٹ ہوس پچاس ہزار روپیہ میں قرق ہو چکا ہے اور فلاں تاریخ کو یہ نیلام ہوگا۔ اس پوسٹر کے بعد پولیس نے پاگل سمجھ کر آپ کے خلاف کچھ نہ کیا مگر آپ لوگوں سے کہا کرتے کہ آپ پچاس ہزار روپیہ میں گورنمنٹ ہوس نیلام کر چکے ہیں۔

”نیتاجی“ نیم چند اخبارات کے دفاتر میں اکثر جایا کرتے اور فرماتے کہ ہندوستان آپ نے آزاد کیا ہے اور آپ کا بیان شائع کیا جائے مگر کوئی اخبار آپ کا بیان شائع نہ کرتا۔ آپ نے ”سیلف ہیپ“ کا ثبوت دیتے ہوئے ایک روز اپنے اخبار کا ڈیکلریشن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں داخل کر دیا اور دفتر ”ریاست“ کے کاتب سے کتابت کی سیاہی اور کاغذ لے کر آپ نے اپنے اخبار کی خود ہی کتابت کی اور اس کا ایک پرچہ شائع کیا جس میں پبلک کی قدرنا شناسی کے متعلق مضامین اور آپ کی تنگ بندی والی نظیں تھیں۔ آپ نے لوگوں سے چند روپیہ لے کر نصف روم کا غذا کا انتظام کیا اور پر میں دالوں کو یہ کہہ کر پرچہ چھپوایا کہ چند روز تک چھپائی کی اجرت دے دی جائے گی۔ یہ پرچہ ڈنیل کے تمام مھاگ کے بادشاہوں پر پڑیڈنٹوں اور ایسیڈنٹوں کے نام پر سٹ کیا گیا۔ اور چونکہ نہ تو کوئی پرچہ فروخت ہوا اور نہ کسی نے چندہ دیا آپ کو دوسرا پرچہ نکالنے کا حوصلہ نہ ہوا اور آپ نے یہ اخبار بند کر دیا۔

”نیتاجی“ نیم چند کے پاگل پن کی وجہ غالباً گھریلو معاملات تھے۔ آپ دو برس کے قریب دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں رہے۔ دن بھر اپنی پارٹی بنانے کی فکر میں بھرتے رہتے اور جب واپس آتے تو محلہ کی عورتوں سے شکایت کی جاتی کہ یہ ان کی شادی کا کوئی انتظام نہیں کرتے عورتیں ان سے واقف ہو چکی تھیں۔ کوئی تو روپیہ طلب کرتی اور کوئی پہننے کا سوٹ مانگا، کسی لڑکی کی تلاش میں جاہیں مانگو ”نیتاجی“ کے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔ آپ کو محلہ کی عورتوں سے ہمیشہ شکایت رہی کہ انھوں نے ان کی شادی کا کوئی انتظام نہیں کیا حالانکہ عورتیں اگرچہ پر تو وہ ایک ہفتہ میں ہی ان کی شادی کر سکتی ہیں۔ محلہ میں اگر کوئی شادی ہوتی تو آپ کسی کو گھنٹہ اُس گھر میں رہتے اور شادی کی رسوم دیکھتے۔ نیتاجی کبھی کبھی اپنے وطن بھی جایا کرتے اور وہاں اپنے رشتہ داروں سے دو چار یا دس روپیہ لے آتے۔ ایک بار آپ اپنے گاؤں گئے واپس آئے تو آپ کے پاس دس روپیہ تھے۔ محلہ کے لوگوں نے آپ سے یہ کہہ کر دعوت لی آپ کی شادی کرادی جائے گی اور ان لوگوں میں سے ایک لڑکے نے کہا کہ آپ کے عزیزوں

ایک خوبصورت لڑکی ہے جس سے شادی ہوگی۔ نیتاجی نے جب واپس آکر بتایا کہ اب شادی ہونے والی ہے اور آپ اپنے والے اپنے سارے یعنی جس نے کہا تھا کہ اس کے عزیزوں میں ایک لڑکی ہے، سے بل چکے ہیں اور دعوت کھلا رکھے ہیں تو مجھے ان لڑکوں کی بے رحمی پر مہبت غصہ آیا مگر نیتاجی کسی اداس انتظار میں رہے کہ عنقریب سگائی کی رسم ادا کی جائے گی۔

”نیتاجی نیم چند“ بہت معصوم اور نیک تھے۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ اپنی زندگی آرام سے دفتر ریاست میں رہ کر گزاریں اور ان کے اخراجات کے لیے بھی انتظام کر دیا تھا مگر لیڈری کی دھن ان کو لینے کے لیے پھرتی تھی۔ اور یہ سکون کے ساتھ نہ بیٹھتے تھے اور اکثر دیہات میں جا کر ”دیہات سدھار“ کے نام پر دورہ کرتے۔ اب ایک عرصہ ہوا آپ دہلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں اور آپ کے تمام خیر خواہ مداح محلہ کے لڑکے اور عورتیں کبھی کبھی آپ کے متعلق دریافت کر لیتے ہیں مگر میں اس طرح ہی کوئی جواب نہیں دے سکتا جس طرح کسی اغوا شدہ عورت کے گھر والے کوئی جواب نہیں دے سکتے اور کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ عنقریب آجائے گی یعنی میں بھی اپنے دل کو اور دوسرے لوگوں کو تسلی دینے کے لئے کہہ دیا کرتا ہوں کہ ”نیتاجی“ عنقریب آئے والے ہیں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ جس طرح ان کے دوست اور مداح ان کو یاد کرتے ہیں وہ بھی ہمیں ضرور یاد کرتے ہوں گے۔

## گھریلو ملازموں کا جھوٹ اور چوری

ایک اہل الرائے کا قول ہے کہ اگر ہندوستان میں پہاڑیے ملازم نہ ہوتے تو گھریلو ملازم رکھنے والے نصف سے زیادہ لوگوں کی بیویوں کو کھانا خود پکا تاڑنا اور ان کو گھر کے برتن صاف کرنے پڑتے چاہے یہ کتنے بھی امیر ہوتے اور اگر سکھ نہ ہوتے تو ہندوستان کی نصف موٹریں اور لاریاں بغیر ڈرائیور کے گیر جوں میں بند پڑی رہتیں اور ان کو چلائے والے نہ ملے۔ کیونکہ شہروں کے گھریلو ملازموں میں پچھتر فی صدی لوگ نیپالی۔ الموڑہ۔ گھڑوال۔ شکر اور کانگرہ کے علاقہ کے پہاڑیے ہیں اور تمام بڑے بڑے شہروں میں نصف سے زیادہ موٹر ڈرائیور سکھ ہیں جو ہندوستان کے ہر صوبہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں تک سکھ موٹر ڈرائیوروں کا تعلق ہے یہ پیداؤشی طور پر جفاکش۔ مخنثی۔ دباستاندار اور اپنے مالک کے وفا شعار ہیں اور پہاڑیے گھریلو ملازموں میں شاید پانچ فی صدی ایسے ہوں گے جو جھوٹ نہ بولتے ہوں اور چوری نہ کرتے ہوں اور ان کی چوری صرف گھی۔ شکر اور کھانے پینے کی اشیاء تک محدود ہے کیونکہ بزدل ہونے کے باعث ان میں بڑی چوری کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی اور کوئی ہی ایسا پہاڑیا ملے گا جس نے زیورات یا دھیر پر ہاتھ صاف کیا ہو۔ ان پہاڑیے ملازموں کے متعلق میں چند اپنے تجربات بیان کرتا ہوں۔

میرے ہاں برانڈی ہمیشہ موجود رہتی ہے کیونکہ میں کبھی کبھی جب طبیعت زیادہ اُداس ہو یا تھکاؤٹ  
محسوس کروں تو نصف یا زیادہ سے زیادہ ایک پیگ (ایک چھٹانک) پی لیا کرتا ہوں اور ویسے  
کئی کئی ماہ تک اس کے پینے کا اتفاق نہیں ہوتا اور ویسی۔ مٹرا۔ دسکا۔ دم یا جن سے مجھے بے حد نفرت  
ہے اور میں کہہ نہیں سکتا کہ کیوں نفرت ہے۔ مجھے اس کی کوئی خاص وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔  
حالانکہ شراب پینے والے سب سے زیادہ سکاچ دسکا کو پسند کرتے ہیں۔

میرے پاس بہینزے تھری سٹار برانڈی کی ایک بوتل موجود تھی اور اس میں سے تھوڑی سی  
میں نے پی لی تھی اور ایک ماہ کے عرصہ سے اس کے پینے کا اتفاق نہ ہوا تھا مگر میں نے دیکھا کہ بوتل  
میں سے برانڈی ہر روز تھوڑی تھوڑی کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور اس میں نصف بوتل کے قریب  
باقی ہے۔ میں نے سوچا کہ جس صورت میں کہ میں اسے پیتا نہیں اس کے روز بروز کم ہوتے چلے جانے کی  
وجہ کیا ہے۔ میں نے یہ محسوس کر کے کوئی نہ کوئی اس میں سے پیتا ہے میں نے فیصلہ کیا کہ چور کو پکڑنا چاہیے  
میں نے اگلے روز صبح ہی قلم اور سیاہی کے ساتھ اس بوتل پر ایک نقطہ کا نشان لگادیا جہاں تک کہ  
برانڈی اس میں پڑی تھی اور اس کے دو دو گھنٹہ کے بعد دیکھنا شروع کیا کہ بوتل میں سے یہ کس وقت  
اُڑائی جاسکتی ہے۔ میں نے یہ نشان صبح چھ بجے لگایا اور آٹھ بجے کے قریب دیکھا تو برانڈی اس نشان  
سے نیچے نہ تھی یعنی اس میں سے کسی نے نکالی نہ تھی۔ پھر دس بجے دیکھا تو پھر بھی یہ اتنی ہی تھی۔ بارہ بجے  
دیکھا تو اس وقت بھی یہ اتنی ہی تھی۔ اور بارہ بجے میں پہاڑیے ملازم سے یہ کہہ کر غسل خانہ میں  
چلا گیا کہ میں غسل کر لیتا ہوں امدقم اتنی دیر میں میرا کمرہ صاف کر دے کیونکہ میں ہر روز صبح چار بجے سے  
بارہ بجے دوپہر تک کام کرتا رہتا اور بارہ بجے غسل خانہ میں جا کر غسل کرتا اور کپڑے بدلنا۔ میں غسل خانہ  
سے غسل کرنے کے بعد واپس اپنے کمرہ میں آیا اتنے میں اس ملازم نے کمرہ میں جھاڑو دے لیا اور کمرہ  
صاف کر دیا۔ میں جب اس کمرہ میں پہنچا اور میں نے الماری میں برانڈی کو دیکھا تو یہ بوتل میں اس  
نقطہ سے نیچے تھی جہاں کہ میں نے یہ نقطہ صبح بطور نشان لگایا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ برانڈی میرے  
غسل خانہ میں جانے کے عرصہ میں چوری ہوئی۔ میں نے جب یہ دیکھا تو اس ملازم کو اسے پاس بلایا  
اور بغیر کچھ دریافت کیے اپنا سیلیپر نکال کر پانچ سات رسید کیے۔ یہ پوچھتا رہا کہ اس کو کیوں پیشا چار  
ہے میں نے اس کے پوچھنے کی کوئی پروا نہ کی اور جب باٹا بازی کا مڑی بلونت سنگھ ملازم کے بٹنے کو  
باٹا بازی کہا کرتے ہیں کیونکہ یہ باٹنی بالٹے کے رڈ کے سیلپر سے ہوا کرتی ہے) ختم ہوئی تو میں نے پوچھا کہ  
پچ بتاؤ تم نے الماری والی بوتل میں سے برانڈی پی ہے یا نہیں۔ اس نے فوراً انکار کیا اور کہا کہ  
اس نے نہیں پی۔ میں نے پھر باٹا کا سیلیپر کھینچ لیا اور باٹا بازی شروع کر دی اور جب اس پر پھر  
باٹا بازی ہوئی تو اس نے اقرار کر لیا کہ ہاں اس نے پی ہے۔ اس کے اقرار کرنے پر میں نے اس کو  
چھوڑ دیا اور پوچھا کہ اب یہ بتاؤ کہ برانڈی بوتل کو منہ لگا کر پیا کرتے تھے یا گلاس میں ڈال کر کیونکہ  
اگر تم بوتل کو ہی منہ لگا کر پیا کرتے تھے تو باقی کی جو بھی برانڈی تم کو دی جاتی ہے اور اگر گلاس  
میں ڈال کر پیا کرتے تھے تو پھر یہ برانڈی میں رکھ دیتا ہوں چنانچہ اس نے وہ گلاس بھی بتا دیا۔

جس میں کو یہ ہر روز برانڈی ڈال کر اور اس میں پانی ملا کر پیا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کا حساب کر کے اس کی تنخواہ کا جو بقایا نکلتا تھا اس کو دیا۔ رسید لی اور موقوف کر دیا۔ اس کے ایک سال بعد اس کا پھر اس کے دطن سے خط آیا کہ یہ ملازمت کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو یہ آجائے میں نے جواب دیا کہ اگر تم برانڈی کی چوری پھر نہ کر دو تو آ سکتے ہو جس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کی چوری کو بھولا نہیں میرے خط کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ یہ ملازمت کے لئے پھر آیا۔

میں ملازموں کی چوری پکڑنے میں بہت مشتاق ہوں۔ اور جب کسی کو ملازم رکھتا ہوں تو دو تین روز میں ہی معلوم کر لیتا ہوں کہ اسے چوری کی عادت ہے یا نہیں۔ ایک پہاڑی کو میں نے ملازم رکھا۔ اور اگلے روز میں نے ایک روپیہ کی ریڑگاری گن کر اور دو دینوں اور چوبیسوں پر سیاہی سے ایک ایک نقطہ بطور نشان لگا کر قلمدان پر رکھ دی۔ خود غسل خانہ میں چلا گیا اور اس سے میں نے کہا کہ میرا کمرہ صاف کر دو۔ میں جب واپس آیا تو میں نے ریڑگاری گنی۔ اس میں سے ایک دو تہی کم تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ جو دو تہی تم نے یہاں سے اٹھائی ہے رکھ دو۔ اس بھت کو یہ ظلم ہی نہ تھا کہ میں نے تمام ریڑگاری پر نشان لگایا ہوا ہے۔ اس نے فوراً انکار کیا کہ اس نے دو تہی نہیں اٹھائی۔ اس کے انکار کو سننے پر میں نے نہ صرف اس پر باٹا بازی شروع کر دی بلکہ باٹا بازی کے بعد اس کی تلاشی لی تو اس کے جیب میں وہ نشان زدہ دو تہی موجود تھیں۔ اس کلاس کے لوگ تمام کے تمام پیسے نہیں اٹھایا کرتے۔ ریڑگاری میں سے ایک آدھ دو تہی یا چوٹی اٹھایا کرتے ہیں تاکہ ان کی چوری کا علم نہ ہو سکے اور مالک یہ سمجھے کہ اگر اس نے چوری کرنی ہوتی تو یہ تمام کے تمام پیسے اٹھا لیتا۔ چنانچہ اس سے دو تہی واپس لینے کے بعد میں نے اس کو دو دن کی تنخواہ دے دی اور ملازمت سے علیحدہ کر دیا یعنی اس نے اپنی دردن کی تنخواہ بھی لے لی اور بطور چوری کے الاؤنس کے باٹا بازی بھی وصول کی۔

ایک پہاڑی میرے پاس ایک سال کے قریب ملازم رہا۔ اور اس کی بیوی بچے دہلی میں ہی تھے۔ یہ صبح و دفتر میں آتا اور رات کو مجھے کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر واپس چلا جاتا اور جب یہ گھر جاتا تو میں اس کو کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتا تاکہ یہ اپنے بیوی بچوں کے لئے لے جائے۔ ایک روز میں نے محسوس کیا کہ یہ جاتے ہوئے گھی چوری کر کے لے جاتا ہے۔ میں نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس کو علم نہ تھا کہ میں اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ رات کو جاتے ہوئے ایک کٹوری میں گھی لے جاتا تھا۔ میں نے ایک روز اس کو معہ گھی کے پکڑ لیا اور پوچھا تو یہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں دیسے تو کسی کو چاہے کچھ دے دوں۔ مگر میں چوری اور جوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور میرا یقین ہے کہ جس گھر میں ملازم چوری کرے وہاں برکت نہیں ہوتی۔ میں نے اس کو زمین پر لٹا دیا اور لٹائے کے بعد اس کا منہ کھول کے اس میں گھی کا ٹین ڈیا۔ ایک سپر گھی کا ٹین تھا۔ میں ہمیشہ ایک مارکر خالص گھی استعمال کرتا ہوں اور میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی بنا سپتی گھی استعمال نہیں کیا۔ آٹ لٹ دیا جس سے نہ صرف اس کا منہ گھی سے بھر گیا بلکہ اس کا تمام چہرہ بھی گھی میں لپٹ گیا۔ اور گھی اٹانے کے بعد اس سے کہا کہ چوری کر کے بہت تھوڑا گھی لے جاتا ہے اس صورت میں تو کافی گھی

کھا سکے گا۔ گھی ڈالنے کے بعد میں نے اس کو بانا کے سیلپر بھی رسید مینے اور اس کا حساب کر کے اس کو نکال دیا۔

میں جب کسی پہاڑیے یا دوسرے شخص کو ملازم رکھتا ہوں۔ تو دو چار روز اس کی سخت نگرانی کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ نیت کے اعتبار سے یہ پست ہے یا بلند ہے۔ چنانچہ اگر تو کھانا دیتے وقت اس کے ہاتھ کا پختے ہوں اس کے منہ میں پانی آجاتا ہو (جیسے کہ کمینہ لوگ کسی کو کھانا کھاتے پکھیں تو ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے) یا یہ فراغی کے ساتھ کھانا نہ دے تو اس کو کمینہ سمجھتے ہوئے دو چار روز کے بعد ہی اسے ملازمت سے الگ کر دیتا ہوں کیونکہ میرا یہ ایسا ن ہے کہ جب کسی کمینہ اور پست فطرت شخص کے ہاتھ سے کھانا کھایا جائے تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یا کھانے میں لذت باقی نہیں رہتی۔

ایک پہاڑیے ملازم نے میرے غسل خانہ میں سے غسل کا سامان خود استعمال کر لیا۔ مجھے اس کا علم ہوا اور اس سے پوچھا تو اس نے جھوٹ بولتے ہوئے اس سے انکار کیا۔ اس کے جھوٹ کو میں برداشت نہ کر سکا تو میں نے اس کو دو تین تھپڑ لگائے اور کہا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ یہ کیفیت دفتر ریاست کے منیجر چاولہ صاحب دیکھ رہے تھے۔ یہ میرے پاس آئے تو انھوں نے کہا کہ ”اس بچارے کو کیڑوں مارتے ہو۔ یہ جھوٹ کیوں نہ بولے جب کہ یہ زندگی بھر جھوٹ بولتا رہا ہے کا باپ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی ماں جھوٹ بولتی ہے۔ اس کے بھائی جھوٹ بولتے ہیں اور خاندانی اعتبار سے اس کا دادا اور نانا بھی جھوٹ بولتے رہے۔ پہاڑیے فطرتاً جھوٹ بولتے اور کھانے پینے کی اشیا کی چوری کرتے ہیں اور آئندہ یہ کرتے رہیں گے۔ اس کو جھوٹ دیکھنے والا اس کی پٹائی نہ کیجئے“ چاولہ صاحب کے اس کہنے کے بعد میں نے اس کو چھوڑ دیا اور اس کا حساب کر کے اس کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ کیونکہ بقول چاولہ صاحب اس غریب کا قصور کیا تھا جب کہ اس کے گھر والوں نے ہی اس کو جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تربیت نہ دی۔

ایک پہاڑی ملازم ہر روز دیکھا کرتا کہ مہانوں کے کمرہ میں مہان کا غسل کا سامان ایک میز پر پڑا رہتا ہے۔ اور غسل کے اس سامان میں دانتوں کے منجن کی ایک ٹیوب بھی ہے جسے مہان اپنے دانتوں کے لئے ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ دانتوں کی اس پیٹ کے ساتھ ہی اس مہان کی دیٹ ڈال کر ڈالنے کی پیٹ) بھی پڑی تھی۔ یہ پہاڑی پلٹا ہوا تھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ دو ٹوں ٹیوبیں دانتوں کے لئے ہی ہیں۔ مہان جب بازار گئے تو اس کجخت نے پوشیدہ طور پر دیٹ والی ٹیوب لے جا کر اپنے دانتوں پر مل لی۔ دیٹ کا سلنا تھا کہ اس کے تمام سوڑے سوچ گئے اور جوتوں پر بھی اس کا اثر ہوا۔ جب اس کو زیادہ تکلیف ہوئی تو یہ میرے پاس آیا اس کا منہ سو جا ہوا تھا اور منہ کے اندر چھالے پڑے تھے۔ میں نے جب اس کو ڈانٹ کر پوچھا کہ اس نے کیا شے استعمال کی ہے تو اس نے بتایا کہ مہان کا دانتوں کا منجن استعمال کیا تھا۔

میں جہان کے کمرہ میں گیا تو پتہ چلا کہ دانتوں کے منجن والی ٹیوب کے پاس ہی ویٹ کی ٹیوب تھی اس بے وقوف کو پتہ نہ تھا کہ دونوں ٹیوبوں میں کیا فرق ہے اور اس نے ویٹ کو بطور منجن استعمال کیا ہے۔ مجھے اس بروقت کی جہالت پر غصہ بھی آیا اور میں اپنا تہمتہ بھی ضبط نہ کر سکا آخر اس سے بہت دیر تک پانی کے غرارے کرائے اور پانی کے غراروں کے بعد سٹرین کے غرارے کرائے تو اس کو کچھ سکون ملا۔ درہ اگر ویٹ کا کچھ حصہ اس کے گلے میں بھی چلا جاتا تو شاید اس کا دم ہی ٹک جاتا اور پولیس گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کے جرم میں تحقیقات شروع کر دیتی۔ اگلے روز میں نے اس ملازم کو بھی اس کا حساب دے کر رخصت کیا اور کہا کہ پہلے کسی کیمسٹ کے ہاں ادویات اور سامان غسل کے استعمال کی ٹریننگ لے لو پھر یہاں ملازمت کرنا اور یہ تو اکثر دیکھا کہ پہاڑیے ملازم نے کتے کے ہنلائے کا صابن استعمال کیا ہے۔ اور اس سے ہی یہ اپنا منہ دھو کر مارتے تھے۔

گھریلو ملازموں میں شاید پانچ یا دس فی صدی ایسے ہونگے جو چوری نہ کرتے ہوں۔ اور بھیتا شیخ احسان الحق کہا کرتے ہیں کہ اگر ملازم کو تیس روپیہ ماہوار تنخواہ دو تو دس فی صدی یعنی تین روپیہ ماہوار اس کی چوری کا بھی ریزہ درکھ دیا کر دیکھو کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ گھریلو ملازم چوری نہ کریں اور یہ غنیمت ہے کہ چونکہ یہ بزدل ہوتے ہیں۔ چوری صرف کھانے پینے کی اشیاء کی کرتے ہیں اور پولیس سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں درہ اگر یہ بزدل نہ ہوں تو شاید گھروں کی صفائی ہی کر دیں۔ ان متام تجربوں کے بعد میری رائے ہے کہ گھریلو ملازموں کی چوری اور جھوٹ کو ایک حد تک نظر انداز کر دیا جانا چاہیے کیونکہ بقول مسٹر چاولہ جب ان کے ماں۔ باپ۔ بھائی اور تمام رشتہ دار ہی جھوٹ بولتے ہیں اور چوری کو جرم ہی نہیں بلکہ ہوشیاری سمجھتے ہیں تو یہ بچارے جھوٹ کیوں نہ بولیں اور چوری کیوں نہ کریں۔

## اخبارات کی اشاعت کے متعلق دروغ بیانیوں

بہت برس ہوئے دفتر ریاست "ہملٹن روڈ پرتھا اور ریاست" کی ضخامت اس زمانہ میں ساٹھ ستر صفحات کے قریب تھی پر ان میں نصف کے قریب اشتہارات ہوتے اور جو سالانہ بجٹ بنایا جاتا اس کے مطابق تقریباً ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی اور خرچ تھا۔ اس زمانہ "ریاست" غالباً چھ ہزار چھپتا تھا اور اگر کوئی مشہور پڑھتا تو اسے اس کی اشاعت دفتر والے سات آٹھ ہزار بتاتے یعنی صرف پچیس فی صدی جھوٹ بولا جاتا اور یہ جھوٹ کنو سیر یا دفتر ریاست "کا منیجر بولتا جو اشتہارات کے متعلق ذمہ دار تھا۔ مگر دوسرے اکثر اخبارات دو گنا۔ سہ گنا یا دس گنا زیادہ اشاعت کا جھوٹ بولتے اور اسی جھوٹ کا آڈیٹر اس سے سرٹیفکیٹ لے کر مشہورین کی جیب تراشی کرتے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ لاہور کا ایک روزانہ انگریزی اخبار اس زمانہ میں صرف پانچ سو چھپتا تھا اور چھپک میں اس اخبار کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی مگر اس کے پاس اشاعت کے متعلق پچیس ہزار

کا آڈیٹس سرٹیفکیٹ تھا یعنی یہ اشاعت کے متعلق پچاس گنا زیادہ یا دو سو فی صد غلطیوں کی ہزار فی صدی جھوٹ ہوتا تھا۔ اور اس کشتی میں ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات ہی سوار تھے۔

گو اخبارات اشاعت کے متعلق بہت ہی جھوٹ بولتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو قریب قریب ہر اخبار کی اصل اشاعت کا علم ہے کیونکہ وہ اپنے ذرائع سے اخبارات کی اصل اشاعت معلوم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز ایڈیٹر ریاست "کو کلکتہ سے اخبارات میں اشتہارات دینے والی ایک سب سے بڑی کمپنی ڈی۔ جے۔ کیمرائیڈ کو (اس کمپنی کا ہیڈ آفس تو لندن میں ہے اور اس کی برانچیں قریب قریب دنیا کے اکثر ممالک میں ہیں) کے جنرل منیجر مسٹر ہٹن ولیمز کا ایک خط پہنچا جس میں آپ نے لکھا کہ آپ دہلی آ رہے ہیں۔ وہاں آپ سیل ہوٹل میں فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک قیام کریں گے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے خط پہنچنے کے بعد میں ایک روز ان سے ملنے کے لیے سیل ہوٹل پہنچا۔ سردی کا موسم تھا اور یہ گھاس پر کرسی بچھائے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ میں جب گیا تو بہت تپاک کے ساتھ ملے کیونکہ اس سے پہلے کئی بار مل چکے تھے اور اس کمپنی کے ایک حصہ دار مسٹر آر کیمر سے بھی میرے کچھ مراسم تھے۔ میں وہاں بیٹھا تو ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب بزنس کی باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے پوچھا کہ "ریاست" کی اشاعت آجکل کتنی ہے۔ میں نے بتایا کہ مجھے ٹھیک تو معلوم نہیں غالباً سات آٹھ ہزار کے درمیان ہوگی۔ یہ اشاعت میں نے وہی کہی جو دفتر والے مشہورین کے خطوط کے جواب میں لکھتے تھے یا لوگوں سے کہتے تھے۔ مسٹر ہٹن ولیمز کو معلوم تھا کہ "ریاست" کی فی الحقیقت اشاعت چھ ہزار ہے۔ آپ نے سات آٹھ ہزار کے درمیان کے الفاظ سن کر شکر اترتے ہوئے جو کہا وہ مجھے اب تک اچھی طرح سے یاد ہے آپ نے فرمایا۔

"ویل سردار دیوان سنگھ۔ اگر ریاست" کی اشاعت فی الحقیقت سات آٹھ ہزار ہے تو

یہ بہت اچھی اشاعت ہے"

اس فی الحقیقت "کے معنی یہ تھے کہ مسٹر ہٹن ولیمز اس اشاعت کو غلط سمجھتے ہیں اور انگریزوں کے بلند کیرئیر کے مطابق شریفانہ انداز میں مجھ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے جب آپ سے یہ الفاظ سنے تو میں شرم کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں اور تھوڑی دیر باتیں کر کے میں واپس چلا آیا۔

میں اپنی کار میں واپس آ رہا تھا۔ اور میرے ہاتھ تو سٹیرنگ پر تھے مگر میرا دماغ اپنی دروغ بیانی پر بے حد نام اور مشغول تھا۔ اور میں نے راستہ میں ہی یہ فیصلہ کیا کہ جا بے نتائج کچھ بھی ہوں میں آئندہ نہ صرف خود کبھی اخبار کی اشاعت کے متعلق جھوٹ نہ بولوں گا۔ بلکہ دفتر والوں کو بھی نہ بولنے دوں گا۔ چنانچہ میں نے دفتر پہنچنے کے بعد منیجر اشتہارات اور کنو میسروں کو ہدایت کی کہ چاہے کچھ بھی ہوا اخبار کی اشاعت کے متعلق آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولا جائے۔ منیجر نے کہا کہ



اگر جھوٹ نہ بولا جائے گا تو اشتہارات کم ہو جائیں گے کیونکہ دوسرے اخبارات درود ہزار چھپتے ہوئے بھی اپنی اشاعت میں ہزار بتاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اخبار جائے جہنم میں یہ فیصلہ ہے کہ اخبار کی اشاعت کے متعلق کبھی بھی جھوٹ نہ بولا جائے گا۔ اور اس واقعہ کے بعد میں نے یہ عہد کیا کہ نہ صرف اپنے اخبار کی اشاعت کے متعلق کبھی جھوٹ نہ بولا جائے گا بلکہ دوسرے اخبارات کے جھوٹ کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ ہندوستانی جرنلزم میں سے جھوٹ کی یہ پلیدگی دور ہو اور اس میں تجارتی پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو۔ چنانچہ ہمارے اس جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتہارات بند ہونے شروع ہو گئے اور اشتہارات دینے والی کمپنیوں نے اپنے بجٹ میں سے ”ریاست“ کا نام خارج کرنا شروع کر دیا۔ اور اس وقت ”ریاست“ میں کسی بھی انگریزی یا امریکن فرم کا کوئی اشتہار نہیں اور ان فرموں کے اشتہارات ان اخبارات کے پاس ضرور موجود ہیں جن کی اشاعت چاہے دو چار سو ہی ہے مگر یہ جھوٹ بول کر اپنی اشاعت دس دس اور پندرہ پندرہ ہزار بتاتے ہیں اور اپنے جیب میں اشاعت کے متعلق جھوٹے اور جعلی سرٹیفکیٹ لے لے مبینی اور کلکتہ میں پھرتے ہیں۔

تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں اردو کا ہفتہ وار اخبار ”شیر پنجاب“ بھی لاہور سے دہلی منتقل ہو گیا اور چونکہ اس اخبار کے لیے دہلی میں دفتر کا کوئی انتظام نہ تھا اور اس اخبار کے مالک سردار مرنگ کے ساتھ کچھ مراسم بھی تھے۔ اس اخبار کے لیے دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں جگہ دے دی گئی اور اس اخبار کا دفتر غالباً دو برس کے قریب دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں رہا اور اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ یہ اخبار پانچ سو چھپتا ہے اور اس پانچ سو میں سے ایک سو کے قریب تو اس کے پیڈ خریدار ہیں۔ ایک سو کے قریب یہ ایجنسیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ایک سو کے قریب اس کے پرچے دفتر میں پڑے رہتے ہیں اور دوسو کے قریب پرچے مشہرین کو بھیجے جاتے ہیں اور ان کو لکھا جاتا ہے کہ یہ اخبار دس ہزار چھپتا ہے اس کے علاوہ یہ اخبار سال میں تین بار خاص نمبر مثلاً کبھی نمبر آزادی، نمبر گورنمنٹ، نمبر دغیر کے نام سے شائع کرتا ہے اور یہ خاص نمبر بھی پانچ سو ہی چھاپے جاتے ہیں مگر مشہرین سے اشتہار لیتے وقت کہا جاتا ہے کہ یہ خاص نمبر پچیس ہزار چھپے گا۔

”شیر پنجاب“ کا دفتر دو برس کے قریب دفتر ”ریاست“ کے ایک کمرہ میں رہا اور اس کے بعد یہ اپنا دفتر دوسری جگہ لے گیا۔ اور اطلاعیں آتی رہیں کہ اس اخبار کا مالک سردار جگدہا مرنگ نہ صرف اپنے اخبار کے متعلق مشہرین کے ساتھ چار سو میں کر کے یعنی دھوکہ دے کر اشتہارات حاصل کرتا ہے بلکہ یہ ”ریاست“ اور دوسرے اخبارات کے خلاف بھی مشہرین کے پاس زہر آگلتا ہے تاکہ دوسرے اخبارات کے اشتہارات کا حصہ بھی اس کو ملے یا جائے یس یہ سب کچھ سنتا رہا مگر اس خیال سے خاموش رہا کہ اگر ہندوستان کے نصف اخبارات دھوکہ پر زندہ ہیں تو اس اخبار کی دھوکہ بازی کوئی زیادہ قابلِ تعزیر نہیں۔

چند برس جسے گورنمنٹ نے ہندوستان میں ایک پریس کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا اور بتایا کہ اس کمیشن کا مقصد اخبارات کے معیار کو بلند کرنا اور ہندوستانی اخبارات کے متعلق درست شاعت دریافت کرنا ہے۔ میں نے گورنمنٹ کا جب یہ اعلان پڑھا تو میں نے خیال کیا کہ یہ موقع ہے کہ اخبارات کے اشاعت کے متعلق جھوٹ کو بے نقاب کیا جائے اور میں اس میں حصہ لوں۔ چنانچہ میں نے ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کو ایک پوسٹ کارڈ ایک دو مہری کمپنی کے نام سے لکھا (تاکہ اخبارات کو یہ علم نہ ہو کہ کوئی اخباری ان کے متعلق اعداد و شمار حاصل کرنا چاہتا ہے) کہ ہم اشتہار دینا چاہتے ہیں آپ اپنا لٹریچر بھیجئے اور لکھیے کہ آپ کے اخبار کی اشاعت کیا ہے اور آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ بھی ساتھ بھیجئے میں نے پریس ڈائریکٹری میں سے ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کو یہ خط بھیجا جس کے جواب میں ان اخبارات نے اپنی اشاعت لکھتی اور اشتہارات کے متعلق جو کچھ بھی ان کے پاس لٹریچر تھا وہ انھوں نے بھیج دیا اور ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کے اشاعت کے متعلق اعداد و شمار میرے پاس پہنچ گئے اور میں حیران رہ گیا کہ اردو کے جو اخبارات دو دو سو چھپتے ہیں ان کے پاس بھی آٹھ آٹھ اور دس دس ہزار اشاعت کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ میرے اس خط کا جواب "شیر پنجاب" کی طرف سے وصول نہ ہوا کیونکہ اس اخبار کے مالک سردار جنگ بہادر سنگھ کو معلوم تھا کہ جس پتہ سے خط آیا ہے اس کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں "شیر پنجاب" کے جواب کا کئی روز انتظار کرتا رہا اور جب کوئی جواب نہ آیا تو میں نے پٹنہ کی یونائیٹڈ سرجیکل کمپنی کے مالک مسٹر کشن چند گپتا جو میرے دوست ہیں ان کو ایک خط لکھا کہ وہ اپنی طرف سے "شیر پنجاب" کو لکھ کر اس کی اشاعت دریافت کریں۔ مسٹر کشن چند گپتا نے یونائیٹڈ سرجیکل کمپنی کے فارم پر ایک خط منبر "شیر پنجاب" دہلی کے نام بھیجا۔ سردار جنگ بہادر سنگھ کو کچھ علم نہ تھا کہ اس فرم کا مالک کون ہے اور اس کا تعلق دیوان سنگھ سے ہے یا نہیں۔ "شیر پنجاب" کی طرف سے فوراً ہی جواب لیا کہ "شیر پنجاب" کی اشاعت دس ہزار ہے اور یہ سکھوں میں نہایت با اثر اور زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار ہے۔ "شیر پنجاب" کے اس خط کے ساتھ کوئی آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ نہ تھا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد میری ہدایت کے مطابق مسٹر کشن چند گپتا نے بھر "شیر پنجاب" کو لکھا کہ آپ اپنی اشاعت کی تائید میں آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ بھیجئے اگر آپ کے پاس سرٹیفکیٹ ہو اس خط کے جواب میں سردار جنگ بہادر سنگھ نے ایک سرٹیفکیٹ بھیجا جو ہے ایمن بھگت اینڈ کو لمیٹڈ آڈیٹر چاندنی چوک دہلی کا تھا اور ساتھ خط لکھا کہ آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ ارسال ہے آپ "شیر پنجاب" میں اشتہار ضرور دیجئے۔

یہ خط اور آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ بھی مسٹر کشن چند نے مجھے بھیج دیا خط پر تو سردار جنگ بہادر سنگھ کے نقطہ نظر خط میں بھر لکھا تھا کہ اشاعت دس ہزار ہے اور سرٹیفکیٹ اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ خط اور سرٹیفکیٹ جب میرے پاس پہنچا تو اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ ہے ایمن بھگت اینڈ کو لمیٹڈ آڈیٹر کا دیا جس کوئی موجود ہی نہیں اور نہ صرف اشاعت کے متعلق یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ ہے۔

بلکہ یہ سوئی صدی قبل سازی بھی ہے۔ میں نے اپنے دفتر کے منبر کو بھیجا کہ وہ جے این۔ جگت اینڈ کمپنی چاندنی چوک جانے اور ان سے میرے ملنے کے لیے وقت مقرر کرے۔ اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ ایک نو میں یہ کہہ کر کہ مجھے بھی دس ہزار اشاعت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے اس فرم سے معلوم کروں کہ یہ کیا فیض لے گی جن کا مطلب یہ ہے کہ اس نے شیر پنجاب سے بھی یہی فیض لی ہوگی۔ دوسرے بات چیت کے بعد اس کے مالک کو ذیل کروں کہ یہ کیوں جھوٹے سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔ میرے دفتر کے منبر نے چاندنی چوک میں اس فرم کو بہت تلاش کیا اور دو گھنٹے تلاش کرنے میں صرف کیے مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر ایک دوسرے آڈیٹر کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کو تو کوئی علم نہیں ہم اگر چاہیں تو آڈیٹر اس کی ایسوسی ایشن کے دفتر سے معلوم کر سکتے ہیں کہ اس فرم کا پتہ کیا ہے کیونکہ اس ایسوسی ایشن کے دفتر میں تمام آڈیٹر اس کے پتے موجود ہیں۔ میں نے اس ایسوسی ایشن کو ایک خط لکھا کہ اس فرم کا دفتر کہاں ہے تو اس فرم نے جواب دیا کہ اس نام کی کوئی فرم دہلی میں موجود نہیں۔ اس کے بعد میں نے ایک خط بذریعہ رجسٹری جے این۔ جگت اینڈ کمپنی کو بھیجا جو تیسرے روز واپس آگیا اور اس پر لکھا تھا کہ اس نام کی کوئی فرم چاندنی چوک میں نہیں۔ یہ دو جواب پہنچے پھر میری آنکھیں کھلیں کہ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے مگر میں اپنے شک کو مٹانے اور بُرے کے گھر تک پہنچنے کے مصداق میں نے دہلی گورنمنٹ کے آفس دفتر کو خط لکھا جہاں کہ تمام لمیٹڈ کمپنیاں رجسٹر کی جاتی ہیں کہ اس لمیٹڈ کمپنی کا پتہ کیا ہے تو وہاں سے بھی جواب آیا کہ اس نام کی کوئی لمیٹڈ کمپنی دہلی میں نہیں یہ تمام ثبوت قبضہ میں کرنے کے بعد میں نے پریس کمیشن کے سیکریٹری کو ٹیلی فون کیا کہ میں آپ سے طنا چاہتا ہوں۔ سیکریٹری ایک صاحب سٹر کھتے تھے۔ یہ میرے اور ”ریاست“ کے حالات سے واقف تھے آپ کے اگلے روز ملنے کا وقت دیا اور میں دس بجے ان کے دفتر میں پہنچا۔ وزٹنگ کار ڈیہا تو انہوں نے بلا بھیجا۔ یہ تپاک کے ساتھ ملے۔ اور آپ نے کہا: ”فرمائیے۔“ گورو دیو کیا حکم ہے۔ میں نے گورو دیو کے الفاظ سن کر کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کہا تو آپ نے جواب دیا کہ ”آپ ہندوستانی جرنلزم کے گورو دیو ہیں اس لیے ایسا کہا ہے“ باتیں شروع ہوئیں تو میں نے کہا کہ پریس کمیشن کا مقصد اخبارات کی اشاعت کے جھوٹ کو ختم کرنا ہے اور جو سرکاری سرکر اخبارات کو بھیجا گیا اس میں بھی صاف لکھا ہے کہ جو اخبار کمیشن کے سوالات کے جواب میں غلط اشاعت بتائے گا یا غلط جواب دے گا اس پر فوجداری مقدمہ چلایا جائے گا۔ میں آپ کو مثال کے طور پر ایک اخبار کے متعلق ثبوت دیتا ہوں کیا آپ اس اخبار پر غلط اطلاع دینے کے جرم میں مقدمہ چلائیں گے۔ آپ نے کہا۔ بتائیے کیا ثبوت ہے۔ میں اس سے پہلے تمام کاغذات کے فوٹو آؤد کر اصل کاغذات محفوظ رکھ چکا تھا۔ میں نے تمام حالات بتائے کے ساتھ فوٹو دکھائے اور کہا کہ یہ اخبار ”شیر پنجاب“ صرف پانچ سو چھپتا ہے جس کے ثبوت میں پریس کے داچرا اور بلبل کی نقلیں موجود ہیں۔ اور یہ نہ صرف دس ہزار کا جعلی سرٹیفکیٹ مشہور کر دے کہ دھوکہ دیتا ہے۔ اس اخبار نے پریس کمیشن کو بھی دھوکہ دے کر اپنی اشاعت پانچ ہزار لکھتی ہے اور یہ ثبوت موجود ہے

تمام کاغذات دیکھنے کے بعد مسٹر کھنہ جیران ہو گئے اور آپ نے کہا کہ میں نوٹوں کی کاپیوں کا ایک سیٹ اُن کے پاس چھوڑ جاؤں۔ کمیشن کے صدر مسٹر راجہ ادھکشا نچ ہائیکورٹ بمبئی (عنقریب دہلی آنے والے ہیں اور آپ یہ کہیں اُن کے سامنے پیش کریں گے۔

میں نوٹوں کی ایک ایک کاپی دے کر اپس آگیا۔ چند روز بعد مسٹر کھنہ کا ٹیلی فون آیا کہ کمیشن کے صدر اور ممبر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور میں اگلے روز نو بجے براڈ کاسٹنگ ہوس کی بلڈنگ میں پہنچ جاؤں، اس بلڈنگ کی اوپر کی منزل میں کمیشن کا اجلاس ہوگا۔ اور آپ نو بجے میرا براڈ کاسٹنگ ہوس کے نیچے کے ہال میں انتظار کریں گے۔ میں وقت کا ٹھہرتا ہوں۔ نو بجے سے پانچ سات۔ منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ نو بجے کھنہ صاحب آئے اور مجھے اس بلڈنگ کے اوپر کے حصہ میں لے گئے جہاں کہ کمیشن کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مجھے مسٹر راجہ ادھکشا صدر کمیشن کے سامنے کرسی پر بٹھادیا گیا اور آپ کی داہنی اور بائیں طرف آٹھ سات دوسرے ممبر بیٹھ گئے۔ مجھے صدر نے پوچھا کہ اصل کاغذات کہاں ہیں۔ میں نے یہ کاغذات دکھائے تو آپ نے پوچھا کہ کیا اصل کاغذات (جن کے نوٹوں کے پاس پہلے موجود تھے) وہ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کو دکھانے اور دیکھنے کے لیے ہی لایا ہوں۔ اس کے بعد مجھ پر جرح ہوئی۔ جو مختلف ممبروں کی طرف سے تھی۔ اور میں نے بتایا کہ میں صرف ”شیر پنجاب“ کو ہی بے نقاب نہیں کرنا چاہتا میری غرض تمام اخبارات کے اشاعت کے جھوٹ کو بند کرنے کی ہے۔ چنانچہ میں نے دوسرے ایک درجن کے قریب غلط اشاعت ہٹانے والے اخبارات کے متعلق بھی کاغذات دیئے اور ان اخبارات میں صوبہ جات اور مرکزی گورنمنٹ کے وزراء کے اخبارات بھی تھے۔ اور میں نے جب ہندوستان کے تمام اخبارات کے آئے ہوئے جوابات والی فائل دکھائی تو تمام ممبر رنگ گئے کہ میں کس طرح سب اخبارات کی اصلی حالت کا پتہ لے لیتا ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک اخبار کا ایک پرچہ دیا جس پر لکھا تھا کہ یہ تین شہروں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے حالانکہ یہ کبھی بھی سوائے ایک جگہ سے کسی دوسری جگہ سے شائع نہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ”ریاست“ کے پچھلے دو سو کے قریب کٹنگ دیئے جن میں ہندوستان کے اخبارات کے جھوٹ اور بے ایمانیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ برہمن ہیں، جہارت پیدا کر کے لے قدم اٹھایا جائے اور قانون کے ذریعہ اخبارات کو مجبور کیا جائے کہ یہ غلط اشاعت نہ بتائیں۔ میں نے جب یہ دو سو کٹنگ ترتیب دار اور تاریخ دار دیئے تو سوالیہ پیدا ہوا کہ یہ اردو زبان میں ہیں اور ممبروں میں کوئی بھی اردو زبان جاننے والا نہیں ان کو کون پڑھے چنانچہ صدر نے سیکریٹری سے کہا کہ مترجم مقرر کر کے تمام مضامین کا ترجمہ کرایا جائے اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یو پی وغیرہ سے مترجم منگائے گئے جنہوں نے ایک ماہ میں ان تمام مضامین کا ترجمہ کیا اور پھر ترجمہ کمیشن کے سامنے پیش ہوا۔

یہ ملاقات غالباً ایک گھنٹہ کے قریب ہوئی میں تمام کاغذات دے کر واپس چلا آیا اس کے

چند روز بعد کمیشن کے سامنے میری پھر شہادت ہوئی اور ایک گھنٹہ کے قریب یہ شہادت جاری رہی اور میں نے بتایا کہ ہم اخبارات والے اس مقدس پیشہ کو تجارت قرار دیتے ہوئے کیا کچھ کرتے ہیں اور ہندوستان کا پرہیز بھائے ملک کے لئے مفید ہونے کے خود جرائیم کرتا ہے۔

میں جب "شیر پنجاب" کے متعلق مواد جمع کر رہا تھا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ تو درست ہے کہ یہ اخبار جعلی سرٹیفکیٹ دکھا کر مشہرین کو دھوکہ دے رہا ہے یہ کس طرح ثابت کیا جائے کہ اس کی اشاعت فی الحقیقت پانچ سو ہے اس مقصد کے لئے میں نے آس پریس سے دو چرویل اور بلوں کی اصلیں حاصل کر لیں جس پریس میں یہ اخبار چھپتا تھا اور جس میں تاریخ وار اس کی اشاعت پانچ سو درج تھی چنانچہ بلوں کی یہ فائل بھی میں نے پریس کمیشن کے حوالہ کر دی۔ اور جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو "شیر پنجاب" میں ان تمام الزامات کو رد کرنے کے لئے یاد دہانے والے الفاظ میں مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے ایک مضمون میرے خلاف شائع کیا گیا۔ اس مضمون کے شائع ہوتے ہی میں نے سردار جنگ بہادر سنگھ پر توہین کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ دائر ہو ہی تھا کہ یہ بھاگتے ہوئے میرے دوستوں کے پاس پہنچے اور معاف کر دینے کے لئے سفارشیں شروع ہوئیں کبھی تو مسٹر جناداس اختر آرہے ہیں۔ کبھی سردار پھمن سنگھ گل کو بھیجا جا رہا ہے اور کبھی گیانی گورمکھ سنگھ کا ٹیلی فون آرہا ہے اور ایک بار گیانی کرتار سنگھ کا بھی ٹیلی فون آیا کہ آپ سنے کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ میں سب سے انکار کرتا رہا آخر سردار سنت سنگھ سابق ممبر اسمبلی و امبیڈر اسی تھوپیانے زور دیا تو میں انکار نہ کر سکا کیونکہ ان کے مجھ پر احسانات تھے اور آخر اس شرط پر مقدمہ واپس لینے پر آمادہ ہوا کہ جنگ کا یہ بہادر شیر لکھ کر عدالت میں معافی مانگے اور بطور خرچہ ہر جائزہ احمقانہ ساڑھے چار سو روپیہ ادا کرے۔ چنانچہ اس نے دو پوسٹ ڈیوٹی چیک (ایک دو سو روپیہ کا اور دوسرا اڑھائی سو روپیہ کا) دیئے اور عدالت میں لکھ کر معافی مانگی یہ دونوں چیک سردار سنت سنگھ کے نام کے تھے ان میں سے دوسو روپیہ والا چیک تو کمیشن ہو گیا اور اس کا روپیہ بھی سردار سنت سنگھ نے مجھے دے دیا اور دوسرا چیک اب تک کمیشن نہیں ہوا اور یہ چیک اب بھی سردار سنت سنگھ کے پاس پڑا ہے اور اس مقدمہ کے واپس لینے کی ایک دہائی بھی تھی کہ پہلی پیشی والے دن ہی سردار جنگ بہادر سنگھ کے دل پر حملے شروع ہو گئے اور رات کو چار بار ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ان کی یہ حالت دیکھ مجھے رحم آ گیا اور میں نے جنگ کے اس بہادر شیر کا معافی نامہ قبول کر لیا ورنہ یہ سردار صاحب جیلسازیوں یا حلف دروغی کے جرم میں جیل کی سیڑ کر تے اور ان کے اخبار کا ایک اشتہار بھی باقی نہ رہتا جس کی بنیاد صرف چار سو بیس او چھل سازیوں پر ہے +

## حسن اور موسیقی کا اثر

پرست برس ہوئے میں لاہور کے ایک اخبار کو ایڈیٹ کرتا تھا اور میرے ماتحت ایک مسکھ سب ایڈیٹر تھے۔ ایک روز شام کو میں سینا جا رہا تھا تو میں نے اس سب ایڈیٹر سے کہا کہ اگر وہ بھی چاہیں تو میرے ساتھ سینا چلیں۔ میرے اس کہنے پر آپ نے جواب دیا کہ انھوں نے کبھی بھی کوئی ظم نہیں دیکھی اور ان کو سینا سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں حیران کر یہ کہے انسان ہیں جن کو سینا سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے ان سے متعدد سوالات کیے اور انھوں نے جو جوابات دیے۔ وہ یہ تھے۔

کیا آپ کو موسیقی سے کوئی دلچسپی ہے۔

مجھے موسیقی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں جب گوردوارہ جاتا ہوں تو وہاں شبد سنایا کرتا ہوں گوردوارہ صاحب کا تو تمام کا تمام کلام ہی راگوں اور راگنیوں میں ہے کیا آپ کو راگ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مجھے فی الحقیقت کسی راگ یا راگنی سے کوئی واقفیت نہیں۔

کیا موسیقی کو سن کر کبھی آپ کی آنکھیں تر نہیں ہوتیں۔

میری ماں کا انتقال ہوا۔ میرے باپ کا انتقال ہوا اور ایک بھائی کا بھی انتقال ہوا اگر میری آنکھوں سے کبھی آنسو نہیں نکلا۔

کیا آپ پر حزن اور خوبصورتی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

میں چلے گئے تھے بھی خوبصورت عورت کو دیکھوں مجھ پر کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کیا آپ کو اچھی خوشبو سے کوئی دلچسپی ہے۔

چاہے میری ناک میں عطر ڈال دیا جائے مجھے خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔

آپ اچھے کھانے میں تولدت محسوس کرتے ہوں گے۔

جیسا کھانا بل جائے کھا لیتا ہوں کوئی زیادہ شوق نہیں۔

یہ جواب انھوں نے نہایت بنجیدگی سے دیئے جن میں کوئی تعنت یا بناوٹ نہ تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ خدا نے فی الحقیقت ان کو ان تمام نعمتوں سے محروم پیدا کیا ہے۔ میں نے ان کو بار بار کریداً تو معاذم ہوا کہ یہ فی الحقیقت پیدا انشی ظہری ذفر اودان خدائی نعمتوں سے محروم ہیں۔ سب کچھ سننے کے بعد میں نے ان سے صرف یہی کہا کہ آپ اس سرزمین کے لئے کیوں بوجھ ہیں اور جہلزم یا لٹریچر کو گندہ کرنے کے لئے کیوں زندہ ہیں؟

میرے اس کہنے پر یہ مسکرا دیئے اور میں حیران تھا کہ دنیا میں انسانوں کے لباس میں کسے کیسے گدے بھرے پٹے ہیں جن پر نہ حسن کا اثر ہو سکتا ہے نہ موسیقی کا۔ نہ خوشبو کا اور نہ اچھے لہذا کھانے کا۔

میں نے اپنی تمام زندگی میں صرف یہی ایک شخص دیکھا ہے جس پر حزن اور موسیقی کوئی اثر نہ کر سکتا

مٹی اور اگر اس سب ایڈیٹر کا یہ شعار نیک چلتی قرار دیا جائے تو مجھ دہیا میں اپنے آپ کو ایک بد چلن  
 ترس انسان کہلانے میں کوئی انکار نہیں جو زندگی بھر حسن اور موسیقی سے ہمیشہ متاثر رہا اور اب بھی جب  
 کسی عین عورت کو دیکھتا ہوں یا اچھا گانا سنتا ہوں تو جسم میں ایک برقی ردی محسوس کرتا ہوں اور اس  
 سلسلہ میں چند ذاتی واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

میں مصوری پہاڑ پر تھا اور وہاں مرحوم ہلدا جہنا جہ بھی مقیم تھے۔ اور ان دنوں چند روز کے لیے مرحوم  
 پنڈت موتی لال نہرو بھی الہ آباد سے سیر و تفریح کے لیے مصوری تشریف لائے تھے، پنڈت موتی لال  
 نہرو کے مصوری تشریف لانے پر ہمارا جہنا جہ نے آپ سے چند سلا تائیں کہیں اور آپ نے ان ملاقاتوں  
 کے بعد پنڈت جی کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا۔ یہ پارٹی وہاں کے ہوٹل میکین میں دی  
 گئی۔ پارٹی کے لیے ایک ہزار کے قریب دعوتی کارڈ جاری کیے گئے اور ان کارڈوں میں سے ڈیڑھ سو کے  
 قریب کارڈ پنڈت موتی لال جی کو بھی بھیجے گئے تاکہ وہ مصوری آچکے اپنے دوستوں کو بھیج دیں اور  
 پنڈت جی کے یہ دوست بھی پارٹی میں شامل ہوں چنانچہ پنڈت موتی لال جی نے یہ کارڈ اپنی کشمیری  
 پنڈت برادری کے لوگوں اور دوسرے دوستوں کو بھیج دیے۔ ایک تو ایسی پارٹیوں میں ہر شخص اپنے  
 لباس میں شامل ہوتا ہے اور وہاں اعلیٰ سوسائٹی کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے اور عورتیں تو  
 ایسی پارٹیوں میں شامل ہوتے وقت اپنی زیبائش پر تمام قوت صرف کر دیتی ہیں اور ہر عورت چاہتی  
 ہے کہ وہ دوسری عورت کے مقابلہ پر زیادہ باعث کشش ہو چنانچہ اس پارٹی میں بھی غالباً ایک سو  
 کے قریب کشمیری پنڈت فیملی کی خواتین شامل ہوئیں کیونکہ پارٹی دینے والے ایک ہمارا جہ اور پارٹی  
 جن کے اعزاز میں دی گئی وہ بہت بلند لیڈر اور کشمیری پنڈتوں کی برادری میں بہت ہی ممتاز  
 شخصیت تھے کشمیری پنڈتوں کی قوم کا حسن اور خوبصورتی کے لحاظ سے شاید ہندوستان کی  
 کوئی قوم بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مترشح اور سپید گلاب سارنگ۔ سیاہ اور لمبے بال۔ پُرکشش  
 آنکھیں اور دیکھنے والوں کو نہ بھولنے والے نقش اس کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کی یہ خواتین بہترین  
 لباس میں شامل ہوتی ہیں اور پارٹی کے تمام لوگوں کی نگاہیں ان کے حسن سے محو رہتی ہیں۔ جب چائے  
 لی جا رہی تھی تو میرے ساتھ میز پر دوسرے دو دوستوں کے ساتھ پنڈت جیون لال شہو جو مرحوم  
 راجہ سرو دیا کشن کول کے قریبی عزیزوں میں اور کشمیری پنڈت ہیں (ابھی بیٹھے تھے۔ اور باتیں ہو رہی  
 تھیں۔ تو پنڈت جیون لال جی نے پارٹی کے متعلق کہنا پارٹی بہت کامیاب رہی۔ شاید ہی کوئی  
 شخص ایسا ہوگا جو مصوری میں ہو اور اس پارٹی میں شامل نہ ہو اور لیڈر بھی کافی تعداد  
 میں شامل ہوئی ہیں۔ میں نے پنڈت جیون لال جی کے اس ارشاد کو سن کر جو کچھ کہا وہ مجھے اب تک  
 اچھی طرح سے یاد ہے میں نے عرض کیا۔

”پنڈت جی کیا پوچھتے ہو۔ اب تو زندگی کی صرف ایک ہی خواہش باقی ہے کہ جب میں

مردوں کو میرا نیا جنم کسی کشمیری پنڈت کے خاندان میں ہو۔“

میرا یہ جواب سن کر پنڈت جیون لال اور دوسرے دوست ہنسنے لگے اور کہہ رہے تھے۔ مگر فی الحقیقت

میری خواہش یہی ہے کہ اگر مسئلہ خلع کے مطابق میرے مرنے کے بعد میرا دوسرا جنم ہو تو میں کشمیری پنڈتوں کے کسی خوبصورت خاندان میں پیدا ہوں۔ اور اگر خدا نے کسی بد صورت خاندان میں پیدا کرنا ہے تو بہتر ہے کہ میرے اس آئندہ جنم میں مجھے پیدا کرنے والی ماں باں مجھ ہی رہے اور مجھے پیدا نہ کرے۔

بہشت برس ہوئے اخبار ریاست کے جاری ہونے سے پہلے میں ایک بار حیدر آباد کے وزیر عظم ہارا جہ سرکشن پرشاد کا سفارشی خط لے کر ملازمت حاصل کرنے کے لئے مرحوم ہارا جہ پر تاب سنگہ والیئے کشمیر کے پاس جوں گیا تھا۔ اور وہاں ایک ہفتہ کے قریب اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں مقیم ہوا۔ اس رشتہ دار کے مکان دالی گلی میں سے گذر رہا تھا تو میں نے اس گلی کے ایک بستر مکان کی ایک ڈیوڑھی میں ڈوگرہ خاندان کی دو خوبصورت عورتوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان کو شاید چند سیکنڈ دیکھا تھا اور اس کے بعد ان کو پھر دوبارہ دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ سچ یہ ہے کہ میں ان خواتین کی خوبصورتی اور حسن کو آج تک کبھی بھی بھول نہیں سکا اور جب بھی ریاست جوں کے کسی ڈوگرہ سے ملاقات ہوتی ہے تو فوراً ہی ان دونوں خواتین کا خیال ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے چنانچہ یہ واقعہ دیکھ سب سے کہ میں جب فیروز پور جیل میں نظر بن رہا تھا تو وہاں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر ڈوگرہ تھے۔ ان سے جب باتیں ہوتیں تو میں ان سے کہا کرتا کہ آپ تو بہشت کے رہنے والے ہیں کیونکہ جوں کی ڈوگرہ قوم بھی اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے تمام ملک میں ایک ممتاز ترین پوزیشن رکھتی ہے۔

بہشت برس ہوئے میرے ہاں ایک مسٹر اینگلو انڈین خاتون مسز سیلینڈ آیا کرتی تھیں یہ دہلی کے ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھیں۔ اس خاتون کی عمر غالباً پچاس برس کی ہوگی اور اس کا شوہر ساتھ ستر برس کا تھا جو ضعیفی اور بیماری کے باعث چل پھر نہ سکتا تھا اور یہ بھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ آیا کرتا ان میان بیوی کی ایک لڑکی جس کا نام مرل تھا بہت ہی خوبصورت تھی جس کی عمر اس وقت غالباً دس برس کی ہوگی۔ میں نے ایسے خوبصورت بچے بہت کم دیکھے ہیں۔ یہ لڑکی بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی اور یہ جب کبھی آتی تو میں اس بچی کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتا اور چونکہ بچوں کی فطرت یہ ہے کہ یہ اشیاء دینے اور اخلاص و محبت سے پیش آنے والے لوگوں سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں جب اسے ہمارے ہاں آئے چند روز ہو جاتے تو یہ اپنی ماں کو مجبور کر کے اس کے ساتھ چلی آتی۔ میں نے اب تک دس اس لڑکی کی ماں اور باپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ اس لڑکی کو مجھے دے دیں تو میں اسے بطور اپنی بیٹی کے اپنے پاس رکھوں گا اور اس کی اعلیٰ تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔ مگر یہ لوگ اس پر تیار نہ ہوئے کیونکہ یہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کے ہاں اور کوئی اولاد نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر اور مسز سیلینڈ آج کل کہاں ہیں اور کیا یہ زندہ بھی ہیں یا نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کے دہلی سے چلے جانے کے بعد مجھے جب بھی ریلوے کے کسی اینگلو انڈین ملازم سے بات حیات کرنے کا اتفاق ہوتا تو میں ان کے متعلق ضرور دریافت کر لیا کرتا اور مجھے کئی سال بعد



معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی ایک اینگلو انڈین نوجوان سے شادی ہو گئی تھی جو کہ ریڈے میں کہیں ملازم تھا اور میں نے بہت کوشش کی کہ اس لڑکی اور اس کے شوہر کا کہیں پتہ چلے تو میں ان کو اپنے ہاں دعوت دلوں یا ان کو کچھ تحائف ہی بھیجوں مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ اور یہ ہمیشہ انوس رہا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیٹی نہ بنا سکا۔ اس لڑکی کی خوبصورتی کو بھی میں اب تک بھول نہیں سکا۔

موسیقی کے متعلق ہندوستان میں ریڈیو کے جاری ہونے سے پہلے مجھے راگوں اور راگنیوں سے کوئی زیادہ واقفیت نہ تھی صرف چند راگوں کو سمجھ لیتا اور ان سے محفوظ ہر لیتا اور ان راگوں میں دیں۔ جوگ۔ آسا اور بھروں وغیرہ راگ میرے لئے بہت کشش کا باعث تھے۔ ریڈیو کے جاری ہونے کے بعد مجھے موسیقی سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور میں نے دوسرے راگوں سے واقفیت حاصل کر لی جس کا ریڈیو صرف ریڈیو کو ہی دیا جاسکتا ہے چنانچہ چند برس تک تو ریڈیو سے ایک عیش کی سی کیفیت جاری رہی۔ میرا ریڈیو پروگرام کے وقت ہمیشہ کھلا رہتا اور مجھے اُس زمانہ میں حلم تھا کہ ہندوستان کے کون کون سے ریڈیو سٹیشن پر اچھے گانے والے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی ریڈیو کے رسالہ پر تمام سٹیشنوں کے تمام اچھے گانے والوں کے پروگرام پر نشان لگا لیتا اور ان کو رات کے گیارہ بجے تک سنتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ میں نے ایک رجسٹر میں ہندوستان کے تمام اچھا گانے والے اور گانے والیوں کے نام لکھتے ہوئے تھے اور ان کے آگے اچھا۔ بہت اچھا اور بہت ہی اچھا کے ریمارک تھے۔ اور ایک بار جب یہ رجسٹر ریڈیو کے کنٹرولر مسٹر احمد شاہ بخاری نے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے اور انھوں نے اپنے پروگرام کے انچارج افسروں کو بلا کر یہ رجسٹر دکھاتے ہوئے شریفانہ انداز میں ان کو سلامت کی کہ ان کو تو کچھ پتہ نہیں کہ کون کون سے سٹیشن پر اچھے گانے اور گانے والیاں ہیں مگر دیوان سنگھ نے ان تمام کے نام رجسٹر میں لکھے ہوئے ہیں تاکہ وہ ان تمام کا گانا سنے اور ان کی موسیقی سے محروم نہ ہو۔

میں ریڈیو پر تو اُس زمانہ میں تمام ہی اچھے گانے والوں اور گانے والیوں کا پروگرام سنا کرتا تھا اور اب مصروفیت کے زیادہ اور شوق کے کم ہونے پر بھی جب کوئی اچھا گانے والا ہو تو اس کا گانا سنتا ہوں اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں نے ہندوستان کے نامور ماہر موسیقی بناب وشنو وگبر کا بھی گانا سنا ہے جب کہ وہ ایک بار دہلی تشریف لائے تھے اور ان کا گانا جرنے والاں کے ایک سکول میں ہوا تھا۔

حسن اور موسیقی کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جو شخص حسن سے متاثر نہیں ہوتا یا وہ کہتا ہے کہ حسن کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ تو دنیا کا سب سے بڑا مسکار ہے اور یا یہ انسان کے جانے میں گدھا ہے کیونکہ حسن پرستی کا بد چلنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور اس سے دیرنا اور غریب بھی متاثر ہوتے رہے اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک بار ہمارا گاندھی ریاست ٹراڈ کو کے دورہ پر گئے اور وہاں آپ نے مالا بار کی عورتوں کے حسن اور صفائی کو دیکھا تو آپ نے ایک

بیان میں فرمایا تھا کہ دہاں کی عورتیں انجیل (فرشتے) ہیں۔ اور موسیقی کے متعلق میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص کسی راگ کو سمجھ سکتا ہے اُس کے لئے اس راگ کا کسی اچھے گانے والے سے سننا آبِ حیات سے کم نہیں اور جو لوگ موسیقی اور راگوں اور راگینوں کو سمجھ نہیں سکتے ان کے سامنے راگ کی باریکیاں فی حقیقت نظر نہیں کے سامنے ہیں بجانے کے مصداق ہیں۔

## گناہوں کے اقرار کا اثر

ایڈیٹر "ریاست" کے درستوں میں ایک صاحب سردار دلیپ سنگھ گل ہیں جو بہت ہی مستعد بہت محنتی بہت ہوشیار بہت دلچسپ اور باعث کشش شخصیت ہیں۔ یہ سردار دلیپ سنگھ گل ۱۹۱۲ء کی پہلی جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گئے۔ ان کے دہاں جانے کے بعد جنگ شروع ہو گئی اُس زمانہ امریکہ میں مرحوم لالہ ہریال کی انقلابی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا۔ اس تحریک میں امریکہ میں رہنے والے تمام ہندو اور سکھ شامل ہو چکے تھے اور یہ تحریک بعد میں غدر پارٹی کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور اس تحریک کے سلسلہ میں ہی سردار گروت سنگھ ایک جاپانی جہاز کا کارکن مار دے کر گنبد لگے۔ چنانچہ سردار دلیپ سنگھ گل بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور جب جنگ کا زیادہ زور ہوا تو آپ جرمنی کے بادشاہ قیصر ولیم کی دعوت پر دوسرے ہندوستانیوں کے ساتھ جرمنی چلے گئے۔ سردار دلیپ سنگھ نے جرمنی جانے کے بعد اس عالمگیر جنگ میں بہت کافی حصہ لیا۔

اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ٹرکی کے انقلاب پسند لیڈر انور پاشا کو ٹرکی سے برلن لے جانے والے یہ سردار دلیپ سنگھ ہی تھے اور جب انور پاشا برلن گئے تو اُسی ہوائی جہاز میں سردار دلیپ سنگھ ان کے ہمراہ تھے۔ اس جنگِ عظیم میں جرمنی اور ٹرکی دونوں کر شکست ہوئی اور انگریز فتحیاب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار دلیپ سنگھ جرمنی میں ہی رہنے پر مجبور ہوئے کیونکہ آپ انگلستان یا ہندوستان آتے تو یہاں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں آپ کو یقیناً پھانسی کی سزا دی جاتی جیسے کہ اُس زمانہ میں غدر پارٹی سے متعلق رکھنے والے سینکڑوں سکھوں اور ہندوؤں کو دی گئی۔

سردار دلیپ سنگھ کئی برس تک جرمنی میں رہے اور آپ کے قیام کے زمانہ میں دہاں آپ کے تعلقات کئی جوان فیلیمز میں ہو گئے۔ ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کی خواتین سے بھی آپ کے گھر سے مراسم ہو گئے اور ان خواتین میں ایک لڑکی سے تو آپ کے گھر سے محبت کے تعلقات بھی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی شادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سردار دلیپ سنگھ گل کی شادی سے پہلے جب آپ کی ہونے والی بیوی سے تعلقات زیادہ گہرے ہوئے تو اس لڑکی نے ہندوستان کے متعلق بہت دلچسپی لیا اظہار کیا۔ آپ اکثر ہندوستان کے متعلق

آپ سے سوالات پر چھاکرتیں اور ایک روز بات چیت جو رہی تھی تو اس خاتون اور سردار دلیپ سنگھ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

خاتون۔ یہ جہاں آپ کا نام سردار دلیپ سنگھ گل ہے اس کے معنی کیا ہیں۔  
سردار دلیپ سنگھ۔ سردار کے معنی رئیس یا لیڈر کے ہیں۔ جیسے برطانیہ میں لارڈ یا کونٹ ہوتے ہیں۔  
دلیپ سنگھ میرا نام ہے اور گل خاندانی لقب ہے۔

خاتون۔ گویا کہ ہندوستان میں آپ کی پوزیشن ایک لارڈ یا کونٹ کی سی ہے۔

سردار دلیپ سنگھ۔ ہاں۔

یورپ اور امریکہ میں ہندوستانی طلباء عام طور پر اپنے خاندان اور اپنی وجاہت کے متعلق بہت سبالت سے کام لیتے ہیں۔ اور سردار دلیپ سنگھ گل نے بھی لارڈ یا کونٹ کے متعلق سوال کے جواب میں ہاں کہہ دیا جو بعد میں ان کے لیے بہت ہی پریشانی کا باعث ثابت ہوا۔

جب اس خاتون نے ٹیٹل لگایا کہ سردار دلیپ سنگھ ہندوستان کے لارڈوں کے خاندان میں سے ہیں اور یہ کسی نہ کسی روز واپس ہندوستان جائیں گے تو اس خاتون نے شادی کے متعلق سردار دلیپ سنگھ کی درخواست کو فوراً منظور کر لیا۔ شادی ہو گئی اور اس خاتون نے اپنے نام کے ساتھ کونٹیس دلیپ سنگھ (یعنی لارڈ دلیپ سنگھ کی بیوی) لکھنا شروع کر دیا اور یہ آئندہ ہندوستان جانے والی ہاتھیوں پر سوار ہو کر شکار کھیلتے۔ دربار منہ قہ کرنے اور محلات میں زندگی بسر کرنے کے خواہش دیکھنے لگی چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ اس خاتون کی ایک حقیقی بہن کی شادی وہاں ایک امیر شخص کے ساتھ ہو چکی تھی جن کے ہاں موٹر بھی تھی۔ سردار دلیپ سنگھ کسی معاملہ میں اپنی بہن سے اراض ہوئی تو اس نے اپنی بہن سے کہا۔

”تمہارے پاس ایک موٹر ہے۔ ہندوستان میں ہمارے ہاں درجنوں موٹریں۔ ہاتھی اور گھوڑے ہیں۔ چند روز کی تکلیف ہے۔ ہم لوگ جب ہندوستان جائیں گے تو ہماری زندگی تمہارے لیے قابل رشک ہوگی۔“

جب اس شادی کو ہوئے چند برس گزر گئے اور جنگ ختم ہونے کے بعد حالات قطعی رل چکے تھے تو مرحوم ہمارا جگمہد فقہ سیر کے لئے فرانس سے جرمنی گئے۔ سردار دلیپ سنگھ نے خیارات میں پڑھا کہ ہندوستان کے ہمارا جگمہد فقہ سیر کے لئے جرمنی آئے ہیں اور برلن کے ملاں ہوٹل میں مقیم ہیں تو آپ ہمارا جگمہد کے لئے ان کے ہوٹل میں گئے۔ ہمارا جگمہد نے در بات چیت ہوئی تو سردار دلیپ سنگھ نے ہمارا جگمہد سے درخواست کی کہ آپ برٹش گورنمنٹ اپنے اثرات استعمال کرتے ہوئے ان کو ہندوستان جانے کی اجازت لے دیں۔ ہمارا جگمہد نے وعدہ کر لیا۔ ہمارا جگمہد برٹش گورنمنٹ پر کافی اثر تھا۔ آپ لندن گئے تو وہاں آپ سے سردار دلیپ سنگھ کے متعلق وزیر ہند سے کہا اور وزیر ہند اس شرط پر سردار دلیپ سنگھ کو ہندوستان جانے کی اجازت دینے پر تیار ہوئے کہ ہمارا جگمہد فقہ ان کی ضمانت دیں اور

سردار دلپ سگہ ہندوستان پہنچنے کے بعد برٹش گورنمنٹ کے خلاف کئی تحریک میں حصہ نہ لیں چنانچہ ہمارا جو کی ضمانت پر سردار دلپ سگہ گل ہندوستان آگئے اور یہاں آپ نے جرمنی کی ٹیک ہیٹ بڑی پرنٹنگ کمپنی کی ایکشن لے لی اور چھاپی کے آرڈر لے کر جرمنی بھیجے شروع کر دیئے جس سے ان کو تین چار سو روپیہ ماہوار آمدنی ہو جاتی اور یاکسنگ کے ساتھ اپنا گزارہ کر لیتے۔

سردار دلپ سگہ جب ہندوستان پہنچ گئے اور یہاں انھوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا تو ان کی بیوی نے برلن سے تقاضے شروع کیئے۔ جس میں ان کو بھی ہندوستان بلالینے کا مطالبہ کیا جاتا۔ یہ تقاضے دو برس تک جاری رہے اور سردار دلپ سگہ ان کو مالتے رہے کہ ابھی گری زیادہ ہے۔ اب سردی کا دور ہے اور اب بارش کے زیادہ ہونے کے باعث سیلاب آ رہے ہیں وغیرہ کیونکہ آپ محسوس کرتے تھے کہ یہاں تو تین چار سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے اور آدھراں کی بیوی اپنی ویٹ لیا جاگیر میں جانے کے خواب دیکھ رہی ہیں جہاں کہ موٹریں ہاتھی اور گھوڑے ہوں گے۔ سردار دلپ سگہ دو برس تک اپنی بیوی کو مالتے رہے اور آخر بیوی نے تنگ آ کر ہندوستان آنے کے لیے جہاز کا ٹکٹ لے لیا اور تار دیا کہ آپ فلاں جہاز میں فلاں روز بمبئی پہنچ رہی ہیں۔

سردار دلپ سگہ کو جب یہ تار پہنچا تو آپ بے حد پریشان ہوئے۔ دہلی کے ایک معمولی سے ہوٹل میں مقیم تھے۔ آپ یہ تار لے کر میرے پاس دفتر "ریاست" میں پہنچے اور آپ نے بتایا کہ آپ اپنی بیوی کو گلیا سبز باغ دکھاتے رہے۔ دو برس تک ٹالنے کے بعد اب بیوی مزید عرصہ انتظار نہ کر سکتی تھی۔ وہ جرمنی سے ہندوستان آنے والے جہاز میں سوار ہو چکی ہیں اور فلاں روز بمبئی پہنچ رہی ہیں اور انھوں نے مجھ سے مشورہ لینا چاہا کہ ان کو اب اس پوزیشن میں کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے جب تمام حالات سنے تو میں نے محسوس کیا کہ ان بچاروں کی پوزیشن بے حد نازک ہے۔ اور ایک تو میرے دل میں ان کے لئے رحم پیدا ہوا اور دوسرے ان کے لارڈ دلپ سگہ ہونے کے واقعہ کو سن کر میں اپنی مہنی ضبط نہ کر سکا۔ جب یہ تمام حالات بیان کر چکے تو میں نے ان تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد ان کو مشورہ دیا کہ یہ اپنے اندر کینٹھوک عیسائیوں کی طرح اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی جرات پیدا کریں (عیسائیوں کے ایک فرقہ کیتھولک میں یہ بہت بڑی قابل تقلید لمبندی ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ سرزد ہو تو یہ انکی صبح گر جائیں جا کر پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل گناہ کی غلاطت سے پاک ہو جائے اور اس میں مہارت پیدا ہو) اور جب ان کی بیوی بمبئی پہنچے تو بغیر کوئی بات چھپائے اپنی بیوی سے تمام اصل حالات بیان کر دیں اور اپنے جھوٹ بولنے یا دھوکہ دینے کے متعلق بیوی سے معافی چاہیں۔ اور اگر انھوں نے اپنی بیوی سے کوئی بات بھی چھپائی تو یہ ان کے لیے آئندہ بہت بڑی مصائب و مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ سردار دلپ سگہ گل ہیٹ ہوشیار ہیں۔ آپ میری اس رائے پر متفق ہو گئے اور یہ فیصلہ ہوا کہ ان کی بیوی جب بمبئی پہنچیں تو یہ تمام حالات اپنی بیوی سے کہہ دیں اور

یہ بھی بتا دیں کہ جب اس خاتون کی شادی سردار دلیپ سنگھ سے ہوئی تو یہ کنوارے نہ تھے اور نہ صرف یہ شادی شدہ تھے بلکہ جب یہ امریکہ تعلیم کے لئے گئے تھان کا ایک بچہ بھی موجود تھا اور اب اُس بچہ کے کسی بچے یعنی سردار دلیپ سنگھ کے پوتے اور پوتیاں بھی موجود ہیں۔

میرے مشورہ پر غور کرنے کے بعد سردار دلیپ سنگھ چلے گئے اور میں نے ان سے کہا کہ جب یہ اپنی بیوی کے ساتھ بمبئی سے روانہ ہوں تو مجھے ایک تار کے ذریعہ اطلاع دیں تاکہ میں ان کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کر سکوں اور ایسا نہ ہو کہ یہ خاتون اپنے شوہر کو بالکل ہی قییم سمجھیں۔ سردار دلیپ سنگھ نے اس کے بعد فوراً کناٹا پلیس میں سردار صاحب سنگھ کی بلڈنگ میں دو کمرے کرایہ پر لینے۔ اس زمانہ میں نئی دہلی میں مکانات کا کرایہ بہت کم تھا۔ یہ کمرے آپ نے چالیس روپیہ ماہوار پر لینے۔ کرایہ پر ہی فرنیچر لیا اور اس مکان کو سجا کر آپ اپنی بیوی کو لینے بمبئی چلے گئے۔

یہ خاتون یعنی "کونٹیس دلیپ سنگھ" جب بمبئی پہنچیں تو سردار دلیپ سنگھ ان کو ایک ہوٹل میں لے گئے اور ہوٹل میں پہنچتے ہی انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ بیوی جب متوجہ ہوئیں تو آپ نے شروع سے لے کر آخر تک کے تمام حالات بغیر کچھ چھپائے بیان کر دیئے۔ انرازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس خاتون کے دل پر ان تمام حالات کے سننے کا کیا اثر ہوا ہوگا اور آنکھ کھل جاسے پر پچھلے خیالوں کے متعلق اس بچاری کی کیا کیفیت ہوگی مگر یہ خاتون بہت بہادر۔ بہت شریف۔ بہت نیک اور جسمانی لحاظ سے بہت صحت مند تھیں۔ تمام حالات سننے کے بعد یہ آئندہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئیں اور آپ نے اپنے دل سے اپنے شوہر کی تمام غلطیوں کو معاف کر دیا۔

اس سے اگلے روز میرے پاس تار پہنچا کہ سردار دلیپ سنگھ معہ اپنی بیوی کے شام کو فرنیچر میل میں نئی دہلی کے اسٹیشن پر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے فوراً اپنی کار کے علاوہ دو تین دوستوں کی کاروں کا انتظام کیا۔ پھولوں کے گلدستے اور ہار منگائے اور چند دوستوں کو لے کر میں گاڑی کے وقت ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ یہ جوڑا جب گاڑی سے اترا تو ہم نے ان کا ایسا ہی شاندار استقبال کیا جیسے نئی شادی ہونے والے دو لہا اور دُلہن کا کیا جاتا ہے۔ ان کے گلے میں ہار پہنائے گئے اور موٹروں میں "ہزات" کناٹا پلیس کے اُس مکان پر پہنچی جہاں سردار دلیپ سنگھ نے کرایہ پر لے لیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد سامان رکھوایا گیا اور میاں بیوی کو ہم اکیلے وہاں چھوڑ کر اس طرح ہی واپس چلے آئے جس طرح شادی کے بعد پہلی رات دُلہا کی رشتہ دار خواتین دُلہا اور دُلہن کو ایک کمرہ میں الگ بھیج دیتی ہیں۔

اگلے روز میں ان کے ہاں گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا اور ان کی بیوی سے باتیں کرتا رہا۔ یہ خاتون ہندوستانی یا انگریزی زبان سے قطعی ناواقف تھیں اور میں جرمن زبان نہ جانتا تھا۔ سردار دلیپ سنگھ انٹرپرائز پر میٹر یعنی مترجم کے فرامیض ادا کرتے رہے اور میں ان کو رات کے کھانے پر آنے کی دعوت دے کر واپس چلا آیا۔ یہ جوڑا رات کو کھانے پر میرے ہاں آیا۔ چند اور دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے پر قیصر ولیم (شہنشاہ جرمنی) کی بہادری اور جرمنی کے دوسرے حالات کا

ذکر ہوتا رہا۔ اور کھانے کے بعد جب یہ جوڑا اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تو میں نے مسنرولپ سنگھ کو چاندی کا ایک ٹی سیٹ دیا جو میں نے ان کے لیے اُس روز ہی خریدا تھا۔ یہ ٹی سیٹ نے کرہمت غوش ہوئیں کیونکہ عورت کو اگر کوئی شے نذر کی جائے تو اس کا اس پر ہمت اثر ہوتا ہے۔ اس سے اگلے روز ان کی دعوت پر میں ان کے ہاں چائے پر گیا۔ بہت دیر تک جرمنی اور ہندوستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس خاتون کے دل پر میرے متعلق بہت اثر تھا کیونکہ ایک تو سردار دلپ سنگھ نے ان سے اخبار "ریاست" کے متعلق تمام حالات بیان کر دیئے تھے اور دوسرے یہ بھی بتا دیا تھا کہ دیوان سنگھ کے کہنے پر ہی ان کے شوہر نے ان کے پاس اپنی پچھلی تمام غلطیوں کا اقرار کیا۔ چائے سے جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو اس خاتون نے مجھے پیرلین کا ایک چھوٹا سا بہت خوبصورت ہسٹنا یہ کہہ کر دیا۔

”آپ پیرلین کی طرح بہادر ہیں جو ہندوستان کے مطلق العنان راجوں اور نوابوں کے حملوں کا مستبد کر رہے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو پیرلین کا بت ہی پیش کرتی ہوں۔“

میں یہ خوبصورت بہت لے کر واپس اپنے مکان پر چلا آیا اور اس کے بعد یہ لوگ اکثر میرے ہاں آتے اور میں ان کے ہاں جاتا۔ چند ماہ کے بعد یہ خاتون جرمنی واپس چلی گئیں اور اپنے ساتھ اپنا ایک پوتا (سردار دلپ سنگھ کی پہلی ہندوستانی بیوی کے بیٹے کا بیٹا) بھی لے گئیں کیونکہ ان کے اپنے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس بچہ کی آنکھوں نے وہاں ہی پردہ ریش کی اور تسلیم دی۔ اب یہ لڑکا جان ہے۔ پہلے یہ جرمنی کی ایک فرم میں انجنیر تھا۔ اب یہ نئی دہلی کی ایک فرم میں غالباً ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے اور جرمنی کی ایک لڑکی سے ہی شادی کر کے والا ہے تاکہ انڈو جرمن اتحاد کا خاندانی سلسلہ قائم رہے۔

مسنرولپ سنگھ چند برس ہوئے پھر ہندوستان آئیں اور یہاں یہ پہلی روڈ کی ایک کوٹھی کے دو تین کمروں میں اپنے شوہر کے ساتھ رہا کرتیں۔ آپ نے وہاں بھی مجھے کئی بار یہ کہہ کر کھانے پر مدعو کیا کہ یہ کھانا خود پکائیں گی۔ یہ کھانا فی الحقیقت بہت اچھا بکاتی تھیں۔ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ سچین کی بیماری میں مبتلا ہو گئیں اور اس بیماری میں ہی آپ کا اردن ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ جس کا سردار دلپ سنگھ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ اور اب بھی سردار دلپ سنگھ جب کبھی آتے ہیں تو اس خاتون کی نیکی، شرافت اور شوہر پرستی کا ذکر ہو جاتا ہے۔

## نفرت اور عداوت میں فرق

میرے وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کے رہنے والے ایک صاحب رائے صاحب لالہ بشن داس چر پڑہ ہیں۔ بہت مستعد۔ بہت ہوشیار۔ بہت ملنسار۔ بہت دلچسپ۔ اور اگر کھڑے ہونے کے لئے جگہ مل جائے تو بیٹھنے کے لئے خود جگہ بنالینے والوں میں سے ہیں۔ آپ نے جب ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا تو گوجرانوالہ میں وکالت شروع کی اور جس طرح آجکل نئے وکیلوں کی پرکیش نہیں چلتی۔ آپ کو بھی اپنی وکالت میں کامیابی نہ ہوئی یعنی صبح دس بجے کچہری چلے جاتے اور شام کو خالی ہاتھ واپس آجاتے۔ آپ اس ناکامی سے تنگ آ گئے تو آپ مجھے ایک روز حافظ آباد د جب کہ میں نا بھکر کی ملازمت سے الگ ہوا اور دو ماہ کے قریب حافظ آباد رہا) پہلے اور تعارف ہوا۔ میں اس سے پہلے ان کو جانا نہ تھا تعارف سے معلوم ہوا کہ وہ میرے کئی عزیزوں کے دوست ہیں اور بعض کے ہم جماعت یا کالج نیا بھی ہیں۔ اس کے بعد یہ مجھے اکثر ملتے رہے اور دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ حافظ آباد کے اس قیام کے بعد میں نے دہلی سے "ریاست" جاری کیا تو یہ کبھی کبھی دہلی بھی تشریف لے آیا کرتے اور تعلقات میں کافی اضافہ ہو گیا۔ "ریاست" کو جب کامیابی نصیب ہوئی اور اس کے اثرات میں اضافہ ہوا تو آپ نے ایک روز خواہش ظاہر کی کہ آپ کو کسی ریاست میں ملازمت دلادی جائے کیونکہ آپ وکالت کی پرکیش کی ناکامی سے تنگ آ چکے ہیں۔ ان کی اس خواہش پر میں نے ریاست دتیا کے وزیر اعظم خان بہادر قاضی سرحدیہ آدین احمد سے ذکر کیا۔ قاضی صاحب بہت وضع دار اور محبت کے انسان تھے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ لالہ بشن داس کو کافی اگال تو ریاست دتیا میں بغیر ہمارا ج سے منظوری حاصل کیے خود ہی ساٹھ روپیہ ماہوار کا تحصیل دار مقرر کر دیتے ہیں اور تھوڑے عرصہ کے اندر ہی وہ ان کو کوئی اچھی جگہ دے دینگے۔ میں نے قاضی صاحب کے اس جواب کا لالہ بشن داس سے ذکر کیا لالہ بشن داس نے یہ عمدہ قبول کر لیا اور آپ ساٹھ روپیہ ماہوار پر ریاست دتیا میں تحصیل دار مقرر ہو گئے۔

قاضی صاحب بہت دور اندیش اور عطا شخصیت تھے۔ ادھر تو آپ نے لالہ بشن داس چر پڑہ کی تقرری کا حکم جاری کر دیا اور ادھر پولیس ایجنٹ کو لکھا کہ آپ گوجرانوالہ کے ایک صاحب لالہ بشن داس چر پڑہی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کو تحصیل دار مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا گورنمنٹ کو ان کی تقرری پر سیاسی اعتبار سے کوئی اعتراض تو نہیں (قاضی صاحب ہر نئے ملازم کے متعلق اس طرح ہی گورنمنٹ کو لکھ دیا کرتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص پولیس وال چلن کے اعتبار سے قابل اعتراض ہو اور گورنمنٹ اس کی تقرری کو ناپسند کرتی ہو) پولیس ایجنٹ نے قاضی صاحب کا یہ خط پنجاب گورنمنٹ کے چیف سیکریٹری کو بھیجا۔ چیف سیکریٹری نے تحقیقات کے لئے گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر کو ڈپٹی کمشنر نے یہ خط سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مقامی سی۔ آئی ڈی کو یہ خط بھیجا تو سی۔ آئی۔ ڈی نے لالہ بشن داس کے متعلق تحقیقات کرنے کے

بعد رپورٹ کی کہ ان کے سیاسی چال چلن کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے۔ یہ صاحب بے ضرر اور سیاسیات سے قطعی بے تعلق ہیں صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے ذاتی تعلقات دہلی کے ایک ایچی میٹر دیوان سنگھ ایڈیٹر ریاست کے ساتھ ہیں اس کے علاوہ ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں اور نہ ان کی ملازمت پر کوئی اعتراض ہے۔ تحقیقات کا یہ نتیجہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈپٹی کمشنر گجرالہ کو ڈپٹی کمشنر نے چیف سیکریٹری پنجاب گورنمنٹ کو اور دہلی سے پولیس ایجنٹ کی معرفت قاضی صاحب کے پاس بھی اتوا قاضی صاحب اس رپورٹ کو دیکھ کر مہنس دینے کیونکہ اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ لالہ بشن داس کے خلاف صرف ایک ہی اعتراض ہے کہ یہ دیوان سنگھ کا دوست ہے۔ اور ادھر صرف اس واحد کو ایفیکشن کے باعث قاضی صاحب نے لالہ بشن داس کو دتیا میں ملازمت دی۔ چنانچہ قاضی صاحب چند روز کے بعد دہلی آئے تو انھوں نے یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا۔

لالہ بشن داس کو ریاست دتیا میں ملازم ہوئے غالباً دہ برس ہوئے تھے کہ ایڈیٹر ریاست پر نواب بھوپال نے پرنس پرولیکشن ایکٹ کے ماتحت ہوشنگ آباد میں مقدمہ قائم کر دیا۔ اس مقدمہ میں مرحوم قاضی صاحب نہ صرف بہت دلچسپی لیتے رہے بلکہ وہ ایڈیٹر ریاست کی ہر ممکن ذریعہ سے امداد بھی کرتے رہے اور آپ نے لالہ بشن داس کو اجازت دے دی کہ وہ مقدمہ کے سلسلہ میں جب بھی چاہیں بغیر رخصت حاصل کیے دہلی یا کسی دوسری جگہ جاسکتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ضرورت ہوتی لالہ بشن داس دہلی آجاتے اور ایک بار آپ ہوشنگ آباد کے علاوہ ایڈیٹر ریاست کے ساتھ سکھر سندھ دجہاں کو ریاست خیر پور میرس کے انگریز وزیر اعظم نے مقدمہ دائر کر دیا تھا بھی گئے کیونکہ اس زمانہ میں ”ریاست“ عروج پر تھا اور سفر کے اخراجات کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ لالہ بشن داس کے مقدمات کے زمانہ میں دہلی آنے کے باعث تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور ان کی پوزیشن ایک فیملی ممبر کی سی ہو گئی یعنی آپ جب کبھی دتیا سے شمالی ہندوستان کی طرف کسی جگہ جاتے تو ایک دروازہ دہلی میں ایڈیٹر ریاست کے ہاں ضرور قیام کرتے۔ اور اگر کچھ عرصہ آنے کا اتفاق نہ ہوتا تو ملنے کے لئے خاص طور پر دہلی آجاتے۔

لالہ بشن داس چڑھ کو ریاست دتیا میں تحصیلدار ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے تو آپ دہلی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنا دیئے گئے اور ایک سال کے بعد آپ دتیا ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ یعنی آپ ڈیڑھ دہ برس کے اندر دتیا میں آئریبل چیف جسٹس ہائی کورٹ دتیا تھے۔ اور ان کی اس ترقی میں گواڈیٹر ریاست کا بھی ہاتھ تھا اور قاضی صاحب کی ہربانی سے یہ سب کچھ ہوا مگر اس میں زیادہ حصہ لالہ بشن داس کی اپنی ہوشیاری اور ملنساری کا تھا کیونکہ آپ کو اگر کسی جگہ کھڑے ہونے کے لئے جگہ مل جائے تو وہاں بیٹھنے کے لئے آپ خود جگہ بنایا کرتے ہیں۔



ریاست دیتا میں آپ کو ملازم ہوئے چند برس ہوئے تھے تو قاضی صاحب کی صحت نے جواب دینا شروع کیا کیونکہ آپ کی عمر بھی کافی تھی۔ قاضی صاحب طبعاً اور فطرتاً ہی حد و شعراً دوست پرست اور خویش پرور انسان تھے۔ آپ نے جب یہ خیال کیا کہ آپ کی صحت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے اور کمزوری میں بھی اضافہ ہو رہا ہے تو آپ نے اپنے تمام پروردوں کے لیے نیا اور مستقل انتظام شروع کیا تاکہ ان کو اپنی زندگی میں تکلیف اور روزگار کی تلاش میں پریشانی نہ ہو کیونکہ دتیا کے ہمارا جہ ہوتی نکلاس کے تھے جو دن رات شرب میں بہت بہتے اور کچھ اعتبار نہ تھا کہ یہ اپنے کس ملازم کو کب موقوف کر دیں۔ چنانچہ ان جذبات کے تحت ہی آپ نے لالہ بشن داس کی بیٹی اپنے گھر سے دوست ہمارا جہ بیکانیر سے سفارش کی اور ہمارا جہ نے لالہ بشن داس کو ریاست بیکانیر میں فنانشل کنٹرول کر دیا اور لالہ بشن داس نے دہاں اپنی کرشماتوں اور سفارشاتوں سے رائے صاحب کا خطاب بھی حاصل کیا یعنی دہاں آپ رائے صاحب لالہ بشن داس چوڑہ بیکانیر فنانشل کنٹرول تھے۔

لالہ بشن داس کا بیکانیر جانے کے بعد بھی ایڈیٹر ریاست کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات کا سلسلہ جاری رہا اور آپ جب کبھی بیکانیر سے گویا یا کسی دوسری جگہ جاتے تو ایک در روز دہلی میں ضرور قیام کرتے اور یہاں ان کے تعلقات ایڈیٹر ریاست کے دوستوں یعنی لالہ بشن داس جیٹنار اور ایڈیٹر ”وطن“ وغیرہ سے بھی ہو گئے کیونکہ یہ دوست اکثر دفتر ریاست میں تشریف لاتے جہاں کہ لالہ بشن داس کی ان سے ملاقات ہوتی۔ اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

ایڈیٹر ریاست ”پرچلی توٹوں کے اپنے قبضہ میں رکھنے کا مقدمہ چل رہا تھا۔ روپیہ بانی کی طرح ہمایا جا رہا تھا اور بے حد مالی پریشانیوں تھیں۔ اس زمانہ میں لالہ دیس راج پاہوہ دہلی میں سب فوج تھے اور ایڈیٹر ریاست ان سے قریب قریب ہر روز ملتا کیونکہ ایک تو لالہ دیس راج واسے ہمارا دینی کار متقرر داس آئی سپینٹلسٹ کے بھیغہ ہوتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ریاست کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ راج کی بھر گہرے نیاز مندانہ تعلقات رہے اور دوسرے لالہ دیس راج کی والدہ کو ایڈیٹر ”ریاست“ کی والدہ اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھیں۔ لالہ بشن داس کے بھی لالہ دیس راج کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ یہ دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی ان کے مراسم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ایک روز لالہ بشن داس چوڑہ بیکانیر سے کسی سرکاری کام کے لیے گویا لگے تو آپ نے ہمیشہ کی طرح دو روز کے لیے ایڈیٹر ریاست کے ہاں قیام کیا۔ اور اس قیام کے دوران جب آپ لالہ دیس راج پاہوہ سے بھی ملے تو لالہ دیس راج نے آپ سے رات کو کھانے پر آئے کے لیے کہا اور ایڈیٹر ریاست ”کو بھی ٹیلی فون کیا کہ وہ رات کو ان کے ہاں کھانے پر آئے کیونکہ لالہ بشن داس کی دعوت ہے ایڈیٹر ریاست“ نے ہاں تو کہہ دیا مگر مصروفیت کے باعث وہ جانہ سکا لالہ بشن داس نے اس روز مقدمہ کے متعلق بہت جلد ردی کا اظہار کیا اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں تو ایڈیٹر ریاست نے اپنی مالی پریشانیوں اور مقدمہ کے مصارف کا ذکر کرتے ہوئے

لالہ بشن داس سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو آپ ایڈیٹر "ریاست" کو پانچ سو روپیہ بطور قرض دیں۔ جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ آپ کے پاس روپیہ تو کافی تھا مگر آپ نے ابھی حال میں ایک جایدا خرید لی ہے اس لیے آپ یہ قرض نہیں دے سکتے۔ آپ کے اس انکار کو ایڈیٹر "ریاست" نے قطعی محسوس نہ کیا کیونکہ ہر شخص کے اپنے حالات ہیں اگر لالہ بشن داس روپیہ نہیں دے سکتے تو مجبور ہیں۔ ان کے اس انکار سے اپنے دل میں میل کیوں آنے لگی تھی۔ دن کو یہ باتیں ہوتی رہیں اور رات کو لالہ بشن داس کھانے پر لالہ دیس راج کے ہاں چلے گئے مگر میں نہ جاسکا کیونکہ ایک تو مصروف تھا اور دوسرے ایک دوست ملنے کے لیے آنے والے تھے۔ لالہ بشن داس لالہ دیس راج کے ہاں کھانا کھانے کے بعد واپس آ گئے اور ہم رات کو دیر تک باتیں کرنے کے بعد سو گئے اور اگلی صبح لالہ بشن داس گواہی دے چلے گئے۔

دو یا تین روز کے بعد ایڈیٹر "ریاست" لالہ دیس راج سے ملا اور باتوں باتوں میں لالہ بشن داس کا ذکر چل پڑا تو لالہ دیس راج نے بتایا کہ لالہ بشن داس نے اپنی سلازمت میں بہت کافی روپیہ پیدا کیا ہے۔ میں نے کچھ زیادہ کر دیا تو آپ نے بتایا کہ کھانے پر لالہ بشن داس نے لالہ دیس راج کی مالی حالت دریافت کی تھی تو لالہ دیس راج نے جواب دیا تھا کہ آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ کچھ روپیہ انٹرنس میں چلا جاتا ہے۔ کچھ بچوں کی تعلیم وغیرہ میں اور اس آٹھ سو روپیہ میں سے ایک سو بیس نہیں بچتا اور آپ نے لاہور میں اپنی کوٹھی بنانے کے لیے اپنے خسر سردار بہادر پر بھ سنگھ ممبر پبلک سروس کمیشن سے جو میں ہزار روپیہ قرض یا تھا اس میں سے بھی آپ ایک سو بیس اب تک واپس ادا نہیں کر سکے۔ اور لالہ دیس راج نے جب باتوں باتوں میں اپنی یہ مشکلات بیان کیں تو لالہ بشن داس نے لالہ دیس راج سے کہا کہ ان کے پاس پچیس تیس ہزار روپیہ نقد موجود ہے اگر لالہ دیس راج چاہیں تو وہ روپیہ لے سکتے ہیں اور لالہ بشن داس کی اس پیشکش کے جواب میں لالہ دیس راج نے کہا کہ ان کو ضرورت نہیں کیونکہ سردار بہادر پر بھ سنگھ کوئی غیر نہیں ہیں جب کبھی ممکن ہو گا آپ ان کا روپیہ واپس کر دیتے۔

میں نے لالہ دیس راج کے منہ سے جب یہ سنا کہ لالہ بشن داس چوڑھ لالہ دیس راج کو بیس پچیس ہزار روپیہ دینے کی پیشکش کی ہے تو میں حیران رہ گیا کہ دن کے وقت تو میں نے لالہ بشن داس سے پانچ سو روپیہ قرض مانگا اور آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اپنا تمام روپیہ جایدا خریدنے میں صرف کر چکے ہیں۔ اور رات کو یہ لالہ دیس راج کو پچیس تیس ہزار روپیہ بغیر لالہ دیس راج کی خواہش کے ان کو دینے کے لیے تیار تھے۔ میں یہ سن کر واپس آ گیا اور میں نے لالہ دیس راج سے کچھ نہ کہا۔ رات کو سوچتا رہا کہ اگر وہ ان سنگھ اور بشن داس کے حقیقی بھائیوں جیسے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں مگر چونکہ وہ ان سنگھ مقدمہ اور مالی مشکلات میں مبتلا ہے اس لیے لالہ بشن داس کی نگاہوں میں اس کی قیمت آج پانچ سو روپیہ قرضہ بھی نہیں اور چونکہ لالہ دیس راج اقتدار میں ہیں اس لیے لالہ بشن داس ان کے قدموں میں بیس پچیس ہزار روپیہ پھینکنے کے لیے تیار ہیں۔ میں رات کو بہت دیر تک دنیا کی اس

حالت پر غور کرتا رہا کیونکہ لالہ بشن داس جب بھی تشریف لاتے ان کے لیے آنکھیں بچھا دی جاتیں۔ ان کے ساتھ تعلقات ایک فیملی ممبر کے تھے۔ اور یہ بھی جب کسی سے ملنے تو یہی کہنا کرتے کہ ان کے اس تمام عرصہ کا باعث دیوان سنگھ ہے جس نے ان کی قاضی سر عزیز الدین احمد سے سفارش کی۔ اس سفارش کے باعث ہی ان کو ریاستوں میں ملازمت ملی۔ اور بعد میں بھی وہ ہمیشہ اسدا کرتا رہا۔

اس واقعے کے چند روز بعد لالہ بشن داس بیکانیر سے کہیں جاتے ہوئے پھر دہلی تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں ہملٹن روڈ والے دفتر کے اپنے کمرہ میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ لالہ بشن داس جب آئے تو آپ نے ہمیشہ کی طرح آتے ہی بے تکلفی کے ساتھ چپڑاسی سے تو کہا کہ سلامان اور کے کمرہ میں رکھ دو اور آپ میرے پاس آ بیٹھ۔ میں نے ان کو دیکھا تو ان سے کوئی بات نہ کی اور سر دھری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کمرہ میں مصروف ہو گیا۔ لالہ بشن داس نے شاید میری اس بے اعتنائی کو محسوس کیا ہو مگر انھوں نے اس وقت غالباً یہی سمجھا کہ میں بے حد مصروف ہوں اور میرے پاس تباک کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے وقت نہیں۔ یہ بیٹھے رہے اور میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ یہ کئی گھنٹے بیٹھے رہے مگر میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اس زمانہ میں دفتر "ریاست" تو ہملٹن روڈ پر تھا اور رہائش کے لیے میں نے قردل باغ میں ایک کڑھی نام مکان لے رکھا تھا۔ جب شام کو پانچ بجے تو میں نے گیرج میں سے کار کو نکالا۔ چپڑاسی کے پاس خراج کے لیے روپیے موجود رہتے تھے میں نے چپڑاسی سے کہا کہ لالہ بشن داس جی کے لیے کھانے وغیرہ کا انتظام کر دینا۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر میں کار میں اکیلا ہی سوار ہو کر قردل باغ چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ لالہ بشن داس نے اس وقت یقیناً محسوس کیا ہو گا کہ کاشابل چکا ہے کیونکہ اس سے پہلے میں ان کو ہمیشہ ہی کار میں قردل باغ والے رہائش مکان میں اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

لالہ بشن داس اگلے روز بھی دفتر کے ایک کمرہ میں جہاں کہ ان کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ میرے اگلے روز صبح دس بجے دفتر پہنچا تو یہ موجود تھے میں نے اس روز بھی ان سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ان کو جرات ہوئی کہ یہ اس بے اعتنائی کا سبب مجھ سے پوچھتے۔ یہ اس روز جہاں جانا تھا چلے گئے اور میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ چار پانچ روز کے بعد یہ پھر واپس بیکانیر جاتے ہوئے تشریف لائے۔ اور دفتر میں مقیم ہوئے۔ میرا رویہ وہی تھا جو چار روز پہلے تھا یعنی میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں ان کو قردل باغ اپنے ساتھ لے گیا اور چپڑاسی سے کہہ دیا کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا جائے۔

ایک یا دو ٹھہراہ ماہ کے بعد یہ پھر بیکانیر سے گویا رہ جاتے ہوئے دہلی تشریف لائے کیونکہ یہ گویا رہا سرکاری کام کے لیے اکثر جایا کرتے تھے۔ اس بار یہ میرے ہاں مقیم نہیں ہوئے۔ ہمارا جہ ہٹل میں ٹھہرے مگر ملنے کے لیے تشریف لائے میرا ان کے ساتھ وہی بے اعتنائی کا رویہ تھا جو ان کے پچھلی بار آنے پر تھا۔ یہ چند منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔ مجھ سے ملنے کے بعد یہ لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس پریکٹیشنرز کے ہاں پہنچے۔

لالہ امیر چند میرے اور ان کے دوست اور دونوں کے ہم وطن تھے۔ انھوں نے لالہ امیر چند سے

میرے رویہ کی شکایت کی اور کہا کہ وہ دیوان سنگھ سے پوچھیں کہ اس بے اعتنائی کا سبب کیا ہے  
 کیونکہ لالہ بشن داس کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ مجھ سے لالہ دیں راج پاہوہ ان کے بیس بچیں ہزار روپیہ  
 کی پیشکش ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس بے اعتنائی کی اصل وجہ یہ ہے کہ لالہ بشن داس ہزار روپیہ  
 نقد رکھتے ہوئے میری پانچ سو روپیہ قیمت بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے  
 زور سے پر نالہ امیر چند میرے پاس آئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ اسے گہرے تعلقات ہوتے  
 ہوئے اس بے اعتنائی کا سبب کیا ہے۔ میں نے لالہ امیر چند کو ٹال دیا اور کہا کہ کوئی خاص وجہ نہیں  
 اس کے چند روز بعد لالہ بشن داس پھر مدلی تشریف لائے اور ہمارا جہول میں ٹھہرے تو آپ نے  
 لالہ شیو نرائن جھنگار ایڈیٹر "وطن" کو میرے پاس بھیجا کہ وہ ہی بے اعتنائی کی اصل وجہ دریافت  
 کریں۔ میں نے لالہ شیو نرائن کو بھی ٹال دیا اور کچھ نہیں بتایا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ چند روز بعد لالہ  
 شیو نرائن پھر تشریف لائے اور جب انھوں نے بہت ہی زور دیا تو میں نے ان کو تمام حالات بتائیے  
 اور لالہ شیو نرائن نے لالہ بشن داس کو بتایا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ آپ نے دیوان سنگھ جیسے سالہا سال  
 کے بہت ہی گہرے دوست کی اس مصیبت کے زمانہ میں پانچ سو روپیہ قیمت نہ سمجھی اور لالہ دیں راج  
 کو آپ بغیر ان کے طلب کیے بیس بچیں ہزار روپیہ دینے پر آمادہ تھے کیونکہ آپ کا ذہن لالہ دیں راج  
 کے اقتدار سے متاثر تھا۔ چنانچہ اس روز لالہ بشن داس کو معلوم ہوا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ اور مجھے  
 بتایا گیا کہ لالہ بشن داس کو جب اصل حالات کا علم ہوا تو وہ اپنے فعل پر بہت ہی نادم اور شرمندہ  
 تھے اور معافی چاہتے تھے مگر تیرکان سے نکل چکا تھا۔ ایڈیٹر زیاست "کے دلی میں جب کسی کے  
 متعلق ایک بار نفرت پیدا ہو جائے تو نفرت کے یہ جذبات زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں۔ ان میں کبھی بھی  
 کمی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میرے ماموں زاد بھائی سردار ہر نام سنگھ کپور دجولاہور کے خزانہ  
 نگار انچارج تھے کسی اپنے سرکاری کام کے لیے بیکانیر گئے۔ لالہ بشن داس بیکانیر میں فنانشل کنٹرولر  
 تھے۔ اور میں اس مقدمہ کے سلسلہ میں ہی لاہور سنٹرل جیل میں تھا۔ بیکانیر میں سردار ہر نام سنگھ  
 لالہ بشن داس سے ملے تو ان دونوں کے درمیان میرے متعلق بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں  
 ہر دو ہی شخصوں لالہ بشن داس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے سردار ہر نام سنگھ سے کہا کہ  
 انھوں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی غلطی کی اور جب آپ لاہور جائیے تو دیوان سنگھ سے جیل  
 میں لے جائیے اور اس سے کہیے کہ بشن داس اپنے فعل پر انتہائی نادم اور شرمندہ ہے۔ وہ معافی چاہتا  
 ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس مقدمہ میں جتنا بھی روپیہ صرف ہمدہ کرے۔ چاہے یہ رقم آٹھ دس ہزار  
 روپیہ ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے لئے اس کو معاف کر دیا جائے۔

سردار ہر نام سنگھ بیکانیر سے لاہور پہنچے اور انھوں نے تمام حالات مجھے لکھے۔ اور بتایا کہ  
 لالہ بشن داس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ وہ اس مقدمہ کے تمام مصالحت  
 برداشت کریں اور ان کو معاف کر دیا جائے۔ میں لاہور جیل میں اس زمانہ وکاتیں اکثر پڑھا کرتا تھا

ایک تو دیران حافظ شیرازی معہ ترجمہ اور دوسری کلیات اکبر الہ آبادی۔ یہ دونوں کتابیں میری چارپائی پر بھی پڑی رہتی تھیں اور ان کے اکثر اشعار مجھے یاد ہو گئے تھے۔ میں نے سردار ہرنام سنگھ کے خط کے جواب میں حافظ شیرازی کا صرف ایک شعر لکھ بھیجا اور اس کے ساتھ ہدایت کی کہ یہ شعر میری طرف سے بطور جواب لالہ بشن داس کو بھیج دیا جائے۔ مجھے اس وقت یہ شعر تو یاد نہیں مگر اس کا ترجمہ یہ تھا۔

”اگر کہینہ شخص سو من سزا دے اور یہ کہے کہ اس سو من سونے کے معاوضہ میں صرف جو کے ایک دانہ کا احسان قبول کرو تو سو من سونے کو قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیے۔“

”اگر کہینہ شخص کے ایک بیکہ اور سان بھی نہ اٹھانا پڑے۔“  
مجھے معلوم نہیں کہ سردار ہرنام سنگھ نے حافظ شیرازی کا یہ شعر میرے جواب کی صورت میں لالہ بشن داس کو بھیجا یا نہیں اور اگر بھیجا تو اس روز ہی یا اس کے بعد۔ میرے پاس اس کے بعد لالہ بشن داس کا نہ کوئی خط آیا۔ نہ پیغام اور نہ میں توقع کرتا تھا۔

میں اس مقدمہ میں بری ہو کر دہلی پہنچ گیا اور دو ماہ کے بعد پھر گرفتار ہو کر انبالہ اور فیروز پور وغیرہ جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور ایک سال اور تین ماہ بعد نظر بندی سے رہائی ملی تو اس وقت اخبار بند ہو چکا تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد محلہ گڑھیہ میں مکان کرایہ پر لیا اور اخبار جاری کر دیا۔ اخبار کو جاری ہونے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ ایک روز دس بجے کے قریب میں اپنی میز پر بیٹھے کام کر رہا تھا کہ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ لالہ بشن داس جو پڑھ تشریف لارہے ہیں۔ جب یہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اپنا کام کرتا رہا۔ یہ میری میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ کے بعد آپ نے فرمایا۔  
”کیا کوئی صورت ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔“

میں نے اس کے جواب میں کہا۔

”لالہ بشن داس میرے دل میں آپ کے لیے نفرت ہے آپ سے عداوت نہیں اور اگر عداوت ہوتی تو آپ بیکانیر میں ملازم نہ رہ سکتے تھے میں انتظام کر سکتا تھا۔ کہ آپ وہاں جیل میں ہوتے۔ میرے دل میں آپ کے لئے صرف نفرت ہے۔ آپ نے اچھا نہیں کیا جہاں چلے آئے۔ مجھے اندوس ہے کہ آپ اس وقت میری چھت کے نیچے ہیں در نہ میں آپ کو بہت ہی بری طرح سے بے عزت اور ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیتا۔ آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے اور پھر بھی میرے مکان پر نہ آئیے۔ اس میں ہی آپ کا فائدہ ہے۔“

میرے یہ الفاظ سن کر لالہ بشن داس میرے مکان سے چلے گئے۔

اس واقعہ کے غالباً دو برس بعد ایک روز لالہ شبونزائین بھٹناگر ایڈیٹر ”وطن“ دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے اس زمانہ میں دفتر ”ریاست“ محلہ چرنے والاں میں تھا۔ آپ جب تشریف لائے

تو آپ نے فرمایا۔

”آپ کے اور میرے سا لہا سال سے اخلاص کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اور میں نے آپ سے آج تک کبھی کوئی فرمایش یا خواہش نہیں کی۔ میں آج ایک خواہش لے کر آیا ہوں بشرطیکہ آپ میری اس خواہش اور درخواست کو منظور کر لیں۔“

میں نے کہا فرمائیے۔ تو لالہ شیونرائین نے پھر کہا۔

”میں پہلے آپ سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ میری درخواست کو منظور کر لیں گے۔“

میں نے پھر کہا کہ فرمائیے۔ آپ بار بار ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ کا نیاز مند ہوں۔۔۔

اس پر لالہ شیونرائین نے کہا کہ

”بشن داس چوڑہ گلی سے باہر کھڑے ہیں آپ ہریانی فرما کر ان کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دے دیجئے۔ اور چونکہ آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ میں جو کچھ کہوں گا آپ اُس کو منظور کریں گے۔ اس لیے انکار نہ کیجئے۔“

لالہ شیونرائین کے یہ الفاظ سن کر میں نے کہا کہ ”اچھا بشن داس کو بلاؤ۔ مگر اس سے کوئی بات نہ کروں گا۔“ لالہ شیونرائین گلی سے باہر گئے۔ لالہ بشن داس کو ساتھ لائے۔ یہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

چند منٹ بیٹھے مگر میں نے نہ تو ان کی طرف دیکھا اور نہ ان سے کوئی بات کی اور چند منٹ کے بعد یہ لالہ شیونرائین کے ساتھ ہی چلے گئے۔

اس واقعہ کے عرصہ بعد ایک روز راتے بہادر ڈاکٹر متھرا داس تشریف لائے میرے اور

ان کے عزیزوں اور بزرگوں کے سے تعلقات ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ اپنے صاحبزادہ مسٹر پیارے لالہ جیٹ انجینئر کے پاس بیگانہ گئے تھے۔ وہاں ان سے لالہ بشن داس ملنے آئے اور

بشن داس نے درخواست کی ہے کہ آپ (یعنی ڈاکٹر صاحب) دیوان سنگھ سے بشن داس کی

سفارش کریں۔ دیوان سنگھ ان پر ناراض ہے وہ لالہ بشن داس کو معاف کرے ڈاکٹر صاحب

کے اصل واقعات کا کوئی علم نہ تھا۔ کیونکہ میں نے ان سے کبھی کوئی ذکر نہ کیا۔ آپ نے پوچھا کہ

ناراضی کی وجہ کیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ٹالنا چاہا اور کہا کہ کوئی وجہ نہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب

نے جھنڈ ہو کر پوچھا کہ ناراضی کا اصل سبب کیا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے زیادہ ہی مجبور

کیا تو میں نے تمام حالات سن دینے دیئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ حالات سن کر بے حد

افسوس ہوا اور آپ نے جو الفاظ کہے وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور میں شاید ان الفاظ کو زندگی

میں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔ آپ نے فرمایا۔

”دیوان سنگھ۔ میری زندگی میں میرے دوستوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا۔

اُس کے متعلق ایک صحیح کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر اس کی شکایت کیا جب کہ تمام

دینا ہی ایسی ہے۔ میں اب تو کسی کے متعلق بھی اپنے دل میں کدورت کے جذبات نہیں

دکھتا۔ تم بھی بشن داس کو معاف کر دو۔“

میں نے ڈاکٹر صاحب کو کڑی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے نصیحت کر کے چلے گئے مگر مجھ پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ جب کسی شخص کے متعلق میرے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے تو یہ زندگی بھر دل سے نہیں نکلے۔ چاہے میں کتنی بھی کوشش کروں۔ ہاں اگر صرف عداوت یا دشمنی کے جذبات ہوں اور ان کے ساتھ نفرت و حقارت کے جذبات کی ملاوٹ نہ ہو تو میرا دل دشمنی یا عداوت کے جذبات سے صاف ہو جاتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں راجہ سردیا کشن کول جیسے کئی اصحاب کے لیے اپنے دل میں مخالفت۔ عداوت اور انتقام کے جذبات رکھتا رہا۔ مگر چونکہ یہ لوگ بلند تھے اور ان کے لیے میرے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات نہ تھے صرف عداوت اور دشمنی تھی وقت آیا کہ میرے دل میں ان کے لیے عزت اور محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ یعنی نفرت و عداوت دونوں کی علیحدہ حیثیتیں ہیں۔ ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ عداوت تو وقت آنے پر محبت کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نفرت و حقارت کے جذبات کو شمش کرنے پر بھی دل سے نہیں نکلے اور یہ ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

## غسل اور صحت

لاہور میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدر لینڈ (جو ہمارا جہ رنجیت سنگھ کے بیٹے ہمارا جہ دلپ سنگھ کے داماد اور شہزادی ببادلیپ سنگھ کے شوہر تھے) نے ایک بار میڈیکل کالج کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے خوب کہا تھا۔

”ہندوستان عجیب ملک ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے منہ کی صفائی کا تو خیال نہیں کرتے جہاں کہ جسم کی پرورش کے لیے غذا داخل کی جاتی ہے اور یہ اپنی مقعد کے متعلق بہت غماظ ہیں جہاں سے یہ غذا فضلہ بن کر نکلتی ہے۔“

کرنل سدر لینڈ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی منہ کی صفائی نہیں کرتے جہاں کہ غذا جسم کے لیے داخل کی جاتی ہے اور گندہ منہ ہونے کے باعث جب غذا اچھی طرح ہضم نہ ہو اور اس کا نتیجہ قبض کی صورت میں پیدا ہو تو پھر یہ جلاب لے کر اس کو نکالتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو کرنل سدر لینڈ کا یہ بیان بے معنی نہیں۔ ہندوستانیوں کی اپنی صحت کے متعلق فی الحقیقت پریشانی ہی ہے۔

میں صحت کے متعلق اپنے چند تجربات لکھتا ہوں تاکہ یہ پبلک کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

آئنگھ۔ یہ شاید تعجب اور حیرانی کے ساتھ سنا جائے گا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میری آنکھوں میں کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ کبھی میری کوئی آنکھ دکھی جس کی وجہ یہ ہے کہ میں جب غسل کرتا ہوں اور غسل کرتے ہوئے صابن سے منہ دھوتا ہوں تو میں آنکھیں کھول دیتا ہوں

تاکہ صابن کی جھاگ میری آنکھوں کی غلاظت کو صاف کر دے کیونکہ آنکھ تب ہی دکھتی ہے اگر وہ غلیظ ہو اور اگر صاف ہو تو اس کے دکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر شبہ کو کسی جرمی سائیل سوپ (جراثیم کش صابن) سے دھویا جائے اور اس صابن کی جھاگ آنکھوں میں جائے تو یہ آنکھوں کے ہر قسم کے جراثیم کو ہلاک کرنے کا باعث بھی ہوتی ہے ورنہ غلاظت کو صاف کرنے کے لیے تو ہر صابن کام لے سکتا ہے۔ جھاگ کے آنکھوں میں جانے کے بعد آنکھوں کو صاف پانی سے اچھی طرح دھو دینا چاہیے تاکہ جھاگ آنکھوں میں باقی نہ رہے۔

**بال۔** بالوں کے متعلق اصول یہ ہے کہ اگر تباہوں کی جڑیں صاف یعنی میل سے پاک اور تر ہوں گی تو بال مضبوط اور صحت مند پیدا ہوں گے اور اگر بالوں کی جڑوں میں میل ہوگی یا یہ خشک ہوں گی تو بال کمزور پیدا ہوں گے کیونکہ میل میں ایک قسم کی ایسی ڈٹی (تیزابی مادہ) ہوتا ہے جو بالوں کی جڑوں کے لیے بے حد نقصان دہاں ہے اور یہی کیفیت جڑوں کے خشک ہونے کے متعلق ہے بالوں کی جڑوں کا خشک ہونا بالوں کی صحت کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ اس لیے بالوں کو اگر ہر روز اچھے صابن سے دھویا جائے اور ان کی جڑوں کو انگلیوں کے ساتھ اچھے تیل سے تر کر دیا جائے تو یہ بالوں کے لیے بے حد مفید ہے ورنہ ہفتہ میں دو تین بار تو بالوں کو ضرور دھونا اور ان کی جڑوں کو تیل میں تر کر دینا چاہیے۔ جہاں تک صابن کا سوال ہے وہ صابن بالوں کے لیے بے حد نقصان کا باعث ہیں جن میں کاربائلک ایسڈ ڈالا جاتا ہے اور جو کاربائلک سوپ کہلاتے ہیں کیونکہ یہ ایسڈ بالوں کی جڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے میری سائے میں بالوں اور غسل کے لیے یہ صابن مفید ہیں۔ پارک ڈیس کمپنی کا نیکو سوپ (یہ صابن جراثیم کش ہے کیونکہ اس میں مرکری یعنی پارہ کا جزو ہوتا ہے) کا ڈریج کمپنی کا سفید دل سوپ (یہ بھی جراثیم کش ہے) اور دوسرے بڑی کمپنیوں کے قیمتی صابن۔ ارزاں کو ایٹھ کے صابن کبھی استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ یہ بالوں کے لیے بے حد نقصان کا باعث ہیں۔ جہاں تک بالوں کے تیل کا سوال ہے یہ تیل چھتہ مفید ہیں۔ سمیٹھ شینی سٹریٹ کمپنی کا کنٹرولڈین میر آئل۔ بنگال کمپنی کی کمپنی کا کنٹرولڈین میر آئل۔ رشک میر کمپنی کا میر آئل اور کارلوگیٹ کمپنی کا میر آئل بھی اسے استعمال کرنا بالوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور ہمیشہ قابل اعتماد اور بڑی کمپنیوں کے میر آئل ہی استعمال کیے جانے چاہئیں۔ بالوں کے متعلق ایک بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر ان کو سردیوں کے زمانہ میں گرم پانی سے دھویا جائے تو گرم پانی سے دھونے کے بعد ٹھنڈے پانی کے دو چار لٹے بالوں میں ضرور ڈال دینے چاہئیں تاکہ مسام (جو گرم پانی کے باعث کھل جاتے ہیں) ٹھنڈے پانی کے باعث بالوں کو اچھی طرح سے پھر پکڑ لیں اور یہ سٹکڑ پائیں۔ بالوں کو دھونے اور تیل لگانے کے بعد ان کو خشک کرنے کے لیے کھلے چھوڑ دینا مفید نہیں بلکہ یہ ایک حد تک غیر مفید بھی ہے کیونکہ اگر سکیلیپ (سر کی کھال) پر تیل اچھی طرح سے لگا لیا جائے تو پانی کے مساموں کے اندر جانے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ تیل پانی کو اندر جذب ہونے نہیں دیتا اور سر میں درد نہیں ہو سکتا اور خوشبودار تیل کی صورت میں اگر غور نہیں غسل کے بعد بالوں کو کنگھی کر کے فوراً باندھ لیں تو نہ تو بد بو پڑے گا نہ اس کا سوال ہے اور بالوں کا عرصہ تک



تیرا مطلب رہنا بالوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ اور بالوں میں بدبو اس زمانہ میں پیدا ہوا کرتی تھی جب عورتیں ان کو دہی سے دھو کر گھی یا سرسوں وغیرہ کا تیل استعمال کرتی تھیں۔ بالوں کو دھوئے وقت پانی میں تھوڑا سا امونیا ملانا تو بہت ہی مفید ہے یہ میل کر بہت صاف کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں میں ایک طرح سے کھاد کا کام دیتا ہے چنانچہ میں نے تمام زندگی ہی اپنے بالوں کو امونیا والے پانی اور صابن سے دھویا مگر امونیا ایک زہر ہے۔ بچوں والے گھروں میں اس کا احتیاط سے نہ رکھنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اگر یہ غلطی سے منہ میں ڈال لیا جائے تو انسان ہلاک ہو سکتا ہے اس لئے اگر اسے استعمال کیا جائے تو بہت احتیاط کی جانی چاہیے۔ میں نے خود بھی ایک بار غسل خانہ میں غرارہ والی دوائی کی جگہ امونیا منہ میں ڈال لیا اور میں بہت مشکل کے ساتھ بچاؤ نہ اگر اس کے چند قطرے بھی حلق میں چلے جاتے تو میں فوراً ہلاک ہو جاتا۔

مستند۔ انسان کو اپنا منہ لازمی طور سے صاف رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر منہ صاف نہ ہو گا تو غذا منہ کی غلاطت کو ساتھ لے کر پیٹ میں جائے گی۔ منہ کی صفائی کے متعلق پہلے ایک بہت بڑی غلطی میں مبتلا ہے اور وہ یہ کہ مسوڑوں کے متعلق پروا نہیں کی جاتی اور تمام کوشش دانتوں کی صفائی اور ان کو چمکانے پر صرف کی جاتی ہے حالانکہ دانتوں کی صفائی کے مقابلہ پر مسوڑوں کا مضبوط ہونا زیادہ ضروری ہے کیونکہ اگر مسوڑے کمزور ہوں گے۔ یہ سخت نہ ہوں گے اور ان میں پلپاٹ ہوگی تو یہ نہ صرف دانتوں کو اچھی طرح سے پکڑ نہ سکیں گے بلکہ ان میں پالو یا دینی پیپ کا پیدا ہونا بھی ہو جائے گا۔ اس لئے منہ کے متعلق سب سے پہلا سوال مسوڑوں کے مضبوط رکھنے کا ہے اور میں اپنے تجربہ کی بنیادوں پر منہ کو صاف کرنے کے متعلق رائے دیتا ہوں کہ

(۱) سب سے پہلے پانی سے غرارے کیے جائیں اور انگلی سے مسوڑوں کی مالش کی جائے تاکہ مسوڑوں کی غلاطت منہ سے باہر نکل جائے۔

(۲) اس کے بعد فارہن (یہ منجن مسوڑوں کے لئے ہے مگر لوگ غلطی سے اس کو دانتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں حالانکہ اس کی ٹیوب پر صاف طور سے فارہن فارگز یعنی مسوڑوں کے لئے لکھا ہوتا ہے) کو انگلی پر لگا کر اسے ایک منٹ مسوڑوں پر زور سے سلا جائے تاکہ مسوڑوں میں دوران خون پیدا ہو جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ چند روز میں مسوڑے مضبوط ہو جائیں گے۔ مسوڑوں پر فارہن کی مالش کرنے کے بعد غرارے کر دیئے جائیں اور پھر برش پر کوئی اچھی یعنی کاربائیڈ یا کوئی دوسری ٹوٹھ پیسٹ لگا کر دانتوں کو صاف کر لیا جائے اور دانتوں کو صاف کرنے کے بعد منہ میں تھوڑی سی لسٹرین ڈال کر غرارہ کر دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ منہ جراثیم سے قطعی پاک ہو جائے گا۔

دانتوں اور مسوڑوں کو الگ الگ حیثیت نہ دینا بہت بڑی غلطی ہے اور اگر مصنوعی دانت ہوں تو مسوڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے فارہن کا استعمال پھر بھی کرنا چاہیے تاکہ مسوڑے مضبوط ہوں اور ان میں پلپاٹ پیدا نہ ہو۔ اگر فارہن میسرنہ آسکے تو پچھلے کی پانی سے غرارے

کرنا بھی مسوڑوں میں مضبوطی اور سختی پیدا کرتا ہے۔

**عُثْل**۔ مسلمانوں کا امیر حلقہ تو ہر روز غسل کرتا ہے مگر ان کا غریب حلقہ کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتا اور یہ صرف جمعہ کے جمعہ غسل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتا ہے جو ان کی صحت کے لئے بے حد نقصان کا باعث ہے اور ہندوؤں میں بھی جو لوگ پانی کے صرف چند لوٹے جسم پر ڈالنا ہی غسل سمجھتے ہیں یہ بھی بہت بڑی حماقت میں مبتلا ہیں غسل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند لوٹے گرم یا سرد پانی کے رسم کے مطابق ڈالے جائیں اور پھر جسم پر اچھی طرح سے صابن لگایا جائے تاکہ یہ صابن میل کو صاف کر دے اور صابن لگانے کے بعد پھر جسم کو پانی سے صاف کیا جائے۔

**جوڑیں**۔ یہ افسوس ناک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اکثر بچوں کے سر میں جوڑیں پڑ جاتی ہیں اور لوگ اپنی جہالت کے باعث ان کو چن چن کر ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک جوں سفر کرتے ہوئے آسانی کے ساتھ ایک شخص کے سر سے نکل کر دوسرے کے سر میں پہنچ جاتی ہے جس کے باعث گھر کے تمام بچوں کے سر جوڑوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ جوڑوں کو ختم کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ امپریل کیمیکل انڈسٹری کے ”لورکسین“ کا ایک بڑا چھلے کر اس کو بالوں اور بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح سے انگلیوں کے ساتھ مل دیا جائے اور اس کو خشک ہونے دیا جائے اور چند گھنٹہ کے بعد بالوں کو صابن سے دھو دیا جائے۔ صرف ایک بڑا چھلے سر کی تمام جوڑوں کو ہلاک کر دے گا۔ بالوں کو دن میں دوبار کنگھی کرنا جوڑوں کو پھر سر میں اپنا اڈہ قائم نہ کرنے اور بالوں کو صاف اور صحت مند رکھنے کے اعتبار سے مفید ہے۔

**کپڑے**۔ میری زندگی کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ میں نے غسل کے بعد پہلے دن والے کپڑے پھر بغیر دھوئے استعمال کیے ہوں۔ اور میں غسل کے بعد ہر روز وہلے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں اور اب کئی برس سے اپنے کپڑے خود ہی دھوتا ہوں۔ کپڑوں کو دھونے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ بالٹی میں پانی ڈال کر اس میں تھوڑا سا لکس پاؤڈر اور دو بڑے چمچے امونیا کے ڈال دیئے جائیں اور اس میں کپڑوں کو ڈال کر ایک یا دو گھنٹہ کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ امونیا اور لکس والا پانی کپڑوں کی میل کو حل کر دے اس کے بعد اچھی کوالٹی کا صابن دیکڑے دھونے کے لئے ۵۰ یا ۷۰ نمبر کے صابن بہت اچھے ہیں) لگا کر ان کو دھو دیا جائے۔ کپڑا دھونے کے بعد کپڑے میں صابن باقی نہ رہنا چاہیے اور پانچ سات بار کھلے پانی میں ان کو صاف کر دینا چاہیے تاکہ صابن باقی نہ رہے اس کے بعد سفید کپڑوں کو تھوڑا سا نیل لگا دیا جائے۔ گھر میں خود کپڑے دھونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہو گا کہ دھو بی کے ہاں دوسروں کے گندے کپڑوں کے ساتھ یہ ملائے نہ جائیں گے اور دوسرے دھو بی کے ہاں دھلوانے کے مقابلہ پر کپڑے کی عمر میں بہت اضافہ ہو جائے گا یعنی اگر دھو بی سے دھلوانے کی صورت میں کپڑا تین ماہ میں پھٹ جائے گا تو اگر پر کی ترکیب سے گھر میں دھوتے ہوئے کپڑا ایک برس میں بھی نہ پھٹے گا۔ کپڑا دھونے میں زیادہ محنت بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اور دھو بی

کے مقابلہ پر کپڑے زیادہ صاف ہوں گے۔  
 کان۔ کانوں کی غلاظت صاف کرنے کے لئے کسی ایسی شے کا استعمال کرنا بے حد خطرناک ہے جس کو جراثیم لگے ہوں۔ میں کانوں کو ہمیشہ چھوٹی قینچی کے سرے پر صاف اور مستحضر کپڑا لگا کر صاف کرتا ہوں تاکہ قینچی کا سراکان کے اندرونی حصہ کو زخمی نہ کر سکے اور صاف کرنے سے پہلے قینچی کو کاربانک سوپ یا کسی دوسری جراثیم کش دوائی مثلاً سٹرین وغیرہ سے دھولیتا ہوں تاکہ اس پر جراثیم نہ ہوں۔

ناخن۔ ناخن کو ہفتہ میں ایک بار ضرور کاٹ دینا چاہیئے تاکہ ان میں میل نہ جم سکے اور ناخن کاٹنے کے بعد ہاتھوں کو کاربانک صابن یا کسی جراثیم کش دوائی سے ضرور دھو دینا چاہیئے۔

## بزنس کا کیریکیر اور تجارتی ساکھ

بہت برس ہوئے لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس پریکٹیشنرز نے باتوں باتوں میں ایک بار خوب کہا تھا کہ ”جس بزنس میں کی تجارتی ساکھ قائم نہ ہو وہ تجارت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور تجارتی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ جس شخص سے روپیہ دینے کا کوئی وعدہ کیا جاسکے یا روپیہ ادا کرنے کی تاریخ مقرر کی جاسکے تو اس شخص کو تاریخ مقررہ سے ایک روز پہلے روپیہ دے دیا جائے چاہے روپیہ کسی پٹھان سے بہت زیادہ سود پر ہی کیوں نہ قرض لینا پڑے۔ کیونکہ تاریخ مقررہ سے پہلے یا تاریخ مقررہ پر روپیہ ادا کرنے کے بعد روپیہ دینے والا تجارتی ساکھ کو دیکھ کر دو گنا اور سو گنا روپیہ اور دے سکے گا۔“

لالہ امیر چند کھنہ کا یہ بیان تجارتی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تجارتی دنیا میں اگر ساکھ قائم ہے تو سب کچھ ہے اور اگر ساکھ قائم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

ایک زمانہ میں جب دالیان ریاست کے چلائے ہوئے گئی فوجداری اور دیوانی مقدمات ایڈمیر ریاست کے خلاف دائر تھے اور یہ تمام مقدمات دہلی سے چھوچھ سائیل کے فاصلہ پر تھے تاکہ ایڈمیر ریاست مقدمات کی زیادتی سے پریشان ہو کر اپنی شکست قبول کر لے اور ہتھیار گرا دے۔ اور ان مقدمات میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا تو اس زمانہ میں ایڈمیر ”ریاست“ چھتیس ہزار روپیہ کا مقرض بن گیا اور دہلی میں یا کسی اور مقام پر اس کی ایک پیسہ کی جاہلانہ غلطی مگر یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ کسی قرضہ دار نے بھی کبھی تنگ نہ کیا کیونکہ قرض لینے والے تمام یہ محسوس کرتے تھے کہ دیوانہ صندلہ گوالی پریشان نہیں ہوتا بلکہ یہ نہایت ہندوستان پر ایمان نہیں یعنی ایڈمیر ”ریاست“ کی تجارتی ساکھ قائم تھی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا روپیہ مارا نہ جائے گا۔

تجارتی ساکھ کے متعلق ایک واقعہ دلچسپ ہے کسی برس تک ”ریاست“ دہلی کے محکمہ سبکدوشی میں چیتا رہا اور اکثر روپیہ تو ساتھ ساتھ ادا کیا جاتا تھا مگر پھر بھی اس کے قرضہ پر میں کا گیارہ سو روپیہ باقی رہا۔

تھا کہ اخبار کے چھاپنے کا انتظام ایک دوسرے پر پس پس کر لیا گیا اور یہ گیارہ سو روپیہ محبوب المطابع کمانی مشکلات کے باعث کئی برس تک ادا نہ ہو سکا۔ اس پر پس کے قانونی مشیر مسٹر آر۔ ایس لاہری ایک روز دفتر ریاست میں آئے تو آپ نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ محبوب المطابع پر پس نے اچھے گاہکوں کے ذمہ جو سات آٹھ ہزار روپیہ بچایا تھا۔ زاید المعیاد ہونے کے باعث اپنی کتابوں میں سے خارج کر دیا ہے۔ یہ روپیہ اب قانوناً بھی عدالت کے ذریعہ وصول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس روپیہ کے متعلق تین برس کی معیاد گزر چکی ہے۔ ایڈیٹر ریاست نے جب یہ سنا تو اس نے دریافت کیا کہ کیا وہ روپیہ بھی کتابوں میں سے خارج کر دیا گیا جو ریاست کے ذمہ تھا کیونکہ وہ بھی تو زاید المعیاد ہو چکا ہے۔ اس پر مسٹر لاہری نے فرمایا۔

”ریاست“ والا گیارہ سو روپیہ تو ہم نے کتابوں میں سے خارج نہیں کیا کیونکہ گریہ روپیہ زاید المعیاد ہو چکا ہے مگر ہم جانتے ہیں۔ کہ یہ روپیہ ادا ہو جائے گا چاہے دس برس بھی کیوں نہ ہو جائیں“

اس کے چند ماہ بعد یہ روپیہ اساطط کی صورت میں محبوب المطابع پر پس کو ادا کر دیا گیا اور اب اس روپیہ کے متعلق لاہری صاحب سے جب بھی ذکر آتا ہے تو میں کہا کرتا ہوں کہ برس کے کسیر کبیر اور تجارتی سالہ کا ایک تاریخ پہلو یہ ہے کہ لوگ معیاد گزرنے کے بعد بھی روپیہ کے وصول کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔

دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی کا ایک نامور ترین پر پس ہے جو اپنی چھپائی کے لحاظ سے بہت شہرت رکھتا ہے۔ اور اب تو دہلی میں پنجابیوں کے بہت اچھے اچھے پر پس ہیں۔ تبادلہ آبادی سے پہلے اس پر پس کا اچھی چھپائی کے اعتبار سے کرنی دوسرا پر پس مقابلہ نہ کر سکتا تھا اور گزرندوں اور وائیسرے تک کا کام اس پر پس میں چھپنے کے لئے آتا۔ اس پر پس کی تجارتی سالہ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ بہت برس ہوئے اس پر پس میں ایک کتاب چھپنے کے لیے آئی جو بہت کافی ضخیم اور بہت بڑی مقدار میں تھی۔ اس کتاب کی جب چھپائی ہو چکی تو پر پس کے مالک لالہ شبنو ناتھ نے دیکھا کہ کتاب کے کچھ فرسے خراب چمپے ہیں اور وہ پتھر بھی کٹ چکے ہیں جن سے یہ فرسے چھلپے گئے تھے آپ نے فوراً کاتب کو بلا کر یہ فرسے لئے لکھوائے۔ بازار سے کاغذ منگایا اور ان کی قیمت اس سے ادا کی اور پر پس میں چھاپ کر ان فرموں کو خراب فرموں کی جگہ رکھا اور کتاب گاہک کو دی گئی۔ اور گاہک کو کوئی علم نہ تھا کہ مالک پر پس نے کاغذ اور کتابت کا خرچ خود برداشت کیا ہے۔ اس واقعہ کا آپ کے ایک دوست کو علم ہوا تو اس نے ازراہ ہمدردی ان غیر ضروری مصارف پر اظہارِ افسوس کیا۔ اس کے جواب میں لالہ شبنو ناتھ نے کہا۔ ”جو روپیہ صرف کیا گیا برس کی سالہ اس سے زیادہ قیمتی تھی۔ اگر یہ روپیہ صرف نہ کیا جاتا ایک تو ہم اس گاہک سے بیعت کے لئے عہدہ ہو جاتے اور دوسرے یہ گاہک اور دس گاہکوں کے پاس شکایت کر کے ہماری بدنامی کا باعث بنتا۔“ یعنی حقیقتاً اندیش ناجرد قنایہ کے مقابلہ پر اپنی تجارتی سالہ کو زیادہ عزیز سمجھتا ہے اور حقیقت

نا انڈیش تا جر وقتی مفاد پر اپنی تجارتی ساکھ کو قربان کر دیتے ہیں۔

جب پچھلی جنگ شروع ہوئی تو جنگ کا اعلان ہونے سے دو روز پہلے جرمنی کی ایک فرم کارلن سے بھیجا ہوا چیک دفتر ”ریاسنت“ میں پہنچا جو غالباً تین چار سو روپیہ کا تھا۔ اور اعلان جنگ ہونے کے باعث یہ چیک کیش ہونے کے لیے برلن نہ بھیجا جاسکا کیونکہ کسی دشمن ملک کے ساتھ لین دین یا خط و کتابت کرنا جرم تھا۔ اور یہ چیک اس فرم کی فائل میں منتھی کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد پانچ برس تک جنگ جاری رہی۔ روس نے جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ میں پہلے حیل گیا اور جیل سے واپس آیا تو ہاتھ کاغذ کی گرفتاری کے چند روز بعد کانگریسوں کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا اور میری نظر بندی میں ہی اخبار بند ہو گیا۔ اور میں جب نظر بندی سے رہا ہو کر واپس آیا۔ اخبار کو پھر جاری کیا اور جنگ بھی ختم ہو چکی تھی اور ایک روز پچھلے کاغذات کو تلف کرنے کے لیے فائیلوں میں سے نکال رہا تھا تو اتفاق سے یہ چیک نظر پڑ گیا۔ اور میں نے تلف ہونے والے کاغذات میں سے اس چیک کو الگ کر کے رکھ لیا۔ اور اس سے اگلے روز اس خیال سے کہ شاید یہ فرم روس کی گولاباری سے پہنچ گئی ہو یہ چیک میں نے اس فرم کو برلن بھیج دیا اور ساتھ لکھا کہ چیک کے پہنچنے کے بعد جنگ جاری ہو گئی تھی اس لیے یہ چیک تک نہ بھیجا اب اگر آپ چاہیں تو اس کی جگہ دوسرا چیک بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ دیکھ سہ ہے کہ اس فرم نے اس چیک کے واپس پہنچتے ہی ایک دوسرا ڈرافٹ بھیج دیا جو دہلی کے ایک بینک کے نام تھا اور اس فرم نے اپنے خط میں رقم کی ادائیگی کی دیر کے لئے اظہار افسوس بھی کیا۔ یعنی پانچ برس کے بعد بھی جرمنی کی اس فرم نے رقم ادا کر کے اپنے بزنس کے کیرئیر کی بلندی کا ثبوت دیا مگر اس کے مفتابلہ پر ہندوستان میں تجارتی ساکھ کی کیونکر مٹی پلیدگی جاری ہے اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی مارکیٹ میں ہماری زبان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔

دنیا کی مارکیٹ میں جہاں تک مال کے اچھا ہونے۔ ایک بات کرنے اور بزنس کے کیرئیر کی بلندی کا سوال ہے۔ برطانیہ پہلی صف میں ہے۔ اس کے بعد جرمنی کا نمبر ہے اور جہاں تک مال کی کوالٹی کے ادئے اور قیمت کے کم ہونے کا سوال ہے جاپان کا کوئی دوسرا ملک مفتابلہ نہیں کر سکتا اور امریکہ بھی مارکیٹ میں کوئی زیادہ اچھی ساکھ نہیں رکھتا۔ وہ یہ عام شکایت ہے کہ امریکن مال تو اچھی کوالٹی کا دکھاتے ہیں مگر مال جو سہلانیا گیا جاتا ہے اس کی کوالٹی اچھی نہیں ہوتی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خریدنے والا جب بازار میں جاتا ہے تو سب سے پہلے انگلستان اور جرمنی کا بسنا ہوا مال تلاش کرتا ہے اور اگر یہ نہ ملے تو پھر وہ امریکن مال خریدتا ہے۔ کیونکہ برطانیہ اور جرمنی کی تجارتی ساکھ مارکیٹ میں زیادہ اچھی ہے۔ ہندوستان ہی نہیں تمام مشرقی ممالک کی حالت تجارتی ساکھ کے اعتبار سے نہ صرف قابل رحم بلکہ شرمناک بھی ہے جسکے کی تجارتی عزت اور وقار کی پروا نہ کرتے ہوئے خراب مال تیار کرتے ہیں اور عارضی اور وقتی منافع پر اپنی امداد اپنے ملک کی تجارتی ساکھ کو قربان

کر دیتے ہیں جسے ان کا اپنی تجارت پر ظلم اور اپنے ملک کے ساتھ عذاری قرار دیا جانا چاہیے چنانچہ یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ جنوبی ہند سے امریکہ کو جو کالی مرچیں بھیجی جاتی ہیں وہ خالص نہیں ہوتیں۔ اگرہ سے روس کو کئی لاکھ جوڑے جوتوں کے بیچے گئے جو مال کے ناقص ہونے کے باعث وہاں پر کر دیئے گئے۔ لہذا نہ اور جالندھر میں سائیکلوں اور سلائی کی مشینوں کے پرزے تیار کر کے ان پر برطانوی کارخانوں کی ٹھہر لگا دی جاتی ہے۔ کھائے کی اشیاء میں لکڑی کا براہ ریت اور کھڑیا مٹی ملائی جاتی ہے۔ دودھ میں پانی نہیں بلکہ پانی میں دودھ ملایا جاتا ہے۔ ادویات میں ملاوٹ کی جاتی ہے اور لاکھوں کی تعداد میں ہر روز جعلی لیبل چھپ رہے ہیں جو غیر ملکی خالی مشینیں پر لگا کر ان میں ناقص اور نقصان رساں ادویات بھری جاتی ہیں۔ اور اس تجارتی چار سو میں کا خمیازہ ملک کی تجارتی ساکھ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اور یہ لوگ نہیں سوچتے کہ اگر تجارتی ساکھ قائم ہے تو تجارت میں کامیابی ہی کامیابی ہے اور اگر تجارتی ساکھ قائم نہیں تو گو وقتی منافع تو مل سکتا ہے مگر ان کی تجارت کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔ اور تجارتی ساکھ کے باعث یورپ میں تو دو سو برس سے لیٹیڈ کمپنیاں قائم ہیں مگر ہندوستان میں لیٹیڈ کمپنیاں عام طور پر دو چار برس میں ہی دیوالی کی درخواست دے کر بند کر دی جاتی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں لیٹیڈ کمپنی کے معنی ہی کاشی ٹیڈیشنل دے آف چٹینگ دینی دنیا کو لوٹنے کا آئینی طریقہ سمجھا جاتا ہے اور کمپنی کے قائم کرنے سے پہلے سوچ لیا جاتا ہے کہ کس کس طریقہ کے ساتھ حصہ داروں کا رویہ مضبوط کیا جائے گا۔

## حضرت جوش ملیح آبادی کی درویشانہ فطرت

حضرت جوش ملیح آبادی کی خدایا مذہب کے متعلق کچھ بھی پرزیشن ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ فطرتاً ایک بہت ہی بلند اور درویش صفت انسان ہیں۔ اور میں نے اپنی زندگی میں دوسروں کی مخالفت یا کمزوریوں کو معاف کر دینے والا انسان ان سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا اور جب بعض خود غرض لوگ ان پر غلط الزام لگاتے ہوئے ان کی مخالفت کرتے ہیں تو میرا خون ابل آتا ہے۔ چنانچہ میں ان کے صرف چند واقعات لکھتا ہوں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ درویش صفت اور محصور انسان کیونکر زندگی بھر دوسروں کے کام آتا رہا۔ اور یہ طبعاً اور فطرتاً لکھتا ہوتا ہے۔

ایک شاعر طویل موصوفہ تک ان کی مخالفت کرتے رہے اور انھوں نے حضرت جوش کا نام لیکتے بشیر "ریاست" میں چھپنے کے لیے ایک نظم بھی بھیجی تاکہ مجھے یہ علم نہ ہو کہ یہ کس کے خلاف ہے اور یہ نظم "ریاست" میں چھپ جائے مگر میں نے جب یہ نظم دیکھی تو محسوس کیا کہ اس نظم کے پروردگار جوش صاحب کی مخالفت ہے اور میں نے یہ نظم "ریاست" میں شائع نہ کی۔ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد یہ حضرت اپنے وطن سے واپسی تشریف لائے۔ دفتر "ریاست" میں ہی

مقیم ہوئے۔ اہل لحاظ سے بے حد پریشان تھے۔ اور کسی سلازمت کے خواہاں تھے۔ تو باتوں باتوں میں جب یہ ذکر ہوا کہ جوش صاحب ان کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ یہ حضرت جوش کے پاس گئے اور اپنی تنگدستی اور مشکلات کا ذکر کیا تو جوش صاحب فرما ان کی امداد کے لیے تیار ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ چیف کنسٹرکشنر شکر پرشاد کے پاس سفارش کے لیے چلے گئے۔ اور آپ نے یہ خیال کیا کہ یہ حضرت ایک طویل عرصہ سے ان کے خلاف زہر اگلے رہے ہیں۔

کنور ہندرسنگہ بیدی سٹی مجسٹریٹ دہلی اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان تعلقات کچھ کشیدہ سے ہو گئے جس کی وجہ ایک دوست کی غلط بیانی تھی۔ کنور صاحب جوش صاحب کے گہرے دوست تھے اور ایڈیٹر "ریاست" جوش صاحب کے پیارے دوست ہیں۔ جوش صاحب کنور صاحب اور ایڈیٹر "ریاست" کے تعلقات کی کشیدگی کو بہت بری طرح سے محسوس کرتے تھے اور آپ نے بار بار ان تعلقات کو اچھا کرنے کی کوشش کی مگر آپ کو اس میں کامیابی نہ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں غیر ضروری طور پر خود دالہ تھے اور کوئی بھی جھٹکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر اتفاق ایسا ہوا کہ کنور صاحب بیمار ہو گئے۔ آپ نے ڈاکٹر سین کے ہسپتال میں اپرین کرایا جو دفتر "ریاست" سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ جوش صاحب نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور آپ دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ نصف گھنٹہ کے قریب اُدھر آدھر کی گپ بازی کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں۔ آپ کی کار دفتر "ریاست" کی گلی کے باہر کھڑی تھی اور جب دفتر "ریاست" سے چلے تو آپ ڈاکٹر سین کے ہسپتال کے سامنے ٹوک گئے اور کہا کہ ایک بیمار کو دیکھنا ہے۔ میں بھی چند منٹ کے لیے ہسپتال کی ادھر کی منزل میں ان کے ساتھ چلوں جہاں کہ بیمار مقیم ہے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا اور ہم اُس کمرہ میں پہنچے تو دیکھا کہ کنور صاحب ہیں۔ کنور صاحب تپاک سے ملے اور تعلقات کی کشیدگی دور ہو گئی کیونکہ دراصل تعلقات کی کشیدگی کی کوئی خاص وجہ ہی نہ تھی صرف ایک دوست نے اپنی غرض کے لیے یہ تعلقات کشیدہ کر دیئے تھے۔ یعنی جوش صاحب نے ایک دوستانہ "سازش" کرتے ہوئے ان کشیدہ تعلقات کو خوشگوار صورت میں بدل دیا۔

دہلی گورنمنٹ کے چیف منسٹر جو دہری برہم پرکاش سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا کیونکہ میں دزلیا حکام سے ملنے کے اعتبار سے کچھ غیر معمولی ساریزرد ہوں۔ اور بغیر کام کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا چنانچہ ابھی حال میں مرکزی گورنمنٹ کے ایک بہت بڑی پوزیشن کے وزیر نے مسٹر انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" سے یہ مشکوہ بھی کیا کہ میں ان سے کبھی ملا نہیں (حالانکہ جو دہری برہم پرکاش کی بلندی کی میر مشتاق احمد اور دوسرے کئی اصحاب نے تعریف کی۔ جوش صاحب اور جو دہری برہم پرکاش کے تعلقات گہرے دوستانہ تھے۔ مجھے علم نہیں کہ میرے متعلق ان دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ ایک روز جوش صاحب دوپہر کو اپنی کار میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ آج رات میں کھانا

ان کے ہاں کھاؤں میں نے کہا کیا کوئی خاص تقریب ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی خاص تقریب تو نہیں جی چاہتا تھا کہ اچھے بیٹھ کر کھانا کھائیں اور باتیں کریں۔ کیونکہ باتیں کیے بہت روز ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ میں رات کو حاضر ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ شام کو سات بجے کے قریب پھر آ گئے اور میں نے کہا کہ میں تو آپ کے ہاں آنے والا تھا۔ آپ کیوں تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک تزیین خیال تھا کہ میں بھول جاؤں گا اور دوسرے یہ کہ عین وقت پر کوئی بہانہ نہ کر دوں۔ اس لئے آپ خود ہی لینے کے لئے چلے آئے۔ میں ان کے ساتھ ان کی کوشی پر گیا۔ اور وہاں ہم بیٹھے ہی تھے کہ چودھری برہم پرکاش آ گئے۔ تو اس وقت آپ نے بتایا کہ میرے لائے کی وجہ یہ تھی کہ میرا چودھری صاحب سے تعارف ہو جائے اور اس غرض کے لئے ہی آپ نے دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ مجھے بتایا اس لئے نہ تھا کہ میں کہیں آنے سے انکار نہ کر دوں۔ کیونکہ میں حکام اور وزرا سے بہت کم ملتا ہوں۔ کھانے کی میز پر مختلف کھانوں کے علاوہ دسکی بھی تھی۔ میں نے تو نصف پیگ کے قریب دسکی پی۔ جوش صاحب نے اپنا کوٹا پڑا کیا۔ اور چودھری برہم پرکاش نے نہ تو دسکی پی اور نہ گوشت کی کچی ہوئی کوئی شے کھائی کیونکہ آپ کانگریسی اور گاندھی جگت ہیں۔ کھانے پر مختلف باتیں ہوتی رہیں اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں چودھری صاحب سے ملا۔ اور جوش صاحب نے اس کے لئے بھی ایک سازش کی حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے ویسے ہی فرماتے تو میں حاضر ہو جاتا۔ مگر آپ کو خیال تھا کہ میں شاید نہ آؤں اور ملنے سے احتراز کروں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد کا ذکر ہے ایک دوست آپ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ آپ اپنے دوست مسٹر شنکر پرشاد چیف کشنر سے ہسپتال کالائنس دینے کی سفارش کر دیں۔ آپ ان کو لے کر مسٹر شنکر پرشاد کے پاس پہنچے اور انہیں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مسٹر شنکر پرشاد۔ فرمائیے کیا ارشاد ہے۔

جوش صاحب۔ یہ میرے دوست ہیں اور ان کو ہسپتال کے لائسنس کی ضرورت ہے۔ مسٹر شنکر پرشاد۔ اب تو فسادات ختم ہو چکے ہیں۔ اب ہسپتال کی کیا ضرورت ہے۔ جوش صاحب۔ ہاں ہسپتال کی اب ضرورت تو نہیں۔

دوست۔ جوش صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں رات کو بارہ بجے واپس گھر آتا ہوں۔ راستہ خطرناک ہے۔ مجھے ہسپتال کی ضرورت ہے۔

جوش صاحب۔ ہاں ہسپتال کی ضرورت تو ہے۔

مسٹر شنکر پرشاد۔ رات کو تمام سڑکوں پر پولیس کا پہرہ ہوتا ہے اس لئے کیا ضرورت ہے۔

جوش صاحب۔ ہاں ضرورت تو نہیں۔

دوست۔ جوش صاحب مجھے ہسپتال کی سخت ضرورت ہے کیونکہ مجھے رات کو آنا پڑتا ہے۔ اور آپ کو اس غرض کے لئے ہی یہاں لایا ہوں۔

جوش صاحب۔ ہاں ضرورت تو ہے۔



یعنی ایک ہی نشست میں جب اس دوست نے کہا کہ پینٹل کی ضرورت ہے تو آپ نے فرمادیا کہ ہاں ضرورت ہے اور جب چیف کمنشنر نے کہا کہ ضرورت نہیں تو آپ نے کہا کہ ہاں ضرورت نہیں۔

انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کی منسٹری میں ایک جگہ خالی تھی اور اس عہدہ کے لئے آپ کے ایک دوست کے علاوہ آپ کے ایک ماتحت (جو رسالہ آجکل "میں کام کرتے تھے") نے بھی درخواست دی۔ آپ کے یہ دوست آئے اور کہا کہ منسٹر انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ سے ملازمت دینے کی سفارش کر دیجئے۔ آپ فوراً ان کے ساتھ چلے گئے۔ اور منسٹر سے سفارش کر دی۔ جب واپس آئے اور آپ کے دفتر والوں کو اس دوست کی سفارش کا علم ہوا تو آپ کے جس ماتحت نے اس عہدہ کے لئے درخواست دی تھی اس نے کہا کہ آپ تو پہلے ہی اپنے ماتحت کی سفارش کر چکے ہیں اور ان کی درخواست پر لکھ کر سفارش کی گئی ہے۔ جوش صاحب کو اپنی پہلی سفارش یاد نہ تھی اور وہ یہ خیال رہا کہ آپ کے ماتحت نے اس عہدہ کے لئے درخواست دی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ اپنے اس ماتحت کے ذریعے اس کے ساتھ بھی منسٹر انفرمیشن کے پاس چلے گئے اور سفارش کر دی۔ جوش صاحب کی یہ حالت دیکھ کر منسٹر انفرمیشن مسکرا دیئے اور کہا کہ جگہ ایک ہے اور آپ نے ہی دو امیدواروں کی سفارش کی ہے۔ کس کے حق میں فیصلہ کیا جائے۔

جوش صاحب کا خود داری کے امتبار سے بھی بہت کم لوگ مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ کئی برس دہلی میں رہے۔ ہر منسٹر اور ہر انسٹر کے ہاں بغیر وقت مقرر کیے بے تکلف چلے جاتے۔ اور ہر وزیر اور انسٹران کی نافرمانی کرتے ہوئے ملتے سے کبھی انکار نہ کرتا۔ ایک بار پنڈت نہرو کی کوٹھی پر پنڈت جی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کہ پنڈت جی کچھ سوچتے سوچتے غل خانہ میں چٹاب کی حاجت رنج کرنے چلے گئے اور ان کو یاد نہ رہا کہ جوش صاحب سے انتظار کرنے کے لئے کہہ جائیں۔ جوش صاحب نے اسے بھی اپنی توہین سمجھا اور آپ اٹھ کر چلے آئے۔ اور بعد میں پنڈت جی نے ٹیلی فون پر غلط فہمی رنج کی۔

بہت برس ہوئے جوش صاحب سرکاری ملازم ہونے سے پہلے ایک بار دہلی تشریف لائے اور ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر ہی مقیم ہوئے تو مسلسل کئی روز تک تجھے اس دودھ فطرت اور معصوم شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ دوسرے سفارتوں کی ضرورت سے زیادہ شراب پیتے ہیں۔ پینے کے بعد کرتے ہیں اور صبح در دسر کے ساتھ دس بارہ بجے تک کر دھیں لیا کرتے ہیں۔ مگر جوش صاحب نے اپنے اعزاز سے زیادہ کبھی شراب نہیں پی۔ وقت مقبرہ پر پیتے ہیں اور اس کے بعد وقت مقررہ پر کھانا کھاتے ہیں۔ اور چاہے گرمی ہو یا سردی اور آندھی ہو یا برسات علی السبب تین چار بجے بیدار اور ضروریات سے فارغ ہو کر لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں چنانچہ جب میرے ہاں مقیم تھے تو آپ بھی صبح تین چار بجے بیدار ہو کر کام کرتے اور میری بھی یہی عادت تھی۔ اور جب دواؤں کا کام شروع کرتے تو میں کہا

مکنا کر آئیے اب دونوں مل کر نبی کی نماز شروع کر دیں۔

جوش صاحب طلوع آفتاب سے پہلے پیدل سیر کے لیے بھی جایا کرتے ہیں۔ آپ دہلی کی سول لائینز میں رہتے تھے اور ان کی کونٹھی سے کچھ فاصلہ پر رائے بہادر ڈاکٹر مشہور اداس اور چیت کشنر مسٹر شنکر پرشاد کی کونٹھیوں پر بھی تھیں اور ڈاکٹر صاحب اور مسٹر شنکر پرشاد بھی صبح پیدل سیر کرنے والوں میں سے ہیں اور سیر کرتے ہوئے یہ تینوں اکثر صبح بلا کرتے۔ جوش صاحب پر ڈاکٹر مشہور اداس صاحب کی نیکی اور بلندی کا بہت اثر تھا ایک روز ڈاکٹر صاحب اور جوش صاحب میں سیر کرتے ہوئے یہ بات چیت ہوئی۔

جوش صاحب۔ ڈاکٹر صاحب آپ شراب پیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں پی۔

جوش صاحب۔ تو پھر آپ اتنے نیک کیونکر ہیں۔ جو شخص شراب نہ پیئے وہ تو اتنا نیک ہو نہیں سکتا۔

یعنی نیک ہونے اور دل میں لہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان شراب پیتا ہو گیا کہ صرف سپرٹ (شراب) ہی دل کی کدورت کو دھو سکتی ہے۔

حضرت جوش کی خود داری کا ایک اور واقعہ دلچسپ ہے آپ ایک بار بمبئی جا رہے تھے اور اسی گاڑی کے دوسرے خانہ میں مرحوم مسٹر جناح بھی تھے۔ راستہ میں مسٹر جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری کو علم ہوا کہ حضرت جوش بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں آپ نے مسٹر جناح سے ذکر کیا تو مسٹر جناح نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ جاکر جوش کو کھانا لائیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے آکر جوش صاحب سے کہا کہ مسٹر جناح ملنے کے لیے بلا رہے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو جواب دیا کہ ”اگر مسٹر جناح ملنا چاہتے ہیں تو ان کو خود آنا چاہیے تھا۔“ پرائیویٹ سیکرٹری نے یہی الفاظ مسٹر جناح سے کہے تو مسٹر جناح حضرت جوش والے خانہ میں آئے اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔

حضرت جوش ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازم تھے۔ ایک بار نظام دکن سے کسی بات میں اختلاف ہو گیا تو آپ نے ملازمت ہی چھوڑ دی اور اپنے وطن چلے آئے۔ ان کے چلے آنے کے بعد بھی نظام نے آپ کی پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی اور بہت چاہا کہ آپ واپس حیدرآباد چلے آئیں مگر آپ نہ گئے۔ اس کے بعد حیدرآباد کے ولی عہد کے ساتھ آپ کے گھرے مراسم رہے اور ولی عہد نے بھی بہت کوشش کی کہ آپ حیدرآباد واپس چلے آئیں مگر آپ اپنی خود داری کے باعث نہیں گئے۔

حضرت جوش کی معصومیت اور لا پرواہی کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ رسالہ ”آجکل“ کے ایڈیٹر تھے تو آپ کا ایک خط ایڈیٹر ”ریاست“ کے پاس پہنچا جس پر سرکاری سروس کا ٹکٹ تھا اور خط قطعی پرائیویٹ تھا یعنی اس کا سرکاری کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس خط کے پہنچنے کے بعد تیسرے روز آپ تشریف لائے تو میں نے یہ لفظ آپ کو دکھایا اور بتایا کہ آپ کو پرائیویٹ خط و کتابت کے لیے سرکاری ٹکٹ استعمال نہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ کیا حرج تھا۔ میں نے کہا اتنا ہی حسد تھا کہ آپ اگر قید نہ ہوں تو کم از کم سرکاری ملازمت سے فوراً موقوف ہو سکتے ہیں۔ یعنی ان کو یہ علم ہی نہ تھا کہ پرائیویٹ خط و کتابت کے لیے سرکاری ٹکٹ استعمال کرنا ایک جرم ہے۔

جوش صاحب خط و کتابت کے معاملہ میں بھی بے حد غیر محتاط ہیں اور اپنے ہاتھ سے خط و کتابت میں بعض ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں۔ جو اگر پبلک میں آجائیں تو آپ کے دشمن یا مخالف ان کا غلط استعمال کرتے ہوئے آپ کو پبلک میں کھڑا ہونے کے قابل نہ سمجھیں۔ حالانکہ ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی۔ صرف بے احتیاطی کے باعث یہ خطوط نقصان پہنچانے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے حضرت جوش کے ہندوستان سے پاکستان چلے جانے کے بعد ہندوستان میں پاکستان میں ان کی مخالفت کی انھوں نے انسانیت پر ہمت ٹرا ظلم کیا کیونکہ ایک مشاعرہ ادیب اور آرٹسٹ کے لیے تمام دنیا ہی اس کا وطن ہے وہ تمام دنیا کے لیے پیدا ہوا اور تمام دنیا کے لیے مرے گا اور حضرت جوش جیسے سیاسیات سے قطعی بے نظریہ شخص کے خلاف سیاست کے پردہ میں بیچ کر حملے کرنا تو یقیناً پست فطرتی کا مظاہرہ ہے جسے معذرت پسند مقلوں میں قابل تعریف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

## کیا سکھ ہندو ہیں

میں بچپن کے زمانہ میں سکھوں کو ہندوؤں سے قطعی الگ سمجھتا تھا یعنی سکھوں کو ہندو قرار نہ دیتا تھا جس کی وجہ مجھ پر میرے سکھ دوستوں کے حلقہ کے اثرات تھے۔ اپنے آپ کو ہندو نہ سمجھتے تھے ورنہ مجھے نہ ہندوؤں کے مذہب سے کوئی واقفیت تھی نہ سکھوں کے مذہب کا کوئی علم اور اگر کوئی شخص میری موجودگی میں سکھوں کو ہندوؤں کا ایک حصہ قرار دیتا تو میں اسے برا محسوس کرتا اور بحث کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

ناگپور جیل میں مجھے کوئی کام نہ تھا اور بیکار رہتا میری فطرت کے خلاف سچ میں نے جیل کی لائبریری سے کتابوں کی فہرست منگائی تو میں نے دیکھا کہ اس فہرست میں ہندی زبان کی بہت اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں چنانچہ میرے اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور اپنے وقت کو ضائع نہ ہونے دینے کے لیے جیل کی اس لائبریری سے ہندی کی کچھ کتابیں منگالیں اور دن بھر ان کتابوں کو پڑھتا اور ہندی لٹریچر اور ہندی کتابوں کا یہ مطالعہ کرتے ہی مجھے خیال آیا کہ میں ہندی زبان کے بلند ترین شعرا کے کلام کا زباں سوت "میں کیوں نہ جہنم شرد"۔

نہ کر دوں۔ چنانچہ میں نے اس جیل میں ہی بہاری اور پراگندہ غیر ہندی زبان کے بلند شعرا کے کلام کا ترجمہ شروع کر دیا اور جب جیل سے رہا ہوا تو میں نے ان کتابوں میں سے اتنے مواد کا ترجمہ کر لیا جو ”ریاست“ کے نئے جاری کیے جانے والے کالم ”جذبات شرق“ کے کئی ماہ کے لیے کافی تھا اور جیل سے رہا ہوتے ہی میں نے اس نئے مستقل کالم کو ”ریاست“ میں جاری کر دیا۔

اس کالم کو جاری ہوتے عرصہ ہو چکا تھا اور میں جب کرسمس کے دنوں میں کلکتہ گیا تو راستہ میں بنارس آ کر کریم نے دو سو روپیہ مالیت کی اور کتابیں ہندی زبان کی خریدیں کیونکہ بنارس ہندی زبان کا مرکز ہے اور وہاں اچھی سے اچھی کتابیں مل سکتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ میں نے گورکھپوری زبان کی اچھی اچھی کتابیں بھی جمع کر لیں اور گورکھپوری زبان کی ان کتابوں میں گوردھ صاحب کے بعد سکھوں کے لیے سب سے زیادہ قابل احترام شخصیت بھائی گورداس کی تصانیف اور سکھ لٹریچر کی مشہور تصنیف ”بھرتیاں“ بھی تھیں جو ادبی اعتبار سے بہت ہی بلند ہیں۔ جب پنجابی زبان کا بھی یہ لٹریچر میں نے جمع کر لیا اور اس کا ترجمہ شروع کیا تو ایک روز میں نے دیکھا کہ بھرتیاں (جو گوردگوبند سنگھ کی تصنیف ہے) میں سری کرشن اور رادھا جی کی تعریف میں اشعار ہیں جن کے لٹریچر اعتبار سے بہت ہی بلند قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان اشعار کا ترجمہ ”ریاست“ میں شائع کر دیا مگر میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ کلام گوردگوبند سنگھ کا ہے یا گوردگوبند سنگھ کے ارشاد کے مطابق یہ کلام بھرتیاں میں شامل کیا گیا اور ان اشعار میں سری کرشن اور رادھا جی کی تعریف کی گئی ہے تو یہ کہنا کس قدر کذب بیانی ہے کہ سکھ ہند نہیں۔ اور جس صورت میں گوردھ صاحب سری کرشن اور رادھا جی کے معترف تھے یہ کہنا ایک مذہبی ظلم ہے کہ سکھ ہند نہیں اور وہ ہندوں سے بالکل الگ ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے قادیان کے ایک احمدی مبلغ گیلانی عباد اللہ (جو سکھ لٹریچر پر اتھارٹی ہیں) کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی کہ آپ سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالیں۔ گیلانی صاحب ”ریاست“ اور ایڈیٹر ”ریاست“ کے معترف ہیں آپ نے اس خط کے جواب میں ایک بہت طویل خط لکھا اور اس میں دوسرے سکھ لٹریچر کے علاوہ گوردگرنٹھ صاحب کے بھی حوالے دیئے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ گوردھ صاحبان رام اور کرشن کے معترف یا بھگت تھے۔ میں نے جب یہ خط دیکھا تو بہری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دہلی کے ایک سکھ مکتب فروش کے ہاں سے اٹھارہ روپیہ میں ایک چھوٹے سا نیر کا گوردگرنٹھ صاحب منگایا اور دیکھا کہ جن شہدوں کا گیلانی عباد اللہ نے حوالہ دیا ہے وہ تمام شہد گوردگرنٹھ صاحب ہیں موجود ہیں۔ چنانچہ ان شہدوں کو دیکھنے کے بعد میں نے سکھوں کی تین اہم شخصیتوں (جو سکھوں کو ہندوؤں سے الگ تسلیم کرنے کے مدعی تھے) پر دھیس جو دھ سنگھ ایم۔ اے۔ خالصہ کالج امرتسر سردار پیدار بھائی آر جن سنگھ آف باگٹیاں (جو ریاست ہائے ناظم۔ پٹیلہ اور

جیند کے مذہبی شبر تھے اور سردار امر سنگھ کو خط لکھتے اور دریافت کیا کہ گورو گرنتھ صاحب کے ان شیدوں کے متعلق ان سکھوں کی کیا پوزیشن ہے جو سکھوں کو ہندوؤں کا ایک حصہ نہیں بلکہ ان کو ہندوؤں سے بالکل الگ قرار دیتے ہیں۔ ان تین اصحاب میں سے سردار امر سنگھ نے تو لکھتے کہ آپ کی آنکھوں میں ہلکیت ہے اس لئے آپ تفصیل کے ساتھ جواب نہیں دے سکتے اور کچھ عرصہ بعد جواب دیں گے۔ اور اس کے بعد ان کا کبھی بھی جواب نہ آیا۔ پروفیسر جردھ سنگھ کا نہ صرف کوئی جواب نہ آیا بلکہ آپ نے خط پہنچنے کی بھی کوئی اطلاع نہ دی۔ اور سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ آف بآگڑیاں کا ایک طویل خط پہنچا جس میں گورو گرنتھ صاحب کے صرف ان شیدوں کو نقل کر دیا تھا جو سری کرشن اور رام چندر جی کے خلاف با آن کی تعلیم دہانڈیا لوجی سے اختلاف رکھتے تھے۔ جب تینوں اصحاب کو لکھے گئے خطوط کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا تو میں نے سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ آف بآگڑیاں کو تو یہ جواب دیا کہ آپ کے خط اور حوالہ جات کا مطالبہ یہ ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں متضاد خیالات موجود ہیں اور آپ کا ایسا کہنا سکھ مذہب کی بہت بڑی توہین ہے چنانچہ میں نے ریاست میں کئی ایک ایڈیٹوریل لکھے جن میں سکھوں کے لیڈروں کو چیلنج کیا گیا کہ ان کے پاس ان شیدوں کا کیا جواب ہے جو گورو گرنتھ صاحب میں سری کرشن اور رام چندر جی کی تعریف میں ہیں۔

جب ریاست میں یہ ایڈیٹوریل شائع ہوئے تو دہلی ہندوہاں سبھا کے ایک لیڈر دفتر ریاست میں نشریف لائے۔ یہ پہلے بھی کبھی سبھا کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر سکھوں کو ہندو ثابت کرنے کی یہ تحریک زور کے ساتھ شروع کی جائے تو سیٹھ برلا دبرلا ٹیلی میں ایک سیٹھ برلا تو گاندھی بھلت اور کانگریسی ہیں اور دوسرے سیٹھ برلا کٹر کلاس کے ہندوہاں بھائی ہیں اس تحریک کے لئے بہت کافی روپیہ دے سکتے ہیں۔ میں نے جب ہندوہاں بھائی لیڈر کا یہ ارشاد سنا تو میں مسکرایا اور کہا کہ اگر تحریک جاری کرنا ایک نیا بن بھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ میرے روپیہ کے لاپس سے نہیں کیونکہ روپیہ کے لئے تحریک جاری کرنا ایک نیا بن بھتا ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی اور آئندہ بھی اگر لکھوں گا تو صرف اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر۔ ہندوہاں سبھا کے یہ لیڈر تو میرا یہ جواب سن کر نشریف لے گئے۔ اور میں نے اس کے بعد بھی کئی ایڈیٹوریل اپنی زندگی میں لکھے جن میں صاف کہا گیا تھا کہ گورو گرنتھ صاحب اور سکھ لٹریچر کی تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ سکھ ہندو نہیں ہیں اور وہ ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں اپنے منہ کو گندہ کرنا ہے۔ اور سکھوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مذہب ہندوؤں سے بے تعلق ہیں ایک بہت بڑی کذب بیانی ہے جس کی مذہبی دنیا میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ میں اب بھی اس خیال کا مدعی ہوں کہ ہندوؤں میں سکھوں کی پوزیشن بالکل ایسی ہی ہے جیسی سنان دھرم میں۔ آریہ سماجیوں۔ جینیوں۔ اور بودھوں وغیرہ کی۔ یعنی یہ ہندو قوم کا ایک حصہ اور فرقہ ہیں۔ یہ ہندوؤں سے قطعی الگ نہیں۔ اور میں اپنے ضمیر کی اس آواز پر قائم رہوں گا۔ کیونکہ سکھ ازم کی تعلیم کے مطابق حق و صداقت کی آواز پیدا کرنا اور اس کا پابند رہنا ہی سکھ ازم ہے۔ اور میں ان سکھوں کا سکھ ہونا

تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو وقتی جذبات سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے دشمن ہیں یا جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں مقصودم اور بے گناہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب میں قتل کر کے ننگ انسانیت اور ننگ سکھ اہم شعار کا ثبوت دیا۔

## ایڈمر "ریاست" کے خلاف مقدمات اور ان میں بریت

کتاب "نا قابل فراموش" کے ختم کرنے سے پہلے میں ان جودہ مقدمات کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں جن کے چلاسنے میں سابق والیاں ریاست کا ہاتھ تھا کیونکہ ان مقدمات نے میری زندگی میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا اور اگر یہ مقدمات نہ چلائے جاتے تو شاید اس کتاب کے لکھنے کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا ان مقدمات کی تفصیل یہ ہے:

(۱) سب سے پہلے مجھ پر پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں ہمارا جہ پٹیا لہ کے ایما اور پنجاب کے بدنام ترین لفٹننٹ گورنر سر ایچکل اور ڈوایر کے حکم سے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ قائم ہوا۔ یہ مقدمہ ڈپٹی کمشنر لاہور کی عدالت میں ایک مپقٹس کے سلسلہ میں چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں میری کم عمری کو دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نے مجھے تنبیہ کر کے مقدمہ واپس لے لیا۔

(۲) یہ مقدمہ مجھ پر کوکین اور کھنکھنے کے جرم میں چلایا گیا جو لاہور کے مجسٹریٹ ٹھاکر للٹ چنکی عدالت میں تھا۔ یہ مقدمہ مرحوم ہمارا جہ پٹیا لہ کے رد پیہ سے چلایا گیا میں اس مقدمہ میں باعزت بری ہوا اور مجسٹریٹ نے مقدمہ چلانے والوں کے خلاف سخت ریمارک پاس کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس مقدمہ کی تحقیقات ایک لایق اور دیانتدار اعلیٰ پولیس آفیسر خان بہادر مسٹر عبدالعزیز کے ذریعہ کی اور مقدمہ میں حصہ لینے والوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔

(۳) تاہم کے ایڈمنسٹریٹو مسٹر اوگلی نے ہمارا جہ پٹیا لہ کے ایما سے ہمارا جہ پٹیا لہ کے خلافت بنادمت کرنے کے جرم میں مجھے نا بھ میں گرفتار کیا اور کئی ماہ تک پولیس کی حراست میں رکھا اور ہندوستان کے وائسیرائے لارڈ ریڈنگ کے حکم سے یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

(۴) ماسٹر ریاست پٹیا لہ میں مجھ پر امانت میں خیانت کرنے کے جرم میں ہمارا جہ پٹیا لہ کے ایما سے ایک مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں مرکزی اسمبلی میں بحث ہوئی اور درجنوں ممبران اسمبلی نے حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقدمہ میں حکم گورنمنٹ ہند میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

(۵) چورنگ آباد (سی پی) میں ذواب مہوپال نے یہ مقدمہ پرنسپل پر فیکشن ایکٹ میں قائم کیا۔ یہ مقدمہ بھی کئی بار مرکزی اسمبلی میں زیر بحث آیا۔ مقدمہ چھ برس تک چلا۔ کئی بار

ٹیکٹورٹ ناگپور میں گیا۔ اس مقدمہ میں میرا اسی ہزار روپیہ اور نواب بھوپال کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور اس مقدمہ میں مجھے تین ماہ قید کی سزا ہوئی اور میں اسے کلاس میں رکھا گیا۔

(۶) میرا تو ای کی عدالت میں ریاست پٹیالہ کے ایک جج نے یہ مقدمہ میرے خلاف توہین کا جاری کیا۔ مقدمہ میں پچاس ہزار روپیہ ہر جانہ کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر چند ماہ کے بعد جب مقدمہ میں حاراجہ کو بے نقاب ہونے کا عندیہ ہوا تو یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

(۷) یہ مقدمہ نواب بھوپال نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں دائر کیا۔ یہ مقدمہ دہلی کورٹ میں بھی گیا۔ اور میں نہ صرف باعزت بری ہوا بلکہ عدالت اور دہلی کورٹ نے نواب بھوپال کے نمائندوں پر عدالت میں جعلی دستاویز پیش کرنے اور ریاست کو سازش کے ذریعہ کچلنے کا سنگین الزام بھی لگایا۔

(۸) یہ مقدمہ ریاست خیر پور میرس کے وزیر اعظم نے سکھر میں توہین کا دائر کیا اور یہ مقدمہ گورنمنٹ آف بمبئی کے حکم سے واپس لے لیا گیا۔

(۹) نواب بھوپال کے نمائندوں کے ایسے یہ مقدمہ آنریری مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں دائر ہوا جس میں باعزت بری ہوا۔

(۱۰) یہ مقدمہ نواب بھوپال کے نمائندوں نے ایک شخص شمس الدین کے ذریعہ دہلی میں دائر کیا مگر مجسٹریٹ نے میرے نام سن ہی جاری نہ کیے۔

(۱۱) حراجہ حسن نظامی نے نواب رام پور کے ایسے یہ مقدمہ رام پور کے کاغذات چوری کرنے کے جرم میں کیا مگر پولیس نے چالان تک نہ دیں۔

(۱۲) یہ مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ کے ذریعہ جھانسی میں کیا گیا اس مقدمہ کی تہ میں بھی ایک دایہ ریاست کا ہاتھ تھا۔

(۱۳) یہ مقدمہ حاراجہ پٹیالہ کے خسر سردار اندر سنگھ نے دہلی میں دائر کیا اور میں بری ہوا۔ اور مجسٹریٹ نے اسپیشیل میں سختی کے خلاف سخت دیر پا رکھیں۔

(۱۴) یہ مقدمہ جعلی نوٹوں کے رکھنے کے الزام میں تھا اس مقدمہ میں سسٹیم لاء

گروپل داس صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ریاست بجنور تھے میں اس مقدمہ میں بری ہوا اور ٹیکٹورٹ نے پولیس کے خلاف اگلی عدالت میں سخت دیر پا رک پاس کیے۔

